تعلق بارہ بنکی سے تھا لیکن خود کو لکھنوی سمجھتے تھے۔ لکھنؤ کی سی شائستگی اپنالی گئی تھی اور پھر یہ ایسی مسلط ہوئی کہ بارہ بنکی بھول گئے اور لکھنؤ یاد رہ گیا۔ حسام احمد البتہ دنیا ساز نہ تھے لکھنؤ کو بارہ بنکی پر ترجیح نہیں دیتے تھے اور شستہ گفتگو میں بھی کبھی کبھی اپنے مخصوص جملے بول جاتے تھے۔ یوں بھی انھوں نے کسی سے نہ کہا کہ ان کا تعلق لکھنؤ سے ہے۔ کھرے آدمی تھے کھری بات کرتے تھے لیکن ان کے باتیں کرنے کا دور گزر چکا تھا۔ پاکستان آئے تو ان خوش نصیبوں میں سے تھے جو بہت کچھ ساتھ لے آئے تھے۔ بارہ بنکی میں بھی چار گاؤں کے مالک تھے اور بڑے لوگوں میں شمار ہوتے اور . . . نواب جی کہلاتے تھے۔ یہاں بھی عیش و عشرت میں گزری اور کوئی مشکل پیش نہیں آئی۔ چھوٹی چھوٹی چند فیکٹریاں لگائیں، اپنے شوروم بنائے اور چار گاؤں یہیں بھی آباد ہو گئے۔ رہے نواب جی کے نواب جی۔ لیکن اب بوڑھے ہو گئے تھے۔ ایک ہی بیٹا تھا جسے اعلیٰ تعلیم دلائی تھی اور جب وہ تعلیم سے فارغ ہوا تو سب کچھ اسے سونپ کر سبکدوش ہو گئے . . .

نوجوانی میں بھی رنگیلے رہے تھے آج بھی مست تھے۔ عمر ستر کے پیٹے میں تھی لیکن قویٰ جوانوں سے مضبوط تھے۔ رنگ سرخ و سپید تھا۔ حواس خمسہ پوری طرح بیدار تھے۔ کوئی کمی نہیں آئی تھی۔ جوانوں کی طرح سیدھی تھی۔ بتیسوں دانت موجود تھے۔ حسن پرست شروع سے تھے۔ آج بھی تانک جھانک سے باز نہ آتے تھے۔ اور شمس النساء بیگم ہمیشہ کی طرح آج بھی ان کی کڑی نگرانی کرتی تھیں لیکن ساری جوانی شوہر کے جل میں آتی رہی تھیں۔ اب اس بڑھاپے میں ان کی کیا نگرانی کرپاتیں۔ جاسوسی ناول اور کہانیاں پڑھنے کے شائق تھے اور ٹیلی ویژن پر جاسوسی فلمیں دیکھتے تھے۔ یہ تھے قبلہ حسام احمد نواب جی۔

دوسری طرف شجاع احمد صاحب تھے۔ باپ کے لاکھوں کو کروڑوں بنا چکے تھے۔ تین بیٹوں اور دو بیٹیوں کے باپ تھے لیکن صحت و جوانی ورثے میں ملی تھی۔ تین بچوں کے بھائی معلوم ہوتے تھے۔ دولت یوں بھی صحت و جوانی کی محافظ ہوتی ہے۔ اس نے شجاع احمد صاحب کو کوئی تکلیف نہ ہونے دی تھی اور وہ جوان کے جوان تھے۔ کاروباری گر میں طاق تھے مجال ہے کہیں مار کھائی ہو۔ فیکٹریاں تھیں، کارخانے تھے، شوروم تھے۔ لاکھوں روپے کی آمدنی تھی لیکن آمدنی کے حصول کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں چھوڑتے تھے۔ ادھر اُدھر کا کوئی کام بھی ہاتھ لگ جاتا اور اس میں کچھ آمدنی کی اُمید ہوتی تو ضرور کرتے تھے اور کسی کو کانوں کان خبر نہ ہونے دیتے۔

دولت کی ریل پیل ایک مزاج بنا دیتی ہے۔ بعض اوقات

اس مزاج کی تشکیل میں کوشش شامل نہیں ہوتی پھر فطرت خود بخود بدل جاتی ہے اور انسان میں چند تبدیلیاں رونما ہو جاتی ہیں۔ یہ تبدیلیاں عین نوجوانی کے عالم میں تو نہ تھیں لیکن رفتہ رفتہ شجاع احمد صاحب ان کے شکار ہوتے گئے۔ اب وہ ایک مغرور انسان کی حیثیت سے مشہور تھے۔ چھوٹے موٹے لوگوں سے بات کرنا پسند نہیں کرتے تھے۔ رکھ رکھاؤ حد سے زیادہ بڑھا ہوا تھا۔ سوچ سمجھ کر مسکراتے تھے۔ یوں شجاع احمد صاحب کی زندگی گزر رہی تھی۔

ہر چند کہ حسام احمد صاحب کی رپورٹ گھر میں اچھی نہیں تھی اور وہ نظر باز مشہور تھے لیکن سخت گیر انسان تھے۔ اس لیے شجاع احمد صاحب محتاط رہتے تھے۔ آج تک اگر وہ کسی سے ڈرتے تھے تو وہ صرف حسام احمد صاحب سے۔ ذرا سی دیر میں بار [illegible] کے رانگ [illegible] جاتے تھے نواب جی اور اس وقت شجاع احمد کو خطرہ لاحق ہو جاتا تھا کہ [illegible] بنی بنائی خاک میں نہ مل جائے۔ اس لیے ساری زندگی نواب [illegible] جی سے ہوشیار رہے۔ صحت و جوانی باپ سے ورثے میں ملی تھی تو دوسری عادات بھی ملیں اور جوانی میں انھوں نے بھی کوئی کسر نہ چھوڑی۔ البتہ جس دن انھیں احساس ہوا کہ تسنیم کا قد خوب لانبا ہو گیا ہے اور اس کی آنکھوں میں جوانی جاگ اٹھی [illegible] اس دن سے انھوں نے توبہ کر لی تھی اور بیٹی کے باپ نظر آنے لگے تھے۔

اور اب ان کی ساری توجہ کاروبار پر تھی۔ یہ گر بھی انھوں نے باپ ہی سے سیکھے تھے۔ حسام احمد صاحب نے آسانی سے چار گاؤں نہیں بنا لیے تھے۔ انھوں نے بھی بہت جدوجہد کی تھی۔ کہیں جنگلات کے ٹھیکے لیے تو کہیں صابن کی پوری لاٹ خرید لی۔ جہاں سے ممکن ہوا کمایا۔ یہی عادت شجاع احمد صاحب کی تھی۔

ان دنوں بھی وہ ایک سودے کے سلسلے میں آئے تھے۔ ایک ہفتے کا کام دو دن میں نمٹا لیا تو واپسی کی سوجھی۔ تنہا آئے تھے اور کسی کو نہیں بتایا تھا کہ کہاں جا رہے تھے۔ بہر حال لاکھوں کا منافع کما کر گھر لوٹ رہے تھے۔ اس کے لیے جدوجہد اور بھاگ دوڑ بھی کافی کرنی پڑی تھی اس لیے تھکن محسوس کر رہے تھے سوچا کہ گھر جا کر ہی آرام کریں گے لیکن ائرپورٹ پہنچے تو فلائٹ نہ مل سکی۔ چونکہ اندازہ ایک ہفتے کا تھا اس لیے بکنگ نہیں کرائی تھی۔ ٹکٹ حاصل کرنے کی ہر کوشش ناکام رہی تو وہاں سے کچھ سوچ کر ریلوے اسٹیشن کی جانب چل پڑے۔ چلتے تو ایک دو رات قیام بھی کر سکتے تھے لیکن فطرت کچھ ایسی تھی گھر جانے کی ٹھانی تو اب گھر ہی پہ آرام کرنے کا مصمم ارادہ تھا۔ نہ سہی ڈیڑھ گھنٹے کا سفر ڈیڑھ دن کا سہی کم از کم یہ احساس تو نہ رہے گا کہ وقت بے کار گزر رہا ہے۔

ریلوے اسٹیشن پر بات چیت کی تو ایک گھنٹے بعد جانے والی ٹرین میں فرسٹ کلاس کا ٹکٹ مل گیا اور شجاع احمد صاحب نے سکون کی سانس لی۔ اب وہ ذہنی طور پر مطمئن تھے۔ ٹرین آئی اور وہ ایک قلی کی مدد سے اپنے کمپارٹمنٹ میں سوار ہو گئے۔ دل میں تھوڑی سی الجھن ضرور تھی کہ ممکن ہے کمپارٹمنٹ میں رش ہو لیکن جب اندر داخل ہوئے تو یہ دیکھ کر باچھیں خوشی سے کھل گئیں کہ پورا کمپارٹمنٹ خالی پڑا تھا اور وہ پُرسکون انداز میں اپنی نشست پر جا بیٹھے۔ صرف ایک چھوٹا سا اٹیچی ساتھ تھا جس میں رات کو سونے کے دو جوڑے اور ایک دو جوڑے مزید تھے۔ دو کمبل ساتھ لائے تھے کیونکہ سردیوں کا زمانہ تھا۔ ان تمام چیزوں کو قلی نے احتیاط سے رکھا اور دس روپے کا نوٹ لے کر سلام کر کے نیچے اتر گیا۔ شجاع احمد صاحب اطمینان سے اپنی سیٹ پر فروکش ہو گئے اور ٹرین کے چلنے کا انتظار کرنے لگے۔ ٹرین یہاں زیادہ دیر نہیں رکی تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد وسل دے کر چل پڑی اور ان کا یہ خدشہ بھی دور ہو گیا کہ ممکن ہے کوئی اور آ جائے۔ کوئی ایسا آ جاتا تو شجاع احمد صاحب کے سر پر کوئی بار تو نہ ہوتا لیکن بس [illegible] ذہنی طور پر اس بات کو محسوس کرتے رہتے کہ وہ مطمئن نہیں ہیں حالانکہ جہاز میں تو وہ تنہا نہیں ہو سکتے تھے لیکن ٹرین کے اس کمپارٹمنٹ میں وہ تنہا ہی سفر کرنا چاہتے تھے۔ اس طرح پُرسکون انداز میں بہت سی باتیں سوچنے کا موقع مل جاتا اور یہ ڈیڑھ دن جو وہ ٹرین کے سفر میں ضائع کر رہے تھے کارآمد ثابت ہو جاتا۔ سرمایہ کار کے لیے تنہائی اور سکون بڑی چیز ہوتی ہے وہ کسی پُرسکون گوشے میں بیٹھ کر لاکھوں روپے اِدھر سے اُدھر کر دیتا ہے۔ یہی کیفیت اب شجاع احمد صاحب کی تھی۔ بہت سے معاملات پر انھوں نے سوچنا چھوڑ دیا تھا۔ گھر کے امور بیگم صاحبہ کی نگرانی میں بخیر و خوبی چل رہے تھے۔ کاروباری امور کے لیے بہت سے منیجر تھے اور بے شمار ایسے کارکن جو وفاداری سے اپنا فرض نبھا رہے تھے اور بہترین معاوضے حاصل کر رہے تھے۔ ان کارکنوں نے شجاع احمد صاحب کا ذہنی بوجھ بہت ہلکا کر دیا تھا اور وہ اپنی کاروباری مصروفیات میں پوری دلجمعی سے اپنے قدم آگے بڑھا رہے تھے۔ کچھ سردی محسوس ہوئی تو انھوں نے ایک کمبل اٹھا کر اپنے پیروں پر ڈال لیا اور پھر ایک رسالہ لے کر نیم دراز ہو گئے۔ یہ رسالہ بین الاقوامی کاروباری امور کا تھا اور اس میں شجاع احمد صاحب کی بے شمار دلچسپیاں چھپی ہوئی

تھیں۔ ٹرین کا سفر جاری رہا نجانے کتنی دیر تک وہ چلتی رہی تھی اس کے بعد بریکوں کی تھرتھراہٹ سنائی دی اور آہستہ آہستہ ٹرین رک گئی شاید کوئی اسٹیشن آگیا تھا۔ شجاع احمد صاحب نے توجہ نہیں کی اور نہ ہی انھوں نے احمق مسافروں کی طرح شیشے کھول کر باہر جھانکنے کی خواہش محسوس کی۔ بھلا کیا ضرورت تھی ٹرین اپنی منزل کی جانب رواں دواں تھی یہ دیکھنا کیا معنی رکھتا تھا کہ اب کون سا اسٹیشن آیا ہے وہ ایسی احمقانہ باتوں میں وقت گزارنے کے عادی نہیں تھے لیکن اس وقت انھیں چونکنا پڑا جب ٹرین کے دروازے سے کوئی اندر داخل ہوا۔ ٹرین اس وقت آہستہ آہستہ رینگنے لگی تھی جب وہ شخص اندر آیا تو اپنے ہمسفر کو ایک نگاہ دیکھنے کے لیے انھوں نے نظریں اٹھائیں اور ایک معمولی سے لباس میں نوجوان کو اپنے سامنے پایا شکل وصورت تو خاصی خوبصورت تھی۔ آنکھوں کی تیز چمک سے احساس ہوتا تھا کہ ذہین بھی ہے لیکن لباس غیر معیاری تھا معمولی سی پتلون اور قمیص میں ملبوس تھا۔ ہاتھ میں صرف ایک اٹیچی کیس جو بوسیدہ اور پرانے طرز کا تھا اور شاید جس کے ہک بھی ٹھیک سے لگے ہوئے نہیں تھے اس لیے کہ اوپر سے چمڑے کی ایک بیلٹ باندھ لی گئی تھی۔ یہ مجہول سا نوجوان ائرکنڈیشنڈ کوپے میں سفر کرنے کے قابل ہے؟

شجاع احمد صاحب نے دوبارہ رسالے پر نگاہیں جما کر سوچا اور پھر دوسری بات ان کے ذہن میں آئی۔ یہ اس وقت اس کوپے میں سوار ہوا ہے جب ٹرین چل پڑی تھی ممکن ہے جلد بازی میں یہاں گھس آیا ہو۔ ورنہ اس فرسٹ کلاس کمپارٹمنٹ میں سفر کرنا ایسے لوگوں کے بس کی بات نہیں تھی۔ تاہم ان کے دل میں اس کے خلاف کوئی اور جذبہ نہ ابھرا وہ اپنے رسالے میں ہی کھوتے رہے۔ پورا کمپارٹمنٹ ہی خالی تھا۔ نوجوان کہیں بھی بیٹھ جاتا لیکن اس نے ان کے بالکل سامنے والی سیٹ پر ہی قبضہ جمالیا تھا۔ اٹیچی وہیں رکھ کر وہ اطمینان سے پاؤں پر پاؤں رکھ کر بیٹھ گیا۔ شجاع احمد صاحب نے ایکبار بھی اس کی طرف نگاہ اٹھا کر نہیں دیکھا تھا اگر کوئی قابل دید یا قابل تعریف شخصیت ہوتی تو شاید وہ اس قدر بد اخلاقی کا مظاہرہ نہیں کرتے لیکن یہ نوجوان تو انھیں بالکل ہی نچلی سطح کا معلوم ہوا تھا اس لیے انھوں نے اس پر توجہ نہیں دی۔ زیادہ دیر نہیں گزری تھی نوجوان نے انھیں مخاطب کیا۔ "میں نے کہا محترم ایسی بھی کیا بے نیازی۔ یہ رسالہ ہے کہ کسی محبوبہ کا خط۔ اتنے انہماک سے پڑھ رہے ہیں جیسے اس کے علاوہ دنیا میں اور کوئی چیز نہ رہ گئی ہو۔"

شجاع احمد صاحب نے نگاہیں اٹھا کر اسے دیکھا اور ناپسندیدگی کے تاثرات چہرے پر پھیل گئے اور پھر وہ کسی قدر سرد لہجے میں بولے۔

"جاہل بھی ہو۔ عمروں کا تقاضا ملحوظ رکھا جاتا ہے۔ میری عمر محبوبہ کا خط پڑھنے کی نہیں ہے یہ باتیں جوان العمر چھوکروں کو ہی زیب دیتی ہیں چنانچہ صاحبزادے پہلے گفتگو کرنے کا سلیقہ سیکھو اس کے بعد کسی سے مخاطب ہونا بہتر ہوگا۔" یہ کہہ کر انھوں نے رسالے پر نگاہیں جمالیں۔ لیکن نوجوان بھی ڈھیٹ تھا اس کے چہرے پر ناگواری کی کوئی شکن نمودار نہ ہوئی اور اس نے پھر کہا۔

"دراصل محترم جوانی کی عمر کا ایک تعین کر لیا جاتا ہے۔ پیدا ہونے کے بعد ہر نیا سال ایک نئی عمر کی جانب لے جاتا ہے۔ درمیانی حصے کو ہم جوانی کہہ لیتے ہیں لیکن انسانی ضرورتیں پیدائش کے بعد سے موت تک جاری رہتی ہیں یہ دوسری بات ہے کہ ہم نے عمر کے حصے متعین کر لیے ہیں۔ میں جاننا چاہتا ہوں کہ عمر کے اس دور میں داخل ہو کر کونسی تحریر اس قدر قابلِ توجہ ہو سکتی ہے جس میں آپ اتنے منہمک ہیں؟" شجاع احمد صاحب نے پھر نگاہیں اٹھا کر اسے دیکھا اس گفتگو میں کچھ سلیقہ نظر آیا تھا لیکن اس کا لباس اس کی شخصیت اس قابل نہیں تھی کہ شجاع احمد صاحب اس سے زیادہ گفتگو کرتے تاہم شریک سفر تھا مختصراً بولے۔

"آنے والا وقت تمھیں ان تمام چیزوں سے روشناس کرا دے گا۔ بہتر یہ ہے کہ اگر کوئی شخص خاموشی پسند ہے تو اس کی خاموشی میں مداخلت مت کرو۔"

"اوہ۔ گویا عرفِ عام میں آپ کو نک چڑھا کہا جا سکتا ہے۔" نوجوان ہونٹ سکوڑ کر بولا۔

"کہنا مناسب نہیں ہے جو تصور کرنا چاہو اپنے دل میں کر لو اور خاموش ہو کر بیٹھو۔ میں اب تمھاری کسی بات کا جواب دینا پسند نہیں کروں گا۔"

"بہت بہتر۔ سنا تھا کہ فرسٹ کلاس میں سفر کرنے والے کھسکے ہوئے ہوتے ہیں دیکھ بھی لیا۔" اس نے کہا اور شجاع صاحب نے ہونٹ بھینچ کر اسے دیکھا۔ ان الفاظ میں گستاخی چھپی ہوئی تھی لیکن یہ کم ذات چھوکرا اس کے علاوہ اور کر بھی کیا سکتا تھا۔ وہ اس کے منہ نہیں لگنا چاہتے تھے چنانچہ خاموش ہو کر دوبارہ رسالے میں غرق ہو گئے۔ لیکن ایک ہلکی سی بے چینی کا احساس ان کے ذہن میں سرایت کر گیا تھا۔ انھوں نے سوچا کہ اگر یہ ہم سفر رہا تو وہ ذہنی کوفت کا شکار رہیں گے۔ نئی نسل کارکردگی میں تو ناکارہ ہے اور اس جھنجلاہٹ کی وجہ سے گستاخ اور بے لگام ہو گئی ہے۔ یہ لوگ زندگی کے سفر میں

ذہانت کی ان دستوں کو نہیں چھو پاتے جو بہتر مستقبل کی ضامن ہوتی ہیں۔ ایک سرکشی ایک بغاوت ہے اس نسل میں۔ لیکن بہتر یہی ہے کہ اس کے سامنے خاموشی اختیار کر لی جائے۔
کچھ دیر گزری تھی کہ وہ پھر ان سے مخاطب ہوا۔ "ماچس ہوگی آپ کے پاس؟" شجاع احمد صاحب کو بڑی زور سے غصہ آیا بجانے کیا سمجھ رہا ہے وہ انھیں گھٹیا انسان۔ انھوں نے نفرت سے گردن اٹھائی اور سرد لہجے میں بولے۔
"نہیں۔ ماچس نہیں ہے میرے پاس۔"
"سگریٹ بھی نہیں ہوگی؟" نوجوان بولا اور شجاع صاحب نے رسالہ بند کر کے نیچے رکھ دیا۔
"تم مسلسل گستاخی کیے جا رہے ہو۔ میں دیر سے تمھیں نظرانداز کر رہا ہوں۔ تمھارا کیا خیال ہے میں کوئی چڑچڑا بڈھا ہوں کہ تم مجھ سے مسلسل چھیڑ چھاڑ کرو۔ صاحبزادے پہلے اپنے آپ کو اس قابل بناؤ کہ کسی سنجیدہ اور معمر شخص سے گفتگو کر سکو۔ یہ سب کچھ جو تم کر رہے ہو تمھارے اپنے خیال میں بہت دلچسپ ہے اور تم کسی گھٹیا سے مکان میں گھٹیا سے سگریٹ کا دھواں اڑاتے ہوئے اپنے دوستوں کو اس سفر کی داستان سناؤ گے اور کہو گے کس طرح تم نے دورانِ سفر ایک شخص کو پریشان کیا تھا۔ دیکھو میاں اول تو میرا خیال ہے کہ تم اس کمپارٹمنٹ میں سفر کرنے کے قابل ہی نہیں ہو اور اگر تم نے ٹکٹ خرید ہی لیا ہے تو بہتر ہوگا کہ خاموشی سے سفر کرو۔ میں تم سے نہ تو بے تکلف ہو سکتا ہوں نہ زیادہ گفتگو کرنا چاہتا ہوں۔"
"اوہ۔" نوجوان نے گردن ہلائی۔ "گویا سگریٹ بھی نہیں ہے آپ کے پاس؟"
"نہیں۔" شجاع احمد صاحب نے کہا اور بے چینی سے ادھر ادھر دیکھنے لگے۔ نوجوان کی حرکت کا انھیں تھوڑا بہت اندازہ ہوتا جا رہا تھا۔ وہ تلخ باتوں پر مشتعل ہونے کا عادی نہیں معلوم ہوتا تھا چنانچہ اب وہ انھیں پریشان کرتا رہے گا۔ نوجوان نے شاید ان کی یہ بے چینی محسوس کر لی اور گردن ہلا کر بولا۔
"[illegible] ہے۔ پھر تو آپ مجھ سے بھی زیادہ تھرڈ کلاس آدمی ہیں [illegible] میں آپ سے کوئی گفتگو نہیں کروں گا۔"
شجاع [illegible] صاحب کے چہرے پر ایک لمحے کے لیے سرخی نظر آئی لیکن انھوں نے کوئی تلخی پیدا کرنا مناسب نہ سمجھا۔ دورانِ سفر اس قسم کی احمقانہ باتوں پر وہ توجہ نہیں دینا چاہتے تھے لیکن اب رسالہ پڑھنے کو بھی جی نہیں چاہا۔ انھوں نے آنکھیں بند کر لیں اور اپنی سیٹ کی پشت سے ٹیک لگائے لیکن نیند کا دور دور تک پتہ نہیں تھا۔ اس کے علاوہ وہ سونا بھی نہیں چاہتے تھے۔ کمپارٹمنٹ میں صرف یہ ایک لفنگا تھا۔ کیا کہا جا سکتا ہے اگر وہ سو گئے تو ان کا اٹیچی لے کر نیچے اتر جائے۔ اب ان کے ذہن میں ایک اور خیال آیا اگر کوئی اسٹیشن آ جائے اور ٹرین رکے تو وہ کم از کم اس نوجوان کے بارے میں چھان بین کر لیں۔ گارڈ کو بلا کر اسے کہیں کہ اس کا ٹکٹ وغیرہ چیک کریں اور اگر یہ غلط کمپارٹمنٹ میں گھس آیا ہے تو اسے یہاں سے بھگا دیں اور ان کی اس خواہش کی تکمیل بھی ہو گئی۔ زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ پھر ٹرین میں بریک لگنے کی آواز سنائی دی اور اس بار شجاع احمد صاحب نے عام آدمیوں کی طرح کھڑکی کھول کر اس کا شیشہ اٹھایا اور باہر دیکھنے لگے۔ کوئی اسٹیشن ہی آ رہا تھا انھوں نے کمبل پیروں سے اٹھا کر برابر کی سیٹ پر رکھ دیا اور کھڑے ہو گئے۔ آہستہ آہستہ وہ کمپارٹمنٹ کے دروازے پر آ گئے۔ ٹرین رک رہی تھی۔ انھوں نے دروازہ کھول لیا۔ پھر جب ٹرین رکی تو وہ نیچے اتر آئے۔ نوجوان اطمینان سے اپنی جگہ بیٹھا رہا تھا۔ ریلوے کا ٹکٹ کلکٹر اتفاق سے بالکل برابر والے کمپارٹمنٹ سے نیچے اترا تھا شجاع احمد صاحب نے اسے روک لیا۔
"میرا نام شجاع احمد ہے اس کمپارٹمنٹ میں سفر کر رہا ہوں ایک نوجوان چھوکرا ایک اسٹیشن سے اس میں چڑھا ہے۔ میرا خیال ہے یا تو کسی تھرڈ کلاس ڈبے کا ٹکٹ رکھتا ہے یا پھر کوئی غلط آدمی ہے براہ کرم آپ اسے چیک کر لیں۔"
"بہت بہتر۔ آپ چلیے میں ابھی آتا ہوں۔" ٹی ٹی نے کہا۔ اور شجاع احمد صاحب اپنے دروازے میں بڑھ گئے۔ ابھی انھیں زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ ٹکٹ چیکر اندر آ گیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک کتاب تھی۔ اس نے شجاع احمد صاحب پر نگاہ ڈالی اور خود کو انجان بناتے ہوئے ان سے ٹکٹ کے بارے میں پوچھا تاکہ نوجوان کو شبہ نہ ہو۔ اس کے بعد وہ اس نوجوان کے نزدیک آ گیا۔ نوجوان نے بھی اپنا ٹکٹ نکال کر اس کے سامنے کر دیا تھا۔ چیکر نے گردن ہلائی اور بے بسی کے انداز میں شجاع احمد صاحب کو دیکھا اور پھر نیچے اتر گیا۔ گویا نوجوان کا ٹکٹ بھی درست تھا۔ شجاع احمد صاحب کی بے چینی کم نہ ہوئی۔ ٹرین پھر چل پڑی تھی۔ وہ دروازہ بند کر کے اپنی سیٹ پر آ بیٹھے پھر بے خیالی کے عالم ہی میں انھوں نے ایک غیر ملکی سگریٹ کا پیکٹ نکالا۔ اور اس کے ساتھ ہی وہ خوبصورت لائٹر بھی جسے انھوں نے بلجیم سے خریدا تھا۔ سگریٹ ہونٹوں میں لگا کر انھوں نے لائٹر سلگایا اور گہرے گہرے کش لینے لگے۔ نوجوان نیم وا آنکھوں سے انھیں دیکھ رہا تھا۔ سگریٹ کے دو تین کش لینے کے بعد شجاع صاحب پھر اپنی جگہ بیٹھ گئے اور سگریٹ پیتے رہے۔ انھیں اس بات کا خیال نہیں رہا تھا

کہ تھوڑی دیر قبل اس نوجوان نے ماچس مانگی تھی۔ انھوں نے سوچا کہ انھیں کسی کمزوری کا مظاہرہ نہیں کرنا چاہیئے تاکہ یہ لفنگا ان پر حاوی نہ ہو جائے۔ دو چار باتیں کر لینے میں کوئی حرج نہیں ہے لیکن اس کے ساتھ انھوں نے یہ بھی سوچا کہ اب وہ دوبارہ ان سے مخاطب ہوگا تب وہ اس سے باتیں کریں گے۔ کیا حرج ہے کم از کم گھٹیا لوگوں کی ذہنیت کا اندازہ بھی ہوتے رہنا چاہیئے۔ نوجوان اب بھی پاؤں پہ پاؤں رکھے آنکھیں بند کیے گھٹنا ہلا رہا تھا۔ سردی کسی قدر بڑھ گئی تھی۔ پھر اس نے ایک گہری سانس لی اور سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔

"سردی کچھ بڑھ گئی ہے۔" وہ جیسے خود سے بولا۔ لیکن شجاع احمد صاحب نے اس موقع سے فائدہ اٹھایا۔

"ہاں جس علاقے سے ٹرین گزر رہی ہے وہ سرد علاقہ کہلاتا ہے۔" نوجوان نے چونک کر آنکھیں کھول دیں۔

"ارے واہ۔ سگریٹ نے آپکو اچانک خوش اخلاق بنا دیا ہے۔"

"شاید۔" شجاع احمد صاحب مسکراتے ہوئے بولے۔ اور پھر گہری نگاہوں سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

"کیا نام ہے تمھارا۔؟"

"فائدہ۔؟ ہم چند گھنٹوں کے ساتھی ہیں۔ ایک دوسرے سے اتنی واقفیت کیا ضروری ہے۔"

"ہوں۔ بدلہ لے رہے ہو۔ گفتگو کی ابتدا تو تم نے کی تھی۔"

"اور انتہا آپ نے کر دی۔"

"نہیں وہ انتہا نہیں تھی۔ بس میں فطرتاً لوگوں سے بے تکلف ہونے کا عادی نہیں ہوں۔"

"بہت بڑے آدمی ہوں گے۔" نوجوان بولا۔

"بڑائی کا تصور تمھارے ذہن میں کیا ہے؟"

"دولت۔ اس دور میں دولت ہی بڑے چھوٹے کا تعین کرتی ہے حالانکہ سینکڑوں کتابوں میں یہی گھسے پٹے الفاظ لکھے ہیں کہ بڑائی اچھے اخلاق اور اچھی عادات سے تعبیر کی جاتی ہے لیکن جدید دور کے سوچنے کا ڈھنگ بدل گیا ہے۔"

"پڑھے لکھے معلوم ہوتے ہو۔"

"جی ہاں۔ آپ کا کیا خیال ہے؟ تعلیم بھی کچھ مخصوص لوگوں کی میراث ہو گئی ہے کیا؟"

"نہیں ایسی بات نہیں ہے البتہ تعلیم حاصل کرنے کے بعد انسان کو کسی قدر شستہ ہونا چاہیئے۔"

"جی ہاں اور اپنی شائستگی کو اپنی جیب میں رکھے بیٹھا رہنا چاہیئے۔ کسی سے گفتگو کی جائے تو وہ حیثیت کا تعین کرنے بیٹھ جاتا ہے۔"

"ہوں۔ کیا کرتے ہو۔؟ پڑھ رہے ہو یا کوئی ملازمت وغیرہ؟"

"جی نہیں۔ نہ پڑھ رہا ہوں نہ ملازمت کر رہا ہوں۔ بس وقت گزار رہا ہوں۔"

"ہوں، اور وقت گزار کر جب تم عمر کے اس دور میں پہنچو گے جہاں وقت کے گزر جانے کا دکھ ہوتا ہے تو پھر کیا ہاتھ لگے گا تمھارے؟"

"نصیحتیں کرنا چاہتے ہیں؟"

"ہاں اس لیے کہ عمر میں تم سے بڑا ہوں۔"

"اچھا اچھا بڑائی کا یہ تصور بھی ہے آپ کے ذہن میں۔؟ بہرصورت میرے بارے میں جان کر آپ کو کوئی فائدہ نہ ہوگا بس بے سروسامانی کے عالم میں سفر کر رہا ہوں عادتیں ذرا گھٹیا ہیں۔ یہ کمبل آپکے پاس فالتو ہے؟" نوجوان نے اچانک دوسرے کمبل کی جانب رخ کر کے کہا اور شجاع صاحب کو پھر الجھن ہونے لگی۔

"کیا مطلب؟"

"دیکھ رہے ہیں آپ کہ میرے پاس کمبل نہیں ہے اور سردی اب ایسی ہو گئی ہے کہ کمپارٹمنٹ کی دیواروں سے بھی اندر گھس رہی ہے۔ آپ محسوس کر رہے ہیں نا۔"

"ہاں یقیناً۔"

"تو اگر یہ فالتو کمبل میرے کام آ جائے تو کیا حرج ہے؟"

"میں معذرت خواہ ہوں۔" شجاع احمد صاحب نے بداخلاقی کا بدترین مظاہرہ کیا۔ دراصل انھیں یہ نوجوان ایک آنکھ نہیں بھایا تھا۔ ورنہ وہ اس قدر کنجوس مزاج نہ تھے۔

"اوہ۔" نوجوان نے مسکرا کر کہا۔ "شاید یہ بھی سگریٹ اور لائیٹر کی طرح آپ کو عزیز ہے؟"

"ہاں۔ اس لیے کہ میری اپنی ملکیت ہے۔ میری ایک اور عادت ہے۔"

"کیا؟" نوجوان نے پوچھا۔

"جو چیز میں استعمال کرتا ہوں وہ کسی دوسرے کو نہیں استعمال کرنے دیتا اور اگر کوئی اسے استعمال کر لے تو پھر اسے اپنے قابل نہیں سمجھتا۔"

"بری عادت ہے۔" نوجوان نے مسکرا کر گردن ہلائی اور پھر سیٹ سے ٹیک کر آنکھیں بند کر لیں۔ سر پھرا ہی معلوم ہوتا ہے یہ بھی۔ شجاع احمد صاحب نے سوچا اور کمبل شانوں تک کھینچ لیا۔ نوجوان جیب سے ایک سکہ نکال کر اس سے کھیلنے لگا تھا۔ شاید بیکاری کے مشغلے کے طور پر۔ شجاع احمد صاحب نے کئی بار دزدیدہ نگاہوں سے اسے دیکھا لیکن وہ بھی ان کی طرف متوجہ نہیں تھا۔ دفعتاً سکہ اس کے ہاتھ سے نیچے گر پڑا اور لڑھکتا ہوا شجاع صاحب کے نزدیک آ گیا۔ نوجوان نے جھک کر اسے اٹھایا تھا اور اس کا ہاتھ شجاع صاحب کے بدن کو لگا تھا۔

شجاع احمد صاحب نے کوئی توجہ نہیں دی کمبل کا ایک گوشہ سرک گیا تھا۔ انھوں نے اسے اپنے بدن پر برابر کر لیا اور پھر کچھ اور دراز ہو گئے۔ نیند کا تو اب بھی کہیں نشان نہیں تھا۔ بس سونے کی کوشش کر رہے تھے اور اس وقت ان کی پلکیں جڑ گئی تھیں جب انھوں نے اپنے سگریٹ کی رانتک بو کمپارٹمنٹ میں محسوس کی۔ انھوں نے چونک کر آنکھیں کھول دیں تو نوجوان مطمئن انداز میں سگریٹ کے گہرے گہرے کش لے رہا تھا بے اختیار ان کا ہاتھ اپنی جیب کی جانب چلا گیا جہاں سگریٹ اور لائٹر رکھے ہوئے تھے۔ سگریٹ اور لائٹر جیب میں نہ تھے وہ چونک کر سیدھے ہو گئے اور ہاتھ لگا کر اٹھنے کی کوشش کی لیکن دونوں چیزیں ان کے نزدیک بے ترتیب پڑی ہوئی تھیں شاید لیٹتے ہوئے جیب سے نکل گئی تھیں۔ انھوں نے گہری سانس لی اور پیکٹ اور لائٹر اٹھا کر دوسری جانب رکھ لیا۔ ملیے یہ نوجوان ان کی نگاہ میں اب تھوڑا سا پُراسرار ہو گیا تھا۔ بظاہر بے سرو سامان اور پھکڑ لیکن یہ سگریٹ جو وہ پی رہا تھا بے حد قیمتی تھا۔ شجاع صاحب کا خیال تھا کہ اس قسم کے سگریٹ کا حصول بہت مشکل ہے لیکن بہر حال جب سگریٹ تیار ہوتی تھی تو باہر بھی جاتی تھی ممکن ہے اس کے پاس بھی وہ موجود ہو۔ انھوں نے پھر آنکھیں بند کر لیں اور خیالات میں ڈوب گئے۔ ذہن بار بار اسی کی جانب متوجہ ہو جاتا تھا لیکن اب کچھ غنودگی سی طاری ہوتی جا رہی تھی بہت دیر گزر گئی بس ذہن نیم غنودہ سا تھا لیکن وہ جاگ ہی رہے تھے۔ کاروباری خیالات، گھر کا ماحول، بے شمار باتیں ان کے ذہن میں آ رہی تھیں اور وہ ٹرین کی ہلکی سی گونج اپنے ذہن میں محسوس کر رہے تھے۔ پھر جب انھوں نے سوچا کہ اس طرح لیٹنے سے کوئی فائدہ تو ہو نہیں رہا نیند بھی آ نہیں رہی۔ چنانچہ وہ اٹھ کر بیٹھ گئے۔ برابر سے سگریٹ کا پیکٹ اٹھایا اور اس میں سے ایک اور سگریٹ نکال لی لیکن اسی وقت انھیں احساس ہوا وہ خاصے حاضر دماغ تھے۔ اس پیکٹ میں سے انھوں نے اس سے قبل صرف تین سگریٹیں پی تھیں۔ تیسری سگریٹ وہ تھی جو انھوں نے اس نوجوان کے سامنے پی تھی لیکن چوتھی سگریٹ کہاں گئی۔ ہاں جو سگریٹ انھوں نے نکالی تھی وہ پانچویں تھی۔ ان کی آنکھیں متحیرانہ انداز میں پھیل گئیں۔ اس کا مقصد ہے کہ چوتھی سگریٹ وہ تھی جو نوجوان نے پی تھی لیکن کیسے؟ کس طرح؟ بے اختیار ان کی نگاہیں سامنے بیٹھے ہوئے نوجوان کی طرف اٹھ گئیں لیکن اب وہ بیٹھا نہیں لیٹا ہوا تھا اور اس کی گہری گہری سانسیں ابھر رہی تھیں جو سب سے حیرت انگیز شے انھیں نظر آئی وہ ان کا اپنا فالتو کمبل تھا جو نوجوان اطمینان سے اپنے گرد لپیٹے ہوئے سو رہا تھا۔ شجاع احمد صاحب کی آنکھوں میں ایک لمحے کے لیے شدید جھنجلاہٹ نمودار ہوئی۔ انھوں نے بے چینی سے ادھر اُدھر دیکھا پھر ان کی نگاہ اس زنجیر کی جانب اٹھی جس سے ٹرین رکوائی جاتی تھی لیکن آہستہ آہستہ ذہن اعتدال پہ آتا چلا گیا۔ گاڑی روک کر کیا کہیں گے کیا یہ کہ اس نوجوان نے ان کا کمبل ان کی اجازت کے بغیر اوڑھ لیا ہے یا یہ کہ اس نے کسی طرح ہاتھ کی صفائی دکھا کر ان کے سگریٹ کے پیکٹ سے ایک سگریٹ نکال کر پی لی ہے۔ دونوں باتیں احمقانہ تھیں۔ دانت پیسنے کے علاوہ اور کیا کر سکتے تھے۔ البتہ یہ ان سے نہ ہو سکا کہ کمبل نوجوان کے بدن سے کھینچ لیتے۔ اب وہ اس کمبل کو ہاتھ لگانا بھی پسند نہیں کرتے تھے جو اس کے جسم کے گرد لپٹ چکا تھا چنانچہ سگریٹ سلگا کر بے چینی کے عالم میں اس کے گہرے گہرے کش لینے لگے۔

★★

شمشیر زماں صاحب کی آدھی زندگی جنگلوں میں گزری تھی ان کے بے تکلف دوستوں کا خیال تھا کہ شمشیر زماں صاحب بیگم سے گھبرا کر جنگل میں نکل پڑتے ہیں اور واپس جانے کا نام نہیں لیتے کیوں کہ گھر کا ماحول جنگل کے ماحول سے کہیں زیادہ خوفناک ہوتا ہے اور یہ حقیقت بھی تھی کہ شمشیر زماں صاحب جس قدر لاابالی اور شوخ طبیعت کے مالک تھے۔ بیگم صاحبہ اتنی ہی سرد مزاج اور ذمہ دار تھیں۔ زندگی میں ایک اصول ایک ٹھہراؤ انھیں پسند تھا۔ شمشیر زماں صاحب کو ایک قطعی غیر ذمہ دار اور بے اصول انسان سمجھتی تھیں۔ ان کا خیال تھا کہ شمشیر زماں صاحب زمیندار فطرت کے مالک ہیں چونکہ ان کی زمینیں ہیں اور انھیں اپنی محنت سے کچھ حاصل نہیں کرنا پڑا اس لیے ان کی فطرت میں لاپروائی شامل ہے۔ اس کے علاوہ شمشیر زماں صاحب کی رنگین فطرت سے بھی واقف تھیں حالانکہ یہ حقیقت نہ تھی۔ بس شمشیر زماں صاحب اپنی شوخ فطرت کا شکار تھے لیکن بیگم صاحبہ کے اندر بہت سی خوبیوں کے علاوہ یہ خوبی بھی تھی کہ وہ شوہر کی طرف سے ہمیشہ مشکوک رہتی تھیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ انھیں کبھی کوئی واضح ثبوت نہیں مل سکا تھا۔ بہر صورت سارے معاملات میں شمشیر زماں صاحب ان کی مان لیا کرتے تھے۔ لیکن شکار کا شوق ایسا شوق تھا جس کے لیے انھوں نے کبھی کسی کی مداخلت پسند نہیں کی تھی۔ چنانچہ ہمیشہ کی طرح اس بار بھی شکار کے موسم میں تیاریاں مکمل ہو گئیں اور دوست جمع ہونے لگے اس سلسلے میں شمشیر زماں صاحب نے بڑے بڑے شکاریوں سے تعلقات قائم کر رکھے تھے اور بہت سے کام کے لوگ ان کے دوست تھے چنانچہ خصوصی طور پر ایک فارم بنایا گیا تھا جو جنگل میں تھا اس کی باقاعدہ نگرانی چند افراد کرتے تھے یہاں سے شکار شروع کیا جاتا تھا۔ شمشیر زماں صاحب کے دو ساتھی بڑے بھاری شکاری تھے اور بے شمار جنگلی جانور شکار کر چکے تھے اس بار بھی یہ دونوں ساتھ تھے اور یہ شکاری قافلہ فارم کی

جانب رواں دواں تھا۔ شمشیر زماں صاحب کی عادت تھی کہ وہ شکار کے وقت ملازموں کو ساتھ نہیں لیتے تھے اور عام آدمیوں کی طرح زندگی بسر کرتے تھے یہ گویا زمینداری کی شاہی زندگی سے اختلاف تھا یکسانیت ٹوٹ جاتی تھی اس دوران اپنے ہاتھوں سے کھانے پکائے جاتے اور اپنے ہاتھ کا پکا ہوا یہ کھانا ملازموں کے پکوان سے کہیں لذیذ ہوتا تھا۔ راستے میں انھوں نے چند تیتر شکار کیے جو فارم پر پہنچ کر اپنے ہاتھوں سے بھونے گئے۔ فارم پر وہ لوگ جمع ہو گئے تھے جنہیں ہانکا کرنے کے لیے بلایا گیا تھا۔ چنانچہ کھانے کے بعد ہانکا لگانے کا فیصلہ کیا گیا اور اس کے بعد وہ ہانکا کرنے والوں کے ساتھ شکاری علاقے میں داخل ہو گئے۔

گرمیوں کے موسم میں یہ علاقہ خاصہ ٹھنڈا رہتا تھا اس لیے جنگلی درندے پناہ لینے اور مزے کی نیند سونے کے لیے کثرت سے اس لمبی لمبی گھاس میں چلے جاتے تھے ہانکے کا پہلا شکار ایک نیل گائے تھی جو ان کے سامنے سے گزری تو شمشیر زماں صاحب نے فائر کیا۔ گولی نیل گائے کی گردن میں لگی تھی لیکن نیل گائے بڑا اور بہت سخت جان جانور ہوتا ہے اس ایک گولی کو وہ کیا خاطر میں لاتا دوسرا فائر بھی اسے گرانے میں ناکام رہا۔ یہ گولی اس کی پیٹھ میں لگی تھی وہ لوگ زخمی نیل گائے کے پیچھے دوڑ پڑے اور کوئی بیس گز کے فاصلے پر جا کر اس پر فائر کیا۔ نیل گائے گری لیکن فوراً ہی اٹھ کھڑی ہوئی البتہ شمشیر زماں صاحب کے دوسرے ساتھی کے فائر نے اس کی کھوپڑی میں سوراخ کر دیا اور وہ ڈکراتی ہوئی ڈھیر ہو گئی۔ بعد میں جب اس کے وزن کا اندازہ کیا گیا تو سات من سے کچھ زیادہ ہی نکلا۔ نیل گائے کو ذبح کر کے وہ لوگ اپنے ٹھکانے پر واپس آ گئے۔ اس کے بعد ایک پاڑے کا شکار کیا گیا اور اس کا گوشت فارم کے باشندوں اور ہانکا کرنے والوں کے حوالے کر دیا گیا۔

رات کا اندھیرا دن کے اجالے کو آغوش میں لے چکا تھا چنانچہ فارم کے دروازے بند کر لیے گئے اور وہ لوگ دوسرے دن کا پروگرام بنانے لگے۔ انھیں اطلاع ملی کہ ایک قوی ہیکل گلدار اس علاقے میں نظر آیا ہے۔ یہ گلدار بہت زبردست ہے اور علاقے کے کئی افراد کو زخمی کر چکا ہے۔ چنانچہ پہلے اس گلدار سے دو دو ہاتھ کرنے کا فیصلہ کر لیا گیا۔

دوسرے دن ضروری تیاریوں کے بعد یہ لوگ چل پڑے۔ گھنے درختوں اور گھاس کے درمیان سفر کرتے ہوئے یہ آگے بڑھ رہے تھے کہ دفعتاً گلدار نظر آ گیا۔ خوفناک درندے کی آنکھیں اور مونچھیں نظر آ رہی تھیں اور اس کے اگلے دو پاؤں بھی صاف نظر آ رہے تھے۔ یہ سب رک گئے۔ گلدار کو آہٹ مل چکی تھی وہ گھبرا کر راستہ چھوڑ گیا اور جھاڑیوں میں آگے بڑھنے لگا جھاڑیاں ہل رہی تھیں جس سے اندازہ ہو رہا تھا کہ گلدار آہستہ آہستہ حرکت کر رہا تھا چنانچہ شمشیر زماں صاحب نے اپنی فطری جلد بازی سے کام لے کر اندازے سے فائر چھوڑ دیا۔ گلدار کی لرزہ خیز چیخ سے جنگل گونج اٹھا تھا اس کے بعد سناٹا چھا گیا۔ سب اپنی اپنی جگہ بے حس و حرکت کھڑے ہوئے تھے تاہم انھیں اتنا احساس ضرور تھا کہ فائر خالی نہیں گیا۔ شمشیر زماں صاحب نے چند ساعت کی خاموشی کے بعد کہا۔

"گولی گلدار کے لگی ہے۔ آیئے پیچھا کریں"۔ اور وہ سب آگے چل پڑے جس جگہ کا نشانہ لیا گیا تھا وہ خالی تھی یہ اندازہ نہیں تھا کہ گلدار کس طرف گیا ہے۔ بہرصورت وہ زمین پر اور گھاس پر خون تلاش کرتے ہوئے آگے بڑھنے لگے اور کافی دور نکل آئے لیکن یہ اندازہ نہیں ہو سکا کہ گلدار زخمی ہو کر کدھر گیا ہے۔ تاہم ماہر شکاریوں نے مشورہ دیا کہ چونکہ گلدار کی سمت کا اندازہ نہیں ہے اس لیے مزید آگے بڑھنا خطرناک ہے۔ شمشیر زماں صاحب نے واپسی کا فیصلہ کیا اور وہ سب پھر فارم لوٹ آئے البتہ طے کر لیا گیا تھا کہ دوسرے دن علی الصبح گلدار کی تلاش میں نکلیں گے کیونکہ جانور رات بھر جنگلوں میں پھرنے کے بعد اپنے اپنے ٹھکانوں کی طرف لوٹتے ہیں اور انھیں آسانی کے ساتھ شکار کیا جا سکتا تھا۔ کل جس جگہ انھوں نے فائر کیا تھا وہاں سے تقریباً پچیس گز تک خون کا کوئی نشان نہیں تھا۔ خیال یہ ہوا کہ شاید نشانہ خالی گیا لیکن آگے چل کر یکایک ایک شکاری کے حلق سے مسرت آمیز چیخ نکلی۔ اس نے گھاس کے پتوں پر خون کی بوندیں دیکھی تھیں جو جم گئی تھیں۔ شمشیر زماں صاحب بھی خوشی سے اچھل پڑے۔

"اس کا مقصد ہے کہ گلدار واقعی زخمی ہوا ہے"۔ چنانچہ انھوں نے فوراً خون کی بوندوں کی تلاش شروع کر دی اور بالآخر اس سلسلے تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئے جو ایک لائن کی شکل میں آگے بڑھ رہا تھا۔ ان کا رخ ایک دریا کی جانب تھا جو اس مقام سے کوئی دو میل دور تھا۔ شمشیر زماں کے ایک ساتھی خان فضل نے کہا۔

"میرا خیال ہے کہ گلدار دریا کے قریب کی جھاڑیوں میں ضرور موجود ہوگا خون کی یہ بوندیں بھی اسی جانب اشارہ کرتی ہیں"۔ دفعتاً ایک اور شکاری نے کہا۔

"دیکھیے یہاں کتنا خون پڑا ہے"۔ ابھی وہ اپنا جملہ مکمل بھی نہیں کر پایا تھا کہ شیر کی ہولناک گرج سے جنگل لرز گیا۔ اس گرج سے وہ لوگ بھی بے اختیار اچھل پڑے تھے۔ بہتر یہی تھا کہ کسی مناسب جگہ پہنچ جائیں لیکن شیر کی ہیبت اس قدر خوفناک تھی اور یہ آواز ایسی گونج رکھتی تھی کہ ایک لمحے کے لیے ان کے اعصاب جواب دے گئے تھے۔ سب کے سب تجربے کار شکاری تھے۔ اچھی طرح جانتے تھے کہ زخمی شیر اگر سامنے آ جائے تو پھر دو ہی باتیں ہوتی ہیں یا تو وہ شکاری کو ختم

کر دیتا ہے یا شکاری اُسے۔

چنانچہ سب نے بندوقیں سنبھال لیں اور چاروں طرف رُخ کیے سمٹنے لگے۔ زیادہ دور نہیں پہنچے تھے کہ دفعتاً گلدار کی غراہٹ بائیں سمت سے سنائی دی اور اس کے ساتھ ہی جھاڑیاں ہلنے لگیں۔ خان فضل نے ان ہلتی ہوئی جھاڑیوں کا نشانہ لے کر ایک اور فائر کیا اور گلدار کی آواز بم کے گولے کی طرح پھٹی۔ ہولناک گرج کے ساتھ اس نے دائیں جانب جست کی اور ایک شکاری کے قریب آن گرا۔ شکاری بے چارا اس کے حملے سے بچنے کے لیے ایک طرف لپکا لیکن گلدار کو شاید وہی نظر آیا تھا وہ غراتا ہوا اس کے تعاقب میں دوڑا۔ ان لوگوں نے کسی وحشی جانور کو اتنے قریب سے کسی انسان پر حملہ کرتے ہوئے نہیں دیکھا تھا اس لیے ایک لمحے کے لیے سب کے سب ساکت ہو گئے۔ ان کی ہمت نہ ہوئی کہ گلدار پر فائر کریں۔ جو ان سے صرف دس بارہ گز کے فاصلے پر اس شکاری کے پیچھے بھاگ رہا تھا۔ یہ دل ہلا دینے والا منظر دیکھ کر ان سب کے اعصاب کشیدہ ہو گئے تھے لیکن پھر شمشیر زماں نے ہی ہمت کی اور بندوق سیدھی کر کے گلدار پر فائر کر دیا۔ گولی بھاگتے ہوئے شکاری سے صرف چند فٹ کے فاصلے سے گزری تھی لیکن تقدیر یاور تھی کہ گلدار اس کی زد میں آگیا یا پھر یہ شمشیر زماں کی مہارت تھی کہ انھوں نے گولی اس جگہ سے چند گز آگے کا نشانہ لے کر چلائی تھی جہاں گلدار اس وقت موجود تھا۔

چنانچہ گولی گلدار کے جبڑوں میں گھس گئی اور دوسری طرف نکل گئی۔ اس نے ایک قلابازی کھائی اور زمین پر گر کر تڑپنے لگا۔ اس کے تڑپنے کا منظر بھی بے حد خوفناک تھا۔ زمین گویا ہل رہی تھی لیکن اب انھیں موقع مل گیا اور دو تین گولیاں اور نشانہ لے کر گلدار پر چلائیں اور وہ ڈھیر ہو گیا۔ وہ شکاری جس کے پیچھے گلدار دوڑا تھا چند ہی قدم آگے جا کر زمین پر گر پڑا تھا۔ گلدار ٹھنڈا ہو گیا تھا لیکن اعصاب ابھی کشیدہ تھے۔ سب کے سب بُری طرح کانپ رہے تھے۔ آگے بڑھ کر شکاری کو اٹھایا گیا وہ بے ہوش ہو گیا تھا۔ چنانچہ فوراً ہی شمشیر زماں اور ان کے دو ساتھی شکاری کو اٹھا کر دریا کی جانب چل پڑے تاکہ اسے ہوش میں لایا جا سکے۔ باقی لوگ گلدار کی حفاظت کے لیے وہیں رہ گئے تھے۔ شمشیر زماں خود بھی خاموش تھے لیکن تھوڑی دور چل کر ہی انھیں احساس ہوا کہ یہ خوف ان کے شایانِ شان نہیں ہے چنانچہ ان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

"بھئی واہ یہ شکار تو میرا خیال ہے ہماری شکاری زندگی کا ایک دلچسپ واقعہ بھی ہے۔ میں ان بڑے بڑے شکاریوں کے چہرے پر خوف کے آثار دیکھ رہا ہوں۔ جو خطرناک ترین حالات میں کبھی خوفزدہ نہیں ہوئے۔"

"خود آپ کی اپنی کیفیت کیا ہے شمشیر زماں صاحب؟"

شمشیر زماں کے ایک دوست نے مسکرا کر پوچھا۔

"بھئی سچ پوچھو تو تھوڑے سے خوفزدہ ہم بھی ہیں لیکن ہمیں بڑی مشق ہے۔"

"کیا مطلب؟"

"جس شیرنی سے روزانہ واسطہ پڑتا ہے وہ اس گلدار سے کہیں زیادہ خطرناک ہے۔" شمشیر زماں نے کہا اور دونوں دوست قہقہہ مار کر ہنس پڑے۔

"گویا آپ کی مراد بھابی صاحبہ سے ہے؟"

"بھابی ایک بڑا محترم لفظ ہے اور کسی ایسی خطرناک شے کے لیے استعمال نہیں کیا جا سکتا جس میں ذرا بھی نسوانیت نہ ہو۔ بڑا اکھڑ مزاج اور شیر سے زیادہ خطرناک نظر آنے والی۔ وہ دیکھو ندی آگئی ہے میرا خیال ہے اپنا شکار یار کو ہوش میں لایا جائے کہیں یہ عدم آباد کو نہ چل پڑے۔" شمشیر زماں صاحب نے کہا اور وہ ندی کے کنارے پہنچ گئے۔

فضل خان نے ایک کپڑا ندی کے پانی میں بھگویا اور اس کا پانی شکاری کے منہ پر نچوڑنے لگا۔ دوسرا شکاری بھی پاس کھڑا تھا اور شمشیر زماں کی نظریں ادھر ادھر بھٹک رہی تھیں وہ سوچ رہے تھے کہ اگر اس جگہ مچان بنایا جائے تو درندوں کا بہترین شکار کیا جا سکتا ہے کیونکہ اس سنسان اور ویران علاقے میں درندے یقیناً پانی پینے آتے ہوں گے۔ ابھی ان کی نگاہیں بھٹک ہی رہی تھیں کہ دفعتاً وہ ٹھٹک گئے۔ وہ سرخ رنگ کا ایک کپڑا تھا جو ایک جھاڑی سے لپٹا ہوا تھا۔ اس کپڑے کی چمک ہر چیز کو چکا دینے والی تھی۔ شمشیر زماں صاحب نے بندوق سنبھالی اور اس طرف چل پڑے۔ انھوں نے یہ بھی نہیں دیکھا تھا کہ ان کے دونوں ساتھی اس شکاری کو ہوش میں لانے میں کامیاب ہوئے یا نہیں۔ دوڑتے ہوئے وہ جھاڑی کے قریب پہنچ گئے اور پھر ان کی نگاہوں نے ایک لرزہ خیز منظر دیکھا۔ یہ ایک نوجوان بدن تھا جس کے دونوں پاؤں ایک جھاڑی میں اُلجھ گئے تھے اور لباس بے ترتیب تھا۔ لمبے بال پانی میں ابھی تک تیر رہے تھے اور سرخ دوپٹہ ہوا سے اڑ کر جھاڑی سے آ لپٹا تھا۔ شمشیر زماں صاحب ایک دم اس کے قریب بیٹھ گئے۔ ایک نوجوان اور نو خیز سی لڑکی تھی جسے شاید کسی درندے نے ہی زخمی کر دیا تھا۔ انھوں نے بازو پکڑ کر لڑکی کی لاش کو کنارے سے اوپر کھینچ لیا اور اس کا جائزہ لینے لگے دفعتاً انھیں محسوس ہوا کہ لڑکی کا تنفس

ابھی جاری ہے۔ دوسرے لمحے وہ چیخ چیخ کر اپنے ساتھیوں کو آواز دینے لگے۔ فضل خان اور ابراہیم علی بھی شمشیر زماں کو اس طرح دو زانو دیکھ کر چونک پڑے تھے اور اسی طرف دیکھ رہے تھے۔ شمشیر زماں کی آوازیں سن کر وہ دونوں اپنے بے ہوش ساتھی کو چھوڑ کر اس طرف دوڑ پڑے۔

یہ نوجوان عورت بلاشبہ زندہ تھی۔ اس کے داہنے کولہے کے قریب ایک زخم تھا جو پانی سے دھل کر خشک سا ہو گیا تھا، لیکن جونہی اس کا تنفس بیدار ہوا اس زخم سے خون رسنے لگا۔

شمشیر زماں نے انسانی ہمدردی کے تحت تمام اخلاقی قدریں بالائے طاق رکھ کر اس زخم کو دیکھا اور ان کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

"ارے فضل خان، یہ تو۔۔۔ یہ تو گولی کا زخم ہے۔"

"کیا مطلب؟" فضل خان بھی چونک پڑا۔

"ہاں میرا خیال تھا کہ اسے کسی درندے نے زخمی کیا ہے لیکن یہ کسی جنگلی جانور کا شکار نہیں ہے، یہ دیکھو تم گولی کے نشان کو صاف محسوس کر سکتے ہو۔ غالباً کولہے کی ہڈی ٹوٹ گئی ہے۔" شمشیر زماں نے کہا اور دونوں دوست اس نشان پر جھک گئے۔ انھوں نے شمشیر زماں کی رائے سے اتفاق کیا تھا۔ "یقیناً اس عورت کے کولہے پر گولی ماری گئی تھی۔" پھر فضل خان نے کہا۔

"لیکن یہ تو عجیب ہے۔ اگر ہم کسی طرح اسے قیام گاہ تک لے جانے میں کامیاب ہو جائیں تو وہاں اسے ابتدائی طبی امداد دی جا سکتی ہے۔"

"مگر یہ ہے کون۔۔۔؟"

"جو کوئی بھی ہو یہی کافی ہے کہ انسان ہے۔" شمشیر زماں نے کہا۔

"اسے دیکھو وہ ہوش میں آیا یا نہیں۔" فضل خان نے اپنے ساتھی ابراہیم سے کہا۔ ابراہیم اپنے بے ہوش ساتھی کے پاس پہنچ گیا لیکن نوجوان کا ملازم ابھی تک ہوش میں نہیں آیا تھا۔ تب یہی طے کیا گیا کہ اسے بھی کاندھے پر لاد کر واپس چلا جائے۔۔۔ چند ساعت بعد وہ سب ندی کے کنارے سے واپس لوٹ رہے تھے۔ شمشیر خان نے عورت کا بدن اپنے شانوں پر ڈال رکھا تھا اور ابراہیم علی اس بے ہوش شکاری کو اٹھائے ہوئے تھا۔ چند ساعت کے بعد وہ اس جگہ پہنچ گئے جہاں گلادل کی لاش پڑی ہوئی تھی۔ انھوں نے اپنے ساتھیوں کو جلدی جلدی ہدایات دیں اور قیام گاہ کی طرف دوڑنے لگے۔

دو انسانی جسموں کو وہ اپنے شانوں پر سنبھالے قیام گاہ آ رہے تھے اس لیے تیز رفتاری تو ممکن نہیں تھی لیکن جس قدر جلد ممکن ہو سکا وہ جلد از جلد قیام گاہ پہنچ گئے۔۔۔ قیام گاہ پہنچ کر شمشیر زماں نے اپنا فرسٹ ایڈ باکس نکال لیا جسے وہ شکار کے دوران اپنے ساتھ رکھا کرتے تھے، پھر عورت کا زخم دیکھا گیا۔

گولی کولہے کی ہڈی توڑتی ہوئی اندر گھس گئی تھی اور یقیناً ابھی اندر ہی تھی، عورت کا زندہ رہنا ایک معجزہ ہی تھا۔ اس کے چہرے کو دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ کافی خون بہہ چکا ہے، پورا بدن اور چہرہ سفید پڑا ہوا تھا۔ بہرصورت خون تو ابھی دیا نہیں جا سکتا تھا، انھوں نے زخم پر مرہم لگا کر بینڈیج کر دی اور کسی نہ کسی طرح اس کا تنفس بحال رکھنے میں کوشاں ہو گئے۔

"بھئی یوں لگتا ہے جیسے شکار کا بقیہ پروگرام ملتوی کرنا پڑے گا۔" شمشیر زماں نے کہا۔

"ہاں یقیناً ایک انسانی زندگی باقی تمام چیزوں سے زیادہ قیمتی ہے۔"

"مگر تم یوں کرو فضل خان کہ تم یہاں رک کر یہ اندازہ کرنے کی کوشش کرو کہ یہ عورت کون سے علاقے کی ہے، میرا خیال ہے معلومات کرنے سے پتہ چل جائے گا، میں اسے گھر لے جا رہا ہوں، اگر اس کے ورثا مل جائیں تو تم انھیں لے کر گھر آ جانا۔"

"ٹھیک ہے میں ایسا ہی کروں گا۔" فضل خاں نے جواب دیا اور شمشیر خاں اس عورت کو لے کر حویلی پہنچ گئے۔ لیکن جب وہ اپنی حویلی میں داخل ہوئے تو ان کے اس طرح واپس آ جانے پر سب ہی حیران رہ گئے، لیکن پھر ان کے ساتھ ایک بے ہوش اور زخمی عورت کو دیکھ کر سب ہی مستعد ہو گئے تھے۔ شمشیر زماں صاحب نے فوری طور پر کارروائی شروع کر دی۔ انھوں نے اپنے چند ملازمین کو گاڑی دے کر دوڑا دیا اور ایک ڈاکٹر کو جو ان کے شناسا تھے طلب کر لیا۔۔۔ ڈاکٹر کے نام انھوں نے رقعہ میں مختصر تفصیل لکھ دی تھی۔ یہ بھی لکھ دیا تھا کہ عورت کو گولی لگی ہے اور گولی شاید اس کے کولہے کی ہڈی میں پھنسی ہوئی ہے، اس لیے ڈاکٹر کو تمام انتظامات کے ساتھ آنا چاہیے۔ ان ساری باتوں کی اطلاع بیگم صاحبہ کو بھی پہنچ گئی تھی چنانچہ وہ بھی آ گئیں۔ اسی اثنا میں ڈاکٹر صاحب بھی پہنچ گئے۔ انھوں نے بے ہوش عورت کا پوری طرح معائنہ کیا اور تشویش زدہ لہجے میں بولے۔۔۔ "میرا خیال ہے اسپتال لے جانا ہوگا، خون زیادہ بہہ گیا ہے۔ نبض کی رفتار بے حد سست ہے۔ خون کا گروپ لے کر خون دینا ہوگا اور پھر آپریشن بھی کافی پیچیدہ ہوگا، ہڈی میں گھسی ہوئی گولی کو نکالنا آسان نہ ہوگا، ہر چند کہ میں آپریشن کا سارا سامان اپنے ساتھ لایا ہوں، لیکن یہاں آپریشن کرنا آسان نہ ہوگا۔"

شمشیر زماں صاحب اس جوان العمر عورت کی حالت سے

بہت متاثر تھے اور اس کی جان بچانے کے لیے سب کچھ کرنے پر آمادہ تھے چنانچہ انھوں نے فوری طور پر اسے اسپتال لے جانے کا بندوبست کیا اور ڈاکٹر کے ساتھ خود بھی چل پڑے۔

بیگم صاحبہ کی آنکھوں میں تشویش کے آثار تھے لیکن انھوں نے کسی سے کچھ کہا نہیں بہرصورت شمشیر زماں صاحب ڈاکٹر کے ساتھ ہسپتال پہنچ گئے اور اس وقت تک وہیں رہے جب تک کہ ڈاکٹر نے اعلان نہ کر دیا کہ اب مریضہ کی حالت تشویش سے باہر ہے، ہڈیوں کے درمیان گولی گوشت ہی میں پھنسی ہوئی تھی، دلھے کی ہڈی متاثر ضرور ہوئی تھی لیکن گولی اس میں داخل نہیں ہو سکی تھی، اس لیے آپریشن بھی بہت زیادہ مشکل ثابت نہ ہوا اور ڈاکٹر اب اس کی حالت سے کلی طور پر مطمئن تھے۔

"آپ لوگ اس مظلوم کی مکمل طور پر نگہداشت کیجیے ڈاکٹر صاحب میں نہیں جانتا یہ کس حادثے کا شکار ہوئی ہے لیکن بہرصورت جوان عورت ہے، میں چاہتا ہوں کہ اس کی ہر طرح سے دیکھ بھال کی جائے۔"

"آپ مطمئن رہیے شمشیر زماں صاحب، آپ کے ذریعے یہ یہاں تک آئی ہے، بس ہمارے لیے اتنا ہی کافی ہے۔" ڈاکٹر صاحب نے انھیں اطمینان دلاتے ہوئے کہا۔

"میں آپ سے ملتا رہوں گا ڈاکٹر صاحب، کوئی خاص ضرورت ہو تو مجھے اطلاع بھجوا دیجیے، اخراجات کی قطعی پروا نہ کیجیے۔" شمشیر زماں صاحب نے کہا اور پھر وہ واپس چل پڑے۔ وہ جانتے تھے کہ اب انھیں ایک دوسری مہم درپیش ہوگی، بیگم صاحبہ کی پراسرار خاموشی کسی طوفان کا پیش خیمہ ہی ہو سکتی تھی، اس کے علاوہ پتہ نہیں فضل خان وغیرہ لڑکی کے ورثا کو تلاش کرنے میں کامیاب ہو سکے یا نہیں۔

حویلی کی فضا میں سنسنی پھیلی ہوئی تھی، سب کے سب اس پراسرار زخمی کے بارے میں جاننے کے خواہش مند تھے، شمشیر زماں حویلی میں داخل ہوتے تو سب سے پہلے انھوں نے فضل خان کے بارے میں پوچھا ـــ لیکن پتہ چلا کہ فضل خان یا دوسرے شکاری ابھی واپس نہیں آئے ہیں۔

چنانچہ شمشیر زماں صاحب دل مار کر رہ گئے۔ شکار کا موسم تھا، اتنا اچھا شکار چھوڑ کر آنا واقعی ان جیسے شوقین شکاری کے لیے مشکل کام تھا لیکن ایک انسانی جان سے ہمدردی سارے شوق پر غالب آ گئی تھی، البتہ بیگم صاحبہ سارے ہتھیاروں پر دھار لگا کر ان کی آمد کے انتظار میں بیٹھی ہوئی تھیں۔

شمشیر زماں خان سارے ملازمین وغیرہ کو ہدایت دے کر بیگم صاحبہ کی خدمت میں حاضر ہو گئے، چہرے کا چہرہ دیکھ کر ان کا دل دھک سے رہ گیا۔

"تشریف لے آئے آپ؟"

"جی ہاں، حاضر ہو گیا ہوں۔"

"یہ شکار کے موسم میں آپ گھر میں کیسے نظر آ رہے ہیں؟" بیگم صاحبہ تلخ لہجے میں بولیں۔

"آپ کو معلوم ہے بیگم ایک انسانی زندگی کا سوال تھا میرے خیال میں باقی ساری باتیں تو تفریح طبع سے تعلق رکھتی ہیں جب کہ کسی انسانی زندگی سے ہمدردی۔"

"اوں ہوں ہوں، اور زندگی بھی کس کی، ایک خوبصورت اور نازک اندام عورت کی۔" بیگم صاحبہ طنزیہ لہجے میں بولیں۔

"کیا مطلب ہے آپ کا ـــ؟" شمشیر زماں صاحب نے ان حالات کا پہلے ہی اندازہ کر لیا تھا۔

"کون ہے وہ ـــ؟" بیگم صاحبہ نے طنز بھرے لہجے میں پوچھا۔

"آپ جانتی ہیں، ایک عورت ہے۔"

"ہاں وہ تو میں جانتی ہوں لیکن یہ بتائیں، آپ سے کیا تعلق ہے؟"

"وہی جو انسان سے انسان کا ہو سکتا ہے۔" شمشیر زماں صاحب بدستور سنجیدگی اختیار کیے ہوئے تھے۔

"بہت خوب، بہت خوب، جوابوں سے تیار ہو کر گئے ہیں آپ؟ مگر اس کے گولی کیسے لگی؟"

"یہ مجھے نہیں معلوم، وہ مجھے انہی حالات میں ایک ندی کے کنارے جھاڑی میں الجھی ہوئی ملی تھی، یوں لگتا ہے جیسے کسی نے گولی مار کر اسے ندی میں پھینک دیا جو شاید اسے مردہ سمجھ کر، خدا کرے بے چاری کی جان بچ جائے، میں نے فضل خان اور دوسرے لوگوں کو اس بات پر مامور کر دیا ہے کہ وہ قرب و جوار کے علاقوں میں پتہ لگائیں کہ یہ عورت کون ہے ـ؟ وہ بے چارے اسی چکر میں لگے ہوں گے۔"

"یہ آپ کون سے جنگل میں شکار کے لیے گئے تھے؟" بیگم صاحبہ نے پوچھا۔

"جہاں ہمیشہ جاتا ہوں بیگم، براہ کرم اس انداز میں سوالات نہ کریں، آخر آپ کیا سمجھ رہی ہیں، کیا آپ کا خیال ہے کہ وہ میری شناسا تھی؟"

"نہیں نہیں یہ خیال تو نہیں ہے میرا لیکن مگر اس عورت

کی جگہ کوئی مرد ہوتا تو کیا اس سے بھی آپ کی اتنی ہی ہمدردیاں ہوتیں؟"

"ہونا تو چاہئیے تھیں۔" شمشیر زماں نے جواب دیا۔

"مگر میں آپ کی فطرت سے اچھی طرح واقف ہوں، آپ اسے وہیں سے اسپتال پہنچا دیتے اور اس کے بعد پلٹ کر خبر بھی نہ لیتے۔"

"اب اس سلسلے میں میں کیا کر سکتا ہوں، آپ کے خیالات میری طرف سے کافی خراب ہیں۔"

"ہوں! خراب تو ہیں، مزید خراب نہیں ہونے چاہئیں اس بات کا آپ خیال رکھیں۔"

"جی بہتر۔"

"اب شکار کے لیے نہیں جائیں گے آپ؟" بیگم صاحبہ نے پوچھا۔۔۔؟

"نہیں، بس ذہن پر تکدر چھا گیا ہے۔ فضل خان واپس آ جائیں تو اچھا ہے ان سے یہ پتہ چل جائے گا کہ خاتون کہاں کی ہیں کس گھر کی ہیں؟ تو میں اس کے وارثان کو اس کے بارے میں تفصیلات بتا کر ہی مطمئن ہو سکتا ہوں۔ میں یہاں ان لوگوں کی واپسی کا انتظار کروں گا۔"

بیگم صاحبہ گومگو کے عالم میں تھیں، بہر صورت شمشیر زماں کی پوزیشن بظاہر صاف نظر آ رہی تھی اس لیے انھوں نے زیادہ تفتیش نہ کی اور خاموشی سے فضل خان وغیرہ کے آنے کا انتظار کرتی رہیں۔

فضل خان اور اس کے تمام شکاری ساتھی تیسرے دن واپس آئے تھے، اسی دوران شمشیر زماں صاحب نے ایک بار پھر آدمی کو بھیج کر اس کی خیریت منگوائی تھی، آدمی نے واپس آ کر یہی کہا تھا کہ اب وہ بخیریت ہے اور ہوش میں آ گئی ہے، لیکن اس کی قوتِ گویائی بند ہے۔ وہ کسی کو اپنے بارے میں کچھ نہیں بتا سکتی۔ بس خاموشی سے لوگوں کو دیکھتی رہتی ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے یہ کہا ہے کہ شمشیر زماں صاحب اب کسی قسم کا تردد نہ کریں، وہ ٹھیک تو ہو گئی ہے، آہستہ آہستہ بالکل نارمل ہو جائے گی۔ قوتِ گویائی بھی ہو سکتا ہے کسی وقت واپس آ جائے ایسا لگتا ہے کسی شدید صدمے سے اس کی قوتِ گویائی چھین لی ہے اور شمشیر زماں صاحب بے چارے خاموش ہو گئے تھے۔ وہ کیا کر سکتے تھے۔۔۔؟ چنانچہ اس طرف سے تو وہ مطمئن ہو گئے تھے کہ اب اس کی حالت بہت بہتر ہے۔

فضل خان نے بتایا کہ قرب و جوار کی جتنی بستیاں تھیں سب میں چھان بین کر لی گئی ہے، جن ذرائع سے کچھ معلوم ہو سکتا تھا معلوم کیا گیا، لیکن عورت کے بارے میں کچھ پتہ نہیں چل سکا۔ کسی نے اس پر دعویٰ نہیں کیا ہے۔

"بہر صورت وہ خود ہوش میں آئے گی تو اپنے خاندان کے بارے میں بتا دے گی، ابھی تو وہ نیم بے ہوشی کی حالت میں ہے۔" شمشیر زماں نے کہا اور اس کی قوتِ گویائی واپس آنے کا انتظار کرنے لگے۔

★★

حمایت بیگ ایڈووکیٹ طویل عرصے سے ایک کامیاب وکیل مانے جاتے تھے، ساری عمر اسی لائن میں گزر گئی تھی، بڑے بڑے مقدمات لڑے تھے اور شہر میں ایک باعزت آدمی تصور کیے جاتے تھے، بہت سے امراء کے قانونی مشیر بھی تھے، نجانے کیا کیا جنجال پالے ہوتے تھے۔ انھوں نے اس عمر میں بھی لیکن مالی طور پر مطمئن تھے، اس لیے ابھی تک قوتِ دماغی برقرار تھی نہایت ذہین اور چالاک تھے گو یا اب زیادہ تر کیس ان کے اسسٹنٹ ہی لڑا کرتے تھے لیکن وہ خود بھی ان کی مدد کرنے کے لیے ہمہ وقت تیار رہتے تھے اور ان کیسز پر خصوصی نگاہ رکھتے تھے۔ اس وقت بھی وہ اپنے دفتر میں بیٹھے ہوتے تھے کہ ان کے اردلی نے ایک شخص کے آنے کی اطلاع دی، اور حمایت بیگ چونک گئے۔

"کوئی موکل ہے۔۔۔؟" حمایت بیگ نے پوچھا۔

"بس جناب آپ سے ملنا چاہتا ہے، میں نے کہا بھی کہ اگر اس کا کوئی کیس ہے تو معروف صاحب سے مل لے لیکن اس نے درخواست کی ہے کہ حمایت بیگ صاحب ہی سے ملاقات کرا دی جائے۔" اردلی نے بتایا۔

"ٹھیک ہے تم اسے بلاؤ۔" حمایت بیگ صاحب نے کہا اور اپنا نزدیک کا چشمہ نکال کر اسے رومال سے صاف کرنے لگے۔ پھر انھوں نے چشمہ آنکھوں پر لگا لیا۔

آنے والا ایک خوش رو نوجوان تھا، گو معمولی سے لباس میں تھا۔۔۔۔ لیکن چہرے سے ذہین اور تعلیم یافتہ نظر آتا تھا، خاص طور سے اس کی روشن آنکھیں اس کی ذہانت کا پتہ دیتی تھیں۔ یوں بھی قبول صورت چہرے بہت جلد ذہنوں میں اپنا مقام بنا لیتے ہیں۔ یہی کیفیت اس وقت حمایت بیگ صاحب کو اس کی صورت دیکھ کر محسوس ہوئی تھی۔

"تشریف لائیے۔" انھوں نے نرم لہجے میں کہا اور نوجوان ان کے نزدیک آ کر کرسی پر بیٹھ گیا، خود اعتماد بھی معلوم ہوتا تھا، حمایت بیگ کے اشارے کا انتظار بھی نہیں کیا تھا اس نے، بہر صورت حمایت بیگ صاحب ان باتوں کی پروا بھی نہیں کرتے تھے، انھوں

نے دونوں بھویں سکیڑ کر پوچھا۔

"فرمایئے میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں"؟

"فدوی کو علی ظفر کہتے ہیں"۔

"جی"! حمایت بیگ صاحب نے سادہ سے لہجے میں کہا۔

"میں جانتا ہوں وکیل صاحب کہ آپ کی زندگی میں بے شمار علی ظفر اور ظفر علی آتے رہے ہوں گے اس لیے حوالے کے طور پر میں آپ کو صرف اتنا بتاؤں گا کہ آپ کے ایک موکل شمشیر زماں صاحب علی ظفر نامی کسی نوجوان کو ایک رقم ہر سال بھجوایا کرتے تھے جو تقریباً دو سال قبل یعنی ان کی موت کے بعد بند ہو گئی"۔

"اوہ! ہاں ہاں مجھے یاد آیا، آپ انگلینڈ سے آئے ہیں"؟ حمایت بیگ صاحب نے تعجب سے پوچھا۔

"جی ہاں! ابھی نہیں آیا بلکہ آتے ہوئے کچھ عرصہ ہو گیا"۔

"بڑی خوشی ہوئی آپ سے مل کر علی ظفر، شمشیر زماں صاحب نے مجھے آپ کے بارے میں تفصیلات بتا دی تھیں"۔

"چلیے تعارف مکمل ہو گیا"۔ نوجوان نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"ہاں یقیناً ــــ یقیناً"۔ حمایت بیگ نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "کیا منگواؤں آپ کے لیے، چائے پئیں گے یا کوئی ٹھنڈا مشروب"۔ حمایت بیگ صاحب نے پوچھا۔

"تکلیف نہ فرمائیں، میں بس آپ سے چند ضروری باتیں کرنے حاضر ہوا ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ آپ کا وقت بے حد قیمتی ہے لیکن اس کے باوجود میری مجبوریاں مجھے آپ تک لے آئیں"۔

"ٹھیک ہے کوئی بات نہیں، میں شائستہ لوگوں کو پسند کرتا ہوں، کہیے اب میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں"؟

"کچھ تفصیلات میرے ذہن میں تشنہ ہیں، میں ان کے بارے میں جاننے کا خواہش مند ہوں"۔

"مثلاً"؟ حمایت بیگ صاحب نے پوچھا۔

"رقم کی فراہمی مجھے کیوں بند ہو گئی"؟

"بیگم صاحبہ کے حکم سے"۔ حمایت بیگ نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ "دراصل شاید یہ بات ان کے علم میں آ چکی ہو کہ شمشیر زماں کا انتقال ایک حادثے کے تحت ہوا تھا، وہ ایک شکار میں کسی درندے کے ہاتھوں زخمی ہو گئے تھے اور اس کے بعد وہ جانبر نہ ہو سکے۔ زخم اتنے کاری تھے کہ دوبارہ انھیں ہوش نہ آیا، اور اسی عالم میں وہ جاں بحق ہو گئے اس لیے ان کی کوئی وصیت بھی موجود نہیں تھی حالانکہ میں نے ان سے بارہا اصرار کیا تھا کہ وہ اپنی وصیت تیار کر دیں لیکن شمشیر زماں صاحب لاابالی اور شوخ سی فطرت کے مالک تھے ان کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ کسی ایسے حادثے کا شکار ہو جائیں گے، ماہر شکاری تھے اور بارہا انھوں نے مجھ سے کہا تھا کہ میاں شکاری وہی ہوتا ہے جو کسی جانور کے ہاتھوں شکار نہ ہو، ہم اگر شکار ہوتے تو کبھی اپنی بیگم صاحبہ ہی کے شکار ہو جائیں گے، باقی کوئی جنگلی جانور ہمیں ہلاک نہیں کر سکتا لیکن یہ انسانی سوچ تھی۔ ایک ماہر تیراک ہمیشہ سمندر میں ہی ڈوب کر مرتا ہے۔ میں شمشیر زماں صاحب کو وصیت کے لیے مجبور نہ کر سکا اور صاحبزادے یہ بات تو آپ کو بخوبی معلوم ہے کہ شمشیر زماں صاحب سے آپ کا کوئی خونی رشتہ نہیں تھا، اس لیے قانونی طور پر ان کی جائداد یا ان کی دولت میں آپ کا کوئی حصہ کسی طور نہیں بنتا۔ میں نے جب بیگم صاحبہ سے اس رقم کی فراہمی کے بارے میں معلومات حاصل کیں تو انھوں نے یہی کہا کہ اب اس کی ضرورت نہیں ہے، یہ مرحوم کے شوق تھے وہ ان کی پابند نہیں ہیں چنانچہ میں ان سے اصرار نہ کر سکا اور اسی ماہ سے آپ کو وظیفہ بھیجنا بند کر دیا گیا۔

"ٹھیک ہے حمایت بیگ صاحب واقعی یہ ان لوگوں کا حق تھا۔ دراصل میری بدقسمتی یہ تھی کہ مجھے تفصیلات نہیں معلوم ہو سکیں۔ شمشیر زماں خان صاحب نے ہمیشہ مجھے اپنے بچوں کی حیثیت دی تھی اس لیے میں غلط فہمیوں کا شکار رہا۔ یہ بات بھی آپ کے علم میں ہو گی کہ بہت چھوٹی سی عمر میں مجھے انگلینڈ بھیج دیا گیا تھا۔ اس لیے یہاں کے بارے میں کچھ تفصیلات مجھ تک نہیں پہنچ سکیں۔ میں بھی مطمئن تھا کہ کوئی ایسی ضرورت بھی نہیں ہے تاہم آپ یقین فرمایئے کہ مجھے اس بات کی ذرا بھی فکر نہیں ہے اور نہ ہی مجھے اس بات کا رنج ہے۔ میں جانتا ہوں کہ شمشیر زماں صاحب نے مجھ پر اور میری ماں پر جو احسانات کیے وہ اس قدر زیادہ تھے کہ میں آج تک اس خاندان کا زیر بار ہوں، میں قطعی یہ نہیں چاہتا کہ اس جائداد میں سے یا اس رقم میں سے مجھے کچھ ملے، دراصل اس شہر میں آنا تھا . . . . . . چونکہ میں بچپن سے جوانی تک انگلینڈ ہی میں رہا ہوں اس لیے میری یہاں شناسائی نہیں تھی، سوائے آپ کے، چنانچہ میں آپ کے پاس حاضر ہو گیا"۔ علی ظفر نے کہا۔

"بھئی مجھے رنج بھی ہے اور مسرت بھی کہ تم نے مجھے اس قابل سمجھا، ہر چند کہ ہم لوگ ایک کاروباری رشتے سے منسلک تھے جو اب ختم ہو گیا، لیکن انسانی رشتے برقرار رہیں، مجھے تمھاری مدد کر کے مسرت ہو گی"۔ حمایت بیگ نے کہا۔

"بہت بہت شکریہ حمایت بیگ صاحب! یہاں ایک چھوٹے سے ہوٹل میں ٹھہرا ہوا ہوں، اخراجات کا مسئلہ خاصا مشکل

ہے۔ میں چاہتا تھا کہ مجھے کوئی ملازمت مل جاتی، اس کے علاوہ میری ایک خواہش اور بھی ہے۔"

"ہاں ہاں کہو —" حمایت بیگ صاحب نے نرم لہجے میں پوچھا۔

"یہاں ایک صاحب شجاع احمد کے نام کے رہتے ہیں بہت بڑی شخصیت کے مالک ہیں شاید نواب خاندان سے تعلق رکھتے ہیں میں چاہتا تھا کہ اس اعلیٰ خاندان میں کوئی چھوٹی موٹی نوکری مل جائے ضروری نہیں ہے کہ یہ نوکری کسی اعلیٰ عہدے کی ہو، اگر مجھے ان کے ہاں مدبان کی نوکری بھی مل جائے تو میرے لیے قابل قبول ہوگی۔"

"ارے کیوں خیریت ہے؟ شجاع احمد سے تم اس قدر متاثر کیوں ہو؟"

"پہلے یہ بتائیے کیا آپ انھیں جانتے ہیں —؟"

"میاں صاحبزادے! جاننے کی بات کر رہے ہو، میری اس کی دوستی تقریباً تیس بتیس سال کی ہے۔ بے شک وہ نواب ہیں لیکن حمایت بیگ سے دوستوں کی طرح ہی ملتے ہیں۔ آج تک بڑے اچھے گھریلو تعلقات ہیں ہمارے اور ان کے درمیان لیکن تم مجھے یہ بتاؤ کہ خصوصاً ان کے ہاں ہی ملازمت کیوں کرنا چاہتے ہو؟"

"بس انگلینڈ میں ایک صاحب سے ملاقات ہوئی تھی، غالباً شاکر حسین نام تھا ان کا۔ شجاع احمد کے شناساؤں میں سے تھے، یعنی شجاع احمد انہیں نہیں جانتے تھے لیکن شاکر صاحب شجاع احمد کے خاندان کی شرافت و نجابت سے بڑے مرعوب تھے۔ کئی بار انھوں نے شجاع احمد صاحب کا تذکرہ کیا اور یہ بھی کہا کہ شجاع احمد صاحب بڑے انسان دوست قسم کے آدمی ہیں۔ اگر کبھی اس ملک میں آنا ہو تو ان سے ملاقات ضرور کرنا، کسی بھی حیثیت سے سہی۔ بس یہ نام میرے ذہن میں محفوظ رہ گیا اور اب جب مجھے ملازمت کی خواہش ہوئی تو اتفاقیہ طور پر ہی شجاع احمد صاحب کا نام میرے ذہن میں آ گیا — میں نے سوچا کہ ممکن ہے آپ ان کے شناسا ہوں ہر چند کہ وکیل صاحب جیسا کہ آپ نے فرمایا، میرے اور آپ کے درمیان ایک بہت معمولی سا کاروباری رشتہ تھا، لیکن پھر بھی کہوں گا کہ اس شہر میں میرا اور کوئی شناسا نہیں تھا۔"

"نہیں میاں کوئی ایسی بات نہیں ہے۔ باقی رہی شجاع احمد کی بات۔" وکیل صاحب نے اپنا داہنا گال کھجایا اور پھر ایک دم چونک پڑے۔ "ارے ہاں سنو میرا خیال ہے تمھارا کام بن جائے گا۔"

"وہ کیسے؟"

"بس تھوڑی سی کوشش کرنا ہوگی۔ تم نے تعلیم تو اچھی خاصی حاصل کی ہوگی انگلینڈ میں —؟"

"جی ہاں پڑھنے کے لیے گیا تھا لو پڑھتا ہی رہا ہوں۔"

"بہت اچھی بات ہے میں نہیں سمجھتا کہ یہ ملازمت قبول کر لوگے یا نہیں کن حالات کے تحت یہاں آئے ہو؟ مجھے اس کا بھی احساس ہے کہ شمشیر زماں صاحب کی طرف سے رقم کی فراہمی بند ہو جانے کے بعد تمھیں مشکلات کا سامنا کرنا پڑا ہوگا لیکن میاں وہی انسان کامیاب زندگی گزار سکتا ہے جو مشکلات کا سامنا کر سکے۔ ان کا مقابلہ کر سکے۔ تم نے یقیناً کچھ نہ کچھ بندوبست کر لیا ہوگا، بہر صورت ابھی چند روز پہلے حسام احمد صاحب کا ایک اشتہار اخبار میں شائع ہوا تھا۔ انھیں غالباً کسی مترجم کی ضرورت ہے، میں نہیں سمجھتا کہ انھوں نے کسی کو ملازم رکھا یا نہیں [illegible] قسمت آزمالو تو کیا حرج ہے۔" حمایت بیگ صاحب نے کہا۔

"یہ حسام احمد صاحب کون ہیں؟"

"شجاع احمد کے والد صاحب۔"

"وہ کون سی زبان سے ترجمہ کرانا چاہتے ہیں؟"

"اب یہ تو انہی سے مل کر معلوم ہوگا، میں تمھیں ذرا ان کی فطرت کے بارے میں بتا دوں تم تجزیہ کر لوگے۔ حسام احمد صاحب بے حد خوش مزاج انسان ہیں میرا خیال ہے ستر سال کے پیٹے میں ہوں گے لیکن صحت برقرار ہے۔ جاسوسی ناول اور کہانیوں کا بے پناہ شوق رکھتے ہیں۔ میرا خیال ہے مترجم بھی انھیں اسی سلسلے میں درکار ہوگا۔ خود بھی تعلیم یافتہ آدمی ہیں لیکن شاید انگریزی کمزور ہے۔ بہر صورت کھلنڈری طبیعت کے مالک ہیں حالانکہ پہلے ایسے نہ تھے لیکن بڑھاپے نے انھیں یہ فطرت بخشی ہے۔ تجسس پسند ہیں۔ ان کی چند داستانیں شجاع احمد ہی مجھے سنا چکا ہے، چونکا دینے کے عادی ہیں اور چونکنا پسند کرتے ہیں۔ اگر تم ایسی کوئی کوشش کر کے انھیں متاثر کر لو تو میرا خیال ہے کامیابی ہو سکتی ہے، بشرطیکہ کوئی دوسرا آدمی ان تک نہ پہنچ گیا ہو۔"

نوجوان کی آنکھوں میں چمک بڑھ گئی تھی۔ پھر اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"اس کا مقصد ہے کہ میں نے آپ کا انتخاب نہایت مناسب کیا تھا —؟"

"خیر یہ کوئی ایسی بڑی بات نہیں ہے۔ تمھیں ملازمت کرنا تھی تو میرے خیال میں تمھیں کوئی معقول ملازمت بھی مل سکتی ہے بس ذرا [illegible] کرنا پڑتا۔ اب میں اتنا بے عقل بھی نہیں ہوں کہ اچھے خاصے تعلیم یافتہ آدمی کو کوئی ڈھنگ کی ملازمت بھی نہ دلوا سکوں۔"

"میں بے حد شکر گزار ہوں حمایت بیگ صاحب،" خاہر

ہے اس سے زیادہ آپ میری مدد کر بھی نہیں سکتے تھے۔ یہ اشتہار کونسی تاریخ کو شائع ہوا تھا؟"

"غالباً پرسوں۔"

"اس کا مطلب ہے کہ ابھی گنجائش ہے؟"

"ہاں اس کے امکانات موجود ہیں۔ میں جیسا کہ تمھیں بتا چکا ہوں کہ حسام احمد صاحب کی فطرت میں عجیب و غریب تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں، اتنے زیادہ متجسس ہو گئے ہیں کہ حیرت ہوتی ہے، مجھے یقین نہیں ہے کہ کوئی عام امیدوار ان کے معیار پر پورا اتر سکے گا، تمھیں بھی کچھ خصوصیت ہی دکھانا ہوگی انھیں، تب ہی منتخب ہو سکوگے۔ ویسے صاحبِ ثروت لوگ ہیں، اگر پسند آ گئے تو میرے خیال میں تمھیں کوئی پریشانی نہیں رہے گی؟"

"بہت شکریہ۔" نوجوان علی ظفر نے کہا اور پھر کافی دیر تک وہ حمایت بیگ سے حسام احمد صاحب کے بارے میں معلومات حاصل کرتا رہا ــــ پھر جب وہ رخصت ہوا تو حمایت بیگ صاحب نے کہا۔

"دیکھو میاں اب جب تم نے اس شہر میں آ کر سب سے پہلے میری ہی طرف رخ کیا ہے تو میری خواہش ہے کہ کوئی تکلیف مت اٹھانا، میں جس حد تک بھی ممکن ہو سکا تو تمھاری مدد کروں گا۔ اگر حسام احمد صاحب کو متاثر کرنے میں ناکام رہو تو دوبارہ مجھ سے رابطہ قائم کرنا، میں کچھ اور کوشش کروں گا، تمھارے جیسے نوجوانوں کے لیے یہاں ملازمت کی کوئی کمی نہیں ہے۔"

اور علی ظفر شکریہ ادا کر کے باہر نکل گیا۔

حمایت بیگ پُرخیال انداز میں دروازے کی طرف دیکھ رہے تھے۔ شمشیر زماں نے مختصراً ایک بار انھیں علی ظفر کے بارے میں بتایا تھا اور سوچ اسے دیکھ کر ان کے ذہن میں عجیب سے تاثرات ابھر آئے تھے۔

★★

دو ماہ گزر گئے تھے۔ اس کا زخم بھر گیا تھا، اور اب نرسیں اسے چلانے کی مشق کرتی تھیں، پاؤں میں لنگڑاہٹ باقی رہ گئی تھی ویسے ابھی بینڈیج برابر ہو رہی تھی۔ اس کے علاوہ اس کی قوتِ گویائی واپس نہیں آئی تھی۔ ڈاکٹروں کا کہنا تھا کہ ذہنی طور پر وہ نارمل ہے لیکن بس اس صدمے سے اس کے اعصاب کشیدہ ہو گئے تھے اور ممکن ہے اس کی قوتِ گویائی ہمیشہ کے لیے ختم ہو گئی ہو۔

شمشیر زماں کئی بار اسے اسپتال جا کر دیکھ چکے تھے، اس کے علاج کے لیے انھوں نے کافی اخراجات ادا کیے تھے لیکن انھیں اس کی فکر نہ تھی، اپنے طور پر انھوں نے ہر ممکن کوشش کی تھی کہ کسی طرح اس کے ورثا کا پتہ چل جائے۔ اس سلسلے میں ان کے کئی ملازمین اور مزارع کام کر رہے تھے، لیکن پتہ نہیں لڑکی کہاں سے آئی تھی، اب جب کہ اس کی حالت کسی قدر درست ہو گئی تو اس کی عمر کا صحیح تعین بھی ہوا تھا۔ نوجوان ہی تھی، تیئیس چوبیس سال کی عمر ہو گی، اس سے زیادہ نہ تھی۔ ڈاکٹروں نے ایک اور انکشاف کیا تھا جو شمشیر زماں کے لیے خاصا تشویشناک تھا۔ انھوں نے بتایا کہ حاملہ بھی ہے، گو حمل زیادہ عرصے کا نہیں ہے۔ لیکن بہرصورت یہ صورتحال شمشیر زماں کے لیے اور زیادہ تشویشناک تھی، اگر وہ حاملہ ہے تو شادی شدہ بھی ہو گی یا پھر ممکن ہے کسی حادثے کا شکار ہوئی ہو ــــ ممکن ہے کسی درندہ صفت نے اس کی عزت و آبرو سے کھیل کر اسے موت کے گھاٹ اتارنے کی کوشش کی ہو، یہ ساری باتیں شمشیر زماں کے لیے بہت پریشان کن تھیں، حالانکہ کوئی خاص مسئلہ نہیں تھا، وہ اسے اپنی تحویل میں رکھ سکتے تھے لیکن بس بیگم صاحبہ کی مخالفت اور پھر یہ احساس کہ آخر وہ کون ہے، نواب صاحب کو پریشان کیے ہوئے تھا، کسی طرح اس کے ورثا کا پتہ چل جاتا، خواہ انھیں اس سلسلے میں مزید کچھ خرچ کرنا پڑتا، وہ اسے ان کے حوالے کر کے خود کو ترو تازہ محسوس کرتے . . .

لیکن اب کچھ انوکھی ذمہ داریاں ان پر آ پڑی تھیں۔

لڑکی اگر اپنی زبان سے کچھ بول سکتی تو شاید انھیں تشویش نہ رہتی۔ ان کی فرمائش پر نرسوں نے بہت کوشش کی تھی کہ کسی طرح وہ اپنے ورثا کی نشاندہی کر دے لیکن نرسوں نے بتایا تھا کہ ان کے اس سوال پر اس کی آنکھیں ڈبڈبا گئی ہیں، وہ کچھ بولنے کی کوشش کرتی ہے لیکن ناکام رہتی ہے۔ نرسوں نے اس کے ہاتھ میں کاغذ اور پنسل بھی دیا تھا لیکن وہ کاغذ پر لکیریں بنانے کے علاوہ کچھ نہ کر سکی تھی، شاید اسے لکھنا پڑھنا بھی نہیں آتا تھا۔ اس بدنصیب کا نام بھی ان لوگوں کو نہیں معلوم ہو سکا تھا اور پھر جب شمشیر زماں ڈاکٹروں سے ملے تو انھوں نے کہا کہ اب اگر وہ چاہیں تو لڑکی کو لے جا سکتے ہیں۔ وہ بالکل تندرست ہے، اس کی چال میں لڑکھڑاہٹ رہے گی اور اگر شمشیر زماں چاہتے ہیں کہ اس کی لڑکھڑاہٹ دور ہو جائے تو انھیں ایک سال انتظار کرنا پڑے گا، اس کے بعد اس کا دوبارہ آپریشن کیا جا سکتا ہے۔

شمشیر زماں صاحب گہری سانس لے کر پریشان سے گردن ہلانے لگے تھے۔ کوئی بات سمجھ میں نہیں آتی تھی کہ کیا کریں۔ بہرصورت چونکہ وہ ان کی معرفت آئی تھی۔ وہ اس کے مکمل اخراجات ادا کرتے

رہے تھے اس کے علاوہ ڈاکٹروں نے بھی اس کی دیکھ بھال اسی
نظریے کے تحت کی تھی کہ وہ شمشیر زماں صاحب کی بیٹی ہوئی ہے۔
اس لیے اب یہ فرض بھی ان پر ہی عاید ہوتا تھا کہ اسے اسپتال سے
لے جائیں یہ دوسری بات تھی کہ اسپتال سے لے جانے کے بعد وہ
اسے کسی جنگل میں ہی چھوڑ دیں لیکن اسپتال سے اسے لے جانا ان کا
فرض تھا چنانچہ وہ اس کے لیے مجبور ہو گئے، البتہ اُسے لے جانے
سے قبل انھوں نے ایک بار ان آفت جہاں سے بات کر لینا مناسب
سمجھا جو ان کے لیے سوہان روح تھی یعنی بیگم صاحبہ۔

ڈاکٹروں سے انھوں نے یہی کہا کہ دو تین دن کے بعد اسے
یہاں سے لے جائیں گے وہ اس کے بعد حویلی واپس آ گئے۔ اس
شام انھوں نے بڑا اچھا ماحول پیدا کیا تھا: بیگم صاحبہ بھی خوش تھیں
اور ان کے ساتھ گفتگو میں حصہ لے رہی تھیں کہ پروگرام کے مطابق
شمشیر زماں چونک کر بولے۔

”ارے ہاں بیگم اس بے چاری کے بارے میں آپ نے آج
تک کبھی کچھ نہیں پوچھا جو نجانے کن مصائب کا شکار ہو کر ہم
تک پہنچی۔“

”پوچھنے کی ضرورت باقی نہیں رہی تھی، میں دو ڈھائی مہینے
سے آپ کی پریشانیاں دیکھ رہی ہوں اور یہ سوچ رہی ہوں کہ آخر
وہ کون سے مصائب تھے جنہوں نے آپ کو اس قدر متاثر کر دیا؟“

”دیکھیے بیگم! طنز نہ کیجیے، آپ ہمیشہ ہی میرے بارے
میں غلط سوچتی رہی ہیں حالانکہ آج تک آپ نے کوئی ایسی بات
تلاش نہیں کی جس سے میں واقعی مطعون ٹھہرا ہوں۔ دیکھیں بیگم سنجیدگی
سے سنیں وہ لڑکی بے چاری اس حادثے سے متاثر ہو کر اپنی قوت
گویائی کھو چکی ہے، ڈاکٹروں کا کہنا ہے کہ وہ حاملہ ہے، میں اپنی
ہر ممکن کوشش کر چکا ہوں کہ اس کے ورثا کا کچھ پتہ چل جائے لیکن
کچھ پتہ نہیں چل سکا، اب یہ ہمارا فرض ہے کہ انسانی رشتے کے
تحت ہم اسے اپنے ساتھ رکھیں اور اس کے مصائب میں شریک
ہو جائیں۔“

”کیا مطلب ہے آپ کا؟“

”میرا مطلب ہے کہ اب وہ صحت یاب ہو چکی ہے، اسے اسی
حویلی میں لانا ہو گا۔“

”خوب۔ کون سا کمرہ تیار کروں اس کے لیے؟ آپ منتخب
فرما دیں اس کے لیے جو اس کے شایان شان ہو۔“ بیگم صاحبہ نے کہا۔

”بیگم! میں آج تک آپ کی باتوں کو پُرمزاح انداز میں محسوس
کرتا رہا ہوں، مجھے یقین ہے آپ کو میرے کردار پر شبہ نہیں ہو گا
لیکن اگر ہے تو یہ نہایت افسوس ناک بات ہے، بلاشبہ میں یہ بھی
جانتا ہوں کہ مرد کی طرف سے عورت کی تشویش اس کی محبت کا مظہر
ہوتی ہے لیکن اس تشویش میں اگر کسی مظلوم کی ذات شامل ہو جائے تو
پھر یہ گناہ کہلاتی ہے، آپ کو انتہائی سنجیدگی کے ساتھ یہ بات
ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ میں نے آپ سے اس بارے میں جو کچھ کہا
ہے وہ بالکل درست ہے، وہ مظلوم لڑکی مجھے ندی کے کنارے
جھاڑیوں میں الجھی ہوئی ملی تھی اور میں صرف انسانی ہمدردی کے تحت
اسے اپنے ساتھ لے آیا تھا۔ خدا کا شکر ہے کہ اس کی جان بچ گئی، اگر
اس کے ورثا کا پتہ چل جاتا تو میں انتہائی مسرت کے ساتھ اسے ان کے
حوالے کر دیتا، لیکن اب مجھے اُسے اسپتال سے یہاں لانا ہے۔ یہاں
آپ اسے انتہائی محبت کے ساتھ رکھیں گی اور میں کوشش کرتا رہوں
گا کہ اس کے لواحقین کے بارے میں معلومات حاصل ہو جائیں، تاہم
اگر میں اس میں کامیاب نہ ہو سکا تو ایک انسانی زندگی ہم پر بھاری
نہیں پڑے گی، جس طرح بہت سے لوگ پلتے ہیں وہ بھی پلتی رہے
گی، میں چاہتا ہوں کہ اس کے تمام معاملات میں آپ اس کی مدد کریں
اور دل میں کسی برائی کو جگہ نہ دیں۔“

بیگم صاحبہ خاموش ہو گئیں، شوہر سے اچھی طرح واقف تھیں،
جانتی تھیں کہ کون سا لہجہ سنجیدہ ہے اور کتنی گنجائش ہے۔ جس لہجے
میں شمشیر زماں صاحب نے یہ سب کچھ کہا تھا اس سے اندازہ ہوتا
تھا کہ وہ آخری بات ہے اور اب ان کی کوئی کوشش الجھنیں پیدا
کرنے کے سوا کچھ نہیں کر سکتی۔ چنانچہ خاموش ہو گئیں اور یہ خاموشی
گویا اعتراف شکست تھی

شمشیر زماں صاحب ایک بڑے مرحلے سے نکل گئے تھے۔
یہ اندازہ تو انھیں تھا کہ اس وقت تک بے انتہا مشکلات پیش آتی
رہیں گی جب تک بیگم صاحبہ کو یہ یقین نہ ہو جاتا کہ شمشیر زماں
صاحب کی نیت صاف ہے اور اس بے چاری لڑکی سے ان کا
کوئی تعلق نہیں ہے لیکن بہر صورت انھوں نے یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ
بہت جلد اس مظلوم کے بارے میں بیگم صاحبہ کے دل سے یہ شبہ
نکال دیں گے تاکہ اگر اسے ان کے ساتھ ہی زندگی بسر کرنی ہے تو پھر
تکالیف کا شکار نہ رہے۔

لیکن شمشیر زماں عورت کی فطرت سے ناواقف تھے اس
لیے یہ بات سوچ رہے تھے جب کہ بیگم صاحبہ کا ذہن ابھی تک
صاف نہیں ہوا تھا۔ وہ اب تک اسی انداز میں سوچ رہی تھیں جانتی
تھیں کہ شمشیر زماں صاحب کے دوست بھی انہی جیسے ہیں شکاری
قسم کے لوگ جو نجانے کہاں کہاں اور کیا کیا شکار کرتے پھرتے ہیں۔

بالآخر شمشیر زماں اس لڑکی کو گھر لے آئے۔ ابتدائی دور تھا اس بات کے خواہش مند تھے کہ اس کے ذہن پر یہاں اگر کوئی بار نہ پڑے۔ وہ یہ نہ سوچے کہ دشمنوں میں آگئی ہے۔ اس لیے ملازموں کو اور چند ایسے لوگوں کو جن پر ان کا اثر تھا ہدایت کر دی کہ حتی الامکان اس کی دلجوئی کریں بیگم صاحبہ سے البتہ یہ بات نہیں کہہ سکتے تھے۔

لڑکی کے لباس سے اس کی شخصیت کا اندازہ لگا لیا تھا اس لیے یہ بھی ضروری نہیں تھا کہ اسے بہت زیادہ عیش و آرام میں رکھا جائے۔ چنانچہ حویلی کے عام سے حصے میں اسے جگہ دے دی گئی۔ دلجوئی کرنے والوں میں چند ملازمائیں اور چند ملازم شامل تھے، اس کے علاوہ نواب شمشیر زماں کی ایک رشتہ دار بزرگ خاتون بھی شامل تھیں جنہیں انھوں نے ساری تفصیلات سمجھا دی تھیں۔

ابتدا میں تو یہ بے چاری لڑکی وحشت کا شکار رہی، اس کی آنکھوں میں سہمے سہمے سے تاثرات لرزتے رہتے تھے لیکن پہلے ہی دن سے اسے تمام سہولیات مہیا ہو گئیں تو وہ کسی قدر پُرسکون ہو گئی۔ البتہ اس کے چہرے پر ایک عجیب سا سکوت چھایا رہتا تھا، یقینی طور پر لکھنا پڑھنا نہیں جانتی تھی، بولنے کی کوشش کرتی تو منہ کھول کر رہ جاتی تھی اور آواز نہ نکلنے سے اس کے انداز میں بیچارگی اور جھنجلاہٹ پیدا ہو جاتی تھی لیکن آہستہ آہستہ اس کے حواس واپس آتے گئے۔ البتہ اشاروں کی زبان میں بھی اس نے کسی کو اپنے بارے میں کچھ بھی بتلانے کی کوشش نہیں کی تھی اور نا ہی کسی ملازم کی اس سے کچھ پوچھنے کی جرأت ہو سکی۔

شمشیر زماں کی رشتے دار بزرگ خاتون فضیلت بیگم خدا ترس تھیں اور صحیح معنوں میں اس گھر میں اس مظلوم عورت کی ہمدرد، باقی لوگ یا تو حق نمک ادا کر رہے تھے یا شمشیر زماں کا دل رکھنے کے لیے اس کی دلجوئی کرتے تھے، ورنہ انھیں اس بے چاری سے کوئی رغبت نہیں تھی۔

"بھئی تیرا تو نام بھی نہیں معلوم ہمیں کس نام سے پکاریں تجھے؟" فضیلت بیگم نے کہا اور پاس ہی بیٹھی نصیبن بول اٹھی۔

"ارے جب وہ بے چاری اپنا نام نہیں بتا سکتی تو کچھ بھی نام رکھ دو اس کا، ہائے ہائے کیسی پیاری بچی ہے — نجانے کن حالات کا شکار ہوئی ہے؟ اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔" نصیبن اپنا سر دونوں ہاتھوں میں لیتے ہوئے بولی۔

"اری میں تو اس کو حسینہ کہوں گی۔" فضیلت بیگم نے کہا۔

"سن بھئی! تو اپنا نام ہمیں نہیں بتا سکتی تو آج سے اپنا نام حسینہ سمجھ — ہم سب تجھے حسینہ کہہ کر پکاریں گے۔" فضیلت بیگم نے کہا اور اس نے آنکھیں بند کر کے گردن ہلا دی جیسے سر تسلیم خم کر رہی ہو کہ جو مزاج یار میں آئے۔

چنانچہ اس دن سے اس گونگی لڑکی کا نام حسینہ پڑ گیا۔ ملازمین اسے حسینہ بی بی کہہ کر پکارنے لگے اور حسینہ بی بی کی بھنک بیگم صاحبہ کے کانوں میں بھی پڑ گئی۔

بیگم صاحبہ نے اسے دیکھا تو ترش لہجے میں بولیں۔ "بھئی یہ حسینہ بی بی ہوں یا جمیلہ بیگم، سوال یہ ہے کہ یہ یہاں کس حیثیت سے رہ رہی ہیں۔ رشتہ دار ہونے کے ناطے سے —؟ یا ہمارے اوپر کوئی احسان کیا ہے انھوں نے؟ ٹھیک ہے شمشیر زماں خان کی منہ لگی ہیں مگر وہ بھی یہ بات بار بار کہتے ہیں کہ اُن کا ان حسینہ بی بی سے صرف ہمدردی کا رشتہ ہے تو بی بی چنانچہ ہمدردی اپنی جگہ، اور باقی معاملات اپنی جگہ، ہمدردی ہم ان سے یہی کر سکتے ہیں کہ یہ آرام سے یہاں رہ رہی ہیں لیکن فضیلت خالہ آپ ان سے کہیں کہ دوسرے لوگوں کے ساتھ مل جل کر گھر کا کام کاج کیا کریں تاکہ رزق حلال ان کے پیٹ میں اترے اور یہ حرام کھانے کی عادی نہ ہو جائیں، اس کے ساتھ ساتھ انھیں یہ بھی سوچنا چاہیے کہ وہ ننھا معصوم جو ان کے پیٹ میں ہے، حرام روزی کا شکار نہ ہو جس کا باپ نجانے کون ہے —؟" بیگم صاحبہ نے زہر بھرے لہجے میں کہا اور وہاں موجود تمام لوگوں کو سانپ سونگھ گیا۔ فضیلت خالہ بھی کچھ نہ بول سکی تھیں۔

اس نے یہ بات سنی اور حسب عادت گردن جھکا دی۔ فضیلت خالہ کچھ نہ بولیں کیونکہ وہ جانتی تھیں کہ بیگم صاحبہ سے کوئی بحث کرنا مصیبت لانے کے مترادف ہے چنانچہ وہ خاموش رہیں۔ البتہ دبی زبان سے انھوں نے اتنا ضرور کہا۔

"دلہن بیگم، امید سے ہے بے چاری میرا خیال ہے چھٹا مہینہ لگ گیا ہے، تین چار ماہ اور نکلوا دو تو ثواب ہوگا تمھیں —"

"فضیلت خالہ کونسا پہاڑ کھودنا ہے اسے، کوئی چھوٹا موٹا کام بتا دیں اسے جو کر لیا کرے — بھئی بات دراصل یہ ہے، میں آپ کو سچ سچ بتا دوں کہ ذرا میں دیکھنا چاہتی ہوں کہ حضور شمشیر زماں اسے ملازمہ کی حیثیت میں دیکھ کر کیا محسوس کرتے ہیں — اگر واقعی ان کے اور اس کے درمیان ہمدردی کا رشتہ ہے تو پھر انھیں اسے کام کاج کرتے دیکھ کر کوئی دکھ نہیں ہونا چاہیے، آخر دوسرے ملازمین بھی اسی کی طرح انسان ہیں۔ سب کام کرتے ہیں، چھوٹے موٹے کام کرتی رہے گی تو ہاتھ پاؤں بھی ہلیں گے جو اس کے حق میں ہی بہتر ہے — ہاں اگر شمشیر زماں صاحب کو کوئی اعتراض ہوا تو پھر دیکھا جائے گا لیکن اصلیت تو کھل کر سامنے آ جائے گی۔" — بیگم صاحبہ نے

اور اس کے چہرے پر کرب کے آثار منجمد ہو گئے۔ گو یا وہ تمام صورتحال سمجھتی تھی لیکن بے بسی کی تخلیق ان تمام باتوں پر کوئی احتجاج نہیں کر سکتی تھی اس کی ذات تو یوں بھی پسی ہوئی تھی۔

اوّل تو زندگی کے بدترین حالات سے دوچار تھی اوپر سے ایک ننھا سا وجود اس کے شکم میں پرورش پا رہا تھا جس کے بارے میں سوچ سوچ کر نجانے اس کی کیا حالت ہو جاتی ہوگی۔ ایک ایسی بے بس اور بے سہارا لڑکی جو انسانیت سے بالکل کٹ کر رہ گئی تھی۔ فضیلت خالہ نے کئی بار اشاروں اشاروں میں اس سے پوچھنے کی کوشش کی کہ کیا اس کا اس دنیا میں کوئی ہے لیکن اس بات کے جواب میں ہمیشہ اس کی آنکھیں ڈبڈبا آتی تھیں آج تک اس نے اشاروں میں بھی کچھ نہیں بتایا تھا۔ شمشیر زماں جو چالاک تھے بیوی کی عادت اچھی طرح جانتے تھے۔ اس لیے انھوں نے یہی سوچا کہ اگر اس مظلوم کو گھر میں انسانوں کی طرح زندہ رہنے کا موقع دینا ہے تو بہتر یہ ہوگا کہ اس کی ذات سے بالکل ہی لاپروائی اختیار کر لی جائے۔ اور آہستہ آہستہ وہ اپنی ان کوششوں میں کامیاب ہوتے چلے گئے تھے۔ بیگم صاحبہ نے ایک بار بھی ان کی زبانی حسینہ کے بارے میں کچھ نہ سنا اور نہ ہی انھیں اس کی طرف متوجہ ہوتے دیکھا تو کسی قدر مطمئن ہو گئیں اور یہی بات حسینہ کے حق میں بہتر تھی۔

شجاع احمد کی خوبصورت کوٹھی ہر وقت قہقہوں کی آماجگاہ بن رہتی تھی۔ تین بیٹے دو بیٹیاں اور متعدد رشتے دار دادا میاں کی نیت میں ہمیشہ ہنگامہ خیزیوں میں مصروف رہتے تھے۔ حسام الدین نے زندگی کی جدوجہد سے ریٹائر ہونے کے بعد زندگی گزارنے کے لیے جو وطیرہ اختیار کیا تھا اس نے نہ صرف ان کی صحت بحال رکھی تھی بلکہ بچوں کو بھی ان سے مانوس کر دیا تھا اور عموماً یہی ہوتا کہ دادا جان پوتے اور پوتیاں اور دیگر افراد کسی دھما چوکڑی میں مصروف رہتے۔ اس دھما چوکڑی میں ستر سالہ حسام احمد کا تو کوئی خاص دخل نہیں ہوتا تھا لیکن سارے ڈرامے ان کی سرکردگی میں اسٹیج ہوتے تھے۔ حسام احمد صاحب کے لیے اگر کوئی بہترین کام تھا تو کوئی عمدہ سا جاسوسی ناول یا کہانی اور بچوں کو اگر ان سے کوئی کام لینا ہوتا تو وہ بازار میں کسی نئی کہانی کی تلاش میں نکل جاتے۔ پھر یوں ہوا کہ قدسیہ شجاع احمد نے دادا جان کو انگریزی ناولوں کی لت ڈال دی۔ ایک دو بار تو ان بچوں نے یہ ناول خود ترجمہ کر کے انھیں سنائے لیکن اس کے بعد ظاہر ہے کہ یہ مشکل کام وہ مسلسل انجام نہ دے سکے لیکن حسام احمد صاحب کو اب انگریزی ناولوں کا چسکہ پڑ گیا تھا۔ بچوں کی خوشامد کرتے کبھی کبھار کوئی ہاتھ لگ جاتا تو اسے گرفتار کر لیا کرتے تھے لیکن عموماً بچے ایسے مواقعوں سے بچنے کی کوشش کرتے تھے چنانچہ انھوں نے فیصلہ کیا کہ کوئی مترجم ملازم رکھ لیا جائے یہ فیصلہ کر کے وہ بہت خوش تھے۔ اخبار میں اشتہار دیا گیا جس کے جواب میں ابھی تک چار نوجوان آئے تھے چاروں کے چاروں عجیب ہونق سے تھے۔ حسام احمد صاحب کو ان میں سے کوئی پسند نہ آیا۔ انھوں نے حسام احمد صاحب کو ترجمہ کر کے ناول سنائے۔ لیکن انھیں ان میں سے کوئی دلچسپی محسوس نہیں ہوئی تھی۔ وہ کسی ایسے نوجوان کی تلاش میں تھے جو خود بھی ان تمام چیزوں سے دلچسپی رکھتا ہو۔

کوٹھی کے دوسرے حصے میں ان کی رہائش گاہ تھی۔ سامنے کے حصے میں شجاع احمد صاحب اپنے اہل خاندان کے ساتھ رہتے تھے اور دوسرے حصے میں حسام احمد صاحب چند وفادار ملازموں کے ساتھ جو ہندوستان ہی سے ان کے ساتھ آئے تھے۔ ان کے علاوہ کچھ نئے ملازم بھی تھے جو حسام احمد صاحب کے پسندیدہ ملازمین میں شمار ہوتے تھے۔

روزمرہ کے معمولات تھے جن میں کبھی کوئی خاص تبدیلی... پیدا نہیں ہوئی تھی۔ سوائے اس کے کہ کبھی کوٹھی میں کوئی تقریب ہوتی یا کچھ مہمان کہیں باہر سے آجاتے تو ان کے معمولات میں تھوڑی سی تبدیلیاں پیدا ہو جاتی تھیں ورنہ وہی سب کچھ۔ اس وقت بھی وہ رات کے کھانے سے فارغ ہو کر کافی دیر تک سبزہ زار میں چہل قدمی کرتے رہتے۔ ملازمین ساتھ تھے ان سے گفتگو ہوتی رہی اور پھر اس کے بعد وہ اپنی خوابگاہ میں آگئے۔ وقت مقررہ پر ملازم نے گاڑھے دودھ کا ایک گلاس ان کی خدمت میں پیش کیا جسے پینے کے بعد وہ اپنی مسہری کی جانب بڑھ گئے۔ ہلکا نیلا بلب خوابگاہ میں روشن ہو چکا تھا مسہری پر لیٹ کر انھوں نے سرخ کمبل پیروں پر ڈال لیا۔ مسہری کے عین سامنے چھت کے نزدیک ایک وسیع روشندان تھا۔ یہ باہر لان میں کھلتا تھا۔ اس روشندان سے چند گز کے فاصلے پر درخت کی وہ شاخ نظر آتی تھی جو روشندان کے سامنے سے گزری تھی۔ اکثر چاندنی اس شاخ کے چھدرے پتوں سے گزر کر روشندان کے چند حصوں کو منور کر دیتی تھی اور حسام احمد صاحب کی نگاہیں عموماً اس روشندان سے گزر کر روشن آسمان کے ان ننھے ننھے سفید نقطوں کو دیکھنے لگتی تھیں۔ اس وقت بھی انھوں نے اپنے نرم و گداز تکیے پر سر رکھ کر جب روشندان کی طرف دیکھا تو بری طرح اچھل پڑے۔ روشندان سے دو ٹانگیں باہر نکلی ہوئی تھیں۔ تقریباً گھٹنوں کے نزدیک سے یہ ٹانگیں نیچے لٹکی ہوئی تھیں۔ ان پر سفید لونگ شوز تھے اور ٹانگیں بے جان سی معلوم ہوتی تھیں۔ حسام احمد صاحب نے

آنکھیں مل مل کر ان ٹانگوں کو دیکھا اور ان کے چہرے پر تعجب کے آثار پھیل گئے۔ اس تعجب میں خوف شامل نہیں تھا کیونکہ بہ صورت وہ بزدل نہ تھے۔ یا تو کوئی شخص روشندان کے راستے اندر داخل ہونے کی کوشش کر رہا تھا یا پھر۔ لیکن اس یا پھر کے بعد ــــ یا پھر کے بعد۔ ان کے پاس کوئی مناسب لفظ نہیں تھا۔ انھوں نے جلدی سے مسہری کے سائیڈ دراز سے اپنا پستول نکال لیا اور اسے کمبل میں چھپا کر اس کے چیمبر چیک کرنے لگے۔ دونوں پاؤں آہستہ آہستہ ہل رہے تھے۔ حسام احمد صاحب انتظار کرتے رہے کہ روشندان کے راستے اندر داخل ہونے والا نیچے اترنے کی کوشش کرے تو وہ اپنی پھرتی اور جواں مردی اسے دکھائیں لیکن پاؤں مطمئن انداز میں ہلتے رہے۔ ایک لمحے کے لیے ان کا دل چاہا کہ پیر ہی کا نشانہ لے کر فائر کریں لیکن پھر انھوں نے یہ ارادہ ملتوی کر دیا۔ وقت سے پہلے اسے زخمی کرنے سے کیا حاصل۔ کچھ نہ کچھ ہونا چاہیے ویسے ایک اور اندازہ انھیں ہوا تھا کہ جو بھی کوئی اس روشندان میں اس طرح بیٹھا ہے تو اسے اندر کا ماحول نظر نہیں آ رہا ہوگا کیونکہ اس کا بقیہ دھڑ اوپر تھا اور اوپر ایسی کوئی جگہ نہیں تھی کہ کمرے میں جھانکا جا سکے۔ ایک لمحے کے لیے حسام احمد صاحب نے ادھر ادھر دیکھا اور بغلی کھڑکی کی جانب ان کی نگاہیں اٹھ گئیں۔ کھڑکی بند تھی اس میں سلاخیں نہیں تھیں اور اس کے راستے عقبی لان میں اترا جا سکتا تھا بشرطیکہ اس کارروائی میں کوئی آہٹ نہ پیدا ہو۔ ایک لمحے میں انھوں نے فیصلہ کر لیا اور پستول ہاتھ میں لیے کمبل یونہی چھوڑ کر مسہری سے نیچے آ گئے۔ گھٹنوں کے بل رینگتے ہوئے وہ کھڑکی کی جانب بڑھ رہے تھے۔ بار بار ان کی نگاہیں روشندان کی طرف اٹھ جاتیں۔ وہ دونوں پاؤں اب بھی اسی انداز میں ہلتے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ کھڑکی کی چٹخنی کھولنے میں انھوں نے انتہائی مہارت کا ثبوت دیا۔ ذرا برابر آواز نہیں پیدا ہونے دی تھی اور یوں بھی یہ تمام چیزیں نئی اور صاف ستھری تھیں۔ جس کی وجہ سے کوئی آواز نہیں پیدا ہوئی۔ کھڑکی کا پٹ کھولتے ہوئے البتہ ایک ہلکی سی سرسراہٹ ہوئی تھی اور اس کے بعد نواب صاحب کا بدن کھڑکی سے باہر نکل گیا۔

بغلی سمت سے بائیں ہاتھ مڑ کر وہ اس دیوار کے پاس پہنچ سکتے تھے جس کے اوپری حصے میں روشندان تھا چنانچہ کھڑکی کے دوسری جانب اتر کر وہ اطمینان سے پستول ہاتھ میں لیے بے آواز اس سمت بڑھنے لگے جہاں درخت تھا اور درخت کی شاخ کے سامنے والی دیوار پر روشندان۔ کونے کے نزدیک پہنچ کر وہ زمین پر بیٹھ گئے۔ انھوں نے فیصلہ کیا تھا کہ اس طرح رینگ رینگ کر وہ ان تک پہنچیں گے اور پھر عقب سے اس پُراسرار وجود کو کور کر لیں گے جو روشندان میں اس طرح مزے سے بیٹھا ہوا تھا لیکن عقب میں پہنچ کر جب وہ درخت کے تنے کے پاس کھڑے ہوئے اور انھوں نے روشندان کی طرف دیکھا تو ان کی آنکھیں متحیرانہ انداز میں پھیل گئیں۔ روشندان کے اس طرف کچھ نہ تھا۔ وہ دیوانوں کی طرح درخت کی شاخ کو دیکھنے لگے ممکن ہے کوئی آہٹ پا کر درخت پر چڑھ گیا ہو کیونکہ روشندان سے درخت کی اس شاخ کا فاصلہ زیادہ نہیں تھا لیکن ان کی عقابی نگاہوں نے درخت کا بھی پوری طرح جائزہ لے لیا۔ یہ درخت بہت زیادہ گھنا نہیں تھا اس لیے اس پر کسی ایسے وجود کا چھپ کر بیٹھ جانا ناممکن تھا۔

"کیا اندر کمرے میں اتر گیا۔" انھوں نے سوچا یا پھر شاید چھت پر پہنچ گیا۔ بڑی تعجب خیز بات تھی۔ ایک لمحے کے لیے ان کے دل میں ان کہانیوں کا احساس جاگا جن میں پُراسرار واقعات تحریر ہوتے تھے۔ پھر جلدی سے انھوں نے گردن جھٹک دی۔ سارے پُراسرار واقعات کی ایسی کی تیسی۔ مسئلہ کس طرح حل ہو؟ یہی فیصلہ کیا کہ گھوم کر دروازے کی سمت جائیں لیکن دروازہ اندر سے بند تھا اسے کھولنا ممکن نہیں تھا۔ "اوہو۔ اگر وہ شخص کمرے میں اتر گیا ہے تو پھر کمرے میں داخل ہونا کہیں مشکل نہ ہو جائے۔ کھلی ہوئی کھڑکی دیکھ کر وہ کھڑکی بند کر دے گا۔ لیکن روشندان بھی اتنا بلند تھا اور اس کے آس پاس کوئی ایسا سہارا نہیں تھا جس کے ذریعے کمرے میں اترا جائے سوائے اس کے کہ پندرہ سولہ فٹ کی بلندی سے نیچے چھلانگ لگا دی جائے۔ ایکبارگی پھر وہ پلٹ کر اسی کھڑکی کی جانب دوڑے اور کھڑکی کے نیچے پستول لے کر بیٹھ گئے پھر آہستہ آہستہ اوپر ابھرے اور کھڑے ہو کر اندر کے ماحول پر روشنی ڈالی لیکن کمرے کا ماحول پرسکون تھا۔ کوئی تبدیلی محسوس نہ ہوتی تھی پھر ان کی نگاہیں روشندان کی طرف اٹھ گئیں۔ اب وہ پاؤں وہاں موجود نہیں تھے۔ حسام احمد صاحب گہری گہری سانسیں لینے لگے۔ انھوں نے سوچا کہ ملازمین کو آواز دیں لیکن یہ تو کوئی بات ہی نہ ہوئی پتہ تو چلنا چاہیے کہ وہ کون تھا؟ اور کیا روشندان کے ذریعے وہ کمرے میں داخل ہونے میں کامیاب ہو گیا۔ ویسے اس دوران انھوں نے کوئی آواز نہیں سنی تھی جبکہ روشندان سے کودنے میں خاصی آواز ہونی چاہیے تھی۔ بہرطور وہ کھڑکی پر چڑھ کر اندر کود گئے اور حفظ ماتقدم کے طور پر انھوں نے کھڑکی بند کر دی۔ کھڑکی کے قریب کھڑے ہو کر وہ پستول ہاتھ میں لیے ادھر ادھر کا جائزہ لینے لگے لیکن کمرے میں کسی کی موجودگی کا احساس ہی نہیں ہوتا تھا پھر وہ چند قدم ہی آگے بڑھے تھے کہ کوئی سخت سی چیز ان کی پشت سے

آ لگی اور اس کے ساتھ ہی ایک گرج دار آواز سنائی دی۔

"دونوں ہاتھ بلند کردیں پھرتی دکھانے کی کوشش نہ کریں۔"

حسام احمد صاحب کے بدن میں ایک لمحے کے لیے جھرجھری آئی تھی۔ لیکن پشت سے لگی ہوئی پستول کی نالی نے انھیں اس آواز کے حکم کی تعمیل پر مجبور کردیا۔ جونہی انکا ہاتھ بلند ہوا پستول اُچک لیا گیا۔ اور اس کے بعد وہ شخص پیچھے ہٹ گیا۔ وہی فل بوٹ تھے جو روشندان میں نظر آئے تھے اور اس کے اوپر سیاہ رنگ کی پینٹ اور ہلکے سبز کلر کی شرٹ نظر آرہی تھی۔ چہرہ ایک خوبصورت نوجوان کا تھا جس کی آنکھوں کی تیز چمک دھندلے بلب میں بھی نمایاں تھی حسام احمد صاحب چند گز کے فاصلے پر کھڑے ہوکر اسے دیکھنے لگے۔ نوجوان نے پستول کا رخ ان کی طرف کیا ہوا تھا۔ پستول حسام احمد صاحب ہی کا تھا اس نے اپنا پستول شاید جیب میں رکھ لیا تھا پھر وہ پستول کا رخ حسام احمد صاحب کی طرف کیے ایک دیوار کی طرف بڑھا جہاں سوئچ بورڈ لگا ہوا تھا اس نے دو بٹن دباکر تیز روشنیاں جلادیں۔ اس تیز روشنی میں حسام احمد صاحب نے اس کا چہرہ دیکھا اور ان کی اپنی آنکھوں میں عجیب سے تاثرات ابھر آئے۔ نوجوان ایک عمدہ شخصیت کا مالک تھا۔ وہ اپنی چمکدار آنکھوں سے حسام احمد صاحب کو گھور رہا تھا۔ پھر اس نے پستول کا بٹ کھول کر اس کے چیمبر سے کارتوس نکال لیے اور پستول مسہری پر اچھال دیا۔ حسام احمد صاحب نے اس کی اس حرکت کو بھی حیرت سے دیکھا تھا۔ نوجوان نے انھیں رائٹنگ ٹیبل کی جانب چلنے کا اشارہ کیا اور حسام احمد صاحب بے اختیار رائٹنگ ٹیبل کی جانب بڑھ گئے۔

"تشریف رکھیئے۔" نوجوان نے رائٹنگ ٹیبل کے نزدیک پڑی ہوئی کرسی گھسیٹ کر حسام احمد صاحب کو بیٹھنے کا اشارہ کیا اور حسام احمد صاحب نے دلچسپی سے اسے دیکھتے ہوئے اس کے اس حکم کی تعمیل کی تھی۔ نوجوان نے جیب میں ہاتھ ڈال کر ایک سفید کاغذ نکالا اور حسام احمد صاحب کے سامنے رکھ دیا۔

"کیا کرنا ہے؟" حسام احمد صاحب نے پوچھا۔

"پڑھ لیجئے اسے۔" نوجوان ٹھنڈے لہجے میں بولا۔

"کیا لکھا ہے اس میں اور کیا چاہتے ہو تم؟"

"درخواست ہے نوکری کی اور نوکری چاہتا ہوں۔" اس نے جواب دیا حسام احمد صاحب کو اپنے کانوں پر شبہ ہوا تھا۔ انھوں نے اب بھی کاغذ کی جانب نہیں دیکھا اور اسے حیرت سے دیکھتے ہوئے بولے۔

"کیا کہا تم نے — کیا کہا —؟"

"عرض کیا نا حضور والا کہ ملازمت کی درخواست ہے اور ملازمت چاہتا ہوں۔ عرصہ دراز سے بے کار ہوں۔ آپ کا اشتہار پڑھ کر آپ سے ملاقات کے لیے حاضر ہوا ہوں۔"

"ہوں۔ گویا یہ کوئی سنجیدہ مذاق ہے۔ میاں صاحبزادے کافی شگفتہ لگتے ہیں آپ اور آپ کو نہیں معلوم کہ یہ مذاق ہمارے لیے بہت ہی دلچسپ ہے لیکن اب اصلی بات بتاؤ کہ سلسلہ کیا ہے؟"

"صرف نوکری کا سلسلہ ہے جناب عالی۔ آپ درخواست پڑھ لیں۔ تب حسام احمد صاحب نے درخواست کے الفاظ پر نظریں دوڑائیں۔ لکھا تھا۔

"قبلہ و کعبہ آداب،

فدوی عرصہ دراز سے بیکار ہے اور انگریزی کی بہتر شُد بُد رکھتا ہے۔ جاسوسی کہانیاں اور ناولوں کا شائق ہے۔ تراجم بآسانی کرسکتا ہے چنانچہ فدوی ملتمس ہے کہ اگر آپ نے ملازمت کے لیے کسی کا انتخاب نہ فرمالیا ہو تو فدوی کو اس خدمت کا موقع عطا کیا جائے۔ خادم زیڈ۔ زیڈ۔ زیڈ۔"

حسام احمد صاحب کی آنکھیں متحیرانہ انداز میں اس نوجوان کی جانب اٹھ گئیں تھیں۔

"بڑا دلچسپ مذاق ہے مگر میاں اصل بات بتادو اب۔ تم نے پستول تو پھینک ہی دیا ہے گولیاں بھی واپس کر دو ظاہر ہے تم جیسے دلچسپ آدمی پر کوئی نامعقول آدمی ہی گولیاں چلاسکتا ہے۔ آؤ بیٹھو۔ میں تمھیں اس وقت چائے اور کافی پیش نہیں کرسکوں گا۔ کیونکہ سارے ملازمین اپنے آخری فرائض سے فارغ ہوکر جاچکے ہیں۔ بیٹھو۔ بیٹھو اور مجھے اپنے یہاں آنے کا مقصد بتاؤ؟ لینا چاہتے ہو کچھ۔ لوٹنا چاہتے ہو مجھے مگر انتہائی احمق معلوم ہوتے ہو۔ معلومات حاصل کیے بغیر کسی کو لوٹنے کا پروگرام بنانا بھی حماقت ہی ہے۔ میں ریٹائرڈ لائف گزار رہا ہوں۔ پیسہ کوڑی اپنے پاس نہیں رکھتا۔ بیٹا ہے سعادتمند ہے جو ضرورت ہوتی ہے لے لیتا ہوں اس سے۔ چنانچہ یہاں تمھیں چند ڈیکوریشن پیس اور فرنیچر کے علاوہ اور کچھ نہیں مل سکتا۔ بینک میں میرا کوئی اکاؤنٹ نہیں ہے۔ جس کے لیے میں تمھیں کوئی چیک وغیرہ لکھ کر دے دوں اور پھر چیک تو یوں بھی خطرناک ہوگا۔ کیا خیال ہے؟"

"بالکل درست۔" نوجوان نے مؤدبانہ انداز میں گردن جھکاکر کہا

"تو پھر بولو۔ کیا خدمت کروں تمھاری؟"

"حضور والا مترجم کی نوکری عنایت فرمادیجئے۔"

"دیکھو بھائی مذاق مختصر ہو تو دلچسپ رہتا ہے۔ طوالت اختیار کر جائے تو اس کی لطافت ختم ہو جاتی ہے۔ ہمیں تمہاری دلچسپ باتیں پسند آئی ہیں اور عقل یہ تسلیم کرنے پر تیار نہیں ہے کہ یہ کام حقیقت پر مبنی ہے۔"

"حضور والا وہ ترکیب بتائیں جس سے میں حضور کو یقین دلا سکوں۔"

"تم پاگل ہو گئے ہو شاید۔ بھلا نوکری حاصل کرنے کے لیے رات کو اس وقت اس انداز میں پستول لے کر آنا کیا معنی رکھتا ہے۔ اب ہماری طبیعت میں ذرا جھنجھلاہٹ پیدا ہوتی جا رہی ہے۔ اگر تم صحیح بات نہیں بتاتے تو نہ بتاؤ۔ ہم بستر پر جا کر لیٹے جاتے ہیں اس کے بعد تمہارا جو دل چاہے کرتے پھرو۔" حسام احمد صاحب نے کہا اور نوجوان ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو گیا۔

"حضور والا کی فطرت کے بارے میں کسی قدر معلومات حاصل کر چکا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ حضور والا طرز پسند کرتے ہیں جاسوسی کہانیوں میں اور ناولوں میں سسپنس اور تھرل ہی تو ایک ایسی چیز ہوتی ہے جو قاری کو متوجہ کرتی ہے۔ مجھے یقین تھا کہ آپ کو سرجم کے فرائض انجام دینے کے لیے مکھیوں پر مکھیاں مارنے والے لوگ پسند نہیں آئیں گے۔ آپ جدت پسند ہوں گے۔ بس اسی جدت پسندی کو ملحوظ رکھ کر میں آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور حاضر ہونے کا یہ انداز میرے خیال میں آپ کے لیے دلکش ہونا چاہیئے۔"

"تو گویا۔ واقعی۔ واقعی۔" حسام احمد صاحب متحیرانہ لہجے میں بولے۔

"جی حضور والا اگر عنایت ہو جائے تو فدوی کو سر چھپانے کا ٹھکانہ بھی مل جائے اور پیٹ بھرنے کا ذریعہ بھی ہو جائے۔"

"تعجب ہے بھئی۔ اگر واقعی تم سنجیدہ بھی ہو تو برسوں یقین نہیں آئے گا ہمیں کہ ملازمت حاصل کرنے کے لیے ایسا بھی کوئی طریقہ اختیار کیا جا سکتا ہے۔"

"میں معذرت خواہ ہوں اگر حضور کو میری یہ حرکت پسند نہ آئی ہو تو مجھے معاف کر دیا جائے۔"

"پستول کہاں ہے تمہارا؟" حسام احمد صاحب نے پوچھا۔

"پستول؟ حضور والا بھلا کوئی بھی شریف آدمی پستول لے کر ملازمت تلاش کرنے کے لیے نکلتا ہے۔"

"تو پھر تم نے ہماری پشت پر کیا لگایا تھا؟"

"یہ خادم کی انگلی تھی بس اور کچھ نہیں۔"

"ہوں سچ کہتے ہو؟ تلاشی لے لی جائے تمہاری؟"

"بندہ حاضر ہے۔" نوجوان نے کہا۔

"کمال ہے بھئی واقعی کمال ہے۔ روشندان سے کود کر اندر آئے ہو؟" حسام احمد صاحب نے پوچھا۔

"نہیں عالی جناب۔"

"پھر؟" حسام احمد صاحب تعجب سے بولے۔

"اس کھڑکی سے اندر داخل ہوا تھا جب حضور والا اس کھڑکی کو کھول کر باہر نکلے تو میں چھت کے ذریعے ہوتا ہوا یہاں پہنچا اور کھڑکی سے اندر داخل ہو گیا کہ یہی مناسب جگہ تھی پھر جب حضور اندر تشریف لائے تو۔"

حسام احمد متحیرانہ نگاہوں سے اسے دیکھ رہے تھے۔ اب ان کی آنکھوں میں الجھن کے نقوش نمایاں تھے۔ پھر وہ گہری سانس لے کر بولے۔

"اگر یہ سب کچھ حقیقت ہے واقعی حقیقت ہے تو تو ہمارے لیے یہ صورت حال دلچسپ ہے لیکن تم جیسا شخص ہمارے لیے نقصان دہ بھی ہو سکتا ہے۔ اگر تم کسی غلط ارادے سے اس کوٹھی میں آئے ہو تو۔ ہم نہیں چاہتے کہ ہمارا شوق دوسروں کے لیے تکلیف دہ ہو جائے۔"

"غلط ارادے سے آپ کی کیا مراد ہے؟"

"ممکن ہے تم کسی سازش کے تحت آئے ہو۔"

"قبلہ چند دلائل پیش کرنے کی اجازت دی جائے۔"

"ہوں۔ کہو۔"

"میں صرف ملازمت کا خواہش مند ہوں۔ کوئی بھی شخص جو یہاں ملازمت کرنے آتا آپ کے لیے اجنبی ہوتا۔ کیا آپ اس کے سارے شجرۂ نسب سے واقف ہو کر اسے ملازمت عطا کرتے۔ ہر شخص آپ سے اپنی شرافت کے بارے میں جھوٹ بول سکتا ہے جبکہ میرا یہاں داخلہ میری سچائی کا مظہر ہے۔"

"وہ کیسے؟"

"میں جس انداز میں یہاں داخل ہوا ہوں وہ کسی بھی شخص کے لیے ایک ناپسندیدہ حرکت ہے۔ کوئی بھی مجھ جیسے اُچکے کو ملازمت دینا پسند نہیں کرتا۔ ملازمت حاصل کرنے کے لیے تو شرافت کے بے شمار لبادے اوڑھ کر آنا چاہیئے تھا لیکن یہ میری سچائی کی دلیل ہے کہ میں اس شکل میں یہاں آیا۔ یہ صرف آپ کی توجہ حاصل کرنے کے لیے کیا گیا ہے۔ میں نہ صرف آپ کے لیے ایک مترجم کے فرائض انجام دوں گا بلکہ آپ کی تجسس پسند فطرت کے لیے بھی بہترین معاون ثابت ہوں گا۔"

"بھلا وہ کس طرح؟"

"اس دور میں لکھی جانے والی کہانیوں پر میں عملی بحث کر سکتا ہوں۔ مصنف بعض اوقات صرف اپنی سمجھ کے مطابق لکھ دیتا ہے جبکہ وہ نکتہ اس کی کوئی سند نہیں رکھتا اور قاری اگر مصنف سے زیادہ سمجھدار ہو تو وہ ان نکتوں پہ پریشان ہو جاتا ہے۔ اسے احساس ہوتا ہے کہ کہانی میں سقم ہے لیکن وہ بے چارا مجبور ہوتا ہے کیا کر سکتا ہے۔ میں کم از کم ایسی کہانیوں کے بارے میں آپ کو مطمئن کر سکتا ہوں۔ ان تحریروں کو درست کر سکتا ہوں۔"

"اماں سبحان اللہ کیا حسین بات کہی ہے۔ دراصل صاحبزادے تم نے کوئی خاص چیز تو نہیں لوٹی مگر ہمیں لوٹے لے رہے ہو۔ اب یہ بات خدا جانے کہ تمہارے دل میں کیا ہے لیکن اس بات کا ہم نے اعتراف کر لیا کہ گفتگو کرنے کا فن جانتے ہو۔ انسان کو اس کی فطرت کے مطابق سمجھ کر اسے رجھانے کے فن میں طاق ہو۔ بہ صورت خدا کرے تمہارے دل میں ہمارے سلسلے کوئی بدی نہ ہو، اگر صرف نوکری ہی کرنا مقصود ہے اور یوں ہمارے تجسس کو ابھار کر کچھ حاصل کرنے کے خواہش مند ہو تو میاں ہم ہارے۔ ملازمت دی ہم نے تمہیں اور یہ یقین بھی دلاتے چلیں کہ کوئی تکلیف نہ ہوگی تمہیں۔ ہاں میاں ایک بات بتاؤ، تنخواہ کیا لوگے۔۔؟"

"جو حضور پسند فرمائیں۔" نوجوان نے جواب دیا۔

"نام کیا ہے تمہارا؟ درخواست میں تو تم نے زیڈ زیڈ، زیڈ لکھا ہے، اس سے کیا مراد ہے۔۔؟"

"فدوی کو زاہد ذوالفقار زیدی کہتے ہیں۔" نوجوان نے جواب دیا۔

"واہ۔ واہ۔۔ مگر جو کہتے ہوں گے وہ کہتے ہوں گے، اگر میں تمہیں صرف زاہد کہوں تو کیسا رہے گا۔۔؟"

"جو کچھ جناب والا کو پسند ہوگا وہی اس فدوی کو پسند ہے۔" نوجوان نے جواب دیا۔

"چلو ٹھیک ہے، تنخواہ کا تعین تمہاری کارکردگی پر ہو جائے گا۔ رہائش بھی چاہتے ہو۔؟"

"جی ہاں۔"

"کچھ اور لواحقین بھی ہوں گے۔؟"

"قطعی نہیں۔ تنہا ہوں۔"

"تب تو ٹھیک ہے، اسی عمارت میں تمہیں جگہ دی جا سکتی ہے۔ تو پھر یوں کرو کل سامان لے کر پہنچ جاؤ۔"

"اور آج رات کہاں گزاروں گا حضور۔۔؟"

"اے تو کوئی ٹھکانہ نہیں ہے؟"

"نہیں ٹھکانہ کیا ہے حضور، ایک ہوٹل میں سامان رکھا ہوا ہے اور وہ ہوٹل صرف سامان رکھنے کے قابل ہے، خود اس میں رہنا بے حد مشکل ہے۔"

"اچھا اچھا چلو ٹھیک ہے، آؤ تمہیں تمہارا کمرہ دکھا دیں۔ ہمارا سونے کا وقت ہو گیا ہے اور نیند سے ہمارا ذہن بوجھل ہوتا جا رہا ہے، کل صبح کو ناشتہ ہمارے ساتھ ہی کرنا اسی وقت باقی گفتگو بھی ہو جائے گی۔"

"جو حکم جناب عالی۔" نوجوان نے جواب دیا اور حسام احمد صاحب اسے کمرے میں لے آئے۔

عمارت کے اس حصے میں بھی کئی کمرے فالتو پڑے ہوئے تھے ان سب میں کچھ نہ کچھ فرنیچر موجود ہی تھا، حسام احمد صاحب نے اسے ایک کمرے میں لے جا کر کہا۔

"فی الحال یہ تمہاری رہائش گاہ ہے، دوسری ضرورتوں کا بندوبست بھی کر دیا جائے گا۔ یہاں آرام کرو اور میاں ثابت کرو کہ جو کچھ تم نے کہا ہے بالکل سچ کہا ہے۔"

"آپ مطمئن رہیں جناب عالی۔"

"سنو۔" حسام احمد صاحب دروازے کی جانب مڑتے ہوئے بولے "یہ فدوی، حضور والا۔ جناب عالی اور جناب والا کا سلسلہ ختم کرو، میرے بچے مجھے دادا جان کہتے ہیں، تم بھی اگر چاہو تو دادا جان ہی کہو۔ ورنہ پھر مجھے میرے نام سے مخاطب کرو۔ سمجھے۔ خدا حافظ شب بخیر۔"

حسام احمد باہر نکل گئے تھے، بستر میں لیٹ کر وہ دیر تک اس نوجوان کے بارے میں سوچتے رہے تھے۔ عجیب سا نوجوان تھا لیکن انہیں بہت دلچسپ لگا تھا۔ ان کے ہونٹوں پر بے اختیار مسکراہٹ پھیل گئی۔

●

اگر واقعی اس نے ملازمت کے حصول کے لیے یہ حرکتیں کی ہیں تو پھر تو واقعی دلچسپ بچہ ہے اور اگر اس نے صرف دعوے کیے ہیں تو پھر تو لطف ہی آ جائے گا، صبح کو ذرا اس کی ذہانت کا امتحان بھی لے لیا جائے گا۔ دیکھیں کتنے پانی میں ہیں برخوردار۔

دیر تک نواب صاحب زاہد ذوالفقار زیدی کی شخصیت پر غور کرتے رہے اور پھر انہیں نیند آ گئی۔ بے فکر انسان تھے زندگی کی جد و جہد ختم کر کے اب سکون کی آغوش میں سانسیں لے رہے تھے۔ اسی لیے کوئی چیز ان کی نیند کی راہ میں مزاحمت نہیں کرتی تھی چنانچہ چند ساعت کے بعد ان کے خراٹے گونجنے لگے۔

●

فضیلت خالہ کے علاوہ اس روئے زمین پر اس کا اور کوئی ہمدرد نہیں تھا۔ بس وہی تھیں جو اس کا خیال رکھتی تھیں۔ اس کے پاس بیٹھ کر اس کی دلجوئی کر لیا کرتی تھیں۔ ہر اچھی بری بات اس سے کہتی تھیں۔ یہ ان کے علم میں تھا کہ اس کی قوت گویائی ضرور ختم ہو گئی ہے لیکن وہ قوت سماعت سے محروم نہیں ہے۔ یہ بھی جانتی تھیں کہ صحیح الدماغ ہے اور گزرے ہوئے وقت کی بھیانک باتیں اس کے ذہن میں محفوظ ہیں۔ گویائی ختم ہو چکی ہے لیکن یہ یادیں اشاروں میں ڈھل سکتی ہیں، بشرطیکہ وہ ان کے بارے میں کچھ بتانا پسند کرے۔ لیکن یوں لگتا تھا کہ جیسے ماضی اس کے لیے ایک گھناؤنے زخم کی حیثیت رکھتا ہو۔ [illegible] کرنے سے اس کے چہرے پر تکلیف کے آثار ابھر آتے تھے۔ اس [illegible] بےبسی کی تصویر بن جاتا تھا۔

بہرصورت بیگم صاحبہ [illegible] اس کی طرف سے غیر مطمئن نہیں تھیں۔ گھر کے چھوٹے موٹے کام اسے سونپ دیے گئے تھے اور ان کاموں میں بھی فضیلت خالہ کی ہمدردیاں اس کے ساتھ شامل تھیں۔ آخر شمشیر زماں خان کی عزیزہ تھیں۔ اپنی بھی کچھ حیثیت رکھتی تھیں۔ چنانچہ انھوں نے ملازمین کو ہدایت کر دی تھی کہ حسینہ کو زیادہ کام نہ کرنے دیا جائے۔ اس وقت تک اس کی مدد کی جائے جب تک وہ ولادت سے فارغ نہیں ہو جاتی۔

اگر فضیلت خالہ نہ ہوتیں تو نجانے اس بے زبان عورت کو کتنی تکالیف کا شکار ہونا پڑتا۔ ان کے علاوہ اس کا یہاں پر کوئی اور ہمدرد نہیں تھا۔ فضیلت خالہ نے اسے تسلیاں دی تھیں اور کہا تھا کہ وہ ولادت کے وقت سے بالکل بھی خوفزدہ نہ ہو۔ وہ اس کی ہر ممکن مدد کریں گی۔ اور فضیلت خالہ نے اپنا قول نبھا دیا تھا۔ جب اس نے ننھے سے وجود کو جنم دیا تو فضیلت خالہ اور دوسری خواتین بھی اس کے نزدیک موجود تھیں۔ گونگی لڑکی ایک بچے کی ماں بنی تو اس کے ... چہرے پر کسی قدر اطمینان کے آثار نمودار ہوتے۔ گویا جو کچھ کھو چکی تھی اس کا صبر اسے مل چکا تھا اور اب وہ اس قدر غیر مطمئن نظر نہیں آتی تھی۔ فضیلت خالہ نے کسی غمگسار ماں کی طرح اس کی دلجوئی کی تھی۔ اس کی جو خدمت کر سکتی تھیں انھوں نے کی۔ شمشیر زماں خان کو یہ خبر فضیلت خالہ کے ذریعے ہی ملی تھی اور شمشیر زماں خان نے فضیلت خالہ کی ہمدردی محسوس کرتے ہوئے ان پر اعتماد کر لیا۔

"فضیلت خالہ! بیگم کو تو آپ جانتی ہیں ذرا چھوٹے سے دماغ کی خاتون ساری زندگی حماقتوں کا شکار رہی ہیں۔ یہ حماقتیں اگر میری ہی ذات کے لیے تکلیف دہ ہوں تو کوئی حرج نہیں ہے لیکن اگر یہ اس بے زبان اور مظلوم عورت کے لیے تکلیف دہ بن گئیں تو شاید میں پسند نہ کروں اس بات کو۔ اس لیے خدا کے واسطے آپ اس مظلوم کی نگرانی کریں۔ پتہ نہیں کون بدنصیب ہے۔ کن حالات کا شکار ہوئی ہے۔ حالانکہ میرے آدمیوں نے شدید کوششیں کیں لیکن یوں لگتا ہے جیسے اس روئے زمین پر اس کا کوئی وارث ہی نہ ہو۔ ہم تو یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ اس بچے کا باپ کون ہے لیکن بہرصورت اگر ایک انسان ہمدردی اور توجہ کا مستحق ہے تو ہمیں اس کے ماضی کی کرید میں نہیں رہنا چاہیے۔ جو کچھ کر سکتے ہیں کر دیا جائے اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ اگر کبھی اس کا کوئی وارث مل گیا تو بخوشی ہم اسے اس کے وارث کے حوالے کر دیں گے لیکن اس وقت تک جب تک اس کا کوئی وارث نہیں ملتا۔ اس مظلوم عورت کا وجود اس عظیم الشان حویلی میں کسی کو ناگوار نہ ہوگا۔ آپ یہ رقم رکھ لیجیے اور اس کی تمام ضروریات پوری کریں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اس کا اجر دیگا۔"

"ٹھیک ہے میاں! تم بالکل فکر مت کرو۔ قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھی ہوں، جو کچھ بن پڑا کرتی رہوں گی۔ مجھے بھی اپنی عاقبت کا خیال ہے۔" فضیلت خالہ نے کہا اور واقعی انھوں نے اپنا قول نبھا دیا۔

وہ زچگی سے فارغ ہو کر اپنی ذمے داریوں میں مصروف ہو گئی۔ گھر میں اس کی حیثیت نوکروں کی مانند ہی تھی جس طرح دوسرے نوکر گھر کے کاموں میں مصروف رہتے اسی طرح وہ بھی رہتی تھی۔ میلے کچیلے کپڑے پہنتی لیکن ان کپڑوں میں بھی اس کا حسن دیکھنے والوں کی نگاہوں سے پوشیدہ نہ رہتا۔ بچے کی پیدائش کے بعد تو اس پر وہ نکھار آیا تھا کہ دیکھنے والے دانتوں میں انگلیاں دبائے رہ جاتے تھے۔ سب ہی اس کے بارے میں جانتے تھے اور سب ہی کا خیال تھا کہ وہ کسی اچھے گھر کی ہے۔ بس تقدیر بگڑ گئی ہے۔

شمشیر زماں کے تمام اہل خاندان اس سے ہمدردی رکھتے تھے۔ پھر عید آئی تو بیگم صاحبہ کے تمام ملازموں کو نئے لباس سلوا کر دیئے۔ اس کے لیے بھی ایک جوڑا بن گیا تھا۔ فضیلت خالہ نے سفارش کی۔

"دلہن بیگم! اس بے چاری حسینہ کے پاس صرف ایک جوڑے کپڑے ہیں۔ اگر تم پسند کرو تو کچھ پرانے کپڑے اسے دے دو۔ ٹھیک ٹھاک کر کے پہن لے گی۔"

"پرانی الماری سے نکال لیں فضیلت خالہ۔ ویسے وہ ٹھیک کام کر رہی ہے۔"

"ہاں۔ بڑی نیک بچی ہے۔ نہ جانے کس گھر کی ہے۔ خدا کرے اس کے اہل خاندان مل جائیں۔"

"کیا کہا جا سکتا ہے فضیلت خالہ۔ ان مردوں کا کوئی بھروسہ نہیں ہوتا۔ کون جانے زماں صاحب اس کے خاندان سے واقف بھی ہوں یا نہیں"۔

"دلہن! اللہ کے لیے کچھ خوف کرو۔ خدا کرے یہ جھوٹ ہو۔ ابھی تک یہ بات تمہارے ذہن میں بھی ہو سکتی ہے۔ وہ ایسی بچی نہیں ہے۔ بڑی نیک ہے۔ بے حد معصوم ہے۔ خدا کسی کی بگاڑی ہے تمھیں اس کے خلاف ایسی باتیں نہیں کرنی چاہئیں"۔

"بات زبان پر آتی ہے تو کہنی ہی پڑتی ہے فضیلت خالہ۔ تم خود سوچو، عام لوگوں کو ایسے حالات نہیں پیش آتے۔ میں خاموش ہو گئی تو دوسری بات ہے مگر ذرا تم ہی بتاؤ اسے گولی کس نے ماری۔ کیوں ماری۔ جوان لڑکی تھی، کوئی تو پرسانِ حال ہوتا۔ کوئی تو ہوگا اس کا۔ یہ بچہ کس کا ہے۔ اور کسی نے اس کی خبر کیوں نہ لی۔ صاف ظاہر ہے کہ کوئی ایسی ویسی بات ہی ہوگی۔ کسی نے جان بوجھ کر چپ سادھ لی ہوگی۔ کون عزت گنواتا ہے"۔

فضیلت خالہ منہ دیکھتی رہ گئی تھیں۔ ان باتوں کا کوئی جواب بھی تو نہ تھا ان کے پاس۔ پھر بیگم صاحبہ نے کہا: "بہرحال جو کچھ بھی ہے اللہ جانے۔ آپ میرے پرانے کپڑوں کی الماری سے جو کپڑے دینا چاہیں نکال لیں اور اسے دے دیں۔ میرے پاس بیکار پڑے ہیں"۔

فضیلت خالہ وہاں سے چلی آئیں۔ بیگم صاحبہ نے جو کچھ کہا تھا انھیں پسند نہیں آیا تھا لیکن مجبور تھیں۔ کچھ بولنے کی جرأت کسی میں نہیں تھی۔ بیگم صاحبہ اتنی بری نہیں تھیں اگر بے چاری حسینہ شمشیر زماں کی معرفت نہ آئی ہوتی اور کسی دوسرے ذریعے سے یہاں پہنچی ہوتی تو کیفیت ہی بدلی ہوتی۔ بات بس شمشیر زماں کی وجہ سے بگڑی تھی مگر اب تو بگڑ ہی گئی تھی۔

انھوں نے بیگم صاحبہ کی پرانی الماری سے چند جوڑے کپڑے نکالے۔ یہ کپڑے اس قدر قیمتی تھے کہ لوگ تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔ فضیلت خالہ کو خیال آگیا۔ حسینہ بیگم صاحبہ سے کہیں زیادہ حسین تھی ان کپڑوں میں تو وہ نہ جانے کیا لگے گی۔ اس لیے انھوں نے بھاری جوڑے نہ نکالے بلکہ جو سادہ ترین کپڑے تھے وہ لے لیے۔

عید کے دن تمام ملازمین خوشیاں منا رہے تھے فضیلت خالہ نے حسینہ کو بھی ایک لباس پہنوایا۔ بیگم صاحبہ کا جوڑا تھا جسے انھوں نے درست کیا تھا۔ ہلکے پیازی رنگ کا غرارہ سوٹ جس پر بہت ہلکی کامدانی بنی ہوئی تھی۔ جب حسینہ نے وہ لباس پہن لیا تو خالہ ششدر رہ گئیں۔ حسینہ کو دیکھ کر آنکھیں اس پر نہیں ٹھہرتی تھیں۔ اتنی حسین لگ رہی تھی، نہ کہیں دیکھتے رہو۔

وہ خوفزدہ ہو گئیں۔ ابھی سوچ ہی رہی تھیں کہ حسینہ سے کہیں کہ کوئی دوسرا لباس پہن لے۔ لیکن اسی وقت ایک ملازم حسینہ کو بلانے آگئی اور وہ اس کے ساتھ چلی گئی۔ ملازمہ نے اسے ڈرائنگ روم کو صاف کرنے کے لیے کہا اور حسینہ سر جھکا کر کام میں مصروف ہو گئی۔

ابھی وہ پھولوں کے ایک گلدستے کے پھول درست کر رہی تھی کہ شمشیر زماں آگئے۔ حسینہ بیگم صاحبہ کے جوڑے میں ملبوس تھی اس لیے شمشیر زماں دھوکا کھا گئے۔ دبے قدموں آگے بڑھے اور پشت سے اس کے زم گداز شانوں پر دونوں ہاتھ رکھ دیے۔ حسینہ چونک کر پلٹی اور اس کی آنکھوں میں خوف کے آثار ابھر آئے۔ بے چارے شمشیر زماں بھی بری طرح گھبرا گئے تھے۔

لیکن آج کا دن قیامت کا دن تھا۔ اسی وقت بیگم صاحبہ بھی ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی تھیں۔ صورتحال یہ تھی کہ حسینہ کے ہاتھوں میں گلدان کے پھول تھے اور شمشیر زماں مجسم حیرت بنے اس کے سامنے کھڑے تھے۔

بیگم صاحبہ کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔

شمشیر زماں چور بن کر رہ گئے تھے۔ جو کچھ ہوا تھا غلط فہمی میں ہوا تھا لیکن صورت حال ایک خطرناک رخ اختیار کر گئی تھی۔ بعض اوقات اتفاقات بھی غلط فہمیوں کو خوب ہوا دیتے ہیں اور انسان چور نہ ہوتے ہوئے بھی چور بن جاتا ہے۔ یہی کیفیت اس وقت شمشیر زماں کی ہو گئی تھی۔ اوّل تو انہیں اس بات کا افسوس تھا کہ اُن کی اس حرکت پر بے چاری حسینہ نے کیا سوچا ہوگا۔ وہ نوجوان تھی، خوبصورت تھی۔ ہر لمحے اُسے اپنی عزت کا دھڑکا لگا رہتا ہوگا۔ انسان کا کیا ٹھکانہ، ذرا سی دیر میں نیت بدل جائے۔

ہرچند کہ شمشیر زماں کی نیت میں کوئی فتور نہیں تھا۔ وہ صرف انسانی ہمدردی کے تحت حسینہ پر مہربان تھے لیکن کوئی بھی لڑکی یہ تمام باتیں سوچ سکتی تھی۔ حالات ہی ایسے تھے۔ دوسری مصیبت یہ آگئی تھی... بہرحال انہوں نے خود کو سنبھالا اور مسکرا کر بولے۔

"کیا خوب بھئی! یہ عورت بھی انوکھی چیز ہے۔ اسے سمجھنا بے حد مشکل کام ہے۔ یہ حسینہ بی بی، آپ کا لباس کیسے پہنے ہوئے ہیں، بیگم؟"

"جو ابتدا کچھ دن کے بعد ہونے والی تھی، وہ میں نے کچھ پہلے کر دی ہے" بیگم صاحبہ نے جواب دیا۔

"کیا مطلب؟ سمجھے نہیں، ہم۔"

"اتنے معصوم بھی نہیں ہیں۔ جو آپ کے دل میں ہے، اُسے بھی نہیں سمجھ سکتے... میں جانتی ہوں، کچھ عرصے کے بعد یہ لباس، زیورات، کوٹھی اور دوسری چیزیں حسینہ کی ملکیت ہوں گی۔ میں آہستہ آہستہ اس کی ملکیت اس کے حوالے کرتی جا رہی ہوں۔ یہ لباس اس کی ابتدا ہے۔"

"اوہ! مجھے یقین تھا، ان فضول باتوں کے علاوہ، آپ سے اور کیا توقع رکھی جا سکتی ہے۔"

"زبان سنبھال کے شمشیر زماں صاحب! میں کسی فقیر کی بیٹی نہیں ہوں۔ یہ پبلک مقام ہے، آپ سے ہٹ کر۔"

"بھئی! عید کے دن تو آپ اپنے تیور بدل لیں۔ یہ تو اچھی بات نہیں... وقت بڑی غلط فہمی ہو گئی ہے۔ میں تو حسینہ کا مجرم بن گیا ہوں۔ حسینہ! تم بیگم کے کپڑے پہنے ہوئے ہو۔ تمہاری پشت میری طرف... لئے مجھے غلط فہمی ہو گئی۔ محسوس نہ کرنا، اس بات کو۔ اور آپ... ئیے۔ آپ سے ذرا تنہائی میں گفتگو ہوگی۔"

"ہائے، افسوس! کیا بے چارگی ہے۔ اس وقت تنہائی میں تو نہ جانے کیا کچھ ہونے والا تھا لیکن بُرے وقت کو کیا کیا جائے۔ یہ پھول تو قبول کر لیں جو آپ کو پیش کئے جا رہے تھے۔"

"حسینہ! تم نے اس سے قبل بھی ذہنی مریض دیکھے ہوں گے۔ اس بیمار عورت کی باتوں پر توجہ نہ دینا... آؤ۔" شمشیر زماں نے دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔ اور بیگم آگ بگولہ ہو کر باہر نکل آئیں۔

"کچھ اور تسلیاں دے لیں۔ میں چلی جاتی ہوں۔ فرصت مل جائے تو آجائیے گا۔ میرا کیا ہے، میں تو پرانی ہو چکی ہوں۔"

"آؤ..." شمشیر زماں کرخت لہجے میں بولے۔ زندگی میں پہلی بار انہوں نے یہ اجنبی لہجہ اختیار کیا تھا۔ بیگم صاحبہ اُن کے ساتھ دوسرے کمرے میں آگئیں۔

"سنو، بیگم! اس بات پر یقین کر لو کہ میں نے تمہارے لباس میں دیکھ کر دھوکا کھا گیا تھا۔ میں، اس سے بھی شرمندہ ہوں کہ نہ جانے اس نے کیا سوچا ہوگا... اس کے علاوہ مجھے، آپ سے شکایت ہے کہ آپ کو اس کے بارے میں ایسی باتیں نہیں کرنا چاہئیں تھیں۔"

"شمشیر زماں صاحب! میں بے وقوف نہیں ہوں۔ میں بہت دور تک دیکھ رہی ہوں۔ یہ کھیل گھر سے باہر ہی رہتا تو اچھا تھا۔ اب آپ کی ہمت بڑھ گئی ہے لیکن..."

"لیکن یہ کہ اب آپ کو خاموش ہو جانا چاہئے... مردوں پر غور نہیں کیا، آپ نے۔ جو کھیل نہ کبھی گھر سے باہر تھا اور نہ اب گھر کے اندر ہے، شروع بھی ہو سکتا ہے اور جو کچھ ہوگا، آپ کے اُکسانے پر ہوگا۔"

"دھمکی دے رہے ہیں، مجھے؟"

"جی ہاں۔ یہی سمجھ لیں۔"

"ٹھیک ہے، دیکھ لوں گی۔ ناک چوٹی کاٹ کر باہر نہ نکالوں تو رفاقت علی خان کی بیٹی نہیں۔"

"کس کی ناک چوٹی کاٹیں گی، آپ؟"

"اسی مُردار حسینہ کی۔ دیکھتی ہوں کیسے رہتی ہے، اب وہ، اس گھر میں۔" بیگم صاحبہ کی آنکھوں سے شعلے برس رہے تھے لیکن اس وقت شمشیر زماں کی کیفیت بھی کچھ غلط ہو گئی تھی۔ انہوں نے گہری سنجیدگی سے بیگم صاحبہ کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"سنو، رفاقت علی خان کی صاحبزادی! حسینہ کو اگر اس گھر میں کوئی تکلیف پہنچی تو آپ تصور بھی نہیں کر سکتیں کہ کیا ہو جائے گا۔ آخری بار اور صرف آخری بار آپ سے عرض کر رہا ہوں کہ اس لڑکی سے میرا صرف انسانیت کا رشتہ ہے، اس کے علاوہ اور کوئی بات نہیں ہے... وہ مظلوم ہے اور مظلوم کی دلداری کرنا انسانی فرض ہے۔ اگر وہ اس قدر... بے بس اور بے سہارا نہ ہوتی تو شاید میں آپ کی خاطر اس سے معذرت کر لیتا اور اُسے یہاں سے ہٹا دیتا۔ لیکن ان حالات میں آپ کی محبت کے علاوہ بھی کچھ فرائض مجھ پر عائد ہوتے ہیں، جن کے تحت میں اس گھر میں اس کا محافظ ہوں... اور جب میں اس کا محافظ ہوں تو مجھے اس حیثیت کے اظہار کی جرأت بھی کرنا ہوگی۔ آپ ناک چوٹی کاٹنے کی بات کر رہی ہیں، اگر اس کی انگلی کو بھی تکلیف پہنچی تو یہ گھر قائم نہ رہ سکے گا، کھنڈرات

میں بدل جائے گا۔ آگ کے تمام شعلے بلند ہوں گے یہاں سے... اور اس کے بعد، بیگم صاحبہ! یہ گھر کبھی آباد نہ ہو سکے گا۔ اس بات کو آپ میرا آخری فیصلہ سمجھیں اور اس کے بعد میں اس موضوع پر آپ سے مزید کوئی بات نہیں کروں گا۔" شمشیر زماں خان نے ٹھوس اور سرد لہجے میں کہا۔

بیگم صاحبہ نے شمشیر زماں کے لہجے کی سنجیدگی محسوس کی اور متعجب رہ گئیں۔ شمشیر زماں ٹھنڈی طبیعت کے شکاری آدمی تھے۔ سختی یا بدمزاجی اُن کی فطرت میں نہ تھی۔ کبھی تیز لہجے میں بات نہیں کی تھی۔ ہر بات پر ہاں میں ہاں ملاتے چلے آئے تھے۔ یہ پہلا اختلاف تھا جو انہوں نے... اتنی شدت سے کیا تھا۔ بیگم صاحبہ متحیرانہ انداز میں اُن کی شکل دیکھنے لگیں پھر اُن کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

"اور آپ یہ سب کچھ آپ اس کے لئے کریں گے؟"

"جی ہاں، صرف حسینہ کے لئے۔" شمشیر زماں نے جواب دیا اور تیزی سے باہر نکل گئے۔

بیگم صاحبہ تھوڑی دیر تو دروازے کی طرف دیکھتی رہیں پھر اُن کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے۔

اس کے بعد عید کا تیسرا دن انہوں نے پلنگ پر روتے ہوئے گزارا تھا۔ سب لوگوں کو معلوم ہو گیا تھا کہ بیگم صاحبہ کا مزاج درست نہیں ہے اس لئے عید کی خوشیوں میں گڑبڑ ہو گئی تھی۔

تاہم نوجوان اپنے طور پر تفریحات میں مشغول تھے۔ شمشیر زماں اپنے ایک دوست کے ہاں چلے گئے تھے۔ انہیں واقعی بیگم پر غصہ آ گیا تھا ہر چند کہ وہ آج تک بیگم سے خوفزدہ رہنے کی اداکاری کرتے رہے تھے لیکن... یہ اداکاری صرف اس لئے تھی کہ گھر میں کوئی بدمزگی نہ پیدا ہونے پائے۔ کوئی خاص اختلاف بھی نہیں تھا انہیں بیگم صاحبہ سے۔

وہ اُن کے تنک کو محبت سمجھتے تھے۔ ظاہر ہے اگر کوئی کسی کے لئے مضطرب ہو تو یہ اضطراب اُس کی محبت کا نتیجہ ہی ہوتا ہے اس لئے انہوں نے کبھی اس پر غور نہیں کیا تھا لیکن آج صورتِ حال مختلف تھی۔

حسینہ بے چاری تو اب ایک بچے کی ماں بھی بن گئی تھی۔ خوبصورت کومل سا بچہ جس کا حقیقی باپ نہ جانے کون تھا۔ کہیں بھی اُس کا کوئی ٹھکانہ نکل آتا تو شمشیر زماں اُسے وہاں پہنچانے میں دریغ نہ کرتے۔ وہ اپنے گھر میں بدمزگی نہیں چاہتے تھے لیکن اب انسانیت سے اتنی دور بھی نہیں جا سکتے تھے کہ حسینہ کو در در کی ٹھوکریں کھانے کے لئے چھوڑ دیتے۔

چنانچہ انہوں نے آخری فیصلہ کر لیا تھا کہ حسینہ عزت و احترام کے ساتھ اس گھر میں رہے گی۔ اور بالآخر وہ دن بھی آ ہی جائے گا جب بیگم صاحبہ کی بدگمانی خود بخود دور ہو جائے گی۔ البتہ اس دن کے انتظار کے لئے انہیں سختی سے کام لینا تھا ورنہ حسینہ مصیبت میں گرفتار ہو جاتی۔

بیگم صاحبہ کا خیال تھا کہ اُن کی اس ہنگامہ آرائی سے حالات درست ہو جائیں گے۔ شمشیر زماں صاحب بالآخر اُن کے پاس آ کر اُن سے معذرت کریں گے اور کہیں گے۔

"ٹھیک ہے بی بی! میں نکالے دیتا ہوں، اس بدبخت کو۔ تم پناول میلا نہ کرو۔" لیکن رات کو بھی شمشیر زماں، اُن کے پاس نہ آئے۔

صبح کو اُن کا پارہ اور چڑھا ہوا تھا۔ ملازم کو گھر بھیج کر کر رفاقت علی خان صاحب کو بلا لائے۔ دوپہر کو بارہ بجے تک رفاقت علی خان صاحب پہنچ گئے۔ شمشیر زماں گھر میں موجود تھے۔ دوست احباب، ملنے جلنے والے آ رہے تھے۔ اُن کی خاطر تواضع ہو رہی تھی۔

عید کا دوسرا دن تھا۔ سسر سے بھی بڑے تپاک سے گلے ملے اور معذرت کی کہ اُن کے پاس نہ پہنچ سکے۔ بہرصورت رفاقت علی خان بیگم صاحبہ سے ملے، شکایتیں سنیں۔ شمشیر زماں جانتے تھے کہ اس کے بعد اُن کی طلبی ہو گی۔

رفاقت علی خان صاحب نے حسینہ کو دیکھا۔ بڑی خوبصورت معلوم ہوئی وہ انہیں۔ ساری صورتِ حال معلوم کی اور پھر نہایت حلیمی سے داماد سے مخاطب ہوئے۔

"کیا سلسلہ ہے شمشیر میاں؟ یہ اس لڑکی کو غلط فہمی کیسے ہو گئی؟"

"بس، ابا میاں! آپ انہیں سمجھا دیں میں نے انہیں تمام صورتِ حال بتا دی ہے۔ حسینہ ایک مظلوم لڑکی ہے۔ میں، آپ کو بھی دعوت دیتا ہوں کہ اس کے بارے میں معلومات کریں۔ اگر اس کے ورثاء کا کوئی پتہ چل جائے تو مجھے اس سے زیادہ مسرت کسی اور بات پر نہیں ہو گی کہ اسے ان لوگوں میں پہنچا دوں... لیکن بات اگر صرف غلط فہمی کی ہے تو آپ خود سوچیں۔ انسانیت سے گری ہوئی یہ حرکت میں کبھی نہیں کر سکتا۔"

"لعنت ہے اس لڑکی پر۔" رفاقت علی خان صاحب نے اپنی بیٹی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "اگر یہ صورتِ حال ہے تو پھر تم کیوں اس بے چاری کے پیچھے پڑی ہوئی ہو۔ خدانخواستہ اسے کوئی نقصان پہنچا، مجھ سے برا کوئی نہ ہو گا... ٹھیک ہے، شمشیر میاں! اس کی پرورش کرو۔ اللہ تعالیٰ ایسے کاموں کا اجر دیتا ہے۔ مجھے بھی اپنی قبر میں جانا ہے۔ بیٹی کے لئے غلط بات نہیں کہوں گا۔ مجھے اس کے بارے میں تفصیلات بتاؤ میں اپنے آدمیوں سے اس کے بارے میں معلومات حاصل کراؤں گا۔"

پھر شمشیر زماں نے حسینہ کے بارے میں مکمل تفصیلات اپنے سسر کے گوش گزار کر دیں۔

رفاقت علی خان صاحب آخری بار بیٹی کو ڈانٹ ڈپٹ کر کے واپس چلے گئے... اور اب بیگم صاحبہ تنہا رہ گئی تھیں، ایک باپ کا سہارا

تھا سو وہ بھی ختم ہو گیا تھا۔ چنانچہ انہوں نے اسی پر اکتفا کی کہ حسینہ کے معاملے میں خاموشی اختیار کر لی۔

شمشیر زماں خود بھی زیادہ مطمئن نہیں تھے۔ جانتے تھے کہ بیگم صاحب عورت ہیں اور عورت جب عورت کی مخالفت پر اتر آتی ہے تو پھر دنیا کا ہر حربہ استعمال کرتی ہے۔ بیچاری حسینہ، اُن کی کون سی سازش... برداشت کر سکتی ہے۔

وہ چاہتے تو حسینہ کو دوسری جگہ لے کر بھی رکھ سکتے تھے لیکن اس طرح شبہات یقین میں بدل جاتے اور دوسرے لوگ بھی یہی سمجھتے کہ حسینہ ایک داشتہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ شمشیر زماں نے نیکی کا کام کیا تھا اور وہ نہیں چاہتے تھے کہ اس نیکی پر کوئی بھی گندگی نظر آئے۔ چنانچہ انہوں نے دل میں یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ ہر طرح سے حسینہ کا تحفظ کریں گے۔

▼ ▼

حسام احمد کو رات کی باتیں خواب کی طرح یاد رہ گئی تھیں... غسل خانے سے نکلے تو انہیں ایک دم رات کا واقعہ یاد آیا اور وہ چونک پڑے۔ ذہن پر زور دیا تو یاد آیا کہ رات کی باتیں خواب نہیں حقیقت تھیں۔ دوڑے دوڑے اُس کمرے میں گئے جہاں اس نوجوان کو سُلا آئے تھے۔ دیکھا تو وہ نیکر اور بنیان پہنے ورزش کر رہا تھا... وہ اندر داخل ہو گئے اور پسندیدہ نگاہوں سے اُس کے ورزشی بدن کو دیکھنے لگے۔ ورزش کرتے کرتے علی ظفر نے انہیں دیکھا اور سیدھا ہو گیا۔

"نہ... نہ... میاں! اپنے کام میں مصروف رہو۔ ہم بھی جب جوان تھے تو بڑی جان بنا رکھی تھی، ہم نے... لیکن بس حالات... انسان جب بڑھاپے کی جانب مائل ہو جائے تو اُس کے قویٰ خود بہ خود اپنی اوقات میں آجاتے ہیں۔ ہر چند کہ ہم اب بھی ہلکی پھلکی ورزش کر لیتے ہیں لیکن وہ جوانی کی سی بات کہاں... ماشاءاللہ تم نے اچھا بدن بنایا ہوا ہے۔"

"شکریہ، جناب!" علی ظفر نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"بہت عرصے سے ورزش کر رہے ہو، شاید؟"

"جی ہاں۔ یہ میرا بچپن کا اصول ہے۔"

"بڑے با اصول آدمی معلوم ہوتے ہو اور بے حد پھرتیلے بھی۔ رات کے واقعات یاد کرتا ہوں تو بڑی حیرت ہوتی ہے اور ابھی تک تمہاری اس دلچسپ شرارت پر ہنسی آتی ہے۔ ملازمت حاصل کرنے کا... یہ انوکھا طریقہ آج تک کسی نے نہ استعمال کیا ہوگا۔"

"جنابِ عالی! آپ کا خادم ہوں۔ آپ میری عزت افزائی فرما رہے ہیں، اس کا شکریہ!"

"دیکھو، میاں! میں کہہ چکا ہوں کہ ان فضول باتوں سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ تم ابھی تک جنابِ والا اور جنابِ عالی کی رٹ لگائے ہوئے ہو۔ چلو، نہا دھو کر ناشتے کی میز پر پہنچ جاؤ۔ میں ایک ملازم کو بھیجے دیتا ہوں، وہ تمہیں ناشتے کے کمرے میں لے آئے گا۔ ٹھیک ساڑھے آٹھ بجے ناشتہ لگ جاتا ہے اور اس وقت تمہیں ناشتے کی میز پر ہونا چاہیئے۔"

"مم... مگر، جناب... میرا مطلب ہے، دادا میاں..."

"ہاں، اب آئے نا، لائن پر... کہو، کیا کہہ رہے تھے، دادا میاں سے؟"

"میرا مطلب ہے، دادا میاں ہیں بہرطور ملازم ہوں اور ملازم ناشتے کی میز پر نہیں بیٹھتے۔"

"ٹھیک ہے، میاں! مگر ملازمت کی نوعیت ہوتی ہے۔ تم پڑھے لکھے آدمی ہو اور ایک ایسے کام پر آئے ہو جو بڑا باقاعدہ اور باعزت کام ہے۔ چنانچہ تمہاری حیثیت کسی طور بھی کم نہیں ہے... اور پھر اس حویلی میں ابھی میں ہوں۔ ہر چند کہ یہاں موجود لوگوں کے دماغ بگڑے ہوئے ہیں لیکن بہر صورت میں نے کچھ اصول ضرور اپنا رکھے ہیں اور ان اصولوں میں ایک اصول یہ بھی ہے کہ ملازم بھی انسان ہوتے ہیں... اور اس حویلی میں رہنے والوں کے لئے یہ میرا حکم ہے کہ ملازموں کو انسان سمجھا جائے اور ابھی تک تو بھائی میری ہدایت پر عمل ہو رہا ہے۔ آگے اللہ مالک ہے۔ چنانچہ تم فوراً آجاؤ۔"

حسام صاحب کہہ کر باہر نکل گئے اور علی ظفر کھڑا سوچتا رہا۔ پھر اُس کے ہونٹوں پر ایک تلخ مُسکراہٹ پھیل گئی۔ "تعجب ہے.... حسام احمد صاحب! واقعی تعجب ہے!"

اس کے بعد وہ ورزش ترک کر کے باتھ روم میں چلا گیا اور تھوڑی دیر بعد ایک ملازم کے ساتھ، ناشتے کے کمرے میں پہنچ گیا۔

طویل و عریض میز لگی ہوئی تھی جس پر تقریباً پندرہ افراد بیٹھے ہوئے تھے۔ چار ملازم ناشتے کے لئے پلیٹیں وغیرہ لگا رہے تھے۔

ناشتے کے کمرے میں موجود لوگوں نے اُسے حیرت آمیز نگاہوں سے دیکھا۔ اسی وقت حسام احمد صاحب کھڑے ہو گئے۔

"ان سے ملو۔ یہ زاہد ذوالفقار زیدی ہیں۔ میرے دستِ راست اب یہ ہمارے ساتھ ہی رہیں گے۔" حسام احمد صاحب نے کہا... اور لڑکوں اور لڑکیوں کے ہونٹوں پر مُسکراہٹ پھیل گئی۔ سب نے نوجوان زاہد ذوالفقار زیدی کو پسندیدہ نگاہوں سے دیکھا۔

"بھئی، زاہد میاں! ان سب سے تعارف اُدھار رہا۔ گرم گرم ناشتہ میز پر آچکا ہے۔ چنانچہ پہلے ہم اس ناشتے سے تعارف حاصل کریں گے۔ اس کے بعد یہ رسم پوری کی جائے گی۔ ارے ہاں، شجاع نہیں آیا، ابھی تک۔ جاؤ، اُسے بُلا کر لاؤ۔ ہمیشہ دیر سے پہنچتا ہے۔"

حسام احمد صاحب نے بیٹے کے بارے میں کہا... اسی وقت

شجاع احمد صاحب، ڈائننگ رُوم میں داخل ہُوئے تھے۔
وہ سلام کرکے اپنی کُرسی کی جانب بڑھ گئے ... کُرسی کھینچ کر بیٹھے تو اُنہیں احساس ہُوا کہ روزمرّہ کے معمول سے ایک فرد بڑھا ہُوا ہے۔ اُنہوں نے چونک کر اس شخص کی شکل دیکھی لیکن دوسرے ہی لمحے اچھل پڑے۔
"تت ... تم ... تم ..." اُن کے حلق سے عجیب سی آواز نکلی ... علی ظفر بھی اُنہیں دیکھ کر متحیّر رہ گیا تھا لیکن دوسرے ہی لمحے اُس نے اپنا چہرہ پُرسکون کر لیا تھا۔
"کیوں، جانتے ہو انہیں؟" حسام احمد صاحب نے شجاع احمد سے پوچھا۔
"جی ہاں، اچھی طرح۔" شجاع احمد صاحب ہونٹ بھینچ کر بولے "کیسے ... ؟"
"اس کا جواب تو آپ ہی دیں گے کہ میاں سے تعارف نہیں ہُوا ... ہیں یہ، ابا میاں؟"
"بس بھئی، تم اسے میرا سیکریٹری سمجھو۔"
"سیکریٹری ...؟" شجاع احمد صاحب نے عجیب سے لہجے میں پوچھا۔
"ہاں، سیکریٹری ... انتہائی قابلِ عزّت اور پُراسرار شخصیت ہے میں اسے گھر کے ایک فرد ہی کی حیثیت دینا چاہتا ہُوں۔"
"لیکن، ابا میاں سیکریٹری ..." شجاع احمد صاحب کچھ کہتے کہتے رُک گئے۔
"ہاں، ہاں کہو کچھ کہہ رہے تھے تم۔"
"ملازم رکھا آپ نے انہیں، ابا میاں؟"
"نہیں، رکھ لیا ہے۔" حسام احمد صاحب نے جواب دیا اور مُسکرا پڑے۔
"خیر، تو کیا بات کو آپ نے انٹرویو لیا تھا ان کا؟"
"انہوں نے خود دے دیا تھا اور نہایت کامیاب رہے ... بہرطور، مزید بات میں جانے کی ضرورت نہیں۔ ناشتہ ٹھنڈا ہو رہا ہے۔"
ناشتے کے دوران بھی شجاع احمد صاحب بار بار علی ظفر کو دیکھتے رہے لیکن وہ گردن جُھکائے بڑے اطمینان سے ناشتہ کرنے میں مصروف تھا۔ شجاع احمد صاحب کے چہرے پر تشویش کے سائے پھیل گئے تھے۔ ناشتے سے فارغ ہوکر اُنہوں نے حسام احمد صاحب سے درخواست کی۔
"ابا میاں، ہم آپ سے کچھ باتیں کرنا چاہتے ہیں۔"
"ہاں، ہاں، کرو۔ ایسی کون سی مشکل پیش آگئی ہے۔"
"وہ، ابا میاں، ذرا تنہائی میں ..."
"اچھا، آؤ، ادھر چلو۔" حسام احمد صاحب نے کہا اور کمرے سے نکل کر راہداری میں آگئے اور بالکونی میں کھڑے ہوکر اُنہوں نے شجاع صاحب سے کہا۔
"ہاں، کہو، کیا بات ہے صاحبزادے؟"
"اوہ ... ابا میاں! میرا مطلب ہے یہ شخص ... یہ لڑکا کچھ زیادہ بہتر معلوم نہیں ہوتا۔"
"کیوں ... کیا خرابی ہے اس میں؟"
"بس، ابا میاں! یہ ضرورت سے زیادہ چالاک اور خود اعتماد ہے۔ میری اس سے ٹرین میں ملاقات ہُوئی تھی۔ خاصی بدتمیزی کی تھی، اس نے، میرا مطلب ہے، انسانوں کا احترام کرنا نہیں جانتا۔"
"اچھا، اس بدتمیزی کی نوعیت کیا تھی؟"
حسام احمد صاحب نے پُوچھا تو شجاع احمد نے اُنہیں سفر کی ساری تفصیل بتا دی۔
"اچھا، اس کے علاوہ بھی کوئی اور بدتمیزی کی تھی یا صرف یہی؟"
"آپ تصوّر کریں، ابا میاں! ایسا آدمی کبھی اپنے مالکان کی عزّت نہیں کر سکتا۔ یہ ان لوگوں میں سے ہے جو ضرورت سے زیادہ خود اعتماد ہوتے ہیں اور دوسروں پر اپنی رائے مسلّط کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ صاحبزادے کے پاس صرف فرسٹ کلاس کے ٹکٹ کے پیسے تھے، ٹکٹ لے کر بیٹھ گئے۔ باقی نہ اوڑھنے کو کچھ تھا، نہ بچھانے کو، نہ کھانے کو کچھ تھا اور نہ پینے کو۔ آپ جانتے ہیں، ایسے آدمی زیادہ بہتر نہیں ہوتے۔"
"جی نہیں۔ ایسے آدمی زیادہ بہتر ہوتے ہیں۔"
"اس کا مطلب ہے کہ آپ، اُسے ملازم رکھیں گے؟" شجاع احمد نے پوچھا۔
"ہاں۔ مجھے وہ پسند ہے اور میں فیصلہ کرچکا ہُوں بلکہ اُسے زبان دے چکا ہُوں۔ میں چاہتا ہُوں کہ اُس کی وہی عزّت کی جائے جو عام افراد کی ہے سمجھے؟"
"جی، ابا میاں!" شجاع احمد صاحب نے مُردہ سے لہجے میں کہا۔ وہ، حسام احمد صاحب کو اچھی طرح جانتے تھے۔ آج بھی اُنہیں یہی خطرہ رہتا تھا کہ کہیں پاؤں سے جُوتی نکل کر ان کے سر پر نہ پڑ جائے۔
حسام احمد صاحب ذرا کچھ تیز مزاج بھی تھے اور اپنی مخالفت ... برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ چنانچہ وہ خاموش ہو گئے لیکن اُنہوں نے دل میں تہیّہ کر لیا تھا کہ اس نوجوان پر نظر رکھیں گے۔ ابا میاں تو اب بُوڑھے ہو چکے ہیں۔ انہیں بس اپنی تفریحات سے مطلب ہے۔ باقی کسی سلسلے میں نہ غور کرتے ہیں اور نہ اس کے بارے میں سوچتے ہیں۔
باہر لان پر نوجوانوں کا اجتماع تھا اور حسام احمد صاحب سب سے ناہد ذوالفقار زیدی کا تعارف کرا رہے تھے۔ شجاع احمد صاحب کی دونوں لڑکیوں اور تینوں لڑکوں نے اُسے خوش آمدید کہا اور اُس کے بارے

اِس طرح طرح کے سوالات کرنے لگے۔

علی ظفر نے نہایت شستہ، صاف ستھرے اور مناسب الفاظ میں تمام سوالات کے جواب دیئے۔ لڑکیوں نے حسام احمد صاحب کو مبارکباد دی کہ اُن کا مسئلہ حل ہوگیا... اور حسام احمد صاحب اُن کا شکریہ ادا کرکے، علی ظفر کو ساتھ لے کر چل پڑے۔

"ہاں، میاں، میرے پاس کچھ کتابیں ہیں۔ یہ وہ تمہارے سپرد کرتا ہوں۔ اب تم اپنا کام شروع کردو۔ کتنا کام کرلوگے، ایک دن میں؟"

"زیادہ سے زیادہ، دادا جان! آپ فکر نہ کریں۔" علی ظفر نے جواب دیا اور حسام احمد صاحب خوش ہوگئے۔

دس، بارہ ناولوں میں سے ایک ناول منتخب کیا گیا اور علی ظفر اُس کا ترجمہ کرنے بیٹھ گیا۔ درحقیقت اسے ترجمہ کرنے میں کمال حاصل تھا... اتنے خوبصورت انداز میں اُس نے ترجمہ کیا کہ حسام احمد صاحب کی باچھیں کھل گئیں۔ اُنہوں نے علی ظفر کو گلے لگالیا۔

"واہ... میاں، واہ! مزا آگیا۔ یوں سمجھو، میری تو ساری مشکلات حل ہوگئیں!"

"ابھی کہاں جناب! انسان کی زندگی میں تجسس اور مہم جوئی کے علاوہ ہوتا ہی کیا ہے۔ ہم صرف تحریروں سے اپنا کام نکال لیتے ہیں... حالانکہ تحریریں صرف ذہن کی اختراع ہوتی ہیں۔ ہماری تجسس پسندی محدود نہیں ہونی چاہیئے۔ جو چیزیں ہماری فطرت کے اس جزو سے تعلق رکھتی ہیں جو تجسس پسند ہے۔ ان کی تفصیلات اس وقت تک صحیح طور پر سامنے نہیں آسکتیں جب تک ان میں ڈوب کر نہ دیکھا جائے... میں تو کچھ اور ہی سوچ رہا ہوں۔"

"کیا... کیا...؟" حسام احمد صاحب دلچسپی سے بولے۔

"آپ صرف کتابوں کی دُنیا تک محدود نہ رہیں۔ یہ قصے اور کہانیاں دلچسپ ضرور ہوتے ہیں لیکن ایک کمرے میں بستر پر لیٹ کر ہم مہم جوئی کی اس لذت کو نظرانداز نہیں کرسکتے جو ہم خود اپنی ذات کو اس میں شامل کرکے محسوس کرسکتے ہیں۔"

"واہ! کیا بات کہی ہے... گویا کیا مطلب ہے، تمہارا؟"

"مطلب یہی ہے حسام احمد صاحب! کہ صرف کتابوں کی سڑک پر نہ دوڑتے رہیں۔ سڑکیں تو بہت کشادہ ہیں۔ آپ کا کیا خیال ہے، کیا ہمارے ہاں جرائم نہیں ہوتے۔ چھوٹے، بڑے سینکڑوں جرائم روزانہ ہوتے ہیں۔ ہم صرف اپنے خیالی جاسوسوں کو اُن مسائل کا حل دریافت کرتے ہوئے دیکھتے ہیں اور ایک مصنف اس بارے میں جو کچھ بھی لکھ دیتا ہے، اُسی پر قناعت کر لیتے ہیں۔ میرے خیال میں یہ غلط بات ہے۔ ہم سڑکوں پر نکل کر ان حالات کو خود اپنی آنکھوں سے دیکھیں تو ہمیں زیادہ مزا آئے گا۔ لوگوں کے مسائل حل کرنے کے لئے آخر ہم بھی تو کام کرسکتے ہیں۔ میں ہوں، آپ ہیں۔ نہ میں کمزور ہوں، نہ آپ۔ کیا خیال ہے، بنائیں کوئی پروگرام؟"

"اوہو... تمہارا مطلب ہے کہ ہم... یعنی ہم... ہم خود اپنے آپ پر ان کہانیوں کو آزمائیں؟"

"بے شک! اس کے بغیر کہانی کا صحیح لطف مل ہی نہیں سکتا۔"

"میاں! بات تو بڑے مزے کی کہی ہے، تم نے... مگر یہ کیسے ممکن ہے اور پھر میں تو بوڑھا آدمی ہوں۔ تم تو اپنا کام چلالوگے لیکن میں کیا کروں گا؟"

"نہیں حسام احمد صاحب! وفاداری کا یہ تقاضا نہیں ہے کہ اگر آپ میں کوئی کمی ہے تو میں اس کمی کو کمی سمجھ کر مجبوراً قبول کرلوں۔ ہرگز نہیں آپ کی وہ کمی میں پوری کروں گا۔ آپ نے بہت عرصے پہلے ٹیلی وژن پر چلنے والی ایک سیریز آئرن سائڈ نہیں دیکھی تھی شاید... اس میں ایک معذور شخص کرسی پر بیٹھ کر کیا کیا کارنامے انجام دیتا ہے۔ آپ تو معذور نہیں ہیں چلتے پھرتے تندرست و توانا آدمی ہیں، آپ وہ سب کچھ کرسکتے ہیں جس کی ہمیں ضرورت ہوگی۔"

"واقعی، ہاں، واقعی! واللہ تم نے تو دل خوش کردیا۔ یقیناً تمہاری کون کون سی صفت کی تعریف کی جائے لیکن برخوردار! بڑی احتیاط رکھنی ہوگی کسی ایسے ویسے چکر میں پھنسنا اچھا نہیں لگے گا۔ ہمارا تعلق ایک اچھے خاصے خاندان سے ہے جس کی نیک نامی اور شہرت دُور، دُور تک ہے۔ اس میں کوئی بٹہ نہیں لگنا چاہیئے۔"

"توبہ، توبہ۔ میں یہ ہونے دوں گا؟" علی ظفر نے بڑے اعتماد سے کہا۔

"مجھے یقین ہے کہ تم نہیں ہونے دوگے۔ بہرکیف فیصلہ تم ہی کروگے کہ ہمیں کیا کرنا ہے۔"

"ہم جاسوس بنیں گے دادا جان! اور ایسے جاسوس کہ مزہ ہی آجائے گا۔ پولیس حیران رہ جائے گی کہ وہ کون تھا جس نے اتنا بڑا مسئلہ چٹکی بجاتے حل کردیا۔ اس کے لئے ہمیں ایک باقاعدہ نظام ترتیب دینا ہوگا۔ آپ بالکل مطمئن رہیں، میں آپ کو وہ بہترین ماحول مہیا کروں گا کہ آپ سوچ بھی نہیں سکتے۔"

"مجھے یقین ہے میاں! مجھے یقین ہے۔" حسام احمد صاحب خوشی سے کھلے پڑ رہے تھے اور علی ظفر کے ہونٹوں پر طنزیہ سی مسکراہٹ پھیلتی جارہی تھی۔

▼ ▼ ▼

بیگم صاحبہ کُتّے کی دُم تھیں۔ کسی طرح سیدھی ہونے کا نام ہی نہیں لیتی تھیں۔ اُس ایک واقعے کے بعد سے آج تک کوئی دوسرا واقعہ نہیں ہُوا ہُوا تھا لیکن اُن کا خیال تھا کہ احتیاط برتی جارہی ہے۔ راتوں کو جاگ جاگ کر چور پکڑنے کی کوشش کرتی تھیں لیکن چور ہوتا تو پکڑا جاتا۔

کئی سال گزر چکے تھے لیکن بیگم صاحبہ کی نفرت میں کوئی کمی نہیں ہوئی تھی۔ ان کی نگاہ میں گھر کی سب سے بدترین ہستی حسینہ تھی۔ دوسرے نمبر پر اس کا بیٹا علی تھا جو اب چار سال کا ہو چکا تھا۔ تندرست گول مٹول بچہ بے حد دلکش خدوخال کا مالک تھا۔ سب ہی اس سے پیار کرتے تھے سوائے بیگم صاحبہ کے۔ وہ ہمیشہ اُسے نفرت کی نگاہ سے دیکھتی تھیں اور کبھی اُسے منہ نہیں لگاتی تھیں۔

لیکن شمشیر زماں نے علی کے بارے میں کچھ اور سختی اختیار کرلی تھی۔ بیوی سے اچھی طرح واقف تھے۔ ان چار سالوں میں انہوں نے حسینہ کے ساتھ جو سلوک روا رکھا تھا، اس سے انہیں بہت دُکھ ہوتا تھا... لیکن حسینہ بے چاری نے یہ سب کچھ ہنسی خوشی برداشت کیا تھا۔ اس لئے بات برابر ہوگئی تھی ورنہ شاید شمشیر زماں کو کچھ اور پریشانیاں اُٹھانا پڑتیں۔

جب علی کو اسکول بھیجا گیا تو بیگم صاحبہ کی نفرت عود کر آئی۔ انہوں نے اس سلسلے میں شدید احتجاج کیا۔ "یہ اسی اسکول میں پڑھے گا جس میں ہمارے بچے پڑھتے ہیں؟"

"ہاں۔ کوئی حرج ہے؟"

"کیا آپ، مالک اور نوکر کا فرق ختم کرنا چاہتے ہیں؟"

"علی، نوکر نہیں ہے۔"

"اس کی ماں تو ہے۔"

"وہ بھی نوکر نہیں رکھی گئی۔ کون سی تنخواہ ملتی ہے اسے... یہ تو آپ کا شوق ہے کہ اس سے دن رات کام لیتی ہیں۔"

"بہت دل دُکھتا ہے، آپ کا؟"

"بے شک! اس خیال سے کہ نہ جانے بے چاری کس خاندان کی چشم و چراغ ہے۔ تقدیر نے اُسے ہم درندوں کے حوالے کر دیا ہے۔"

"بہرحال علی کو کسی دوسرے اسکول میں داخل کرائیں... میں یہ برداشت نہیں کر سکتی کہ وہ ہمارے بچوں کے ساتھ پڑھے۔"

"دوسرے بہت سے بچے بھی آپ کے بچوں کے ساتھ پڑھتے ہیں کیا آپ ان سب کو اسکول سے نکلوا دیں تو میں، آپ کی یہ بات مان لوں گا" شمشیر زماں نے کہا۔

"آپ پھر مجھ سے ضد کر رہے ہیں۔"

"جی ہاں۔ یہ ضد ضروری ہے کیونکہ آپ کی خواہش قطعی بیکار اور احمقانہ ہے۔"

"اس کے باوجود آپ میرے شک کو غلط قرار دیتے ہیں۔ بہت محبت ہے، آپ کو علی سے؟" بیگم صاحبہ نے طنز کیا۔

"آپ... آپ ہمیشہ سے گندی فطرت کی مالک ہیں بیگم! اپنی دانست میں، آپ مجھ پچھاڑ رہی ہیں... لیکن صورت حال مختلف رہی ہے۔ میں نے ہمیشہ طرح دی ہے، آپ کو، ہمیشہ آپ کا وقار بڑھایا ہے، اس اُمید پر کہ ممکن ہے، آپ کو اس کا احساس ہو جائے لیکن..."

"لیکن کیا...؟"

"آپ اتنی غلیظ اور گھناؤنی گفتگو کریں گی مجھے اُمید نہیں تھی۔ کیا کہنا چاہتی ہیں، آپ؟"

"صرف یہ کہ علی اس اسکول میں داخل نہیں ہوگا۔"

"کون روکے گا، اُسے... آپ!"

بیگم صاحبہ صورت حال کو بگڑتا دیکھ کر خاموش ہو گئیں۔

علی کو اسکول میں داخل کرا دیا گیا۔

لیکن گھر تو بیگم صاحبہ کا تھا۔ علی کے لئے مشکلات پیدا کر دی گئیں۔ اس کی کتابیں گم کر دی جاتیں، کاپیاں خراب کر دی جاتیں اور طرح طرح سے اُسے پریشان کیا جاتا۔ معصوم بچہ صورتیں دیکھنے کے سوا اور کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا۔

جب علی نے نو سال کی عمر میں پرائمری اسکول پاس کر لیا تو بیگم صاحبہ کے حسد کی انتہا نہ رہی۔ علی اب سمجھدار ہو گیا تھا... اور صورت حال اس کی سمجھ میں آنے لگی تھی۔

ایک دن تو وہ بپھر ہی گیا۔ اس نے کتابوں کے ڈھیر کو آگ لگا دی... بیگم صاحبہ کو اس نے اپنی کاپیاں پانی میں بھگوتے دیکھ لیا تھا۔ شمشیر زماں گھر میں موجود نہیں تھے۔ اسی وقت وہ آگئے۔ چند ملازم علی کے اردگرد کھڑے تھے۔

"ارے! یہ کیا ہو رہا ہے، علی؟" وہ جلتی ہوئی کتابوں کو حیرت سے دیکھ کر بولے۔

"میں کل سے اسکول نہیں جاؤں گا۔ گھر کے کام کیا کروں گا۔ اس لئے میں نے کتابیں جلا دیں۔"

"چلو، ٹھیک ہے۔ کتابیں جل گئیں۔ اب میرے ساتھ آؤ۔" وہ اسے لئے ہوئے اپنے کمرے میں آگئے۔ "ہاں، علی! اب بتاؤ، اسکول کیوں نہیں جاؤ گے...؟"

"اس لئے کہ رانی ماں میرا پڑھنا پسند نہیں کرتیں۔"

"کچھ کہا ہے، انہوں نے؟"

"بہت کچھ کہتی رہتی ہیں، میری کاپیاں خراب کر دیتی ہیں... آج انہوں نے میری کاپیاں پانی میں بھگو دیں۔ اسکول میں سب مجھے گندہ کہتے ہیں۔"

"گھر کا کام کرنے کی کیوں سوچی، تم نے؟"

"اس لئے کہ میں نوکر ہوں۔"

"یہ کون کہتا ہے؟"

"رانی ماں" علی نے جواب دیا۔

شمشیر زماں سوچ میں ڈوب گئے۔ بیگم صاحبہ واقعی بہت نیچ فطرت کی مالک تھیں۔ وہ، ان ماں بیٹے کی بدترین دشمن تھیں۔ "لیکن انہیں، ان کی بیعنت نہیں چڑھنا چاہیئے۔ جب میں نے ایک نیک کام کا بیڑا اُٹھایا ہے... تو اُسے پُورا کر کے ہی چھوڑوں گا۔" شمشیر زماں نے سوچا اور پھر اس رات وہ دیر تک سوچتے رہے۔

صبح ہونے سے بہت پہلے وہ جاگ گئے۔ انہیں ایک خطرناک کام کرنا تھا۔ وہ سب کی نظروں سے بچتے ہوئے حسینہ کے کمرے میں پہنچ گئے... معصوم حسینہ، علی کو بٹلائے سو رہی تھی۔ شمشیر زماں کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

'ایک ماں کی کل کائنات یہی ہے۔ میں اسے تباہ نہیں ہونے دوں گا۔'

"حسینہ! اٹھو... اُٹھو، حسینہ! مجھے تم سے کچھ باتیں کرنا ہیں۔" انہوں نے کہا۔

حسینہ ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھی لیکن شمشیر زماں کو دیکھ کر اس کی آنکھوں میں سکون کے آثار اُبھر آئے... وہ شمشیر زماں کی شرافت کو خراج تھا۔ یہ اُن کی کاوشوں کا بدل تھا۔ حالانکہ اتنے طویل عرصے میں وہ پہلی بار حسینہ کے پاس تنہا آئے تھے، اور وہ بھی بلا وقت... لیکن اُسے اُن پر اعتماد تھا۔ اُس کے دل میں کوئی شبہ نہیں پیدا ہُوا تھا۔

"شکریہ حسینہ! تم نے مجھے مالا مال کر دیا ہے۔ تمہارا یہ اعتماد میرے لئے کسی خزانے سے کم نہیں ہے۔ اُٹھو، مجھے تم سے کچھ باتیں کرنا ہیں۔" شمشیر زماں ایک مونڈھے پر بیٹھ گئے۔

حسینہ سر پر دوپٹہ برابر کر کے ان کے سامنے آ بیٹھی۔

"تمہیں علم ہے، علی نے کل اپنی کتابیں جلا دی تھیں؟" انہوں نے پوچھا تو حسینہ نے اثبات میں گردن ہلا دی۔

"علی اب سمجھدار ہو گیا ہے، حسینہ! اس طویل عرصے میں تم نے یہاں کے ماحول کا بخوبی مشاہدہ کر لیا ہے۔ تم شریف النفس اور عزت دار لڑکی تھیں جو اس ماحول میں گزارا کر لیا... اور تم نے تکلیف سے یہاں زندگی گزاری ہے اس کا مجھے بخوبی اندازہ ہے اور... میں شرمندہ بھی ہوں۔"

شمشیر زماں کی اس بات پر حسینہ نے کسی قدر پریشان نگاہوں سے ان کی طرف دیکھا اور دونوں ہاتھ ہلائے جیسے کہہ رہی ہو کہ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔

"بہرحال حسینہ! میں علی کی طرف سے متفکر ہوں اور بہت... غور و خوض کے بعد ایک فیصلہ کر کے تمہارے پاس آیا ہوں۔ علی ابھی بچہ ہے لیکن اس کے ساتھ بھی وہی سلوک ہو رہا ہے جو تمہارے ساتھ ہوتا رہا ہے لیکن علی اُن بچوں میں نہیں معلوم ہوتا جو ہر ماحول کو قبول کر لیتے ہیں۔ اس عمر ہی میں اس کے بارے میں اندازہ قائم کیا جا سکتا ہے۔ کتابیں جلا دینے کے عمل سے اس کی حسیات کا پتہ چلتا ہے۔"

حسینہ بڑی توجہ سے اُن کی باتیں سُن رہی تھی کیونکہ وہ باتیں اس کے بیٹے سے متعلق تھیں۔

"حسینہ! کیا تم علی کے شاندار مستقبل کے لئے اس کی طویل جُدائی گوارہ کر لوگی؟"

حسینہ کی حسین بادامی آنکھوں میں پھر اضطراب اُبھر آیا۔ وہ سوالیہ انداز میں شمشیر زماں کو دیکھنے لگی۔

"میں علی کو ولایت بھیجنا چاہتا ہوں۔ وہاں رہ کر وہ تعلیم حاصل کرے گا، شہزادوں کی طرح زندگی بسر کرے گا... اور علی تعلیم حاصل کرنے کے بعد وطن واپس آئے گا پھر میں بڑی خوشی سے تم ماں بیٹے کو ایک الگ گھر میں منتقل کر دوں گا۔ تم علی کی شادی کر دینا اور اس گھر میں، اُس کے اور اُس کے بچوں کے ساتھ آرام کی زندگی گزارنا... یہاں رہ کر علی کی شخصیت کچل جائے گی، حسینہ! یا تو وہ ذہنی طور پر نوکر بن کر رہ جائے گا یا پھر اُس کی نفرت خطرناک ہو جائے گی۔ تم ان باتوں کو نہیں سمجھ سکوگی حسینہ! لیکن یقین کرو۔ باہر جا کر علی مستقبل کا مالک بن جائے گا۔"

شمشیر زماں نے حسینہ کو دیکھا۔ اُس کے چہرے پر شدید کشمکش کے آثار تھے۔ وہ گہری سانس لے کر دوسری طرف مُڑ گئے۔

"بہرحال، حسینہ! میں تمہیں سوچنے کے لئے وقت دے سکتا ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ علی، تمہاری آرزوؤں کا مرکز ہے اور تمہاری خوشیوں کا واحد سہارا۔ تم اپنی اس محبت کا اظہار اُس کا مستقبل بنا کر کر سکتی ہو۔ میں تمہیں اس کے علاوہ اور کچھ نہیں دے سکا، حسینہ! علی کے اخراجات میں برداشت کروں گا۔ میں چاہتا ہوں کہ اپنی زندگی ہی میں تمہیں محفوظ مقام دے جاؤں تم اچھی طرح سوچ لو۔ میں پھر تم سے بات کروں گا۔"

شمشیر زماں اُٹھ کر دروازے کی طرف بڑھے... لیکن حسینہ جلدی سے اُن کے سامنے آ گئی۔ اُس کے چہرے پر انوکھی چمک تھی۔ اُس نے مسکرا کر گردن ہلائی اور سر جُھکا لیا۔

"کیا کہنا چاہتی ہو؟" شمشیر زماں نے بغور اُسے دیکھا... اور حسینہ زور، زور سے گردن ہلانے لگی۔

"گویا تم اُسے باہر بھیجنے کو تیار ہو؟" شمشیر زماں نے پُوچھا اور حسینہ نے اثبات میں گردن ہلا دی۔

"بہت اچھا فیصلہ کیا ہے، تم نے۔" شمشیر زماں خوش ہو گئے۔ "خُدا کی قسم! اگر تقدیر نے ساتھ دیا تو تمہارے ماضی کی ساری کمی پوری کر دوں گا۔ تو ہمارے درمیان یہ بات طے ہے۔"

حسینہ نے دوبارہ اثبات میں گردن ہلا دی۔

"اچھا، اب میرا پروگرام سنو۔ میں اپنے دوستوں کی مدد سے علی کو پہلے شہر بھجوا دوں گا اور اس کے بعد اُسے لندن بھیج دیا جائے گا لیکن گھر میں

تم مشہور کریں گے کہ علی گھر سے ناراض ہو کر چلا گیا ہے۔ تم بھی افسردہ رہنے کی اداکاری کرنا اور لوگ تم سے پوچھیں تو یہی کہنا۔ میرا مطلب ہے، یہی ظاہر کرنا کہ تمھیں اس بارے میں کچھ نہیں معلوم۔"

حسینہ نے گردن ہلا دی۔

حسینہ سے گفتگو کے بعد شمشیر زماں کو اطمینان ہو گیا۔ ان مظلوم ماں بیٹے کے لئے وہ اتنا ہی کر سکتے تھے۔ چنانچہ افضل خان کی مدد سے یہ مسئلہ حل ہو گیا۔ علی کو خاموشی سے شہر سے جایا گیا۔ شمشیر زماں نے حسینہ کے سامنے علی سے بات کی تھی۔

"علی بیٹے! سنا ہے، آپ نے اسکول جانا ترک کر دیا ہے۔"

"جی، چچا جان!"

"کیوں بیٹے؟"

"بس، چچا جان! دل نہیں لگتا پڑھنے میں۔"

"پھر کیا کرو گے؟"

"گھر کے کام کاج کروں گا جیسے امی کرتی ہیں۔"

"نہیں بیٹے! گھر کے کام کاج تو نوکر کرتے ہیں۔"

"ہم... میں بھی تو نوکر ہوں۔ امی بھی تو نوکر ہیں۔"

"نہیں بیٹے! ایسی کوئی بات نہیں۔ یہ گھر میرا ہے۔ میں جو کہتا ہوں۔ ابھی کس کی مجال ہے کہ تمھیں نوکر سمجھے... اور رہیں تمھاری امی بیٹے! تو وہ گھر کے کام کاج اس لئے کرتی ہیں کہ یہ ان کا بھی گھر ہے... بیٹے! میں چاہتا ہوں کہ آپ خوب تعلیم حاصل کریں۔ بڑے آدمی بنیں اور اپنی امی کے لئے ایک شاندار گھر بنائیں۔ آپ کو پڑھنے کا شوق ہے؟"

"ہے تو سہی... لیکن میں یہاں نہیں پڑھ سکتا۔ یہاں سب لوگ مذاق اڑاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ میں نوکر ہوں، نوکر رہوں گا۔ میں پڑھ نہیں سکتا۔"

"آپ ان لوگوں کو شرمندہ کر دیں۔ میں آپ کو ملک سے باہر بھیج رہا ہوں۔ ہوائی جہاز میں بیٹھ کر آپ لندن جائیں گے... وہاں، آپ تعلیم حاصل کریں گے۔"

علی کی معصوم آنکھوں میں خوابوں کی چمک پیدا ہو گئی تھی...

"ہوائی جہاز میں بیٹھ کر...؟"

"ہاں۔ اور تعلیم کے دوران، آپ صرف تعلیم حاصل کریں گے... بولیے۔ تیار ہیں؟"

اور علی نے خوشی سے آمادگی ظاہر کر دی۔

حسینہ ساری رات اُسے سینے سے لگائے روتی رہی لیکن بیٹے کے لئے اس نے اپنی ممتا کو دبا لیا تھا۔ یوں علی، لندن روانہ ہو گیا۔ گھر کے لئے شمشیر زماں نے ڈراما تیار کر رکھا تھا۔

پہلا دن گزرا۔ دوسرے دن انہوں نے خود علی کے بارے میں دریافت کیا۔ یہ سوال انہوں نے فضیلت خالہ سے کیا تھا۔

"پتہ نہیں، نظر نہیں آ رہا۔"

"میں نے بھی نہیں دیکھا۔ آپ جا کر معلوم کریں۔"

فضیلت خالہ چلی گئیں اور پھر دہاڑتی ہوئی واپس آئیں۔

"ہائے، شمشیر میاں! بچہ تو کل سے غائب ہے۔ بے چاری حسینہ دل پکڑے بیٹھی ہے۔"

"کہاں غائب ہے؟"

"خدا جانے۔ یوں لگتا ہے، چلا گیا ہے، گھر سے۔ بہت برا سلوک ہوتا تھا اُس کے ساتھ۔ بے چاری حسینہ بڑی بدنصیب ہے۔ ساری زندگی مصیبتوں میں گزری اور اب اولاد کا غم بھی مل گیا۔ کچھ کرو میاں! ورنہ وہ بدقسمت بے موت ماری جائے گی۔"

شمشیر میاں کے تیار کردہ ڈرامے پر عمل شروع ہو چکا تھا... لیکن ظاہر ہے کہ وہ صرف ڈراما تھا اور اس کا کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہو سکتا تھا۔

* *

اُسے اس گھر میں آئے زیادہ دن نہیں گزرے تھے لیکن وہ سب کی پسند بن گیا تھا۔ کوٹھی میں بہت سے افراد تھے۔ شجاع احمد صاحب کے تین نوجوان بیٹے اور دو بیٹیاں تو اس کے گرویدہ ہو کر رہ گئے تھے... اور حسام احمد صاحب تو اس کی مٹھی میں آ گئے تھے۔

وہ تھا بھی ہرفن مولا۔ کوئی اس کی تعلیمی حیثیت کا صحیح اندازہ نہیں لگا سکا تھا۔ ریاضی، فلسفہ، نفسیات، جغرافیہ، ہسٹری، کون سے مضمون میں وہ سمندر نہیں تھا۔ بحث کرنے پر آتا تو چھکے چھڑا دیتا تھا۔ مجال ہے مقابل اس کے سامنے کچھ بول جائے۔ سب کے لئے وہ ایک پیر کی حیثیت اختیار کر گیا تھا۔ بس ایک بیگم صاحبہ رہ گئی تھیں لیکن ایک دن، اس نے ان پر بھی ڈورے ڈال... دیے۔

شجاع احمد کروڑپتی تھے۔ بہت سے کاروبار چلتے تھے، ان کے اور بظاہر ان کی خوب آمدنی تھی لیکن معدودے چند لوگوں ہی کو علم تھا کہ ان کے چند خفیہ گودام بھی ہیں اور بلیک مارکیٹ میں احمد گروپ ایک نمایاں حیثیت رکھتا ہے۔

یہ چند دولت مند لوگوں پر مشتمل ایک گروہ تھا جو اشیائے صرف کی اہم چیزوں کی قلت پیدا کر کے، انہیں گوداموں میں محفوظ کر لیتا تھا اور پھر انتہائی مہنگے داموں انہیں مارکیٹ میں لاتا تھا۔ اس کاروبار کو جاننے والے صرف وہی لوگ تھے جو شجاع احمد صاحب کے کاروباری شریک تھے اور انہیں اپنا استاد مانتے تھے۔ شجاع احمد صاحب، اس گروپ کے چیئرمین تھے۔ بہرحال ان کی مصروفیات بے پناہ تھیں۔

گھریلو قسم کی تقریبات میں وہ کبھی حصہ نہیں لیتے تھے۔ ہاں ان... تقریبات میں روپیہ خرچ کرنے پر کوئی قید نہیں تھی جس کا جو دل چاہے کرے، انہیں اس سے کوئی غرض نہیں تھی۔ بس اُن کی شرکت ضروری نہ سمجھی جائے۔ البتہ کاروباری تقریب کوئی بھی ہو، وہ اس میں ضرور شریک... ہوتے تھے۔

زاہد کو اُنہوں نے روزِ اوّل ہی سے ناپسند کیا تھا اور اس کی وجہ اُس کی وہی تُرپن والی حرکت ہی تھی۔ اس کے علاوہ اور کوئی خیال اُن کے ذہن میں نہ تھا...

لیکن زاہد... وہ چیز ہی کچھ اور تھی۔ اتنا خود اعتماد کہ توبہ۔ کبھی کسی سے مرعوب ہونا جانتا ہی نہ تھا... پھر دادا جان کی پسند تھا۔ اس لئے اُسے مراعات بھی حاصل تھیں۔ کھانے اور چائے وغیرہ کے علاوہ نوجوانوں کی نجی گفتگو میں بھی شریک ہو جاتا تھا۔ دوسروں کو تو خیر کوئی اعتراض ہی نہیں تھا لیکن شجاع احمد صاحب اُس کی وجہ سے خاصے بے چین رہتے تھے۔ نہ جانے کیوں، اُس کی موجودگی میں ایک بے نام سی بے کلی کا شکار رہتے تھے، انہیں اپنی شخصیت ہلکی ہلکی محسوس ہوتی تھی۔

یہ ایک خوشگوار شام کی بات ہے۔ سب لوگ لان میں بیٹھے تھے... چائے کا دور چل رہا تھا، خوش گپیاں ہو رہی تھیں۔ زاہد اتفاق سے شجاع احمد کے قریب ہی بیٹھا ہوا تھا اور شجاع احمد صاحب اس بات سے ناخوش تھے۔ چائے کے بعد اُنہوں نے جیب سے ایک بلوریں پائپ نکالا اور اس میں تمباکو بھرنے لگے۔ بلجیم کے بنے ہوئے اس خوبصورت پائپ میں تمباکو بھر کر اُنہوں نے اُسے سُلگانے کے لئے دانتوں میں دبا لیا لیکن اسی وقت زاہد نے اُن کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ دیا۔

شجاع احمد صاحب نے چونک کر اُس کی طرف دیکھا۔

"پائپ دانتوں سے نکالیں۔" وہ بولا اور شجاع احمد صاحب نے اس کا ہاتھ جھٹک کر پائپ دانتوں سے نکال لیا۔

"یہ کیا بدتمیزی ہے؟" وہ غرّائے۔

زاہد نے پائپ اُن کے ہاتھ سے لے لیا اور شجاع احمد صاحب کا چہرہ بگڑ گیا۔

"آپ غلط طریقے سے پائپ استعمال کر رہے تھے۔"

"کیا بکواس ہے؟"

"یہ پائپ شیشے کا ہے اور دانتوں کی گرفت سے اس کی..."

"میں کہتا ہوں کہ تم نے پائپ کیوں اُٹھایا؟"

"آپ کو کچھ بتانے کے لئے انکل! اوّل تو اس پائپ کو اس مقصد کے لئے بنایا ہی نہیں گیا کہ اس میں تمباکو بھر کر استعمال کیا جائے۔"

"اوہ... پھر کوئی نئی بات آئی ہے تمہارے ذہن میں؟" حسام احمد صاحب دلچسپی سے بولے۔

"جی ہاں..."

"بھلا وہ کیا؟"

زاہد نے لائٹر اُٹھایا اور پائپ منہ میں لے کر اُسے سُلگایا پھر وہ، اُس کے دو، تین کش لے کر اُسے دادا جان کے سامنے کر کے بولا۔ "اس دھوئیں کا رنگ دیکھئے جس قدر یہ اس بلوریں نمایاں ہے کسی اور شے میں نہیں ہو سکتا۔"

"ہاں، بے شک!"

"اس رنگ پر توجہ دیجئے، دادا جان! یہ نکوٹین کا اصل رنگ ہے اور نکوٹین کے بارے میں اب دُنیا کو بتانے کی ضرورت باقی نہیں رہ گئی۔ یہ زرد زہر انسان کے لئے کس قدر مُضر ہے، اس کی تفصیلات سامنے آ چکی ہیں۔"

"بے شک!"

"میرے خیال میں تو یہ پائپ بے خبر لوگوں کی اصلاح کا بہترین... ذریعہ ہے۔ اس سے نظر آ جاتا ہے کہ انسان کتنا زہر کتنے وقت میں اپنے اندر اُتار لیتا ہے۔"

"بہت خوب۔ یہ نکتہ تم ہی تلاش کر سکتے تھے۔" دادا جان نے مُسکراتے ہوئے کہا۔

شجاع احمد صاحب کا چہرہ غصّے سے سُرخ ہو گیا۔ وہ ہونٹ چبا رہے تھے۔

"صرف یہی نہیں، دادا جان! تمباکو نوشی کے مُضر اثرات، اخلاقی قدروں کو بھی مِٹا رہے ہیں۔"

"ہوں... وہ کیسے؟"

"ظاہر ہے، یہ ایک نشہ آور شے ہے۔ شراب، چرس، بھنگ وغیرہ یہی اشیاء ہیں جن کے استعمال میں ابھی ایک پردہ باقی ہے لیکن تمباکو نوشی نے اس پردے کو مِٹا دیا ہے۔ اب دیکھئے نا، بیٹا، باپ کے سامنے نشہ استعمال کر رہا ہے۔ یہ یورپ تو نہیں۔"

"کیا بکواس کر رہے ہو؟ ابا جان! یہ بدتمیز شخص کب تک ہمارے سروں پر مسلط رہے گا۔ اگر یہ آپ کا شوق ہے تو اُسے خود تک محدود کیوں نہیں رکھتے؟" شجاع احمد صاحب دہاڑتے ہوئے اُٹھ کھڑے ہوئے۔

دادا جان نے چونک کر شجاع احمد صاحب کی طرف دیکھا۔ "میاں! کیا مطلب ہے تمہارا؟"

"یہ کیا بکواس کر رہا ہے۔ اس کی اس قدر جرأت کیسے ہوئی کہ...؟"

"جھوٹ کہا ہے اس نے؟ بتلاؤ، کون سی بات جھوٹ ہے...؟ کیا یہ بدتہذیبی نہیں یا تمباکو نوشی بُری چیز نہیں؟ اس کے علاوہ یہاں تم نے میری کیا حدود مقرر کی ہیں؟ یعنی میں کہاں تک محدود رہوں۔ چائے میں،

کھانے میں نہ شریک رہوں، تمہارے ساتھ۔ یہی مراد ہے نا؟"

"میں نے اس کی بات کی ہے، ابا میاں!"

"بات پلٹنے کی کوشش مت کرو، شجاع احمد! میں بارہ بنکی کا پٹھان ہوں اور تم جو کچھ ہو، میری بدولت ہو۔ ابھی اُتار دوں گا جوتا اور..."

درحقیقت دادا جان، ایسے ہی تھے اور شجاع احمد صاحب ساری دُنیا میں صرف انہی سے گھبراتے تھے۔ اس وقت بھی شدید طیش کے عالم میں بول پڑے تھے ورنہ دادا جان کے سامنے بولنے کی ہمت نہیں پڑتی تھی۔

"بہتر ہے۔ میں خود ہی آئندہ ایسی جگہ نہیں رہوں گا۔" شجاع احمد ایک جھٹکے سے مڑ کر چل دیئے۔

"اوہ، انکل یہ پائپ..." زاہد نے جلدی سے پائپ اُن کی طرف بڑھایا تو وہ نفرت سے منہ سکیڑ کر بولے۔

"تم جانتے ہو، میری جو چیز دوسرا چھو لیتا ہے، اُسے میں ہاتھ لگانا بھی پسند نہیں کرتا۔"

"اوہ، سوری! میں بھول گیا تھا۔" زاہد نے کہا اور اطمینان سے پائپ جیب میں ڈال لیا۔

فضا میں چند ساعت کے لئے تکدر سا پیدا ہو گیا تھا لیکن اہلِ خانہ شجاع احمد سے زیادہ متاثر نہ تھے اس لئے جلد ہی صورتِ حال معمول پر آ گئی۔

ایک دن بیگم صاحبہ کو بھی شیشے میں اُتارنے کا موقع مل گیا۔

شجاع احمد صاحب ایک کاروباری شادی میں شرکت کرنے جا [illegible] کسی بڑی شخصیت کی بیٹی کی شادی تھی۔ مسٹر اور مسز شجاع احمد [illegible]ے۔ بیگم صاحبہ عموماً فیشن ایبل لباس پہنتی تھیں اور شجاع احمد صاحب بھی ایسے ہی لباس پسند کرتے تھے۔ خاص طور سے تقاریب میں۔

بیگم صاحبہ بالوں کا جُوڑا بنا رہی تھیں کہ زاہد پہنچ گیا۔ "آؤ زاہد میاں! کوئی خاص بات ہے؟"

"جی... آیا تو ہارون میاں کی تلاش میں تھا لیکن..."

"لیکن کیا...؟"

"چچی جان! نمک کیا چیز ہوتی ہے؟"

"ایں... نمک، نمک ہوتا ہے۔"

"کوئی خاص بات ہوتی ہے، اس میں؟"

"کوئی فلسفہ بیان کر رہے ہو۔ نمک میں جو خاص بات ہوتی ہے، وہ تمہیں بھی معلوم ہے۔"

"بڑی سستی سی چیز ہوتی ہے پھر اس کے حوالے کیوں دیئے جاتے ہیں؟"

"کیسے حوالے...؟"

"یہی کہ جس کا نمک کھاؤ، اُس کے وفادار رہو۔ میں نہیں جانتا کہ اس بے حقیقت چیز کو اتنی اہمیت کیوں دی گئی ہے! ممکن ہے، نمک صرف محاورہ ہو اور اس سے مُراد یہ لی گئی ہو کہ احسان، بے حقیقت نمک کا بھی ہوتا ہے۔ یعنی اگر کوئی نمک جیسی چیز بھی کھلا دے تو اُس سے دغا کرو۔"

"چلو ٹھیک ہے۔ تم نے خود ہی تشریح بھی کر دی... مگر نمک کا ذکر کیوں نکل آیا؟"

"اس لئے چچی جان! کہ میرے دل میں آپ کا ایک وقار ہے۔ ایک احترام ہے، میری آنکھوں میں آپ کی یہ تصویر نہیں ہے، جو نظر آ رہی ہے۔"

"کیا مطلب...؟"

"یہ لباس اور یہ جُوڑا، آپ کے شایانِ شان نہیں ہے۔ معاف کیجئے اس لباس میں آپ اپنا مذاق لگتی ہیں۔"

"اوہ! کیا واقعی...؟"

"آئینے سے سوال کیجئے، وہ صحیح جواب دے گا۔ بشرطیکہ آپ خوشامد پسند لوگوں کی زبان میں نہ سوچیں۔"

"تم ٹھیک کہتے ہو، زاہد! مجھے بھی یہ لباس پسند نہیں لیکن شجاع مجھے یہ پہننے کے لئے مجبور کرتے ہیں۔"

"آپ نے کبھی اپنے لمبے بالوں پر غور کیا ہے، چچی جان؟"

"کیوں نہیں...؟"

"کیا ان سے عورت کی شناخت نہیں ہوتی؟ کیا مذہبی کتابیں، بالوں کے تقدس کی کہانیاں نہیں سناتیں؟ کیا حسنِ مشرق ان سیاہ گھٹاؤں میں پوشیدہ نہیں ہوتا؟ آپ حسنِ مشرق سے مالامال ہیں۔ اپنی شناخت کیوں مٹا رہی ہیں؟ آپ نے ان گھٹاؤں کو مقید کیوں کر لیا ہے؟"

"بھئی، بس شجاع احمد..."

"معاف کیجئے گا، چچی جان! اگر انکل شجاع، آپ کو مذاق بنا کر پیش کرنے کے خواہشمند ہیں تو آپ خود کو مذاق کا نشانہ کیوں بناتی ہیں؟ پاکستان اپنی روایتیں رکھتا ہے۔ ہمارے لباس، ہماری روایتوں کے امین ہیں۔ ہماری عورت، یورپ کی برہنگی سے دور ہے... ہم خود کو احساسِ کمتری کا شکار کیوں بنائیں؟ آپ کے پاس کوئی علاقائی لباس نہیں ہے؟"

"میرے پاس تو نہیں ہے۔"

"قدسیہ صاحبہ کے پاس ہے۔ میرا خیال ہے، اُن کا لباس آپ کے بدن پر بالکل درست ہوگا۔"

"ہاں، اُس کے کپڑے میرے آ جاتے ہیں۔"

"تو اُن سے ے لیں۔ بالوں کو کھول کر چوٹی گوندھ لیں اور پھر آئینے سے سوال کریں اور خود کو پہچانیں۔ اگر کوئی آپ کی ذات کو کچھ نہ چاہے تو اس کی برتری قبول نہ کریں۔ آپ کی اپنی ایک حیثیت ہے۔"

"تم ٹھیک کہتے ہو۔ ذرا تکلیف کرو۔ قدسیہ کو میرے پاس بھیج دو۔"

"بہتر ہے۔" اس نے کہا اور کمرے سے نکل گیا... پھر اس نے قدسیہ کو بیگم صاحبہ کا پیغام دے دیا تھا۔

بیگم صاحبہ اس لباس اور اس انداز میں واقعی پُرقار لگ رہی تھیں۔ اُن کی دونوں بیٹیاں اُن سے لپٹ گئیں۔

"ہائے، امی! کتنی کیوٹ لگ رہی ہیں۔"

"خدا کی قسم! بے حد حسین۔"

"بیگم صاحبہ! صاحب باہر گاڑی کے قریب آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔" ایک ملازم نے آکر کہا۔

"اوہ... ہاں۔ دیر ہو رہی ہے، چلو۔" اُنہوں نے کہا... اور باہر نکل آئیں۔

شجاع احمد صاحب، گاڑی کے پاس کھڑے، حسام احمد صاحب سے باتیں کر رہے تھے۔ ڈرائیور ایک طرف مؤدب کھڑا تھا۔ شجاع احمد صاحب بار، بار گھڑی دیکھ رہے تھے کہ بیگم صاحبہ اُن کے پاس پہنچ گئیں۔

"ارے..." شجاع احمد صاحب کے مُنہ سے نکلا۔ وہ متحیرانہ انداز میں بیگم کو دیکھتے رہ گئے۔

"چلیں، میں تیار ہوں۔"

"تیار ہیں، آپ! یہ تیاریاں کر رہی تھیں، اتنی دیر سے؟"

"کیوں، کیا بات ہے؟"

"یہ حلیہ کیا بنایا ہے، آپ نے؟"

"[illegible]... ہے"

"دماغ خراب ہو گیا ہے، آپ کا... جانتی ہیں کتنے بڑے لوگوں میں جا رہی ہیں، آپ۔ شیخ جاوید کی بیگم مغربی جرمنی سے تعلق رکھتی ہیں۔" شجاع احمد صاحب بولے۔

"تو پھر...؟"

"میں کہتا ہوں، آپ سب لوگوں کا دماغ خراب ہو گیا ہے کیا؟" شجاع احمد صاحب جھلا گئے۔

"مجھ سے بات کرو میاں! کیا مسئلہ ہے؟"

"اباجان! یوں لگتا ہے، جیسے سب لوگ مجھے پریشان کرنے پر تُل گئے ہیں۔"

"ایسی کیا بات ہے میاں؟"

"اب دیکھیں، یہ لباس۔"

"کیا شیخ صاحب خود بھی انگریز ہیں یا تم مغربی جرمنی جا رہے ہو؟"

"اُفوہ... یہ لباس بہت فرسودہ بلکہ بیہودہ ہے۔"

"ابے کیا بک رہا ہے، بارہ بنکی کے گدھے! اپنی ماں کی... تصویریں دیکھی ہیں، اپنی دادی کو دیکھا تھا۔ انہیں فرسودہ اور بیہودہ کہہ رہا ہے، نالائق۔ ننگا کر کے لے جانا چاہتا ہے، میری عزت کو۔ اسی میں خوش ہے، ایں؟"

"ابامیاں! آپ..."

"دیکھیے، شجاع احمد! ہوش درست کر لے، اپنے۔ بے حواس ہوتا جا رہا ہے۔ دو منٹ میں دماغ درست کر دوں گا۔ کیا سمجھتا ہے... اپنے آپ کو؟" حسام احمد صاحب بے اختیار جھکے اور شجاع احمد صاحب جلدی سے کار کا دروازہ کھول کر اندر بیٹھ گئے۔

بیگم صاحبہ نے بھی دوسری طرف جا کر اپنی سیٹ سنبھال لی... اور ڈرائیور، مالکان کو تیار دیکھ کر خود بھی سیٹ پر بیٹھ گیا۔

"خدا حافظ، اباجان!" بیگم صاحبہ نے کھڑکی سے ہاتھ لہرا کر کہا۔ وہ اس مداخلت پر خوش تھیں۔ شجاع احمد صاحب کا موڈ بے حد خراب تھا۔ اور وہ سکڑے بیٹھے تھے۔ کافی دیر گزر گئی تو وہ بولے۔

"یہ آپ کو سوجھی کیا آخر؟"

"کون سی قیامت آگئی اور آخر یہ بھی تو لباس ہے۔"

"اعلیٰ گھرانوں کی بیگمات کا لباس... کیوں؟"

"پاکستان کی اپنی روایات ہیں اور ہمارے لباس، اپنی روایتوں کے امین ہوتے ہیں اور ہماری عورت یورپ... یورپ... یورپ کی حساس کمتری... اوہ نہیں... وہ مذاق کا نشانہ..." بیگم صاحبہ، ناہید کے کہے ہوئے الفاظ کا ربط بھول گئیں۔

شجاع احمد صاحب تعجب سے انہیں دیکھ رہے تھے بیگم صاحبہ معمولی پڑھی لکھی تھیں۔ یہ الفاظ، اُن کے نہیں ہو سکتے تھے۔

"ہاں، ہاں، آگے فرمائیے۔" وہ بغور انہیں دیکھتے ہوئے بولے۔

"بس، یہی سب کچھ..."

"کس نے سمجھائی ہیں، یہ قیمتی باتیں، آپ کو؟"

"ناہید نے۔ بڑا پیارا لڑکا ہے۔ بڑا ہی نیک اور وفادار۔" بیگم صاحبہ بے اختیار بولیں۔

"ناہید..." شجاع احمد صاحب کے حلق سے غراہٹ نکلی اور وہ دانت پیستے ہوئے کھڑکی سے باہر دیکھنے لگے۔

● ●

ایک سی ڈگر تھی۔ بیگم صاحبہ نے مظالم کی حد کر ڈالی تھی۔ جس طرح بھی ممکن ہوتا وہ حسینہ کو پیستی رہتی تھیں۔ اتنی ذہین نہیں تھیں

شوہر کی حکمتِ عملی کو سمجھ سکتیں۔ بس اس بات پر خوش تھیں کہ چلو
ب کا نشانہ تو نکلا۔ بس انہیں علی سے بغض تھا، بے چاری حسینہ سے جس کی
خاموش زبان سے کبھی ایک لفظ بھی نہ نکلا تھا۔

حسینہ کی آنکھوں کی قندیلیں صرف ایک تصور سے روشن تھیں اور
وہ تصور علی کا تھا۔ اس وقت کا تصور، جب علی یورپ سے جوان ہو کر
آئے گا۔ اس کا ایک گھر ہوگا، شادی ہوگی، بچے ہوں گے اور وہ، اس
بھرے پُرے گھر کی مالک ہوگی، وہ علی کے بچوں کی پرورش کرے گی۔

فضیلت خالہ کا انتقال ہو چکا تھا۔ شمشیر زماں بھی اب بوڑھے ہوتے
جا رہے تھے۔ گو ابھی انہوں نے بڑھاپے کو قبول نہیں کیا تھا۔ شکار کا مشغلہ
جاری تھا۔ وہ دوستوں کے ساتھ نہ جانے کہاں کہاں نکل جاتے تھے۔ حالانکہ
اب وہ پہلے جیسی پھرتی اور چستی نہیں رہی تھی لیکن وہ اپنے شوق کے
ہاتھوں مجبور تھے۔

آج کل چند انگریز شکاری آئے ہوئے تھے۔ شمشیر زماں کے دوستوں
میں تھے۔ ان کا قیام بھی شمشیر زماں کی حویلی میں تھا۔ ان میں ایک خاتون
شکاری بھی تھیں جو اپنے شوہر مسٹر میگ یارن کے ساتھ آئی تھیں۔

طے کیا گیا کہ ایک خاص علاقے کے جنگلات میں شکار کھیلا جائے۔
تیاریاں ہوئیں اور شکار پر روانگی ہوگئی۔ یہ سفر جیپوں میں طے کیا جا رہا تھا
لیکن شکار کو دلچسپ بنانے اور گھنے جنگل میں دور تک جانے کے لئے
گھوڑے بھی ساتھ لے لئے گئے۔ فضل خان اور دوسرے لوگ بھی ساتھ
تھے۔ جیپیں مناسب رفتار سے سفر کر رہی تھیں۔ بالآخر وہ لوگ جنگلات
میں داخل ہو گئے۔

ہر طرف سرسبز میدان تھے جن کے دوسرے سرے پر گھنے جنگلات
شروع ہو جاتے تھے۔ ایک دریا بھی تھا جو گھنے جنگلات کے درمیان سے
گزرتا تھا۔ ان لوگوں نے دریا کے کنارے خیمے لگا دیئے۔ سرحدی لوگ
اس دریا میں کشتی رانی کرتے تھے۔

طے یہ کیا گیا کہ ہیڈ کوارٹر یہیں رہنے دیا جائے اور گھوڑوں سمیت
دریا کے دوسری طرف جا کر شکار کھیلا جائے۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا اور وہ
لوگ گھوڑوں سمیت، کشتیوں کے ذریعے دریا کے دوسرے کنارے پر
پہنچ گئے۔

مسز اور مسٹر میگ اس علاقے سے بہت متاثر تھے اور سب
گھوڑوں پر سوار ہو کر گھنے جنگل کی جانب چل پڑے۔ سورج سر پر آ گیا تھا
لیکن گھنے جنگل میں داخل ہونے کے بعد، اس کی تپش کا احساس نہ رہا
تھا۔ دوپہر کو ایک ہرن شکار کر کے بھونا گیا اور پیٹ کی آگ بجھانے کے
بعد یہ لوگ پھر آگے چل پڑے۔ شکار کے شوق میں یہ احساس بھی نہ رہ گیا
تھا کہ وہ کتنا سفر طے کر چکے ہیں۔

اب بے حد گھنے اور خطرناک جنگلوں کا علاقہ شروع ہو گیا تھا جس
میں گھوڑوں کی سواری بھی ممکن نہ رہی تھی۔ چنانچہ ایک جگہ گھوڑے، دو
ملازموں کے سپرد کر کے انہیں وہیں چھوڑ دیا گیا... اور سب لوگ وہاں
سے بھی آگے بڑھ گئے۔ سب مہم جو، اس جنگل سے بہت متاثر تھے اور
خاردار جھاڑیوں اور خشک ٹہنیوں کو ہٹاتے، راستہ بناتے بڑھتے جا رہے
تھے۔ ایک انگریز شکاری مسٹر گین نے کہا۔

"درحقیقت' ان علاقوں میں اتنے شاندار جنگل کا میں تصور بھی نہیں
کر سکتا تھا۔ ایسے جنگلات میں تو ہر قسم کے جانور ہوتے ہیں؟"

"میں بھی اس سے قبل یہاں نہیں آیا۔ جبکہ تقسیم سے قبل ایک
بار مجھے' دوسرے جنگلات میں شکار کھیلنے کا موقع ملا تھا۔" مسٹر میگ نے
متاثر کن لہجے میں کہا۔

"میگی ہمیشہ مجھ سے یہاں کے جنگلات کا تذکرہ کرتے رہتے تھے۔
اس لئے مجھے بھی یہاں آنے کا بے حد شوق تھا۔" مسز میگ بولیں۔

"ویسے آپ لوگوں کو یہ سن کر تعجب ہوگا کہ مسز میگ' مسٹر میگ
سے اچھی شکاری ہیں اور ان سے زیادہ تجربہ رکھتی ہیں کیونکہ یہ دنیا کے
مختلف علاقوں میں شکار کھیل چکی ہیں۔" مسٹر گین نے بتایا۔

"اور ان کا آخری شکار میں ہوں۔" مسٹر میگ بولے اور جنگل کی
فضا قہقہوں سے گونج اٹھی۔

لیکن چند ہی لمحات بعد مسز میگ نے ثابت کر دیا کہ وہ درحقیقت
ایک شاندار اور نڈر کھلاڑی ہیں۔

ہر طرف خاموشی تھی، صرف اُن کے قدموں تلے آنے والے خشک
پتوں کے چرمرانے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ دفعتاً ایک طرف سے خوفناک
غراہٹ سنائی دی اور مٹیالے رنگ کا ایک چیتا، ان کے عین سامنے
آ گیا۔ چیتا اس قدر اچانک اور اس قدر قریب نمودار ہوا تھا کہ ایک
لمحے کو تو سب ہی بدحواس ہو گئے۔ مسٹر میگ، چیتے کے عین سامنے تھے۔
انہوں نے سنبھلنے کی کوشش کی تو لڑکھڑا کر چیتے کے قریب جا گرے۔

اس سے قبل کہ چیتا بڑھ کر انہیں دبوچ لیتا، مسز میگ نے
رائفل سیدھی کر کے ٹریگر دبا دیا۔ گولی واقعی بڑی مہارت سے چلائی گئی
تھی ورنہ وہ گولی چیتے کے قریب پڑے ہوئے مسٹر میگ کے بھی لگ سکتی
تھی لیکن گولی نے صرف چیتے کے سر کے پرخچے اڑائے تھے اور وہ وہیں
ڈھیر ہو گیا تھا۔

بہرحال' مسز میگ کو اُن کے اس کارنامے کی بھرپور داد دی گئی۔
چیتے کی کھال خراب ہو گئی تھی اس لئے اسے وہیں چھوڑ دیا گیا اور وہ لوگ
سنبھل کر آگے بڑھ گئے۔

اب شام کے آثار نمودار ہونے لگے تھے۔ چنانچہ یہ فیصلہ کرنا تھا... کہ

یہیں قیام کیا جائے یا واپسی کا سفر اختیار کیا جائے۔ مسٹر گین اس بات پر مُصر ہو گئے کہ اتنا طویل سفر پیدل طے کرنے کی بجائے یہیں کہیں ٹھکانہ بنا لیا جائے ورنہ دوسرے دن پھر اتنا ہی طویل سفر کرنا پڑے گا۔ مسٹر گین کی بات مان لی گئی اور ایک صاف ستھری جگہ منتخب کر کے، اُس کے گرد الاؤ بنائے گئے۔

ایک نیل گائے شکار کر کے' الاؤ پر اُس کا گوشت بھونا گیا اور یہ کچا پکا گوشت شکاریوں کی مرغوب غذا ہوتی ہے۔ اس پُرخطر جنگل میں سب کا ایک ساتھ سو جانا کسی طور مناسب نہیں تھا۔ اس لئے باری باری مستعدی سے پہرہ دیا گیا اور بخیر و خوبی صبح ہو گئی۔ دوسری صبح ضروری تیاریوں کے بعد یہ سلسلہ پھر شروع ہو گیا۔

آگے جنگل اور زیادہ گھنا تھا۔ درختوں کی سرسبز چوٹیاں آسمان سے باتیں کرتی معلوم ہو رہی تھیں۔ زمین جھاڑ جھنکار سے اٹی پڑی تھی اور روشنی کی کرنیں اُوپر ہی گھنی شاخوں میں اُلجھ کر ختم ہو جاتی تھیں۔ لیکن گھنے درختوں کا یہ سلسلہ زیادہ طویل ثابت نہیں ہوا۔ آگے چل کر کھلے قطعات تھے اور ان میں خوبصورت مناظر بکھرے پڑے تھے۔

ایک نشیب میں مسٹر گین کی نگاہ پڑی تو وہاں انتہائی نایاب نسل کے چھوٹے قد کے سیاہ ہرن نظر آئے اور مسٹر گین مسرت سے چیخ پڑے۔ "میرے خدا! سیاہ ہرن... میں انہیں ضرور شکار کروں گا۔"

شمشیر زماں بھی اس طرف متوجہ ہو گئے اور دونوں، نشیب میں اُترنے لگے۔ دوسرے لوگ اُوپر ہی رہ گئے۔ مسٹر گین اور شمشیر زماں نشیب میں دُور تک بڑھتے چلے گئے۔

یہاں لمبی لمبی گھاس تھی جو بعض جگہوں پر انسانی قد سے بھی اُونچی ہو گئی تھی۔ اس کے درمیان سے گزرتے ہوئے کئی بار وہ ایک دوسرے کی نگاہوں سے اوجھل بھی ہو گئے لیکن پھر آگے چل کر مل گئے اُوپر سے یہ فاصلہ اتنا زیادہ نہیں معلوم ہوتا تھا لیکن نیچے اُترتے ہوئے نہ جانے کتنی دیر تک چلنا پڑا تھا... اور جب اندازے سے وہ، اُس جگہ پہنچے جہاں وہ سیاہ ہرن نظر آئے تھے، تو ہرنوں کا وہ غول آگے بڑھ چکا تھا۔

اُنہوں نے مایوسی سے چاروں طرف نظریں دوڑائیں۔

"کیوں نہ آگے بڑھ کر اُنہیں تلاش کیا جائے۔" مسٹر گین نے تجویز پیش کی۔

"کوئی حرج نہیں ہے۔" شمشیر زماں نے جواب دیا... پھر وہ زمین پر ہرنوں کے کھروں کے نشانات تلاش کرتے ہوئے آگے بڑھنے لگے۔ جانوروں کی پیچ در پیچ گزرگاہوں پر چلتے ہوئے اُنہیں کافی دیر ہو گئی... یہاں زمین قطعی ناہموار تھی اور وہ مزید نشیب میں اُترتے جا رہے تھے۔ ان کے دونوں جانب بلندیاں تھیں جن پر خودرو کی جھاڑیاں پھیلی ہوئی تھیں۔ مسٹر گین پریشان ہو گئے۔ سورج یا تو بادلوں کی اوٹ میں ہو گیا تھا یا پھر جوش کے عالم میں چلتے ہوئے اُنہیں وقت کا اندازہ نہیں ہو سکا تھا اور شام ہو گئی تھی۔

"شمشیر زماں!" مسٹر گین نے پریشان لہجے میں اُنہیں مخاطب کیا۔

"کیا بات ہے، مسٹر گین؟"

"یہ ہرن کہیں واہمہ تو نہیں تھے۔ آپ کو علم ہے کہ سیاہ ہرنوں کے بارے میں کیسی کیسی کہانیاں مشہور ہیں۔ اُن کا وجود کہیں دھوکہ تو نہیں تھا۔ کہیں نظر ہی نہیں آ رہے۔"

"ہاں، وہ بہت دُور نکل گئے ہیں۔"

"پھر کیا خیال ہے؟"

"بہت وقت ہو گیا ہے۔ میرے خیال میں واپسی مناسب ہے۔"

پھر متفقہ فیصلے کے بعد وہ واپس چل پڑے۔ شام تیزی سے جھکتی آ رہی تھی اور اُن کی رفتار میں بھی تیزی آتی جا رہی تھی... لیکن کئی میل کا سفر کرنے کے بعد بھی وہ اپنے ساتھیوں تک نہ پہنچ سکے۔

مسٹر گین کے چہرے پر پریشانی کے آثار گہرے ہوتے جا رہے تھے... ایک جگہ رُک کر اُنہوں نے شمشیر زماں کی طرف دیکھا۔ "کیا خیال ہے، ہم کہیں راستہ تو نہیں بھول گئے؟"

"ایسا ہی لگتا ہے۔"

"یہ بہت خطرناک بات ہو گی۔ رات ہوتی جا رہی ہے۔"

"میرا اندازہ کچھ اور ہے۔" شمشیر زماں کی آنکھوں میں بھی بے چینی کے آثار جھلک رہے تھے۔

"کیا...؟"

"ابھی رات نہیں ہوئی۔ بادل گھر آئے ہیں۔ ذرا گھڑی دیکھیں۔" شمشیر زماں نے کہا۔ پریشانی کے عالم میں اُنہیں اپنی کلائی پر بندھی ہوئی... گھڑی کا بھی خیال نہیں آیا۔

"ساڑھے تین بجے ہیں۔" مسٹر گین نے گہری سانس لے کر کہا۔

"بارش ہو گئی تو اور مصیبت آ جائے گی..... پانی ان ڈھلانوں سے گزر کر نہ جانے کہاں تک پہنچے۔" شمشیر زماں نے کہا اور تیزی سے آگے بڑھنے لگے۔

لیکن جنگل کی بھول بھلیوں نے اُنہیں راستہ نہیں دیا۔ ناہموار راستوں اور جھاڑیوں سے گزرتے ہوئے جب وہ ایک جگہ پہنچے تو یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ وہ اُسی جگہ پر تھے جہاں سے واپسی کا سفر اختیار کیا گیا تھا۔

پریشانی اب انتہا کو پہنچ چکی تھی۔ شمشیر زماں، مسٹر گین کی وجہ

سے پریشان تھے، وہ بےجان تھا۔ یوں بھی آسمان پر گھرے بادلوں کی۔۔ موجودگی خطرناک تھی اور حالات خراب سے خراب ہو سکتے ہیں۔

اس بار اُنہوں نے بائیں سمت کے اُن ٹیلوں کا رُخ کیا جن پر تھوہر کی جھاڑیاں اُگی ہوئی تھیں۔ ابھی وہ، اُن جھاڑیوں کے درمیان زیادہ بلندی پر نہیں گئے تھے کہ اوپر سے چند چھوٹے چھوٹے پتھر لڑھکے اور اس کے ساتھ ہی ایک خوفناک گرج سُنائی دی۔۔ اور پھر ایک سائے نے اُن پر چھلانگ لگادی۔

شمشیر زماں کو اپنے دائیں شانے میں آگ سی اترتی ہوئی محسوس ہوئی اور اس کے ساتھ ہی وہ گہرائی میں لڑھکتے چلے گئے۔۔ لیکن اس خوفناک درندے نے وہاں بھی ان کا پیچھا نہیں چھوڑا۔ اس بار وہ، شمشیر زماں سے لپٹ ہی گیا اور دوسرے لمحے، اُس کے تیز نوکیلے دانتوں نے شمشیر زماں کا نرخرہ اُدھیڑ کر رکھ دیا۔

مسٹر گین کی قسمت اچھی تھی کہ وہ اس درندے کی لپیٹ میں نہیں آئے تھے۔ ہر چند کہ اُن کے ہاتھ پاؤں پھول گئے تھے لیکن اُنہوں نے حواس یکجا کر کے لگاتار کئی فائر کر دیئے۔۔ اور وہ درندہ، شمشیر زماں ہی پر ڈھیر۔۔ ہو گیا۔

وہ لرزتے قدموں سے شمشیر زماں کے پاس پہنچے لیکن شمشیر زماں دم توڑ چکے تھے۔ تقریباً آٹھ فٹ لمبا شیر، اُن کے جسم پر چھایا ہوا تھا جسے ہٹانا مسٹر گین کے بس کی بات نہ تھی۔ مسٹر گین حلق پھاڑ کر چیخنے لگے۔ اُن کی دہشتناک چیخیں جنگل میں گونج رہی تھیں۔ اُن کی خوف سے بُری حالت تھی۔ اُنہیں اندازہ تھا کہ وہ راستہ بھٹک چکے ہیں اور رات سر پر چلی آ رہی ہے۔ اس سیاہ رات میں کوئی بھی درندہ، کسی بھی طرف سے نکل کر اُن پر حملہ آور ہو سکتا تھا۔

اچانک اُنہیں آواز سُنائی دی، اور اُنہوں نے رائفل بلند کر کے فائر کر دیا۔ چند لمحوں بعد کسی نے اُن کا نام لے کر پکارا۔ یہ اُن کے ساتھی تھے جو اُن کی طویل گمشدگی سے پریشان ہو کر، اُنہیں تلاش کرتے پھر رہے تھے۔

● ●

آخری باب ختم کر کے، زاہد نے ناول بند کر دیا۔ دادا جان آنکھیں بند کیے، آرام کرسی پر دراز تھے اور اُن کی گہری گہری سانسوں کی آواز کمرے میں گونج رہی تھی۔ زاہد کے خاموش ہو جانے کے بعد جب دیر تک اُن کے انداز میں تبدیلی نہیں ہوئی تو زاہد نے اُنہیں پکارا اور دادا جان جلدی سے سیدھے ہو کر بیٹھ گئے۔

"اوہ۔۔ میں سمجھا کہ آپ سو گئے۔"

"لغو۔۔ بیہودہ۔۔ بکواس۔" دادا جان ناک سکیڑ کر بولے اور زاہد چونک کر اُنہیں دیکھنے لگا۔

"کیا خیال ہے؟" دادا جان نے اُس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"میرے بارے میں فرما رہے ہیں؟"

"ایں، نہیں۔۔ اس ناول کے بارے میں۔ مصنف کے ذہن میں جو مواد تھا، وہ اس نے ابتدائی صفحات ہی میں نکال کر رکھ دیا اور اُس کے بعد، اُس کی کھوپڑی خالی ہو گئی۔ آخری صفحات میں تو وہ اپنی کہانی سے خود ہی خوفزدہ لگ رہا تھا اور اسی خوف کے عالم میں اُس نے کہانی کا اختتام کیا ہے۔ کیا خیال ہے؟"

"بعض اوقات، میں تو ششدر رہ جاتا ہوں، دادا جان!"

"کس بات پر؟"

"آپ کی سُوجھ بُوجھ پر۔ اگر آپ کا تعلق کسی انتظامی محکمے سے ہوتا تو آپ کیا حشر کرتے؟"

"چھوڑو میاں! اب ان باتوں میں کیا رکھا ہے۔" دادا جان گہری سانس لے کر بولے۔ "جو نہ کر سکے، اُس کا افسوس بے معنی ہے۔ تم نے کہا تھا کہ اس سلسلے میں کچھ کرو گے لیکن اس کے بعد تم نے کوئی کارروائی ہی نہیں کی۔"

"میں تو آپ کے حُکم کا منتظر تھا، دادا جان! جب بھی آپ کو فرصت ملے، اس سلسلے میں میری خدمات حاصل کر لیں۔"

"ہمیں کون سے کام ہیں میاں! فرصت ہی فرصت ہے۔۔ تم پلان پیش کرو۔ ہم تمہارے ساتھ ہیں۔"

زاہد گردن جھکائے چند ساعت تک کچھ سوچتا رہا پھر بولا۔ "ہمیں کچھ کارکنوں کی ضرورت ہو گی لیکن ابھی باہر کے لوگوں پر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا۔ میری خواہش ہے کہ ہمیں چند ایسے لوگ مل جائیں جو ہمارے قریب ہوں اور جن سے ہمیں کوئی خطرہ درپیش نہ ہو۔"

"میرا خیال ہے، یہ پانچوں بچے ہمارے کام آ سکتے ہیں۔ احمد رضا، فیصل، ہارون، قدسیہ، شازیہ، سب کے سب ہی ایکٹو ہیں۔"

"ہرگز نہیں، دادا جان! وہ ہم سے بے تکلف ہیں، ہمارے دوست ہیں، وہ ہمارے دباؤ میں نہیں رہیں گے اس لئے ہم، اُن سے حسبِ منشا کام نہیں لے سکتے۔"

"ہُوں۔۔ تو پھر تمہاری کیا تجویز ہے؟"

"میرا خیال ہے، فی الوقت ہم چند ملازمین سے کام چلا لیتے ہیں۔"

"یہ بھی ٹھیک ہے۔" دادا جان نے اتفاق کرتے ہوئے کہا۔

"میں نے ملازمین کا جائزہ لیا ہے۔ رمضان ڈرائیور اور حاجی فضل ڈرائیور، یہ دونوں ہمارے کام کے ثابت ہو سکتے ہیں۔ ان کے علاوہ رحیم داد خانساماں بہترین آدمی ہے۔ اس کی بیوی کو بھی ہم اپنی ٹیم میں شامل کر سکتے ہیں۔ فی الوقت ہم انہی چار افراد سے اپنے کام کی ابتداء کرتے ہیں۔"

"یہ لوگ جاہل اور بے وقوف سے ہیں۔ کیا یہ ہمارے لیے کارآمد ثابت ہو سکتے ہیں؟"

"طریقۂ کار، دادا جان! آپ کو مارکس فیلوی کا وہ ناول یاد ہے جس میں اس کے ساتھی بالکل ہی گاؤدی تھے لیکن گاؤدی لوگوں سے اس نے کتنا فائدہ اُٹھایا۔ اگر اُن کی جگہ ذہین اور سمجھدار لوگ ہوتے تو شاید مارکس فیلوی کے وہ کردار آسانی سے اپنی منزل نہ پا سکتے تھے۔"

"ہوں... یاد ہے۔"

"میں بھی یہی چاہتا ہوں، دادا جان! فی الحال انہی لوگوں کو اعتماد میں لے کر محدود پیمانے پر کام کی ابتدا کرنا چاہیئے۔ اس کے بعد اگر ہم نے اپنے دائرہ کار کو پھیلایا تو پھر ہم باہر کے افراد کا انتخاب بھی کریں گے۔"

"ہُوں..." دادا جان نے پُرخیال انداز میں گردن ہلائی۔ "لیکن ان چاروں کو کس طرح قابو میں لایا جائے گا؟"

"اُن کی مجال ہے، دادا جان! کہ وہ، آپ سے انحراف کر سکیں۔ میرا خیال ہے، انہیں کچھ اضافی معاوضے کی پیش کش کی جائے پھر ان سے بات چیت کر لی جائے۔ کیا خیال ہے، اس کی ابتدا ہم آج ہی سے کیوں نہ کر دیں۔"

"بھئی! مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے، جس طرح تم چاہو۔" دادا جان نے جواب دیا۔

"مگر دادا جان! ہر کام میں باقاعدگی ضروری ہوتی ہے۔"

"ہاں، بے شک۔"

"پھر ایک لائحہ عمل بنا لیا جائے۔"

"ضرور..."

"آپ اس نامکمل گروہ کے سربراہ ہیں اور میں، آپ کا سیکریٹری۔"

"اوہ..." دادا جان ہنسنے لگے۔ "چلو ٹھیک ہے۔"

"اب آپ کی ایک الگ حیثیت ہونی چاہیئے، دادا جان! آپ کے پاس کچھ مخصوص لباس بھی ہونے چاہئیں۔ جیسے عموماً باسز کے ہوتے ہیں میرا مطلب ہے، کچھ نقابیں، کچھ سیاہ لبادے اور اسی ٹائپ کی دوسری چیزیں..." زاہد نے کہا۔

دادا جان کی آنکھیں خوشی سے چمکنے لگیں۔

"بس تو پھر یوں سمجھ لیں کہ آج ہی سے ہماری تیاریاں شروع ہو گئیں... ہمیں ابتدا چھوٹے موٹے کاموں سے کرنا چاہیئے۔ ممکن ہے اس دوران کوئی بڑی بات بھی ہمارے علم میں آجائے۔ اس طرح ہم آہستہ آہستہ آگے بڑھتے جائیں گے۔"

پھر وہ لوگ، اسی شام کو شاپنگ کے لئے نکل کھڑے ہوئے۔ زاہد نے دادا جان کے لئے بہت سی چیزیں خریدی تھیں۔ میک اپ کا سامان اور ایسی ہی کئی چیزیں۔ درزی کو چند مخصوص لبادوں کا ناپ بھی دیا گیا تھا۔

دادا جان بہت خوش تھے۔ انہیں یہ عمل بے حد پسند آیا تھا۔ رات گئے تک دادا جان اور زاہد پلاننگ کرتے رہے پھر زاہد، اُن سے اجازت لے کر کمرے سے نکل آیا۔

درحقیقت، اس کی شخصیت چند ہی روز میں اس کوٹھی کے مکینوں کی پسندیدہ شخصیت بن گئی تھی۔ جسے دیکھو، زاہد زاہد پکارتا نظر آتا تھا۔ سب اس کی ذہانت کے قائل ہو گئے تھے، سوائے شجاع احمد صاحب کے۔

شجاع احمد صاحب کو بھی اس سے کوئی پرخاش نہیں تھی... بس ٹرین کے سفر میں اس نے جو بدتمیزی کی تھی، اس کے اثرات ابھی تک ذہن میں موجود تھے۔ اس کے علاوہ، اس کی بڑھی ہوئی خود اعتمادی انہیں سخت ناپسند تھی۔ وہ ملازم تھا اور اُسے ملازموں کی طرح سہما، سمٹا رہنا چاہیئے تھا، نہ کہ وہ سب کو اپنا کچھ سمجھتا تھا اور بے تکلفی سے پیش آتا تھا۔

شجاع احمد صاحب، نوکر اور مالک کے درمیان ایک فرق کے قائل تھے اور اُن کے خیال میں یہ فرق ہمیشہ اور ہر حال میں قائم رہنا چاہیئے۔ جب کہ زاہد کے سلسلے میں ایسا نہیں تھا۔

وہ مجبور نہیں تھے، اس کوٹھی کے مالک تھے۔ ایک منٹ میں زاہد کو کان سے پکڑ کر نکال سکتے تھے لیکن سارا معاملہ حسام احمد صاحب کا تھا۔

حسام احمد صاحب ہمیشہ سے سخت مزاج تھے۔ بچپن میں شجاع احمد صاحب کی وہ پٹائی ہوتی تھی کہ وہ اب تک نہیں بھولے تھے۔ وہ ہر کام نہایت خود اعتمادی اور دلیری سے کرتے تھے لیکن حسام احمد صاحب وہ آج بھی اسی طرح خوفزدہ رہتے تھے جس طرح چھ سال کی عمر میں۔ بچپن کا خوف اُن کے لاشعور میں بیٹھ گیا تھا۔

زاہد حسام احمد صاحب کا منہ چڑھا تھا اس لئے شجاع احمد صاحب کو جرأت نہیں ہوتی تھی کہ وہ، اُسے کوٹھی سے نکال دیتے۔ بہر حال پورے گھر میں وہ واحد انسان تھے جو زاہد کو ناپسند کرتے تھے لیکن اُن کی ناپسندیدگی ابھی تک زاہد کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکی تھی۔

البتہ زاہد نے اس کوٹھی میں رہنے والوں کو اچھی طرح سمجھ لیا تھا اور اُسے اندازہ ہو گیا تھا کہ اس کی پوزیشن پوری طرح محفوظ ہے لیکن وہ اس کوٹھی میں اپنا ایک بھی مخالف نہیں چاہتا تھا۔ اس لئے اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ جہاں تک ممکن ہو سکے، شجاع احمد صاحب سے دور رہا جائے۔

کارروائیاں جاری رہیں اور دادا جان جاسوس بننے کی خوشی میں پوری نیند سوتے بھی نہیں تھے... پھر جب لبادے وغیرہ تیار ہو گئے... تو انہوں نے کارروائی کا آغاز کر دیا۔

اس روز شام ہی سے ہلکی ہلکی بارش ہو رہی تھی۔ رات کو بجلی بھی چلی گئی اور پوری کوٹھی تاریکی میں ڈوب گئی۔ چوکیدار گل خان نے لالٹین

جلا کر اپنے کیبن میں رکھی تھی۔ بارش اب بھی ہو رہی تھی لیکن بہت ہلکی تھی۔ دادا جان اور زاہد برساتیاں پہن کر باہر نکل آئے۔ ان کے ہاتھوں میں ٹارچیں تھیں لیکن ابھی انہیں روشن کرنے کی ضرورت پیش نہیں آئی تھی۔ وہ دبے پاؤں پوری کوٹھی میں چکراتے پھرے۔ تقریباً سب ہی گہری نیند سو رہے تھے۔ کوٹھی سے نکل کر وہ ملازموں کے کوارٹروں کی طرف چل دیئے۔ ملازموں کے کوارٹروں کی تعداد سات تھی جن میں سے چھ آباد تھے... اور ایک خالی پڑا تھا۔

رمضان اور فضل تنہا رہتے تھے۔ گل خان کے بیوی بچے اس کے ساتھ رہتے تھے۔ اسی طرح رحیم داد بھی اپنی بیوی کے ساتھ رہتا تھا جو شوخ اور الھڑ سی تھی۔

فضل کے کوارٹر میں ہلکی سی روشنی نظر آئی اور وہ دونوں سنبھل گئے۔ پھر چھوٹے احاطے کی دیوار پھلانگ کر اندر داخل ہو گئے اور اس کمرے کے پاس پہنچ گئے جس میں موم بتی جل رہی تھی۔ ایک کھڑکی اس کمرے کی پشت پر تھی جو بند تھی لیکن اس کا ایک شیشہ ٹوٹا ہوا تھا۔ اس ٹوٹے ہوئے شیشے سے انہوں نے اندر جھانکا۔

دو موم بتیاں جل رہی تھیں اور ان کی روشنی میں فضل، رمضان اور رحیم داد بیٹھے تاش کھیل رہے تھے۔ ان کے سامنے ریزگاری اور چند نوٹ پڑے ہوئے تھے۔ گویا جوا ہو رہا تھا۔

دادا جان نے زاہد کو دیکھتے ہوئے سرگوشی کی "جوا..."

زاہد نے اثبات میں گردن ہلا دی۔

"انہیں اس کی سزا ملنی چاہیے۔"

"بے شک..."

"پروگرام..."

"آیئے" زاہد نے کہا اور دونوں گھوم کر دروازے کے سامنے آ گئے... "مزا رہے گا"... زاہد نے سرگوشی کی اور دادا جان نے گردن ہلا دی۔

اندر سے باتیں کرنے کی ہلکی ہلکی آوازیں بھی آ رہی تھیں۔ زاہد نے دروازے پر دستک دی تو اندر خاموشی چھا گئی... لیکن چند لمحوں بعد فضل کی آواز ابھری۔

"ہوا ہے، چلنے دو دوستو۔"

"نہیں، یہ ہوا نہیں تھی۔" رحیم داد نے کہا۔

زاہد نے دوبارہ دستک دی تو پھر سناٹا چھا گیا۔ تھوڑی دیر بعد رحیم داد دبے لہجے میں بولا۔

"دستک معلوم ہوتی ہے۔"

"کون...؟"

"مید... کسی کی آنکھ کھل گئی ہو گی۔"

تیسری دستک پر رمضان کی آواز دروازے کے قریب سنائی دی۔ موم بتی شاید بجھا دی گئی تھی اور پیسے اٹھا کر جیبوں میں ڈال لیے گئے ہوں گے... "کون ہے، بھائی؟"

زاہد نے جواب دینے کی بجائے پھر دروازے پر دستک دی... اور دروازے کی چٹخنی کھل گئی۔ اس کے ساتھ ہی رمضان، آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر پیچھے ہٹ گیا کیونکہ زاہد نے ٹارچ کی روشنی اس کے چہرے پر ڈالی تھی۔

زاہد کے پیچھے دادا جان بھی کمرے میں داخل ہو گئے... پھر زاہد نے بھاری آواز میں کہا۔

"یہ پستول ہیں۔ انہیں دیکھ رہے ہو؟"

"ارے... بب... باپ رے... پپ... پستول..." تینوں کی کانپتی ہوئی آواز سنائی دی۔

"تاش کی گڈی کہاں ہے؟" زاہد نے اسی بدلی ہوئی آواز میں کہا۔

"فف... فضل کے پاس۔"

"نکالو..." زاہد گرجا اور تاش کی گڈی اس کے ہاتھ میں آ گئی۔ "پیسے کہاں ہیں؟" اور ریزگاری کے ساتھ چند نوٹ بھی زاہد کی جیب میں آ گئے۔

"اب تم لوگ دیوار کی طرف رخ کر کے کھڑے ہو جاؤ، ورنہ سب کی کمر میں سوراخ ہو جائیں گے۔"

تینوں کانپتے ہوئے دیوار سے جا لگے۔ زاہد اور دادا جان چپکے سے باہر نکل آئے۔

دادا جان ہنسی سے لوٹ پوٹ ہو رہے تھے: "پتہ نہیں، ان سروں کی کیا حالت ہوئی ہے، ہمارے بعد۔"

"کیسا تجربہ رہا، دادا جان؟"

"بھئی، بہت عمدہ، بے حد شاندار۔ اس طرح ہمیں کم از کم، اپنے گھر کا جائزہ لینے کا بھی موقع مل گیا۔ گویا یہ لوگ کوارٹروں میں جوا کھیلتے ہیں اور رحیم داد اپنی بیوی سے چھپ کر جوا کھیلنے آتا ہے۔ بہرصورت سب کے مشاغل معلوم ہو گئے۔ اب کیا ارادہ ہے؟"

"ابھی تو کچھ نہیں، دادا جان! یہ تو یوں سمجھئے کہ ہم نے ابتدا کی تھی۔ اب اس کے بعد، دوسری کارروائیاں عمل میں آئیں گی۔ میرا خیال ہے، ان لوگوں سے صبح بات چیت کر لی جائے۔"

"ٹھیک ہے،" دادا جان نے جواب دیا۔

دوسرے دن سب سے پہلے رحیم داد کو طلب کیا گیا۔ ناشتے کے بعد وہ کھانا پکانے میں مصروف تھا۔ کھانا پکانے کی ذمے داری اپنی بیوی کو سونپ کر وہ، دادا جان کے پاس پہنچ گیا۔

"جی، دادا جان؟" اس نے گردن جھکا کر پوچھا۔ زاہد بھی دادا جان کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔

"رحیم داد! تمھارے بارے میں کچھ اطلاعات ملی ہیں۔"

"کیسی، دادا جان؟" رحیم داد نے پوچھا۔

"جوا کھیلتے ہو؟" دادا جان نے اُسے کڑی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ رحیم داد کا چہرہ اُتر گیا۔

"ک ک... کس سالے نے کہا، آپ سے دادا جان! ماں قسم، میں تو کبھی تاش کو ہاتھ بھی نہیں لگاتا۔ قسم لے لیں، زندگی میں کبھی جوئے کا نام بھی لیا ہو۔" رحیم داد نے کہا۔

"رحیم داد! قسم بھی کھا رہے ہو؟"

"جھوٹی تھوڑی ہے دادا جان! ماں قسم، مجھے تو جوا آتا بھی نہیں ہے۔"

"ہوں..." دادا جان نے تاش کی گڈی اور پیسے نکال کر اس کے سامنے رکھ دیے۔ رحیم داد کی آنکھیں حیرت اور خوف سے پھیل گئیں۔

"پہچان گئے، اس گڈی کو؟"

"گ گ... گڈی تو نہیں لیکن پیسے میرے ہیں۔"

"اب بھی جھوٹ بول رہے ہو؟"

"معاف کردیں، دادا جان! معاف کردیں۔ کان پکڑتا ہوں... آئندہ ایسا نہیں ہوگا۔ بس ایک بار معاف کردیں۔"

"تمھیں کتنی تنخواہ مل رہی ہے، رحیم داد؟"

"جی چار سو۔"

"اور تمھاری بیوی کو؟"

"تین سو، جی۔"

"کیا تم تین سو روپے ماہوار اور کمانا چاہتے ہو؟"

"ایں... ہاں، دادا جان! کیا تنخواہ بڑھے گی ہماری؟"

"نہیں، تمھیں کچھ اور کام کرنے ہوں گے۔ اگر تم چاہو تو جمیلہ کو بھی تین سو روپے ماہوار الگ مل سکتے ہیں۔"

"ماں قسم، دادا جان! سارے دلدر دور ہو جائیں گے۔ سارا قرضہ اُتر جائے گا۔ بڑا قرض ہے، دادا جان!"

"تو تمھیں یہ کام منظور ہے؟"

"کیا کام کرنا ہوگا، جی؟"

"وہ، تمھیں بعد میں بتایا جائے گا۔"

"کوئی بھی کام ہو، جی... میں تیار ہوں۔"

"سنو، رحیم داد! ایک بات کان کھول کر سن لو۔ اگر کبھی کسی کے سامنے زبان کھولی تو ایسی سزا ملے گی کہ زندگی بھر یاد رکھوگے... اور جھوٹ کبھی نہیں بولوگے۔"

"ٹھیک ہے، دادا جان!" رحیم داد نے کہا۔

"اس میں تمھارے کتنے پیسے تھے؟"

"سات روپے بیس پیسے۔" رحیم داد نے کہا اور دادا جان نے وہ رقم اسے واپس کردی۔

فضل اور رمضان بھی جاسوسوں کی اس ٹیم میں شامل ہو گئے... جمیلہ بھی تین سو روپے ماہوار کمانے کی خوشی میں دادا جان کے احکامات پر عمل کرنے پر تیار ہو گئی تھی اور ان لوگوں کو ان کے کام بتا دیے گئے تھے... نتیجے میں جو کچھ سامنے آیا۔ اس کی تفصیل کچھ یوں تھی۔

سامنے والی کوٹھی میں شیخ عبدالجلیل صاحب رہتے تھے جن کی بیگم نوجوان تھیں۔ جب کہ شیخ صاحب کی عمر پچپن یا ساٹھ سال تھی۔ دونوں میاں بیوی میں دن، رات جھگڑا رہتا تھا اور اس جھگڑے کی بنیاد بیگم صاحبہ کا ماموں زاد بھائی تھا جو شیخ صاحب کے دفتر جاتے ہی ان کے گھر آجایا کرتا تھا اور ان کی دفتر سے واپسی سے پہلے چلا جایا کرتا تھا۔

گھر کے ملازم، بیگم صاحبہ کو بلیک میل کیا کرتے تھے اور اچھی خاصی رقمیں اینٹھ لیتے تھے۔ شیخ صاحب کا چمڑے کا کاروبار تھا۔ وہ کھالیں پکانے کی ایک فیکٹری کے مالک تھے اور ان کی معاشی حالت خاصی بہتر تھی۔ جس کا اندازہ، ان کے گھر کے ٹھاٹ باٹ سے ہوتا تھا۔

— برابر والی کوٹھی میں جو صاحب رہتے تھے، وہ بینک میں ملازم تھے، بینک کی طرف سے یہ کوٹھی انہیں کرائے پر ملی تھی۔ کوئی بڑے افسر تھے۔ میاں، بیوی ہنسی خوشی رہتے تھے۔ بیگم صاحبہ کا میکہ کسی دوسرے شہر میں تھا لیکن وہ میکے نہیں جاتی تھیں۔ ان کے عزیز و اقارب وہیں ان سے ملنے آجاتے تھے۔ اس طرح قرب و جوار کی کئی کوٹھیوں کا احوال بھی سامنے آگیا تھا۔

جمیلہ نے زاہد کے پروگرام پر عمل کرتے ہوئے یہ ساری معلومات اُسے فراہم کی تھیں۔ ہر چیز کا ایک باقاعدہ فائل تیار ہوتا تھا۔ اس کے بعد افضل اور رمضان تھے، انہیں جو ہدایات ملتی تھیں، اسی کے تحت وہ بھی کام کرتے تھے۔

چنانچہ اس سلسلے میں زاہد نے اپنے طور پر شجاع احمد صاحب کے بارے میں معلومات حاصل کی تھیں۔ شجاع احمد صاحب کے تمام معمولات اس کے علم میں آچکے تھے۔ کہاں کہاں جاتے ہیں، کیا کیا کرتے ہیں... یہ ساری باتیں، اس نے باقاعدہ درج کرلی تھیں لیکن ان میں کچھ ایسے... پوائنٹ بھی تھے جنہیں اس نے دادا جان سے بھی چھپایا تھا۔ اسے اس کارروائی سے بہت خوشی تھی۔ وہ، شجاع احمد صاحب کے بارے میں ایک ایک بات جمع کر رہا تھا۔

دوسری طرف حسام احمد صاحب بھی بہت خوش تھے۔ درحقیقت، انہیں زندگی کا لطف آگیا تھا۔ ان کی تجسس پسند فطرت کی تسکین ہو رہی تھی اور زاہد، ان کی آنکھوں کا تارا بنتا جا رہا تھا۔

ایک وہی کیا، زاہد تو سب کی آنکھوں کا تارا تھا۔ احمد رضا میڈیکل کا اسٹوڈنٹ تھا اور آخری سال کے امتحان کی تیاری کر رہا تھا۔ اسے کوئی ضرورت پیش آتی تو زاہد اس کا مددگار تھا۔ بائیولوجی میں اسے کمال دسترس تھی۔ فیصل کو ٹیبل ٹینس کا شوق تھا۔ وہ اپنے کالج کا چیمپئن تھا لیکن زاہد سے وہ کبھی ایک گیم بھی نہ جیت سکا تھا۔ یہی کیفیت قدسیہ اور شاذیہ کی تھی۔

اور تو اور، بیگم صاحبہ بھی اب ہر وقت زاہد زاہد پکارا کرتی تھیں۔ ہر کام میں مشورہ، ہر ضرورت میں زاہد۔ اس طرح زاہد، اس پورے گھرانے کی اہم ضرورت بن گیا تھا۔ سب اس کے گن گاتے تھے۔ یہ ساری باتیں تھیں لیکن زاہد ابھی خود کو نامکمل سمجھتا تھا۔ اسے تو ابھی بہت کچھ کرنا تھا۔ بہت کچھ...

◆

شمشیر زماں کی موت بدترین حادثہ تھی جس نے اس حویلی کے ماحول کو تہہ و بالا کر کے رکھ دیا تھا۔ پوری حویلی اداسیوں میں ڈوب گئی تھی۔ وہ اتنا چھوڑ کر مرے تھے کہ حویلی کے مکین پشتوں تک پریشان نہ ہوتے لیکن ان کی کمی کون پوری کر سکتا تھا، ان کے دم سے تو بہت سوں کے دم تھے۔

بڑی تبدیلیاں ہوئیں۔ بہت سے پرانے ملازم نکال دیئے گئے۔ حویلی کے معمولات بدل گئے۔ بیگم صاحبہ شروع ہی سے سنگدل اور بدفطرت تھیں۔ ان کے چند خوشامدی اور حرام خور رشتے دار، ان کے گرد منڈلانے لگے۔ حویلی میں نئے نئے لوگوں کا اضافہ ہو گیا۔

لیکن ان حالات کا اثر ابھی تک نہ جانے کیوں، بدنصیب حسینہ پر نہیں پڑا تھا۔ وہ تو اب بالکل تنہا رہ گئی تھی۔ اس کی ہمدرد فضیلت خالہ تو کب کی مر چکی تھیں۔ یوں تو حویلی کے بہت سے لوگ اس سے ہمدردی رکھتے تھے لیکن وہ بے چارے اس کے لئے کر بھی کیا سکتے تھے۔

شاہدہ بیگم، بیگم شمشیر زماں کی پھوپی زاد بہن تھیں۔ شوہر ہمیشہ کے نکھٹو تھے۔ بیٹے بھی باپ کی روش پر چل رہے تھے۔ انہیں یہ بہترین موقعہ ہاتھ آگیا۔ روتی، پیٹتی بیگم صاحبہ کے پاس پہنچ گئیں۔ ساز و سامان ساتھ تھا۔

"ہائے مہر النساء! تو اکیلی رہ گئی۔ شمشیر بھائی کی صورت اب کہاں ملے گی! ہائے، کیسے خوش مزاج انسان تھے۔" وہ بین کرنے لگیں۔ بیگم صاحبہ بھی ان کے ساتھ آنسو بہانے لگیں۔

"رفیق کے ابا تو بس جان کھوئے جا رہے ہیں، اپنی۔ لاکھ سمجھا رہی ہوں کہ تم تو کبھی ملتے بھی نہ تھے، ان سے۔ اب رونے سے کیا فائدہ...؟ کہنے لگے کہ تم کیا جانو، شمشیر بھائی جیسے تو کبھی کبھی ہی پیدا ہوتے ہیں۔ کون جانے کہ کس کس کی مدد کرتے تھے۔ اب تم یہی دیکھ لو کہ میں کتنی دور رہتی تھی، ان سے لیکن مجھے بھی تین سو روپے ماہوار بھجوایا کرتے تھے۔"

"تین سو روپے ماہوار؟" بیگم صاحبہ چونکیں۔

"ہاں۔ ارے، بڑے فیاض تھے وہ۔ نہ جانے کتنوں کے گھر چلتے تھے۔ ان کے دم سے۔ تجھے کیا معلوم مہر النساء! خیر چھوڑو، ان باتوں کو۔ رفیق کے ابا کہتے ہیں کہ وہ اب کہیں نہیں جائیں گے۔ اسی ڈیوڑھی میں پڑے رہیں گے۔ اکیلا تھوڑی چھوڑنا ہے مہر النساء کو اور بھلا شمشیر بھائی کا گھر کسی غیر کا گھر... تھوڑی ہے۔ بچوں کی دیکھ بھال ہے، حویلی کی دیکھ بھال ہے... اور نہ جانے کیا کیا ہے، میں نہیں کروں گا تو اور کون کرے گا۔ شمشیر بھائی کو تو خدا نے بیٹا دیا ہی نہیں۔ بیٹیاں ہی بیٹیاں ہیں اور اگر بیٹیوں کے سر پر... بزرگوں کا سایہ نہ ہو تو وہ کیا کریں گی؟"

بیگم صاحبہ خاموش ہو گئیں۔ ایسی کوئی خاص بات بھی نہ تھی حویلی میں بہتیرے پلتے تھے، یہ لوگ بھی یہیں رہ پڑیں گے تو کیا ہوگا... لیکن شاہدہ بیگم تو کسی اور ارادے سے آئی تھیں۔ دو نکھٹو بیٹوں کی ماں تھیں، اور شمشیر زماں کی تین بیٹیاں تھیں۔ اگر بات بن جائے تو پھر لطف ہی آجائے گا۔ بہرحال ان کی رہائش کے لئے بندوبست کر دیا گیا۔

شاہدہ بیگم ہی کی اپج تھی کہ اخراجات کم کئے جائیں اور اس کا واحد حل یہی ہے کہ ملازموں کی فوج کو نکال دیا جائے۔ بھلا کیا ضرورت ہے، ان سب کی۔ ایک خانساماں، ایک مالی، ایک چوکیدار اور دو گھر کے کام کرنے والے، بس کافی ہیں۔

بیگم صاحبہ تو بوکھلائی ہوئی تھیں۔ باپ مر چکے تھے لیکن باپ بھی ان کا سہارا نہ تھے۔ وہ بیاہ کر بھول گئے تھے۔ مہر النساء، ان سے کبھی خوش نہ رہی تھیں۔ اب بیوہ ہو گئی تھیں تو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر چاروں طرف دیکھ رہی تھیں۔ کوئی تو اپنا ہو جو سر پر ہاتھ رکھے۔ لاکھ جائداد سہی، کاروبار سہی لیکن ان کا کوئی نگران تو ہو ورنہ یہ نوکر چاکر تو کہیں کا نہ... چھوڑیں گے۔

اب توفیق صاحب نے آکر سر پر ہاتھ رکھا تو بڑی ڈھارس ہوئی۔ نوکروں کی فہرست بنائی گئی اور جو پشتینی ملازم تھے، برسوں کے بعد حویلی چھوڑنے پر مجبور ہو گئے۔ ان کا اب کوئی پرسان حال نہ تھا۔

شاہدہ بیگم آہستہ آہستہ پنجے گاڑ رہی تھیں۔ رفیق اور شفیق اب بڑے باقاعدہ ہو گئے تھے۔ حلیے ہی بدل گئے تھے، ان کے۔ پڑھنے لکھنے سے تو کوئی دلچسپی تھی ہی نہیں۔ کھیل کود کے رسیا تھے۔ پہلے تاش اور نکیسی کھیلتے تھے، اب کرکٹ اور بیڈمنٹن کھیلنے لگے۔ ان کے یہ سارے شوق خالہ جان ہی پورے کرتی تھیں۔ اپنے بچے جو تھے۔

نوبت حسینہ پر بھی آگئی۔ ابھی تک شاہدہ بیگم نے اسے گھر کی صفائی ہی کرتے دیکھا تھا اور کوئی توجہ نہیں دی تھی۔ پھر ایک دن انہیں کچھ یاد آیا تو بولیں۔

"اے مہرالنسا! ایک بات تو بتا۔"
"جی، شاہدہ باجی!"
"ایک قصہ سنا تھا، ایک دفعہ۔"
"کیسا قصہ؟"
"خدا جنت نصیب کرے شمشیر بھائی کو۔ کوئی عورت لا ڈالی تھی، گھر میں۔"
"اب ان باتوں سے کیا فائدہ، شاہدہ باجی!" بیگم صاحبہ نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا۔
"ہُوا تھا، ایسا؟"
"ہاں، ہُوا تھا۔" بیگم صاحبہ غمگین لہجے میں بولیں۔
"پھر کہاں گئی وہ کلموہی؟ نکال باہر کیا، تو نے؟"
"نہیں، شاہدہ باجی! انہوں نے ہمیشہ اس کی مدد کی۔ سب کچھ سُن لیتے تھے مگر اس کے بارے میں کچھ نہیں سُنتے تھے۔"
"الگ گھر لے کر رکھا ہوگا، اُسے؟"
"کہاں... یہیں رہتی ہے تم نے دیکھا نہیں، اُسے؟"
"ایں! اب بھی یہیں رہتی ہے، کیا؟"
"ہاں، وہ ہے نا، حسینہ... وہی کمبخت تو ہے۔"
"ارے، توبہ، حسینہ... اچھا میں تو سوچ بھی نہیں سکتی تھی... مگر بی بی! میں تو اُسے گھر کی ملازمہ ہی سمجھی تھی۔"
"ہاں! ہمیشہ ملازمہ کی حیثیت ہی سے رہی۔ کبھی سر نہیں اُٹھایا اس لیے پڑا رہنے دیا۔ جب کہ مرحوم ہمیشہ یہی کہتے تھے کہ اس سے اُن کا کوئی ناتہ نہیں ہے، بس ایک پریشان حال عورت سمجھ کر گھر میں ڈال رکھا ہے۔" مہرالنسا نے بتایا۔
"اللہ کی مار! ابھی تک یہیں پڑی ہے... اور تیرا بھی دل ہے کہ اُسے آج تک برداشت کیے جا رہی ہے۔ توبہ! کیسی انوکھی بات ہے۔ بی بی! تُو نے تو کمال ہی کر دیا۔ ارے، نکال باہر کر، اس کلموہی کو۔ جب تک تیرے سینے پر مونگ دلتی رہی، دلتی رہی۔ اب اس کا اس گھر میں کیا کام۔ سُنا ہے، اس کے ایک بیٹا بھی ہُوا تھا؟"
"ہاں..."
"وہ کہاں گیا؟"
"بھاگ گیا، ایک دن گھر سے اور اس کے بعد سے آج تک اس کا کوئی پتہ نہیں چل سکا۔ اب تو چودہ سال ہو گئے۔ مر کھپ گیا ہوگا، کم بخت! اب کیا ملے گا۔"
"ہُوں..." شاہدہ بیگم نے پُرخیال انداز میں گردن ہلائی پھر بولیں۔ "بی بی! اس ہَوا میں نہ رہنا۔ ہاں، ایک بات اور بتاؤ مجھے۔"
"جی پوچھیے۔"
"نکاح کیا تھا، شمشیر زماں نے اس سے؟"
"یہ نہیں معلوم۔"
"وہ تو شاید گونگی ہے۔" شاہدہ بیگم کی دلچسپی بڑھتی جا رہی تھی۔
"ہاں۔" مہرالنسا بیگم نے جواب دیا۔
"سُنا ہے، اسی حادثے میں اس کی قوتِ گویائی ختم ہو گئی تھی۔ اس سے پہلے بولتی چالتی تھی۔"
"مجھے کیا معلوم، شاہدہ باجی! میں اُسے پہلے سے تھوڑی جانتی تھی۔" مہرالنسا بیگم نے منہ بنا کر کہا۔
"ہُوں... اس کا مطلب ہے کہ خطرہ موجود ہے۔ مہرالنسا، حالات ٹھیک نہیں ہیں۔ شمشیر بھائی زندہ تھے تو دوسری بات تھی۔ کسی دشمن کی مجال نہیں تھی کہ کوئی غلط کام کر جاتا لیکن اب صورتِ حال دوسری ہے۔ کل کو اس عورت کا بیٹا آ جائے اور یہ عورت دعویٰ کر دے کہ شمشیر بھائی نے اس سے نکاح کیا تھا۔ اس طرح اس کا بیٹا بھی جائداد کا حصے دار ہوگا۔ تو مصیبت میں پھنس جائے گی، مہرالنسا!"
"تو پھر کیا کروں میں؟"
"نکال باہر کر، لعنتی ماری کو۔ اب اس کے یہاں رہنے کی کیا تُک ہے؟" شاہدہ بیگم نے کہا تو مہرالنسا بیگم سوچ میں ڈوب گئیں۔ پھر بولیں۔
"میں نے یہ سوچ کر اسے پڑا رہنے دیا تھا کہ اب تو کھیل ہی ختم ہو گیا ہے۔ اب اس سے کیا خطرہ۔ مگر تمہاری یہ بات تو ٹھیک ہی معلوم ہوتی ہے۔"
"فوراً نکال باہر کرو۔ اس کا گھر میں رہنا ٹھیک نہیں ہے... جائداد کے کاغذات میں تو اس کا تذکرہ نہیں ہے؟"
"پتہ نہیں..."
"کاغذات ہیں، کہاں؟"
"وکیل صاحب کے پاس... اور وکیل صاحب شہر میں رہتے ہیں چند روز قبل مجھ سے ملنے آئے تھے۔"
"تم نے پوچھا تھا، کاغذات کے بارے میں؟"
"نہیں... بلکہ وہ خود ہی پوچھ رہے تھے کہ کوئی اُلجھن تو نہیں ہے۔"
"میں یوں کرتی ہوں کہ رفیق کے ابا سے کہتی ہوں کہ وکیل صاحب سے حساب کتاب سمجھ لیں۔ وہ یہ کام ٹھیک کر لیں گے۔"
"ٹھیک ہے۔ میں، علیم دین کو بھیج کر وکیل صاحب کو بلوائے لیتی ہوں۔"
"بالکل بلوا لو۔ ایسا کرتے ہیں، جب تک وکیل صاحب سے

معلومات نہیں ہو جاتیں اُسے رہنے دیتے ہیں اور جُونہی پتہ چلا... اُسے نکال دیں گے۔"

"جیسی آپ کی مرضی، شاہدہ باجی! میرا تو سر چکرا کر رہ گیا ہے۔ کوئی بات سمجھ میں نہیں آتی۔"

"اے تو تجھے سمجھنے کی کیا ضرورت ہے۔ اللہ رکھے، تیرے اپنے وجود ہیں، سب سنبھال لیں گے۔ تو اُدھر علم دین کو بھیج، میں رفیق کے ابا سے بات کئے لیتی ہوں۔"

یہ ساری گفتگو گھر کا ایک پُرانا ملازم سُن رہا تھا۔ وہ، شمشیر زماں سے اچھی طرح واقف تھا۔ اُن کی خدا ترسی اور دریا دلی کو بھی جانتا تھا... کئی بار شمشیر زماں نے اس کی مالی امداد بھی کی تھی۔ اس طرح اُس نے ایک چھوٹا سا جھونپڑا بنالیا تھا جو کرائے پر اُٹھا ہوا تھا۔ تھوڑے دن پہلے کرائے دار اس جھونپڑے کو چھوڑ کر چلے گئے تھے۔

اُس نے سُنا تو فکرمند ہو گیا۔ حسینہ کو اچھی طرح جانتا تھا۔ پوری زندگی بے چاری نے یہیں بسر کردی تھی۔ نیک اور شریف عورت تھی۔ اس کی ذات سے کبھی کسی کو کوئی معمولی سی تکلیف بھی نہیں پہنچی تھی۔

کرم دین نے حسینہ کے خلاف یہ سازش سُنی تو دل مسوس کر رہ گیا۔ اپنی بیوی کے پاس پہنچا تو ساری صورتِ حال، اُسے کہہ سُنائی۔

"مظلوم حسینہ بھی ماری گئی۔ اُس کا تو اس بھری دُنیا میں کوئی نہیں ہے" کرم دین نے افسوس بھرے لہجے میں کہا۔

"مگر اب وہ بے چاری کرے گی کیا؟"

"کیا معلوم۔ ہم تو اُسے اپنے کوارٹر میں بھی نہیں رکھ سکتے۔"

"ارے توبہ کرو، شامت آجائے گی ہماری۔ ہمیں بھی یہاں سے نکال باہر کیا جائے گا۔ اب رہ ہی کون گیا ہے یہاں۔ شمشیر صاحب کے مرتے ہی انقلاب آگیا ہے... مگر، کرم دین! کچھ تو کرو، اس بے چاری کے لئے... ستیاناس ہو، اُن لوگوں کا، جو خوامخواہ ہی دوسروں کے دُشمن ہو جاتے ہیں۔ بھلا شاہدہ بی بی کو کیا پڑی تھی کہ سب کے ساتھ یہ سلوک کرایا۔ خدا غارت کرے اسے۔ نہ جانے کیا سوچ کر اس حویلی میں آئی ہے۔" کرم دین کی بیوی شاہدہ بیگم کو کوسنے لگی۔

"اب ان باتوں سے کوئی فائدہ نہیں۔ یہ بتاؤ کہ حسینہ کے لئے کیا کیا جائے؟"

"ہماری جھونپڑی خالی پڑی ہے۔ بیس رُوپے مہینہ کرایہ آتا تھا، اس کا اب کرائے دار نہیں رکھیں گے، حسینہ کو وہاں چھوڑ آئیں گے۔ اچھے سے اُس کی مدد ہو جائے گی۔ اللہ اس کا بدلہ دے گا۔"

"ٹھیک ہے۔ ہمارے دل، اِن دولت مندوں کی طرح چھوٹے تھوڑی ہیں۔ ہم اُس کی مدد کریں گے۔" دونوں نے فیصلہ کرلیا۔

وکیل حمایت بیگ صاحب آئے۔ توفیق صاحب نے اُن سے کُرید کُرید کر باتیں پوچھیں۔ جن باتوں کی مرحوم نے ہدایت کردی تھی کہ کسی کو نہ بتائی جائیں وہ صیغہ راز میں رہیں۔ باقی جائداد کی تفصیل بتادی گئی۔ توفیق صاحب بھی بڑے خرانٹ تھے۔ چنانچہ بولے۔

"کچھ وظائف وغیرہ بھی تو جاتے تھے، لوگوں کو؟"

"جی ہاں... جاتے تو تھے۔"

"اب بند کر دیئے جائیں۔ یہ مہرالنسا بہن کی خواہش ہے۔"

"بہتر ہے۔ افسوس تو یہ ہے کہ شمشیر زماں مرحوم نے کوئی وصیت نہیں چھوڑی۔ بہرحال اگر بیگم صاحبہ کی خواہش ہے تو اس پر عمل ہوگا۔"

وکیل صاحب کے جانے کے بعد توفیق صاحب نے شاہدہ بیگم کو اطمینان دلادیا کہ ایسی کوئی بات نہیں ہے... اور شاہدہ بیگم نے مہرالنسا بیگم کو۔ اس کے بعد حسینہ کے لئے اس گھر میں کوئی گنجائش نہیں تھی... لہٰذا دونوں شیطان صفت عورتیں اس کی تلاش میں چل پڑیں۔

وسیع و عریض ڈرائنگ رُوم میں حسینہ فرنیچر صاف کر رہی تھی... دُبلی پتلی حسینہ بھی اب بوڑھی ہو گئی تھی۔ بال جگہ جگہ سے سفید ہو گئے تھے لیکن چہرہ بھی بالوں کی طرح سفید تھا۔ نقش و نگار اب بھی اُتنے ہی پاکیزہ اور حسین تھے جنہیں دیکھ کر مہرالنسا بیگم ہمیشہ احساس کمتری کا شکار ہو جایا کرتی تھیں۔

"حسینہ..." مہرالنسا بیگم نے بارُعب لہجے میں پکارا... اور وہ چونک کر انہیں دیکھنے لگی۔ "یہاں آؤ۔"

حسینہ صفائی کا کپڑا کندھے پر ڈال کر اُن کے سامنے آکھڑی ہوئی۔

"تمہیں معلوم ہے حسینہ! اب حویلی کے حالات بدل چکے ہیں۔ ہم نے بہت سے نوکروں کو نکال دیا ہے۔"

حسینہ کا چہرہ زرد ہو گیا۔ اُس کی خوبصورت آنکھوں میں خوف کے سائے لہرانے لگے۔

"مجھے افسوس ہے حسینہ! اب تم بھی یہاں نہیں رہ سکو گی اس لئے آج ہی اپنا کوئی ٹھکانہ کرلو۔"

حسینہ کو چکر آگیا۔ اُس نے گرنے سے بچنے کے لئے ایک کرسی کا سہارا لے لیا تھا۔

"آج ہی سے مُراد، ابھی ہے۔ تم اپنا سامان اُٹھاؤ اور ایک گھنٹے کے اندر اندر حویلی چھوڑ دو۔" شاہدہ نے کہا اور آگے بڑھ کر صفائی کرنے والا کپڑا اس کے کندھے سے اُتار لیا۔ حسینہ نیچے بیٹھ گئی۔

"ان باتوں سے اب کچھ نہیں ہوگا حسینہ بی بی! چلو، اٹھو۔ جو کہا جارہا ہے، اُس پر فوراً عمل کرو۔"

شاہدہ بیگم نے اُسے بازو سے پکڑ کر اُٹھایا اور ڈرائنگ روم سے

باہر لاکر چھوڑدیا۔

حسینہ لڑکھڑاتے قدموں سے اپنے کوارٹر کی طرف جارہی تھی مظلوم عورت کے ذہن میں نہ جانے کیا خیالات ہوں گے جن کے اظہار سے اُن کی زبان قاصر تھی۔

"پچیس سال کے بعد، اُس نے حویلی سے قدم نکالا تھا؟ پچیس سال سے وہ باہر کی دُنیا سے ناواقف تھی کیسی اجنبی ہے یہ دُنیا۔ کیا اس حویلی کے علاوہ بھی کوئی اور جگہ ہے لیکن، اب ... اب کون سا سایہ تلاش کرے، کہاں جائے؟

تبھی کرم دین اس کے پاس آپہنچ گیا۔

"حسینہ... حسینہ بہن!" وہ رُک گئی "کہاں جاؤگی؟" کرم دین نے پُوچھا تو حسینہ کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔

"رو نہیں، بہن! زمین اللہ کی ہے۔ انسان اسے اپنا سمجھتے ہیں، بڑی بھول ہے، اُن کی... آؤ، بہن! ایک چھوٹا سا جھونپڑا ہے، ہمارا۔ وہ تمہارا منتظر ہے۔ اللہ نے چاہا تو جب تک میں زندہ ہوں، تمہیں کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔"

حسینہ نے ایک گہری سانس لے کر آنسو خشک کر لئے اور ایک نئی منزل کی جانب چل پڑی۔ وقت کا کھیل جاری تھا۔

شاہدہ بیگم اپنا کام انجام دے چکی تھیں۔ بیچاری حسینہ، ان کے لئے کیا، آج تک حویلی کے ہر شخص کے لئے بے ضرر رہی تھی۔ اُس نے کسی کا کچھ نہیں بگاڑا تھا، خود، اُس کا سب کچھ بگڑ چکا تھا۔ شاہدہ بیگم نے اُس سے سر چھپانے کا ٹھکانہ بھی چھین لیا تھا۔

انسان اپنے طور پر بہت کچھ بننے کی کوشش کرتا ہے۔ چھوٹی موٹی کامیابیوں کے بعد، وہ خود کو کچھ سمجھ بھی لیتا ہے لیکن کون جانے جسے وہ کامیابی سمجھتا ہے، وہ کیا ہے؟ کہاں کیا حساب ہو رہا ہے اور اس کامیابی کے صلے میں اسے کیا ملنے والا ہے۔ یہ معاملات اور ہی ہاتھوں میں ہوتے ہیں... اور فیصلہ کرنے والا فیصلہ کرتا ہے۔

جو نعمت مہرالنساء بیگم نے شاہدہ بیگم کے کہنے سے کھودی تھی، وہ کرم دین جیسے معمولی شخص نے حاصل کرلی تھی اور کرم دین کو اس کے عوض کیا ملا؟... یہ تصور قبل از وقت ہے۔ ہاں نیکیاں پہلا انعام دلی سکون کی صورت میں دیتی ہیں اور دیکھا جائے تو یہ سکون کسی ... چیز کے عوض نہیں ملتا... دونوں میاں بیوی حسینہ کی مدد کر کے بہت خوش تھے اور حتی الامکان، اُس کی دلجوئی کرتے تھے۔

دوسری طرف توفیق صاحب پنجے گاڑتے جا رہے تھے۔ حویلی پر اُن کی گرفت سخت سے سخت ہوتی جا رہی تھی۔ شفیق اور رفیق، اب بڑے آدمیوں کی طرح رہنے لگے تھے۔ وہ اب خود کو اس حویلی کا داماد سمجھ بیٹھے تھے۔ یوں مہرالنساء بیگم کی تباہی کا آغاز ہوگیا تھا لیکن وہ اس تباہی سے بے نیاز، ان لوگوں کے ہاتھوں میں کھلونا بنی ہوئی تھیں۔

کافی وقت گزر گیا معمولات میں کوئی تبدیلی رُونما نہیں ہوئی... شمشیر زماں کی چھوٹی بیٹی نشاط، شہر میں پڑھتی تھی اور وہیں ہوسٹل میں رہتی تھی۔ چھٹیوں میں وہ ہمیشہ گھر آجاتی تھی اور اُس کے گھر آنے سے گھر میں بڑی رونق ہوجاتی تھی کیونکہ وہ بے حد ہنس مکھ اور خوش مزاج تھی۔ ہر وقت نئی نئی شرارتیں کرتی رہتی تھی اور حویلی کا سناٹا رونق میں بدل جاتا تھا۔

اس بار بھی اُس کی آمد کا انتظار تھا۔ دونوں بہنیں بے چینی سے اُس کے تار کا انتظار کر رہی تھیں۔ تینوں بہنوں میں آپس میں بہت پیار تھا۔ حویلی کے معاملات سے بے نیاز، وہ اپنے آپ میں مگن رہتی تھیں پھر جب نشاط کا تار آیا تو بہنیں خوش ہوگئیں۔

توفیق صاحب جو اب اس گھر کے بڑے تھے، اپنے دونوں بیٹوں کے ساتھ کار لے کر دُور دراز ریلوے اسٹیشن پہنچ گئے۔ گھر کے ایک ملازم کو بھی ساتھ لے لیا گیا تھا۔

فرسٹ کلاس کمپارٹمنٹ سے نشاط اُتری تو ملازم نے آگے بڑھنے کی کوشش کی لیکن توفیق صاحب نے اُسے روک دیا اور شفیق سے بولے۔

"جاؤ، شفیق! تم دیکھو۔"

شفیق جلدی سے آگے بڑھ کر نشاط کے قریب پہنچ گیا۔

"ہیلو، نشاط!" اُس نے مُسکراتے ہُوئے کہا اور نشاط چونک کر اُسے دیکھنے لگی۔

"کون ہیں آپ؟"

"بوجھو تو جانیں۔" شفیق بولا۔

"بتّو کاکا کے بیٹے ہو؟"

"ایں... نن... نہیں تو۔" وہ گڑبڑا گیا۔

"شکل تو اُنہی سے ملتی جلتی ہے۔"

"چلو، تعارف بعد میں ہوتا رہے گا۔"

"کہاں چلوں؟" وہ تعجب سے بولی۔

"گھر نہیں چلوگی؟"

"ضرورت سے زیادہ اسمارٹ بننے کی کوشش فرما رہے ہیں، آپ۔ اُتاروں چپل؟" نشاط آنکھیں نکال کر بولی تو شفیق کی سٹی گم ہوگئی۔

"اوہ، نشاط! میں، تمہارا خالہ زاد بھائی ہوں۔" اُس نے گھبرائے ہُوئے لہجے میں کہا۔

"کون نشاط... آپ اپنا چشمہ گھر بھول آئے ہیں کیا؟"

"ایں... " شفیق چونک پڑا۔ اس نے گھبرائے ہوئے انداز میں اِدھر اُدھر دیکھا۔ وہ نشاط کو نہیں پہچانتا تھا۔ کبھی دیکھا ہی نہیں تھا۔ لیکن اشارہ تو اسی لڑکی کی طرف کیا گیا تھا۔

اسی وقت ایک اور لڑکی نشاط کے عقب میں نظر آئی۔ یہ بھی اچھی خاصی شکل و صورت کی مالک تھی اور شہر ہی سے آئی ہوئی معلوم ہوتی تھی اور وہ متلاشی نگاہوں سے اِدھر اُدھر دیکھ رہی تھی۔

شفیق نے سوچا، غلط فہمی ہو گئی۔ اگر یہ نشاط نہیں ہے تو یقیناً وہ ہو گی۔ وہ اس کی طرف لپکا۔

"اوہ! ہیلو، نشاط!" اس نے مسکرا کر کہا۔ اور لڑکی چونک کر اس کی طرف دیکھنے لگی۔ اس کے چہرے پر گھبراہٹ کے آثار نمودار ہو گئے تھے۔ اس کے ہاتھ میں ایک وزنی ہینڈ بیگ تھا جسے اٹھانے میں اسے دقت ہو رہی تھی۔

شفیق نے جلدی سے ہینڈ بیگ، اس سے لینے کی کوشش کی تو لڑکی کی سُریلی چیخ نے اسٹیشن پر موجود لوگوں کو اس کی طرف متوجہ کر دیا۔

بہت سے لوگ، ان کے گرد جمع ہو گئے۔ اب صورتِ حال یہ تھی کہ شفیق اور اس لڑکی کے درمیان ہینڈ بیگ چھین لینے کی کوشش ہو رہی تھی۔ ایک نوجوان نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، ایک گھونسہ شفیق کے منہ پر جڑ دیا۔ شفیق کا ہونٹ زخمی ہو گیا اور اس نے ہینڈ بیگ چھوڑ دیا۔

"اُچکا ہے، پکڑلو، مارو، پولیس کے حوالے کر دو۔" نوجوان پُرجوش ہو گئے اور شفیق پر پل پڑے۔ لڑکی کے جو رشتے دار اسے لینے آئے تھے، وہ بھی اس کارِ خیر میں شریک ہو گئے۔

توفیق صاحب نے جو یہ صورتِ حال دیکھی تو رفیق اور ملازم کے ہمراہ دوڑے لیکن شفیق کی خاطر مدارت کرنے والے مجمعے نے انہیں شفیق تک پہنچنے کی مہلت ہی نہیں دی۔ شفیق کے کپڑے پھٹ گئے۔ حلیہ بگڑ گیا۔ بمشکل تمام وہ، ان لوگوں کے چنگل سے نکل سکا تھا۔

نشاط، ملازم کے پاس پہنچ گئی۔ "کہاں رہ گئے تھے آپ، ہاشم بابا؟"

"ارے، بٹیا بی بی! یہیں تو تھا لیکن یہ کیا ہو گیا؟" ملازم بے چارہ بھی پریشان تھا۔ رفیق اور توفیق صاحب لوگوں کو سمجھا رہے تھے۔ پولیس والوں نے شفیق کو پکڑ لیا تھا اور کوئی بات ماننے کو تیار نہیں تھے۔ بہت سی گواہیاں تھیں کہ شفیق کو ہینڈ بیگ چھینتے دیکھا گیا ہے۔

"چلتے کیوں نہیں، ہاشم بابا؟ اور یہ صوفیہ اور نزہت کہاں ہیں؟ مجھے لینے نہیں آئیں؟"

"وہ تو آ رہی تھیں، بی بی، مگر توفیق صاحب نے منع کر دیا کہ [illegible] کے ہوتے ہوئے لڑکیوں کو اسٹیشن جانے کی ضرورت نہیں۔"

"توفیق صاحب کون؟"

"اب یہ ساری باتیں تو تمہیں گھر چل کر ہی معلوم ہوں گی۔"

"تو پھر چلو، گھر۔"

"مگر توفیق صاحب..." ملازم ہچکچایا۔

"پھر تم، توفیق صاحب کے چکر میں پڑے رہو۔ میں تانگہ لے کر گھر چلی جاتی ہوں۔" نشاط نے بگڑ کر کہا۔

"ارے نہیں، نشاط بی بی! بیگم صاحبہ ہمیں زندہ دفن کر دیں گی۔ بس، دو منٹ... میں ابھی معلوم کرتا ہوں، کیا صورتِ حال ہے۔"

اسی وقت توفیق صاحب دوڑتے ہوئے ان کے پاس پہنچ گئے۔

"نشاط بیٹی! یہ کیا ہو گیا، کیسے ہو گیا؟ کیا چکر تھا؟"

"آپ کون ہیں جناب! میں، آپ کو نہیں جانتی۔"

"میں توفیق ہوں۔ تمہارا خالو۔ مجھے نہیں پہچانتیں؟"

"دیکھا تو نہیں ہے کبھی۔ ویسے کیا تکلیف ہے، آپ کو؟" نشاط نے ناک چڑھا کر پوچھا۔

"ارے، وہ شفیق... میرا بیٹا... میرا مطلب ہے..."

"آپ کا جو مطلب ہو، گھر آ کر بیان فرمائیے۔ ہاشم بابا! آپ چل رہے ہیں یا نہیں؟"

"سنو تو سہی، نشاط بیٹی! ذرا پولیس والوں سے کہہ دو کہ تم، شفیق کی خالہ زاد بہن ہو، شمشیر زماں کی بیٹی ہو۔ یہاں تو سارا معاملہ ہی بگڑ گیا ہے۔" توفیق صاحب گھگھیائے۔

"میں، شفیق کی خالہ زاد بہن ہوں اور یہ شفیق کون ہے؟" نشاط نے ناک چڑھا کر پوچھا۔

"میرا بیٹا ہے جو تمہیں... میرا مطلب ہے جو تمہارے پاس گیا تھا۔" توفیق صاحب جلدی سے بولے۔

"وہ، آپ کا بیٹا ہے؟" نشاط نے حیرت سے آنکھیں پھاڑیں۔

"ہاں، ہاں، تمہارا خالہ زاد بھائی، شفیق۔"

"پاگل ہے، کیا؟"

"ایں..." توفیق صاحب متحیرانہ انداز میں بولے۔

"ہاں، میرے پاس آ کر پوچھنے لگا کیا میں، بلّو کاکا کی بیٹی ہوں۔ میں نے منع کر دیا۔ ظاہر ہے، میں کسی بلّو کاکا کو نہیں جانتی۔" نشاط نے معصوم سے انداز میں کہا۔

"یہ کہا تھا، اس نے؟" توفیق صاحب متحیرانہ انداز میں بولے۔

"جی ہاں۔ یہی فرمایا تھا، آپ کے صاحبزادے نے۔"

"مم... مگر وہ تو کہہ رہا ہے کہ تم نے اسے یہ بتایا تھا۔"

"کیا...؟"

"یہ کہ تم، بلّو کاکا کی بیٹی ہو۔"

"میں کیا عرض کر سکتی ہوں، اس سلسلے میں. بہرصورت میں زیادہ دیر نہیں رک سکتی. آپ لوگ اگر دو منٹ میں تشریف لا سکتے ہیں تو بے آئیے ورنہ میں جا رہی ہوں۔"

"تم ذرا پولیس والوں سے یہ الفاظ کہہ دو۔"

"جی نہیں، میں فضول باتیں پسند نہیں کرتی۔"

"وہ پھنس جائے گا. خواہ مخواہ مصیبت پڑے گی۔"

"یہ آپ کا اپنا ذاتی معاملہ ہے. مجھے اس سے کوئی دلچسپی نہیں ہے. ہاشم بابا! آپ چل سکتے ہیں تو چلیں ورنہ میں جا رہی ہوں۔" نشاط نے کہا اور اپنے مختصر سے سامان کے ساتھ آگے بڑھنے لگی.

ہاشم نے ملتجیانہ نگاہوں سے توفیق صاحب کی طرف دیکھا اور بولا.

"سرکار! ہمیں تو جانے ہی دیں ورنہ بیگم صاحبہ بہت ناراض ہوں گی۔"

"ٹھیک ہے. تم جاؤ. میں ان معاملات سے نمٹ کر آتا ہوں۔" توفیق صاحب نے کہا. عجیب ٹیڑھی لڑکی تھی. وہ اچھی خاصی مصیبت میں گرفتار ہو گئے تھے.

نشاط اطمینان سے کار میں آ بیٹھی. ہاشم خان نے ڈرائیونگ سنبھال لی. تھوڑے فاصلے پر پہنچ کر نشاط نے پوچھا.

"تو میرے یہ خالو، توفیق صاحب کب تشریف لائے؟"

"بی بی! ہم اپنی زبان سے کچھ نہیں کہیں گے. ساری باتیں آپ کو گھر چل کر معلوم ہو جائیں گی۔" ہاشم نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا.

"معاملہ کیا ہے؟ میں تم سے پوچھ رہی ہوں، جواب دو۔"

"بس بی بی! یہ توفیق صاحب، ان کی بیگم اور دو بیٹے اب حویلی میں آ کر رہنے لگے ہیں. یہاں آ کر انہوں نے بڑی تباہی مچائی ہے. ہم کہیں گے تو شکایت ہوگی. پر نشاط بی بی! آپ ہمارے سامنے بڑی ہوئی ہیں... ہماری روزی پر لات نہ ماریں. جو کچھ آپ پوچھ رہی ہیں، ہم بتا رہے ہیں ورنہ ہم کبھی شکایت نہ کرتے۔"

"ہوں... کیا تباہی مچائی ہے انہوں نے؟"

"تقریباً آدھے سے زیادہ نوکر حویلی سے نکال دیئے ہیں. باقی ملازموں کو بھی اپنی نوکری کی فکر پڑی ہوئی ہے اور کوئی نہیں کہہ سکتا کہ کب کس کو نکال دیا جائے. اس بے چاری جیننہ کو بھی نکال دیا گیا جبکہ بیس پچیس سال سے اسی حویلی میں رہ رہی تھی. ... حویلی پر انہی کا سکہ چلتا ہے. گھر کے بڑے بن بیٹھے ہیں۔" ہاشم خان نے بتایا... اور نشاط متحیرانہ انداز میں آنکھیں گھمانے لگی.

"مگر یہ حق انہیں کس نے دیا؟"

"میں نے کہا نا، بی بی! مالکان کے معاملات، مالکان ہی جانتے ہیں ہم کیا جانیں. پر اللہ کے واسطے بی بی! تم اس سلسلے میں ہمارا نام مت لینا۔"

"پھر تو اچھا ہی ہوا، ہاشم خان اگر سب کچھ اتفاقیہ طور پر ہوا لیکن خوب ہوا۔" نشاط مطمئن انداز میں بولی. رفیق، شفیق اور توفیق صاحب کی پریشانیوں کا اندازہ کر کے اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی.

تھوڑی دیر بعد کار حویلی میں داخل ہوئی تو نشاط کے استقبال کے لئے سب لوگ موجود تھے. ملازم، مہرالنساء بیگم اور اُن کے قریب کھڑی ہوئی... شاہدہ بیگم. دونوں بہنیں ناراض تھیں اس لئے وہ اپنے کمرے ہی میں تھیں جب نشاط کو کار سے اکیلا اترتے دیکھا تو شاہدہ بیگم حیران رہ گئیں.

"یہ سب کے سب کہاں گئے؟"

"خدا جانے۔"

بہرحال شاہدہ بیگم نے مہرالنساء بیگم سے پہلے آگے بڑھ کر نشاط کو گلے لگانے کی کوشش کی لیکن نشاط پہلو بدل کر ایک طرف ہٹ گئی.

"ارے، آؤ بیٹی! میں، تمہاری خالہ ہوں. آؤ میرے گلے لگ جاؤ۔" شاہدہ بیگم کھسیانے سے انداز میں بولیں.

"سوری... میرے پیٹ میں درد ہے. کوئی دباؤ برداشت نہیں کر سکتی۔" نشاط سرد لہجے میں کہہ کر ماں کے پاس پہنچ گئی. مہرالنساء بیگم نے اُس کی پیشانی کو بوسہ دیا. بوڑھے ملازموں نے سر پر ہاتھ پھیرا. شاہدہ بیگم کو دوبارہ آگے بڑھنے کی جرأت نہیں ہوئی. وہ گہری نگاہوں سے نشاط کو دیکھ رہی تھیں.

"صوفیہ اور نزہت کہاں ہیں، امی؟"

"ناراض ہیں. اپنے کمرے میں گھسی بیٹھی ہیں. آؤ، اندر چلو۔"

مہرالنساء نے اتنا ہی کہا تھا کہ نشاط جلدی سے بول پڑی.

"اسٹیشن پر ایک عجیب واقعہ ہوا، امی!"

"کیا...؟"

"میں اسٹیشن پر اتری ہی تھی کہ ایک لفنگا میرے قریب پہنچ گیا اور بڑے لوفرانہ انداز میں بولا کہ کیا تم ابلو کاکا کی بیٹی ہو؟ میں نے اُسے ڈانٹ دیا تو وہ ایک دوسری لڑکی کا ہینڈ بیگ چھین کر بھاگنے لگا... بس پولیس نے پکڑ لیا اُسے۔"

شاہدہ بیگم نے سنبھالا لے لیا تھا خاموشی مناسب نہ تھی. جلدی سے بولیں۔ "دیکھا، میں نہ کہتی تھی، زمانہ بہت بُرا ہے. لڑکیوں کا اسٹیشن جانا کسی طرح اچھا نہیں... مگر وہ لوگ کہاں رہ گئے؟ ارے، ہاشم! شفیق کے ابا کو کہاں چھوڑ آیا تو؟"

"وہ اسٹیشن ہی پر ہیں بی بی!" ملازم نے جواب دیا.

"کیوں... وہ ساتھ کیوں نہ آئے؟"

"وہ، بی بی! شفیق میاں کو پولیس نے پکڑ لیا. انہوں ہی نے تو اس لڑکی کا ہینڈ بیگ چھین کر بھاگنے کی کوشش کی تھی۔" ہاشم بابا نے کہا اور شاہدہ بیگم کا منہ کھلا رہ گیا... پھر وہ سینے پر دوہتڑ مارنے لگیں.

"ہائے، میرا بیٹا... ارے، اب کیا ہوگا؟ اس نے تو ایسی حرکت کبھی نہیں کی۔ وہ تو بڑا معصوم ہے۔ ضرور کوئی غلط فہمی ہوئی ہوگی۔" شاہدہ بیگم بین کرنے لگیں۔

"امی! اب میں یہیں کھڑی رہوں گی؟ اندر جانے کی اجازت نہیں ملے گی مجھے؟" نشاط چڑ کر بولی۔

مہرالنساء بیگم جو ان واقعات کو سن کر خود بھی ہکابکا رہ گئی تھیں... چونک کر بولیں۔ "ہاں، آؤ... مگر تعجب ہے، سخت تعجب ہے۔" نشاط ان کے ساتھ اندر چل پڑی۔

شاہدہ بیگم بھی پیچھے پیچھے آگئیں۔

"اے، بہن! کچھ ان کے لئے بھی تو کرو۔ میرا دم نکل جائے گا۔ ہائے. میرا بچہ پولیس کے قبضے میں ہے۔"

"نشاط بیٹی، تم اپنے کمرے میں چلو۔ صوفیہ اور نزہت سے ملو۔ میں تھوڑی دیر میں آتی ہوں۔"

"ٹھیک ہے، امی!" نشاط نے کہا اور اندر چلی گئی۔

مہرالنساء نے جلدی سے اپنے پرانے منشی کو بلایا اور بولیں۔ "تم ہاشم کے ساتھ چلے جاؤ۔ ضمانت کی ضرورت ہو تو میری ضمانت دے دینا۔ اگر پولیس شمشیر زماں کے حوالے سے مان جائے تو شفیق کو چھڑا لاؤ۔"

"یہ سب کیا ہوا، مہرالنساء! میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آیا۔" منشی جی کے جانے کے بعد شاہدہ بیگم نے کہا۔

"خدا جانے۔" مہرالنساء بیگم بولیں۔

شفیق ایسا نہیں کر سکتا۔ اُسے ضرورت ہی کیا پڑی ہے۔ اللہ کا دیا سب کچھ ہے۔ ہائے، نہ جانے کیا ہوگیا اُسے۔" شاہدہ بیگم بین کرنے لگیں۔
مہ جبیں کو اُن کی یہ حرکت بُری محسوس ہوئی۔ بیٹی کئی ماہ کے بعد آئی تھی وہ دل کھول کر اُس سے ملنا چاہتی تھیں۔ اخلاقاً شاہدہ بیگم کے پاس رُکی رہیں لیکن ذہن پر بیزاری طاری ہو رہی تھی۔

●

جاسوسوں کی ٹیم شاندار پیمانے پر کام کر رہی تھی۔ پولیس کے تمام گھروں کی تفصیل مہیا ہو چکی تھی اور بہت سے اہم راز سامنے آئے تھے لیکن زاہد شجاع احمد صاحب کے بارے میں جو معلومات حاصل ہوئی تھیں وہ بہت اہم تھیں اور اسے ان معلومات سے بے حد دلچسپی تھی۔ یہ معلومات اُس نے حسام احمد صاحب کو فراہم نہیں کی تھیں۔ اُن پر خفیہ طور پر خود ہی کام کر رہا تھا۔
شجاع احمد صاحب کاروباری مصروفیات میں اس قدر اُلجھے رہتے تھے کہ گھر کے معاملات میں انہیں بہت کم دلچسپی لینے کا موقعہ ملتا تھا لیکن جب گھر آتے تو زاہد ہی کو ہر جگہ پاتے۔ زاہد سے انہیں دلی بغض تھا اور گھر والوں کی اُس سے دلچسپی انہیں سخت ناگوار گزرتی تھی لیکن باپ کے خوف سے وہ، زاہد کو کچھ نہیں کہہ سکتے تھے۔ لے دے کے بیگم صاحبہ ملتی تھیں لہٰذا انہی کی شامت آتی تھی۔ ایک دن کہنے لگے۔
"یہ زاہد کو بہت سر چڑھا لیا گیا ہے، اس کوٹھی میں۔ شاطر آدمی معلوم ہوتا ہے لیکن سمجھ میں نہیں آتا کہ تم لوگ اس سے اتنے متاثر کیوں ہو؟"
"تو آخر وہ بگاڑتا کیا ہے کسی کا۔ نیک اور ہنس مکھ بچہ ہے۔ بالکل اپنے بچوں کی مانند اور وہ بھی اس گھر کو اپنا گھر سمجھتا ہے۔ اس طرح سب میں گھل مل گیا ہے جیسے سب کے سب آپس میں بہن بھائی ہوں۔ آخر آپ کو اس سے کیا کد ہے۔ ہر ایک کے کام آتا ہے۔ پڑھا لکھا ہے۔ ہر معاملے میں معلومات رکھتا ہے۔"
"جی ہاں، جس طرح اُس دن، اُس نے آپ کو بندر بنا دیا تھا..." شجاع احمد صاحب چڑ کر بولے۔
"میں تو ہر شکل میں آپ کو بندر لگتی ہوں۔ بھلا یہ مغربیت بھی کوئی اچھی چیز ہے۔ کون اسے اچھا سمجھتا ہے۔ اپنا چولا اُتار کر، غیروں کا چولا پہن لیا اور اس کے بعد اپنے آپ کو تہذیب یافتہ کہلانے لگے۔"
"مجھ سے بحث کریں گی، اس سلسلے میں؟"
"جی نہیں۔ میں کوئی بحث نہیں کر رہی۔ زاہد کے معاملے میں بات کرنی ہے تو ابا جان سے بات کریں۔ وہ، آپ کو مناسب جواب دیں گے۔"
"یہ سارا کیا دھرا، ابا جان ہی کا تو ہے۔ میں کہتا ہوں، کوئی نقصان پہنچ گیا تو کوئی بھی سنبھالنے کے لئے تیار نہیں ہوگا۔"
"جی نہیں۔ وہ ایسا لڑکا نہیں ہے۔ اُس سے کسی کو کوئی نقصان نہیں پہنچ سکتا۔"
"بہت بہتر۔ جب کسی دن کوٹھی کا صفایا ہوگا تو میں، پولیس میں رپورٹ تک نہیں کراؤں گا۔"
"توبہ کریں، توبہ! وہ بھی کسی ماں کا لعل ہے۔ چوری چکاری ہی کرنا ہوتی تو اتنے دن یہاں نہ ٹکا رہتا اور پھر میں آپ سے کہہ چکی ہوں کہ ابا جان سے بات کریں۔ انہوں ہی نے اسے یہاں رکھا ہے اور اس کے بارے میں تمام لوگوں کو ہدایات جاری کی ہیں۔"
"ابا جان...!" شجاع احمد صاحب دانت پیس کر بولے۔ اُن کی ہمت نہیں پڑ سکتی تھی کہ اب حسام احمد صاحب سے زاہد کے بارے میں بات کرتے۔ ایک آدھ بار دبی زبان سے کہہ کر دیکھ چکے تھے... لیکن اُن کا جواب بہت حوصلہ شکن تھا۔

اس دن شجاع احمد صاحب فارغ تھے۔ اُن کے ایک دوست حاجی نیاز صاحب جو بہت بڑے تاجر تھے، شجاع احمد کے پاس شطرنج کھیلنے کے ارادے سے آ گئے۔ چنانچہ بازی لگ گئی۔
شجاع احمد صاحب کو اس قسم کی تفریحات کا کم ہی موقعہ ملتا تھا شطرنج کے بے تحاشہ شوقین تھے اور اس سلسلے میں کسی دور میں دیوانے تصور کئے جاتے تھے لیکن اب تو سب تفریحات ختم ہو کر رہ گئی تھیں۔ کاروباری مصروفیات ہی پیچھا نہیں چھوڑتی تھیں۔ اب تو کبھی کبھار ہی ایسے موقعے نصیب ہوتے تھے کہ اس قسم کی تفریحات زندگی میں شامل ہو جائیں۔
نیاز صاحب بھی شطرنج کے ماہر کھلاڑی تھے اور اُن کا کھیل شجاع صاحب کو بہت پسند تھا۔ دونوں مصروف تھے کہ زاہد کسی کام سے اِدھر آ نکلا... اور شجاع احمد صاحب کے پیچھے کھڑے ہو کر، اُن کا کھیل دیکھنے لگا۔
شجاع احمد صاحب بُری طرح گھر گئے تھے اور پریشانی سے ہاتھ پر ٹھوڑی ٹکائے بیٹھے، شطرنج کے مہروں کو دیکھ رہے تھے جو اب کسی طرح بھی حاجی نیاز کی گرفت سے نہیں نکل سکتے تھے... پھر انہوں نے ایک مہرے کی طرف ہاتھ بڑھایا تو عقب سے زاہد کی آواز سُنائی دی۔
"ارے، ارے... یہ نہیں۔" دونوں چونک کر اُسے دیکھنے لگے۔
زاہد کو دیکھ کر شجاع احمد صاحب کی پیشانی پر ناگواری کی شکنیں پھیل گئیں۔
"کیا بات ہے؟" وہ تنفر آمیز انداز میں بولے۔
"گھوڑا... گھوڑا... آپ اسے گدھا بنانے پر کیوں تُلے ہوئے ہیں؟" زاہد، شطرنج کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔
"کیوں آئے ہو، یہاں؟"
"گھوڑے کو اِدھر چلیں۔ یہ اس طرف۔" زاہد نے جُھک کر چال چل دی۔ شجاع احمد صاحب ہکا بکا رہ گئے... پھر وہ سینے پر دو ہاتھ رکھ کر بساط کی طرف دیکھنے لگے۔

ایک لمحے کے لیے وہ غلط ہو گئے۔ اس چال نے کھیل ہی بدل دیا تھا لیکن پھر وہ فوراً سنبھل گئے۔

"زاہد! یہاں کیوں آئے ہو؟"

"جی، بس اِدھر سے گزر رہا تھا۔"

"نکل جاؤ یہاں سے۔ گیٹ آؤٹ۔"

"بہتر۔" زاہد نے سر جھکا کر کہا اور باہر نکل گیا۔

حاجی نیاز صاحب پریشانی سے بساط کی طرف دیکھ رہے تھے۔۔ شجاع احمد صاحب بھی اس طرف متوجہ ہو گئے۔ زاہد کو دیکھ کر انہیں خود بخود غصہ آ جاتا تھا لیکن جو چال وہ چل گیا تھا، وہ واقعی انوکھی تھی۔ اس ایک چال نے کھیل کا پانسہ ہی پلٹ دیا تھا۔

"بھئی، یہ چال تو نہیں ہو گی۔" حاجی نیاز بولے۔

"کیوں، نیاز صاحب؟"

"اس لئے کہ تم نے نہیں چلی۔"

"چال چلیں، نیاز صاحب! ممکن ہے میں ہی چل دیتا۔"

"تم اچھے کھلاڑی ہو شجاع احمد... مگر یہ چال... یہ لڑکا کون ہے؟"

"ملازم ہے ہمارا۔"

"مجھے دے دو۔" حاجی نیاز بولے۔

"کیا مطلب؟"

"جو تنخواہ تم اُسے دیتے ہو، میں اس سے دُگنی دوں گا... بات صرف اس سے۔"

"صرف اس ایک چال پر؟"

"ہاں، صرف اس ایک چال سے اندازہ ہو گیا کہ وہ کیا چیز ہے۔ تم نے اسے کمرے سے نکال دیا ورنہ میں، اُس سے ایک بازی کھیلتا۔"

"میں، مالک اور ملازم کے درمیان فاصلہ رکھنے کا قائل ہوں..." شجاع احمد صاحب بولے۔

"اسی لئے کہہ رہا ہوں کہ یہ فاصلہ کچھ اور بڑھا دو۔ میرا مطلب ہے اپنی ... سے میری کوٹھی تک۔"

"آپ اُسے بخوشی لے جائیں۔ مجھے اعتراض نہیں لیکن وہ، اباجان کا ملازم ہے اور یہاں گھر کے تمام لوگ اُس سے خاصے متاثر ہیں۔ اس لئے ... ہو جائے گی۔ البتہ وہ خود ہی چلا جائے تو اور بات ہے۔"

"تم یوں کرو کہ میرا یہ کارڈ رکھ لو، اُسے دے دینا اور اُس سے کہنا کہ ... مل لے۔ میں بات کروں گا، اُس سے۔ بھئی، شطرنج سے مجھے عشق ... اس طرح شطرنج کھیلنے والوں سے۔ اگر یہ چال اتفاقیہ ہے تو خیر، ... نہیں لیکن اگر وہ اتنا ہی عمدہ شطرنج کھیلتا ہے تو میں، اُسے ہر ... اپنے پاس رکھنا پسند کروں گا۔"

"ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔ یہ باتیں بعد میں ہو جائیں گی، پہلے چال چلیں۔" شجاع احمد صاحب نے کہا۔

حاجی نیاز احمد صاحب متفکرانہ نگاہوں سے شطرنج کی بساط دیکھنے لگے۔ بازی اُلٹ گئی تھی اور اب یہ بازی پوری طرح سے شجاع احمد صاحب کے حق میں جا رہی تھی۔ پھر وہ بآسانی شطرنج کی یہ بازی جیت گئے۔

کھیل ختم ہو گیا۔ حاجی نیاز احمد صاحب چلے گئے لیکن شجاع احمد صاحب کے ذہن میں زاہد چکرا رہا تھا۔ 'آخر یہ شخص ہے کیا؟ ہر شخص اسی کے گن گا رہا ہے۔ حویلی پر اُس نے اپنا اچھا خاصا سکہ جما لیا ہے۔ کون ہے یہ اور کیا چاہتا ہے؟ تھوڑی بہت معلومات تو ہونی ہی چاہئیں۔' وہ پُرخیال انداز میں بیٹھے ٹھوڑی کھجاتے رہے۔ پھر انہوں نے فیصلہ کر لیا کہ وہ زاہد کے بارے میں مکمل معلومات حاصل کریں گے۔

دوسری طرف زاہد کا کھیل جاری تھا۔ فضل ڈرائیور، اِس وقت، اُس کے لئے سب سے زیادہ دلچسپی کا باعث تھا۔ رات کو اُس نے داداجان کے نائب کی حیثیت سے فضل کو طلب کر لیا۔ اس وقت داداجان... موجود نہیں تھے۔ فضل، زاہد ہی کے کمرے میں پہنچ گیا۔

"ہاں بھئی فضل! کیسے ہو؟ اب بتاؤ تفصیل، وہ جو اس دن تم نے بتایا تھا کہ شجاع احمد صاحب، دفتر سے نکل کر، تمہارے ساتھ... بندرگاہ کے علاقے میں اُن گوداموں تک گئے تھے اور پھر وہاں سے کچھ سامان ٹرکوں پر بار کرا کے، انہوں نے اس ویران علاقے میں بھجوایا تھا، کیا تم اس کی کچھ تفصیل بتا سکتے ہو، مجھے؟"

"ضرور بتا سکتا ہوں، جناب عالی! لیکن صورتِ حال کچھ سنگین ہو جائے گی۔" فضل ڈرائیور نے کہا۔

"کیوں...؟"

"بس صاحب نے مجھ سے کہہ دیا تھا کہ اس بارے میں کسی کو کچھ معلوم نہ ہو اور یہ بات بڑی سختی سے کہی تھی، انہوں نے... مگر چونکہ آپ کا معاملہ دوسرا ہے، اس لئے میں نے آپ کو بتا دیا۔"

"یہ کام کب سے ہو رہا ہے؟"

"کئی سال ہو گئے ہیں صاحب! آج کی بات نہیں ہے۔ شہر میں صاحب کے کئی گودام ہیں۔ اُن میں مال آتا جاتا رہتا ہے... بس سوچنے کی بات یہی ہے کہ سب کام چوری چھپے ہوتا ہے۔ ایک مرتبہ ہمارا ایک ٹرک آگے جا رہا تھا اور گاڑی کافی پیچھے تھی کہ پولیس کی ایک جیپ نے ہمارے ٹرک کو روک لیا اور پولیس والے اوپر چڑھ کر سامان کی تلاشی لینے لگے۔ تب صاحب نے پولیس والوں کو خاصی رقم دی تھی اور اس کے بعد یہ سامان ایک گودام میں منتقل ہو گیا۔ لیکن صاحب کئی دن تک پریشان نظر آتے رہے تھے۔"

"ہُوں، فضل! تمہاری رپورٹ خاصی کارآمد ہے۔ یہ لو پچیس روپے، تمہارا انعام اور سنو، ایک کام اور کرنا ہے، تمہیں۔"

"جی، صاحب۔" حاجی فضل نے کہا۔

"دفتری اوقات میں جب صاحب دفتر میں ہوتے ہیں تو تم کہاں ہوتے ہو؟" زاہد نے پوچھا۔

"میں دفتر ہی میں ہوتا ہوں، صاحب! ایک اسٹول پر بیٹھا رہتا ہوں تاکہ اگر صاحب کو کبھی میری ضرورت پڑے تو میں پہنچ جاؤں..." حاجی فضل نے کہا۔

"ہُوں، فضل! جس طرح بھی ممکن ہو سکے، تم صاحب کے ملنے جلنے والوں کی ایک فہرست تیار کرو، نہایت رازداری سے۔ جس شخص کو تم نہیں جانتے ہو، اُس کے بارے میں کسی دوسرے شخص سے پوچھ سکتے ہو لیکن اس طرح کہ کسی کو کوئی شبہ نہ ہو۔ میں جانتا ہوں کہ جاسوسوں کی ٹیم میں تم بہتر کارکردگی کے حامل ہو۔ چنانچہ تم یہ کام بآسانی کر لو گے۔"

"کر تو لوں، صاحب! پر ڈر لگتا ہے۔"

"ڈر کیوں لگتا ہے؟"

"بس، شجاع احمد صاحب سے ڈر لگتا ہے۔ اگر انہیں معلوم ہو گیا کہ میں اُن کی ٹوہ میں رہتا ہوں تو وہ نہ جانے کیا سلوک کریں... میرے ساتھ؟"

"سلوک کی تم پروا نہ کرو۔ جب دادا جان، ہماری پشت پر ہیں تو ہمیں کسی چیز کی پروا نہیں ہونی چاہیئے۔ دادا جان کو تم بخوبی جانتے ہو۔"

"ہاں، صاحب! یہ بات تو ہے۔"

"بس، تو پھر تم اپنا کام سرانجام دیتے رہو۔" زاہد نے کہا۔

حاجی فضل کے جانے کے بعد، زاہد کافی دیر تک غور و فکر میں ڈوبا رہا... پھر اُس کے ہونٹوں پر ایک طنزیہ سی مسکراہٹ پھیل گئی اور وہ اپنے کمرے سے نکل گیا۔

حویلی کے ایک کمرے کے سامنے سے گزرتے ہوئے اُس کے قدم رُک گئے۔ قدسیہ کمرے میں بیٹھی، ایک کاغذ پر آڑی ترچھی لکیریں کھینچ رہی تھی۔ نہ جانے کس خیال میں گم تھی۔ اُسے زاہد کے کمرے میں داخل ہونے کا پتہ بھی نہیں چلا۔ البتہ جب اُس نے گردن اُٹھائی تو زاہد اُس کے سامنے موجود تھا اور اُس کے چہرے پر حیرت کے نقوش پھیلے ہوئے تھے۔ قدسیہ نے اچنبھے سے اُسے دیکھا۔

"ارے، زاہد! تم کب آئے؟"

"کافی دیر سے یہاں کھڑا ہوں، قدسیہ صاحبہ!" اُس نے جواب دیا۔

"مجھے آواز بھی نہ دی۔"

"نہیں، بس حیران تھا۔"

"کس بات پر؟" قدسیہ نے تعجب سے پوچھا۔

"آپ کاغذ پر یہ بے معنی لکیریں کھینچ رہی ہیں یا ان کا کوئی مقصد ہے؟"

"ارے، نہیں بھئی! ان کا کوئی مقصد نہیں ہے۔"

"قدسیہ صاحبہ! انسان بعض اوقات خود کو بھی نہیں سمجھ پاتا۔ حالانکہ اُس کے اندر ایسی صلاحیتیں ہوتی ہیں لیکن اکثر وہ خود... ان صلاحیتوں کو سمجھنے سے قاصر رہتا ہے... میں، ان آڑی ترچھی لکیروں کو دیکھ رہا تھا جو بظاہر بے مقصد ہیں لیکن کیا آپ یقین کریں گی، قدسیہ صاحبہ! کہ یہ لکیریں چیخ چیخ کر آپ کی صلاحیتوں کا اعلان کر رہی ہیں۔"

"بھئی کیسی صلاحیتوں کا؟"

"آپ مصورہ ہیں، ایک عظیم مصورہ۔ ان لکیروں میں جو کشش ہے آپ اُن کا تصور نہیں کر سکتیں۔ اس لئے کہ آپ نے کبھی اپنی ان صلاحیتوں پر غور نہیں کیا۔ قدسیہ صاحبہ! میں دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ تجریدی آرٹ میں آپ بے مثال ثابت ہو سکتی ہیں۔ بشرطیکہ رنگ اور برش سے آپ کو کوئی دلچسپی ہو۔"

"ارے، واقعی۔ میں نے تو کبھی سوچا بھی نہ تھا۔" قدسیہ حیرت آمیز انداز میں مسکرائی۔

"بہرصورت... میں، آپ سے عرض کر رہا ہوں، میں نے آپ کو آپ کی ایک صلاحیت سے آگاہ کر دیا ہے، اب آپ اس سے فائدہ اُٹھائیں۔ یہ میری پیشن گوئی ہے کہ بہت مختصر سے وقت میں آپ ایک عظیم مصورہ بن سکتی ہیں۔ اتنی عظیم کہ دُنیا میں آپ کے فن کا ڈنکا بج جائے گا۔" زاہد نے کہا۔

قدسیہ کے چہرے پر جوش کے آثار پھیل گئے تھے۔ وہ حیرت سے اُن لکیروں کو دیکھ رہی تھی... پھر وہ، زاہد کی طرف دیکھ کر بولی۔

"یہ بات تو تم نے عجیب کہی، زاہد! مصوری سے تو مجھے دلچسپی ہے لیکن صرف اچھی تصویروں کو پسند کرتی ہوں، خود کبھی کچھ بنانے کی کوشش نہیں کی۔"

"آپ اس وقت کچھ سوچ رہی تھیں؟"

"ہاں، بس یونہی مختلف خیالات ذہن میں آ رہے تھے، کوئی خاص بات نہیں تھی، ذہن میں۔ یہ پنسل تو بس یونہی کاغذ پر چل رہی تھی۔" قدسیہ نے جواب دیا۔

"بے شک! انسان کا لاشعور، اُس کے اندر چھپی ہوئی حقیقتوں کا صحیح ترجمان ہوتا ہے۔ اگر آپ شعوری طور پر یہ لکیریں بنائیں تو یقیناً اس حقیقت کو پیش نہیں کر سکتی تھیں جو آپ کے اندر پوشیدہ ہے۔ بہرصورت میں نے جو کچھ محسوس کیا، آپ کے سامنے پیش کر دیا۔ اب آگے آپ کا

کام ہے۔"

"ہاں، بے شک۔ لیکن اس سلسلے میں تمہیں میری راہنمائی کرنا ہوگی۔"

"مجھے...؟" زاہد نے چونک کر پوچھا۔

"ہاں، تمہیں... ظاہر ہے، تم مجھے میری اس پوشیدہ صلاحیت سے روشناس کرانے کے بعد کیا راستے ہی میں چھوڑ دوگے۔ تم، مجھے کوئی ایسی ترکیب بتاؤ جس سے میں اعلیٰ پائے کی مصورہ بن سکوں۔"

"بہتر ہے۔ میں سوچوں گا اور جب آپ فن کے آسمان پر ستارہ بن کر چمکیں گی تو میں اس بات پر فخر کیا کروں گا کہ اس ستارے کو آسمان کی بلندیوں تک لے جانا میرا کام تھا۔"

"یقیناً... یقیناً..." قدسیہ نے خلوص سے کہا۔

زاہد نے اُس سے اُس کی مدد کرنے کا وعدہ کر لیا۔ اُس کے جانے کے بعد، قدسیہ حیران سی بیٹھی، اُن لکیروں کو دیکھنے لگی جو بظاہر بے مقصد ہی تھیں لیکن اس کا لاشعور اب اُسے ان لکیروں میں عجیب و غریب چہرے دکھا رہا تھا اور قدسیہ ان چہروں کو دیکھ کر بے حد مسرور تھی۔

وہ چشمِ تصور سے خود کو ایک عظیم مصورہ کے روپ میں دیکھ رہی تھی جس کی تصویروں کی نمائش ہو رہی تھی اور لوگ ان تصویروں کو دیکھ کر انگشت بدنداں تھے۔ اُن کی آنکھوں میں اس عظیم مصورہ کے لئے عقیدت کے جذبات تھے۔

خُدا کی قسم، نشاط! بڑا نیک کام کیا ہے، تُو نے۔ اللہ، تجھے اس کا اجر دے گا۔ خوش کر دیا، آتے ہی۔" صوفیہ کہہ رہی تھی۔ دونوں بہنوں کا ہنستے ہنستے بُرا حال تھا۔ نشاط نے اُنہیں اسٹیشن کا واقعہ سُنایا تھا۔

"بس، میں تو اسی کوشش میں رہتی ہوں کہ کسی کی دُعا لگ جائے، مجھے مگر تم لوگ تفصیل تو بتاؤ۔"

"شاہدہ خالہ، امّی کی رشتے کی بہن لگتی ہیں۔ اب یہ رشتہ کیا ہے، اللہ جانے۔ توفیق خالو، اس لحاظ سے ہمارے بزرگ ہوئے اور اُن کے دونوں... بیٹے، کزن۔ یہ لوگ مستقل یہیں آ گئے ہیں۔ توفیق خالو اپنی زندگی میں ہمیں بے سہارا چھوڑ کر جانے پر تیار نہیں ہیں۔ چنانچہ ان لوگوں نے آتے ہی حویلی کا سارا نظم و نسق سنبھال لیا ہے۔ تمام پُرانے نوکروں کو نکال باہر کیا ہے صرف چند ملازم رہ گئے ہیں۔ نہ جانے اُن بیچاروں کی بھی کب باری آ جائے۔ سب سہمے سہمے رہتے ہیں، ان بلاؤں سے۔ ہمیں، انہوں ہی نے اسٹیشن نہیں جانے دیا۔"

"یہ تو اچھی بات نہیں ہے۔ تم لوگوں نے دخل نہیں دیا۔ ابّو کے زمانے کے ملازم تو گھر کے افراد کی سی حیثیت رکھتے تھے۔"

"امّی ہی نے انہیں قبول کر لیا ہے تو کوئی کیا کرے۔ امّی ان کے ہاتھوں میں کھلونا بنی ہوئی ہیں۔"

"بڑے شاطر لوگ معلوم ہوتے ہیں۔ ہمیں ہوشیار رہنا چاہیئے۔"

"تُو ہی کچھ کر سکتی ہے، نشاط! ہم تو بے بس ہیں۔" نزہت نے کہا اور نشاط خیالوں میں ڈوب گئی۔

اسی وقت مہرالنساء بیگم اندر آ گئیں۔ چھوٹی ہونے کی وجہ سے وہ نشاط کو بہت چاہتی تھیں۔ بڑی لڑکیوں نے تو صرف میٹرک تک تعلیم حاصل کی تھی لیکن نشاط کی ضد تھی کہ وہ آگے تعلیم حاصل کرے گی۔ بیگم صاحبہ نے مخالفت کی تو شمشیر زماں سینہ سپر ہو گئے تھے اور اُن کی زندگی ہی میں نشاط شہر کے بورڈنگ ہاؤس میں چلی گئی تھی۔

باپ کی موت نے نشاط کی شوخیوں پر اثر ڈالا تھا لیکن وہ جلد سنبھل کر اپنی تعلیم میں مصروف ہو گئی تھی۔ سال میں تین، چار ماہ کے لئے گھر آ جاتی تھی ورنہ شہر ہی میں رہتی تھی۔

"کیا ہوا، امّی؟ کیا انتظام کیا آپ نے، اُن لوگوں کے لئے...؟" نشاط نے پوچھا۔

"منشی جی کو بھیج دیا ہے۔ وہ چھوڑ آئیں گے۔ تم سناؤ، پڑھائی کیسی چل رہی ہے؟"

"بہت اچھی، امّی۔"

ماں بیٹیوں کے درمیان دیر تک گفتگو ہوتی رہی۔ پھر خالہ جان کا موضوع نکل آیا۔

"خیر، یہ خالہ اور خالو پیدا کب ہوئے، امّی جان؟"

"نشاط! بزرگوں کا ذکر احترام سے کرتے ہیں۔" مہرالنساء بیگم سرزنش کرنے والے انداز میں بولیں۔

"آپ، بزرگانِ دین کی بات کر رہی ہیں؟" نشاط نے پوچھا۔

"نہیں۔ تمہارے خالو اور خالہ کی۔"

"مگر اب تک یہ کہاں تھے؟"

"بس، دُور کی رشتے داری تھی، ملنا نہیں ہوا۔ اور پھر کافی دور رہتے تھے یہ لوگ۔ کئی ماہ بعد تو انہیں تمہارے ابّو کے انتقال کی خبر ملی... ورنہ بے چارے اسی وقت آ جاتے۔"

"اچھا، جا کب رہے ہیں یہاں سے؟"

"مخلص لوگ ہیں۔ بہنوں کی طرح کام آئے ہیں۔ پوری حویلی سنبھال رکھی ہے۔ کوئی ہو تو سہی، ایسا۔ اب نہیں جائیں گے، یہ لوگ یہاں سے۔"

"یعنی مستقل آ گئے ہیں؟"

"ہاں، اپنا سب کچھ چھوڑ کر اب تو، انہیں نہیں جانے دوں گی۔"

گھر میں بڑوں کا رہنا ضروری ہے۔"
"یقیناً بشرطیکہ مخلص ہوں۔ ویسے، امی، پہلے ہی بہت سے بڑے گھر میں موجود تھے، کیا وہ کافی نہیں تھے؟"
"تمہیں کوئی اعتراض ہے، اُن پر، نشاط؟"
"اوہ، نہیں، امی، مگر وہ دونوں لڑکے مجھے بوفر لگے تھے... آپ دیکھیں، کوئی تُک ہے؟"
"مجھے حیرت ہے۔ وہ تو بڑی محبت سے تمہیں لینے گئے تھے۔ پھر نہ جانے شفیق نے ایسا کیوں کیا؟" مہرالنساء بیگم نے کہا۔
"آپ نے اُن لوگوں سے پُوچھا نہیں، کوئی خرابی تو نہیں ہے دماغ میں؟" نشاط بولی۔
"بُری بات ہے، نشاط، شاہدہ باجی نے سُن لیا تو بُرا مان جائیں گی۔"
اُسی وقت ایک ملازم نے آکر اطلاع دی کہ وہ لوگ واپس آگئے ہیں، شفیق بھی ساتھ ہے۔
"آؤ، نشاط، بہنوں سے پھر بات کر لینا، پہلے اُن سے مل لو۔" مہرالنساء بیگم نے کہا تو تینوں لڑکیاں، اُن کے ساتھ اُٹھ گئیں۔
شاہدہ بیگم شفیق کو سینے سے لگائے بیٹھی، آنسو بہا رہی تھیں... توفیق صاحب سگریٹ پی رہے تھے۔ رفیق بھی ایک کونے میں مُنہ پھُلائے بیٹھا تھا۔
"کیا ہُوا تھا، توفیق بھائی، کیا بات ہو گئی تھی؟"
"بس، مہر بہن، شاید نشاط بیٹی کو ہم لوگ پسند نہیں آئے۔ بہرحال کوئی بات نہیں ہے۔"
"میں نے زندگی میں پہلی بار آپ لوگوں کو دیکھا ہے۔ میری پسند یا ناپسند کا کیا سوال ہے۔ آپ سب میرے لئے اجنبی ہیں۔" نشاط نے کہا۔
"ہاں، نشاط کو آپ لوگوں کے بارے میں کچھ بھی علم نہ تھا ورنہ ایسا نہ ہوتا۔" مہرالنساء بیگم جلدی سے بولیں۔
"کیسا نہ ہوتا، امی، یعنی میں کسی بلو کاکا کی بیٹی بن جاتی؟"
"یہ بات تو خود آپ نے کہی تھی۔" شفیق بولا۔
"اوہ... اوہ، امی، یہ تھپڑ تو نہیں مارتا؟" نشاط نے خوف زدہ ہونے کی اداکاری کی۔
"نہیں، نشاط، ایسی باتیں مت کرو۔ یہ سب ہمارے اپنے ہیں۔"
"اچھا، امی، اب میں آرام کروں گی۔ آؤ، صوفیہ، نزہت، آؤ چلتے ہیں۔" نشاط نے کہا اور چلی گئی۔ دونوں بہنیں بھی اُس کے پیچھے پیچھے چلی آئی تھیں۔ اُن کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی۔ تینوں اپنے کمرے میں پہنچ گئیں۔
"ہمیں یقین ہے کہ ان لوگوں کو تُو ٹھیک کرے گی، نشاط۔ ہمیں یہ ایک آنکھ نہیں بھاتے۔ چاروں کے چاروں صُورت ہی سے مکار لگتے ہیں۔ ایسی مصنُوعی باتیں کرتے ہیں کہ بس... اسی لئے تو امی، ان کے جال میں پھنس گئی ہیں۔"
"یہ جال کاٹنا ہوگا۔" نشاط نے کہا۔
"آسان کام نہیں ہے۔" صوفیہ بولی۔
"آہستہ آہستہ سہی۔ جلدی کیا ہے۔ ویسے ملازموں کا مجھے افسوس ہُوا... ارے، ہاں، وہ حسینہ تو موجود ہے؟"
"نہیں۔ اُسے بھی نکال دیا گیا۔"
"اوہ، یہ واقعی بہت بُرا ہُوا۔ خُدا کی قسم، یہ ناقابلِ برداشت ہے۔ کہاں گئی ہو گی؟ اُس بے چاری گونگی عورت کو تو کہیں ملازمت بھی نہیں ملے گی۔ یہ واقعی امی نے بہت بُرا کیا ہے۔" نشاط نے افسوس بھرے لہجے میں کہا۔
شام کی چائے پر سب یکجا تھے۔ چائے لان پر لگائی گئی تھی۔ اس دوران شاید توفیق صاحب نے بھی کئی پینترے سوچ لئے تھے... نشاط سے بڑی محبت سے ملے اور اس کے سر پر ہاتھ پھیر کر مُسکرانے لگے۔ رفیق اور شفیق بھی اُن کے زیرِ اثر تھے۔ اُن کے چہروں سے بھی کبیدگی کا کوئی اظہار نہیں ہو رہا تھا۔
چائے پینے کے دوران، توفیق صاحب نے کہا۔ "اس دوران کئی بار تمہارے پاس آنے کے بارے میں سوچا، نشاط، مگر یہ مصرُوفیتیں جو کبھی فرصت لینے دیں۔"
"میرے پاس؟" نشاط نے تعجب سے پوچھا۔
"ہاں، تمہارے ہوسٹل۔"
"وہ کیوں؟"
"بھئی، وہاں کا ماحول دیکھنا چاہتا تھا۔ تم سب کی ذمے داری اب میرے کندھوں پر آپڑی ہے۔ ساری باتوں کا خیال کرنا پڑتا ہے۔ آج کل شہر کا ماحول تباہ ہو کر رہ گیا ہے۔ نہ جانے ہوسٹل کے منتظمین کس قسم کے ہوں۔"
"آپ نے وہاں نہ آکر دانشمندی کی، خالو جان۔"
"ایں... کیوں؟"
"میٹرن نے چند خطرناک کُتّے ٹرینڈ کر رکھے ہیں۔ اس سے بھی بُرا حشر ہوتا جیسا شفیق بھائی کا اسٹیشن پر ہُوا تھا۔" نشاط بولی۔
"ہم... مگر لڑکیوں کے عزیز اُن سے ملنے نہیں آتے کیا؟"
"جی نہیں۔ اجازت نہیں ہے۔"
"یہ کیسے ہو سکتا ہے؟"
"پھر کبھی تشریف لا کر دیکھ لیجئے۔" نشاط بولی۔

"اب شاید اس کی ضرورت ہی نہ پیش نہ آئے۔" توفیق صاحب مُسکرا
ر بولے۔ نشاط خاموشی سے اُن کی طرف دیکھتی رہی۔ توفیق صاحب چند
ساعت کچھ سوچتے رہے پھر بولے۔
"بی۔ اے کے بعد کیا خیال ہے، نشاط؟"
"قانون پڑھوں گی۔ وکیل بننے کا ارادہ ہے۔"
"اس کی ضرورت؟"
نشاط نے بھنویں اُچکا کر اُن کی طرف دیکھا... پھر دفعتہً مسکرا کر بولی
"آپ کی کیا تعلیم ہے، خالُو جان؟"
"وہ میں نے... میں نے تو بس ادیب فاضل کیا تھا۔"
"ادیب فاضل... یہ کیا ہوتا ہے؟"
"اب نہیں ہوتا۔ کسی زمانے میں ہوا کرتا تھا۔"
"اوہ... تو اس کا مطلب ہے کہ آپ گزر چکے۔" نشاط گہری سانس
لے کر بولی۔
مہرالنساء بیگم نے مضطربانہ انداز میں نشاط کو دیکھا لیکن پہلو بدل کر رہ
گئیں۔ سب کے سامنے بیٹی کو کچھ کہنے کی جرأت نہ تھی۔ جانتی تھیں کہ نشاط
جس قدر خوش مزاج ہے، اسی قدر تنک مزاج بھی ہے۔ ذرا سی دیر میں
بگڑ گئی تو سنبھالنا مشکل ہو جائے گا۔
"ہاں بھئی! ایک طرح سے تو ہم گزر ہی چکے۔ تم نوجوانوں کے سامنے
ہماری حیثیت ہی کیا... ماشاءاللہ! اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے تم لوگ اعلیٰ
صفات کے مالک بن جاتے ہو... بہرحال! اتنا تو ہم جانتے ہیں کہ بیٹیوں کو
اعلیٰ تعلیم کی ضرورت نہیں ہوتی اور پھر قانون کی تعلیم، میرے خیال میں تو یہ
لڑکیوں کے لئے مناسب ہی نہیں ہے۔ وکیل بن جائیں گی لیکن کیا کریں
گی، اپیل بن کر؟ نہ بابا، نہ... ہمیں اپنے خاندان میں یہ ساری باتیں ہرگز
پسند نہیں ہیں۔"
"خوب۔ آپ کا خاندان کہاں آباد ہے، خالُو جان؟" نشاط نے
سوال کیا۔
توفیق صاحب گہری نگاہوں سے اُسے دیکھنے لگے پھر ٹھنڈی
سانس لے کر بولے۔
"اب تو جو کچھ ہو تم ہی لوگ ہو۔ ورنہ ہمارا ہے ہی کون، اس
دنیا میں۔"
"کیا مطلب... پھر آپ کون سے خاندان کی بات کر رہے تھے؟"
"بھئی، تم ہی لوگوں کی... میں نے فیصلہ کیا ہے، نشاط! کہ بس،
زیادہ سے زیادہ تم بی۔ اے کر لو۔ اس کے بعد چھٹی۔ کوئی ضرورت نہیں،
آگے پڑھنے کی۔"
"یہ فیصلہ آپ نے کیا ہے، خالُو جان؟" نشاط نے پیار بھرے لہجے
میں پُوچھا۔
"ہاں بھئی! اب یہ ساری ذمّے داریاں میرے کاندھوں پر ہی
تو ہیں..."
"آپ اپنے کاندھے جھٹک دیجئے، خالُو جان! بلاوجہ یہ ناتواں
بدن، ذمّے داریوں کے بوجھ تلے دب کر زمین بوس ہو جائے گا... اب
آپ یہاں آ ہی گئے ہیں تو بہتر ہے کہ کسی کونے میں بیٹھ کر اللہ، اللہ کریں۔
فضول باتوں میں پڑنے کی ضرورت نہیں۔" نشاط بولی۔
"نشاط بیٹی! توفیق بھائی، ہم لوگوں کی بہتری کے لئے سوچتے
ہیں۔" مہرالنساء بیگم نے دخل دیا۔
"کیا مطلب ہے، آپ سب لوگوں کا؟ چلنے پھرنے دیں گے،
مجھے یا نہیں؟" نشاط غرّا کر بولی۔
"ارے نہیں نہیں، بٹیا! ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ ہم تو مشورہ
کر رہے تھے، تم سے۔"
"ظہور کہاں ہے؟" نشاط نے اِدھر اُدھر دیکھ کر پوچھا۔
"کون ظہور...؟" بیگم صاحبہ بولیں۔
"ظہور کو نہیں جانتیں، امّی جان؟ ہمارا پرانا ملازم ظہور۔" نشاط نے تیز
لہجے میں کہا۔
"وہ... وہ تو یہاں سے چلا گیا۔"
"کیا مطلب...؟" نشاط نے چائے کی پیالی پرچ میں پٹخ دی۔
"میرا مطلب ہے، ظہور نوکری چھوڑ کر چلا گیا۔"
"کیوں...؟"
"وہ دراصل نوکروں کی تعداد بہت زیادہ ہو گئی تھی اس لئے اس
کی ضرورت نہیں تھی۔" مہرالنساء بیگم نے سراسیمہ سے انداز میں کہا اور نشاط
اُٹھ کھڑی ہوئی۔
"امّی جان! دو گھنٹے کے اندر اندر ظہور کو کوٹھی میں آ جانا چاہیئے
ورنہ اس کے بعد جو کچھ ہوگا، اس کی ذمّے داری آپ پر ہوگی۔" نشاط پاؤں
پٹختی اندر چلی گئی۔
سب ہکّا بکّا رہ گئے تھے۔ چائے کا دَور رُک گیا تھا۔ مہرالنساء بیگم
نے بوکھلائے ہوئے انداز میں توفیق صاحب کی طرف دیکھا تو توفیق صاحب
جلدی سے بولے۔
"بہت تیز مزاج ہے، نشاط بیٹی کا... یہ ہوتا ہے۔ سب بچوں
کی عادات ایک سی نہیں ہوتیں۔ کوئی حرج نہیں ہے۔ سب ٹھیک
ہو جائے گا۔ میں اسے سنبھال لُوں گا۔ پیاری بچی ہے۔"
"آپ لوگ محسوس نہ کریں، بھائی صاحب!" مہرالنساء بیگم نے
شرمندگی سے کہا۔

"ارے نہیں مہر بہن! یہ بھی کوئی محسوس کرنے والی بات ہے۔ یہ نئی تعلیم بچوں کو یہی سب کچھ دے رہی ہے۔ ہمیں اپنے بچوں کو اس بیماری سے بچانا ہے۔"

"آپ کے دونوں بچے تو اس بیماری سے بچے ہوئے ہیں خالو جان! دوسروں کی فکر نہ کریں۔" صوفیہ بھی جلے کٹے انداز میں بول پڑی۔

بیگم صاحبہ نے چونک کر دونوں کی طرف دیکھا تو صوفیہ اور نزہت بھی اُٹھ کر اندر چلی گئیں۔

"کیا ہوتا جا رہا ہے، ان بچوں کو، بزرگوں کا ادب کرنا ہی بھول گئے۔ میں سمجھا دوں گی، انہیں۔" مہرالنساء بیگم نے کہا۔

"میں نے کہا نا، بہن! تمھیں اس سلسلے میں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ وقت انہیں بہت کچھ سمجھا دے گا۔" توفیق صاحب نے مکاری سے مسکراتے ہوئے کہا۔ اور چائے کی میز سے اُٹھ گئے۔

مہرالنساء بیگم پریشان ہو گئی تھیں۔ ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کریں۔ نشاط کی خودسری انہیں بھی پسند نہیں آئی تھی... ان لوگوں نے تو یہاں آ کر ان کی تنہائی دُور کر دی تھی۔ سارا نظام سنبھال لیا تھا۔ ہمدرد اور غمگسار تھے۔ نہ جانے کیوں نشاط ان سے برگشتہ ہو گئی تھی۔ اگر گھر ہی پر ہوتی تو شاید وہ، اُسے سخت سست کہہ کر ٹھیک کر لیتیں لیکن وہ شہر میں رہتی تھی اور کافی عرصے کے بعد آئی تھی۔ بس اس لئے اُلجھی ہوئی تھیں۔ ایک بار پھر وہ پریشان سی نشاط کی تلاش میں چل دیں۔

★★

"نمبر ایک، شیخ جمال الدین۔ اب یہ بات پایۂ تکمیل کو پہنچ چکی ہے کہ وہ نقلی بیٹری سیل بناتے ہیں اور یہ کارخانہ، اُن کی کوٹھی کے نیچے تہہ خانے میں موجود ہے۔ رحیم داد نے ہمیں، اُن کے کارخانے کی پروڈکشن مہیا کر دی ہے جس کا تجزیہ ہم لوگ کر چکے ہیں۔ اگر اُس بڑی فیکٹری کو یہ معلوم ہو جائے کہ اُس کے سیل کی نقل کہاں تیار ہوتی ہے تو وہ قیامت مچا دے گی۔ شیخ جمال مجرم ہیں۔ انہیں اس جرم کی قیمت پانچ ہزار روپے ماہوار ادا کرنی ہوگی۔"

"اوہ... مگر یہ دوسرا جرم ہم کریں گے۔" حسام احمد صاحب بولے تو زاہد کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

"حالات کو سمجھنے کی کوشش کریں، دادا جان! کیا آپ کے خیال میں شیخ صاحب کے کچھ شریک کار نہیں ہوں گے جو اُن کی قانونی حفاظت کرتے ہوں گے۔ شیخ صاحب بہر حال جرم کر رہے ہیں اور دولت کما رہے ہیں۔ اگر اس کی اطلاع پولیس کو دے دی جائے تو شیخ صاحب کو اُن کے محافظ بچا لیں گے۔ فیکٹری اسی طرح چلتی رہے گی... کسی کو کیا ملے گا؟"

"ہاں، یہ تو تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔"

"اگر ہم براہِ راست اس اصلی فیکٹری کو اس حقیقت سے آگاہ کر دیں تو پھر حالات دوسرے ہوں گے۔"

"وہ سب کچھ ٹھیک ہے لیکن بلیک میلنگ..." دادا جان پریشانی سے بولے۔

"پوری بات نہیں سُنی آپ نے دادا جان! وہ کالونی والی زمین بے کار پڑی ہے، آپ کے پاس۔"

"کالونی والی زمین...؟"

"جی۔ کیا اس زمین پر ایک عمارت تعمیر نہیں ہو سکتی؟ کیا اس عمارت کو محتاج خانہ نہیں بنایا جا سکتا۔ ایک ایسا محتاج خانہ جہاں صرف ان مظلوم لوگوں کو پناہ مل سکے گی جو واقعی بے سہارا ہوں گے۔ جو زندگی سے محروم، مصائب کے بوجھ تلے دبے سڑکوں پر مارے پھرتے ہیں۔ ایک جدید ادارہ جو نہ روایتی ہوگا اور نہ دارالامان ہوگا اور نہ یتیم خانہ بلکہ یہ ایک طرح سے فرسٹ ایڈ ہاؤس ہوگا جہاں ایسے لوگوں کو امداد فراہم کی جائے گی جو ایمانداری سے آگے بڑھنا چاہتے ہوں لیکن مناسب سہارا نہ ملنے کی وجہ سے اپنی ذات میں گھُٹ رہے ہیں۔ ہم اُن کے بارے میں معلومات حاصل کر کے اُن کی امداد کریں گے اور انہیں معاشرے میں ایک صحت مند انسان کی حیثیت سے لا کھڑا کریں گے۔ یہ اصل کام ہوگا، دادا جان! ذرا غور کریں، اگر ہم کسی پریشان حال کو ایک وقت کی روٹی دے دیں تو یہ کوئی کام نہ ہوا، اُسے دوسرے وقت کی روٹی درکار ہوگی اور وہ پھر کسی کے سامنے ہاتھ پھیلائے گا اور پھر ہاتھ پھیلانا اُس کی عادت بن جائے گی۔ اس کے برعکس اگر ہم ابتدا ہی سے اُسے ٹھوس مالی وسائل فراہم کر دیں اور اُس کی رہنمائی کریں تو آنے والے وقت میں وہ ایک پُروقار کردار بن کر اُبھرے گا۔"

"خدا کی قسم! بہت مناسب خیال ہے... مگر بلیک میلنگ سے اس تصور کا کیا تعلق؟" دادا جان نے کہا۔

"تعلق ہو جائے گا۔ آپ فکر نہ کریں۔ میں ایک نیا آئرن سائڈ جنم دے رہا ہوں۔ دادا جان! آپ کو جاسوسی ناولوں اور کہانیوں کا شوق ہے یہ کہانیاں اگر صرف کسی اچھے تخیل کی تسکین کر دیں تو بے مقصد رہ جاتی ہیں الفاظ کو خواب کا روپ دے کر چند لمحات تخیل کی دُنیا میں بسر کر لینا عمل تو نہ ہوا۔ عمل کا میدان دوسرا ہے۔"

"ٹھیک کہتے ہو لیکن..." دادا جان پریشانی سے بولے۔

"فرسٹ ایڈ ہاؤس کی تعمیر میں لاکھوں روپیہ خرچ ہوگا پھر اس ادارے کے لئے اسٹاف ہوگا اور بے سہارا لوگوں کو مالی وسائل فراہم کرنے کے لئے دولت کی ضرورت ہوگی۔ اتنی دولت کہاں سے آئے گی؟"

"ویسے تو میرے پاس کافی پیسے پڑے ہیں اور جو مزید ضرورت ہوگی وہ شجاع احمد سے لے لیں گے۔"

"ضرورت پڑتی ہے گی، دادا جان! شجاع احمد صاحب ہماری اتنی مدد نہیں کر سکیں گے بے شک! آپ اس عمارت کی تعمیر اپنی جیب سے شروع کر دیں لیکن اس کارِ خیر میں دوسروں کو بھی تو شرکت کا موقع دیں۔"

"دوسروں کو...؟"

"جی ہاں، جیسے شیخ جمال، سردار داؤد جو اپنی سوتیلی بیٹی کے باپ کی دولت دبائے بیٹھے ہیں اور ایسے ہی دوسرے۔ یہ سب ہمیں سرمایہ فراہم کریں گے اور اگر سرمایہ فراہم نہیں کریں گے تو جیل جائیں گے۔"

"خدا کی قسم! یہ دماغ تم کہاں سے لائے ہو، زاہد! تم نے تو مجھے نہال کر دیا ہے۔ آج تک میرے خواب صرف کہانیوں میں پورے ہوتے تھے لیکن اب تم نے میرے دل میں ایک اور لگن پیدا کر دی ہے۔ خدا کی قسم! کیا بات سوچی ہے تم نے۔ یعنی برائی کرنے والوں کو بلیک میل کر کے ان سے رقومات حاصل کی جائیں اور انہیں فلاحی کاموں پر صرف کیا جائے۔ واہ! لاجواب آئیڈیا ہے۔"

"بس، دادا جان! ابتدا کر دیں۔ نمبر ایک، شیخ جمال۔ نمبر دو، قاضی فرزند ارجمند۔ نمبر تین، سردار داؤد۔ نمبر چار، حاجی نیاز... ان چاروں کے علاوہ بھی نئی اسامیاں تلاش کی جائیں گی اور کام جاری رہے گا۔ شیخ جمال سے پہلی قسط پچیس ہزار روپے اور اس کے بعد، پانچ ہزار روپے ماہوار... قاضی صاحب سے پہلی قسط پچاس ہزار روپے، اس کے بعد دس ہزار روپے ماہوار، اسی طرح دوسروں سے حسبِ مراتب رقومات وصول کی جائیں گی۔ کیا خیال ہے؟"

"گریٹ آئیڈیا... لیکن اس سارے معاملے کو ہینڈل کون کرے گا؟" دادا جان نے پوچھا۔

"آپ... اور آپ کا یہ خادم۔"

"ابتدا کہاں سے کرو گے؟"

"عمارت کی تعمیر سے... اس کے لئے کچھ رقم اپنے پاس سے اور کچھ رقم شجاع احمد صاحب سے وصول کریں۔"

"عمارت کا نقشہ وغیرہ؟"

"وہ سب ہو جائے گا۔"

"میں تیار ہوں۔" دادا جان کا چہرہ جوشِ مسرت سے سرخ ہو رہا تھا۔

"تو پھر آج رات شجاع احمد صاحب سے بات ہو جائے۔"

"تمہاری موجودگی میں ہو گی۔ بے فکر رہو۔" دادا جان نے کہا اور زاہد سر ہلا کر بے فکر ہو گیا۔ اس کی آنکھوں میں بے پناہ چمک تھی اور ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل رہی تھی۔

شجاع احمد صاحب کا کوئی ٹھیک نہیں تھا۔ عموماً وہ لنچ یا ڈنر پر نہیں ملتے تھے لیکن آج موجود تھے اور چونکہ حسام احمد صاحب نے گھر میں یہ تاثر دیا تھا کہ زاہد گھر کے ایک فرد کی حیثیت رکھتا ہے، اس لئے وہ بھی کھانے کی میز پر ہوتا تھا۔

یہ بھی حقیقت تھی کہ جب سے زاہد کھانے کی میز پر نظر آنے لگا تھا، شجاع احمد صاحب کی خوراک مختصر ہو گئی تھی۔ یہ بات ان کے لئے ناقابلِ برداشت تھی کہ ایک تنخواہ دار ملازم برابری کا درجہ اختیار کرے۔

اس وقت بھی شجاع احمد صاحب زاہد کے عین سامنے بیٹھے تھے اور کھا بھی رہے تھے لیکن جس طرح کھا رہے تھے، ان کا دل جانتا تھا۔ میز پر مکمل خاموشی چھائی ہوئی تھی۔

یہ خاموشی ختم ہوا۔ اس سے قبل کہ حسام احمد صاحب کچھ، شجاع احمد صاحب خود ہی بول پڑے۔

"ابا جان، کوئی خاص مصروفیت تو نہیں ہے اس وقت؟" ان کے لہجے میں جھجک تھی۔

"نہیں، نہیں... کوئی کام ہے مجھ سے؟" حسام احمد صاحب نے نرم لہجے میں پوچھا۔

"جی ہاں۔ کچھ باتیں کرنا تھیں۔"

"تو پھر میرے کمرے میں آ جاؤ۔"

"یہاں بھی کوئی حرج نہیں ہے۔"

"کہو، کیا بات ہے؟"

"وہ حاجی نیاز کو تو آپ جانتے ہیں۔ میرے دوست بھی ہیں اور کاروبار کی معاملات میں میرے معاون بھی۔"

"ہاں دیکھا ہے میں نے انہیں۔ کیا ہوا انہیں؟"

"کچھ نہیں۔ یہ زاہد ایک حماقت کر بیٹھے ہیں اور حاجی نیاز ضد پر انسان ہیں۔ میں ذرا سا الجھ گیا ہوں۔"

"زاہد حماقت کر بیٹھے ہیں... کیا حماقت کی ہے میاں تم نے؟" حسام احمد صاحب نے زاہد کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

"قبلہ و کعبہ! سب سے پہلی حماقت تو یہ کی تھی کہ اس دنیا میں آ گیا۔ دوسری حماقت یہ ہوئی کہ اس تنگ و ترش ماحول میں زندہ بھی رہا اور اس وقت سے لے کر اب حماقتیں ہی کئے جا رہا ہوں۔ اب پتہ نہیں میری کون سی حماقت کا تذکرہ ہو رہا ہے۔" زاہد نے کہا۔

سب کے چہروں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

"چلو خیر... تمہاری زندگی کی حماقت تو برداشت کی جا سکتی ہے لیکن حاجی صاحب کے ساتھ کیا حماقت کی، یہ بتاؤ؟"

"میرا خیال ہے، انکل ہی اس سلسلے میں وضاحت فرما سکتے ہیں مجھے تو یاد نہیں۔" زاہد نے کہا۔

"تم نے اس وقت شطرنج کھیلتے ہوئے ہمارے درمیان دخل

نہیں دیا تھا۔" شجاع احمد صاحب کے لہجے میں غراہٹ تھی۔ زاہد کا اس بے تکلفی سے بات کرنا بھلا انہیں کہاں پسند آ سکتا تھا۔

"جی ہاں، جی ہاں، وہ تو کی تھی۔ آپ بری طرح پھنس گئے تھے اور مجھے یقین تھا کہ آپ کوئی غلط چال چل دیں گے اور مات کھا جائیں گے۔ میں نے بس ایک گھوڑا ہی تو استعمال کیا تھا۔" زاہد بولا۔

"ہاں، لیکن اس گھوڑے نے تمہاری گردن میں لگام ڈال دی ہے۔" شجاع احمد تلخی سے بولے۔

"وہ کیسے جناب؟" زاہد نے پوچھا۔

"ابا جان! میں آپ سے بات کر رہا ہوں۔ حاجی نیاز نہ صرف ہمارے کاروباری ساتھی ہیں بلکہ ان کے مجھ پر کچھ احسانات بھی ہیں۔ میں نے ان سے جو بھی بات کی، انہوں نے کبھی نہیں ٹالی۔ چنانچہ اگر انہوں نے مجھ سے کوئی فرمائش کی ہے تو میرے لئے بھی اس فرمائش کو ٹالنا ناممکن ہے۔"

"ارے بھائی! کیا فرمائش کی ہے، اس نے؟ بتاؤ تو سہی۔"

"وہ، زاہد کو اپنے ساتھ رکھنا چاہتے ہیں۔"

"کیا مطلب...؟" حسام احمد صاحب نے منہ ٹیڑھا کر کے کہا۔

"میرا مطلب ہے کہ زاہد کو یہاں جو کچھ ملتا ہے، اس سے دوگنی تنخواہ حاجی نیاز انہیں دیں گے اور وہاں بھی وہ گھر کے ایک فرد کی حیثیت سے رہیں گے۔"

"ہوں... اور یہ حاجی نیاز کریں گے کیا، زاہد کا؟"

"اس دن شطرنج کھیلتے ہوئے زاہد نے ہمارے درمیان مداخلت کی تھی۔ حاجی نیاز کو ان کی چال بہت پسند آئی۔ بس اسی دن سے وہ اصرار کئے جا رہے ہیں۔"

"کہ زاہد کو ان کے حوالے کر دیا جائے؟"

"جی ہاں۔"

"کیا تنخواہ دے گا وہ، زاہد کو؟"

"رنگین مزاج آدمی ہے۔ وہ تین ہزار بلکہ چار ہزار روپے ماہوار بھی دے سکتا ہے۔" شجاع احمد بولے۔

"اس سے کہو شجاع احمد! ہمیں بھی ایک آدمی کی ضرورت ہے۔ حاجی نیاز اگر خود ملازمت کرنا چاہے تو ہم اُسے آٹھ ہزار روپے ماہوار دیں گے۔ دراصل جو کپڑے اور جوتے وہ پہنتا ہے، اُن کی استری اور پالش زاہد کو بہت پسند ہے۔ مختصر کام ہوگا۔ بس زاہد کے جوتوں پر پالش... اور کپڑوں پر استری کر دیا کرے۔" حسام احمد صاحب نے کہا۔

لڑکوں اور لڑکیوں کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

شجاع احمد صاحب جلدی سے بولے۔ "آپ برا مان گئے، ابا جان! میری مجبوری بھی تو سمجھیں۔"

"ہماری مجبوری بھی تو سمجھو۔ زاہد، اس دن سے ضد کر رہا ہے۔ تم نیاز احمد سے بات کر کے تو دیکھو۔"

"ان میں اور زاہد میں فرق ہے، ابا جان!"

"کیا فرق ہے؟"

"وہ کروڑپتی ہے اور..."

"ابے چپ ہوتا ہے یا اتاروں جوتی۔ ایسی تیسی تیری... اور تیرے نیاز کی... بک بک کر رہا ہے۔ کیا سمجھا ہے، تم لوگوں نے اسے کوئی شے نہیں ہے وہ جو حاجی نیاز مانگ رہا ہے۔ ڈوب مرنا چاہئے، تم کم ظرفوں کو۔ کسی کی صلاحیتوں کا احترام کرنے کی بجائے اُن کی قیمت لگاتے ہو۔ وہ حرام خور، میرے سامنے تو بات کرے۔" حسام احمد صاحب گرجنے لگے۔

"آپ کی مرضی۔ اگر آپ کو میرا نقصان پسند ہے تو۔" شجاع احمد، بارہ بنکی کے اس دانگڑ سے بہت خوفزدہ رہتے تھے۔ وہ کرسی کھسکا کر اٹھنے لگے تو حسام احمد صاحب گرجے۔

"بیٹھو! مجھے تم سے کچھ بات کرنی ہے۔"

شجاع احمد صاحب کنکھیوں سے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے بیٹھ گئے۔ ایسے حالات سے وہ بہت گھبراتے تھے۔

"جی ابا جان! فرمائیے۔" اُن کی مری مری آواز نکلی۔

"وہ کالونی والے پلاٹ کا کیا ہوا؟"

"کچھ نہیں، ابا جان! پڑا ہوا ہے، جوں کا توں۔"

"کیوں پڑا ہوا ہے؟"

"جی..." شجاع احمد صاحب پریشان لہجے میں بولے۔

"میرا مطلب ہے، اس کا کیا استعمال سوچا ہے، تم نے؟"

"ابھی تو کچھ نہیں۔ سوچ رہا ہوں وہاں چند گودام بنواؤں گا۔"

"یہ سوچنا ملتوی کر دو۔" حسام احمد صاحب سرد لہجے میں بولے۔ اور شجاع احمد صاحب چونک کر انہیں دیکھنے لگے۔

"کیوں، ابا جان! کیا آپ کے ذہن میں کوئی بات ہے؟" انہوں نے نرمی سے پوچھا۔

"ہاں۔ وہ پلاٹ مجھے چاہئے۔"

"آپ، آپ کیا کریں گے، اس کا؟"

"میں نے اور زاہد نے مل کر ایک پروگرام بنایا ہے۔" حسام احمد صاحب نے کہا تو زاہد نے دونوں آنکھیں میچ لیں۔ حسام احمد صاحب نے اس کا نام لے کر شجاع احمد صاحب کو ذہنی اذیت پہنچائی تھی۔

"کیا پروگرام ہے؟" انہوں نے پوچھا۔

"دراصل میں وقت سے پہلے بوڑھا نہیں ہونا چاہتا... جب تک زندہ ہوں مصروفِ عمل رہنا چاہتا ہوں اور میں نے اپنے لئے ایک مصروفیت ڈھونڈلی ہے۔ میں کالونی والی زمین پر ایک فرسٹ ایڈ ہاؤس بنانا چاہتا ہوں۔"

"فرسٹ ایڈ ہاؤس... ؟" شجاع احمد صاحب نے حیرت آمیز لہجے میں پوچھا۔

"ہاں۔ ایک نہایت منفرد اور کارآمد ادارہ جس میں پریشان حال انسانیت کو سہارا ملے گا۔ ان لوگوں کو جن میں کچھ کرنے کی لگن ہے اور جن کے وسائل محدود ہیں اور وہ اپنی ان صلاحیتوں کے ساتھ ... میں گھٹ کر قبر میں چلے جاتے ہیں، زندگی بخشنے کا ادارہ ہوگا... اور بھی بہت سے کام ہوں گے، اس ادارے کے۔ بس یوں سمجھو، یہ یتیم خانہ نہیں ہوگا، دارالامان نہیں ہوگا، ایک فعال ادارہ ہوگا جو ملک و قوم کا قرض ادا کرے گا۔"

شجاع احمد صاحب منہ پھاڑے بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کی آنکھیں ... سے پھیلی ہوئی تھیں۔ حسام احمد صاحب کے خاموش ہو جانے کے بعد وہ بولے۔

"اور اس کے اخراجات ؟"

"تم پورے کروگے، تم جیسے دوسرے سرمایہ دار پورے کریں گے۔ ... ملک کے تم باشندے ہو، جہاں تمہیں عزت و دولت ملی ہے، اس ... کیا صرف اتنا رہنا چاہیئے کہ تم اس سے کھاتے کماتے رہو۔ ... اس پر اتنا حق ہے تو اس کا تم پر کوئی حق نہیں ؟ میاں عاقبت کے ... بھی کچھ کرو، کچھ وہاں کی بھی سوچو۔ وہ دو گز زمین جو تمہاری اصل ملکیت ہے ... بھی تو سوچو ورنہ موت کے بعد، اس کی تاریکیاں تمہیں پھاڑ کھائیں گی ... ؟"

"اس کے اخراجات معمولی تو نہ ہوں گے، اباجان ؟"

"تم بھی تو معمولی نہیں ہو، شجاع احمد اکروڑ پتی ہو اور تمہارے دوست ... ارب پتی ہیں۔ وہ ایک شطرنج کے شوق کو پورا کرنے کے لئے... اتنی ... رقم خرچ کرسکتے ہیں تو اس نیک کام کے لئے تو بہت کچھ کرسکتے ہیں۔ ... خیال میں یہ سب کچھ اتنا مشکل نہیں ہوگا۔"

"اتنا آسان بھی نہیں ہوگا، اباجان !"

"وہ کیوں، میاں ؟"

"اس لئے کہ ان پر کسی حسام احمد کا دباؤ نہیں ہوگا۔" شجاع احمد صاحب ... ہمت کرکے کہہ دیا۔

"ہوں... میں، تمہارے کرب کو سمجھتا ہوں میرے بچے، لیکن تقدیر ... کو کہ ابھی میری صحت بھی خراب نہیں ہے اور بظاہر موت کے آثار نظر نہیں آتے۔ اس لئے کم از کم تم تو ابھی مجبور ہو۔ ہاں، ایک ترکیب ہو سکتی ہے۔ کسی معقول ڈاکٹر سے مشورہ کرکے میرے لئے کوئی سست رفتار زہر تجویز کرالو۔ دو چار ماہ بعد تم پر سے بھی دباؤ ختم ہو جائے گا۔"

"خدانخواستہ، میرا یہ مقصد نہیں تھا، اباجان!" شجاع احمد صاحب جلدی سے بولے۔

"بھئی، سبحان اللہ: کم از کم بارہ نمکی کے رہنے والے کسی شخص میں اتنا اخلاق و مروت تو ہے کہ وہ اپنی مرضی کے خلاف اپنے باپ کو زندہ رہنے دے۔ تمہارے اس اخلاق سے میں متاثر ہوا۔ بہر صورت میرے بچے، یہ سب کچھ تو کرنا ہی ہے۔ بے شک یہ کڑوی گولی ہے لیکن اسے نگلنا ہے اور مجھے اس سلسلے میں بہت سے گر آتے ہیں۔"

"اباجان! آپ میری طرف سے غلط فہمیوں کا شکار نہ ہوں... میں تو بس یہ کہہ رہا تھا کہ ایسے ادارے موثر نہیں ہوتے۔ ہمارے ملک میں حرام خوروں کی تعداد زیادہ ہے۔ ایسے کسی ادارے کا سہارا پاکر لوگ یہاں آتے رہیں گے اور کچھ کرنا دھرنا بھول جائیں گے۔"

"میاں: وہ تو ٹھیک ہے لیکن ہمارا مقصد ہی ایسے حرام خوروں کو کارآمد بنانا ہے۔ جو کچھ بھی کرسکے، جتنا سرمایہ بھی خرچ ہو، اسے خرچ کرکے چند آدمیوں کو بھی سدھار سکے تو کیا یہ بات ہمارے لئے بہتر نہ ہوگی ؟"

"آپ بہتر سمجھ سکتے ہیں، اباجان!" شجاع احمد صاحب نے خفگی سے کہا۔

"ہاں، اس میں کیا شک ہے۔ تم صرف وہ کرو، جس کی ہمیں ضرورت ہے۔"

"مجھے کیا کرنا ہوگا ؟"

"فی سبیل اللہ: جو بھی امداد کرو۔ تعمیر کا مسئلہ ہے... میرے اکاؤنٹ میں بھی اچھے خاصے پیسے پڑے ہوئے ہیں اور پھر یہ بچے... کیوں، بچو! تم ہماری اس تجویز سے اتفاق رکھتے ہو یا نہیں؟" داداجان نے پوچھا تو سب بچوں نے ہاتھ اٹھادیئے۔

"انکار میں یا اقرار میں ؟" داداجان نے سوال کیا۔

"نہیں، داداجان: ہم رضاکارانہ طور پر آپ کے ساتھ ہر قسم کی خدمات سرانجام دینے کے لئے تیار ہیں۔"

"بڑی مسرت ہوئی۔ تمہارے اس جذبے سے لیکن میں تم سے کوئی امداد نہیں لوں گا۔ البتہ اپنے جیب خرچ میں سے کچھ رقم اس ادارے کو بھی بخش سکو تو یہ تمہاری مہربانی ہوگی۔ تم لوگ ابھی اپنی تعمیر میں مصروف ہو۔ مکمل ہوجاؤ، اس کے بعد، اس قسم کے کسی بھی ادارے کی جو بھی خدمت کرسکو، ضرور کرنا۔ تم یقین کرو، اس میں منافع ہی منافع ہے۔ ہم تو اپنا کاروبار شروع کر ہی رہے ہیں۔"

دادا جان پھر شجاع احمد صاحب کی طرف متوجہ ہوئے۔ "ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ تعمیر میں کوئی خاص مشکل پیش نہیں آئے گی مجھے کیونکہ میرے اکاؤنٹ میں ابھی خاصی رقم موجود ہے۔ بعد کی کچھ ضرورتیں ہوں گی، تو وہ تم پوری کر دینا... اور اگر تمہارے کچھ خیر دوست، اس ادارے کی افادیت اور مقاصد کو سمجھ کر، اسے کچھ دینے کے لئے تیار ہوں تو یہ ان کے لئے سعادت ہوگی۔ کوئی نہ دے تو مجبوری بھی نہیں ہے۔ ہم کسی نہ کسی طرح اپنا کام چلا ہی لیں گے۔ ویسے تمہارا اثر بے شمار لوگوں پر ہے۔ کم از کم وہ لوگ جو تمہارے زیر اثر ہیں، اس سلسلے میں کچھ نہ کچھ کرنے پر آمادہ تو ہو ہی جائیں گے۔ تو اتنا سا مقصد تھا میرا جو میں نے تمہارے سامنے رکھ دیا۔"

"جی..." شجاع احمد صاحب بھاری آواز میں بولے۔ ان کے دل پر جو کچھ بیت رہی تھی، وہی جانتے تھے۔ کالونی والی زمین اچھی خاصی تھی اور اس وقت، اس کی قیمت، آسمان سے باتیں کر رہی تھی۔ اس کا اس طرح ضائع ہو جانا، شجاع احمد صاحب کو پسند نہیں تھا لیکن جانتے تھے کہ حسام احمد صاحب زبان کے بعد جوتے کے استعمال پر اتر آتے ہیں اور یہ استعمال بہر صورت انہیں اس عمر میں پسند نہ تھا۔ چنانچہ خاموش ہو گئے۔ البتہ کمرے سے نکلتے ہوئے انہوں نے بڑی خونی نگاہوں سے زاہد کو دیکھا تھا اور زاہد نے پھر آنکھیں موند لی تھیں۔

★★

دونوں جوان توفیق صاحب کی عدالت میں پیش تھے۔ شاہدہ بیگم بھی سہمی ہوئی موجود تھیں۔

"میں، ان گدھوں کو انسان کیسے بناؤں، شاہدہ؛ مجھے کوئی ترکیب بتاؤ۔" توفیق صاحب بولے۔

"کوشش کریں۔ ہر کام ممکن ہے۔" سہمی ہوئی شاہدہ بیگم جلدی سے بولیں۔

"میری کوشش سے کیا ہوگا؛ ان میں خود بھی تو کوئی صلاحیت موجود ہو۔"

"ہمارا قصور کیا ہے، ابا جان؟" شفیق نے پوچھا۔

"تُو تو بات ہی مت کریو۔ خون کھول رہا ہے، تجھے دیکھ کر... کیا کرنے گیا تھا، اس کے پاس؟"

"کس کے پاس؟" شفیق نے چونک کر پوچھا۔

"اسی اپنی... روک لے، شاہدہ! اسے روک لے۔ نہیں تو جوتی لے کر اس کا حلیہ بگاڑ دوں گا، اس کا۔" توفیق صاحب آپے سے باہر... ہونے لگے۔

"شفیق کے ابا! تمھی سے کام لو۔ یہ ہمارا گھر نہیں ہے۔ یہاں تو گالی گلوچ مت کرو۔ یہاں ہم شریف آدمی بن کر آئے ہیں۔"

"ارے، تُو پوچھ ان سے، پوچھ... زندگی میں ایک ہی داؤ لگایا ہے۔ ایک ہی کوشش کی ہے اور یہ دونوں اسے بھی خاک میں ملائے دے رہے ہیں۔ پوچھ ان سے۔ کریں گے کیا زندگی میں...؟ لنگوٹی باندھ کر گلی میں گلی ڈنڈا کھیلتے تھے۔ تخت پر دری بچھا کر سوتے تھے۔ اب کرکٹ کھیلتے ہیں اور بیڈ روم میں مسہری پر سوتے ہیں۔ گاڑی میں سفر کرتے ہیں۔ اگر یہی لچھن رہے تو کیا یہ سب کچھ باقی رہے گا؟"

"ابا! میں نے کیا، کیا آخر؟" شفیق نے پوچھا۔

"اس کا بیگ چھین کر کیوں بھاگ رہا تھا؟"

"سچ کہہ رہا ہوں، ابا! میں نے جھوٹ نہیں بولا۔"

"کیا جھوٹ نہیں بولا؟ ابے! کیا جھوٹ نہیں بولا؟"

"پولیس کو جو بیان دیا تھا، میں نے۔ نشاط نے بھی یہی کہا تھا مجھ سے کہ وہ نشاط نہیں ہے۔ میں سمجھا کہ دوسری لونڈیا نشاط ہوگی۔"

"اپنی ماں کو بھی کسی دن نشاط سمجھ بیٹھیو۔"

"شفیق کے ابا! اپنی زبان کو لگام دو۔"

"ان سسروں کو بھی تو لگام دے، شاہدہ! غصہ دلائے جا رہے ہیں مجھے۔ نشاط نے اگر مذاق کیا تھا تو دوسری لونڈیا پر کیوں جھپٹ پڑا۔ کچھ سوچا سمجھا، مشورہ کرتا، ہم سے۔ بیگ چھیننے لگا، اس سے سالا۔"

"ہاں، ابا! بس یہ غلطی ہو گئی، مجھ سے۔" شفیق نے گردن جھکا کر اعتراف کیا۔

"کرتے رہو، ایسی ہی غلطیاں کرتے رہو اور اپنے باپ کو مصیبتوں میں پھنساتے رہو۔ کتنے مہینے ہو گئے، یہاں آئے ہوئے، اب تک کیا، کیا۔ خرلو کے کام پر بٹھایا تمہیں۔ وہ سیکھ کر نہیں دیا۔ پان کی دکان کھلوائی۔ دکان چھوڑ چھوڑ کر بھاگ جاتے تھے اور دکان تباہ ہو گئی۔ سالو! عشق بھی نہیں کر سکتے۔ لونڈیوں کو چکر میں نہیں لا سکتے۔ بولو، کیا کرو گے، تم؟"

"ابا! یقین کرو۔ وہ لونڈیاں خود چکر باز ہیں۔" رفیق بولا۔

"لونڈیں چکر باز ہیں... سن رہی ہو، شاہدہ! ارے، بتاؤ انہیں کلو کی لونڈیا کے بارے میں... میں دو بچوں کا باپ تھا۔ کبوتر اڑا رہا تھا کوٹھے پر چڑھ کر۔ اے، مرمٹی، سالی، ہم پر۔ کہتی تھی، شاہدہ باجی کی خدمت کروں گی۔ دونوں بچوں کو پالوں گی۔ بس، نکاح کر لو مجھ سے۔ گھر سے بھاگنے کو تیار تھی، ہمارے ساتھ۔ ارے، شاہدہ! بتاؤ نا، ان جوانوں کو۔"

"یاد آ گئی نا، بہن! اتر آئے بے شرمی پر۔ بڑا اچھا سبق دے رہے ہو، بیٹوں کو۔" کلو کی لونڈیا کے نام نے شاہدہ بیگم کو بھڑکا دیا۔

توفیق صاحب فوراً سنبھل گئے۔

"سمجھنے کی کوشش کرو، شاہدہ! اتنے مہینے ہو گئے، ان دونوں کو اور ابھی تک صوفیہ اور نزہت سے دوستی نہیں کر سکے۔ ہم ہوتے

ان کی جگہ تو دیکھتے۔"

"بہت مشکل کام ہے، ابا! تم نہیں سمجھتے۔ جب بھی ہم، اُن کے قریب جاتے ہیں تو وہ دونوں ہمارا مذاق اُڑاتی ہیں۔"

"اے، تم جاتے ہی ایسے ہو گے۔ سمجھنے کی کوشش کرو میرے بچو! ایک ایک کرکے جاؤ۔ ایسی کوشش کرو کہ وہ تمھاری محبت کا دم بھرنے لگیں... بس پھر کوئی مشکل نہیں ہوگی۔ اے، لڑکیاں اگر تیار ہو گئیں تو پھر یہ مہرالنساء بیگم کیا حیثیت رکھتی ہیں، کون پوچھتا ہے انہیں... لڑکیاں اپنی مرضی سے شادی کریں گی۔ وہ جوان ہیں، بالغ ہیں، عاقل ہیں اور پھر ہم اُن کے مددگار ہوں گے۔ یہ سب کچھ میں، تمھارے ہی لئے تو کر رہا ہوں۔ کوشش کرو، کچھ نہ کچھ دے کر ہی جاؤں گا، تمھیں اس دُنیا میں۔ یہ بھی کوئی بات ہے۔ دو لونڈیاں، گھریلو، نیک، شریف، پاکباز اور تم انہیں قابو میں نہ لا سکو۔ کوئی مشکل بات نہیں ہے۔ ذرا محنت کرو۔ البتہ یہ لونڈیا ذرا ٹیڑھی ہے، اس کا خیال رکھنا۔"

"نشاط کی بات کر رہے ہو، ابا؟" شفیق نے پوچھا۔

"ہاں، یہ چکر میں آنے والی نہیں۔ شہر میں پڑھتی ہے اور پھر تمھارے بس کی ہے بھی نہیں۔ مگر وہ دونوں تمھارے پھندے میں نہ آئیں، یہ بات میں نہیں سن سکتا۔"

"ہم اور کوشش کریں گے، ابا۔" رفیق بولا۔

"ابھی مت کرنا۔ کچھ دن رُک جاؤ۔ جب نشاط چلی جائے، اُس کے بعد اپنا کام کرنا۔ کہیں بھڑکا نہ دے، اُن دونوں کو... مگر ذرا سمجھداری سے کام کرنا۔ تمھارے ہی بھلے کی بات ہے۔ میں یہ سب کچھ تمھارے ہی لئے تو کر رہا ہوں۔" توفیق صاحب دھیمے پڑ گئے۔

اور دونوں بیٹے گردن ہلانے لگے۔

نشاط کے بارے میں اُنہوں نے بخوبی اندازہ لگا لیا تھا کہ وہ کسی جال میں پھنسنے والی نہیں ہے بلکہ خاصی خطرناک ہو سکتی ہے، ان کے لئے۔

توفیق صاحب نے مہرالنساء بیگم کو تو جال میں پھانس لیا تھا اور بیشتر اُن کی ہاں میں ہاں ملائی تھی لیکن یہ بات وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ اُن کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ وہ قانونی طور پر کچھ بھی نہیں ہیں کل اگر مہرالنساء بیگم، اُن سے معذرت کر لیں کہ نشاط یہاں اُن کی موجودگی کو پسند نہیں کرتی تو اُن کے رُکنے کا کوئی جواز نہ ہوگا۔

رات کو دونوں میاں، بیوی سر جوڑ کر بیٹھے۔

"یہ لڑکی ذرا بے ڈھب معلوم ہوتی ہے۔" شاہدہ بیگم نے کہا۔

"مہرالنساء نخرے بھی تو بہت اُٹھاتی ہے، اُس کے۔"

"چھوٹی بیٹی ہے، نا۔"

"تو پھر کیا کرنا چاہیئے؟"

"جو کچھ کر رہے ہو، وہ چھوڑ دو۔"

"کیا مطلب...؟"

"تم بھی تو بلا سوچے سمجھے بول پڑے تھے۔"

"کیا بول پڑا تھا؟"

"اُس کی پڑھائی چھڑانے لگے تھے۔"

"میں تو ٹٹول رہا تھا کہ کتنا دم خم رکھتی ہے مگر بات بنتی نظر نہیں آتی۔ وہ طاہرہ کی کیا رہی؟"

"مہرالنساء نے کسی نہ کسی طرح سمجھا بجھا لیا ہے۔ ابھی تو خاموش ہو گئی ہے مگر وہ خاموش رہنے والی نظر نہیں آتی۔"

"اپنا نام بھی مرزا توفیق بیگ ہے۔ سب ٹھیک کر لیں گے..." توفیق صاحب نے اکڑ کر کہا۔

"مگر آہستہ آہستہ... جلد بازی کام خراب کر دے گی۔"

"ہاں، یہ تو ٹھیک ہے۔"

"میرا خیال ہے، اُسے ہاتھ میں لو۔ اُس کی ہاں میں ہاں ملاؤ۔ تب کام بنے گا ورنہ کھیل بگڑ جائے گا۔" شاہدہ بیگم نے کہا۔

"ہاں، کچھ کرنا ہی پڑے گا مگر یہ دونوں سسُرے ناکارہ ہیں۔ اگر یہ کام کے ہوتے تو اب تک ہم اتنے کمزور نہ ہوتے۔ اب دیکھو، اس گدھے کو، جلد بازی میں دوسری لونڈیا پر جھپٹ بیٹھا اور پولیس کے ہتھے چڑھ گیا۔ بلاؤ، ذرا دونوں کو۔"

"کیا کہو گے، اُن سے؟"

"جو کہوں گا، ٹھیک کہوں گا۔ بلاؤ تو انہیں۔" توفیق صاحب نے کہا۔

شاہدہ بیگم دونوں بیٹوں کو بلا لائی تھیں۔ نتیجے میں دونوں پر یہ بیتی تھی۔ توفیق صاحب لفنگے قسم کے آدمی تھے۔ اس حویلی میں آنے سے پہلے، کافی دن تک اُنہوں نے اپنا لب و لہجہ اور عادات و اطوار بدلنے کی مشق کی تھی۔ تب کہیں جا کر خود پر تھوڑا سا قابو پا سکے تھے۔

بہر صورت، پروگرام میں تبدیلیاں ہوئی تھیں اور اُنہوں نے اس پر عمل کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

دوسری طرف مہرالنساء بیگم نے بھی نشاط کو بہت سمجھایا تھا۔ نشاط سیخ پا تھی۔ دونوں بہنوں نے بعد میں ہونے والی گفتگو بھی اُسے بتا دی تھی۔

مہرالنساء دوبارہ، اُن کے پاس پہنچیں تو وہ باتیں کرتے کرتے خاموش ہو گئیں۔ مہرالنساء بیگم مسکراتی ہوئی بیٹھ گئیں۔ "نہ جانے کون سی اہم باتوں میں مداخلت کی ہے، میں نے... لیکن میں بھی تو مجبور ہوں۔"

"جی ہاں، امی! اس بار آپ ضرورت سے زیادہ مجبور نظر آرہی ہیں، مجھے۔" نشاط نے کہا۔

"مجھ سے بھی ناراض ہو، نشاط؟"

"جی، امی!"

"کیوں آخر...؟"

"یہ لوگ کون ہیں، امی! جو ہماری زندگی میں زبردستی گھسنے آگئے ہیں۔ ابّو کی موت برداشت کرلی ہم نے۔ ہمارے لئے وہ اتنا چھوڑ گئے ہیں کہ خدا کے فضل سے ہمیں کوئی پریشانی نہیں ہے۔۔ پھر یہ پریشانیاں کیوں خرید رہی ہیں، آپ؟"

"یہ لوگ اتنے بُرے نہیں ہیں، بیٹی! جتنا تم سمجھ رہی ہو۔ میرے میکے میں سگا تو کوئی ہے نہیں، مرحوم ابامیاں نے کسی سے بنا کر ہی نہیں رکھی تھی۔ شاہدہ میری دُور کی بہن ضرور ہے لیکن قریب کا وہی ہے جو دُکھ درد میں کام آئے۔ میری بپتا سُن کر یہ بے چارے گھربار چھوڑ کر آگئے... بہت بڑا سہارا ملا ہے مجھے، ان سے۔ یقین کرو، نشاط! انہوں نے اپنوں کی طرح سب کچھ سنبھال لیا ہے۔ بڑے خلوص سے وہ، ہمارے لئے سب کچھ کر رہے ہیں۔"

"کیا کیا کر رہے ہیں، امی! ذرا تفصیل معلوم ہو سکتی ہے، مجھے؟"

"جائداد کی دیکھ بھال، حویلی اور اس کے تمام مفادات کی دیکھ بھال وہی کر رہے ہیں۔"

"اور اس کام کے لئے جو پُرانے لوگ تھے؟"

"کچھ ہیں۔ جن کی زیادہ ضرورت نہیں تھی، انہیں نکال دیا گیا تاکہ اخراجات میں کچھ کمی ہو۔"

"آپ نے ان لوگوں کو، میرا مطلب ہے توفیق صاحب کو کوئی قانونی حیثیت بھی دے رکھی ہے؟"

"نہیں، ایسی کوئی بات نہیں ہے۔"

"آپ ایسا کوئی کام نہیں کریں گی، امی! اگر آپ نے ایسا کیا تو سمجھ لیں، اپنی بیٹیوں کو زندہ دفن کردیا۔"

"نہ تو ان لوگوں نے ایسی کوئی فرمائش کی ہے اور نہ ہی میں نے کبھی اس بارے میں سوچا ہے لیکن میری اتنی خواہش ضرور ہے کہ تم، ان لوگوں کے لئے دل میں اس قدر میل نہ رکھو۔"

"اور یہ لوگ اتنی آسانی سے میرے مستقبل کی تباہی کی بات... کریں، کیوں؟"

"نہیں۔ میں انہیں سمجھا دوں گی کہ آئندہ ایسی کوئی بات نہ کریں۔"

"گھر کے تمام پُرانے ملازم نکال دیئے گئے ہیں، امی!"

"جن کی ضرورت نہیں تھی، صرف انہیں نکالا گیا ہے۔"

"بے چاری حسینہ کو بھی۔" نشاط نے کہا تو بیگم صاحبہ تلملا گئیں۔

"تم اسے بے چاری کہہ رہی ہو۔ وہ جس دن سے گھر میں داخل ہوئی، مجھے مریض بنا دیا۔ میرے اور شمشیر زماں کے درمیان اتنی بڑی خلیج حائل کردی کہ اس کے بعد، ہمارے دل نہ مل سکے۔"

"خیر، امی! میں اب اس بارے میں کچھ نہیں کہوں گی۔ سوائے اس کے کہ اب تو وہ بے سہارا تھی۔"

"مجھے اس سے کوئی غرض نہیں ہے۔" مہرالنساء بیگم بولیں۔

"ظہور کے بارے میں آپ نے کیا سوچا، امی؟"

"اُسے بھول جاؤ، نشاط! کہیں نہ کہیں لگ گیا ہوگا۔"

"افسوس! آپ نے اُن کے ساتھ انصاف نہیں کیا، امی! تھوڑا سا حق اس حویلی پر ہمارا بھی ہے، ہم بھی کچھ کہہ سکتے ہیں، اپنے گھر کے بارے میں یا ہمیں کبھی کچھ بولنے کی اجازت نہیں ملے گی؟"

"میں نے کبھی تم لوگوں پر کوئی پابندی نہیں لگائی۔ بولو، کب شکایت ہوئی مجھ سے؟"

"کبھی نہیں، امی! لیکن یہ سُن لیں، مزید کوئی تبدیلی نہ ہو۔ ہر شخص کی ایک حد مقرر ہونی چاہیئے۔ میں، ان لوگوں کی مخالفت نہیں کرتی لیکن انہیں بہت زیادہ اختیارات نہ دیئے جائیں۔ آپ، انہیں کوئی رقم وغیرہ بھی دیتی ہیں؟"

"کچھ نہیں۔"

"مانگی بھی نہیں، اُنہوں نے؟"

"نہیں۔ میں خود ہی ان کی ضرورتیں پُوری کر دیتی ہوں۔ غریب لوگ تھے، بس بہتر زندگی گزارتے ہیں۔"

"یہ دونوں لڑکے کچھ کرتے ہیں؟"

"ابھی تو کچھ نہیں کرتے۔"

"بہرحال، میں ان معاملات میں دخل نہیں دوں گی لیکن، امی! کوئی تبدیلی نہ ہو ورنہ اچھا نہ ہوگا۔"

"اب تو، مجھے بھی دھمکیاں دینے لگی۔" مہرالنساء بیگم نے مُسکراتے ہوئے کہا۔

"نہیں، امی! آپ نہیں جانتیں۔ آپ معصوم ہیں۔ آپ کچھ نہیں سمجھتیں۔ یہاں امداد علی پھوپھا بھی تو ہیں۔"

"ہاں، بہت سے ہیں۔ میں کسے منع کرتی ہوں۔"

"یہ لوگ کھانے کی میز پر نظر نہیں آتے۔"

"اُن کی میز الگ لگتی ہے۔"

"اس لئے کہ ابّو کے رشتے دار ہیں۔"

"یہ بات نہیں۔ میں خود زیادہ بھیڑ بھاڑ پسند نہیں کرتی۔"

"بہرحال، ٹھیک ہے۔ آپ، ان لوگوں کو ہوشیار کردیں۔ خاص طور سے خالو جان کو۔ میں، اُن کے مُنہ سے مزید کوئی بات برداشت نہیں کروں گی۔"

"اچھا، چھوڑو، ان باتوں کو۔ تمہاری تعلیم کب تک ختم ہوجائے گی؟"
"ابھی تو تین، چار سال اور لگیں گے۔ بی۔ اے کے بعد ایل۔ ایل۔ بی... پھر پریکٹس اور پھر..."
"پھر کیا...؟"
"اس کے بعد دیکھا جائے گا، امی! ممکن ہے، وکالت کروں یا کچھ اور سوچوں۔"

"وکالت کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ بس پڑھ لو، یہی کافی ہے۔"
"ضرورت ہے، امی! پہلے وکیل بنوں گی پھر جج بنوں گی۔ اپنے ابو کا نام روشن کروں گی۔ بس، آپ دیکھتی رہیئے۔" نشاط نے مسکرا کر کہا اور مہرالنساء بیگم کسی سوچ میں ڈوب گئیں۔
"آیئے باجی! دوسرے لوگوں سے ملیں... اور ہاں، امی! رات کا کھانا ہم اُن لوگوں کے ساتھ کھائیں گے جن کی میز الگ لگتی ہے۔ آپ حِس نہ کریں۔"
"تمہاری مرضی ہے۔" مہرالنساء بیگم بولیں۔
رات کے کھانے پر توفیق صاحب سے ملاقات نہیں ہوسکی لیکن صبح کو وہ موجود تھے۔ بڑی مسمسی سی شکل بنائے، ناشتے کی میز پر آئے تھے۔ نشاط نے اُن کی طرف کوئی توجہ نہیں دی۔
"رات کو آپ کہاں تھے، بھائی صاحب؟" مہرالنساء بیگم نے پوچھا تو توفیق صاحب نے پھیکی سی مُسکراہٹ کے ساتھ، اپنی پلیٹ، اپنے آگے سرکالی۔

"بس، کیا بتاؤں، مہر بہن! اپنی بیٹی کے سامنے شرمندہ واپس آیا ہوں۔" توفیق صاحب مکاری سے بولے۔
"کیا مطلب؟ میں سمجھی نہیں۔" مہرالنساء بیگم نے کہا۔
"بس، بٹیا کا حکم تھا کہ ظہور کو تلاش کرکے لاؤں۔ ہر جگہ دیکھ لیا۔ پتہ چلا، کسی کمپنی میں ملازم ہوکر شہر چلا گیا ہے۔ اس کی تلاش میں مارا مارا پھرتا رہا، خاصی رات گئے تک۔" توفیق صاحب نے جواب دیا تو نشاط کے ہونٹوں پر طنزیہ سی مسکراہٹ پھیل گئی۔

"میں نے نشاط سے بات کرلی تھی، توفیق بھائی! بس، یہ ذرا جذباتی ہے۔ بہرصورت، مان گئی کہ جو کچھ ہوا، بہتر ہی ہوا۔" مہرالنساء بیگم نے کہا۔
"ہاں، امی! مجبوری ہے۔ جن لوگوں کے ساتھ ظلم ہونا تھا، وہ تو ہو ہی گیا۔ نہ جانے کہاں کہاں مارے پھر رہے ہوں گے، بے چارے۔"
"یہ بات نہیں ہے، نشاط بیٹی! یہ ملازم قسم کے لوگ جہاں بھی پہنچ جاتے ہیں، اُنہیں نوکری مِل جاتی ہے اور پھر ملازمت کے ساتھ ساتھ ان کی وفائیں بھی بدل جاتی ہیں۔ بہرحال، مجھے افسوس ہے کہ تمہارا پسندیدہ ملازم بھی چلا گیا۔ دراصل، بیٹی! صورتِ حال ذرا مختلف ہے۔ تم ابھی بچی ہو۔ حالات سے ناواقف۔ بے شک، خداوندکریم برکت دے، بھائی صاحب کی چھوڑی ہوئی جائدادوں کی آمدنی اتنی ہے کہ تم لوگوں کو کبھی مالی پریشانی نہیں ہوگی لیکن اس کے باوجود، بیٹی! کفایت شعاری ضروری ہے وہ شاہانہ ٹھاٹ باٹ جاری رکھے جائیں جو بھائی صاحب کے دور میں تھے لیکن ایسے لوگوں کو فائدہ نہ اُٹھانے دیا جائے جو بالکل بے مقصد اور حرام خور ہوتے ہیں۔ کیا خیال ہے، تمہارا؟"
"میرے خیال کی بات رہنے دیں، خالو جان! اگر آپ کا اشارہ کسی خاص سمت میں ہے تو میں امی جان سے گفتگو کرچکی ہوں۔ آپ بھی سُن لیں۔ جو کچھ ہوچکا ہے، اُسے میں نے برداشت کرلیا ہے لیکن جو کچھ مزید ہونے والا ہے، اُس کے امکانات ہمیشہ کے لئے ختم کردیئے جائیں۔ یہ میں آخری بار کہہ رہی ہوں۔"

"ارے، ارے، نشاط! ہمارے، تمہارے درمیان بات ہوچکی ہے اب ان باتوں کی کیا گنجائش ہے؟" مہرالنساء بیگم جلدی سے بولیں۔
"کیا کروں، امی! عادت سے مجبور ہوں۔" نشاط نے کہا۔
توفیق صاحب معنی خیز انداز میں اُسے دیکھنے لگے اور جب نشاط سے آنکھیں ملیں تو جلدی سے نگاہیں جُھکا کر ناشتہ کرنے لگے۔
نشاط مسکراتی رہی تھی۔ وہ، توفیق صاحب کی نگاہوں کا مفہوم اچھی طرح سے سمجھ رہی تھی لیکن اس وقت اُس نے خاموشی ہی بہتر سمجھی۔
پھر جب ناشتہ ختم ہوگیا تو توفیق صاحب اُٹھتے ہوئے بولے۔
"نشاط بیٹے! میں تم سے تنہائی میں کچھ گفتگو کرنا چاہتا ہوں۔"
"مجھ سے؟" نشاط نے چونک کر پُوچھا۔
"ہاں، ذرا آؤ میرے ساتھ۔"
"امی، صوفیہ اور نزہت کے خلاف کوئی بات ہے؟" نشاط نے شرارت سے پوچھا۔
"نہیں، بھئی... وہ، بھلا یہ کیسے ممکن ہے۔" توفیق صاحب بوکھلا کر بولے۔

"تو پھر مجھ سے، آپ کے خُفیہ تعلقات تو نہیں ہیں، خالو جان! یا ایسا کوئی ارادہ ہے؟" نشاط نے رازداری سے پوچھا تو صوفیہ اور نزہت نے مُنہ میں دوپٹے ٹھونس لئے۔ مہرالنساء بیگم کا مُنہ کھُل گیا۔
"کک... کیسی باتیں کررہی ہو، بیٹی؟"
"تو جو بات کرنی ہے، سب کے سامنے کریں۔ میں ان تنہائیوں کی عادی نہیں ہوں۔"

"اللہ بھی، بہت ضدی ہو۔ چلو پھر سہی۔ ارے ہاں، شاہدہ! وہ میری شیروانی کے بٹن ٹانک دیئے، تم نے؟ ذرا آؤ، میرے ساتھ۔ سارے بٹن ٹوٹے ہوئے ہیں۔" توفیق صاحب نے وہاں سے کھسک جانا ہی مناسب سمجھا تھا۔

"توبہ، توبہ، خالہ جان! کتنا عرصہ ہو گیا، آپ کی شادی کو۔ یہ تو آپ کا فرض ہے کہ خالو جان کے کپڑوں کا خیال رکھیں۔ اب کہیں جلدی میں نکلنا ہو جائے تو؟" نشاط نے کہا۔

"ارے، بیٹی! اس بد نصیبی میں تو ساری عمر گزار دی۔" توفیق صاحب ٹھنڈی سانس لے کر بولے۔

"سبحان اللہ! سبحان اللہ! یہ آپ فرما رہے ہیں، آپ... ساری زندگی میں شیروانی نصیب ہوئی تھی، آپ کو؟" شاہدہ بیگم بھنا گئیں۔

"کیا مطلب ہے، تمہارا؟"

"میں لگی لپٹی رکھنے کی عادی نہیں ہوں۔ بد نصیبی ہوں، تمہاری تو کسی خوش نصیبی سے بیاہ کیوں نہ رچالیا؟ ساری عمر رو، رو کر گزاری ہے، تمہارے ساتھ۔ بس، اب منہ نہ کھلواؤ۔"

"کیا تم یہ کہنا چاہتی ہو کہ تمہاری بہن کے گھر آکر، مجھے شیروانی نصیب ہوئی ہے؟" توفیق صاحب غرائے۔

"یہ سوال تو خود اپنے دل سے کرو۔ میں اپنے منہ سے کیا کہوں؟"

"ارے، ارے... یہ آج کیا ہو گیا، آپ لوگوں کو؟ شاہدہ باجی! آپ کیا کہہ رہی ہیں؟" مہر النساء بیگم نے درمیان میں مداخلت کی۔

"اور جو وہ کہہ رہے ہیں، سو...؟" شاہدہ بیگم نے کہا اور توفیق صاحب بوکھلائے ہوئے کمرے سے نکل گئے۔

شاہدہ بیگم بھی ان کے پیچھے پیچھے باہر نکل آئیں۔

"کیا ہو گیا تھا، تمہیں؟" توفیق صاحب نے پوچھا۔

"بس، بس... دل کھل گیا، تمہارا۔ جو کچھ دل میں رکھتے ہو، سامنے آگیا۔" شاہدہ بیگم نے کہا۔

"بے وقوف عورت! وہ تو میں نے بات بنائی تھی۔ ورنہ میری کون سی شیروانی کے بٹن ٹوٹے ہوئے ہیں۔ تمہیں خود یہ بات معلوم ہے لیکن الجھ گئیں، مجھ سے۔"

"آپ بھی زبان پر قابو رکھا کریں۔ عزت کریں گے تو عزت کرائیں گے۔ مجھے کیوں ذلیل کر رہے تھے، آپ؟"

توفیق سوچ میں ڈوب گئے پھر بولے۔

"بہرحال، برا نہیں ہوا، یہ بھی۔ کم از کم یہ پتہ چل گیا کہ وہ لڑکی نہ صرف خطرات سے بچاؤ کی قوت رکھتی ہے بلکہ حملہ بھی کر سکتی ہے... بہت چالاک ہے۔ شاہدہ! بڑی ہوشیاری کی ضرورت ہے۔"

★★

"ارے کون سا اشتہار، بابا! کدھر سے آیا، اشتہار؟" چوکیدار گل خان نے نووارد کو گھورتے ہوئے کہا۔

"یہ دیکھیں خان صاحب! یہ اخبار میں اشتہار ہے... میں مصور ہوں۔" نووارد نے اخبار سامنے کر دیا۔

"چہ، ہم کو دیکھنا نہیں آتا، بابا! کیا لکھا ہے اس میں؟"

"ضرورت ہے، فنکار کی۔ جو ایک ذہین مصورہ کی لکیروں کی اصلاح کر سکے۔ تجریدی آرٹ کے ماہر کو ترجیح دی جائے گی... معاوضہ مناسب دیا جائے گا۔"

"پتہ کیا ہے؟" گل خان نے پوچھا

نووارد نے پتہ دہرا دیا۔

"پتہ تو ادھر ہی کا ہے۔ تم ادھر رکو، ہم معلوم کر کے آتا ہے..." گل خان نے کہا لیکن اسی وقت اس کی نگاہ سامنے اٹھ گئی۔ زاہد اسی طرف آرہا تھا۔

"چہ، صاب! یہ اشتہاری آیا ہے۔" زاہد کے قریب آنے پر گل خان نے نووارد کی طرف اشارہ کیا۔

"ارے ہاں، گل خان! رات کو میں تمہیں بتانا بھول گیا۔ ابھی اور بھی لوگ آئیں گے۔ ان سب کو فضل خان کے کوارٹر میں بھیج دینا لیکن بس گیارہ بجے تک۔ اس کے بعد جو بھی آئے، اسے واپس لوٹا دینا۔"

"ٹھیک ہے، صاب!" گل خان نے جواب دیا اور زاہد، نووارد کو لئے، فضل خان کے کوارٹر میں پہنچ گیا۔

"جی۔ فن مصوری کے بارے میں کیا جانتے ہیں، آپ؟"

"تخلیق، انسان کی گھٹی میں پڑی ہے۔ رنگ و برش کائنات کی نقاشی کرتے ہیں۔" مصور نے کہا۔

"شادی شدہ ہیں، آپ؟"

"جی نہیں۔"

"سوری... پہلے شادی کریں۔ تخلیق کا عمل سیکھیں، اس کے بعد مصوری کی طرف رجوع ہوں۔"

"لیکن جناب! میں پانچ سال تک کمرشل آرٹسٹ رہا ہوں۔"

"تب تو بالکل نہیں چل سکتے، آپ۔ براہ کرم، وقت ضائع نہ کریں، شاباش... شادی کریں تو دعوت نامہ ضرور بھیجیں۔" زاہد نے نووارد کے شانے پر تھپکی دیتے ہوئے کہا اور نووارد پریشان سا باہر نکل آیا۔ زاہد وہیں رک گیا تھا۔

تھوڑی دیر بعد قدسیہ بھی اس کے پاس پہنچ گئی۔

"میں نے معلوم کر لیا تھا کہ تم یہاں ہو۔" وہ بولی۔

مجھے یہاں ہونا ہی چاہیئے تھا۔ رات کو گل خان سے کہنا بھول گیا تھا، بہرصورت، میں نے اُسے بتلایا ہے کہ اُمیدواروں کو فضل خان کے کوارٹر میں بھیج دیا جائے۔"

"کوئی آیا۔۔؟"

"ہاں، ابھی ایک غیر شادی شدہ آیا تھا۔"

"پھر۔۔۔؟"

"پھر کیا۔۔۔ میں نے اُسے واپس کر دیا۔" زاہد بولا۔

"کیا مطلب؟" قدسیہ مُسکرانے لگی۔

"مصوّر کہتا تھا خُود کو۔۔۔ میں کہتا ہُوں، شادی کے بغیر مصوّری مکمل ہو ہی نہیں سکتی۔"

"کیا۔۔؟" قدسیہ کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

"ہاں، میرا مطلب ہے، ایک کامیاب مصوّر کا شادی شدہ ہونا ضروری ہے۔"

"تت۔۔تو۔۔۔ میرا مطلب ہے کہ۔۔۔ کک۔۔۔ کیا مجھے بھی۔۔۔؟"

"ارے نہیں، قدسیہ صاحبہ! سمجھنے کی کوشش کیجئے۔ میں، اُس شخص کی بات کر رہا ہُوں جو آپ کو مصوّری سکھلائے گا۔ سیکھنے والے کے لئے یہ سب ضروری نہیں ہے۔" زاہد نے کہا لیکن قدسیہ کے چہرے پر شگفتگی پیدا نہیں ہُوئی۔

"اور سیکھنے کے بعد۔۔۔ میرا مطلب ہے مصوّر بننے کے بعد۔۔۔؟"

"لڑکیوں کی بات نہیں قدسیہ صاحبہ! اگر ایسی بات ہوتی تو میں آپ کو پہلے بتا دیتا۔"

"اوہ۔۔۔" قدسیہ کے چہرے پر شگفتگی کی لہر دوڑ گئی۔ "تو، یہ صرف مردوں کے لئے ہے۔"

"ہاں، بے شک۔" زاہد نے جواب دیا اور قدسیہ عجیب سی نگاہوں سے زاہد کو دیکھنے لگی۔ اُس کی آنکھوں میں میٹھی میٹھی سی چمک پیدا ہو گئی تھی۔ زاہد کسی اور خیال میں گم تھا۔ اُس نے قدسیہ کے اس انداز کو نہیں دیکھا تھا۔

"زاہد۔۔۔!" قدسیہ نرم آواز میں بولی۔

"ہُوں۔۔۔" زاہد چونک کر اُسے دیکھنے لگا۔

"تم خود مصوّر کیوں نہیں بن جاتے؟"

"مم۔۔۔ میں۔۔۔" زاہد بوکھلا کر بولا۔

"ہاں، تم۔"

"لیکن میرے اندر تو وہ جراثیم ہی نہیں ہیں۔"

"میں نہیں مانتی۔ مصوّری کے لئے جراثیم کی کیا ضرورت ہے؟" قدسیہ نے کہا۔

"اوہو۔۔۔ یہی تو پوائنٹ کی بات ہے جسے آپ نہیں سمجھتیں۔" زاہد جلدی سے بولا۔

"خیر، مصوّر بنو یا نہ بنو۔۔۔ شادی تو کر لو۔"

"لو، میں مصوّری سے پناہ مانگ رہا ہُوں اور آپ شادی کی بات کرنے لگیں۔"

"کیا مطلب ہُوا؟ نہ مصوّری سیکھو گے، نہ شادی کرو گے۔۔۔ کبھی کرو گے ہی نہیں، شادی؟"

"یہ اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ کب اور کس وقت، دماغ میں خلل واقع ہو جائے۔ بہرحال، جس حد تک ممکن ہو سکا، اُس بُرے وقت کو ٹالنے کی کوشش کروں گا۔" زاہد نے کہا اور قدسیہ، اُسے میٹھی نگاہوں سے دیکھنے لگی۔ زاہد کی توجہ اب بھی اُس کی طرف نہیں تھی۔

"زاہد! تم نے کبھی کسی سے محبت بھی نہیں کی؟"

"نہیں، بھئی۔۔۔ کہاں۔۔۔" زاہد بے چارگی سے بولا۔

"کیوں۔۔۔؟"

"بس، وقت ہی نہیں ملا۔" زاہد نے جواب دیا پھر بولا۔ "میرا خیال ہے، کوئی آ رہا ہے۔" اُسی وقت، ایک صاحب نے اندر جھانکا۔

"حاضر ہو سکتا ہُوں۔"

"تشریف لائیے۔" زاہد نے بغور اُسے دیکھتے ہُوئے کہا۔

"وہ اشتہار تھا۔۔۔ چوکیدار نے مجھے اس طرف بھیج دیا۔" آنے والے نے کہا۔

"جی ہاں، جی ہاں۔۔۔ مصوّر ہیں، آپ؟"

"جی ہاں۔۔۔"

"کیا کرتے ہیں، آپ؟"

"ملازمت کرتا ہُوں۔"

"یہ ملازمت کس قسم کی ہے؟"

"ایک فرم میں کمرشل آرٹسٹ ہُوں۔ پارٹ ٹائم میں موقع مل سکے گا مجھے؟"

"جی ہاں۔ لیکن پہلے اپنی کسی تصویر کا تعارف تو کرائیے۔"

"جی ہاں۔۔۔ یہ لایا ہُوں۔" اُن صاحب نے بغل میں سے بیگ نکال کر، اُسے کھولا اور چند تصاویر نکال کر سامنے رکھ دیں۔

زاہد، انہیں دیکھ کر مُنہ بناتا رہا پھر بولا۔ "جی نہیں۔۔۔ یہ نہیں چلیں گی۔"

"کیا مطلب۔۔۔؟" مصوّر نے تحیّر آمیز لہجے میں پُوچھا۔

"میرا مطلب ہے، جس قسم کا آرٹ ہمیں درکار ہے، وہ نہیں ہے، یہ۔"

"میں ایک مشہور مصور ہوں، جناب! میری تصاویر مختلف رسائل میں چھپتی ہیں۔"

"یہ مزید بدنصیبی ہے، آپ کی۔" زاہد بولا۔

"جی بہتر... خدا حافظ!" مصور نے ناک چڑھا کر کہا۔

"فی امان اللہ!" زاہد گہری سانس لے کر بولا... اور مصور باہر نکل گیا۔ قدسیہ اس دوران میں خاموش رہی تھی۔

جب یہ مصور بھی چلا گیا تو قدسیہ بولی۔ "ہم محبت کے بارے میں بات کر رہے تھے۔"

زاہد نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اور قدسیہ مسکرادی۔

"قدسیہ صاحبہ!"

"جی...؟"

"کیا آپ چاہتی ہیں کہ مجھے یہاں سے نکال دیا جائے؟"

"کیوں...؟ ہرگز نہیں۔"

"تو پھر جائیے، آپ! یہاں سے۔ خدا کی پناہ! یہ بات اب تک ذہن میں کیوں نہیں آئی تھی؟"

"کیا کہہ رہے ہو، زاہد؟"

"یہ ملازم کا کوارٹر ہے... اور یہاں ہم دونوں تنہا ہیں۔ میں غلط تو نہیں کہہ رہا؟"

"نہیں... مگر..."

"ارے، بھاگئے یہاں سے۔ اگر کسی نے دیکھ لیا تو دادا جان بھی میری مغفرت نہیں کر سکیں گے۔" زاہد نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے باہر دھکیل دیا۔ قدسیہ کو بھی صورت حال کا اندازہ ہو گیا تھا۔ چنانچہ وہ چلی گئی اور زاہد گریبان کھول کر سینے پر پھونکیں مارنے لگا۔

تھوڑی دیر بعد گل خان نے ایک اور آدمی کو بھیج دیا۔ میلے کچیلے کپڑوں میں ملبوس اس نوجوان کی شیو بڑھی ہوئی تھی، آنکھوں کے گرد حلقے پڑے ہوئے تھے۔ چہرے کے نقوش دل آویز تھے لیکن ان پر عسرت کی دھول جمی ہوئی تھی۔

"ہیلو..." اس نے اندر داخل ہو کر کہا۔

"وعلیکم ہیلو! کیسے مزاج ہیں؟" زاہد نے اسے بغور دیکھتے ہوئے کہا۔

"انتہائی بیہودہ، بکواس... مزاج نام کی کسی شے سے میں واقف نہیں ہوں۔"

"کبھی تعارف بھی نہیں ہوا؟" زاہد نے پوچھا۔

"ہوا ہوگا... بھول گیا ہوں۔"

"ایکسیلنٹ... شادی کر لی؟"

"جی نہیں، ہو گئی ہے۔"

"خود بخود...!"

"ہاں، بیگم صاحبہ، فاقہ کشی، تنگدستی اور بے روزگاری جیسے ظلموں سے بگاڑی جاتی ہیں۔" نوجوان نے کہا اور زاہد، اسے دلچسپ نظروں سے دیکھنے لگا۔

"یہ تینوں نام، ایک ہی خاتون کے ہیں؟"

"ہاں، ایک سمجھ لیں یا تین سمجھ لیں۔ چوتھی شادی کی فکر میں ہوں جو کبھی نہیں ہو سکے گی۔" نوجوان نے تلخی سے مسکراتے ہوئے کہا۔

"وہ کیوں...؟"

"اس لئے کہ چوتھی محترمہ مجھ سے بے پناہ نفرت کرتی ہیں۔ لاکھ خوشامدیں کیں مگر کسی طور راضی ہی نہیں ہوئیں۔"

"موصوفہ کا نام؟" زاہد نے پوچھا۔

"ملازمت... مگر آخری بات بعد میں بتاؤں گا۔"

"کون سی آخری بات؟"

"جو بعد میں بتائی جائے گی۔" نوجوان مسکرا کر بولا۔ حالانکہ اس کی مسکراہٹ میں محرومی اور یاسیت تھی اس کے باوجود بھی یہ مسکراہٹ بڑی دلکش تھی۔

"کچھ بنایا ہے، آپ نے؟"

"جی ہاں۔ جو کچھ بنایا ہے، آپ دیکھ رہے ہیں۔"

"یعنی...؟"

"یہ حلیہ... جسے دیکھ کر لوگ خوش ہوتے ہیں۔"

"میرا مطلب ہے، کوئی تصویر..."

"صرف اپنی یہ تصویر بنائی ہے، میں نے۔ اور کچھ نہیں۔"

"کیا تنخواہ لیں گے، آپ؟"

"دو روٹیاں صبح کو دو پیالی چائے کے ساتھ اور چار روٹیاں شام کو سالن کے ساتھ۔ دو میرے لئے اور دو، میری ماں کے لئے... رات کو سونے کے لئے ایک چارپائی جو کسی بھی جگہ پڑی ہو۔ ہم دونوں ماں، بیٹا، ایک جگہ بہ آسانی سو جاتے ہیں۔ باقی سب ٹھیک ہے۔ میں اس لباس سے مطمئن ہوں جو میرے بدن پر ہے لیکن اگر آپ لوگوں کو اس سے بدبو محسوس ہو تو آپ اسے اپنے خرچ پر بدلوا دیں۔" نوجوان نے جواب دیا۔

زاہد گہری نگاہوں سے اسے دیکھ رہا تھا... پھر اس نے گہری سانس لے کر کہا۔

"اب آخری بات بھی بتا دو۔"

"وعدہ کریں کہ اس کے بعد کوئی سوال نہیں کریں گے۔"

"وعدہ..." زاہد مسکرا کر بولا۔

"میں نے پوری زندگی میں کبھی برش پکڑا بھی نہیں، مصوری تو دور کی چیز ہے۔" نوجوان نے کہا اور ہنس پڑا۔ "اچھا خدا حافظ!"

"ارے، بڑے بھائی! کہاں چلے؟ بات تو سنو۔" زاہد جلدی سے بولا۔

"جی فرمائیے۔" وہ رک گیا۔

"ہمیں اس عہدے کے لئے تم جیسے لائق انسان ہی کی ضرورت تھی۔ یہ ملازمت تمھیں دی جاتی ہے۔" زاہد نے کہا اور نوجوان کے ہونٹوں کی مسکراہٹ کافور ہوگئی اور اس کے چہرے پر حزن و ملال کے آثار نمودار ہوگئے تھے پھر وہ گہری سانس لے کر بولا۔

"انسانوں کی مایوسیوں سے کھیلنا اچھی بات نہیں ہے۔"

"لعنت ہے اس کھیل پر۔ میں، ٹیبل ٹینس، بیڈ منٹن، کرکٹ اور فٹ بال وغیرہ کھیلتا ہوں... بس، بیٹھ جاؤ... مجھے اپنا نام اور دیگر تفصیلات بتاؤ۔"

"بڑا مضحکہ خیز نام ہے۔ فدوی کو سرفراز کہتے ہیں۔" نوجوان نے کہا اور پھر ہنس پڑا۔

"ماں کہاں ہے؟" زاہد نے پوچھا۔

"عیدگاہ کے عقبی فٹ پاتھ پر۔"

"کہاں...؟" زاہد نے چونک کر پوچھا۔

"بتایا نا۔ فٹ پاتھ پر۔ میں نے اس کے سر پر اس کے دوپٹے کا سائبان بنا دیا ہے۔ بوڑھی ہوگئی ہے۔ اب اسے دوپٹے کی بھی... ضرورت نہیں ہے۔"

"بس کرو یار! چلو، ماں کو لے آئیں۔ آؤ۔" زاہد نے اس کا بازو پکڑ کر اسے اٹھاتے ہوئے کہا... پھر وہ دونوں کوٹھی کے گیٹ سے بھی باہر نکل آئے۔

نشاط، دونوں بہنوں کی بہ نسبت بہت چالاک تھی۔ باپ کی زندگی میں انہوں نے کوئی فکر نہیں کی تھی۔ شمشیر زماں شکار کے رسیا تھے۔ ایک طرح سے انہیں گھریلو معاملات میں لاپرواہ کہا جا سکتا تھا لیکن ایسی بات نہ تھی۔ ان کی گہری نگاہ ہر کھوٹے کھرے پر تھی۔ کاروباری امور اور جائداد کے مسائل یوں چٹکی بجاتے حل کرتے تھے کہ لوگ سوچتے ہی رہ جاتے تھے۔ کوئی بدنیتی کرنے کی کوشش کرتا تو شمشیر زماں کا انگوٹھا، اس کے حلق پر جا ٹکتا چنانچہ انہوں نے ایسے لوگوں کا انتخاب کر لیا تھا جو پورے طور سے اطمینان بخش تھے۔ اور اس کے بعد وہ مطمئن ہوگئے تھے۔ گھر والوں کو کسی مسئلے کا سامنا نہیں کرنا پڑتا تھا۔

لیکن ان کی موت کے بعد صورت حال بدل گئی تھی مہر النساء بیگم تند خو، بدمزاج اور تیز و طرار خاتون ضرور تھیں لیکن بس عورت ہونے کی حد تک۔ اس سے زیادہ وہ کچھ نہیں تھیں۔ یہی وجہ تھی کہ شاہدہ بیگم نے انہیں بہ آسانی شیشے میں اتار لیا تھا... اور وہ، بہن اور بہنوئی کے اشارے پر ناچ رہی تھیں۔

جائداد کی آمدنی جوں کی توں تھی۔ کوئی مالی مشکل پیش نہیں آ سکتی تھی لیکن شاہدہ بیگم نے ان کے سامنے بہت سے ہوّے کھڑے کر دیئے تھے اور مہر النساء بیگم کافی فکرمند رہنے لگی تھیں۔

نشاط کو تعلیم حاصل کرنے کا شوق تھا اور اس کی اس خواہش کی تکمیل میں کوئی مزاحمت بھی نہیں ہوئی تھی۔ باپ کی حادثاتی موت نے اس پر بہت اثر کیا تھا لیکن بہرحال اس نے خود کو سنبھال لیا تھا اور اب دلجمعی سے تعلیم حاصل کر رہی تھی۔

گھر کی طرف سے اسے کوئی الجھن نہیں تھی لیکن اس بار جب حویلی آئی تو حالات بدلے ہوئے تھے۔ توفیق صاحب کے رنگ ڈھنگ ٹھیک نظر نہیں آتے تھے۔ نشاط، گھر سے باہر کی دنیا دیکھ رہی تھی۔ آہستہ آہستہ تجربات ہو رہے تھے۔ بہت سی ایسی کہانیاں ذہن میں تھیں، جن میں توفیق صاحب جیسے لوگوں نے اچھے اچھے خاندانوں کو خون کے آنسو رلایا تھا... اور اس وقت وہ ایسا ہی کردار، اپنے گھر میں پا رہی تھی، اس لئے فکرمند ہوگئی تھی۔ اس کی گہری نگاہیں، حالات کا بغور جائزہ لے رہی تھیں اور اسے یقین آگیا تھا کہ توفیق صاحب خطرناک آدمی ہیں۔ مشکل یہ تھی کہ وہ لڑکی تھی جس کی وجہ سے چند معاملات میں مشکل پیش آ سکتی تھی۔

لے دے کے دو بہنیں تھیں جو بیوقوف تو نہیں تھیں لیکن انہوں نے بچپن سے لے کر اب تک، گھر کے کسی معاملے میں دخل نہیں دیا تھا... اس لئے اب بھی عادت نہیں تھی۔

نشاط پریشان تھی کہ کیا کرے۔ تعلیم کا معاملہ تھا اور گھر کو بھی خطرناک لوگوں کے رحم و کرم پر نہیں چھوڑا جا سکتا تھا۔ بہرحال ابھی کافی عرصے تک فرصت تھی۔ اس لئے کچھ نہ کچھ تو کیا جا سکتا تھا اور وہ اسی کچھ نہ کچھ کے بارے میں سوچ رہی تھی۔

نزہت اور صوفیہ کے علاوہ کوئی نہیں تھا جس سے پورے اعتماد سے بات کی جا سکتی۔ بہرحال، اس وقت اس نے میٹنگ طلب کر لی تھی اور دونوں بہنیں، اس کے کمرے میں پہنچ گئی تھیں۔

"خیریت نشاط! کچھ پریشان نظر آ رہی ہو؟" نزہت نے کہا۔

"آپ دونوں خواتین گھر کے معاملات سے اس قدر بے خبر رہتی ہیں کہ مجھے حیرت ہوتی ہے۔"

"کیوں؟ کوئی خاص بات ہوگئی؟"

"ہو گئی، کیا... مسلسل ہو رہی ہے اور اس کا اختتام بے حد خطرناک ہو گا۔"

"ارے، کیا ہُوا، آخر؟" صوفیہ نے پریشانی سے پُوچھا۔

"افسوس تو یہ ہے باجی! کہ آپ لوگوں نے تعلیم میں دلچسپی نہیں لی اور اس کے علاوہ خود کو اس قدر محدود رکھا کر زمانے سے کوئی واقفیت ہی نہ رہی۔ یہ مناسب نہیں ہے باجی!"

"لیکن اب تو یہ سب کچھ ہو چکا، نشاط! مگر معاملہ کیا ہے؟"

"باجی! خُدا کی قسم! مجھے ساری دُنیا میں کسی سے نفرت نہیں، کسی سے کوئی پرخاش نہیں۔ لیکن یہ بھی نہیں ہو سکتا کہ کوئی ہمارے گھر کو آگ لگا جائے اور میں خاموش تماشائی بنی رہوں۔"

"ظاہر ہے۔ یہ تو ممکن نہیں۔"

"شاہدہ خالہ اور اُن کا خاندان ہمارے لئے سخت خطرہ ہے! اس خطرے کے سدِّباب کے لئے کچھ کرنا ہو گا۔"

"ہمیں بھی اس کا احساس ہے گڑیا! اُن کی مٹھی میں ہیں اور انہیں اپنا سب سے بڑا ہمدرد سمجھتی ہیں۔ تم تو اس قدر بات کر لیتی ہو... ہمیں اس کی اجازت نہیں۔" صوفیہ نے کہا۔

"یہی ہوتا ہے۔ ایسے لوگ ہمیشہ جڑ پر ہاتھ مارتے ہیں اور پھر اسے اُکھاڑ پھینکتے ہیں لیکن میری زندگی میں یہ ناممکن ہے۔ البتہ ہمیں حویلی میں کچھ ہمدردوں کو تلاش کرنا ہو گا۔"

"کون ہو سکتے ہیں ہمارے ہمدرد؟"

"یہی تو فکر کی بات ہے۔ بہر حال یہ بھی ہو جائے گا کسی نہ کسی طور۔ ابھی تو میں یہاں موجود ہوں، اس عرصے میں کچھ کرنے کی کوشش کروں گی۔ لیکن آپ لوگوں کو بھی محتاط رہنا ہو گا۔ شاہدہ خالہ، توفیق خالو اور اُن دونوں پر نگاہ رکھنا ہو گی، ان کی ایک ایک حرکت کا جائزہ لینا ہو گا۔ میں اس سلسلے میں کوئی بہتر پروگرام بنا رہی ہوں۔ تمہیں اس سے آگاہ کر دوں گی لیکن اس دوران تم ہوشیار رہنا۔"

"ٹھیک ہے۔ ہم تمہاری ہدایات پر عمل کریں گے۔"

"میں، پھوپھا امداد علی سے ملوں گی۔ پریشانی کی بات تو یہ ہے کہ ان رشتے داروں میں بھی کوئی کام کا آدمی نہیں ہے۔ پھوپھا امداد علی سیدھے سادے انسان ہیں۔ یہ لوگ ہماری مدد نہیں کر سکتے۔"

"اللہ مالک ہے۔" صوفیہ نے کہا۔

نشاط، امداد علی صاحب کی رہائش گاہ کی طرف چل پڑی۔ غریب رشتے دار کان دبائے پڑے تھے۔ اُنہیں دو روٹیوں کا ٹھکانہ مل گیا تھا... اُنہوں نے اسے ہی کافی سمجھا تھا۔ نشاط کو دیکھ کر پھوپھی جان خوش ہو گئیں "خُدا تمہیں خوش رکھے، نشاط! ایک تم ہی ہو جو رشتے نبھاتی ہو ورنہ اور تو کوئی ہم سے ملتا بھی نہیں۔"

"آپ لوگ خود ہی دُور رہتے ہوں گے۔ ورنہ آپ کا حق بھی اس حویلی پر اتنا ہی ہے، جتنا دوسروں کا۔" نشاط نے کہا۔

"نہیں، بیٹی! ہمارا اتنا حق نہیں ہے۔ تم تجزیہ کر سکتی ہو۔" پھوپھا امداد علی بولے۔

"میں تجزیہ کر چکی ہُوں، پھوپھا جان! ابّو کے انتقال کے بعد، میں نے آپ لوگوں سے بہت سی توقعات وابستہ کر لی تھیں... لیکن وہ پوری نہیں ہُوئیں۔"

"ہماری جان حاضر ہے، بیٹی! مگر ہم کیا کر سکتے ہیں؟"

"پھوپھا! مجھے، توفیق صاحب کے بارے میں بتائیں۔"

"کیا پوچھنا چاہتی ہو؟"

"کیا یہ لوگ، اس حویلی سے مخلص ہیں؟"

"خُدا بہتر جانتا ہے، بیٹی! ویسے جو کچھ یہ سب کر رہے ہیں، وہ تو اچھا نہیں ہے۔ وہ ملازم نکال دیئے گئے ہیں۔ جنہوں نے یہیں پیدا ہو کر ساری زندگی یہیں گزار دی۔ وفاداروں کے ساتھ یہ سلوک، اچھی بات تو نہیں۔ لیکن توفیق صاحب کی اس کوشش سے انہیں ایک فائدہ ضرور ہُوا۔"

"وہ کیا...؟"

"حویلی کے سارے نوکر اُن سے خوفزدہ رہتے ہیں اور صحیح معنوں میں اُن کے وفادار ہیں۔"

"آپ لوگ اس سلسلے میں کچھ نہیں کر سکتے، پھوپھا جان؟"

"ہم لوگ... بس، اس سے زیادہ اور کچھ نہیں کہیں گے، نشاط! کہ ہماری حیثیت بھی مُلازموں جیسی ہے۔ یہاں رہ رہے ہیں اور حویلی کے وفاداروں میں سے ہیں۔"

"نہیں پھوپھا جان! آپ کی حیثیت مُلازموں جیسی نہیں ہے۔ میری خواہش ہے کہ آپ لوگ بھی حویلی کے معاملات میں دلچسپی لیں اور توفیق صاحب پر نگاہ رکھیں۔ میں، آپ سے یہ عرض کر دوں... کہ توفیق صاحب کے لئے میرے دل میں کوئی خاص بدگمانی نہیں ہے۔ بس، میں ذرا محتاط رہنا چاہتی ہُوں۔"

"خُداوند قدوس، تم بہنوں اور مہرالنساء کو ہر آفت سے محفوظ رکھے۔ میں، تمہیں اس بات کا یقین دلاتا ہُوں، نشاط! اگر کوئی کام، تم لوگ میرے سپرد کرو گی تو میں اُس کی انجام دہی میں کوئی کوتاہی نہیں کروں گا۔"

"بس، پھوپھا جان! میں یہی چاہتی ہُوں۔"

"ہم لوگ خلوصِ دل سے حاضر ہیں، بیٹی!"

پھوپھا امداد علی سے رُخصت ہو کر، نشاط باہر نکلی تو اس کی نگاہ

ایک الھڑ سی لڑکی پر پڑی جس کی شکل و صورت تو بس واجبی ہی سی تھی لیکن دیکھنے میں وہ خاصی پیاری نظر آتی تھی۔ نشاط نے اشارے سے اُسے قریب بلایا۔

لڑکی اُس کے قریب پہنچ گئی۔

"کون ہے، تو؟"

"چھیمو..." لڑکی نے جواب دیا۔

"یہاں کب آئی؟ میں نے تو تجھے پہلی بار دیکھا ہے۔"

"بس، ڈیڑھ مہینہ ہوا ہے۔ ہمارا ماما لایا ہے جی، یہیں۔ ماما کے پاس ہی رہتی ہوں۔ ماما کہتا ہے کہ حالات ٹھیک نہیں ہیں... ورنہ تجھے بھی یہیں نوکر کرا دیتا۔ ماما کوشش کر رہا ہے کہ مجھے کہیں اور نوکری مل جائے۔"

"نوکری..."

"ہاں، بی بی! گاؤں میں، میں اپنی ماں کے پاس رہتی تھی... ماں کی موت کے بعد، ماما مجھے یہاں لے آیا ہے۔ ماما نے بیگم صاحبہ سے تھوڑے دن کی اجازت لے لی تھی۔"

"کون ہے، تیرا ماما؟" نشاط نے بغور اسے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"ماما کرم دین۔"

"اوہو... تو کرم دین کی بھانجی ہے؟"

"ہاں، بی بی جی!"

"بہرحال چھیمو! تو فکر نہ کر۔ میں تجھے نوکری دلوا دوں گی۔ مگر ایک شرط ہو گی۔"

"کیا، بی بی جی؟"

"تجھے، میرے سارے کام کرنا ہوں گے۔"

"لو، بڑی خوشی سے کروں گی، ہیں تو... میں کام چور نہیں ہوں۔ کوئی کام کر کے دیکھو، میرے سپرد۔" لڑکی نے جواب دیا۔

گو اس کی عمر زیادہ نہیں تھی لیکن وہ تیز طرار نظر آتی تھی۔ شوخ اور ہنس مکھ بھی تھی۔ نشاط کافی دیر تک اس سے باتیں کرتی رہی۔ نہ جانے اُس کے ذہن میں کیا منصوبہ پرورش پا رہا تھا۔ پھر اُسی شام، اُس نے مہرالنساء بیگم سے چھیمو کے لئے بات کی۔

"ٹھیک ہے۔ مگر تم تو شہر چلی جاؤ گی۔ کیا اُسے اپنے ساتھ لے جاؤ گی؟" مہرالنساء بیگم نے لاپرواہی سے پوچھا۔

"نہیں، امّی! بورڈنگ میں کسی کو ساتھ رکھنے کی اجازت نہیں ہوتی ہے۔ اسے یہیں چھوڑ جاؤں گی۔ گھر کے کام کاج کرتی رہا کرے گی... لیکن بس میں اسے نوکر رکھنا چاہتی ہوں۔"

"تو ٹھیک ہے۔ میں منع کب کر رہی ہوں۔ جیسا پسند کرو، کرو۔"

چھیمو کا مسئلہ توفیق صاحب کے سامنے بھی آیا اور اُن کا مُنہ بن گیا۔ "یعنی... یعنی، ایک اور ملازم کا اضافہ کیا جا رہا ہے۔ اگر مزید ملازم رکھنا ہی تھے تو پھر پرانوں کو نکالنے کی کیا ضرورت تھی۔" توفیق صاحب نے دبے دبے لہجے میں کہا۔

نشاط بھڑک اُٹھی اور سخت لہجے میں بولی۔

"خالو جان! میرا خیال ہے کہ آپ صرف اپنے کام سے کام رکھا کریں۔ خاص مسائل میں آپ کا نہ بولنا بہتر ہوگا۔"

توفیق صاحب جلدی سے سنبھل گئے۔ انہیں احساس ہو گیا تھا۔ ہنستے ہوئے بولے۔

"ارے بیٹے! غصہ تو تمہاری ناک پر دھرا رہتا ہے۔ بھئی ٹھیک ہے تم چھ ملازم اور رکھ لو۔ ہمارا کیا جاتا ہے۔"

*

سرفراز کی والدہ کو فضل کے کوارٹر ہی میں رکھا گیا تھا۔ فضل تنہا تھا۔ اُس نے بخوشی اپنا کوارٹر خالی کر دیا... اور رمضان کے پاس چلا گیا تھا۔ کوٹھی والوں کو ابھی ان معاملات کی خبر نہ تھی۔

زاہد سرفراز سے بہت متاثر ہو گیا تھا۔ زمانے کا ستایا ہوا انسان تھا۔ دُکھ درد کی بہت سی کہانیوں میں سے ایک کہانی اُس کی تھی۔ باپ بچپن میں فوت ہو گیا تھا۔ کوئی پرسان حال نہ تھا۔ دونوں ماں بیٹا کسی نہ کسی طرح زندگی کی گاڑی دھکیلتے رہے۔

سرفراز نے بمشکل تعلیم حاصل کی اور پھر نوکری کی تلاش شروع کر دی۔ اپنا مکان نہیں تھا۔ دوسروں کے رحم و کرم پر گزارہ کرتے رہے... نوکری مل گئی لیکن تھوڑے ہی دنوں بعد وہ سازشوں کا شکار ہو گیا۔ فرم کے اکاؤنٹنٹ نے اپنا جرم چھپانے کے لئے، اُسے پھنسا دیا اور اُسے تین سال کی سزا ہو گئی۔

ماں بیٹے کے غم میں بیمار ہو گئی اور ایک محتاج خانے میں جا پڑی۔ تین سال بعد جب جیل سے رہائی ملی تو وہ بلیک لسٹر تھا۔ کہیں بھی نوکری نہ مل سکی۔ وہ، ماں کو محتاج خانے سے نکال لایا لیکن اُس کے لئے سر چھپانے کا ٹھکانہ مہیا نہ کر سکا۔ ماں دوبارہ محتاج خانے جانے کے لئے تیار نہ تھی۔

بدنصیبی فٹ پاتھ پر لے آئی اور ذہنی بحران بڑھتا گیا۔ مایوسیوں نے ذہن میں گھر کر لیا تھا اور حالات زیادہ سے زیادہ خراب ہوتے چلے گئے۔ اخباروں میں چھپنے والے ملازمتوں کے اشتہار اسے مذاق لگتے تھے اور مذاق ہی مذاق میں وہ یہاں آ گیا تھا۔

"یار، سرفراز! میں، تمہارے سلسلے میں، ایک نتیجے پر پہنچا ہوں۔" زاہد نے کہا۔

"کیا...؟"

"کمی تم ہی میں ہے۔ زمانے کا قصور نہیں ہے۔"

"میں اس کمی کو تلاش نہیں کر پایا ہوں، زاہد بھیا!"

"یار، زمانہ جو بنانا چاہتا ہے، بن جاؤ۔ اپنی ٹانگ کیوں گھسیڑتے ہو، زمانے کے معاملات میں؟"

"میں نہیں سمجھا۔"

"یہ بتاؤ کہ مجھ سے تعاون کرنے کو تیار ہو یا اقدار کے بانس پر چڑھے جھولتے رہو گے؟"

"تم مسیحا ہو، زاہد! تم سے اختلاف ممکن نہیں ہے۔"

"تو پھر تم مصور ہو۔"

"میں نہیں سمجھا۔"

"جس اشتہار کے جواب میں تم آئے تھے، اسی جگہ تمھیں کام... کرنا ہوگا۔" زاہد معنی خیز انداز میں بولا۔

"کیا سکھاؤں گا اس بچی کو؟"

"جو میں کہوں گا۔"

"میں تیار ہوں۔" سرفراز نے گہری سانس لے کر کہا۔

"ایسے نہیں، خلوصِ دل سے۔" زاہد نے کہا۔ "سنو، سرفراز... میں خود بھی اس کوٹھی میں ملازم ہوں، منہ چڑھا ملازم۔ میں یہاں جو کچھ کر رہا ہوں، خدا کی قسم! اس میں کوئی مالی مفاد حاصل کرنے کا جذبہ کارفرما نہیں ہے لیکن میں یہاں بہت کچھ کرنے کا خواہشمند ہوں کسی کی زندگی کو کوئی نقصان پہنچانے کی فرمائش کروں تو ہرگز نہ ماننا۔ اپنے مالی مفاد کی بات کروں تو مت ماننا... لیکن اس کے علاوہ جو کچھ کہوں... آنکھیں کھول کر دیکھنا اور آنکھیں بند کر کے عمل کرنا منظور ہے؟"

سرفراز نے آنکھیں بند کیں اور مسکرا کر بولا۔ "منظور ہے۔"

"زندہ باد..." زاہد خوش ہو گیا... پھر وہ جذباتی لہجے میں بولا...

"سرفراز! میری بھی ایک ماں ہے۔ ایسی ماں جس نے اپنی زندگی کے پچیس سال سُولی پر لٹک کر گزار دیے۔ ایسے گزارا ہے، وہ عرصہ کہ اگر تم اس کی تفصیل سن لو تو اپنا غم بھول جاؤ گے، میرے دوست! زندگی میں صرف پہلی بار میں نے یہ بات تم سے کہی ہے اور ایک خاص جذبے کے تحت کہی ہے۔ میرے اس جذبے کی لاج رکھنا۔ میں تمھاری اس بیمار ماں اور اپنی ماں کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میرے دل میں جو جذبہ پرورش پا رہا ہے اس میں کوئی مالی مفاد شامل نہیں ہے۔ میں اپنے پروگرام کی تفصیل ابھی تمھیں نہیں بتا سکتا لیکن آنے والا وقت یقیناً میرے اور تمھارے درمیان دوستی اور محبت کے نئے رشتے استوار کرے گا اور یہ رشتے ہمیں ایک دوسرے کو سمجھنے میں مدد دیں گے لیکن ایک درخواست ہے کہ تم مجھ پر اعتماد رکھنا اور کبھی میرے بارے میں کوئی غلط بات مت سوچنا۔"

سرفراز آبدیدہ ہو گیا اور رُندھے ہوئے لہجے میں بولا۔ "جو لوگ کسی کے لئے کچھ کرنے کا جذبہ رکھتے ہیں وہ غلط نہیں ہوتے۔ یہ میرا اعتماد ہے۔ زاہد! میں برائی کے راستے پر بھی نکل سکتا تھا لیکن میرے ضمیر نے یہ گوارا نہیں کیا میں مجرم بننا نہیں چاہتا تھا اور اب بھی نہیں بننا چاہتا لیکن تمھارے اوپر اعتماد کر کے میں ہر راستے پر آنکھیں بند کر کے چلوں گا۔ یہ میرا وعدہ ہے، میرا عہد ہے۔"

"تب تم یہ بھی سن لو، سرفراز! کہ ہم برائی کے راستوں پر ضرور چلیں گے لیکن بھلائی کے لئے... بس اب یہ جذباتی گفتگو ختم۔ ہم دوسرے مسائل پر بات چیت کریں گے۔"

"ختم..." سرفراز مسکرا کر بولا۔ اس کی آنکھوں میں اعتماد کی چمک تھی جیسے وہ، زاہد کو دیوتا سمجھتا ہو۔

"جس لڑکی کو تم مصوری سکھاؤ گے وہ بہت معصوم ہے مصوری کی ابجد سے بھی واقف نہیں لیکن مصوری سیکھنا چاہتی ہے۔"

"پھر...؟"

"ارے پھر کیا... تم اُسے مصوری سکھاؤ گے۔"

"بسر و چشم... لیکن کیا سکھاؤں گا؟"

"تجریدی آرٹ... کیا اس کے لئے فنِ مصوری سے واقفیت ضروری ہے؟"

"ہرگز نہیں۔"

"بس تو پھر کوئی مسئلہ ہی نہیں رہ جاتا۔ میں گھر والوں کی فطرت اور اُن کے مزاج سے تمھیں روشناس کرا دوں۔ اس طرح تم، ان لوگوں کے بارے میں بخوبی اندازہ لگا سکتے ہو۔"

پھر وہ دیر تک سرفراز کو کوٹھی کے حالات اور مکینوں کے بارے میں بتاتا رہا اور سرفراز مسکراتا رہا۔

بیمار ماں نے بیٹے کو مسکراتے دیکھا تو اس کی آنکھوں میں مسرت کی چمک دوڑ گئی۔ ماں کے چہرے کا یہ سکون، خدا کا وقار تھا اور خدا ایسے لوگوں کو نظر انداز نہیں کرتا۔

قدسیہ، زاہد کے پاس پہنچ گئی۔

"کیا رہا...؟" اس نے رازداری سے پوچھا۔

"بات بن گئی۔"

"تم کہاں چلے گئے تھے؟"

"اُستاد کو لینے۔ اُن کے ساتھ، اُن کی والدہ محترمہ بھی ہیں۔ میں انہیں بھی ساتھ لے آیا ہوں۔ یوں سمجھو قدسیہ! تمھاری تقدیر کھل گئی... آسمانِ مصوری کا وہ ستارہ، ہمارے ہاتھ لگا ہے جس کا کوئی ثانی نہیں..."

سرفراز صاحب بہت بڑے تجریدہ کار ہیں۔"

"کہاں ہیں؟" قدسیہ نے پُوچھا۔

"فضل کے کوارٹر میں۔"

"اور اُن کی والدہ؟"

"ڈیڈی جیسی ہیں مگر ہمیں دوسرے مسائل سے بھی تو نمٹنا ہے، قدسیہ! اُن کا کیا کریں گے؟"

"کون سے مسائل؟"

"ابھی تک شجاع احمد صاحب کو تمہارے اس ذہنی انقلاب کا علم نہیں ہے۔ وہ، تمہارے ذہن میں پوشیدہ فنکار سے ناواقف ہیں اور قدسیہ! تم جانتی ہو کہ یہ دُنیا ہر بڑے فنکار کی راہ میں کانٹے بچھاتی آئی ہے۔"

"میں جانتی ہُوں، زاہد!" قدسیہ رنج سے بولی۔

"تم اس دُنیا سے ٹکرانے کی قوت رکھتی ہو؟"

"ہاں، کمزور نہیں ہُوں میں... مگر یہ دُنیا کون سی ہے؟"

"شجاع احمد صاحب... مجھے یقین ہے کہ وہ، تمہارے اس شوق کی مخالفت کریں گے۔ وہ سرفراز کی یہاں موجودگی کی بھی مخالفت کریں گے۔ تم نہیں جانتیں، فنکار کا دل کتنا نازک ہوتا ہے۔"

"میں جانتی ہُوں۔"

"پھر، کیا کرو گی، اس سلسلے میں؟"

"سب کچھ۔ میں انسان ہُوں۔ میری اپنی شخصیت اور حیثیت ہے۔ کس کی مجال ہے کہ میری اس شخصیت کو مجرُوح کرے۔" قدسیہ غرا کر بولی۔

"فن کا حصول بہت مشکل ہوتا ہے... اور جب فنکار جنم لے لیتا ہے تو اس کا مذاق اُڑانے والی دُنیا، اُس کے سامنے جھک جاتی ہے۔"

"تم فکر مت کرو، زاہد! میں سب ٹھیک کر لُوں گی۔"

"کیا تنخواہ دلواؤ گی، اُستاد سرفراز کو؟"

"تم نے طے نہیں کی؟"

"تم سے پوچھے بغیر کیسے طے کر سکتا تھا؟"

"اتنی غیریت نہ برتا کرو۔"

"کم از کم دو ہزار روپے ماہوار ہونے چاہئیں۔"

"ٹھیک ہے۔ میں، ڈیڈی کو تیار کر لُوں گی۔"

"فی الحال میں نے انہیں افضل کے کوارٹر میں رکھا ہے لیکن میرے خیال میں ایک فنکار کے لئے وہ جگہ مناسب نہیں ہے۔"

"کوٹھی میں بے شمار کمرے خالی پڑے ہیں۔ اوپری منزل پر اُن کے لئے انتظام کر دوں گی۔ اوپری منزل کے بڑے ہال کو میں نے نگار خانہ بنانے کا فیصلہ کیا ہے۔"

"ایکسیلنٹ... ہر لحاظ سے بہترین جگہ ہے۔ بہرحال اب اُستاد سے ملاقات کر لو۔ اس کے بعد دوسرے معاملات طے کر لیں گے۔"

قدسیہ بڑی عقیدت سے اُستاد کے سامنے پیش ہُوئی۔ سرفراز، زاہد کی شاگردی اختیار کر چکا تھا۔ اُس کے چہرے کی گھمبیرتا قابلِ دید تھی۔

"تم نے تجریدی آرٹ ہی کا انتخاب کیوں کیا، لڑکی؟" اُستاد نے سوال کیا۔

قدسیہ گھبرائی ہُوئی نظروں سے زاہد کی طرف دیکھنے لگی۔ زاہد اس کا مطلب سمجھ کر مسکرا دیا اور پھر بڑی عقیدت سے بولا۔

"اس کی ایک خاص وجہ ہے، اُستادِ محترم!"

"ہم وہی وجہ جاننے کے خواہش مند ہیں۔"

"دراصل خوبصورت شکلیں، مناظر اور مصوری سے متعلق دوسری ایسی ہی چیزیں انسان کی اپنی نگاہ کا حسن پیش کرتی ہیں۔ کوئی حسین مسکراتا ہوا تر و تازہ چہرہ یا کسی سرسبز و شاداب خطے کی منظر کشی، دراصل اس چیز کا صحیح عکس نہیں ہوتی جس طرح تصویر کے دو رُخ تسلیم کئے گئے ہیں۔ اسی طرح ہر چہرے پر گوشت کے پیچھے ہڈیوں کے بدنما ڈھانچے اور ہر منظر کے پیچھے زمین کی اصلی شکل موجود ہے۔ اسی شکل کا نام شاید تجرید ہے۔ خوشنما چہرے نگاہ کو جاذبیت کا احساس ضرور دلاتے ہیں لیکن یہ جاذبیت حقیقت نہیں ہوتی۔ تجریدیت عکس کا دوسرا پہلو ہے اور ان میں سے کسی پہلو کا انتخاب کرنا انسان کی اپنی پسند پر منحصر ہوتا ہے۔ حسن کی مصوری ایک جھوٹا تصور تسلیم کی جاتی ہے۔ جبکہ اس کے دوسرے پہلوؤں کو بھی سامنے رکھنا چاہیئے۔ قدسیہ صاحبہ حقیقت کی عکاسی کرنا چاہتی ہیں۔ وہ اصلیت کے خوشنما یا بدنما داغوں کو نمایاں کرنا چاہتی ہیں۔" زاہد نے نہایت متانت سے جواب دیا۔

"آہ! کیا یہ ان خاتون کے خیالات ہیں؟" سرفراز نے پُوچھا۔

"جی... میں انہی کے خیالات کی نمائندگی کر رہا ہُوں۔"

"اگر یہ بات ہے تو یُوں سمجھو کہ تجرید کی دُنیا میں ایک نئے فنکار کا اضافہ ہو گیا۔"

"اُستادِ محترم! اگر آپ کی عنایتیں شاملِ حال رہیں تو اس ساری دُنیا کی تجرید ہو جائے گی۔" زاہد نے کہا تو سرفراز نے بمشکل اپنی ہنسی روکی۔

"بے شک... بے شک۔"

"آپ کو اس پُورے ماحول کی تجرید کرنی ہے۔" زاہد بولا۔

"ہم کر دیں گے، کر دیں گے۔ آپ قطعی فکر نہ کریں زاہد صاحب!" اُستادِ محترم نے کہا۔

"مجھے کیا کرنا ہو گا اُستادِ محترم؟" قدسیہ نے پوچھا۔

اب سرفراز کے گھبرانے کی باری تھی۔ اُس نے امداد طلب نظروں

سے زاہد کو دیکھا اور زاہد جلدی سے بول پڑا۔

"استادِ محترم کا خیال ہے کہ پہلے ایک نگار خانہ تعمیر کیا جائے... کسی بھی جگہ کو ہم نگار خانے کی حیثیت دے سکتے ہیں۔ اس کے بعد استادِ محترم ایک فہرست پیش کریں گے، تمہیں وہ تمام چیزیں منگوانی ہوں گی۔"

"بے شک... بے شک! میں منگوالوں گی۔" قدسیہ نے کہا۔ "اور کوئی حکم، اُستادِ محترم؟"

"نہیں، بس اتنا ہی کافی ہے۔" سرفراز نے جواب دیا۔

"تو پھر ٹھیک ہے۔ آپ فی الوقت یہاں قیام فرمایئے۔" زاہد نے کہا۔ "قدسیہ صاحبہ جلد ہی آپ کے لئے بہتر قیام گاہ کا بندوبست کر دیں گی۔"

"بسر و چشم..." سرفراز نے کہا اور پھر زاہد قدسیہ کے ساتھ باہر نکل آیا۔

"کیا خیال ہے، قدسیہ؟"

"بالکل ٹھیک ہے۔ مگر یہ اُستادِ محترم بڑے میلے کچیلے سے نظر آ رہے تھے۔"

"آہ، قدسیہ! تم نہیں جانتیں، یہ فنکار کیا ہوتا ہے۔ اپنی ذات کو بھولے ہوئے۔ اپنے فن کی دُنیا میں مگن۔ اسے لباس کی فکر نہیں ہوتی، وہ کسی دُنیاوی شے کا خواہشمند نہیں ہوتا، نہ اُسے کسی قسم کے مالی مفاد کی پرواہ ہوتی ہے۔ بس یہ ہمارا اپنا فرض ہوتا ہے کہ ہم اسے بہتر ماحول اور بہتر لباس فراہم کریں تاکہ ایک فنکار زندہ رہے۔"

"میں اُن کے لئے بہت سے لباس سلوا دوں گی۔" قدسیہ نے کہا۔

"بے شک! یہ تمہارا فرض ہے۔" زاہد نے کہا اور قدسیہ نہ جانے کیا کیا خیالات لئے ہوئے واپس آ گئی۔ بس اب اُسے شجاع احمد صاحب کو تفصیل بتانی تھی اور اس سلسلے میں اُن سے امداد طلب کرنی تھی۔

• •

نزہت نے آنکھیں پھاڑ کر رفیق کو دیکھا۔

"خیریت، رفیق بھائی؟" اس نے بوکھلائے ہوئے انداز... میں پوچھا۔

"یہ پھول... یہ پھول، تمہارے بالوں میں لگانا چاہتا ہوں۔"

"کیوں...؟"

"بس، خوبصورت لگے گا۔"

"آپ کو کیسے معلوم؟"

"میں نے چشمِ تصور سے دیکھا ہے۔" رفیق بولا۔

"آہ! کیا واقعی؟" نزہت غم زدہ لہجے میں بولی۔

"یقین کرو، نزہت! الٹے خواب دیکھتا رہتا ہوں تمہارے بارے میں۔ راتوں کی نیندیں اُڑ جاتی ہیں۔ پریشان ہو جاتا ہوں کہ کیا کروں؟"

"آنکھوں میں تکلیف ہوتی ہے؟" نزہت نے ہمدردی سے پوچھا۔

"ایں... نہیں، آنکھیں تو ٹھیک ہیں۔" رفیق چونک کر بولا۔

"آگے چل کر ہونے لگے گی۔ میں دعوے سے کہتی ہوں کہ آپ کو موتیابند ہے۔"

"کیا ہے؟"

"موتیابند... آنکھوں کی ایک بیماری ہے۔ ابھی موقع ہے... علاج کرا لیں ورنہ مرض بڑھ بھی سکتا ہے۔"

"میرا مذاق نہ اُڑاؤ، نزہت! میں سنجیدہ ہوں۔"

"میں بھی آپ کے لئے رنجیدہ ہوں، رفیق بھائی!"

"نزہت! میں..."

"آپ فکر نہ کریں۔" نزہت جلدی سے اُس کی بات کاٹ کر بولی۔ "جب تک میں زندہ ہوں، آپ کو اندھا نہیں ہونے دوں گی۔ ارے، ہاں... کوٹھی میں ٹھوکریں کھاتے پھریں گے۔ ہم سب ہی کو افسوس ہوگا۔" نزہت نے کہا اور وہاں سے آگے بڑھ گئی۔

رفیق کو اس کا تعاقب کرنے کی ہمت نہیں ہوئی تھی۔ بہرحال، وہ اپنی اس پہلی کوشش سے مایوس نہیں تھا۔ جب نزہت نگاہوں سے اوجھل ہو گئی تو ایک درخت کے پیچھے سے شفیق نکل کر رفیق کے قریب پہنچ گیا۔

"کیا خیال ہے، شفیق؟"

"زندہ باد، رفیق بھائی! تم تو ایسے فٹافٹ بول رہے تھے کہ میں حیران رہ گیا۔ سچی بات ہے، جو کچھ تم کہہ گئے میرے لئے مشکل تھا... مگر بڑی چالاک لڑکیاں ہیں۔ پڑھی لکھی جو ہیں۔ فکر مت کرو۔ ابتدا اتنی ہی کافی ہے۔ اب وہ تمہارے الفاظ پر غور کرے گی تو اس کے دل میں تمہارے لئے جگہ بننی شروع ہو جائے گی۔" شفیق نے کہا۔

"ابا کو بتا دینا، یہ بات۔ وہ مجھے بالکل گدھا سمجھتے ہیں۔"

"ہم دونوں کو ایک دوسرے کی اتنی مدد تو کرنی ہی چاہئے۔ تم بے فکر رہو۔ میں ابا کو مطمئن کر دوں گا۔"

رفیق کو موقع مل گیا تھا۔ نزہت اس وقت باغ میں پھول توڑ رہی تھی۔ رفیق نے اُسے تنہا دیکھا تو لپک کر اس کے قریب پہنچ گیا تھا۔ ہرچند کہ ابھی ناکامی ہوئی تھی لیکن وہ بددل نہیں ہوا تھا۔ البتہ رات کو صورتِ حال بگڑ گئی تھی۔

کھانے کی میز پر سب موجود تھے۔ کھاتے کھاتے نزہت بولی۔

"خالو جان! آپ، رفیق بھائی کو شہر لے جائیں اور آنکھوں کے کسی اچھے سے ڈاکٹر کو دکھائیں۔"

"ایں..." توفیق صاحب چونک پڑے۔

"جی ہاں۔ میرا خیال ہے کہ موتیا بند کی شکایت ہو گئی ہے۔" نزہت نے کہا۔

رفیق کا چہرہ اتر گیا اور اس کے ہاتھ سے چمچہ گرتے گرتے بچا... توفیق صاحب چونک کر رفیق کو دیکھنے لگے۔

"کیا ہو گیا ہے، بھئی، تمہیں؟" انہوں نے پوچھا۔

"وہ... وہ... کک... کچھ نہیں، ابا! نزہت مذاق کر رہی ہیں۔"

"جو کچھ میں کہہ رہی ہوں، خالو جان! اس پر توجہ دیں... میں دعوے سے کہتی ہوں کہ یہ موتیا بند کی علامات ہیں۔ ابھی ابتدا ہے لیکن بعد میں حالات سنجیدہ بھی ہو سکتے ہیں۔ نوجوان آدمی ہیں۔ ابھی سے آنکھوں کے مرض کا شکار ہو گئے تو آگے کیا ہو گا۔ اس لئے بہتر ہے کہ ابھی سے علاج معالجے کی طرف توجہ دی جائے۔"

"مگر تمہیں کیسے معلوم ہوا، نزہت! کہ رفیق کی آنکھیں خراب ہیں؟" مہر النساء بیگم نے پوچھا۔

"بس، امی! میں باغ میں پھول توڑ رہی تھی کہ یہ ایک پھول لے کر میرے پاس پہنچ گئے اور کہنے لگے کہ یہ پھول میرے بالوں میں لگانا چاہتے ہیں۔ میں نے وجہ پوچھی تو یہ آنکھوں کی تکلیف کا اظہار کرنے لگے۔ انہوں نے بتایا کہ یہ چشم تصور میں اکثر میرے بالوں میں پھول لگا ہوا دیکھتے ہیں اور اس کے بعد راتوں کو ان کی نیندیں اڑ جاتی ہیں۔ بہت کوشش کرتے ہیں، سونے کی مگر نیند نہیں آتی۔" نزہت نے کنکھیوں سے رفیق کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"امی! میں نے ایک کتاب میں پڑھا تھا کہ اگر راتوں کی نیند اڑ جائے اور انسان عجیب و غریب چیزیں دیکھنے لگے تو یہ موتیا بند کی علامات ہوتی ہیں۔" نزہت نے بڑی سادگی سے بتایا۔

نشاط اور صوفیہ منہ دبائے بیٹھی تھیں۔ یہ طے ہو گیا تھا کہ کوئی ہنسے گا نہیں، ورنہ سارا کھیل بگڑ جائے گا۔ البتہ مہر النساء کے چہرے پر عجیب سے تاثرات پھیل گئے تھے پھر انہوں نے گہری سنجیدگی سے پوچھا۔

"کیوں، رفیق! کیا یہ بات درست ہے؟"

"نج... خالہ جان... مم... میں... میرا مطلب ہے، نزہت مذاق کر رہی ہیں۔"

"کیوں... مجھے باغ میں اکیلا دیکھ کر آپ میرے پاس نہیں پہنچ گئے تھے؟" نزہت نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔

"پ... پہنچا تو تھا۔" رفیق نے اعتراف کیا۔

"پھول نہیں تھا آپ کے ہاتھ میں؟"

"ہاں تھا..."

"آپ یہ نہیں کہہ رہے تھے کہ آپ چشم تصور میں یہ پھول میرے بالوں میں لگا ہوا دیکھتے ہیں اور پھر راتوں کو جاگ پڑتے ہیں؟" نزہت نے بدستور تیز لہجے میں کہا۔ اور رفیق گھبرائی ہوئی نظروں سے ادھر ادھر دیکھنے لگا۔

مہر النساء بیگم کے چہرے پر گہری سنجیدگی طاری تھی... پھر انہوں نے مختصر الفاظ میں کہا۔ "آئندہ ایسی کوئی بدتمیزی نہ ہو، رفیق! سمجھ گئے ہو نا... تم؟"

رفیق کے حلق میں نوالہ اٹکنے لگا۔ اس نے سہمے ہوئے انداز میں گردن ہلا دی۔ توفیق صاحب کا چہرہ بھی اتر گیا تھا۔ اس کے بعد ناشتہ تکدر کی فضا میں ختم ہوا۔ مہر النساء بیگم کے چہرے پر سنجیدگی کے آثار تھے اور توفیق صاحب انتہائی پریشان اور فکر مند نظر آنے لگے تھے۔ کھانے کی میز سے اٹھ کر باہر جاتے ہوئے، انہوں نے مہر النساء بیگم سے کہا۔

"میں شرمندہ ہوں، مہر بہن! لیکن آپ بے فکر رہیں، ایسا درست کر دوں گا کہ آئندہ کبھی ایسی بدتمیزی کی جرأت نہیں ہو گی، اسے۔"

"توفیق بھائی! میں حویلی میں یہ سب کچھ نہیں دیکھنا چاہتی۔ اس پر توجہ دیں۔" مہر النساء بیگم سنجیدگی سے بولیں... تو توفیق صاحب ہنکارا بھر کر رہ گئے۔

وہ اپنے کمرے میں متفکر سے داخل ہوئے تھے۔ شاہدہ بیگم، رفیق اور شفیق تینوں ان کے پیچھے کمرے میں پہنچ گئے تھے۔ توفیق صاحب نے دروازہ بند کر دیا۔

"یہ برا ہوا۔" وہ گھبرائے ہوئے لہجے میں بولے۔

"لڑکیاں شیطان صفت ہیں۔ ان پر قابو پانا آسان بات نہیں ہو گی۔" شاہدہ بیگم نے متفکرانہ انداز میں کہا۔

"کیوں بے! تو نے یہ سب کچھ اتنے احمقانہ انداز میں کیوں کیا؟" توفیق صاحب، رفیق کی طرف پلٹ پڑے تو وہ گھبرا کر پیچھے ہٹ گیا۔

"ابا! قسم لے لو۔ شفیق سے پوچھ لو۔ میں نے بالکل وہی کیا جو طے ہوا تھا۔ حالانکہ وہ شروع ہی سے میرا مذاق اڑانے لگی لیکن میں نے ہمت نہیں ہاری۔ میں قسم کھاتا ہوں، ابا! شفیق سے پوچھ لو، ساری باتیں۔"

"شفیق کے بچے! پھر یہ سب کچھ کیسے ہوا؟ تو نے اس بات کو وہیں سنبھال کیوں نہیں لیا؟"

"کیا سنبھالتا، ابا! وہ کہنے لگی کہ کسی ڈاکٹر کو دکھاؤ۔ اب تم ہی بتاؤ، ابا! میری آنکھوں میں کیا خرابی ہے جو کسی ڈاکٹر کو دکھاؤں؟"

"مگر تم نے ایسی بکواس کیوں کی تھی؟"

"تو پھر کیا کرتا، ہاتھ پکڑ لیتا اُس کا؟ چپل اُتار کے اتنے مارتی کہ دماغ درست ہو جاتا۔ نہیں، ابا! میں یہ سب کچھ نہیں کر سکوں گا۔"

"ابے... ابے... ابھی سے ہمت ہار دی۔ حوصلہ پکڑ، بیٹا! حالات بگڑے ہوئے ہیں... مگر ذرا احتیاط سے۔ اور تُو نے کیا، کیا ہے، بے! اب تک؟" وہ شفیق کی طرف پلٹے۔

"ابھی تک کوئی موقع ہی نہیں مِل سکا، ابا! وہ سب اکٹھی ہوتی ہیں۔ رفیق کی تو قسمت ہی اچھی تھی کہ نزہت، اسے باغ میں مِل گئی۔"

"مگر یہ جو کچھ ہُوا، اچھا نہیں ہُوا۔ اس کا مقصد ہے کہ نزہت تجھ سے متاثر نہیں ہے۔ اب تُو یوں کر کہ ابھی کچھ دن تک نزہت کی طرف رُخ مت کیجیو اور شفیق! تُو بھی ابھی خاموش رہنا۔" توفیق صاحب نے نئی ہدایات دیں۔

اُن کے کانوں میں بیگم صاحبہ کے الفاظ گُونج رہے تھے... اور یہ الفاظ پریشان کُن تھے۔ تھوڑی دیر تک تو پریشان سے رہے پھر آہستہ آہستہ اُن کے ہونٹوں پر مُسکراہٹ پھیلتی گئی۔ جیسے وہ کسی خاص فیصلے پر پہنچ گئے ہوں۔

"حویلی میں وہ ہوگا، مہرالنساء بیگم! جو میں چاہتا ہُوں۔ وہ نہیں ہوگا، جو تم چاہتی ہو، کیا سمجھیں؟"

دوسری طرف لڑکیاں ایک کمرے میں کھُسر پھُسر کر رہی تھیں۔

"خُدا کی قسم! لُطف آگیا۔ یہ حالات تو بڑا دلچسپ رُخ اختیار کر گئے ہیں۔" صوفیہ بولی۔

"مجھے تو ایک بات پر حیرت ہے، صوفیہ! یہ رفیق تو شکل سے گاؤدی نظر آتا ہے مگر خوب بول رہا تھا، کمبخت!"

"اچھا، اب ہنسنا بند کرو... اور یہ بتاؤ، آگے کیا خیال ہے؟" نشاط نے درمیان میں دخل دیا۔

"جو حکم پیر و مرشد! ہم تو حکم کے بندے ہیں۔"

"یہ بات نہیں ہے، صوفیہ باجی! آپ یہ بتلایئے کہ کیا رفیق دوبارہ بھی یہ حرکت کرے گا؟"

"کرنی تو چاہیئے۔ جیسا کہ تمھارا خیال ہے کہ اسے ہدایات اُوپر سے ملتی ہیں۔ چنانچہ اُوپر والے، اُس کی اس ناکامی کا کوئی حل تلاش کریں گے اور دوسری کوشش ضرور ہوگی۔ لیکن امی کا لہجہ اور الفاظ مجھے بہت پسند آئے۔ یاد ہے، تمھیں کیا کہا تھا، انہوں نے؟"

"ہاں..." نزہت بولی۔

"حویلی میں یہ سب کچھ نہیں ہونا چاہیئے، بھائی صاحب! اور ان الفاظ میں خاصی جان تھی۔ امی ہر معاملے میں بہت اچھی ہیں لیکن انہیں، توفیق خالو کے ہاتھوں سے نکلنا چاہیئے۔" صوفیہ پُرخیال انداز میں بولی۔

"نکل جائیں گی، نکل جائیں گی، بچیو! فکرمند ہونے کی... ضرورت نہیں۔" نشاط بڑی بُوڑھیوں کے سے انداز میں بولی۔ "اب کل صبح یہ کھیل ایک نیا رُخ اختیار کرے گا۔"

"وہ کیا، پیر و مُرشد؟" دونوں بہنوں نے بیک وقت پُوچھا۔

"نزہت باجی! بس ہم ایسی پوزیشن تلاش کریں گے جب ہمارے پیارے رفیق بھائی، ہمارے نزدیک ہوں اور بظاہر ہمیں اُن کی موجودگی کا علم نہ ہو۔ اس وقت میں جو کچھ کروں گی، آپ اُس وقت کی پوزیشن کا اندازہ خود لگا لیں۔"

"نہیں، بھئی۔ ہمیں بتا دو پہلے۔ تاکہ میں تیار رہوں۔ اب میں، تمھاری طرح چکر باز تو ہوں نہیں۔" نزہت نے کہا۔

"چکر بازی کی بات نہیں ہے، باجی! مجھے، آپ کی یہ حرکت بالکل پسند نہیں آئی۔" نشاط مُنہ بنا کر بولی... اور نزہت کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

"کون سی حرکت؟"

"یہی، بھلا بیچارے رفیق بھائی کو اس طرح ذلیل کرنا کیا مناسب تھا؟ کیسا چہرہ اُتر گیا تھا۔" نشاط نے مُنہ بنا کر کہا اور دونوں بہنیں حیرت سے اُس کی صُورت دیکھنے لگیں۔ "نہیں سمجھیں...؟" نشاط نے آنکھیں نکال کر پوچھا۔ تب صوفیہ اور نزہت، نشاط کا مطلب سمجھ سکی تھیں۔

دوسری صبح ناشتے کی میز پر نشاط نے کسی سے بات نہیں کی اُس کا مُوڈ بگڑا ہُوا تھا۔ ناشتہ کرتے ہُوئے نزہت نے انڈوں کے حلوے کی پلیٹ اُس کی طرف بڑھائی تو اس نے بڑی تنک مزاجی سے اُسے مسترد کر دیا۔

"شکریہ! میرے بھی ہاتھ ہیں، لے سکتی ہُوں" سب کچھ نشاط نے کہا تو سب چونک کر اُسے دیکھنے لگے۔ نزہت نے گہری سانس لے کر پلیٹ رکھ دی تھی۔

"کیا بات ہے نزہت! کوئی جھگڑا ہو گیا ہے تم دونوں کے درمیان؟" مہرالنساء بیگم خاموش نہ رہ سکیں۔

"پتہ نہیں، امی! رات کے کھانے کے بعد سے ناراض ہے، مجھ سے۔ میں نے تو کچھ بھی نہیں کہا۔"

"میں کسی سے ناراض نہیں ہُوں۔ بیکار باتیں کر کے، میرا دماغ نہ خراب کیا جائے۔"

"نشاط! ناشتے کے بعد، تم میرے کمرے میں آؤ۔ میں، تم سے بات کروں گی۔" نزہت نے کہا۔

"آجاؤں گی۔" نشاط نے مُنہ بنا کر کہا۔

"مگر بات بھی تو معلوم ہو۔ جھگڑا کیا ہے؟" مہرالنساء بیگم نے

دوبارہ پوچھا۔

"کوئی جھگڑا نہیں ہے، امی! اور اگر ہے بھی تو ہم دونوں اسے آپس میں نمٹا لیں گے۔ آپ فکرمند نہ ہوں۔" نزہت نے مسکرا کر کہا۔

توفیق صاحب کا چہرہ، اس دوران میں کئی رنگ بدل چکا تھا۔ وہ، دوسرے لوگوں کے فارغ ہونے سے پہلے ہی ناشتے کی میز سے اُٹھ کر کمرے سے نکل گئے۔

توفیق صاحب اپنے کمرے میں جانے کی بجائے نزہت کے کمرے کی طرف چل دیئے۔ اس بات نے اُن کے دل میں تجسس بیدار کر دیا تھا کہ نشاط، رات سے بگڑی ہوئی ہے۔ رات کے کھانے پر جو بات ہوئی تھی، ممکن ہے، نشاط کی ناراضگی کا اُس سے کوئی تعلق ہو۔

وہ، لڑکیوں کے کمرے میں آنے سے قبل ہی کوئی ایسی جگہ تلاش کر لینا چاہتے تھے جہاں سے وہ، اُن کے درمیان ہونے والی گفتگو سُن سکیں اور یہ جگہ، نزہت کے بیڈ روم کی عقبی کھڑکی ہی ہو سکتی تھی۔ جسے انہوں نے کمرے میں داخل ہو کر تھوڑا سا کھول دیا تھا تاکہ وہ اس کے پیچھے کھڑے ہو کر، اندر ہونے والی گفتگو سُن سکیں۔

پھر وہ دوڑتے ہوئے کمرے سے نکل آئے اور اس کمرے کے عقب میں پہنچ گئے۔ انہیں خدشہ تھا کہ کہیں رفیق اور شفیق انہیں تلاش کرتے ہوئے نہ آ جائیں۔ بہرصورت وہ کھڑکی کے نیچے دُبکے، صبر اور سکون سے انتظار کرتے رہے۔

تھوڑی دیر کے بعد، کمرے میں آہٹیں محسوس ہوئیں اور وہ چوکنے ہو گئے۔

"ہاں، نشاط! اب بتاؤ، کیا بات ہے؟"

"کوئی بات نہیں ہے، باجی! بس میرا موڈ خراب ہے۔ مجھے میرے حال پر چھوڑ دیں۔"

"نشاط! ہم دونوں تمہیں کتنا چاہتے ہیں۔ کیا ہم، تمہاری ناراضگی برداشت کر سکتے ہیں۔ آخر بات تو بتا دو، کیا بات ہے؟" صوفیہ نے ملتجی لہجے میں پوچھا۔

"صوفیہ باجی! آپ لوگ شاید میری بات کو پسند نہ کریں۔"

"ارے، تو کہو تو سہی، پگلی! کیا معاملہ ہے؟" صوفیہ نے دُزدیدہ نگاہوں سے کھڑکی کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔ یقیناً، کھڑکی پہلے بند تھی۔ لیکن اب وہ کھلی ہوئی صاف نظر آ رہی تھی۔ انہوں نے مسکراہٹیں دبانے کے لئے رُخ بدل لئے تھے۔ نشاط چند ساعت خاموش رہی... اور پھر اس نے بھاری لہجے میں کہا۔

"نزہت باجی! مجھے آپ کی رات کی حرکت پسند نہیں آئی۔"

"کون سی حرکت؟" نزہت نے متحیرانہ انداز میں پوچھا۔

"رفیق بھائی اتنے بُرے انسان تو نہیں ہیں... اور پھر آپ کو یہ بھی معلوم ہے کہ وہ، ہمارے کزن ہیں۔ نزہت باجی! ہمارا ہے ہی کون، اس دُنیا میں۔ یہ لوگ ہمارے اپنے ہیں۔ رفیق بھائی اگر آپ کے بالوں میں پھول لگا دیتے تو کون سی قیامت آ جاتی۔"

"تو میں نے کیا کیا، نشاط؟"

"آپ نے جان بوجھ کر امی کے سامنے وہ بات نکالی اور رفیق بھائی کو ذلیل کیا۔ امی نے کیا سوچا ہو گا، ان کے بارے میں۔"

"جو سوچا ہو گا، ٹھیک ہی سوچا ہو گا۔ مجھے ایسی حرکتیں پسند نہیں۔" نزہت نے کہا۔

"اس کے باوجود، آپ کو امی کے دل میں فرق نہیں ڈالنا چاہیئے تھا۔"

"نشاط! تُو خود سوچ۔ اگر میں یہ بات چھپا لیتی تو وہ آئندہ بھی ایسی کوئی حرکت کرتے۔ میری جگہ تُو ہوتی تو کیا کرتی؟"

"پھول لگوا لیتی، خاموشی سے۔"

"ایں... دونوں بہنیں حیرت سے بولیں۔

"کیوں، کیا بُرائی ہے، رفیق بھائی ہیں۔ اچھی خاصی شکل و صورت کے مالک ہیں، اپنے ہیں۔ میں تو ان میں کوئی بُرائی نہیں پاتی۔" نشاط نے کہا اور آنکھ سے صوفیہ کو اشارہ کیا۔ صوفیہ دبے پاؤں کمرے سے نکل گئی

"اپنی اپنی پسند ہے، نشاط!" نزہت نے کہا۔

"بہرحال، خدا کے لئے، نزہت باجی! آئندہ آپ، اُن کے بارے میں کوئی ایسی ویسی بات نہ کیجئے گا۔"

"تو عجیب ہے، نشاط! بظاہر تو یوں لگتا ہے جیسے تو ان لوگوں کی موجودگی پسند نہ کرتی ہو لیکن اندر سے..."

"نہیں، نزہت باجی! بس میری عادت ہے کہ اپنی مخالفت برداشت نہیں کر سکتی ورنہ توفیق خالو اور شاہدہ خالہ اتنی بُری نہیں۔"

"اور اُن کے بیٹے...؟" نزہت نے پوچھا۔

"رفیق، مجھے بہت اچھے لگتے ہیں۔" نشاط نے شرماتے ہوئے لہجے میں کہا۔

توفیق صاحب کے پیٹ میں درد ہونے لگا۔ خوشی کے مارے اُن کی باچھیں کھلی پڑ رہی تھیں۔ انہیں، خواب و خیال میں بھی یہ گمان نہ تھا کہ یوں پانسہ پلٹ جائے گا۔ اُن کے خیال میں نشاط، اس حویلی کی سب سے خطرناک شخصیت تھی۔ وہ ذہین بھی تھی اور چالاک بھی۔ اگر یہ ذہین اور چالاک لڑکی اُوپر سے سخت اور اندر سے اس قدر نرم ہے تو یہ تو سب سے زیادہ کارآمد ثابت ہو سکتی ہے... درحقیقت توفیق صاحب کی لاٹری نکل آئی تھی۔

اس سے زیادہ سُننے کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ چنانچہ وہ پیٹ پکڑے پکڑے بھاگے اور راہداری میں پہنچ کر اپنے کمرے کی طرف دوڑ لگادی۔ انہوں نے صوفیہ کو نہیں دیکھا تھا جو کونے کے کمرے کے دروازے کے پیچھے چھپی ہوئی انہیں دیکھ رہی تھی۔ جب وہ دوڑ نکل گئے تو صوفیہ ہنستی ہوئی دروازے کے پیچھے سے نکلی اور پھر اس کمرے میں پہنچ گئی جس میں تھوڑی دیر پہلے نزہت اور نشاط ڈرامہ کر رہی تھیں۔ یہ ڈرامہ ابھی تک جاری تھا کہ صوفیہ نے اندر آکر ہاتھ اٹھا دیئے۔

"بس، بس... کافی ہے۔"

"کیا رہا، صوفیہ باجی؟" نشاط نے مُسکرا کر پُوچھا۔

"خالو جان تھے۔ سارا کھیل اُن کی ڈائرکشن میں ہوا ہے اور بھلا وہ حقیقت جاننے سے محروم رہیں... مگر جس بُری طرح بھاگے ہیں، خُدا کی قسم دیکھ لیتیں تو مزہ آجاتا۔ دانت نکلے پڑ رہے تھے اور پیٹ پر دونوں ہاتھ رکھے ہُوئے تھے۔ اُن کی خوشی کی انتہا نہیں ہے۔" صوفیہ نے جواب دیا... اور نشاط سینہ تان کر دونوں کو دیکھنے لگی۔

"ابھی کیا ہے، دیکھتی جاؤ۔" اس نے مُنہ ٹیڑھا کر کے مردانہ آواز بنانے کی کوشش کی اور پھر تینوں بہنیں قہقہے لگانے لگیں۔

دوسری طرف توفیق صاحب دوڑتے ہُوئے اپنے کمرے میں گھس گئے۔ جہاں شاہدہ بیگم، رفیق اور شفیق، اُن کے منتظر تھے۔ شاہدہ بیگم نے معنی خیز نگاہوں سے توفیق صاحب کو دیکھا اور بولیں۔

"کیا رہا...؟"

"رہتا کیا، پانسہ پلٹ گیا۔"

"کیسا پانسہ، ابا؟"

"تو نہیں سمجھے گا، مُرغی والے! ابے، پلٹ گیا ہے، پانسہ... تیاریاں کر لے تیاریاں۔" توفیق صاحب مسرت سے بے قابو ہُوئے جا رہے تھے۔

"پھر اسی بکواس پر اُتر آئے، تم۔ میں کہتی ہُوں کہ اس حویلی میں تم اپنی زبان سنبھال کر رکھا کرو۔ مُرغی والے، کبوتر والے... یہ کوئی الفاظ ہیں، بولنے کے۔"

"ارے، ارے، کیا کڑک مُرغی کی طرح کٹ کٹ کر رہی ہو۔ وہ کام ہُوا ہے کہ بس سُنو گی تو مُنہ پھاڑ کر رہ جاؤ گی۔"

"تم ہی پھاڑتے رہو مُنہ... خواہ مخواہ اینٹھے جا رہے ہو ماش کے آٹے کی طرح۔" شاہدہ بیگم نے کہا۔

"یار رفیق، دیکھ، تیری ماں پاگل لگتی ہے شکل سے۔"

"یہ تو آپ جانتے ہوں گے، ابا! بھلا ہم کیسے کہہ سکتے ہیں لیکن معاملہ کیا تھا، کچھ پتہ چلا؟" رفیق نے پُوچھا۔

"ابے، ایسا ویسا پتہ چلا۔ بس مزہ آگیا ہے۔ یوں سمجھ لے، سب سے بڑا موذی چت ہو گیا ہے۔"

"کیا مطلب...؟"

"نشاط..." توفیق صاحب سنسنی خیز انداز میں بولے۔

"اب جب تک آپ تفصیل نہیں بتائیں گے، ہم لوگ خاموش ہی رہیں گے۔" رفیق نے کہا۔

"بیٹا! تفصیل یہ ہے کہ تیاریاں کر لو۔ اس بار ایک پڑھی لکھی لڑکی سے واسطہ پڑے گا۔ وہ دونوں تو بس سیدھی سادی گاؤدی تھیں۔ اور پھر بات بھی صحیح ہے۔ ہر انسان کی اپنی اپنی پسند ہوتی ہے۔ جانتے ہو، نشاط نے کیا کہا؟"

"تم ہی جانتے ہو، ابا! ہم کیا جانیں؟ ہمیں، آپ نے اُدھر جانے ہی کب دیا تھا؟" رفیق بولا۔

"بیٹے! وہ، اس بات پر نزہت سے ناراض ہے کہ نزہت نے رات کو تمہاری بے عزتی کیوں کرادی تھی؟"

"نشاط اس بات پر ناراض ہے؟" رفیق نے پُرمسرت انداز میں پوچھا۔

"جی، نشاط ناراض ہے اور کہتی ہے کہ اگر وہ پھُول اُس کے بالوں میں لگایا جاتا تو وہ، اسے دل و جان سے قبُول کر لیتی۔ یقین کرو، رفیق! اگر تم تھوڑی سی ذہانت سے کام کر گئے تو پھر اس حویلی میں ہماری مخالفت کرنے والا کوئی نہ ہوگا۔ اس لڑکی کے آنے سے پہلے مجھے بڑا اطمینان تھا لیکن جب یہ آئی اور میں نے اس کے رنگ ڈھنگ دیکھے تو سچی بات یہ ہے کہ میں پریشان ہو گیا تھا۔ میں نے سوچا تھا کہ یہ کوئی مصیبت کھڑی نہ کر دے لیکن یہ مصیبت تو خود بخود ہماری جیب میں آگئی۔ بھئی واہ! مزہ آگیا۔" رفیق صاحب ہنسنے لگے۔

"اور کیا کہا تھا، ابا! اُس نے؟" رفیق نے والہانہ انداز میں پوچھا۔

"بڑی باتیں ہو رہی تھیں، دونوں بہنوں میں۔ کہنے لگی، تم نے جان بُوجھ کر، امی کے سامنے رفیق بھائی کو ذلیل کیا تھا۔ مجھے ایسی حرکتیں پسند نہیں ہیں، اور پھر بولی۔ کیا بُرائی ہے، رفیق بھائی میں۔ اچھی خاصی شکل و صُورت کے مالک ہیں۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ اپنے ہیں۔ بیٹا رفیق! بس تُو یُوں سمجھ کر ہنڈیا پکی ہُوئی تیار ہے۔ بس تیری ذہانت کی ضرورت ہے۔ اس بار اگر کوئی گدھے پن کی بات کی ——— تو مار مار کر بھُس بھر دوں گا۔"

"ارے واہ، ابا! میں نے تو پہلے بھی کوئی گدھے پن کی بات نہیں کی تھی۔ اب وہ نزہت ہی نک چڑھی نکلی تو اس میں میرا کیا قصور؟ اور سچی بات تو یہ ہے، ابا! کہ اُس کی شکل و صورت مجھے اچھی نہیں لگتی تھی۔ نشاط، اُس

سے کہیں زیادہ خوبصورت ہے۔"

"اچھا، اچھا۔۔۔ اب زیادہ ذہین بننے کی کوشش مت کر۔ بڑھاپے چلا جا رہا ہے۔ بوسے خوبصورتی اور بدصورتی کی باتیں کرے گا۔ اے! مجبوری نہ ہوتی تو حلیہ بگاڑ، بلکہ دیتا، مگر کیا کروں؟ انسان حالات کے ہاتھوں مجبور ہے۔ بہر صورت غور سے سن۔ تو اپنا کھیل دوبارہ شروع کر سکتا ہے اور رہیں مہر النساء بیگم، تو ان کی حیثیت ہی کیا ہے۔ شاہدہ تو بھی کچھ کر یا مجھے ہی سارے معاملوں میں آگے بڑھانے جا رہی ہے۔"

"تو بھلا میں کیا کروں؟" شاہدہ بیگم نے چونک کر پوچھا۔

"سن، غور سے۔ تجھے یہ کرنا ہے کہ مہر النساء کو اپنے ہاتھوں میں لے۔ ابھی کھیل کا علم کسی کو نہیں ہونا چاہئے۔ مہر النساء کو بھی نہیں۔ تو خود ہی شفیق اور رفیق کو برا بھلا کہتی رہیو، اور اس بات کا اطمینان دلا دیجیو، انہیں کہ تیری زندگی میں کوئی گڑبڑ نہیں ہو سکتی۔ ابھی دل کی بات زبان پر مت لائیو ورنہ کام بگڑ جائے گا۔"

"ٹھیک ہے۔ جیسا تم کہہ رہے ہو، ویسا ہی کروں گی۔"

"اور رفیق! تو تیاریاں کر لے، بیٹا! بہت بڑا کام ہو جائے گا بس یوں سمجھ، منو آجائے گا۔"

"اور میں کیا کروں، ابا؟" شفیق نے مرے مرے لہجے میں پوچھا۔

"اب، تو خاموش بیٹھ۔ ابھی سے کیا کروں، کیا کروں لگا رکھی ہے۔ پہلے ایک کام تو ہو جانے دے۔ اس کے بعد تیری بھی دیکھی جائے گی۔"

"ہونہہ۔۔۔ ایک کام ہو جانے دے۔۔۔" شفیق نے منہ بنا کر کہا اور غصیلے انداز میں کمرے سے نکل گیا۔

توفیق صاحب باقاعدہ سچویشن ترتیب دے کر رفیق کو ہدایات دے رہے تھے اور رفیق بڑی خوشی اور غور سے تمام تفصیلات کو ذہن نشین کر رہا تھا۔

*

شجاع احمد صاحب گھر میں داخل ہوئے تو ان کا موڈ خاصا بگڑا ہوا تھا۔ باہر کی مصروفیات کافی رہی تھیں۔ دوپہر کو کھانے پر بھی نہیں آ سکے تھے اور رات کو بھی اس وقت پہنچے جب ڈنر کا وقت ہو رہا تھا۔ سیدھے اپنے کمرے میں گئے، غسل وغیرہ سے فارغ ہوئے اور باہر نکلے تو ملازم موجود تھا۔

"حضور! بیگم صاحبہ نے پوچھا ہے کہ کھانا۔۔۔"

"ہاں، آ رہا ہوں۔ جاؤ، کھانا لگواؤ۔" شجاع احمد صاحب نے جواب دیا اور بال وغیرہ درست کر کے، بدن پر کولون چھڑکا اور ڈائننگ ٹیبل پر پہنچ گئے، جہاں سب ان کا انتظار کر رہے تھے۔ حسب معمول زاہد بھی موجود تھا جسے دیکھ کر شجاع احمد صاحب کا موڈ خود بخود خراب ہو جاتا تھا اور اس وقت تو ان کا موڈ خاصا بگڑا ہوا تھا۔ پلیٹ سیدھی کر کے انہوں نے کھانا نکالا اور خاموشی سے کھانے میں مصروف ہو گئے۔

"بڑے مصروف رہے، شجاع بیٹے!" حسام احمد نے خود ہی [illegible] چھوڑ دیا۔

"جی ہاں، ظاہر ہے میرے علاوہ یہاں مصروف رہنے والا اور کون ہے؟" شجاع احمد نے جلے کٹے لہجے میں کہا۔

"بھئی، جب تمہاری عمر میں تھے تو ہم بھی ایسے ہی مصروف رہا کرتے تھے۔ یہ مصروفیت تو مردوں کی زندگی ہوا کرتی ہے۔"

"ٹھیک ہے لیکن اس زندگی میں خواہ مخواہ کانٹے بونا تو اچھی بات نہیں ہے۔" شجاع احمد صاحب نے کہا۔

"کیا ہو گیا، بیٹے! کیا بات ہوئی؟ کچھ اکھڑے اکھڑے سے ہو۔"

"جی ہاں، ایک نیا اشتہار دیکھا تھا، آج اخبار میں۔ اس کے بارے میں کچھ معلومات حاصل نہیں ہو سکیں۔"

"نیا اشتہار۔۔۔؟"

"جی نیا اشتہار۔۔۔ جس پر ہماری ہی کوٹھی کا پتہ درج تھا اور کسی صاحبزادی کو مصوری سکھانے کے لئے ایک استاد کی ضرورت تھی۔ میرا خیال ہے، آج تو کوٹھی استادوں سے بھری رہی ہو گی۔" شجاع احمد صاحب بدستور طنزیہ انداز میں بولے۔

"صاحبزادی کو مصوری سکھانے کے لئے استاد کی ضرورت ہے۔ کیوں بھئی، کس نے دیا تھا، اشتہار؟ اور میری نظر سے کیوں نہیں گزرا؟" حسام احمد صاحب نے پوچھا۔

"دادا جان! میں نے دلوایا تھا، اشتہار۔" قدسیہ پُراعتماد لہجے میں بولی۔ اور سب چونک کر اُسے دیکھنے لگے۔

"تم نے۔۔۔؟" شجاع احمد صاحب نے بھنویں اٹھا کر اُسے دیکھا۔

"جی، میں نے۔۔۔"

"کیوں۔۔۔؟"

"میں، مصوری سیکھنا چاہتی ہوں۔ میرا اپنا شوق ہے۔ میرے اندر صلاحیتیں ہیں، میں کچھ کرنا چاہتی ہوں۔ کسی کو اعتراض ہے؟" قدسیہ نے سخت لہجے میں کہا۔

"یہ خبط، تمہارے ذہن میں کیسے سمایا کہ تم، مصورہ بن سکتی ہو؟" شجاع احمد صاحب نے پوچھا۔

"آپ نے اپنے بارے میں کیسے سوچا تھا، ڈیڈی! کہ آپ ایک اچھے بزنس مین بن سکتے ہیں؟" قدسیہ ترکی بہ ترکی بولی۔

"دیکھ رہے ہیں، آپ، اباجان! یہ ہیں میرے بچے، جو مجھ سے اس طرح گفتگو کرتے ہیں۔"

"بھئی، یہ کوئی ایسی بات نہیں ہے۔ ٹھنڈے دل سے بات کرو۔ خواہ مخواہ تیزی کی کیا ضرورت ہے... قدسیہ بیٹے! واقعی تم نے کسی کو نہیں بتایا کہ تم میں مصورہ بننے کے جراثیم موجود ہیں اور اشتہار بھی دلوا دیا۔" دادا جان نے نرم لہجے میں پوچھا۔

"جی، دادا جان! اس کے باوجود، آپ لوگ کہتے ہیں کہ بچوں میں خود اعتمادی ہونی چاہیئے۔ کیا ہماری یہ خود اعتمادی، ہمارے بزرگوں کو پسند آتی ہے؟" قدسیہ نے تیکھے لہجے میں سوال کیا۔

"خود اعتمادی اور خود سری میں بہت فرق ہوتا ہے۔ اگر تمہیں مصورہ بننے کا شوق تھا بھی تو تمہیں یہ بات ہم سے کہنا چاہیئے تھی۔ اپنے طور پر سب کچھ کر لینا، کیا اچھی بات ہے۔" شجاع احمد صاحب نے کہا اور قدسیہ پلیٹ رکھ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

"میں نے جو کچھ کیا، اس میں کوئی ایسی برائی نہیں ہے جس سے ہمارے خاندان کی عزت پر حرف آجائے۔ ہم سے یہی کہا جاتا ہے، نا کہ ہم خاندان کی عزت کو سنبھال کر رکھیں تو میں نے ایسی تو کوئی بات نہیں کی جس سے خاندان کی عزت پر بٹہ آگیا ہو اور جس پر مجھے اس انداز میں سرزنش کی جائے۔"

"ارے ارے بیٹھو، بیٹی! کھڑی کیوں ہو گئی ہو؟"

"نہیں، دادا جان! ہم لوگوں کو اس کوٹھی میں اپنی حیثیت کا تعین کر لینا چاہیئے۔ ہم خواہ مخواہ ان غلط فہمیوں کا شکار رہتے ہیں کہ ہماری اپنی کوئی حیثیت ہے یہاں پر... بس ہم ہیں یہاں اور کہیں نہیں جب سکتے۔ ہم پر پابندیاں عائد ہیں کہ ہم خاندان کی عزت و ناموس کا خیال رکھیں اور بھیڑ بکریوں کی طرح زندگی گزار دیں۔ یہ ہے ہماری زندگی... اور اگر اس انداز میں ہم اپنی زندگی نہ گزار پائیں تو بس ایک ہی کام کر سکتے ہیں اور وہ ہے، خودکشی۔ مجھے اپنی حیثیت معلوم ہو گئی ہے۔ دادا جان! ٹھیک ہے، میں مصوری نہیں سیکھوں گی۔ میں کچھ بھی نہیں کروں گی۔" قدسیہ روتی ہوئی کمرے سے نکل گئی اور کھانے کی میز پر ایک سوگوار سی فضا چھا گئی۔ شجاع احمد صاحب کسی گہری سوچ میں ڈوب گئے تھے۔

سب کچھ تھا مگر وہ، بچوں کو بہت زیادہ چاہتے تھے اور قدسیہ تو خاص طور پر ان کے لاڈ پیار کا مرکز تھی۔ بس دن بھر موڈ خراب رہا تھا اس لئے لہجہ تلخ ہو گیا تھا۔ ورنہ وہ، بچوں کے معاملے میں اس قدر تلخ نہ تھے۔ چنانچہ خود ہی پگھل گئے۔

"ارے، بلاؤ، اس پگلی کو۔ خواہ مخواہ بگڑ گئی ... تھا اس لئے لہجہ تیز ہو گیا۔"

"بیٹے! اگر ہتھیار ڈال دیئے ہیں تو خود ہی اٹھ جاؤ۔ تمہاری اولاد ہے۔ تمہارے علاوہ کسی کے ساتھ نہیں آئے گی۔ جاؤ، جاؤ۔ ہم سب انتظار کر رہے ہیں۔ تھوڑی دیر کے لئے ٹائم آؤٹ۔" حسام احمد صاحب نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔ سب نے ہاتھ روک لئے اور شجاع احمد صاحب مسکراتے ہوئے قدسیہ کے کمرے کی طرف چل دیئے۔

بہرطور، نہ جانے کیا کیا کہہ سن کر اور بہلا پھسلا کر وہ، اسے کھانے کی میز پر لے آئے۔ قدسیہ دوبارہ کھانے بیٹھ گئی۔ شجاع احمد صاحب کا موڈ خود بخود ٹھیک ہو گیا تھا اور وہ قدسیہ کو دیکھ دیکھ کر مسکرا رہے تھے۔ کھانا، کھانے کے بعد انہوں نے گہری سانس لے کر کہا۔

"جی، تو محترمہ مصورہ صاحبہ! اب ذرا یہ فرمایئے کہ آپ کو کوئی استاد ملا یا نہیں؟ اشتہار کے جواب میں کتنے افراد نے یہاں حملہ کیا؟"

"میں نے ایک بہت ہی عظیم مصور کو رکھ لیا ہے، ڈیڈی... دو ہزار روپے ماہوار تنخواہ دوں گی اُسے۔ اوپر کی منزل پر ایک رہائشی کمرہ بھی ہو گا۔ جہاں وہ اپنی ماں کے ساتھ رہے گا۔"

"اللہ اکبر... اللہ اکبر... تو یہ سارے انتظامات آپ فرما چکی ہیں۔" شجاع احمد صاحب نے کہا۔

"جی ہاں..."

"اور دو ہزار روپے تنخواہ ہو گی، ان محترم کی؟"

"جی، زیادہ ہے کیا؟"

"نہیں نہیں، بھائی... اتنے بڑے رئیس اعظم کی بیٹی کے لئے دو ہزار روپے کیا حیثیت رکھتے ہیں۔ دیں گے، بھائی! دیں گے۔ ذرا ہمیں بھی تو ملاؤ، ان مصور صاحب سے۔ ذرا دیکھیں تو سہی کہ ان کی پہنچ کہاں تک ہے؟"

"ملادوں گی۔ مگر ابھی نہیں۔"

"ہیں کہاں وہ؟"

"بس ہیں کہیں۔ کل یہاں اپنی رہائش گاہ میں منتقل ہو جائیں گے۔" قدسیہ مسکراتے ہوئے بولی۔

"ٹھیک ہے۔" شجاع احمد صاحب گہری سانس لے کر اٹھ گئے۔ وہ اس بات سے خوش نہ تھے۔ بھلا بیٹی کو مصورہ بننے کی کیا ضرورت تھی۔ خواہ مخواہ کا ایک شوق جس میں اخراجات بھی اچھے خاصے ہوں گے اور کوئی مصرف بھی نہیں تھا اس کا۔

وہ کنجوس تو نہ تھے لیکن فضول خرچ بھی اور پیسے کو احتیاط سے سنبھالنا جانتے تھے۔ اگر ایسا نہ کرتے تو لاکھوں کروڑوں کیسے بنا لیتے لیکن ان دنوں حالات، ان کے خلاف ہو گئے تھے اور اس کی وجہ پر انہوں نے غور کیا تھا۔

زاہد اب کوئی معمولی چیز نہ رہا تھا۔ حالانکہ وہ گھر کے سربراہ تھے... حسام احمد صاحب کے علاوہ کسی کی مجال نہیں تھی کہ ان کی بات کو کاٹے،

لیکن زاہد... وہ محسوس کر رہے تھے کہ زاہد مذاق ہی مذاق میں ایک خطرناک حیثیت اختیار کرتا جا رہا ہے اور گھر کے لوگ، زیادہ تر اُس کی خواہشات پر چل رہے تھے۔ کیا عجب کہ یہ مصوری کا چکر بھی اُسی نے چلایا ہو... ورنہ اس سے قبل تو قدسیہ کو مصوری کا شوق کبھی نہیں چرّایا تھا... زاہد... انہوں نے سوچا کیا یہ لڑکا کسی خاص مقصد کے تحت یہاں آیا ہے یا صرف کھلنڈری طبیعت کا مالک نوجوان ہے۔ معلوم کرنا پڑے گا!

• •

"جی، نشاط بی بی؟" چھیمو نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"خوش ہے تُو یہاں؟"

"اتنی بڑی حویلی میں، اتنے اچھے اچھے لوگوں کے درمیان خوش نہیں رہوں گی بی بی؟"

"کچھ کام بھی کرے گی، میرا یا بس یونہی؟"

"آپ کے لئے تو جان بھی حاضر ہے، بی بی۔ بولیں، کیا کام ہے، مجھ سے؟"

"ایک بہت ضروری کام کرنا پڑے گا، تجھے، میرا... سوچ لے، کر بھی سکے گی یا چوراہے پر بھانڈا پھوڑ دے گی؟"

"گردن کاٹ کر پھینک دینا، بی بی! جو کوئی بات کبھی مُنہ سے نکل جائے۔ چھیمو بڑی وفادار ہے۔"

"کوئی بھی، کیسا ہی بُرا کام کیوں نہ ہو؟" نشاط نے سوال کیا۔

"آپ کہیں گی تو اندھے کنویں میں چھلانگ لگا دیں گے۔"

"محبت کی ہے تُو نے، کبھی؟" نشاط نے پوچھا تو چھیمو شرما گئی اور پھر آنکھیں بند کر کے مسکراتی ہوئی بولی۔

"ہاں، کی ہے۔"

"کس سے؟"

"عبداللہ ہے، اس کا نام۔ گاؤں میں رہتا ہے۔ بھینسیں ہیں، اس کے پاس۔ دودھ بیچتا ہے... پر بی بی! بڑی محبت کرتا ہے، مجھ سے۔ ماں زندہ تھی تو دوسری بات تھی۔ وہ کہتی تھی کہ اگر عبداللہ، تیرا ہاتھ پکڑنا چاہے تو مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے مگر ہمارے پاس تو اتنا بھی نہیں ہے کہ چار جوڑے کپڑے دے سکیں۔ ماں نے ماما کرم دین کو لکھا تھا۔ پر ماما نے کوئی جواب نہ دیا۔ پھر ماں مر گئی۔"

"اوہ... عبداللہ نے کسی اور سے شادی کر لی؟" نشاط نے پوچھا۔

"نہیں، بی بی! وہ تو کہتا ہے کہ اگر شادی کی تو مجھ ہی سے کرے گا ورنہ کبھی نہیں کرے گا۔"

"اُسے، تیرا یہ پتہ معلوم ہے؟"

"ہاں۔ گاؤں سے ہم اکیلے نکلے تھے مگر راستے میں عبداللہ آگیا تھا وہی ہمیں یہاں تک چھوڑ کر گیا تھا۔"

"اُس کے بعد وہ کبھی تجھ سے ملنے آیا؟"

"نہیں، ابھی نہیں۔ اگلے ماہ کی بیس تاریخ کو آئے گا۔"

"جب وہ آئے تو اُسے مجھ سے ضرور ملانا... اور ایک وعدہ میرا بھی ہے تجھ سے۔ عبداللہ سے تیری شادی کراؤں گی۔ اب تو میں، تیری سہیلی ہوں۔ تجھے مجھ پر اعتبار کرنا چاہیئے۔"

"زندگی بھر پاؤں دھو دھو کر پیوں گی، بی بی! ہم دونوں تمہارا احسان کبھی نہیں بھولیں گے۔" چھیمو نے بے پناہ مسرت سے کہا۔

"لیکن تجھے میرا کام بھی بڑی ہوشیاری سے کرنا پڑے گا چھیمو... میں تجھے اس کی تفصیل بتاتی ہوں... پھر تو مجھے بتا کہ وہ سب کچھ کر بھی سکے گی یا نہیں؟"

"بتاؤ، بی بی!" چھیمو نے کہا۔

پھر نشاط دبی دبی آواز میں اپنا مقصد بتانے لگی... چھیمو کے ہونٹوں پر دبی دبی مُسکراہٹ پھیل رہی تھی۔ پوری بات سُننے کے بعد اُس نے کہا۔

"میں تو یہ سب کچھ آسانی سے کر لوں گی، بی بی! پر کوئی بات بگڑی تو آپ ہی کو بنانی پڑے گی۔"

"تُو اس کی بالکل فکر مت کر۔ باقی معاملے میں دیکھ لوں گی۔"

"ماما بیچارے کو بھی کہیں حویلی سے نہ نکال دیا جائے۔ اُس کی عزّت خراب نہ ہو جائے۔"

"میں نے کہا نا، چھیمو! بس تُو میرے کہنے پر عمل کرتی رہ۔ باقی کام میرے اوپر چھوڑ دے۔" نشاط ہنستی ہوئی بولی۔ "لیکن یہ سب کچھ تُو آسانی سے کر بھی لے گی؟"

"ارے ہاں، بی بی! ساری جوان لڑکیوں کو یہ سب کچھ آتا ہے۔ اور پھر یہ تو مذاق ہوگا۔ میں کر لوں گی۔"

"زندہ باد چھیمو! بس پھر تماشہ آج ہی سے شروع ہو جانا... چاہیئے۔" نشاط نے پُرمسرت لہجے میں کہا۔

"ہو جائے گا، بی بی! آج ہی سے شروع ہو جائے گا۔" چھیمو نے جواب دیا اور دونوں ہنسنے لگیں۔

نشاط کا یہ کام بھی بن گیا تھا۔ رات کی باتوں پر مہرالنساء بیگم کے ردِ عمل کا پتہ نہیں چل سکا تھا۔ چھیمو سے فارغ ہو کر وہ، مہرالنساء بیگم کے کمرے میں پہنچ گئی۔

مہرالنساء بیگم اپنے کمرے میں تنہا نہیں تھیں۔ شاہدہ بیگم، اُن کے پاس موجود تھیں۔ نشاط نے بڑی اپنائیت سے شاہدہ بیگم کو سلام کیا اور وہ جواب دے کر مسکرانے لگیں۔

"اس بچی کو دیکھ کر تو آنکھوں میں سرور اُتر آتا ہے، مہرا میں تو اس وقت کو سوچتی ہوں جب یہ سچ مچ بنی بیٹھی ہوگی۔"

"خالو جان تو ابھی سے میری مخالفت کرنے لگے ہیں، خالہ جان!" نشاط نے شکایتی انداز میں کہا۔

"اونہہ... خالو جان کیا حیثیت رکھتے ہیں؟ وہ کیا جانیں علم کیا ہے۔ وہی ہوگا جو میری بیٹی چاہے گی۔"

"نہیں، خالہ جان! وہ، ہمارے بزرگ ہیں۔ بہت بڑی حیثیت ہے اُن کی۔ بس میں پڑھنا چاہتی ہوں۔"

"ضرور پڑھو، بیٹی! اب کوئی تمہیں نہیں روکے گا۔" شاہدہ خالہ نے کہا۔

مہرالنساء بیگم، اس دوران میں خاموش رہی تھیں۔

"اچھا اب تم دونوں ماں، بیٹی باتیں کرو۔ میں چلی۔" شاہدہ بیگم اُٹھ گئیں۔ کسی نے انہیں نہیں روکا تھا۔

"کیا بات ہے، امی! خاموش خاموش ہیں؟"

"بس یونہی... پریشان ہوں۔"

"کس بات سے؟" نشاط نے پوچھا۔

مہرالنساء بیگم گہری سانس لے کر اُٹھ بیٹھیں... پھر پُرخیال انداز میں بولیں۔

"ہمیں کچھ کرنا چاہیئے، نشاط! کچھ کرنا ضروری ہے۔"

"مثلاً..." نشاط نے بغور مہرالنساء بیگم کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"بس، رات سے دل پریشان ہے۔"

"اس پریشانی کی کوئی وجہ تو ضرور ہوگی، امی جان؟"

"ہاں، بس اس خیال سے پریشان ہوں کہ ہمارا کوئی مضبوط سہارا نہیں ہے۔ کوئی بیٹا ہی ہوتا تو یہ مشکل نہ ہوتی۔"

"ہم، آپ کے تین تین بیٹے ہیں تو امی! آپ پریشان کیوں ہیں... پریشانی کی وجہ تو بتائیں؟" نشاط نے کہا اور مہرالنساء بیگم اُداس نگاہوں سے بیٹی کو دیکھنے لگیں۔

"ایک منٹ، امی! میں ابھی آئی۔" نشاط بولی اور تیزی سے اُٹھ کر دروازے کی طرف لپکی۔ راہداری میں کوئی نہیں تھا۔ اس کمرے کی کوئی ایسی کھڑکی بھی نہ تھی جس کے دوسری جانب کسی کے موجود ہونے کے امکانات ہوں۔ تب وہ دروازہ بند کرکے اطمینان سے ماں کے پاس آ بیٹھی۔

"جی، اب بتائیے۔"

"رات کو تم نے نزہت کی بات سُنی تھی۔ یہ اچھی بات نہیں تھی میرے دل کو لگ گئی ہے۔"

"کون سی بات، امی؟"

"ارے وہی۔ رفیق نے جو بدتمیزی نزہت کے ساتھ کی تھی۔"

"میرا خیال ہے، اس میں بدتمیزی کی تو کوئی بات نہیں۔ رفیق ہمارے خالہ زاد بھائی ہیں۔ اگر انہوں نے باجی کے بالوں میں پھول لگانے کی کوشش کی تو اس میں کوئی بُری بات بھی نہیں ہے۔"

"ہے تو نہیں۔ مگر یہ لڑکے، اچھے ماحول کے پروردہ نہیں ہیں۔ یوں بھی فطرتاً جاہل ہیں۔ خود توفیق بھائی نے بھی زندگی میں کچھ نہیں کیا یونہی وقت گزاری کی ہے۔ یہاں میں اپنے آپ کو تنہا محسوس کرتی تھی۔ ان لوگوں نے یہاں آکر حالات کو سنبھال لیا۔ اور سچی بات ہے کہ ابھی تک تو خلوص سے سارے کام کئے ہیں۔ اُن کا کوئی لالچ یا فریب میرے سامنے نہیں آیا۔ اس لئے میں نے بھی سوچا۔ چلو، بُرا ہی سہی جو کم از کم سر پر ہاتھ تو رکھے، بیٹے! ہمارے پاس اللہ کا دیا سب کچھ ہے لیکن تمہارے ابّو کے انتقال سے جو خلا پیدا ہوگیا ہے، اُسے کوئی نہیں پُر کرسکتا۔ ہمارے لئے اتنا مخلص اور کوئی نہیں ہوگا، جتنے وہ تھے۔ ماشاءاللہ! مجھے تم تینوں کے گھر آباد کرنے ہیں اور اس کے بعد، خُدا نے مجھے جتنی زندگی دی ہے، وہ بھی عزت سے گزارنی ہے۔ ان سب باتوں کے لئے کوئی بہتر سہارا ضروری ہے۔ میرے ذہن میں بار، بار ایک بات آرہی ہے۔ کیوں نہ صوفیہ... اور نزہت کی شادی کردوں، ایسے اچھے لوگوں میں جو ہمیں اس حیثیت سے بھی سہارا دے سکیں۔ اس طرح خاندان میں کچھ نئے لوگ بھی شامل ہوں گے۔ ممکن ہے اُن میں کوئی اتنا ہی اچھا نکل آئے کہ ہمارے مسائل کو بھی سمیٹ لے۔ یوں ہمیں اپنے ہمدرد مل جائیں گے اور دوسروں کی طرف نہیں دیکھنا پڑے گا۔"

"خیال تو بُرا نہیں ہے، امی! لیکن ایسے لوگوں کی تلاش...؟" نشاط نے پوچھا۔

"میں نے کہا نا۔ یہی سارے معاملات دل کو پریشان کرتے ہیں۔" مہرالنساء بیگم نے سنجیدگی سے کہا۔

"ایک بات کہوں، امی! بُرا تو نہیں مانیں گی؟"

"ہاں، ہاں، کہو۔"

"آپ نے دوسرے لوگوں کو قطعاً نظرانداز کررکھا ہے۔ میرا... مطلب ہے، ابّو جان کے رشتے دار، وہ یہاں ملازموں کی حیثیت سے بسر کررہے ہیں۔ ٹھیک ہے، میں انہیں بھی بہتر نہیں سمجھتی جو لوگ اپنی انا کو قتل کرکے کسی دولت مند رشتے دار کے دروازے پر جا پڑیں وہ لوگ بہت اچھے تو نہیں ہوتے لیکن بہرصورت اگر آپ، اُن کی پرورش کررہی ہیں تو اُن سے کچھ فائدہ بھی اُٹھائیں۔"

"مثلاً..." مہرالنساء بیگم نے پوچھا۔

"مثلاً امداد علی پھوپھا ہیں، اور دوسرے بہت سے لوگ ہیں... ان

سب سے اتنی دُور مت رہیے کہ کوئی آپ کے قریب آکر آپ پر اپنے پنجے گاڑنے کی کوشش کرے۔ سب کے قریب رہیے تاکہ کسی ایک کا جادو آپ پر نہ چل سکے۔"

"میں نے ان لوگوں کو دُور رکھنے کی کوشش نہیں کی ہے، بیٹی!"

"نہیں، امّی! میں نہیں مانتی۔" نشاط نے گردن ہلا کر کہا۔

"کیوں...؟"

"بس، میں نے یہی محسوس کیا ہے کہ آپ، اُن پر توجہ نہیں دیتیں ناہم چھوڑیں، ان باتوں کو۔ جو کچھ نہیں ہوا ہے، آئندہ، اس پر غور کرلیں گے۔ اس وقت، آپ کو کیا پریشانی ہے؟"

"کوئی خاص پریشانی نہیں۔ بس، میں یہی سوچ رہی تھی کہ یہ رفیق اور شفیق کچھ آگے بڑھنے کی کوشش نہ کریں۔"

"دیکھا جائے گا، امّی! ویسے بھی شاہدہ بیگم، ہماری خالہ ہیں۔ ہمیں اُن کے بارے میں خیالات خراب نہیں کرنے چاہئیں۔"

"نہیں، نہیں... خیالات کون خراب کر رہا ہے... توفیق بھائی اتنے بُرے انسان نہیں ہیں۔ میں اچھی طرح جانتی ہوں۔ بس، بچوں کی طرف سے خدشہ تھا لیکن شاہدہ باجی بڑی معذرت کر رہی تھیں۔ کہہ رہی تھیں کہ رفیق کا کوئی بُرا مقصد ہرگز نہ ہوگا۔ معصوم سا لڑکا ہے۔ بس، بہن کے بالوں میں پھول لگانے کی خواہش ہوئی اور پھول لے کر پہنچ گیا... میں بھی مانتی ہوں کہ وہ اتنا بُرا لڑکا نہیں ہے، بس بیوقوف ہے۔"

"بس، تو پھر ٹھیک ہے، امّی! جب کوئی بات سامنے آئے گی تو دیکھا جائے گا۔ اب ہم کوئی ایسے موم کے بھی بنے ہوئے نہیں ہیں۔"

"تمہاری بات دوسری ہے، بیٹے! تم شہر میں رہتی ہو۔ دُنیا دیکھ رہی ہو لیکن یہ دونوں لڑکیاں بے وقوف ہیں۔"

"ایسی بے وقوف بھی نہیں ہیں۔ آپ، ان کی فکر نہ کریں۔" نشاط نے مسکراتے ہوئے کہا... مہرالنساء بیگم کو بیٹی کی باتوں سے بڑی ڈھارس ہوئی۔ وہ گردن ہلاتے ہوئے بولیں۔

"ٹھیک ہے، بھئی! لیکن تم تو چلی جاؤ گی۔ تمہاری طرح وہ لڑکیاں مجھے سہارا نہیں دیتیں۔"

"میں ابھی کہاں جا رہی ہوں، امّی! دو، تین مہینے رہوں گی آپ کے ساتھ۔ آپ بالکل فکر نہ کریں۔ یہاں سے جاؤں گی تو سب کچھ ٹھیک ٹھاک کرکے جاؤں گی۔" نشاط نے کہا تو مہرالنساء بیگم کے چہرے سے تردد کے آثار مٹ گئے۔

مہرالنساء بیگم کے پاس سے واپسی پر نشاط کافی مسرور تھی۔ اُس نے محسوس کیا تھا کہ توفیق صاحب کا طلسم ٹوٹ رہا ہے۔ آج سے چند روز قبل جو کیفیت تھی، وہ اب نہیں تھی۔ اُن کے ذہن میں، اُن لوگوں کی طرف سے ایک پریشانی پیدا ہوگئی تھی اور یہ بڑی خوش آئند بات تھی۔

شام بادلوں بھری تھی۔ فضاؤں میں نمی سی رچی ہوئی تھی۔ نشاط جان بُوجھ کر عقبی باغیچے میں تنہا جا بیٹھی۔ یہ ایک تجربہ تھا جس سے توفیق صاحب کے خیالات کا ثبوت مل سکتا تھا۔

اور تجربہ غلط نہیں ہوا۔ رفیق شاید دن بھر اُس کی نگرانی کرتا رہا تھا۔ چنانچہ فوراً نازل ہوگیا۔ لیکن اس لڑکی سے سب بد کے ہوئے تھے۔ اس لئے رفیق بھی محتاط نظر آرہا تھا۔

"ہیلو..." وہ کانپتی ہوئی آواز میں بولا۔

نشاط چونک کر پلٹی... پھر اُس کے ہونٹوں پر دل آویز مسکراہٹ پھیل گئی۔

"اوہ، ہیلو، رفیق بھائی! کیسے مزاج ہیں آپ کے؟"

"ٹھ... ٹھیک ہوں... بالکل ٹھیک ہوں۔"

"کچھ گھبرائے ہوئے سے ہیں۔ خیریت تو ہے؟"

"اللہ کا شکر ہے۔"

"آئیے، بیٹھئے... موسم کتنا خوبصورت ہے۔"

"ایں، ہاں... واقعی..." رفیق آسمان کی طرف دیکھ کر بولا۔

"آپ بہت دُور، دُور رہتے ہیں، رفیق بھائی! کیا مصروفیتیں ہیں آپ کی؟"

"کچھ نہیں۔ بس، ڈر لگتا ہے۔"

"ایسی ڈراؤنی شکل ہے میری؟" نشاط نے مسکرا کر پوچھا۔

"نہیں، نشاط! یہ بات نہیں۔ دل تو چاہتا ہے کہ تمہارے لئے جان دے دی جائے مگر سماج کے... میرا مطلب ہے، ظالم آسمان بہت خوفناک ہے۔" رفیق اس موقعے کے جملے تلاش کرنے لگا۔ اُسے اندازہ ہو گیا تھا کہ ابا نے جو کچھ کہا تھا، غلط نہیں کہا تھا۔

"آسمان خوفناک ہے... میرا خیال ہے کہ اس وقت تو آسمان بہت خوبصورت لگ رہا ہے۔ دیکھئے نا، پرندوں کے غول اپنے اپنے آشیانوں کی طرف لوٹ رہے ہیں۔ ہوا میں نمی رقصاں ہے۔ کیا آپ کو بارش سے خوف آتا ہے؟" نشاط کی رگِ شرارت اُبھر آئی۔

"مم... میرا مطلب، اس وقت کے آسمان سے نہیں تھا۔"

"پھر کس وقت کے آسمان کی بات کر رہے ہیں، آپ؟"

"بس، نشاط! اب کل کی بات لے لو۔ کوئی خاص بات نہیں تھی۔ نزہت پھول توڑ رہی تھیں۔ میں نے کہا، ایک پھول اپنے بالوں میں لگا لو۔ اس میں کون سی بُری بات تھی؟"

"کوئی بُری بات نہیں تھی۔"

"مگر اُنہوں نے شکایت کردی اور خالہ جان ناراض ہوگئیں۔"

"بس، کیا کہوں، رفیق بھائی! آپ میرے بالوں میں پورا گلدستہ لگا دیں، مجھے اعتراض نہ ہوگا۔"

"بیچ نشاط..." رفیق کا دل مسرت سے ناچ اُٹھا۔

"سر حاضر ہے۔" نشاط ایک ادا سے جھک گئی اور رفیق بے خود ہو گیا۔ اسی بے خودی میں اُس کی زبان گنگ ہو گئی۔ اس کے بعد وہ ایک لفظ بھی نہ بول سکا۔

اسی وقت دور سے بابا کرم دین آتے نظر آئے اور نشاط جلدی سے بولی۔ "آیئے چلیں... پھر ملیں گے، کسی وقت۔ بابا کرم دین اسی طرف آ رہے ہیں۔" وہ جلدی سے آگے بڑھ گئی اور رفیق دوڑ کر درختوں کی آڑ میں ہو گیا۔ نشاط مسکراتی ہوئی اندر چلی گئی۔

**

ناہد نے نقشہ، داداجان کے سامنے رکھ دیا اور اُنہیں اُس کے بارے میں تفصیل بتانے لگا۔ داداجان بغور ایک ایک بات سمجھ رہے تھے۔ اُنہوں نے خوش ہو کر کہا۔

"انتہائی مکمل نقشہ ہے۔ کسی بات کی کمی نہیں چھوڑی، تم نے۔"

"یہ اس نقشے کی فوٹو سٹیٹ کاپیاں ہیں۔ اب یہ نقشہ، گورنمنٹ سے منظور کرانا ہے، داداجان! اس کام میں طویل وقت بھی لگ سکتا ہے۔ میں ایک اور قدم اُٹھانا چاہتا ہوں۔"

"وہ کیا، زاہد میاں؟"

"میری خواہش ہے کہ آپ، پریس کانفرنس بلائیں اور صحافیوں کو اپنے اغراض و مقاصد سے آگاہ کریں۔ ان سے کہیں کہ وہ اخبارات میں ان اغراض و مقاصد کی تفصیل چھاپیں۔ ان سے یہ بھی کہیں کہ آپ اس سلسلے میں حکومت کی صرف اتنی امداد چاہتے ہیں کہ وہ اس کی تکمیل میں دیر نہ ہونے دے۔ نقشہ پاس ہو جائے۔ ہمیں اس کی تعمیر کے لئے میٹیریل فراہم کر دیا جائے۔ بجلی اور ٹیلیفون کی سہولتوں میں دقت نہ ہو۔ ہمیں کچھ دن کے بعد ایک سب آفس بھی قائم کرنا ہوگا، داداجان!"

"پپ... پریس کانفرنس..." داداجان گھبرا سے گئے۔

"ہاں، داداجان! اس طرح آپ کی شخصیت اُبھر کر سامنے آئے گی۔ لوگ، آپ کے اس تصور کو سلام کریں گے۔ آپ دیکھئے تو سہی کیا ہوتا ہے۔"

"مگر میرے بچے! میں صحافیوں سے کیسے بات کروں گا؟ میں نے تو کبھی کوئی مراسلہ بھی نہیں لکھا، کسی اخبار کے لئے۔"

"داداجان! ان باتوں کو آپ کیوں سوچتے ہیں۔ آخر یہ خادم کس دن کام آئے گا۔ میں، آپ کا سیکریٹری بھی تو ہوں۔ آپ صرف میری سرپرستی کرتے رہیں، وہ سب کچھ کرتے رہیں جو میں، آپ کو بتاتا ہوں لیکن اس شرط کے ساتھ کہ جہاں بھی کہیں کوئی بات آپ کی مرضی کے خلاف ہو، وہاں آپ میری مرضی کا خیال نہیں کریں گے... ورنہ پھر بات نہیں بنے گی، داداجان!"

"ارے نہیں، بھئی! آج تک کبھی ایسا ہوا ہے؟"

"ہونا بھی نہیں چاہیئے، داداجان! آپ پریشان کیوں ہوتے ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ ملک و قوم کی نگاہ میں آپ کو ایک خاص عزت اور خاص مقام حاصل ہو۔ ہمارے اندرونی پروگرام کچھ بھی ہوں لیکن بیرونی ذرائع سے ہم جو کچھ بھی کریں گے، اس میں آپ دیکھیں گے کہ کچھ عرصے کے بعد آپ کی کیا کیفیت ہوتی ہے۔"

"مجھے یقین ہے۔ جو آئیڈیا تم نے پیش کیا ہے، اُس کے بارے میں، میں جتنا سوچتا ہوں، اتنا ہی مجھے اس کی افادیت کا یقین ہو جاتا ہے۔ یہ نہ صرف ایک نیک کام ہوگا بلکہ ہماری شہرت کو چار چاند لگا دے گا... شجاع احمد نے بے شک بڑی دولت کمائی ہے لیکن وہ صرف ایک تاجر کی حیثیت سے مشہور ہے۔ میرا مقام کچھ اور ہی ہونا چاہیئے۔ مجھے تو صرف اس بات کا افسوس ہے کہ تم مجھے پہلے کیوں نہ مل گئے... اتنی زندگی میں نے بیکار میں گزار دی۔"

"اب مل گیا ہوں، داداجان! فکر کس بات کی ہے۔" ناہد نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"بس، تو ٹھیک ہے۔ تم پریس کانفرنس کا بندوبست کرو۔ کہاں بلاؤ گے، صحافیوں کو؟"

"اسی کوٹھی میں، داداجان! وہ بڑا ہال جو ہے، اُس میں ہم اس پریس کانفرنس کا انتظام کئے لیتے ہیں۔"

"کب...؟"

"جب آپ پسند کریں۔"

"نہیں، جب تم پسند کرو۔"

"تو ٹھیک ہے، داداجان! میں کل ہی صحافیوں کو دعوت نامے بھجوائے دیتا ہوں۔ کل شام کی چائے پر ہم، اُنہیں بلوا لیں گے... لیکن ایک مسئلہ ہے، داداجان!"

"کیا...؟" داداجان نے چونک کر پوچھا۔

"میری ان کوششوں سے کہیں شجاع احمد صاحب نہ اُلجھنے لگیں۔ میری پوزیشن خطرے میں پڑ جائے گی۔"

"مجال ہے، کسی کی اور پھر ہم کون سا بُرا کام کر رہے ہیں۔ وہ اگر کوئی بہت بڑی چیز ہوگا تو اس کوٹھی سے باہر ہوگا۔ یہاں میرے معاملات میں کچھ بولا کر تو دیکھے، دماغ درست کر کے رکھ دوں گا۔" داداجان غصیلے لہجے میں بولے۔

"ارے... نہیں، نہیں، دادا جان! اس کی نوبت نہیں آئے گی۔ کیونکہ شجاع احمد صاحب کو بھی دل سے ان تمام باتوں کا قائل ہونا چاہیئے۔ قوم کی بہتری اور فلاح کے لئے جو قدم بھی اٹھ جائے، وہ کسی ایک شخص کے مفاد میں نہیں ہوتا۔ یہ تو ہم پر قرض ہے۔"

"بے شک، بے شک..." دادا جان نے خلوص سے کہا۔

"تو، دادا جان! میں پہلے یہ بیان صحافیوں کو دے دیتا ہوں، آپ کی طرف سے، میرا مقصد ہے کل اس پریس کانفرنس میں اور اس کے بعد ہم یہ نقشہ منظوری کے لئے بھیج دیتے ہیں۔ اس دوران میں ہمیں کسی اچھی کنسٹرکشن کمپنی سے بھی رابطہ قائم کرنا ہوگا۔ آپ بس پیسوں کا بندوبست کر رکھیئے۔"

"ارے بھئی! تم پیسوں کی فکر مت کرو۔ ابھی خود میرا بینک بیلنس اتنا ہے کہ ہم بہ آسانی اس کام کو شروع کر سکتے ہیں۔ جہاں کہیں رکاوٹ ہوگی، اُسے شجاع احمد پورا کرے گا۔ فی الحال تم اُس پروگرام پر عمل کرنے کا ارادہ تو نہیں رکھتے؟"

"نہیں، دادا جان! وہ سب بعد کی باتیں ہیں۔"

"ٹھیک ہے، زاہد میاں! مجھے تمہاری یہ تجویز بھی منظور ہے..." انہوں نے مطمئن انداز میں کہا۔

"یہ فائل، آپ کی نذر۔ اسے سنبھال کر رکھیں۔ میں چلتا ہوں۔" زاہد نے کہا اور دادا جان سے رخصت ہو کر قدسیہ کی طرف چل پڑا۔

قدسیہ ایک فہرست لئے، اُس کا انتظار کر رہی تھی۔

"کہاں چلے گئے تھے، زاہد! میں کب سے تمہارا انتظار کر رہی ہوں۔"

"خیریت...؟"

"استاد صاحب نے یہ فہرست دی ہے۔ رنگ، برش، کینوس، ... اور نہ جانے کیا، کیا..."

"اوہ، اچھا ٹھیک ہے، آجائے گا، سب کچھ۔ لاؤ فہرست مجھے دے دو۔"

"جی نہیں۔ یہ آپ کو نہیں ملے گی۔"

"کیوں...؟"

"زاہد! میں کبھی تمہارے ساتھ باہر نہیں گئی۔ آج چلوں گی۔ ہم ... شاپنگ کریں گے اور دوپہر کا کھانا کسی ہوٹل میں کھائیں گے۔ پلیز، انکار ... ورنہ میں ناراض ہو جاؤں گی۔"

"امی جان سے پوچھ لیا ہے، تم نے؟"

"تمہارے ساتھ جانے سے کوئی منع نہیں کرے گا۔"

"اس کے باوجود میں چاہتا ہوں کہ اجازت لے لو۔"

"آؤ پھر میرے ساتھ۔ تمہارے سامنے ہی پوچھ لیتی ہوں۔" قدسیہ نے کہا اور زاہد، اس کے ساتھ چل پڑا۔

بیگم صاحبہ نے مسکرا کر اُن دونوں کو دیکھا تھا۔

"امی! میں زاہد کے ساتھ بازار جا رہی ہوں۔ کچھ خریداری کرنا ہے۔"

"چلی جاؤ۔" بیگم صاحبہ نے کہا تو زاہد چونکنے کی اداکاری کرتا ہوا بولا۔

"ایلی ہاؤس میں کچھ غیر ملکی کپڑا آیا ہوا ہے۔ بیگم صاحبہ! اعلیٰ درجے کی ساڑھیاں بھی ہیں۔ آپ کو تو نہیں خریدنی؟"

"کوئی اچھی چیز ہے؟"

"سنا تو یہی ہے۔ کسی وقت چل کر دیکھ لیں۔"

"تو دس منٹ رُک جاؤ۔ میں بھی چلتی ہوں۔" بیگم صاحبہ اٹھ گئیں۔

قدسیہ نے عجیب سی نگاہوں سے زاہد کو دیکھا لیکن کچھ کہا نہیں۔ البتہ بازار میں وہ بہت بور رہی۔

زاہد نے شاپنگ کے بعد کھانے کی پیشکش کر دی۔ تینوں نے دوپہر کا کھانا ایک ہوٹل میں کھایا پھر گھر واپس آ گئے۔

سرفراز، کوٹھی کی اوپری منزل میں منتقل ہو گیا تھا۔ ماں کا علاج بھی شروع ہو چکا تھا اور اُس کا رُواں، رُواں زاہد کا ممنون تھا جس نے ان بجھتے چراغوں میں نئی زندگی دوڑا دی تھی۔

سامان، اوپری منزل کے اُس ہال میں منتقل ہو گیا تھا جسے نگار خانے کے طور پر منتخب کیا گیا تھا۔

قدسیہ کا موڈ ابھی تک درست نہیں ہوا تھا۔ شام کو اس کی ملاقات پھر زاہد سے ہو گئی۔ وہ اب بھی زاہد سے ناراض تھی۔

"قدسیہ..." زاہد نے پیار بھرے لہجے میں اُسے مخاطب کیا۔

"کیا بات ہے؟"

"ناراض ہو مجھ سے؟"

"تمہیں، اس کا خیال کیسے آگیا؟"

"میں محسوس کر رہا ہوں۔"

"میری ناراضگی تم نے محسوس کر لی، زاہد! میرے دوسرے جذبات پر کوئی توجہ نہیں دی۔"

"دوسرے جذبات...؟"

"ہاں، زاہد! میں، تمہیں پسند کرتی ہوں۔ میرے دل میں تمہارے لئے ایک جذبہ پروان چڑھ رہا ہے... لیکن میں جانتی ہوں کہ تم جان بوجھ کر اسے نظر انداز کر رہے ہو۔ اس دن تھوڑی سی تنہائی ملی تھی لیکن تم نے مجھے وہاں سے بھگا دیا تھا۔ آج میں نے تم سے کہا تھا کہ ہم دونوں باہر چلیں گے... ساتھ کھانا کھائیں گے مگر تم نے امی کو ساتھ لے لیا۔ دیکھو، زاہد! میں صاف ستھرے ذہن کی مالک ہوں۔ حالانکہ لڑکی ہونے کے باوجود، میں نے تم سے اپنی چاہت کا اظہار کیا ہے۔ یہ بات میرے لئے باعثِ شرم ہے لیکن میں

ایک بات جانتی ہوں۔ ساری دُنیا میں محبت کبھی یک طرفہ نہیں ہوتی۔ میں بھی خیالوں کے بھنور میں پھنسے رہنا نہیں چاہتی۔ اگر تم کسی اور کو چاہتے ہو تو میں خلوص دل سے تمہیں، اُس کے لئے آزاد چھوڑ دوں گی ہیں، اس بات پر ہرگز آزردہ نہیں ہوں گی۔ بلکہ تمہاری چاہت کے حصُول میں تمہاری مدد کروں گی ... مجھے بتاؤ، تمہارا مطمع نگاہ کچھ اور ہے تو میں اپنے آپ کو سنبھال لوں گی۔ ہیں اس کے بعد بھی تمہیں چاہتی رہوں گی... لیکن تمہاری ذات سے کوئی توقع چھوڑ دوں گی۔"

زاہد کے ہونٹوں پر مُسکراہٹ پھیلی ہُوئی تھی۔ قدسیہ کے خاموش ہو جانے کے بعد وہ بولا۔

"جو کچھ میں کہوں، اُس پر یقین کرو گی، قدسیہ؟"

"ضرور کروں گی لیکن یہ آخری بات ہو گی۔"

"بالکل آخری اور فیصلہ کُن۔"

"بتاؤ پھر...؟"

"اگر تم چاہت کی بات کرتی ہو، قدسیہ! تو یقین کرو، میں بھی تمہیں اتنا ہی چاہتا ہُوں، جتنا تم مجھے لیکن میری چاہت میں ایک ذرا سی تبدیلی ہے، قدسیہ! میرے دل میں تم لوگ بالکل بہن بھائیوں کی طرح ہو، بالکل سگے بہن، بھائیوں کی طرح... اور قدسیہ! مجھے اس گھر میں رہنا نصیب ہو یا نہ ہو، میں اپنے اس احساس میں تبدیلی نہیں کر سکتا، میں، تمہیں ایک بھائی کی محبت دے سکتا ہُوں، بس... اور یہ بھی سُن لو... قدسیہ! آج تک میری ساری زندگی میں کوئی لڑکی اس حیثیت سے نہیں آئی اور نہ ہی ابھی تک اس احساس کا کوئی وجُود ہے۔ تم وعدہ کر چکی ہو کہ میری بات پر یقین کرو گی ... قدسیہ! تمہارا نسوانی غرُور ہمیری زندگی ہے اور غرُور کو قائم رکھنے کے لئے تمہارا یہ اظہار، ایک بھائی کے پاس، بہن کی امانت ہے۔ یہ الفاظ، اس سینے کی گہرائی میں ہمیشہ کے لئے دفن ہو چکے ہیں... اب مجھے بتاؤ، قدسیہ! کہ تم مجھے یہاں برداشت کر سکو گی یا نہیں؟"

"کیا مطلب ...؟" قدسیہ نے پُوچھا۔

"اگر مجھے دیکھ کر تمہارے دل میں یہ احساس جاگا کہ میں نے تمہارے پیار کی پذیرائی نہیں کی تو میں یہاں نہیں رہوں گا۔ اب سے ایک گھنٹے کے بعد، میں یہ کوٹھی چھوڑ دوں گا اور دوسرے گھنٹے میں یہ شہر... اور جب تک زندہ رہوں گا اس شہر میں نہیں آؤں گا۔ زاہد کے لہجے میں فولاد کی سختی تھی...

قدسیہ کی آنکھوں میں عقیدت کے جذبات نظر آنے لگے۔ اُس کے چہرے پر پھُولوں کی سی شگفتگی پیدا ہو گئی۔ وہ آگے بڑھی اور بڑے پیار سے زاہد کا سر اپنے سینے سے لگا لیا۔ پھر بولی۔

"تم نے میری توہین نہیں کی، زاہد! تم نے تو مجھے اُس سے اُونچا مقام دیا ہے جس کی میں طلبگار تھی۔ تم نے میری چاہت کو ٹھکرایا تو نہیں بلکہ تم نے اس کے سارے داغ دھو دیئے ہیں۔ مجھے، تم پر اور تمہاری اس محبت پر فخر ہے، زاہد! خُدا کی قسم! پُورے خلوص سے کہہ رہی ہُوں کہ میں نے کچھ کھویا نہیں بلکہ بہت کچھ پایا ہے اور اس پانے پر مجھے فخر ہے۔ میری حماقت کو معاف کر دینا، زاہد!"

"بس، بس... آج کی کہانی ختم۔ کل سے ابتدا ہو رہی ہے نا؟"

"کس بات کی؟"

"تمہاری مصوّری کی۔"

"یقیناً..." قدسیہ نے جواب دیا۔

"اور کوئی بات، قدسیہ؟"

"بس، اور کچھ نہیں۔" قدسیہ نے جواب دیا۔

اور زاہد، اُس سے رُخصت ہو کر آگے بڑھ گیا... اُس کے ذہن کو کافی سکُون ملا تھا۔

شجاع احمد صاحب اچانک کسی کام سے شہر سے باہر چلے گئے تھے۔ شام کو اُن کا فون آیا تھا کہ وہ جا رہے ہیں۔ اتنا وقت نہیں ہے کہ گھر آ سکیں اُن کا ضروری سامان بھجوا دیا جائے۔ چنانچہ وہ چلے گئے تھے۔

زاہد، دوسرے دن صبح ہی سے مصرُوف ہو گیا تھا۔ چونکہ شجاع احمد صاحب گھر پر نہیں تھے، اس لئے پریس کانفرنس والی بات گھر میں عام ہو گئی تھی۔ تمام لوگوں نے اس کانفرنس کی کارروائی دیکھنے کی خواہش ظاہر کی تھی اور دادا جان سے اجازت نامہ حاصل کر لیا تھا۔

دوپہر کے کھانے کے بعد دادا جان زاہد کو لے کر کمرے میں بند ہو گئے تھے۔ اُن کے ہاتھ، پاؤں پھُولے ہُوئے تھے، کانفرنس کے تصوّر سے صحافیوں کے سامنے بولنا معمولی بات نہیں تھی۔

زاہد، انہیں، صحافیوں کے متوقع سوالات اور اُن کے جوابات بتاتا رہا۔ اُس نے اُنہیں کافی تسلیاں دی تھیں کہ وہ فکر نہ کریں۔ وہ خود موجود ہو گا اور کسی بھی مشکل وقت کو سنبھال لے گا۔ اس کے علاوہ جو کچھ اُس نے بتایا ہے، وہی کیا جائے، کوئی مشکل نہیں ہو گی۔ بمشکل تمام دادا جان کے دل کو قرار آیا تھا۔

گھر کی فضا خاصی پُررونق تھی، مہمان صحافیوں کے لئے خاصے انتظامات کئے گئے تھے۔ شجاع احمد صاحب اگر گھر پر ہوتے تو شاید یہ انتظامات نہ ہو پاتے لیکن اُن کی غیر موجودگی سے سب ہی لطف اندوز ہو رہے تھے... اور پھر... وقت مقررہ پر پریس فوٹو گرافرز، صحافی اور کچھ دوسرے حضرات پہنچ گئے جنہیں مدعو کیا گیا تھا۔ صحافیوں کو خود زاہد نے ریسیو کیا تھا اور بڑے اہتمام سے اُس بڑے ہال میں پہنچا دیا گیا تھا جو کانفرنس کے لئے تیار کیا گیا تھا۔

بیگم شجاع احمد اور سب بچوں نے صحافیوں سے تعارف حاصل کیا

تھوڑی دیر بعد، دادا جان خوبصورت شیروانی میں ملبوس، کچھ افراد کے ساتھ اندر آ گئے۔ فوٹوگرافروں نے ان کی تصویریں بنائیں اور دادا جان کا چہرہ ہونقوں جیسا ہو گیا۔ وہ خود کو انتہائی طور پر سنبھالے ہوئے تھے۔ بہر صورت، وہ اپنی مخصوص نشست پر آ کر بیٹھ گئے تب کارروائی کا آغاز ہوا۔

زاہد نے ایک ہلکی پھلکی تقریر کرتے ہوئے کہا۔ "اس کانفرنس میں شرکت کرنے پر میں اپنے معزز ساتھیوں کا شکریہ ادا کرتا ہوں اور اس کے بعد اس کے اغراض و مقاصد کی مختصر سی تفصیل عرض کرتا ہوں...۔ اپنے تعارف کے سلسلے میں صرف اتنا ہی کہنا پسند کروں گا کہ میں عظیم المرتبت جناب حسام احمد کا پرسنل سیکریٹری ہوں اور اس بات پر فخر کرتا ہوں کہ مجھے اس کوٹھی میں، گھر کے ایک فرد کی حیثیت حاصل ہے۔ ان اغراض اور مقاصد کی تفصیل بھی میں ایک سیکریٹری کی حیثیت سے عرض کر رہا ہوں۔ جناب حسام احمد اپنی پرسکون زندگی میں ہمیشہ انسانیت کی فلاح و بہبود کے لئے سوچتے رہے ہیں اور بالآخر انہوں نے اپنا فرض پورا کرنے کے لئے ایک حل نکال لیا ہے... اور یہ حل "فرسٹ ایڈ ہاؤس" کے نام سے منسوب کیا ہے۔ فرسٹ ایڈ ہاؤس ذاتی نوعیت کا ایک ایسا ادارہ ہوگا جس کے... اغراض و مقاصد، انسانیت کی فلاح کے لئے ہیں۔"

زاہد نے اپنے اور حسام احمد صاحب کے درمیان طے ہونے والے معاملات پر روشنی ڈالتے ہوئے اس فرسٹ ایڈ ہاؤس کی افادیت بتائی تو صحافیوں کے چہروں پر جوش کے تاثرات پھیل گئے۔

تفصیلات بتانے کے بعد زاہد خاموش ہو گیا.. پھر اس نے صحافیوں کو دعوت دی کہ اب وہ اس سلسلے میں جو سوالات کرنا چاہیں، کر سکتے ہیں۔

ایک صحافی نے کہا۔

"سب سے پہلے ہم، اس انوکھے ادارے کی بنیاد رکھنے پر جناب حسام احمد کو مبارکباد دیتے ہیں۔ یقیناً یہ ادارہ ملک میں اپنی نوعیت کا انوکھا ادارہ ثابت ہوگا اور جس کے مقاصد بے شک بہت اعلیٰ ہیں گے۔ میں پہلا سوال حسام احمد صاحب سے یہ کرتا ہوں کہ اس ادارے کی تکمیل کب تک ہو جائے گی؟"

حسام احمد صاحب نے گلا صاف کیا اور کسی قدر اعتماد سے بولے۔

"اس کے لئے وسیع و عریض زمین محفوظ کر لی گئی ہے۔ ہم نے اس کا نقشہ ایک ماہر آرکیٹکٹ سے بنوایا ہے اور اب ہماری خواہش ہے کہ حکومت ہمارے اس منصوبے کی جلد تکمیل کے لئے ہماری مدد کرے اور ہمیں ایسی الجھنوں میں نہ پڑنے دے جس سے اس پروجیکٹ کی تکمیل کے سلسلے میں تاخیر ہو۔"

"بے شک! یہ حکومت کا بھی فرض ہے۔ ہم اخبار والے آپ کو اپنے مکمل تعاون کا یقین دلاتے ہیں۔ ہم آج کی اس رپورٹنگ کو نمایاں طور پر شائع کریں گے اور حکومت سے اپیل کریں گے کہ آپ کے چھوٹے چھوٹے مسائل کو حل کرنے میں آپ کی مدد کرے۔" ایک صحافی نے کہا۔

دوسرے صحافی نے پوچھا۔ "ویسے محترم! آپ کا تعلق کہاں سے ہے؟"

"بھئی، بڑے فخر کے ساتھ کہتا ہوں کہ پاکستانی ہوں۔ یہی میرا وطن اور ملک ہے اور میں اس سے اپنے کو دنیا کے دوسرے تمام تعلقات پر ترجیح دیتا ہوں۔"

"پاکستان آنے سے قبل، آپ کا قیام کہاں تھا؟"

"بارہ بنکی کا رہنے والا ہوں۔ وہیں پیدا ہوا تھا مگر اب یہ پرانی بات ہے۔" حسام احمد صاحب نے کہا۔

ایک صحافی جو کسی سلسلے میں شجاع احمد صاحب کا انٹرویو کر چکا تھا، چونک کر بولا۔

"آپ شجاع احمد صاحب کے والد ہیں۔ جبکہ شجاع احمد صاحب خود کو لکھنوی بتلاتے ہیں... پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ آپ کا تعلق بارہ بنکی سے ہو اور شجاع احمد صاحب کا لکھنؤ سے؟"

حسام احمد صاحب ایک لمحے کے لئے بوکھلا گئے۔ جانتے تھے کہ بیٹا اس بات کے لئے شدید کوشاں رہا ہے کہ خود کو بارہ بنکی کے بجائے لکھنؤ کا ظاہر کرے۔ زاہد نے ان کی بوکھلاہٹ محسوس کی تو مسکراتا ہوا، اٹھ کھڑا ہوا۔

"معافی چاہتا ہوں، دخل اندازی کی۔ اس کا جواب میں پیش کرنا چاہتا ہوں۔ لکھنؤ کی تہذیب اور وہاں کے رہنے والوں کا ایک خاص تاثر، اس کے اطراف میں بھی اسی طرح موجود ہے جس طرح خود لکھنؤ میں اور لکھنؤ کے بالکل قرب و جوار میں رہنے والے اس تہذیب سے متاثر ہیں اور خود کو لکھنوی کہلانے میں ایک شان محسوس کرتے ہیں۔"

"اوہ..." صحافی مطمئن ہو گیا۔

اس کے بعد بھی حسام احمد صاحب سے بہت سے سوالات کئے گئے۔ یہ بھی پوچھا گیا کہ آپ فرسٹ ایڈ ہاؤس کے اخراجات کہاں سے پورے کریں گے؟ اس میں کتنا اسٹاف ہوگا؟ حکومت سے کتنی امداد حاصل کی جائے گی؟

حسام احمد صاحب جوابات دیتے رہے۔ صحافیوں نے یہ سارے جوابات نوٹ کر لئے تھے۔ اس کے بعد چائے رکھی گئی جس کے ساتھ بہترین لوازمات پیش کئے گئے... پھر یہ کانفرنس ختم ہو گئی۔

حسام احمد صاحب کی بے شمار تصویریں لی گئیں۔ ان کے اہل خاندان کی تصاویر بھی کھینچی گئیں اور دوسرے دن اخبارات نے اس

پریس کانفرنس کی شاندار رپورٹنگ کی۔ تقریباً تمام ہی اخبارات نے حسام احمد صاحب کے اس دوستانہ اقدام کو بے حد سراہا تھا اور لکھا کہ اگر ملک و قوم کے ہمدرد یہی درد، دل میں رکھ کر اپنے حسب حیثیت ملک کی فلاح کے لئے کچھ کرتے رہیں تو وہ وقت دور نہیں ——

—— جب اس ملک میں پریشان حال لوگ تلاش کرنے کے باوجود نہیں ملیں گے۔ حسام احمد اور ان کے اہل خاندان کی تصاویر نمایاں طور پر شائع کی گئی تھیں۔ یہ تمام اخبارات، زاہد نے حسام احمد صاحب کو فراہم کئے تھے... اور حسام احمد صاحب کی خوشیوں کا کوئی ٹھکانہ نہیں تھا۔ انہوں نے بڑے متاثر کن لہجے میں کہا تھا۔

"زاہد! دراصل انسان بہت کچھ ہوتا ہے۔ لیکن اُسے تحریک دینے والا حقیقت میں سب کچھ ہوتا ہے۔ میری تعریف و توصیف میں جو کچھ کہا گیا ہے، اُسے میں صرف تمہاری مہربانی سمجھتا ہوں۔ یہ سب کچھ تمہاری وجہ سے مجھے حاصل ہوا ہے۔"

"اور میں، آپ کا کون ہوں، دادا جان؟" زاہد نے محبت بھرے لہجے میں پوچھا۔

"تم، میرے بیٹوں ہی کی مانند ہو۔ میں دروغ گو آدمی نہیں ہوں لیکن میرے دل میں تمہاری محبت اسی طرح جاگزیں ہے جس طرح اپنے تمام بچوں کے لئے۔"

"بہت بہت شکریہ، دادا جان! اس سے زیادہ مجھے کچھ درکار نہیں ہے۔" زاہد نے کہا۔

گھر کے تمام افراد بے حد خوش تھے۔ البتہ شام کو شجاع احمد صاحب آگ بگولہ بنے کوٹھی میں داخل ہوئے۔ ان کا چہرہ غصے سے سُرخ ہو رہا تھا۔ خونخوار نگاہوں سے وہ، اہل خانہ کو گھورتے ہوئے وہ اپنے کمرے میں چلے گئے اور پھر بیگم کو آواز دی۔

بیگم صاحبہ بڑے مطمئن انداز میں اندر پہنچیں۔ اُن کے ہونٹوں پر استقبالیہ مُسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ انہوں نے پیار بھرے لہجے میں پوچھا۔

"آگئے، آپ... میرا تو خیال تھا کہ دو، چار دن کے بعد آئیں گے۔ کوئی اطلاع بھی نہیں ملی تھی کہ کب آئیں گے۔"

"کیا خیال تھا، آپ کا۔ دو چار مہینوں کے بعد آؤں گا۔ تاکہ آپ لوگوں کی رنگ رلیوں میں کوئی فرق نہ پڑے۔" شجاع احمد صاحب غرّائی ہوئی آواز میں بولے۔

بیگم صاحبہ چونک کر اُن کی طرف دیکھنے لگیں۔ "اپنے الفاظ پر غور کر رہے ہیں، آپ! کون سی رنگ رلیوں کی طرف اشارہ ہے؟"

"اخبارات ضرور دیکھے ہوں گے، آپ نے۔ بلکہ نہایت ذوق شوق سے دیکھے ہوں گے۔ سب کی تصویریں ہیں، ان میں۔ ماشاءاللہ! بڑی شہرت ملی ہے، آپ سب کو۔"

"کسی ناچ رنگ کی محفل کی تصویریں ہیں کیا؟" بیگم صاحبہ بھی تنک کر بولیں۔

"پریس کانفرنس کا انتظام کس نے کیا تھا؟"

"آپ کے والد صاحب کے حکم پر زاہد نے۔"

"زاہد..." شجاع احمد صاحب غرائے۔ "میں جانتا تھا، اچھی طرح جانتا تھا۔ میں خوب جانتا ہوں کہ زاہد کو میرا قائم مقام بنانے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ اس گھر میں، اب میرا نہیں، زاہد کا حکم چلتا ہے۔ وہ سب کچھ بن چکا ہے، اس گھر کا۔ ہر شخص اسی کے گن گا رہا ہے اور ابا جان... وہ، اس گھر پر بہت بڑی تباہی لانے کی کوشش کر رہے ہیں۔"

"بات کریں، آپ، اُن سے۔ ہم لوگوں پہ کیوں بگڑ رہے ہیں؟"

"اس لئے بیگم! کہ ابا جان بوڑھے ہو چکے ہیں، وہ عقل کھو بیٹھے ہیں لیکن میرے بعد گھر کی ذمّے داریاں، آپ پر عائد ہوتی ہیں۔ آپ کی آنکھیں بند ہونے پر مجھے تعجب ہے۔"

"خدا کا شکر ہے کہ میری آنکھیں کھلی ہوئی ہیں۔"

"خوش فہمی ہے، آپ کی... میں کہتا ہوں، غور کیا ہے، کبھی زاہد پر... سوچا ہے کبھی اس کے بارے میں؛ وہ کون ہے؟ کہاں سے آیا ہے؟ کیوں آیا ہے؟ اس کا مقصد کیا ہے؟ کیا کرنا چاہتا ہے، وہ اس گھر میں؟ بیگم! آپ بیٹیوں کی ماں ہیں، جوان بیٹیوں کا گھر ہے، یہ۔ اس جیسا شاطر کچھ بھی کر سکتا ہے۔ سر پر ہاتھ رکھ کر روئیں گی، کسی وقت... کیا آپ انتظار کر رہی ہیں، اس وقت کا، جب آپ کی ناک کٹ جائے اور ہم کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہیں؟"

"خاموش ہو جائیے، شجاع احمد صاحب! خاموش ہو جائیے۔ اگر میری زبان کھل گئی تو آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ جائیں گی۔ سارا غرور خاک میں مل جائے گا۔ جائیے۔ میں ذمّے داری لیتی ہوں۔ ضمانت دیتی ہوں، اس بات کی کہ آپ کی بیٹیوں کے لئے وہ کوئی خطرہ نہیں بنے گا۔ اگر اس کی ذات سے آپ کی بیٹیوں کو کوئی نقصان پہنچ جائے تو آپ مجھے گولی مار دیجئے گا۔ جو کچھ میں نے سنا ہے، دیکھا ہے، اس کے لئے میں... صرف اتنا ہی کہہ سکتی ہوں کہ آپ کی بیٹیاں بہک سکتی ہیں، زاہد نہیں بہک سکتا۔" بیگم صاحبہ پُرجوش لہجے میں بولیں۔

"کیا مطلب... کیا مطلب ہے، اس بات کا؟"

"بس، اس سے زیادہ میں کچھ نہیں بتا سکتی۔"

"پھر بھی کوئی تو مطلب ہوگا، اس بات کا؟"

"صرف ایک مطلب ہے اور وہ یہ کہ وہ کسی شریف ماں کی اولاد ہے، وہ کسی مریم صفت کا بیٹا ہے جس نے اُسے شرافت سکھائی ہے۔ میں نے اس کی ذمّے داری قبول کی ہے۔"

بیگم صاحبہ کی کیفیت دیکھ کر شجاع احمد صاحب کچھ نرم پڑ گئے۔

"آپ بہت جذباتی ہیں، اس کے لئے۔"

"وہ ہے ہی محبت کئے جانے کے قابل۔ خدا کی قسم! زاہد۔ اب اس گھر میں غیر نہیں رہا۔ میں ماں ہوں، اس کی۔ وہ، ہماری عزت کا رکھوالا ہے۔ مجھے وہ اپنے دوسرے بیٹوں ہی کی مانند عزیز ہے۔"

"تعجب ہے۔ وہ آج تک مجھے متاثر نہیں کر سکا۔"

"آپ... آپ کو میں کچھ نہ کہوں گی۔"

"ابا جان نے مجھے دو کوڑی کا نہ رکھا۔ لوگ مجھے مکھنوی کی حیثیت سے جانتے تھے۔ انہوں نے رپورٹروں کو کیا بیان دیا ہے، پڑھا ہے؟"

"جی ہاں۔ پڑھا ہے۔ زاہد نے اسی وقت بات سنبھال لی تھی ورنہ اخبارات اور بھی بہت کچھ لکھتے۔"

"آپ لوگ کچھ بھی کہیں، اس کے بارے میں کوئی بھی رنگ چڑھ جائے، آپ پر... لیکن میرا دل نہیں مانتا۔ کوئی گڑبڑ ضرور ہے۔ کہیں کوئی پھانس ضرور ہے... نہ جانے وہ کیا چاہتا ہے... ہے کچھ ضرور..."

شجاع احمد صاحب کی آواز دھیمی پڑ گئی۔ وہ غور و فکر میں ڈوب گئے تھے۔

شفیق، توفیق صاحب سے ناراض تھا۔ رفیق کی تو قسمت کھل گئی تھی اور اس کی طرف کسی کی توجہ نہیں تھی حالانکہ دو لڑکیاں اور بھی تھیں۔ اگر اسے بھی اجازت مل جاتی تو کیا حرج تھا۔ باپ بہت سخت تھے لیکن شاہدہ بیگم نے ہمیشہ ناز برداریاں کی تھیں اور جا بے جا مانتی چلی آئی تھیں۔ یہ شکایت ماں سے ہی کی جا سکتی تھیں۔

"یہ ناانصافی نہیں ہے میرے ساتھ؟" وہ نتھنے پھلا کر بولا۔

"کیسی ناانصافی؟" شاہدہ بیگم چھالیہ کی چٹکی منہ میں ڈال کر بٹوے کے بند کستی ہوئی بولیں۔

"وہ تو گل چھرے اڑا رہا ہے نشاط کے ساتھ اور میں بے وقوفوں کی طرح ادھر ادھر ٹامک ٹوئیاں مارتا پھر رہا ہوں۔"

"اے ارے کیا اول فول بک رہا ہے۔ دماغ خراب ہو گیا ہے تیرا۔ نہ شرم نہ حیا آخر تو چاہتا کیا ہے؟"

"دیکھو اماں جی! میں بھی جوان ہوں۔ میرے اندر بھی جوانی کا جوش ہے۔ رہی بات شرم و حیا کی تو وہ بھی کچھ کر رہا ہے۔ اس میں کوئی حرج نہیں ہے؟ اور ادھر جو ڈرامہ ہو رہا ہے وہ اس لئے جائز ہے کہ ابا جی کی ڈائریکشن میں ہو رہا ہے۔"

"ارے تیرا ستیاناس... زبان کو لگام دے ناس پیٹے۔ سب کیا دھرا چوپٹ کرے گا کیا۔ دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں۔ کسی نے سن لیا تو ہادا زمین میں گڑھا کھود کر گاڑ ڈالے گا۔" شاہدہ بیگم دانت پیس کر

دیں...

"صبر و سکون سے سنو اماں جی۔ دیکھو ہم دونوں بھائیوں میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ آج تک دونوں نے کبھی ایک دوسرے کی کاٹ نہیں کی لیکن تم لوگ ہمارے بیچ نفرت کا بیج بو رہے ہو۔"

"وہ کیسے...؟"

"رفیق نے نشاط کو پھانس لیا ہے۔ آج نہیں تو کل ان دونوں کی شادی ہو جائے گی۔ رفیق کو جہیز میں دولت ملے گی اور مجھے؟ میں کیا کروں گا؟"

"جو کچھ رفیق کو ملے گا اس میں تیرا کچھ نہ ہوگا؟" شاہدہ بیگم کی آواز میں سرور پیدا ہو گیا۔

"گھنٹی... گھنٹی ملے گی مجھے۔ تم تو بھول جاتی ہو اماں جی۔ بیس روپے کی سائیکل خریدی تھی اس نے اور گھنٹی میں نے لگائی تھی اس میں یاد نہیں ہے تمہیں، جب میں نے سائیکل چلانے کو مانگی تو اس نے گھنٹی اتار کر میرے ہاتھ میں دے دی تھی۔"

"خدا کے بندے اور ضد کے بندے۔ کچھ تو وقت کا خیال کر۔ ہم دونوں تمہاری زندگی بنانے کی کوشش میں مرے جا رہے ہیں اور تم اپنی نادانیوں سے سب کچھ خراب کرنے پر تلے ہوئے ہو۔ بدھو۔ تو کر ایک بھائی کی شادی ہوئی جس گھر میں تو کیا دوسرے کی خود بخود نہ ہو جائے گی۔ ایک ہی گھر کے دو داماد ملیں گے مہر النساء بیگم تو پھولے نہیں سمائیں گی۔ مجال ہے ان کی کہ دوسری بیٹی کی شادی کر دیں کسی اور سے پھر

تو ہمارا زور ہوگا اُن پہ۔ مجھے تو یہ افسوس ہے کہ ہمارا کوئی تیسرا بیٹا نہ ہُوا۔ ایک پیسہ گھر سے باہر نہ جاتا لیکن خیر اس کا بھی حل سوچ لیا جائے گا۔ کوئی ایسی ترکیب۔ کہ تیسری کو کوئی پوچھنے تک نہ پوچھے مگر ابتدا تو ہونے دے۔ اپنی بے وقوفی سے سارے کام خراب نہ کر دینا۔"

شفیق مُنہ بنا کر خاموش ہو گیا۔ ماں کی باتوں میں وزن تو تھا لیکن جوانی اس مصلحت کو قبول نہیں کرتی تھی۔ رفیق تو پھولوں کے کنج میں، دریچوں میں، چھت پر محبت کے کھیل کھیلے اور وہ بس احمقوں کی طرح وقت گزار رہا ہے۔ اسے بھی تو چانس دیا جاتا۔ نزہت تو خطرناک تھی لیکن صوفیہ کے لئے تو کوشش کی جا سکتی تھی۔ بہت زیادہ تو فرق نہیں تھا ان کی عمروں میں۔

موسم صبح سے ہی ابر آلود تھا۔ جوں جوں شام ہوتی گئی بادل گہرے ہوتے گئے۔ پانی کے بوجھ سے بدمست ہوائیں امنگوں بھری الھڑ حسیناؤں کی مانند لڑکھڑاتی پھر رہی تھیں۔ فضاؤں میں نشہ گھلا ہُوا تھا اور موسم شفیق کو اور پریشان کر رہا تھا۔

باہر لان میں نکلا تو ننھی ننھی بوندوں نے دل میں آگ سی لگا دی۔ بھیگتا ہُوا بائیں باغ میں آ گیا۔ بوندیں تیز ہوتی گئیں لیکن بھیگنے میں بہت سرور مل رہا تھا۔ پھر موسلا دھار بارش ہونے لگی۔ لیکن اس نے اپنی جگہ نہیں چھوڑی تھی۔ اس کا سارا لباس بھیگ گیا۔ بدن سے پانی کی دھاریں چھوٹنے لگی۔ اسی وقت ملازموں کے کوارٹروں سے ایک لڑکی باہر نکلی اور حویلی کے اندرونی حصّے کی طرف چل پڑی۔ اس نے ٹاٹ کی بوری اوڑھی ہوئی تھی اور چوپایوں جیسی عجیب سی چال سے آگے بڑھ رہی تھی۔ دفعتاً اس کی نگاہ شفیق پر پڑی اور وہ ٹھٹک گئی۔ ایک لمحہ اپنی جگہ کھڑی رہی جیسے کسی کشمکش میں گرفتار ہو پھر آہستہ قدموں سے وہ شفیق کی طرف بڑھ آئی۔ اس کی رفتار میں پہلے جیسی تیزی نہیں رہی تھی جیسے وہ بارش کو بھول گئی ہو۔

شفیق مسکراتی نگاہوں سے اسے دیکھتا رہا۔ لڑکی اس کے بالکل نزدیک آئی تو وہ چونک پڑا۔ یہ تو اچھی خاصی شکل تھی بالکل نوجوان اور الھڑ۔

"پانی ... پانی برس رہا ہے صاحب جی۔" وہ نزدیک آ کر فکرمند سے انداز میں بولی۔

"معلوم ہے مجھے۔" شفیق بولا۔

"بھیگ کر بیمار ہو جاؤ گے۔" اس نے کہا۔

"تو پھر...؟" شفیق کی مسکراہٹ گہری ہو گئی۔

"مر جاؤ گے۔" وہ جھنجلا کر بولی۔

"مر جانے دے تجھے کیا۔" لڑکی کے ہونٹ کھلے اور پھر بے دم بند ہو گئے۔ پھر وہ آہستہ سے بولی۔

"نہیں جی۔ ہمارے مالک ہو۔ ہمارا تو فرض ہے جی۔ لو یہ اوڑھ لو اور اندر چلے جاؤ۔" اس نے بوری سر سے اتار کر شفیق کی طرف بڑھا دی۔

"میں تیرا مالک کیسے ہو گیا؟"

"دیکھو بری طرح بھیگ گئے ہو۔ جلدی کرو۔ یہ بارش اچھی نہیں بخار آ جائے گا۔"

"اور اب تو جو بھیگ رہی ہے۔" شفیق نے اسے اوپر سے نیچے تک دیکھتے ہوئے کہا اور دھک سے رہ گیا۔ بھیگا وجود دھڑکنیں بند کرنے کی صلاحیت رکھتا تھا۔ اسے گمان بھی نہیں تھا کہ وہ اتنی حسین ہو گی۔ لڑکی اس کی نگاہوں کی گستاخی سے شرما گئی اور پھر اس نے خوفزدہ ہرنی کی طرح ادھر ادھر دیکھا۔ پھر دانت پیس کر اسے اور اس کے بعد تیز تیز قدموں سے حویلی کے اندرونی حصّے کی طرف بھاگ گئی۔

شفیق گہری نگاہوں سے اسے دوڑتے ہوئے دیکھتا رہا۔ اس کے دل کی دھڑکنیں بے اعتدال ہو گئی تھیں۔ کون ہے یہ۔ کون ہے؟ کوئی ملازمہ ہی ہو سکتی ہے لیکن کتنی خوبصورت ہے۔ واقعی کتنی حسین ہے۔ اس کے دل میں میرے لئے یہ احساس کیوں جاگا۔ وہ کشمکش کا شکار کیوں ہو گئی تھی۔ اسے دیکھ کر ٹھٹک کیوں گئی تھی؟ ذہن کے کیڑے اس کے ذہن نے نہ جانے کیا کیا خاکے پیش کر دیئے۔ وہ اپنی جگہ سے ہلا تک نہیں تھا۔

تھوڑی دیر کے بعد وہ دوبارہ نظر آئی۔ کوئی چیز پلاسٹک میں چھپائے آ رہی تھی۔ اسی طرف آ گئی اور پھر اسے دیکھ کر کھل کھلا کر ہنس پڑی۔

"بوری تو دے دو میری۔ بلاوجہ بھگو دی۔"

"ایک شرط پر۔" شفیق نے کہا۔

"شرط کیسی جی؟"

"چائے بنا کر پلاؤ مجھے۔ ورنہ میں سچ مچ بیمار ہو جاؤں گا۔"

"چائے کا سامان نہیں ہے میرے کوارٹر میں۔ پکوڑے کھاؤ گے؟"

"اوہ پکوڑے... اس موسم میں ضرور کھاؤں گا۔"

"آؤ..." اس نے کہا اور شفیق کے دل میں پنکھے لگ گئے۔ اس کے قدم زمین پر نہیں پڑ رہے تھے۔ وہ اسے اپنے کوارٹر میں لے آئی۔ تنہا تھی، بھیگی ہوئی تھی۔ غضب ڈھا رہی تھی۔ ایک کمرے کا کوارٹر تھا سامنے دالان اور پھر صحن۔ دالان میں چولہا تھا جس پر کڑاہی چڑھی ہوئی تھی اور اس میں تیل کھول رہا تھا جس میں بارش کی کوئی بوند جا پڑتی تو ایک شور اُبھرنے لگتا تھا اور پھر ہلکا ہلکا دھواں۔ نزدیک ہی پتیل کے تسلے میں پیاز بلا بیسن گھلا رکھا تھا۔ گویا پکوڑوں کی مکمل تیاریاں تھیں۔

"زیادہ نہیں تھا چٹنی کے لئے، وہ لینے گئی تھی۔ بھیگ گئی

ساری کی ساری اور وہ بھی تمھاری وجہ سے۔ خود بھی بھیگ گئے پوری بھی بھگو دی۔ اب ضرور بیمار پڑ جاؤ گے دیکھ لینا۔"

"بھیگ تو تم بھی گئی ہو۔" شفیق لرزتی آواز میں بولا۔

"ارے ہماری اور بات ہے۔ ہمارا کچھ نہ بگڑے گا۔ تم مالک لوگ کمزور ہوتے ہو۔"

"میں تو مہمان ہوں یہاں، مالک کہاں سے ہو گیا؟"

"مالک کے مہمان ہو نا۔ مالک ہی ہوئے۔"

"کیا نام ہے تمھارا؟"

"چھیمو۔"

"میرا نام شفیق ہے۔"

"جانتے ہیں۔" وہ چولھے کے پاس بیٹھ گئی۔ شفیق تھوڑے فاصلے پر پڑی چارپائی پر بیٹھ گیا تھا۔

"ادہو۔ وہ کیسے؟" اس نے پوچھا۔

"بس کیسے ہی معلوم ہو، معلوم ہے۔" اس نے ہنس کے پکوڑے کڑاہی میں ڈالتے ہوئے کہا۔ پھر ہنس کر بولی۔ "نزہت اور صوفیہ بی بی کو پکوڑے بہت پسند ہیں مگر بڑی بیگم صاحبہ کسی کو ایسی چیزیں نہیں کھانے دیتیں۔ اس لئے میری شامت آتی ہے۔ چھپ کر پکا رہی ہوں۔ چھپا کر لے جاؤں گی اندر۔"

"تم اس کوارٹر میں تنہا رہتی ہو؟"

"کیوں بھیڑیے کھا جائیں گے مجھے؟"

"نہیں۔ میرا مطلب تھا۔"

"ماما کرم دین بھی رہتا ہے میرے ساتھ، پر ہر وقت نہیں۔ اس کا اپنا بھی ایک گھر ہے کبھی یہاں کبھی وہاں۔ گیا ہو تا ہے ورنہ پکوڑے نہیں بنتے۔ لو کھاؤ۔" اس نے گرم پکوڑوں کی ایک پلیٹ بھر کر شفیق کے ہاتھ میں تھما دی۔ شفیق کی کیفیت عجیب ہوتی جا رہی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کہے، کیا کرے۔ کچھ نہ بن پڑا تو پکوڑے کھانے لگا۔

"چھیمو تمھاری اس اپنائیت نے مجھے بہت متاثر کیا ہے اور سنو میں مالک والک نہیں ہوں مجھے اب شفیق کہا کرو۔"

"اور دُوں؟" چھیمو نے کہا۔

"اوہ۔ نہیں یہ بہت ہیں۔ مگر ایک اجازت دو۔ میں تم سے ملتے رہنا چاہتا ہوں۔"

"پکوڑے بہت اچھے لگے ہیں؟"

"نہیں۔ پکوڑے تو اچھے . . . لیکن تم بہت اچھی ہو۔"

"جلدی کھاؤ۔ مجھے گرم گرم اندر لے جانے ہیں۔ چٹنی بھی پیس لی ابھی۔" وہ بولی۔ آگ کی تپش سے اس کا چہرہ سلگ رہا تھا۔

"تم نے مجھے اجازت نہیں دی چھیمو۔"

"اچھا اچھا۔ مگر منہ اٹھا کر مت گھس آنا۔ ماما کرم دین کو دیکھ لینا، بس اب جلدی کرو مجھے ڈر لگنے لگا ہے۔"

شفیق باہر نکل آیا لیکن اس کے دل میں گدگدیاں ہو رہی تھیں۔ باہر بارش شباب پر تھی۔

رات کو وہ چھیمو کے کوارٹر کے پاس آیا لیکن اندر سے حقے کے تمباکو کی خوشبو اٹھ رہی تھی۔ دوسرے دن چند لمحات کے لئے چھیمو سے ملاقات ہوئی لیکن دور سے توفیق صاحب نظر آ گئے تھے۔ تیسرا دن بھی بس یونہی رہا لیکن چوتھا دن خوش بختی کا دن تھا۔ اس دوران میں شفیق کرم دین پر بھی ڈورے ڈالتا رہا تھا۔ بڑا گھاگ بڈھا تھا۔ شفیق کو ہوشیار ہونا پڑا۔ پھر اس نے کرم دین کو سائیکل پر کہیں جاتے دیکھا اور وہ چھیمو کو تلاش کرنے لگا۔ چھیمو کوٹھی میں ہی مل گئی تھی۔

"یہ تمھاری دوستی ہے چھیمو؟" اس نے شکایتی لہجے میں کہا۔

"ارے ارے۔ پچھلے کمرے میں بیگم صاحبہ موجود ہیں۔"

"مجھے تو تم سے ملنے کا موقع ہی نہیں ملتا۔"

"تو میں کیا کروں؟"

"وہ کرم دین چچا۔"

"آج تو وہ گئے ہوئے ہیں۔ چھٹی لے گئے ہیں۔ اوہ بیگم صاحبہ آواز دے رہی ہیں۔" وہ جھپاک سے باہر نکل گئی لیکن شفیق کے کانوں میں رس گھل گیا تھا۔ یہ دعوت تھی۔ کھلی دعوت۔ آج تو وہ گئے ہوئے ہیں۔ گویا . . . گویا۔ اس کا دل خوشی سے ناچ اٹھا۔ یہ اس کی ذاتی کوشش تھی۔ اس کے لئے اس نے توفیق صاحب کا سہارا نہیں لیا تھا۔ ہونہہ۔ یہ اباجی مجھے بالکل ہی ناکارہ سمجھتے ہیں۔ جیسے میں کچھ کر ہی نہیں سکتا۔

نہ جانے کس طرح وقت گزرا۔ ایک ایک پل طویل ہو گیا تھا۔ بہت سے خیالات اس کے ذہن میں گردش کرتے رہے۔ چھیمو اس گھر کی نوکرانی ہے۔ اس کا عشق کوئی پھل تو نہیں دے سکتا لیکن وقت گزاری کے لئے کیا بری ہے۔ جب تک اباجی نزہت یا صوفیہ کی طرف اشارہ نہیں کرتے، وہی ٹھیک ہے۔ کچھ نہ کچھ تو جاری رہنا چاہیئے۔

رات ہو گئی۔ اس سے ٹھیک سے کھانا بھی نہیں کھایا گیا تھا۔ اس کی دلی خواہش تھی کہ جلد سے جلد پوری کوٹھی تاریکی میں ڈوب جائے۔ سب لوگ سو جائیں لیکن اس رات حویلی والوں کو بھی نیند نہیں آ رہی تھی۔ توفیق صاحب شاہدہ بیگم سے نہ جانے کیا گفتگو کر رہے تھے۔

اور یہ رفیق نہ جانے کہاں مر گیا تھا۔

نشاط آج شاید اس ڈرامے کا ڈراپ سین کرنے پر تلی ہوئی تھی۔ اس سلسلے میں میٹنگوں پر میٹنگیں ہو رہی تھیں۔ صوفیہ اور نزہت بزدل تھیں۔ کسی بھی سلسلے میں نشاط کا بھرپور ساتھ نہیں دے سکی تھیں۔ نشاط بے چاری تنہا ہی سب کچھ کر رہی تھی۔ ہاں چھیمو اسے کام کی لڑکی مل گئی تھی۔ وہ بڑی بے خوفی اور کامیابی سے اپنا فرض انجام دے رہی تھی۔ ایک ایک لمحے کی رپورٹ نشاط کو مل رہی تھی۔ اور نشاط اس کی کارکردگی سے مطمئن تھی۔ اس وقت بھی تینوں ایک تاریک کمرے میں بیٹھی کھسر پھسر کر رہی تھیں۔ صوفیہ اور نزہت کے رنگ فق تھے۔ نزہت کہنے لگی۔

"نشاط کہیں کوئی حادثہ نہ ہو جائے۔ اچھی طرح سوچ لو۔"

"میں تو تمہاری اس بزدلی سے پریشان ہو گئی ہوں۔ اباجان شیر کے شکاری تھے اور بیٹیاں اتنی بزدل۔ میں کہتی ہوں، کیا حادثہ ہو سکتا ہے۔ کوئی قتل ہو جائے گا کیا، گولیاں چلیں گی؟"

"ہم بدنام ہو جائیں گے۔ نوکروں کو بات پتہ چلے گی۔ چھیمو کا مسئلہ دوسرا ہے۔ وہ بے چاری نوکرانی ہے اور ہم لوگ اسے سنبھال لیں گے لیکن امی کا مسئلہ۔۔۔؟"

"بس بس۔ تم انہی خدشات میں پھنسی رہنا زندگی بھر اور کوئی کام کی بات نہ کر پانا۔ میں ان لوگوں سے کس طرح نجات حاصل کرنا چاہتی ہوں کہ پھر ان کا سایہ بھی نہ پڑ سکے اس گھر پر۔ دوسری شکل میں تو کوئی امکان بھی رہے گا لیکن اس کے بعد جناب خالو جان اور خالہ جان ایسے بھاگتے اڑیں گے کہ دیکھنے والے دیکھتے رہ جائیں گے۔"

"میری تو بری حالت ہے۔" صوفیہ بولی۔

"تم آرام سے اپنے کمروں میں گھس کر سو جاؤ، میں تم سے کیا کہہ رہی ہوں۔"

"لیکن نشاط تمہیں یقین ہے کہ رفیق رات کو نشہ کرتا ہے؟"

"جی نہیں، بکواس کر رہی ہوں۔ ارے میں نے دس بار دیکھا ہے۔ ۔۔۔ بلاناغہ نشے میں ہوتا ہے کمبخت ۔۔۔ ۔۔۔ نیند نہیں آتی صاحبزادے کو اس کے بغیر۔ ماں باپ معصوم سمجھتے ہیں۔ ابھی تو بچے کے دودھ کے دانت بھی نہیں ٹوٹے۔" نشاط دانت نکوس کر بولی۔

"نشے میں تو کبھی نہیں دیکھا۔" نزہت بولی۔

"آج دیکھ لینا۔ میں نے زبردست انتظام کیا ہے اور پھر وہ کمبخت نشے کے بعد نظر ہی کہاں آتا ہے سو جاتا ہے اس کے بعد۔"

"تجھے یہ سب کیسے معلوم ہوا؟"

"تمہاری طرح گھر کی بو بو نہیں ہوں۔ ہوسٹل میں رہتی ہوں، ایک سے ایک شاطر لڑکی کے ساتھ۔ تمہیں کیا معلوم یہ لڑکیاں کیا کیا باتیں کرتی رہتی ہیں۔"

"خدا تمہیں نیکی دے نشاط! میرا تو دل ہول رہا ہے۔" نزہت نے دل پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

"تو پھر قبول کیوں نہ کر لئے عقیدت کے پھول۔ ٹھکرا کیوں دیا انہیں، کوئی دقت نہ ہوتی۔ خالو میاں کوئی نہ کوئی جال پھینک کر امی کو بھی رام کر ہی لیتے اور خیر سے تمہارے ہاتھ پیلے ہو جاتے۔ شوہر کو جام بھر بھر کر پلایا کرتیں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ مجھے تم جیسی لڑکیوں پر سخت غصہ آتا ہے نزہت بس اب زیادہ میرا دماغ خراب مت کرو۔ مجھے بہت کام کرنا ہے۔" وہ اپنی جگہ سے اٹھ گئی۔

رات خوب گہری ہو گئی تھی۔ گھر کے لوگ تقریباً سو گئے تھے ویسے آج خاص طور سے خاصی دیر تک جاگا گیا تھا۔ بات کچھ نہیں تھی بس باتیں ہوتی رہی تھیں اور خواب گاہوں کا رخ دیر میں کیا گیا تھا۔

رفیق اور شفیق ایک ہی کمرے میں سوتے تھے۔ دونوں بھائی ایک دوسرے کے رازدار تھے اور دونوں کی برائیاں ایک دوسرے کے علم میں تھیں۔ نشاط نے بڑی ذہانت سے آج کا پروگرام ترتیب دیا تھا۔ اسے علم تھا کہ آج شفیق بھی کمرے میں نہیں ہوگا۔

بہرحال وہ دبے قدموں رفیق کی خواب گاہ پر پہنچ گئی۔ اس نے آہستہ آہستہ دروازے پر دستک دی۔ رفیق کے کمرے کی روشنی ابھی ابھی بجھی تھی لیکن دوسرے لمحے وہ دوبارہ جل گئی اور کچھ سرسراہٹیں ابھری تھیں۔ پھر رفیق کی آواز آئی۔

"کون ہے۔ ابھی سے آ گئے۔ کام نہیں بنا کیا؟" اور پھر اس نے دروازہ کھول دیا۔ کام تو بن گیا تھا۔

"ارے۔ نشاط۔۔۔ تم۔۔۔؟" رفیق نے اسے پہچان لیا۔

"۔۔۔ کیا کر رہے ہو؟"

"اوہ۔ اوہ۔ کچھ نہیں۔ سونے کی۔۔۔" رفیق نے رک کر آنکھیں پھاڑیں۔ "سونے کی تیاری کر رہا تھا۔"

"مجھے نیند نہیں آ رہی۔"

"آؤ۔۔۔ پھر۔۔۔؟" رفیق بہکے بہکے لہجے میں بولا۔ نشاط کی باتوں کی تصدیق ہو رہی تھی۔ وہ نشے میں مدہوش تھا۔

"آؤ نا۔ میں امی کے کمرے میں تمہارا انتظار کر رہی ہوں۔" نشاط

سرگوشی کے انداز میں بولی۔

"اوہ نشاط ۔۔۔۔ یہیں آجاؤ نا۔ شفیق یہاں نہیں ہے۔ آجاؤ"، رفیق کی آواز لرزنے لگی۔

"نہیں ہے تو آجائے گا۔ میں چلتی ہوں۔ تم بتی وغیرہ بجھا کر امی کے کمرے میں آجاؤ"،

"امی کے کمرے میں کیا ؤں۔ تمہارے کمرے میں کیا ؤں نہیں؟"

"اوہ بحث مت کرو۔ امی میرے کمرے میں ہیں اور میں اُن کے کمرے میں سو رہی ہوں۔ کیوں یہ بعد میں بتا دوں گی"۔

"ہو کے۔۔۔ ہو کے۔۔ زندہ باد۔۔ ابھی۔ بس ابھی آیا" رفیق نے بہکے ہوئے لہجے میں کہا۔ اور نشاط جلدی سے واپس پلٹ پڑی۔ اس نے واپسی میں مہرالنسا بیگم کے کمرے کا دروازہ آہستہ سے دھکیل کر دیکھا۔ دروازہ حسب معمول اندر سے بند نہیں تھا۔ نشاط نے پرسکون انداز میں گردن ہلائی اور پھر دوڑتی ہوئی نزہت کے کمرے میں گھس گئی۔ جو مہرالنسا بیگم کے کمرے کے قریب تھا۔

دونوں لڑکیاں اندر سے لرز رہی تھیں، اُن کے منہ سے آواز ہی نہیں نکل رہی تھی۔ "خدا تم لوگوں سے سمجھے۔ تم نے تو حد کر دی ہے۔ ارے آؤ دیکھیں تو سہی"۔ وہ دروازے کے پاس آگئی اور اس میں تھوڑی سی جھری کر کے باہر دیکھنے لگی۔

"جا رہا ہے۔ خدا کی قسم جا رہا ہے۔ آؤ تو سہی رباجی، نزہت پلیز آؤ مزا کر کرامت کرو"۔ بدقت تمام دونوں لڑکیاں دروازے کے پاس پہنچ گئیں۔

باہر تاریکی میں رفیق کا ہیولا نظر آ رہا تھا۔ امی کا کمرہ سامنے تھا۔ وہ رکا اور دوسرے لمحے دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گیا۔ لڑکیوں کے سانس رُکے جا رہے تھے۔ نشاط البتہ مطمئن تھی۔ ایک ایک لمحہ سنسنی خیز تھا۔ دماغ پھٹے جا رہے تھے۔ پھر جب امی کے کمرے میں ایک ہولناک چیخ گونجی تو صوفیہ بھی بے اختیار چیخ اُٹھی۔ نشاط نے لپک کر صوفیہ کا منہ بھینچ لیا تھا۔

"خدا کی پناہ صوفیہ باجی، کہیں قتل تو نہیں کر دیا امی کو، تاکہ میں بھی خود کو"۔ اس نے بھینچی بھینچی آواز میں کہا۔ امی کے کمرے میں روشنی ہو گئی تھی۔ دوسری چیخ یقیناً رفیق کی تھی۔ پھر دروازہ بھڑاک سے کھلا اور رفیق نے باہر چھلانگ لگائی لیکن چوکھٹ میں الجھ کر اس بری طرح گرا کہ نانی یاد آگئی ہوگی۔

دروازے میں امی نظر آئیں۔ شب خوابی کے لبادے میں ملبوس تھیں۔ "توفیق بھائی۔ توفیق بھائی۔ باہر آئیے۔ شاہدہ باہر آؤ۔ باہر آؤ۔ لوگ۔۔۔" رفیق ایک بار پھر اُٹھ کر اپنے کمرے کی طرف دوڑ پڑا تھا۔

شجاع احمد صاحب کی زندگی میں ایک جھگڑا نہیں تھا۔ دولت کی ہوس تھی کہ بڑھتی جا رہی تھی۔ وہ سارے ملک کی دولت اپنی تجوریوں میں سمیٹ لینا چاہتے تھے۔ اندر کا آدمی کبھی کبھی جاگتا تھا لیکن وہ اس پر حاوی تھے۔ اس کی بات پر انھوں نے کبھی کان نہیں دھرے تھے۔ یہ اندر کا آدمی تو ہمیشہ بہکاتا ہے۔ فضول باتیں کرتا ہے۔ نیکو کاروں کی بہت سی بستیاں آباد ہیں۔ جن میں بھوک، افلاس، بیماریاں پرورش پاتی ہیں۔ نورانی چہرے فاقہ کشی سے زرد نظر آتے ہیں۔ انھیں یہ زرد چہرے ناپسند تھے۔ زردی ہو تو سونے کے انبار کی اور وہ سونے کے انبار لگا رہے تھے۔ ہر جائز اور ناجائز طریقے سے۔ چالاک آدمی تھے۔ ہمیشہ پہلو بچا کر کام کرتے رہے تھے۔ شہر میں ان کی کئی ملیں اور فیکٹریاں کام کر رہی تھیں۔ ان فیکٹریوں میں مختلف چیزوں کی پروڈکشن ہوتی تھی۔ صاف ستھرا مال باہر نکلتا تھا۔ اور بڑی ایمان داری سے صحیح داموں فروخت ہوتا تھا۔ حکومت کو کبھی اُن سے ٹیکس کی شکایت نہیں ہوئی تھی لیکن در پردہ کوئی بھی نہیں جانتا تھا کہ ملک کی مارکیٹ میں شجاع احمد صاحب کا کتنا ناجائز مال پھیلا ہوا ہے۔ اسمگلنگ کے ذریعے جو کچھ باہر سے آتا تھا، وہ ان بڑی بڑی عظیم الشان فیکٹریوں کے نیچے بنے ہوئے تہہ خانوں میں اسٹور ہو جاتا تھا اور ان فیکٹریوں کی طرف کوئی بھی نگاہ اُٹھا کر نہیں دیکھتا تھا چونکہ بڑی اچھی ساکھ تھی ان کی۔ پھر یہ مال بازار میں پھیل جاتا تھا۔ اس طرح کے نظام قائم کر رکھے تھے شجاع احمد صاحب نے اپنے چند دوستوں کی مدد سے کہ کوئی آنچ ان پر نہ آئے۔ بہت ہی چالاکی سے انھوں نے اپنا یہ کاروبار آگے بڑھا رکھا تھا۔ ایک طرف تو حکومت کی نگاہ میں اُن کی شخصیت انتہائی ارفع و اعلیٰ تھی اور وہ ایک انتہائی ایمان دار تاجر گردانے جاتے تھے لیکن تصویر کا دوسرا رُخ بھی تھا۔ جو ابھی تک کسی کو معلوم نہیں ہوا تھا۔ سوائے ان چند افراد کے کہ جو اس سلسلے میں براہ راست ملوث تھے۔ کسی ایک آدمی کے بارے میں شجاع احمد صاحب نے کبھی نہیں سوچا تھا۔ وہ بُرے آدمی ضرور تھے لیکن اُن کی بُرائیوں میں ایک خاص بات تھی۔ وہ قتل و غارت گری اور خونریزی سے پرہیز کرتے تھے۔ وہ اسمگلنگ ضرور کراتے تھے لیکن اُن کے کارکنوں کو ان کی طرف سے ہدایت تھی کہ وہ دہشت گردی اور درندگی نہ کریں۔ اگر کبھی مال پکڑا جائے تو وہ جان بچا کر فرار ہو جائیں۔ پولیس پر ایک بھی فائر نہ کریں۔ یہ ان کی ذہانت کی ایک اور مثال تھی۔

اپنی اولاد کے لئے بہت اچھے باپ تھے۔ بچپن سے حسام احمد صاحب سے ڈرتے تھے اور آج تک یہ خوف قائم تھا۔ مجموعی طور پر وہ کیا تھے۔ اس کا فیصلہ کرنا مشکل تھا۔

آج کل زاہد ان کے ذہن کی خلش بن گیا تھا۔ گھر میں وہ ایک

حلیم الطبع بزرگ کی حیثیت رکھتے تھے۔ بچوں کے معاملات میں مداخلت ضرور کرتے تھے لیکن ایک حد تک تاکہ بچوں کو ناگوار نہ گزرے۔ فضول خرچیوں کی اجازت نہیں دیتے تھے اور جائز ضروریات میں کبھی بخل سے کام نہیں لیتے تھے۔ چنانچہ اس طرح ایک معتدل نظام قائم تھا۔ اس کوٹھی میں لیکن حسام احمد صاحب کا یہ نیا شوق ان کو بہت گراں گزر رہا تھا۔ یہ تو صرف احمقانہ بات تھی۔

فرسٹ ایڈ ہاؤس کے نظریات یقینی طور پر اس سور نے پیش کئے تھے جس کا نام زاہد تھا۔ یہ دشمن کون ہے۔ کیوں اس کوٹھی میں گھسا ہے۔ یہ بات شجاع احمد صاحب کے لئے پریشان کن تھی۔ وہ خوفزدہ تھے اس بات سے کہ کہیں یہ کوئی گورنمنٹ کا آدمی نہ ہو جو ان کی ٹوہ میں ہے لیکن جب گہرائیوں پر نگاہ ڈالتے تو انھیں یہ بات لغو نظر آتی چونکہ گورنمنٹ کے اعلیٰ ترین عہدیداران سے لے کر نچلے درجے تک کے تمام افراد ان سے متاثر تھے اور خود کو ان کا دوست سمجھتے تھے۔ پھر کون سا ایسا محکمہ تھا جس نے اپنا ایک آدمی ان کے بیچ گھسیڑ دیا تھا۔ اگر یہ دشمن کسی انتظامی محکمے سے تعلق نہیں رکھتا تو پھر یہ کوئی جرائم پیشہ آدمی ہو سکتا ہے۔ جو دولت کے حصول کے لئے یہاں آ گھسا ہے۔ ٹرین میں اس کی بے باکی شجاع احمد صاحب کو عجیب لگی تھی لیکن دل ہی دل میں انھوں نے اعتراف بھی کیا تھا کہ عجیب سا نوجوان ہے پر کشش شخصیت کا حامل۔ البتہ انھیں یہ گمان نہیں تھا کہ ٹرین کا یہ ہم سفر کسی طرح ان کی کوٹھی تک پہنچ جائے گا۔

لیکن اس نے یہ مضبوط شاخ پر قدم جمائے تھے یعنی حسام احمد صاحب جب تک وہ زندہ تھے شجاع احمد صاحب کو یقین تھا کہ وہ کبھی اپنی بات ان کی بات سے اونچی نہ کر سکیں گے اور آج وہ اس شخص کے بارے میں بڑی گہرائی سے سوچ رہے تھے۔

زاہد ذوالفقار زیدی... اگر اس شخص کے ذہن میں کوئی خطرناک منصوبہ ہے تو اس سے ہوشیار ہونا ضروری ہے۔ گھر کے لوگ تو ناتجربے کار اور احمق ہیں۔ اباجان تو بوڑھے ہو چکے ہیں۔ اب ان کے سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں تقریباً ختم ہو گئی ہیں۔ پھر یہ شخص کیا چکر چلا رہا ہے۔ گھر کے لوگوں کو مٹھی میں لے کر اس نے کیا جال پھیلا رکھا ہے۔

ایک بار تو ان کا دل چاہا کہ اس کا قصہ ہی پاک کرا دیں۔ اغوا کر کے کسی دوسرے ملک پہنچوا دیں اور ہدایت کر دیں اپنے آدمیوں کو کہ یہ شخص دوبارہ یہاں داخل نہ ہونے پائے لیکن ہمت نہیں پڑتی تھی۔ وہ اس احساس سے ہی خوفزدہ ہونے لگتے تھے

لیکن اب تو یہ زاہد ذوالفقار زیدی بڑھتا ہی چلا جا رہا تھا۔ بات اگر صرف حسام احمد صاحب کی تفریحات تک محدود رہتی تو کوئی حرج نہیں تھا لیکن اس پریس کانفرنس نے شجاع احمد کو کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا تھا۔ یہ شخص آگے دور تک جا سکتا ہے اس بارے میں شجاع احمد صاحب نے کبھی نہیں سوچا تھا۔

فرسٹ ایڈ ہاؤس کی تعمیر کالونی والی زمین پر حسام احمد صاحب کا قبضہ یہ دونوں چیزیں ایسی تھیں جو شجاع احمد کسی طور برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ لاکھوں کیا بلکہ کروڑوں روپیہ خرچ ہوگا اور اس کے بعد خرچ ہوتا ہی رہے گا۔ بھلا ایک ایسا ادارہ جو غریبوں کی اعانت کے لئے بنایا گیا ہو، ذاتی بنیادوں پر کیسے چل سکتا ہے حکومت سے اسے کیا مل جائے گا یا مخیر حضرات اسے کیا دے دیں گے۔ یہ ساری چیزیں تو دکھاوے کی ہوتی ہیں۔ اخبارات میں خبریں اور تصاویر چھپوانے کے لئے اس قسم کے ڈرامے کئے جاتے ہیں۔ حقیقتیں تو کچھ اور ہی ہوتی ہیں اور ان حقیقتوں سے شجاع احمد صاحب جیسے شخص واقف نہ ہوتے تو اور کون ہوتے۔

گھر کے ایک ایک فرد پر زاہد اس طرح چھایا ہوا تھا کہ کوئی اس کے خلاف ایک لفظ سننے پر آمادہ نہیں تھا۔ یہاں تک کہ بیگم شجاع جیسی سنجیدہ خاتون جو بہت کم کسی پہ ایمان لاتی تھیں اس کو بہت زیادہ اہمیت دینے لگی تھیں۔

شجاع احمد صاحب کو ان ساری باتوں کی بہت زیادہ پروا نہ ہوتی لیکن بس یہ احساس انھیں مارے دے رہا تھا کہ کہیں یہ نوجوان کوئی بہت گہری چال نہ چل رہا ہو۔ کافی دیر تک وہ سوچتے رہے پھر انھوں نے اس سلسلے میں حسام احمد صاحب سے ہی بات کرنا مناسب سمجھی اور وہاں سے اٹھ کر ان کے پاس پہنچ گئے۔

اتفاق ہی کی بات تھی کہ زاہد ذوالفقار اس وقت... حسام احمد صاحب کے پاس موجود نہیں تھا اور کہیں گیا ہوا تھا چنانچہ... حسام احمد صاحب انھیں تنہا مل گئے۔

"ابامیاں کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں"۔

"ہاں کہو۔ آؤ..." حسام احمد نے نرم لہجے میں کہا۔

"ابامیاں آپ نے بڑی محنت سے یہ گھر تعمیر کیا ہے بڑی مشقت کی گئی ہے اس کی بنیادوں میں، آپ ہی کی وجہ سے آج ہمارے باغ میں پھول ہی پھول نظر آ رہے ہیں۔ میں اس بات کا معترف ہوں ابامیاں کہ آپ نے ہمیشہ مجھے ذہانت کے راستے دکھائے اور آپ ہی کے بتائے ہوئے راستوں پر چل کر آج میں اس مقام تک پہنچا ہوں لیکن ابامیاں کیا آپ اس بات کو

تسلیم نہیں کرتے کہ گزرنے والا ہر لمحہ گزرے ہوئے لمحے سے زیادہ ذہانت کا حامل ہوتا ہے۔ وقت انسان کو بہت سے تجربات دیتا ہے اور عمر ان تجربات کے لئے محدود ہوتی ہے۔"

"دیکھو بھائی میں جاہل قسم کا آدمی ہوں۔ مجھ سے فلسفے کی زبان مت بول، جو کہنا ہے صاف صاف کہہ۔" حسام احمد صاحب پھکڑ انداز میں بولے اور شجاع احمد صاحب جلدی سے سنبھل گئے۔ یہ زبان حسام احمد صاحب کے غصے کا احساس دلاتی ہے چنانچہ انھوں نے نرم لہجے میں کہا۔

"ابا میاں میں کالونی والی زمین کی بات کر رہا ہوں۔ اتنی قیمتی زمین ہے وہ اور اتنا بڑا پروجیکٹ ہے وہ میرا کہ میں آپ کو بتا نہیں سکتا۔"

"پھر وہیں آ گئے تم... آخر کیا مصیبت آ جائے گی تم پر اگر میں اس زمین کو استعمال کروں تو...؟"

"او ہو نہیں ابا جان میرا یہ مقصد نہیں ہے۔ آپ تو میرا جو کچھ موجود ہے وہ سب استعمال کر ڈالیں تب بھی میری پیشانی پر شکن نہیں آئے گی۔ آخر یہ ہے کس کا دیا ہوا۔ میں صرف یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ اگر آپ پسند کریں تو میں کوئی دوسری جگہ اس کام کے لئے مختص کر دوں۔"

"ہاں ہاں کر دو... کر دو، شہر سے تقریباً دو سو میل پرے۔ وہاں، جہاں چڑیا کا بچہ بھی پر نہ مار سکے۔ تم کوئی جگہ جلد حوالے کر دو۔ ہم وہاں فرسٹ ایڈ ہاؤس بنا لیں گے لیکن وہاں تک پہنچنے والوں کے لئے شہر ہی سے طبی امداد فراہم کرنا ہوگی۔ کیا خیال ہے تمھارا...؟"

"نہیں نہیں ابا میاں اتنی دور نہیں۔ بس یہیں کہیں مناسب جگہ، آپ اس کے لئے مجھے موقع تو دیں۔"

"دیکھو بھائی جو کچھ فیصلہ میں کر چکا ہوں۔ اس پر میں اٹل ہوں۔ اس کے علاوہ اور کوئی بات کرنا ہو تو حاضر ہوں۔"

"آخر آپ اس احمقانہ کام کو کر کے کیا حاصل کر لیں گے ابا میاں؟"

"کیا مطلب؟ ہوش درست ہیں تمھارے؟" حسام احمد غرائے۔

"ن... نہیں میرا مطلب ہے ابا میاں، آپ کو یہ تمام راستے [illegible] نے دکھائے ہیں نا؟ ابا میاں ایک بار پھر میں آپ سے درخواست کروں گا کہ اس شخص پر نظر ثانی کر لیں۔"

"[illegible]...؟"

"[illegible] کی بات کر رہا ہوں۔"

"[illegible] مجھے نظر ثانی کرنی پڑی بیٹا تو اس سے پہلے میں تم پر نظر ثانی کرنا پسند کروں گا اور میں یہ غور کروں گا کہ میری تربیت میں کہاں خامی رہ گئی تھی جو تمھارے اندر یہ فطرت پیدا ہو گئی۔"

شجاع احمد صاحب ایک لمحے کے لئے جھلا گئے لیکن باپ کے سامنے تھے، جانتے تھے کہ آج بھی حسام احمد صاحب کے بدن میں رتی جان ہے اور آج بھی انھیں اپنے ذہن پر قابو پانا اسی طرح مشکل ہوگا جس طرح شجاع احمد صاحب کے بچپن میں، جو تو اٹھ نہیں گے او... پل پڑیں گے اور اس کے بعد تماشہ دیکھنے کے قابل ہوگا۔ آج میرے لئے خود کو سنبھال کر بولے۔

"بڑا سرمایہ خرچ ہوگا ابا میاں آپ کا ہو یا میرا، بہرصورت سکہ الگ الگ تو نہیں ہے۔ آپ کو اس سے ملے گا کیا۔ چند روز کے بعد پریشان ہو جائیں گے۔ سارے بھوکے ننگے آپ کو گھیر لیں گے۔ آپ اس قوم کے بارے میں نہیں جانتے۔ محنت کرنے کی بجائے یہ ہاتھ پھیلانا پسند کرتی ہے۔ شہر میں لاکھوں ایسے ملنا آپ کو دیکھنے کو ملیں گے کہ ہٹے کٹے تندرست لوگ کسی بھی ہوٹل کے سامنے کھڑے ہوں گے یا بیٹھے ہوں گے کہ کوئی آئے اور انھیں محتاج سمجھ کر کھانا کھلا دے۔ یہ ہے فطرت ہماری اس قوم کی ابا میاں لوگ کام کی بجائے آپ کے اس فرسٹ ایڈ ہاؤس کو گھیر لیں گے۔ آپ کی زندگی عذاب ہو جائے گی۔"

"ٹھیک ہے بھائی میں انھی بھوکے ننگوں کے درمیان زندہ رہنا چاہتا ہوں۔ اس کے علاوہ اگر میں تمھاری کوئی خدمت کر سکتا ہوں تو حاضر ہوں۔ فرسٹ ایڈ ہاؤس اس کالونی والی زمین پر تعمیر ہوگا۔ اس میں تم کوئی رخنہ مت ڈالو بلکہ میں چاہتا ہوں کہ تم اپنے وسائل سے کام لے کر یہ نقشہ جلد از جلد پاس کرا دو اور ہاں ایک بات سن لو، اگر یہ بھی اندازہ ہو گیا مجھے کہ تم اس کے مخالف ہو۔ نقشہ پاس کرانے کے سلسلے میں تم تساہل ہی سے کام نہیں لو گے بلکہ اس کی مخالفت بھی کرو گے۔ تو سنو میرے بیٹے، میرے بچے یہ نقشہ جلد ہی پاس ہو جانا چاہئے، ہر قیمت پر۔ میں جانتا ہوں کہ اس قسم کے کاموں میں کوئی پیچ نہیں ہوتی اور اگر ہوتی بھی ہے تو تم جیسے لوگ اسے دور کر لیتے ہیں سمجھے۔ نقشہ پاس کرا کے اسے جلد سے جلد میرے حوالے کر دو۔ میں نقشہ بنانے کے لئے دے چکا ہوں۔" حسام احمد نے ٹھوس لہجے میں کہا۔

"جی ابا میاں۔" شجاع احمد صاحب ڈوبتے ہوئے دل کے ساتھ بولے۔ اب کوئی ترکیب نہیں رہ گئی تھی سوائے اس کے کہ اس کڑوے گھونٹ کو پی لیا جائے لیکن یہ کڑوا گھونٹ اگر یہیں تک محدود رہتا تو ٹھیک تھا لیکن زاہد ذوالفقار زیدی بجانے اور

لیا کیا سوچ رہا تھا۔ وہ بس اسی کے لئے پریشان تھے۔ آپا میاں کے پاس سے بالکل ناکام اور مایوس ہو کر اُٹھے تھے اور اب ان کے پاس ٹہلنے اور کوئی ذریعہ نہیں تھا۔

مہرالنساء بیگم کی آواز میں ایک ایسی خونخوار گرج تھی کہ اس سے قبل لڑکیوں نے کبھی نہیں سُنی تھی۔ صوفیہ نے جھک کر باہر نکلنے کی کوشش کی تو نشاط نے اس کی کمر میں ہاتھ ڈال کر اسے روک لیا۔

"ارے ارے کیا کر رہی ہیں صوفیہ باجی! ابھی نہیں! ابھی نہیں! ذرا ماما آگے بڑھنے دیجئے۔" وہ بدستور سرگوشی کے انداز میں بولی اور صوفیہ رُک گئی۔ اس کا بدن بدستور ہولے ہولے کانپ رہا تھا۔ بمشکل تمام اس نے کہا۔

"نشاط کی بچی تو تو بڑی عجیب ہے۔"

"بس بس آپ خاموش رہیں تو بہتر ہے، میری بہن ہو کر اتنی بزدلی۔ کمال کی بات ہے۔ ارے مزے سے بیٹھئے۔ اس ڈرامے کو دیکھئے تو سہی میں نے کیا کر دکھایا ہے۔ وہ کام کیا ہے میں نے جو سکندر اعظم نے بھی نہ کیا ہوگا۔" نشاط کی باچھیں کھلی پڑ رہی تھیں۔ وہ اپنے اس کارنامے پر بے حد خوش تھی اور باہر توفیق صاحب اور شاہدہ بیگم حیران و پریشان مہرالنساء بیگم کے سامنے پہنچ گئے تھے۔

"کیا ہوا... کیا ہوا؟ بات کیا ہے؟" توفیق صاحب گھبرائے ہوئے لہجے میں کہہ رہے تھے۔ "کوئی چور گھس آیا ہے کیا؟ کیا ہوگیا؟"

"جو کچھ ہوگیا ہے توفیق بھائی آیئے ذرا اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں آئیے میرے ساتھ..." مہرالنساء بیگم نے توفیق صاحب کا بازو پکڑ کر انہیں آگے دھکیلتے ہوئے کہا اور توفیق صاحب سٹک گئے۔ بازو پر جو گرفت تھی اس سے انہوں نے اندازہ لگا لیا کہ یہ گرفت دوستانہ نہیں ہے۔ کوئی خاص ہی بات ہوگئی ہے۔ مہرالنساء انہیں گھسیٹتی ہوئی رفیق کے کمرے میں لے گئیں۔ دروازے پر لات ماری۔ دروازہ کھلا ہوا تھا۔ بے چارہ رفیق دروازہ اندر سے بند بھی نہیں کر سکا تھا۔

مہرالنساء بیگم نے توفیق صاحب کو کمرے میں دھکیل دیا اور خود بھی ان کے پیچھے کمرے میں داخل ہوگئیں پھر انہوں نے دیوار پر لگا ہوا سوئچ دبا دیا۔

رفیق مسہری کے نیچے گھسنے کی کوشش کر رہا تھا۔ مہرالنساء بیگم نے انتہائی تلخ آواز میں کہا۔

"نکالئے اسے، نکالئے باہر نکالئے، میں کہتی ہوں۔ اسے فوراً باہر نکالیے۔" انہوں نے غراتی ہوئی آواز میں کہا اور توفیق صاحب پھٹی پھٹی نگاہوں سے رفیق کو دیکھنے لگے۔ پھر سنبھل کر بولے۔

"ابے کیا کر رہا ہے وہاں، باہر نکل... نکل باہر۔" وہ دھاڑ کر بولے۔ رفیق مسہری کے نیچے گھس گیا تھا لیکن اس کی دونوں ٹانگیں باہر ہی تھیں۔ توفیق صاحب کو اور کچھ نہ سوجھا تو انہوں نے اس کی دونوں ٹانگیں پکڑ کر اسے باہر کھینچ لیا۔ رفیق تھر تھر کانپ رہا تھا۔

"کھڑا ہو جا۔ میں کہتا ہوں کھڑا ہو جا۔ کیا کیا ہے تو نے، کیا کیا ہے؟"

"میں بتاتی ہوں کہ کیا کیا ہے اس نے۔ آپ کو شراب کی تمیز تو ہوگی توفیق صاحب پہلے ذرا اس کا منہ سونگھئے۔"

"ایں، اوہ، آخ تھو۔" توفیق صاحب حیرت سے اُچھل پڑے۔ پھر انہوں نے رفیق کا گریبان پکڑ کر اسے اپنی طرف گھسیٹا اور اس کا منہ سونگھنے لگے۔ دوسرے لمحے انہوں نے گریبان چھوڑ کر منہ پیچھے ہٹا لیا تھا۔

"تت تُو نے... تُو نے... نشہ کیا ہے؟" انہوں نے سخت غصیلے لہجے میں پوچھا۔

"نن نہیں ابا۔ قسم لے لو۔ قسم لے لو ابا میں نے... مم میں نے... نہیں ابا..."

"ہوں، قسم تو میں ابھی تجھ سے لوں گا۔"

"یہ شفیق کہاں مر گیا؟ میں کہتا ہوں شفیق او شفیق..." لیکن شفیق کمرے میں ہوتا تو بولتا۔ وہ تو کمرے میں موجود ہی نہیں تھا۔ توفیق صاحب چاروں طرف دیکھنے لگے: "شفیق کہاں ہے؟" انہوں نے غراتے ہوئے لہجے میں رفیق سے پوچھا۔

"وہ... وہ... پتہ نہیں ابا۔ تم مجھے اللہ قسم مجھے نہیں معلوم۔" رفیق نے جھوٹ بولا۔ شاید یہ بھائی کو بچانے کی کوئی کوشش تھی۔

لیکن ابھی یہ بات چیت ہو ہی رہی تھی کہ کوٹھی کے بیرونی حصے سے شور و غل کی آوازیں سنائی دیں۔ اچھی خاصی زور دار آوازیں تھیں۔ سب ہی چونک پڑے۔ خود مہرالنساء بیگم بھی... انہوں نے ادھر اُدھر دیکھا اور پھر آگے بڑھ کر کوٹھی کے صدر دروازے کی جانب چل پڑیں۔ ان آوازوں نے انہیں ایک لمحے کے لئے اپنے اوپر گزرنے ہوئے واقعات سے غافل کر دیا تھا۔ وہ صدر دروازہ کھول کر باہر نکلیں اور اب لڑکیوں نے اپنے کمروں میں گھسے رہنا مناسب نہیں سمجھا۔ نشاط نے صوفیہ اور نزہت کو اشارہ کیا تو وہ تینوں باہر نکل آئیں... توفیق صاحب، رفیق، شاہدہ بیگم ہکا بکا کھڑے ہوئے تھے۔ توفیق صاحب بھی رفیق کے کمرے سے نکل آئے تھے پھر وہ صورت حال جاننے کے لئے

مہرالنساء بیگم کے پیچھے چل پڑے۔

شور و غل کی آوازیں ملازموں کے کوارٹروں کی طرف سے آرہی تھیں اور زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ دو تین ملازم شفیق کو پکڑ کر گھسیٹتے ہوئے صدر دروازے کے پاس پہنچ گئے۔ صدر دروازے پر پیلے رنگ کا ایک بلب لگا ہوا تھا۔ اس کی روشنی میں بیگم مہرالنساء سامنے گھور رہی تھی۔

سب سے آگے چھیمو روتی پیٹتی بین کرتی آرہی تھی۔

"ہائے سرکار' بچ گئے ہم تو۔۔۔ ورنہ عزت لٹ گئی تھی ہماری سرکار ہم غریب لوگ محنت کرتے ہیں' عزت نہیں بیچتے۔ اگر یہی کام ہمیں کرنا ہوتا سرکار تو ہم بازاروں میں جاکر بیٹھتے' سرکار دہائی ہے دہائی۔"

مہرالنساء بیگم کا پورا بدن غصے سے تھر تھر کانپ رہا تھا۔ شفیق کو دیکھ کر ان کی آنکھوں میں خون اتر آیا تھا۔ وہ آگے بڑھیں اور انھوں نے چھیمو کے بازو پر ہاتھ رکھ دیا۔

"کیا ہوا چھیمو' کیا ہوا؟"

"سرکار عزت لوٹنے گھسا تھا یہ ہماری۔ وہ تو سرکار اللہ نے بچالیا ہم کو' لیکن سرکار ایسی جگہ ہم کیسے رہ سکتے ہیں آپ خود سوچیں سرکار ہماری عزت اتنی سستی تو نہیں ہوتی" چھیمو آنسو بہاتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ پھر ایک اور ملازم نے آگے بڑھ کر کہا۔

"یہ سب کیا ہو رہا ہے سرکار' اس حویلی کی تو شان ہی نرالی تھی۔ یہاں یہ سب کچھ کیا ہونے لگا۔ بڑے سرکار کے مرتے ہی یہ سب کیا ہوگیا۔ بتائیے سرکار ہم کیا سوچیں اس بارے میں۔ ہم کیا سوچیں' مگر یہی سب کچھ ہونا ہے ہمارے ساتھ تو ہمیں اجازت دیں کہ ہم یہاں سے اپنی عزتیں بچا کر باہر نکل جائیں۔"

مہرالنساء بیگم سے کوئی جواب نہ بن پڑا۔ توفیق صاحب کے بدن کا تمام لہو جیسے خشک ہوگیا تھا اور شاہدہ بیگم ایک دیوار کا سہارا لئے کھڑی تھیں۔ ان کے پیچھے صوفیہ' نزہت اور نشاط خاموش کھڑی تھیں۔ اب اس سلسلے میں استفسار کرنے کی ضرورت باقی نہیں رہ گئی تھی جو کچھ ہوچکا تھا' سب کے سامنے تھا۔

شفیق ابھی تک ملازموں کی گرفت میں تھا اور کسی بھیگے ہوئے چوہے کی مانند نظر آرہا تھا۔ ملازموں نے شاید اس کی خاصی خاطر تواضع کر دی تھی۔ چہرے پر خراشیں اور جا بجا نیلے دھبے نظر آرہے تھے۔

مہرالنساء بیگم نے چھیمو کا بازو پکڑا اور اسے لئے ہوئے اندر کی سمت چل پڑیں۔ نشاط' صوفیہ اور نگہت بھی ان کے پیچھے چل پڑی تھیں۔ پھر مہرالنساء بیگم' چھیمو کو اپنے کمرے میں لے آئیں اور اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولیں۔

"نہیں بیٹے روتے نہیں ہیں۔ خدا نے تمھیں بچا دیا نا؟"

"جی بڑی سرکار' اللہ نے ہماری عزت بچالی۔ پر بڑی سرکار اب تو ہم دشمنوں کے بیچ آگئے ہیں۔"

"نہیں ہرگز نہیں۔ تم بھروسہ رکھو۔ جو کچھ ہوچکا ہے۔ آئندہ کبھی نہیں ہوگا' کبھی بھی نہیں اور اگر ایسا ہوا تو میں خودکشی کرلوں گی میرے بعد تم لوگ یہاں سے چلے جانا' جہاں دل چاہے چلے جانا لیکن اس وقت یہ حویلی کی عزت ہے' سمجھیں۔ زبان بند رکھنا ہوگی۔" مہرالنساء بیگم نے کہا۔

"جی بڑی سرکار' آپ بے فکر رہیئے۔ آپ کے لئے تو ہم اپنی زبان کاٹ کر پھینک سکتے ہیں۔"

"کسی سے نہیں کہوگی تم اس واقعہ کو چھیمو' کوئی بھی کسی سے نہیں کہے گا۔ میں آج ہی سے کوشش کروں گی کہ حویلی کی عزت برقرار رہے۔ جو کچھ ہوا ہے میری غفلت اور لاپرواہی کی وجہ سے ہوا ہے۔ مجھے افسوس ہے۔ مجھے افسوس ہے۔" مہرالنساء بیگم کی آواز مدھم پڑ گئی اور چھیمو کے آنسو خشک ہوگئے۔ اس نے گردن جھکالی تھی۔

***

بہت کم وقت ایسے ہوتے تھے جب شجاع احمد صاحب کو باہر کے کاموں سے فرصت ہو اور وہ گھر میں وقت گزاریں۔ گھر والے ان کی غیرحاضری کے عادی ہوگئے تھے اور اب گھر میں کوئی تقریب ہو یا کوئی بھی ایسی تقریب جس میں سارا گھر حصہ لے رہا ہو' شجاع احمد صاحب کی کمی کو محسوس نہیں کیا جاتا تھا۔ خود بیگم شجاع احمد بارہا اس سلسلے میں شجاع احمد سے شکائتیں کرچکی تھیں لیکن وہ اپنی مصروفیات کا بہانہ کر دیتے تھے۔ چنانچہ وہ بھی اب اس کی عادی نہیں رہی تھیں۔ جن دنوں شجاع احمد گھر میں رہتے' ان سب کو حیرت ہوتی تھی بلکہ اگر یہ کہا جائے تو غلط نہیں ہوگا کہ الجھن سی محسوس کرتے تھے سب کے سب۔ حالانکہ بیٹے اور بیٹیاں باپ سے محبت کرتے تھے لیکن بس ایک عادت بن چکی تھی ان کی۔

ان دنوں شجاع احمد گھر پر وقت گزار رہے تھے۔ شاید کوئی مصروفیات نہیں تھی ان کی یا پھر تھک گئے تھے اور آرام کرنا چاہتے تھے۔ پھر کوئی تیسری بات' جو ان کے ذہن کی گہرائیوں میں ہی پوشیدہ ہوسکتی تھی یہ ہوگی کہ اس دوران وہ زاہد ذوالفقار کی نگرانی کر رہے تھے۔ وہ اس شخص کو قریب سے دیکھنا چاہتے تھے اور اس بات کو معلوم کرنے کے خواہش مند تھے کہ اس کی آمد

کی وجہ کیا ہے یا اس کی مقبولیت کا کیا راز ہے۔ اکثر وہ کوٹھی کے مختلف حصوں میں نکل جاتے تھے۔

اس وقت بھی وہ ٹہلتے ہوئے اوپری منزل پر اس جگہ آ گئے۔ جہاں قدسیہ نے اپنا نگارخانہ بنایا ہوا تھا۔

نگارخانے کا وسیع و عریض ہال گوناں گوں تصویروں سے سجا ہوا تھا لیکن یہ تصویریں ایسی تھیں جنھیں دیکھ کر شجاع احمد صاحب سر پیٹنے کے علاوہ اور کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ بڑے بڑے مصوروں کی تجریدی پینٹنگز جو دیواروں پر آویزاں تھیں۔ یہ تجرید آرٹ کسی دوسروں کی طرح اُن کی سمجھ میں بھی نہیں آتی تھی لیکن جدید رجحان اسی سمت تھا۔ ایک دوبار اُنھیں ایسی نمائشوں میں مدعو کیا گیا تھا جو کسی بڑے مصور کی تصویروں کی تھیں اور وہاں شجاع احمد بھی سوچتے رہ جاتے تھے کہ آرٹ گیلری میں لگی ان تصویروں کا مقصد کیا ہے۔ ایک دوبار انھیں اس سلسلے میں مہمانِ خصوصی بنانے کی پیش کش کی گئی تو اُنھوں نے صاف گوئی سے کہا۔

"بھائی میں کسی ایسی تقریب کا مہمانِ خصوصی کیسے بن سکتا ہوں جو میری سمجھ ہی سے بلہر ہو۔ اگر تم لوگ مجھ سے ان تصویروں کے بارے میں کچھ کہلوانا چاہو گے تو یقین کرو کہ میں بھی ایسی اوٹ پٹانگ باتیں کروں گا کہ ان تصویروں کی اہمیت ہی ختم ہو جائے گی۔"

لیکن اب یہ مرض ان کے گھر تک پہنچ چکا تھا سامنے ہی اُنھوں نے اس نوجوان مصور کو دیکھا جو شکل و صورت سے اچھا خاصا اور شریف نظر آتا تھا۔ وہ عقب میں کرسی پر بیٹھا ہوا تھا اور اس کے عین سامنے قدسیہ ایک کینوس بورڈ پر ایک تصویر بنا رہی تھی۔ غالباً اس تصویر کو وہ آخری ٹچ دے رہی تھی۔

شجاع احمد صاحب جب اندر داخل ہوئے تو نوجوان مصور اُٹھ کھڑا ہوا۔ شجاع احمد صاحب کو اس نے سلام کیا تھا اور شجاع احمد صاحب نے شرافت سے اس کا جواب بھی دیا تھا لیکن اس کے بعد وہ اس کی جانب متوجہ نہ ہوئے اور قدسیہ کے قریب پہنچ گئے۔ قدسیہ باپ کو دیکھ کر مسکرانے لگی تھی پھر اس نے کہا۔

"آئیے ابو نہ ہے نصیب کہ آپ نے آج ہمارے اس نگارخانے کا رُخ کیا۔"

"ہاں بھئی دیکھنا چاہتا تھا میں کہ تم نے جس زور و شور سے جو کام شروع کیا ہے' اس کی کیفیت کیا ہے؟"

"تو دیکھ لیجئے ابو۔ اُستاد صاحب کا کہنا ہے کہ میں قدرتی فنکار ہوں۔"

"سبحان اللہ۔ سبحان اللہ۔ اُستاد صاحب یہ نہ کہیں گے تو اور کون کہے گا۔" شجاع احمد صاحب طنزیہ انداز میں بولے۔

"دیکھئے ابو میں نے یہ تصویر مکمل کرلی ہے۔ یوں سمجھے کہ یہ میری پہلی مکمل تصویر ہے۔ اب میں لائنوں کی دُنیا سے نکل آئی ہوں۔"

"ٹھیک ٹھیک ٹھیک۔ تو یہ تصویر ہے۔" شجاع احمد صاحب رنگوں کے اس ملغوبے کو دیکھتے ہوئے بولے۔

"جی ابو۔ ذرا بتائیے تو سہی یہ کیا ہے؟" قدسیہ نے پوچھا۔

"میں تو اسے اپنی تقدیر سمجھتا ہوں۔" شجاع احمد صاحب نے کہا۔

"جی... میں سمجھی نہیں ابو۔"

"ہاں ہاں بھئی تصویر اور تقدیر میں تھوڑا سا ہی فرق ہے۔ یہ تصویر کی خرابی ہے یا میری تقدیر کی خرابی کہ میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا۔"

"اوہ ابو میں آپ کو سمجھاتی ہوں۔ براہِ کرم اس طرف آئیے۔" قدسیہ نے کہا۔

"بھئی بدلتے ہوئے ادوار ہیں یہ۔ کل کی مصوری خود بخود سمجھ میں آتی تھی۔ کسی بھی تصویر کو دیکھ لو۔ پتہ چل جاتا تھا کہ مصور کا ذہن کس طرف چل پڑا ہے اور آج کی تصویر کے لئے مصور کو سمجھانے کی ضرورت پیش آتی ہے۔ اگر وہ کسی کو نہ سمجھائے تو خدا کی قسم کوئی کچھ نہ سمجھے۔" شجاع احمد صاحب نے مسکراتے ہوئے کہا۔ پھر ہنستے ہوئے بولے۔ "سمجھاؤ بھئی سمجھاؤ یہ کیا ہے؟"

"یہ سراب ہے ابو۔" قدسیہ نے کہا۔

"س والا یا ش والا؟" شجاع احمد بولے۔

"سراب... سراب... دھوکا۔ فریب..."

"خوب۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے' یہ میں نے مان لیا۔ فن مصوری کے لئے تجرید سب سے بڑا دھوکا ہے۔" شجاع احمد صاحب بولے۔

"ابو آپ اُستاد صاحب کے سامنے یہ بات کہہ رہے ہیں ہمارے اُستاد ایک عظیم مصور ہیں۔"

"بہت خوب۔ بہت خوب۔ واقعی میں ان کی عظمت اس کینوس پر دیکھ رہا ہوں۔" شجاع احمد صاحب طنزیہ انداز میں سرفراز کی جانب مڑ کر بولے۔ سرفراز خاموش کھڑا تھا۔

بہت ہی حساس نوجوان تھا۔ ذرا ذرا سی بات کو دل پر لے لیتا تھا۔ شجاع احمد صاحب کی طنزیہ گفتگو اسے اپنے سینے پر نشتر کی مانند محسوس ہو رہی تھی۔

"کیوں نوجوان مصور، کیا سمجھا ہے ہو اس بچی کو پتہ؟" انھوں نے سوال کیا۔

"غالب خود کبھی اپنے کسی شعر کی تشریح نہ کر سکے۔ شاعر شعر کہہ دیتا ہے اور اسے سمجھنے والا صحیح معنوں میں اس کا قدردان ہوتا ہے۔ غالب کی شاعری کے بارے میں اگر کسی سے پوچھا جاتا تو وہ بہادر شاہ ظفر یا استاد ذوق تھے جو اس شاعری کی روح میں اتر سکتے تھے۔" دروازے سے آواز آئی اور شجاع احمد صاحب چونک کر پلٹے۔ زاہد مسکراتا ہوا اندر آرہا تھا۔

شجاع احمد صاحب کے ہونٹ بھینچ گئے۔ "آپ کی آمد کا مقصد؟" انھوں نے سوال کیا۔

"سراب کی رونمائی۔" زاہد نے فوراً گردن خم کر کے جواب دیا۔

"لیکن میں آپ سے اس کا خواہش مند نہیں ہوں۔" شجاع احمد صاحب جھنا کر بولے۔

"میں نے عرض کیا نا کہ غالب کے شعر کا صحیح حسن استاد ذوق کی نگاہ میں دیکھا جائے۔ دیکھئے یہ سراب ہے۔ رنگوں کی اپنی زبان اپنی کہانی ہوتی ہے۔ پرانے دور کے عکاس ان رنگوں کو دوسرے درجے کی چیز سمجھتے تھے اور انھیں صرف اس لیے استعمال کرتے تھے کہ تصویر خوشنما معلوم ہو۔ جیسے جیسے رنگوں کی زبان سمجھی گئی۔ لائنیں بے مقصد ہو کر رہ گئیں۔ ہر رنگ اپنی زبان خود رکھتا ہے۔ اپنی کہانی خود کہتا ہے۔ یہ زرد رنگ نفرت اور مایوسی کا علمبردار ہے۔ سرخ رنگ میں تیزی اور شدت پائی جاتی ہے۔ نیلا رنگ امن پسندی اور مسکراہٹوں کا امین ہے۔ سبز رنگ میں نرمی اور بزرگی پائی جاتی ہے۔ سو جناب محترم ہر رنگ کی اپنی ایک زبان ہوتی ہے اور پھر ان مخصوص لائنوں سے ہٹ کر زندگی کے ٹیڑھے میڑھے راستوں کو برش کی مدد سے نمایاں کیا گیا ہے جن پر چلتے ہوئے انسان اپنی شخصیت کھو بیٹھتا ہے۔ وہ ان راستوں سے اپنی منزل کا تعین کرتا ہے حالانکہ یہ راستے اس قدر ناہموار ہوتے ہیں کہ ان کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ ان ناہموار راستوں کے جال میں انسان بھٹک تو سکتا ہے منزل کبھی نہیں پا سکتا۔ یہ رنگ اس بات کے عکاس ہیں کہ انسان خود کو سمجھ لے۔ نیلے رنگ کی کشادگی اپنائے۔ سرخ رنگ کی تیزی درشتی سے بچے۔ اس تصویر کے ہر پیچ و خم میں نصیحتیں پنہاں ہیں۔ بس اس کی ضرورت ہے کہ انسان انھیں سمجھ لے۔ اور اپنے راستے بدلنے کی کوشش کرے۔ یہ تمام راستے سراب ہیں۔ ایک دھوکا ایک فریب جو کبھی منزل کو سامنے نہیں لاتے بلکہ انسان کو بھٹکا کر بجانے کہاں سے کہاں پہنچا دیتے ہیں۔"

زاہد اپنی ترنگ میں بولے جا رہا تھا۔ سرفراز اور قدسیہ حیرت سے منہ پھاڑے زاہد کو دیکھ رہے تھے۔ جو کچھ زاہد نے کہا تھا۔ وہ ایسا دل کو لگتا تھا کہ بس اس سے آگے اور کوئی بات نہیں کہی جا سکتی تھی۔ سرفراز کے وہم و گمان میں بھی یہ تشریح نہ تھی۔ وہ بے چارہ مصور تھا ہی کب۔ وہ تو زاہد نے کھینچ کھانچ کر اسے مصور بنا دیا تھا اور زاہد ہی کے کہنے پر وہ قدسیہ کو الٹی سیدھی تصویریں بنانا سکھا رہا تھا۔

جہاں تک قدسیہ کا تعلق تھا اس نے بھی اس تصویر کی اسکیچنگ پر یہ غور نہیں کیا تھا لیکن اب جو اس نے اس تصویر کو دیکھا تو درحقیقت زاہد کی باتیں اسے بالکل سچ نظر آئیں۔

دوسری طرف شجاع احمد صاحب بھی زاہد کو گہری نگاہ سے دیکھ رہے تھے۔ بجانے ان کے ذہن میں کیا تھا۔ پھر ان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

"بھئی واقعی، تم نے تو میری آنکھیں کھول دیں زاہد۔ میں نے اس انداز میں اس تصویر کو نہیں دیکھا تھا لیکن اس سے ایک اندازہ مجھے اور ہوا۔"

"وہ کیا جناب؟" زاہد نے پوچھا۔

"یہ کہ تم مصوری پر بھی گہری نگاہ رکھتے ہو۔ کبھی کرتے رہے ہو مصوری؟"

"نہیں جناب، میں نے بس فن کاروں کے فن پاروں کو قدردانی کی نگاہ سے دیکھا ہے۔ شاعروں کے اشعار کی گہرائیوں پر غور کیا ہے۔ ادیبوں کی نثر پر توجہ دی ہے۔ مصوروں کی فطرت کو میں نے پڑھا ہے اور اس سے مجھے ان سب کو سمجھنے کا موقع ملا ہے۔ بس یہی وجہ ہے کہ میں ہر معاملے میں تھوڑی بہت شدبد رکھتا ہوں۔" زاہد نے جواب دیا۔

"بھئی تم سے کچھ گفتگو کرنی ہے مجھے بھی۔" شجاع احمد صاحب نے کہا۔

"حاضر ہوں جناب۔ خادم ہوں آپ سب کا۔ جب بھی حکم فرمائیں۔"

"فرصت کس وقت ہے محترم؟" شجاع احمد صاحب بولے۔

"میں نے عرض کیا نا میں تو حکم کا غلام ہوں جب حکم دیں حاضر ہو جاؤں۔"

"تو پھر آج دوپہر کے کھانے کے بعد میرے کمرے میں

نشست رہے گی۔"

"تنہا میں ہی ہوں گا یا۔۔۔"

"نہیں بھئی صرف تم۔۔۔ بات تم ہی سے کرنی ہے" شجاع احمد صاحب نے کہا اور زاہد نے سر تسلیم خم کر دیا۔ شجاع احمد صاحب باہر نکل گئے تو قدسیہ زاہد کی طرف متوجہ ہوئی۔ وہ بڑی میٹھی نگاہوں سے زاہد کی طرف دیکھ رہی تھی۔

"زاہد بھائی آج آپ نے لاج رکھ لی میری۔ میں اتنی تفصیل سے ابو کو یہ سب کچھ نہیں بتا سکتی تھی جو آپ نے بتایا اور اس کا ذمہ دار میں اپنے استاد صاحب کو قرار دوں گی۔"

"وہ کیوں؟" زاہد نے پوچھا۔

"اس لئے کہ استاد صاحب نے اس تصویر کی اسکیچنگ تو کر دی تھی لیکن مجھے اس کی تفصیل نہیں بتائی تھی۔ آپ ان سے میری سفارش کر دیجئے کہ آئندہ جب بھی وہ مجھ سے کسی چیز کی اسکیچنگ کرائیں تو مجھے اس کے ہر پہلو سے آگاہ کر دیں۔"

"ہاں بھئی، اتنی سفارش تو میں آپ سے ضرور کروں گا سرفراز صاحب۔" زاہد نے کہا اور سرفراز بے چارہ مشینی انداز میں گردن ہلانے لگا۔ اسے کیا معلوم تھا کہ اس نے کیا ہوا ہے اور کیا بن گیا ہے

دوپہر کے کھانے کے بعد زاہد شجاع احمد صاحب کے کمرے میں پہنچ گیا۔ وہ تنہا تھے اور اس کا انتظار کر رہے تھے۔

"آؤ۔۔" انھوں نے نرم لہجے میں کہا۔ ذہن میں تو زاہد کے لئے سخت نفرت تھی۔ اس کی چرب زبانی کو دیکھ چکے تھے۔ تصویر کے معاملے کو اس نے جس خوبی سے سنبھال لیا تھا۔ شجاع احمد صاحب کی جہاندیدہ نگاہیں اسے سمجھ چکی تھیں۔ انھیں اندازہ ہو گیا کہ یہ نوجوان آفت کا پرکالہ ہے اور اس سے جیتنا خاصا مشکل کام ہوگا۔

بہرطور جہاندیدہ انسان تھے، سمجھدار تھے، زیرک تھے اور اپنے کاروباری مخالفین کو کاروباری ہتھکنڈوں سے شکست دیتے آئے تھے۔ اس لئے اس نوجوان سے ہار تو نہیں مان سکتے تھے چنانچہ انھوں نے پینترا بدل لیا تھا۔ زاہد کو بیٹھنے کی پیش کش کی گئی تو وہ شکریہ ادا کر کے بیٹھ گیا۔

"میں تم سے تمہارے بارے میں گفتگو کرنا چاہتا ہوں۔" انھوں نے کہا اور زاہد کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

"بس یہی ایک پہلو ہے دنیا کا جو میری نگاہوں سے تاریک ہے۔ میں خود کو اس قابل نہیں سمجھتا جناب کہ زیر بحث آؤں جب میں خود ہی اپنی ذات کی شناخت نہیں کر سکا تو دوسروں کو اس کے بارے میں کیا بتاؤں۔"

"دیکھو بیٹے میں زندگی کا طویل عرصہ گزار چکا ہوں۔ میں نے دنیا دیکھی ہے۔ بہت سے لوگوں سے میرا سابقہ پڑا ہے اور میں یہ جانتا ہوں کہ کون شخص کس انداز میں کس وقت بول رہا ہے۔ تم خود کو چھپانے کی کوشش کے علاوہ اور کچھ نہیں کر رہے اور میں اس کوشش کو مشکوک سمجھتا ہوں۔"

"شاید۔ ایسا ہو۔" زاہد نے آہستہ سے کہا۔

"لیکن یہ بھی تمہیں بتانا چاہتا ہوں زاہد کہ بہرطور یہ میری مملکت ہے۔ انسان اپنے گھر کی چہاردیواری کو اپنی مملکت سمجھتا ہے۔ یہاں صرف ایک شخصیت ایسی ہے جو مجھ سے منحرف ہو سکتی ہے اور وہ ہیں حسام احمد صاحب۔۔۔ اور میں تمہیں داد دیتا ہوں کہ تم نے ،میں سے ابتدا کی ہے۔ یہ کسی معمولی آدمی کا کام نہیں لیکن تم یہاں جو کچھ کر رہے ہو یا کرنا چاہتے ہو۔ بہرطور کسی نہ کسی دن وہ میرے علم میں ضرور آئے گا اور اس وقت جب مجھے یا اس کوٹھی میں بسنے والوں کو کسی نقصان سے دوچار ہونا پڑے گا تو میں ڈیڈی پاور بھی استعمال کر سکتا ہوں کیونکہ یہ میری مملکت ہے۔ تم جانتے ہو اس وقت تمہارا کیا بنے گا؟"

"جانتا ہوں جناب والا، درحقیقت اس وقت میری پوزیشن انتہائی نازک ہو جائے گی اور میں کوئی پناہ گاہ نہ حاصل کر سکوں گا لیکن یہ اس وقت ممکن ہوگا نا جب میں اس کوٹھی کے لئے یا اس کوٹھی کے مکینوں کے لئے کوئی غلط کام کروں گا۔ اگر ایسا سرے سے ہی نہ ہو تو پھر آپ کو میری مخالفت کا سودا کیوں سمانے لگا۔" زاہد نے جواب دیا۔

"ٹھیک ہے تم ان خوبصورت باتوں سے دلوں کو موہ لینے کی قوت رکھتے ہو لیکن میں تم سے کہہ رہا ہوں کہ میری نگاہ میں تمہاری شخصیت مشکوک ہے۔ اگر تم یہ چاہتے ہو کہ میں بھی دوسرے لوگوں کی طرح تمہیں پیار کرنے لگوں تو پھر یہ تمہارا فرض بنتا ہے کہ تم مجھے اپنے بارے میں سب کچھ بتا دو۔"

"میں نے عرض کیا نا، میں ایک سادہ سا ورق ہوں جس پر کوئی تحریر نہیں ہے۔ ملازمت چاہتا تھا، سو اس گھر میں آ گیا یہاں کے لوگوں کی خدمت کی انھوں نے مجھے اپنا لیا۔ آپ کے ذہن میں جو شکوک و شبہات ہیں، آنے والا وقت یقیناً انھیں زائل کر دے گا اور میں اپنی تقدیر میں اس روشنی کا انتظار کروں گا ورنہ یہاں پر باقی لوگوں کو مجھ سے کوئی شکایت نہیں ہے۔" زاہد نے جواب دیا۔

"تو تم کچھ نہ بتاؤ گے اپنے بارے میں؟"

"میں نے عرض کیا نا، اگر کچھ ہوتا تو ضرور بتاتا۔ آنے والے وقت میں بھی اگر میری زندگی میں کوئی ایسی چیز شامل ہوئی جو کسی کو تباہی جاسکے تو میں آپ کے سامنے عرض کر دوں گا۔"

"ہوں۔ اچھا ٹھیک ہے۔ مجھے اپنی ذہانت بھی آزمانی ہوگی تمھارے سلسلے میں۔ بہرطور تم اس گھر میں ایک فرد کی حیثیت سے رہتے ہو۔ کیا تم مجھے اس گھر کا بڑا تسلیم نہیں کرتے ہو؟"

"یقیناً کرتا ہوں جناب والا۔" زاہد نے جواب دیا۔

"تو پھر میرا بھی کچھ حق بنتا ہے تم پر۔"

"بسر و چشم، بسر و چشم۔"

"میں تم سے کچھ کام لینا چاہتا ہوں۔"

"حکم فرمایئے بندہ حاضر ہے۔" زاہد سینے پر ہاتھ رکھ کر جھکا۔

"مجھے بتاؤ، ابا جان کو فرسٹ ایڈ ہاؤس کی تعمیر سے باز رکھو۔" شجاع احمد صاحب نے کہا اور زاہد کے چہرے پر ایک لمحے کے لئے رنگ آیا لیکن دوسرے لمحے وہ سنبھل گیا۔

"دیکھئے جناب! انسان کی زندگی میں دو روٹیاں یا بدن کا کپڑا ہی سب کچھ نہیں ہوتا۔ ہم اپنے ضمیر کے لئے بھی زندہ رہتے ہیں۔ فرسٹ ایڈ ہاؤس کے اغراض و مقاصد میری اپنی زندگی سے بھی تعلق رکھتے ہیں۔ مجھ جیسے بے سہارا نوجوان جو میری طرح خوش نصیب نہیں ہوتے اور انھیں ایسے کسی اچھے خاندان میں جگہ نہیں ملتی زندگی اور موت کی کش مکش کا شکار ہو کر سڑکوں اور گلیوں میں مارے مارے پھرتے رہتے ہیں۔ مجھے ان کا کرب معلوم ہے۔ میں جانتا ہوں کہ وہ سب پہلی امداد کے ضرورت مند ہوتے ہیں۔ اگر کوئی ان کی پشت پر ہاتھ رکھ کر انھیں بس اتنا سہارا دے کہ وہ اس وقتی کرب سے نجات حاصل کر کے معاشرے میں اپنا کوئی مقام حاصل کر لیں تو آپ یقین فرمایئے کہ وہ معاشرے کے بہترین افراد ثابت ہو سکتے ہیں۔ بصورت دیگر ان کی مالی پریشانیاں ذہنی الجھنیں انھیں برائی کے راستے پر لے جاتی ہیں۔ وہ چور، قاتل، ڈاکو، خونی، اسمگلر، جیب کترے، بلیک میلر نجانے کیا کیا بن جاتے ہیں۔ یہ تو ایک قومی خدمت ہے جناب، جس کا حکم دین بھی دیتا ہے اور دنیا بھی۔ میں وطن پرست ہوں، یہ میرا وطن ہے۔ میرے وطن کے سربراہ اور وہ لوگ اگر میرے انداز میں نہیں سوچتے تو جو شخصیت میرے سامنے اس انداز میں سوچتی ہوئی سامنے آئے، میں بھلا اس کی مخالفت کیسے کر سکتا ہوں۔" زاہد نے جواب دیا۔

"زاہد میں بہت غلط آدمی ہوں، چرب زبانی کسی بھی طور قابل قبول نہیں ہوتی۔ میں چاہتا ہوں کہ فرسٹ ایڈ ہاؤس تعمیر نہ ہو اور تمھیں اس سلسلے میں [illegible] آپ [illegible] میرا خیال تھا کہ آپ رات ہی کے کسی حصے میں جا چکے

"نہیں شجاع احمد صاحب آپ اس بات کو ذہن سے کھرچ دیں کہ میں اس سلسلے میں آپ کا معاون ہو سکتا ہوں بلکہ یہ میرا فرض بنتا ہے کہ میں دادا میاں کو آپ کے اس جذبے سے آگاہ کروں۔"

"تم۔ کیا بکواس کر رہے ہو؟" شجاع احمد بوکھلائے ہوئے انداز میں بولے۔

"فرض، فرض ہے۔ فرسٹ ایڈ ہاؤس ابھی تعمیر بھی نہیں ہوا اور اس کی مخالفت شروع ہو گئی۔ میں اس سے جذباتی لگاؤ رکھتا ہوں اور یہ میری ڈیوٹی ہے کہ میں اس مخالفت کی اطلاع دادا جان کو دوں۔" زاہد کھڑا ہو کر بولا۔

"اگر تم نے ایسا کیا تو یہ نمک حرامی ہوگی۔ تم ہمارے درمیان تفرقے کا باعث بنو گے۔"

"تو پھر آپ وعدہ کریں کہ فرسٹ ایڈ ہاؤس کی مخالفت نہیں کریں گے۔" زاہد نے کہا اور شجاع احمد صاحب اُسے گھورنے لگے۔ پھر بولے۔

"تمھاری تعلیمی حیثیت کیا ہے؟"

"بس ضرورت پوری ہو جاتی ہے۔"

"میں تمھیں اپنی ایک فرم میں ایک بڑا عہدہ پیش کروں تو اُسے قبول کرو گے؟"

"فرسٹ ایڈ ہاؤس کے عوض سارے جہان کے عہدے ٹھکرا دوں گا۔ یہ میرا عزم ہے۔" زاہد نے جواب دیا اور شجاع احمد صاحب دانت پیسنے لگے۔ پھر گردن ہلا کر بولے۔

"تم لوگوں کے لئے یہ ادارہ مصیبت بن جائے گا۔ اس کے اخراجات برداشت نہیں کر سکو گے اور ہزاروں کی مخالفتیں مول لو گے۔ لوگ طرح طرح کے الزامات رکھیں گے تم پر۔ دیکھ لینا، میری بات کو گرہ میں باندھ لینا، بعد میں پچھتاؤ گے۔"

"ایسا کبھی نہیں ہوگا۔ آپ اطمینان رکھیں۔" زاہد نے کہا اور پھر باہر نکل گیا۔

شجاع احمد گہری گہری سانسیں لیتے رہے۔ انھیں شدید غصہ آرہا تھا زاہد ذوالفقار پر لیکن پھر آہستہ آہستہ وہ معتدل ہو گئے۔ وہ اس کی شخصیت پر غور کرنے لگے تھے۔ ذرا بھی مرعوب نہیں ہوا مجھ سے۔ اس کی فطرت میں ملازموں جیسی کوئی بات ہی نہیں ہے۔ کون ہے یہ، آخر کون ہے یہ؟"

⊡

توفیق صاحب شدید غصے میں تھے۔ شاہدہ بیگم کا چہرہ زرد ہو رہا تھا اور رفیق و شفیق گردن جھکائے ان کے سامنے بیٹھے ہوئے تھے۔ [illegible] چلے گئے تھے جھیمو بدستور بیگم مہرالنساء کے کمرے میں تھی لیا بھی؟

اور بیگم صاحبہ دوبارہ توفیق صاحب کے پاس نہیں آئی تھیں۔ وقت ایک گھٹن کے عالم میں گذر رہا تھا۔

"کچھ بولو گے نہیں جیالو۔ رات کی تاریکی میں یہ کیسی مہم سر کرنے نکلے تھے تم دونوں؟" توفیق صاحب تقریباً آدھے گھنٹے خاموش رہنے کے بعد بولے۔

"معاف کردو ابا غلطی ہوگئی"، رفیق بولا۔

"ارے نہیں بیٹے۔ کوئی بات نہیں غلطی انسان سے ہی ہوتی ہے اور پھر یہ تو کوئی غلطی بھی نہیں۔ تم نے سوچا کھونٹوں پر ہاتھ مارنے کے بجائے گلے پر ہی کیوں نہ ہاتھ مارا جائے۔ تمہاری خالہ جان بیوہ ہیں ممکن تھا تمہارے جال میں پھنس جاتیں۔ اس طرح کوئی خطرہ ہی نہ رہتا۔ بھلا پھر یہ لڑکیاں کیا حیثیت رکھتی تھیں۔ کیوں۔۔۔ یہی بات سوچی تھی نا تم نے۔۔۔" توفیق صاحب ... ہوئے بولے

"نن نہیں ابا۔۔۔ یہ بات نہیں تھی"

"پھر کیا ہوا تھا میرے لعل؟"

"وہ۔۔۔ وہ نشاط نے مجھے خود بلایا تھا"، رفیق ہکلاتے ہوئے بولا۔

"اپنی امی کے کمرے میں۔۔۔ کیوں۔۔۔ یا پھر تم۔۔۔ نشے میں نشاط کے بجائے مہر النساء بیگم کے کمرے میں جا گھسے تھے۔ یہی بات تھی نا؟" توفیق صاحب پیار بھرے لہجے میں بولے: "دیکھا شاہدہ تم نے یہ اپنا رفیق کتنا معصوم بچہ ہے"۔ شاہدہ بیگم کی تو آواز ہی بند تھی۔ ان کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔

"وہ ابا۔ مجھے نہیں معلوم۔ اس نے مجھ سے یہی کہا تھا یقین کریں ابا، بڑی گہری سازش ہوئی ہے"۔ رفیق بولا۔

"ہاں ہاں۔ سی آئی اے کام کر رہی ہے تمہارے خلاف۔ بے شک، ارے مردود اب کیا ہوگا۔ یوں لگتا ہے سارا کھیل بگڑ گیا اور کیوں میاں۔ تم وہاں اپنی امی کو تلاش کرنے گئے تھے کیا۔ کیوں گئے تھے اس ملازمہ کے کوارٹر میں۔ کیا ہوگیا تھا تمہیں۔ کوئی خواب دیکھا تھا کیا۔ کوئی ڈراؤنا، بھیانک خواب اور وہاں اس کی آغوش میں پناہ لینے گئے تھے"۔

"ابا جی وہ میں۔۔۔ میں۔۔۔"

"تمہارا ستیاناس مردود، تمہاری بدچلنی نے مجھے کہیں کا نہ رکھا۔ یہ سوچ کر کشتیاں جلادی تھیں کہ شمشیر زماں کے خاندان میں پہنچ کر خود کو اُن کے قدموں میں ڈال دوں گا اور تمہارا مستقبل بنا دوں گا۔ یہی سوچا تھا کہ اس خاندان کی دامادی مل جائے گی تمہیں تو ساری زندگی عیش کروگے لیکن یہ تو نصیب کی باتیں ہوتی ہیں۔ تم سڑکوں کے بھکاری سڑکوں پر ہی رہنے کے ...

آخر بھی تم نے اپنی اصلیت دکھا دی۔ کیا کر ڈالا تم نے مردودو۔ اب یہ سب کچھ سنبھالنا میرے لئے کتنا مشکل ہوگا۔ ارے شاہدہ تم ہی بتاؤ۔ تمہاری اولاد نے جو کارنامے انجام دیئے ہیں۔ ان کا سدباب کیسے ہو۔ کیا کہوں میں مہر النساء بہن سے، کس طرح میں معافی مانگوں گا اُن سے۔ ارے ان کی ساری اصلیت اُن کی نگاہوں میں آگئی۔ کہتا ہے مردود کم بخت کہ نشاط نے بلایا تھا۔ ارے ان لڑکوں نے تو میری عزت دو کوڑی کی کردی"۔

"ابا آپ میری بات تو مانتے ہی نہیں"، رفیق نے گال پھلا کر کہا اور توفیق صاحب نے پاؤں سے جوتا اتار لیا۔

"شسر ے ایسی مانوں گا تیری بات کہ سر پر ایک بال بھی نہیں رہے گا۔ یہ بات کبھی منہ سے نکالیو بھی نہیں۔ اگر تو نے یہ الزام لگایا نشاط پر تو پھر سارا کھیل ہی بگڑ جائے گا اور تو مجھے یہ بتا کہ یہ تو نے نشہ کرنا کب سے شروع کیا ہے؟"

"بس ابا۔۔۔ کبھی کبھی۔۔۔"۔ رفیق نے جواب دیا۔

"بے غیرت، بے شرم۔ شریف خاندانوں میں یہ سب کچھ ہوتا ہے، مگر میں بھول گیا۔ ہم شریف خاندان کہاں ہیں۔ ہم تو شریف بننے کی کوشش کر رہے ہیں"۔ توفیق صاحب جنون کے عالم میں نجانے کیا کیا بکتے رہے۔

ساری رات اسی طرح گزر گئی تھی۔ نہ وہ خود سوئے نہ دوسروں کو سونے دیا۔ منتظر تھے اس بات کے کہ صبح کو ایک ہنگامہ ہوگا ایک خوفناک ہنگامہ۔

صبح ہوگئی۔ شاہدہ بیگم کی ہمت نہیں پڑ رہی تھی کہ معمول کے مطابق اٹھ کر بہن کے پاس پہنچ جائیں۔ جو کچھ ہو چکا تھا اس کے بعد تو بڑی مشکلات پیش آگئی تھیں ان کے لئے۔ واقعی بیٹوں نے سارا پروگرام چوپٹ کر دیا تھا۔ وہ خود بھی ان دنوں بڑے سہانے خواب دیکھ رہی تھیں لیکن نجانے اب ان سہانے خوابوں کا کیا بنے گا؟

ناشتے کا وقت ہوگیا۔ نہ اُدھر سے کوئی بلاوا آیا اور نہ ہی ان لوگوں کو جانے کی ہمت پڑی۔ توفیق صاحب کی پیشانی شکن آلود تھی، رفیق اور شفیق کمرے سے نکل کر اپنے کمرے میں آگئے تھے اور توفیق شاہدہ بیگم کے سامنے بیٹھے الوؤں کی طرح اونگھ رہے تھے۔

"کیا سوچ رہے ہیں رفیق کے ابا۔ نیند آ رہی ہے تو تھوڑی دیر آرام کریں۔ ساری رات بیٹھے بیٹھے گزر گئی"۔

"بجومت، نام مت لینا ان مردودوں کا۔ مجھے ان کا آبا کہو ... اپنے ... تھا۔ مجھے تو اب تم ...

تم کچھ نہ بتاؤ گے اپنے بارے میں؟"

سے کہ بچے ہیں بجھول ہو گئی۔ ارے بچے کہیں ایسے ہوتے ہیں بھول بھلا ایسے ہوتی ہے اور پھر شراب اور سونے پر سہاگہ کم بخت سیدھا مہر النساء کے کمرے میں پہنچ گیا۔ اگر لڑکیوں میں سے کسی کے پاس پہنچا ہوتا تو بات سنبھالی بھی جا سکتی تھی لیکن مہر النساء کے کمرے میں... معاف کر دے گی وہ، معاف کر دے گی؟"

"تت... تو میں جا کر دیکھوں؟" شاہدہ بیگم نے کہا۔

"دیکھو، دیکھو۔ جوتے کھا کر بھاگتی ہوئی چلی آنا۔ جاؤ دیکھو، دیکھو جلدی کرو۔" توفیق صاحب نے کہا۔ شاہدہ بیگم چند لمحات انھیں دیکھتی رہیں پھر بمشکل اٹھ گئیں۔ منہ پر پانی کے چھینٹے مارے بالوں میں الٹی سیدھی کنگھی کی اور پھر اٹھ کر باہر نکل آئیں۔

شاہدہ بیگم کا دل بُری طرح لرز رہا تھا۔ درحقیقت جو کچھ ہوا تھا اس کے بعد بہن کے پاس جانے کو منہ نہیں تھا لیکن یہ سونے کی کان ایسے بھی تو چھوڑی نہیں جا سکتی تھی۔ چنانچہ وہ آہستہ آہستہ مہر النساء کے کمرے کی جانب چل پڑیں۔ مہر النساء اپنے کمرے میں موجود تھیں تینوں بیٹیاں بھی وہیں تھیں۔ کوئی بات ہو رہی تھی۔ انھیں دیکھتے ہی خاموشی چھا گئی۔ شاہدہ بیگم گردن جھکائے اندر پہنچ گئیں۔

"ناشتہ کر لیا تم لوگوں نے...؟" انھوں نے پوچھا کسی نے کوئی جواب نہ دیا تو شاہدہ بیگم آگے بڑھیں اور وہیں کرسی پر بیٹھ گئیں۔

"مہر النساء کیا کروں اب اس سلسلے میں، کیا سوچا ہے تم نے ہم لوگوں کے بارے میں۔ یہ اولاد کبھی کبھی کس طرح رسوا کرتی ہے۔ میں تو تم سے آنکھیں ملانے کے قابل بھی نہیں ہوں۔ کیا کہوں اور کیا نہ کہوں، کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔" شاہدہ بیگم نے کہا۔ مہر النساء نے اب بھی کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ شاہدہ بیگم تھوڑی دیر خاموش رہ کر جواب کا انتظار کرتی رہیں، پھر بولیں۔ "میں ناشتہ منگواتی ہوں پہلے ناشتہ کر لو۔ بھوکی ہو گی اب تک۔"

"کیوں۔ بھوکے کیوں ہوتے ہم لوگ، اپنے گھر میں ہیں اور پھر ہم بھوکے کیوں رہیں۔ تم نے تو کوئی ایسی بات نہیں کی ہے۔" مہر النساء بیگم رکھائی سے بولیں۔

"تو ناشتہ کر لیا تم لوگوں نے؟"

"جی...؟"

"اچھا کیا۔ کم نصیب تو ہم ہیں۔ تقدیر تو ہماری پھوٹی ہے۔ کہو تو سہی مہر النساء اب کیا کیا جائے؟"

"زیادہ اہم مسئلہ نہیں ہے باجی۔ آپ لوگ فوری طور پر یہ حویلی [illegible] دیں۔ مجھے تو حیرت ہوئی ہے آپ لوگوں کو ابھی تک یہاں [illegible] میرا تو خیال تھا کہ آپ رات ہی کے کسی حصے میں جا چکے ہوں گے۔" مہر النساء نے کہا۔ اور شاہدہ بیگم ہکا بکا رہ گئیں۔ کچھ بھی تھا، یہ جواب ان کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا۔

"ہاں۔ ہونا تو یہی چاہیے تھا مگر ہم محبت کے مارے، جی تک یہیں مرے ہوئے ہیں۔" وہ بولیں۔

"میرے خیال میں اب اس کی گنجائش نہیں ہے شاہدہ باجی۔ براہ کرم آپ فوری طور پر حویلی خالی کر دیں۔"

"معاف نہیں کرو گی مہر النساء؟" شاہدہ بیگم بولیں۔

"عرض کر چکی ہوں باجی۔ اب اس کی قطعی گنجائش نہیں ہے۔ مجھے افسوس ہے۔"

"تھوڑا سا غور کر لو ہم کم نصیبوں پر۔"

"ساری رات غور کرنے کے بعد ہی یہ فیصلہ کیا ہے۔" مہر النساء بیگم نے کہا۔

"اچھا۔ مہر النساء اچھا۔ جو تمھارا حکم۔ میں تمھارا یہ مطالبہ تمھارے بہنوئی تک پہنچا دیتی ہوں۔"

"براہ کرم جلدی کریں۔" مہر النساء بیگم نے منہ پھیر کر کہا۔ اور شاہدہ بیگم باہر نکل گئیں۔ حالات بے شک سنگین تھے لیکن مہر النساء اس حد تک چلی جائے گی۔ یہ ان کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا۔ وہ کمرے میں داخل ہوئیں تو توفیق صاحب اٹھ کر بیٹھ گئے۔

"ملیں ان لوگوں سے...؟"

"ہاں..."

"کوئی بات ہوئی؟"

"ہاں..." شاہدہ بیگم نے کہا۔

"اب یہ پوچھوں کہ کیا بات ہوئی، پھوٹتی کیوں نہیں منہ سے۔" توفیق صاحب جھلاتے ہوئے انداز میں بولے۔

"نکل جانے کو کہا ہے ہم لوگوں سے۔ کہا ہے فوراً حویلی خالی کر دیں۔"

"ایں..." توفیق صاحب اچھل پڑے۔ "کس نے کہی یہ بے ہودہ بات؟" وہ بولے

"مہر النساء نے۔"

"کھل کر کہی ہے۔ یعنی اتنی سخت بات؟"

"جی۔ کہہ رہی تھیں کہ تعجب ہے آپ لوگ اب تک یہیں ہیں۔" شاہدہ بیگم بولیں۔

"سنک گئی ہے مہر النساء۔ اتنی احمقانہ بات اس کے منہ سے نکلی ہے۔ تم نے کچھ نہ کہا اس کے جواب میں؟"

"کیا کہتی؟"

"تو کیا نکال چلو گی اس حویلی سے۔ سارے سنہرے خواب نکال دو گی آنکھوں سے؟"

"مجھے کیا معلوم؟"

"ہاں۔ ساری ذمہ داری میری ہی تو ہے۔ ان مردودوں کو پیدا کرنے کی ذمہ داری بھی مجھے ہی سونپ دیتیں۔ بلاوجہ تم نے کیوں تکلیف اٹھائی۔ آج تک جتنے قصور کیے ہیں میں نے کیے ہیں۔ تم نے شادی کی۔ یہ بچے پیدا کیے۔ اب جب تک زندہ ہوں ساری ذمہ داریاں میرے شانوں پر ہی تو ہیں۔ ارے میں کہتا ہوں کیا چاہتے ہو تم ماں بیٹے۔ خودکشی کر لوں میں۔ تم رو دھو کر معاملے کو ہموار کرنے کی کوشش نہیں کر سکتی تھیں؟"

"حالات بہت خراب ہیں۔ ناشتہ وغیرہ بھی کر چکے ہیں، وہ لوگ ہمیں پوچھا بھی نہیں۔ اسی سے اندازہ لگالو۔"

"ایں۔ یعنی حد ہو گئی بداخلاقی کی۔ اب تو یہ ضرورت سے زیادہ ہوتی جا رہی ہے۔ بہرحال منہ دھو رکھیں مہرالنساء بیگم، بھلا یہ کیسے ممکن ہے کہ اب ہم یہاں سے چلے جائیں۔ میں بھی تو ذرا بات کر لوں مہرالنساء سے یہ توفیق صاحب اٹھ گئے۔ یہ صورت حال واقعی میاں بیوی کی توقع سے زیادہ تھی۔ مہرالنساء سے اتنی سختی کی امید نہیں تھی انھیں۔

تھوڑی دیر کے بعد وہ مہرالنساء کے کمرے کے دروازے پر تھے: "اندر آسکتا ہوں؟" وہ غمزدہ انداز میں بولے۔

"آئیے۔۔" اندر سے مہرالنساء کی آواز سنائی دی اور توفیق صاحب اندر داخل ہو گئے۔

"ماشاء اللہ۔ سب ہیں یہاں۔ بچیو تم لوگ باہر جاؤ۔ میں اپنی بہن سے کچھ گفتگو کرنا چاہتا ہوں۔"

"بچیوں کو یہیں رہنے دیں بھائی صاحب۔ جو کچھ کہنا ہے ان کے سامنے ہی کہہ دیں۔" مہرالنساء نے کہا۔

"بڑوں کی باتیں ہیں مہرالنساء۔ بچیوں کو ان کے درمیان نہیں ہونا چاہیے۔"

"مجھے اپنی بچیوں پر مکمل اعتماد ہے۔ میں ان کے بغیر ایک قدم نہیں چلنا چاہتی۔"

"اپنے بھانجوں کو معاف نہیں کرو گی مہرالنساء؟"

"معاف کیجیے بھائی صاحب۔ مجھے اپنے عزیزوں سے زیادہ اپنی عزت عزیز ہے۔ میرے شوہر جو بنا کر گئے ہیں میں اسے ملیامیٹ نہیں کر سکتی۔ اس لیے میں معذرت خواہ ہوں۔"

"یہ ان کی پہلی غلطی تھی۔"

"آپ اسے غلطی تصور کرتے ہیں۔ تعجب ہے۔ رفیق نے رات کو پہلی بار شراب نہیں پی ہوگی۔ شفیق نے پہلی بار کسی کی عزت لوٹنے کی کوشش نہیں کی ہوگی۔ ایسی حرکتیں عادی لوگ ہی کرتے ہیں۔"

"ایسی بات نہیں ہے مہرالنساء اس بے دردی سے گفتگو نہ کرو۔ وہ بھی تمھارے بچے ہیں۔"

"نہیں توفیق بھائی۔ میں اتنی اعلیٰ ظرف نہیں ہوں کہ انھیں اخلاقاً بھی اپنا مان لوں۔ میں چاہتی ہوں توفیق بھائی کہ اس سلسلے میں ہم کوئی تلخ گفتگو نہ کریں۔ آپ جتنی جلد ممکن ہو سکے یہاں سے چلے جائیں۔ میری یہ خواہش ہے کہ اس کام میں ایک دو گھنٹوں سے زیادہ صرف نہ ہوں۔"

"یہ کیسے ممکن ہے مہرالنساء۔ تمھیں علم ہے کہ ہم اپنا سب کچھ چھوڑ کر تمھاری محبت میں بھاگے چلے آئے ہیں۔ میں تو اپنا گھر بھی بیچ آیا ہوں اس خیال سے کہ اب باقی زندگی تمھاری خدمت کروں گا۔"

"میں نے آپ سے اس کی درخواست نہیں کی تھی توفیق صاحب۔"

"فرض سمجھا تھا ہم نے ایک۔"

"تو اس غلط فہمی کو دور کر لیجیے مجھے آپ کی ضرورت نہیں ہے۔"

"لیکن ہم حماقت کر بیٹھے ہیں۔ اب ہمارے پاس سر چھپانے کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے۔"

"وہ رقم تو آپ کے پاس ہو گی جو آپ نے گھر بیچ کر حاصل کی تھی۔ اس سے کوئی دوسری جگہ خرید لیں۔"

"مہرالنساء اس وقت تم غصے میں ہو۔ ٹھنڈے دل سے غور نہیں کر رہی ہو۔ تمھیں علم ہے کہ تالی ایک ہاتھ سے نہیں بجتی۔"

"میں سمجھی نہیں بھائی صاحب۔"

"نشاط نے رفیق کو اپنے کمرے میں بلایا تھا۔" توفیق صاحب بولے اور مہرالنساء کے وجود میں آگ بھڑک اٹھی۔

"کیا بکواس کر رہے ہیں آپ؟" وہ غرا کر بولیں۔

"جی۔ یہ سچ ہے۔" توفیق صاحب بولے۔ دوسرے لمحے نشاط اچھل کر کھڑی ہو گئی۔ اس نے نیچے پڑی ہوئی جوتی اٹھائی اور دروازے کی طرف لپکی۔ دوسرے لمحے وہ غڑاپ سے دروازے سے باہر نکل گئی۔ لیکن یہ رفیق کی خوش بختی تھی کہ دونوں بھائی دروازہ اندر سے بند کیے بیٹھے تھے۔ واردات سنگین تھی کسی اور کا تو نہیں توفیق صاحب کا خطرہ تھا انھیں کہ چراغ پا ہو کر بداخلاقی پر نہ اتر آئیں اور اس وقت یہ دوراندیشی کام آ گئی تھی۔

ہارون شجاع احمد بی اے کے آخری سال میں تھا۔ سیدھا سادا شریف سا نوجوان، نئی نئی جوانی آئی تھی اور وہ اس کی جاذبیت سے آشنا نہیں تھا۔ امنگوں بھرا دل تھا۔ گو ابھی غلط راستوں کی جانب مائل نہیں ہوا تھا لیکن کئی شوق ذہن میں جاگزیں ہو گئے تھے۔

اسے موسیقی سے بے پناہ دلچسپی تھی۔ ایک انتہائی خوبصورت ٹیپ ریکارڈر اس نے اپنے کمرے میں رکھا ہوا تھا اور مغربی موسیقی کے بے شمار کیسٹ اس کے پاس موجود تھے۔ رقص سے بھی دلچسپی رکھتا تھا لیکن شجاع احمد صاحب سخت آدمی تھے، ایسے کسی شوق کو بے مہار نہیں ہونے دیا گیا تھا۔ البتہ جب بھی تنہائی ہوتی تو وہ دھیمے سُروں میں کیسٹ لگا کر رقص کی مشق کیا کرتا تھا اور اس وقت بھی یہی صورتِ حال تھی۔

کمرے کے قرب و جوار میں کوئی نہیں تھا۔ اس نے موقع غنیمت جانا اور ایک خوبصورت کیسٹ دھیمے سُروں میں لگا۔ پھر وہ کمرے کے وسط میں قالین پر رقص کرنے لگا۔ اچھے خاصے اسٹیپس تھے حالانکہ کسی سے رقص سیکھا نہیں تھا۔ کیسٹ کی دھنیں اسے مست کر رہی تھیں۔ چند لمحات کے بعد وہ ماحول کو بھول گیا۔

اس کا بدن متحرک رہا تھا۔ آنکھیں بند تھیں اور دروازہ کھلا رہ گیا۔ اس کھلے ہوئے دروازے سے کون داخل ہوا۔ کیسٹ کے ختم ہونے تک اسے احساس نہ ہو سکا۔ پھر جب کیسٹ ختم ہوا تو اس نے آنکھیں کھول دیں۔

آنکھیں کھلیں تو اپنے سامنے کسی کو پا کر اس کا دل دھک سے رہ گیا۔ لیکن جب اس شکل پر نگاہ پڑی تو خوف کا احساس دل سے نکل گیا۔ یہ ایک انتہائی قابلِ اعتماد صورت تھی۔ زاہد ذوالفقار زیدی بد تحیرانہ انداز میں اس کی شکل دیکھ رہا تھا۔

ہارون جھینپے ہوئے انداز میں ہنس پڑا: "مجھے شوق ہے زاہد بھائی۔" وہ بولا۔

"زاہد کو بے وقوف بنا رہے ہو؟"

"کیوں؟" ہارون تعجب سے بولا۔

"کتنا پرانا ہے یہ شوق؟"

"کافی پرانا... لیکن..."

"رقص کس سے سیکھا؟"

"سیکھا ہی کہاں ہے۔ بس موسیقی خود بخود تھرکا دیتی ہے۔"

"کیا میں ناقابلِ اعتبار ہوں ہارون؟" زاہد اندر آ کر ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔

"ہرگز نہیں۔ مگر میں سمجھ نہیں سکا۔"

"تمہارے رقص کا انداز ناتجربے کار نہیں تھا۔"

"ایسے نہیں زاہد بھائی۔"

"زاہد کی معلومات کو چیلنج کر رہے ہو؟"

"اس کی جرأت بھی نہیں کر سکتا۔"

"ایک ایک قدم لاجواب تھا تمہارا۔"

"خدا کی قسم کسی سے نہیں سیکھا۔"

"تب پھر ایک ہی بات کہی جا سکتی ہے۔ تم پیدائشی فنکار ہو۔"

"زاہد بھائی۔ کیوں گھس رہے ہیں۔"

"تم دونوں سے اتنا مخلص ہوں کہ کسی کو گھس ہی نہیں سکتا۔ اس گھر میں ایک بات کا شدت سے احساس ہوتا ہے۔"

"کس بات کا؟" ہارون نے کرسی گھسیٹ کر زاہد کے سامنے بیٹھتے ہوئے کہا۔

"تم ایسے ناتراشیدہ ہیرے پڑے ہیں اس گھر میں کہ اگر ان کی تراش خراش ہو جائے تو دنیا ان کی چمک دیکھ کر دنگ رہ جائے۔ مجھے انتہائی دکھ ہے ہارون، یقین کرو تم لوگ بے مثال ہو۔ ایسے کہ تم اپنی اصلی شکل میں سامنے آ جاؤ تو نجانے کیا ہو جائے۔ تمہارا یہ رقص۔ خدا کی پناہ... اگر یہ کسی اسٹیج پر ہوتا تو یقین کرو، تمہیں نجانے کہاں سے کہاں لے جاتا۔" ہارون اب سنجیدہ ہوتا جا رہا تھا۔ زاہد کی سنجیدگی دیکھ کر اب اسے احساس ہوتا جا رہا تھا کہ وہ واقعی پیدائشی فنکار ہے۔ "لیکن زاہد بھائی ہم اپنی اس بدنصیبی کو کیا کریں کہ ایک دقیانوسی خاندان میں پیدا ہوئے۔ ابو گھر کی فضا کو قبرستان کی شکل میں دیکھنا چاہتے ہیں۔ سنجیدہ سنجیدہ ماحول، نہ کوئی ہنس سکے نہ بول سکے۔ نہ زندگی کی دوسری تفریحات میں حصہ لے سکے۔ تمام چیزیں اخلاق کی بندشوں میں آتی ہیں۔ یہ نہ کرو، وہ نہ کرو۔ اپنے کسی شوق کی تکمیل نہ کرو۔ صرف وہ کرو جو شجاع احمد صاحب کو پسند ہے۔"

"ہاں مجھے اس کا احساس ہے لیکن ایک بات میں تمہیں بتا دوں کہ فنکار قدرتی طور پر فنکار ہوتا ہے۔ اس کے فن کی حسیات کو جتنا دباؤ گے وہ اتنا ہی ابھریں گی اور شجاع احمد صاحب اس بات سے واقف نہیں ہیں لیکن وہ فنکار کو دبا نہیں سکتے۔"

"ہم... مگر میں کیا کروں زاہد بھائی۔"

"دیکھو دوست زندگی ایک مختصر سی چیز ہے۔ خواہشات اگر ذہن میں پیدا ہوں تو بلاشبہ وہ فطری ہیں۔ بلاشبہ کچھ خواہشات سفلی بھی ہوتی ہیں لیکن گندگی اور غلاظت بآسانی عیاں ہو جاتی

ہے اور جس چیز سے ذہن میں کراہت نہ پیدا ہو اور وہ ذہن کی گہرائیوں میں جنم لے تو اس کا مقصد ہے کہ وہ ایک جائز خواہش ہے اور جائز خواہشات کو پروان چڑھانے کے لئے تھوڑی سی سرکشی تھوڑی سی بغاوت ضروری ہوتی ہے۔"

"میں نہیں سمجھا زاہد بھائی آپ کیا کہہ رہے ہیں؟"

"بھئی سیدھی سی بات ہے۔ اگر فن سے شوق ہے تو اسے اپناؤ۔ موسیقی کا تعلق روح سے ہوتا ہے اور اگر روح کو قتل کر دو گے تو باقی کیا رہ جائے گا؟"

"میں کب اسے قتل کرنا چاہتا ہوں۔" ہارون کراہ کر بولا۔

"تم اور صرف تم اس کے قاتل ہو گے میری بات کو یاد رکھنا اور ایبرن کی داستان حیات معلوم ہے تمہیں؟"

"نہیں لیکن اس کے ریکارڈ موجود ہیں میرے پاس۔"

"پریسلے کے بارے میں کچھ جانتے ہو؟"

"صرف ایک بات کہ کسی نے اسے زندگی میں سیدھا کھڑے نہیں دیکھا۔ شاید وہ سوتے میں بھی تھرکتا رہتا تھا۔"

"کتنا بڑا فنکار تھا۔ یہ معلوم ہے؟"

"دنیا جانتی ہے۔"

"راک شائن، سوان بک اور ایسے ہی دوسرے یہ لوگ فطرتاً فنکار تھے۔ فن نے انہیں زندہ جاوید کر دیا۔ موسیقی کے قدردان ان کی پوجا کرتے ہیں۔ ہمارے ہاں کی غلط اقدار نے بےشمار فنکار ذبح کئے ہیں۔ مجھے فنکار کی موت کا بہت دکھ ہے ہارون تم کسی طور آؤبرے ایبرن، ایلوس پریسلے، راک شائن اور سوان بک سے کم نہیں ہو۔"

"زاہد بھائی... زاہد بھائی۔ آپ ٹھیک کہتے ہیں لیکن.. لیکن میں کیا کروں؟"

"فن کی حیات چاہتے ہو تو اسیر بنو۔"

"ک... کس طرح؟"

"اس فن کو سیکھو، اسے جلا دو۔ کھلے عام اس کا پرچار کرو لیکن خوف کے عالم میں نہیں ہمت سے دلیری سے۔"

"زاہد بھائی... زاہد بھائی آپ میری مدد کریں۔ خدا کے لئے آپ میری مدد کریں۔" ہارون کا سانس پھولنے لگا۔

"شیو بناتے ہو؟"

"ایں...؟" ہارون اس بے تکے سوال پر چونک پڑا۔ پھر بولا۔ "ہاں بناتا ہوں۔"

"آج سے چھوڑ دو۔ داڑھی اور سر کے بال بڑھاؤ۔ آج سے ان میں نہ تیل پڑے نہ کنگھی ہو۔ شاید تم اس بات پر یقین نہ کرو کہ سوان بک نے تمہاری شکل میں نیا جنم لیا ہے۔ اس قدر مشابہہ ہو تم اس سے کہ کینیڈا کی لڑکیاں تمہیں دیکھ کر پاگل ہو جائیں۔ دنیا بھر کی ڈیڑھ لاکھ لڑکیاں سوان بک سے عشق کرتی تھیں اور اس کی موت پر اپنا ذہنی توازن کھو بیٹھی تھیں۔

ہارون اپنی جگہ سے اٹھا اور اس نے زاہد کے پاؤں پکڑ لیے۔

"زاہد بھائی... زاہد بھائی۔ آپ کی مدد کے بغیر میں کچھ نہ کر سکوں گا۔ میری رہنمائی کیجئے زاہد بھائی۔ میں اپنے فن کی بلندیوں کو پانا چاہتا ہوں۔ میں روح کی آسودگی چاہتا ہوں۔ مجھے میری منزل دکھا دیں زاہد بھائی یہ آپ کا احسان ہوگا۔"

"جذباتی نہ ہو ہارون۔ دنیا کی تاریخ گواہ ہے کہ کسی نے کسی کے لئے کچھ نہیں کیا۔ انسان نے ہمت اور لگن سے اپنی منزل پائی ہے۔ اگر تم مجھ سے کچھ چاہتے ہی ہو تو صرف میرے مشوروں پر عمل کرو۔"

"میں آپ کی رہنمائی چاہتا ہوں۔"

"ہمت ہے؟" زاہد نے پوچھا۔

"ہاں کچھ بھی ہو جائے۔ میں سنگر بنوں گا۔ میں رقاص بنوں گا۔" ہارون نے کہا۔

"تو ابتدا کر دو۔"

"کس طرح؟"

"میں تمہیں اس فن پر لٹریچر فراہم کروں گا۔ ان عظیم لوگوں کی تصاویر حاصل کروں گا کہیں نہ کہیں سے۔ یہاں سے نہ ملیں تو باہر سے منگواؤں گا۔ تم آغاز کرو۔ کل سے شیو نہیں بنے گی۔ بال نہیں کٹیں گے۔ لباس کے ڈیزائن میں تمہیں فراہم کروں گا سلواؤ گے تم خود۔ سب سے پہلے اپنا حلیہ وہ بناؤ جو تم ہو۔"

"او کے۔ میں عمل کروں گا۔" ہارون نے کہا۔

"ایک درخواست ہے ہارون۔" زاہد آخر میں بولا۔

"حکم کہیں زاہد بھائی۔"

"میں اس گھر کا ملازم ہوں۔ کسی بھی وقت کان پکڑ کر نکالا جا سکتا ہوں۔ کسی بھی سلسلے میں میرا نام نہ آنے پائے۔ یہ میری محبت کا صلہ ہوگا تمہاری طرف سے۔"

"کیسی باتیں کرتے ہیں آپ زاہد بھائی۔ اگر آپ پر اس گھر میں کوئی زیادتی ہوئی تو آپ تنہا اس گھر سے نہیں جائیں گے۔ ہم سب بھی آپ کے ساتھ ہوں گے۔"

"اس کی نوبت ہی کیوں آئے ہارون۔ تم جو کچھ کرو ٹھوس بن کر کرو اور کرنے سے پہلے سوچ لو۔ اگر ہمت نہ پاؤ تو قدم ہی

مت اُٹھاؤ۔"

"اب تو مجھے دُنیا کی کوئی طاقت نہیں روک سکتی۔"

"او کے۔ فنکار اسی طرح جنم لیتا ہے۔ ریاض جاری رکھو۔" زاہد نے کہا اور ہارون سے اجازت لے کر نکل آیا۔ ابھی زیادہ دُور نہیں گیا تھا کہ اس نے شیلاک پائی کی آواز سُنی۔

پیار کا درخت، آسمان کی وسعتوں میں۔

اور زاہد کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

سب ہکا بکا رہ گئے تھے۔ نشاط کی یہ حرکت کسی کی سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ پھر مہرالنساء بیگم اُٹھ کر باہر کی طرف دوڑیں۔ اُن کے پیچھے ہی توفیق صاحب اور ان دونوں کے پیچھے صوفیہ اور نزہت۔ نشاط جوتی سے دروازہ پیٹ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں سے شعلے اُبل رہے تھے اور وہ چیخ رہی تھی۔

"دروازہ کھولو۔ گندے کمینے انسان، دروازہ کھولو غلیظ خون۔ دروازہ کھول دو۔ ورنہ... ورنہ اچھا نہیں ہوگا۔"

مہرالنساء بیگم نشاط کے پاس پہنچ گئیں۔ "نشاط... نشاط بیٹی خود کو سنبھالو۔ میری حماقت پر خود کو ہلکان مت کرو۔ چاند پر خاک نہیں ڈالی جا سکتی۔ میں نے ان لوگوں کو آسمان پر چڑھایا تھا میں ہی انھیں زمین پر لے آؤں گی۔ نشاط خود کو سنبھالو۔"

"انھیں میری نگاہوں سے دُور کر دیں امی۔ ورنہ... میں بھول جاؤں گی یہ کون ہیں۔ ہٹا دیں انھیں یہاں سے۔" نشاط نے خونی آنکھوں سے توفیق صاحب کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"براہِ کرم آپ باہر چلے جایئے توفیق بھائی۔ جایئے باہر ورنہ میں نوکروں کو بلاتی ہوں۔" بیگم صاحبہ نے کہا اور توفیق صاحب موقع کی نزاکت دیکھ کر وہاں سے کھسک گئے۔

"ان کتوں کو بھی یہاں سے نکال باہر کریں۔ ایک لمحہ نہ لگے۔ مجھے ان کمینوں کے وجود سے نفرت ہے۔"

"چلو تم اندر چلو۔ چلو نشاط بات حویلی سے باہر نہیں جانی چاہیے۔" بیگم صاحبہ نے کہا اور پھر دونوں بہنوں کو اشارہ کیا کہ نشاط کو اندر لے آئیں۔ صوفیہ اور نزہت بمشکل نشاط کو اندر لے گئیں۔ وہ بے چاری ... تھیں۔ اس بات کی حقیقت انھیں معلوم تھی۔ اس لئے ... یہ غصہ ان کی سمجھ میں نہیں آیا تھا۔

کمرے میں داخل ہو کر انھوں نے دروازہ اندر سے بند کر لیا۔

"پانی پلاؤ یار۔ چیخ چیخ کر گلا خراب ہوگیا۔" نشاط نے اندر ... پُرسکون لہجے میں کہا۔

"مگر تمھیں ہو کیا گیا تھا؟"

"افسوس دروازہ بند نکلا ورنہ..." نشاط ہنس پڑی۔ پھر بولی۔ "کیسی رہی؟"

"خدائی پناہ۔ توبہ اداکاری تھی۔"

"ثانی نہیں رکھتی اپنا۔ ڈرامہ نگار بھی میں خود ہوں۔ جانتی ہوں کون سے موقع پر کیسے جذبات ڈرامے کو حقیقت کا رنگ دیتے ہیں۔ سُرخ لوہے پر پے در پے چوٹیں لگا کر ہی اپنی پسند کے مطابق ڈھالا جا سکتا ہے۔ دُشمن کچا ہے۔ پے در پے حماقتیں کر رہا ہے۔ اور یہی حماقتیں ہماری مددگار ہیں۔"

"نشاط تجھے خدا سمجھے۔ پانی لاؤں؟" نزہت بولی اور پھر پانی لینے باہر نکل گئی۔

"بڑی محنت کر رہی ہوں باجی تمھارے لئے، اس گھر کے لئے ورنہ توفیق صاحب تو امی کے کلیجے میں پنجے گاڑ ہی چکے تھے۔ میں نے اس جونک کی کمر میں چنگاری لگائی ہے۔ ارے ہاں، وہ ہمارا چوتھا کردار کہاں ہے؟"

"کون...؟" صوفیہ نے پوچھا۔

"چھیمو...؟"

"میرے کمرے میں ہے۔ ڈری ہوئی ہے بے چاری کہ کہیں شفیق کوئی انتہائی کارروائی نہ کر بیٹھے۔"

"مجال ہے ان بزدلوں کی۔ دروازہ بند کئے بیٹھے ہیں۔ بلا لاؤ باجی اسے بھی۔ اب ذرا ماحول میں شگفتگی ہونی چاہیئے۔ ڈرامہ تقریباً مکمل ہو گیا ہے۔"

"لاتی ہوں۔" صوفیہ نے کہا اور کمرے سے نکل گئی۔ اتنی دیر میں نزہت پانی لے آئی تھی۔ نشاط نے پانی پیا۔ پھر چھیمو آ گئی مسکرا رہی تھی۔

"ڈر رہی ہے چھیمو؟" نشاط نے کہا۔

"اللہ۔ بڑی پٹائی ہو گئی تھی اس کی۔ چوٹ تو نہیں آئی؟" چھیمو نے کہا۔

"رحم آ گیا ہے کیا؟"

"نہیں چھوٹی بی بی۔ بس ڈر لگ رہا ہے۔"

"بدھو ہمت سے کام لو۔ مجال ہے کوئی بال بیکا کر سکے تیرا۔ مگر پورا واقعہ تو سُنا۔" نشاط نے کہا۔

"بس بی بی۔ آپ نے کھیل پورا کر لیا۔ باقی تو ہم تمھیں بتا ہی چکے ہیں۔ رات کو پہنچ گئے۔ ہم سوانگ بن گئے تھے۔ اندر آیا تو ہم نے چیخ پڑے اور پھر باہر بھاگ آئے۔ دروازہ باہر سے بند کر کے ہم نے شور

مچادیا اور سب لوگ آ گئے تو پہلے تو کوئی یہ سمجھ ہی نہیں سکا کہ معاملہ کیا ہے۔ وہ اسے چور سمجھ رہے تھے اور چور سمجھ کر ہی انھوں نے خوب جی بھر کر بازی کی لات گھونسے اور تھپڑ۔۔۔ نیچے گر پڑا تھا۔ پھر جب اصلیت معلوم ہوئی تو انھیں جوش آ گیا۔ ہم نے بھی خوب چیخ دھاڑ مچائی۔"

"تو بھی اَدیجی فنکار ہے چھیمو۔ بے چارے عبداللہ کا بُرا حشر کر دیا گی" نشاط نے کہا اور چھیمو ہنسنے لگی۔

دوسری طرف بیگم صاحبہ بے سکون تھیں۔ انھیں شدید غم و غصہ تھا کہ انھوں نے ان بلاؤں کو اپنی حویلی میں کیوں جگہ دی تھی۔ اب وہ اس قصے کو ختم کر دینا چاہتی تھیں۔ چنانچہ انھوں نے شاہدہ بیگم کو جا پکڑا۔

"جو کچھ ہو چکا ہے شاہدہ باجی۔ کیا اس کے بعد کوئی گنجائش رہ گئی ہے۔ مجھے سخت اور بُرے الفاظ کہنے پر مجبور نہ کریں۔ بڑا گندہ خون ہے آپ کا۔ آپ لوگ فوراً یہاں سے جانے کی تیاری کریں کہیں میں آپے سے باہر نہ ہو جاؤں۔"

"میری آخری درخواست ہے مہرالنساء بیگم۔ صبر و سکون سے معاملے کو ہموار کرنے کی کوشش کریں۔ صرف اخلاق مار کھا رہا ہوں ورنہ ان باتوں کا جواب بھی دیا جا سکتا ہے۔" عقب سے توفیق صاحب کی آواز سنائی دی۔ وہ دوبارہ اندر گھس آئے تھے۔

"آپ کو اندر آنے کے لئے منع کیا گیا تھا۔" مہرالنساء بیگم نے کہا۔

"صورت حال سمجھانے آیا ہوں آپ کو۔ بس بہت ہو چکا۔ ہمارے لئے یہاں سے کہیں جانا مشکل ہے بلکہ ناممکن ہے۔ اس لئے کہ کوئی جگہ ہی نہیں ہے ہماری۔ اوباش فطرت لوگ ہیں رفیق اور شفیق بدمعاشی کرتے رہے ہیں اپنے علاقے میں۔ ان حالات سے خوفزدہ نہیں ہوں گے۔ یہ صرف میرا خوف ہے جو وہ خاموش ہیں ورنہ اتنی بے عزتی برداشت نہ کرتے۔ نکلیں گے تو سہی ہم اس حویلی سے لیکن دو چار لاشیں گرا کر تاکہ جیل میں ٹھکانہ تو مل جائے۔ دوسری کوئی جگہ نہیں ہمارے ذہن میں۔"

"گویا آپ لوگ غنڈہ گردی کریں گے؟"

"میں نے کہا نا فطرت ہی ایسی ہے۔ کیا کیا جائے۔" توفیق صاحب بولے۔

"غلط فہمیوں کے شکار ہیں توفیق بھائی۔ ٹھیک ہے آپ غنڈہ گردی کا بندوبست کریں۔ میں اپنے تحفظ کی فکر کرتی ہوں اس کے بعد شاہدہ بیگم کسی مروت کی گنجائش نہیں رہتی۔" بیگم صاحبہ کمرے سے نکل گئیں۔

❀

زاہد ذوالفقار زیدی کے شب و روز جاری تھے۔ کوٹھی کا ہر فرد اسے چاہتا تھا۔ یہاں تک کہ نوکروں کو بھی اس سے لگاؤ ہو گیا تھا۔ ہر ایک کے کام آنے والا، علم و فن کا سمندر۔ کون سے کام میں دسترس نہیں تھی اسے، کسی بھی موضوع پر گفتگو کر لو۔ اور تو اور لڑکے لڑکیوں کے تعلیمی معاملات میں بھی وہ ان کا مددگار تھا۔ رضا احمد میڈیکل کے آخری سال میں تھا۔ ایک ذہین طالب علم گردانا جاتا تھا وہ، لیکن کئی بار ایسے مواقع بھی آئے جب زاہد نے اس کی مدد کی اور رضا احمد آنکھیں پھاڑ کر رہ گیا۔ اسے تعجب تھا کہ زاہد میڈیکل کی ان الجھی ہوئی گتھیوں کے بارے میں کیسے جانتا ہے۔

اکثر اہل خاندان اس کے بارے میں گفتگو کرتے تو ان کی آنکھیں گہری سوچ میں ڈوب جاتیں: "میں تو صرف یہ سوچتی ہوں کہ آخر اس کی تعلیمی حیثیت کیا ہے۔ کوئی معمولی انسان نہیں ہے وہ اور اگر معمولی انسان نہیں ہے تو پھر اتنی معمولی ملازمت کیوں کر رہا ہے۔" شازیہ کہتی۔

"خدا جانے۔ اس کے بارے میں سوچو تو کوئی بُرا خیال تو ذہن میں ابھرتا ہی نہیں۔"

"وہ بُرا ہو ہی نہیں سکتا۔"

"میں تو صرف ایک نتیجے پر پہنچتی ہوں۔" قدسیہ گہری سانس لے کر بولی: "وہ تنہا انسان ہے۔ محبتوں اور اپنوں کو ترسا ہوا۔ اسے ایک گھر کی تلاش تھی اور وہ گھر اسے مل گیا۔"

"اب تو وہ تنہا نہیں ہے ہم سب اس کے ہیں۔"

"خدا کی قسم اسے دُور رکھ کر سوچو تو عجیب لگتا ہے۔"

"ہاں واقعی۔ اپنے خون کی سی بُو آتی ہے اس میں۔"

"کبھی پوچھو تو سہی اس کی تعلیم کے بارے میں۔"

"بیکار ہے جو بات وہ نہ بتانا چاہے اسے کوئی پوچھ سکتا ہے۔ تعلیم تو درکنار، اس کی ذات کے بارے میں کسی کو کیا معلوم ہے۔ کوئی معلوم کر سکتا ہے اس سے۔۔"

"میرا خیال ہے کوئی نہیں۔" اور یہاں خاموشی چھا جاتی تھی۔ وہ ان سب کا اپنا تھا۔ سب اس سے پیار کرتے تھے لیکن سب اس سے ناواقف تھے اور وہ ان سب کی سوچوں سے بے خبر اپنی دُھن میں مست تھا۔

اس وقت بھی وہ داداجان کے بیڈروم میں تھا اور قہقہے اُڑ رہے تھے۔ اخبار سامنے تھا۔ صحافی انھیں نہیں بھولے تھے اور آج کے اخبار میں بھی فرسٹ ایڈ ہاؤس کے بارے میں ایک مضمون تھا جس میں حسام احمد صاحب کی تعریف و توصیف کی گئی تھی۔ شجاع احمد صاحب کا بھی تذکرہ اور ملک کے تعمیر کنندگان میں ان کا نام لیا گیا تھا۔

"ایک یہ شجاع احمد ہے۔ اسے دولت سمیٹنے کے علاوہ کسی چیز سے دلچسپی ہی نہیں ہے۔ بھئی دولت ہم نے بھی کمائی اور خوب کمائی اور اس کے حوالے کر دی۔ اب جبکہ نوٹوں کے انبار لگے ہوئے ہیں۔ سونے کے ڈھیر چمک رہے ہیں تو ان میں سے ضرورت مندوں کا حق کیوں نہ نکالا جائے۔ کیا یہ دولت اس کوٹھی میں رہنے والوں کے لئے ہی مخصوص ہے۔ نہیں ہرگز نہیں۔ عیش سے گزارو لیکن اپنی عیش کوشیوں میں اُن کا بھی تو خیال رکھو جن کے حصے کی دولت بھی تمہارے قبضے میں آ گئی ہے۔ اُنھیں سونے کے ڈھیر نہ دو زندگی تو دے دو۔" دادا جان کہہ رہے تھے۔

"خدا آپ کو زندگی دے دادا جان۔ ابھی تو بہت سے منصوبے ہیں میرے ذہن میں، فرسٹ ایڈ ہاؤس کو ساری دُنیا کے لئے ایک مثال نہ بنا دوں تو ٹرپل زیڈ نہیں۔"

"ٹرپل زیڈ...؟" دادا جان چونک پڑے۔

"زاہد ذوالفقار زیدی۔"

"سمجھ رہا ہوں، سمجھ رہا ہوں لیکن میرے ذہن میں ایک اور خیال آیا ہے۔"

"وہ کیا دادا جان؟"

"ہمارے خفیہ ڈیپارٹمنٹ کا کاروبار ٹرپل زیڈ کے نام سے ہی کیوں نہ ہو۔ بہت دلکش نام ہے۔"

"اوہ نہیں دادا جان۔ میں اس کے لئے ایک اور نام سوچ چکا ہوں۔" زاہد نے کہا۔

"اوہ، وہ کیا؟" دادا جان نے پُوچھا۔

"آئرن ٹاور... عرف دادا جان، درحقیقت میں آپ کو ایک فولادی مینار سمجھتا ہوں دادا جان، جس کی عظمت مستحکم ہے اور جسے کوئی مضبوط ترین ہاتھ بھی نہیں ہلا سکتا۔ میں اس ادارے کا نام آئرن ٹاور تجویز کر چکا ہوں۔"

"ارے ارے بھئی، کمال کے آدمی ہو۔ دادا جان تو سب کچھ ہیں مگر دادا جان کا یہ آئرن ٹاور بھی تو ٹرپل زیڈ کے سہارے کام کر رہا ہے۔ ورنہ اکیلے دادا جان تو زندگی میں کچھ بھی نہ کر سکے۔"

"ٹرپل زیڈ تو دادا جان کا ایک ادنیٰ خادم ہے۔ مجھے تو دادا جان کے نام ہی سے مسرت ہوتی ہے۔ آپ یقین کریں دادا جان کہ میرا دل تو کبھی کبھی یہ چاہتا ہے کہ کاش میں سچ مچ آپ کے خاندان کا فرد ہوتا اور آپ درحقیقت میرے دادا جان ہوتے۔" زاہد نے کہا۔

"دیکھو بیٹے زاہد، میں جذباتی گفتگو کر کے تجسس قائل کرنے کی کوشش نہیں کر رہا۔ دو مختلف خاندان ہوتے ہیں جن کا آپس میں

کبھی کوئی ربط نہیں ہوتا۔ پھر یُوں ہوتا ہے کہ ایک خاندان کی لڑکی بیاہ کر دُوسرے خاندان میں آجاتی ہے اور اسی خاندان کی نسل کو بڑھاتی ہے۔ خاندان اس کے نام سے آگے بڑھتا ہے۔ مجھے بتاؤ اس لڑکی کا خون کا رشتہ تو کوئی نہ ہُوا۔ کیا اُس کے خون کے تشکیل پانے والے اُس خاندان کے افراد نہیں ہوتے، مَیں یہ کہنا چاہتا ہُوں بیٹے کہ آدم کی اولاد ایک ہی خون سے تشکیل پائی' اب یہ خون کہیں بھی بکھر جائے لیکن جب بھی یہ کہیں آکر جمع ہو جائے اور دل اسے تسلیم کرلے تو زاہد میاں نام کے رشتے سے نہیں' بلکہ آدم کے رشتے سے میری اور تمھاری عمروں میں اگر دادا اور پوتے کا تضاد ہے تو تم مجھے اپنا اصلی دادا جان کیوں نہیں سمجھ لیتے؟"

" واہ داداجان واہ، کیا توجیح پیش کی ہے۔ ویسے ذہنی طور پر تو مَیں آپ کو اب بھی دادا جان سمجھتا ہُوں۔ بس یہ خیال کبھی کبھی ذہن میں آجاتا ہے کہ مَیں اس گھر میں پیدا نہیں ہُوا۔"

" بیٹے اگر مَیں تمھیں دوبارہ پیدا کرا سکتا تو یقین کرو' اس میں کوتاہی نہ برتتا" دادا جان بولے اور زاہد ہنسنے لگا۔

" آپ مجھے پسند کرتے ہیں دادا جان' لیکن آپ یقین کریں' آپ کی شخصیت بھی میرے لئے اس وقت صفِ اول میں ہے۔ میں آپ سے زیادہ اس رُوئے زمین پر کسی کو پسند نہیں کرتا۔"

" شکریہ، شکریہ زاہد میاں' ہم جذباتی گفتگو نہیں کرتے۔ اس لئے کہ یہ غیروں کے درمیان ہوتی ہے۔ ان کے درمیان جنھیں اجنبیت کا احساس ہو۔ یہاں اس احساس کا کوئی وجود نہیں ہے تو ہم ایسی احمقانہ باتیں کیوں کریں۔ اس موضوع کو چھوڑو۔ اب یہ بتاؤ نقشے کا مسئلہ کب تک حل ہو رہا ہے۔ میرے خیال میں بیٹا تم اس سلسلے میں فوری کوشش کر ڈالو۔ جب تک بھاگ دوڑ نہیں کرو گے' یہ کام نہیں بنے گا۔"

" یہ کوئی بات نہیں ہے دادا جان' آج ہی لیں۔ مَیں تقریباً گیارہ ساڑھے گیارہ بجے جاؤں گا اور اس کے بعد شام کو جب واپس آؤں گا تو نقشے کا مسئلہ حل کر کے ہی لوٹوں گا۔"

" ونڈرفل، ونڈرفل، مجھے یقین ہے کہ اگر تم اس مضبوط لہجے میں کوئی بات کہہ دو تو وہ بات ضرور پُوری ہوگی۔" دادا جان نے کہا۔

" اچھا دادا جان اجازت؟"

" ہاں جاؤ، نقشے کا معاملہ آج طے کر لو تاکہ سارے معاملات طے ہو جائیں۔"

" اوکے دادا جان۔" زاہد نے کہا اور وہاں سے نکل گیا۔ وہ دادا جان کے کمرے سے نکل کر آگے بڑھ رہا تھا کہ تھوڑے فاصلے پر سرفراز نظر آیا۔ مسمسی سی شکل بنائے کھڑا تھا۔ زاہد نے اسے دیکھ کر گہری سانس لی اور کمر پر ہاتھ رکھ کر اسے دیکھنے لگا۔

" یقیناً یہاں تمھیں کسی سنتری کے طور پر نہیں کھڑا کیا گیا ہوگا۔ خیریت تو ہے؟"

" ہاں، آپ ہی کا انتظار کر رہا تھا۔" سرفراز نے جواب دیا۔

" جی جی، فرمائیے... فرمائیے۔"

" آئیے ذرا میرے ساتھ' امّی آپ سے ملنا چاہتی ہیں۔"

" اوہ امّی۔ کیوں خیریت تو ہے؟"

" ہاں خیریت ہی ہے' بس یُونہی کہہ رہی تھیں کہ زاہد سے ملاقات نہیں ہُوئی۔"

" اوہ سوری بھئی، واقعی امّی کے پاس نہیں پہنچ سکا' چلو۔"

زاہد نے کہا اور سرفراز کے ساتھ اس کی رہائش گاہ پر آگیا۔ سرفراز کی والدہ کی حالت اب بہت بہتر تھی بلکہ تقریباً صحت یاب ہو گئی تھیں۔ زاہد کو دیکھ کر اُن کی آنکھوں میں ممنونیت کے تاثرات اُبھر آتے تھے۔ زاہد کئی بار اس پر اعتراض کر چکا تھا لیکن شریف النفس خاتون اپنی فطرت کا کیا کرتیں۔

اس وقت بھی زاہد نے ان کے قریب جا کر گردن جھکا لی اور سرفراز کی والدہ نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرنے کی بجائے اس کے سر کو سینے سے لگا لیا۔

" مَیں رسمیات کی قائل نہیں ہُوں بیٹے' دل اندر سے یہی کہتا ہے کہ تم میرے سرفراز سے کسی طور کم نہیں ہو۔"

" یقیناً کم نہیں ہُوں امّی جان، اگر آپ نے مجھے کم سمجھا تو اچھا نہیں ہوگا۔"

" کیسے کم سمجھ سکتی ہُوں بیٹے' بالکل اسی کی مانند ہو تم میرے لئے، حالانکہ یہ الفاظ ہیں مگر خدا گواہ ہے کہ دل کی گہرائیوں سے نکلے ہیں۔"

" مَیں خُود بھی گواہ ہُوں امّی جان، طبیعت کیسی ہے آپ کی؟"

" مَیں بالکل ٹھیک ہُوں بیٹے' بس یہ سرفراز ذرا پریشان ہے۔"

" اوہو ہو... کوئی احمقانہ خیال آگیا ہوگا ذہن میں' ورنہ پریشانی خُود پر مسلط کئے بغیر مسلط نہیں ہوتی۔"

" زاہد بھائی آج امّی کے سامنے آپ سے کچھ گفتگو کرنا چاہتا ہُوں۔"

" جی جی فرمائیے اور دروازہ بند کر دیجئے' یقیناً آپ کی گفتگو خطرناک ہوگی۔" زاہد ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ سرفراز نے واقعی پلٹ کر دروازہ بند کر دیا تھا۔

" زاہد بھائی پھر وہی خیال ذہن پر حاوی ہوتا جا رہا ہے۔ مَیں یہاں کس بات کی تنخواہ وصول کر رہا ہُوں۔"

" یہاں ملازم ہو، مصوری سکھا رہے ہو' نواب شجاع احمد کی صاحبزادی

کو تنخواہ وصول نہیں کرو گے تو پھر کیا کرو گے ؟"

"کیا میں مصوّر ہوں ؟" سرفراز نے پوچھا۔

"ہاں ہو "

"کس طرح زاہد بھائی ' میں تو مصوّری کی ابجد سے بھی واقف نہیں ہوں "

"احمق ہونا اس لئے یہ بات کہہ رہے ہو "

"کیوں ...؟"

"مصوّر کیا ہوتا ہے ۔ کیا کسی مصوّر کی تخلیق خصوصی طور پر ہوتی ہے ۔ اس روئے زمین پر جو آیا ہے سرفراز اور جس کو خداوندِ قدوس نے بینائی دی ہے میرے خیال میں وہ مصوّر ہے ۔ وہ دیکھتا ہے ' عکس اپنے ذہن میں محفوظ کر لیتا ہے اور اسے کاغذ پر اُتار لیتا ہے چنانچہ مصوّر کی تخلیق خصوصی طور پر نہیں ہوتی ' یہ تو انسانی فطرت کا ایک جزو ہے "

"میں نے مان لیا زاہد بھائی اور میں کیا شجاع احمد صاحب بھی مان گئے تھے ۔ کتنے حیران تھے وہ اس وقت آپ کی باتوں پر ' آپ یقین کریں آپ اندازہ نہیں لگا سکتے ۔ وہ بالکل ہی بے بس ہو کر رہ گئے تھے اور جب شجاع احمد صاحب جیسی چیز آپ کے سامنے بے بس ہو کر رہ جائے تو پھر بھلا سرفراز کیا حیثیت رکھتا ہے "

"بھئی دیکھو یہ باتیں مت کرو سرفراز ، جب گفتگو کرنے پڑ گئے ہو تو یا تو قائل ہو جاؤ یا قائل کر دو "

"میں صرف ایک عرض کرنا چاہتا ہوں زاہد بھائی ۔ یہ جو کچھ مجھے مل رہا ہے جائز نہیں ہے "

"دیکھو بیٹے ' میرا مطلب ہے سرفراز میاں منے سے بھائی ... جائز و ناجائز کا تصوّر بلا شبہ ایک حقیقت رکھتا ہے اور ایک شریف النفس شخص کو ناجائز پیسہ حاصل نہیں کرنا چاہیئے لیکن ہر دَور کے کچھ تقاضے بھی ہوتے ہیں ۔ تم صرف مجھے ایک بات بتا دو ، کیا تجریدی مصوّر ' مصوّر ہوتا ہے ؟"

"میں کیا کہہ سکتا ہوں زاہد بھائی "

"بھائی کہہ نہیں سکتے ' سمجھ تو سکتے ہو نا ۔ ایسا کرو میرے ساتھ ہی تجریدی آرٹس کی نمائش میں چلو ۔ ایک بھی تصویر کے بارے میں مجھے صحیح طور پر بتا دو ' مان جاؤں گا ۔ جب لاکھوں افراد تجریدی آرٹس تسلیم کر چکے ہیں ۔ اس کی تعریف و توصیف میں زمین و آسمان کے قلابے ملاتے ہیں اور اسے سمجھ نہیں پاتے تو پھر تم ان لاکھوں سے الگ ہو کر کیوں سوچ رہے ہو ؟ جیسے وہ مصوّر ' ایسے تم ..." زاہد نے کہا اور سرفراز ہنس پڑا ۔

"یہ منطق آپ تراش سکتے ہیں زاہد صاحب ' میں نہیں "

"تمہیں بھی یہ منطق تسلیم کرنا ہوگی سرفراز ' براہ کرم ان احمقانہ باتوں کو سوچنے میں وقت مت ضائع کیا کرو ۔ جو ہو رہا ہے ۔ ہونے دو "

"میں زندگی کی آخری سانس تک آپ سے انحراف نہیں کر سکتا ۔ زاہد بھائی ، لیکن خوفزدہ ہوں "

"کس بات سے ؟"

"اگر اس وقت آپ نہ آتے تو کیا ہوتا ؟"

"کس وقت ؟"

"جب شجاع احمد صاحب نگار خانے میں آ گئے تھے " سرفراز نے ہنس کر کہا ۔

"میں پھر وہی بات دُہراؤں گا ۔ بات اگر تجریدی آرٹ کی نہ ہوتی تو تشویش کی بات تھی ۔ اس فن میں یہی فائدہ ہے ۔ منہ میں رنگ بھرو اور کینوس پر کلی کر دو ' کائنات ' تشکیل ہو گئی ۔ مجال ہے کوئی اس کی تردید کر سکے ۔ ہر چھینٹ کو زمانے کا نشیب و فراز ثابت کر سکتے ہو ۔ بس سمجھانے کا فن آنا چاہیئے "

سرفراز قہقہہ مار کر ہنس پڑا " امی آپ سمجھائیے اسے ۔ یہ بچہ کیسی باتیں کر رہا ہے "

"بیٹے ہماری عزت تمہارے ہاتھ ہے ۔ ذلیل کر کے نہ نکالے جائیں اس گھر سے "

"ایسا کبھی نہیں ہو گا امی ۔ آپ مجھ پر بھروسہ رکھیں "

"ایک اور بات بھی آتی ہے میرے ذہن میں زاہد بھائی "

"کیا ...؟"

"یہ بے تکی مصوّری میں کب تک سکھاتا رہوں گا اس شریف لڑکی کو ۔ ایک دن وہ بھی تو ایک کامیاب مصوّرہ بن جائے گی "

"صرف ایک دو ماہ " زاہد جھٹ سے بولا ۔

"اور اس کے بعد ؟"

"فرسٹ ایڈ ہاؤس تعمیر ہو جائے گا "

"کیا مطلب ؟"

"بھئی فرسٹ ایڈ ہاؤس میں لوگوں کی ضرورت نہیں ہو گی ؟ اس کے لئے ایک مینجر درکار ہو گا اور ہمیں سرفراز علی سے عمدہ آدمی اور کون مل سکتا ہے "

"آپ نے پہلے سے سوچ رکھا تھا " سرفراز نے ہنستے ہوئے کہا ۔

"میں نے تو بہت کچھ سوچ رکھا ہے سرفراز ! دُعا کرو کہ مجھے کامیابی نصیب ہو ۔ اب مجھے اجازت ۔ ایک ضروری کام سے نکلنا ہے کہیں آنے کا وعدہ کر چکا ہوں "

"بہتر ..." سرفراز نے کہا ۔ اور زاہد یہاں سے نکل آیا ۔ تھوڑی دیر

کے بعد وہ کوٹھی سے باہر نکل آیا۔ نقشے کے ساتھ اس نے کچھ اور بھی بندوبست کیا تھا دادا جان کو خوش کرنے کے لئے۔ نقشہ تو کئی دن قبل ہی تیار ہو گیا تھا لیکن زاہد نے آرکیٹیکٹ سے درخواست کی تھی کہ اس نقشے کے مطابق پلاسٹر آف پیرس کا ایک خوبصورت ماڈل بھی تیار کرا دے۔ اسی کی وجہ سے دیر ہو رہی تھی اور اب یہ ماڈل تیار ہو گیا تھا۔

مہرالنساء بیگم شدید طیش کے عالم میں واپس لوٹی تھیں۔ ان کی آنکھیں غصے سے سرخ ہو رہی تھیں تینوں لڑکیاں ان کے ساتھ ہی اُن کے کمرے میں آگئی تھیں۔

بیگم صاحبہ کرسی پر بیٹھ گئیں۔ توفیق صاحب نے جو کچھ کہا تھا وہ اُن کے خواب و خیال میں بھی نہیں تھا۔ شاہدہ بیگم کو انھوں نے بہت بڑی حیثیت دی تھی۔ ان لوگوں کی اس اپنائیت کی وہ بڑی ممنون تھیں لیکن یہ صورتِ حال... اُسے شمشیر زمان یاد گئے۔ شیروں کے شکاری تھے لیکن اُن کی دلجوئی کے لئے ہمیشہ اُن سے ہار مان لیتے تھے۔ مجال ہے کبھی اُن سے انحراف کیا ہو۔ آج وہ نہیں تھے تو کتے شیر ہو رہے تھے۔ کاش کوئی بیٹا ہوتا۔

اُن کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے تو صوفیہ بے قرار ہو کر آگے بڑھی "امی آپ...؟"

"اے صوفیہ باجی، بس پیچھے ہٹ جائیے۔ رونے دیجئے امی کو۔ آپ نہیں جانتیں ہماری امی رو رو کر توفیق خالو کو ہلاک کر دیں گی۔" نشاط نے طنزیہ انداز میں کہا۔

"نشاط! امی رو رہی ہیں۔" صوفیہ درد بھرے انداز میں بولی۔

"تو رونے دیں۔ آخر چیلنج کر کے آئی ہیں ان غنڈوں کو۔" نشاط نے کہا اور بیگم صاحبہ اُسے غصے سے گھورنے لگیں۔

"تم میرا مذاق کیوں اُڑا رہی ہو؟" وہ غمزدہ ہونے کے باوجود غصے سے بول اٹھیں۔

"افسوس کر رہی ہوں امی آپ کی سوچ پر۔ جانتی ہوں اس وقت آپ کے ذہن میں کیا خیالات ہیں۔ ابو یاد آ رہے ہوں گے آپ کو، سوچ رہی ہوں گی کہ کوئی بیٹا نہیں ہے آپ کا۔ بتا دیجئے اس کے علاوہ رونے کی وجہ کوئی اور ہے؟" نشاط نے کہا۔

"غلط سوچ ہے میری؟" مہرالنساء بیگم نے کہا۔

"سو فیصدی۔"

"کیوں؟"

"لڑکیوں نے چوڑیاں پہننا چھوڑ دی ہیں امی۔ اب وہ جہاز اُڑا رہی ہیں۔ ہاں آپ جیسے قدامت پرست لوگ آج بھی اُنھیں چوڑیاں پہنانے پر مصر ہیں۔ کیا بگاڑ لیں گے توفیق خالو ہمارا۔ ہم اپاہج نہیں ہیں۔ آپ اُن لوگوں کو یاد کرتی ہیں جو نہیں ہیں اور اُنھیں نظر انداز کر رہی ہیں جو ہیں۔" نشاط نے کہا۔

"میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آ رہا۔ کیا کروں؟"

"ٹھیکہ دے دیں مجھے ان لوگوں کو نکالنے کا اور پھر کوئی مداخلت نہ کریں میرے کسی معاملے میں۔"

"کیا کرو گی تم۔ جنگ کرو گی ان سے؟"

"ٹھیکہ دے دیں۔ میرا کام میں جانوں۔"

"توفیق بھائی ایسے ہی آدمی ہیں۔ زندگی میں کبھی کام دھندا کوئی نہیں کیا۔ بس یونہی آوارہ گردی کرتے رہے۔ بیٹے بھی اُنھی کے نقشِ قدم پر ہیں نفنگے قسم کے۔ شرابی کبابی۔ ہم ان لوگوں سے..."

"ٹھیکہ دے رہی ہیں یا نہیں؟" نشاط نے ان کی بات درمیان سے کاٹ دی۔

"مگر نشاط...؟"

"مرضی ہے آپ کی۔ اگر نہیں تو اب دھاڑیں مار مار کر روئیں۔ آپ تو ان لوگوں کے جال میں اچھی طرح پھنس گئی تھیں بلکہ کسی نہ کسی بیٹی کو بیاہ دیتیں ان میں سے کسی سے تو اس کے بعد یہ آنسو بھی آپ کے اپنے نہ رہتے۔"

"ہاں۔ مجھ سے غلطی ہوئی تھی۔" بیگم صاحبہ نے کہا۔

"بس بس۔ کافی ہے۔ گویا ٹھیکہ مل گیا مجھے۔ تو جناب کام شروع۔ ہم چلے ڈیوٹی پہ۔" نشاط نے کہا اور اپنی جگہ سے اٹھ گئی۔ مہرالنساء بیگم اُسے دیکھتی رہ گئیں۔

نشاط وہاں سے امداد علی پھوپھا کے پاس پہنچی تھی۔ پھوپھا اور پھوپی ان کے واقعات پر ہی تبصرہ کر رہے تھے۔ "وقت آ گیا ہے پھوپھا جان کہ آپ اپنی اہمیت واضح کر دیں۔" نشاط نے کہا۔

"کیا مطلب نشاط بیٹے؟"

"قرب و جوار میں تو کوئی موجود نہیں ہے؟"

"نہیں، جو کہنا چاہتی ہو بے فکری سے کہو۔" پھوپھا امداد علی بولے۔

"آپ سے کچھ نہیں چھپاؤں گی پھوپھا جان۔ یہ سارا ڈرامہ میں نے کیا ہے۔ صرف اس لئے کہ ایک غلط خاندان ہم پر مسلط ہوا جا رہا تھا اور ان لوگوں نے امی کی آنکھوں پر پردے ڈال دیئے تھے۔ خالو توفیق بھی میرے لئے محترم ہوتے۔ اگر وہ مخلص اور سچے ہوتے۔ یہ لوگ ایک لاوارث خاندان کو لوٹنے آئے تھے۔ میں نے انھیں چت کر دیا۔"

"میں کچھ سمجھا نہیں۔"

"میری آپ سے پہلے بھی گفتگو ہو چکی ہے پھوپھا جان۔"

"ہاں مجھے یاد ہے۔"

"اس کے بعد میں غافل نہیں رہی۔ ان لوگوں کو پڑھتی رہی ہوں اور جو کچھ میں نے سوچا تھا بات اس سے مختلف نہیں ہے۔"

"رات کے واقعات؟"

"وہ ماحول میں نے تشکیل دیا تھا۔"

"کیسے....؟"

"چھیمو کو آلۂ کار بنا کر۔ جس وقت باہر یہ ڈرامہ ہوا اندر ایک اور ڈرامہ ہو چکا تھا۔" نشاط نے دبی زبان سے ان لوگوں کو رات کی کہانی سنائی اور امداد علی پھوپھا دنگ رہ گئے۔ "ان لوگوں کی صحیح تصویر آپ کو دکھانا تھی پھوپھا میاں۔ سو خدا کا شکر ہے میں ان میں کامیاب ہو گئی۔ بڑے زبردست معرکے رہے ہیں اندر اور اب کھلم کھلا دشمنی کا آغاز ہو چکا ہے۔"

"میں سمجھا نہیں۔"

"خالو توفیق نے صاف کہہ دیا ہے کہ اب غنڈہ گردی کریں گے اور یہیں رہیں گے۔ انھیں کوئی نہیں نکال سکتا۔ اگر اس کی کوشش کی گئی تو دو چار لاشیں گریں گی۔"

"ارے زبردستی ہے کوئی۔"

"جی ہاں۔ وہ زبردستی پر ہی آمادہ ہیں۔"

"میں بات کروں گا ان سے۔ یہ کیسے ممکن ہے۔"

"آپ نیک لوگ ہیں پھوپھا جان اور وہ تینوں باپ بیٹے جرائم پیشہ۔ بات کرنے سے کام نہیں چلے گا۔"

"پھر کیا کرنا چاہئے؟"

"خان دلاور یاد ہیں آپ کو؟"

"کیوں نہیں۔ شمشیر بھائی کے جگری دوست تھے۔"

"شیر پور جانا پڑے گا آپ کو۔ تمام باتیں انھیں بتا دیں اور ان سے کہیں کہ وہ یہاں پہنچ جائیں۔"

"بڑی دُور کی کوڑی لائی ہو نشاط۔ خان دلاور پکے خان ہیں۔ بگڑ گئے تو سنبھالنا مشکل ہو جائے گا۔" پھوپھا ہنس پڑے۔

"خالو توفیق نے ہمیں بالکل ہی بے سہارا سمجھ لیا ہے۔ اس طرح گھر پر مسلط ہو گئے جیسے بس اب ان کے سوا کوئی باقی ہی نہ بچا ہو۔ انھیں مزا چکھانا ضروری ہے۔"

"بات کروں ایک بار ان سے؟"

"کوئی فائدہ نہ ہوگا پھوپھا جان۔"

"پھر بھی نشاط۔ میں ملازموں کے حوالے سے ملوں گا۔ کہوں گا کہ وہ سب بدل دیں۔"

"میں آپ کو نہیں روکوں گی لیکن مجھے یقین ہے کوئی حل نہیں نکلے گا اس سے۔ بہرحال آپ بات کر لیں اور اگر ناکام رہیں تو پھر شیر پور چلے جائیں۔"

"بالکل مناسب ہے۔ میں صرف چھیمو کے حوالے سے ملوں گا۔ اندر کی بات ابھی میرے علم میں نہیں ہے؟"

"ٹھیک ہے۔" نشاط نے گردن ہلا دی اور پھر وہ وہاں سے واپس چلی آئی۔

دوپہر کے بعد امداد علی پھوپھا توفیق صاحب سے ملے۔ توفیق صاحب بالکل پُرسکون تھے۔ بیگم صاحبہ اور لڑکیوں نے کھانا کمرے میں کھایا تھا لیکن توفیق صاحب نے اپنے اہلِ خاندان کے ساتھ بڑے ٹھسے سے ڈائننگ ہال میں کھانا کھایا تھا اور رات کے لئے باورچی سے خصوصی فرمائشیں کی تھیں۔ ان کی آواز بے حد پُررعب تھی جیسے اب وہ ہی اس کوٹھی کے مالک ہوں۔

"اور سنو" انھوں نے باورچی کو ڈانٹتے ہوئے کہا "کھانے کے ذائقے میں تبدیلی پیدا کرو، کہیں مجھے تمھاری جگہ کسی دوسرے آدمی کا بندوبست نہ کرنا پڑے۔ مصالحوں میں توازن رکھا کرو۔ یہاں تو کوئی شخص سلیقے سے اپنا کام ہی نہیں کرتا، جاؤ...." اور باورچی گردن جھکا کر چلا گیا تھا۔ بیگم صاحبہ نے ہی اس کا موقع دیا تھا کہ توفیق صاحب سب پر اپنا کنٹرول قائم کریں۔ تمام ملازمین دیکھ چکے تھے کہ یہاں توفیق صاحب کی چلتی ہے اور ان کی مرضی سے ڈھنٹ میں ملازموں کو نکال باہر کیا جاتا ہے لیکن وہ کیا کرتے بے چارے وہ بھی مجبور تھے۔ توفیق صاحب کی بات ماننا ہی پڑتی تھی انھیں۔

بہرطور امداد علی پھوپھا توفیق صاحب کے پاس پہنچ گئے۔ توفیق صاحب قیلولہ کر رہے تھے، بڑی شان سے باہر نکل کر آئے۔

"کہو بھئی امداد کیا بات ہے۔ یہ وقت کسی سے ملاقات کا نہیں ہوتا، خیر اب تم آ ہی گئے ہو تو بتاؤ، خیریت تو ہے؟"

"آپ سے کچھ باتیں کرنا چاہتا ہوں توفیق صاحب۔" امداد علی پھوپھا نے نرم لہجے میں کہا۔

"ہاں بھئی کہو، اچھا ادھر آؤ۔ اُدھر بیٹھتے ہیں۔" توفیق صاحب امداد علی کو لے کر برآمدے کے ایک دریچے کے پاس پہنچ گئے۔ انھیں اپنے کمرے میں بلانا انھوں نے کسرِ شان سمجھا تھا۔ توفیق صاحب کوٹھی میں رہتے تھے اور امداد علی پھوپھا رشتہ دار دل کے کوارٹر میں... ان میں اور امداد علی میں بڑا فرق تھا لیکن امداد علی نے صبر و سکون سے ان کا یہ رویّہ برداشت کر لیا تھا۔

"وہ پچھلی رات کے سلسلے میں بات کرنے آیا تھا۔"

"تو ہوں میری سمجھ میں یہ بات نہیں آئی کہ غیر متعلق لوگ دوسروں کے معاملات میں اس قدر گھسنے کی کوشش کیوں کرتے ہیں۔" توفیق صاحب نے کہا۔

"میں غیر متعلق نہیں ہوں، میرا بھی تعلق ہے اس کوٹھی سے اور آپ سے بہت پہلے سے ہے اور پھر ملازموں نے مجھے کہا ہے کہ میں اس سلسلے میں مداخلت کروں۔"

"ہوں، تو آپ ملازموں کے نمائندے بن کر آئے ہیں۔"

"جی، یہی سمجھ لیں۔"

"کیا کہنا ہے آپ کو؟" توفیق صاحب نے پوچھا۔

"شفیق رات کو چھیمو کے کوارٹر میں کیوں گھسا تھا؟"

"بچہ ہے، نوجوان ہے، نوجوانی میں حماقتیں ہو ہی جاتی ہیں اور پھر یہ بچے ذرا آزاد ماحول میں پلے بڑھے ہیں، زیادہ پروا نہیں کرتے کسی کی، چاقو، بندوق، پستول کا آزادانہ استعمال ان کی فطرت میں شامل ہے۔ میں خود بھی انھیں نہیں سدھار سکا۔ بس وہ لڑکی اسے پسند تھی اور آپ خود سوچئے امداد علی صاحب، تالی ایک ہاتھ سے کبھی نہیں بجتی، کچھ نہ کچھ تو اس کی طرف سے بھی ہوا ہی ہوگا۔ ہم اور آپ بھی جوان تھے اپنی جوانی یاد کریں۔ ساری حقیقتیں کھل کر سامنے آجاتی ہیں۔ بس بہک گیا لیکن شکر ہے کہ کوئی غلط بات نہ ہوسکی۔ آپ ملازموں کو سمجھا دیں کہ آئندہ اس کا خیال رکھا جائے گا اور انھیں ایسی کوئی شکایت نہیں ہوگی۔"

"ٹھیک ہے توفیق صاحب لیکن یہ گھر بچوں کا گھر ہے آپ اگر ان پر کنٹرول نہیں کرسکتے تو پھر بہتر یہ ہے کہ یہاں سے نکل کر کوئی اور جگہ بنالیں اپنے لئے۔"

"کیا بکواس کر رہے ہیں آپ؟ یہ جملے کہنے کی جرأت کیسے ہوئی آپ کو؟" توفیق صاحب آگ بگولا ہوگئے۔

"صحیح عرض کررہا ہوں توفیق صاحب۔ ہم لوگ بھی اس گھر سے تعلق رکھتے ہیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ ہمارے اور آپ کے درمیان کوئی تصادم ہوجائے۔" امداد علی نے کہا۔

"خدا کی شان ہے۔ آپ جیسے لوگ بھی یہ زبان بولنے لگے۔ تصادم کے معنی جانتے ہیں آپ۔ بہتا ہوا خون دیکھا ہے آپ نے۔ کٹی ہوئی گردنیں کبھی نگاہوں سے گزری ہیں؟" توفیق صاحب نے کہا۔

"نہیں گزریں تو اب گزر جائیں۔ کونسی مشکل بات ہے۔ میں نے سمجھا دوں آپ کو، نہیں سمجھ رہے تو آپ کی تقدیر۔"

"تم لوگوں کے بارے میں بھی مجھے سنجیدگی سے سوچنا پڑے گا۔ آخر تم لوگ کس حساب میں یہاں رہ رہے ہو۔ غریب رشتے دار ہو تو یہ تو ضروری نہیں کہ ساری زندگی کے لئے آپڑو۔"

"یہ حویلی شمشیر زماں کی ہے اور مہرالنساء بیگم اسے جہیز میں نہیں لائی تھیں۔ میں شمشیر زماں کی بہن کا شوہر ہوں سمجھے آپ۔ آپ لوگوں میں کیا یہی دستور ہے کہ بہنوئی کے گھر پہ تسلط جمالیں۔ بہرحال یہ بیکار باتیں ہیں۔ میں اس فضول بحث میں نہیں پڑنا چاہتا آپ غور کریں اور مجھے جواب دیں۔" امداد علی صاحب وہاں سے چل پڑے۔

"جواب بہت جلد پیش کردیا جائے گا۔ انتظار کریں۔" توفیق صاحب نے دھمکی آمیز لہجے میں کہا۔ امداد علی واپس چلے آئے۔ یہ ضمیر کو مطمئن کرنے کی ایک کوشش تھی۔ شریف النفس انسان تھے اور کسی کے خلاف بلاوجہ کچھ نہیں کرنا چاہتے تھے۔

واپس آنے کے بعد امداد علی صاحب نے تیاریاں کیں اور پھر خاموشی سے باہر نکل آئے۔ چالاک بھی تھے، آخر دنیا دیکھی تھی۔ شبہ تھا کہ توفیق صاحب تعاقب نہ کریں لیکن ایسی کوئی بات نہیں ہوئی۔ توفیق صاحب اپنے آپ میں مست تھے۔ انھوں نے اس گھر کو بے سہارا سمجھ لیا تھا۔ اس لئے انھیں اطمینان تھا کہ رفیق، شفیق اور وہ مل کر سارا معاملہ سنبھال لیں گے۔ البتہ انھوں نے رفیق سے کہا تھا کہ وہ کچھ ہتھیار ضرور حاصل کرے تاکہ ملازم ٹائپ کے لوگوں کو ان سے دھمکایا جاسکے۔ اور رفیق نے سینہ نکال کر کہا تھا کہ وہ فکر نہ کریں۔

امداد علی صاحب خاموشی سے بس کے اڈے پر آگئے اور پھر بس میں شیرپور چل پڑے جو وہاں سے تیس میل کے فاصلے پر تھا۔ بس کے ایک گھنٹے کے سفر کے بعد وہ شیرپور پہنچے اور پھر خان دلاور کی حویلی چل پڑے۔

خان دلاور بھی رئیس تھے اور شمشیر زماں کے انتہائی گہرے دوستوں میں سے تھے۔ یہ امداد علی صاحب کی خوش قسمتی تھی کہ خان دلاور انھیں مل گئے۔ شکاری فطرت کے آدمی تھے اور شکار کے بغیر سکون نہیں ملتا تھا انھیں۔ چنانچہ کہیں شکار ہی پر جانے کی تیاریوں میں مصروف تھے۔ امداد علی صاحب کو بس سرسری سا پہچانتے تھے۔ یہ علم تھا کہ وہ شمشیر زماں کے رشتے دار ہیں اور شمشیر زماں کی کوٹھی میں رہتے ہیں۔ بہرصورت بڑے تپاک سے ملے اور حویلی کی خیریت پوچھی۔

"میں تو کافی دنوں سے ادھر جا نہیں سکا۔ بھابی نجانے کیا سوچتی ہوں گی لیکن بھائی صاحب میں نے کہہ دیا تھا بھابی جان سے کہ جس وقت بھی خان دلاور کی ضرورت پیش آئے کوئی تعرض نہ کریں۔ حویلی کے سارے معاملات ٹھیک ٹھاک تو چل رہے ہیں نا؟"

"نہیں خان صاحب: میں اسی لئے آپ کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں۔"

"ارے کیوں خیریت، کیا بات ہے؟" خان دلاور نے پوچھا۔

"حویلی کو اب لاوارثوں کا اکھاڑہ سمجھ لیا گیا ہے۔ لوگوں نے اب یہ سوچنا شروع کر دیا ہے کہ مہرالنساء بیگم تنہا رہ گئی ہیں۔ ایک بیوہ کی بھلا کیا حیثیت ہے جس کا دل چاہے اسے دبا لے۔" امداد علی صاحب نے کہا۔

"خدا کی قسم خان دلاور کی زندگی میں یہ ممکن نہیں ہے۔ اگر کسی نے اس حویلی کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی دیکھا تو وہ آنکھیں زمین پر پڑی ہوں گی۔ کون ہے وہ امداد صاحب! مجھے بتائیے کس مردود نے یہ جرأت کی ہے۔ شمشیر زماں میرا یار ہی نہیں میرا بھائی بھی تھا۔ آپ کو دل کی بات بتاؤں۔ میں صرف حویلی کی عزت کے لئے حویلی کے زیادہ چکر نہیں لگاتا۔ مجھے اس کی ایک ایک اینٹ سے پیار ہے۔ مجھے بتائیے وہ کون مردود ہے جس نے حویلی کی طرف غلط نگاہوں سے دیکھا ہے؟"

"توفیق احمد صاحب مہرالنساء بیگم کے بہنوئی ہیں۔ شمشیر زماں نے زندگی میں کبھی انھیں منہ نہیں لگایا کیونکہ اوباش فطرت تھے اور کبھی کوئی ڈھنگ کا کام نہیں کیا انھوں نے۔ ان کی موت کے بعد بیوی بچوں سمیت روتے دھوتے آ گئے۔ اور اب... حویلی پر قبضہ جمانے کی فکر میں ہیں۔"

امداد علی صاحب نے پوری تفصیل خان دلاور کو بتا دی اور خان صاحب آگ بگولہ ہو گئے۔ "تو یہ حرکت کر چکے ہیں وہ۔ ٹھیک ہے انھوں نے اپنی شامت کو دعوت دی ہے۔ کیا نام بتایا ہے آپ نے اس لڑکی کا؟"

"کس لڑکی کا؟"

"وہی ملازم لڑکی؟"

"چھیمو۔"

"کوئی اور رشتے دار ہے یہاں اس کا؟"

"ہاں کرم دین نامی ایک ملازم ہے۔ وہ اس کا ماموں ہے۔"

"کرم دین کو وہاں سے ہٹا دیں دو چار دن کے لئے۔ میں آج ہی شام کو پہنچ رہا ہوں۔"

"بہتر ہے مجھے اجازت دیں۔"

"اوہ نہیں، آرام سے کھانا وغیرہ کھا کر جائیں۔ فکر نہ کریں سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

"اس کا تکلف نہ کریں خان صاحب۔ بس مجھے اجازت دیں۔" امداد علی صاحب نے کہا اور بمشکل خان صاحب نے انھیں اجازت دے دی۔

حویلی کی فضا عجیب ہو رہی تھی۔ توفیق صاحب اپنی دانست میں مہرالنساء بیگم کی چھاتی پر مونگ دل رہے تھے۔ پوری حویلی پر رعب جما رہے تھے۔ شفیق نے کمر میں خنجر لٹکایا ہوا تھا اور اکڑتا پھر رہا تھا۔ مہرالنساء بیگم اپنے کمرے میں محدود تھیں۔

شام کے پانچ بجے ہوں گے کہ چار جیپیں حویلی کے احاطے میں داخل ہوئیں۔ سب سے آگے والی جیپ میں سے خان دلاور نیچے اترا۔ اس کے پیچھے کی جیپوں سے سولہ چھ فٹے جوان نیچے اترے۔ سب کے سب کلاہ پگڑی پہنے ہوئے لمبے کرتوں اور شلواروں میں ملبوس بندوقیں لٹکائے ہوئے تھے۔

"کدر ہے گل پری... گل پری، تمہارا چاچا آ گیا ہے کہاں ہو تم...؟" توفیق صاحب اتفاق سے برآمدے میں کھڑے باہر کا نظارہ کر رہے تھے۔ رفیق اور شفیق بھی ان کے ساتھ موجود تھے اور ان ہتھیاروں کا مظاہرہ کر رہے جو رفیق نے مہیا کئے تھے۔ ان عجیب اور غریب لوگوں کو دیکھ کر سہم گئے۔

"یہ... یہ کیا چکر ہے ابا؟" رفیق گھبرا کر بولا۔

"پ... پتہ نہیں۔ پٹھان ہیں یہ لوگ۔" توفیق صاحب ہکلاتے ہوئے بولے۔

"یہ گل پری کون ہے؟"

"معلوم کرتا ہوں۔" توفیق صاحب ہمت کر کے بولے اور آگے بڑھ گئے۔ انھوں نے خان دلاور کے پاس پہنچ کر بڑی عاجزی سے سلام کیا تھا۔

"وعلیکم سلام بائی صاب چہ گل پری کدر ہے؟"

"کون گل پری؟ یہاں اس حویلی میں۔ میرا مطلب ہے یہاں اس نام کی کوئی خاتون نہیں ہیں۔" توفیق صاحب نے دانت نکال کر کہا۔ اور خان دلاور کی آنکھیں سرخ ہو گئیں۔

"چہ خاتون کا بچہ۔ بک بک مت کرو۔ ہمارا آدمی اس کو ادر دیکھا۔ چہ وہ بولا گل پری ادر نوکر بن کر رہتا ہے اور اس حویلی میں اس نے اپنا نام چھیمو بتایا ہے۔"

"چھیمو، چھی... مو... وہ... وہ..." توفیق صاحب کا رنگ فق ہو گیا۔

"چہ ہاں یارا۔ وہ خطرناک لڑکی ہے۔ ڈرامہ کرتی ہے۔ ابھی تین مہینہ ہوا گھر سے ناراض ہو کر چلا گیا۔ ام اس کو تلاش کرتا۔ ب پتہ چلا کہ وہ ادر حویلی میں چھیمو کے نام سے نوکری کرتا۔ چہ اس کو بولو تمہارا چاچا آیا۔ تمہاری منت کرتا۔ چہ جلدی کرو۔ ہمارا دماغ خراب ہے۔ اگر تم ایک منٹ لگایا تو ام تم کو بھون کر رکھ دے گا۔" خان

دلاور نے شانے سے بندوق اتار لی۔

"م... مَیں... مَیں کوشش... کرتا ہوں" توفیق صاحب گھگھیائے ہوئے انداز میں بولے اور واپسی کے لئے پلٹے لیکن اسی وقت خان دلاور نے عقب سے ان کی گردن پکڑ لی۔

"اوکوشش کا بچہ۔ ام کوشش نہیں مانگتا گل پری مانگتا۔ چہ تھلا کو نئیں ملوم ہم اس کا چاچا ہی نئیں باپ بھی ہے۔ سارے جہان میں اس سے زیادہ کسی کو نہیں چاہتا۔ کوئی اس کا بال بھی چھوئے تو ام اس کا بال بچہ کو اس روئے زمین پر نہیں چھوڑے۔ کوشش مت کرو اسے لاؤ اور... اوئے زنانہ لوگ تم ادر کھڑا شکل کیا دیکھتا ادر آؤ" خان دلاور نے شفیق اور رفیق کو دیکھ کر کہا اور توفیق صاحب کی گردن چھوڑ دی۔

توفیق صاحب کی ٹانگیں لرز رہی تھیں۔ ایک لمحے میں اُن کی آنکھوں میں بے شمار مناظر گھوم گئے تھے۔ جیسے کسی ایسے سرپھرے کی بھتیجی ہوگی، کون سوچ سکتا تھا۔ ابھی وہ حویلی سے رُخصت ہوگی۔ اپنے چچا کو خود پر حملے کی داستان سُنائے گی۔ گولیاں چلیں گی اور ان سب کے بدن میں سوراخ ہی سوراخ ہوں گے۔ سُرخ سُرخ خون اُگلتے ہوئے سُوراخ ۔ ہائے... انھیں ایک سوراخ میں شدید تکلیف کا احساس ہُوا اور اُن کی رفتار تیز ہوگئی۔

"ابا... کون جنگلی ہیں یہ ؟" رفیق نے آگے بڑھ کر پُوچھا۔

"بھاگو... بھاگو... اپنی، اپنی ماں کو سنبھال کر پچھلی دیوار سے نیچے اُتارو۔ نکل چلو۔ سیدھے بس اڈے پر۔ ہائے جلدی کرو گدھو"۔

رفیق اور شفیق نے اندر چھلانگ لگا دی۔ توفیق صاحب ان کے پیچھے تھے۔ کمرے کے دروازے پر رفیق رُکا "مگر ابا۔ کچھ بتا دو تو ؟"

"تقدیر... تقدیر بیٹا، ہمارے ساتھ نہیں ہے۔ وہ... وہ گل... پری... پری ؟"

"پری... ؟" رفیق تعجب سے بولا۔ توفیق صاحب کی سانس پھُول رہی تھی۔ اس لئے وہ کچھ بول نہیں پا رہے تھے۔

"پری کے بچے... موت آئی ہے جلدی کر۔ پہلے یہاں سے نکلو پھر بتاؤں گا۔ تمھارا ستیاناس، سارے کھیل بگاڑ دیئے میرے ارے کیا کیا سوچا تھا۔ میں کہتا ہوں جلدی کرو ورنہ بے موت مارے جائیں گے"، توفیق صاحب بولے۔ اسی وقت باہر سے بندوق کے فائر کی آواز سنائی دی اور توفیق صاحب اُچھل کر اوندھے مُنہ کمرے میں جا گرے۔ "شاہدہ بیگم گھبرا کر کھڑی ہوگئی تھیں۔

"ارے کیا ہُوا... کیا ہوگیا ؟"

"نکل چل رفیق کی ماں۔ خدا کے واسطے نکل چل۔ تباہ ہو جائیں گے ہم لوگ۔ وہ سرپھرا ایک ایک کو ختم کر دیں گے۔ ارے اُنھوں نے گولیاں چلانا شروع کر دی ہیں۔ ابے شفیق جلدی کر، اپنی ماں کو لے کر حویلی کی پچھلی دیوار سے باہر کود جا۔ سامنے کا رُخ... ہائے۔" گولی کی آواز پھر سُنائی دی تھی۔

"ابا میرے کپڑے..." رفیق منمنایا۔

"کفن بن جائیں گے۔ ارے سُن نہیں رہے تم لوگ۔ مت سُنو مرو سُسرو۔" توفیق صاحب خود نکل بھاگے۔ ان کے پیچھے ہی رفیق شفیق اور شاہدہ بیگم بھی دوڑ پڑے تھے۔ نہ جانے کس طرح وہ حویلی کی عقبی چہار دیواری تک پہنچے تھے۔ خان دلاور ہر تیس سیکنڈ کے بعد ایک ہوائی فائر کر دیتا تھا اور توفیق صاحب کو یہ گولیاں خود میں سے گزرتی محسوس ہوتی تھیں۔

"بس اڈے۔ بس اڈے چلو سیدھے" وہ چیخے اور تھوڑی دیر کے بعد سب بس اڈے پہنچ گئے۔ اُنھوں نے یہ بھی تعین نہیں کیا تھا کہ کون سی بس کہاں جا رہی ہے۔ بس جو پہلی بس روانگی کے لئے تیار ملی۔ اسی میں گھس گئے۔

⧉

پلازہ آف پیرس کا خوبصورت ماڈل جس کے صدر دروازے پر خوبصورت الفاظ میں فرسٹ ایڈ ہاؤس لکھا ہُوا تھا۔ دادا جان کے سامنے تھا اور وہ مسرت سے دیوانے ہو رہے تھے۔ تمام اہلِ خانہ جمع تھے ان کے کمرے میں سوائے شجاع احمد صاحب کے۔ شجاع احمد صاحب گھر پر موجود نہ تھے ورنہ اُنھیں بھی طوعاً و کرہاً ہی سہی، آنا تو پڑتا۔ معاملہ حسام احمد صاحب کا تھا۔ فرسٹ ایڈ ہاؤس کا ماڈل اتنا خوبصورت تھا کہ جس نے دیکھا، دیکھتا رہ گیا۔

"مَیں نے اس سے کہا تھا کہ آج فرسٹ ایڈ ہاؤس کا نقشہ مل جانا چاہیئے۔ تم لوگوں نے دیکھ لیا۔"

"اس جادوگر کے لئے یہ بات مشکل نہیں تھی"۔ بیگم شجاع احمد نے پیار بھری نگاہوں سے زاہد کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"ذرا ان لوگوں کو اس کی تفصیل تو بتاؤ زاہد" دادا جان نے کہا۔

"بس یُوں سمجھ لیں آپ لوگ، مَیں دورِ جہانگیری واپس لے آیا ہُوں۔ یہ وہ جگہ ہے جہاں دادا جان کا دفتر ہوگا۔ یہاں سے دُور دُور تک نگاہ رکھی جا سکتی ہے۔ کوئی بھی ضرورت مند، کوئی بھی پریشان حال دادا جان کی نگاہوں سے پوشیدہ نہ ہوگا۔ فرسٹ ایڈ ہاؤس کے سربراہ تک پہنچنے کے لئے سیکرٹریوں، کلرکوں اور چپڑاسیوں کو رشوت دینے کی ضرورت نہیں ہوگی بلکہ اس عمارت میں داخل ہونے والا شخص پہلے اس کے سربراہ سے ملے گا اور اس کی فوری

دادرسی ہوگی۔ اس کا مشرقی حصّہ جس میں سو کمرے ہوں گے، دارالامان ہوگا۔ . . جو بے سہارا خواتین کے لئے مخصوص ہے۔ یہاں ایک دفترِ شادی بھی ہوگا جس میں ان بے سہارا کنواری، بیوہ اور طلاق شدہ لڑکیوں سے شادی کے خواہش مند حضرات اپنے کوائف بیان کرکے اپنے لئے رشتہ حاصل کرسکیں گے اور ادارہ اس شادی کے اخراجات برداشت کرے گا۔ بیرونی حصّہ ایمپلائمنٹ ایکسچینج ہوگا۔ جس کے ذریعے بڑے بڑے صنعتی تجارتی اداروں سے رابطہ قائم کرکے نوجوانوں کے لئے ملازمتیں تلاش کی جائیں گی اور اُنھیں برسرِ روزگار بنایا جائے گا جب تک وہ بے روزگار ہوں گے، اُن کی تمام جائز ضروریات کا خرچ ادارہ برداشت کرے گا۔"

زاہد تفصیلات بتاتا رہا اور لوگ عش عش کرتے رہے۔ داداجان کا سیروں خون بڑھ رہا تھا۔ سب نے اس ادارے کے اغراض و مقاصد کو سراہا تھا۔

ماڈل داداجان کے کمرے میں ایک نمایاں جگہ سجا دیا گیا اور زاہد اس سلسلے میں آئندہ اقدامات کے پروگرام بنانے لگا۔ داداجان نے ابتدائی اخراجات کے لئے بیس لاکھ کا چیک اسے دیا تھا۔ چنانچہ ایک ہفتے کے اندر اندر نقشہ پاس ہوکر آگیا اور کنسٹرکشن کمپنیوں سے اخبارات کے ذریعہ ٹینڈر طلب کرلئے گئے۔ دوسرے ہفتے اخبار کے دو صفحات پر فرسٹ ایڈ ہاؤس کے بارے میں ایک ضمیمہ شائع ہوا جس میں سب سے اُوپر حسام احمد صاحب کی تصویر تھی اور پھر اس ادارے کی تفصیلات تھیں۔

ملک کے دُور دُور کے علاقوں سے حسام احمد کے پاس مبارک باد کے تار موصول ہوئے۔ بہت سے مخیّر حضرات نے فرسٹ ایڈ ہاؤس کی تعمیر میں اپنے حصّے کی پیش کش بھی کی تھی۔ داداجان سخت مصروف ہوگئے۔ اُنھیں ہر وقت ٹیلی فون اٹنڈ کرنے ہوتے تھے۔ تب زاہد نے اُنھیں مشورہ دیا۔

"اب آپ کو فوری طور پر ایک منیجر کا بندوبست کرلینا چاہیئے داداجان۔"

"مجھے . . . ؟"

"جی . . . آپ تنہا کام نہ کرسکیں گے۔ منیجر فی الحال آپ کا سیکریٹری ہوگا اور ادارہ قائم ہونے کے بعد اس ادارے کا منیجر۔ ابھی سے ہم کسی ایسے آدمی کو رکھ لیں گے تو اس کی تربیت بھی ہوجائے گی۔"

"بالکل ٹھیک ہے مگر اس آدمی کا انتخاب تم کرو زاہد۔"

"میں نے انتخاب کرلیا ہے۔"

"تو ٹھیک ہے۔ اسے بُلا لو۔ کون ہے وہ . . . ؟"

"اپنا سرفراز۔"

"کون سرفراز؟"

"قدسیہ کا ماسٹر جو اُسے مصوّری سکھاتا ہے۔"

"وہ، چلا سکے گا اس کام کو؟"

"قابلِ بھروسہ اور ایمان دار آدمی ہے اور پھر ہم اسے اس قابل بنائیں گے۔"

"تو ٹھیک ہے بات کرو اس سے۔"

"اسے قدسیہ کی طرف سے دو ہزار روپے ماہوار ملتے ہیں داداجان ہمیں کم از کم پانچ ہزار سے ابتدا کرنی ہوگی۔"

"تم اگر یہ سمجھتے ہو تو ٹھیک ہے۔ مجھ سے کیوں مشورہ کر رہے ہو؟"

"تو میں اس سے بات کرلوں۔"

"کمال ہے بھئی۔ یہ مجھ سے پوچھنے کی بات ہے۔" داداجان نے بُرا مان کر کہا اور زاہد نے گردن ہلادی۔

سرفراز نے یہ خبر سُنی تو بہت خوش ہُوا۔ "خدا کی قسم زاہد بھائی یہ نئی زندگی دیدی ہے آپ نے مجھے۔ یہاں رہ رہا تھا۔ سکون سے زندگی گزار رہا تھا لیکن ایک خلش تھی دل میں کہ میں یہ تنخواہ ناجائز لے رہا ہوں۔ یہ احساس دل کو مُردہ رکھتا تھا۔ اب ٹھیک ہے کوئی کام تو ہوگا اور سرفراز نے منیجر کا چارج لے لیا۔ قدسیہ اس بات پر بُری طرح بھڑک اُٹھی تھی۔

"یہ کیسے ممکن ہے اُستاد صاحب۔ آپ داداجان کے منیجر ہو جائیں گے تو میرا فن تکمیل کیسے ہوگا؟"

"بھئی بڑی منکسر المزاج ہیں آپ قدسیہ بیگم۔ لوگ جس فن کو حاصل کرنے میں صدیاں لگاتے ہیں آپ نے اسے چند ماہ میں سیکھ کر اپنے اُستاد کو حیران کردیا ہے اور انکساری کا یہ عالم ہے کہ آپ ابھی تک خود کو نامکمل سمجھتی ہیں۔" زاہد نے یہ محاذ بھی سنبھال لیا۔ قدسیہ کے چہرے پر پھول کھل اُٹھے تھے۔ اس نے حیرانی سے مسکراتے ہوئے کہا۔

"تو کیا . . . تو کیا؟"

"سرفراز مجھے آپ کی ذہانت کی کہانی سناتے رہتے ہیں وہ آپ کی ذہانت پر انگشت بدنداں ہیں۔ اُن کا کہنا ہے کہ رنگ اور برش آپ کے غلام ہیں۔ جس لکیر کو آپ بنا دیتی ہیں وہ اپنی جگہ مستحکم ہوتی ہے اور اب ان کے پاس آپ کو سکھانے کے لئے کچھ نہیں ہے۔"

"کیوں اُستاد صاحب؟" قدسیہ نے سرفراز کی طرف دیکھ کر پوچھا اور سرفراز نے کسی جاپانی کے گڈے کی طرح گردن ہلا دی۔ قدسیہ مسرور ہوگئی تھی۔

"مگر مجھے تو یوں لگتا ہے جیسے میں نے ابھی کچھ سیکھا ہی نہ ہو۔"
"فن تو ایک سمندر ہے قدسیہ۔ کون خود کو مکمل کہہ سکتا ہے۔ اس سمندر سے تو چند قطرے ہی مل سکتے ہیں۔ یہ بھی انسان کی خوش بختی ہے۔ تم خود کو فن کی دنیا میں جاننا چاہتی ہو؟"
"ہاں۔ مجھے علم تو ہو کہ میں نے کیا سیکھا؟" قدسیہ نے کہا۔
"تو ٹھیک ہے۔ اپنی تصاویر کی نمائش کر ڈالو۔"
"نمائش...؟" قدسیہ کا دل خوشی سے دھڑکنے لگا۔
"ہاں نمائش۔"
"اللہ... یہ کیسے ممکن ہے؟" وہ مسرت بھرے لہجے میں بولی۔
"کمال ہے۔ زاہد سے یہ بات کہہ رہی ہو؟"
"زاہد۔ آپ میری تصاویر کی نمائش کرا دیں۔ میں تو خود کچھ بھی نہ کر سکوں گی۔"
"بسر و چشم۔ یہ ذمہ داری میں قبول کرتا ہوں۔ تم اس نمائش میں رکھنے کے لئے تصاویر تیار کرنا شروع کرا دو۔ سرفراز اور میں تمھاری ان تصویروں پر نگاہ ڈالتے رہیں گے اور تمھیں مشورے دیتے رہیں گے۔"
"میں... میں کل ہی سے تیاریاں شروع کر دوں گی۔" قدسیہ کپکپاتی آواز میں بولی۔
سرفراز کو وہاں سے نجات ملی تو اس نے کپکپاتی آواز میں کہا۔
"یہ آپ نے کیا کر ڈالا زاہد بھائی؟"
"کیوں بھائی۔ خیریت تو ہے؟"
"یہاں اس کوٹھی میں تو فن مصوری سے کوئی واقفیت نہیں رکھتا ہے۔ یہ کھیل جاری تھا لیکن آپ میری اس رسوائی کو کوٹھی سے نکال کر نمائش گاہ تک لے جا رہے ہیں؟ وہاں تو فن کے جاننے والے مصور اور نقاد ہوں گے۔"
"ہاں۔ ہوں گے۔ پھر...؟"
"قدسیہ کیا بتانے گی اور میں اسے کیا بتاؤں گا؟"
"وہی جو آج تک بتاتی رہی ہے اور وہی جو آج تک بتاتے رہے ہو۔"
"لیکن نمائش میں؟"
"تمھارا کیا خیال ہے۔ نقاد مصور ہوتے ہیں؟ جو جس فن پر جتنا زیادہ بولتا ہے وہ اس سے ... اتنا ہی ناواقف ہوتا ہے۔ فنکار اور نقاد میں بنیادی فرق یہی ہوتا ہے عزیز من کہ نقاد فنکار نہیں ہوتا۔ اسے صرف تنقید کا فن آتا ہے۔ کسی بھی فن سے متعلق نقادوں کی فہرست پر نگاہ ڈالو۔ گنے چنے نام سامنے آئیں گے۔ چند مفاد پرست کسی بھی شخص کو اپنے مفاد کے لئے منتخب کر لیتے ہیں۔ وہ مہمان خصوصی بن جاتا ہے، نقاد بن جاتا ہے اور نہ جانے کیا کیا بن جاتا ہے۔ یہ مفاد پرست اپنے مفاد میں اس کی حیثیت قبول کر لیتے ہیں اور پھر اس نقاد کو دوسروں پر مسلط کر دیتے ہیں۔ وہ نقاد یا مہمان خصوصی جسے چاٹ لگ جاتی ہے بھٹک جاتا ہے۔ وہ درحقیقت خود کو دیانتدار سمجھنے لگتا ہے۔ طرح طرح کی حرکتیں کرتا ہے خود کو اس حیثیت میں برقرار رکھنے کے لئے اور سچ مانو تو سرفراز ایسے ہی لوگوں کے دم سے بہتوں کا بھرم قائم رہتا ہے اور لوگ نہ جانے کیا سے کیا بن جاتے ہیں۔ یہ نقاد ان فنکار لوگوں کو اپنی ذہانت سے ہینڈل کرتے ہیں لیکن خود انھیں ہینڈل کرنے کا بھی ایک فن ہے۔ تم دیکھتے رہو۔ نمائش ہونے دو۔ وہ کھیل دکھاؤں گا کہ ہمیشہ یاد رکھو گے۔"
سرفراز عجیب سی نگاہوں سے زاہد کو دیکھ رہا تھا۔ پھر وہ گہری سانس لے کر بولا۔ "ایک بات کا جواب اور دے دیں زاہد بھائی۔"
"جی جی ارشاد۔"
"آپ کیا ہیں؟"
"خدا حافظ۔ مجھے اور بھی کام ہیں۔ اب سارے ہی سوالوں کے جواب دیتا پھروں۔" زاہد نے کہا اور تیزی سے آگے بڑھ گیا۔ سرفراز بس کر رہ گیا تھا۔ اس کی نگاہیں دور تک زاہد کا تعاقب کرتی رہیں۔ یہ معمہ کبھی حل نہ ہونے کے لئے تھا۔

بات تصور سے باہر تھی۔ کوئی بھول کر بھی نہیں سوچ سکتا تھا کہ توفیق صاحب کی مصیبت اس طرح ٹل جائے گی۔ یہاں تو بڑے بلند و بانگ دعوے تھے۔ قتل و غارت گری کی باتیں ہو رہی تھیں۔ چاقو چھریاں تیز ہو رہی تھیں۔ ایک اچھی خاصی ہنگامہ خیز کیفیت تھی۔ خود نشاط اس مرحلے پر تشویش کا شکار تھی۔ اس کا خیال تھا کہ توفیق صاحب ان حالات کے بعد مستقبل سے مایوس ہو جائیں گے۔ سوچیں گے کہ اس کے بعد حویلی میں کوئی مفاد حاصل کرنے کی کیا گنجائش رہ جاتی ہے لیکن وہ ڈھٹائی پر آمادہ ہو گئے تھے۔ انھوں نے سوچا تھا کہ شمشیر زماں کے عزیزوں کو تو یہاں کوئی حیثیت حاصل نہیں ہے۔ باقی رہ گئیں مہر النساء اور لڑکیاں تو عورتوں کو خوفزدہ کرنا مشکل نہ ہوگا۔
لیکن یہاں بساط الٹ گئی تھی۔ ایک ایسے سلسلے میں شفیق پھنسا تھا جو وہم و گمان سے باہر تھا۔ خان دلاور نے آتے ہی ایسا ڈرامہ کیا تھا کہ توفیق صاحب ایک لمحہ تک نہ ٹک سکے۔

خان دلاور چونکہ تمام حقیقتِ حال سمجھ چکا تھا۔ اس لئے اس نے بہترین چال چلی تھی۔ جہاں ندیدہ انسان تھا اس نے کوئی کسر نہیں چھوڑی اور اس وقت توفیق صاحب بس میں بیٹھے ہوئے تھے اور بس چلنے والی تھی۔ اس کے بندوق بردار لوگ بس کے اڈے پر بھی پہنچ گئے تھے۔ توفیق صاحب نے اُنھیں دیکھ لیا تھا اور سمجھ گئے تھے کہ اگر بس نہ چلی تو بس اڈہ ان کا مقبرہ بن جائے گا لیکن اسے اُنھوں نے اپنی خوش بختی سمجھا تھا کہ خان دلاور کے آدمی دوسری بسوں کو تو جھانکتے پھرے۔ اس بس تک نہ آئے جس میں وہ بیٹھے تھے۔ یہاں تک کہ بس چل پڑی۔

بیگم مہرالنساء کو تو اس وقت خان دلاور کی آمد کا علم ہوا جب باہر گولیاں چل رہی تھیں۔ ان گولیوں نے ایک لمحہ کے لئے تو اُنھیں خوفزدہ کر دیا۔ یہی گمان گزرا تھا کہ توفیق صاحب نے دہشت گردی شروع کر دی۔

کسی اور کی ہمت تو نہ پڑ سکی لیکن نشاط نچلی نہ بیٹھ سکی اور دریافت حال کے لئے نکل آئی۔ اس نے خان دلاور کو گرجتے ہوئے دیکھا اور پھر صورتِ حال اسے معلوم ہوئی تو اس کا دل خوشی سے اُچھل پڑا۔

توفیق صاحب کو لوگوں نے جوتے چھوڑ کر بھاگتے دیکھا تھا۔ تمام سامان چھوڑ گئے تھے۔ خان دلاور نے جو گیم کھیلا تھا اس کے بعد اس کی گنجائش نہیں تھی کہ توفیق صاحب دوبارہ ادھر کا رُخ کریں۔ بسوں کے اڈے سے رپورٹ مل گئی کہ توفیق احمد صاحب معہ اہل خاندان ہیم پور جانے والی بس میں نظر آئے تھے۔

نشاط نے میدان مار لیا تھا۔ مہرالنساء بیگم شکرانے کے نفل پڑھنے بیٹھ گئی تھیں۔ خان دلاور نے زنان خانے میں لڑکیوں سے ملاقات کی۔ "کوئی فکر نہ کرنا بیٹے۔ مجھے اس بات کا علم نہیں تھا کہ کوئی ایسی شخصیت بھی ہو سکتی ہے اس خاندان میں۔ مجھے تو یہاں کی خیریت کی اطلاعات ہی ملتی رہتی تھیں۔ بہرحال کوئی بھی اُلجھن ہو فوراً مجھے اطلاع کرا دیا کرو۔"

"بس بھائی صاحب۔ میں خود شرمندہ ہوں۔ یہ شمشیر زماں کے نہیں میرے خاندان کے لوگ تھے۔"

"یہ ابن الوقت لوگ ہوتے ہیں بہن، ان کا کوئی خاندان نہیں ہوتا۔ مجھے اجازت دیں۔ اب وہ نہیں آئیں گے اور اگر کبھی وہ ادھر کا رُخ کریں تو مجھے فوراً اطلاع دیں۔"

خان دلاور اس کے بعد نہیں رُکا تھا لیکن حویلی میں جشن کا سا سماں ہو گیا۔ چھیمو گانے گا رہی تھی۔ بیگم صاحبہ بھی بہت خوش تھیں۔ ایک مصیبت سے نجات مل گئی تھی۔ امداد علی پھوپھا کو اس وقت نظر انداز نہیں کیا گیا۔ بیگم صاحبہ نے اُنھیں بُلایا تھا۔

"آپ نے بروقت ہماری مدد کی امداد بھائی۔ اس کے لئے میں شکرگزار ہوں۔ میری بھول تھی کہ میں آپ لوگوں کو بھول رہی۔ اگر مجھ سے کوئی کوتاہی ہوئی ہو تو معاف کر دیں۔"

"ہمارا فرض تھا بھابی۔ ہم سے بھی اس فرض کی ادائیگی میں کوتاہی ہوئی۔"

نشاط اکڑی اکڑی پھر رہی تھی۔ اُس نے واقعی ناقابلِ یقین کارنامے انجام دیئے تھے لیکن حقیقت چند ہی لوگوں کے درمیان تھی۔ بیگم صاحبہ کو اس کی ہوا نہیں لگنے دی تھی۔

تیسرے دن چھیمو نے مطالبہ کر دیا۔ "چھوٹی سرکار... میرا انعام۔" اس نے کہا۔

"اوہ چھیمو۔ جو تو مانگے۔" نشاط بولی۔

"مُنہ سے مانگوں۔ شرم نہ آئے گی مجھے۔"

"کیا مطلب؟"

"عبداللہ۔" چھیمو نے کہا اور مُنہ میں دوپٹہ ٹھونس لیا۔

"ارے ارے۔ بڑی بے شرم ہے تُو تو۔ کہاں سے لاؤں تیرا عبداللہ، میری جیب میں رکھا ہے کیا۔ کرم دین چچا سے بات کروں گی۔ اُسے بلواؤں گی۔ تب کہیں جا کر فیصلہ ہوگا۔"

"ہم نے تو یاد دلایا ہے بس۔ ابھی تھوڑی کہہ رہے ہیں۔" چھیمو نے کہا۔

"ہاں ہاں یاد ہے، یاد ہے بے شرم کہیں کی۔" اور چھیمو ہنستی ہوئی بھاگ گئی۔

حویلی کے شب و روز معتدل ہو گئے۔ نشاط کی واپسی کی تیاریاں ہونے لگیں۔ اب کوئی تردّد نہیں تھا۔ امداد علی کو حویلی کے انتظامی اُمور سونپ دیئے گئے۔ جن لوگوں کے ساتھ توفیق صاحب کی وجہ سے ناانصافی ہوئی تھی، اُنھیں اُن کی جگہوں پر بحال کیا گیا۔ تلاش کر کر کے پُرانے ملازموں کو واپس بُلایا گیا۔

پھر ایک شام حویلی کے پُرسکون ماحول میں ایک اور اضطراب پیدا ہُوا۔ موسم ابر آلود تھا۔ لڑکیاں لان پر نکلی ہوئی تھیں۔ نوکر کھیل تماشے کر رہے تھے کہ حویلی کے گیٹ پر ایک شخص نمودار ہُوا۔ ہاتھ میں خوبصورت اٹیچی کیس دبا ہُوا تھا۔ بدن پر سفری لباس تھا۔ بال پریشان تھے لیکن آنکھوں میں زندگی چمک رہی تھی۔

"کوئی مہمان ہے۔" نشاط نے تبصرہ کیا۔

"اجنبی شکل ہے۔" نزہت بولی۔

"ہاں پہلی بار نظر آیا ہے۔" صوفیہ نے بھی تصدیق کر دی اور پھر عالم کو آواز دے کر بولی۔ "عالم دیکھو تو کون ہے؟" اور عالم

نووارد کی طرف بڑھ گیا۔

نووارد دلچسپ نگاہوں سے حویلی کو دیکھ رہا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی۔ عالم قریب پہنچا تو اس نے اٹیچی اس کے ہاتھ میں تھما دیا۔ عالم نے بادلِ نخواستہ اٹیچی لے لیا تھا۔

"فی الحال اسے مہمان خانے کے کسی عمدہ سے کمرے میں رکھوا دو۔ بعد میں کوٹھی میں منگوا لیا جائے گا۔" نووارد نے بڑے اعتماد سے کہا۔

"جی۔ وہ ... بی بی جی"

"ہاں ہاں۔ بی بی جی کو بھی دیکھ لیں گے۔ کہاں ہیں وہ؟"

"وہ نشاط بی بی اور وہ نزہت اور صوفیہ بی بی!"

"بیگم صاحبہ کہاں ہیں اور شمشیر زماں صاحب؟"

"آپ کو نہیں معلوم صاحب۔ نواب صاحب کا تو انتقال ہوگیا۔ کافی عرصہ ہوا۔"

"کیا...؟" نووارد دنگ رہ گیا۔ پھر اس کے چہرے پر اضمحلال کے آثار ابھر آئے: "اوہ... اوہ۔ تو یہ بات تھی۔ اچھا ٹھیک ہے جاؤ۔ تم اندر جاؤ۔" اس کے چہرے کی شوخی کافور ہوگئی تھی۔ عالم اندر چلا گیا اور نووارد لڑکیوں کی طرف بڑھ آیا۔

"نواب صاحب کا انتقال کب ہوا؟" اس نے بغیر کسی تمہید کے کہا۔

"آپ کون صاحب ہیں۔ کہاں سے تشریف لائے ہیں؟" نشاط نے ایک قدم آگے بڑھ کر سوال کیا۔

"میں بیرونِ ملک سے آیا ہوں۔ مجھے ان کی موت کی اطلاع نہ تھی۔" اس نے افسردہ لہجے میں کہا۔

"آپ کا ان سے کیا تعلق تھا جناب؟" نزہت نے پوچھا۔

"جو آپ سے تھا!"

"کیا مطلب؟"

"وہ میرے باپ تھے۔" نووارد نے کہا اور لڑکیوں کے منہ کھلے رہ گئے۔ ان کی آنکھیں تعجب سے پھٹی رہ گئی تھیں۔

"کیا کہہ رہے ہیں آپ؟"

"جی درست کہہ رہا ہوں۔ آپ لوگ مجھے بھول گئیں لیکن میں نے ہمیشہ آپ کو یاد رکھا۔"

"کون ہیں آپ؟"

"ظفر ہے میرا نام... اور حسینہ میری ماں کا نام ہے۔ کہیے اب کچھ یاد آیا آپ کو؟"

"اوہ۔ اوہ آپ... آپ ظفر ہیں جو گھر سے بھاگ گئے تھے۔ جو، جو لاپتہ ہوگئے تھے؟" نشاط تعجب سے بولی۔

"جی، دماغ درست ہے آپ کا۔ میں بھاگ گیا تھا۔ آپ خود بھاگ گئی ہوں گی۔ میں تو لندن میں تعلیم حاصل کر رہا تھا۔" نووارد نے ناخوش گوار لہجے میں کہا۔

"آپ اندر چلیے۔ امی سے ملیے۔ پلیز آئیے۔" نشاط نرم لہجے میں بولی۔ ظفر ان میں سے کسی کو یاد نہیں تھا لیکن اس کا تذکرہ کئی بار ہوا تھا۔ حسینہ کے سلسلے میں۔ اس لیے اس کی شخصیت انھیں یاد تھی۔

اندر جاتے ہوئے اس نے مضمحل لہجے میں پوچھا: "نواب صاحب کا انتقال اچانک کس طرح ہوگیا؟"

"شیر کا شکار ہوگئے تھے۔ بس اچانک حادثہ ہوا تھا۔ آپ واقعی لندن میں تھے، آپ کو اس سلسلے میں نہیں معلوم ہوسکا؟" نشاط نے پوچھا۔

"ہاں۔ مجھے علم نہیں ہوا۔ کون اطلاع دیتا مجھے؟" اس نے افسوس بھرے لہجے میں کہا۔

لڑکیاں اندر داخل ہوگئی تھیں۔ عالم ملازم کو بیگم مہر النساء نے دیکھ لیا تھا اور اس نامعلوم مہمان کو دیکھنے باہر نکل آئی تھیں۔ ظفر کو لڑکیوں کے ساتھ دیکھ کر وہ ٹھٹک گئیں۔ وہ اسے پہچان نہیں سکی تھیں۔ ظفر نے انھیں سلام کیا تھا۔

"وعلیکم سلام۔ میں پہچان نہیں سکی بیٹے۔" انھوں نے نرم اور شفیق لہجے میں کہا۔

"بیگم صاحبہ میں ظفر ہوں، حسینہ کا بیٹا۔" آنے والے نے کہا اور بیگم صاحبہ ٹھٹک گئیں۔ ان کے چہرے کے تاثرات اب بدلنے لگے تھے۔ انھیں اس لڑکے کے خدوخال یاد آ رہے تھے۔ چند لمحات کے بعد ان کا چہرہ سُت گیا۔

"تو تم ظفر ہو؟"

"جی۔ آپ مجھے پہچان نہیں سکیں؟"

"پہچان لیا ہے۔ خیریت...، یہاں کیسے آئے؟" بیگم صاحبہ نے رکھائی سے پوچھا۔

"جی...؟" ظفر حیرت سے بولا: "پھر کہاں جاتا؟"

"یہ بتانا ہماری ذمہ داری تو نہیں ہے؟"

"بیگم صاحبہ آپ... آپ؟" ظفر کے لہجہ میں کرب نمایاں ہوگیا تھا۔ نشاط آگے بڑھی اور بولی۔

"آپ اندر تشریف لے چلیں۔ امی آئیے بیٹھ کر بات ہوگی۔ یہ نہ جانے کتنا سفر طے کر کے آئے ہیں؟"

"نشاط۔ بچوں کی حدود ہوتی ہیں۔ تمھارا بولنا ضروری ہے؟" بیگم صاحبہ آنکھیں نکال کر بولیں اور نشاط منہ کھول کر رہ گئی۔ بیگم صاحبہ سے اس بے رحمی کی توقع نہیں تھی۔

"میں تمھاری کیا مدد کرسکتی ہوں ظفر۔ سنا ہے تم لندن میں تھے؟"

"جی۔ ڈیڈی نے مجھے تعلیم کے لئے لندن بھیج دیا تھا۔ مجھے وہاں باقاعدہ خرچ ملتا تھا جو اچانک بند ہو گیا۔ اس کے ساتھ ہی ڈیڈی کے خطوط بھی بند ہو گئے۔ مجھے خط لکھنے کی ممانعت تھی۔ اس لئے میں نے خط تو نہیں لکھا لیکن میں بہت پریشان تھا۔ آپ یقین کریں میں نے بہت ضبط کیا لیکن جب برداشت نہ کر سکا تو وہاں سے چل پڑا۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ... کہ ڈیڈی اب... " اس کی آواز بھرا گئی۔

"تو خرچ کی پریشانی تمھیں یہاں لے آئی لیکن افسوس تمھاری اس مشکل کا کوئی حل نہیں ہے یہاں۔ نواب صاحب کے انتقال کے بعد میں نے فضول قسم کے تمام وظیفے بند کرا دیئے تھے مجھے اُڑتی اُڑتی بھنک ملی تھی کہ تم لندن میں ہو جبکہ اس سے قبل یہ مشہور تھا کہ تم گھر سے بھاگ گئے ہو۔"

"وظیفہ... مجھے وظیفہ ملتا تھا؟ آپ بھول رہی ہیں بیگم صاحبہ کہ میں شمشیر زماں کا بیٹا ہوں۔"

"خوب۔ یہ ڈرامہ سوچ کر آئے ہو تم۔ کوئی خاص بات نہیں ہے ظفر۔ ابھی چند روز قبل ایک اور ڈرامہ باز یہاں سے بھاگ چکا ہے۔ ہم اتنے کمزور نہیں ہیں کہ ہر کس و ناکس ہم پر حملہ آور ہو جائے۔ تمھیں اپنے مشن میں ناکامی ہو گی۔" بیگم صاحبہ پتھریلی آواز میں بولیں۔ رقابت اُبھر آئی تھی۔ یہ الفاظ اُن کے لئے بہت تکلیف دہ تھے کہ ظفر شمشیر زماں کی اولاد ہے اور شمشیر زماں نے زمانے کو دھوکہ دے کر اسے لندن میں رکھ چھوڑا تھا۔

"یہ ڈرامہ نہیں ہے بیگم صاحبہ۔ ایک ٹھوس حقیقت ہے۔ لندن کے اسکولوں میں، کالجوں میں، یونیورسٹیوں میں میری ولدیت میں شمشیر زماں کا نام ہے، ان کے دستخط ہیں۔"

"ہوں گے لیکن لندن کا قانون اس ملک میں رائج نہیں ہے اور اگر تم شمشیر زماں کے بیٹے ہو بھی... تو... معاف کرنا تمھاری ماں سے ان کا نکاح نہیں ہوا تھا۔"

"بیگم صاحبہ۔" ظفر کی آواز میں غراہٹ ابھر آئی۔ "آپ بے رحم اور بداخلاق ہی نہیں بے غیرت بھی ہیں۔ اپنے مرحوم شوہر پر یہ الزام لگاتے ہوئے آپ کو حیا نہیں آئی۔"

"بے غیرت میں نہیں تمھاری ماں تھی جو چور دروازے سے اس حویلی میں گھس آئی تھی اور آخر تک یہاں رہی۔"

"میری ماں کہاں ہے؟" ظفر نے سرد لہجے میں پوچھا۔ اس کی آنکھوں سے خون جھلکنے لگا تھا۔

"کسی اور گھر میں کوئی ڈرامہ کر رہی ہو گی۔ ہمیں کیا معلوم؟" بیگم صاحبہ نفرت سے بولیں۔

"آپ انتہائی ذلیل فطرت ہیں بیگم صاحبہ۔ میں نے کسی انسان میں اتنی گراوٹ کا تصور بھی نہیں کیا تھا۔ میں پوچھتا ہوں میری ماں کہاں ہے؟"

"زبان سنبھالو ظفر۔ میں تمھاری زبان کھنچوا لوں گی۔ کیا سمجھا ہے تم نے ہمیں۔ میں نہیں جانتی حسینہ کہاں ہے۔ اُسے اس گھر سے نکال دیا گیا تھا۔" بیگم صاحبہ غضب ناک ہو کر بولیں۔

"کاش۔ کاش شمشیر زماں... کاش شمشیر زماں میرے باپ نہ ہوتے۔ کاش آپ اُن کی بیوی نہ ہوتیں تو میں آپ کو ان الفاظ کا جواب دیتا اور ایسا دیتا کہ آپ مرنے کے بعد بھی یاد رکھتیں۔ آپ نے کہا ہے کہ میری ماں نے شمشیر زماں سے نکاح نہیں کیا۔ اگر یہ بات جھوٹ نکلی بیگم صاحبہ تو... تو آپ یقین کر لیں کہ میں آپ کو سڑکوں پر لے آؤں گا۔ میں آپ کو ایسی عبرت ناک سزا دوں گا ان الفاظ کی کہ آپ قیامت تک یاد رکھیں گی۔ اس بات کو نوٹ کر لیں بیگم صاحبہ۔"

"ہاں ہاں نوٹ کر لیا ہے میں نے۔ جاؤ تحقیقات کرو۔ کرم دین۔ بابا کرم دین۔" بیگم صاحبہ نے دُور سے گزرتے ہوئے کرم دین کو دیکھ کر آواز دی اور کرم دین ادھر آ گیا۔ "یہ حسینہ کا بیٹا ظفر ہے۔ خود کو شمشیر زماں کی اولاد بتا رہا ہے۔ اسے بتاؤ کیا حسینہ نے شمشیر زماں سے نکاح کیا؟"

"ارے ظفر... ظفر حسینہ کا بیٹا؟" کرم دین بُری طرح اچھل پڑا۔ "تو کہاں چلا گیا تھا بیٹے۔ تو..."

"میں نے تم سے جو کہا ہے اس کا جواب دو کرم دین۔" بیگم صاحبہ گرجیں اور کرم دین سنبھل گیا۔

"ہم نوکر لوگ مالکوں کی باتوں کی کرید نہیں رکھتے بیگم صاحبہ۔ ہمیں ان باتوں کا کیا معلوم؟" اس نے کسی قدر ناخوش گوار لہجے میں کہا۔

"میری ماں کو مار ڈالا تم لوگوں نے۔ مجھے بتاؤ وہ کہاں ہے۔ خدا کی قسم، وحدہٗ لاشریک کی قسم بیگم صاحبہ اگر میری ماں مجھے نہ ملی تو... اگر اس پر لگایا گیا الزام غلط نکلا تو میں تمھاری ان بیٹیوں کو طوائف بنا دوں گا۔ تمھیں بھیک منگوا دوں گا سڑکوں پر... اس حویلی کو جلا کر خاکستر کر دوں گا۔ نام و نشان مٹا دوں گا شمشیر زماں کے خاندان کا۔ یہ میرا عہد ہے اور یہ عہد میرا ایمان ہے۔"

"نکل جاؤ یہاں سے۔ کرم دین تمام نوکروں کو بلا لو گولی مار دو اسے۔ اس کی لاش حویلی کے دروازے پر ڈلوا دو۔ میں ذمہ دار ہوں۔" بیگم صاحبہ وحشیانہ انداز میں چیخیں۔

"نہیں بیگم صاحبہ۔ ہم نوکر لوگ مالکوں کے وفادار ضرور ہوتے ہیں لیکن وحشی درندے نہیں ہوتے۔ یہ درندگی آپ کو ہی مبارک ہو۔ آؤ ظفر بیٹے آؤ۔ تم غلط جگہ آ گئے۔ یہ درندوں کی بستی ہے۔

آؤ۔" کرم دین کا ضبط بھی جواب دے گیا اور بیگم صاحبہ کی زبان گنگ ہو گئی۔ انھیں کرم دین سے یہ اُمید نہیں تھی۔ سب سے پرانا، سب سے وفادار ملازم تھا۔

ظفر کی اٹیچی بیگم صاحبہ نے کمرے میں نہیں جانے دی تھی۔ ظفر نے آگے بڑھ کر اٹیچی اُٹھائی اور کرم دین کے ساتھ باہر نکلتے ہوئے بولا۔ "اپنے بُرے وقت کا انتظار کرو بیگم شمشیر زماں۔ انتظامات کرلو۔"

"آؤ ظفر۔ تمھیں یہ باتیں زیب نہیں دیتیں۔ آؤ بیٹے۔" کرم دین ظفر کا ہاتھ پکڑ کر باہر نکل گیا۔

بیگم شمشیر زماں غصّے سے تھر تھر کانپ رہی تھیں۔ غصّے کی وجہ سے ان کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ تینوں لڑکیاں ساکت و جامد کھڑی ہوئی تھیں۔ پھر نشاط بھاری قدموں سے واپس اپنے کمرے کی طرف چل پڑی۔ بیگم صاحبہ نے اس کی طرف توجہ نہیں دی تھی۔

کافی دیر تک یہی کیفیت رہی۔ پھر بیگم صاحبہ نے کہا۔ "نزہت امداد علی بھائی کو بُلاؤ۔ ہمارے ستارے گردش میں ہیں۔ کوئی نہ کوئی مُصیبت کھڑی رہتی ہے سر پر۔"

"معاف کیجیے گا امّی۔ خدا کا قانون غلط نہیں ہے۔ کبھی ہم کسی پر زیادتی کرتے ہیں اور کبھی کوئی ہم پر۔۔۔" نزہت آہستہ سے بولی۔

"کیا بکواس کر رہی ہو۔" بیگم صاحبہ گرجیں۔

"میں آپ سے بحث کی ہمت نہیں رکھتی امّی لیکن آج آپ ایک نئی شکل میں ہمارے سامنے آئی ہیں۔" نزہت نے کہا اور وہاں سے پلٹ گئی۔ صوفیہ بھی اس کے پیچھے چل پڑی تھی۔ بیگم صاحبہ تنہا کھڑی دیر تک اس راستے کو گھورتی رہیں، جدھر لڑکیاں گئی تھیں اور پھر انھوں نے اس پریشانی سے ہاتھ ملے اور اپنے کمرے میں آکر ایک آرام کرسی میں دراز ہوگئیں۔ اُن کے پُورے بدن میں سنسناہٹ ہو رہی تھی۔

فرسٹ ایڈ ہاؤس کی بُنیادیں کُھدیں۔ پہلی کدال حسام احمد نے چلائی تھی۔ ملک بھر کے اخبارات نے اس رسمِ افتتاح کی تصویریں شائع کی تھیں۔ گھر کے تمام لوگ اس افتتاح میں شریک تھے، سوائے شجاع احمد کے۔ شجاع احمد چالاک تھے۔ ایک ضروری کام نکال کر جاپان چلے گئے تھے لیکن حقیقت یہ تھی کہ وہ اس نقصان کو برداشت نہیں کر پا رہے تھے۔ فرسٹ ایڈ ہاؤس کے منصوبے کے بارے میں وہ آخر تک یہی سوچتے رہے تھے کہ اس میں کوئی نہ کوئی پیچ نکل آئے گی اور یہ منصوبہ ناکام ہو جائے گا لیکن زاہد کی ذہانت نے اس میں کوئی سقم نہیں چھوڑا تھا اور تمام مراحل نہ صرف بہ احسن و خوبی طے ہو گئے تھے بلکہ ادارے کے اغراض و مقاصد کو حکومت کی طرف سے بھی سراہا گیا تھا۔ نجی اور سرکاری شعبوں نے ہر طرح کی امداد کی یقین دہانی کرائی تھی۔ ملک کے طول و عرض سے بہت سے افراد نے حسبِ توفیق مالی اعانت کی پیش کش بھی کی تھی۔

اگر معاملہ حسام احمد کا نہ ہوتا تو شاید شجاع احمد اپنے اثر و رسوخ سے کام لے کر اس ادارے کو کبھی تعمیر نہ ہونے دیتے لیکن باپ کی مخالفت کس طرح کر سکتے تھے۔ جس سے بھی کسی کام کے لئے کہتے وہ حیرت کی نگاہ سے اُنھیں دیکھتا۔ اُن کی پوزیشن بُری طرح خراب ہو جاتی۔ اس سلسلے میں اُنھوں نے زاہد کو شیشے میں اتارنے کی کوشش کی تھی لیکن زاہد وہ بلا تھی کہ شیشے سے تیر کو توڑ دے۔ وہ تو اس ادارے کا رُوحِ رواں تھا۔ وہ بھلا ان کے جال میں کس طرح آتا۔ سچی بات تو یہ تھی کہ زاہد نے اُنھیں اس سلسلے میں شکستِ فاش دی تھی اور اب کچھ ان کے ہاتھ میں نہ رہا تو وہ چُپ ہو کر بیٹھ گئے۔ زیادہ سے زیادہ یہی کر سکتے تھے کہ اس کی تقریبات میں شریک نہ ہوتے۔ یہ اُنھوں نے کر لیا تھا۔

لیکن کب تک جاپان میں بیٹھے رہتے۔ واپس آنا ہی تھا۔ واپس آگئے۔ اخباری نمائندے فرسٹ ایڈ ہاؤس کے بارے میں ان کے خیالات جاننے کے خواہش مند بھی تھے اور اتفاق سے انھی دنوں میں حسام احمد صاحب سے انٹرویو بھی لینا تھا اُنھیں۔۔۔ چنانچہ حسام احمد صاحب کے ساتھ وہ بھی پکڑے گئے۔ اُنھوں نے فرار ہونے کی کوشش کی تھی لیکن ممکن نہ ہو سکا۔ ایک اخباری نمائندے نے حسام احمد سے سوال کیا۔

"یہ تعمیر کب تک مکمل ہو جائے گی؟"

"انشاءاللہ ایک سال کے اندر اندر۔۔۔ دن رات کام ہوگا۔ کئی کنسٹرکشن کمپنیاں مصروف ہیں۔ ایک خاص انداز سے تعمیر ہو رہی ہے اس کی۔" حسام احمد نے جواب دیا۔

"اس کے اخراجات کی موجودہ شکل کیا ہے؟"

"نوٹوں کی شکل میں ہو رہے ہیں۔" ایک کونے سے زاہد کی آواز اُبھری اور نمائندے مسکرانے لگے۔ سوال کرنے والا جھینپ گیا تھا۔

"میرا مطلب ہے، دُوسرے حضرات نے اس سلسلے میں۔۔۔ مالی معاونت کی ہے؟"

"عزیزم۔ ابھی تو میرا بینک بیلنس چل رہا ہے اور اُمید ہے کافی عرصہ چل جائے گا۔ زمین برخوردار نے عنایت کر دی ہے لیکن اس کے بعد سے وہ بھی خاموش ہیں۔ میں اس سلسلے میں سچے دل سے کام کر رہا ہوں۔ باقی اللہ مسبب الاسباب ہے۔

ہاں اگر اس سلسلے میں شجاع احمد کوئی اطمینان دلا دیں تو بڑی ڈھارس بندھ جائے۔" حسام احمد نے کہا۔ شجاع احمد کی جان نکل گئی تھی۔ مگر یہ بلت نہیں تھی ایک ایک لفظ اخبار کی ملکیت تھا۔ اس لئے جلدی سے بولے۔

"میرے والد محترم نے جس نیک کام کا بیڑا اٹھایا ہے۔ اس سے میری گردن بھی فخر سے بلند ہوگئی ہے۔ میرے پاس جو کچھ ہے۔ حاضر ہے۔ فرسٹ ایڈ ہاؤس کی تکمیل میں کوئی رکاوٹ نہیں ہوگی۔" شجاع احمد صاحب کے یہ الفاظ نوٹ کر لئے گئے۔ وہ اب گردن تک پھنس گئے تھے۔ اس وقت تو مسکراتے رہے لیکن رات کو خواب گاہ میں خاصا ہنگامہ کیا تھا انھوں نے۔

"ابا میاں ہم لوگوں کے تابوت تیار کر رہے ہیں اور اس کی بُنیاد وہ منحوس بلا ہے جو ہمارے گھر میں آ گھسی ہے۔"

"کون... زاہد؟"

"زاہد اور صرف زاہد۔"

"بال بچوں والے ہو شجاع۔ دل پر ہاتھ رکھ کر بات کرو۔ وہ بھی کسی کا لختِ جگر ہوگا۔ بھلا ابا میاں کو کوئی ان کی مرضی کے خلاف کچھ کرنے پر مجبور کر سکتا ہے۔" بیگم صاحبہ نے کہا۔

"میں تو اس گھر پر تباہی کے بادل منڈلاتے دیکھ رہا ہوں۔ ہر فرد کا رنگ ہی بدلا ہوا ہے۔ نہ جانے کیا ہونے والا ہے۔"

"جو کچھ ہوگا ٹھیک ہوگا۔ تم فکر مت کرو۔"

"ہاں۔ ہاں تمہیں اندازہ ہو رہا ہے جو پروجیکٹ ابا جان نے شروع کیا ہے وہ کروڑوں روپے سے تکمیل تک پہنچے گا۔ ابا میاں کا بینک بیلنس کتنا ہے۔ آج اخباری نمائندوں کے سامنے انھوں نے مجھے پھانس لیا ہے لیکن میں یہ سب کچھ ہونے نہیں دوں گا۔ شجاع احمد ہے میرا نام بھی جو کچھ بنایا ہے اس کی حفاظت بھی کرنا جانتا ہوں۔ دیکھ لوں گا ایک ایک کو۔"

بیگم صاحبہ نے کوئی جواب نہیں دیا اور شجاع احمد بک جھک کر خاموش ہوگئے۔ دوسری صبح ناشتے کی میز پر تھے کہ ہارون پر نگاہ جا پڑی۔ داڑھی بڑھی ہوئی تھی۔ بال بھی اُلجھے اُلجھے اور بے ترتیب سے نظر آ رہے تھے۔ چونک پڑے۔

"ہارون؟"

"جی ابو۔"

"کچھ پریشان ہو؟"

"جی نہیں۔"

"پڑھائی کیسی ہو رہی ہے؟"

"ٹھیک ہو رہی ہے۔"

"بھئی پھر یہ داڑھی وغیرہ شیو کیوں نہیں بنائی؟"

"وہ بس ابو۔ ایسے ہی۔"

"بھئی داڑھی بھی آج کل فیشن بن گئی ہے۔ یہ فیشن کی داڑھی ہے یا پھر طبیعت کچھ مذہب کی طرف راغب ہوگئی ہے۔ اگر ایسا ہے تو مجھے خوشی ہوگی۔"

"جی ابو۔" ہارون نے کھیسیں نکال دیں۔ کچھ اور کہنے کی ہمت نہیں ہوئی تھی لیکن شجاع احمد کو دلچسپی پیدا ہوگئی۔ انھوں نے چند اور باتیں کیں لیکن ہارون کھلا نہیں تھا۔ ناشتے کے بعد شجاع احمد اس کے کمرے کی طرف چل پڑے۔ بیٹے کی اس کیفیت کے بارے میں جاننا چاہتے تھے۔

ہارون کو گمان بھی نہیں تھا کہ شجاع احمد اس طرح آ جائیں گے۔ دستک دی تو اس نے دروازہ کھول دیا اور پھر بوکھلا کر ایک قدم پیچھے ہٹ گیا۔

شجاع احمد مسکراتے ہوئے اندر داخل ہوئے۔ "بھئی میں تمہارے اس بدلے ہوئے روپ سے بہت متاثر ہوں۔" لیکن جملہ پورا نہ کر سکے تھے وہ۔ سامنے ہی ایک ریچھ کی تصویر لگی ہوئی تھی۔ اتنی بڑی تصویر کہ کمرے کے درمیان کی دیوار ہی ڈھک گئی تھی۔ بالوں کے انبار سے اگر ایک انسانی چہرہ نہ جھانک رہا ہوتا تو تمیز کرنا مشکل تھا کہ وہ انسان ہے یا ریچھ۔ بائیں سمت نگاہ پڑی تو دردِ کمر کا ایک دشنیہ نظر آیا۔ ویسا ہی ایک بھالو نوجوان کرب کے عالم میں کمر ٹیڑھی کئے کھڑا تھا۔ منہ پھٹا ہوا تھا آنکھیں چڑھی ہوئی تھیں۔ چھوٹی چھوٹی عجوبہ روزگار تصویریں خوبصورت فریموں سے آراستہ دیواروں پر آویزاں تھیں۔ ان تصویروں کے ساتھ مغربی ساز بھی لٹکے ہوئے تھے۔ مینڈولن، الیکٹرک گٹار، وائلن اور نہ جانے کیا کیا۔

شجاع احمد کی مسکراہٹ کافور ہوگئی۔ مغربی ممالک جاتے رہتے تھے۔ خود تو سنجیدہ آدمی تھے لیکن کاروباری معاملات میں اکثر بڑے بڑے ہوٹلوں میں مدعو ہوتے تھے اور ان ہوٹلوں اور نائٹ کلبوں میں انھوں نے نئی نسل کے ان بندروں کو دیکھا تھا جو اسٹیج پر دھاڑتے رہتے تھے۔ یہ بندر آج تک شجاع احمد صاحب کی سمجھ میں نہیں آئے تھے اور نہ ہی وہ لوگ جو ان کو سمجھ لیا کرتے تھے۔

لیکن ہارون کے کمرے کی یہ حالت، بکھرے بال بڑھی ہوئی داڑھی دیکھ کر وہ دنگ رہ گئے۔ یہ لعنت ان کے گھر میں بھی گھس آئے گی۔ انھوں نے سوچا بھی نہیں تھا۔

"یہ... یہ سب... یہ سب..." بمشکل تمام ان کے منہ سے نکلا۔ اسی وقت ایک ملازم دوڑتا ہوا اندر آ گیا۔

"صاحب، فرانس سے کال آئی ہے آپ کی۔ ہولڈ کیا ہوا ہے۔ جے جے اینڈ آرگنائزر کی کال ہے۔"

شجاع احمد صاحب ہارون کو گھورتے ہوئے باہر نکل گئے۔ ہارون سینے پر ہاتھ رکھ کر دیوار سے ٹک گیا تھا اور پھر جب اسے طوفان ٹل جانے کا احساس ہوا تو کمرے سے ہی نکل بھاگا۔ اس وقت پناہ زاہد کی آغوش میں ہی تھی۔ زاہد اوپر کی منزل میں تھا۔ اوپر چڑھتے ہوئے اس کا سانس پھول گیا اور پھر وہ زاہد پر گر ہی پڑا تھا۔ "ارے ارے، خیریت۔ کیا کسی شکاری نے حملہ کر دیا ہے اس معصوم چڑیا پر۔"

"خطرہ... خطرہ سر پر آ گیا زاہد بھائی۔ راز کھل گیا۔ اچانک کھل گیا" ہارون لرزتی ہوئی آواز میں بولا۔

"خطرہ... راز؟ تفصیل جانِ من تفصیل۔"

"ابو اچانک گھس آئے تھے میرے کمرے میں۔ انھوں نے سب کچھ دیکھ لیا۔ سب کچھ دیکھ لیا۔ اچانک فرانس سے کال آگئی ورنہ... میں پھنس گیا تھا لیکن اب... اب اس کال کے بعد وہ مجھے تلاش کریں گے... اب کیا کروں زاہد؟"

"یوں کرو ان تصویروں کو جلدی جلدی دیواروں سے اتار کر باورچی خانے لے جاؤ اور آگ دکھا دو۔ سارے سازوں کو کسی کنستر کا ڈھکن کھول کر ان میں ڈال دو اور پھر ماچس جلا کر اپنے اس گھونسلے کو آگ لگا دو۔" زاہد نے اس کے بال مٹھی میں پکڑ کر پرخلوص لہجے میں کہا۔

"ایں...؟" ہارون کا منہ تعجب سے کھل گیا۔

"جو کچھ میں کہہ رہا ہوں وہی کرو۔ اس کے علاوہ چارۂ کار نہیں ہے۔"

"آپ... آپ مذاق کر رہے ہیں؟" ہارون پھیکی سی مسکراہٹ سے بولا۔

"مذاق تو تم خود کر رہے ہو ہارون، میرے ساتھ، اپنے ساتھ اور ان عظیم موسیقاروں اور فنکاروں کے ساتھ، جنھیں تم نے بڑی عقیدت سے اپنے کمرے کی دیواروں پر جگہ دی تھی اور جنھیں حاصل کرنے کے لئے میں نے نہ جانے کہاں کہاں تگ و دو کی ہے۔ راز، خطرہ۔ زندگی کی ایک ٹھوس حقیقت کو تم راز رکھنا چاہتے ہو۔ تم ایک عظیم فن کے انکشاف کو اپنے لئے خطرہ قرار دے رہے ہو۔ فنکار تو آگ میں جلتا ہے ہارون، بھٹیوں میں تپتا ہے تب فنکار بنتا ہے۔ افسوس تم نے فن اور فنکار کا مذاق اڑایا۔ تم فنکار نہیں بن سکتے۔ میں اچانک تم سے مایوس ہو گیا ہوں۔" زاہد نے گردن لٹکا کر کہا۔

"زاہد بھائی" ہارون لرزتی آواز میں بولا۔

"یہی لگن فنکار کی بلندیوں کا تعین کرتی ہے۔ فن کی عظمت اگر انسان کے دل میں جاگزیں ہو تو اسے وہ حقیر نہیں سمجھتا اور دنیا سے منہ نہیں چھپاتا۔ جس فن کو تم منہ چھپانے کی وجہ سمجھتے ہو، براہ کرم اسے نہ اپناؤ۔ جاؤ سچے جذبے دیکھنے ہیں تو قدسیہ کے نگار خانے میں جاؤ۔ دیکھو اس نے چند ماہ میں کیا کچھ حاصل کر لیا ہے۔ اس نے جو کچھ کرنا چاہا اسے سوچا، پرکھا اور اپنا لیا۔ اس نے شجاع احمد کو فیس کیا اور ان کی کوئی تادیب قبول نہیں کی اور تم ہو کہ ایک خوفزدہ چڑیا کی طرح دوڑے چلے آئے ہو۔ افسوس تم نے ان تمام فن کاروں کے منہ پر کالک مل دی جن کی ایک دنیا دیوانی ہے۔"

"ارے ارے۔ آپ تو... آپ تو سنجیدہ ہو گئے زاہد بھائی۔"

"سنجیدہ نہیں رنجیدہ کہو۔"

"وہی سہی۔ ہم... میرا مطلب ہے..."

"میں تمھاری کیا خدمت کر سکتا ہوں ہارون۔"

"بس زاہد بھائی، غلطی ہو گئی معاف کر دیں۔ واقعی مجھے اس طرح نہیں بھاگنا چاہیے تھا۔"

"تمھارا ذاتی معاملہ ہے۔"

"زاہد بھائی پلیز" ہارون خوشامد کرنے لگا۔

"جاؤ جاؤ۔ شجاع احمد صاحب ڈانٹ ڈپٹ کریں تو زاہد کا نام لے دینا۔ کہہ دینا اس نے اُکسایا تھا اس کے لئے۔"

"آپ مجھے اتنا ذلیل سمجھتے ہیں؟"

"نہیں۔ بچت کے راستے بتا رہا ہوں۔" زاہد نے کہا اور ہارون کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ پھر اس نے پرعزم لہجے میں کہا۔

"ایسا کبھی نہیں ہو سکتا۔ میں فنکار ہوں۔ مجھے اپنے فن سے عشق ہے اور... وہ کیا کہتے ہیں میرا عشق صادق ہے۔ ہاں صادق ہی کہتے ہیں یعنی سچا بالکل ٹھیک۔ تو میں فنکار ہوں۔ فن سمندر ہے اور سمندر میں بند نہیں باندھے جاتے۔ مجھے معاف کر دیں زاہد بھائی میں نے فن کی توہین کی ہے۔ میں اس کا ازالہ کروں گا۔" ہارون کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔ وہ تن گیا اور پھر اسی طرح گردن سیدھی کئے سینہ اکڑائے باہر نکل گیا۔

"جیتے رہو میرے لعل۔ تم لوگ ہی تو میری آرزوؤں کا ماحصل ہو۔" زاہد نے زیر لب کہا اور پھر خلاؤں میں گھورنے لگا۔

کرم دین، ظفر کے ساتھ حویلی سے باہر نکل آیا۔ ظفر کی آنکھیں خون اگل رہی تھیں۔ وہ جوشِ انتقام سے پھنک رہا تھا۔ اس کے ذہن میں طرح طرح کے منصوبے بن رہے تھے۔

"یہ ایچی مجھے دے دو ظفر میاں۔" ساتھ چلتے ہوئے کرم دین

کی آواز سنائی دی اور ظفر چونک پڑا۔
"ارے آپ ... آپ" وہ حیرت سے بولا۔
"میرا نام کرم دین ہے بیٹے"
"جی۔ میں سن چکا ہوں مگر بابا آپ میرے ساتھ باہر کیوں چلے آئے۔ آپ تو یہاں ملازم ہیں"
"دل کھٹا ہو گیا اس حویلی سے۔ نوکری کوئی حیثیت نہیں رکھتی بیٹے۔ پیدا ہونے کے بعد سے آج تک اسی حویلی کا نمک کھایا ہے مگر اب یہ نمک زہر لگنے لگا ہے۔ ہم ہاتھ پاؤں کے بندے ہیں جہاں ہاتھ پاؤں چلائیں گے وہاں سے روٹی مل جائے گی۔ اب اس حویلی کی روٹی نہیں کھائیں گے"
"عظمت کسی کی میراث نہیں ہوتی بابا۔ آپ جو کچھ بھی ہیں، بڑے دل کے مالک ہیں۔ خدا آپ کو اس انصاف پسندی کا اجر دے گا۔ میں نہیں چاہتا کہ میری وجہ سے ..."
"نہیں ظفر میاں۔ بس اب ہم جھوٹ کا ساتھ نہیں دے سکتے۔ ظلم کا ساتھ دینا سب سے بڑا گناہ ہے"
"میں آپ کی عظمت کو سلام کرتا ہوں۔ آپ کا ضمیر زندہ ہے بابا کرم دین لیکن ایک بار پھر منت سماجت کرتا ہوں کہ مجھے میرے حال پر چھوڑ دیں۔ آپ اس بڑھاپے میں پریشان ہوں گے"
"بوڑھے ضرور ہو گئے ہیں ظفر میاں لیکن کمزور نہیں ہیں۔ حلال کی روٹی کھائی ہے اور بڑی جان ہوتی ہے اس روٹی میں۔ بہت کچھ کر سکتے ہیں ابھی" کرم دین نے ہاتھ بڑھا کر ظفر کے ہاتھ سے اٹیچی لے لی۔
"کہاں لے جائیں گے مجھے" ظفر نے پوچھا۔
"اپنے گھر بیٹے اور کہاں"
"اوہ۔ آپ اس حویلی میں نہیں رہتے"
"رہتے ہیں مگر ہمارا اپنا بھی ایک گھر ہے۔ اس گھر میں ہماری بیٹی رہتی ہے۔ اسی کے پاس لے چل رہے ہیں تمہیں" کرم دین نے کہا
"اچھا..." ظفر نے گردن جھکا دی۔ اس بستی میں شمشیر زماں کی اس جاگیر میں اس کا اور کوئی نہیں تھا۔ کسی کے دروازے پر کھڑا نہیں ہو سکتا تھا۔ قدرت نے ایک انسان کا سہارا دیا تھا تو اسے قبول کرنے میں تکلف نہیں کرنا چاہیئے تھا۔ دفعتاً اس نے پوچھا
"ایک بات بتاؤ گے بابا"
"پوچھو بیٹے"
"میری ماں کو تمہارے سامنے نکالا گیا تھا"
"ہاں بیٹے۔ اسی طرح۔ بالکل اسی طرح جس طرح آج انھوں نے تمہارا ساتھ سلوک کیا ہے"
"تم اس کا سہارا کیوں نہ بنے بابا۔ وہ بھی تو مظلوم تھی۔ بتاؤ تم نے آج کی طرح اس دن اپنا دل کیوں نہ کھول لیا۔ میں تو مرد ہوں دنیا سے نمٹ سکتا ہوں لیکن وہ مظلوم کہاں گئی ہو گی۔ اس پر کیا بیتی ہو گی۔ بتاؤ کرم دین بابا۔ اس دن تمہارے دل میں رحم کی روشنی کیوں نہ پھوٹی" ظفر کی آواز بھرا گئی۔
"ہم نے اس دن بھی اپنا فرض پورا کیا تھا بیٹے۔ خدا کا بڑا کرم ہے کرم دین پر کہ آج وہ تمہاری امانت تمہیں لوٹانے کے قابل ہے۔ تمہاری ماں ہمارے گھر میں ہے بیٹے۔ ہم اس کے پاس تو لے جا رہے تمہیں۔ وہی تو ہماری بیٹی ہے جس کے بارے میں ہم نے تمہیں بتایا ہے۔"
ظفر ایک دم رک گیا۔ اس کی سرخ آنکھوں میں ٹھنڈک پڑ گئی۔ یہ ٹھنڈک پگھل کر آنسو بن گئی۔ آنسو اس کے گالوں پر آ گئے اور وہ جذباتی ہو کر کرم دین سے لپٹ گیا۔
"کیا یہ حقیقت ہے بابا۔ سچ بتاؤ کیا یہ حقیقت ہے۔ کیا میری ماں، کیا میری ماں ... مجھے اتنی آسانی سے مل جائے گی"
"خود کو سنبھالو بیٹے۔ خدا سب کا سہارا ہے۔ اپنے بندوں کو تو وہ بس ذریعہ بنا دیتا ہے۔ دیکھو نا اس کا کرم۔ کسی کام سے نکل گیا تھا کوٹھی کے اندر ونی حصے میں۔ بہت کم جاتا ہوں۔ اگر اس وقت نہ جاتا تو مجھے تو کچھ معلوم بھی نہ ہوتا۔ نہ جانے کیا کیا ہو جاتا۔ مگر خدا نے مجھے یہاں پہنچا دیا۔ کوئی جواب ہے اس بات کا"
"بابا... آسمان کے نیچے، خدا کے بعد تم نے سب سے بڑا احسان کیا ہے میرے اوپر... میری ماں کو سہارا دے کر تم نے مجھے ساری زندگی کے لئے خرید لیا ہے۔ میں تمہارا غلام ہوں کرم دین بابا۔ میں تمہارا غلام ہوں"
"گنہگار مت کرو ظفر بیٹے۔ غلام نہیں نواسے ہو تم میرے۔ نانا ہوں میں تمہارا۔ مجھے تو دیکھو۔ ایک بھانجی کے علاوہ کوئی نہیں تھا میرا اس دنیا میں۔ مگر اب ایک بیٹی ہے ایک نواسا ہے۔ یہ خوبصورت یہ لمبا تڑنگا جوان۔ کیا میری نیکیوں کا صلہ ہاتھ کے ہاتھ نہیں مل گیا۔ بہت بڑا تاجر ہے وہ آسمان والا۔ کسی کا ادھار نہیں رکھتا"
"بابا" ظفر نے کرم دین کے ہاتھ سے اٹیچی لے لی۔
"رہنے دو بیٹا"
"نہیں بابا۔ نواسا جوان ہے مگر ایک بات مجھے اور بتا دو"
"گھر چل کر پوچھ لینا بیٹا۔ ایسی جلدی کیا ہے"
"یہ میرے سینے کی آخری گھٹن ہے بابا۔ خدا کے لئے اسے اور

نکال دو۔"

"کہو۔۔۔" کرم دین کی آواز میں گھبراہٹ پیدا ہوگئی۔ جہاندیدہ انسان تھا۔ اس سوال کے بارے میں کچھ کچھ سمجھ گیا تھا۔

"کیا۔۔۔ کیا میں شمشیر زماں کا بیٹا نہیں ہوں۔ کیا میری ماں۔۔۔ اس کی بیوی نہیں تھی۔۔۔ میرا مطلب ہے وہ شمشیر زماں کی داشتہ تھی؟"

"خدا کے لئے ایسے لفظ نہ نکالو ماں کے لئے۔ ماں کی عظمت آسمان کی طرح ہوتی ہے۔"

"مگر وہ ماں تو ثابت ہو جائے۔ بیٹے کے لئے ایک گالی تو نہ بنے۔"

"میں جھوٹ نہیں بولوں گا ظفر میاں۔ میں نوکر ہوں حویلی کا، خدا کی قسم مجھے اس بارے میں۔۔۔ کچھ نہیں معلوم۔ ایک لفظ جو معلوم ہو تو میری عاقبت خراب ہو۔"

"اوہ۔۔۔ اوہ۔ پھر کیا ہوگا۔ کیسے پتہ چلے گا۔ ماں تو گونگی ہے وہ اب بھی گونگی ہے نا بابا؟"

"ہاں۔ لیکن خدا عظیم ہے۔ وہ تمہیں سچائی سے محروم نہ رکھے گا۔ آج نہ سہی کل تمہیں اس بارے میں سب کچھ معلوم ہو جائے گا۔ وہی اس کے اسباب بھی پیدا کرے گا۔"

"اگر یہ۔۔۔ اگر یہ سچ نکلا بابا تو کیا ہوگا۔ اگر یہ بات سچ نکل آئی تو۔۔۔ تو۔۔۔" ظفر کا بدن لرزنے لگا۔ بوڑھے کرم دین نے اس کی پشت پر ہاتھ رکھ دیا۔

"صرف ایک بات اس بوڑھے کی بس سن لو۔ ان دھندلائی ہوئی آنکھوں میں تجربوں کے شہر آباد ہیں۔ ان شہروں کی قسم ان آنکھوں کی قسم چھینا نی کھو بیٹھیں تو انسان زمانے سے محروم ہو جاتا ہے۔ اگر ایسی کوئی بات نکل بھی آئے تو حسینہ بے قصور ہوگی۔ اس کی آنکھوں کی پاکیزگی خدا کے گھر کی مانند ہے۔ پوری جوانی گزری ہے اس کی ہمارے سامنے، اس کا کردار بالکل ——— پاک ہے۔ کبھی کوئی دھبہ نہیں دیکھا ہم نے اس پر۔ کوئی بری بات ہوتی تو چھپتی نہیں بیٹے۔ اس کے آگے ہم کچھ نہیں کہہ سکتے۔"

ظفر کچھ نہ بولا۔ چند لمحات کے بعد کرم دین ایک مکان کے سامنے رک گیا۔ اس دروازے کے دوسری طرف ظفر کا مستقبل تھا۔ اس کا دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔ یہ مستقبل کیا ہوگا۔ ماں جو طویل عرصے کے بعد اس کے سامنے آ رہی تھی۔ وہ لمحات اسے یاد تھے جب اسے حویلی سے لے جایا گیا تھا، ماں سے دور رہ کر اسے بڑا دکھ ہوا تھا۔ لمحہ لمحہ اسے ماں یاد آتی تھی لیکن شمشیر زماں اس کے مستقبل کو تاریک نہیں دیکھنا چاہتے تھے۔ انہوں نے اسے لندن پہنچوا دیا تھا اور پھر لندن میں اس کا دل لگ گیا لیکن گونگی ماں اسے آج تک یاد تھی۔ حویلی کے دوسرے لوگ بھی یاد تھے۔ جوں جوں اس نے ہوش سنبھالا۔ اس کے احساسات میں پختگی پیدا ہوتی گئی۔ اسے یہ علم ہوگیا کہ نواب شمشیر زماں کی دو بیویاں ہیں۔ ایک بیگم صاحبہ اور دوسری حسینہ، حسینہ جو گونگی تھی۔ شمشیر زماں نے اپنے خطوط میں ہمیشہ یہی لکھا کہ وہ ان کا بیٹا ہے۔ چنانچہ ظفر کے دل میں کبھی بھول کر بھی یہ خیال نہیں آیا تھا کہ کوئی ایسی بات نکل آئے گی۔ اس نے بڑے ہو کر یہ تو تسلیم کر لیا تھا کہ اس کی ماں شمشیر زماں کی دوسری بیوی ہے اور بیگم صاحبہ کا سلوک اس کے ساتھ اچھا نہیں تھا لیکن اسے یہ گمان نہیں تھا کہ اس کی ماں حویلی میں بالکل ہی بے حیثیت ہوگی اور اس کے ساتھ کبھی یہ سلوک بھی ہوگا۔ اگر اسے اس کا علم ہوتا تو وہ بہت پہلے اپنی ماں کو سہارا دینے کے لئے واپس آ جاتا۔ شمشیر زماں سے پوچھتا کہ اگر انہوں نے دوسری شادی کی ہے تو اس کی ماں کے ساتھ یہ بے انصافی کیوں ہو رہی ہے لیکن شمشیر زماں کے رویّے نے کبھی اسے ان باتوں کا احساس نہیں ہونے دیا تھا اور اب بھی شمشیر زماں کی پراسرار خاموشی سے گھبرا کر وہ واپس آ گیا تھا ورنہ شاید وہ واپس نہ آتا۔

اس دوران اس نے شمشیر زماں کو خطوط نہیں لکھے تھے کیونکہ اس کے لئے بھی اسے ہدایت تھی کہ وہ خود کوئی خط نہ لکھے، شمشیر زماں خود اس کی خیریت معلوم کر لیا کرتے تھے۔ کبھی ٹیلی فون پر کبھی کسی اور ذریعے سے لیکن یہاں آ کر جو نیا انکشاف ہوا تھا اس نے ظفر کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ وہ حویلی میں طیش میں آ کر بڑے بلند و بانگ دعوے کر آیا تھا۔ لیکن اس گھر کی دہلیز کو پار کرتے ہوئے اس کا دل بری طرح لرز رہا تھا۔ دروازے پر دستک دی گئی اور چند لمحات کے بعد دو بوڑھے سفید ہاتھوں نے دروازہ کھول دیا۔ دروازے کے دوسری جانب حسینہ کھڑی ہوئی تھی۔

سادہ سادہ سا چہرہ، بکھرے بال جن میں اب کہیں کہیں سفیدی ابھر آئی تھی۔ چہرے کی دلکشی میں جھریوں کا اضافہ ہو چکا تھا لیکن وہ چہرہ اسی طرح دلکش تھا۔ ظفر کی نگاہ اس چہرے پر پڑی اور وہ اس کی پاکیزگی اس کے تقدس میں کھو گیا۔ اس کا دل یکبارگی خوشی سے دھڑک اٹھا۔ یہ تقدس یہ پاکیزگی کسی ایسی عورت کی نہیں ہو سکتی جو کسی نواب کی داشتہ ہو۔ حسینہ نے جو کرم دین کے ساتھ کسی مرد کو دیکھا تو جھجک کر ایک قدم پیچھے ہٹ گئی لیکن اس مرد کی جھلک جو اس کی آنکھوں نے دیکھی تھی، اس نے اسے پلٹ کر دیکھنے پر مجبور کر دیا۔ یہ جھلک تو بڑی انوکھی تھی۔ بڑی ہی دلکش، بڑی ہی پیاری جو اس سے قبل کسی اور کے چہرے میں نظر نہ آئی تھی۔ کرم دین نے ظفر کو اشارہ کیا اور ظفر اندر آ گیا۔ حسینہ ایک بار ٹھٹکی۔ ایک بار پھر اس نے پلٹ کر دیکھا۔ یہ آرزو نجانے کس طرح اس کے دل میں پیدا ہو گئی تھی۔ یہ گناہ نجانے

کون سے جذبے کے تحت مجبور ہو کر اس نے کیا تھا۔ پلٹ کر جو دیکھا تو وہ قد آور، قوی ہیکل جوان نگاہوں کے سامنے ہی تھا اور دفعتاً اس کے خدوخال آنکھوں میں روشن ہو گئے۔ دل نے ایک آواز دی اور حسینہ کے پورے بدن میں لرزش پیدا ہو گئی۔ اس نے گھبرائی ہوئی نگاہوں سے ظفر کو دیکھا پھر کرم دین کو... پھر ظفر کو اور پھر کرم دین۔ اس کی نگاہیں سوال کر رہی تھیں۔ کرم دین نے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

"ہاں حسینہ تیرا بیٹا ظفر اور حسینہ کو جیسے چکر سا آ گیا۔ اس نے آنکھیں پھاڑ کر خلا میں دونوں ہاتھ پھیلائے۔ ایک قدم آگے بڑھی لیکن ٹھوکر کھائی اور گرنے لگی۔ ظفر نے آگے بڑھ کر اسے سہارا دیا تھا لیکن اس سہارے میں وہ اہمیت نہیں تھی جو ہونی چاہیئے تھی۔ اس کے دل میں ایک خلش تھی' ایک دھبہ تھا اور اس دھبے کو دور کئے بغیر ایک سچا انسان دوسرے سچے انسان سے نہیں مل سکتا تھا۔ ماں کو سہارا دے کر اس نے گرنے سے تو بچا لیا لیکن اس کے سینے سے نہ لپٹ سکا جب کہ اس کا رواں رواں بے قرار تھا اس سینے سے لپٹ جانے کے لئے۔

حسینہ البتہ بے حال ہوئی جا رہی تھی۔ اچانک قارون کا خزانہ مل جائے گا، اس نے سوچا بھی نہ تھا۔ اس کے قد سے کہیں اونچا۔ اس کے تصور سے کہیں خوبصورت یہ جوان، گوشت پوست کا یہ زندہ وجود اس کے بدن کا ایک حصہ ہے۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا۔ اس نے تو ایک کمزور سے مجبول سے بچے کو بحالت مجبوری خود سے جدا کیا تھا۔ آج وہ کیا بن گیا تھا۔ کیا خدا اس سے بڑا کوئی اور انعام بھی دے سکتا تھا زندگی بھر کی تکلیفوں کا۔

اس کا دل چاہ رہا تھا اسے بدن کے جوڑ جوڑ میں سما لے۔ زندگی بھر کی محرومیوں کا ازالہ کر لے۔ یہ کیسا وحشی ہے' کیسا پاگل ہے۔ یہ میری طرح پاگل کیوں نہیں ہو جاتا۔ کیا ہو گیا ہے اسے۔ اس کے دل میں وہ تلاطم کیوں نہیں پیدا ہوتا۔ وہ اسے جھنجھوڑ رہی تھی بھینچ رہی تھی اسے۔ پاگل ہوئی جا رہی تھی۔

کرم دین واپس دروازے کی طرف پلٹ گیا۔ وہ اس وقت خود پر قابو نہیں پا سکا تھا۔ ماں اور بیٹے کی کشمکش کو وہ محسوس کر رہا تھا اور اس کا دل دھڑک رہا تھا۔ باہر نکلتے ہوئے اس نے خدا سے دعا کی۔

"معبود! فضل کرنا اپنا۔ بڑا سخت امتحان ہے انسان کا، انسان بہت کمزور ہے مالک۔ اس کی کمزوریوں کو سنبھال لینا۔"

فرانس کی وہ کال بڑی اہمیت کی حامل تھی۔ شجاع احمد صاحب

کو ایک اہم کاروباری سلسلے میں فوراً فرانس جانے کی تیاریاں کرنی پڑیں اور وہ ہارون کے پاس واپس نہ آ سکے۔ اس طرح ہارون کو فوراً ہی کسی اہم پریشانی سے دوچار نہ ہونا پڑا اور بات ٹل گئی جبکہ ہارون خود کو واقعی تیار کر چکا تھا۔

شجاع احمد کے چلے جانے سے بات وہیں دب گئی۔ یہ دورہ تقریباً بیس دن کا تھا۔ ان بیس دنوں میں صرف ایک اہم واقعہ ہوا۔ یعنی رضا احمد ایم بی بی ایس کے آخری سال کے امتحان میں بہترین پوزیشن سے پاس ہو گیا۔

دادا جان نے مٹھائی کی کئی دکانیں خالی کرادی تھیں۔ بہت خوش ہوئے تھے وہ۔ پاس ہونے والے دن کی شام کو انہوں نے ایک ہلکی پھلکی پارٹی دی اور اس پارٹی میں شجاع احمد کی واپسی پر ایک شاندار جشن منانے کا اعلان کر دیا۔

"اس جشن کا اہتمام ابھی سے شروع کر دیا جائے۔ تمام بچوں پر مشتمل ایک کمیٹی بنائی جائے جو اس جشن کا اہتمام کرے اور اس سلسلے میں بہترین پروگرام ترتیب دے۔"

"میں اس جشن کی انتظامیہ کے سربراہ کی حیثیت سے زاہد بھائی کا نام پیش کرتی ہوں۔" شاذیہ نے کہا۔

"نہیں بھئی۔ زاہد کی مصروفیات میں دخل اندازی نہ کی جائے۔ وہ جس قدر کام کر رہا ہے اس کے تحت اس کے پاس گنجائش نہیں ہے۔" دادا جان بولے۔

"پھر بھی ان کے مشورے تو حاصل ہو سکتے ہیں، ہیں؟"

"ہاں اگر زاہد کو فرصت ہو تو۔"

"ٹھیک ہے دادا جان۔ آپ کی خواہش کے مطابق اہتمام ہو جائے گا۔" زاہد نے جواب دیا۔

تیاریاں شروع ہو گئیں۔ ویسے زاہد کافی وقت فرسٹ ایڈ

ہاؤس کی نگرانی میں صرف ہو رہا تھا۔ سرفراز درحقیقت ایک بہترین کارکن ثابت ہوا تھا۔ اس میں زبردست انتظامی صلاحیتیں تھیں۔ اور اس نے زاہد کا آدھے سے زیادہ کام بانٹ لیا تھا۔ پہلی بار اسے کھل کر کام کرنے کا موقع ملا تھا۔ اس لیے وہ اپنی بھرپور صلاحیتوں کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ فرسٹ ایڈ ہاؤس کے سلسلے میں حکومت کی طرف سے بھی بہترین تعاون مل رہا تھا۔ سیمنٹ لوہا اور ضرورت کی دوسری چیزیں بہ آسانی مل رہی تھیں اور ان کی فراہمی میں کوئی خلل نہیں ہو رہا تھا جس کی وجہ سے تعمیر کا کام بڑی خوبی سے جاری تھا۔

زاہد کی نگاہ چاروں طرف تھی۔ ہارون کو اس نے جس راستے پر لگایا تھا اس کی نگرانی بھی ضروری تھی۔ زاہد کے مشورے اسے ملتے رہتے تھے۔ ابھی خاصی داڑھی بڑھ گئی تھی۔ بالوں کے جھنڈ بھی خوب پھیل گئے تھے۔ گٹار کی مشق جاری تھی اور اچھا خاصا بجانے لگا تھا وہ۔ اس نے اپنے کئی پسندیدہ نغمے یاد کر لئے تھے اور ان کی مشق کر رہا تھا۔ زاہد نے چند خاص نغموں کے بارے میں اس سے کہا۔

"انھیں اچھی طرح یاد کر لو ہارون۔ وقت آگیا ہے کہ اب تمھارا فن منظرِ عام پر آئے۔"

"کک... کیا مطلب۔ میں نہیں سمجھا زاہد بھائی؟" ہارون کی سانس پھولنے لگی۔

"رضا احمد کے جشن کے سلسلے میں میری طرف سے صرف ایک پروگرام پیش ہوگا اور وہ تمھارے گانے کا پروگرام ہوگا۔" زاہد نے کہا۔

"مم... میں۔ میرا مطلب ہے۔ ٹھیک ہے۔ ٹھیک ہے جیسی آپ کی ہدایت۔"

"وہ دن تمھیں فن کی بلندیوں پر لے جائے گا ہارون۔ میں اس کے لئے خصوصی بندوبست کروں گا۔ ایک کمرشل آرگنائزیشن کو مدعو کروں گا میں، جو تمھارے اس پروگرام کے کیسٹ تیار کرے گا اور اس کے بعد، اس کے بعد اس سرزمین سے ایک سوان بک اُبھرے گا اور دنیا اس کا لوہا مان لے گی۔"

"میں آپ کے معیار پر پورا اُترنے کی کوشش کروں گا زاہد بھائی۔" ہارون کی سانسیں اعتدال پر آگئیں۔ وہ پُرعزم ہو گیا تھا۔ جب بھی اس کا موڈ گرنے لگتا تھا زاہد اس میں چابی بھر دیتا تھا اور پھر یہ چابی کافی دن تک چلتی تھی۔

اسی طرح سرفراز اور قدسیہ کا معاملہ چل رہا تھا۔ نگار خانے میں اب تک چھ تصویریں تیار ہو گئی تھیں۔ رات کو سرفراز ایک گھنٹہ قدسیہ کے ساتھ صرف کرتا تھا اور قدسیہ رنگین عجوبے تشکیل دے رہی تھی۔ ہر تصویر تیار کرنے کے بعد وہ زاہد کو اسے دیکھنے کی دعوت دیتی تھی اور زاہد ان تصویروں کو دیکھ کر سر دھننے لگتا تھا۔ وہ انھیں اتنا سراہتا کہ قدسیہ پاگل ہو جاتی۔

"میں ڈرتی ہوں زاہد۔"

"کس بات سے عزیزہ؟"

"یہ نمائش کامیاب ہوگی یا نہیں۔"

"میں نے تم سے کیا کہا ہے اس بارے میں؟" زاہد آنکھیں نکال کر بولا۔

"وہ تو ٹھیک ہے لیکن اپنے اس خوف کو کیا کروں؟"

"اگر تم لوگ اسی طرح ڈرتے رہے تو پھر زاہد کا اس کوٹھی میں رہنا فضول ہے۔"

"ارے نہیں۔ براہِ کرم برا مت مانو۔ دل کی بات تم سے نہ کہوں گی تو کس سے کہوں گی؟"

"بس تو اس دل کو یقین دلا دو کہ نمائش کامیاب ہوگی۔ یہ زاہد کی پیش گوئی ہے۔"

دادا جان نے زاہد کو طلب کر لیا۔ کسی قدر متفکر بیٹھے ہوئے تھے۔ زاہد کو دیکھ کر پُرخیال انداز میں گردن ہلانے لگے۔ "خیریت دادا جان...؟" زاہد پیار بھرے لہجے میں بولا۔

"ذرا سی تشویش کا شکار ہوں میاں۔"

"زاہد کے ہوتے ہوئے؟"

"اسی لئے تمھیں بلایا ہے اس وقت۔ فرسٹ ایڈ ہاؤس برق رفتاری سے تعمیری منازل طے کر رہا ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ وقت سے پہلے ہی تیار ہو جائے گی۔"

"یقیناً اسی کے امکانات ہیں۔"

"یہ سرفراز مجھے حسابات پیش کرتا رہتا ہے۔ خرچ بہت تیزی سے ہو رہا ہے۔ ہمیں فوری طور پر مزید رقم کا بندوبست کرنا ہوگا۔ شجاع نے وعدہ تو کیا ہے مگر وہ کنجوس ہے اور میں جانتا ہوں کہ دل سے وہ فرسٹ ایڈ ہاؤس کے حق میں نہیں ہے۔"

"تو یہ پریشانی کس بات کی ہے دادا جان۔ گیم نمبر دو شروع کئے دیتے ہیں۔" زاہد نے کہا۔

"گیم نمبر دو؟" دادا جان نے تعجب سے زاہد کو دیکھا۔

"جاسوسوں کی ٹیم مفت کی تنخواہیں لے رہی ہے۔ اسے متحرک کیا جائے۔ حاجی نیاز، شیخ جمال، قاضی فرزند ارجمند اور سرداؤد۔ یہ لوگ ہمارے لئے چلتے پھرتے بینک ہیں۔ ایک ایک کرکے ان سے چیک کیش کرتے ہیں۔" زاہد نے کہا اور دادا جان گردن ہلانے لگے۔

سوکھے ہوئے چہرے کی سفیدی میں سُرخ خون کا دریا موجزن ہوگیا تھا۔ آن کی آن میں ایسی شکل بدلی کہ دیکھنے والوں کو یقین نہ آیا۔ آنکھیں اُس کے انگ انگ کا طواف کر رہی تھی چوڑا چکلا بدن، مضبوط ہاتھ پاؤں، دراز قامت حسین خدوخال۔ یہ اس کے لہو کا قطرہ تھا۔ یہ اُس کا خواب تھا، یہ اُس کا ستون تھا۔ اس ساری کائنات میں صرف ایک یہی تھا جس کا بازو پکڑ کر وہ دُنیا کے سامنے سینہ تان سکتی تھی جس سے پُشت لگا کر وہ کھڑی ہو سکتی تھی ہر قسم کے خطرے سے بے نیاز ہو کر۔

لیکن وہ اتنا خاموش کیوں ہے۔ وہ اس سے لپٹ کیوں نہیں جاتا۔ وہ اسے یقین کیوں نہیں دلاتا کہ زندگی ہی میں اسے زندگی بھر کی کلفتوں کا انعام مل گیا ہے۔ وہ کیوں نہیں کہتا کہ ماں گوشت اور ہڈیوں کا یہ پہاڑ میری ملکیت ہے تو اس پہاڑ کی ساری بلندیاں سر کر سکتی ہے۔ وہ خاموش تھا۔ ایک عجیب سی اُداسی اُس کے چہرے پر چھائی ہوئی تھی۔ گونگی ماں کے بدن کی ایک ایک جُنبش پکار رہی تھی لیکن وہ پتھر کی طرح ساکت تھا۔

وہ اسے دیکھتی رہی، مضطرب ہوتی رہی۔ پھر دیوانگی نے سکون نہ لینے دیا تو دوبارہ اُٹھی اور اس سے لپٹ گئی۔ پیشانی، آنکھیں رُخسار، گردن پاگلوں کی طرح چُومنے لگی۔ تب اس کی آواز اُبھری۔

"مجھے کیوں چُوم رہی ہے ماں۔ کیا تجھے تعفن نہیں محسوس ہوتا۔ میرے بدن سے کیا مجھ میں سڑاند نہیں ہے ماں۔ کیا میرے خون کی غلاظت تیرے نتھنوں تک نہیں پہنچ رہی؟"

وہ رُک گئی۔ تعجب سے اسے دیکھتی رہی۔ کچھ نہیں سمجھی تھی وہ۔ اس کی آنکھوں میں سوال اُبھر آیا۔ تب وہ بولا۔

"میں نہیں جانتا ماں۔ میرا وجود کن حالات کا تابع ہے۔ مجھے کچھ نہیں معلوم لیکن تیری پُرنور پیشانی، تیرا پاکیزہ چہرہ بتاتا ہے کہ تیری نمود جائز ہے تو اپنی ماں کی مجبوریوں کا نتیجہ نہیں تھی۔ پھر تو نے مجھے کیوں ان غلاظتوں میں لپٹا ہوا دُنیا میں آنے دیا۔ اگر مجبوری تھی تو میری فنا تو تیری مجبوری نہ ہوگی۔ کیا تو مجھے پیدا کر کے میری گردن نہیں دبا سکتی تھی۔ بول ماں کیا حرام کے بچّے ہلاک نہیں کر دیئے جاتے۔ کیا ناجائز اولاد پیدا کر کے ان کی پرورش ضروری ہے۔ کیا کوئی ماں اپنے بطن کے لوتھڑے سے ایسا انتقام لے سکتی ہے تو اپنی محبت میں دیوانی ہو رہی ہے۔ بہت عرصہ کے بعد دیکھا ہے نا تو نے مجھے اس لئے میرے بدن کی سڑاند بھُول گئی ہے۔ یہ بدبُو تو تجھے ہمیشہ میرے بدن سے آتی ہوگی ماں۔ کوئی ماں اپنی اولاد کے لئے بے ضمیر نہیں ہوتی۔ بول ماں میں ناجائز کیوں ہوں۔ اگر شمشیر زمان نے تجھ سے شادی نہیں کی تھی تو تُو نے مجھے دُنیا میں کیوں آنے دیا۔ جواب دے ماں جواب دے۔"

... اور حسینہ کے پُورے بدن میں تھرتھری دوڑنے لگی۔ ماں کا چہرہ سُرخ ہوگیا۔ آنکھوں کی بینائی چلی گئی۔ گردن کی رگیں پھُول گئیں۔ مُنہ سے جھاگ آنے لگا۔ اس کے سینے کی ساری قوت باہر آنے لگی۔ اس نے دونوں ہاتھ سینے پر رکھے اور زور لگانے لگی۔ اس کے حلق سے خرخراہٹ نکل رہی تھی۔

ظفر نے اسے دیکھا۔ بغور دیکھا اور اس کا کلیجہ پھٹنے لگا۔ ماں کی یہ حالت اس سے نہ دیکھی گئی۔ وہ ٹوٹی ہوئی آواز میں بولا۔
"جو کچھ بھی ہوں ماں تیرے قدموں کی خاک ہوں۔ تیرے خون کی بوند ہوں۔ باقی میری تقدیر۔ میں... میں۔" وہ آگے بڑھا اور اسی وقت ساری جان کی قوت حلق کے دائرے سے باہر نکل آئی۔

"نائیں... نا۔ آآئیں۔ نہیں... تو... ایک فاحشہ سے فاحشہ سے چھُٹنا چاہتا ہے اپنی آوارہ ماں جس نے تجھے ناجائز پیٹ میں رکھا جس نے تجھے چوری چھپے جنم دیا۔ ظفر... ظفر۔ یورپ سے تو میرے لئے یہ تحفہ لایا ہے میرے بچّے... میرے بچّے... میرے بچ... بچ...."
حسینہ نڈھال ہو کر زمین پر بیٹھ گئی۔

اب ظفر کی دیوانگی کی باری تھی۔ حسینہ بول اُٹھی تھی۔ شدید ذہنی انتشار نے اس کی گویائی لوٹا دی تھی۔ وہ بول پڑی تھی۔
"ماں... تو... بول رہی ہے۔ تو بول رہی ہے۔" وہ اُس کے نزدیک بیٹھ گیا۔ اس نے حسینہ کے شانے پکڑنے کی کوشش کی لیکن وہ تڑپ کر پیچھے ہٹ گئی۔
"مجھے مت چھُو ظفر۔ گندے وہ نہیں ہوتے۔ جو گندگی سے جنم لیتے ہیں۔ اصل غلاظت وہ گندگی ہوتی ہے۔ میں فاحشہ ہوں۔ میں ناجائز بچّے کی ماں ہوں خبردار مجھے نہ چھُونا ناپاک ہو جائے گا۔ جلدی سے اس گھر سے نکل جا۔ یہاں غلاظت کے جراثیم پھیلے ہوئے ہیں۔ وہ سب تجھے لپٹ جائیں گے چلا جا یہاں سے بیٹے تیری ماں تجھے اس ناپاک گھر میں نہیں رہنے دے گی۔ چلا جا یہاں سے۔"
"ماں..." ظفر بولا۔
"اس لفظ کے تقدس کو پامال نہ کر۔ ایک فاحشہ ماں نہیں ہوتی۔ مجھے فاحشہ کہہ کر پکار ظفر۔ میں فاحشہ ہوں۔"
"ماں تو بول رہی ہے۔ میری ماں کی قوت گویائی واپس آگئی۔" وہ آنسو بہاتا ہوا بولا۔
"اب بھی نہ بولوں گی۔ اب بھی اگر میرا معبود مجھے گویائی نہ دیتا تو روز حشر میں اس سے سوال کرتی۔ معبود میں تو تیری تخلیق تھی خود

ہی غلق کیا اور خود ہی میرے وجود کو مسخ کر دیا۔ کیوں آخر کیوں ؟"

"مجھے حقیقت بتا ماں۔ میری ذات سے آشنا تو کر دے مجھے ؟"

"نہیں۔ میں تجھے اپنے گناہ کی کہانی نہیں سناؤں گی۔ کچھ نہیں بتاؤں گی تجھے، بس تو چلا جا یہاں سے۔ چلا جا ظفر ؟"

"ٹھیک ہے ماں۔ اگر تیرا اصرار ہے تو میں چلا جاتا ہوں یہاں سے کچھ دُور جاکر میں خودکشی کر لوں گا۔ ساری زندگی صرف تیرا تصوّر کیا تھا۔ تیرے علاوہ کچھ اور نہیں سوچا تھا۔ بڑی اعلیٰ تعلیم حاصل کی ہے میں نے، سوچا تھا تجھے تیرے معیار کا بن کر دکھاؤں گا۔ تو کہتی ہے تو میں چلا جاتا ہوں۔ میری لاش کی تدفین کرا دینا۔ یہ تو میرا حق ہے تجھ پر صرف تجھ پر ؟"

ظفر پلٹا۔ حسینہ اسے دیکھتی رہی۔ پھر جلدی سے اُٹھ کھڑی ہوئی "ظفر... کہاں جا رہا ہے بیٹے۔ میرے سینے کی آگ سرد نہیں کرے گا۔ یہ بھی نہیں بتائے گا کہ تجھے میرے گناہ کا علم کہاں سے ہوا ؟"

وہ رُک گیا۔

"تو پُوچھے گی تو ضرور بتاؤں گا ماں مجھے پہلے ایک بات کا جواب دے دے ؟" اُس نے کہا۔

"پُوچھ۔ خدا نے مجھے تیرے لئے زبان دی ہے، سچ بولنے کے لئے اُس نے مجھے زبان دی ہے، جو دل میں ہے پُوچھ لے۔"

"کیا میں ناجائز ہُوں۔ کیا میں گناہ کی تخلیق ہُوں ؟"

"نہیں۔ وحدہٗ لاشریک کی قسم نہیں۔ اُس کی قسم۔ نہیں۔ جس نے سالوں کے بعد مجھے گویائی عطا کی ہے ؟"

"ماں..." ظفر کا چہرہ آگ کی طرح سُرخ ہو گیا۔ "ماں" وہ دیوانوں کی طرح آگے بڑھا اور پھر حسینہ کا ہلکا سا وجُود اس کے بازوؤں میں سما گیا۔ "ماں، تو نے میرے وجُود کی کرچیاں جوڑ دیں۔ تو نے مجھے پھر سے چٹان بنا دیا۔ میری ماں، میری پیاری ماں" اُس نے حسینہ کو نیچے اُتار دیا۔ "مجھے تھوڑی دیر کی اجازت دے۔ بس میں تھوڑی دیر میں واپس آیا ؟"

"کہاں جا رہا ہے ؟" حسینہ نے پوچھا۔

"اُنھیں سزا دینے جن کا وجُود اس زمین پر ناجائز ہے۔ میں زمین کے ان پھوڑوں کو پھوڑ دوں گا۔ ایک ایک قطرہ لہو نچوڑ دوں گا ان کے بدن سے اور پھر اُنھیں جلا کر خاکستر کر دوں گا تاکہ ان کے مُردہ جسموں کے ناپاک جراثیم کہیں اور نہ پھیلنے پائیں۔ میں پہلے اپنی ماں پر الزام لگانے والوں کو فنا کر دوں گا۔ اس کے بعد کچھ اور کروں گا ؟"

"کون ہیں وہ ؟" حسینہ نے پوچھا۔

"نواب شمشیر زماں جیسے فرشتے کے اہل خاندان۔ بیگم مہرالنسا۔ اور ان کی بیٹیاں جن کے لئے میں نے ان کے سامنے قسم کھائی تھی کہ اگر میری ماں پر لگایا ہوا الزام جھوٹ نکلا تو اُنھیں طوائف بنا دوں گا"

"کیا... ؟" حسینہ لرز گئی۔

"مہرالنسا بیگم کو اپنے ایک ایک لفظ پر خون کے آنسو رونا پڑے گا اور میں ان سے سوال تو کروں ماں ؟"

"بیٹھ جا ظفر۔ بیٹھ جا میرے لعل آ اندر آ۔ آتے ہی ماں کو کتنے صدمے پہنچائے گا۔ بیٹھ جا۔ خود کو سنبھال۔ کن حالات میں آیا... اچانک آیا اور نہ جانے کن الجھنوں میں گھر گیا۔ چل اندر چل۔ شاید خود خدا کو یہی منظور تھا۔ شاید اسی دن کے لئے اس نے میری زبان بند رکھی تھی اور یہ اچھا ہی ہُوا۔ زبان کھلی ہوتی تو حالات نہ جانے کیا ہوتے۔ کیا بنتا کیا بگڑ جاتا۔ آجا اب میری بات سے انحراف نہ کر"

ظفر ماں کو دیکھتا رہا۔ پھر وہ اس کے ساتھ اندر چلا گیا۔ حسینہ بیٹے کے کرب کو سمجھ گئی تھی۔ اس نے آتے ہی جو کچھ سنا تھا۔ اس سے اس کی یہ کیفیت ہونا فطری بات تھی۔ بھرپور جوانی بے نظیر شخصیت پر اگر ایک ایسا داغ لگے اور اچانک لگے تو کیا نہ ہو جائے۔ حسینہ کا دل ڈھل گیا تھا اور پھر اندرُونی خوشی اُبھر آئی تھی۔ وہ بار بار ظفر کو چُوم رہی تھی اور ظفر اس کی ممتا کا بھرپور جواب دے رہا تھا۔

بابا کرم دین جو دل میں شدید اضطراب چھپائے نہ جانے کہاں کہاں مارے مارے پھر رہے تھے اور اُنھیں قرار نہ آ رہا تھا۔ بے چین ہو کر واپس آئے۔ دروازے پر دستک دی اور اندر آ گئے۔

"حسینہ بیٹی... ظفر میاں" اُنھوں نے صحن میں کھڑے ہو کر آواز دی اور حسینہ اُٹھ گئی۔ بابا کرم دین کے لئے اس کے دل میں بے حد احترام تھا۔ یہی تھے جن کی وجہ سے وہ محفوظ تھی۔ یہی تھے جنھوں نے اس کے کڑیل جوان کو اس کے سامنے لا کھڑا کیا تھا۔ حسینہ باہر آ گئی۔

"ظفر کہاں ہے ؟" بابا نے بے اختیار پوچھا۔ وہ حسینہ کی آنکھوں میں دیکھ رہے تھے۔

"اندر موجود ہے بابا" حسینہ نے جواب دیا۔ اور بابا کرم دین گردن ہلا کر اندر کی طرف چل پڑے۔ اُنھوں نے محسوس بھی نہیں کیا تھا کہ حسینہ بول رہی ہے۔ وہ سوال کرتے تھے اور حسینہ کی آنکھیں اس سوال کا جواب دیتی تھیں اور آنکھوں کی اس زبان کے اب وہ اس قدر عادی ہو گئے تھے کہ جواب سمجھنے میں اُنھیں کوئی دقت نہیں ہوتی تھی۔ آنکھوں کے یہ جواب ان کے ذہن کے راستے کانوں تک پہنچ جاتے تھے اور ہمیشہ وہ مطمئن ہو جاتے تھے۔

اس وقت بھی یہی ہوا تھا۔ دو قدم آگے بڑھے تو اُنھیں احساس ہوا کہ کوئی غیر معمولی بات ہوئی ہے۔ ایک اجنبی آواز کانوں میں اُبھری ہے۔ یہ آواز کہاں سے آئی؟ وہ چونکے، رُکے، اِدھر اُدھر دیکھا۔ پھر بے اختیار بولے۔

"کہاں ہے ظفر؟"

"اندر موجود ہے بابا۔ آیئے نا۔"

"ایں۔ ایں۔ ارے، ارے۔ تت تو۔ تُو بول رہی ہے۔ تُو بول رہی ہے حسینہ۔ ارے تُو بول رہی ہے۔ یہ آواز تیری ہے حسینہ بیٹی؟"

"ہاں بابا، آیئے۔ آیئے نا۔" حسینہ نے آگے بڑھ کر محبت سے کرم دین کا ہاتھ تھام لیا۔ کرم دین بد حواس سے اندر داخل ہو گئے۔ ظفر اندر بیٹھا ہوا تھا۔ بابا کرم دین کے احترام میں اُٹھ کھڑا ہوا۔ اُس نے بڑی محبت سے بابا کو بیٹھنے کی جگہ دی۔

"ارے بیٹے۔ ارے ظفر، حسینہ بول رہی ہے۔ عمر گزر گئی اسے دیکھتے ہوئے۔ کبھی نہ بولی تھی یہ اب بول رہی ہے۔"

"ہاں بابا۔ میری ماں کی قوت گویائی واپس آگئی۔ وہ فرعونوں کے لگائے ہوئے الزامات برداشت نہ کر سکی۔ اسے بولنا ہی تھا بابا ورنہ میرے دل کے سوراخ کون بند کرتا۔"

"چاند پر کتنی ہی خاک ڈالو بیٹا، وہ کب میلا ہوتا ہے۔ تُو ایک بار اپنی ماں کی آنکھوں میں جھانک لیتا۔ وہ تو مریم ہے۔ لوگوں کی زبان کے آگے لگام کہاں ہوتی ہے۔"

"یہ بے لگامی اب اُن کا مستقبل سیاہ کر دے گی بابا۔ تم دیکھتے رہو۔ وہ مجھے نہیں جانتے۔ میرا نام ظفر ہے۔"

"نہیں ظفر بیٹے۔ تم ابھی کوئی فیصلہ نہیں کرو گے۔ کوئی ایسی قسم نہیں کھاؤ گے جسے توڑنا پڑے۔ پہلے میری پوری بات سُن لینا۔" حسینہ نے سخت لہجے میں کہا۔

"مَیں تیری ہر بات مان لوں گا۔ جو تُو کہے گی زندگی بھر وہی کروں گا لیکن مَیں ان لوگوں کو نہیں چھوڑوں گا۔ جنھوں نے میرے خون پہ الزام لگایا ہے۔ جنھوں نے میری ماں پر کیچڑ اُچھالی ہے۔ مجھے اُس کی اجازت دے دے۔ مجھے اس کی اجازت ضرور دے دے۔ اُنھوں نے تیرے ساتھ جو سلوک کیا ہے، مَیں اسے کبھی معاف نہیں کروں گا۔ اگر بابا کرم دین نہ ہوتے تو مَیں کیا کرتا، کہاں تجھے تلاش کرتا؟"

"مہرالنسا بیگم نے ہمارے ساتھ جو کچھ کیا ٹھیک کیا۔ خدا نے اُنھیں دیکھنے والی آنکھ ہی نہ دی تھی۔ سمجھنے والا دماغ بھی نہ دیا گیا۔ پھر بھی ہم اس گھر کے احسانات کے بوجھ تلے دبے ہوئے ہیں۔"

"کیسا احسان ماں؟ آخر کیا احسان کیا نواب شمشیر زمان نے؟ اپنے اہلِ خاندان کو یہ نہیں بتایا تھا کہ تم بھی ان کی بیوی ہو۔ کیا اُنھوں نے تم سے نکاح نہیں کیا؟" ظفر نے بپھرے ہوئے انداز میں کہا اور حسینہ نے اس کے مُنہ پر ہاتھ رکھ دیا۔

"نہیں ظفر، کیسی باتیں کر رہا ہے۔ میرا نواب شمشیر زمان سے نکاح نہیں ہوا تھا۔" حسینہ نے کہا اور ظفر کا مُنہ تعجب سے کھلا رہ گیا۔

★★

انتہائی خفیہ میٹنگ ہو رہی تھی۔ اس میٹنگ میں صرف دو افراد شریک تھے۔ دادا جان اور ٹریبل زیڈ یعنی زاہد ذوالفقار زیدی جو اپنے آپ کو تین افراد شمار کرتا تھا۔ دادا جان سر جھکائے گہری سوچ میں غرق تھے۔ پھر اُنھوں نے بھاری لہجے میں کہا۔

"بھئی مَیں بزدل نہیں ہوں لیکن تم ابھی طرح سوچ لو، یہ بات قابلِ دست اندازی پولیس ہو سکتی ہے۔ ہم اپنے تعلقات بھی استعمال نہیں کر سکیں گے کیونکہ دُوسری طرف کی پارٹی بھی بڑی ہو گی۔"

"دادا جان، آپ کا یہ خادم آج تک جن صلاحیتوں کا مظاہرہ کرتا رہا ہے، کیا آپ کو ان پر اعتبار نہیں ہے؟ دیکھیں اگر نہیں ہے تو مجھے بتا دیجئے۔"

"ارے نہیں زاہد میاں، یہ بات نہیں ہے مگر بلیک میلنگ نہیں... بلیک میلروں کا انجام کچھ اچھا نہیں ہوتا۔"

"نہیں، نہیں، آخر کون سے ناول میں آپ نے یہ پڑھا ہے کہ کوئی بلیک میلر اپنے کسی کلائنٹ کے ہاتھوں مارا گیا اور پھر اگر نوبت یہاں تک پہنچ بھی گئی تو آپ کو کون پوچھتا ہے۔ آپ کا یہ خادم جو آپ کے سامنے ہے بس اگر کبھی گڑبڑ ہو جائے تو آپ عقب سے سنبھال لیں۔ زیادہ سے زیادہ یہی کہا جائے گا کہ زاہد بلیک میلر تھا۔ آپ میری پشت پناہی کریں۔ شجاع احمد صاحب کے تعلقات بھی تو کچھ کم نہیں ہیں۔ کچھ نہ کچھ ہو ہی جائے گا لیکن فرسٹ ایڈ ہاؤس کی تعمیر میں کوئی سقم نہیں رہنا چاہیئے۔ ہمیں فوری طور پر پانچ لاکھ روپے کی ضرورت ہے اور ہمارا محفوظ سرمایا اتنا نہیں رہا ہے کہ ہم اس کا رسک لیں۔ بس آپ ہاں کہہ دیجئے دادا جان، پھر دیکھئے میرا تماشا۔"

"ٹھیک ہے اگر تم یہی مناسب سمجھتے ہو تو یہی ٹھیک ہے لیکن پروگرام کیا ہو گا؟"

"ہمارا پہلا شکار حاجی نیاز ہیں۔ شجاع احمد صاحب کے دوستوں میں سے ہیں۔ ابھی پچھلے دنوں اُنھوں نے ایک فراڈ کیا تھا۔ ایک پورا جہاز اُنھوں نے ہانگ کانگ سے بُک کیا تھا، ایک نقلی نام سے۔ جہاز جب بندرگاہ سے آ لگا تو وہ نقلی نام اُنھوں نے غائب کر دیا یعنی جس نقلی نام سے یہ شپ منٹ ہوا تھا۔ اس کا کوئی وجود ہی نہیں تھا۔

"اعلیٰ حکام پریشان ہوگئے۔ مال بندرگاہ پر جہاز میں موجود تھا اور اس فرم کی تلاش ہو رہی تھی لیکن سارے کاغذات جعلی تھے اور ان پر ابھی خاصی رقم خرچ کی گئی تھی۔ پھر یہی فیصلہ ہوا کہ گورنمنٹ اس جہاز کا مال نیلام کر دے۔ اب ظاہر ہے نیلام کی وہ کیفیت تو نہیں ہو سکتی تھی جو اس مال کی اصل قیمت تھی چنانچہ حاجی نیاز صاحب نے نیلام میں زیادہ بولی لگا کر جہاز کا مال خرید لیا۔ اس طرح انھیں پچیس لاکھ کا منافع ہوا لیکن وہ کاغذات جس پریس میں پرنٹ کرائے گئے تھے وہاں ان کاغذات کی وہ پلیٹیں محفوظ تھیں جو پرنٹنگ کے لئے استعمال ہوتی ہیں چنانچہ وہ پلیٹیں حاصل کر لی گئیں۔ اب صورتِ حال یہ ہے کہ اگر پرنٹنگ پریس کو ہم اپنے شکنجے میں پھانستے ہیں تو وہاں کے کرتا دھرتا حاجی نیاز کا نام لیں گے کہ ان کے ایما پر یہ کاغذات تیار کئے گئے تھے اور اس طرح حاجی نیاز کھل کر سامنے آجائیں گے۔ اگر حاجی نیاز سے ان پچیس لاکھ میں سے ساڑھے بارہ لاکھ دو قسطوں میں یا تین قسطوں میں وصول کر لئے جائیں تو کیا حرج ہے۔ پھر بھی ساڑھے بارہ لاکھ روپے کا منافع ان کا اپنا ہوا نا۔"

داداجان متحیرانہ نگاہوں سے زاہد کو دیکھ رہے تھے پھر انھوں نے سراسیمہ سے لہجے میں کہا۔

"لیکن... لیکن زاہد تمھیں یہ سب کچھ کیسے معلوم ہوا؟"

"اس کی نہ پوچھیں داداجان۔ ظاہر ہے آپ نے ایک شعبہ میرے حوالے کیا ہے اور مجھے اس کے کارکن کی حیثیت سے کام کرنا ہے تو پھر یہ تمام معلومات تو رکھنا ہی ہوں گی۔ میں اس سلسلے میں اپنی جاسوسوں کی ٹیم کے ساتھ مصروفِ عمل ہوں ہر چند کہ وہ سارے کے سارے گھامڑ ہیں لیکن یہ گھامڑ ہمارے لئے بڑے کام کے ثابت ہو رہے ہیں۔ میں اپنے دوسرے شکاروں کے بارے میں بھی تفصیلات معلوم کرنے میں مصروف ہوں۔ آپ مطمئن رہیں۔ بس آپ میرے سر پر ہاتھ رکھے رہیں۔ پھر دیکھئے زاہد ذوالفقار زیدی کیا گل کھلاتا ہے۔"

حسام احمد صاحب عمر رسیدہ ضرور تھے، عادتوں میں بچگانہ پن بھی تھا لیکن اپنی زندگی بڑی شان و شوکت سے گزار چکے تھے۔ یہ شان و شوکت حماقتوں کا نتیجہ نہیں تھی۔ ذہین تھے اور اپنے دور میں اتنا کچھ کر چکے تھے کہ بڑا نام کمایا تھا۔ بڑی دولت کمائی تھی۔ اس وقت بھی اگر ذہن پر زور دیتے تو صحیح فیصلہ کر سکتے تھے اور یہی وہ وقت تھا جب ان کی ذہانت بیدار تھی۔ وہ زاہد کے بارے میں ہی سوچ رہے تھے۔ یہ شخص کیسی عجیب و غریب سوچ کا مالک ہے حاجی نیاز کا معاملہ سو فیصدی زاہد ذوالفقار زیدی کی اپنی کاوشوں کا نتیجہ تھا۔ اگر اس بلیک میلنگ کے ذریعے وہ ساڑھے بارہ لاکھ روپے حاجی نیاز سے وصول کرلے تو درحقیقت حسام احمد صاحب کا اس میں کوئی ہاتھ نہ ہوگا۔ یہ رقم زاہد ذوالفقار جیسے آدمی کے لئے جو معمولی سی حیثیت کا مالک ہے اور تھوڑی سی تنخواہ پاکر زندگی گزار رہا ہے۔ بہت بڑی حیثیت رکھتی تھی۔ وہ یہاں سے ہٹ کر بھی اپنا کیریئر شروع کر سکتا تھا لیکن کیا وہ واقعی فرسٹ اینڈ ڈاؤنز کی تعمیر میں اتنی ہی دلچسپی لے رہا ہے کہ اسے اپنے مفاد کا کوئی خیال نہیں آتا۔ اس کی تمام فطرت کو مدِنظر رکھتے ہوئے حسام احمد صاحب اس پر شبہ نہیں کر سکتے تھے اور جب وہ سوچ کی حدود سے نکل جاتے تو پھر زاہد ان کی کی نگاہ میں ایک عظیم انسان رہ جاتا تھا جسے اپنے آپ سے کوئی دلچسپی نہیں تھی اور جو خلوصِ دل سے مظلوم انسانوں کے لئے بہت کچھ کر رہا تھا۔ انھوں نے جذبات سے مغلوب ہوکر زاہد کا ہاتھ پکڑ لیا اور دھیمے لہجے میں بولے۔

"زاہد تم اپنے لئے کچھ کیوں نہیں کرتے۔ یہ ملازمت عجیب نہیں ہے جس میں تم دوسروں کو تو لاکھوں کا فائدہ پہنچا سکتے ہو اور خود ایک معمولی سی تنخواہ پر گزارہ کر رہے ہو؟"

"داداجان... داداجان اگر آپ مجھے اپنے خاندان میں ایک فرد کی حیثیت دے چکے ہیں تو میرے بارے میں آپ نے اندازے بھی لگائے ہوں گے جس کام کا بیڑہ آپ نے میرے ایما پر اٹھایا ہے کیا اسے نظر انداز کرکے میں اپنے مفادات کے چکر میں پڑ جاؤں۔ نہیں داداجان بھول کر بھی یہ نہ سوچیں۔ جس وقت بھی زاہد آپ کو بے ایمان نظر آئے اس کے کان پکڑ کر اس کوٹھی کے احاطے سے باہر نکال دیں۔"

"نہیں بیٹا، میں تجھ پر مکمل اعتماد کرتا ہوں۔ پتہ نہیں کون ہے تو؟ پتہ نہیں کون ہے؟"

"آپ کا زاہد ہوں اور بس، آپ میرے لئے دنیا کی ہر شے سے زیادہ قیمتی ہیں داداجان، ہر شے سے زیادہ قیمتی۔" زاہد نے آہستہ سے کہا اور داداجان نے اسے کھینچ کر سینے سے لگا لیا۔ تھوڑی دیر کے بعد زاہد اپنی جگہ سے اٹھ گیا۔

"داداجان طے یہ کیا گیا ہے کہ آج ہی اس سلسلے میں عمل کر ڈالا جائے۔ میں نے اس کارروائی کا آغاز، رمضان سے کیا ہے۔ یعنی ایک کام میں رمضان سے لوں گا، دوسرا کام میں خود کروں گا۔ کوئی ایسی بات بتلائیے جس کے ذریعے میں حاجی نیاز کے پاس پہنچ سکوں اور اس کے ساتھ کچھ وقت گزار لوں۔"

"ایسی بات... ایسی بات۔" حسام احمد صاحب پرخیال انداز میں بولے۔ وہ اپنا گال کھجا رہے تھے۔ پھر انھوں نے ایک دم اچھل

کر کہا۔ "ہاں بھئی زاہد میاں، ہے ایک ایسا کام، جس کی وجہ سے تم حاجی نیاز کے پاس جا سکتے ہو۔"

"بھلا کیا، بتایئے داداجان۔"

"بھئی میں نے حاجی نیاز سے دو بھینسیں منگوائی تھیں۔ اس کی زمینوں پر بھینسوں کا باڑہ بنا ہوا ہے اور وہاں عمدہ قسم کی بھینسیں موجود ہیں۔ اس سے میں نے کہا تھا کہ مجھے ان میں سے دو اعلیٰ پائے کی بھینسیں لا کر دے۔ اس بات کو کہے ہوئے بھی دو تین مہینے ہو گئے لیکن ابھی تک اس نے کوئی بندوبست نہیں کیا۔ بس مجھے اچھی نسل کی بھینسیں پالنے کا شوق رہا ہے اور یونہی دوران گفتگو حاجی نیاز نے ایک بار بھینسوں کا تذکرہ کیا تھا۔ تم اگر اس کے پاس جانا چاہتے ہو تو یہ سہارا لے کر چلے جاؤ اور پھر تم جس طرح چاہو، عمل کرنا۔"

"ٹھیک ہے داداجان، اچھا آئیڈیا ہے۔ اب میں باقی کارروائی مکمل کر لوں۔"

"ٹھیک ہے۔" داداجان نے جواب دیا اور زاہد ان کے کمرے سے نکل گیا۔

باہر آ کر وہ رمضان کے کوارٹر کی جانب چل پڑا تھا۔ دوسری تیاریاں شاید اس نے مکمل کر لی تھیں۔ تقریباً پندرہ منٹ وہ رمضان کو صورتِ حال سمجھاتا رہا اور رمضان تھرتھر کانپتا رہا۔ پھر وہ لرزتی ہوئی آواز میں بولا۔

"زاہد بھیا... زاہد بھیا... مم میں... میں کہیں پھنس نہ جاؤں۔"

"پھنس نہ جاؤں اور یہ اتنے عرصے سے جو تو مجھ سے تنخواہ وصول کر رہا ہے اس کا کیا ہو گا، سارا حساب کر دے، ابھی اور اسی وقت۔ نکال کاغذ پنسل۔"

"ارے نہیں زاہد بھیا، میرا مطلب ہے، میں... میں... میں انکار تو نہیں کر رہا۔ آخر جاسوس ہوں۔ یہ کام تو کرنے ہی ہوں گے۔ مم مگر ڈرتا ہوں۔"

"ڈرنے والے جاسوس مجھے نہیں چاہئیں سمجھے رمضان تم ایک ایک پائی کا حساب کرو۔ ورنہ سمجھ لو کہ تمھاری ساری رپورٹ داداجان کے پاس پہنچ جائے گی۔"

"اس کی کیا ضرورت ہے زاہد بھیا۔ مم میں نے منع تھوڑی کیا ہے۔ ٹھیک ہے جیسا آپ کہیں گے، ویسا ہی کروں گا۔" رمضان نے کہا۔

"نہیں جیسا میں کہہ رہا ہوں اس سے بڑھ کر کرو گے۔ اتنی ہوشیاری سے یہ سارا کام ہونا چاہیئے کہ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو۔ سمجھے تم۔ اگر ایسا ہو گیا تو پھر سمجھ لو، بات ہم تک ہی محدود نہیں رہے گی بلکہ تمھیں پولیس کے حوالے کر دیا جائے گا اور میں تمھارے خلاف گواہی دوں گا کہ تم جرائم پیشہ انسان ہو۔"

"مم مگر زاہد بھیا، میں نے تو کوئی جرم نہیں کیا۔"

"اب کر دگے۔ ہمارے لئے کرو گے لیکن ہمارا نام نہیں لے سکو گے۔ اب میں کہتا ہوں تو آدمی ہے یا گاجر مولی۔ اتنے سے کام کے لئے کہا ہے اور اس میں تیرا دم نکلا جا رہا ہے۔ مجھے تم جیسے... جاسوسوں کی ضرورت نہیں ہے۔ میں ذرا بہترین قسم کے آدمی تلاش کرنا چاہتا ہوں۔"

"آدمی تو میں بھی بہترین ہوں زاہد بھیا۔ تم دیکھنا کیا کر کے دکھاتا ہوں۔"

"پروگرام سمجھ گیا نا۔ تو میرے ساتھ جائے گا اور گاڑی میں بیٹھا رہے گا۔ ٹھیک ہے۔ جب میں حاجی نیاز کے ساتھ ان کے کمرے میں بیٹھا ہوں گا تو تو خاموشی سے چاروں طرف کا جائزہ لے کر حاجی نیاز کے کمرے تک پہنچے گا۔ کوئی ایسی جگہ تلاش کرے گا جہاں سے تو فائر کر سکے، سمجھا۔ پستول چلاتے وقت خوف کا شکار مت ہو جانا۔ میں نے تجھے اس کی مشق کرائی ہے۔"

"پستول تو میں یوں ہی چلا لیتا ہوں۔ بس کی تو کوئی بات ہی نہیں ہے۔"

"بے وقوف آدمی، وہ کوئی اصلی پستول تھوڑی ہو گا۔ صرف پٹاخے والا پستول ہے جس میں سے ایک معمولی سا چھرا نکلتا ہے مگر آواز ایسی ہی ہوتی ہے جیسے اصلی پستول چلایا گیا ہو۔"

"تب تو ٹھیک ہے بھیا، کوئی مرے گا تو نہیں اس سے؟" رمضان نے پوچھا۔

"تو مر جائے تو دوسری بات ہے اور کوئی نہیں مرے گا۔ بس پہلے دھماکا کرنا اس کے بعد یہ لفافہ پھینک دینا اور پھر خاموشی سے واپس آ کر کار میں بیٹھ جانا۔"

"بس اتنا سا کام بھیا، یہ تو کوئی بات ہی نہیں ہے۔ میں باآسانی یہ کام کر لوں گا۔" رمضان نے کہا۔ اندر سے اس کا دل بھر بھرا رہا تھا لیکن اوّل تو وہ جو تنخواہ وصول کر چکا تھا، وہ واپس نہیں کر سکتا تھا۔ دوسری بات یہ ہے کہ چھوٹی سی بات پر... یہ بڑی نوکری چھوڑنا نہیں چاہتا تھا جس نے اس کے حالات بدل دیئے تھے۔ چنانچہ وہ تیار ہو گیا۔

زاہد مسکراتا ہوا باہر نکل گیا تھا۔

★ ★

بابا کرم دین خاموش بیٹھے تھے۔ وہ بے چینی سی محسوس کر رہے تھے اور ظفر کی آنکھیں حسینہ کے چہرے کا طواف کر رہی تھیں۔ ماں کے اس انکشاف نے ایک بار پھر اسے حیران کر دیا تھا۔ حسینہ خلا میں گھور رہی تھی جیسے ماضی کے بکھرے ہوئے اوراق یکجا کر رہی ہو۔

پھر اس کی نگاہیں بیٹے کے چہرے کی جانب اٹھیں اور ان میں مسکراہٹ پھیل گئی۔

"سوچ رہا ہو گا کیسی بے وقوف عورت ہے، شاید لفظوں کے جال میں پھنسا کر مجھے بے وقوف بنانا چاہتی ہے، نہیں ظفر بیٹے تیرا خیال غلط ہے۔ وہ خاندان، وہ گھر ہمارے محسنوں کا گھر ہے۔ عورت سب سے زیادہ کمزور عقل کی مالک ہوتی ہے۔ شک و شبہ اس کے خمیر میں گندھا ہوا ہے۔ میں یہ ساری باتیں اس سے پہلے نہیں جانتی تھی لیکن اب ایک طویل تجربہ ہے، مجھے سالوں گزر گئے۔ اب تو مجھے یاد بھی نہیں ہے کہ کتنے سال ہو گئے۔ میں نے ان سالوں میں صرف تجربات ہی تو حاصل کئے ہیں۔ میں بول تو نہیں سکتی تھی، سمجھ تو سکتی تھی۔

وہ خاندان ہر طرح سے اس قابل ہے کہ ہم اس کی پوجا کریں، ہم اس کے احسانات کو تسلیم کریں۔ ہم انہیں دعائیں دیں۔ خداوند شمشیر زمان کو جنت الفردوس میں جگہ دیں۔ وہ میرے شوہر نہیں تھے بیٹے۔ وہ میرے لئے ایک بھائی کا درجہ رکھتے تھے۔ ہاں وہ بھائیوں سے زیادہ میرے محسن تھے۔ اس دور میں شاید سگے بھائی بھی وہ سلوک نہ کر سکیں جو انہوں نے میرے اور تیرے ساتھ کیا۔ میں جانتی ہوں بیٹا، انہوں نے تجھے لندن بھیجا، تجھے تعلیم دلوائی اور خود کو تیرے باپ کی حیثیت دی۔ مجھے یقین ہے کہ انہوں نے تجھے یہ حیثیت صرف اس لئے دی ہو گی کہ تو بن باپ کا نہ کہلائے، تیری شخصیت مشکوک نہ ہو۔"

"مگر ماں میرا باپ کون تھا؟ کوئی تو ہو گا جب میں تیری ناجائز اولاد نہیں ہوں تو میرا جائز باپ کہاں ہے؟"

"خدا جانے کہاں ہے وہ بدنصیب، خدا جانے کہاں ہے وہ، جس نے تجھے ایک وجود دیا اور اس کے بعد ہم دونوں سے یہ سلوک کیا۔ وہ قاتل ہے بیٹے، وہ قاتل ہے۔ اس نے مجھے بھی قتل کر دیا تھا اور تجھے بھی۔ میں اگر مر جاتی تو تیرا وجود کہاں ہوتا۔ تیرا ننھا سا وجود تو میری ذات میں ہی فنا ہو جاتا۔ شمشیر زمان نے ہم دونوں کو زندگی دی، مجھے بھی اور تجھے بھی۔"

"کیا...؟" ظفر کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ بابا کرم دین کا منہ بھی تعجب سے کھلا رہ گیا تھا۔ حسینہ کی کہانی ان بے چاروں کو کیا معلوم۔ وہ تو بس ازراہ انسانیت یہ سب کچھ کرتے رہے تھے۔ وہ کیا جانتے تھے کہ حسینہ کون ہے۔ کس طرح شمشیر زمان کے ہاتھ لگی۔ اور کس طرح یہاں تک پہنچی۔ بس انہوں نے اسے ہمیشہ سے دیکھا تھا اس کی نرمی، سادگی اور معصومیت ان سب کے دلوں پر نقش تھی اور پھر جب اس پر ظلم ہوا تو بابا کرم دین اس ظلم کو نہ دیکھ سکے اور جو کچھ کر سکتے تھے انہوں نے حسینہ کے لئے کیا۔

وہ خود بھی حسینہ کی کہانی کو دلچسپی سے سن رہے تھے۔ حسینہ کے چہرے پر ماضی کے سائے لرزاں تھے اور ظفر اسے دیکھ رہا تھا۔

"میرا نام حسینہ نہیں ہے۔ یہ نام تو ان نیک لوگوں نے مجھے اپنی آرام گاہ میں دیا تھا۔ میرا اصل نام شبہ بانو ہے۔ میں اور میرا باپ گل زمان خان ایک چھوٹے سے گاؤں جمال گڑھی میں رہتے تھے۔ میری ماں میری پیدائش کے وقت مر گئی تھیں۔ گل زمان خان نے مجھے بڑے ناز و نعم سے پرورش کیا۔ تھوڑی سی زمین تھی ہماری۔ میرے باپ گل زمان اس زمین پر کھیتی باڑی کرتے تھے۔ ترکاریاں اگاتے تھے اور انہیں منڈی میں لے جا کر فروخت کر دیا کرتے تھے۔ گاؤں کے حسین ماحول میں میں کسی جنگلی بیل کی طرح بڑھ رہی تھی۔ میری ابھی عمر زیادہ نہیں تھا لیکن قد کاٹھ بڑھ گیا تھا۔ پھر جب گل زمان نے میرے قد کاٹھ کو دیکھا تو انہیں میری شادی کی فکر ہوئی۔ انہوں نے مجھے گاؤں کی دوسری لڑکیوں کی طرح اجڈ جاہل اور گنوار نہیں رکھا تھا۔

"ہمارے پڑوس میں ایک مؤذن رہتے تھے جو ہمارے گاؤں کی مسجد میں امامت بھی کیا کرتے تھے۔ بچوں کو درس و تدریس بھی دیتے تھے۔ بڑے نیک آدمی تھے۔ میرے باپ نے ان سے کہہ کر مجھے کلام پاک کی تعلیم دلوائی اور اس کے بعد اردو کی کچھ کتابیں بھی پڑھوائیں۔ میں اچھا خاصا لکھنا پڑھنا سیکھ گئی تھی۔ اس طرح میں گاؤں کی دوسری لڑکیوں سے ممتاز تھی۔

"یوں بھی میری فطرت میں چھچھورا پن نہیں تھا۔ نہ ہی میں کبھی کسی بات پر برا مانا کرتی تھی۔ زندگی یوں ہی رواں دواں تھی۔ زندگی کی دوسری نعمتیں بھی حاصل تھیں۔ سہیلیاں تھیں۔ میں ان کے ساتھ جا کر باغوں میں جھولا ڈالتی اور ساون کے گیت گایا کرتی۔ ایسے ہی ایک منحوس دن شاجی نے مجھے دیکھ لیا۔

"وہ جنگلوں کی کٹائی کرانے آیا تھا۔ ٹھیکیدار تھا۔ ٹھیکہ لیا تھا انہوں نے بہت بڑا اور اس وقت جمال گڑھی کے تمام نوجوان اس کی غلامی میں لگے ہوئے تھے۔

"شاجی ایک جوان اور وجیہہ انسان تھا۔ گھوڑے پر بیٹھ کر نکلتا تو ایسے لگتا جیسے کوئی شہزادہ اپنی محل سرا سے نکل کر عازم سفر ہوا ہو۔

"میں نے بھی انہیں دیکھا اور دل محسوس کر کے رہ گئی بیٹے تمہارے

سامنے یہ سارے اعترافات کرتے ہوئے میں شرم محسوس کر رہی ہوں۔ ایک ماں اور بیٹے کے درمیان شرم و حیا کے جو رشتے ہونے چاہئیں میں ان سے نا آشنا نہیں ہوں لیکن میں اپنی ساری کہانی تمہیں سنا دینا چاہتی ہوں۔ صرف تمہیں اس لئے کہ کچھ ناعاقبت اندیشوں نے تمہارے ذہن کو گندا کر دیا تھا۔ انھوں نے تم پر جو کیچڑ اچھالی ہے، میں وہ کیچڑ واپس ان کے منہ پر تو نہیں مار سکتی لیکن میرے بچے تمہارا دل صاف کرنا میری ذمے داری ہے... اتنے طویل عرصے کے بعد تمہارے واپس آنے سے میں بے حد خوش ہوں لیکن میری ذات سے تمہیں کوئی بوجھ ملے۔ یہ ماں کا فرض نہیں ہے۔ اس لئے مجھے میرے لفظوں پر معاف کر دینا۔"

"ماں تم کہو، میں سن رہا ہوں۔" ظفر نے کہا۔

"شاجی کو دیکھ کر میں متاثر ہو گئی تھی۔ میں فطرتاً بری نہیں تھی لیکن عمر کا ایک حصہ ایسا ہوتا ہے جب انسان کے دل میں خواہ مخواہ امنگیں جنم لیتی ہیں۔

"شاجی نے بھی مجھے دیکھا اور کھو سا گیا۔ وہ اتنا برا انسان نہیں تھا بیٹے یا پھر میرا تجربہ ہی اس سلسلے میں کچھ نہیں تھا۔ میں اس کی آرزو کرنے لگی۔ میں اس کے خواب آنکھوں میں بسائے گھر لوٹی اور اس کے بعد موقع تلاش کرتی رہی کہ کس طرح اسے دوبارہ دیکھوں۔

"اس کی اپنی بھی یہی کیفیت تھی۔ بہت بڑا آدمی تھا وہ۔ بڑی شان سے رہتا تھا جبکہ میں اس کے مقابلے میں کچھ نہیں تھی۔

"جنگلوں کی کٹائی کا ٹھیکے دار جمال گڑھی میں رہنے والوں کے لئے بہت بڑی حیثیت رکھتا تھا۔ وہ ان سب کا ان داتا تھا اور وہ اس کے ہر احکام پر سر جھکانے والوں میں سے تھے۔ بہت بڑا طبقہ اس کے ملازموں میں شامل تھا۔ چنانچہ اس کے لئے کسی کے دل میں کوئی برائی پیدا ہو ہی نہیں سکتی تھی۔

"وہ پھر مجھ سے ملا اور میرے نزدیک آ گیا۔ اس نے مجھ سے کہا کہ وہ مجھے چاہنے لگا ہے۔ میرے کان یہی الفاظ سننے کے متمنی تھے۔ میں نے اس کی اس بات کے جواب میں گردن جھکا دی۔

"اس کے بعد بات میرے بابا کے کانوں تک پہنچ گئی۔ جمل نسمان خان بہت ہی شریف اور نیک نام آدمی تھا۔ اسی بستی میں پیدا ہوا اسی بستی میں شادی کی۔ اسی میں زندگی گزاری لیکن اس کے نام کے ساتھ کوئی حرفِ غلط کبھی نہیں ابھرا۔ یہ پہلا موقع تھا جو اس کی زندگی میں کٹھن آیا تھا۔ اس نے شاجی سے بات کی۔ اس نے کہا کہ یہ جوڑ کسی طرح مناسب نہیں ہے۔ یہ ساری کہانیاں وہی ہیں جن کا اختتام المیوں پر ہوتا ہے۔ وہ ایسا نہ کرے، اس طرح نہ سوچے۔ وہ ہمارے لئے قابلِ احترام ہے۔ ہم اس کی عزت کرتے ہیں۔ کہیں یوں نہ ہو کہ اس عزت میں کوئی فرق آ جائے۔ تب شاجی نے آنسوؤں بھری آنکھوں سے میرے بابا سے کہا کہ وہ میرے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔

"میرے بابا نے اس سے کہا کہ کیا وہ اپنے والدین کی رضامندی حاصل کر سکتا ہے؟ اس پر شاجی نے کہا کہ یہ اس کی ذمہ داری ہے لیکن آسانی سے یہ کام نہیں ہو گا۔ وہ اپنی دلہن کو وہی مقام دے گا جو ایک شریف گھرانے کی بہو کو ملتا ہے۔ اس نے کہا کہ وہ مجھ سے نکاح کرنا چاہتا ہے۔ نکاح کرنے کے بعد وہ اس وقت تک یہیں رہے گا جب تک جنگلوں کی کٹائی ہوتی رہے گی اور اس کے بعد وہ مجھے لے کر چلا جائے گا۔

"گاؤں کے بہت سے لوگوں نے میرے باپ کو مجبور کیا کہ وہ ٹھیکیدار کی بات مان لے۔ ٹھیکیدار بھلا آدمی ہے۔ اس کی بیٹی کی تقدیر جاگ رہی ہے تو وہ کیوں اس پر سیاہی تھوپنا چاہتا ہے۔

"میرا بابا تشویش کا شکار تھا۔ وہ بہت عرصے سے بیمار رہنے لگا تھا۔ دمے کا مرض تھا اسے۔ میرے لئے وہ ہمیشہ فکرمند رہتا تھا۔ بہت غور و خوض کرنے کے بعد بالآخر اس نے اپنی رضامندی کا اظہار کر دیا۔ مولوی صاحب نے ہمارا نکاح پڑھایا اور شاجی مجھے رخصت کر کے لے گیا۔

"اس نے اپنے گھر میں مجھے بڑی عزت و احترام سے رکھا۔ میرے بابا کو علاج کے لئے قریب کے شہر لے گیا۔ اس نے ہر طرح سے ہماری دیکھ بھال کی اور اس طرح کہ میرا بابا اس کی طرف سے مطمئن ہو گیا۔

"ہماری شادی کے تین مہینے کے بعد میرے بابا کا انتقال ہو گیا۔ شاجی نے مجھے ہر طرح سے دلاسا دیا تھا لیکن میں کبھی کبھی اسے تنہائیوں میں پریشان دیکھتی تھی۔ وہ کھویا کھویا رہتا تھا۔ بظاہر وہ مجھ سے بے پناہ محبت کرتا تھا۔ مجھے اس کی طرف سے کوئی خوف نہیں تھا لیکن وہ پریشان رہنے لگا تھا۔ میں نے کئی بار اس سے اس کی پریشانی کی وجہ پوچھی لیکن وہ مجھے کچھ نہیں بتا سکا۔

"وقت گزرتا رہا۔ کٹائی کا کام اب بہت تھوڑا سا رہ گیا تھا۔ جنگلوں میں اس نے جتنا حصہ خریدا تھا وہ سب کا سب کٹ گیا تھا۔ اور اب درختوں کے تنے گاڑیوں پر لدوا لدوا کر روانہ کئے جا رہے تھے۔ گویا کام اب آخری مراحل میں تھا۔

"شاجی کے انداز میں میں نے کچھ تبدیلی محسوس کی تھی لیکن میں ناتجربہ کار تھی۔ صحیح طور پر اس تبدیلی کو سمجھ نہ سکی۔

"بالآخر شاجی کا آخری کام بھی مکمل ہو گیا اور وہ واپسی کی تیاریاں کرنے لگا۔ تب اس نے مجھ سے کہا کہ وہ مجھے اسی مکان میں چھوڑے جا رہا ہے۔ یہاں میرے لئے تمام چیزیں مہیا کر دی جائیں گی۔ دو چار مہینے وہ لکڑی کے اس کاروبار کو مختلف جگہوں پر پھیلانے

کی کوششیں کرے گا۔ نئے ٹھیکے حاصل کرے گا اور اس کام سے فراغت پاتے ہی وہ مجھے لے جائے گا۔ اس نے کہا تھا کہ نیا ٹھیکہ لینے کے بعد ہم پھر کسی جنگلی مقام پر قیام کریں گے۔

"لیکن میرا دل نہ مانا۔ میں نے اس سے کہا کہ وہ جہاں بھی جا رہا ہے مجھے ساتھ لے جائے۔ میں اس پر بوجھ نہیں بنوں گی۔ کچھ دن تک تو شاجی مجھے یونہی ٹالتا رہا لیکن ایک دن وہ سخت ہو گیا۔

"اس نے کہا کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ یہ ممکن نہیں ہے۔ ابھی میں نے تمھارے بارے میں کسی کو کچھ نہیں بتایا۔ کیسے لے جا سکتا ہوں تمھیں۔ پہلے مجھے تمھارے لئے ایک راستہ ہموار کرنا ہو گا۔ اس کے بعد ہی تو تم میرے ساتھ جا سکتی ہو۔

"میں رونے لگی۔ میں نے یہ بات ان مولوی صاحب کو بتائی جنھوں نے بچپن میں مجھے پڑھایا تھا اور جنھوں نے میرا نکاح پڑھایا تھا۔

مولوی صاحب نے یہ معاملہ پنچائت کے سامنے رکھ دیا۔ ہمارے سرپنچ زمان داد خان بابا تھے۔ وہ بے حد سخت گیر آدمی تھے۔ انھوں نے شاجی کو پکڑ بلوایا اور سخت لہجے میں کہا۔

"شاجی اس قسم کے حادثے گاؤں اور دیہاتوں میں ہوتے رہتے ہیں۔ شہر سے آنے والے گاؤں کی بھولی بھالی لڑکیوں پر جال ڈالتے ہیں۔ انھیں اپنی ہوس کا نشانہ بناتے ہیں اور اس کے بعد انھیں اس طرح بھول جاتے ہیں جیسے ان سے کوئی تعلق ہی نہ رہا ہو۔ ایسے بہت سے الیے ہو چکے ہیں چونکہ اس نے وعدہ کیا تھا کہ یہاں کی کھدائی کا کام مکمل ہوتے ہی وہ مجھے اپنے ساتھ لے جائے گا اور یہ وعدہ میرے مرحوم باپ سے سب کے سامنے کیا گیا تھا۔ اس لئے اب اس پر لازم ہے کہ وہ اپنا وعدہ پورا کرے اور مجھے اپنے ساتھ لے جائے۔

"شاجی نے بہت کچھ کہا سرپنچوں سے لیکن انھوں نے اس کی کسی بات کو تسلیم نہیں کیا اور اسے سختی سے ہدایت کی کہ وہ یہاں سے اسی شکل میں واپس جا سکتا ہے کہ وہ مجھے ساتھ لے جائے۔

"شاجی بحالتِ مجبوری تیار ہو گیا لیکن... لیکن...

حسینہ کی آواز سسکیوں میں تبدیل ہو گئی۔ اس کا سانس تیز ہو گیا۔ اس نے اپنے سینے پر دونوں ہاتھ رکھ لئے اور ٹھٹھر تڑپ اٹھا۔

"ہاں سنبھالو خود کو، خود کو سنبھالو۔ پھر کیا ہوا؟" اس نے بے چینی سے پوچھا لیکن حسینہ کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی۔ کرم دین بابا بھی اپنی آنکھوں سے بہنے والے آنسوؤں کو نہیں روک سکے تھے۔

★ ★

حاجی نیاز نے اسے کمرے میں بلا لیا۔ انھیں یاد نہیں آ رہا تھا کہ زاہد کون ہے لیکن زاہد کو دیکھتے ہی وہ پہچان گئے اور پہچان کر کھل اٹھے تھے۔

"ارے تم۔ تم کیا شجاع احمد کے ہاں سے آئے ہو؟"

"جی حاجی صاحب مجھے حسام احمد صاحب نے بھیجا ہے۔"

"ارے آؤ بھئی۔ تم سے تو ملاقات ہو چکی ہے نا ایک بار۔" حاجی نیاز بڑے تپاک سے اس سے مصافحہ کرتے ہوئے بولے۔

"جی ہاں۔ اسی دن جب آپ شجاع احمد صاحب کے ساتھ شطرنج کھیل رہے تھے۔"

"اور تم نے بساط ہی بدل دی تھی کیوں؟" حاجی نیاز ہنس کر بولے اور زاہد نیاز مندانہ انداز میں ہنسنے لگا۔

"حسام احمد صاحب نے تمھیں جس لئے بھی بھیجا ہو میاں، میری بڑی خواہش تھی کہ کسی دن تم میرے یہاں آؤ۔ غالباً میں نے تمھیں دعوت بھی دی تھی۔"

"جی ہاں جی ہاں آپ نے فرمایا تھا لیکن بس مصروفیات۔"

"اس وقت تو کوئی خاص مصروفیت نہیں ہے؟"

"جی نہیں۔ بس وہ دادا جان نے میرا مطلب ہے حسام احمد صاحب نے۔"

"ہاں، ہاں بیٹھو تو سہی۔ ارے چائے لاؤ بھئی زاہد میاں کے لئے۔ زاہد تم یقین کرو کہ میں تمھاری شطرنج کی چالیں دیکھ کر دنگ رہ گیا تھا۔ میاں تم تو بین الاقوامی معیار کے مطابق کھیلتے ہو۔ کبھی کسی مقابلے میں حصہ لیا؟"

"جی نہیں۔ بس زندگی کے پُرپیچ راستوں پر سنبھل سنبھل کر چلتا ہوں۔ کبھی اتنا موقع ہی نہیں ملا کہ ان دلچسپیوں میں حصہ لوں۔ یہ سب کچھ تو بس یونہی سیکھ لیا تھا۔"

"یونہی سیکھ لیا تھا۔ جبھی میں تو تمھاری جانب سے اچھے اچھے شاطروں کو چیلنج کر سکتا ہوں۔"

"نوازش ہے آپ کی حاجی صاحب۔ آپ نے میرا دل بہت زیادہ بڑھا دیا ہے تو وہ حسام احمد صاحب نے۔"

"گولی مارو حسام احمد صاحب کو۔ ہم... میرا مطلب ہے سوری معاف کرنا ذرا جذباتی ہو جاتا ہوں مگر تمھیں یہاں سے ایک بازی کھیلے بغیر نہ جانے دوں گا۔ ویسے حسام احمد صاحب نے کس کام سے بھیجا ہے تمھیں؟" حاجی صاحب بوکھلاہٹ میں حسام احمد صاحب کے بارے میں نازیبا الفاظ استعمال کر گئے تھے۔

"جی وہ کبھی انھوں نے آپ سے بھینسوں کا تذکرہ کیا تھا؟"

"اوہ۔ ہاں ہاں کیا کروں بھئی۔ بس کاروباری معاملات میں اتنا اُلجھا رہتا ہُوں کہ بعض اوقات یادداشت ساتھ نہیں دیتی۔ میرا سب سے دلچسپ مشغلہ شطرنج ہے۔ ہاں تو میاں چائے آ رہی ہے۔ جینیوں کے بارے میں بھی بات چیت کریں گے۔ تم یہ کہہ سکتے ہو ان سے کہ مَیں نے تمہیں روک لیا تھا۔ کچھ جینیوں کے بارے میں بات چیت کر رہا تھا۔ تمھیں کوئی جلدی تو نہیں ہے؟"

"جی نہیں۔ ایسی کوئی بات نہیں ہے جس کوٹھی میں مَیں رہتا ہُوں وہاں کے لوگ فرشتہ صفت ہیں۔ ملازموں کو بڑا اعلیٰ درجہ دیا جاتا ہے چنانچہ میرے لیئے کوئی ایسی مشکل نہیں ہے۔"

"ارے واہ۔ تب پھر کیا بات ہے آؤ پھر ذرا ہو جائیں دو، دو ہاتھ" حاجی صاحب نے ایک ملازم کو آواز دی اور اس نے شطرنج کی بساط بچھا دی۔ زاہد سامنے بیٹھ گیا۔ سارے کام پروگرام کے مطابق ہو رہے تھے حاجی صاحب کی شطرنج سے دلچسپی کو وہ اچھی طرح سمجھ چکا تھا ایک ہی ملاقات ہُوئی تھی لیکن اس نے اچھی طرح اندازہ لگا لیا تھا کہ وہ شطرنج کے زبردست عاشق ہیں چنانچہ بازی لگ گئی۔

زاہد اپنی زندگی کے بہترین کھیل کا مظاہرہ کرنے لگا۔ حاجی نیاز کو پھانسنے کے لئے اسے کچھ زیادہ ہی محنت کرنی پڑی۔ دو چار چالیں چلی تھیں اس نے لیکن حاجی صاحب انگشت بدنداں رہ گئے۔ وہ زاہد کی ایک ایک چال کی تعریف کر رہے تھے۔ اسی دوران چائے آ گئی لیکن چائے پینے کی فرصت اس دوران بھلا کسے تھی۔ وہاں تو ذہن شطرنج کے مہروں میں اُلجھا ہُوا تھا۔ پہلی بازی ختم ہونے کو تھی۔ بالآخر زاہد نے آخری مہرہ آگے بڑھایا اور حاجی صاحب کو مات ہو گئی۔ وہ پریشانی سے اپنا گال کھجا رہے تھے کہ دفعتاً ایک دھماکا ہُوا اور چائے کی پیالی ریزہ ریزہ ہو کر شطرنج پر آ گئی۔ ساری چائے بساط پر پھیل گئی تھی۔ حاجی نیاز کے ساتھ ساتھ زاہد بھی بُری طرح اُچھلا تھا۔ حاجی نیاز کے تو اعصاب ہی ایک لمحے کے لئے جواب دے گئے تھے۔ وہ اپنی جگہ پھیل سے گئے تھے اور زاہد کی آنکھیں اس کھڑکی کی جانب اُٹھ گئیں تھیں۔ جدھر سے یہ فائر ہُوا تھا۔ اگر حاجی نیاز صاحب ہوش میں ہوتے تو اس ہاتھ کو اندر داخل ہوتے صاف دیکھ سکتے تھے جس نے ایک سفید لفافہ اندر پھینک دیا تھا اور یہ ہاتھ ظاہر ہے، رمضان کے علاوہ اور کس کا ہو سکتا تھا۔ بے وقوف نے اتنا ہاتھ اندر کر کے لفافہ پھینکا تھا کہ اگر کوئی قریب ہوتا تو آسانی سے اس ہاتھ کو پکڑ لیتا اور اس کے لیے جان بچانا مشکل ہو جاتی لیکن حاجی نیاز کچھ اس طرح حواس باختہ تھے کہ کسی ہاتھ کو یا کھلی ہوئی کھڑکی کو نہیں دیکھ سکے تھے۔ اُن کی پھٹی پھٹی آنکھیں اس پیالی پر جمی ہوئی تھیں جو ٹوٹ گئی تھی۔

زاہد اُچھل کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے ادھر اُدھر دیکھا اور پھر متحیرانہ انداز میں بولا۔

"یہ کیا تھا؟ یہ تو شاید فائر کیا گیا تھا۔"

"فف... فائر" حاجی نیاز صاحب کے حلق سے بھرائی ہُوئی آواز نکلی۔

"جی ہاں۔ غالباً اس کھڑکی کی طرف سے۔" زاہد نے ایک طرف اشارہ کیا اور حاجی صاحب کی خوفزدہ آنکھیں اس طرف گھوم گئیں۔ پھر وہ کھڑکی کے نیچے بچھی ہُوئی قالین کے اس حصّے پر پڑیں، جہاں سفید لفافہ پڑا ہُوا تھا۔

"یہ... یہ... یہ کیا ہے؟" اُنھوں نے خوفزدہ لہجے میں کہا۔ اسی وقت دو تین ملازم اندر آ گئے تھے۔ سبھی استفسار حال کر رہے تھے لیکن حاجی صاحب کی آواز بند تھی۔ ایک ملازم نے ٹوٹی ہُوئی پیالی کی کرچیاں اُٹھائیں اور دُوسرے کپڑے سے شطرنج کی بساط صاف کرنے لگا لیکن حاجی صاحب کے اعصاب اب بھی بحال نہیں ہُوئے تھے۔ وہ صوفے کی پُشت سے ٹکے خوفزدہ آنکھوں سے کھڑکی کی جانب دیکھ رہے تھے۔ ملازموں نے اُنھیں کوئی جواب نہیں دیا لیکن زاہد ہی ان سے بولا۔

"ٹھیک ہے کوئی بات نہیں ہے تم لوگ جاؤ۔" ملازم زاہد اور حاجی نیاز صاحب کو دیکھتے ہُوئے باہر نکل گئے تھے۔ حاجی نیاز صاحب بمشکل تمام خود کو پُرسکون کر سکے۔ پھر اُنھوں نے اس لفافے کی جانب اشارہ کرتے ہُوئے کہا۔

"یہ... یہ پہلے یہاں نہیں تھا۔ ذرا اسے اُٹھا کر لاؤ۔ مَیں پولیس کو فون کرتا ہُوں۔"

"ضرور، ضرور کیجیۓ۔ کسی نے آپ پر گولی چلائی تھی حاجی صاحب لیکن شکر ہے کہ آپ بچ گئے۔"

"م... مگر پہلے یہ لفافہ۔ پلیز ذرا اُٹھا کر لاؤ۔" حاجی صاحب نے کہا اور زاہد آگے بڑھ گیا۔ اس نے وہ لفافہ لا کر حاجی صاحب کے سامنے رکھ دیا تھا۔ حاجی صاحب نے کانپتے ہُوئے ہاتھوں سے لفافہ کھولا۔ اس میں رکھا ہُوا کاغذ پڑھا اور اس کے چہرے پر مکمل تاریکی چھا گئی۔

"کیا ہے حاجی صاحب۔ کوئی خاص بات ہے؟"

"اں... نن۔ نہیں... نہیں۔ کوئی بات نہیں ہے... کک... کوئی بات نہیں ہے۔" حاجی صاحب دہشت زدہ انداز میں بولے۔ پھر کہنے لگے۔

"زاہد اس وقت، اس وقت یہ کیفیت میرا مطلب ہے

یہ سب کچھ۔ مم... میرا مطلب ہے۔ میرا مطلب ہے...۔"

"حاجی صاحب! میں جانتا ہوں کہ میں آپ کے لئے اجنبی ہوں۔ ایک دُوسرے آدمی کا ملازم ہوں لیکن میں آپ کو اس حال میں چھوڑ کر نہیں جا سکتا۔ میں دادا جان کے ایک کام سے آیا تھا لیکن شطرنج کے ناتے آپ بھی میرے بہت کچھ لگتے ہیں۔ آپ بہترین کھلاڑی ہیں عام لوگوں سے اچھا کھیلتے ہیں۔ میں آپ سے بہت متاثر ہوں۔ بہر طور آپ میرے بزرگ بھی ہیں۔ میں کس طرح آپ کو چھوڑ کر چلا جاؤں"۔ حاجی صاحب ممنون نگاہوں سے اسے دیکھنے لگے پھر کہنے لگے۔

"نن... نہیں مگر نہیں، میں تمہیں، میں تمہیں اپنے اس راز میں شریک نہیں کر سکتا۔ بڑی پریشانی پیدا ہوگئی ہے میرے لئے۔"

"میں آپ کے کسی راز میں شریک نہیں ہونا چاہتا حاجی صاحب لیکن براہ کرم مجھے یہ تو بتا دیجئے کہ آپ کی زندگی کو تو خطرہ نہیں ہے؟"

"خطرہ.. خطرہ ہو بھی سکتا ہے۔ میں مر بھی سکتا ہوں۔"

"تو پھر فوراً پولیس کو فون کر دیجئے یا ایک منٹ... میں پولیس کو فون کرتا ہوں اور ساری صورتِ حال بتاتا ہوں۔" زاہد تھوڑے فاصلے پر رکھے ہوئے فون کی جانب بڑھ گیا لیکن پیچھے سے حاجی صاحب کی چیخ سنائی دی۔

"نہیں زاہد نہیں رکو تو سنو تو۔ پولیس کو فون مت کرو۔ پولیس کو فون مت کرو ورنہ میں تباہ ہو جاؤں گا۔ میں برباد ہو جاؤں گا۔"

"کیا مطلب؟" زاہد چونک کر بولا اور حاجی صاحب آنکھیں بند کر کے گہری گہری سانسیں لینے لگے۔

"آپ کی زندگی خطرے میں ہے حاجی صاحب۔ آپ پر گولی چلائی گئی ہے۔ یہ گولی ذرا سی اچٹ کر پڑتی تو آپ ہلاک بھی ہو سکتے تھے لیکن آپ پولیس کو فون نہیں کرنا چاہتے۔ آخر کیا بات ہے؟ دیکھئے حاجی صاحب ایک بات پھر آپ سے عرض کر دوں میں آپ کا کوئی نہیں لگتا۔ ملازم بھی نہیں ہوں آپ کا لیکن میں آپ سے بے پناہ ہمدردی رکھتا ہوں۔ حسام احمد صاحب کی کوٹھی کا ہر فرد مجھے پسند کرتا ہے۔ مجھ پر اعتماد کرتا ہے اور اس کی وجہ یہی ہے کہ میں جس کی جو بات سن لیتا ہوں اُسے ہمیشہ اپنے دل میں رکھتا ہوں۔ کبھی اس بارے میں کسی کو کچھ نہیں بتاتا۔ میں آپ کا کوئی راز جاننا نہیں چاہتا لیکن میری خدمات آپ کے لئے حاضر ہیں اگر آپ میرے ذریعے کوئی کام لینا چاہیں تو براہ کرم تکلف نہ کریں۔ میں اب چلتا ہوں۔" زاہد اُٹھ گیا۔ نجانے حاجی صاحب کو اس کی بات میں سچائی محسوس ہوئی تھی یا پھر وہ خوفزدہ تھے کہ وہ بے اختیار چلا اُٹھے۔

"رکو زاہد۔ رک جاؤ۔ بیٹھو ابھی مت جاؤ تھوڑی دیر پلیز۔ زاہد تھوڑی دیر اور میرے حواس ذرا بہتر ہو جائیں۔"

"بہتر ہے۔" زاہد خاموشی سے ان کے سامنے والے صوفے پر بیٹھ گیا۔ ویسے اسے مسرت تھی کہ رمضان نے سوائے ایک حماقت کے کہ ٹوٹا ہاتھ اندر گھسیٹر دیا اور کوئی حماقت نہیں کی تھی۔ بڑی کامیابی سے وہ اپنا کام کر کے نکل گیا تھا۔ ظاہر ہے اتنی دیر میں تمام لوگ اس کی تلاش میں تو نہ دوڑ پڑے ہوں گے اور پھر حاجی صاحب نے اپنے ملازموں کو کوئی ہدایت بھی نہ دی تھی۔ اس لئے ملازم اطمینان سے واپس چلے گئے تھے۔ حاجی صاحب تھوڑی دیر سوچتے رہے تھے۔ پھر وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولے۔

"زاہد یہ فائر مجھے قتل کرنے کے لئے نہیں کیا گیا تھا بلکہ صرف مجھے ہوشیار کرنے کی ایک کوشش تھی۔"

"ہوشیار کیا مطلب؟" زاہد نے پوچھا۔

"ہاں، میں اچانک بدنصیبی کا شکار ہوا ہوں۔ پتہ نہیں کون کمبخت ہے اور پتہ نہیں کس طرح اُسے میرا ایک ایسا راز معلوم ہو گیا ہے جو میرے لئے تباہ کن ہے۔"

"تت تو... تو کیا۔ بلیک میلنگ میرا مطلب ہے یہ خط؟"

"ہاں۔ تمہارا اندازہ درست ہے تم واقعی بے حد ذہین آدمی ہو۔"

"اوہ جناب۔ کیا کوئی ایسی ہی بات ہے جو آپ پولیس کو نہیں بتا سکتے۔" زاہد نے متفکرانہ انداز میں پوچھا۔

"ہاں، بیٹے ایسی ہی بات ہے کیا کروں میں کچھ نہیں سمجھ میں آتا۔"

"مگر بلیک میلر نے کہا کیا ہے؟"

"پانچ لاکھ روپے کا مطالبہ کیا ہے پُورے پانچ لاکھ۔"

"کمال ہے۔" زاہد کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ "کیا اس راز کی اتنی قیمت ہے کہ آپ اسے پانچ لاکھ ادا کر دیں؟" اس نے سوال کیا اور حاجی نیاز پریشان نگاہوں سے اسے دیکھنے لگے۔

"میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تم پر اعتبار کروں یا نہ کروں۔ مجھے معاف کرنا۔ میں یہ الفاظ بڑی پریشانی کے عالم میں کہہ رہا ہوں۔ تم بھی میری ذہنی کیفیت کا اندازہ نہیں لگا سکتے۔"

"میں بھی آپ سے معافی چاہتا ہوں حاجی نیاز صاحب کہ بلاوجہ آپ کے معاملات میں اُلجھنے کی کوشش کی۔ واقعی میرا اور آپ کا رشتہ ہی کیا ہے۔ میں تو آپ کا ملازم بھی نہیں ہوں۔ مجھے اجازت دیجئے گا۔"

"بُرا مان گئے۔ بیٹھو، بیٹھ جاؤ۔ چونکہ یہ واقعہ تمہارے سامنے پیش آیا ہے اس لئے میں... میں تمہیں اس راز میں

میں شریک کرنے پر مجبور ہوں۔"

"آپ مطمئن رہیں۔ اگر آپ چاہیں گے تو یہ راز کبھی میری زبان سے نہیں نکلے گا۔ میں کسی کو ان حالات کے بارے میں نہیں بتاؤں گا۔ میں بھول جاؤں گا کہ یہاں کوئی واقعہ ہوا تھا۔ اگر کبھی میری زبان سے آپ کا یہ راز نکل جائے تو آپ مجھے دنیا کا سب سے گھٹیا انسان تصور فرمائیے حاجی صاحب۔ میں اس قسم کا آدمی نہیں ہوں۔ باقی اگر اس سلسلے میں پولیس کو میری گواہی دلوانی چاہتے ہیں تو میں اس کے لئے بھی حاضر ہوں۔ اس سے زیادہ خلوص کا اظہار میں نہیں کر سکتا۔ براہِ کرم مجھے اجازت دیجئے۔"

"نہیں، نہیں بیٹھ جاؤ زاہد۔ بیٹھ جاؤ ابھی نہ اٹھو۔ خدا کے لئے میری مدد کرو۔"

"تو پھر فرمائیے نا۔ آپ مجھ پر اعتماد بھی نہیں کر سکتے اور مجھے جانے بھی نہیں دے رہے۔ حسام احمد صاحب مجھ سے اس تاخیر کی وجہ بھی پوچھ سکتے ہیں۔"

"ان سے میں بات کر لوں گا۔ تم... تم ابھی نہ جاؤ۔ مجھے سہارا دو زاہد مجھے سہارا دو۔ میں بے حد پریشان ہوں۔"

"آپ یہ فرمائیے کہ کیا آپ اس بلیک میلر کو یہ رقم ادا کرنا چاہتے ہیں یا اسے پولیس کے حوالے کرنا چاہتے ہیں؟"

"نہیں۔۔ نہیں۔ پولیس کو ان معاملات میں ملوث کرنا سخت خطرناک ہوگا میرے لئے۔ میں تباہ ہو جاؤں گا۔ میں برباد ہو جاؤں گا زاہد۔"

"تو پھر اس کے علاوہ اور کوئی چارہ کار نہیں ہے کہ آپ اسے یہ رقم ادا کر دیں۔" زاہد نے جواب دیا اور حاجی نیاز اس کی شکل دیکھنے لگے۔ پھر بھرائی ہوئی آواز میں بولے۔

"پانچ لاکھ۔ پورے پانچ لاکھ اور بات ان پانچ لاکھ پر بھی ختم نہیں ہوگی۔ وہ حسبِ ضرورت مجھ سے مطالبہ کرتا رہے گا۔ ساڑھے بارہ لاکھ روپے ادا کرنے ہیں اسے پورے ساڑھے بارہ لاکھ۔" حاجی نیاز لرزتے ہوئے لہجے میں بولے۔

"اتنی بڑی رقم۔ گویا یہ پانچ لاکھ پہلی قسط ہے؟" زاہد نے پوچھا۔

"ہاں۔۔"

"مگر کیا یہ راز اتنا ہی قیمتی ہے کہ آپ اسے اتنی بڑی رقم دے دیں؟" حاجی نیاز نے اس سلسلے میں کوئی جواب نہیں دیا لیکن ان کا چہرہ مجسم جواب تھا اور زاہد دل ہی دل میں مسکرا رہا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ حاجی صاحب ویسے تو آپ اس کارِ خیر میں کوئی کارہائے نمایاں انجام نہ دیتے لیکن آپ کی یہ کالی کمائی اگر چند انسانوں کے کام آ جائے تو کیا حرج ہے۔ آپ کروڑپتی ہیں اور ایک کروڑ پتی کے لئے اپنی ناجائز کمائی میں سے اتنی رقم نکال دینا کوئی مشکل کام نہیں ہے۔ اس لئے میں آپ سے کوئی ہمدردی نہیں کروں گا۔ حاجی صاحب کچھ دیر بیٹھے سوچتے رہے پھر انہوں نے ادھر اُدھر دیکھا اور پھر زاہد سے ہی بولے۔

"براہِ کرم ملازم کو آواز دے کر میرے لئے ایک گلاس پانی منگوا دو۔" زاہد نے ان کے حکم کی تعمیل کی تھی۔ مچھلی کانٹے میں پھنس چکی تھی اور اب تڑپ رہی تھی دیکھئے نتیجہ کیا نکلتا ہے۔ وہ سوچ رہا تھا۔

حاجی صاحب نے پانی پیا۔ چند ساعت گہری گہری سانسیں لیتے رہے اور پھر زاہد کی طرف رُخ کر کے بولے۔

"تم میرا ایک کام کر سکتے ہو؟"

"جی، جی فرمائیے۔ بصد خلوص دل وجان سے۔"

"اس بلیک میلر سے تم ہی نمٹ لو۔ میں رقم ادا کر دوں گا اس کے علاوہ اور کوئی چارہ کار نہیں ہے لیکن میں اتنی ہمت نہیں رکھتا کہ اس کا سامنا کر سکوں۔ اس قسم کے واقعات سے کبھی میرا واسطہ نہیں پڑا ہے۔"

"میرے سپرد آپ جو ڈیوٹی کریں گے، میں دل وجان سے انجام دوں گا۔"

"میں تمہیں اس کا تھوڑا سا معاوضہ بھی ادا کر دوں گا زاہد۔ اب تم ہی اس مسئلے میں میرے رازدار ہو۔ یہ سوال مجھ سے کبھی مت کرنا کہ مجھے کس سلسلے میں بلیک میل کیا جا رہا ہے لیکن اس بلیک میلر سے تم ہی نمٹو جس طرح تم مناسب سمجھو اس سے بات کرو۔ میں یہ رقم اسے ادا کرنا چاہتا ہوں۔"

"کمال ہے پانچ لاکھ روپے کی رقم۔ ویسے حاجی صاحب میں کسی کی مجبوری سے ناجائز فائدہ اٹھانا نہیں چاہتا۔ آپ کے لئے میں نے اپنے دل میں بڑے احترام کے جذبات پائے ہیں۔ بھلا یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے کہ آپ مشکل میں ہوں اور میں آپ کے کسی کام کے لئے کوئی معاوضہ وصول کروں۔۔۔؟ آپ جس طرح چاہیں اور جو خدمت چاہیں میرے سپرد کر دیں۔ میں اسے دل وجان سے انجام دوں گا۔"

"چلو ٹھیک ہے۔ بلیک میلر کا فون آئے گا آج دن میں کسی بھی وقت، وہ مجھ سے سوال کرے گا کہ کیا میں رقم دینے کے لئے تیار ہوں میں اس سے کہوں گا کہ ہاں یہ رقم اسے ادا کر دی جائے گی۔ پھر وہ جگہ کا تعین کرے گا۔ خط میں یہی لکھا ہے اور جب وہ جگہ کا تعین کرے گا تو میں تمہیں بتاؤں گا۔ آج شام تک یا کل دن میں کسی وقت میں تمہیں فون کر کے جگہ کے بارے میں بتا دوں گا کہ میری اس

بلیک میلر سے کیا بات چیت ہوئی اور پھر زاہد یہ رقم تم ہی اسے پہنچانا۔"

"گویا آپ پولیس کو اس سلسلے میں بالکل ملوث نہیں کریں گے۔" زاہد نے پوچھا۔

"سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ پولیس کو تو ان واقعات کی بھنک بھی نہیں ملنی چاہیئے۔ میں تم سے ہاتھ جوڑ کر کہتا ہوں زاہد خدا کے لئے میرا خیال کرنا، میری زندگی کا خیال کرنا۔ اس مسئلے کو کسی کے کانوں تک نہیں پہنچنا چاہیئے۔"

"نہیں پہنچے گا حاجی صاحب آپ بالکل مطمئن رہیں۔" حاجی صاحب پھر خاموش ہو گئے تھے تھوڑی دیر کے بعد زاہد نے ان سے اجازت طلب کی اور حاجی صاحب چونک کر بولے۔

"اوہ۔ ہاں حسام احمد سے کہنا کہ ان کی بھینسیں کل تک پہنچ جائیں گی۔ میں باڑے سے منگوا دوں گا۔"

"جی بہت بہت شکریہ۔" زاہد نے کہا اور مسکراتا ہوا حاجی نیاز کے کمرے سے نکل آیا۔ وہ اپنی مہم کا پہلا مرحلہ انجام دے چکا تھا۔

★★

"شاہ جی مجھے لے کر چل پڑے۔ میں محسوس کر رہی تھی کہ ان کا موڈ ٹھیک نہیں ہے۔ ان کی آنکھوں میں نفرت کی پرچھائیاں صاف محسوس کی جا سکتی تھیں۔ وہ مجھے کسی طور ساتھ لے چلنے کے لئے راضی نہیں تھے۔ روانہ ہونے سے کچھ دیر قبل ہی انھوں نے مجھ سے کہا کہ میں ان پر بھروسہ کروں اور خود ہی ان لوگوں سے کہہ دوں کہ میں ابھی نہیں جانا چاہتی لیکن شاہ جی کی یہ ضد مجھے بھی متوحش کر رہی تھی۔ میں سوچ رہی تھی کہ کہیں میں بھی کوئی المیہ نہ بن جاؤں۔ کہیں کیوں نہ ہو کہ شاہ جی پھر اس طرف واپس ہی نہ آئیں اور میری پوری زندگی آہوں اور آنسوؤں کا گہوارہ بن جائے۔ میں محسوس کر رہی تھی بیٹے کہ میں تمہاری ماں بننے والی ہوں۔ میں... میں کسی قیمت پر وہاں نہیں رکنا چاہتی تھی۔ مجبوراً شاہ جی مجھے لے کر چل پڑے۔ ان کے ساتھ بستی کا ایک آدمی عبداللہ بھی تھا۔ یہ عبداللہ شاہ جی کا خاص آدمی تھا اور ان کے ہر کام میں ان کے ساتھ ہی رہتا تھا۔ ہم جیپ میں سفر کر رہے تھے۔ شاہ جی خود ہی اسے چلا رہے تھے۔ بستی سے کافی دور نکل آئے۔ اس جگہ جو میں نے اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ پھر ایک جنگلی علاقے میں شاہ جی نے گاڑی روک دی۔ اس وقت صرف عبداللہ ان کے ساتھ تھا۔ شاہ جی اتر کر کہیں چلے گئے اور تھوڑی دیر کے بعد عبداللہ بھی ان کے پاس پہنچ گیا۔ وہ مجھے نظر نہیں آ رہے تھے۔ دس منٹ پندرہ منٹ آدھا گھنٹہ اور پھر گھنٹہ بھر گزر گیا تو میں سخت پریشان ہو گئی۔ میں جیپ سے اتر کر اس طرف چل پڑی جدھر شاہ جی اور عبداللہ گئے تھے۔ میں جاننا چاہتی تھی کہ وہ کہاں گئے اور کیوں گئے۔ میں انھیں آوازیں دیتی ہوئی چلی جا رہی تھی کہ دفعتاً گولی چلی اور میں زخمی ہو کر گر پڑی۔ میں شدید تکلیف کے عالم میں تھوڑی دیر تڑپتی رہی اور اس کے بعد بے ہوش ہو گئی لیکن بے ہوشی سے قبل میں نے شاہ جی کو دیکھ لیا تھا جن کے ہاتھ میں بندوق نظر آ رہی تھی۔ ہاں یہ گولی شاہ جی ہی نے مجھ پر چلائی تھی۔ میرے سرتاج نے، میرے شوہر نے، مجھ سے پیار کرنے والے نے اور یہ آخری احساس تھا جو میرے سینے میں درد بن کر اتر گیا۔ اس کے بعد بیٹے مجھے ہوش آیا لیکن میں گویائی کھو چکی تھی۔ وہ شدید بوجھ میرے سینے پر پتھر کی طرح جم گیا تھا اور اس نے میری آواز ہمیشہ کے لئے بند کر دی تھی۔ وہ جگہ جہاں میں نے آنکھ کھولی شمشیر زمان کی شاندار حویلی تھی۔ بے شمار ملازم تھے۔ اس میں بیگم صاحبہ تھیں، بچے تھے، شمشیر زمان تھے۔ شمشیر زمان نے میرے ساتھ اس محبت کا برتاؤ کیا کہ میں تم سے بیان نہیں کر سکتی ظفر۔ انھوں نے مجھے اپنی سگی بہنوں کا درجہ دیا لیکن وہ بیگم سے ڈرتے تھے۔ مہرالنسا بیگم عجیب و غریب فطرت کی مالک تھیں۔ شمشیر زمان پر پوری طرح حاوی تھیں۔ انھوں نے مجھے شک کی نگاہ سے دیکھا۔ میں نے لاکھ کوشش کی کہ اُن سے اپنے بارے میں سب کچھ کہہ دوں لیکن میری زبان میرا ساتھ نہ دے سکی۔ میں اشاروں کنایوں میں بھی انھیں نہ سمجھا سکی کہ میں اُن کے گھر میں کیا حیثیت رکھتی ہوں۔

"شمشیر زمان نے اپنی عنایتیں جاری رکھیں۔ پھر تم پیدا ہوئے۔ بہت سے واقعات ہوتے رہے بیٹے اس دوران جگہ جگہ میرا دل ٹوٹا لیکن مجھے سہارا دینے والا موجود تھا۔ اس نے مجھے ہمیشہ پاکیزہ نگاہوں سے دیکھا۔ ایک بھائی کی نگاہوں سے اسی نے تمہاری پرورش کی۔ شمشیر زمان نے تمہارے لئے ہر وہ بہتری فراہم کرنے کی کوشش کی جو وہ اپنی اولاد کے لئے کر سکتے تھے لیکن مہرالنساء بیگم آڑے آئیں۔ مجھے اُن سے کوئی شکایت نہیں، وہ عورت تھیں اور عورت کی سوچ عام طور پر غلط ہوتی ہے۔ وہ اپنی جلن میں رشتوں کا تقدس بھول جاتی ہے۔ رشتے خون ہی سے تخلیق نہیں ہوتے۔ بعض اوقات زبان کے رشتے بھی مضبوط ہوتے ہیں۔ میں وہاں سب کچھ برداشت کرتی رہی۔ یہ گھر میری آخری پناہ گاہ تھا۔ کہاں جاتی کس سے کہتی۔ ان لوگوں نے میرا نام حسینہ رکھ دیا تھا جو میں نے قبول کر لیا۔ اپنی بستی میں بھی میرا کوئی نہیں تھا اور اگر کوئی ہوتا تو کیا بگاڑ لیتا شاہ جی کا۔ وہ تو اپنا کام کر کے جا چکا تھا۔ اس نے تو مجھے مُردہ سمجھ لیا ہوگا۔ اگر نہ سمجھتا تو اس طرح چھوڑ کے نہ جاتا بلکہ دو چار گولیاں اور چلا دیتا مجھے ختم کرنے کے لئے۔ میں نے فیصلہ کیا کہ

بقیہ زندگی اسی گوشۂ عافیت میں گزار دوں۔ اس کے بعد کے حالات تمہارے سامنے ہیں۔ ظفر یہاں تمہارے ساتھ اچھا سلوک نہیں تھا۔ اس نے شمشیر زمان نے یہ ظاہر کیا کہ تم گھر سے بھاگ گئے ہو لیکن درپردہ اُنھوں نے تمہیں اعلیٰ تعلیم کے لئے ملک سے باہر بھیج دیا۔ مجھے تمہارے بارے میں بتا دیا گیا تھا اور میں مطمئن تھی کہ اس فرشتہ صفت انسان نے تمہاری زندگی بنانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ بس اس کے بعد ظفر حالات یونہی گزرتے رہے۔ پھر تقدیر نے مجھ سے میرا بھائی چھین لیا۔ شمشیر زمان ہمارے درمیان سے اُٹھ گیا اور میرے لئے مصیبتیں ہی مصیبتیں کھڑی ہو گئیں۔ اس کے بعد حرام خور، مہرالنساء بیگم کے گرد جمع ہو گئے اور بالآخر مجھے وہاں سے نکال دیا گیا۔ اس وقت واقعی میرے ساتھ زیادتی ہوئی تھی۔ میں بے سہارا تھی۔ یہ بات مہرالنساء بیگم کو معلوم تھی۔ شمشیر زماں بھی اس دُنیا میں نہیں رہے تھے... وہ اگر چاہتیں تو مجھے کسی کونے کھدرے میں پڑا رہنے دیتیں لیکن جلن اور حسد کی وہ زندگی جو اب تک اُنھوں نے گزاری تھی، رنگ لائی اور اُنھوں نے مجھے نکال پھینکا لیکن خدا سب کا سہارا ہوتا ہے۔ ایک دروازہ بند ہوتا ہے تو ستر دروازے کھلتے ہیں۔ بابا کرم دین نے مجھ پر کرم کیا اور مجھے اپنی جھونپڑی میں لے آئے۔ اس کے بعد اُنھوں نے مجھے کوئی تکلیف نہ ہونے دی۔ ظفر یقین کرو۔ یہ میرے باپ کی مانند ہیں۔ ان کے زیرِ سایہ میں اپنی تمام مصیبتیں بھول چکی ہوں۔ بس میرے دل میں ایک ہی لگن تھی کہ تم واپس آ جاؤ اور مجھے اپنی مضبوط بانہوں کا سہارا دے دو۔ میرے بچے میرے بیٹے۔ یہ ہے میری کہانی... یہ ہے میری داستان۔"

★★

احمد رضا کے سلسلے میں جشن کی تیاریاں زبردست پیمانے پر ہو رہی تھیں۔ دعوت نامے تقسیم ہو گئے تھے۔ ڈیکوریشن کے لئے آرڈر دیا گیا تھا۔ بہت بڑا اجتماع تھا۔ شہر کے کسی معزز آدمی کو نہیں چھوڑا گیا۔ سرکاری افسر بھی مدعو کئے گئے تھے اور اعلیٰ حکام بھی، تقریب کے مختلف مراحل رکھے گئے تھے اور ان کی ترتیب شجاع احمد صاحب کی مرضی کے مطابق ہی کی گئی تھی لیکن کاؤنٹر پروگرام بھی تھا جو صرف... چند خاص خاص لوگوں کو معلوم تھا۔ زاہد نے اس پروگرام کو درمیان میں رکھا تھا تاکہ شرکاء موجود رہیں اور پروگرام جاری رہے۔ بہت کم وقت رہ گیا تھا، زاہد کے لئے بے شمار مصروفیات تھیں۔ چاروں طرف پھرکی کی طرح گھوم رہا تھا۔ بیگم صاحبہ کو لباس کے سلسلے میں اس نے چڑھا دیا تھا۔

"بات یہ ہے چچی جان کہ آپ نے اب تک کی زندگی شجاع احمد صاحب کے اشاروں پر گزاری ہے۔ شوہر پرستی اچھی چیز ہے لیکن اولاد کے بھی کچھ حقوق ہوتے ہیں۔ کیا آپ کو اپنے بچوں کا بہتر مستقبل عزیز نہیں ہے؟"

"کیوں نہیں زاہد... مگر بات کیا ہے؟" بیگم صاحبہ بولیں۔

"تقریب کے دن آپ کا لباس کیا ہو گا؟"

"کامدار غرارہ تیار کرایا ہے میں نے۔"

"ایک بات عرض کروں چچی جان۔ اگر اس تقریب میں ایک خاتون بھی غرارہ پہن کر شریک ہوں تو بھری تقریب میں زاہد کو دھکے دے کر باہر نکلوا دیں۔ میں اُف نہ کروں گا۔"

"کیا مطلب ہے تمھارا؟"

"اگر چھوٹا مُنہ بڑی بات نہ سمجھی جائے تو کچھ عرض کروں؟"

"ہاں ہاں کہو تو۔ کیا کہنا چاہتے ہو؟" بیگم صاحبہ ہولتے ہوئے بولیں۔

"آپ بے حد معصوم ہیں، ان مردوں کو نہیں سمجھتیں۔ شجاع احمد صاحب اپنی عمر سے بیس سال کم نہیں لگتے؟"

"ہاں۔ ماشاءاللہ ان کی صحت بہت اچھی ہے۔"

"اور آپ...؟"

"میں... میں کیا بتاؤں؟"

"آپ کے خلاف سازش ہو رہی ہے سو فیصدی سازش۔ میں دعوے سے کہہ سکتا ہوں۔ خدانخواستہ میں شجاع احمد صاحب پر کوئی الزام نہیں لگا رہا لیکن ایک مرد کی حیثیت سے مرد کی فطرت کے بارے میں بتا سکتا ہوں۔ غرارہ سُوٹ پہن کر آپ... اپنی عمر سے مزید بیس سال آگے پہنچ جائیں گی اور شجاع احمد اپنی کسی بھی منظورِ نظر سے کہہ سکتے ہیں کہ دیکھو انھیں دیکھو اور ان کی بیگم کو دیکھو۔ والدین نے شادی کر دی تھی، بھگت رہے ہیں ورنہ بیگم عمر میں ان سے کس قدر بڑی ہیں۔ میں عیاش طبع نہیں ہوں لیکن تم خود فیصلہ کر لو۔ یہ بوڑھی بیگم میرے لائق ہیں؟" زاہد شجاع احمد کی آواز بنا کر بولا۔ اور بیگم صاحبہ کا سانس پھولنے لگا۔

"یہ... یہ کیا کہہ رہے ہو تم؟" وہ رندھی ہوئی آواز میں بولیں

"ایک حقیقت جو مردوں کی فطرت ہے۔"

"میں... میں خودکشی کر لوں گی۔ قتل کر دوں گی شجاع کو..." وہ بولیں۔

"اس کے علاوہ بیگم صاحبہ۔ بچے شرمندہ ہوتے ہیں۔ ان کے مہمان آئیں گے، دوست آئیں گے۔ اس ماڈرن دور میں وہ سو سالہ قدیم خاتون کو دیکھیں گے۔ کتنا پسماندہ سمجھیں گے اس گھرانے کو۔ آخر آپ کو ان بچوں کی شادی بھی کرنی ہے۔ ان کے لئے اچھے گھرانے تلاش کرنے ہیں۔ کیا خواتین اس گھرانے کو قدیم معیار پر نہ پرکھیں گی؟"

"ہاں یہ سچ ہے لیکن ...؟"

"جی... لیکن کیا...؟"

"پہلے بھی شجاع میرے لباس پر بگڑ چکے ہیں۔"

"اس بگڑنے کی وجہ میں بتا چکا ہوں۔"

"اوہ۔ ہاں ٹھیک ہے لیکن زاہد۔ کیا وہ کسی جال میں پھنسے ہوئے ہیں؟"

"جھوٹ کبھی نہیں بولوں گا بیجی جان۔ کبھی کوئی ایسی بات نہیں دیکھی اور پھر میرا ان سے واسطہ ہی کب رہتا ہے لیکن آثار بہتر نہیں ہیں۔"

"کیا مطلب؟"

"آپ خود غور کریں۔ کبھی کرتے پاجامے میں گھر سے نکلے ہیں کوئی سوٹ ایسا ہے جو پرفیوم میں نہ بسا ہوا ہو۔ کیا آئینے کے سامنے کئی منٹ صرف نہیں ہوتے۔ آخر کیوں۔ دوسرے کاروباری لوگوں کو بھی دیکھ لیں۔ بس عمدہ لباس پہن لیتے ہیں یا پھر کوئی تقریب ہو تو دوسری بات ہے لیکن شجاع احمد صاحب۔ آپ کو نگاہ رکھنی ہوگی بیجی جان۔"

"میں... میں گھر میں گھسی گھسی کیا نگاہ رکھوں گی۔ زاہد میرے بچے۔ کیا تم میرا یہ کام کر سکتے ہو؟"

"میں آپ کا نمک خوار ہوں۔ کھال کے جوتے بنا کر پہن لیں۔ میں انکار نہیں کروں گا۔ جو حکم دیں میں کروں گا۔"

"تو پتہ لگاؤ۔ معلوم کرو کہ وہ کون مال زادی ہے جس کے پھیر میں وہ پھنسے ہوئے ہیں۔" بیگم صاحبہ نے ناک سے شوں شوں کرتے ہوئے کہا۔ ان کی آنکھوں میں نمی آ گئی تھی۔

"حوصلے سے کام لینا ہوگا بیگم صاحبہ حوصلے سے۔ اس طرح تو وقت سے پہلے کھیل ختم ہو جائے گا۔ وہ محتاط ہو جائیں گے اور پھر ہم کبھی تہ تک نہیں پہنچ سکیں گے۔"

"میں خیال رکھوں گی لیکن زاہد بس تمہارا سہارا ہے۔ میری نیا تم ہی پار لگا سکتے ہو۔" بیگم صاحبہ نے کہا اور زاہد نے گردن جھکا دی۔

"زاہد آپ کا غلام ہے۔ آپ مطمئن رہیں۔ اب یہ میری ڈیوٹی ہے لیکن وہ لباس کی کیا رہی۔"

"ارے میری مرضی ہے جو دل چاہے گا پہنوں گی۔ تم بتاؤ میں کیا سلواؤں اپنے لئے؟"

"میکسی۔ اعلیٰ درجے کی میکسی۔ ایسی کہ جو دیکھے دیکھتا رہ جائے۔ لیکن کسی کو کانوں کان خبر نہ ہونے پائے۔ کانوں کان...۔"

"نہیں ہوگی۔ تم فکر نہ کرو۔" بیگم صاحبہ نے اسے یقین دلایا اور زاہد اطمینان سے گردن ہلاتا ہوا وہاں سے نکل آیا۔ اس کی آنکھوں میں سکون کا سمندر لہریں لے رہا تھا۔ اب اسے دوسرا کام کرنا تھا چنانچہ وہ کوٹھی سے نکل آیا اور دادا جان کی کار لے کر چل پڑا۔ یہ کار آزادانہ طور پر اس کے استعمال میں رہتی تھی۔ ہوٹل پلازا کے پارکنگ لان میں اس نے کار کھڑی کی اور پھر پارک میں بنے فون بوتھ کے پاس پہنچ گیا۔ اطراف سنسان تھے۔ بوتھ میں داخل ہو کر اس نے فون کا ریسیور اتارا سکے ڈالے اور حاجی نیاز کے نمبر ڈائل کرنے لگا جنہیں وہ نوٹ کر لایا تھا۔ دوسری طرف سے رابطہ قائم ہو گیا۔ بولنے والی کوئی لڑکی تھی۔ زاہد کی درخواست پر تھوڑی دیر کے بعد حاجی نیاز نے فون موصول کیا۔

"حاجی نیاز...۔"

"خادم بول رہا ہے حاجی صاحب۔ کیسے مزاج ہیں؟"

"میں پہچان نہیں سکا۔"

"بحوالہ پانچ لاکھ...۔" زاہد آواز بدل کر بول رہا تھا۔ دوسری طرف خاموشی چھا گئی۔ پھر حاجی نیاز کی بھرائی ہوئی آواز ابھری۔

"میں تیار ہوں لیکن ایک شرط ہوگی۔"

"ان کے علاوہ میں کچھ اور نہ دوں گا۔"

"نہیں حاجی صاحب۔ پچیس لاکھ کی رقم آدھی آدھی ہوگی ساڑھے بارہ لاکھ آپ کے ساڑھے بارہ لاکھ میرے۔ چاہیں تو یکمشت ادا کر دیں یا تین قسطوں میں۔ کیا فیصلہ ہے؟"

"میں پانچ لاکھ سے زیادہ نہیں دے سکوں گا۔"

"میں ساڑھے بارہ لاکھ سے کم نہ لے سکوں گا اور یہ نقصان برداشت کر لوں گا۔ سارے کاغذات حکومت کے حوالے کر دیے جائیں گے اور اس سے میں ایک فائدہ بھی حاصل کر لوں گا کیونکہ معاملہ براہ راست حکومت سے متعلق ہے۔ اس لئے آپ کے اس جرم کی پردہ پوشی بھی نہیں کی جائے گی اور پھر بات صرف متعلقہ محکمے تک ہی نہیں رہے گی۔ اس لئے آپ یہ نہ سوچیں کہ آپ کچھ رشوت وغیرہ دے دلا کر معاملہ برابر کر لیں گے۔ ان کاغذات کی مختلف کاپیاں ہوں گی۔ اینٹی کرپشن کے ہر محکمے کو بھیجی جائیں گی۔ اخبارات کو باقاعدہ رپورٹ دی جائے گی اور ایک کاپی صدر مملکت کو بھی ارسال کی جائے گی۔ اصل کاغذات میرے پاس رہیں گے۔"

"کک۔ کیا بکواس کر رہے ہو؟"

"اس کے بجائے یہ پوچھیں کہ مجھے اس سے کیا فائدہ حاصل ہوگا؟" زاہد نے کہا۔

"کیا فائدہ ہوگا تمہیں؟" حاجی نیاز کی آواز ابھری۔

"میرے دوسرے کلائنٹ جان جائیں گے کہ میں کتنے پانی میں ہوں۔ آئرن ماور کی پبلسٹی ہو جائے گی۔"

"آئرن مادر ؟" حاجی نیاز نے پوچھا۔

"ہاں یہ میرا کوڈ ہے۔ اسے ذہن نشین کر لینا۔ اچھا تو اب تم سے اس بارے میں پورا کوئی بات نہیں ہوگی حاجی نیاز "۔

"نہیں نہیں سنو۔ میں تمہیں پانچ لاکھ ادا کر رہا ہوں۔ بقیہ رقم کب تک دینا ہوگی ؟"

"تمہیں اس سے آگاہ کر دیا جائے گا "۔

"میں کچھ سہولت چاہتا ہوں۔ یہ رقم ڈھائی ڈھائی لاکھ کی تین قسطوں میں وصول کی جائے "۔

"منظور ہے۔ رقم کب ملے گی ؟"

"کل کسی بھی وقت لے لو "۔

"ہوں۔ تو تم یوں کرو حاجی نیاز کہ کل شام پانچ بجے پانچ لاکھ روپے کے نوٹ نقد ایک سرخ رنگ کے بیگ میں رکھ کر ہوٹل کونٹرز دے پہنچ جاؤ۔ کونٹرز دے کے فٹ پاتھ پر پیدل گرین اسکوائر کی طرف بڑھو۔ یہ اندازہ کرنے کے بعد کہ تم نے کوئی چال نہیں چلی ہے۔ تمہیں دوسری ہدایت دے دی جائے گی اور پھر رقم وصول کر لی جائے گی "۔

"رقم لانے والا میں نہیں ہوں گا "۔

"پھر کون ہوگا ؟"

"میرا ایک آدمی "۔

"کوئی بھی ہو، سرخ ہینڈ بیگ پہچان لیا جائے گا۔ یہی ہدایات اپنے آدمی کو دے دینا۔ اگر کوئی فراڈ ہوا تو پھر بات دوسرا رخ اختیار کر جائے گی اور تمہیں اس کی پاداش میں موت کی سزا بھگتنی ہوگی "۔

"کوئی فراڈ نہیں ہوگا "۔ حاجی نیاز نے کہا اور زاہد نے فون بند کر کے ریسیور سے انگلیوں کے نشانات صاف کئے۔ پھر اسے کریڈل پر لٹکا کر باہر نکل آیا۔ احتیاطاً اس نے بوتھ کے ہینڈل سے بھی انگلیوں کے نشانات صاف کر دیئے تھے۔ اس کے بعد وہ اپنی کار میں بیٹھ کر چل پڑا۔

★★

اس چھوٹے سے مکان میں سکوت پھیلا ہوا تھا۔ حسینہ یا شہرہ بانو کی سسکیاں کبھی کبھی اس سکوت کو توڑ دیتی تھیں۔ ظفر کی آنکھوں میں عجیب سی کیفیت تھی۔ وہ خلا میں گھور رہا تھا۔ کافی دیر گزر گئی تو کرم دین بابا نے ہی یہ سکوت توڑا۔

"قدرت کے کھیل ہیں۔ کتنی مختصر، کتنی ناپائیدار زندگی ملی ہے انسان کو اور اس موہوم سی زندگی میں وہ کیا کچھ کر ڈالتا ہے۔ جانتا ہے کہ دوسرا لمحہ حساب کا لمحہ بن سکتا ہے لیکن برائی سے باز نہیں آتا اگر اسے اس کی مرضی کی زندگی مل جاتی تو کیا کرتا یہ۔ خداوند نے سوچ لیا تھا۔ مرد، اس نے سوچ لیا تھا!"

"ہاں بابا، میری ماں پر بہت ظلم ہوا ہے۔ اسے زندگی سے محروم کرنے کی کوشش کی گئی۔ اسے ذلیل و خوار کیا گیا ہے پوری زندگی۔ بابا یہ طویل زندگی اس نے انگاروں پر لوٹتے گزاری ہے "۔ ظفر نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

"ہر دکھ کی ایک حد ہوتی ہے بیٹے۔ خدا شمشیر زماں کو کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے۔ اس نے تو اپنا فرض ادا کر دیا تھا۔ اب تم اپنی ماں کو سنبھالو "۔ کرم دین نے کہا۔

"نہیں بابا۔ ایسا نہیں ہوگا۔ ایک ایک سے حساب لیا جائے گا۔ بیگم صاحبہ نے میری ماں پر بہت گھناؤنا الزام لگایا ہے۔ میں... میں ان لوگوں کو نہیں چھوڑوں گا "۔

"ظفر... ظفر میرا بیٹا ہے نا۔ تیرے اوپر تو مان کر سکتی ہوں۔ تجھ پر تو عزور کر سکتی ہوں۔ تجھ پر تو حکم چلا سکتی ہوں۔ تو تو میری بات مانے گا۔ بول مانے گا یا تو بھی مجھے ٹھکرا دے گا "۔

"نہیں ماں۔ ظفر تیرے قدموں کی خاک ہے۔ بول کیا کہتی ہے ؟"

"شمشیر زماں کا گھر میرے لئے عبادت گاہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ وہ ایک ایسے انسان کا گھر ہے جس نے مجھے عورت رہنے دیا۔ اگر وہ مجھے سہارا نہ دیتا بیٹے تو ممکن ہے میں وہیں مر جاتی۔ نہ مرتی تو ممکن ہے مجھے کسی گندے ماحول میں پناہ لینا پڑتی۔ نہ جانے کس کے ہاتھ لگتی میں اور نہ جانے کیا سلوک ہوتا میرے ساتھ۔ مہرالنسا عورت تھیں۔ وہ اس سے زیادہ اور کچھ نہیں دے سکتی تھیں لیکن وہ تینوں بچیاں شمشیر زماں کی بیٹیاں ہیں۔ اس کے جگر گوشہ ہیں۔ تم ان سے انتقام لوگے۔ مہرالنسا بے سہارا رہ گئی ہیں۔ کوئی بیٹا نہیں ہے بے چاری کا۔ ان بے سہارا لوگوں کو پریشان کروگے۔ کیا شمشیر زماں کی روح نہ تڑپ اٹھے گی۔ کیا یہ ان کے احسانوں کا صلہ ہوگا۔ وہ بے قصور لوگ ہیں ظفر۔ انتقام لینے کے قابل نہیں ہیں "۔

"اور وہ تیرا شاجی... ماں... ؟" ظفر دانت پیس کر بولا۔

"دلی آرزو ہے ظفر۔ دلی آرزو ہے۔ اگر وہ زندہ ہیں تو ایک بار زندگی میں صرف ایک بار تو انہیں میرے سامنے لے آ۔ ایک بار تو انہیں لاکر میرے قدموں میں جھکا دے۔ میں تیرا یہ احسان کبھی نہیں بھولوں گی"۔

"یہ تو تیرا قرض ہے ماں مجھ پر اور یہ میرا عہد ہے کہ اگر وہ زندہ ہے تو ایک بار ضرور تیرے قدموں میں لاڈالوں گا "۔

"ایک وعدہ تجھے اور کرنا ہوگا ظفر "۔

"بول ماں۔ جو دل چاہے کہہ۔ میں تیری اولاد ہوں "۔

"انتقام لیتے ہوئے تو کسی کو جسمانی نقصان نہیں پہنچائے گا کسی کو قتل نہیں کرے گا "۔

"ٹھیک ہے ماں تعمیل ہوگی۔"

"بہت خوش ہوں ظفر۔ خدا کی قسم بہت خوش ہوں۔ مجھے شکرانے کے نفل پڑھنے دو اب۔ اپنی خوشی میں اپنے معبود کو نہیں بھولوں گی جس نے مجھے یہ سب کچھ دیا ہے۔ آج میں بہ آوازِ بلند اس کی حمد و ثنا کروں گی۔ بابا ظفر کو باہر لے جاؤ۔ میں اپنے اور رب کے درمیان کسی کو نہیں رہنے دوں گی۔"

"آؤ ظفر...." بابا کرم دین نے کہا اور ظفر اس کے ساتھ کمرے سے باہر نکل آیا۔ دونوں برآمدے میں پڑی چارپائی پر بیٹھ گئے۔

"آپ شمشیر زماں کی حویلی کے پرانے ملازم ہیں بابا؟"

"ہاں بیٹے۔"

"آپ نے میرا بچپن بھی دیکھا ہوگا؟"

"ہاں بیٹے میرے سامنے ہی تم بڑے ہوئے تھے۔"

"آپ کو ہم لوگوں کی وجہ سے یہ نوکری بھی چھوڑنی پڑی۔ اب تو آپ حویلی واپس نہیں جائیں گے؟"

"خدا کی زمین وسیع ہے بیٹے۔ وہ رازق ہے۔ مجھے کوئی فکر نہیں ہے۔ کہیں اور نوکری کر لوں گا۔ کوئی کام کر لوں گا۔"

"میں جو آگیا ہوں بابا۔ میری زندگی میں اب آپ کہیں کام کریں گے۔ آپ میرے نانا کی جگہ ہیں۔ یہ باتیں بھول جایئے۔ اب مجھے مشورہ دیجئے، میں کیا کروں؟"

"اب لندن واپس نہیں جاؤ گے ظفر؟"

"سوال ہی نہیں پیدا ہوتا بابا۔"

"اور تمہاری تعلیم....؟"

"وہ پوری ہو چکی ہے۔ میں تو وہاں نوکری بھی کرتا رہا ہوں۔ پچیس ہزار روپے نقد ہیں میرے پاس۔ اس وقت تک کے لئے بہت کافی ہوں گے۔ جب تک میں اپنا کوئی بہتر مقام نہ حاصل کر لوں۔"

"ہاں بیٹے اب میں وہاں نہیں جانا چاہتا۔"

"آپ بالکل نہیں جائیں گے بابا۔ وہاں آپ کا کوئی سامان ... تو نہیں ہے؟" ظفر نے پوچھا۔

"نہیں۔ بس میری بھانجی چھیمو وہاں نوکری کرتی ہے۔ میں وہاں تھا تو کوئی بات نہیں تھی لیکن اب...."

"ہم چھیمو کو وہاں نہیں رہنے دیں گے بابا۔ آپ بس ابھی جائیں اور چھیمو کو وہاں سے لے آئیں۔"

"لے آؤں گا بیٹے۔"

"اب یہ بتائیں بابا کہ میں اس شاجی کو کہاں تلاش کروں۔ میرا خون کھول رہا ہے۔ میں اسے تلاش کرنا چاہتا ہوں۔"

"تم مجھ سے زیادہ ذہین ہو بیٹے۔ تم بہتر سوچ سکتے ہو۔"

"یہ جال گڑھی کہاں ہے بابا؟"

"ایک پہاڑی گاؤں ہے۔ بہت دور نہیں ہے یہاں سے دو چار سو کوس پر ہوگا۔ میں اس کا نام سنتا رہا ہوں۔"

"بہت پرانی بات ہے لیکن پورے گاؤں میں کوئی نہ کوئی تو مل ہی جائے گا۔ ایک نام بتایا تھا ماں نے۔ کیا نام تھا اس کا جو جال گڑھی میں شاجی کا ساتھی تھا۔"

"عبداللہ۔" کرم دین نے بتایا۔

"ہاں عبداللہ۔ وہ اسی جگہ کا رہنے والا تھا۔ ممکن ہے وہ زندہ ہو۔ ممکن ہے وہ مل جائے۔" ظفر نے جیسے خود سے کہا۔ "جاؤ بابا تم چھیمو کو لے آؤ۔ ان لوگوں سے اور کوئی بات کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔"

"ٹھیک ہے بیٹے۔ جیسے تم کہو۔ وہ نماز پڑھنے بیٹھ گئی ہوگی۔ کوئی سودا سلف منگوانا ہو تو لا دیتا۔"

"تم جاؤ بابا۔ میں جو موجود ہوں۔" ظفر نے کہا اور کرم دین گردن ہلاتا ہوا باہر نکل گیا۔ ظفر اسی کھردری چارپائی پر لیٹ گیا تھا۔

★★

زاہد نے حاجی نیاز کا فون ریسیو کیا اور مستعد گیا۔ "جی حاجی صاحب آپ کا خادم عرض کر رہا ہے۔"

"فون مل گیا ہے زاہد۔"

"جی حاجی صاحب پروگرام طے پا گیا؟"

"ہاں۔ کل پانچ بجے بلایا ہے۔"

"میرے لئے کیا حکم ہے؟"

"تمہارے علاوہ اور کون یہ کام کر سکتا ہے بیٹے۔" حاجی صاحب خوشامدانہ انداز میں بولے۔

"مجھے ایسے معاملات سے بہت ڈر لگتا ہے حاجی صاحب۔ سنا ہے اس قسم کے لوگ بے حد خطرناک ہوتے ہیں۔"

"ڈرنے کی کیا بات ہے۔ میں اس سے غلط بیانی تو نہیں کر رہا۔ میں نے اس کی خواہش کے مطابق کام کر دیا ہے اور پھر چونکہ تم اتفاقیہ طور پر ان معاملات سے واقف ہو گئے ہو۔ اس لئے مجھے تمہاری مدد کی سخت ضرورت ہے۔"

"پھر جو حکم....؟"

"کل چار بجے آجاؤ۔ میں تمہارا انتظار کروں گا۔ تم سے اور بھی کچھ باتیں کرنی ہیں۔"

"بہتر ہے۔ حاضر ہو جاؤں گا۔"

"میں انتظار کروں گا۔ حاجی نیاز نے کہا اور فون بند کر دیا۔

زاہد نے ریسیور رکھا اور مسکراتا ہُوا مُڑا لیکن عقب میں شجاع احمد صاحب کو کھڑے دیکھ کر ایک دم سنبھل گیا۔ شجاع احمد اسے گھور رہے تھے۔ زاہد نے اُنھیں سلوٹ مارا اور پھر بے تکے انداز میں مُسکرانے لگا۔

"میرے کمرے میں آؤ۔" اُنھوں نے سخت لہجے میں کہا اور واپس مڑ گئے۔ زاہد نے شانے ہلائے تھے۔ پھر وہ اُن کے پیچھے پیچھے اُن کے کمرے میں پہنچ گیا۔ شجاع احمد ایک کرسی پر بیٹھ گئے تھے۔ زاہد خود بھی دوسری کرسی پر بیٹھ گیا۔ شجاع احمد نے چونک کر اسے دیکھا لیکن اس کی بے باک فطرت سے بخوبی واقف تھے۔ اس لئے پہلو بدل کر رہ گئے۔

"کس کا فون تھا؟"

"حاجی نیاز بول رہے تھے۔"

"تم سے ان کا کیا واسطہ؟"

"ہم دونوں شاطر ہیں۔"

"کیا مطلب؟"

"شاطر شاید شطرنج کے کھلاڑی کو کہتے ہیں۔" زاہد نے طنزیہ انداز میں کہا۔

"تم نے گفتگو کا سلیقہ نہیں سیکھا؟"

"سیکھا ہے شجاع احمد صاحب۔ جانتا ہُوں کس سے کس انداز میں گفتگو کرنی چاہیئے۔"

"کیا مطلب؟"

"میرے الفاظ میں کوئی معنویت نہیں ہے، جو کہتا ہُوں، صاف لفظوں میں کہتا ہُوں۔"

"حاجی نیاز میرے دوست ہیں۔ تمھارا اُن سے کیا تعلق؟"

"وہ میرے بھی دوست ہیں؟"

"تمھاری اُن سے کیا برابری ہے؟"

"اس کا جواب آپ اُن سے طلب کریں۔" زاہد خشک لہجے میں بولا اور شجاع احمد صاحب کھول کر رہ گئے۔ اتنی بدتمیزی سے بات کرنے کی جرأت کسی کو نہیں تھی لیکن یہ نوجوان، نہ جانے یہ کیا تھا۔ بہر حال وہ خود بھی اپنی سخت فطرت سے مجبُور تھے۔ اس لئے بنی ہُوئی بات بگاڑ لیتے تھے۔ بمشکل تمام اُنھوں نے خود کو سنبھالا اور بولے۔

"تمھارا اندازِ گفتگو اتنا تکلیف دہ ہوتا ہے کہ خواہ مخواہ غصہ آجاتا ہے۔ حالانکہ میں تمھاری صلاحیتوں کا دل سے قائل ہُوں اور تمھاری عزت کرتا ہُوں۔"

"شکریہ۔ بس کیا عرض کروں۔ تلخ لہجہ ہضم نہیں ہوتا۔"

"میں نہیں جانتا فرسٹ ایڈ ہاؤس کے معاملات میں تمھارا اپنا حصّہ کیا ہے۔ تمھیں اس سے کیا آمدنی ہو رہی ہے لیکن میں ذاتی طور پر بھی تمھاری آمدنی میں اضافے کا خواہش مند ہُوں۔"

"فرسٹ ایڈ ہاؤس سے آمدنی کا کیا تعلق؟" زاہد نے پوچھا۔

"صاحبزادے دُنیا دیکھی ہے۔ بہت کچھ گنوایا ہے۔ بہت کچھ کمایا ہے۔ تم نے اس زندگی میں نیا نیا قدم رکھا ہے۔ تجربہ حاصل کرو میں تمھارا اُستاد بننے کے لئے تیار ہُوں۔"

"اوہ شجاع احمد صاحب۔ آپ مہربان انسان ہیں۔ مجھے اس معاملے میں اپنی ناتجربہ کاری کا اعتراف ہے۔ اگر آپ کوئی راہنمائی کر سکیں تو۔" زاہد انکساری سے بولا اور شجاع احمد مسکرانے لگے۔

"ہم سے تعاون کرو گے تو کچھ بن جاؤ گے۔ اعتراف کرو، اس بات کا کہ فرسٹ ایڈ ہاؤس کا چکر تم نے بلاوجہ نہیں چلایا۔"

"مجھے اعتراف ہے۔ یہ چکر بلاوجہ نہیں چلایا گیا۔"

"ابھی تک کچھ حاصل ہو سکا؟"

"ابھی کہاں۔ ابھی تو ابتدا ہے۔"

"یہی تو وقت ہے عزیزی۔ گُر ہم سے سیکھو بس کبھی کبھی ہمارے کام بھی آتے رہا کرو۔"

"میں اس تعاون کے لئے تیار ہُوں۔"

"گڈ۔ تو پہلے یہ بتاؤ۔ حاجی نیاز سے کیا معاملات چل رہے ہیں؟"

"اُنھوں نے مجھے رازداری کی قسم دی ہے۔"

"اوہ۔ قسمیں توڑنے کے لئے کھائی جاتی ہیں۔ یہ ایک دُوسرے کو بے وقوف بنانے کا ذریعہ ہوتی ہیں۔ بتاؤ کیا معاملہ ہے؟"

"اُنھیں بلیک میل کیا جا رہا ہے۔"

"کون کر رہا ہے؟"

"شاید کوئی آئرن نادر۔"

"آئرن نادر۔ یہ کیا ہُوا؟"

"میں نہیں جانتا؟" زاہد نے کہا۔

"لیکن تمھارا ان معاملات سے کیا تعلق؟"

"ایک واقعہ اس کا محرک ہے۔" زاہد نے کہا اور اطمینان سے پُوری تفصیل شجاع احمد کو بتا دی۔

"ویری گڈ۔ اب پھنسی ہے مچھلی جال میں۔ بہت بڑا شاطر بنتا تھا۔ لیکن اب تم کیا کرو گے؟"

"میں نے حاجی صاحب کا یہ کام کرنے کا وعدہ کیا ہے۔"

"تمھیں اس سے کیا ملے گا؟"

"بس خدمتِ خلق کا بھی شوق ہے۔" زاہد نے جواب دیا اور شجاع احمد کسی سوچ میں گم ہو گئے۔ پھر بولے۔

"احمق ہو۔ یہ پانچ لاکھ روپے اس بلیک میلر تک پہنچانے

کی ذمہ داری تمھاری تو نہیں ہے۔ ہضم کر جاؤ۔"

"جی..." زاہد کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

"مجھے ان میں سے ایک پیسہ بھی درکار نہیں ہوگا۔ سب تمھارے۔ ایسے میں تم پر آنے والی ہر الجھن کو ختم کرنے کی ذمہ داری لیتا ہوں۔"

"لیکن... لیکن حاجی صاحب تو آپ کے دوست ہیں شجاع احمد صاحب...؟"

"یہ کاروبار کی دُنیا ہے۔ اس کی دوستیاں ذرا مختلف ہوتی ہیں۔ ابھی دیر سے سمجھو گے۔"

"یہ میں نہ کر سکوں گا شجاع احمد صاحب۔"

"چلو ٹھیک ہے نہ کرو۔ ساڑھے بارہ لاکھ ادا کرنے ہیں نہ حاجی کو؟"

"جی ہاں۔"

"اور اس کے بعد وہ بلیک میلر وہ تمام اشیا اُن کے حوالے کر دے گا۔"

"جی ہاں۔ امکان تو اسی کا ہے۔"

"اور یہ سب کچھ تمھارے ذریعے ہوگا؟"

"ہاں۔ شاید..."

"بس تو پانچ لاکھ چھوڑ دس لاکھ کماؤ۔"

"وہ کیسے؟"

"وہ سارا بلیک میلنگ کا مواد میرے حوالے کر دینا۔ میں تمھیں اس کی قیمت دس لاکھ ادا کروں گا۔" شجاع احمد نے مسکراتے ہوئے کہا اور زاہد گہری گہری سانسیں لینے لگا۔ "میں تمھاری تقدیر بنا دوں گا زاہد۔ بڑے بڑے سرمایہ داروں کی صف میں لا کھڑا کروں گا تمھیں۔ یہ مراعات ہر انسان کو حاصل نہیں ہوتیں۔ تم ذہین ہو اور میں تمھاری ذہانت کی قدر کرتے ہوئے یہ سب کچھ کر رہا ہوں۔"

"میں آپ کا شکر گزار ہوں شجاع احمد صاحب لیکن ان کاغذات سے آپ کو کیا فائدہ حاصل ہوگا؟"

"اس سوال کو ذہن سے خارج کر دو۔ دس لاکھ ان تمام چیزوں کی مشترکہ قیمت ہے۔ تاہم تمھارے تجسس کو ختم کرنے کے لئے اتنا بتا دینا کافی سمجھتا ہوں کہ کاروبار کی یہ دُنیا عجیب ہے۔ ہم لوگ گہرے دوست ہیں، ہم نوالہ وہم پیالہ ہیں لیکن کاروبار کی چوکی پر بیٹھ کر ہم شطرنج کی چالیں چلتے ہیں اور ایک دُوسرے کو مات دینے کے خواہش مند ہوتے ہیں۔ حاجی نیاز میرا کاروباری حریف ہے۔ بعض اوقات ایسے مقامات آجاتے ہیں کہ کوئی سودا ہمارا وقار بن جاتا ہے۔ اس وقت دُوسرے کو زیر کرنے کے لئے ہر چال جائز ہوتی ہے۔ سمجھ دار ہو تو سمجھ جاؤ۔"

"سمجھ گیا۔ وہ کاغذات حاجی نیاز کو آپ کا نیاز مند بنائے رکھیں گے۔" زاہد نے کہا۔

"دس لاکھ اسی سمجھ داری کی قیمت ہیں۔"

"میں اس پر غور کروں گا۔"

"ٹھیک ہے۔ بات یہیں تک نہیں۔ فرسٹ ایڈ ہاؤس کا عظیم الشان چکر چلا کر بھی تم نے کچھ کمانے کا پروگرام بنایا ہوگا۔ میں اس میں بھی تمھاری مدد کر سکتا ہوں۔"

"آپ کی نوازش ہے شجاع احمد صاحب۔"

"تم لوگوں نے اس ادارے کی تشہیر کر کے خاصی نیک نامی کما لی ہے اور حکومت اس سلسلے میں تمھاری ہر امداد کر سکتی ہے۔"

"جی... پھر۔"

"سیمنٹ کے بحران سے واقف ہو؟"

"جی ہاں۔ ان دنوں سیمنٹ کے حصول میں کافی مشکلات ہیں۔"

"لیکن اگر تم چاہو تو حکومت سے سیمنٹ بہت بڑی مقدار میں حاصل کر سکتے ہو۔ تم ادارے کے نام پر گرانٹ لے لو۔ باقی تمام ذمہ داری میری۔ سیمنٹ میں امپورٹ کروں گا۔"

"فائدہ...؟" زاہد نے ان کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا اور شجاع احمد مسکرانے لگے۔

"مزید دس لاکھ روپے تمھارے۔"

"تفصیل شجاع احمد صاحب۔"

"وہ سیمنٹ میرے حوالے کر دینا۔ مارکیٹ میں مہنگے داموں نکل جائے گا اور ہم لاکھوں کما لیں گے۔"

"اور فرسٹ ایڈ ہاؤس کی تعمیر کا کیا ہوگا؟"

"تعمیر ہوگی۔ اس کے لئے میں اپنے پوشیدہ اسٹاک سے تمھیں سیمنٹ دوں گا۔ یہ اسٹاک میں ظاہر نہیں کر سکتا۔ اسے فروخت بھی نہیں کر سکتا۔ لیکن نیا سیمنٹ ہاتھوں ہاتھ بک جائے گا۔ میں ایسا ہی سیمنٹ امپورٹ کروں گا۔ تمھارا کام بھی نہیں رکے گا اور دولت..." شجاع احمد ہنسنے لگے۔

"سیمنٹ کی امپورٹ اور خریداری کے لئے رقم...؟" زاہد نے کہا۔

"اس کی تم فکر ہی مت کرو۔"

"مجھے منظور ہے شجاع احمد صاحب۔ آپ مجھے ہدایات دیں۔ میں تیاریاں کرتا ہوں۔"

"گڈ... بن جاؤ گے۔ میری پیش گوئی ہے ایک دن سرمایہ داروں کی فہرست میں ایک نیا نام اُبھرے گا۔ زاہد ذوالفقار زیدی۔ بس اب جاؤ عیش کرو۔" شجاع احمد نے کہا اور زاہد گردن جھکائے باہر نکل آیا۔ اس کا چہرہ پرسکون تھا لیکن کون جانتا تھا کہ اس پرسکون چہرے کے

پیچھے کتنے تلاطم تھے۔ کیا کیا خیالات تھے۔

★★

کرم دین حویلی میں داخل ہو گیا۔ ملازموں نے اس کے آنے کی خبر بیگم صاحبہ کو دی۔ مہرالنسا بیگم جلاپے کا شکار تھیں۔ شوہر کا انتقال ہو گیا تھا لیکن آج بھی یہ بات دل پر نقش تھی کہ ظفر، شمشیر زماں کی اولاد ہے۔ حسینہ نے ان کے سہاگ پر ڈاکہ ڈالا تھا۔ اس محرومی کا احساس بھی تھا کہ ان کی کوئی اولادِ نرینہ نہیں۔ ایک داشتہ کے بیٹے کو وہ جائداد میں سے حصہ کیسے دے سکتی تھیں۔ اور پھر تین تین بیٹیوں کا بوجھ تھا۔

ظفر جو کچھ کہہ گیا تھا۔ وہ بہت تھا۔ اتنا کہ سننے کی تاب نہیں رکھتی تھیں۔ تینوں بیٹیاں الگ باغی ہو گئی تھیں۔ ماں کی گفتگو کو اُنھوں نے پسند نہیں کیا تھا۔ نشاط نے تو فوراً وہاں سے جانے کا اعلان کر دیا تھا۔ ظفر اور کرم دین کے جانے کے بعد وہ بہت دیر تک تنہا بیٹھی اس کے بارے میں سوچتی رہی تھیں اور کوئی سہارا نہیں ملا تو مجبوراً امداد علی صاحب کو طلب کر لیا۔ اس وقت وہی مخلص نظر آتے تھے۔

"کیا بات ہے مہرالنسا بہن؟"

"شمشیر زماں کا سہارا سر سے اٹھتے ہی کمینوں کی بن آئی ہے بھائی صاحب۔ یوں لگتا ہے لوگ مجھے جینے نہیں دیں گے۔" وہ رندھی ہوئی آواز میں بولیں۔

"ایسی بات نہ کہیں، ہم سب زندہ ہیں۔ بات کیا ہوئی؟"

"نیا ڈرامہ آپ کو معلوم نہیں؟"

"نہیں مجھے خبر نہ ہو سکی کیا ہوا؟" امداد علی صاحب کو واقعی ان تمام کی خبر نہیں تھی۔

"ظفر لندن سے واپس آ گیا ہے۔ شمشیر زماں نے خدا اُنھیں کروٹ کروٹ جنّت نصیب کرے ساری زندگی مجھے کوئی دُکھ نہ دیا لیکن یہ ایک ایسی چھُری رکھ گئے ہیں میرے گلے پر کہ باقی زندگی اذیت میں گزرے گی۔"

"ظفر کون؟"

"حسینہ کا وہ لوفر بیٹا جو گھر سے بھاگ گیا تھا اور جس کے بارے میں مرحوم ہمیشہ کہتے رہے کہ وہ میری اولاد نہیں ہے اور حسینہ سے میرا کوئی ایسا رشتہ نہیں ہے لیکن یہ سب اڑائی ہوئی تھی کہ وہ بھاگ گیا ہے۔ مرحوم نے اپنی اولاد نرینہ کی پرورش لندن میں کرائی۔ اسے اعلیٰ تعلیم سے آراستہ کیا۔ لندن کے اسکول، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں ظفر الزماں ولد شمشیر زماں درج ہے۔ یہ اس کے پاس ثبوت ہیں۔"

"اوہ۔ پھر کیا ہوا؟"

"ماں کی تلاش میں آیا تھا۔ حق جتا کر گیا ہے اپنا۔ دھمکیاں دے گیا ہے کہ اگر یہ الزام غلط نکلا کہ حسینہ شمشیر زماں کی منکوحہ نہیں ہے تو میری بیٹیوں کو طوائف بنا دے گا۔ اتنی بدتمیزی کی ہے اس نے کہ بیان سے باہر ہے۔"

"گیا کہاں؟"

"جہنم میں۔ مجھے کیا معلوم…؟" بیگم صاحبہ نے روتے ہوئے کہا۔

"آپ ہراساں نہ ہوں مہرالنسا بیگم۔ حسینہ خود تو ایسی نہ تھی۔ اس کا بیٹا اتنا کمینہ ہے۔"

"ارے وہ جو کچھ تھی مجھے معلوم ہے۔ بس مُنہ نہ کھلوائیں۔"

"اس کا کوئی پتہ ہے، کہاں چلی گئی؟"

"نہیں، مجھے نہیں معلوم۔ ویسے اچھا ہی ہوا، مَیں نے اس کلموہی کو نکال دیا۔ ورنہ اس وقت دونوں ماں بیٹے میری چھاتی پر مونگ دلتے۔"

"معاملہ واقعی اُلجھا ہوا ہے۔ اگر یہ بات ثابت ہو گئی کہ وہ شمشیر زماں کی اولاد ہے تو قانونی اُلجھنیں پیدا ہوں گی۔ میرے خیال میں حمایت بیگ بھی ہماری حمایت نہیں کر سکیں گے۔"

"خان دلاور سے مدد لیں امداد علی بھائی، اُنھیں بلائیں، ان سے کہیں ٹکڑے کر دیں دونوں ماں بیٹے کے۔ ان کی لاشیں چیل کوّوں کو کھلا دیں۔ مَیں سارا الزام اپنے سر لوں گی چاہے جیل ہی کیوں نہ جانا پڑے۔"

"خدا نہ کرے بہن۔ تمھاری جگہ ہم جیل جانے کو تیار ہیں۔ کوئی اور تھا اس وقت جب وہ یہ دھمکیاں دے رہا تھا۔"

"ہاں۔ لڑکیاں تھیں۔ وہ نمک حرام کرم دین تھا۔ مجھے حیرت تو یہی ہے کہ نمک خوار بھی غداری کر رہے ہیں۔"

"بابا کرم دین۔ اُنھوں نے کیا کیا؟"

"اس کی طرفداری کی اور لے کر چلے گئے سارے۔ مَیں نے ان لوگوں کے ساتھ کبھی نوکروں کا سا سلوک نہیں کیا اور اُنھوں نے کیا صلہ دیا مجھے؟"

"کرم دین چلے گئے یہاں سے؟"

"ہاں۔ پھر آ مریں گے۔ اس بڑھاپے میں اور کہاں جائیں گے؟"

"بہرحال آپ فکر نہ کریں۔ ذرا لڑکیوں کو بلائیں میرے پاس…"

امداد علی صاحب نے کہا اور بیگم صاحبہ نے ایک ملازم کو بلا کر لڑکیوں کو طلب کر لیا۔ نشاط جانے کی تیاریاں کر رہی تھی۔ تینوں لڑکیاں مُنہ بنائے ہوئے پہنچ گئیں۔

"کیا بات ہے؟"

"مَیں نے بلایا تھا بچیو۔ وہ حسینہ کا بیٹا کیا کہہ کر گیا ہے؟" امداد علی بولے۔

"امی جان سے ہی پوچھ لیں۔" نشاط تنک کر بولی۔

"سُن رہے ہیں امداد علی بھائی، سُن رہے ہیں ان کا لہجہ۔" بیگم صاحبہ نے فریاد کی۔

"سُنا ہے بیٹی کہ وہ دھمکیاں دے کر گیا ہے۔ بڑی غلیظ باتیں کر کے گیا ہے۔"

"آپ ہم سے کیا چاہتے ہیں پھوپھا جان؟" نزہت بولی۔

"اس کی رپورٹ کرنا پڑے گی بیٹے۔ پولیس کو مطلع کرنا پڑے گا کہ وہ ہمیں دھمکی دے کر گیا ہے۔"

"اور ہمیں اس کی گواہی دینی پڑے گی؟"

"ہاں ممکن ہے اس کی ضرورت پیش آجائے۔"

"ہم تینوں کا متفقہ فیصلہ ہے پھوپھا جان کہ ہم اس سلسلے میں کوئی گواہی نہیں دیں گے۔"

"کیوں بیٹی؟"

"اس لئے کہ اس حویلی میں ایک انسان کے ساتھ بہتر سلوک نہیں ہوا۔ وہ کچھ بھی تھا۔ کچھ بھی کہہ رہا تھا اس کی تسلی کی جاتی۔ ایک پُروقار اور تعلیم یافتہ نوجوان کو ناجائز اولاد کہہ دینا کوئی اچھی بات تو نہیں تھی۔ اس کے ساتھ بہت بُرا سلوک ہوا ہے۔ وہ طویل عرصے کے بعد اپنی ماں سے ملنے کی آس لے کر آیا تھا لیکن اس کی ماں ... وہ ظلم کا شکار ہو گئی۔"

"ہاں۔ میں ظالم ہوں، قاتل ہوں، بدتہذیب ہوں، سب کچھ ہوں۔ ٹھیک ہے۔ دیکھتی ہوں کوئی میرا کیا بگاڑ لیتا ہے۔ دیکھا آپ نے امداد بھائی یہ میری اولاد ہیں۔ دیکھ لیا آپ نے۔" بیگم صاحبہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔

تینوں لڑکیاں اُٹھ کر چلی گئی تھیں۔ امداد علی بیگم صاحبہ کو دلاسہ دیتے رہے۔ "صبر اور ہوشیاری سے کام لیں۔ نوجوان بچیاں ہیں جذباتی ہو گئی ہیں۔ ہمیں ہوشیاری سے کام لینا ہوگا۔ میں اس مسئلے کا کوئی حل سوچتا ہوں۔"

"سوچ لیں۔ میں بھی اتنی بے بس نہیں ہوں۔" بیگم صاحبہ نے کہا۔ امداد علی چلے گئے۔ نشاط اسی شام شہر چلی گئی تھی۔ پھر کرم دین، بیگم صاحبہ کے سامنے پہنچا۔

"کیوں ہُوا نکل گئی کرم دین۔ میرا کھایا زندگی بھر اور مصلحت کے تحت یہاں سے بھاگ گئے۔ سوچا ہوگا۔ اب حویلی کے نئے مالک سے بنانی چاہیئے تاکہ بقیہ زندگی بھی سکون سے گزرے۔"

"اس میں کوئی شک نہیں ہے بیگم صاحبہ کہ زندگی بھر آپ کا نمک کھایا ہے۔ اس کا جواب خُدا کو دوں گا کہ حلال تھا یا نہیں لیکن آپ نے حویلی کے نئے مالک کی کیا بات کہی؟"

"شمشیر زماں کا بیٹا۔ جائیداد اُسے ہی ملے گی نا؟"

"نہیں بیگم صاحبہ۔ وہ غریب ماں کا بیٹا ہے اور غریب صرف اپنے باپ کو باپ کہتا ہے۔ وہ کسی بھی لالچ کے تحت اپنی ولدیت نہیں بدلے گا آپ فکر نہ کریں۔ اسے علم ہو گیا ہے کہ شمشیر زماں اس کے باپ نہیں تھے۔ وہ کسی اور کی اولاد ہے۔ اسے علم ہو گیا ہے بیگم صاحبہ کہ حسینہ شمشیر زماں کے لئے ایک بہن کی حیثیت رکھتی تھی۔ صرف ایک بہن کی۔ آپ مطمئن رہیں۔ اب وہ یہاں کبھی نہیں آئے گا۔ اس لئے آپ کا کہا سچ مان لیا ہے۔ اس کی قسم تو وہ بھی توڑ گئی بیگم صاحبہ۔ وہ کبھی آپ کو پریشان نہیں کرے گا۔ یہ اس غریب بوڑھے کا وعدہ ہے۔"

بیگم صاحبہ کا مُنہ حیرت سے کھُل گیا۔

"کیا کہہ رہے ہو کرم دین بابا۔ اسے یہ کیسے معلوم ہُوا؟ اور کیا... کیا واقعی یہ سچ ہے حسینہ... حسینہ...؟"

"ہم غریبوں کی دُنیا آپ دولت مندوں کی دُنیا سے بہت مختلف ہوتی ہے بیگم صاحبہ۔ بس اس سے زیادہ میں کچھ نہیں کہوں گا۔ چھیمو کو لینے آیا ہُوں۔ اسے اجازت دیں۔ اب وہ آپ کی خدمت نہ کر سکے گی۔

... بیگم صاحبہ صرف ایک عرض ہے۔ اب یہ بات ثابت ہو گئی ہے کہ حسینہ شمشیر زماں کی کچھ نہیں تھی۔ ان کے درمیان ہمدردی کا ایک بے لوث رشتہ تھا۔ اب یہ بات کسی سے نہ کہیں کہ وہ ... وہ شمشیر زماں کی داشتہ تھی۔ میرے مرحوم مالک کی رُوح کرب کا شکار ہوتی ہوگی اس الزام سے۔ خدا کے لئے یہ الزام اب نہ لگائیں اُن کی رُوح پر۔" کرم دین روتا ہُوا باہر نکل گیا۔ بیگم صاحبہ سکتے کے عالم میں بیٹھی رہ گئی تھیں۔

پوری کوٹھی بقعۂ نور بنی ہوئی تھی۔ کوٹھی کے پارکنگ میں کاروں کا شہر آباد تھا۔ باہر سڑک پر بھی دُور دُور تک کاریں کھڑی ہوئی تھیں۔ لان... مہمانوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ ایک طرف آرکسٹرا نغمہ سرا تھا۔ ویٹر مشروبات کی ٹرالیاں گھسیٹے گھسیٹے پھر رہے تھے چاروں طرف کی خوشیاں بکھری ہوئی تھیں۔ قہقہے بکھرا رہے تھے۔ معزز مہمانوں کے درمیان شجاع احمد صاحب بڑی شان بڑے غرور سے میٹھی باتیں کر رہے تھے۔ اس محفل کا دُولہا ابھی محفل میں نہیں آیا تھا۔

اندر... کوٹھی کے بالکل اندرونی حصے کے ایک کمرے میں دُولہا میاں ایک اعلیٰ درجے کے سوٹ میں ملبوس زاہد کے سامنے کھڑے تھے۔

"گڈ... احمد رضا تمہارے اندر بولنے کی صلاحیتیں ہیں۔ خدا کی قسم ذرا بھی احساس نہیں ہوتا کہ کوئی پہلی بار تقریر کر رہا ہے۔ تمہارے الفاظ بھرپور احساس کے ساتھ ادا ہو رہے ہیں۔ میں مطمئن ہوں۔" زاہد نے کہا۔

"بند کمرے کی بات اور ہے زاہد بھائی! وہاں مجمعے میں سب کے سامنے۔" احمد رضا نے گھبرائے ہوئے انداز میں کہا۔

"آنکھیں صرف آنکھیں۔ میں مجمعے میں سب سے آخر میں کسی

اُونچی جگہ کھڑا ہوں گا۔ تم بولتے وقت میرے علاوہ کسی اور کو نہ دیکھنا۔ بس مجھ پر نگاہ جمائے رکھنا۔"

"ہاں یہ اچھا آئیڈیا ہے۔" احمد رضا نے کہا۔

"گڈ۔ باہر نکلنے سے پہلے ایک بار پھر دُہرا لو۔ میں جاؤں؟"

"جی ٹھیک ہے۔" احمد رضا نے کہا۔ اور زاہد باہر نکل آیا۔ اب وہ ایک راہداری میں دوڑ رہا تھا۔ پھر وہ اُوپری منزل کے زینوں سے گزرتا ہُوا اوپری منزل کے آخری کمرے میں پہنچ گیا۔ دروازے پر رُک کر اس نے اندر کی آواز سُنی۔ اندر سے ہارون کے دھاڑنے کی آوازیں سُنائی دے رہی تھیں۔ ایک پُرجوش نغمہ اس کے حلق سے نکل رہا تھا۔ اس کی دُھن زاہد نے بنائی تھی۔ یہ نغمہ احمد رضا کی شان میں ایک بھائی کے جذبات کا ترجمان تھا لیکن بڑا خفیہ نغمہ تھا۔ اور اس کی پیش کش بھی اچانک ہونے والی تھی۔

زاہد اندر داخل ہُوا تو ہارون سہم کر خاموش ہوگیا لیکن زاہد کو دیکھ کر اس نے سکون کی سانس لی تھی۔ "ہاں فنکار کہو کونسی منزل میں ہو؟"

"پپ... پہلی منزل پر۔ میرا مطلب ہے آپ نے یہی جگہ بتائی تھی نا..."

"ہاں ہاں... ٹھیک ہے۔ ایک دو بول سُنا دو تو جاؤں۔" زاہد نے کہا۔

"زاہد بھائی! میرا دم گھٹ رہا ہے۔" ہارون روندھی ہوئی آواز میں بولا۔

"ایک منٹ ایک منٹ۔" زاہد نے کہا۔ اور آگے بڑھ کر ہارون کی ٹائی کی ناٹ ڈھیلی کر کے کہا۔ "کوئی خاص بات نہیں گرہ ذرا تنگ ہوگئی تھی۔"

"یہ بات نہیں۔ یہاں سب کے سامنے گانے سے دل گھبرا رہا ہے۔"

"ہائے تو میرے لعل کیا بند کمروں میں گا گا کر فنکار بننا چاہتے ہو۔ ابے مردِ مومن یہ تو ایک فنکار کی کسوٹی ہے۔ آج اخباری نمائندے ہوں گے۔ فوٹوگرافر ہوں گے۔ یہ دن تمہاری شہرت کی ابتداء کا دن ہے۔"

"وہ تو ٹھیک ہے۔ اور کسی کی فکر نہیں، بس ڈیڈی..."

"فن ان ہی پریشانیوں میں پروان چڑھتا ہے۔ بس بس سمجھ لو آج کی ہمت کل کے فنکار کو جنم دے گی۔ کسی کی پرواہ مت کرو۔ بس گاؤ دل کھول کر گاؤ۔"

"حالات اگر بگڑ گئے تو؟"

"تمہارا زاہد موجود ہے۔"

"ڈیڈی غصّے کے عالم میں سب کچھ بھول جاتے ہیں۔"

"اپنے والد بزرگوار کو نہیں بھولتے۔ دادا جان ہمارے ساتھ ہیں۔"

"ہاں تب تو ٹھیک ہے۔" ہارون نے کہا۔

"او کے میں جاؤں؟"

"جی..." ہارون نے کہا۔ اور زاہد باہر نکل آیا۔ سیڑھیاں اُترا تھا کہ ایک ملازمہ نظر آئی۔

"زاہد بھیا! بیگم صاحبہ کب سے بلا رہی ہیں۔ میں چاروں طرف ڈھونڈتی پھر رہی ہوں۔ جہاں جاؤ پتہ چلتا ہے بس ابھی نکلے ہیں۔"

"یہیں آ رہا تھا شمو! چلو..." زاہد نے کہا اور تیز تیز قدموں سے بیگم صاحبہ کے کمرے کی طرف چل پڑا۔ تیز روشنی میں بیگم صاحبہ قیامت بنی ہوئی تھیں۔ آئینے کے سامنے آخری جائزہ لے رہی تھیں۔ گنگا جمنی کام کی بنی ہوئی ایرانی طرز کی میکسی پہنے ہوئے تھیں۔ بال جوگنوں کے انداز میں کھلے ہوئے تھے۔ زاہد نے اُنھیں گھورا تو شرما گئیں۔

زاہد نے اپنے چہرے پر بوکھلاہٹ کے آثار پیدا کر لئے تھے پھر وہ پیچھے ہٹتا ہُوا بولا۔

"مم... معاف کیجئے گا مم... میں وہ بیگم صاحبہ بیگم صاحبہ کہاں گئیں میں تو اُن سے ملنے آیا تھا۔"

"ارے ارے۔ کیا بدتمیزی ہے آ گئے آؤ۔" بیگم صاحبہ نے کہا۔

"جی، وہ میں نے آپ کو پہچانا نہیں۔"

"کیا واقعی؟" بیگم صاحبہ عجیب سے لہجے میں بولیں۔

"کیا مطلب؟ میرا مطلب ہے کہ آپ کوئی، کوئی مہمانوں میں سے ہیں شاید۔"

"زاہد... زاہد اگر میرا مذاق اُڑایا... ہے ہو تو اتنی پٹائی کروں گی کہ دماغ درست ہو جائے گا۔ اور اگر سچ کہہ رہے ہو تو آگے آؤ مجھے سنجیدگی سے بتاؤ کیسی لگ رہی ہوں؟" بیگم صاحبہ نے پیار بھرے لہجے میں کہا۔

"جی، جی..." زاہد حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر بولا۔ "آپ میرا مطلب ہے اُوہ... خُدا کی پناہ۔ یہ آپ ہیں بیگم صاحبہ! کیا یہ کیا یہ... واقعی آپ ہیں؟"

"کیوں کیا میں... میں نہیں لگ رہی؟"

"کمال ہوگیا۔ میں نے اپنی زندگی میں اتنی حیرت انگیز تبدیلی کبھی نہیں دیکھی۔ بخدا آپ، آپ مجھے تو آپ کوئی بتیس سالہ خاتون معلوم ہو رہی ہیں۔ بھلا کون ہے جو آپ کو اس انداز میں پہچان سکے۔ دیکھئے نا اُوہ... میں کہتا تھا میں کہتا تھا نا، میں کہتا تھا۔" زاہد اپنی دونوں رانیں پیٹتا ہُوا بولا۔ "میں کہتا تھا بیگم صاحبہ! میں کہتا تھا کہ آپ کا حشر کر دیا گیا ہے دراصل آپ اتنی بوڑھی نہیں ہیں جتنا بوڑھا آپ کو بنا دیا گیا ہے بھلا دیکھئے تو کون کہہ سکتا ہے کہ یہ... یہ وہی خاتون ہیں۔"

"اب مجھے زیادہ بے وقوف مت بناؤ، کیسی لگ رہی ہوں سچ بتاؤ۔ مذاق تو نہیں اُڑے گا باہر...؟"

"میں مذاق اُڑانے والوں کی زبان نکال کر ہاتھ پہ رکھ دوں گا سمجھیں

آپ۔ اتنی حسین تو شاید اس محفل میں کوئی نظر نہ آئے سارے بیگم صاحبہ آپ یقین فرمایئے کہ آپ کی بچیاں آپ کی بہنیں لگیں گی۔ بلکہ آپ ان سے بھی کمسن لگ رہی ہیں۔ کمال کی بات ہے آپ آئینے میں دیکھیں میری بات پر یقین نہ کریں۔"

"اچھا اچھا بس میں تم سے ایک سوال کرنا چاہتی ہوں۔ بتاؤ ٹھیک لگ رہی ہوں یا اپنا حلیہ تبدیل کروں؟"

"آپ صرف ٹھیک کی بات کر رہی ہیں۔ میں سمجھتا ہوں لوٹ لی آج کی محفل آپ نے۔" زاہد نے کہا اور بیگم صاحبہ جھینپے ہوئے انداز میں ہنسنے لگیں۔

"اچھا چلو ٹھیک ہے تم نے پاس کر دیا۔ تو پھر سب ٹھیک ہے۔ لیکن ڈرا دیا ہے تم نے بھئی شجاع احمد صاحب کی طبیعت جانتے ہو ابھی تک نکلیں پتہ نہیں چلا کہ یہاں کیا ناٹک ہو رہا ہے؟"

"چھوڑیئے بیگم صاحبہ! پتہ چل جائے گا تو کون سی برائی ہو رہی ہے۔ یہاں پڑ اپنے آپ کو اچھا رکھنا، اپنے آپ کو سلیقے سے دنیا میں لانا کیا کوئی بری بات ہے یہ تو ظلم ہے کہ کوئی کسی سے اس کا حسن و سلیقہ بھی چھین لے۔"

"چلو ٹھیک ہے نمٹ لوں گی میں ان سے بھی تم ٹھیک کہتے ہو۔ میرا بھی اپنا دل ہے میں بھی زندہ رہنا چاہتی ہوں۔ سب کچھ دیا ہے اللہ تعالیٰ نے تو کیا میں ہی خود پر بڑھاپا طاری کر لوں۔ خود تو دیکھو کیسے سوٹ پہنے ہوئے چھیل چھبیلے بنے رہتے ہیں۔ اچھا زاہد بیٹے سارے کام مکمل ہیں؟"

"جی بیگم صاحبہ! بالکل۔ اگر آپ کی نگاہ میں کوئی چیز رہ گئی ہو تو مجھے حکم دیں۔"

"ہاں! ایک چیز رہ گئی ہے۔" بیگم صاحبہ نے مسکراتی نگاہوں سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

"جی جی فرمایئے۔" زاہد ادب اور مستعدی سے بولا۔

"تمہارا لباس۔"

"مم... میرا۔" زاہد چونک کر بولا۔

"ہاں تم نے کپڑے کیوں نہیں بدلے؟"

"واہ، آپ نے تو تمام کیا دھرا چوپٹ کر کے رکھ دیا۔ یہ لباس کیا آپ کو پرانا نظر آ رہا ہے؟" زاہد نے اپنے لباس کی طرف دیکھ کر کہا۔

"نہیں، پرانا تو نہیں ہے لیکن یہ نہیں چلے گا۔"

"اوہ بیگم صاحبہ! زاہد، زاہد ہے اور زاہد کو زاہد ہی رہنا چاہیئے۔ میرے لئے یہی لباس مناسب ہے تاکہ مالک اور ملازم میں تفریق کی جا سکے۔"

"فضول باتیں کیں تو میں بھی یہ سب کچھ اتار کر پھینک دوں گی۔ اور پہن لوں گی اپنا وہی پرانا لباس سمجھے تم۔" بیگم صاحبہ ناز بھرے لہجے میں بولیں۔

"میں سمجھا نہیں بیگم صاحبہ!"

"میں سمجھائے دیتی ہوں تمہیں۔ لاؤ شبیرن لے کر آؤ۔" بیگم صاحبہ نے اندرونی دروازے کی طرف رخ کر کے کہا اور ایک ملازمہ ایک لباس، نئی موزے جوتے وغیرہ لئے ہوئے اندر آگئی۔ دراصل ہارون، احمد رضا اور فیصل کو ایک ہی ڈیزائن کے سوٹ سلوا کر دیئے گئے تھے اور یہ سوٹ بھی اسی ڈیزائن اور اس کپڑے کا تھا جو بیگم صاحبہ نے زاہد کے لئے تیار کروایا تھا۔ زاہد نے اسے دیکھا اور اس کی آنکھیں حیرت... سے پھیل گئیں۔

"یہ... یہ، یہ کس کا ہے؟"

"تمہارا۔"

"میرا مگر... بیگم صاحبہ! یہ نہیں ہو سکتا۔ آپ یقین کیجئے یہ زیادتی ہو گی میرے ساتھ۔"

"کیوں وجہ بتاؤ؟"

"بیگم صاحبہ! لوگ مجھے اس لباس میں دیکھیں گے تو پھر انہیں یہ فیصلہ کرنے میں دقت نہ ہو گی کہ میں اس گھرانے کو لوٹ کر کھا رہا ہوں نہیں بیگم صاحبہ اسے کوئی بھی پسند نہیں کرے گا۔"

"میں پسند کروں گی سمجھے تم اور میری پسند اتنی حقیر نہیں ہے جاؤ لباس تبدیل کرو۔" بیگم صاحبہ سخت لہجے میں بولیں۔

"بیگم صاحبہ، براہ کرم میرے اوپر یہ بوجھ نہ ڈالئے۔"

"اگر میری محبت تمہارے اوپر بوجھ ہے زاہد! تو میں خاموش ہوئی جاتی ہوں اس کے بعد میں کچھ نہیں کہوں گی۔"

"نہیں بیگم صاحبہ! آپ کی محبت تو جینے کا سہارا ہے۔ مجھ جیسے تنہا انسان کے لئے آپ کی محبت اسی طرح ہے جیسے ویران صحرا میں کوئی سایہ دار درخت جس کے نیچے محبتوں کے چشمے بہہ رہے ہوں۔"

"تو پھر تم اس محبت کو قبول کرنے سے انکار کیوں کر رہے ہو۔ میں تمہیں اپنے ہارون، رضا اور فیصل سے کم نہیں سمجھتی۔ تم یہاں کسی بھی حیثیت سے آئے ہو کچھ بھی ہو۔ دل ہی کی بات تو ہے نا میرے دل میں تمہارے لئے وہی جگہ ہے اس بات کو ذہن نشین کر لینا میں کبھی بھی تمہارے لئے الگ ہٹ کر نہیں سوچوں گی۔ اگر کبھی محسوس کرو تو مجھ پر شک کرنا۔" بیگم صاحبہ کے لہجے میں ایسا خلوص اور ایسا پیار تھا کہ ایک لمحے کے لئے زاہد کے بدن میں کپکپی سی دوڑ گئی وہ کھو سا گیا تھا لیکن دوسرے لمحے اس نے خود کو سنبھال لیا۔ آگے بڑھ کر بیگم صاحبہ کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اسے بوسہ دیا۔ آنکھوں سے لگایا اور لباس لے کر وہاں سے باہر نکل گیا۔

تھوڑی دیر کے بعد وہ لباس تبدیل کر کے بیگم صاحبہ کے پاس پہنچ گیا تھا۔ بیگم صاحبہ نے اُسے دیکھا اور ششدر رہ گئی۔

"خدا کی قسم اتنے پیارے لگ رہے ہو کہ میری نظر نہ لگ جائے تمہیں"۔ بیگم صاحبہ نے زاہد کی پیشانی چومتے ہوئے کہا۔

"اچھا اب باہر چلئے۔ میرا خیال ہے تقریب کا آغاز ہو گیا ہے"۔ زاہد نے کہا اور بیگم صاحبہ نے گردن ہلا دی۔ زاہد خود تیزی سے باہر نکل گیا تھا۔ وہ بیگم صاحبہ کو اپنے ساتھ باہر نہیں لے جانا چاہتا تھا۔ ورنہ پھر یہ ساری ذمہ داری اسی پر عائد ہو جاتی اور فوراً ہو جاتی، بعد کے معاملات تو بعد میں دیکھے جاتے فی الحال تو اس وقت جان بچانے کا مسئلہ تھا۔

باہر محفل شباب پر تھی، رنگ بکھرے ہوئے تھے چاروں طرف سے قہقہوں کی کھنک سنائی دے رہی تھی۔ شجاع احمد صاحب اپنے دوستوں میں فخر سے سر بلند کئے بیٹھے تھے، دادا جان نے اپنے ہم عمروں کا انتخاب کر لیا تھا اور ان کے ساتھ محو گفتگو تھے۔ فوٹو گرافر تصویریں بناتے پھر رہے تھے اور جگہ جگہ فلیش لائٹوں کے جھماکے ہو رہے تھے۔ ویڈیو کیمرے سے فلم بنائی جا رہی تھی۔ غرض چاروں طرف ہنگامہ آرائی تھی۔ بیگم صاحبہ باہر نکلیں تو بے شمار نگاہیں ان کی طرف اُٹھ گئیں۔

مضحکہ خیز تو نہیں لگ رہی تھیں لیکن اس محفل میں کچھ نرالی ہی سج دھج تھی اُن کی کچھ بیگمات نے جو اُنہیں پہچانتی تھیں ان کا استقبال کیا لیکن اُن کے ہونٹوں پر دبی دبی مسکراہٹیں اُبھر آئی تھیں۔ بات یہ نہیں تھی کہ بیگم صاحبہ دُنیا سے انوکھی لگ رہی تھیں بلکہ اس سے قبل بھی وہ بہت سی تقاریب میں شریک ہو چکی تھیں اور ایک سادہ سی خاتون کی حیثیت سے مشہور تھیں جنہوں نے نئے دور کے رنگ ڈھنگ نہیں اپنائے تھے اور اپنے آپ کو جس ماحول میں رہنے دیا تھا جو قدیم اور شریفانہ کہلاتا تھا۔ اُن کی اس ندرت کے اکثر چرچے بھی ہوا کرتے تھے۔

لیکن آج اُنھوں نے وہ سب کچھ اُتار کر رکھ دیا تھا۔ گھر کی بات تو گھر ہی میں رہتی تھی لیکن اب بیگم صاحبہ کی یہ سج دھج دُنیا کی نگاہوں میں آ گئی تھی۔ شجاع احمد صاحب نے ابھی بیگم صاحبہ کو نہیں دیکھا تھا۔ بہر طور زاہد اس وقت منظر عام پر آنے سے کترا رہا تھا۔ خاص طور پر وہ شجاع احمد صاحب کی نگاہوں سے بچنا چاہتا تھا۔

تھوڑی ہی دیر کے بعد وہ دادا جان کے پاس پہنچ گیا۔ دادا جان اس وقت حاجی نیاز سے محو گفتگو تھے۔ حاجی نیاز کے چہرے سے کسی خاص بات کا اظہار نہ ہوتا۔ دوسرے بہت سے سرمایہ دار بھی جو دادا جان کے اس مشن سے دلچسپی رکھتے تھے جو اُنھوں نے شروع کیا تھا دادا جان کے گرد جمع تھے اور فرسٹ ایڈ ہاؤس کے بارے میں ہی بات چیت چل رہی تھی۔ زاہد بھی اس گفتگو میں شریک ہو گیا۔ دادا جان کہہ رہے تھے۔

"بھئی ساری زندگی کمایا، وہاں بھی کمایا اور یہاں بھی اور اس کے بعد اپنا یہ مشن اپنے بیٹے کو سونپ کر ہم تو بس بڑھاپے کی دلچسپیوں میں مصروف ہو گئے۔ ذہن میں آنا کچھ نہیں تھا لیکن ایک ایسا بچہ ہاتھ لگ گیا جس نے عاقبت کی راہ دکھائی اور یہ فرسٹ ایڈ ہاؤس انسانی ہمدردی کے ساتھ ساتھ وہاں بھی کچھ کمانے کی کوششوں میں سے ایک ہے۔ بس میری تو دلی خواہش ہے کہ خداوند قدوس اس کی تعمیر جلد از جلد کرا دے۔ اور اس کے بعد میں ان تمام حاجت مندوں کو جو واقعی اس کے مستحق ہیں۔ اس فرسٹ ایڈ ہاؤس میں جگہ دے کر کچھ خدا کی نوازشیں بھی حاصل کر لوں"۔

"محترم حسام احمد صاحب، فرسٹ ایڈ ہاؤس کے اغراض و مقاصد میرے خیال میں ساری دُنیا میں سب سے انوکھے ہیں۔ ویسے تو بہت سے ملکوں کی حکومتیں ان بے روزگاروں کو اور پریشاں حالوں کو امداد دیتی ہیں جو اس کے مستحق ہوتے ہیں لیکن پرائیویٹ پیمانے پر ایسا کام کبھی نہیں ہوا۔ آپ کے مشن میں ایک نمایاں خوبی ہے وہ یہ کہ آپ ایسے نوجوانوں کو زندگی کے صحیح راستے پر لگانا چاہتے ہیں جن کے اندر صلاحیتیں تو ہیں لیکن حالات اُنھیں اس کا موقع نہیں دیتے۔ میرے خیال میں اس طرح ملک میں ہنر منعل کی سرپرستی کا ایک نیا دور شروع ہو گا اور در حقیقت فرسٹ ایڈ ہاؤس بہت سے ہنرمندوں کو سامنے لائے گا"۔

"بس یہاں جو رب العزت کی مرضی ہو گی وہی ہو گا۔ میں نے تو اپنا یہ مشن انجام دینے کے لئے جو کچھ وسائل تھے جھونک دیئے ہیں باقی ابھی میں محسوس کرتا ہوں کہ اس کے لئے بہت کچھ ... کی ضرورت ہو گی"۔

"ہم سب آپ کے اس مشن میں آپ کا ساتھ دینے کے لئے تیار ہیں"۔ ایک سرمایہ دار نے کہا۔

"خدا تمہیں اس کا اجر دے میاں، بکم از کم نیک کاموں سے ہمدردی تو رکھتے ہو"۔ زاہد یہاں ہونے والی گفتگو سے مطمئن ہو کر آگے بڑھ گیا۔ وہ سارے ماحول پر نگاہ رکھنا چاہتا تھا تاکہ کہیں بھی گڑبڑ ہو تو اُسے ... سنبھال لے۔

بالآخر تقریب کا آغاز ہو گیا۔ شجاع احمد صاحب کے دوستوں نے شجاع احمد صاحب کو مجبور کیا کہ وہ اپنے بیٹے کی اس کامیابی پر اظہار خیال کریں۔ ایک طرف باقاعدہ اسٹیج بنایا گیا تھا۔ شجاع احمد صاحب کو اُن کے دوستوں نے ڈائس پر چڑھا دیا۔ اور قہقہے رُک گئے لوگ شجاع احمد کی طرف متوجہ ہو گئے تھے۔ ایک اناؤنسر کو باقاعدہ اس تقریب کی ... اناؤنسمنٹ کے فرائض سونپے گئے تھے یہ اسٹیج کا آدمی تھا اچھی شخصیت کا مالک تھا اور اسے بھی زاہد نے ہی تربیت دی تھی۔ یعنی پروگرام کی وہ فہرست جس کا اُسے اناؤنسمنٹ کرنا تھا اس کے پاس موجود تھی شجاع احمد صاحب کی تقریر سرفہرست تھی چنانچہ اس نے اناؤنسمنٹ کرتے ہوئے

کہا کہ احمد رضا صاحب کے والد بزرگوار اور ملک کے ایک بڑے صنعت کار و تاجر جناب شجاع احمد صاحب اپنے بیٹے کی کامیابی کی خوشی میں اپنے خیالات کا اظہار کریں گے۔ لوگوں کی نگاہیں شجاع احمد صاحب پر جمی ہوئی تھیں۔ اور شجاع احمد صاحب کا چہرہ جوشِ جذبات سے سُرخ نظر آ رہا تھا۔

★★

کرم دین چھیمو کو لے کر اپنے اس چھوٹے سے مکان میں پہنچ گیا۔ ظفر اور شہر بانو اپنی سے پہلے بیٹھے ہوئے تھے۔ ماں بیٹوں کے درمیان گفتگو ہو رہی تھی۔ کرم دین نے راستے ہی میں چھیمو کو مختصراً یہ کہانی سُنادی تھی۔ شوخ و شنگ لڑکی جیسے حویلی سے چلے آنے کا افسوس ہُوا تھا۔ اس کہانی سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔ حویلی چھوڑنے کا افسوس اُسے صرف اس لئے ہُوا تھا کہ وہاں نزہت، صوفیہ اور نشاط اس کی سہیلیاں بن گئی تھیں۔ ... رفیق احمد صاحب کے بیٹوں کے سلسلے میں چھیمو نے جو کچھ کیا تھا اس نے لڑکیوں کے دل میں اس کی وقعت بڑھا دی تھی۔

ویسے چھیمو کو بھی اس کام میں بڑا لطف آیا تھا اور بعد میں ان واقعات کو یاد کر کے وہ سب خوب ہنستی رہتی تھیں۔ نشاط سے خاص طور سے چھیمو کو بڑا لگاؤ پیدا ہو گیا تھا۔ وہ سب سے زیادہ خوش مزاج اور سب سے اچھی انسان تھی۔ بہرطور یہ لوگ گھر میں داخل ہوئے اور کرم دین نے ظفر اور شہر بانو سے چھیمو کا تعارف کرایا پھر بولا۔

"اب یہ بچی تمھاری خدمت کرے گی شہر بانو۔ اسے اپنے بچوں کی طرح عزیز رکھنا اس کا بھی کوئی نہیں ہے، اس دُنیا میں۔ اور کرم دین تم لوگوں کے لئے کہیں نوکری کرے گا۔"

"نہیں بابا! میں آپ سے کہہ چکا ہوں کہ آپ کو اب اس کی ضرورت نہیں پیش آئے گی یہ کچھ رقم آپ سنبھال لیجئے فوری طور پر آپ لوگوں کی ضروریات کے لئے کافی ہوگی اس گھر کی مکمل نگرانی اب آپ کی ذمہ داری ہے میں اپنی ذمہ داریاں اپنی ماں کے لئے وقف کر چکا ہوں۔ اس نے زندگی میں ایک ہی کام سونپا ہے۔ مجھے وہ یہ کہ اس کے شاہ جی کو ایک بار اس کے قدموں پر جھکا دوں۔ خدا کرے وہ زندہ ہو تندرست ہو اور کسی ایسے المیے کا شکار نہ ہوا ہو جس کی وجہ سے مجھے اس پر ترس کھانا پڑے۔

میں چاہتا ہوں کرم دین بابا کہ بس کل جمال گڑھی روانہ ہو جاؤں اور وہاں جا کر اس شخص کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی کوشش کروں۔"

"بیٹے اتنی پرانی بات ہے اب تو ان جنگلوں میں نئے درخت پیدا ہو چکے ہوں گے۔ جہاں جنگلوں کی کٹائی ہوتی تھی۔ یہ درخت بھی جوان ہوں گے۔ اور کوئی نیا ٹھیکیدار ان کے ٹھیکے لے رہا ہوگا تمھیں یہ بات کیسے معلوم ہوگی کہ شاہ جی کون تھا اور کہاں چلا گیا؟"

"بابا! جذبے صادق ہوں تو انسان اپنی منزل پا ہی لیتا ہے۔ میں کوشش کروں گا کہ اس کا پتہ لگ جائے؟"

"جیسی تمھاری مرضی بیٹے! لیکن کرم دین کو اس کے اس چھوٹے سے کام کا اتنا بڑا صلہ نہ دو۔ میں اپنی بوڑھی ہڈیوں کو زنگ نہیں لگانا چاہتا اور پھر میرے اُوپر کچھ اور بھی ذمہ داریاں ہیں۔ یہ چھیمو جنگلی بیل کی طرح جوان ہوئی ہے کچھ دن نوکری کرنا چاہتا تھا۔ اس سے اس کے بعد سوچا تھا کہ اس کے پاس ہوگا کچھ میں اپنے پاس سے ملاؤں گا اور اس کے ہاتھ بھی پیلے کر دوں گا۔"

"بابا... بابا ب تو یہ میری بہن ہوئی نا پھر کیا ایک بھائی کو آپ اس کا موقعہ نہیں دیں گے؟"

"کیا، کیا کرو گے بیٹا! ابھی تو تم خود تعمیر منزل میں ہو کچھ بن جاؤ تو پھر میں ہاتھ پاؤں چھوڑ کر بیٹھ جاؤں گا؟"

"بس میں نے کہہ دیا نا آپ سے کرم دین بابا۔ اگر آپ میری بات نہیں مانیں گے تو میں اپنی ماں کو لے کر یہاں سے چلا جاؤں گا۔ آپ نوکری کریں گر میرے جانے کے بعد؟"

"بڑا ضدی بچہ ہے۔ اچھا بھئی جیسے تم کہو۔ ہم تو تسلیم کے بندے ہیں۔"

چھیمو نے باورچی خانہ سنبھال لیا تھا۔ شہر بانو کو اس نے کسی کام میں ہاتھ نہیں لگنے دیا تھا۔ پورے گھر کی از سرِ نو صفائی ہوئی اس کی شوخ و شنگ فطرت اور ہلکے ہلکے قہقہے اب بھی بکھر رہے تھے۔ تنہا ہی ہنسنے کی عادی تھی کوئی شریک ہو یا نہ ہو بات بات میں جیسے اسے گدگدی ہونے لگتی تھی۔ ظفر کو دیکھ کر ہی ہنسنے لگی اور ظفر بھی مسکرائے بغیر نہ رہ سکا۔

"ارے پاگل لڑکی۔ میں تجھ سے بے تکلف نہیں ہوں پھر کیوں مجھے دیکھ دیکھ کر ہنسے جا رہی ہے؟" ظفر نے کہا اور چھیمو ہنستے ہنستے بے قابو ہو گئی "کمال کی ہے بھئی" یہ تو یوں لگتا ہے جیسے ہوا اس کو گدگدی... کرتی ہے؟"

"بیٹے یہ عمر ہی ایسی ہوتی ہے مگر چھیمو اتنا ہنسنا اچھی بات نہیں ہے" بابا کرم دین نے کہا۔

"ارے ارے آپ کو ہم بہن بھائی کے معاملے میں مداخلت کرنے کے لئے کس نے کہا تھا دیکھ لو ماں یہ تمھارے بزرگ ہمارے معاملات میں دخل دے رہے ہیں" ظفر نے شکایت آمیز لہجے میں کہا اور شہر بانو بے اختیار مُسکرا پڑیں۔

"کیسا اچھا لگ رہا ہے بابا۔ کیسا اچھا لگ رہا ہے؟"

"اور تجھے بولتے ہوئے دیکھ کر تو مجھے یقین نہیں آتا کہ ان سوکھے دھانوں میں پھر سے ہریالی آگئی ہے؟"

"ہاں بابا... ان سوکھے دھانوں میں پھر سے ہریالی آگئی ہے۔ میرا ظفر جوان ہو کر آیا ہے۔ دیکھو، کیسا پیارا ہے یہ۔ کتنا خوبصورت ہے یہ۔ کتنا لمبا چوڑا۔ اتنا لمبا چوڑا تو اس کا باپ بھی نہیں تھا۔ یہ بابا۔ یہ...؟"

"خدا تجھے مبارک کرے بیٹی۔ ویسے خدا کی قدرت کا اس سے بڑا اظہار اور کیا ہوگا۔ وہ سب کے دن پھیرتا ہے سب کے۔"

ظفر جانے کے لئے تیار تھا۔ دوسرے دن کرم دین اور شہہ بانو نے اُسے لاتعداد دُعاؤں کے ساتھ رخصت کیا۔ جمال گڑھی جانے کے لئے ٹرین سے سفر کرنا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد ظفر اسٹیشن پہنچ گیا۔ اُس کے چہرے کی وہ شوخ مُسکراہٹیں اب غائب ہوگئی تھیں۔ اور ان کی جگہ... سنجیدگی نے لے لی تھی۔

ٹرین کے سفر کے دوران وہ کھڑکی سے باہر کے مناظر دیکھتا رہا۔ لہلہاتے ہوئے سرسبز کھیت، اُفق کی دُھندلاہٹوں میں پہاڑی ٹیلے، درخت اور ان درختوں میں ایسے کام کرتے ہوئے مزدور نظر آرہے تھے۔ جنگلوں کی کٹائی کرتے ہوئے ایک شخص گھوڑے پر سوار وجیہہ شخصیت کا مالک ان مزدوروں کے درمیان نظر آرہا تھا۔ بڑی مغرور اور فاتحانہ نگاہوں سے اُن غریب لوگوں کو دیکھ رہا تھا۔ جو اس کے سامنے ایک حقیر سی حیثیت رکھتے تھے۔ اس کے اشارے پر اس کے لئے دولت کے انبار لگنے والے پھر اس نے اپنی ماں کو ایک الہڑ اور نوخیز حسینہ کے رُوپ میں دیکھا۔ شرمائی لجائی نگاہوں سے وہ اس گھوڑے سوار کو دیکھ رہی تھی۔ اور پھر ایک چیخ، ایک دردناک چیخ اس کے پہلو سے خون اُبل رہا تھا۔ اور وہ زخمی لاوارث اس جنگل میں پڑی ہوئی تھی۔ ظفر کی آنکھوں میں خون بھر گیا۔ اس کے جبڑوں کی نسیں اُبھر آئیں اور اس کے حلق سے بھرائی ہوئی سی آواز نکلی۔

"شاہ جی تو میرا باپ ہے لیکن کسی بیٹے نے اپنے باپ سے اتنا خوفناک انتقام نہ لیا ہوگا۔ جتنا میں تجھ سے لوں گا۔ کاش، تو زندہ ہو۔ کاش، تو مجھے مل جائے۔"

"کیا مجھ سے کہا بیٹے؟" برابر بیٹھے ہوئے ایک بڑے میاں نے پوچھا۔ جن کے ساتھ ایک نوجوان لڑکی بیٹھی ہوئی تھی۔

"نہیں بابا... نہیں۔"

"کچھ کہہ تو رہے تھے۔" بوڑھے نے خوامخواہ اس سے گفتگو کرنے کی کوشش کی۔

"کچھ نہیں بابا۔ خود سے باتیں کر رہا تھا۔"

"اوہ، اچھا اچھا۔ کہاں جا رہے ہو بیٹا؟" بڑے میاں نے ہمسفر کی حیثیت سے بے تکلف ہونے کی کوشش شروع کردی۔ اُن کے ساتھ بیٹھی نوجوان دیہاتی سی لڑکی کاجل بھری آنکھوں سے ظفر کو دیکھ رہی تھی۔ اُس کے ہونٹوں پر ہلکی سی مُسکراہٹ تھی۔ ظفر نے جلدی سے اس پر سے نگاہ ہٹالی۔

"جمال گڑھی بابا۔"

"اچھا، اچھا۔ کوئی رشتہ دار ہے جمال گڑھی میں؟"

"جی ہاں، پورا کنبہ ہے وہاں۔"

"بڑی اچھی جگہ ہے۔ بڑی سرسبز اور خوبصورت، میری سالی رہتی تھی وہاں۔ پر بے چاری کو سانپ نے کاٹ لیا اور وہ ہلاک ہوگئی اس کا شوہر تیسرے مہینے ہی دوسری کر لایا اور جمال گڑھی سے چلا گیا۔ میں تو کئی سال پہلے جمال گڑھی گیا تھا۔ جب میری سالی زندہ تھی۔" بڑے میاں تفصیل بتاتے رہے اور اُن کے قریب بیٹھی نوجوان لڑکی مُسکراتی نگاہوں سے ظفر کو دیکھتی رہی۔ ظفر گہری سانس لے کر دوسری طرف متوجہ ہوگیا۔ باتیں بھی وہ بہت کم سن رہا تھا۔ ذہنی طور پر مصروف تھا۔ میاں سے یہ سوچ کر اس نے گفتگو کی تھی کہ ممکن ہے بارے میں کچھ اور جانتے ہوں لیکن جب سالی بھی مرگئی تو اسے کیا واسطہ، تھوڑی دیر تک تو بڑے میاں اسے بتاتے رہے پھر اس کی طرف سے کوئی جواب نہ پا کر خاموش ہوگئے۔ ظفر کھویا رہا تھا۔

سفر جاری رہا۔ ایک بار پھر اسے بڑے میاں سے مخاطب ہونا پڑا تھا۔

"آپ جا کہاں رہے ہیں؟" اس نے پوچھا اور اس کی نگاہیں یونہی لڑکی کی جانب اُٹھ گئیں۔ اب وہ ایک چادر اوڑھے دونوں پاؤں سیٹ پر سکوڑے بیٹھی ہوئی تھی لیکن اس کی آنکھوں میں اب بھی وہی مُسکراہٹ جاگ رہی تھی۔ پتہ نہیں کب سے وہ اسی طرح ظفر کو دیکھے جا رہی تھی۔ ظفر کو اُلجھن ہونے لگی۔

"احسان پور جا رہا ہوں میاں، وہیں رہتا ہوں۔" بڑے میاں نے جواب دیا۔

"یہ احسان پور جمال گڑھی سے پہلے پڑتا ہے یا بعد میں...؟"

"چار اسٹیشن بعد ہے۔ جمال گڑھی سے تو بڑا فاصلہ ہے۔" بڑے میاں نے جواب دیا۔

"آپ ایک زحمت کریں گے۔ جمال گڑھی آجائے تو مجھے بتادیں۔"

"ایں۔ کیا تم پہلی بار وہاں جا رہے ہو تم تو کہہ رہے تھے کہ تمہارا پورا کنبہ وہاں رہتا ہے۔"

"جی ہاں جی ہاں، میں بس باہر کے ملک گیا ہوا تھا۔ پڑھنے کے لئے، میرے ماں باپ شہر میں رہتے ہیں اور میرا باقی کنبہ وہیں جمال گڑھی میں ہے وہاں میں پہلی بار جا رہا ہوں۔"

"واہ، یہ تو بڑے مزے کی بات ہوگی پہچان لیں گے وہاں کے لوگ تمھیں......؟"

"نہیں، پہچانیں گے تو میں بتادوں گا اپنے بارے میں" ظفر کو اپنے اس جھوٹ پر اُلجھن ہونے لگی۔ بڑے میاں جھکی تھے۔ ایک مرتبہ سلسلہ گفتگو شروع ہوتا تو پھر ختم ہونے کا نام نہیں لیتا تھا۔ انھوں نے یہ وعدہ تو کر لیا تھا کہ جمال گڑھی کے بارے میں اُسے بتادیں گے لیکن اس کے بعد بہت ساری باتیں ظفر کو سنانا پڑیں۔ بڑی مشکل سے وہ ان سے پیچھا چھڑانے میں کامیاب ... بالآخر جمال گڑھی آگیا۔

بڑے میاں نے کافی دور پہلے اُسے بتادیا تھا کہ اب جو ٹرین رُکے گی۔ شام کے سائے زمین پر اُتر آئے تھے اطراف متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی ... ہوا تھا کہ وہاں نزہت ... ہا تھا۔ ٹرین پہاڑوں کے درمیان سفر کر رہی تھی۔ رفیق احمد صاحب کے بیٹوں ... ان میں درختوں کے جھنڈ کے جھنڈ نظر آرہے تھے۔ لڑکیوں کے دل میں اس کی ... شام کی کجلاہٹوں میں دھندلا گئے تھے لیکن ظفر کو ... واقعی خوبصورت اور رومینٹک قسم کا ہے۔ وہ ویسے چھیمو کو بھی ... واقعات کو یاد کرکے ... کے ساتھ جمال گڑھی کے اسٹیشن پر اُترنے کے طور سے ... ہوگیا۔ بڑے میاں نے اُسے بتایا تھا کہ ٹرین ایک منٹ سے ... وہاں نہیں رکتی۔ بس مسافر اُتارتی ہے اور آگے بڑھ جاتی ہے۔ چنانچہ وہ پورے طور پر تیار تھا۔ اس نے اپنے سامان کو پیروں کے نزدیک رکھ لیا۔ اور ایک بار پھر اس کی نگاہ لڑکی کی جانب اُٹھ گئی۔ اس کے ذہن کو جھٹکا سا لگا۔ لڑکی کی آنکھوں میں اب دُکھ کے ......

آثار تھے۔ وہ عجیب سی نگاہوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ ان میں بے چینی تھی کرب تھا۔

یہ کرب چند لمحات کے لئے ظفر کے ذہن پر چسپاں ہوگیا عجیب احمق لڑکی ہے۔ یہ سب کچھ کیوں؟ آخر کیوں؟ پھر اس نے اس کی عمر کے بارے میں سوچا۔

معصومیت کی عمر ہے خواہ مخواہ ہر ایک سے متاثر ہوجانے والی تھوڑی دیر تک یاد کرے گی۔ اور اس کے بعد بھول جائے گی لیکن اس کی آنکھیں ظفر کو اپنے ذہن میں چبھتی ہوئی محسوس ہوئی تھیں تھوڑی دیر کے بعد ٹرین رکنے کے بریکوں کی آوازیں سنائی دیں اور یہ شور بڑھتا گیا۔

جمال گڑھی کا اسٹیشن نزدیک آگیا تھا ظفر نے بڑے میاں سے ہاتھ ملایا ایک نگاہ لڑکی کی جانب دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کی نمی تھی پھر گردن جھٹک کر وہ کمپارٹمنٹ کے دروازے پر جا کھڑا ہوا۔ ٹرین رُک گئی جمال گڑھی کا اسٹیشن آگیا تھا۔ چند خوانچے والے خوانچہ لگائے طرح طرح کی آوازیں .. نکال رہے تھے۔

ظفر نیچے اُتر آیا۔ سرخ بجری کے پلیٹ فارم پر وہ آگے بڑھنے لگا۔

تھوڑے ہی فاصلے پر چائے کا ایک اسٹال لگا ہوا تھا اور دو آدمی وہاں کھڑے چائے پی رہے تھے۔ ظفر کے علاوہ جمال گڑھی کے اسٹیشن پر کوئی نہ اترا نہ ہی کوئی وہاں سے ٹرین میں سوار ہوا تھا۔ ظفر اپنا چھوٹا سا سوٹ کیس ہاتھ میں اُٹھائے تھوڑے فاصلے پر جا کھڑا ہوا۔

ٹرین نے پہلی وسل دی پھر دوسری اور اس کے بعد آگے بڑھ گئی۔ پلیٹ فارم کے کلاس کے دروازے پر کوئی ٹکٹ چیکر موجود نہیں تھا ظفر آہستہ آہستہ آگے بڑھتا ہوا گیٹ کے نزدیک پہنچ گیا اور پھر اطراف میں دیکھتا ہوا گیٹ سے باہر نکل آیا سامنے چھوٹا سا مسافر خانہ تھا جس میں کوئی مسافر نہیں تھا وہاں تھوڑے ہی فاصلے پر دو تین تانگے کھڑے ہوئے تھے۔ ظفر نے ایک گہری سانس لی۔ شام کے سناٹے گہرے ہوتے چلے جارہے تھے اور اس کے ساتھ ساتھ سردی بھی بڑھ رہی تھی۔ قیام کے لئے کسی مناسب جگہ کی تلاش ضروری تھی اور اس سلسلے میں تانگے والے ہی مدد کرسکتے تھے۔ ویسے اس قصبے یا شہر کے بارے میں ابھی وہ کوئی اندازہ نہیں لگا سکا تھا کہ کتنا بڑا ہے اور وہاں زندگی کے کیا کیا وسائل موجود ہیں۔

قیام گاہ کی تلاش کے لئے اس نے ایک تانگے والے ہی کو چنا اور اس کے نزدیک پہنچ گیا تانگے والے بیچارے چادریں اُوڑھے بیٹھے اُونگھ رہے تھے۔ انھیں شاذ و نادر ہی یہاں سواریاں ملتی ہوں گی۔ بہر طور کسی مسافر کو محسوس کرکے وہ جلدی جلدی اپنے تانگوں سے نیچے اُتر آئے۔

کہاں جاؤ گے بابوجی، کہاں جانا ہے۔ .... سب کی آوازیں اُبھریں اور ظفر کے نزدیک جو سب سے پہلا آدمی پہنچا ظفر نے اپنا سوٹ کیس اسی کو تھما دیا۔ اس نے دوسروں سے جان بچانے کے لئے جلدی سے اپنا رُخ موڑا اور سوٹ کیس اپنے تانگے میں رکھ لیا۔ یہ تو بعد میں بھی پوچھا جاسکتا تھا کہ سواری کو جانا کہاں ہے۔

ظفر اس کے تانگے میں بیٹھ گیا اور تانگے والے نے اپنے گھوڑے کو ایڑ لگائی۔ اور اس کا رُخ بدل دیا۔ دوسرے تانگے والے دیکھتے رہ گئے تھے۔ .... انھیں شاید افسوس ہو رہا تھا کہ ٹرین آنے کے وقت انھیں اونگھ کیوں آگئی تھی۔

تھوڑے فاصلے پر نکلنے کے بعد تانگے والے نے پھر یہی سوال دُہرایا۔

"کہاں جاؤ گے بابوجی؟"

"جمال گڑھی میں نیا آیا ہوں بھائی۔ ٹھہرنے کی کوئی جگہ بتاؤ یہاں کوئی ہوٹل وغیرہ ہے؟"

"ہوٹل کہاں بابوجی! یہاں ہوٹلوں کا کیا کام۔ ہوٹل تو بڑے شہروں میں ہوتے ہیں۔ یہاں تو سرائے ہیں۔ بانکے کی سرائے ہے۔ رحیمو نے بھی سرائے بنا رکھی ہے۔ کونسی سرائے میں لے جاؤں؟ تانگے

والے نے پوچھا۔"

"کونسی اچھی ہے؟"

"ٹھیک ہے بابوجی! میں آپ کو رحیموں کی سرائے میں لے چلتا ہوں۔ وہاں کا انتظام اچھا ہے۔" تانگے والے نے کہا اور ظفر نے گردن ہلا دی۔

رحیموں کی سرائے لکڑی کے بنے ہوئے بیرک نما مکان پر مشتمل تھی جس میں چھوٹی چھوٹی کوٹھریاں بنی ہوئی تھیں۔ اس لکڑی کے مکان کے سامنے کچی مٹی کا ایک احاطہ تھا۔ دروازے کو گولائی سے بنایا گیا تھا۔ دروازے سے تھوڑے ہی فاصلے پر رحیمو تندور پر بیٹھا روٹیاں لگا رہا تھا۔ یہی اس سرائے کا مالک تھا۔ ایک دو آدمی بیٹھے نظر آ رہے تھے۔ جو زمین پر بیٹھے چنگیری میں روٹیاں رکھے سالن سے کھا رہے تھے۔ رحیمو نے لوہے کے گز سے تندور کریدتے ہوئے ظفر کی طرف دیکھا۔ تانگے والا اس کے ساتھ ساتھ ہی اندر آ گیا تھا۔

"مسافر لایا ہوں رحیمو چاچا! شہر کا آدمی ہے ذرا آرام سے رکھو۔"

"ٹھیک ہے دے۔ بڑی مہربانی تیری۔ آؤ بابوجی ٹھہرو گے یہاں؟" رحیمو نے پوچھا۔

"ہاں...!"

"ارے او چھیتن۔" رحیمو نے ایک طرف رخ کر کے آواز لگائی اور چھیتن اس کے قریب پہنچ گیا۔ شکل ہی سے چھیتن نظر آتا تھا۔ لمبا کرتا پاجامہ پہنے ہوئے اس پر ایک پرانی سی واسکٹ، بالوں میں تیل چپڑا ہوا اور انہیں بڑے اسٹائل سے ماتھے پر جمایا ہوا تھا۔ جوان العمر تھا۔ لیکن گال پچکے ہوئے تھے اور ان پر چہرے پر چیچک کے ہلکے ہلکے نشانات نظر آ رہے تھے۔ شکل و صورت سے بڑی دلچسپ چیز نظر آ رہا تھا۔ وہ نزدیک پہنچ گیا۔

"بابو صاحب کو چھ نمبر میں لے جاؤ، چھ نمبر صاف ستھرا ہے نا؟"

"ہاں رحیمو چاچا... آؤ بابو۔" اس نے آگے بڑھ کر ظفر کا سوٹ کیس اٹھا لیا اور احاطے سے اندرونی حصے کی جانب چل پڑا۔

چھ نمبر بیرک کے دروازے سے اندر گھستے ہی بائیں سمت واقع تھی۔ واقعی یہ جگہ صاف ستھری تھی۔ قرینے سے بستر لگا ہوا تھا۔ بستر پر پائنتی لحاف رکھا ہوا تھا۔ ایک طرف ایک مٹکا رکھا ہوا تھا جس پر صاف ستھرا گلاس رکھا تھا۔ بس یہی اس کمرے کی کل کائنات تھی۔

چھیتن نے سوٹ کیس ایک کونے میں رکھ دیا اور مسکراتی نگاہوں سے ظفر کو دیکھنے لگا۔

"ہیرو معلوم ہوتے ہو بابوجی! بالکل ہیرو۔ کہاں سے آئے ہو۔" ظفر نے اسے جواب دیئے بغیر جیب سے پانچ روپے کا نوٹ نکالا اور چھیتن کی طرف بڑھا دیا۔

"کیا منگانا ہے بابوجی؟"

"کچھ نہیں، کچھ نہیں۔ یہ تم رکھ لو۔"

"م میں...؟" چھیتن کا منہ ستادن بن گیا۔

"ہاں تم...! کیوں حیرت، کیوں ہوئی تمہیں؟"

"نہیں بابوجی نہیں، شکریہ سلام، سلام ویسے آپ نے بتایا نہیں کہاں سے آئے ہیں...؟ کسی فلم کمپنی میں کام کرتے ہیں؟"

"نہیں بھئی، کسی فلم کمپنی میں کام نہیں کرتا۔ بس یہاں ان پہاڑوں کی سیر کرنے آیا ہوں۔"

"سمجھ گیا ہے ہے... سمجھ گیا میں، سمجھ گیا۔" چھیتن عجیب سے انداز میں ہنستا ہوا بولا۔

"کیا سمجھ گئے؟" ظفر نے تعجب سے اسے دیکھتے ہوئے پوچھا۔"

"بس سمجھ گیا بابوجی! بتاؤں گا نہیں۔" وہ ہنستا ہوا باہر نکل گیا۔ ظفر گہری سانس لے کر پلنگ پر بیٹھ گیا تھا۔

جوتے اور موزے اتار کر وہ پلنگ پر دراز ہو گیا۔ اور گہری گہری سانسیں لینے لگا۔ رحیمو نے یہ بھی نہیں پوچھا تھا کہ وہ یہاں کتنے دن قیام کرے گا نا ہی یہ بتایا تھا کہ قیام کے اخراجات کیا ہوں گے۔

بہرطور ان ساری باتوں کی ظفر کو پرواہ نہیں تھی۔ رات ہو گئی۔ چھیتن اس کے لئے کھانا لے کر آ گیا۔ کھانا ٹرے میں سجا ہوا تھا۔ درمیانے قسم کا کھانا تھا۔ بس سالن اور روٹی، ساتھ میں ایک پلیٹ میں کٹی پیاز، پودینہ اور ٹماٹر رکھے تھے۔

"یہ تمہارا رحیمو چاچا کسی مسافر سے پیسے ویسے نہیں لیتا؟"

"میاں آدمی ہے اچھا۔ جس نے جو دیا وہ لے لیا۔ کبھی وہ اپنے کسی مسافر سے جھگڑا نہیں کرتا۔ ویسے اس کھولی کا کرایہ ایک روپیہ روز ہوتا ہے۔ کھانے کے پیسے الگ۔" چھیتن نے جواب دیا۔ اور ظفر گہری سانس لے کر رہ گیا۔

جو کچھ اس کے سامنے آیا۔ اس نے خدا کا شکر ادا کر کے کھایا۔ چھیتن اس کے قریب ہی رہا تھا۔ پانچ روپے کا نوٹ شاید اس کے لئے بہت زیادہ تھا۔ ویسے بھی کھولی کا پانچ دن کا کرایہ بنتا تھا۔

"تم پڑھے لکھے آدمی معلوم ہوتے ہو چھیتن؟" ظفر نے کھانے کے دوران کہا۔

"جی ہاں صاب۔ پورے تین سپارے پڑھے تھے۔ میں نے مسجد کے مولوی صاب سے، اور اس کے بعد دو قاعدے، اپنا نام بھی لکھ لیتا ہوں۔ اور انگوٹھا لگانے کی بجائے دستخط کرتا ہوں، بس مار کھا گیا صاحب اپنی غریبی سے۔ ورنہ سوچا تو یہ تھا کہ شہر جا کر خوب پڑھوں گا

اور ہیرسٹر بنوں گا۔" چھتن نے جواب دیا۔

"چلو کوئی ہرج نہیں ہے۔ یہ نوکری بھی کیا بُری ہے؟"

"ہاں صاب بُری نہیں ہے۔"

"کیا ملتا ہے تمہیں یہاں سے؟" ظفر نے پُوچھا۔

"ایک رُوپیہ روز، اور چھٹی والے دن دو روپے۔" چھتن نے جواب دیا۔

"ہُوں، تمھارا گھر بھی ہوگا یہیں کہیں؟"

"جی ہاں صاب کیوں نہیں۔ اپنے دادا کے ساتھ رہتا ہُوں باپ مر چکے ہیں۔ ماں موجود ہے۔"

"اچھا اچھا، ویسے چھتن! جمال گڑھی کی آبادی کتنی ہوگی؟"

"صحیح پتہ تو نہیں ہے صاب! بہت سے گھر ہیں ہم نے کبھی اس کا اندازہ نہیں لگایا۔"

"تم سب ایک دوسرے کو جانتے ہوگے، ظاہر ہے اس چھوٹی سی آبادی میں کون کسی سے چھپتا ہے۔"

"جی ہاں صاب! ہم سب ایک دوسرے کو جانتے ہیں۔ بڑی محبت سے رہتے ہیں۔ جمال گڑھی میں کبھی آپس میں کوئی جھگڑا نہیں ہُوا کسی میں۔"

"یہ تو بڑی اچھی بات ہے۔ کیا تمھارے اور بہن بھائی ہیں؟" ظفر نے پُوچھا۔

"نہیں صاب! میں نے کہا نا بس دادا جی ہیں ماں ہیں اور میں ہوں۔ میں جو کچھ کماتا ہوں وہ کافی ہوتا ہے۔ دادا جی کی تھوڑی سی زمین ہے۔ وہ اسی کام کرتے ہیں۔ اس پر زمین سے جو آمدنی ہوتی ہے وہ بھی دادا جی ہم ہی لوگوں پر خرچ کرتے ہیں۔ ویسے صاب آپ شکل سے بالکل ہیرو لگتے ہیں۔ ایک فلم کمپنی یہاں آئی تھی فلم بنانے کے لئے۔ مجھے دیکھا چانس بھی دیا۔ مگر صاحب جو فلم انھوں نے بنائی تھی۔ وہ میں نے کبھی نہیں دیکھی۔ یہاں کوئی سینما ہی نہیں ہے۔ کبھی سال دو سال میں کوئی چھٹی ملتی ہے تو میں دھان پور چلا جاتا ہوں۔ دھان پور میں دو سینما گھر ہیں لیکن وہ فلم آج تک نہیں لگی جس میں اپنا بھی کام تھا۔"

"اچھا تو تم نے بھی فلم میں کام کیا ہے؟"

"ہاں صاحب! ریل کی پٹری کے پاس ہیروئن پٹری سے بندھا ہُوا پڑا تھا۔ ہم دور سے دوڑتے ہوئے آئے۔ ریل آ رہی تھی ہم نے ہیرو کو کھولا اور اس کی جان بچائی۔ ہیرو نے ہمیں گلے سے لگایا۔ وہ کیا نام تھا اس کا؟ اوہ... ہمیں یاد نہیں آرہا پر صاحب بہت شاندار جوان تھا۔ ڈائریکٹر نے ہمیں دیکھا اور بولا کہ وہ ہمیں فلم میں چانس دے گا۔ صاحب بڑی... خدمت کی ہم نے اُن کی۔ ڈائریکٹر ہم سے وعدہ کر کے گیا کہ وہ ہمیں شہر بلا لے گا۔ اور ہمیں اپنی اگلی فلم میں ہیرو کا چانس دے گا۔ بس تبھی سے ہم آج تک بنے ٹھنے رہتے ہیں کہ پتہ نہیں کس وقت ڈائریکٹر آ جائے اور ہمیں شہر لے جائے۔ تیار رہتے ہیں۔ مگر وہ ابھی تک نہیں آیا۔ حالانکہ اس بات کو گزرے ہوئے پُورے دو سال ہو چکے ہیں۔ پُورے دو سال۔"

ظفر ٹھنڈی سانس لے کر رہ گیا۔ بے اختیار اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی تھی۔ یہ چھوکرا بھی ہیرو بننا چاہتا تھا۔ بہرحال کوئی بات انسان کو اس کی خوش فہمیاں ہی زندہ رکھتی ہیں۔ اگر وہ اپنے بارے میں ان خوش فہمیوں کا شکار نہ ہو تو موت کی آغوش میں نہ جا سوئے۔

رات کو رحیمو چاچا آیا۔ انگوچھے سے ہاتھ پونچھتے ہوئے اس نے اندر آ کر سلام کیا اور مسکراتے ہوئے کہنے لگا۔

"کوئی تکلیف ہو بابوجی تو بتا دینا۔ رحیمو چاچا کی سرائے ہے سب مجھے چاچا کہتے ہیں اور میں بھی بس بابوجی زندگی گزارنے کے لئے یہ چکر چلائے ہوئے ہوں۔ لوگوں کی خدمت کر لیتا ہوں۔ دل کو خوشی مل جاتی ہے۔ کوئی بھی تکلیف مت اُٹھانا کتنے دن یہاں رہو گے؟"

"کہہ نہیں سکتا رحیمو چاچا! ممکن ہے دو چار دن ممکن ہے دس پندرہ دن۔ ممکن ہے ایک دو ماہ۔" ظفر نے جواب دیا۔

"جب تک دل چاہے رہو بابوجی! ویسے کھولی کا کرایہ ایک روپیہ ہے اور ایک روپیہ کھانے کا۔ دن میں تین دفعہ کھاؤ گے تین روپے ہو جائیں گے۔ جس چیز کی کمی ہو یا ضرورت ہو بتا دینا۔ پیسوں کی پرواہ نہیں ہے۔ جو دل چاہے دے دینا۔"

"نہیں رحیمو چاچا تم نے بہت مناسب پیسے رکھے ہیں یہ لو یہ پچاس روپے کا نوٹ رکھ لو۔ جب اس کا حساب پُورا ہو جائے تو مجھ سے اور مانگ لینا تکلف مت کرنا۔"

"جو حکم بابوجی۔" رحیمو چاچا نے پچاس روپے کا نوٹ لے کر رکھ لیا۔ پھر وہ دو چار باتیں کرتا رہا۔ اس کے بعد چلا گیا۔

رات کو بہت دیر تک نیند نہیں آئی تھی لیکن اس کے بعد وہ سو گیا۔ صبح کو اُٹھا مُنہ ہاتھ دھویا، ناشتہ کیا۔ جس میں چائے، دو انڈے اور ایک پراٹھا تھا۔ اچھا ناشتہ تھا۔ ظفر اس سے زیادہ ناشتہ کرتا بھی نہیں تھا۔

ناشتے سے فارغ ہونے کے بعد وہ تیار ہوا اور باہر نکل گیا۔ جمال گڑھی اس کی نگاہوں کے سامنے تھا۔ وہ اس کے اطراف میں گھومتا رہا۔ بہت زیادہ بڑی جگہ نہیں تھی۔ بس ایک چھوٹا سا پہاڑی قصبہ کہا جا سکتا تھا اسے۔ دو بازار تھے۔ جن میں ضروریات کی دُکانیں سجی ہوئی تھیں۔ چھوٹے چھوٹے کچے پکے مکانات تھے۔ جن میں کچھ لکڑی کے

بنے ہوئے تھے۔ کچھ گھاس پھونس کے اور کچھ کچی مٹی کے۔

ظفر عجیب سی نگاہوں سے ان مکانوں کو' ان بازاروں کو اور ان گلیوں کو دیکھتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔ بہت سی یادیں تھیں۔ بہت سی باتیں تھیں جو اس کے ذہن میں آرہی تھیں۔ بہت سی پرچھائیاں تھیں۔

ان ہی میں سے کوئی مکان گل زماں خان کا ہوگا۔ ان ہی میں سے کسی مکان میں اس کی ماں نے جنم لیا ہوگا۔ شہ بانو نے' وہاں وہ کھیلی ہوگی۔ انہی گلیوں بازاروں میں اس نے پرورش پائی ہوگی۔

ماں... شہ بانو ایک قابل احترام ماں۔ ایک عظیم شخصیت' ایک بہت ہی پیاری ہستی جس نے اپنی پوری زندگی دکھوں میں گزار دی ہے۔ جس نے اپنی زندگی میں صرف ایک خوشی دیکھی ہے۔ ظفر اس کا بیٹا۔

ظفر کے دل میں ماں کے لئے عجیب سی محبت ابھر آئی اس عورت کے لئے ساری زندگی تج جا سکتی ہے۔ اس عورت کی خوشیاں حاصل کرنے کے لئے اپنے آپ کو قربان کیا جاسکتا ہے۔

وہ گھومتا رہا۔ پھر ایک جگہ پرچون کی ایک دکان دیکھ کر رک گیا۔ ایک بوڑھا آدمی وہاں بیٹھا ہوا تھا۔ ظفر نے اس بوڑھے شخص کو سلام کیا۔ اور بوڑھے نے سلام کا جواب دے کر سوالیہ نگاہوں سے اسے دیکھا۔

"بابا' میں باہر سے آیا ہوں۔ ایک آدمی کے بارے میں معلوم کرنا چاہتا ہوں۔ آپ ہی کی طرح ایک بزرگ شخصیت یہاں رہتی ہیں۔ ان کا نام عبداللہ ہے۔ کیا آپ انہیں جانتے ہیں؟"

"عبداللہ...؟" بوڑھا دکاندار کچھ سوچنے لگا۔ پھر گردن ہلا کر کہنے لگا۔ "ہاں میں جانتا ہوں۔ عبداللہ چھوٹی بستی میں رہتا ہے تم چھوٹی بستی چلے جاؤ۔ وہاں پر کسی سے بھی عبداللہ کے بارے میں پوچھ لینا۔"

"چھوٹی بستی کس طرف ہے؟"

"بس یہاں سے سیدھے چلے جاؤ' پھر الٹے ہاتھ پر ایک کچی سی پگڈنڈی جاتی ہے۔ اس پر چلے جانا۔ وہ چھوٹی بستی پر ہی ختم ہوتی ہے۔"

"بہت بہت شکریہ بابا۔" ظفر نے کہا اور بوڑھے کے بتائے ہوئے راستے پر چل پڑا۔

چھوٹی بستی پہنچا۔ وہاں پہنچ کر اس نے عبداللہ کے بارے میں معلوم کیا۔ ایک شخص نے اسے ایک مکان کے دروازے پر لا کھڑا کیا۔

چھوٹا سا بوسیدہ سا مکان تھا۔ وہ مکان کے دروازے پر پہنچ کر رکا پھر اس نے آہستہ سے دروازے پر دستک دی۔ چھوٹی سی آٹھ نو سال کی لڑکی باہر نکل آئی تھی۔ ظفر نے اس سے عبداللہ کے بارے میں پوچھا اور اندر سے ایک آدمی اس کے نزدیک آگیا۔ ادھیڑ عمر کا آدمی تھا۔ عجیب سا جاہل سا' وہ ظفر کے قریب آکر اکھڑ لہجے میں بولا۔

"کس سے ملنا ہے بابوجی؟" اس نے پوچھا۔

"عبداللہ سے۔"

"میں عبداللہ ہوں' کہو کیا بات ہے؟"

"اوہ... تم عبداللہ ہو" ظفر نے سر سے پاؤں تک اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

"آؤ بابوجی اندر آجاؤ۔" ادھیڑ عمر آدمی اسے صحن میں لے آیا۔ جہاں ایک چارپائی بچھی ہوئی تھی۔ اندر کچھ عورتیں بھی تھیں۔ جو ظفر کو دیکھ کر اندر کمرے میں چلی گئی تھیں۔

"کہو بابوجی! کیا کام ہے مجھ سے؟"

"عبداللہ میں... میں تم سے ایک بہت پرانی بات معلوم کرنا چاہتا ہوں۔ بہت ہی پرانی' میرا خیال ہے اس بات کو بیس پچیس سال کا عرصہ گزر چکا ہے۔"

"بیس پچیس سال پہلے تو ہم اس بستی میں تھے نہیں بابوجی! ہم سے کونسی بات معلوم کرنا چاہتے ہو؟"

"بیس ۲۰ پچیس ۲۵ سال پہلے تم اس بستی میں نہیں تھے؟" ظفر نے تعجب سے پوچھا۔

"نہیں بابوجی۔"

"تو پھر تم کہاں رہتے تھے؟"

"ہم دھان پور رہتے تھے جی۔ وہیں ہمارا کام دھندہ تھا۔ ہمیں اس بستی میں آئے ہوئے آٹھ نو سال سے زیادہ نہیں ہوئے۔"

"اوہ... تو اس کا مقصد ہے تم وہ نہیں ہو۔ یہاں اور بھی کوئی عبداللہ رہتا ہے؟ معاف کرنا میں غلط فہمی کی وجہ سے تمہارے... پاس آگیا۔"

"نہیں بابوجی' کوئی ہرج نہیں ہے۔ ویسے عبداللہ نام کا تو کوئی اور یہاں نہیں رہتا۔ پر کتنی عمر ہے اس کی؟"

"آپ سے بھی زیادہ بزرگ ہو سکتے ہیں وہ۔"

"تو پھر ہم نہیں جانتے انہیں' ایک اور لڑکا ہے طوائیل کا..... اس کا نام بھی عبداللہ ہے اور ایک اور لڑکا ہے جس کا نام عبداللہ ہے۔ پر وہ جوان ہے اور دکان کرتا ہے۔ ان کے علاوہ تو کوئی اور عبداللہ نہیں ہے یہاں۔"

"اوہ..." ظفر نے مایوسی سے ہونٹ سکوڑے' پھر گہری سانس لے کر بولا۔ "تمہیں میں نے تکلیف دی اس کی معافی چاہتا ہوں۔ مگر تمہیں یقین ہے کہ یہاں کوئی بزرگ عبداللہ نہیں ہے؟"

"ہاں بابو... اور اگر ہیں تو ہم نہیں جانتے۔" ظفر وہاں سے نکل

آیا۔ تین چار جگہ اور اس نے عبداللہ کے بارے میں پوچھا۔ لیکن کوئی پتہ نہیں چل سکا۔ تب شام کو وہ مایوس سا سرائے میں واپس آگیا۔ اس صورت حال کا اُسے اندازہ نہیں تھا۔

ویسے یہ بات یقینی طور پر نہیں کہی جاسکتی تھی کہ بوڑھا عبداللہ زندہ بھی ہے یا مر گیا یا یہاں سے کہیں چلا گیا۔ کوئی حال کی بات تو تھی نہیں۔ اس طرح وہ کیسے اس سلسلے میں معلوم کر سکے گا۔

سرائے میں واپس آکر وہ کافی دیر تک غور و خوض کرتا رہا۔ چھیمن اس کے پاس آگیا تھا۔

"کہاں گھومتے رہے بابوجی؟"

"بس چھیمن تمہاری بستی دیکھ رہا تھا۔"

"کیسی لگی؟"

"بہت خوب صورت ہے۔ یہاں کی زندگی بڑی سادہ سی ہے۔ مجھے بہت پسند آئی۔ ویسے چھیمن یہاں جنگلوں کی کٹائی وغیرہ بھی ہوتی رہتی ہوگی؟"

"ہاں بابوجی...!"

"ٹھیکیدار بھی آتے ہوں گے۔ لوگوں کو کام بھی ملتا ہوگا؟"

"ہاں بابوجی آج کل بھی کٹائی کا کام ہو رہا ہے۔"

"کس طرف...؟"

"پچھائی پلے میں۔"

"یہ کہاں ہے؟"

"یہ جنگل کا علاقہ ہے بابو صاب! بستی سے بالکل ملا ہوا ہے۔ وہاں آج کل ایک ٹھیکیدار کٹائی کرا رہا ہے۔"

"کیا نام ہے اس کا؟"

"ہمیں تو پتہ نہیں ہے بابو صاب! دوسرے لوگ جانتے ہوں گے۔"

"مجھے بھی ایک ایسے آدمی کی تلاش ہے چھیمن! وہ جنگل کی کٹائی کے ٹھیکیداروں کے ساتھ مل کر کام کرتا تھا۔ پچیس سال پہلے میرے باپ کی اس سے ملاقات ہوئی تھی۔ اور یہاں اس بستی میں آنے کا مقصد یہی ہے۔ میں اپنے اس بزرگ سے ملنا چاہتا تھا چھیمن۔"

"اچھا جی...! ویسے ہمارے دادا جی بھی ٹھیکیداروں کے ساتھ مل کر کام کرتے رہے ہیں۔ آپ اُن سے معلوم کریں۔ آپ کو پتہ چل جائے گا۔"

"اچھا... تمہارے دادا جی سے کب ملاقات ہو سکتی ہے؟"

"جب آپ چاہیں۔"

"کیا تم لوگ شروع سے اس بستی میں رہتے ہو؟"

"پشتوں سے جی! پشتوں سے۔"

"تب تو مجھے تمہارے دادا جی سے معلومات حاصل ہو سکتی ہیں۔ کب لے چلو گے مجھے اُن کے پاس؟"

"آج ہی چلیں ابھی چلیں۔ رحیمو چاچا سے کہہ دو وہ منع تھوڑی کریں گے۔"

"ویسے تم یہاں کب تک رہتے ہو؟"

"کوئی ٹھیک نہیں ہے جی! آٹھ، نو، دس بھی بج جاتے ہیں۔ بس جب کام ختم ہو جائے۔"

"اس وقت کوئی کام ہے تمہیں؟"

"نہیں بابوجی کوئی کام نہیں ہے۔ بس جانے ہی والا تھا۔ چلو رحیمو چاچا سے چھٹی لے لو۔ آؤ میرے ساتھ۔" اس نے کہا اور ظفر اس کے ساتھ چل پڑا۔

رحیمو چاچا نے انہیں بخوشی جانے کی اجازت دے دی تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد چھیمن اُسے اپنے مکان پر لے گیا۔ اس کے دادا سے ملاقات ہوئی۔ اچھے تن و توش کا چوڑے جبڑے والا آدمی تھا۔ اس نے دھندلائی ہوئی آنکھوں سے ظفر کو دیکھا۔ چھیمن اُسے ظفر کے بارے میں بتانے لگا۔

"کہو بابوجی! کیا پوچھنا ہے؟ اتنی پرانی بات کیسے یاد رہتی ہے۔"

"بابا! مجھے عبداللہ نامی ایک آدمی کا پتہ چاہیے جو بہت عرصہ پہلے جنگل کی کٹائی کے ٹھیکیداروں کے ساتھ مل کر کام کیا کرتا تھا۔ کیا آپ مجھے بتا سکتے ہیں کہ یہاں عبداللہ نامی کوئی آدمی تھا یا ہے؟" بوڑھے کی بجائے چھیمن جلدی سے بول اُٹھا۔

"ہمارے دادا جی بھی تو عبداللہ ہیں۔ بہت عرصے تک یہ جنگل کاٹنے والے ٹھیکیداروں کے ساتھ کام کرتے رہے ہیں۔ کیوں دادا جی میں غلط تو نہیں کہہ رہا؟"

ظفر کے بدن میں سرد لہریں دوڑ گئی تھیں۔ تو یہ تھا عبداللہ! شاہی کا دست راست! اس کی ماں کے قاتلوں میں سے ایک۔ وہ آنکھوں کے بدلتے ہوئے رنگ پر قابو پانے کی کوشش کرنے لگا۔ عبداللہ کو اپنے سامنے دیکھ کر اس کے ذہن میں آگ سی دہکنے لگی تھی۔

★★

"دوستوں میں اپنے اس جشن مسرت میں آپ تمام حضرات کی پرخلوص شرکت کا دلی شکر گزار ہوں۔ تمام والدین کی خواہش ہوتی ہے کہ ان کی اولادیں بہترین مستقبل حاصل کریں۔ اس سلسلے میں ان کی کوششیں بھی شامل ہوتی ہیں۔ مجھے مسرت ہے کہ میرا سب سے بڑا بیٹا آج ڈاکٹر بن چکا ہے۔ میں نے اس کے لئے ایک شاندار کلینک بنوانے کا فیصلہ کیا ہے۔ جگہ کا انتخاب کر لیا گیا ہے اور بہت جلد اس کلینک کی تعمیر شروع ہو جائے گی۔ میں اپنے ملک میں بین الاقوامی طرز کا کلینک تعمیر کراؤں گا جس

میں جدید ترین علاج کی تمام سہولتیں مہیا ہوں گی۔ یہ کلینک میرے بیٹے احمد رضا کے لئے میری طرف سے تحفہ ہے اور میں اس جشن مسرت میں اس کے کاغذات احمد رضا کو پیش کرتا ہوں!"

چاروں طرف سے اس چھوٹی سی تقریر کا خیر مقدم کیا گیا۔ احمد رضا آئے اور شجاع احمد صاحب نے کلینک کی زمین کے کاغذات انھیں پیش کر دیئے۔ اسی وقت اناؤنسر کی آواز ابھری۔

"احمد رضا صاحب اپنے والد کے اس تحفے اور اپنے آئندہ اقدامات کے بارے میں آپ لوگوں کو اپنے خیالات سے آگاہ کریں گے ... احمد رضا صاحب!"

خوش شکل اور خوش لباس احمد رضا اپنے باپ کے نزدیک پہنچ کر کھڑا ہو گیا۔ شجاع احمد صاحب ڈائس سے نیچے اُتر آئے تھے۔ وہ مہمانوں میں شامل ہو گئے اور احمد رضا ڈائس پر پہنچ گیا پھر اس نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔

"حضرات بلاشبہ میرے والد شجاع احمد صاحب ایک مشفق اور مہربان باپ ہیں۔ ہمیں جس طرح پرورش کیا گیا اور پروان چڑھایا گیا وہ ایک مثالی حیثیت رکھتا ہے۔ میں اس تحفے کا دلی شکریہ ادا کرتا ہوں۔ جیسا کہ میرے والد صاحب نے فرمایا کہ ایک جدید ترین ہسپتال تعمیر کر رہے ہیں۔ جہاں جدید علاج معالجے کا معقول بندوبست ہوگا۔ اس میں میرے بہت سے ساتھی ڈاکٹر اپنی مہارت کا مظاہرہ کر سکیں گے۔ اور ہم بڑی محنت اور جانفشانی کے ساتھ غریب اور بے یار و مددگار انسانوں کی خدمت کر سکیں گے۔

میں اپنی جانب سے یہ اعلان کرتا ہوں کہ اس عظیم الشان ہسپتال کا نقطہ نگاہ قطعی کاروباری نہیں ہوگا۔ اس میں ایک ہزار بستر غریب اور نادار لوگوں کے لئے مخصوص ہوں گے۔ جو علاج معالجے کی سہولتیں نہیں رکھتے۔ اور مہلک بیماریوں کا شکار ہونے کے باوجود اسپتالوں کے اخراجات کا بوجھ سنبھالنے کے متحمل نہیں ہو سکتے۔

میرا کلینک اِن مظلوم انسانوں کے لئے ہوگا اور وہاں انھیں علاج معالجے کی ہر وہ جدید ترین سہولت مہیا کی جائے گی جو اونچے اور امیر لوگ دولت کے بل بوتے پر باآسانی حاصل کر سکتے ہیں۔"

احمد رضا کی نگاہیں سب سے پیچھے ایک کرسی پر کھڑے ہوئے ناہید پر جمی ہوئی تھیں۔ اس نے شجاع احمد صاحب کی شکل نہیں دیکھی تھی۔ جن کا چہرہ لال بھبوکا ہو گیا تھا اور وہ اپنی کرسی پر بے چینی سے پہلو بدل رہے تھے۔ احمد رضا کی یہ بکواس ان کی سمجھ سے باہر تھی۔ بھلا اتنی دولت صرف کر کے جو کلینک تعمیر کیا جائے گا۔ اس میں یہ غریب اور نادار لوگ گھسیں گے، بستروں کو گندہ کریں گے اور پھر اُن کے اخراجات، علاج و معالجے کے لئے دوائیں، یہ کہاں سے پوری ہوں گی۔ وہ سوچ رہے تھے۔ اُن کی آنکھوں میں جنون کے آثار نظر آ رہے تھے۔ ان سب کو کیا ہو گیا ہے۔ دماغ ہی خراب ہو کر رہ گیا ہے۔ والد صاحب ہی کیا کم تھے۔ انھوں نے ایک بہت بڑا منصوبہ فرسٹ ایڈ ہاؤس کے نام سے پیش کر دیا۔ اور اب یہ صاحبزادے بھی چلے ہیں غریبوں کی ہمدردی کرنے کے لئے ہسپتال میں لاکھوں روپیہ لگایا جائے گا۔ لاکھوں روپے کی مشینیں بیرونی ممالک سے درآمد کی جائیں گی۔ کیا صرف اسی لئے کہ وہ گھٹیا قسم کے انسانوں کے علاج و معالجہ کے کام آئیں۔ ان مشینوں اور اس کلینک سے تو وہ... کروڑوں روپیہ بٹورنا چاہتے تھے۔ اپنی اس دولت میں بے پناہ اضافہ کرنا چاہتے تھے۔ اس کلینک کو تو وہ اس ملک کا مہنگا ترین کلینک بنانا چاہتے تھے اور اس میں اعلیٰ پائے کے ڈاکٹروں کا اپائنٹ منٹ کر کے ان کی صلاحیتوں کا فائدہ اُٹھانا چاہتے تھے۔ یہ احمد رضا کیا بکواس کر رہا ہے۔

احمد رضا اُن کے خیالات سے بے پرواہ ہو کر غریبوں کی مشکلات کا تذکرہ کر رہا تھا۔ اور چاروں طرف سے تالیاں بج رہی تھیں۔ فوٹو گرافر کھٹا کھٹ تصویریں کھینچ رہے تھے۔ اخباری رپورٹرز اس کی اس تقریر کو نوٹ کر رہے تھے اور شجاع احمد صاحب کی بُری حالت تھی۔ لیکن صورت حال ایسی تھی کہ وہ اپنے جذبات کا اظہار نہیں کر سکتے تھے۔

بہر طور احمد رضا کی تقریر ختم ہو گئی۔ وہ لرز رہا تھا۔ کانپ رہا تھا۔ شجاع احمد صاحب اس کے بالکل سامنے بیٹھے ہوئے تھے لیکن اس نے ایک بار بھی اُن کی طرف نہیں دیکھا اور اسٹیج سے اُتر کر اپنے ان دوستوں میں جا شامل ہوا جو نیچے اُترتے ہی اس کے گلے میں ہار ڈال رہے تھے اور اُسے مبارکباد دے رہے تھے۔

پھر اناؤنسر نے بیگم شجاع احمد سے درخواست کی کہ وہ اپنے بیٹے کے لئے کچھ کہیں۔ بیگم شجاع احمد اس پر تیار نہیں تھیں۔ بمشکل تمام وہ انھیں شجاع احمد صاحب کی نظریں انھیں تلاش کر رہی تھیں۔ وہ کڑی نظروں سے انھیں گھورنا چاہتے تھے۔ انھیں بتانا چاہتے تھے کہ دیکھو اس احمق لڑکے نے کیا بکواس کی ہے۔

بمشکل تمام بیگم صاحبہ اسٹیج پر چلنے کے لئے آمادہ ہوئیں۔ شجاع احمد صاحب نے انھیں دیکھا۔ اور ان کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

ایک بار پھر ان پر بدحواسی کا حملہ ہوا تھا۔ یہ بیگم شجاع احمد تھیں۔ یہ... اُن کا سر چکرا کر رہ گیا تھا۔ وہ تین عورتیں بیگم شجاع احمد کو گھسیٹتی ہوئی ڈائس پر لے گئیں۔ وہ ہنستی مسکراتی ڈائس کے سامنے آئیں اور بولیں۔

"میں نے کبھی تقریر نہیں کی۔ لیکن میں بہت خوش ہوں میرا بیٹا ڈاکٹر بن گیا ہے۔ یہ سب ان کا کمال ہے۔" انھوں نے شرماتے ہوئے شجاع احمد صاحب کی طرف اشارہ کیا اور شجاع احمد صاحب نے زور سے آنکھیں بھینچ

ہیں۔ لوگوں نے قہقہے لگائے تھے۔ تالیاں اُبھری تھیں اور بیگم صاحبان بڑی بالیوں کی گونج میں دالانوں سے اُتر کر نیچے آئیں اور شجاع احمد صاحب کے نزدیک جا بیٹھیں۔

بڑی وابستگی کا اظہار کر رہی تھیں وہ لیکن شجاع احمد صاحب کے تن بدن میں آگ لگی ہوئی تھی۔ اُنھوں نے اِدھر اُدھر دیکھا لیکن بالکل موقع نہیں تھا کہ بیگم سے اُن کے اس بدلے ہوئے حُلیے کے بارے میں سوال کرتے اس لئے خون کے گھونٹ پی کر رہ گئے۔ لیکن وہ زیادہ دیر اُن کے پاس نہیں بیٹھ سکے تھے۔ بہت سی تمسخرانہ نگاہیں اُنھیں اپنی جانب اُٹھی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔ وہ اپنی جگہ سے اُٹھے اور ایک طرف چل پڑے اُسی وقت سیٹھ غلام الٰہی اُن کے قریب پہنچ گئے۔ اور بولے۔

"واہ بھئی شجاع احمد کیا گھرانہ پایا ہے۔ واقعی قابلِ فخر گھرانہ ہے۔ تمہارا اور یہ بچہ اس کے خیالات تو بڑے عجیب نکلے بھئی۔ تم سے بالکل مختلف۔ کیا یہ تمہارا ہی بیٹا ہے یقین نہیں آتا کہ ایک اتنے بڑے کاروباری اور ذہین آدمی کا بیٹا ایسی باتیں کرے۔ بھئی غریبوں کے علاج معالجے کے لئے تو گورنمنٹ نے ہی بہت سے اسپتال کھول رکھے ہیں۔ اتنا قیمتی اسپتال ان غریبوں کے لئے کھولا جائے گا۔ بہرصورت دولت مند ہو بھئی۔ جس طرح چاہو خرچ کرو۔ ویسے تم نے اپنے خاندان کی جون ہی بدل ڈالی مجھے یاد ہے بہت کچھ یاد ہے۔ بڑے قدامت پرست ہوتے تھے تم لوگ تو... سُنا تو یہ گیا تھا کہ تمہارے ہاں پردے کا شدید رواج تھا۔ لیکن آج تمہاری بیگم کو بھی دیکھا۔ بھئی واہ ماشاء اللہ اس عمر میں بھی اتنے بڑے بڑے بچوں کی ماں ہونے کے باوجود نوجوان لگ رہی تھیں۔ سبحان اللہ سبحان اللہ" سیٹھ غلام الٰہی سپاٹ لہجے میں بول رہے تھے۔ لیکن شجاع احمد صاحب کے دِل میں برچھیاں اُتر رہی تھیں۔ اُنھیں یہی محسوس ہو رہا تھا جیسے سب اُن کا مذاق اُڑا رہے ہوں۔ وہ سیٹھ صاحب کی باتوں کو پی گئے اور کچھ اور لوگوں سے باتیں کرنے لگے۔

اناؤنسر نے اب ہارون کا نام لیا تھا۔ وہ بُری طرح چونکے اور پلٹ کر ڈائس کی طرف دیکھنے لگے۔ یہ ہارون اب کیا کہنا چاہتا ہے؟ کیا کرنا چاہتا ہے۔ اُنھوں نے سوچا اور دوسرے لمحے اُنھوں نے محسوس کیا۔ جیسے اُن کے تابوت میں آخری کیل ٹھک گئی ہو۔

ہارون ایک گٹار لئے ہوئے اسٹیج پر آ گیا تھا۔ عمدہ سوٹ پہنے ہوئے تھا۔ ویسا ہی جیسے دوسرے بھائی فیصل اور احمد رضا پہنے ہوئے تھے۔ لیکن اس کے بال عجیب سے انداز میں کھڑے ہوئے تھے۔ خشک بالوں کو پتہ نہیں کس طرح بکھرایا گیا تھا۔ داڑھی بھی بے ترتیب تھی۔ عمدہ قسم کے سوٹ اور عمدہ قسم کی ٹائی میں وہ عجیب جنگلی نظر آ رہا تھا۔

اس نے گٹار کے تاروں پر ہاتھ مارے۔ شجاع احمد صاحب سر پکڑ کر بیٹھ گئے تھے۔ ہارون کی دہاڑیں اُبھرنے لگیں۔ وہ آہستہ آہستہ موڈ میں آتا جا رہا تھا۔ ناہد ترکیب تو بتا ہی چکا تھا۔ کسی طرف دیکھو ہی نہیں۔ بس اپنے کام سے کام رکھو۔ چنانچہ وہ شروع میں تو جھجکا لیکن چند ساعت کے بعد وہ گٹار کی تانوں کی لے میں گم ہو کر سب کچھ بھول گیا۔ اب وہ جھوم جھوم کر اُچھل اُچھل کر ناچ رہا تھا اور اس کے ہونٹوں سے ایک وحشیانہ نغمہ نکل رہا تھا جو جوش و جذبات سے بھرپور تھا۔

لوگ حیرت سے اُسے دیکھ رہے تھے۔ بہت سے کونے کھدروں سے دبے دبے قہقہے اُبھر رہے تھے۔ بعض لوگ تالیاں بجا بجا کر اُسے داد دے رہے تھے۔ نوجوانوں کا ایک ٹولہ دفعتاً اپنی جگہ سے اُٹھا اور اس کے نزدیک پہنچ گیا۔ اور اس کے بعد اچھل کود شروع ہو گئی۔

سیٹھ غلام الٰہی ایک بار پھر شجاع احمد صاحب کے نزدیک پہنچ گئے۔ پتہ نہیں کس ٹائپ کے آدمی تھے۔ یا تو شجاع احمد صاحب سے کوئی پرخاش رکھتے تھے۔ اور اُن کا مذاق اُڑانا چاہتے تھے۔ یا پھر خواہ مخواہ کے خوشامدی تھے۔

"بھئی واہ... یہ یہ تو تمہارا منجھلا بیٹا ہے۔" اُنھوں نے شجاع احمد کی طرف دیکھتے ہوئے کہا اور شجاع احمد صاحب نے خونی نگاہوں سے اُنھیں گھورا۔

"آپ میرے پُورے خاندان سے بخوبی واقف معلوم ہوتے ہیں"۔ وہ طنزیہ انداز میں بولے۔

"بھئی سبحان اللہ، تم نے اپنے بچوں کو اچھی خاصی مشق کرائی ہے۔ مجھے تو تمہارے طرزِ زندگی کی تبدیلی پر بڑی مسرت ہوئی ہے۔ دراصل جدید دور کو اس طرح کے نوجوانوں کی ضرورت ہے ہم خواہ مخواہ اُنھیں پس ماندہ بنائے دے رہے تھے لیکن میرا خیال ہے اب تمہیں عقل آ گئی ہے۔"

"شکریہ..." شجاع احمد صاحب نے منہ ٹیڑھا کر کے کہا۔ اور وہاں سے آگے بڑھ گئے۔ اب اُن کے لئے یہ سب کچھ ناقابلِ برداشت ہو گیا تھا۔ جو کچھ ہوا تھا وہ اُن کے علم میں نہیں تھا۔ لیکن حالات اِس بُری طرح بگڑے تھے کہ اب اُن کے سنبھالے نہیں سنبھل سکتے تھے۔ وہ اپنی جگہ نہیں رُکے۔ لیکن یہاں سے نکل جانا بھی کچھ عجیب سا ہوتا۔ تمام مہمان موجود تھے۔ ایک اور صاحب نے تذکرہ کرتے ہوئے کہا۔

"بھئی شجاع احمد اس کو تو تم نے واقعی فنکار بنا دیا۔ کہاں سے سکھایا اسے یہ سب کچھ؟"

"خدا جانے"، شجاع احمد صاحب گہری سانس لے کر بولا۔ "بچوں کے معاملات میں میں دخل نہیں دیتا۔"

"دُنیا بھی نہیں چاہیئے۔ جدید دور کے تقاضے ہیں یہی سب

کچھ ہو رہا ہے۔ اس دُنیا میں۔" ایک صاحب نے کہا۔

شجاع احمد صاحب دل ہی دل میں کٹے جا رہے تھے لیکن کیا کرتے۔ سب کو فیس کرنا تھا۔ اس طرح یہ محفل جاری رہی۔

زاہد کے لئے بڑے پُرمسرت لمحات تھے یہ۔ وہ شجاع احمد کے کرب اور بے چینی کو محسوس کر رہا تھا اور اس کے دل میں ٹھنڈک دوڑ رہی تھی۔

★★

لیکن اس نے خود پر قابو پا لیا چند لمحات کے لئے وہ خود کو پُرسکون کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ اور پھر اس نے کہا۔

"آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی ہے، بابا عبداللہ! سُنا ہے اپنی جوانی میں آپ نے بڑے بڑے کارنامے انجام دیئے ہیں۔ دراصل میری اب تک کی زندگی یورپ میں گزری ہے لیکن یہ میرا وطن ہے اب میں اپنے وطن واپس آ گیا ہوں۔ اور یہاں کچھ کرنا چاہتا ہوں۔"

"بڑی اچھی بات ہے بیٹے! رہی میری جوانی کی بات تو ایسی کوئی خاص بات نہیں۔ اس قصبے میں زندگی گزاری ہے یہیں عزت سے کھایا کمایا اور یہ کوئی کارنامہ نہیں ہے۔"

"یورپ میں میری ملاقات ایک شخص سے ہوئی تھی۔ وہ آپ کی بہت تعریف کرتا تھا۔"

"کون تھا وہ...؟"

"میں اُسے شاہجی کے نام سے جانتا ہوں۔ پورا نام مجھے نہیں معلوم۔ نہ جانے آپ اُسے کس نام سے جانتے ہوں۔"

"شاہجی..." بوڑھا عبداللہ کسی سوچ میں گم ہو گیا۔ پھر دفعتاً اس کے ذہن کو جھٹکا سا لگا۔

"شجاع احمد... ہاں بیٹے، وہی شاہجی کہلاتا تھا۔"

"کون تھا وہ...؟" ظفر نے خود پر مکمل طور پر کنٹرول کر کے پوچھا۔

"ایک ٹھیکیدار تھا بیٹے! مگر وہ اچھا انسان نہیں ہے۔ بہت ہی بُرا آدمی تھا وہ۔"

"کمال ہے، وہ تو آپ کی بہت تعریف کرتا تھا۔"

"کرتا ہو گا بدبخت کہیں کا۔ میں بھی اس وقت اچھا انسان نہیں تھا۔ بیٹے بُروں کے ساتھ رہنے والا اچھا انسان تو نہیں ہوتا۔ مگر اس کے ساتھ مل کر کرنے والی بُرائیوں نے مجھے کبھی بھی سکھ سے نہیں بیٹھنے دیا۔ میرا ضمیر اب تک مجھے ملامت کرتا ہے۔"

"میں سمجھا نہیں بابا؟"

"بس بیٹے کسی کی بُرائی چھپی رہے تو اچھا ہے۔ کیا کرو گے پوچھ کر۔"

"میں تو اُسے تلاش کر رہا تھا بابا۔ اس نے مجھے اپنے ساتھ کاروبار کرنے کی پیش کش کی تھی۔ آپ کے پاس میں اسی لئے آیا تھا کہ اس کے بارے میں معلوم کروں۔" ظفر نے مایوسی سے کہا۔

"کاروبار کی تو میں نہیں کہتا بیٹے! لیکن انسان کی حیثیت سے وہ بہت بُرا تھا۔ اس نے ایک ایسا گناہ کیا تھا جسے خدا کبھی معاف نہیں کرے گا۔ اور میں بدنصیب اس کے ساتھ تھا۔"

"بابا... مجھے اس کے بارے میں بتا دیں۔ بڑی مُشکل سے میں آپ کو تلاش کر سکا ہوں۔ آپ مجھے مایوس کر دیں گے؟"

"بتا دو بابا... صاب بہت اچھا آدمی ہے۔ میرا دوست ہے۔" چھتن نے ظفر کی سفارش کی۔

"گل زماں خان میرا بھی دوست تھا۔ خدا جانتا ہے مجھے اس وقت شاہجی ٹھیکیدار کے بارے میں کچھ نہیں معلوم تھا۔ ٹھیکیدار گل زماں خان کی بیٹی پر مرمٹا تھا۔ اور پھر اس نے گل زماں خان کی بیٹی سے شادی کر لی۔ میں نے خود گل زماں سے بات کی تھی۔ وہ کسی طرح اس بات پر تیار نہیں تھا۔ لیکن میں نے اسے مجبور کر دیا۔ اس وقت ٹھیکیدار نے مجھے دوست بنا لیا تھا۔ اور مجھے اس کی نیت کا پتہ نہیں تھا۔ بہرحال میری کوشش سے گل زماں نے اپنی معصوم بیٹی شہربانو کو اس کے نکاح میں دے دیا۔ ٹھیکیدار بہت خوش تھا۔ اس نے میرا بہت شکریہ ادا کیا تھا۔ پھر جنگلوں کی کٹائی ختم ہو گئی۔ اور ٹھیکیدار واپس جانے لگا۔ اس نے کوشش کی کہ لڑکی کو اپنے ساتھ نہ لے جائے۔ گل خان مر گیا تھا۔ لوگوں نے ٹھیکیدار کو مجبور کر دیا۔ وہ شہربانو کو ساتھ لے جائے۔ ٹھیکیدار بہت پریشان ہو گیا تھا۔ یہاں صرف میں اس کا ایسا دوست تھا جس پر وہ مکمل اعتبار کرتا تھا۔ اور یہ حقیقت بھی ہے کہ میں اس سے مانوس بھی بہت تھا۔ ایک شام اس نے مجھے اپنے پاس بلایا۔ بے حد پریشان تھا۔ اس نے اپنی پریشانی کی وجہ بتاتے ہوئے کہا کہ وہ شادی شدہ ہے شہر میں اس کے بیوی بچے ہیں۔ ایک پورا خاندان ہے اور یہ خاندان میری اس دوسری شادی کو کبھی قبول نہیں کرے گا۔ اس نے مجھ سے گڑگڑاتے ہوئے کہا کہ عبداللہ میری مصیبت آ جائے گی۔ اتنے خوفناک حالات میں گھِر جاؤں گا جس کا تم تصور نہیں کر سکتے۔ میرا باپ حسام احمد بہت ہی جلاد صفت آدمی ہے اور میرے اس کاروبار میں بہت بڑا حصہ میری بیوی کی دولت کا ہے سارا شیرازہ منتشر ہو جائے گا۔ میرے بچے مجھ سے چھن جائیں گے اور مجھے خودکشی کرنا ہو گی۔ اس بدبخت نے آنکھوں میں آنسو بھرتے ہوئے کہا کہ عبداللہ اس وقت تم واحد سہارا ہو میرا جو میرے لئے کچھ کر سکتے ہو۔ میں یہ حالات سُن کر خاصا پریشان ہوا تھا۔ میں نے اُس سے کہا بھی کہ ٹھیکیدار! گل زمان کی بیٹی باپ کی موت کے بعد بالکل بے سہارا ہو کر رہ گئی ہے۔ یہاں اس کا ساتھ دینے والا اور کوئی نہیں ہو گا کہنے

کو تو سب ہی کہہ دیں گے لیکن درحقیقت کسی کا ساتھ نبھانا بہت مشکل ہوتا ہے اور پھر تم کیا کرو گے۔ میں اس کے لئے خرچہ بھجتا رہوں گا تم یہاں اس کی نگہداشت کی نگرانی سنبھال لو اور بے فکر ہو جاؤ۔ روپے پیسے کی کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔ میں نے اس سے معذرت کرتے ہوئے کہا کہ نہیں ٹھیکیدار پوری بستی اس کے خلاف ہے' بات صرف اس کی نہیں ہے۔ تم اُسے خرچہ بھیجتے رہو بلکہ بات یہ ہے کہ ایسی بستیوں میں تم جیسے سرمایہ دار آتے رہتے ہیں۔ یہاں کی لڑکیاں خراب کرتے ہیں اور پھر لاتعداد کہانیاں جنم لیتی ہیں۔ یہ لڑکیاں خودکشی کر لیتی ہیں۔ اور بستی والے شہر والوں سے نفرت کرنے لگتے ہیں۔ میں ان حالات میں یہ ذمہ داری قبول نہیں کر سکتا۔ تب اس نے ایک اور تجویز پیش کی۔ اس نے کہا کہ عبداللہ ٹھیک ہے میں یہاں سے اُسے لے جاؤں گا لیکن کسی اور شہر یا بستی میں اس کے قیام کا بندوبست کر دوں گا تم بھی بستی چھوڑ دو۔ اور اس کی نگرانی کی ذمہ داری سنبھالو۔ میں نے سوچ بچار کے بعد اس کی اس بات پر رضامندی ظاہر کر دی لیکن ٹھیکیدار کے دل میں بددیانتی تھی وہ مجھے لے کر چل پڑا۔ گل زمان کی بیٹی شہہ بانو بھی اس کے ساتھ تھی۔ پھر ایک ایسے مقام پر پہنچ کر جو بے حد سنسان تھا۔ اور جہاں ہم دونوں کے علاوہ اور کوئی نہ تھا اس نے شہہ بانو کو گولی مار دی اُس نے یہی فیصلہ کیا تھا کہ شہہ بانو کو قتل کر کے اس کی لاش یہاں جنگل میں پھینک دے۔ درندے اور مُردہ خور اُسے کھا لیں گے اور اس طرح شہہ بانو کی کہانی ختم ہو جائے گی۔ قتل کرنے سے پہلے ٹھیکیدار شجاع احمد نے مجھ پر اپنے ارادے کا اظہار نہیں کیا تھا۔ ہاں جب اس نے اُسے گولی مار دی اور میں نے اس کا گریبان پکڑا تو وہ میرے سامنے گڑگڑانے لگا۔ اس نے کہا کہ اس کے پاس اس کے علاوہ اور کوئی چارہ کار نہیں تھا۔ میرا دل مجھے ملامت کر رہا تھا۔ میں نے اس پر لعنت بھیجی لیکن بیٹے شجاع احمد نے مجھے دس ہزار روپے دیئے اور دولت کی چمک نے مجھے بھی اندھا کر دیا۔ میں دل سے تو اس کے جرم میں شریک نہ تھا لیکن دس ہزار روپے کے عوض میں زبان بند رکھنے پر رضامند ہو گیا اور پھر میں نے ٹھیکیدار کی کہانی کسی کو نہیں بتائی۔ وہ دس ہزار روپے خرچ ہو گئے لیکن میری عاقبت خراب ہو گئی۔ میں ایک ایسے جرم کا شریک کار تھا جس میں میری مرضی شامل نہ تھی۔ مجھے آج بھی گل زمان خان کا چہرہ نظر آتا ہے۔ وہ میرے خوابوں میں آتا ہے اور مجھ سے سوال کرتا ہے کہ عبداللہ کیا تُو نے میری دوستی کا یہی صلہ دیا ہے؟ بیٹا اس کے بعد سے میں آج تک کرب کا شکار رہا ہوں؟ کیا یاد دلا دیا تُو نے۔ کیا یاد دلا دیا۔ وہ بڑا کمینہ انسان ہے اور اس کے ساتھ کوئی بھی کاروبار تیرے لئے سودمند ثابت نہیں ہوگا جو شخص قاتل ہو اور کسی کو اتنا بڑا دھوکا دے۔ وہ کبھی بھی اچھا آدمی نہیں ہو سکتا چنانچہ تُو اس کے ساتھ مشترکہ کاروبار کا ارادہ ترک کر دے۔ میں نے یہ راز تجھے اس لئے بتا دیا ہے کہ میرے پوتے نے تیری سفارش کی تھی۔ خُدا مجھے معاف کرے۔ خُدا مجھے معاف کرے؛ ظفر کی آنکھوں میں شرارے ناچ رہے تھے۔ عبداللہ نے اپنے آپ کو بے قصور ثابت کر دیا تھا لیکن بہرطور وہ بھی ٹھیکیدار کے جرم میں برابر کا شریک تھا۔

ظفر اس شخص کے بارے میں کوئی فیصلہ نہیں کر سکا تھا کہ اُسے اس کے ساتھ کیا کرنا چاہیئے۔ بہرِطور اس نے مصلحت سے کام لیا اور بولا۔

"بابا آپ نے بلاشبہ میری بڑی بھرپور مدد کی ہے میں آپ کا یہ احسان کبھی نہیں بھول سکتا۔ ٹھیک ہے اب میں اس شخص کے ساتھ کوئی کوئی کاروبار نہیں کروں گا کیا اس واقعے کے بعد بھی اس نے آپ سے ملنے کی کوشش کی ہے؛

"کئی بار... کئی بار وہ زیادہ دلیر آدمی نہیں ہے۔ ابھی میرا خیال ہے کہ چار یا پانچ سال پہلے ایک بار مجھ سے ملا تھا۔ غالباً یہ اندازہ لگانا چاہتا تھا کہ میں زندہ ہوں یا مر گیا۔ اپنے جُرم کا خوف تو اُسے رہتا ہی ہوگا۔ کئی بار مجھے پیسے بھی بھجوا چکا ہے لیکن میں نے اس کے بعد اس کی مدد قبول نہیں کی اور اُسے ٹھکرا دیا۔ البتہ میں نے دل میں یہ سوچا کہ زبان بند رکھوں کیا فائدہ ہوگا اب گڑے مردے اکھاڑنے سے۔ گل زمان کی بیٹی مر چکی ہے۔ لاکھ لوگوں سے کہوں گا کہ میں اس کے جُرم کا شریک نہیں تھا۔ لیکن کون قبول کرے گا۔ میں یہ تو کہہ نہیں سکتا کہ میں نے اس جُرم کی پردہ پوشی کے لئے اس سے کچھ نہیں لیا۔ ہاں وہ دس ہزار روپے میں نے بڑے کروفر سے خرچ کئے تھے؛ عبداللہ کی آنکھوں میں دھندلاہٹیں آ گئیں۔

"وہ کہاں رہتا ہے بابا؟" ظفر نے پُوچھا۔

"شہر میں رہتا ہے بیٹے بڑا سرمایہ دار ہو گیا ہے۔ اب تو پہلے جنگلوں کے ٹھیکے لیا کرتا تھا۔ اب بڑے بڑے کاروبار کرتا ہے۔ ابھی حال کی تو معلوم نہیں لیکن چار پانچ سال پہلے جب وہ آیا تھا تو یہ شاندار لمبی گاڑی تھی۔ اس کے پاس دو ملازم بھی بیٹھے ہوئے تھے اور اس کی شکل ہی بدلی ہوئی تھی۔ اس وقت جب وہ ٹھیکیدار کی حیثیت سے آیا تھا۔ اتنا زیادہ دولت مند نہیں معلوم ہوتا تھا لیکن اب تو یوں لگتا ہے جیسے اس کے پاس دولت کے انبار لگے ہوں؛"

"شہر میں وہ کس جگہ رہتا ہے عبداللہ بابا؟" ظفر نے پُوچھا۔

"اتنا مجھے نہیں معلوم بیٹا۔ لیکن شہر میں جا کر اگر معلومات کرو گے تو تمہیں پتہ چل جائے گا۔ شجاع احمد صاحب کے نام سے وہ مشہور ہے اور اس کے باپ کا نام حسام احمد ہے پتہ نہیں کون لوگ ہیں۔ پتہ نہیں مجھ سے سچ بھی بولا تھا یا جھوٹ؛"

"ہوں... بہت بہت شکریہ بابا۔ بلاشبہ آپ نے اس کے جرم میں عیانت کر کے بہت بڑا گناہ کیا تھا لیکن اگر اس گناہ نے آپ کے ضمیر کو بے چین کیا ہے تو پھر آپ قابلِ معافی ہیں۔ آپ کا مسئلہ آپ کے اور خدا کے درمیان ٹھہرا۔" ظفر نے جتلاتے ہوئے لہجے میں کہا۔ چھیتن اس کے لہجے سے کوئی اندازہ نہیں لگا سکا تھا۔ پھر ظفر وہاں سے اُٹھ گیا۔

"چلو چھیتن، تمہارا بہت بہت شکریہ کہ تم نے مجھے عبداللہ دادا سے ملا دیا۔"

"کمال ہو گیا بابو جی، ہمیں تو معلوم ہی نہ تھا کہ جسے آپ ساری بستی میں تلاش کرتے پھر رہے ہیں۔ وہ اپنا دادا ہے۔ بہرحال ہم آپ کے کام آئے اب آپ بھی ہمارے کام آجانا بابو جی۔"

"ہاں... ہاں چھیتن بتاؤ میں تمہارے کیا کام آسکتا ہوں؟"

"بس جی ایک بار ہیرو کا چانس دلا دو۔ اپنی تو یہی آرزو ہے۔" چھیتن نے کہا اور ظفر مسکرانے لگا۔

"کاش میں تمہارے لئے کوئی فلم بنا سکتا۔ اگر ایسا ہوتا چھیتن تو میں تمہیں ضرور اپنی فلم میں ہیرو کا چانس دیتا۔"

"جب بھی وقت آئے اور آپ فلم بنائیں تو چھیتن کو نہ بھولیں۔" چھیتن نے جواب دیا۔

"ارے تمہیں کہاں بھول سکتا ہوں چھیتن۔" ظفر بولا۔ تھوڑی دیر بعد وہ رحیمو کی سرائے پہنچ گئے۔ ظفر کے لئے اب یہاں رُکنے کی کوئی گنجائش نہ تھی۔ وہ اپنی جس مہم پر نکلا تھا۔ اُسے انجام دے چکا تھا۔ شجاع احمد کا نام اس کے ذہن پر نقش ہو گیا تھا۔

شہر میں شجاع احمد کو تلاش کرنا کوئی مشکل کام نہ تھا۔ بہرطور وہ وہاں سے واپس چل پڑا۔ زیادہ دن نہیں لگے تھے۔ اس کام میں وہ شہ بانو کے پاس پہنچ گیا ______

کرم دین، چھیمو اور شہ بانو بہت ہی خوش تھے۔ بابا کرم دین نے بڑی گرم جوشی سے اس کا استقبال کیا۔ شہ بانو نے اس کی پیشانی اور آنکھیں چومیں اور چھیمو اُسے دیکھ کر حسبِ عادت ہنسنے لگی۔

"لڑکی تیرے دانت توڑنے پر غور کرنا پڑے گا۔ ہنستے ہوئے تیرے یہ سارے دانت مُنہ کے دہانے سے اس طرح باہر نکل آتے ہیں کہ لگتا ہے کاٹنے کو دوڑے گی۔"

"واہ ظفر بھیا... ہم آپ کو کیوں کاٹیں گے۔ آ گئے آپ کہاں گئے تھے؟"

"بس تیرے لئے کوئی بے وقوف سا لڑکا تلاش کرنے گیا تھا جس سے جلد از جلد تیری شادی کر کے اس مصیبت کو دُور کر دیا جائے۔" ظفر نے کہا اور چھیمو کی آنکھوں میں عجیب سے خواب لہرا گئے۔ اس نے نشاط، نزہت اور صوفیہ سے ایک شرط پر تعاون کا وعدہ کیا تھا۔ لیکن اب تو ان کے ہاں سے چلی ہی آئی تھی۔ بہرطور اب ظفر موجود ہے۔ اس نے سوچا اس خوبصورت اور جوان نے بھیا سے کبھی نہ کبھی دل کا حال کہہ دے گی اور اپنی منزل پالے گی لیکن اس کے لئے ابھی وقت درکار تھا بانو اور بابا کرم دین ظفر کو لئے ہوئے اندر پہنچ گئے اور ظفر اس چارپائی پر بیٹھ گیا جو دالان میں پڑی تھی۔ شہ بانو اس کے نزدیک ہی بیٹھ گئی تھی۔ بابا کرم دین ایک مونڈھے پر بیٹھ گئے۔

"ہاں بیٹا... تم جمال گڑھی ہو آئے؟"

"ہاں بابا، وہیں سے آ رہا ہوں۔"

"کچھ کام بنا۔ کچھ معلوم ہو سکا؟"

"ہاں بابا... ٹھیکیدار شاہجی کا پتہ چل گیا ہے لیکن ابھی میری ایک بہت بڑی مہم باقی ہے بابا! میں ایک دن یا دو دن میں یہاں سے روانہ ہو جاؤں گا۔ شہر جانا ہے اور شہر جا کر اپنی منزل کو تلاش کرنا ہے۔ آپ لوگوں کو اس وقت تک یہاں رہنا پڑے گا۔ آپ کو کوئی تکلیف نہیں ہوگی بابا۔ میں جس وقت بھی موقع مناسب دیکھوں گا۔ آپ کو شہر بلوا لوں گا۔ آپ بالکل مطمئن رہیئے۔ میں آپ لوگوں کے لئے ایسے انتظامات کر دوں گا کہ آپ لوگوں کو بالکل تکلیف نہ ہو بس اپنے کام سے کام رکھئے۔ بیگم صاحبہ کا احسان لینا اب ہمارے لئے ممکن نہیں ہے۔ ماں نے اس گھر کو عبادت گاہ کا درجہ دیا ہے تو میں بھی اس گھر کی عزت کرنے پر مجبور ہوں۔ بے فکر رہ ماں شمشیر زمان کے گھر کے خلاف میرا کوئی قدم نہ اُٹھے گا۔ حالانکہ مجھے ان لوگوں سے بے پناہ نفرت ہے۔ یہ نفرت اس لئے ہے کہ اگر شمشیر زمان نے میری ماں کو [illegible] کیا تھا تو دوسرے لوگوں کو بھی تسلیم کرنا چاہیئے تھا اُنھوں [illegible] گھناؤنے الزامات کیوں لگائے۔ انھوں نے اس کے ساتھ یہ سلوک کیوں کیا؟"

"بھول جا بیٹے اُنھیں بھول جا۔ یہ ساری باتیں بھلائی جا سکتی... ہیں کیونکہ اُنھوں نے مجھے ایک طویل عرصے تک پناہ دی ہے۔ اور اس گھر کا سربراہ شمشیر زمان جیسا فرشتہ تھا تو کب جائے گا؟"

"بس ماں! کل یا زیادہ سے زیادہ پرسوں چلا جاؤں گا۔ شہر جا کر میں اس بارے میں معلومات حاصل کروں گا۔ کوئی نوکری تلاش کروں گا۔ تاکہ تم لوگوں کے لئے مزید آسانیاں فراہم کر سکوں۔"

"جیسی تیری مرضی بیٹے! مگر تو ہمیں بھولنا نہیں۔ اتنے عرصے کے بعد وہ مجھے ملا ہے۔ اور اب مجھے یہ نئی زندگی ملی ہے جس میں میں اپنی زبان سے بول سکتی ہوں۔ میں تجھ سے زیادہ عرصے دُور رہنا نہیں چاہتی بیٹے۔ مجھے جلدی بلا لینا یا خود واپس آجانا۔"

"تم مطمئن رہو ماں ... !میں ایسا ہی کروں گا" ظفر نے ... جواب دیا۔

"میں صبر کیے بیٹھی تھی تیری آس میں۔ خُدا نے میری آرزو پُوری کر دی۔ اب مجھے خُدا کے بعد صرف تیرا سہارا ہے ظفر۔ اپنی حفاظت کرنا جوش جذبات میں کوئی ایسا قدم مت اُٹھا بیٹھنا جو تجھے مجرم بنا دے۔ یہ میری ہدایت ہے تجھے۔" شہ بانو بیٹے کو سمجھاتی رہی۔

بڑی کامیاب تقریب رہی تھی۔ خاصی رات گئے تک ہنگامے ہو رہے تھے۔ لیکن اصل ہنگامہ آخری مہمان کے رخصت ہونے کے بعد شروع ہُوا تھا۔ شجاع احمد بہت پہلے اپنے کمرے میں چلے گئے تھے۔ غصے کے مارے بُرا حال تھا۔ بوٹیاں نوچ رہے تھے۔ اپنی تقریب کے ختم ہونے کا انتظار تھا۔

ساڑھے بارہ بج رہے تھے۔ اس وقت ایک ملازم کو بلا کر مہمانوں کے بارے میں پُوچھا۔

"جی ... سب جا چکے ہیں۔"

"بیگم صاحبہ کو بُلا کر لاؤ۔" اُنھوں نے بھاری لہجے میں کہا۔ اور ملازم چلا گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد بیگم صاحبہ مُسکراتی ہوئی اندر آگئیں۔

"ہیلو ...!" اُنھوں نے ایک ادا سے مسکراتے ہوئے کہا۔

"سبحان اللہ، سبحان اللہ۔ یورپ سے تشریف لا رہی ہیں۔ اب تو آپ ہیلو بھی کہتی ہیں۔" شجاع احمد صاحب طنزیہ لہجے میں بولے۔

"کیسی لگ رہی ہوں؟"

"مجھ سے پُوچھ رہی ہیں؟ اُن کی آنکھوں میں نہیں جھانکا۔ جو تمسخرانہ نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔ اُن کی باتوں سے نہیں آپ پر فقرے اُچھال رہے تھے۔"

"کیا مطلب ہے آپ کا؟" بیگم صاحبہ کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔

"یہ آپ نے کیا حُلیہ بنایا ہے اپنا؟"

"کیوں برداشت نہیں ہو سکا؟" بیگم صاحبہ نے چُبھتے ہوئے لہجے میں پُوچھا۔

"آئینے پر غور کیا آپ نے؟"

"آئینہ تو سچ بولتا ہے۔ اس نے تو میرا کوئی مذاق نہیں اُڑایا۔ ہاں آپ کے کلیجے میں جو چُبھن ہے وہ آپ کی آنکھوں سے ظاہر ہو رہی ہے۔ کون تھے وہ تمسخرانہ نگاہوں سے مجھے دیکھنے والے۔ کون تھے وہ فقرے اُچھالنے والے؟ آپ نے اُنھیں میرے پاس نہیں بھیجا؟"

"کیا ہو گیا ہے آپ کو۔ دیوانی ہو گئی ہیں؟" شجاع احمد غصے سے ہونٹ کاٹتے ہوئے بولے۔

"جی نہیں۔ خُدا کے فضل سے عقل آگئی ہے۔ آپ کو پرکھ لیا ہے۔ اور سمجھ بھی لیا ہے۔"

"کیا مطلب ہے آپ کا؟"

"جو کچھ بھی ہے آپ کے دل میں ہے۔ پھبتیاں ناراض ہو رہی تھیں کیا؟ آپ نے کہا نہیں کہ میں نے یہ لباس اپنی بیوی کے لئے نہیں خریدا۔ اس بے چاری نے خود ہی بنایا ہے۔"

"فضول ہو گئی ہیں آپ۔ نری احمق۔"

"جی ہاں۔ حقیقت جو کہنے لگی ہوں۔"

"کونسی پھبتی کے بارے میں بکواس کر رہی ہیں آپ۔"

"میں نے غور ہی کونسا کیا تھا اب تک۔ اب نام بھی بتا دوں گی۔ بس تھوڑی سی مہلت دے دیں۔"

"میری عمر اب اس قابل رہ گئی ہے کہ آپ مجھ پر شک کریں؟"

"مرد کے بدن میں رعشہ بھی آجائے تب بھی وہ قابلِ اعتماد نہیں ہوتا سمجھے آپ۔ میں نے آپ پر اعتماد ضرور کیا لیکن بالکل ہی بے وقوف نہیں ہوں میں۔"

"نہ جانے یہ عقل کس بدبخت نے دی آپ کو۔ میں کہتا ہوں اس سے قبل کبھی آپ نے ایسا لباس کیوں نہیں پہنا۔ کیا عجیب نہیں لگ رہی ہیں آپ۔ اس بے تُکے لباس میں۔"

"بیگم پراچہ کو دیکھا تھا آپ نے۔ بڑے معزز دوست ہیں آپ کے۔ آپ بِچھے جاتے ہیں اُن کی راہ میں۔ اور مسز صلاح الدین، مسز قندانی، مسز حبیب پر بھی آپ کی نگاہ پڑی تھی۔ کیسے حلیئے میں تھیں وہ؟"

"اُن کی اور بات ہے۔ ہماری اپنی ایک روایت ہے۔ یہ لباس ہمارے ہاں کہاں پہنے جاتے ہیں؟"

"سوٹ پہن کر پیدا ہوئے تھے آپ۔ کہہ دیجئے ہاں۔ وہ گھسی ہوئی شیروانی کہاں گئی جو بارہ بنکی میں آپ کے خاندان کا امتیاز تھی۔ یہاں کتنی بار آپ نے شیروانی پاجامہ اور ترکی ٹوپی پہنی ہے۔"

"میری بات اور ہے۔"

"ہاں ابھی آپ کی عمر ہی کیا ہے۔ کان کھول کر سُن لیں شجاع احمد صاحب۔ میں بیوی ہوں آپ کی لونڈی نہیں۔ میرے رہن سہن اور لباس پر آپ کو تنقید کرنے کا کوئی حق نہیں ہے سمجھے آپ۔ میں اپنے طور پر زندہ رہنا چاہتی ہوں۔ آپ کا غلام بن کر میں نے بہت عرصے زندگی گزار لی آپ نے ہمیشہ مجھے بے وقوف بنایا۔ پسماندہ رکھا مجھے لیکن اب میں جوان بچوں کی ماں ہوں۔ بیٹیاں اور بیٹے میرے ہیں۔ مجھے اُن کے لئے بہتر رشتے تلاش کرنے ہیں۔ میں جانتی ہوں کہ معزز گھرانے کی خواتین کس طرح رہتی ہیں۔ میں نے ہمیشہ اُنھیں دیکھا اور محسوس کیا ہے۔ اور

اس بات کی توقع کرتی رہی ہوں کہ کبھی آپ بھی مجھے اُن کی صف میں لا کھڑا کریں گے۔ لیکن میں اچھی طرح جانتی ہوں کہ آپ مجھے اُن کے درمیان نہیں دیکھنا چاہتے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ آپ دوسروں کو اپنی مظلومیت کا یقین دلا سکیں۔ آپ ان سے کہہ سکیں کہ آپ کی بیوی پسماندہ ذہنیت کی مالک ہے اور آپ ایک مظلوم انسان ہیں لیکن شجاع احمد صاحب میں نے اب خود اپنے بارے میں سوچا ہے مجھے اپنے بچوں کا مستقبل عزیز ہے۔"

"بچے... وہی بچے۔ جنھیں آج آپ نے دیکھا تھا۔ وہ جگر جو... بندروں کی طرح اُچھل رہا تھا اور حلق پھاڑ پھاڑ کر دھاڑ رہا تھا۔ خوب نام روشن کرایا ہے آپ نے سیرز۔ یقیناً یہ آپ ہی کی تربیت ہوگی۔ آپ نے اُنھیں بھی ماڈرن بنانے کی کوشش کی ہوگی۔ آپ نے گانا سُنا تھا اُس کا؟"

"ہاں ہاں سُنا تھا۔ اور یہ بھی دیکھا تھا کہ لوگ اُسے کس طرح پسندیدہ نگاہوں سے دیکھ رہے تھے یہ نیا دور ہے شجاع احمد صاحب! نئے دور کے نوجوانوں کے اپنے مشاغل ہیں۔ اُن کی اپنی زندگی ہے کیا اُنھیں بھی میری طرح غرارہ سوٹ پہنا کر گھر میں رکھنا چاہتے ہو۔"

"پاگل ہوگئی ہو تم پاگل ہوگئی ہو۔ میں ایک ایک کا دماغ درست کر کے رکھ دوں گا۔ غلط شہ دے رہی ہو اپنی اولاد کو۔ لڑکی ہے اُس پر مصوری کا جنون سوار ہے تجریدی مصوری کرتی ہے۔ صاحبزادے ہپی بن گئے ہیں اور گٹار بجانا چاہتے ہیں۔ حلق میں پھنسے ہوئے بانس اٹکے ہوئے ہیں۔ ارے میں کہتا ہوں تمھیں ہو کیا گیا ہے کیوں اس خاندان کو تباہ کرنا چاہتی ہو؟"

"ٹھیک ہے، اگر اسی طرح خاندان تباہ ہوتے ہیں تو مجھے اس کی تباہی منظور ہے۔"

"لیکن مجھے منظور نہیں ہے۔"

"تو پھر کرلیں جو کیا جائے۔ نکال دیں ہم سب کو باہر۔ آپ کی کوٹھی ہے، آپ کی جائیداد ہے۔ آپ کو اختیار ہے جو دل چاہے کریں۔"

"بیگم، بیگم یوں لگتا ہے تم پاگل ہوگئی ہو، یقیناً پاگل ہوگئی ہو کسی نے جادو کر دیا ہے تم پر بچھیں تم اپنا اچھا بُرا نہیں سوچ پا رہیں۔ میں تو یہ سب دیکھ دیکھ کر ہول رہا ہوں۔ کیا ہو رہا ہے اس گھر میں۔ ابا میاں ہیں کہ اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ ہی بنائے بیٹھے ہوئے ہیں تمام دولت تباہ کرنے پر تُلے ہوئے ہیں اور کروڑوں روپے کی لاگت سے وہ فرسٹ ایڈ ہاؤس تعمیر ہو رہا ہے۔ ارے میں کہتا ہوں کہ کیا ہو گیا ہے آپ کو۔ کیا میں خودکشی کرلوں؟"

"نہیں نہیں۔ اس کی کیا ضرورت ہے ہم سب کو زہر دے دیں۔ اپنے طور پر عیش کریں۔ حکمران ہیں آپ اس گھر کے نا۔ جس طرح چاہیں اپنی رعایا پر حکم چلائیں۔ ہم بھی سوچیں گے کہ جمہوریت کے اس دور میں کس حکمران کی ظالمانہ حکمرانی تسلیم کی جائے یا اپنے اپنے طور پر زندگی گزارنے کا... بند و بست کیا جائے۔"

"خوب خوب تو اب آپ اپنے طور پر بھی زندگی گزارنے کے بارے میں سوچنے لگی ہیں۔ کیوں نہ سوچیں بیٹے جوان ہوگئے ہیں۔ میری تو اب ضرورت نہیں رہی دولت کمائیں گے عیش کرائیں گے۔ آپ کو۔ سُنا تھا آپ نے اس احمد رضا کی باتوں کو۔ ارے اِس کی تقریب میں ہی میں نے ہزاروں روپیہ خرچ کر ڈالا ہے اور وہ، وہ اس کلینک کو غریبوں کی فلاح و بہبود کے لئے استعمال کرنا چاہتا ہے۔ ان تمام لوگوں کو اچانک غریبوں کی غریبی دور کرنے کا مرض کیوں لاحق ہوگیا ہے۔ ابلیس الگ پاگل ہوگئے ہیں۔ صاحبزادے میں تو پاگل ہوں نا بالکل جو اس کلینک میں لاکھوں روپے لگاؤں گا۔ میں لعنت بھیجتا ہوں ایسی اولاد پر جو میرے تمام کئے کرائے پر پانی پھیر دینا چاہتی ہو۔ میں نے ساری زندگی اُنہی لوگوں کے مستقبل کے خواب دیکھے ہیں۔ اُن ہی کے لئے یہ سب کیا ہے اور اب یہ ہیں کہ اپنے ہاتھوں سے اُسے برباد کرنے پر تُلے ہوئے ہیں؟"

"اے اپنے باوا کی بھی تو بات کرو۔ یہ تو ابھی نئے نئے جوان ہوئے ہیں۔ وہ تو بوڑھے ہوگئے ہیں وہ کیوں یہ ساری دولت خرچ کرنے پر تُلے ہوئے ہیں؟"

سارے آوے کا آوا ہی بگڑ گیا ہے میں نہیں جانتا کہ یہ سب کچھ کیوں ہوا۔ کیسے ہوا۔ یہ سب کچھ۔ خدا کی پناہ، خدا کی پناہ! میرا دماغ پھٹ جائے گا۔ میں بے حد پُرسکون اور مطمئن آدمی ہوں۔ اپنا کاروبار اس اعلیٰ پیمانے پر کر رہا ہوں کہ لوگ حیران رہ جاتے ہیں لیکن یہ گھر، یہ گھر مجھے تباہ کر کے رہے گا۔ میں جانتا ہوں یہ گھر مجھے تباہ کر کے رہے گا۔ تم لوگ مجھے ختم کر کے دم لو گے۔ احمد رضا سے کہہ دینا۔ ارے کہہ کیا دینا بلاؤ کہاں ہے احمد رضا، بلاؤ اُسے۔" شجاع احمد صاحب خود ہی اپنی جگہ سے اُٹھ گئے۔ گھنٹی بجائی اور ایک ملازم کو طلب کرلیا۔

"رضا کہاں ہے؟" اُنھوں نے پوچھا۔

"جی... وہ شاید اوپر کی منزل میں۔"

"کون کون ہے وہاں؟"

"جی وہ... وہ مجھے نہیں پتہ۔"

"جاؤ بلال اور رضا کو بلا کر لاؤ۔ فوراً لاؤ۔" شجاع احمد صاحب نے کہا اور ملازم کان دبا کر نکل گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد احمد رضا اندر آگیا۔

"بلال کہاں ہے؟"

"جی وہ تو... وہ تو گھر میں موجود نہیں ہے۔"

"کیا مطلب ؟ اس وقت کہاں گیا ہے ؟"

"پتہ نہیں ڈیڈی! کسی کو کچھ بتائے بغیر کہیں چلا گیا ہے ؟"

"بھلا چلا کہاں گیا ہے، یہیں کہیں کوٹھی کے کونے کھدرے میں چھپا بیٹھا ہوگا۔ کب تک چھپے گا مجھ سے دیکھتا ہوں کب تک چھپتا ہے مجھ سے۔ اور تم نے کیا تقریر کی تھی ؟"

"جی وہ ڈیڈی ... ڈیڈی میرا مطلب ہے !"

"ہاں ہاں مطلب بتاؤ اپنا میرے لال، میرے بچے مطلب بتاؤ۔ کیا مطلب تھا تمہارا ؟"

"جی وہ میں نے کچھ غلط کہا ؟"

"نہیں، نہیں بالکل ٹھیک کہا۔ یہ اربوں روپے کی جائداد جو ہمارے پاس آرہی ہے، تم یقین کرو کہ ہم نے ذرا سی بھی محنت نہیں کی۔ بس خزانے ملتے رہے ہمیں زمین میں دفن۔ اور ہم انہیں نکال نکال کر اپنی عیش و عشرت پر صرف کرتے رہے۔ تمہاری تعلیم پر جو اخراجات ہوئے ہیں وہ یقین کرو بالکل حرام کے تھے۔ ایک پیسہ اس میں حلال کا نہیں تھا۔ اگر ہوتا تو ہمیں تمہیں اس کے زیاں کا دکھ نہ ہوتا اور اب باقی جو رہ گیا ہے بیٹا تو تم کلینک بناؤ۔ اور اس میں ملک بھر کے غریبوں اور ناداروں کو جمع کر لو۔ ان کا علاج کرو۔ مشینیں منگواؤ۔ بیرونی ممالک سے پیسے کی تو کوئی کمی نہیں ہے۔ ان سب کا علاج غریبوں کے لئے مہیا ہونا ضروری ہے اور جب یہ غریب تمہاری کلینک سے باہر نکلیں گے تو تم پر تھوکنے بھی نہیں آئیں گے سمجھے۔ ارے پاگل دیوانے باپ ہوں میں تیرا۔ میری مرضی کے بغیر تو نے یہ اعلان کیوں کیا ؟"

"ڈیڈی! وہ میرے دل نے کہا تھا !"

"سبحان اللہ، سبحان اللہ۔ یہ دل، یہ تم سب کے دل میرے دشمن کیوں ہو گئے ہیں۔ کسی کا دل کہتا ہے کہ وہ آوارہ گردوں کا روپ اختیار کرے سر پر گھونسلہ رکھے ٹھوڑی پر داڑھی اگائے اور ہاتھوں میں گٹار لئے پھرتا پھرے۔ کسی کا دل کہتا ہے کہ ایسا ایک رفاہی ادارہ قائم ہو۔ جو کروڑوں روپے کی لاگت سے تیار ہو اور اس میں ملک کے نوجوانوں کو ابتدائی امداد دی جائے انہیں ان کے مستقبل بنانے کے لئے سرمایہ فراہم کیا جائے اور شجاع احمد کو زمین کی گہرائیوں میں دفن کر دیا جائے جس نے اتنی محنت سے یہ ساری دولت حاصل کی تھی۔ یہی سب کچھ پروگرام ہے نا تمہارا لیکن میں دیکھتا ہوں۔ میں دیکھتا ہوں کہ تم لوگ اپنی اپنی سازشوں میں کہاں تک کامیاب ہوتے ہو۔ میں صاف، صاف کئے دیتا ہوں کہ میں نے جس کلینک کو بنانے کا اعلان کیا تھا میں اس اعلان کو واپس لے رہا ہوں۔ بیٹے خود بناؤ، خود غریبوں کا درد دل میں رکھو پھر دیکھو۔ کیا تماشہ ہوتا ہے۔"

"جی وہ ڈیڈی آپ نے ... آپ نے تو اخباری رپورٹروں کے سامنے یہ اعلان کیا ہے ؟" احمد رضا نے گردن جھکائے جھکائے کہا۔

"ہاں ہاں بلیک میل کرنا مجھے اخباری رپورٹروں کو اپنے ساتھ ملا لینا۔ کہنا ان سے بیان دے دینا انہیں کہ شجاع احمد صاحب غریبوں کے سخت خلاف ہیں وہ نہیں چاہتے کہ ایک پیسے کی دوا کسی غریب کی ذات پر خرچ ہو۔ انہیں تباہ کر دو۔ ان کا گھر پھونک دو۔ انہیں سنگسار کر دو۔ یہ بیان دینا، تمام غریب اٹھ کھڑے ہوں گے میرے خلاف اور پھر میرا وجود ہی مٹ جائے گا۔ ترکہ تو بیٹا تم ہی لوگوں کو ملے گا۔ اس کے بعد تم اپنے آپ کلینک تعمیر کرنا جو دل چاہے من مانی کرنا اور نام کمانا، مگر اس بات کو ذہن میں رکھنا کہ صرف نام کما سکو گے۔ جو صاحب عقل ہیں۔ وہ تمہیں دیکھ کر ہنسیں گے اور کہیں گے کہ دیکھو یہ سماج سدھار تشریف لے جا رہے ہیں۔ پھٹے ہوئے جوتے، پھٹے ہوئے کپڑے لیکن صاحب ... لیڈروں کا یہی حال ہوتا ہے۔ ابے ابے میں کہتا ہوں کہ عقل پکڑو جو کچھ میں تمہارے لئے بنا چکا ہوں۔ اسے تباہ مت کرو سمجھے !"

"ڈیڈی ہم نئے دور کے لوگ ہیں۔ پرانے لوگوں کا یہ وطیرہ رہا ہے کہ انہوں نے ہمیشہ اپنی عقل کو بڑا سمجھا۔ اپنے آپ کو بزرگ کے روپ میں لا کر یہ تسلیم کر لیا کہ ان کے تجربے نے انہیں ساری کائنات کی.. وسعت دے دی ہے۔ ڈیڈی یہ ایک غلط خیال ہے۔ نیا دور نئے ... تقاضوں کا حامل ہے۔ میں غریبوں کو بھی انسان ہی سمجھتا ہوں۔ آپ جو لاکھوں روپے کی مشینری اس کلینک میں لگائیں گے اس سے اگر صرف صاحب حیثیت لوگوں کو فائدہ پہنچے تو کیا یہ ناانصافی نہیں ہے کیا غریبوں کو جینے کا حق نہیں ہے ؟"

"ہے لیکن میں جو سرمایہ صرف کروں گا۔ اس کا بدل کیا ہوگا ؟"

"غریبوں کی دعائیں ان کی متشکرانہ نگاہیں ہماری ان کاوشوں کا بدل ہوں گی ؟" احمد رضا نے کہا۔

"ویری گڈ، ویری گڈ ... دعاؤں کو تم بدن پر پہن لینا اور متشکرانہ نگاہوں کو پیٹ میں اتار لینا۔ پیٹ کی آگ بھی بجھ جائے گی۔ تن بھی ڈھک جائے گا۔ ٹھیک ہے یہ دونوں چیزیں اس کام آ سکتی ہیں !"

"ڈیڈی پیٹ بھرنا اور تن ڈھکنا انسان کا بنیادی مسئلہ ہے اور میرا خیال ہے شہر کی سڑکوں پر آپ کو ننگے نظر نہیں آتے۔ بھوکوں کو تو میں مان لیتا ہوں لیکن وہ بھی خدا کے فضل سے زیادہ دیر بھوکے نہیں رہتے کہیں نہ کہیں سے اللہ تعالیٰ ان کا بندوبست بھی کر ہی دیتا ہے۔ آپ پرانے لوگ تو بڑے مذہبی ہوتے ہیں۔ نئی نسل کو آپ نے مذہب سے دور قرار دیا ہے لیکن یہ جو باتیں آپ کر رہے ہیں کیا مذہب سے تعلق رکھتی ہیں ؟"

"پاگل ہوگیا ہے تو بالکل پاگل ہوگیا ہے تم سب پاگل ہوگئے ہو۔ بس اِس گھر کو اب پاگل خانہ کہنا چاہیئے میں ایک بورڈ بنوا کر لگا دوں گا کہ اب یہ پاگل خانہ ہے سمجھے۔ میں اس پاگل خانے میں زندہ نہیں رہ سکوں گا۔ تم لوگ کان کھول کر سن لو جو کچھ تم کر رہے ہو، وہ نہیں ہوسکے گا۔ میری زندگی میں یہ سب کچھ نہیں ہوسکے گا۔ احمد رضا تیرا کلینک میرے پیسے سے تعمیر نہیں ہوگا۔ میں اخباری رپورٹروں کو دیئے ہوئے بیان سے پھر جاؤں گا۔ لوگ یہی کہیں گے ناکہ شجاع احمد نے کہے ہوئے سے انحراف کیا کسی کا قرض تو نہیں مجھ پر۔"

"سمجھ گیا ڈیڈی اس کا حل بھی تلاش کر لیا جائے گا۔" احمد رضا نے مودبانہ انداز کہا۔ اور شجاع احمد حیران رہ گئے بیگم صاحبہ اٹھیں اور احمد رضا کا ہاتھ پکڑ کر۔۔ دروازے کی طرف بڑھ گئیں۔

شجاع احمد صاحب بُری طرح اُلجھے ہوئے تھے۔ عظیم الشان کاروبار تھا۔ نہ جانے کیسے کیسے ہنگامے اُن کے دل و دماغ میں ہوتے رہتے تھے۔ کاروباری حریفوں سے چپقلش ساکھ بحال رکھنے کے لئے جوڑ توڑ۔ نہ جانے کیا کیا۔ اولادوں کا پیار دوسرے والدین کی طرح اُن کے دل میں بھی تھا۔ سوسائٹی میں بہت بڑا مقام حاصل کر چکے تھے۔ سرکاری حکام عزت کرتے تھے ہر جگہ بات اُونچی رہتی تھی۔ اور وہ اس حیثیت کو قائم رکھنے کے خواہاں تھے۔ بلاشبہ حسام احمد صاحب نے انھیں بہت کچھ دیا تھا۔ تعلیم سوجھ بوجھ، دولت اُن ہی کی بخشی ہوئی تھی۔ لیکن شجاع احمد نے اپنی فراست یا چالاکی سے ایک ایک کو ہزار ہزار بنا دیئے تھے۔ اور اب اُن کی آرزو تھی کہ اُن کی اولاد دس ہزار کے لاکھ بنائیں۔ اب تک انھوں نے جو کچھ کیا تھا اس سے بہت مطمئن تھے۔ اور اُن کا ذہن صرف کاروبار میں اُلجھا رہتا تھا۔ لیکن تربیت یافتہ اور سیدھے راستے پر چلنے والی اولادوں میں نہ جانے کس طرح بغاوت کے جراثیم سرایت کر گئے تھے۔ اچانک ہی شجاع احمد نے اُن میں نمایاں تبدیلیاں محسوس کی تھیں۔

حسام احمد کے مشاغل سے اُنھیں کوئی کد نہ تھی۔ بڑھاپا پھر سے بچپن طاری کر دیتا ہے۔ حسام احمد نے اپنی ذمہ داریاں بڑی خوش اسلوبی سے نبھائی تھیں اور جب اُنھوں نے محسوس کیا کہ شجاع احمد کے بازو۔۔ مضبوط ہوگئے ہیں تو وہ بوڑھے ہوگئے۔ بیٹے نے پوری سعادت مندی سے باپ کے بڑھاپے کا احترام کیا تو اس بڑھاپے میں بچپن کی شوخیاں شامل ہوگئیں۔ جو آرزوئیں ذمہ داری کے بوجھ تلے دب گئی تھیں وہ پھر سے انگڑائی لے کر مسکرانے لگیں۔ جاسوسی کہانیوں سے شاید بچپن میں بہت متاثر تھے۔ بچپن واپس آیا تو یہ شوق پھر سے جاگ گیا۔ محدود تھے کہ ناہر ذوالفقار نہ یدی اس میں شامل ہوگیا۔ اور وہ لامحدود ہوگئے۔ اور اب تو صورتِ حال ہی دوسری تھی۔ جو حالات چل رہے تھے اگر شجاع صاحب کو معلوم ہوجاتے تو نہ جانے کیا قیامت آتی۔ وہ نہیں جانتے تھے کہ اُن کے گرد جاسوسوں کا جال پھیلا ہوا ہے ڈرائیور سے لے کر مالی تک "خفیہ طور پر" آئرن ٹاور کا نمائندہ ہے۔ اور اپنے کام کی اصل قیمتوں سے چار گنا زیادہ قیمتیں آئرن ٹاور سے وصول کرتا ہے۔ یہ سب کچھ اُنھیں معلوم نہیں تھا۔ وہ تو موجودہ حالات سے ہی پریشان ہوگئے تھے یعنی وہ حالات جو ان کے علم میں آئے تھے۔ برسوں کی ساتھی شریکِ حیات بیگم صاحبہ جنھوں نے ہمیشہ شوہر کی پرستش کی تھی اب دوسری زبان میں گفتگو کرنے لگی تھیں۔ اور بیٹے، احمد رضا نے اُنھیں حریف کر لیا تھا۔ اس کا لہجہ جب بھی شجاع احمد کو یاد آتا وہ انگشت بدنداں رہ جاتے۔ کتنی نخوت سے اس نے کہا تھا کہ اس کا بھی انتظام ہو جائے گا۔ کلینک کی تعمیر کے لئے آخر لاکھوں بلکہ کروڑوں کا انتظام کہاں سے ہو جائے گا؟

دماغ تاریک ہونے لگتا تھا ان الفاظ سے۔ میں بھی تو دیکھوں گا کہاں سے انتظام ہو جائے گا۔ اُنھوں نے دانت پیس کر سوچا لیکن پھر فوراً ہی خود کو سنبھال لیا۔ جوانی یاد آگئی تھی۔ حسام احمد جس بات سے اختلاف کرتے۔ وہ ایک ضد بن جاتی اور کسی نہ کسی طرح اُسے انجام دینے کا جنون سر پر سوار ہو جاتا۔ بیٹا کوئی غلط قدم اُٹھا بیٹھتا تو کیا ہوتا اصل چیز جڑ کی تلاش تھی یہ جڑ، آنکھوں کے سامنے تھی۔ لیکن کمبخت نے اُن کی گود میں بیٹھ کر اس طرح پنجے گاڑے تھے کہ وہ بے بس ہوگئے تھے۔ جس طرف نگاہ دوڑاتے ناہر ہی نظر آتا تھا۔ اُن کے تمام بچے ناہر کے زیرِ اثر تھے۔ آخر کیوں؟ اور یہ ناہر ... یہ کیا چاہتا تھا؟

اس کے بارے میں سوچتے تو سینکڑوں وسوسے ذہن میں در آتے کہیں لمبی چوٹ نہ دے جائے کس تاک میں ہے۔ بہرحال کوئی ایسی کارروائی نہیں کرنا چاہتے تھے جس سے صورتِ حال بگڑ جائے۔ ناہر گفتگو کر کے تو وہ خود بھی مرعوب ہو جاتے تھے۔ اظہار نہیں کیا تھا کبھی۔ لیکن جو گفتگو دو ایک بار اس سے ہوئی تھی اس سے اُنھوں نے اندازہ لگایا تھا کہ قیامت کا ذہن رکھتا ہے۔ اگر اس ذہن کاروباری تربیت مل جائے تو چند ہی دنوں میں وہ بڑے بڑوں کے کان کتر کر رکھ دے۔

کچھ کرنا پڑے گا اس کے بارے میں کچھ کرنا پڑے گا۔ قدسیہ مصور بن گئی ہے اندر جانے کیا کیا لکیریں کھینچتی رہتی ہے۔ حامدن پاگل ہوگیا ہے۔ تنہا ذکی بات تو اور تھی جشن کے موقع پر اُنھوں نے اس کے کرتب دیکھے تھے اور ششدر رہ گئے تھے۔ شجاع احمد جیسے جبل لی انسان کا لوہا۔ بیٹا اس طرح عوام کے سامنے کولہے مٹکا مٹکا کر دہاڑے گا۔ کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ کتنی چاہ سے احمد رضا کو ڈاکٹر بنایا تھا۔

سوچا تھا کہ ایک مثالی کلینک بنوائیں گے پوری دُنیا سے جدید ترین طبی سائنسی آلات منگوائیں گے اور اس کلینک کو ملک کا جدید ترین ہسپتال بنا دیں گے جہاں سے لاکھوں روپے ماہانہ آمدنی ہوگی اور ان کی دولت میں بے پناہ اضافہ ہو جائے گا۔ لیکن احمد رضا نے سارے خواب چکنا چور کر دیئے تھے۔ اس نے جو کچھ اس کی بجی اُسے یاد کرکے شجاع احمد کا خون کھولنے لگتا تھا۔ یہ گھر یتیم خانہ بنتا جا رہا ہے۔ ایسا کیوں ہو رہا ہے، آخر کیوں؟

ابھی تک اُنھوں نے ان حالات پر زیادہ توجہ نہیں دی تھی۔ لیکن اب محسوس کر رہے تھے کہ اگر مزید کچھ عرصہ وہ ان معاملات سے بے تعلق رہے تو پورا گھرانہ ہی اُن کے ہاتھ سے نکل جائے گا۔ غور کرتے تو ناہید ہی اس بدلے ہوئے ماحول کا روحِ رواں نظر آتا تھا۔ دقت یہ تھی کہ گھر میں کوئی اس کے بارے میں کچھ سُننے کے لئے تیار نہیں تھا۔ اس کے باوجود اگر اُسے حسام احمد کی حمایت حاصل نہ ہوتی تو سب ٹھیک کیا جا سکتا تھا۔

کوئی ترکیب کوئی ایسی کوشش جس سے ناہید کا نقاب اُٹھ جائے۔ کاروبار میں تو بڑی بڑی سازشیں کرتے رہتے تھے لیکن اپنے ہی گھر کے خلاف کوئی سازش۔ وہ سوچتے رہے۔ ذہن نہ جانے کیا کیا منصوبے بناتا... اور پھر اُن کے طوفانی ذہن نے ایک منصوبہ تیار کر ہی لیا۔ وہ اس منصوبے کے اہم نکتوں پر غور کرتے رہے۔ دوسرے دن اُنھوں نے اپنی فرم کے ایک منیجر قاسم حسین کو اپنے پاس طلب کیا۔ یہ شاطر قسم کا انسان تھا۔ اور بہت سے معاملات میں شجاع احمد کا رازدار تھا۔

"مجھے ایسے ایک دو افراد کی ضرورت ہے جو ذہین ہوں اور چالاکی سے میرا ایک کام انجام دے سکیں۔"

"کام کی نوعیت کیا ہوگی جناب؟"

"یہ نہیں بتایا جا سکتا بس یوں سمجھ لو ایک خاندان میں داخل ہو کر اس کے اندرونی معاملات کا اندازہ لگانا ہے۔ کسی کے خلاف جاسوسی کرنی ہے۔"

"قتل وغیرہ بھی؟"

"اُوہ... نہیں۔ اُنھیں وہاں صرف رپورٹیں تیار کرنی ہوں گی کون کیا ہے، کیا کر رہا ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔"

"جی... اُن افراد کو اس خاندان میں اپنے طور پر داخل ہونا ہوگا یا اس کا کوئی اور بندوبست ہو سکتا ہے؟"

"نہیں... اُنھیں تمام سہولتیں ہم پہنچائی جائیں گی۔"

"تھوڑی سی تفصیل اور بتا دیجئے سر! کیا اُنھیں کوئی خطرناک کام بھی کرنا ہوگا؟"

"ہرگز نہیں۔ ایسی کوئی بات نہیں ہوگی۔ اُن لوگوں کا یا کسی ایک فرد کا ذہین خوش شکل اور اسمارٹ ہونا ضروری ہے ایک ایسی شخصیت جو دوسروں کو اپنی طرف متوجہ کر سکے۔"

"میں سمجھ گیا۔ اور یہ صرف اتفاق ہے کہ ایسے دو نوجوان میرے ذہن میں بھی ہیں۔" منیجر نے کہا۔

"کون ہیں وہ؟"

"دو بھائی جو جڑواں ہیں اور ایک دوسرے کے ہمشکل ہیں۔ میرے دُور کے رشتے دار ہیں۔ دونوں نے بی ایس سی کیا ہے۔ اور اب حالات کے تحت ملازمت کی تلاش میں ہیں۔ میں اُن کے بارے میں کسی وقت آپ سے بات کرنے والا تھا۔"

"میں نے جس کام کے لئے کہا ہے اُسے انجام دے سکیں گے؟"

"بخوبی... میں ذمہ داری لیتا ہوں۔"

"تب آپ اُنھیں مجھ سے ملا دیں۔ میں اُن سے بات چیت کروں گا۔ ان سے کہہ دیں کہ اُنھیں معقول مشاہرے پر رکھ لیا گیا ہے اور اگر اُنھوں نے میرا کام بحسن و خوبی انجام دے لیا تو ان کی یہ ملازمت پکی ہو جائے گی۔" شجاع احمد صاحب نے کہا۔

"کل صبح اُنھیں آپ کی خدمت میں پیش کر دوں گا۔" منیجر نے کہا۔ اور شجاع احمد نے گردن ہلا دی۔

دوسرے دن وعدے کے مطابق عازم اور فاخر کو شجاع احمد کے سامنے پیش کر دیا گیا۔ دونوں بھائی واقعی خوش شکل تھے۔ اُن کا ہمشکل ہونا بے حد دلچسپ تھا۔ اور یہی بات دوسروں کے لئے قابلِ توجہ بن سکتی تھی۔

"آپ نے اُنھیں میرا مافی الضمیر بتا دیا ہے؟" شجاع احمد نے منیجر سے پوچھا۔

"بخوبی... اور یہ آپ کے لئے پوری وفاداری کے ساتھ کام کرنے کو تیار ہیں۔" منیجر نے جواب دیا۔

"ٹھیک ہے منیجر صاحب! آپ جا سکتے ہیں۔ میں ان لوگوں سے گفتگو کروں گا۔" شجاع احمد نے کہا۔ اور منیجر کمرے سے باہر نکل گیا۔ منیجر کے جانے کے بعد شجاع احمد صاحب نے گہری نگاہوں سے ان دونوں کو دیکھا پھر بولے۔

"تعلیم کے اختتام کے بعد آپ نے اب تک کیا کیا ہے؟"

"ملازمت کی تلاش۔" فاخر نے جواب دیا۔

"آئندہ تعلیم حاصل کرنے کا ارادہ کیوں ملتوی کر دیا؟"

"حالات اس کے متقاضی نہ تھے۔" اس بار عازم بولا۔ دونوں کی

آواز حیرت انگیز طور پر یکساں تھی۔ اور دونوں کے گفتگو کرنے کا طریقہ بھی ایک ہی تھا۔

"ٹھیک ہے' انسان کو حالات کے تحت چلنا چاہیئے لیکن جو کام میں تم لوگوں کے سپرد کرنے والا ہوں۔ اس میں ابتدائی چیز رازداری ہے۔ تم دونوں کا تعلق چونکہ ایک ہی مشن سے ہوگا۔ اس لئے تم دونوں تو ایک دوسرے کے رازدار رہ سکتے ہو۔ لیکن اگر تمہارے قریبی حلقوں میں یا خود تمہارے . . . اپنے گھر میں میرے سپرد کئے ہوئے کام کا چرچا ہو گیا تو میرے اور تمہارے درمیان معاہدہ ختم ہو جائے گا۔ جو کام میں تمہارے سپرد کرنا چاہتا ہوں۔ وہ کسی نوعیت سے غیر قانونی نہیں ہے۔ بس یوں سمجھو کہ میں چند لوگوں کے بارے میں مفصل معلومات حاصل کرنے کا خواہشمند ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ اس گھرانے میں رہ کر تم اس گھرانے کے افراد کو بغور دیکھو' ان کا جائزہ لو' اُن کے عمل کا تعین کرو اور مجھے اس کے بارے میں رپورٹ دو۔ اس گھرانے میں تمہاری جو حیثیت ہوگی وہ میری متعین کردہ ہوگی اور کہیں بھی تم سے اس سلسلے میں باز پرس نہیں کی جا سکے گی۔ گویا تمہیں میری مکمل پشت پناہی حاصل ہے۔ اور ہر قسم کے ناخوشگوار نتائج میں خود قبول کروں گا۔"

"سر! اس کے بعد تو ہمارا کوئی کام رہ ہی نہیں جاتا سوائے اس کے کہ ہاتھوں اور آنکھوں کا استعمال کریں۔ آپ ہمیں اپنے لئے بہتر پائیں گے۔ جہاں تک رازداری کا سوال تو سب سے بڑا رازدار انسان کا پیٹ ہوتا ہے۔ ہم اپنے رزق پر لات نہیں ماریں گے۔"

"مجھے تمہاری باتوں سے خوشی ہوئی۔ سمجھدار آدمی معلوم ہوتے ہو۔ میں اپنا کام ہونے کے بعد تم پر ترقی کے دروازے کھول دوں گا اور تم یہاں رہ کر بہتر زندگی گزار سکو گے۔ یہ میری ذمہ داری ہے۔ لیکن جن لوگوں سے تمہارا واسطہ پڑے گا۔ وہ بھی بہت ذہین ہیں۔ یہ لوگ کوئی مجرمانہ کارروائی نہیں کرتے۔ بس گھریلو قسم کی باتیں ہیں۔ جن پر نگاہ رکھنی ہے۔ تمہیں کچھ لوگوں کو اپنا دوست بھی بنانا ہوگا۔ اور میری ہدایت کے مطابق اُن کی... سوچ میں کچھ تبدیلیاں بھی پیدا کرنی پڑیں گی۔ کام ایک لحاظ سے مشکل ضرور ہے لیکن ناممکن نہیں۔ میں محسوس کرتا ہوں کہ تمہاری یہ دوہری شخصیت بہت سوں کے لئے قابل دلچسپی ہوگی اور تم ان کی توجہ حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاؤ گے۔"

"ایسا ہی ہوگا جناب' ایسا ہی ہوگا۔ آپ بالکل مطمئن رہیں۔" فاخر نے کہا۔

"لیکن دوسری صورت حال بھی ہے۔ اگر تم لوگ اپنے طور پر اس میں کامیاب نہ ہوئے۔ اور کسی بھی طور تم نے میرے لئے نقصان دہ بننے کی کوشش کی تو پھر تمہارے ساتھ بہتر سلوک نہ ہوگا اور بدعہدی کے نتیجے میں تمہیں نقصانات بھی پہنچائے جا سکتے ہیں۔"

"ایسا نہیں ہوگا سر... ! آپ ہماری طرف سے مطمئن رہیئے۔"

"میں چاہتا ہوں کہ قاسم حسین کو بھی یہ نہ معلوم ہو سکے کہ میں نے تمہیں کس کام پر لگایا ہے۔ اچھے اور وفادار ساتھیوں کی حیثیت سے یہ بات تم پر فرض ہوتی ہے۔ قاسم حسین اگر تم سے پوچھے کہ میں نے تمہارا تقرر کہاں کیا... ہے۔ تو تم اس سے بڑی صاف گوئی سے کہہ سکتے ہو کہ تمہیں اس سلسلے میں منع کر دیا گیا ہے۔ اور مالکان سے وفاداری تمہارا فرض ہے۔"

"ہم آپ کو یقین دلاتے ہیں کہ ایسا ہی ہوگا۔"

"تو ٹھیک ہے' ڈھائی ہزار روپے ماہوار سے میں تمہاری ابتدا کر رہا ہوں۔ تم دونوں کو ملا کر پانچ ہزار روپے ملیں گے۔ اس کے علاوہ دیگر اخراجات کی ذمہ داری بھی قبول کی جاتی ہے۔ خواہ کتنے ہی ہوں۔ میں تمہیں مفصل ہدایات دے دوں گا کہ تمہیں اس سلسلے میں کیا کرنا ہے۔ یوں سمجھ لو کہ تمہیں میرے کام میں کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔"

"یہ ہماری خوش بختی ہے۔ ہم خلوص دل سے آپ کی یہ خدمت انجام دینے کے لئے تیار ہیں۔"

"شکریہ' مجھے اپنا پتہ نوٹ کرا دو' میں ضروری کارروائی کرنے کے بعد تم سے رابطہ قائم کر لوں گا۔ باقی تمہاری ملازمت کا سلسلہ آج ہی سے شروع ہو گیا ہے۔ ضرورت کے لئے اگر رقم درکار ہو تو میں قاسم حسین کو ہدایت کئے دیتا ہوں۔ ایک ایک ماہ کی تنخواہ ایڈوانس وصول کر لو۔"

دونوں بھائیوں کے چہرے مسرت سے سرخ ہو گئے تھے۔ انہوں نے پُر خلوص انداز میں شجاع احمد صاحب کا شکریہ ادا کیا اور سلام کر کے باہر نکل گئے۔

شجاع احمد صاحب گہری نگاہوں سے ان کا جائزہ لے رہے تھے۔ یہ سب کچھ کر کے اُن کا دل بھی خوش نہیں تھا۔ اپنے ہی گھر میں اپنے ہی اہل خاندان کے خلاف سازش کر رہے تھے۔ لیکن کم بخت زاہد ذوالفقار کی سرکوبی کے لئے یہ سازش ضروری تھی۔ وہ اتنا آگے بڑھ چکا تھا کہ شجاع احمد صاحب کا اثر ہی ختم کئے دے رہا تھا۔ ان کے اپنے خاندان سے وہ ان کی ہوا اکھاڑ چکا تھا۔ اور اب' اب اُن کی اولاد بھی ان کے مُنہ آنے لگی تھی۔ یہ صُورت حال تو کسی بھی طرح قابل برداشت نہیں تھی۔ وہ اپنے گھر کو کس طرح نہیں چھوڑ سکتے تھے کہ زاہد ذوالفقار جیسے لوگ گھر ہی کو اُجاڑ نہیں سکتے۔ شجاع احمد صاحب نے آخری حربے محفوظ رکھے تھے اور ایک معمولی سا نوجوان اُن کی شخصیت سے باآسانی نہیں ٹکرا سکتا تھا۔ لیکن وہ اس حد تک جانے کے خواہشمند نہیں تھے۔ اپنی زندگی کے اس دور کو وہ بہت پیچھے چھوڑ آئے تھے۔ اور اب اُسے آواز دینا اُن کے لئے کوئی خوشگوار حیثیت نہیں رکھتا تھا۔ اگر زاہد ذوالفقار سیدھی انگلیوں سے ہی مان جاتا تو بہت

بہتر ہے ورنہ کسی ایک آدمی کا دودھ کی مکھی کی طرح نکال پھینک دینا اُن کے لئے ممکن نہیں تھا۔

اس شام کوٹھی واپس آئے تو انھوں نے اپنے رویئے میں تھوڑی سی تبدیلی پیدا کرلی تھی۔ پچھلے دو دنوں تک جس طرح ذہنی تکدر کا شکار رہے تھے۔ اس کا احساس گھر والوں کو بھی تھا لیکن انھوں نے اچھی طرح محسوس کیا تھا کہ وہ اُن کی اس کیفیت کا نوٹس بھی نہیں لے رہے تھے۔ گویا وہ خود بھی اپنی ناراضگی کا اظہار کر رہے تھے۔ اور اس بات پر یقین رکھتے تھے کہ احمد رضا نے جو کچھ کہا ہے وہ بالکل جائز ہے۔

شجاع احمد صاحب نے اچھی طرح محسوس کر لیا تھا کہ اُن تمام لوگوں میں گٹھ جوڑ ہے۔ اور کوئی بھی کسی کے خلاف کچھ بھی کہنے پر آمادہ نہیں ہے۔ چنانچہ اُن میں سے تو کسی کو اپنا ساتھی منتخب نہیں کیا جا سکتا تھا۔ ساری باتیں بیگم ہی سے ہوئی تھیں۔ رات کو وہ بیگم کے ساتھ بیٹھ کر مختلف موضوعات پر باتیں کرتے رہے پھر چونک کر بولے۔

"ارے ہاں وہ تمھیں الیاس احمد یاد ہے؟"

"کون الیاس احمد؟" بیگم صاحبہ اچنبھے سے بولیں۔

"ارے وہی میرا بچپن کا لنگوٹیا یار۔ جس نے اپنی تمام زندگی یورپ میں گزاری ہے۔"

"الیاس احمد! نہیں بھئی مجھے یاد نہیں آ رہے۔" بیگم صاحبہ نے کہا۔

"ہاں... دراصل ابتدا میں تم سے دو تین ہی ملاقاتیں ہوئی تھیں۔ ویسے تمھاری یادداشت بڑی کمزور ہو گئی ہے۔ بھئی تعجب کی بات ہے۔ اس کا مطلب ہے الیاس کے بیوی بچے بھی بھول گئی ہوگی تم؟"

"واقعی مجھے تو یہ نام یاد ہی نہیں آ رہا۔" بیگم صاحبہ نے شوہر کو خوشگوار موڈ میں پایا تو خود بھی اپنے لہجے میں تبدیلی پیدا کرلی۔

"بہرطور مجھے یاد ہے اور خاص طور سے یوں کہ اُس سے میرے کچھ کاروباری معاملات بھی چل رہے ہیں۔ باہر رہ کر وہ کئی بار مجھے فائدے پہنچا چکا ہے۔"

"اچھا... مگر اس کا تذکرہ اس وقت کیوں آیا؟"

"ایک خاص مقصد کے تحت۔ اس کے دونوں بیٹے یہیں ہیں اور یہاں تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ پہلے وہ کسی دوسرے شہر میں تھے لیکن اب وہ یہاں آ رہے ہیں۔ الیاس نے مجھے فون کیا تھا۔ کہنے لگا اپنے بھتیجوں کا خیال رکھو۔ ان کا قیام کسی بورڈنگ وغیرہ میں مناسب طور پر کرا دو... کیونکہ وہ میرے شہر آ رہے ہیں۔ میں نے کہا بھئی اپنا گھر موجود ہے۔ بچوں کو بورڈنگ میں داخل کروانے کی کیا ضرورت ہے۔ اور پھر تین چار مہینوں کی بات ہے۔ اس کے بعد الیاس خود بھی یہاں آ رہے ہیں۔ اُن کا خیال ہے کہ بچوں کے لئے کوئی بہتر گھر خرید لیا جائے اور وہاں انھیں منتقل کر دیا جائے۔ اب تم بتاؤ تین چار مہینوں کے لئے میں یہ بات کیسے کہہ سکتا تھا کہ وہ بورڈنگ میں رہیں۔ چنانچہ میں نے اُسے پیشکش کر دی ہے کہ بچے یہیں میرے پاس رہیں گے۔ تمھیں اس پر کوئی اعتراض تو نہیں ہے؟"

"نہیں... ہرگز نہیں۔ جہاں اتنے سارے افراد ہیں۔ وہاں وہ دو بچے بھی رہ لیں گے۔ کیا چھوٹی عمروں کے ہیں؟"

"نہیں سُنا ہے ماشاءاللہ جوان ہیں۔ جڑواں ہیں دونوں ایک کا نام عادم اور دوسرے کا فاخر ہے۔"

"ٹھیک ہے آپ جہاں بھی مناسب سمجھیں اُن کے لئے بندوبست کر دیں۔"

"ویری گڈ، تمھارے اس تعاون سے مجھے بڑی خوشی ہوئی ہے۔"

"آپ خود ہی گھر سے اکھڑے اکھڑے رہتے ہیں۔ ورنہ یہاں کون ہے جو آپ کے ساتھ تعاون نہیں کرے گا۔ اور پھر خاص طور سے ایسے کسی مسئلے میں۔"

"نہیں بیگم یہ بات نہ کہو۔ مجھے اس گھر سے کچھ شکایتیں پیدا ہو گئی ہیں۔"

"میں جانتی ہوں ان ساری شکایتوں کی وہی یتیم بچہ ہے۔ جس کا نام ناہر ہے۔ کم بخت اپنا خون نہیں ہے لیکن اتنا مخلص اور اتنا سچا انسان ہے۔ اتنی محبت کرتا ہے اس گھر والوں سے کہ اپنی ایک علیحدہ ہی حیثیت بنالی ہے اس نے۔"

"ہاں آپ لوگوں نے یہی تصور کر رکھا ہے اور میں اس وقت کا منتظر ہوں جب وہ آپ لوگوں کو کوئی گہری چوٹ دے کر جائے گا۔ اور آپ لوگ ہاتھ ملتے رہ جائیں گے۔"

"یہی ہمارے اور تمھارے درمیان اختلاف کی وجہ ہے۔ شجاع احمد بات صرف یہ نہیں ہے کہ ناہر ہمارے لئے کوئی خاص حیثیت رکھتا ہے۔ بلکہ میں اور بچے تم سے اس بات پر نالاں ہیں کہ ہم اپنی مرضی سے یہاں کچھ بھی نہیں کر سکتے اور تم ہم پر ہمیشہ حکومت کرتے چلے آئے ہو۔ اگر ناہر کو گھر کے تمام افراد پسند کرتے ہیں تو تم بھی تو کسے آزما کر دیکھو تم اس سے کیوں کدر رکھتے ہو۔" بیگم صاحبہ نے کسی قدر بگڑے ہوئے لہجے میں کہا۔

"دیکھ رہا ہوں دیکھ رہا ہوں۔ جو کچھ میری آنکھیں دیکھ رہی ہیں۔ وہ تم نہیں دیکھ رہیں بیگم۔ میں دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ یہ شخص یہاں بے مقصد نہیں آیا۔ یہ کچھ کر کے جائے گا یہاں سے۔"

"جب کچھ کر جائے گا تب ہمیں ذلیل و خوار کر لینا۔ اس سے پہلے ہم اس کے بارے میں کچھ سُننے کو تیار نہیں ہیں۔"

"کہا ہے نا ابتدا کر چکا ہے۔ کیا تمھیں اپنا حلیہ یاد نہیں کیا تم اپنا وہ ماضی بھول گئیں جس میں تم ایک شریف خاندان کی شریف عورت نظر آتی تھیں۔

کیا میرے بچے مثالی حیثیت نہیں رکھتے تھے۔ اس جدید دور میں بھی وہ تھوڑی
کی روایات کو زندہ نہیں رکھے ہوئے تھے۔ مجھے بتاؤ کیا لوگ یہ نہیں کہتے
تھے کہ شجاع احمد نے اپنے گھرانے کو ایک مثالی حیثیت دے رکھی ہے" شجاع احمد
نے تیز نظروں سے بیگم کو گھورتے ہوئے کہا۔
"ہاں کہتے تھے۔ لیکن شجاع احمد صاحب آپ تھوڑی روایت کو اس
گھر میں کہاں سے آئے ہیں۔ بار دوشی کی بات کہاں قبول کرتے ہیں۔ یہ دو بچی کی روایات
تو تھوڑے مختلف تھیں۔"
"دیکھو، دیکھو تم پھر مجھ پر طنز کرنے لگیں۔ اگر ہم کوئی اچھائی اپناتے ہیں تو اس
میں کوئی بُرائی ہے"
"نہیں نہیں ہرگز نہیں۔۔۔ لیکن ایک اچھائی اور اپنا لو تو۔ جس کا نام
زاہد ہے"
"ٹھیک ہے ٹھیک ہے۔ ایک جگر داڑھی مونچھیں بڑھا کر اسٹیج
پر پھدکنے لگا ہے۔ دوسرا غزلوں کا ہمدرد بن گیا ہے۔ تیسری کو تجریدی
مصور بننے کا شوق پیدا ہوگیا ہے۔ باقی دورہ گئے ہیں۔ دیکھو زاہد ذوالفقار
انھیں کیا بناتا ہے"
"کچھ بھی ہو، میں آپ کے اس سے اختلاف کو برداشت نہیں
کرسکتی۔ وہ میرے بچوں کو صحیح تربیت دے رہا ہے۔ وہ کام جو آپ نے
نہیں کیا وہ انجام دے رہا ہے"
"ہاں ہاں! تھوڑے دنوں کے بعد وہ میرے بچوں کی ولدیت
میں اپنا نام بھی لکھنے لگے گا"
"دیکھئے آپ پھر اُلٹی سیدھی باتیں کرنے لگے۔ کیا اس طرح اس
گھر میں کسی غیر کو رکھیں گے جہاں ہر وقت میدانِ کارزار گرم رہتا ہے؟ کیا
اس طرح کسی اور کو یہاں بلا کر اس گھرانے کو ذلیل کریں گے، نا بابا نا۔ میرے
لئے ممکن نہیں ہوگا۔ گھر کی بات گھر میں ہی رہنی چاہیئے۔ بچیاں ہیں میرے
سامنے۔ انھیں بھی کل کو دوسرے گھر جانا ہے اگر یہاں یہی سب کچھ ہوتا رہا
تو کام کیسے چلے گا"
"ہوں اب اس رُخ پر آگئیں۔ اگر میرے دوست کے دو بچے
یہاں پر قیام کریں گے تو آپ کو ناگوار گزرے گا۔ اور وہ جو اس سارے
گھر میں دندناتا پھرتا ہے وہ جس نے اس گھر کو اپنی ملکیت سمجھ لیا ہے۔
وہ آپ کے لئے سب سے زیادہ مقدم ہے"
"ارے میں کیا کہہ رہی ہوں آپ خود ہی ایسی باتیں کرتے ہیں۔
آپ خود سوچیئے آج تو یہ باتیں ہمارے ہی اپنے گھر میں ہیں۔ ہم ہی لوگوں
تک محدود ہیں۔ لیکن جب وہ نئے آجائیں گے تو کیا بات گھر سے باہر
نہیں نکلے گی؟"
"کیسے نکلے گی اور پھر میں کہتا ہی کیا ہوں" شجاع صاحب نے
پینترا بدل لیا۔ "اگر دل کی بات تم سے کہی تو تم بُرا مان گئیں بس اس کے
علاوہ اب گھر میں میری حیثیت رہ ہی کیا گئی ہے۔ ٹھیک ہے بھئی
آپ زاہد کو سر پر بٹھائیے۔ وہ جو کچھ کہے وہی اس گھر میں کیجئے۔ میرا اپنا
کیا ہے۔ میں تو مجبور آدمی ہوں جو اپنے ہی گھر اپنے ہی خاندان کے ہاتھوں
ذلیل و خوار ہو رہا ہوں" شجاع احمد صاحب خاموش ہوگئے۔ دل کی
بھڑاس زبان تک آگئی تھی ورنہ طے یہ کیا تھا کہ اب ماحول میں ذرا سی تبدیلی
پیدا کی جائے گی تاکہ عازم اور فاخر کے لئے ایک مناسب ماحول پیدا ہو
جائے۔ اور انھیں اپنے کام میں کوئی دقت نہ ہو۔
بیگم صاحبہ تھوڑی دیر تک بڑبڑاتی رہیں اور اس کے بعد اُٹھ کر
باہر نکل گئیں۔ شجاع احمد صاحب گہری نگاہوں سے دروازے کو تکتے رہ
گئے تھے۔ اُن کے ذہن میں نجانے کیا کیا خیالات تھے۔

★★

گھر کے ماحول میں ابتدا ہی سے شجاع احمد صاحب کی سنجیدگی گھلی
ہوئی تھی۔ یہ بات نہیں تھی کہ بچے ہنسنا نہیں جانتے تھے۔ بس اُن کی
اپنی تفریحات رہتی تھیں۔ لیکن سب کے سب شجاع احمد صاحب
کے محکوم تھے اور اس بات کا خیال رکھتے تھے کہ کہیں اُن کی کوئی حرکت
شجاع احمد صاحب کو ناگوار نہ گزرے۔ بے شمار باتیں ایسی ہوتی تھیں۔
جو ان کی پسند کے مطابق نہیں ہوتی تھیں۔ لیکن شجاع احمد کے خوف سے
انھیں وہ سب کچھ کرنا پڑتا۔ انھیں کوئی مہمیز دینے والا نہیں تھا اور جب
سے زاہد ذوالفقار اس گھر میں آیا تھا۔ ان کی شخصیتیں بدل گئی تھیں۔ ایک
طرح سے وہ اُن کا سہارا بن کر رہ گیا تھا۔ اس کے ذریعے وہ اپنے دل
کی بھڑاس نکال سکتے تھے۔ اس جدید ماحول میں شجاع احمد صاحب کی
نازل کی ہوئی قدامت انھیں پسند نہیں تھی۔ لیکن بس کوئی ہمت دلانے
والا نہیں ملا تھا۔ اور اب جب کہ زاہد ذوالفقار کے ذریعے وہ اپنی دبی
ہوئی خواہشات کی تکمیل کرنے پر قادر ہو گئے تھے تو پھر بھلا زاہد سے بہتر
شخصیت اُن کے لئے اور کونسی ہوتی۔ سب سے بڑی بات یہ تھی کہ
جب بھی وہ زاہد کے کردار پر نگاہ ڈالتے۔ وہ انھیں بے لوث محسوس ہوتا۔
کبھی بھی تو اس بے چارے نے اپنی ذات کے لئے کوئی کام نہیں کیا تھا۔
بس اُن ہی کی بہتری، اُن ہی کی خوشیوں کے لئے اس نے خود کو وقف کر
دیا تھا۔ چنانچہ یہی وجہ تھی کہ اب اس گھر کے افراد میں جرأت پیدا ہوگئی تھی۔
اور بیگم صاحبہ جو ہمیشہ شوہر کی بات کو آخری بات سمجھتی چلی آئی تھیں۔ اب
اپنی مرضی بھی مقدم سمجھنے لگی تھیں اور شوہر سے آنکھ ملانے کی جرأت اُن
میں پیدا ہوگئی تھی۔
بالکل ہی جاہل نہیں تھیں۔ دُنیا میں رہنا جانتی تھیں۔ لیکن شوہر
کی مرضی کے مطابق ہی زندگی گزارتی چلی آئی تھیں۔ اب جو انھیں کھل

کھیلنے کا موقع ملا تو دبی ہوئی آرزوئیں ہوا پا گئیں جو کچھ اُنھوں نے
اب تک نہیں کیا تھا وہ سب کچھ کرنے کو اُن کا دل مچلنے لگا۔ اس
میں کوئی بُرائی بھی نہیں تھی۔ تقاریب میں جو بیگمات شامل ہوتی تھیں۔
وہ ان میں خود کو بے حد پسماندہ محسوس کرتی تھیں۔ لیکن اب اُنھیں...
احساس ہو رہا تھا کہ یہ پسماندگی ان پر مسلط کی گئی تھی۔ شجاع احمد صاحب
اپنی ناجائز حکومت چلانے میں پیش پیش تھے اور اُنھوں نے ان سب
کی شخصیتیں ہی مسخ کر کے رکھ دی تھیں۔ آہستہ آہستہ اُنھیں احساس
ہونے لگا تھا کہ اُن کی جرأت سارے گھر والوں کے لئے بہتری کا سامان
بن رہی ہے تو اُنھوں نے اپنے آپ کو شجاع احمد صاحب کے سامنے
کچھ اور مضبوط کرنے کی کوششیں شروع کر دیں۔ دو تین بار ہی ...
شجاع احمد صاحب سے ٹکراؤ ہوا تھا اور اُنھوں نے محسوس کیا تھا کہ

اب تک وہ حماقت کرتی رہیں۔ اگر یہی لہجہ اور یہی زبان اگر پہلے استعمال
کر لی جاتی تو شاید یہ سب کچھ پہلے ہی ہو چکا ہوتا۔ لیکن جرأت دلانے والا
کون تھا۔ پھر وہ معصوم سا بچہ، محبت کرنے والا مخلص اور پیارا پیارا اُن
کی زندگی میں آ گیا اور اس نے ان کی فطرت بھی بدل ڈالی بھلا زاہد کو کون پیار نہ
کرتا۔ احمد رضا نے جرأت سے کام لے کر باپ سے وہ الفاظ کہہ دیئے
تھے جو شاید وہ زندگی میں کبھی نہ کہہ پاتا۔

لیکن اس کے بعد دنوں اُسے کپکپی چڑھی رہی تھی۔ بھلا کلینک
بنوانے کے لئے دولت کا بندوبست وہ کہاں سے کر سکتا تھا۔ اس
دن کے بعد سے آج تک وہ شجاع احمد صاحب کے سامنے نہیں آ سکا
تھا۔ ہر وقت اپنی سوچ میں غلطاں رہتا۔ اُسے احساس ہو گیا تھا کہ
شجاع احمد صاحب کی دولت کے بغیر اس کی زندگی بے کار ہو گی۔ سوائے
اس کے کہ کسی ہسپتال میں ہاؤس جوب کرے اور وہیں سے اپنی عملی
زندگی کا آغاز کرے۔

زاہد اپنی مصروفیتوں میں گم تھا لیکن دو تین دن کے اندر ہی
اُسے احساس ہو گیا کہ احمد رضا غیر معمولی طور پر غائب ہے۔ چنانچہ اس
وقت اس نے اُسے اس کے کمرے میں ہی پکڑا تھا۔

احمد رضا میڈیکل کی ایک کتاب لئے ایک آرام کرسی پر دراز تھا۔
زاہد کو دیکھ کر کھل اٹھا۔

"آیئے زاہد بھائی! بہت مصروف نظر آتے ہیں آپ آج کل۔"

"نہیں قبلہ! مصروف تو میں آپ کو دیکھ رہا ہوں۔ کہاں غائب
ہیں اتنے دن سے؟"

"بس ... بس زاہد بھائی! اپنے کمرے میں ہی رہتا ہوں زیادہ تر۔"

"کیوں کیا مراقبہ کر رہے ہیں؟" زاہد نے پوچھا۔ اور احمد رضا پھیکے سے
انداز میں ہنسنے لگا۔

"اسے یہ کوئی ہنسنے کا انداز ہے۔ مجھے یہ پھسپھسی سی ہنسی پسند
نہیں۔ بھرپور قہقہے لگاؤ کہ یہی زندگی کی علامت ہیں۔" زاہد نے مسکراتے
ہوئے کہا۔

"آپ کا سا جگر کہاں سے لاؤں زاہد بھائی ڈیڈی سے جو بات
چیت ہوئی ہے اس نے مجھے دہشت زدہ کر کے رکھ دیا ہے۔"

"ارے ارے، گویا میری ساری تربیت خاک میں مل گئی۔"

"نہیں یہ بات نہیں ہے۔ لیکن آپ بتایئے جو کچھ ہوا ہے اس
کا نتیجہ کیا ہو گا؟"

"وہی جو تم چاہو گے۔" زاہد نے اعتماد سے مضبوط لہجے میں کہا۔

"مگر یہ کیسے ممکن ہے؟"

"صاحبزادے احمقانہ باتوں سے گریز کرو۔ زندگی میں نیک...
راستوں کی جانب قدم بڑھائے ہیں۔ تاریخ گواہ ہے کہ نیکیوں کو
کبھی شکست نہیں ہوتی۔ ہاں اُن کی راہ میں رکاوٹیں ضرور پیدا کی
جاتی ہیں۔ لیکن ایک لمحہ ایسا آتا ہے جب رکاوٹیں پیدا کرنے والے
خود ہی اُن رکاوٹوں کو سمیٹتے نظر آتے ہیں۔"

"یہ الفاظ تو بے حد خوب صورت ہیں زاہد بھائی! لیکن میرے
سامنے عمل نہیں ہے۔"

"زاہد بھی نہیں ہے تمہارے سامنے؟"

"بس ایک آپ ہی کا تو سہارا ہے زاہد بھائی۔ لیکن میری کچھ
میں نہیں آیا کہ آپ اس مرحلے کو کیسے حل کریں گے؟"

"میاں اپنی تو زندگی ہی ان ساری باتوں کے لئے وقف ہے۔
تم نے کوئی ایسی بات تو نہیں کہی شجاع احمد صاحب سے، جس پر
تمہارا ضمیر تمہیں ملامت کر رہا ہو۔ جو مذکرہ شجاع احمد صاحب ایک اعلیٰ
پائے کا کلینک بنوانا چاہتے ہیں۔ ایک ایسا کلینک جس میں دُنیا بھر
کی جدید ترین مشینری جمع کر دی جائے اور سائنسی اصولوں پر یہاں علاج
ہو۔ کوئی بھی بڑی آسامی اگر ایک بار اس اسپتال میں آ کر پھنس جائے
تو زندگی بھر نہ نکل پائے اور اپنا آدھا سرمایہ اپنی بیماری پر خرچ کر دے۔
مجھے اس سے اختلاف نہیں ہے جو کچھ شجاع احمد صاحب نے کیا ہے۔
تم پر لگایا ہے۔ اور اگر وہ تم سے ایک ایک کے دس دس وصول کرنا
چاہتے ہیں تو یہ ان کا حق ہے۔ میں تم سے صرف ایک سوال کرتا ہوں
احمد رضا۔ اور وہ یہ کہ تمہارے اس جدید ترین کلینک میں غریبوں کے علاج
کی گنجائش ہو گی؟ کیا شجاع احمد صاحب کسی ایسے شخص کو وہاں داخل
ہونے دیں گے جس کی جیب میں پیسہ نہ ہو؟ احمد رضا زندگی صرف
چند کپڑوں اور دنیا کی وقت کی روٹی تک محدود ہے۔ مجھے بتاؤ کیا

تم ہیرے کھا سکتے ہو، سونے کے ڈھیر چبا سکتے ہو، بے شک تم اُن کے انبار لگا لو۔ سارا سوسائٹی تمھاری عزت کرے گی۔ لیکن تمھاری اپنی ذات کے لئے اُن میں سے کیا ہوگا۔ کیا وہ نیکیاں جو تم کرو گے، تمھارے کسی کام نہیں آئیں گی۔ رضا میاں ایک غریب کو ایک ایسے شخص کو جو جیتی ... سہولتوں سے محروم ہو اپنی بیماری سے ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر رہا ہو ایک بے بسی کی موت۔ اُسے تم زندگی دے کر دُنیا بھر کی خوشیاں نہیں کما لو گے۔ دیکھو رضا۔ شجاع احمد صاحب بھی انسان ہیں۔ ایک دن اُنھیں بھی فنا ہو جانا ہے۔ اُن کی دولت کی ہوس تمھیں کچھ نہیں دے گی۔ جب کہ تمھاری کوئی بھی نیکی تمھیں دُنیا بھر کی خوشیوں سے ہمکنار کر دے گی، نہ صرف دُنیا تم دین میں بھی سرخرو ہو جاؤ گے تم نے اس لئے اپنے باپ سے بغاوت کی ہے کہ تم نیکیوں کی جانب سفر کرنا چاہتے ہو۔ مذہب، تاریخ، دین کوئی بھی کتاب اُٹھا کر دیکھ لو تمھیں اس کا اندازہ ہو جائے گا کہ ہر بیٹے نے ہر بڑے آدمی نے ہمیشہ یہی سبق دیا ہے کہ اگر نیکی کی جانب قدم اٹھاؤ تو پھر راستے کے ہر درخت کو بھول جاؤ۔ کوئی بھی چیز تمھارے سامنے آ جائے تم مردانہ وار اُسے اپنے سامنے سے ہٹا کر آگے بڑھتے رہو۔ زندگی تمھاری اپنی ہے۔ کوئی تمھیں زندگی دے سکتا ہے۔ نہ تم سے زندگی چھین سکتا ہے۔ میرا خیال ہے شجاع احمد صاحب کو اُن کے اپنے راستے پر چلنے دو تم نے جس راستے کا انتخاب کیا ہے اس پر ٹھوس رہو۔"

"وہ تو ٹھیک ہے اد بھائی! میں آپ سے مکمل طور پر متفق ہوں۔ لیکن یہ بتائیے میں کلینک کہاں سے بناؤں گا؟"

"میں نے کہا نا زاہد جو تمھارے سامنے ہے میں تمھیں دادا جان سے ملانا چاہتا ہوں۔"

"دد، دد... دادا جان سے وہ کلینک کیوں؟"

"اس لئے کہ اُن مسائل کا حل دادا جان پیش کریں گے۔"

"مم... مگر وہ کیا۔ وہ کیا پیش کریں گے؟"

"آؤ... میرا خیال ہے اس وقت شجاع احمد صاحب بھی گھر میں موجود نہیں ہیں۔ دادا جان سے بات کر لیں۔" عاطر نے کہا اور احمد رضا تیار ہو گیا۔ بہرطور دادا جان سے سب ہی محبت کرتے تھے لیکن بعض معاملات میں اُن سے خوفزدہ بھی رہتے تھے۔

حسنا احمد صاحب نے پرتپاک انداز میں استقبال کیا تھا شاید زاہد وہاں پہلے ہی کوئی مسئلہ کر چکا تھا۔

"آؤ رضا بیٹے! کہاں ہو بھئی تم لوگ کہا تھا کم از کم دن میں ایک بار مجھ سے مل لیا کرو تمھاری ہی وجہ سے زندگی کی دلکشیاں باقی ہیں۔" احمد رضا شرمندگی سے سکڑا سکڑایا سا ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔

"مسئلہ یہ ہے دادا جان کہ احمد رضا اپنے اس اعلان کے بعد سے آج تک متفکر ہیں وہ ایک اتنی بڑی بات کہہ چکے ہیں جس کے بارے میں اُن کا خیال ہے کہ وہ اُسے پورا کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔"

"کون سی بات میاں۔ کچھ کہو تو سہی مجھ سے؟"

"شجاع احمد صاحب سے اُن کا معرکہ ہوا تھا۔ شجاع احمد صاحب اُن کی تقریر سے بالکل غیر متفق ہیں وہ کسی غریب کو اس کلینک میں نہیں گھسنے دینا چاہتے جو احمد رضا بنوائیں گے۔"

"تو پھر کیا وہ خود اس میں داخل ہوگا؟" دادا جان نے غصیلے لہجے .. میں پوچھا۔

"خدا نہ کرے، خدا نہ کرے۔ ہمیں اُن کی صحت و زندگی کی دُعائیں کرتے رہنا چاہیئے۔ لیکن دوران گفتگو احمد رضا بھی گرم ہو گئے تھے جب شجاع احمد صاحب نے کہا کہ وہ اس کلینک کے لئے ایک پھوٹی کوڑی بھی نہیں دیں گے تو احمد رضا نے کہا کہ اس کا بندوبست وہ خود کر لیں گے۔"

"ہوں تو پھر اب پریشانی کس بات کی ہے؟" دادا جان نے کہا۔ اور احمد رضا چونک کر اُنھیں دیکھنے لگا پھر آہستہ سے بولا۔

"دادا جان! آپ میری اس گستاخی سے ناراض تو نہیں ہیں؟"

"کمال ہے میں انسان ہوں میاں! نیک کاموں کا اعلان کیا ہے تم نے جب کہ میں خود بھی ایک ایسے پروجیکٹ کی تکمیل میں مصروف ہوں جو صرف غریبوں اور معذوروں کے لئے ہے تو پھر میں تمھیں اس کام سے کیسے منع کروں گا؟"

"دادا جان ..." احمد رضا کی آنکھیں خوشی سے چمک اُٹھیں۔

"ہاں میاں ہاں۔ تم کیا سمجھتے ہو شجاع احمد میری اولاد ہے۔ میں اگر چاہوں تو اس سے ایک ایک پائی چھین سکتا ہوں۔ اور تمھیں دے سکتا ہوں۔ لیکن میں ایسا نہیں کروں گا۔ فرسٹ ایڈ ہاؤس کی تیاری میں بھی میں نے شجاع احمد سے زیادہ مدد نہیں لی ہے اپنے وسائل اور اپنے سہاروں سے کام لے رہا ہوں تو کیا اس سلسلے میں میں تمھاری معاونت نہیں کر سکتا۔ شاید میں پہلے بھی تم سے کہہ چکا ہوں کہ فرسٹ ایڈ ہاؤس ایک ایسا ادارہ ہوگا۔ یہاں ہر وہ شخص جو کسی تکلیف کا شکار ہوگا اپنے آپ کو سنبھالا دینے کے لئے قیام کر سکتا ہے ہم اس میں ان مریضوں کو بھی شامل کر سکتے ہیں جو اپنا علاج کرانے کے قابل نہیں ہیں۔ اگر اُن کا علاج اُنھیں زندگی اور صحت دے دے تو کیا اُن پر یہ فرض عائد نہ ہوگا کہ صحت مند ہو کر جب وہ عملی دُنیا میں اپنا مقام حاصل کرنے کی کوشش کریں تو فرسٹ ایڈ ہاؤس کو بھی نہ بھولیں اُسے اپنی آمدنی میں سے تھوڑا سا حصہ ضرور دیں تاکہ اس کا کاروبار یونہی چلتا رہے۔ تم ذرا غور تو کرو احمد رضا! ہم ایسے انسانوں کو سہارا دے کر اُنھیں خرید لیں گے۔ وہ خوشی سے فرسٹ ایڈ کو اپنی محنت

کے ثمر میں سے کچھ حصہ دینے پر تیار ہو جائیں گے۔ تمہارا کلینک بھی اُس سے چلے گا سمجھے تم فرسٹ ایڈ ہاؤس سب سے پہلی ایڈ تمہیں دینے کا اعلان کرتا ہے اس کا ایک بہت بڑا حصہ ایک بہت بڑا کلینک ہو گا۔ جس میں بے شمار بستر ہوں گے احمد رضا اور بہت سے ڈاکٹرز لاعلاج اور نادار مریضوں کی خدمت کریں گے اور اپنے طور پر کوشش کریں گے کہ خداوند قدوس انہیں صحت سے ہمکنار کر دے۔ تم اپنی ساری ... پریشانیاں بھول جاؤ اور فرسٹ ایڈ ہاؤس جا کر کلینک کے لئے جگہ منتخب کرو نقشے میں تبدیلیاں کرالی جائیں گی۔" دادا جان نے کہا احمد رضا کا خوشی سے بُرا حال ہو گیا تھا وہ دوڑ کر دادا جان سے لپٹ گیا۔

"آپ نے میری عزت رکھ لی دادا جان! میری لاج رکھ لی۔ میں یہ الفاظ ادا کرنے کے بعد موت کی قیمت پر بھی ڈیڈی سے دوبارہ اپنی مدد کے لئے نہیں کہہ سکتا تھا آپ نے مجھے میرا مقام دے دیا۔ دادا جان میں آپ کا جتنا بھی شکر گزار ہوں کم ہے۔"

"ابے ابے میری اولاد کی اولاد ہے مکھن لگا رہا ہے۔ مجھے کوئی احساس نہیں کیا میں نے تیرے اوپر نیکیوں میں میں نے بھی حصہ بٹا لیا ہے۔" دادا جان نے کہا احمد رضا خوشی سے ناچ رہا تھا پھر اُس نے ناہد کو پکڑ لیا۔

"زاہد بھائی! مجھے افسوس ہے کہ میں تین دن تک پریشانیوں کا شکار رہا۔ آپ ہی نے مجھے اس راستے پر لگایا ہے۔ میں نے آپ ہی سے تو مشورہ کر لیا؟"

"بس بس ٹھیک ہے۔ اب تو خوش ہو۔" زاہد نے کہا اور احمد رضا مسرت سے گردن ہلانے لگا۔

"تو پھر میں آج ہی وہاں چلا جاؤں گا۔ دادا جان آپ فوری طور پر اس کام کا آغاز بھی کر دیجئے۔"

"میاں یوں سمجھو ہو گیا۔ فکر مت کرو۔" دادا جان نے جواب دیا اور احمد رضا ناہد کی طرف دیکھ کر مسکرانے لگا۔

☐

وہ دونوں شجاع احمد کے ساتھ ہی اُن کی خوبصورت سفید گاڑی میں آئے تھے۔ گھر والوں کا ابھی تک اُن سے کوئی دلچسپی پیدا نہیں ہوئی تھی جب کہ اُن کی آمد کی خبر پوری کوٹھی میں اُڑ گئی تھی۔ شجاع احمد صاحب سے کچھ اس طرح بددل تھے یہ لوگ کہ مہمان کی پذیرائی بھی اس انداز میں نہ کر سکے جس انداز میں کرنی چاہیئے تھی لیکن جب رات کے کھانے پر شجاع احمد صاحب نے پورے خاندان سے اُن کا تعارف کرایا اور سب نے اُن نئے مہمانوں کو دیکھا تو ان کی ایک بات نے اس سب کو متوجہ کر لیا تھا اور وہ تھی اُن کی یکساں شکل و صورت تن و توش اور چہرے مہرے سے... وہ خوش شکل اور خوبصورت بدن کے مالک تھے۔ ایک نے گہرے کلر کا سوٹ پہنا تھا اور دوسرا کریم کلر کے سوٹ میں ملبوس تھا۔ گھر کے رہنے والوں نے سوچا کہ اُن کی آمد اُن کے درمیان ایک خوشگوار اضافہ ہے۔

شجاع احمد صاحب ایک ایک کے چہرے کے تاثرات دیکھ رہے تھے۔ بیگم صاحبہ نے بھی خوشدلی سے اُن دونوں کو خوش آمدید کہا تھا۔ پھر شجاع احمد صاحب نے سب لوگوں سے اُن کا تعارف کرایا۔ احمد رضا، فیصل ہارون، قدسیہ اور شاذیہ وغیرہ سے آخر میں زاہد کا نمبر بھی آیا تھا۔

"یہ ناہد ذوالفقار زیدی ہیں۔" شجاع احمد صاحب اخلاقی قدروں کو اس وقت نہیں بھولے تھے۔ دونوں نوجوان سوالیہ انداز میں شجاع احمد صاحب کو دیکھنے لگے اور شجاع احمد صاحب جلدی سے بولے۔

"ہمارا ان کا کوئی رشتہ نہیں ہے لیکن یہ ہم سب کے زبردست رشتے دار ہیں اور ہر معاملے میں ٹانگ اڑانا اُن کی مجبوری ہے۔"

"ہاں... یوں سمجھو کہ شجاع احمد میرا ایک بیٹا ہے تو ناہد دوسرا۔ سوتیلے بھائیوں کا رشتہ سمجھ لو ان دونوں کے درمیان اور اس کا اندازہ تم لوگ شجاع احمد کے لہجے سے لگا چکے ہو گے۔" حسام احمد ناہد ذوالفقار کی یہ توہین برداشت نہ کر سکے اور بول پڑے شجاع احمد صاحب جز بز ہو کر رہ گئے تھے۔

"بڑی خوشی ہوئی زاہد صاحب آپ سے مل کر۔"

"مزید ہو لی مزید ہو گی۔" ناہد نے گردن ہلاتے ہوئے کہا اور شجاع احمد اُسے گھورنے لگے پھر انھوں نے کہا۔

"یہ میرے انتہائی محترم اور پیارے دوست کے بچے ہیں بیگم۔ میں خاص طور سے آپ کو ہدایت کر رہا ہوں کہ اس کوٹھی میں کوئی ایسی بات نہ ہو جو انھیں ناگوار گزرے مجھے یقین ہے کہ تمام لوگ اس کا خیال کریں گے۔"

"ہاں میاں بالکل۔ تم اُن تمام باتوں کی ایک فہرست تیار کر کے ان کی فوٹو اسٹیٹ کرا کے ہم سب میں تقسیم کر دینا جو تمہیں ناگوار گزرتی ہوں ہم روزانہ صبح اُٹھ کر اسی فہرست کو پڑھ لیا کریں گے اور پورا دن محتاط رہیں گے۔" حسام احمد صاحب نے کہا۔

"ابو... میں نے کوئی ایسی بات نہیں کی جو انسانی قدروں کے خلاف ہو اس کے باوجود اگر میرے کچھ الفاظ آپ کو ناگوار گزرے ہوں تو آپ مجھے معاف کر دیں یہ بچے اپنے ہی ہیں اور میں صرف اپنوں کی طرح انھیں یہاں رکھنا چاہتا ہوں۔" شجاع احمد نے کہا۔

"تو میاں ان ساری باتوں کی تمہیں کہنے کی کیا ضرورت تھی تمہارے خیال میں کیا یہاں گدھوں کی آبادی ہے جو سوچ اور سمجھ نہیں سکتے۔ ہم

یہ بات جانتے ہیں کہ مہمانوں کے ساتھ کیا سلوک کیا جاتا ہے۔ یہ فضول باتیں کیا معنی رکھتی ہیں؟"

"معذرت خواہ ہوں اور بچو! تم دونوں سے بھی میرے ابو ذرا تیز مزاج واقع ہوئے ہیں لیکن بہت ہی ہمدرد بہت ہی محبت کرنے والے تمہیں خاص طور سے ابو سے مصالحت رکھنا ہے۔" شجاع احمد صاحب ماحول کو خوشگوار رکھنا چاہتے تھے اور کوئی ایسی بات نہیں چاہتے تھے جو ان کے ان جاسوسوں کے لئے مضر ثابت ہو۔ بہر طور اس کے بعد اس سلسلے میں کوئی گفتگو نہ ہوئی۔ عازم اور فاخر خود بھی حالات کا جائزہ لے رہے تھے۔ بے وقوف لوگ نہیں تھے۔ صورت حال کا انھیں اندازہ تھا اور اس گفتگو کا انھوں نے برا بھی نہیں منایا تھا کیونکہ انھیں اندازہ تھا کہ یہاں کے حالات ہیں۔

شجاع احمد صاحب نے یہاں لانے سے پہلے انھیں تھوڑی بہت معلومات فراہم کر دی تھیں لیکن یہ معلومات اس قدر نہیں تھیں کہ انھیں ہر چیز کا اندازہ ہو جاتا شجاع احمد صاحب ان لوگوں کا بھی تو اندازہ کرنا چاہتے تھے۔ بہت بڑا خطرہ مول لیا تھا انھوں نے لیکن بہر طور اس کے علاوہ اور کوئی چارہ نہیں تھا اور بہتر یہی تھا کہ موضوع کو مختصر ہی رکھا جائے تاکہ کوئی الجھن نہ پیش آ جائے کھانے کے بعد سب منتشر ہو گئے۔

ان دونوں نوجوانوں کو لڑکے اور لڑکیوں نے اپنی تحویل میں لے لیا تھا یہ لوگ شام کو ساڑھے پانچ اور چھ بجے کے قریب آتے تھے شام کی چائے ختم ہو چکی تھی چنانچہ یہ چائے انھیں کمرے میں ہی پیش کر دی گئی تھی اس کے بعد سے یہ پہلی نشست تھی جب وہ ان کے سامنے آئے تھے۔ چنانچہ اب جب یہ ان کے ہاتھ لگے تو انھیں پائیں باغ کے فوارے کے قریب مدعو کیا گیا اور وہاں نشست... جم گئی۔

طرح طرح کے سوالات کئے جا رہے تھے۔ ان سے سارے کے سارے زیرک قسم کے نوجوان تھے چنانچہ عازم اور فاخر کو بھی بہت سوچ سمجھ کر بول دینے پڑ رہے تھے لیکن چونکہ وہ تیاری کر کے آئے تھے۔ اس لئے انہوں نے کسی کو بھی شبہے کا موقع دیا اور اس بات سے کسی کو بھی احساس نہ ہو سکا کہ وہ کسی غلط مقصد ...... کے لئے یہاں آئے ہیں سب ہی نے اس بات کو تسلیم کر لیا تھا کہ بہر صورت وہ دلچسپ ساتھی ثابت ہوں گے ویسے بھی اس کوٹھی میں کوئی ایسی الجھن کی بات نہیں تھی جہاں کسی نووارد کی آمد کو ناخوشگوار... نگاہوں سے دیکھا جا سکے کافی دیر کے بعد ان لوگوں نے انھیں چھوڑا تھا۔ زاہد خاص طور سے ان کا جائزہ لے رہا تھا۔ اس کے ذہن میں کچھ نئی کونپلیں پھوٹ رہی تھیں۔ شجاع احمد صاحب کبھی سے بھی اس قدر تکلفات کے عادی نہیں تھے یہاں تک کہ اپنے دوستوں سے بھی وہ بہت ہی سرسری انداز میں ملتے تھے لیکن ان لڑکوں کے لئے ان کی یہ خصوصی توجہ ذرا قابل غور تھی۔ اور زاہد اس بات کو اپنے ذہن میں ہی رکھنا چاہتا تھا یہ اس کا خاص ذاتی معاملہ تھا اور اس میں ابھی وہ دوسروں کو شریک نہیں کرنا چاہتا تھا۔ چاروں طرف سے ہوشیار رہنے کا عادی تھا شجاع احمد صاحب کی طرف سے کسی چال کی توقع تو اسے ہمیشہ ہی رہتی تھی بلکہ وہ حیران تھا کہ شجاع احمد صاحب نے اس کے خلاف ابھی تک کوئی ٹھوس قدم نہیں اٹھایا۔ چنانچہ شجاع احمد صاحب کی طرف سے ہونے والی ہر تحریک کو وہ بغور دیکھتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ان نوجوانوں کی طرف سے اس کا ذہن کسی قدر شبہے کا شکار ہو گیا۔ یہ چونکہ خالص ذاتی مسئلہ تھا۔ اس لئے اس نے اپنے طور پر ہی سوچنا مناسب سمجھا۔ اس رات کافی دیر تک وہ جاگتا رہا تھا۔

اس کے ذہن میں نئے نئے منصوبے بن رہے تھے۔ نجانے کس خیال کے تحت وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور سرفراز کی رہائش گاہ کی جانب چل پڑا۔ سرفراز چونکہ باہر کا آدمی تھا اور زاہد نے اسے اپنے معاملات میں کسی حد تک شامل کر لیا تھا۔ اس کی اپنی پوزیشن بھی زاہد ہی کی بنائی ہوئی تھی اور ویسے بھی سرفراز ایک شریف الطبع اور نیک نوجوان تھا اس لئے زاہد اس پر اس کوٹھی کے تمام افراد سے زیادہ بھروسہ کرتا تھا۔ یہاں تک کہ دادا جان کو بھی زاہد وہ حیثیت نہیں دیتا تھا جو سرفراز کو حاصل تھی۔ وہ سرفراز سے اس موضوع پر تبادلۂ خیال کرنا چاہتا تھا کیونکہ اس کے علاوہ کوئی اور شخصیت ایسی نہیں تھی جس سے کم از کم دل کی بات کہی جا سکے۔ سرفراز کی رہائش گاہ کوٹھی سے الگ اس انیکسی کے علاقے میں تھی اور ان کوٹھی کے صدر گیٹ کے نزدیک تھی۔ سرفراز اپنی والدہ کے ساتھ رہتا تھا لیکن انیکسی اور کوٹھی کا درمیانی فاصلہ طے کرتے ہوئے وہ پھولوں کے ایک کنج کے نزدیک اسے کچھ سرگوشیاں سنائی دیں اور وہ چونک کر رک گیا یہاں کون ہو سکتا ہے؟ اس نے سوچا پھر اس کے قدموں کی رفتار بالکل ہی معدوم ہو گئی۔ وہ دبے قدموں چلتا ہوا کنج کے نزدیک پہنچا تھا کنج سے دوسری طرف اس نے جھانک کر دیکھا۔ اس طرف سفید سنگ مرمر کی ایک بنچ پڑی ہوئی تھی۔ اور اس بنچ پر قدسیہ بیٹھی تھی۔ اس سے دو چار قدم کے فاصلے پر سرفراز گھاس پر بیٹھا ہوا تھا۔

"سرفراز صاحب! بلاشبہ آپ کی یہ گھبراہٹ درست ہے۔ لیکن میں ذہنی طور پر اس قدر معطل ہو گئی ہوں کہ مجھے آپ تک آنے پر مجبور ہونا پڑا۔ آپ کی والدہ تو سو گئی ہیں۔ ادھر کوٹھی میں بھی کوئی نہیں جاگ رہا۔ چنانچہ آپ پریشان نہ ہوں ویسے بھی آپ میرے استاد ہیں اور اسی عمارت میں رہتے ہیں۔ اگر ہمیں دیکھ بھی لیا جائے تو کوئی قیامت نہیں ٹوٹ پڑے گی۔"

"جی جی... قدسیہ صاحبہ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ بس میں

اس بات پر حیران ہوں کہ آخر کون سی ایسی بات ہو گئی اس وقت جس کے لئے آپ نے اتنی تکلیف کی اور مجھے میرے کمرے سے اُٹھا کر یہاں تک لائیں؟"

"بات یہ ہے سرفراز صاحب کہ میں کئی دن سے اُلجھن کا شکار تھی۔ میں نے اپنے طور پر بہت غور و خوض کیا اور کوشش کی کہ اس اُلجھن سے نکل آؤں لیکن پتہ نہیں کیا ہو گیا ہے۔ میں مجبور ہو گئی۔ اس وقت بھی میں اسی شدید ذہنی دباؤ کا شکار تھی اور پھر مجھے ایک ہی سیدھا اور سچا راستہ نظر آیا کہ جو کچھ دل میں ہے آپ سے کہہ دوں تاکہ کم از کم یہ بوجھ تو میرے سینے سے ہٹ جائے۔"

"ایسی کون سی بات ہے آپ کے ذہن میں کہیئے؟" سرفراز نے بھاری لہجے میں کہا۔

"سرفراز صاحب! براہ کرم جو کچھ میں کہہ رہی ہوں۔ اس میں جھوٹ تلاش نہ کیجئے گا۔ میں جھوٹ بولنے کی عادی نہیں ہوں۔ میں نے بہت اچھے ماحول میں آنکھ کھولی ہے ہمارے گھر میں... مشرقیت کا دور دورہ تھا۔ ہمارے دل ضرور چاہتے تھے کہ ہم بھی عام لوگوں کی طرح اپنے اس چولے کو بدلیں۔ لیکن اس حد تک کہ جہاں شرافت اور انسانیت مجروح نہ ہو۔ آپ نے ہمارے اردگرد پھیلے ہوئے لوگوں دیکھا ہوگا۔ دولت مندوں کا یہ قافلہ ایک ہی جانب رواں دواں ہے۔ ہوگئے درمیان سے شرم و حجاب اُٹھ چکا ہے لڑکیاں نیم عریاں لباس کلبوں میں رقص کرتی نظر آتی ہیں۔ نوجوان بدفطرتی کو اپنا شعار دل تے ئے ہیں مجھے نہ ایسی لڑکیاں پسند ہیں اور نہ ایسے نوجوان میں نے زندگی کی اس منزل میں داخل ہو کر جسے جوانی کہا جاتا ہے۔ اپنے بارے میں سوچا۔ میری آنکھوں میں کچھ خواب جاگے اور میرے دل میں بھی یہ خواہش پیدا ہوئی کہ میں کسی کے تصور کو ذہن میں بسا کر تنہائیوں میں مسکراؤں کوئی احساس مجھے گدگدائے لیکن طویل عرصے تک میں اپنی ان کیفیات پر قابو پانے کی کوشش کرتی رہی میں نے ہر طرح سے سوچا اور یہ اندازہ لگایا کہ کوئی بھی عامیانہ حرکت میرے خاندان کی بدنامی کا باعث تو بن ہی سکتی ہے میری اپنی شخصیت کو بھی مسخ کر کے رکھ دے گی۔ میں ایک بار پھر آپ سے عرض کر رہی ہوں سرفراز صاحب کہ جو کچھ کہہ رہی ہوں سچ کہہ رہی ہوں اور یہ سچائی آپ کے سامنے اُگل دینے پر مجبور ہوں۔ زاہد بھائی ہمارے درمیان آئے اُن کی پُرسحر شخصیت نے مجھے بھی مسحور کر دیا۔ میں اپنے کچے ذہن سے سوچنے لگی کہ زاہد وہی تو ہیں جن کے بارے میں میری آنکھوں میں خواب آتے تھے میں نے بڑے سادہ سے انداز میں زاہد صاحب کو اپنے دل کی بات بتا دی لیکن وہ شخص عام انسانوں سے بہت بلند ہے ——

اس کی بلندیاں کہاں تک ہیں۔ اُن کا تصور بھی شاید عام انداز میں نہ کیا جا سکے۔ اس نے امّی کو امّی کہا تھا۔ حسام احمد کو دادا جان کہا تھا گو ڈیڈی کو ڈیڈی نہ کہہ سکا کیونکہ ڈیڈی نے کبھی اُسے اس کی اجازت نہیں دی۔ لیکن... جو اس نے مجھے سمجھا وہ دل کی سچائیوں سے سمجھا۔ میرے جذبات کے اظہار پر اس نے جو کہا ایسی شگفتگی اور دیانتداری سے اپنے ذہن سے آگاہ کر دیا کہ مجھے ذرا بھی محسوس نہ ہوا۔ اس نے مجھ سے کہا کہ وہ مجھے ایک بہن کی طرح چاہتا ہے اور سرفراز صاحب کسی انسان کے ذہن کی بلندیوں کا اعتراف نہ کرنا بڑی کمینگی ہے میرا دل اس طرح دُھل گیا جیسے اسے کسی لطیف سی شے سے پاک کر دیا گیا ہو۔ میرے دل میں بھی زاہد کیلئے وہی جذبات پیدا ہو گئے جو اس کے دل میں تھے میں نے اپنے آپ کو سنبھال لیا اس نے مجھے شرمندہ نہیں ہونے دیا تھا۔

بہر طور سرفراز صاحب اس کے بعد میرے ذہن کی کتاب پھر سادہ ہو گئی لیکن دل میں ایک آرزو ضرور تھی کہ کوئی زندگی کے قریب آئے۔ آپ نے مجھے مصوری سکھائی میں نہیں جانتی کہ اپنے فن میں میں کیا بن گئی ہوں لیکن دفعتاً مجھے احساس ہوا کہ آپ بھی تو وہ بن سکتے ہیں جو میرے جذبات کو گدگدا دیں سرفراز صاحب میں پاکیزگی کو اولیت دیتی ہوں لیکن دل میں جو احساس ہوا ہے کہنا بھی بُرا نہیں سمجھتی۔ آپ بہت عرصے سے میرے ذہن میں کلبلا رہے ہیں۔ پتہ نہیں میں آپ کے دل و دماغ میں وہ جگہ پا سکتی ہوں یا نہیں جس کی خواہشمند ہوں لیکن میں نے کہہ دینا زیادہ پسند کیا آپ بھی مجھے اپنی فطرت سے اپنے خیالات سے آگاہ کر سکتے ہیں۔ یقین کیجئے میں آپ کی کسی بات کا بُرا نہیں مانوں گی بس جو کچھ میرے دل میں تھا میں نے کہہ دیا میرا بوجھ ہلکا ہو گیا۔" سرفراز عجیب سی نگاہوں سے اُسے دیکھنے لگا ناہید نے ایک گہری سانس لی تھی پھر اُس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ وہ سرفراز کے جواب کا انتظار کرتا رہا۔ سرفراز گہری سوچ میں ڈوب گیا تھا۔ پھر اس نے بھاری آواز میں کہا۔

"قدسیہ آپ نے مجھے اتنا بڑا اعزاز دیا ہے کہ میں خود کو آسمان کی بلندیوں پر محسوس کر رہا ہوں اپنے نامساعد حالات میں مجھے کبھی یہ باتیں سوچنے کا موقع نہیں ملا۔ خُدا کی قسم اگر آپ دل کی سچائیوں سے روشناس ہیں تو میرے الفاظ کو بھی سچا سمجھیں جس طرح آپ نے لڑکی ہو کر مجھے اپنے جذبات سے آگاہ کیا اور مجھے وہ مقام بخشا جو بہت بلند ہے۔ اسی طرح میں بھی آپ کے الفاظ کا سچائی سے جواب دے رہا ہوں میں نے کبھی کسی لڑکی کے بارے میں غور نہیں کیا آپ کے بارے میں بھی نہیں۔ لیکن میں بھی احساسات سے عاری کوئی مردہ شخص نہیں ہوں اس گھر نے مجھے اس وقت سہارا دیا جب میں شدید عذاب کا شکار تھا۔ بڑے احسانات ہیں۔ آپ سب لوگوں کے میرے اُوپر۔ بہر طور قدسیہ صاحبہ لاکھوں قصے

لاکھوں کہانیاں اِس بات کی گواہ ہیں کہ جب بھی عزت اور امارت کا ٹکراؤ ہوا غریب کو شرمسار ہونا پڑا۔ آپ کے یہ الفاظ میری زندگی کا قیمتی سرمایہ ہیں لیکن آپ کی معصومیت آپ کو حقائق سے دُور رکھ رہی ہے۔ آپ نے اُن کہانیوں پر غور کیا جو ہم جیسے لوگوں کے لئے اس کائنات کے چپے چپے میں بکھری پڑی ہیں۔ آپ دولت مند ہیں اور میں آپ کے در کا بھکاری ہماری کہانی کا انجام بھی وہی ہوگا جو ایسی کہانیوں کا ہوا کرتا ہے۔ یہاں کوئی ایسا مصنف نہیں ہے جو ایسی کہانی کو ڈرامائی موڑ دے دے۔ اس لئے یہ کہانی حقیقتوں کے درمیان ہی چلے گی شجاع احمد صاحب بااصول اور سخت گیر انسان ہیں۔ اپنے اصولوں میں وہ کبھی اس بات کو پسند نہیں کریں گے۔ آپ کو سرزنش کی جائے گی۔ اس کے بعد سختی کی جائے گی۔ آپ پر اور میرے ساتھ وہ تمام سلوک کئے جائیں گے جن کا

اُن حالات میں میں واقعی مستحق ہوں گا۔ اگر آپ مناسب سمجھیں تو اس خیال کو اپنے ذہن سے نکال دیں۔ اپنے ہی معیار اور اپنی ہی سطح کا کوئی شخص منتخب کیجئے تاکہ مجھ غریب کی ذات ہی محفوظ رہ جائے۔"

"دیکھئے سرفراز صاحب میں نے بہت غور وخوص کے بعد آپ سے براہِ راست گفتگو کرنے کا فیصلہ کیا تھا اور اب جب کہ میں زبان کھول چکی ہوں تو یوں سمجھئے کہ میں نے اپنا وقار اپنی نسوانیت آپ کو سونپ دی ہے۔ جہاں تک سطح کا تعلق ہے تو میرا اپنا اندازہ یہ ہے کہ انسان کی کوئی سطح نہیں ہوتی ہم نے جھوٹے مفروضے تعمیر کرتے ہیں۔ اور اُن کی روشنی میں ایک دوسرے کو پرکھنے لگے ہیں آپ سے صرف یہ معلوم کرنا چاہتی ہوں کہ حالات اگر کسی طور پر مجھے اور آپ کو اس طرح آگے لاکھڑا کریں کہ ہم ساتھ زندگی گزارنے کے لئے آزاد ہوں تو کیا آپ مجھے قبول کرلیں گے؟" قدسیہ نے پوچھا۔

"قدسیہ صاحبہ! ایک خاتون کی حیثیت سے آپ میری نگاہوں میں بہت بلند ہیں اتنی کہ آپ کے حصول کی آرزو کی جاسکتی ہے آپ کو پانے کا تصور نہیں کیا جاسکتا اگر تقدیر کسی طور آپ کو میری زندگی میں داخل کردے تو میں سمجھوں گا کہ مجھے زندگی بھر کی صعوبتوں کا صلہ مل گیا۔"

"گویا گویا...؟" قدسیہ مسرت بھرے انداز میں بولی۔

"ہاں قدسیہ... میں اس بات سے انکار نہیں کرسکتا کہ میں آپ کو دل وجان سے پسند کرتا ہوں لیکن اب تک میری اس پسند میں آپ کے حصول کا احساس نہیں شامل ہوا تھا۔ آج سے میری بدنصیبی مجھے یہ دن بھی دکھا دے گی میں آپ کے لئے ترسوں گا۔ میں جانتا ہوں کہ آپ مجھے نہیں حاصل ہوسکتیں تاہم اگر میرے اور آپ کے درمیان یہ دھاگے بندھ ہی چکے ہیں تو میں اُنھیں توڑنا نہیں چاہتا۔"

"سرفراز... ! ہم پورے خلوص اور پوری سنجیدگی سے ایک دوسرے کی زندگی میں شامل ہونے کی کوشش کریں گے باقی معاملات تقدیر پر چھوڑ دیں گے ہم اس سلسلے میں کوئی ایسا عامیانہ قدم نہیں اُٹھائیں گے جو ہماری شخصیتوں کو رسوا کردے لیکن اپنے طور پر جس حد تک جد وجہد ممکن ہوسکی کریں گے۔ لائیے اپنا ہاتھ مجھے دیجئے میں آپ کو یقین دلانا چاہتی ہوں کہ میں آپ کو سچے دل سے پسند کرتی ہوں۔" ناہ سرکھجانے لگا تھا یہ نیا کھیل تو خود بخود شروع ہوگیا تھا جو اُسے شروع کرنا چاہئے "اے ہاں... پتہ نہیں کیوں اب تک یہ بات سمجھ میں نہیں ٹھیک تو ہے۔"

سرفراز، شجاع احمد صاحب کا ایک ادنیٰ سا ملازم ہے اس کی بیٹی کو مصوری سکھانے والا ماسٹر ایک گھٹیا درجے کا انسان اور اگر امر گھٹیا درجے کے انسان کو شجاع احمد صاحب اپنا داماد قبول کرنے پر مجبور ہوجائیں تو اُن کی ذہنی اذیتوں میں ایک اور اضافہ ہوگا اور میرا مقصد، اس کے علاوہ اور کیا ہے۔ وہ پیچھے کھسکنا شروع ہوگیا۔ بعد کے مناظر میں وہ دخل اندازی نہیں کرنا چاہتا تھا لیکن کھسک کر وہ اپنی رہائش گاہ کی طرف واپس نہیں گیا تھا بلکہ سرفراز کی رہائش گاہ میں داخل ہوگیا تھا۔

سرفراز کی امی سکون کی نیند سو رہی تھیں ان دنوں ان کی طبیعت پھر کچھ خراب ہوگئی تھی اور ڈاکٹر کا علاج ہورہا تھا۔ وہ سرفراز کے کمرے جا بیٹھا۔ جس کا دروازہ اُسے کھلا ہوا ہی ملا تھا کمرے میں تاریکی پھیلی تھی۔ اور ناہ نے وہاں روشنی۔ کرنے کی ضرورت نہیں سمجھا اُن تھی زیادہ دیر نہیں گذری تھی کہ اُسے قدموں کی چاپ سُنائی لمحات کے بعد سرفراز نے کمرے میں روشنی کردی لیکن روشنی ہو اس کی نگاہ ناہ پر پڑی اور وہ بُری طرح اُچھل پڑا ایک لمحے کے۔ اس کے بدن میں کپکپی سی دوڑ گئی تھی۔

"آپ آپ...!"

"ہاں... کیوں اتنی زیادہ حیرت کی تو کوئی بات نہیں ہے۔"

"ن... نہیں۔ حیرت کی بات نہیں۔ میرا مطلب ہے آپ کب سے یہاں بیٹھے ہوئے ہیں؟"

"زیادہ دیر نہیں گزری۔"

"مم... مگر مگر اس وقت آپ...؟"

"کمال ہے سرفراز! تم تو اس طرح پریشان ہورہے ہو جیسے تم کوئی عزت مآب حسینہ ہو اور میں حُسن کا چور بھائی تم سے ملنے آیا تھا۔ تم موجود نہیں تھے۔ میں نے سوچا کہیں باتھ روم وغیرہ میں گئے ہو واپس آجاؤ گے۔ اس لئے انتظار کرنے بیٹھ گیا۔ اس میں پریشان ہونے کی کیا بات ہے" ناہ نے کہا اور سرفراز نے سکون کی گہری سانس لی۔

"کہاں گئے تھے؟" زاہد سپاٹ لہجے میں بولا۔ جس میں کوئی تجسس کوئی تشویش نہیں تھی۔ سرفراز صوفے پر بیٹھ گیا۔ اس نے زاہد کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ زاہد چند لمحات اُسے دیکھتا رہا پھر بولا۔
"کچھ اُلجھے ہوئے سے ہو۔ کیا بات ہے؟"
"نہیں نہیں... ایسی تو کوئی بات نہیں ہے بس آپ ہی کے بارے میں سوچ رہا تھا کوئی کام تھا مجھ سے؟"
"گویا تمہاری خواہش یہ ہے کہ میں چلا جاؤں کسی کام کے بغیر یہاں نہیں آسکتا۔"
"آپ غلط نہ سمجھیں زاہد صاحب! زاہد صاحب دراصل میں صحیح الفاظ کا انتخاب نہیں کر پا رہا۔"
"اور میں تمہاری اس گھبراہٹ کی وجہ تم سے نہیں پوچھوں گا۔ بہر حال جس مقصد کے تحت آیا ہوں۔ وہ تمہیں بتا رہا ہوں غور سے سنو۔" زاہد نے کہا اور سرفراز ہمہ تن گوش ہو گیا۔ "کوٹھی میں دو نئے افراد کا اضافہ ہو رہا ہے۔"
"جی ہاں...! مجھے علم ہے۔"
"تم اس وقت وہاں موجود نہیں تھے لیکن میں نے اُن پر شجاع احمد کی خصوصی توجہ دیکھی ہے۔"
"کون ہیں وہ؟" سرفراز نے کہا۔
"بقول شجاع احمد ..... اُن کے عزیز ترین دوست کے بچے۔"
"ہر تو یہ توجہ فطری ہے۔ اس میں کوئی تشویش بات ہے؟" لاپرواہ انداز میں بولا۔
"ہاں ہے۔"
"مجھے سمجھائیے۔"
"شجاع احمد صاحب اپنی ذات سے بھی سرسری رویہ اختیار کرنے کے عادی ہیں۔ وہ کبھی کسی کے لئے ضرورت سے زیادہ مخلص نہیں ہوتے۔ شاید تم نے اپنے بچوں کے ساتھ بھی اُن کا رویہ محسوس کیا ہو۔"
"پھر آپ کے خیال میں توجہ کس لئے ہو سکتی ہے؟"
"میں وثوق سے کوئی بات نہیں کہہ سکتا۔ سرفراز کیونکہ کوئی ثبوت نہیں ہے میرے پاس۔ لیکن شجاع احمد سے میں محتاط رہنا چاہتا ہوں۔ ممکن ہے یہ لوگ کسی خاص مقصد کے تحت یہاں آئے ہوں۔ یہ شبہہ ہے میرا سرفراز! ممکن ہے غلط ہو۔ لیکن ذہن میں رکھنے میں کیا حرج ہے۔ تم یوں سمجھو تو میری چھٹی حس نے مجھے ہوشیار کیا ہے اور میں اس لئے پیش بندی کر رہا ہوں۔"
"ٹھیک ہے۔ لیکن شجاع احمد انھیں کس مقصد کے تحت... لا سکتے ہیں؟"
"سرفراز! اس گھر میں صرف میری شخصیت ایسی ہے جو شجاع احمد کے لئے ناپسندیدہ ہے۔ میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ وہ مجھے ایک لمحے کے لئے یہاں برداشت نہیں کر سکتے۔ اس کی وجہ تم جانتے ہو؟"
"بدقسمتی سے نہیں جانتا۔"
"پورا گھر مجھے پسند کرتا ہے۔ میرے اشاروں پر چلتا ہے۔ میں نے شجاع احمد کی ترتیب دی ہوئی لکیریں مٹا دی ہیں اور کچھ نئے خطوط ترتیب دیئے ہیں اس گھر میں۔ ماشاءاللہ سارے بچے اب نئے خطوط پر سفر کر رہے ہیں اور شجاع احمد اس بات کو ناپسند کرتے ہیں۔ گھر کے دوسرے افراد کو تو وہ سنبھال لیتے لیکن معاملہ حسام احمد کا ہے۔ اُن کے سامنے شجاع احمد کی نہیں چلتی۔ اور حسام احمد صاحب اس گھر میں میرا وجود برقرار رکھے ہوئے ہیں۔ ان حالات میں شجاع احمد میرا طلسم توڑنے کے لئے کچھ بھی کر سکتے ہیں۔ سمجھ رہے ہو؟"
"اوہ... آپ کا خیال ہے کہ شجاع احمد صاحب آپ سے اس قدر نفرت کرتے ہیں کہ آپ کے خلاف کوئی سازش بھی کر سکتے ہیں؟" سرفراز نے تعجب سے پوچھا۔ اور زاہد کے چہرے پر عجیب سے تاثرات پھیل گئے۔ پھر اُس نے گہری سانس لے کر کہا۔
"ہاں سرفراز...! یہ بات میرے سینے میں محفوظ ہے۔ اور یقین کرو بے مقصد نہیں ہے۔"
"میں مانتا ہوں زاہد صاحب! آپ بے حد سمجھدار انسان ہیں۔ آپ نے ضرور اس سلسلے میں کچھ محسوس کیا ہوگا۔ بہر طور میں ہر خدمت کے لئے حاضر ہوں۔ مجھ سے کیا کام ہے۔ بے تکلفی سے فرمائیے؟" سرفراز نے کہا۔
"دیکھو سرفراز! مجھے اس بات کا بہر طور خیال رکھنا ہے کہ احمد رضا، ہارون، فیصل، قدسیہ اور شادیہ وغیرہ شجاع احمد صاحب کے بچے ہیں۔ وہ بہت عرصے سے ذہنی گھٹن کا شکار تھے لیکن اُن کے ذہن کی گہرائیوں میں یہ احساس ضرور پرورش پا رہا تھا کہ جو کچھ اُن پر گزر رہی ہے۔ مناسب نہیں ہے۔ نیا وقت کچھ اور چاہتا ہے۔ نئے ادوار کے تقاضے کچھ اور ہیں۔ لیکن وہ یہ بھی جانتے تھے کہ شجاع احمد صاحب انھیں اس کی اجازت نہیں دیں گے۔ بس یوں سمجھو کہ وہ کسی کے دھکیلنے کے منتظر تھے۔ اُن کے اندر خود اتنی جرأت پیدا نہیں ہو پائی تھی۔ میں نے انھیں وہ جرأت دلا دی۔ اب اُن میں سے ہر شخص اپنے شوق کی تکمیل کی طرف گامزن ہے اور تم یہ بھی دیکھ رہے ہو گے سرفراز کہ میں نے ان میں سے کسی کو بھی جوئے یا شراب کی عادت نہیں ڈالی۔ کوئی ایسا کام نہیں کیا جو مستقبل میں اُن کی شخصیت کو ختم کر کے رکھ دے۔ قدسیہ اگر مصوری سے شغف رکھتی ہے

توبہر طور میں نے تجرباتی طور پر اس کے شوق کی تکمیل کر ڈالی۔"
"تجرباتی طور پر...؟"
"ہاں یار... بعض باتیں میرے ذہن میں بھی بُری طرح کھٹکتی رہتی ہیں۔"
"مثلاً زاہد صاحب!" سرفراز نے دلچسپی سے پوچھا۔
"قدسیہ کی مصوری... جس کے استاد تم ہو۔"
"جی ہاں! میں آج تک اس بات پر نادم ہوں کہ ایک ایسے فن کا استاد بن گیا ہوں جس کی الف۔ب سے ... مجھے واقفیت نہیں ہے۔"
"سرفراز فنِ مصوری بلاشبہ ایک ٹھوس حقیقت ہے۔ تصویروں کی زبانی، کائنات کے حسن کو اُجاگر کرنا، ماضی حال اور مستقبل کی باتیں کرنا بڑے بڑے فن کاروں کا کام تھا۔ اُنھوں نے اپنے فن میں کمال حاصل کیا۔ اجنتا ایلورا تشکیل پائے مونالیزا کی تخلیق ہوئی اور بجانے کیا کیا۔ لیکن نئے گروہ نے فنِ مصوری کا ستیاناس مار دیا۔ یہ نیا گروہ خود ساختہ تھا۔ اس نے فنِ مصوری کی نئی زبان تخلیق کی۔ جس نے جو چاہا بنایا اور دوسروں کو اُسے تسلیم کرنے پر مجبور کر دیا۔ لیکن میرے اپنے خیال میں یہ مجبور ہونے والے بھی وہ تھے جو فنِ مصوری کو حاصل کرنے میں ناکام رہے اور اُنھوں نے من ترا حاجی بگویم تو مرا حاجی بگو والی مثل کے مصداق خود کو ایک دوسرے سے منوایا اور اس کے بعد کچھ وہ بھی سامنے آئے جو اپنی زبان ملکوں کے ذریعے دوسروں تک پہنچاتے ہیں۔ چنانچہ تجریدی آرٹ کی تخلیق ہوئی۔ ضرورت مندوں نے اسے سمجھا۔ اور سراہا۔ میں نے آج تک اس فن کو تسلیم نہیں کیا اور اس لئے اس کا مذاق اُڑانا میں اپنا حق سمجھتا ہوں۔ تم محسوس نہ کرنا قدسیہ ایک باقاعدہ فنکارہ بننے میں تو شاید آدھی عمر گزار دیتی۔ لیکن دولت مند باپ کی بیٹی ہے۔ لمحوں میں فن کار بن گئی اور اس کا استاد تم جیسا آدمی رہا اور اب اس کی تصاویر کی نمائش ہوگی۔ تم دیکھنا اس نمائش میں کیا کیا تماشے ہوتے ہیں۔ میں نے قدسیہ کا مذاق نہیں اڑایا بلکہ تجریدی آرٹ کا مذاق اُڑایا ہے۔ تم دیکھنا کیسی کیسی تعریف و توصیف ہوتی ہے اس کی۔ اور لوگ اس کے برش کے کمال کو کیا کیا رنگ دیتے ہیں۔ یہ ایک الگ بات ہوئی۔ میرے کہنے کا مقصد صرف یہ تھا کہ میں نے کوئی ایسا نقصان نہیں پہنچایا ان لوگوں کو جو ان کے لئے مستقبل میں تکلیف دہ ہو۔ ہاں اُن کے شوق کی تکمیل ہو گئی۔ اس میں کیا حرج ہے۔ ہارون گونگا بن گیا ہے۔ بھلا شجاع احمد صاحب کو کیا تکلیف ہے۔ اس سلسلے میں وہ اپنا کام کریں۔ احمد رضا اگر غریبوں کے لئے کلینک کھول دیتا ہے تو جتنی اس کو ثواب تو مجھے بھی ملے گا۔ میں اس چیز کو اپنے حق میں سمجھتا ہوں۔ اور کچھ نہ کچھ ثواب اس سلسلے میں احمد رضا اور اُن کے خاندان کو بھی ملے گا۔ تو میں نے کیا بُرا کیا؟ یہ سب کچھ جو میں کر رہا ہوں۔ اس میں کوئی ایسی بات نہیں ہے جو شجاع احمد صاحب کو تکالیف کا شکار بنا دے۔ لیکن ان کا طلسم ٹوٹا ہے اور وہ میرے مخالف ہو گئے ہیں حسام احمد صاحب کا سہارا اگر مجھے حاصل نہ ہوتا تو یقین کرو۔ میرا نام و نشان تک اس عمارت میں نہ ہوتا۔ لیکن اب مجھے یہ شبہ ہے۔ یقین سے تو نہیں کہہ سکتا۔ شجاع احمد صاحب میرے خلاف کوئی نیا قدم اُٹھانا چاہتے ہیں۔"
"اور اس کا ذریعہ یہ دونوں بن سکتے ہیں۔" سرفراز نے پوچھا۔
"ہاں سو فیصدی۔ مجھے شجاع احمد صاحب کے چہرے پر ایک خاص بات نظر آئی تھی۔ اُنھوں نے بڑے مزاحیہ انداز میں گفتگو کی حالانکہ وہ اس فطرت کے آدمی نہیں ہیں۔ جو کچھ کہنا چاہتے ہیں پھٹ سے کہہ دیتے ہیں۔ اپنے دوست کے بچوں کو بلاشبہ وہ عزیز رکھتے ہوں گے۔ لیکن سب کو ہدایت کی گئی ہے کہ اُن کی ہر ضرورت کا خیال رکھیں اور عمارت میں اُن کو مکمل آزادی دی جائے۔ اس کے علاوہ سرفراز صاحب! میں جلد ہی یہ معلومات حاصل کر لوں گا کہ یہ لوگ کونسی تعلیم حاصل کرنے والے ہیں۔ یہ مشکل کام نہیں ہوگا میرے لئے۔ آپ سے میں جو کچھ چاہتا ہوں۔ اس کی مکمل تفصیل یہ ہے کہ اُن بچوں کو میں اس سلسلے میں اپنا رازدار نہیں بنا سکتا بلکہ آپ میرے لئے اُن لوگوں کے خلاف جاسوسی کریں گے۔ کوٹھی میں اُن کے معاملات پر نگاہ رکھیں گے۔ اور اُن کی دیگر حرکات و سکنات سے مجھے مطلع کریں گے۔"
"میں...!" سرفراز حیرت سے بولا۔
"جی ہاں آپ۔"
"لیکن کیسے زاہد بھائی...؟ میں تو یہاں اس کوٹھی میں اتنا متعارف بھی نہیں ہوں۔ میری پہنچ تو صرف قدسیہ کے نگار خانے تک ہے۔ اور بس...!"
"نہیں سرفراز! تم خود ہی محتاط رہتے ہو۔ اگر تم کچھ اور قدم آگے بڑھاؤ تو میرا خیال ہے کوٹھی میں تمھاری مکمل پذیرائی ہوگی۔ اور پھر قدسیہ تو تمھاری بہت زیادہ عزت کرتی ہے۔ مقصد یہ کہ اُن دونوں پر نگاہ رکھنے کے لئے تم ہر قدم اُٹھاؤ گے اور یہ کام میں تمھارے سپرد کر رہا ہوں۔"
"آپ مطمئن رہیں۔ اگر آپ نے یہ ڈیوٹی میرے سپرد کی ہے تو میں اُسے پوری محنت اور جانفشانی سے انجام دوں گا۔"
"شکریہ! اسی لئے میں یہاں آیا تھا۔ کل سے تم اپنے کام کا آغاز کر دینا۔ فرصت شرط ہے۔ فرسٹ ایڈ ہاؤس اگر روزانہ نہ بھی جاؤ تو کوئی ہرج نہیں ہے۔ وہاں کا معاملہ ہم سنبھال لیں گے۔ لیکن یہاں ذرا بات ذہن میں رکھنا۔" زاہد نے کہا۔

"بہت بہتر... آپ نے بہت اچھا کیا جو یہ بات مجھے بتادی۔ میں کوشش کروں گا کہ کوٹھی میں اُن لوگوں کے سامنے نہ آؤں اور اگر آؤں بھی تو جس حد تک ممکن ہو بچنے کی کوشش کروں" سرفراز نے جواب دیا۔

"بس ٹھیک ہے تم اپنا کام جاری رکھو اور ہاں اب ہمارا اگلا قدم قدسیہ کی تصویروں کی نمائش ہے۔"

"ایک بات بتائیے زاہد صاحب؟"

"پوچھئے..."

"میں اس نمائش سے بڑا خوفزدہ ہوں۔"

"کیوں بھئی خیریت۔ بھلا اس نمائش سے تم کیوں خوفزدہ ہو؟"

"زاہد صاحب! یہاں تو آپ ان تصویروں کو سمجھنے والے موجود ہیں۔ اور اُن کی تشریح بھی کر دیتے ہیں۔ جب یہ منظر عام پر پیش ہوں گی تو یقیناً اُنھیں دیکھنے کے لئے وہ لوگ بھی آئیں گے جو کم از کم اس فن سے تھوڑے بہت واقف ہیں۔ وہ ان تصویروں کے بارے میں کیا کہیں گے، قدسیہ کی جان تو بچ جائے گی۔ کیونکہ وہ ایک بڑے باپ کی بیٹی ہے اور لوگ اس کے بارے میں کچھ کہتے ہوئے غور کریں گے۔ لیکن اگر اس کے استاد کے بارے میں کسی نے سوال کر دیا تو میں کیا کہوں گا؟"

"میں کیا مر جاؤں گا؟" زاہد نے سینے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ اور سرفراز ہنس پڑا۔

"گویا آپ وہاں بھی وہاں بھی..."

"دیکھو سرفراز میں نے جو کچھ کہا ہے اپنے تجربے کی بنیاد پر کہا ہے۔ اسے تم دیکھتے رہو۔ تم اس کی تصاویر مکمل کرا دو اور اس کے بعد اس دنیا کا تماشہ دیکھو" سرفراز مسکراتا رہا پھر زاہد نے اُٹھتے ہوئے کہا۔

"اچھا دوست... تم میری سپرد کی ہوئی ذمہ داری سنبھال لو۔ مجھے یقین ہے کہ تم پوری تندہی سے اپنا کام انجام دو گے۔"

"آپ مطمئن رہیں زاہد صاحب! میری خوش قسمتی ہے کہ آپ نے کوئی کام میرے سپرد تو کیا۔ بالکل مطمئن رہیئے۔ اُن دونوں جنگلروں کو میں اچھی طرح چیک کروں گا" سرفراز نے جواب دیا اور زاہد اس سے مصافحہ کر کے باہر نکل آیا۔ سرفراز کے چہرے پر پہلے تو خوف کے آثار چھائے رہے تھے۔ کیونکہ وہ چند ہی لمحات قبل قدسیہ کے پاس سے واپس آیا تھا۔ لیکن جب زاہد نے اس موضوع پر کوئی بات نہیں کی اور آرام سے تمام صورتِ حال ٹل گئی تو اس نے سکون کی گہری سانس لی تھی۔ وہاں سے نکلنے کے بعد زاہد اس نئے مسئلے میں اُلجھ گیا تھا اور اپنے بستر پر لیٹ کر بھی وہ اس موضوع پر کافی دیر تک غور کرتا رہا تھا۔ سرفراز کی قدسیہ میں دلچسپی اور قدسیہ کا سرفراز سے التفات بھی اس کے مقصد کی چیز تھی۔ اس التفات کو ہوا ملنی چاہیئے۔ اور اس کا انجام بہتر ہونا چاہیئے۔ اس نے سوچا اور اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

تھوڑی دیر تک وہ مسکراتا رہا۔ اور پھر آہستہ آہستہ اس کے دانت مضبوطی سے ایک دوسرے پر جم گئے۔ شجاع احمد صاحب آپ کو... آپ کو اپنی زندگی کے بدترین دور سے گزرنا پڑے گا" مجھے آپ۔ آپ کو ایسے حالات سے گزرنا پڑے گا کہ آپ نے کبھی اس کا تصور بھی نہ کیا ہوگا۔

★★

حازم اور فاخر نے اپنے کام کا آغاز کر دیا تھا۔ دونوں چالاک نوجوان تھے۔ سب سے پہلے تو انھوں نے یہ کوشش کی کہ اس عمارت میں موجود نوجوانوں سے دوستی کریں۔ حسام احمد صاحب ہر ایک کو منہ لگانے کے عادی نہیں تھے۔ اُنھوں نے ابھی تک اُن لڑکوں پر کوئی خاص توجہ نہیں دی تھی۔ اوّل تو زیادہ تر وہ فرسٹ ایڈ ہاؤس کے معاملات میں ہی اُلجھے رہتے تھے۔ اس کے علاوہ اُن کا بہترین مشغلہ یہ تھا کہ عمدہ قسم کے جاسوسی ناول اور کہانیاں حاصل کریں، انھیں پڑھیں یا پھر زاہد سے سنیں۔ کیونکہ زاہد کے سنانے کا انداز بے حد دلچسپ ہوتا تھا۔ حسام احمد صاحب کو یوں محسوس ہوتا جیسے وہ اس ماحول میں کھو گئے ہوں۔ زاہد کی یہ خوبی اُنھیں بے حد پسند تھی اور اس کی اس خوبی کی وہ بارہا تعریف کر چکے تھے۔ باقی رہیں بیگم صاحبہ تو اُن کی توجہ ان دونوں کو حاصل تھی۔ کیونکہ شوہر کی ہدایت تھی۔ اور وہ شوہر کی ہر بات کی نفی کرنے کی عادی نہیں تھیں۔

قدسیہ اپنے معاملات میں مصروف تھی۔ اس کی دُنیا مصوری تک محدود تھی اور اب تو اس کے ساتھ ساتھ ایک نیا مشغلہ بھی اُسے حاصل ہو گیا تھا۔ یعنی سرفراز کا تصور... وہ سرفراز کو اپنے ذہن میں آئیڈیل بنا چکی تھی۔ اور اب اس کی پوری توجہ سرفراز کی جانب تھی۔ تنہائیوں میں وہ سرفراز کو اپنے مستقبل کا ساتھی محسوس کرتی تھی اور اس کے ساتھ زندگی گزارنے کے تصور کو خاکوں کی شکل دے دیتی۔ اس طرح اُسے بڑا سکون محسوس ہوتا تھا۔

احمد رضا، دادا جان کی حمایت حاصل کرنے کے بعد مطمئن ہو گیا تھا۔ وہ روزانہ دن کو گیارہ بارہ بجے فرسٹ ایڈ ہاؤس پہنچ جاتا اور وہاں کے معاملات میں دلچسپی لیتا۔ زاہد نے وہاں بھی اس کے لئے مصروفیات پیدا کر دی تھی۔ یعنی فرسٹ ایڈ ہاؤس کی عظیم الشان عمارت میں کلینک کا مسئلہ۔ چنانچہ اس سلسلے میں زاہد نے نقشہ نویس کو ہدایات جاری کر دی تھیں۔ اور... احمد رضا اپنی پسند کا نقشہ بنوا رہا تھا۔ اس کا زیادہ تر وقت وہیں گزرتا تھا۔ باقی رہ گیا تھا ہارون... تو وہ اپنے ریاض میں مصروف تھا۔ فیصل ابھی چھوٹا تھا۔ اور شاذیہ اپنے معاملات میں مصروف تھی۔ یوں بھی اس پر ابھی کوئی بُرا اثر نہیں پڑ سکا تھا۔ بس اس کی چند فرینڈز تھیں جن میں وہ گم رہتی

زاہد نے ابھی اس پر کوئی توجہ نہیں دی تھی۔
چنانچہ ان لوگوں نے بھرپور پلاننگ کر کے سب سے پہلے احمد رضا پر ڈورے ڈالنے کا فیصلہ کیا۔ احمد رضا بہت کم اِن کے ہاتھ لگتا تھا۔ لیکن بہرحال یہ اب اُن کی ذمہ داری تھی کہ وہ ان سارے معاملات کو بھرپور نگاہوں سے دیکھیں اور شجاع احمد صاحب کی مرضی کے مطابق عمل کریں۔
ان دونوں کو ایک ہی کمرہ دیا گیا تھا۔ جو انتہائی کشادہ اور بہترین قسم کے فرنیچر سے آراستہ تھا۔ تقریباً ایک ہفتہ اُنھیں یہاں آئے ہو چکا تھا۔ اور اس ایک ہفتے میں اُنھیں جو زندگی ملی تھی۔ اس نے اُنھیں بہت متاثر کیا تھا۔ فاخر نے ایک رات عازم سے کہا۔
"عازم یار زندگی کا یہ رُخ بھی ہے۔ تم نے دیکھا یہ اہلِ ثروت کس طرح آسائشوں میں بسر کرتے ہیں۔ دُنیا کا کوئی غم اُن کے نزدیک نہیں پھٹکا جو سوچا وہ ہو گیا۔ اور ایک بدبخت ہماری زندگی تھی کہ ملازمت حاصل کرنے کے لئے ہی اتنے پاپڑ بیلنے پڑے۔ میں تو کچھ اور سوچ رہا ہوں۔"
"کیا...؟" عازم نے پوچھا۔
"بھائی ہماری جو یہاں ڈیوٹی لگائی گئی ہے۔ وہ تو ہمیں انجام دینی ہی ہے۔ ہمیں اس کی تنخواہ ملے گی۔ اور اس کے بعد جب ہمارا یہاں کا کام مکمل ہو جائے گا تو پھر دفتروں میں کلرکی کرنا پڑے گی۔ کیا کوئی ایسی ترکیب نہیں ہو سکتی کہ ہم بھی زندگی کی ان لطافتوں سے دائمی طور پر... منسلک ہو جائیں۔"
"دیکھ فاخر میرے سامنے بڑے بڑے جملے نہ بولا کر۔ صاف کہہ کیا کہنا چاہتا ہے؟" عازم نے اُلجھتے ہوئے کہا۔
"کوئی ایسی ترکیب، کوئی، ایسا کھیل جو ہمیں شجاع احمد صاحب کی نگاہوں میں اتنا بلند کر دے کہ وہ ہمارے مستقبل کے بارے میں سوچنے لگیں۔"
"مطلب کیا ہے صاف صاف کہو؟"
"کمال کے آدمی ہو یار! شجاع احمد صاحب کی دو بیٹیاں ہیں۔"
"تو پھر...؟"
"قدسیہ اور شاذیہ! دونوں اچھی شکل و صورت کی مالک ہیں۔ بلکہ انھیں ایک طرح سے خوب صورت کہا جا سکتا ہے۔ اور پھر ایک ایسے دولت مند باپ کی بیٹیاں ہیں جو اُنھیں بہت کچھ دے گا۔ اتنا کچھ کہ اس کے بعد اُن کے شوہروں کو کسی اور چیز کی ضرورت نہ رہے گی۔"
"اُوہ، اُوہ... تو تمھارا خیال ہے، تمھارا خیال ہے...؟"
"ہاں... لیکن نہایت محتاط انداز میں۔ اتنے محتاط انداز میں کہ خود اپنے آپ کو بھی خبر نہ ہو سکے۔" فاخر نے گہرے لہجے میں کہا اور عازم کسی سوچ میں گم ہو گیا۔ اس کی آنکھوں میں ایک حسین مستقبل کے خواب لہرانے لگے تھے۔ پھر وہ چونک پڑا۔
"فاخر شامت آئی ہے تمھاری۔"
"کیا مطلب؟"
"یہاں جس مقصد کے لئے آئے ہو۔ اُسے پورا کرو۔ اپنی روزی... برقرار رکھو تم نے تو فوراً ہی بلندیوں کی جانب پرواز شروع کر دی۔"
"پرواز تو میرا خیال ہے۔ ہر ذی رُوح کا حق ہے۔ ہم نے جو کچھ سوچا ہے وہ ناجائز تو نہیں ہے۔ ہم کسی سے کوئی فریب نہیں کرنا چاہتے۔ کوئی ایسا جرم نہیں کرنا چاہتے جو قانون کے لئے قابلِ توجہ ہو۔ زندگی کے لئے بہتر راستوں کی تلاش کون پسند نہیں کرتا۔"
"وہ تو ٹھیک ہے محترم! لیکن جس مقصد کے لئے آپ کو بھیجا گیا ہے وہ تو پورا کر لیں کم از کم۔ ہم اُن لوگوں میں بے شک گھل مل جائیں گے۔ اتنی دوستی کر لیں گے ان سب سے کہ اس کے بعد یہ ہمارے لئے بے چین رہیں۔ لیکن یہ سب کچھ کرنے کے لئے ابھی ہمیں اس سمت سفر کرنا ہوگا۔ جس سمت ہم آئے ہیں اور جو ہمارے یہاں آنے کا مقصد ہے۔ عزیزم! اس کوٹھی میں رہنے کے لئے سب سے پہلے شجاع احمد صاحب کا... اطمینان ضروری ہے۔ اس سلسلے میں کام کرو، اگر کہیں کسی کو بھنک پڑ گئی کہ ہمارے ذہنوں میں کیا ہے تو دوسرے دن کان پکڑ کر نکال دیئے جائیں گے۔ چنانچہ آپ ابھی اپنی یہ کوشش اپنے آپ تک محدود رکھیں اور اُنھیں اپنے ذہن میں بھی جگہ نہ دیں۔ پہلے شجاع احمد صاحب کے دل میں گھر کرو۔ اس کے بعد اس گھر میں تمھاری گنجائش کسی نہ کسی طور نکل ہی آئے گی۔"
"ہاں بات تو درست ہے۔ میں فوری طور پر تو کسی کام کے لئے... نہیں کہہ رہا۔" فاخر نے کہا۔
"سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ہمیں یہاں آئے ہوئے ایک ہفتہ ہو گیا ہے۔ شجاع احمد صاحب نے اب تک ہم سے صرف تین ملاقاتیں کی ہیں۔ آخری ملاقات میں ہمارے اور اُن کے درمیان کیا گفتگو ہوئی تھی تمھیں یاد ہے؟"
"ہاں...! اُنھوں نے کافی کھل کر بات کی تھی۔ اُنھوں نے کہا تھا کہ سب سے پہلے یہ معلومات حاصل کی جائیں کہ ان لوگوں کے ذہنوں میں یہ خبریں کہاں سے پہنچیں۔ ویسے اتنا اندازہ تو میں نے لگایا ہے عازم کہ اُن سب کا ممدوح رحمان زاہد ہے۔ تم نے دیکھا نہیں بیگم صاحبہ کس طرح زاہد... زاہد... پکارتی رہتی ہیں۔ دادا جان کس طرح زاہد، زاہد... کہتے رہتے ہیں اور یہی حالت اُن سب کی ہے۔ میرا خیال ہے زاہد اس مسئلے میں ایک نمایاں کردار ادا کر رہا ہے۔ پہلے تو یہ اندازہ لگانا ہے کہ اس کی یہاں آمد کن حالات کے تحت ہوئی اور کیسے ہوئی؟"

"میرا خیال ہے اس سلسلے میں دادا جان سے ابتداء کرنی چاہیئے۔" عازم بولا۔

"میں کچھ اور سوچ رہا تھا۔"

"وہ کیا...؟"

"میرا خیال تھا کہ پہلے شجاع احمد صاحب کے بچوں کے ذہنی رجحان کا اندازہ لگا لیا جائے۔ یعنی احمد رضا، ہارون اور قدسیہ! تین نام ہیں نا ابھی ہمارے سامنے۔ باقی دو تو فہرست سے خارج ہیں۔"

"ہاں...!"

"تو پھر یوں کرتے ہیں کہ تم دادا جان کو ٹٹولو اور میں احمد رضا کو۔" فاخر نے کہا اور عازم کسی گہری سوچ میں گم ہو گیا۔ پھر بولا۔

"ٹھیک ہے۔ کل میں دادا جان سے ایک خصوصی ملاقات کروں گا۔"

"اور میں احمد رضا سے۔ احمد رضا دن کو گیارہ بجے گھر سے نکل جاتے ہیں۔ میں ان کا تعاقب کروں گا۔ اور اتفاقیہ طور پر اُن سے باہر ہی ملاقات کرنے کی کوشش کروں گا۔"

"ٹھیک ہے۔" دونوں کے درمیان یہ بات طے ہو گئی۔ دوسرے دن دونوں اپنے اپنے مشن پر نکل گئے۔

فاخر احمد رضا کے تعاقب کے سلسلے میں گھر سے باہر نکل گیا تھا۔ وہ احمد رضا کو راستے ہی میں کہیں پکڑنا چاہتا تھا۔ عازم تیار ہو کر دادا جان کی رہائش گاہ کی جانب چل پڑا۔

حسام احمد صاحب اس وقت برآمدے میں کرسی ڈالے ایک جاسوسی ناول پڑھ رہے تھے۔ عازم کو اپنی جانب آتے دیکھا تو ناول پر نشان لگایا اور حیران نگاہوں سے اُسے دیکھنے لگے۔ عازم اُن کے قریب پہنچ گیا تھا۔

"جی... کیا خدمت ہے میرے لئے؟" حسام صاحب نے پُروقار انداز میں پوچھا۔

"بس دادا جان! آپ کی خدمت میں سلام کرنے کے لئے حاضر ہوا تھا۔"

"وعلیکم السلام... اور کوئی بات؟" دادا جان نے پوچھا۔ اور عازم کو احساس ہو گیا کہ بے ڈھب آدمی ہے۔ ذرا مشکل سے ہی سنبھالنا پڑے گا۔

"بس یونہی دادا جان! آپ کتاب پڑھ رہے تھے۔ کتابوں سے عشق ہے۔ میں جاننا چاہتا تھا کہ آپ کو کس قسم کی کتابیں پسند ہیں؟"

"بیٹھو...!" دادا جان نرم لہجے میں بولے اور عازم اُن کے سامنے پڑی ہوئی کرسی پر بیٹھ گیا۔ دادا جان نے ناول اُٹھا کر پیچھے رکھ دیا تھا۔

"پہلے تو میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ تمہیں کس قسم کی کتابوں سے شغف ہے؟"

"بڑے بڑے ادیبوں کی بہت سی تخلیقات پڑھی ہیں۔ میں نے ولیم شیکسپیئر، جارج برنارڈ شا، کنفیوشس، گوئٹے اور اسی قسم کے دوسرے مصنفین کو اچھی طرح پڑھ چکا ہوں۔"

"گڈ... کیا حاصل کیا تم نے اُن سے؟"

"انسانی اقدار، تہذیب اور معاشرے کے بہتر اصول۔"

"تو ان اصولوں کو کہاں جمع کیا ہے تم نے؟"

"جی... میں نہیں سمجھا دادا جان...!"

"میرا مطلب ہے یہ سارے اصول کل کتاب تک تمہیں کیا کچھ دے چکے ہیں۔"

"کچھ نہیں دادا جان! بس زندگی کا ایک لائحہ عمل بنایا ہے کس طرح جینا ہے، کس طرح مستقبل میں اپنا مقام بنانا ہے۔"

"تو ٹھیک ہے میاں! مقام بناؤ، یہ لوگ تمہارے مددگار ہیں۔ ان سے امداد حاصل کرو۔ دوسروں کی کرید میں کیوں رہتے ہو؟" حسام احمد صاحب نے کہا۔

"اوہ نہیں دادا جان...! بس ہم ذوق کی تلاش کسے نہیں ہوتی۔"

"میرا ذوق تمہیں پسند نہیں آئے گا میاں۔" دادا جان طنزیہ انداز میں بولے۔

"کیوں نہیں دادا جان! آپ بتائیے تو سہی آپ کس قسم کی کتابیں پسند کرتے ہیں؟"

حسام احمد نے جاسوسی ناول اُٹھا کر عازم کے سامنے رکھ دیا۔ اور عازم کے چہرے پر خوشی کے تاثرات پھیل گئے۔

"ہنری سلاسر...! کمال ہے دادا جان۔ یہ میرا پسندیدہ رائٹر ہے۔"

"خوب، خوب... اس سے تم نے کیا حاصل کیا میاں؟" دادا جان نے پوچھا۔

"کچھ نہیں دادا جان! زندگی صرف جمود میں نہیں گزرتی انسان فطری طور پر تبدیلیوں کا طالب ہوتا ہے۔ اور فکشن ہمیں وہ سارے مہیا کر دیتا ہے جو میرے خیال میں ذہنی سفر کے لئے ضروری ہوتے ہیں۔"

"اچھی باتیں کر رہے ہو۔ اور کچھ کہو۔" دادا جان آہستہ سے بولے۔

"کچھ نہیں دادا جان...! بس میں یہ عرض کر رہا تھا کہ مجھے بھی ناولوں کا شوق ہے۔ آپ مجھے بتائیں کون کون سے ناول آپ کو پسند ہیں، وہ میں آپ کو مہیا کر دوں گا۔"

"الحمدللہ...! اس کے لئے میرے پاس معقول بندوبست ہے۔"

"تو دادا جان...! کبھی کبھی مجھے آپ کے ذخیرے میں سے کچھ حاصل ہو سکتا ہے؟"

"اُدھار دیا جا سکتا ہے، دیانتداری سے واپس کرنا شرط ہوگی۔" حسام احمد صاحب نے کہا۔

"یقیناً، یقیناً... میں کتاب کی عزت بہت ضروری سمجھتا ہوں۔"

"تو آؤ... کتاب چاہیئے نا تمہیں؟"

"جی اگر عنایت ہو جائے تو..." دادا جان اپنی جگہ سے اُٹھ کر اندر داخل ہو گئے۔ عازم بھی اُن کے ساتھ تھا۔ حسام احمد کا رُخ اپنی لائبریری کی جانب تھا۔ عازم نے دو کتابیں پسند کی تھیں۔

"لے جاؤ... اُنھیں پڑھ کر واپس کر دینا اور اگر تمہارے ہاتھ کوئی عمدہ چیز لگ جائے تو وہ مجھے فراہم کر دینا۔ اس طرح اگر کتاب پر کوئی نشان نہ پڑا تو تمہیں مستقل ملتی رہیں گی۔"

"جی... ویسے دادا جان! آپ کے اس ذوق کا کوئی اور بھی شریک ہے یہاں میرا مطلب ہے اِن بچوں میں سے بھی کسی کو پڑھنے کا شوق ہے؟"

"ہاں ہے... لیکن اُن بچوں میں نہیں۔ بلکہ میرا اپنا بچہ یعنی زاہد۔"

"اوہ زاہد صاحب کی شخصیت واقعی اتنی پیاری ہے کہ دل چاہتا ہے ان کے پاس سے اُٹھا ہی نہ جائے۔ لیکن بڑے مصروف انسان ہیں۔"

"ہاں میاں رزقِ حلال کھانے کا شوقین ہے۔ حالانکہ کون اُسے مجبور کر سکتا ہے کہ وہ اپنی مرضی کے خلاف کچھ کرے۔ لیکن دیکھو بے پناہ مصروف رہتا ہے۔ ایسے لوگ کم ہی ہوتے ہیں۔"

"ویسے دادا جان! زاہد میاں کوئی رشتہ دار ہیں آپ کے؟"

"دیکھو بھائی! ادب کی کتابوں میں تم نے پتہ نہیں کیا کچھ پڑھا ہوگا رشتوں کے بارے میں۔ لیکن میری اپنی سوچ ذرا مختلف ہے۔ ان تمام چیزوں سے میں رشتوں کا تعلق ذہن سے سمجھتا ہوں۔ بہت سے لوگ ہمارے اتنے قریبی عزیز ہوتے ہیں جیسے بھائی بہن چچا تایا۔ ماموں... لیکن اُن کی فطرت کچھ اس قسم کی ہوتی ہے کہ ہم ذہنی طور پر ان سے ہم آہنگ نہیں ہو سکتے۔ ہم اُنھیں رشتہ دار کہنے کے لئے مجبور تو ہوتے ہیں لیکن دل سے سمجھنے کے لئے ذرا مشکل پیش آتی ہے۔ بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں جو کچھ بھی نہیں ہوتے۔ لیکن اُن کی جگہ دل کی جڑوں میں ہوتی ہے۔ زاہد میرا ایسا ہی... رشتے دار ہے۔"

"واہ دادا جان... کیا حسین الفاظ میں آپ نے اپنے احساسات کی تشریح کی ہے۔ زاہد کی شخصیت بلاشبہ ایسی ہی ہے کہ اُسے اتنا ہی چاہا جائے۔ لیکن وہ عام لوگوں سے بے تکلف نہیں ہوتا؟"

"مصروف آدمی ہے۔ ظاہر ہے ان بے تکلفیوں کے لئے وقت کہاں سے نکالے۔" دادا جان نے کہا۔

"اس کا مطلب ہے کہ اس کے علاوہ آپ کا اُن سے کوئی رشتہ نہیں ہے؟"

"اس سے زیادہ کوئی رشتہ ہو بھی نہیں سکتا۔" دادا جان نے جواب دیا۔

"وہ بچپن ہی سے آپ کے ساتھ ہیں؟"

"کاش ہوتا۔ کاش اس نے اتنا وقت کہیں اور ضائع نہ کیا ہوتا۔" دادا جان بولے۔

"گویا بچپن سے نہیں ہیں؟"

"نہیں، تھوڑے عرصے پہلے آیا تھا میرے پاس۔ کچھ ایسا دل کو لگا کہ دل ہی میں جا بیٹھا۔"

"دادا جان! آپ کی محبت جس کو حاصل ہو جائے۔ وہ کم خوش نصیب نہیں ہوتا۔ میں جاننا چاہتا ہوں کہ زاہد صاحب میں ایسی کون سی خوبیاں ہیں؟"

"دیکھو میاں...! ہم ہرجائی نہیں ہیں۔ بس ایک کو اپنا لیا سو اپنا لیا۔ پہلے اہلیہ تھیں جو زندگی کے ہر دکھ سکھ کی رازدار اور شریک... اور اب اپنا یہ بیٹا ہے یعنی زاہد! تمہاری گنجائش صرف اس حد تک نکل سکتی ہے کہ ملتے رہا کرو۔ بچے ہو اور اگر کتابوں سے شوق ہے تو پھر تھوڑا تھوڑا یہ سلسلہ بھی چلتا ہی رہے گا۔ بس اب جاؤ۔ میں نے ناول ایسی جگہ چھوڑا ہے جہاں بڑا سسپنس ہے۔ پہلی بار میں نے تم سے یہ اخلاق برت لیا ہے۔ شاید آئندہ نہ برت سکوں۔ ہاں اگر کوئی کتاب میرے ہاتھ میں نہ ہو تو بے تکلف آ جانا۔"

"آپ کی اتنی ہی محبت اور اتنی ہی توجہ میرے لئے کافی ہے۔" عازم نے کہا اور وہاں سے رخصت ہو گیا۔ دونوں کتابیں اس کے ہاتھ میں تھیں۔ اور وہ مسکرا رہا تھا۔ اس نے زندگی میں شاید ایسی کوئی کتاب کبھی کھول کر بھی نہ دیکھی ہو۔ لیکن دادا جان کی توجہ حاصل کرنے کا یہ پہلا نسخہ اس کے ہاتھ آ گیا تھا۔ اس کے بعد اب اُسے دوسرا کام انجام دینا تھا کم از کم دادا جان سے تو راہ و رسم ہو ہی گئی تھی۔ اور یہ بھی پتہ چل گیا تھا کہ زاہد دادا جان کو کتنا پسند ہے۔ گویا دادا جان کی توجہ حاصل کرنے کا یہ نسخہ یقیناً زاہد کو بھی معلوم ہوگا۔ اور اگر اس سلسلے میں زاہد سے آگے بڑھ جایا جائے تو لطف ہی آ جائے گا۔ چنانچہ اس سلسلے میں اس نے اپنے ذہن میں کچھ منصوبے ترتیب دے لئے تھے۔

دوسری طرف فاخر ایک چوڑی سڑک پر احمد رضا کا منتظر تھا۔ اُسے کافی دیر احمد رضا کا انتظار کرنا پڑا۔ ساڑھے دس بجے اس نے احمد رضا کی خوبصورت اسپورٹس کار سڑک پر آتے دیکھی اور وہ سڑک کے کنارے آ کھڑا ہوا۔ اتفاق سے سڑک سنسان ہی تھی۔ وہ آہستہ آہستہ دو چار قدم آگے بڑھا اور پھر سیدھا ہو گیا۔ احمد رضا کی کار اس کے نزدیک پہنچ گئی تھی... احمد رضا نے اُسے دیکھا۔ تھوڑا سا آگے نکل گیا تھا لیکن پھر کار ریورس کر کے فاخر کے نزدیک آ گیا۔

"ارے آپ کہاں فاخر صاحب، خیریت...؟" احمد رضا نے پوچھا۔

"بس یونہی اکتا کر باہر نکل آیا تھا۔ سوچا کچھ کر دوں... لیکن سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا کیا جائے۔ یہ ایک دو ماہ گزارنا بڑا مشکل مرحلہ ہے۔"

"آیئے آیئے جا کہاں رہے تھے آپ؟"

"میں نے عرض کیا نا، بس یونہی آوارہ گردی کرنے نکل آیا تھا۔"

"تو گاڑی لے لی ہوتی گھر سے۔ دو گاڑیاں تو فالتو کھڑی رہتی ہیں ہمیشہ" احمد رضا نے کہا۔ فاخر اس کے برابر آ بیٹھا تھا۔

"بس دراصل آپ لوگوں کی محبت کے بوجھ تلے اس طرح دب گئے ہیں کہ مزید تکلیف دیتے ہوئے جھجک محسوس ہوتی ہے۔"

"کیا مطلب...؟"

"میرا مطلب ہے گاڑی وغیرہ کا معاملہ۔ چچا جان تو اس طرح ہم لوگوں کو گلے سے لگائے ہوئے ہیں جیسے ہم انہی کی اولاد ہوں۔"

"ڈیڈی سادہ دل اور مخلص آدمی ہیں۔ جس سے محبت کرتے ہیں ٹوٹ کر کرتے ہیں، چنانچہ براہ کرم آپ ایسی باتیں مت سوچا کریں جب آپ ہمارے گھر میں ہیں تو گھر کے فرد کی حیثیت ہی سے رہیں، جب تک بھی آپ کا قیام ہے۔ آپ ہمارے ہاں کسی قسم کی تکلیف نہ اٹھائیں۔"

"زندگی میں ہم نے بھی بہت کچھ دیکھا ہے احمد رضا صاحب، بہت سے لوگوں سے ملاقات ہوئی ہے۔ لیکن بعض لوگ یوں لگتے ہیں جیسے آسمان سے براہِ راست اترے ہوں۔ آپ یقین کیجئے ہم دونوں بھائی اس گھر میں آنے سے اس قدر متاثر ہیں کہ الفاظ میں اُسے بیان نہیں کر سکتے آپ لوگ بے حد اچھے اور مخلص انسان ہیں۔" فاخر نے کہا اور احمد رضا ہنسنے لگا۔

"چھوڑیئے فاخر بھائی! اِن باتوں کو۔ آپ خود اچھے انسان ہیں۔ اس لئے دوسروں کو بھی اچھا سمجھتے ہیں۔ اچھا سنیں...، اگر کوئی خاص مصروفیت نہیں ہے تو آج کا دن آپ میرے ساتھ گزار دیں۔ نقشہ نویس کے پاس جانا ہے۔ تھوڑی دیر وہاں رہیں گے۔ پھر ہم آپ کو فرسٹ ایڈ ہاؤس لے جائیں گے۔"

"فرسٹ ایڈ ہاؤس یہ کیا ہے؟" فاخر نے سوال کیا۔

"یہ ایک طویل تفصیل ہے جو میں آپ کو بتا دوں گا۔ لیکن یہاں نہیں۔ پہلے ہم نقشہ نویس کے پاس پہنچ کر اپنا کام کر لیں۔ اس کے بعد کسی ریستوران میں بیٹھ کر کافی پئیں گے۔ پھر میں آپ کو فرسٹ ایڈ ہاؤس لے چلوں گا۔"

"ضرور، ضرور... مجھے یہ نام ہی بڑا دلچسپ لگ رہا ہے۔" فاخر نے کہا۔ وہ احمد رضا کو پوری طرح شیشے میں اتار رہا تھا۔

نقشہ نویس کے پاس تھوڑی دیر صرف ہوئی۔ کلینک کا نقشہ تیار ہو چکا تھا جو نقشہ نویس نے احمد رضا کے حوالے کر دیا۔ وہاں سے وہ لوگ ایک خوبصورت ریستوران میں آ بیٹھے۔ احمد رضا نے کافی منگوائی اور تھوڑی دیر کے بعد وہ کافی کے گھونٹ لے رہے تھے۔

"ہاں تو یہ فرسٹ ایڈ ہاؤس کیا چیز ہے۔ اب آپ مجھے بتایئے..."

"دادا جان نے زندگی کے آخری ایام انسانوں کی فلاح و بہبود کے لئے صرف کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ اور یہ فرسٹ ایڈ ہاؤس اس سلسلے کی ایک عظیم الشان عمارت ہے۔ یہ عمارت دراصل ایک خیراتی ادارہ سمجھا جا سکتا ہے جبکہ دادا جان کے سامنے اس قسم کا کوئی تصور نہیں ہے۔ وہ اُسے اپنی ضرورت اور ذمہ داری محسوس کرتے ہیں۔ اس عظیم الشان عمارت میں دفاتر ہوں گے رہائش گاہیں ہوں گی۔ دارالامان ہوگا۔ اور ایسی ہی دوسری چیزیں یہاں اُن معذوروں کو رکھا جائے گا جو زندگی کے بوجھ کو سڑکوں پر گھسیٹتے پھرتے ہیں۔ اور وہ اس کے لئے مجبور ہیں کیونکہ معاشرے میں اُنھیں کوئی پناہ گاہ نہیں ملتی۔ ایسے تمام لوگ فرسٹ ایڈ ہاؤس میں زندگی کی دلچسپیوں سے بہرہ ور ہو سکیں گے۔ اُنھیں وہاں مفت رہائش اور خوراک فراہم کی جائے گی۔ ابھی تو فرسٹ ایڈ ہاؤس ایک عمارت میں ہے اور اس عمارت میں اُن معذور افراد کے لئے جتنی گنجائش نکل سکتی ہے نکالی جائے گی۔ لیکن اس کی بے شمار برانچیں ہوں گی۔ دادا جان کا پروگرام ہے کہ شہر میں بہت سے ایسے مکان حاصل کئے جائیں گے۔ جو اُن معذوروں کی رہائش گاہ کے لئے ہوں گے۔ اور اُن کی معذوری کو دیکھتے ہوئے اُن کے لئے زندگی کے لوازمات فراہم کئے جائیں گے۔ اس کے علاوہ ہمارے ملک کا ایک بہت بڑا طبقہ ہے جو نوجوانوں پر مشتمل ہے۔ ایسے نوجوان جو بے روزگار ہوتے ہیں۔ تعلیم یافتہ ہوتے ہیں۔ لیکن اُنھیں زندگی میں کوئی سہارا نہیں ملتا۔ بے سہارا ہونے کی وجہ سے اُن کی تمام صلاحیتیں ختم ہو جاتی ہیں۔ فکرِ معاش کا مسئلہ اُنھیں جینے نہیں دیتا اور وہ معاشرے میں کوئی نمایاں کام انجام نہیں دے پاتے۔ .... کوئی کسی دفتر میں کلرک بن جاتا ہے کوئی دُکاندار بن جاتا ہے اور معمولی سی زندگی اُن کا مقدر بن جاتی ہے۔ فرسٹ ایڈ ہاؤس میں ایسے لوگوں کو ابتدائی امداد دی جائے گی۔ یعنی اُن کے لئے سوچا جائے گا۔ اُن کی ضروریات فرسٹ ایڈ ہاؤس کے وسائل سے پوری کی جائیں گی اور اُنھیں موقع دیا جائے گا کہ وہ جس فیلڈ میں آگے بڑھنے کے اہل ہیں۔ اس میں اُنھیں داخل کیا جائے۔ ملکی طور پر اور ملک سے باہر وہ اپنی صلاحیتوں کو آزمائیں گے اور اس کے بعد ملک و ملت کے لئے ایک مفید انسان بن جائیں گے۔ دارالامان میں

ایسی محتاج اور معذور لڑکیوں کو جگہ دی جائے گی جو اپنی زندگی کانٹوں میں گھسیٹ رہی ہیں۔ میں غالباً صحیح طور پر اُس کی تشریح نہیں کر سکا ہوں۔ بہر حال یہ فرسٹ ایڈ ہاؤس ہے۔"

"خُدا کی پناہ... ایسا عظیم ارادہ، میرا خیال ہے میں نے اس کے بارے میں اخبارات میں تفصیل بھی پڑھی تھی۔"

"ہاں دادا جان نے ایک پریس کانفرنس کو اپنے خیالات سے آگاہ کیا تھا۔"

"تو اس میں حکومت بھی کچھ امداد کر رہی ہے؟"

"ہاں... لیکن ہم نے اپنے طور پر حکومت کو اس سلسلے میں بہت زیادہ تکلیف نہیں دی ہے۔ بس جو مسئلہ رُکتا ہے وہاں ہم اعلیٰ حکام سے رابطہ قائم کر کے اس کا حل تلاش کر لیتے ہیں۔"

"اور یہ آپ کا کلینک؟"

"یہ کلینک دراصل ایک چیلنج ہے۔ میں اپنے ڈیڈی کی بے پناہ عزت کرتا ہوں۔ بلاشبہ انھوں نے ہمارا مستقبل تعمیر کرنے میں بے حد مدد کی ہے۔ لیکن خُدا کے فضل و کرم سے ہمارے پاس بے پناہ دولت ہے اور دولت کے یہ انبار تجوریوں میں بے کار پڑے رہیں تو اُن سے کسی کو کوئی فائدہ حاصل نہیں ہوتا۔ دولت ہمیشہ سرکولیشن میں رہنی چاہیئے۔ ہر ایک کے پاس تھوڑی تھوڑی ضرور پہنچنی چاہیئے۔ میں اگر ایک اعلیٰ پائے کا کلینک قائم کر کے دولت گھسیٹنا شروع کر دیتا تو اس سے فائدہ کیا ہوتا۔ سوائے اس کے کہ ہمارے بینک بیلنس میں کچھ اور اضافہ ہو جاتا۔ ہماری تجوریاں کچھ اور بھر جاتیں۔ میں اس سے متفق نہیں تھا فاخر بھائی۔ چنانچہ ڈیڈی نے کہا کہ میں خود ہی اپنے پیروں پر کھڑا ہوؤں۔ وہ اس سلسلے میں میری کوئی مدد نہیں کریں گے۔ جبکہ پہلے وہ میرے لئے ایک کلینک تعمیر کرانے کے لئے تیار تھے۔ چنانچہ اب دادا جان نے فرسٹ ایڈ ہاؤس میں میرے لئے کلینک بنوانے کا فیصلہ کر لیا ہے اور یہ نقشہ اس کا ہے۔"

"گویا اس فرسٹ ایڈ ہاؤس میں طبی امداد بھی فراہم کی جائے گی۔"

"جی ہاں... غریبوں کو وہ تمام سہولتیں مہیا کی جائیں گی جو بڑے بڑے ہسپتالوں میں ہیں۔ اور اُن کی پہنچ وہاں تک نہیں ہے جن کی وجہ سے انھیں حادثات سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ وہ بہترین مشینوں پر اپنا ٹریٹ منٹ نہیں کرا سکتے۔ کیونکہ اس کے لئے انھیں وافر سرمایہ درکار ہوتا ہے۔ فرسٹ ایڈ ہاؤس میں جدید ترین پیمانے پر ان نادار لوگوں کو طبی سہولتیں فراہم کی جائیں گی جو اس کے اہل نہیں ہوتے۔"

"اور اس کے اخراجات فرسٹ ایڈ ہاؤس برداشت کرے گا۔"

"جی ہاں... لیکن فرسٹ ایڈ ہاؤس کو چلانے کے لئے سرمایہ کہاں سے فراہم ہوگا؟"

"ہم ابھی تو اپنے طور پر یہ سب کچھ کر رہے ہیں اور شاید طویل عرصے تک کرتے رہیں گے۔ لیکن اس کے بعد فرسٹ ایڈ ہاؤس کے اپنے کچھ اور معاملات بھی ہیں جو یقیناً زاہد بھائی اور دادا جان کے ذہن میں ہوں گے۔ اتنے بڑے ادارے کو چلانے کے لئے بلاشبہ بہت بڑی رقم درکار ہوگی۔ ممکن ہے مخیر حضرات اس سلسلے میں اس ادارے کی مدد کریں۔ حکومت بھی کچھ گرانٹ ضرور دے گی۔ باقی فی الحال تو ہم اپنی.. جیب سے ہی خرچ کر رہے ہیں۔"

"بہت بڑا سرمایہ درکار ہوگا۔ اس عمارت کی تعمیر کے لئے۔" فاخر نے پوچھا۔

"تم خود دیکھ لو چل کر۔ عمارت اتنی وسیع ہے کہ اس میں ہزاروں افراد کے لئے گنجائش نکل سکتی ہے۔"

"بخدا دادا جان جنت کما رہے ہیں۔ میں تو اُن سے بے حد متاثر ہُوا ہُوں۔"

"ہاں بس اب جو کچھ بھی ہے میں نے تمھیں اس کی تفصیل بتا دی ہے۔"

"میں بہت متاثر ہُوا ہوں۔ ویسے احمد رضا صاحب اس فرسٹ ایڈ ہاؤس کی تحریک کہاں سے پیدا ہوئی۔ کونسا خیال دادا جان کے ذہن میں آیا جس نے انھیں اس طرف راغب کیا۔"

"میں بتاؤں آپ کو۔ یہ جو ہمارے زاہد ذوالفقار زیدی یعنی ٹرپل زیڈ ہیں نا یہ ایک ایسی ہمہ گیر شخصیت ہیں کہ تم تصور نہیں کر سکتے فاخر... زاہد بھائی علم و عمل کا سمندر ہیں۔ تمھیں یقیناً حیرت ہوگی کہ انھوں نے میڈیکل کی تعلیم میں مجھے بے پناہ مدد دی ہے۔ کونسا شعبہ ہے جس سے ان کی واقفیت نہیں ہے۔ دادا جان تو اُن پر جان چھڑکتے ہیں۔ فرسٹ ایڈ ہاؤس اُنہی کے ذہن کی تخلیق ہے اور انھوں نے ہی دادا جان کو اس کی تحریک دلائی تھی۔ اُنھوں نے ہی اس کا منصوبہ پیش کیا تھا۔ دادا جان بس اس منصوبے پر عمل کر رہے ہیں۔" احمد رضا نے جواب دیا۔ فاخر کی آنکھوں میں چمک پیدا ہو گئی۔ یہ معلومات یقیناً شجاع احمد صاحب کے لئے دلچسپ ہُوں گی۔ گویا کام تسلی بخش طور پر جاری ہے۔

احمد رضا خاموش ہو کر فاخر کی شکل دیکھنے لگا۔ دفعتاً فاخر کو اپنی خاموشی کا احساس ہُوا اور وہ جلدی سے بولا۔ "واقعی... تب تو یہ زاہد ذوالفقار بہت عظیم انسان ہے۔ دادا جان نے انھیں ملازم رکھا ہُوا ہے؟"

"یہ تُم کبھی دادا جان کے سامنے کہہ بھی مت دینا۔ زاہد بھائی کی حیثیت قطعاً ایک ملازم کی نہیں ہے۔ میں تو یہ بھی نہیں جانتا کہ وہ ہمارے

ہاں سے تنخواہ بھی لیتے ہیں یا نہیں۔ وہ اس گھر ہی کے ایک فرد ہیں۔"

"ہاں ہونا بھی چاہیئے۔ ایسی شخصیت کو بھلا کون اپنے آپ سے دُور رکھنا پسند کرے گا؟" فاخر نے گہرے لہجے میں کہا۔

کافی پینے کے بعد وہ دونوں ریستوران سے اُٹھ گئے اور احمد رضا اُسے کر فرسٹ ایڈ ہاؤس پہنچ گیا۔ فاخر نے بہر طور اپنے طور پر خاصی معلومات حاصل کر لی تھیں۔ رات کو جب دونوں بھائی اپنے بیڈ روم میں یکجا ہوئے تو دونوں نے اپنی کارروائی کی تفصیل سے ایک دوسرے کو آگاہ کیا۔

"گڈ... گویا احمد رضا کو کلینک کی تعمیر کے لئے آمادہ کرنے والا بھی زاہد ہی ہے؟"

"ہاں... اور حسام احمد صاحب کے ذہن میں فرسٹ ایڈ ہاؤس کا خاکہ پیدا کرنے والا بھی یہی شخص ہے۔"

"یار ایک بات ہے جو کچھ تم نے بتایا ہے وہ ہے تو بہت عظیم الشان زاہد کا ذہن اس کے مقصد سے بہت آگے کی سوچتا ہے۔" عازم نے پُرخیال لہجے میں کہا۔

"تمہاری کیا رپورٹ ہے؟"

"میں نے حسام احمد صاحب کو ٹٹولا ہے انسان سے راہ و رسم بھی پیدا کر لی ہے۔ بڑا عجیب شوق ہے انھیں ایک اور وہ شوق ہے جاسوسی ناول پڑھنے کا۔ جاسوسی کہانیوں میں وہ بہت دلچسپی لیتے ہیں اور مجھے یقین ہے کہ زاہد نے انھیں اُن کی اس کمزوری پر پھانسا ہے۔ اس کے بعد اس نے اس طرح اپنے پنجے گاڑ لئے ہیں کہ حسام احمد صاحب اب اس کے شکنجے سے نہیں نکل سکتے۔"

"ایک بات کا پتہ چلانے کی خاص طور سے کوشش کرو عازم۔"

"کیا۔" عازم نے سوالیہ نگاہوں سے اُسے دیکھا۔

"یہ زاہد یہاں سے رقمیں کس طرح مار رہا ہے۔ ظاہر ہے بے مقصد تو ان لوگوں میں نہیں گھسا ہوگا۔ مسئلہ یہ ہے کہ اس کی کمائی میں سے کچھ ہمارا حصہ بھی ہونا چاہیئے۔"

"ہوں ابھی نہیں۔ ذرا دیر میں یہ کام کروں گا۔ میں حسام احمد کو شیشے میں اتار لوں۔ ویسے آج ہم نے جو کچھ کیا ہے وہ بہت کافی ہے۔ اب اس کی رپورٹ کس طرح شجاع احمد صاحب کو دی جائے۔"

"میرا خیال ہے رپورٹ ہم تیار کر لیتے ہیں تحریری طور پر اور پھر وہ لفافہ شجاع احمد صاحب کے سپرد کر دیا جائے گا۔"

"بس ٹھیک ہے۔ آؤ رپورٹ تیار کریں۔ اب اس وقت یہاں کسی کے آنے کا امکان نہیں ہے۔"

"کل کا کیا پروگرام ہے؟"

"کل میرا خیال ہے۔ میں ہارون کو دیکھوں گا۔" عازم نے کہا۔

"اور میں قدسیہ کو...!" فاخر بولا اور دونوں مسکرانے لگے۔ اس کے بعد وہ رائٹنگ ٹیبل پر رپورٹ کی تیاریاں کرنے لگے۔

●

قدسیہ اپنے نگار خانے میں مصروف تھی۔ بڑے بڑے کینوس بورڈ پر لگے ہوئے تھے اُن پر خاکے ترتیب پا چکے تھے اور اب اُن خاکوں میں رنگ بھرا جا رہا تھا۔

سرفراز کی ذمہ داریاں کچھ زیادہ بڑھ گئی تھیں۔ وہ کئی گھنٹے قدسیہ کے ساتھ اس کے نگار خانے میں صرف کرنے لگا تھا۔ دونوں میں.... جب سے ذہنی رابطہ قائم ہوا تھا اُن کی یگانگت اور بڑھ گئی تھی۔ کبھی کبھی سرفراز کا دل چاہتا کہ قدسیہ کو روک دے اس سے کہے کہ وہ مصوّر نہیں ہے اور قدسیہ جو کچھ کر رہی ہے وہ ٹھیک نہیں ہے۔ اُسے بالکل اُمید نہیں تھی کہ وہ تصویریں جو قدسیہ بنا رہی ہے کوئی مقام حاصل کر سکیں گی۔ زاہد نے ہرچند کہ اس کا یقین دلایا تھا لیکن سرفراز کے دل کا اطمینان نہیں ہوتا تھا۔ وہ قدسیہ کے سامنے جب بھی آتا اس اضطراب کا شکار رہتا۔ لیکن اس میں اتنی جرأت نہیں پیدا ہوئی تھی کہ وہ قدسیہ کو حقیقت سے آگاہ کر سکتا۔ یہ حقیقت معلوم کر کے قدسیہ کا ذہن بُری طرح بھٹک جاتا۔ سرفراز بھی اس کے ذہن سے اُتر جاتا اور شاید وہ مصوّری سے بھی بددل ہو جاتی۔ سرفراز کے وہ لمحات بھی قدسیہ کو کمال گذرتے جو اس نے مصوّری کے استاد کی حیثیت سے قدسیہ کے ساتھ گذارے تھے۔ وہ خود بھی ایک چھوٹا انسان تصور کیا جا سکتا تھا اور کیا قدسیہ اس چھوٹے انسان کے لئے دل میں وہ جگہ رکھ سکتی تھی جو پیدا ہو گئی تھی۔

ان الجھنوں کا شکار تھا سرفراز لیکن بہر طور وہ قدسیہ کو کام کرا رہا تھا۔

...... یہ کام ایسا تھا جو خود اس کی سمجھ سے بھی باہر تھا اس کا دل چاہتا تھا کہ مصوّری کی کتابیں پڑھے۔ حقیقتوں کو تلاش کرے اور ان حقیقتوں کے خطوط پر قدسیہ کے فن کو استوار کر لے۔ وہ اس کے لئے بہت کچھ کرنا چاہتا تھا۔ حالانکہ اس کے دل میں کبھی کبھی یہ خوف بھی جاگزیں ہو جاتا تھا کہ ان احساسات کا انجام بہتر نہ ہوگا۔

اس وقت بھی دونوں ہی مصروف تھے۔ قدسیہ نے صرف سرفراز کے زیرِ ہدایت کام کیا تھا۔ جو کچھ کر رہی تھی وہ خود ہی کر رہی تھی۔ ایک تصویر مکمل ہونے کو تھی۔ سرفراز خاموش بیٹھا قدسیہ کو کام کرتے دیکھ رہا تھا۔ اس کی نگاہوں میں یہ ایک بے مصرف عمل تھا۔ لیکن بہر طور یہی عمل اس کے یہاں آنے کا باعث بنا تھا اس لئے کیا کرتا۔

تصویر کو آخری ٹچ دے کر مکمل کر دیا گیا۔ قدسیہ تھکے تھکے انداز میں اس کے سامنے آ کر بیٹھ گئی۔

"کیا خیال ہے سرفراز صاحب! آپ میری اس کاوش سے مطمئن ہیں؟"

"ایں... ہاں بہت زیادہ..." سرفراز نے اُلجھے ہوئے انداز میں کہا۔

"کیا بات ہے کچھ سوچ رہے ہیں؟"

"ایں... ہاں کچھ نہیں۔ کوئی خاص بات نہیں۔"

"عام بات بھی اگر آپ سوچیں تو مجھے اس سے مطلع کر دیا کریں۔"
قدسیہ نے ناز بھرے انداز میں کہا اور سرفراز نے گہری سانس لے کر دونوں آنکھیں بند کرلیں۔

"سرفراز کیا بات ہے پلیز... بتاؤ تو سہی۔"

"یقین کرو قدسیہ کوئی خاص بات نہیں ہے۔ وہ دراصل رات کو پوری نیند نہیں لے سکا تھا۔ امی کی طبیعت کچھ گڑبڑ چل رہی ہے نا۔ اس لئے رات کو سو نہ سکا اور دیر تک جاگنا پڑا۔"

"اوہ اچھا پہلے کیوں نہ بتایا۔ آج یہ کام ہی نہ کرتے۔" قدسیہ نے محبت بھرے انداز میں کہا۔

"نہیں نہیں... ایسی کوئی خاص بات بھی نہیں ہے۔ تمہارے پاس آکر تو طبیعت کو خاصی فرحت حاصل ہوجاتی ہے۔ اسی وقت دروازے پر کسی کا سایہ سا لہرایا اور دونوں چونک کر دروازے کی جانب دیکھنے لگے۔

"دخل در معقولات کوئی معقول چیز نہیں ہے۔ لیکن بہرطور ہم جیسے لوگ بھی اس دُنیا میں ہوتے ہیں۔" باہر سے فاخر کی آواز سُنائی دی۔ پھر اس نے کہا۔ "اندر آنے کی اجازت چاہتا ہوں۔"

"آئیے آئیے فاخر صاحب! تشریف لائیے۔" سرفراز سنبھل کر بولا۔ اور فاخر اندر آگیا۔

"سبحان اللہ، سبحان اللہ... بھئی اب کیا کہا جائے۔ اس گھر کے بارے میں۔ میں سمجھتا ہوں یہ دُنیا کا نواں عجوبہ ہے۔"

"آپ کس طرح سمجھتے ہیں یہ بات؟" سرفراز نے سوال کیا۔

"میں عجوبہ کسی غلط معنوں میں نہیں کہہ رہا۔ یہاں لوگوں کا اندازِ فکر اتنا منفرد ہے۔ عام لوگوں سے کہ بڑا رشک آتا ہے۔ اس گھر کو دیکھ کر..."

"کمال ہے..." سرفراز نے تمسخرانہ انداز میں کہا۔ "تشریف رکھیئے۔"

"اگر اجازت ہو تو ان تصویروں کو دیکھ لوں؟"

"اب آپ آ ہی گئے ہیں تو ایک نگاہ ڈال لیجئے ان پر۔ حالانکہ یہ عام نگاہوں کے لئے نہیں تھیں۔" قدسیہ نے جواب دیا۔

"ہاں فنکار اپنے فن کو بڑا محبوب رکھتا ہے۔ لیکن آپ یقین کیجئے ہم تو ان پر محبت بھری نگاہ ڈالیں گے۔ ویسے سرفراز صاحب سُنا ہے آپ محترمہ قدسیہ کے استاد ہیں؟"

"بڑی جلدی آپ کو یہاں کے بارے میں بے شمار معلومات حاصل ہوگئیں۔"

"کیوں نہ ہوتیں۔ یہ ہمارے چچا جان کا گھر ہے۔ میں آپ سے فنِ مصوری کے بارے میں کچھ گفتگو کرنا چاہتا ہوں محترمہ قدسیہ۔"

"بہتر یہ ہے کہ آپ اس وقت یہ گفتگو نہ کریں۔ آپ تشریف لائے ہیں۔ ان تصویروں کو دیکھیں اور اس کے بعد ہمیں اجازت دیں کہ ہم اپنا کام جاری رکھ سکیں۔"

"اوہو... مصروف تھے آپ لوگ، معذرت خواہ ہوں۔ اگر ایسی بات ہے تو میں چلتا ہوں۔"

"نہیں نہیں... اب ایسی بات بھی نہیں ہے آپ اگر تفریحاً ہی یہاں آئے ہیں تو کوئی ہرج نہیں بیٹھئے اور اگر گفتگو ہی کرنا چاہتے ہیں تو قدسیہ نہ سہی میں حاضر ہوں۔"

"ہاں ہاں سرفراز صاحب! دراصل تجریدی آرٹ میری سمجھ میں کبھی نہیں آیا۔"

"تب تو آپ کو اس موضوع پر بات ہی نہیں کرنی چاہیئے کیونکہ یہاں سمجھانے کا وقت کسی کے پاس نہیں ہے۔ اہلِ نظر خود ہی حقیقتوں کو پرکھ لیتے ہیں۔ اگر انہیں بتانا پڑے تو حقیقتوں کا حسن گم ہوجاتا ہے۔" سرفراز نے جواب دیا۔

"آپ کے پاس خوبصورت الفاظ کا بہت بڑا ذخیرہ ہے۔ کاش ہم بھی انہی لفظوں میں بول سکتے۔"

"ضروری نہیں ہے کہ آپ بھی ہنس کی چال چلنے کی کوشش کریں۔" قدسیہ نے مُنہ بنا کر کہا۔ لیکن فاخر ڈھیٹ آدمی تھا اس کے اس طنز کو سہہ گیا۔

"ہاں ہر شخص کو اہم مقامات حاصل نہیں ہوتے۔ ہم نے سوچا کہ چونکہ ہمیں بھی اس گھر میں اتنی زیادہ اہمیت دے دی گئی ہے۔ سو سب ہی سے ملاقات کرلیں۔ اس لئے آپ کے پاس آگئے۔ لیکن لگتا یوں ہے کہ آپ کو ہماری آمد ناگوار گزری ہے قدسیہ صاحبہ۔"

"ہاں ہر ضروری کام میں کسی کی مداخلت پسندیدہ نگاہوں سے تو نہیں دیکھی جاسکتی۔" قدسیہ نے جواب دیا۔

فاخر پر بھرپور چوٹ تھی۔ وہ اس چوٹ کو برداشت نہیں کرسکا اور بولا۔

"یوں لگتا ہے جیسے ان تنہائیوں میں میری مداخلت بہت ہی ناگوار گزری ہے آپ حضرات کو، چلے جاتے ہیں۔ لیکن یہ خلش دل میں لے کر یہاں ہماری پذیرائی نہیں ہوئی۔"

"ارے نہیں نہیں بیٹھئے۔ بھئی قدسیہ یہ غلط بات ہے۔ آپ فاخر صاحب کی پذیرائی کریں۔ ۔۔۔۔ اپنے فن کے بارے میں گفتگو کریں۔"

"میں صرف ایک سوال پوچھنا چاہتا ہوں۔ آپ سے قدسیہ صاحبہ؟"

"جی فرمائیے۔۔۔"

"آپ کو یہ احساس کیسے ہوا کہ آپ مصوّرہ ہیں؟"

"اس کا جواب کسی دن اخبار میں پڑھ لیجئے گا۔ میری تصویروں کی نمائش ہونے والی ہے۔"

"اچھا۔۔۔ بہت خوب، کب تک؟" فاخر نے سوال کیا۔

"وقت کا اعلان بھی اخبارات میں ہی کیا جائے گا۔" قدسیہ نے جواب دیا۔

"بہتر ہے۔ ویسے آپ کے بارے میں بہت کچھ معلوم کرنا چاہتا تھا۔ آج سے اخبار روزانہ پڑھنا شروع کردوں گا۔ اجازت دیجئے۔" فاخر نے کہا اور باہر نکل گیا۔

یہاں سے وہ بہت ذلیل وخوار ہو کر نکلا تھا لہذا اس کے ذہن میں انتقام کا جذبہ پیدا ہو گیا تھا۔ قدسیہ اور سرفراز نے اس کی اچھی خاصی بے عزتی کی تھی۔ وہ اس بے عزتی کو برداشت نہیں کر سکا تھا۔ دفعتاً وہ چونک پڑا۔

سرفراز اور قدسیہ۔۔۔ قدسیہ اور سرفراز۔ ویری گڈ۔ ویری گڈ۔ لیکن کیا رپورٹ میں واضح الفاظ میں اس گٹھ جوڑ کے بارے میں کچھ لکھا جائے یا احتیاط برتی جائے۔ اس نے فیصلہ کیا کہ عازم سے اس موضوع پر گفتگو کی جائے گی اور اس کے بعد ہی قدسیہ اور سرفراز کے بارے میں رپورٹ تیار کی جائے گی۔ یہ فیصلہ کرنے کے بعد وہ مطمئن ہو گیا۔

شجاع احمد صاحب کے دونوں جاسوس ابھی تک تو کامیابی سے اپنا کام انجام دے رہے تھے۔ لیکن آنے والا وقت شاید اُن کے لئے بہتر نہیں تھا۔

عازم کو بھی اپنے مشن میں کسی قدر کامیابی حاصل ہوئی تھی۔ پروگرام کے مطابق اُسے ہارون کے بارے میں اندازہ لگانا تھا۔ چنانچہ وہ ہارون کے علاقے میں داخل ہو گیا۔ جو اُوپری منزل پر تھا۔ ہارون گٹار کے تاروں پر کوئی دُھن سیٹ کر رہا تھا۔ عازم کو داخل ہوتے دیکھ کر اس کے ہاتھ رُک گئے۔

"واہ۔۔۔ ہارون صاحب! میں اس لئے نہیں آیا۔ براہ کرم نغمہ جاری رکھئے۔ فنکار کو اپنے فن سے زیادہ عزیز کوئی شے نہیں ہوتی۔ مجھے تو گٹار کی مدھر آواز اس طرف گھسیٹ لائی ہے۔"

"آپ کو موسیقی سے دلچسپی ہے عازم صاحب؟"

"عاشق ہوں موسیقی کا۔ آپ صرف دلچسپی کی بات کر رہے ہیں۔"

"خوب۔۔۔ تب تو آپ سے ہماری خوب گھٹے گی۔ ویسے کس قسم کی موسیقی آپ کو پسند ہے؟"

"ہر قسم کی۔"

"میرا مطلب ہے مغربی یا مشرقی؟" ہارون نے پوچھا۔ عازم چالاک آدمی تھا ایک لمحہ میں اندازہ لگا لیا کہ اس جگہ کو مشرقی موسیقی کی الف۔ ب بھی نہ معلوم ہوگی۔ ایک بھی ساز مشرقی نہیں نظر آ رہا تھا یہاں۔ اس لئے جلدی سے بولا۔

"ہر دور اپنی روایت رکھتا ہے ہارون صاحب! مشرقی موسیقی میں ٹھہراؤ تھا۔ جھیل کا سا سکوت اور گہرائی تھی۔ لیکن یہ اس وقت کی بات ہے جب انسانی زندگی میں بھی۔۔۔ ٹھہراؤ تھا اور اب زندگی جھیل کا سکوت نہیں بلکہ طوفانی سمندر کی حیثیت رکھتی ہے۔ چنانچہ یہ دور طوفانی تیزی کا ہے۔"

"واہ، واہ۔۔۔ کیا بات کہی ہے عازم بھائی! ایک منٹ میں یہ جملے نوٹ کر لوں کبھی کام آئیں گے۔" ہارون نے کہا اور عازم کے جملے اپنی ڈائری میں نوٹ کر لئے۔

"یہ بات خود تمہارے ذہن میں نہیں تھی ہارون؟"

"تھی۔۔۔ میرے ذہن میں۔" ہارون اٹک کر بولا۔ "ہاں تھی تھی۔۔۔"

"یقیناً ہوگی۔۔۔ ورنہ تم اتنے بڑے فنکار نہ بن سکتے۔"

"بالکل بالکل۔۔۔" ہارون گردن ہلا کر بولا۔

"یہ ملک فن کا قدردان نہیں ہے۔ لیکن تم جیسے فن کار کو بیرونی دُنیا ہاتھوں ہاتھ لے گی۔"

"اچھا۔۔۔؟" ہارون نے دانت نکال کر پوچھا۔

"بالکل اس موضوع پر پھر۔"

"ضرور سر جی گا۔"

"ویسے ہارون! تم نے مغربی موسیقی کا سبق کس سے لیا؟"

"زاہد بھائی سے۔" ہارون نے اطمینان سے جواب دیا۔

"زاہد بھائی سے؟ کیا وہ موسیقی سے شغف رکھتے ہیں؟"

"وہ تو علم وعمل کا سمندر ہیں۔ کونسا موضوع۔۔۔ ہے جس پر انھیں دسترس نہیں؟" ہارون عقیدت سے بولا۔

"کمال ہے یہ زاہد صاحب کیا کیا ہیں۔ ہم ابھی تک نہیں سمجھ سکے۔"

"کوئی نہیں سمجھ سکا۔ زاہد بھائی ہر فن مولا ہیں۔"

"یقیناً ایسا ہی معلوم ہوتا ہے لیکن تمہارے لئے انھوں نے کیا کیا؟"

"بس کچھ نہیں۔ ایک دن اچانک انھیں میرے اندر چھپا ہوا فنکار نظر آ گیا۔ کہنے لگے ہارون اگر تم فن موسیقی میں کمال حاصل کرنا چاہو تو

تمہارے اندر وہ صلاحتیں موجود ہیں۔ بس اس کے بعد انھوں نے مجھے بڑے بڑے موسیقاروں کے بارے میں ساری تفصیلات بتانا شروع کردیں۔ اُن کے گلے اور اُن کے فنِ موسیقی کے بارے میں اُنھوں نے مجھے مکمل ریکارڈ فراہم کیا۔ اکرے، ہیمپرن یا ٹرن لالی شوکا اور نجانے کون کون سے موسیقاروں کی زندگی میرے سامنے پیش کی۔ مجھے اُن کے ریکارڈ فراہم کئے۔ اور میں فنکار بن گیا۔"

"اور یہ داڑھی اور بال...؟"

"یہ ہر فنکار کی شناخت ہوتے ہیں۔" ہارون نے جواب دیا۔

"تم اپنے فن کا یہ مظاہرہ باہر بھی پیش کر چکے ہو؟"

"ہاں ایک بار پیش کیا تھا۔"

"کب...؟"

"احمد رضا بھائی کی کامیابی کے جشن میں ورنہ اس سے قبل بس گھریلو فنکار رہا ہوں۔"

"گویا زاہد نے تمھیں فنکار بنایا؟"

"بے شک، بے شک... یہ ساری حیثیت مجھے میرے استادِ محترم یعنی زاہد رضا قصار زیدی نے دی ہے۔"

"سبحان اللہ، سبحان اللہ۔ واقعی ہارون مان گئے زاہد صاحب کو۔ وہ تو اس گھر کا حلیہ ہی بدلنے پر تلے ہوئے ہیں۔"

"بلاشبہ اس میں کیا شک ہے۔" ہارون نے جواب دیا۔

"اچھا بھئی چلتے ہیں۔ ہمارے لائق بھی کبھی کوئی خدمت ہو تو ہمیں بتا دیں۔"

"جی شکریہ۔ اگر کبھی ضرورت پیش آئی تو ضرور بتا دوں گا عاظم بھائی۔" ہارون نے کہا اور عاظم وہاں سے بھی نکل آیا۔ اس نے اپنا کام بخوبی انجام دے لیا تھا۔

▣

بیگم صاحبہ نے زاہد کو طلب کیا تھا۔ زاہد دست بستہ اُن کے سامنے پہنچ گیا۔ بیگم صاحبہ نے مسکراتی نگاہوں سے اس کا استقبال کیا تھا پھر بولیں۔

"آؤ بیٹے بیٹھو۔ ایک ضروری مسئلے میں تم سے بات چیت کرنا تھی۔"

"جی فرمائیے..." زاہد نے انکساری سے کہا۔

"وہ زاہد میاں، اب بار بار یہ بات کہتے ہوئے اچھی نہیں لگتی کہ تم اس گھر میں میرے لئے کیا حیثیت رکھتے ہو۔ تمھیں خود ہی اس کا احساس ہوگا۔ دل کی بات کہنے کے لئے تم سے زیادہ معتبر اور کوئی شخصیت نظر نہیں آتی۔"

"یہ عنایت ہے آپ کی۔ زاہد کے لہو کا ایک ایک قطرہ آپ کے لئے وقف ہے۔ حکم دیجئے۔"

"میں جانتی ہوں بیٹے! میں جانتی ہوں۔ خدا تمہارے لہو کو اپنی جگہ سلامت رکھے۔ پچھلے چند دنوں سے میں اُلجھن میں ہوں بیٹے۔"

"جی فرمائیے۔"

"وہ اُن کے۔ میرا مطلب ہے شجاع احمد کے ایک بچپن کے دوست تھے۔ بارہ بنکی کے رہنے والے تھے۔ وہاں چھوٹا موٹا کاروبار کرتے تھے۔ یہاں آئے، ہاتھ پاؤں مارے اور دولت مند بن گئے۔ اب وہ نواب طالب علی کہلاتے ہیں۔ طالب علی کے چھ بیٹے ہیں۔ پتہ نہیں کہاں شجاع احمد صاحب سے ملاقات ہوگئی۔ ایک دفعہ ملنے کو آئے تھے۔ گھر دیکھ گئے۔ پتہ نہیں ان کے ہاں کے حالات کیسے ہیں، کیا ہیں... بہر صورت دو تین بار اُن کی بیگمات بھی آ چکی ہیں۔ وہی پرانے طرز کی ہیں۔ دولت نے چولا نہیں بدلا۔ بدن کا لباس جوں کا توں رہے تو کوئی ہرج نہیں ہے۔ لیکن ذہن بھی ویسے کا ویسا ہے۔ تم قدسیہ اور شازیہ کو بھی دیکھ چکے ہو۔ میں یہ نہیں کہتی کہ ہم لوگ بڑے ماڈرن اور بہت ہی اچھے ماحول کے ہیں۔ لیکن بہر طور اتنے قدیم بھی نہیں رہے کہ بالکل ہی سڑے بُسے نظر آئیں۔ جب کہ طالب علی کے ہاں کی خواتین، بہت ہی پُرانے طرز کی ہیں۔ طالب علی اپنے بیٹے مطلوب علی کا رشتہ قدسیہ کے لئے چاہتے ہیں۔ کئی دفعہ اس سلسلے میں اشارے دے چکے ہیں۔ اس بار کچھ خاص ہی توجہ دی جارہی ہے۔ کل شاید وہ آنے والے ہیں۔"

"اوہ... قدسیہ کے رشتے کے لئے؟"

"ہاں بیٹے... اوّل تو میں ابھی قدسیہ کی شادی نہیں کرنا چاہتی۔ میری بچی کی عمر ہی کیا ہے۔ ابھی سے شادی کے جھمیلوں میں پھنس جائے گی۔ پتہ نہیں کیا کیا تبدیلیاں آئیں۔ میرا تو جی بھی نہیں بھرا ابھی اپنی بچیوں سے۔ میں ابھی شادی وادی نہیں کرنا چاہتی۔ لیکن شجاع احمد ہر وہ کام کرنا پسند کرتے ہیں جو مجھے پسند نہ ہو۔ اُن پر بیٹی کے ہاتھ پیلے کرنے کی دُھن سوار ہے۔ مجھ سے دو تین بار اس سلسلے میں بات کی انھوں نے۔ ابتدا میں تو میں نے کھلے الفاظ میں کہہ دیا کہ بھئی یہ طالب و مطلوب کا چکر میں نہیں جانتی۔ ابھی قدسیہ کی عمر ہی کیا ہے جو شادی کے لئے پریشان ہوا جائے۔ لیکن پچھلے دنوں اُنھوں نے ذرا سخت زبان استعمال کی اور کہنے لگے کہ یہ ذمہ داری باپ کی ہوتی ہے۔ تم تو گھر میں بیٹھی ہوئی ہو، ابھی چھوٹی عمر ہے رشتے آ رہے ہیں۔ ایک دن ایسا آئے گا کہ رشتے آنا بند ہو جائیں گے اور ہم سب مصیبت کا شکار ہو جائیں گے۔ چنانچہ طالب علی کو دیکھ لیا جائے۔ اگر اُن کا بیٹا ہمارے معیار پر پورا اترتا ہے تو پھر کیا ہرج ہے۔ اب تم سوچو اُنھوں نے تو ہٹلر شاہی چلا دی۔ لیکن بیٹے بیٹی کا معاملہ ہے اور پھر قدسیہ کوئی جاہل لڑکی تو ہے نہیں کہ ماں باپ نے جس سے

پلّو باندھ دیا بندہ گئی۔ وہ تو کر دے گی ہنگامہ اس مسئلے کو حل کرنا ہے۔ جس کے لئے میں نے تمھیں تکلیف دی ہے۔" بیگم صاحبہ نے کہا۔ اسی وقت بیگم صاحبہ کے عقب سے کتّے کے بھونکنے کی آواز اُبھری اور بیگم صاحبہ اچھل پڑیں۔

زاہد نے بھی چونک کر دیکھا صوفے کے پیچھے سے فیصل کا سر جھانکتا ہوا نظر آ رہا تھا۔ پھر وہ ہنستا ہوا اُٹھ کھڑا ہوا۔

" ڈر گئیں نا ممی... ڈر گئیں نا..." وہ باہر نکل آیا۔

" فیصل فضول کی حرکتیں نا کیا کرو۔ آرام سے بیٹھ جاؤ۔ دیکھتے نہیں ہم بات کر رہے ہیں۔"

"جی..." فیصل تھوڑے فاصلے پر ایک صوفے پر بیٹھ گیا۔ اس کے ہونٹوں پر شرارت آمیز مسکراہٹ تھی۔ زاہد بھی مسکرانے لگا۔ بیگم صاحبہ نے پھر سلسلہ گفتگو اسی سنجیدگی سے شروع کیا۔

" تو میں کہہ رہی تھی زاہد میاں کہ یہ مسئلہ تمھیں ہی حل کرنا ہے۔ ہمارا تم سے بڑا محسن اور کوئی نہیں ہے۔ میں یہ نہیں کہتی کہ مطلوب کو نہ دیکھو۔ میں تو بس یہ کہہ رہی تھی کہ جس طرح کی اُن کے ہاں کی عورتیں ہیں اسی طرح کے اگر مطلوب بھی ہیں تو بابا قدسیہ تو اُسے کبھی مُنہ نہیں لگائے گی اور خواہ مخواہ کے لئے اُلجھنیں پیدا ہو جائیں گی۔" بیگم صاحبہ نے کہا۔

" مجھے کیا کرنا ہے۔ آپ جو حکم دیں۔"

" بھئی دیکھو۔ اب یہ لوگ کب آتے ہیں۔ میں نے پہلے ہی سے یہ بات تمھارے کانوں میں ڈال دی ہے تاکہ تم ہوشیار ہو جاؤ... طالب علی اور مطلوب علی دونوں یہاں آ رہے ہیں۔ ابھی اُن کے آنے کی تاریخ طے نہیں ہوئی۔ بس شجاع احمد صاحب نے مجھے اس سلسلے میں دھمکی دی ہے کہ وہ آ رہے ہیں۔ میں تو اُسے دھمکی ہی کہوں گی۔ زاہد میاں جن لوگوں سے دل نہ ملے جو لوگ کبھی ذہن میں نہ اتریں۔ اُن کی آمد بھلا دلچسپی کا باعث ہو سکتی ہے اور پھر وہ بھی اس سلسلے میں بظاہر مطلوب میاں صرف مہمان کی حیثیت سے یہاں آئیں گے لیکن در پردہ یہ بر دکھاوا ہوگا۔ چنانچہ اب ان کی لگام تمھارے ہاتھ میں ہوگی۔ دیکھنا، پرکھنا طبیعت کا اندازہ کرنا اور پھر مجھے صحیح رپورٹ دینا۔ میں ایک بار پھر یہ کہہ رہی ہوں کہ میں تمھارے علاوہ کسی پر بھروسہ نہیں کر سکتی جو کچھ کرنا ہے تمھیں ہی کرنا ہے سمجھے تم۔"

"جی آپ مطمئن رہیں۔ آپ کا شکریہ کہ آپ نے مجھ سے یہ بات کہہ دی۔ آپ بالکل مطمئن رہیئے۔ میں مطلوب علی کو پاؤں کے ناخن سے لے کر سر کے بالوں تک تلاش کر لوں گا اور دیکھوں گا کہ وہ کیا شے ہیں۔"

" جیتے رہو... خُدا تمھیں زندگی میں کبھی کسی اُلجھن کا شکار نہ بنائے۔ تم نے تو یہاں آ کر ہمارے سارے مسائل حل کر کے رکھ دیئے ہیں۔ کوئی بھی بات ذہن میں اُلجھے۔ یہ اطمینان ہو جاتا ہے کہ اپنا زاہد موجود ہے۔ پھر اُلجھن کیسی؟"

" بیگم صاحبہ... یہ آپ کی نوازش ہے۔" زاہد نے کہا اور اس وقت کہیں زور سے بلّی چیخی اور دونوں پھر چونک پڑے۔ زاہد کی نگاہیں فیصل کی جانب اُٹھ گئی تھیں۔ فیصل بے تعلقی سے چھت کی جانب دیکھ رہا تھا۔

" بھئی فیصل میاں، یہ آوازیں آخر کہاں سے آ رہی ہیں؟"

" خُدا جانے زاہد بھائی! آپ تو بہت بڑے جاسوس ہیں۔ تحقیقات کیجئے۔" فیصل نے جواب دیا اور بیگم صاحبہ دانت پیس کر اسے دیکھنے لگیں۔

" یہ اپنی شرارتوں سے باز نہیں آتا۔ ارے کسی نے تحفہ بھجوایا ہے اسے دکھا نا زاہد بھائی کو، دکھا...!"

" کیسا تحفہ ممی... مجھے تو پتہ بھی نہیں۔" فیصل نے آنکھیں مٹکائیں۔

" کوئی بات نہیں بیگم صاحبہ ہم خود فیصل میاں سے رابطہ قائم کریں گے" زاہد نے مسکراتے ہوئے کہا۔

" بس زاہد میاں اسی کے لئے میرا ذہن اُلجھ رہا تھا۔ رات ہی کو شجاع احمد نے مجھ سے بات کی تھی اور میرا ذہن اُلجھ رہا تھا اور اُس وقت سے میں سوچ رہی تھی کہ جتنی جلد ممکن ہو سکے تم سے اس سلسلے میں بات کر لوں۔"

" آپ مطمئن رہیئے۔ آپ نے میری یہ ڈیوٹی لگا دی۔ اب آپ اپنے ذہن کو بالکل آزاد چھوڑ دیجئے۔"

" خُدا تمھیں خوش رکھے زاہد!" بیگم صاحبہ نے پُر خلوص لہجے میں کہا۔

" اجازت...؟" زاہد نے پوچھا اور بیگم صاحبہ نے گردن ہلا دی۔

" آیئے فیصل میاں... اب ذرا آپ سے دو دو ہاتھ ہو جائیں۔ یہ بلّی اور کتّے آپ نے کہاں سے پکڑے ہیں ہمیں بھی تو معلوم ہو۔" زاہد فیصل کا ہاتھ پکڑ کر باہر نکل آیا۔

فیصل شجاع احمد صاحب کا سب سے چھوٹا بیٹا تھا۔ شرارت اُس کی رگ رگ میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ ابھی تک زاہد کی نگاہ اس پر نہیں پڑی تھی۔ پہلے وہ دوسرے ہی معاملات سے نمٹنا چاہتا تھا۔ وہ فیصل کو لئے اپنے کمرے میں آ گیا۔

" بھئی زاہد بھائی! ہمیں نہیں معلوم کہ یہ آوازیں کہاں سے آ رہی تھیں۔ آپ سے ممکن ہو سکے تو آپ معلوم کر لیں۔"

"ہوں"۔ ناہر نے گہری نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا اور پھر اس کی نچلی جیب میں ہاتھ ڈال دیا۔ فیصل ہنس پڑا تھا۔

"آپ بہت چالاک ہیں زاہد بھائی! آپ بہت چالاک ہیں واقعی آپ بہت چالاک ہیں"۔ اس نے ہنستے ہوئے کہا اور پھر جیب سے وہ دو چھوٹے چھوٹے چوکور ٹکڑے نکال کر ناہر کے سامنے رکھ دیئے جو ایک ہی ساخت اور ایک ہی ڈیزائن کے بنے ہوئے تھے۔

"یہ کیا ہے فیصل صاحب؟"

"ٹیپ ریکارڈر، بہت ہی اعلیٰ پائے کا ٹیپ ریکارڈر اور... وائرلیس اس پر ہر طرح کی آوازیں ریکارڈ ہو جاتی ہیں زاہد بھائی! میں نے بلی اور کتے کی آوازیں ریکارڈ کی تھیں۔ اور آپ نے دیکھا کہ اتنا سا ٹیپ ریکارڈر ہے۔ لیکن اس کی آواز کتنی تیز ہے"۔

"واہ یہ تو کمال کی چیز ہے بھئی۔ لیکن یہ دو کیوں ہیں؟"

"بس یہ دونوں ملا کر ایک سیٹ بنتا ہے۔ اس کی عجیب و غریب خصوصیات ہیں"۔

"وہ کیا...؟"

"یہ... یہ دیکھئے یہ اس میں کیسٹ لگا ہوا ہے"۔ فیصل نے اس ننھے سے ٹیپ ریکارڈر سے ایک بہت ہی چھوٹا سا کیسٹ نکال کر ناہر کے سامنے رکھ دیا۔

"یہ کیسٹ پورے ایک گھنٹے کا ہے۔ اور... اُسے آن کرنے کا یہ بٹن ہے جسے اگر آن کر دیا جائے تو ٹیپ ریکارڈر آن ہو جاتا ہے۔ آپ اسے آن کر کے چھوڑ دیجئے اگر یہ کہیں دور رکھا ہوا ہے تو آپ کو اس دوسرے سیٹ پر اس پر ہونے والی آوازیں سنائی دیتی رہیں گی۔ بشرطیکہ آپ دوسرے سیٹ کا یہ والا بٹن آن کر دیں"۔ فیصل نے ایک اور ننھے سے بٹن کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ "گویا اس بٹن کو آن کرنے کے بعد دوسری طرف ریکارڈنگ بھی ہوتی رہے گی اور یہ گفتگو جو ریکارڈ ہو رہی ہو گی آپ کو تقریباً ایک فرلانگ کے فاصلے پر سنائی بھی دیتی رہے گی۔ اس طرح یہ وائرلیس بھی ہے اور ٹیپ ریکارڈر بھی"۔

ناہر کی آنکھیں تعجب سے پھیل گئی تھیں۔ اس کے ذہن میں کچھ بجلیاں سی چمکیں اور وہ فیصل کو دیکھنے لگا۔

"کمال ہے فیصل میاں! کہاں سے آئی یہ چیز آپ کے پاس"۔

"میرے انکل ہیں میں نے اُن سے فرمائش کی تھی۔ انہوں نے یہ ٹیپ ریکارڈر مجھے جرمنی سے بھیجا ہے۔ کل ہی تو اس کا پارسل موصول ہوا تھا مجھے۔ میں نے بہت ساری آوازیں ریکارڈ کی ہیں"۔

"بڑی ہی نایاب چیز ہے یہ فیصل میاں۔ اور میں آپ کو ایک بات بتاؤں"۔

"جی زاہد بھائی...؟"

"اس ٹیپ ریکارڈر کے ساتھ آپ بہت بڑے جاسوس بن سکتے ہیں۔ کیا خیال ہے آپ کا۔ جاسوسی سے آپ کو کوئی دلچسپی ہے؟"

"کیوں نہیں میں نے ٹیلی ویژن پر بہت سی جاسوسی فلمیں دیکھی ہیں۔ بڑا لطف آتا ہے۔ آپ کو یہ فلمیں پسند ہیں زاہد بھائی؟"

"کمال ہے بھئی مجھے پسند ہی صرف جاسوسی فلمیں ہیں۔ اور کوئی فلم تو میں دیکھتا ہی نہیں ہوں۔ لیکن فیصل میاں کیوں نہ آپ بھی جاسوسی شروع کر دیں"۔

"جاسوسی...؟" فیصل نے حیرت بھری نگاہوں سے ناہر کو دیکھا۔

"ہاں میں نے کہا نا کہ اس ٹیپ ریکارڈر کو حاصل کرنے کے بعد تو آپ بہت بڑے جاسوس بن سکتے ہیں۔ یہ چیزیں عام لوگوں کے پاس کہاں ہوتی ہیں"۔

"ہاں یہ تو ہے سب میں سب کی آوازیں ریکارڈ کر سکتا ہوں"۔

"تو پھر ٹھیک ہے آج سے آپ جاسوس اعظم اور ہم آپ کے اسسٹنٹ"۔ ناہر نے کہا۔

"نہیں نہیں زاہد بھائی... بڑے تو آپ ہیں۔ میں آپ کا اسسٹنٹ بنوں گا"۔

"بھئی سوچ لیں۔ اگر آپ چیف بننا چاہیں تو چیف بن جائیں۔ اسسٹنٹ بننا چاہیں تو اسسٹنٹ بن جائیں۔ لیکن کام آپ کو بڑی ہوشیاری سے کرنا ہو گا"۔

"زاہد بھائی چیف آپ ہیں۔ اور چیف آپ حکم دیں۔ آپ کا اسسٹنٹ ایسی عمدہ جاسوسی کر کے دکھائے گا کہ آپ کو لطف ہی آ جائے گا"۔

"ہوں لیکن آپ کو معلوم ہونا چاہیئے۔ مسٹر فیصل کہ جاسوسی کوئی آسان کام نہیں ہے۔ جاسوس کو اپنے چہرے کے تاثرات پر ہمیشہ کنٹرول ہونا چاہیئے تاکہ... اس کی شکل دیکھ کر کبھی اس کے بارے میں یہ اندازہ نہ لگایا جائے کہ وہ کب کیا کرنا چاہتا ہے۔ یہ چالاکی ہی جاسوسی کو کامیابی سے ہمکنار کر سکتی ہے"۔

"میں نے پہلا سبق نوٹ کر لیا۔ آپ مطمئن رہیئے۔ آپ کا یہ جاسوس آپ کی ہدایت کے مطابق ہی کام کرے گا"۔ فیصل نے جواب دیا۔ اپنے اس ننھے سے کھلونے سے اُسے ایک اور تفریح ہاتھ آئی تھی اس سے اچھی بات اس کے لئے اور کون سی ہو سکتی تھی؟

"تو فیصل میاں ہم آپ کو پہلی ڈیوٹی سپرد کرتے ہیں۔ آپ کو پوری طرح عازم اور فاخر پر نگاہ رکھنی ہو گی۔ یہ لوگ جب اپنے کمرے میں تنہا ہوں تو آپ چالاکی سے اُن کی گفتگو ریکارڈ کر لیجئے اور ہمیں

اس سلسلے میں مکمل رپورٹ پیش کی جائے۔"

"او کے چیف بہت جلد یہ کام انجام دے دیا جائے گا۔" فیصل نے جواب دیا۔

"گڈ، ویری گڈ، ہماری نیک خواہشات آپ کے ساتھ ہیں۔"

ناہر نے کہا اور فیصل گردن ہلا کر ناہر کے کمرے سے باہر نکل آیا۔ ناہر کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی تھی۔ واقعی اگر فیصل نے اپنا یہ کام سلیقے سے انجام دے لیا تو عازم اور فاخر کی شخصیت کھل کر سامنے آ جائے گی۔ اگر کوئی خاص ہی بات ہے تو پھر اُن لوگوں کو بھی چیک کر لیا جائے گا۔ پھر اس کے ذہن میں وہ طالب و مطلوب دوڑ لگانے لگے۔ قدسیہ کے معاملے میں کسی طالب و مطلوب کا جھگڑا ملوث نہیں ہونا چاہیئے۔ معصوم اور شریف النفس سرفراز، قدسیہ کی جانب متوجہ ہو گیا ہے اور قدسیہ خود اسے چاہنے لگی ہے۔ تو اب ان دونوں کا یہ رابطہ ختم نہیں ہونا چاہیئے۔ بلکہ اگر ممکن ہو سکے تو سرفراز اور قدسیہ کو رشتۂ ازدواج میں منسلک کر دیا جائے خواہ اس میں کتنا ہی وقت لگے لیکن فیصلہ کن بات یہ ہے کہ شادی ہوگی تو ان دونوں کی ہوگی۔ کوئی اور قدسیہ پر قابو نہیں پا سکے گا۔ اگر یہ بات ناہر کے علم میں نہ آئی ہوتی تو کوئی ہرج نہیں تھا۔ شجاع احمد صاحب کہیں بھی قدسیہ کی شادی کر دیتے۔ ہاں اگر قدسیہ خود اس کی مدد کی طالب ہوتی تو دوسری بات تھی۔ لیکن اب تو ناہر خود بھی اُسے اپنا فرض ہی سمجھتا تھا چنانچہ اس نے دل میں فیصلہ کر لیا کہ یہ بیل منڈھے نہیں چڑھنے دے گا۔ "آؤ تو سہی طالب و مطلوب، دیکھیں تو سہی تم کیا چیز ہو۔" وہ مسکراتا ہوا اپنے کمرے سے باہر نکل آیا۔

رات کو دس بجے عازم اور فاخر یکجا ہوئے تھے۔ آج اُنہیں فائنل رپورٹ تیار کرنا تھی اور یہ رپورٹ وہ شجاع احمد صاحب کو پیش کرنا چاہتے تھے۔ اُن کے فرشتوں کو بھی اس بات کا احساس نہیں تھا کہ دو ننھی ننھی پُراسرار آنکھیں صبح سے اُن کی کھوج میں ہیں۔ اور مسلسل اُن کے پیچھے لگی ہوئی ہیں۔ چنانچہ بات کو جب وہ دونوں یکجا ہوئے اور اس سلسلے میں گفتگو کا آغاز کرنے بیٹھے تو اُسی وقت فیصل کافی کی ٹرے لئے ہوئے اندر داخل ہو گیا۔ دروازہ چونکہ کھلا ہوا تھا۔ اس لئے دونوں فیصل کو دیکھ کر چونک پڑے تھے۔

"ارے فیصل میاں آپ، آپ..."

"جی انکل کیا بات ہے؟" فیصل نے تعجب سے پوچھا۔

"میرا مطلب ہے کہ یہ تکلیف آپ نے کیوں کی۔ ملازم کہاں چلا گیا تھا؟"

"رمضان سے میں نے ایک چیز منگوائی تھی۔ وہ کافی لے کر آ رہا تھا میں نے اس سے کہا کہ کافی میں پہنچائے دیتا ہوں۔ تم میرے لئے ٹافیوں کا پیکٹ لا دو۔" فیصل نے کہا۔

"بہت بہت شکریہ آپ کا۔ آپ نے ہمیں شرمندہ کر دیا۔" فاخر نے محبت بھرے انداز میں کہا۔

"کوئی بات نہیں انکل، گھر کے کام بچوں کو خود بھی کرنے چاہئیں۔" فیصل بڑے مہذب لہجے میں بولا۔

"آپ عظیم شخصیت کے مالک ہیں۔ شکریہ رکھ دیجئے کافی۔" فاخر نے کہا۔ فیصل نے کافی کی ٹرے اُن کے سامنے رکھی اور پھر ایک ایک پیالی اُن کے سامنے سرو کر دی۔ اس کے بعد وہ ٹرے اُٹھا کر واپس پلٹ پڑا۔ لیکن اس دوران اس کا ہاتھ اپنا کام کر چکا تھا۔

چھوٹا ٹیپ ریکارڈر سیٹ اسی میز کے نیچے ایک مخصوص خانے میں پہنچ گیا تھا۔ جس کے گرد وہ دونوں بیٹھے ہوئے تھے۔ اس کے بعد فیصل کمرے سے باہر نکل گیا۔

"دروازہ بند کر دو۔ کہیں کوئی اور نہ آ جائے۔" عازم نے فاخر سے کہا۔ اور فاخر نے اُٹھ کر دروازہ بند کر دیا۔

"کیا رپورٹ ہے فاخر؟"

"عازم یوں سمجھو کر بس لطف ہی آ گیا۔ میرا خیال ہے ہم نے زبردست کارنامہ انجام دیا ہے۔"

"گڈ، ویری گڈ۔ پھر شروع ہو جاؤ۔" عازم بولا۔

"میں نے سب سے پہلی ملاقات احمد رضا سے کی تھی۔ احمد رضا بلاشبہ ڈاکٹر بن چکا ہے۔ لیکن فطری طور پر انتہائی معصوم شخصیت کا مالک ہے۔ اس کے ذہن میں پہلے کوئی بات نہیں تھی۔ یعنی جس طرح شجاع احمد صاحب چاہتے تھے۔ اس طرح وہ عمل کرنے کا خواہش مند تھا۔ کلینک کھولتا اور شجاع احمد صاحب کے لئے دولت کے ڈھیر لگا دیتا۔ لیکن ناہر نے اس کے ذہن میں تبدیلیاں پیدا کیں۔ ناہر ہی نے اُسے یہ راستہ دکھایا کہ . . . دولت مندوں کی بجائے غریبوں کا علاج کر کے دُعائیں سمیٹی جا سکتی ہیں۔ دولت مند تو اپنا علاج کہیں بھی کرا لیتے ہیں۔ لیکن غریبوں کے لئے جدید علاج معالجے کی تمام سہولتیں موجود نہیں ہیں۔ کیوں نہ احمد رضا ایک ایسے کام کی داغ بیل ڈالیں جو نادار لوگوں کے حق میں ہو اور احمد رضا کو یہ بات بھا گئی۔ چنانچہ اس نے اپنے جشن کے دوران ناہر ہی کے ایما پر یہ اعلان کیا کہ وہ اپنے کلینک کو غریبوں کے لئے وقف کر دے گا۔ ظاہر ہے... شجاع احمد صاحب اس کے حق میں نہیں تھے۔ لیکن ناہر نے احمد رضا کے ذہن میں یہ بات اس طرح بٹھا رکھی تھی کہ وہ شجاع احمد صاحب سے بھی لڑ گیا۔ اور نتیجہ تمہارے سامنے ہے۔"

"ویری گڈ، ویری گڈ... احمد رضا نے اس بات کا اعتراف کیا۔"

"ہاں بالکل کھلے انداز میں اس نے کہا کہ زاہد اسس کا ہاتھ ہے۔ ویسے یہ چیز ذرا اُونچی گئی ہے عازم۔ اس بات کو ذہن میں رکھنا۔"

"زاہد نا۔۔۔؟" عازم نے پوچھا۔

"ہاں سو فیصدی وہی۔" فاخر نے جواب دیا۔

"کس لحاظ سے کہہ رہے ہو؟"

"بھئی سارے معاملات میں اس کی کارکردگی نظر آتی ہے۔ سارا گھر اسس کے اشاروں پر چل رہا ہے۔ کیا یہ بات حیرت انگیز نہیں ہے؟"

"سو فیصدی ہے۔ اگر نہ ہوتی تو شجاع احمد صاحب ہمارا انتخاب کیوں کرتے؟"

"ہاں ہاں ٹھیک ہے تو احمد رضا کو یہ تمام ہدایات زاہد ہی کی جانب سے ملی ہیں۔ اور مطلب فرسٹ ایڈ ہاؤس میں احمد رضا کے لئے ایک علیحدہ حصہ مخصوص کر دیا گیا ہے۔ نقشہ تیار ہو چکا ہے اور کلینک کی تعمیر بہت جلد شروع ہو جائے گی۔ فرسٹ ایڈ ہاؤس اپنے وسائل سے احمد رضا کو وہ تمام چیزیں مہیا کرے گا جو اس کی ضرورت ہوں گی۔ یہ تھا احمد رضا کا معاملہ۔ میری دوسری شکار محترمہ قدسیہ تھیں۔"

"اوہ۔۔۔ محترمہ قدسیہ کو کیسا پایا؟" عازم نے پوچھا۔

"قدسیہ کو میں نے اس کے نگارخانے میں جا کر ٹٹولا۔ بڑی بداخلاقی سے میرے ساتھ پیش آئی۔ سرفراز بھی اس کے ساتھ ہی موجود تھا۔ بہرطور یہ بات یہاں بھی مکمل طور پر ثابت ہو گئی کہ قدسیہ کو اس کے فن کا احساس دلانے والے بھی حضرت زاہد ہی تھے۔ سرفراز کو ان کے استاد کی حیثیت سے متعین کیا گیا۔ لیکن عازم ایک بہت ہی دلکش اور دلچسپ مرحلہ میرے سامنے آیا۔ وہ یہ ہے کہ سرفراز صاحب قدسیہ کو صرف فنِ مصوری ہی کی تعلیم نہیں دے رہے۔ بلکہ عشق و محبت کا کھیل بھی جاری ہے۔"

"کیا۔۔۔؟" عازم اچھل پڑا۔

"جی ہاں جی ہاں۔ آپ کے اس غلام نے صحیح معنوں میں بہت بڑا کارنامہ انجام دیا ہے۔ قدسیہ بڑی بداخلاقی سے میرے ساتھ پیش آئی۔ لیکن سرفراز ذرا بہتر لڑکا ہے۔ قدسیہ جو کچھ بنا رہی ہے۔ وہ اپنی سمجھ کی بات تو نہیں ہے لیکن سرفراز اس سے جو کچھ بنوا رہا ہے' اس میں یقینی طور پر اس قسم کے معاملات ہوں گے کہ قدسیہ اس سے متاثر ہو گئی اور اب ان دونوں کا عشق چل رہا ہے۔"

"یہ تو تم نے اچھی خبر نہیں سنائی فاخر۔"

"کیوں؟"

"بھئی قدسیہ کو تو میں نے اپنے لئے پسند کیا تھا۔"

"تو پھر اس میں پریشانی کی کیا بات ہے۔ بھائی میرے یہ سرفراز صاحب تو کنوں سے کٹ جائیں گے۔ بھلا ایک معمولی سا مصوری کا استاد' ایک اتنے بڑے صنعت کار اور تاجر کی بیٹی سے عشق کر رہا ہو۔ یہ بات شجاع احمد صاحب کو کس طرح پسند آئے گی۔ سرفراز کو تو اپنی جان بچانا مشکل ہو جائے گی۔ ہماری رپورٹ کے بعد اور اب یہ مشورہ بہت اُونچا جائے گا۔ چنانچہ سرفراز صاحب کی تو بلی بھسری ہو جائے گی۔ اس کے بعد ہمارا ہی چانس ہے۔" فاخر نے جواب دیا۔

"وہ تو ٹھیک ہے لیکن میں سمجھتا ہوں کہ ابھی ہمیں اس سلسلے میں کوئی ٹھوس قدم نہیں اُٹھانا چاہیئے۔ حالات بگڑ جائیں گے۔" عازم پُرخیال لہجے میں بولا۔

"وہ کیوں۔۔۔؟"

"اس لئے نا کہ شجاع احمد صاحب نے جو کام ہمارے سپرد کیا ہے ہمیں اس سے نہیں ہٹنا چاہیئے۔"

"ہاں تمہارا خیال درست ہے۔ اس سلسلے میں ہمیں اور کیا کرنا ہوگا؟" فاخر نے پوچھا۔

"اس سلسلے میں سب سے پہلے ہمیں سرفراز کی جڑ کو تلاش کرنا ہے۔ کتنا گہرا ہے یہ آدمی۔ اور قدسیہ کے ذہن میں کہاں تک پہنچ چکا ہے۔ اگر ابھی سے ہم نے اس کی ابتدا کر دی تو کیا پھر ہم قدسیہ کی توجہ حاصل کر سکیں گے۔"

"ہوں صحیح بات تو یہی ہے سوچنے کی تو پھر اس کا مقصد ہے کہ اپنی رپورٹ میں سرفراز اور قدسیہ کے مسئلے کو شامل نہ کیا جائے؟"

"ہرگز نہیں۔۔۔ قدسیہ کو شیشے میں اُتارنے کے لئے ہمیں اس کی توجہ حاصل کرنی پڑے گی اور پھر اتنی چالاکی سے سرفراز کو منظرِ عام پر لائیں گے کہ ہمارا ذکر بھی نہ آئے اور کام بھی ہو جائے سمجھے؟ فی الحال صرف اتنا ہی کافی ہے۔ قدسیہ کے ذہنی رجحان کا محرک زاہد ہی ہے۔ یعنی زاہد ہی نے قدسیہ کے اندر چھپی ہوئی مصوری کو تلاش کیا ہے۔"

"ٹھیک ہے۔ اگر تمہاری یہ رائے ہے تو یونہی سہی۔"

"ہاں فاخر' مستقبل میں ایک عظیم الشان زندگی حاصل کرنے کے لئے ہمیں ہر قدم پھونک کر اُٹھانا ہوگا۔ قدسیہ کو میں سنبھال لوں گا اور شازیہ تمہاری بن جائے گی۔ میں یہ نہیں کہتا کہ ہمیں شجاع احمد صاحب کی ساری دولت مل جائے گی۔ لیکن آخر۔۔۔ ہم داماد ہوں گے ان کے اور اس حیثیت سے بھی ہمیں اتنا ملے گا کہ ہماری زندگیاں بن جائیں گی۔"

"ٹھیک ہے اس سلسلے میں میں تم سے اتفاق کرتا ہوں۔ اب تم سناؤ۔"

"کیا سناؤں... زاہد، زاہد، زاہد۔ جتنے بھی اس کوٹھی کے معاملات ہماری نگاہوں کے سامنے آئیں گے۔ پتہ... چلے گا کہ ان کے پس پشت زاہد ہی تھا۔ دادا جان یعنی حسام احمد صاحب بھی سادہ لوح انسان ہیں۔ اپنی عملی زندگی سے ریٹائر ہو چکے ہیں۔ لیکن جوانی ذہن میں تازہ ہے۔ ویسے بھی کھاتے پیتے آدمی ہیں۔ چست و چالاک بھی ہیں۔ جاسوسی ناول اور کہانیوں سے بڑا شغف ہے انھیں۔ زاہد کسی چور دروازے سے اُن کی زندگی میں داخل ہوا اور اُسی راستے سے اُن کی آنکھوں کا تارہ بن گیا۔ یعنی جاسوسی ناول۔ میں نے خود بھی چکر چلا دیا ہے۔ بہت جلد میں دادا جان پر ڈورے ڈال لوں گا چونکہ محسوس یہ ہوا ہے کہ یہ بوڑھا آدمی یہاں بڑی ٹھوس حیثیت رکھتا ہے۔ اگر اس کی توجہ حاصل کر لی جائے تو یوں سمجھو اس کوٹھی میں مخالفوں کی زبانیں بند ہو جائیں گی چنانچہ قدسیہ کے حصول کے لئے میں نے یہی طے کیا ہے کہ دادا جان کی زیادہ سے زیادہ قربت حاصل کی جائے۔"

"ٹھیک ہے یار تمھارا کام تو یوں ہو جائے گا لیکن شاذیہ کے سلسلے میں کیا ہوگا؟"

"صبر کرو ابھی تھوڑا۔ شاذیہ پر تمھیں خود ڈورے ڈالنے ہوں گے۔ شجاع احمد صاحب کی تمام اولادیں معصوم طبیعتوں کی مالک ہیں۔ میرا خیال ہے شاذیہ کو اپنے جال میں پھنسانے کے لئے تمھیں زیادہ محنت نہیں کرنی پڑے گی۔"

"ٹھیک ہے تو پھر یہ بات طے ہو گئی کہ زاہد صاحب قدسیہ کو فنکار بنانے کے روح رواں ہیں۔"

"بالکل اور یہی کیفیت ہارون کی ہے۔ اس جگر کو بھی پٹری سے اُتارنے والے زاہد صاحب ہی ہیں جو انھیں دنیا کا بہت بڑا گلوکار یا موسیقار بنا دینا چاہتے ہیں۔ یعنی انھوں نے ہی اُسے یہ احساس دلایا کہ اُس کے اندر ایک فنکار چھپا ہوا ہے اور بس ہارون چکر میں آ گیا۔ زاہد ہی نے اُسے مکمل فنکار بنایا ہے۔"

"گڈ... اس کا مطلب ہے ہماری رپورٹ مکمل۔"

"ہاں... اور اب یہ رپورٹ شجاع احمد صاحب کو آج ہی پہنچا دی جائے تو بہتر ہے۔"

"او کے... تو پھر یہ بات طے۔"

"ہاں..."

"شجاع احمد صاحب اپنے کمرے میں ہیں اس وقت؟"

"ہاں موجود ہیں۔ کھانے کے بعد وہ اپنے کمرے میں ہی گئے تھے۔ میں نے کئی بار اُن کی شکل دیکھی تھی۔ وہ سوالیہ نگاہوں سے مجھے دیکھ رہے تھے۔"

"ہوں ٹھیک ہے تو پھر یوں کرو، تم نکلو اور شجاع احمد صاحب کے کمرے میں پہنچو... میں تمھارے پیچھے پیچھے آتا ہوں۔"

"او کے..." فاخر نے جواب دیا اور اس کے بعد یہ سلسلۂ گفتگو منقطع ہو گیا۔

دونوں کمرے سے نکل آئے۔ ظاہر ہے کمرے کے دروازے کو بند کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ دونوں ایک ایک کر کے شجاع احمد صاحب کے کمرے کی طرف چلے گئے۔ اس وقت کسی طرف سے نبیل دوڑتا ہوا آیا اور کمرے کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گیا۔ وہ دوسرے سیٹ پر ان دونوں کی گفتگو سنتا رہا تھا اور اس کی آنکھیں خوشی سے چمک رہی تھیں۔ اس گفتگو کی گہرائی تو اس کے ذہن میں نہیں تھی۔ بس اُسے یہ مسرت تھی کہ وہ جاسوسی کر رہا ہے۔ اور اب ضروری تھا کہ ان دونوں کی گفتگو شجاع احمد صاحب کے کمرے میں بھی ریکارڈ کی جائے۔

چنانچہ اس نے اپنا سیٹ سنبھالا اُسے آف کیا۔ تھوڑا سا ریوائنڈ کر کے کیسٹ سنا۔ گفتگو تسلی بخش طور پر ریکارڈ ہوئی تھی۔ اس کے بعد اس نے کیسٹ کو اسی جگہ واپس کیا۔ جہاں سے مزید گفتگو کا آغاز ہونے والا تھا اور اس کے بعد وہ شجاع احمد صاحب کے کمرے تک پہنچ گیا۔

فاخر اندر داخل ہو گیا تھا اور عازم دروازے سے اندر گھس رہا تھا۔ ان دونوں کے پیچھے پیچھے نبیل بھی کمرے داخل ہو گیا۔

شجاع احمد صاحب جو ایک آرام کرسی پر دراز کسی فائل کو دیکھ رہے تھے۔ چونک پڑے۔ انھوں نے فائل رکھا اور اسی وقت نبیل ان کے پاس پہنچ گیا۔

"ڈیڈی... انکل شیراز نے میری الیکٹرک بائیک نہیں بھیجی ابھی تک۔ کیا آپ انھیں اس سلسلے میں یاد دہانی نہیں کرائیں گے؟"

"بھائی اس وقت الیکٹرک بائیک کا کیا مسئلہ سامنے آ گیا۔"

"بس ڈیڈی مجھے فوراً الیکٹرک بائیک چاہیے۔ آپ انکل شیراز کو لکھ دیں کہ وہ فوراً مجھے بائیک بھیج دیں۔ ورنہ پھر مجھے اس کی ضرورت نہیں ہوگی۔"

"لیکن اس وقت بیٹے، تم آرام کرنے نہیں گئے۔" شجاع احمد بولے۔

"بس آرام ہی تو کر رہا تھا کہ مجھے اپنی الیکٹرک بائیک یاد آ گئی۔ آپ نے وعدہ کیا تھا کہ آپ انکل شیراز کو فون پر بتائیں گے۔"

"بھئی مجھے یاد نہیں رہا۔ کل میں انھیں خصوصاً فون کر دوں گا۔" شجاع احمد نے کہا۔

"ڈیڈی دیکھئے۔ آپ نے وعدہ کیا ہے۔ آپ کو فون کرنا ہوگا اس بات کو آپ ذہن نشین کر لیں۔"

"ہاں بھئی... میں جھوٹا وعدہ نہیں کرتا۔ کہہ جو دیا۔ کل فون کر دوں گا۔" شجاع احمد صاحب نے کہا۔

"ٹھیک ہے ڈیڈی... میں آپ سے ایک ہفتے کے اندر اندر بائیک لے لوں گا۔ ورنہ پھر کبھی نہیں لوں گا۔" فیصل نے کہا اور پھر وہ وہاں سے اُٹھ کر ایک اور جگہ پہنچ گیا۔ اور شجاع احمد صاحب کی کتابیں ٹٹول رہا تھا...

"ارے ارے بھئی۔ دیکھو فیصل میں نے تمہیں ہمیشہ منع کیا ہے کہ ان کتابوں کو ہاتھ مت لگایا کرو۔"

"ڈیڈی... میں کب ہاتھ لگا رہا ہوں۔ میں تو بس یونہی دیکھ رہا تھا۔ اس کتاب کا کور بے حد خوب صورت ہے۔ دُور سے چمک رہا تھا۔"

"اچھا اب تم جاؤ۔ ہم لوگ ذرا کاروباری گفتگو کریں گے۔"

"او کے ڈیڈی! بہر صورت کل آپ انکل شیراز کو ضرور ٹیلی فون کر دیجئے گا۔"

"ہاں بھئی کر دوں گا۔ ایک دفعہ کہہ دیا نا۔" شجاع احمد صاحب کسی قدر ناخوشگوار لہجے میں بولے اور فیصل وہاں سے نکل آیا۔ اپنی چالاکی پر وہ دل ہی دل میں مسکرا رہا تھا۔

* * *

"ہیلو چیف...!" فیصل نے رعب دار آواز میں زاہد کو مخاطب کیا۔ اور زاہد چونک پڑا۔

"اوہ ہیلو۔ مائی اسسٹنٹ ہاؤ آر یو؟"

"فائن چیف! یہ رپورٹ پیش خدمت ہے۔" فیصل نے ننھا سا ٹیپ ریکارڈر زاہد کے سامنے رکھ دیا۔

"گڈ... ویری گڈ۔ کیا تمہیں کامیابی ہوئی ہے زیرو زیرو سیون؟" زاہد نے پوچھا۔

"یس چیف! زیرو زیرو سیون کبھی ناکام نہیں ہوتا۔" فیصل نے فخریہ انداز میں کہا۔

"رپورٹ پلیز؟"

"ایک منٹ، رپورٹ ریورس کر لوں۔" فیصل نے جواب دیا اور ٹیپ ریکارڈر کا ننھا سا بٹن آن کر دیا۔ کیسٹ ریوائنڈ ہوتا رہا اور تھوڑی دیر کے بعد اس سے آوازیں اُبھرنے لگیں۔ زاہد اور فیصل سر جوڑ کر بیٹھ گئے تھے۔ زاہد نے جلدی سے دروازہ بند کر دیا تھا اور پھر فیصل کی شاندار کارکردگی زاہد کے سامنے آگئی۔ فاخر اور عازم گفتگو کر رہے تھے اور فاخر کی آواز میں عجیب و غریب انکشافات ہو رہے تھے۔ زاہد کے چہرے پر خون سمٹ آیا تھا۔ وہ اُن کی گفتگو سنتا رہا اور پھر عازم کی آواز سُنائی دی۔ عازم سرفراز اور قدسیہ کے بارے میں بتا رہا تھا۔ دادا جان کے بارے میں بتا رہا تھا۔ زاہد مسرت سے دیوانہ ہو گیا۔ گفتگو کا پہلا مرحلہ ختم ہو گیا۔ اور اس کے بعد شجاع احمد صاحب کی آواز سُنائی دی۔

"ہوں... کیا معلوم کر سکے تم لوگ؟"

"جناب عالی! اس کوٹھی میں آنے کے بعد جو انکشافات ہوئے ہیں وہ بڑے حیرت انگیز ہیں۔ ہمیں حیرت ہے کہ لوگ کس طرح نمک حرامی کرتے ہیں۔ یہ زاہد اس کوٹھی میں موجود تمام لوگوں کا اخلاق خراب کر رہا ہے۔ دادا جان اس کے آلۂ کار ہیں اور انہیں قابو میں کرنے کے بعد اس نے اپنی کارروائیوں کا آغاز کیا ہے۔ اس نے دادا جان کو جاسوسی ناولوں کے ذریعے پھانسا ہے چونکہ دادا جان اس میں دلچسپی رکھتے ہیں۔ اس لئے زاہد نے ان کی اس دلچسپی کو نشانہ بنایا۔ دادا جان کو اپنے شکنجے میں لینے کے بعد اس نے احمد رضا، قدسیہ اور ہامعن کو ان راستوں پر ڈالا۔" اس کے بعد تمام تفصیلی گفتگو تھی جو فاخر اور عازم نے احمد رضا، قدسیہ اور ہامعن سے بات چیت کر کے حاصل کی تھی۔ شجاع احمد صاحب کی آواز اس دوران سُنائی نہیں دی تھی۔ اس کے بعد خاموشی چھا گئی پھر شجاع احمد صاحب کی ہلکی سی بڑبڑاہٹ سُنائی دی۔

"ہُوں... تو میرا اندازہ بالکل درست تھا۔ یہ شیطان میری اس جنت کو تباہ کرنے کے لئے اس گھر میں داخل ہوا ہے لیکن اس کا مقصد... کا مقصد کیا ہے؟"

"اس کے بعد ہمیں یہی کارروائی کرنا ہے جناب کہ زاہد کا مقصد معلوم کیا جائے۔ اور مقصد صرف ایک ہی ہو سکتا ہے سو فیصدی ایک ہی ہو سکتا ہے۔ اور اس سے آپ بھی انکار نہیں کر سکتے۔" فاخر کی آواز سُنائی دی۔

"وہ کیا...؟" شجاع احمد صاحب نے پوچھا۔

"دولت اور صرف دولت۔ آپ کا کیا خیال ہے۔ کیا زاہد چاروں طرف سے دولت نہیں سمیٹ رہا ہوگا۔ دادا جان کا اپنا بینک بیلنس ہی کیا کم ہے۔ فرسٹ ایڈ ہاؤس کے نام سے جو ادارہ تعمیر کیا جا رہا ہے۔ اور اس میں جو بیرونی امداد مل رہی ہے جو کچھ آپ نے دیا ہے اور جو کچھ دادا جان کے پاس موجود ہے کیا آپ کے خیال میں وہ صرف اسی عمارت میں صرف ہو رہا ہوگا۔ ہرگز نہیں جناب ہرگز نہیں۔ زاہد اس میں سے بہت بڑا حصہ وصول کر رہا ہوگا۔ اور پھر قدسیہ صاحبہ کا فن مصوری سے شوق زاہد کے لئے مالی منافع کا باعث ہوگا۔ اُنہیں بھی تو کچھ نہ کچھ جیب خرچ ملتا ہی ہوگا؟"

"الگ الگ اکاؤنٹ ہے اُن سب کا۔" شجاع احمد صاحب نے بگڑے ہوئے لہجے میں کہا۔

"تو پھر آپ ذرا حسابات چیک کرا لیجئے۔ مصوری کی تعلیم پر جو کچھ خرچ ہو رہا ہے۔ قدسیہ صاحبہ کا چیک بیلنس صاف ہوتا جا رہا ہوگا۔ یہی کیفیت

ماہدان صاحب کی ہے۔ احمد رضا صاحب بھی ظاہر ہے کلینک کی تعمیر میں اپنی جیب سے بھی کچھ دیں گے۔ یہ جو کچھ ہو رہا ہے صرف دولت کے حصول کے لئے ہے۔" فاخر کی آواز سنائی دی۔

"ہاں۔۔۔ ظاہر ہے ظاہر ہے۔ اس کے علاوہ اس کمینے کا اور کیا مقصد ہو سکتا ہے۔ اس نے ہماری اس کوٹھی کو تاکا ہے۔ یہاں عام سی پوزیشن میں گھسا تھا پھر پورے گھر پر اپنے پنجے گاڑ دیئے اور اب یہاں سے دولت اکٹھی کر رہا ہے لیکن وہ نہیں جانتا کہ اس کا مقابلہ کس سے ہے۔ میں کسی کی زندگی نہیں لینا چاہتا۔ لیکن اگر اس نے مجھے اس طرح مجبور کر دیا تو ایک دن جان سے ہاتھ دھو بیٹھے گا۔"

"میرے خیال میں اس حد تک نہ جایئے شجاع احمد صاحب ہم اُسے ان تمام لوگوں کی نگاہوں میں رسوا کیوں نہ کر دیں۔ ہم اس کا یہ طلسم کیوں نہ توڑ دیں۔ اُسے ان سب لوگوں کے سامنے برہنہ کر دیا جائے۔ وہ اپنی موت آپ مر جائے گا۔"

"یہ سب پاگل ہو چکے ہیں اس کے لئے تم ان سے کچھ بھی کہہ دیکھو۔۔۔ تمہاری کوئی بات نہیں سنی جائے گی سارے جب مجھ جیسے آدمی کی نہیں سنی جاتی تو تم کس کھیت کی مولی ہو۔"

"ہم گاجر ہیں شجاع احمد صاحب! مولی نہیں۔" فاخر نے جواب دیا۔

"بکواس مت کرو۔ تم ایک ایک سے کہتے پھرو گے اور ایک ایک تمہارا دشمن بنتا چلا جائے گا اس طرح یہ کام نہیں ہو سکتا۔"

"کیا آپ ہم پر اعتماد نہیں کر سکتے شجاع احمد صاحب؟"

"مطلب کیا ہے تمہارا؟"

"ہمیں اجازت دیجئے کہ ہم باقاعدہ اس شخص کے خلاف مہم کا آغاز کریں۔ ہم کسی سے کچھ نہیں کہیں گے۔ سب سے پہلے ناہد کی جڑوں کو تلاش کیا جائے گا۔ یہ شخص یہ دولت حاصل کر کے کہاں جمع کر رہا ہے۔ کس طرح بینک بیلنس بڑھا رہا ہے اس کے پشت پناہ اور کون کون لوگ ہیں۔ باہر کس کس سے اس کا رابطہ قائم ہے۔ یہ تمام معلومات حاصل کرنے کے بعد ہم بڑے اطمینان سے اُسے پولیس کے سپرد کر دیں گے۔ پولیس جب سارا معاملہ آپ کے اہل خاندان کے سامنے پیش کرے گی تو ہر شخص کی آنکھیں خود بخود کھل جائیں گی۔ ہمیں کیا ضرورت ہے کہ ایک ایک سے کہتے پھریں کہ زاہد ایسا ہے۔ اس طرح تو واقعی ہماری دال نہیں گلے گی۔ کیونکہ اس کے پنجے کافی گہرائی میں ہیں۔" شجاع احمد صاحب شاید کچھ سوچنے لگے تھے۔ پھر اُن کی آواز سنائی دی۔

"ہاں تمہاری یہ تجویز بالکل ٹھیک ہے۔ تم اس کے اطراف میں پھیلے ہوئے لوگوں کے بارے میں معلومات حاصل کرو۔ یہ پتہ لگاؤ کہ باہر کس کس سے اس کا رابطہ ہے کیا تم یہ کام کر سکو گے؟"

"کیوں نہیں جناب! آپ کے منیجر قاسم حسین نے آخر ہمارا انتخاب بلاوجہ تو نہیں کیا ہوگا۔ آپ نے ہمیں اس گھر میں جاسوسی کے لئے انگیج کیا ہے آپ مطمئن رہیں جو کام آپ نے ہمارے سپرد کیا ہے اُسے انجام دیں گے اور پھر شجاع احمد صاحب یہ ڈھائی ہزار روپے تنخواہ جو ہمیں مل رہی ہے یہ کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔ آپ یہ تنخواہ ہمارے لئے بند کر دیجئے اب ہم اتنے گئے گزرے بھی نہیں ہیں کہ اپنا خرچ نہ چلا سکیں۔ بے شک ہمیں ملازمت کی تلاش تھی اور آپ نے ہمیں یہ آسانی فراہم کی ہے۔ لیکن ہم پر انسانی فرض بھی تو عائد ہوتا ہے۔ آپ کا ایک دشمن آپ کے سینے پر بیٹھ کر آپ کے خلاف کاروائیاں کر رہا ہے۔ یہ بات ہم برداشت نہیں کر سکتے۔ ہم نے دل میں فیصلہ کیا ہے شجاع احمد صاحب کہ آپ کو مالی تکلیف نہیں دی جائے گی۔ ہم بلا معاوضہ کام کریں گے آخر ہم پر بھی کچھ فرائض عائد ہوتے ہیں۔"

"نہیں میاں! تنخواہ و تنخواہ میرے لئے کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔ بے شمار ملازم ہیں میرے جو کام کر رہے ہیں تم اس کی پرواہ مت کرو اپنا کام بخوبی انجام دو۔"

"نہیں شجاع احمد صاحب! ہمارے دل میں آپ کا بڑا احترام ہے۔ ایک عجیب سی محبت ایک عجیب سا لگاؤ پیدا ہو گیا ہے آپ سے اگر ہم نے اِس کام کا معاوضہ وصول کیا تو ہمارا ضمیر خود ہمیں چین نہیں لینے دے گا۔"

"میں نے کہا نا۔ معاوضے کے چکر میں مت پڑو یہ کوئی معاوضہ نہیں ہے خلوص دل سے میرے لئے کام کر رہے ہو یہی میرے لئے کافی ہے اس کمبخت کو پوری طرح میری نگاہوں کے سامنے لے آؤ۔ میں دیکھوں گا یہ کتنا شاطر ہے۔" شجاع احمد صاحب کی آواز ابھری۔

"ٹھیک ہے، ہم پورے زور شور سے اپنی کاروائیاں جاری رکھیں گے اب ہمیں اجازت دیجئے۔"

"ٹھیک ہے میں ان معلومات کے لئے تمہارا شکر گزار ہوں۔۔۔"

شجاع احمد صاحب نے کہا اور پھر قدموں کی چاپ سنائی دی! اس کے بعد دروازہ بند ہونے کی آواز۔ پھر خاموشی چھا گئی۔

ناہد بڑے غور سے یہ ساری گفتگو سن رہا تھا اور اس کے چہرے پر تمسخر کے آثار تھے پھر اس نے بھاری لہجے میں کہا۔

"دیکھا آپ نے اسسٹنٹ زیرو زیرو سیون! ایک ہی داؤ میں چت ہو گئے یہ دونوں۔"

"یس چیف میرے لئے آئندہ کیا حکم ہے؟"

"یقیناً۔۔۔ زیرو زیرو سیون! تمہاری جاسوسی کا آغاز ہو چکا ہے اب تم یوں کرو کہ ان دونوں پر ہر وقت نگاہ رکھو یہ کیا کرتے ہیں کیا کھاتے ہیں

کیا پیتے ہیں۔ کس کس طرح گھر میں لوگوں سے ملتے ہیں۔ یہ سب معلومات کرنا تمھاری ڈیوٹی ہے۔"

"زیرو زیرو سیون اس ڈیوٹی کو بخوبی انجام دے گا چیف!" فیصل نے اپنا ننھا سا ہاتھ سینے پر رکھ کر خم ہوتے ہوئے کہا۔

" او کے زیرو زیرو سیون۔ اب یہ بتاؤ کہ ایسے ننھے ننھے کیسٹ تمھارے پاس کتنے ہیں؟"

" دو درجن کیسٹ ہیں چیف۔ یہ پہلا کیسٹ ہے جو میں نے استعمال کیا ہے۔"

" ٹھیک ہے اسے ڈسٹیکٹو ہاؤس کے ریکارڈ روم میں جمع کرا دو۔"

" کہاں ...؟" فیصل نے معصومیت سے پوچھا۔

" بھئی یہ کمرہ ہمارا دفتر ہے۔ یہ کیسٹ ریکارڈ کے طور پر محفوظ رہے گا اور ہم اس سے کوئی مناسب فائدہ حاصل کریں گے۔"

"او کے چیف ... ! میں ٹیپ ریکارڈر میں نیا کیسٹ لگا لوں گا۔"

" یقیناً ... لیکن ان لوگوں کی گفتگو ریکارڈ کرنے کے معاملے میں ذرا محتاط رہنا کہیں ایسا نہ ہو کہ انھیں تم پر شک ہو جائے۔"

" زیرو زیرو سیون معمولی جاسوس نہیں ہے۔ آپ بالکل مطمئن رہیے ایسا کبھی نہیں ہو گا۔" فیصل نے جواب دیا اور اکڑتا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا۔ یہ چھوٹا سا کیسٹ زاہد نے اپنے پاس محفوظ کر لیا تھا۔ اس کا ذہن اس سلسلے میں کوئی موثر کارروائی سوچ رہا تھا۔ یہ یقینی امر تھا کہ شجاع احمد صاحب اس کے خلاف کارروائی کرتے۔ زاہد نے معمولی پیمانے پر اپنے کام کا آغاز نہیں کیا تھا۔ اگر حسام احمد صاحب اس کے پشت پناہ نہ ہوتے تو بلا شبہ شجاع احمد صاحب اسے جوتے مار کر گھر سے نکال دیتے۔

بہر طور اس کی پوزیشن محفوظ تھی۔ شجاع احمد صاحب نے جو کارروائی اُن لوگوں کے ذریعے شروع کرائی تھی وہ مکمل طور پر زاہد کے علم میں آ چکی تھی اور سب سے بڑی بات یہ تھی کہ ان دونوں نوجوانوں کے مذموم ارادوں کی خبر بھی اُسے ہو گئی تھی۔ یہی ان لوگوں کی موت تھی۔ زاہد دانت پیسنے لگا۔ "عازم اور فاخر تم لوگوں کو اس عمارت میں کُتا نہ بنا دیا تو میرا نام بھی زاہد نہیں ہے۔" وہ آہستہ سے بولا۔ اور پھر کسی گہری سوچ میں گم ہو گیا۔ وہ سرفراز کے بارے میں سوچ رہا تھا۔

سرفراز ایک شریف نوجوان تھا۔ زاہد نے ایسے لمحات میں اُسے سہارا دیا تھا جب سرفراز چاروں طرف سے مصیبتوں میں گھرا ہوا تھا اس لئے وہ زاہد کا ممنونِ کرم تھا ویسے زاہد کے علم میں یہ بات بھی آ چکی تھی کہ قدسیہ سرفراز سے متاثر ہے اور سرفراز بھی اس سے نہیں بچ سکا ہے ان حالات میں سرفراز کے لئے زاہد کا تحفظ بہت ضروری تھا لیکن زاہد اب اس معاملے میں اپنا کوئی راز دار بھی چاہتا تھا۔ وہ اپنی اصل شخصیت تو کسی کو نہیں بتا سکتا تھا۔ اس سلسلے میں وہ آخر وقت تک محتاط رہنا چاہتا تھا لیکن اگر کسی حد تک سرفراز کو مزید اپنے رازوں میں شامل کر لیا جائے تو کوئی ہرج بھی نہیں ہے۔ وہ اُسے پرکھ چکا تھا چنانچہ یہاں سے اُٹھ کر سرفراز کی تلاش میں چل دیا۔

سرفراز فرسٹ ایڈ ہاؤس جانے کی تیاریاں کر رہا تھا اس کی والدہ ایک کمبل اوڑھے آرام کرسی پر دراز تھیں وہ بیچاری اکثر بیمار رہتی تھیں۔ ان کی صحت کافی خراب ہو گئی تھی۔

"ہیلو زاہد بھائی! خیریت؟"

"ہاں ... تم سے کچھ بات کرنا تھی۔"

"کیا خیال ہے آپ فرسٹ ایڈ ہاؤس نہیں چلیں گے؟"

"جا رہے ہو تم ...؟"

"جی ہاں ...!"

"تو پھر ٹھیک ہے چلو۔ راستے ہی میں بات چیت ہو جائے گی۔" زاہد نے جواب دیا اور سرفراز نے گردن ہلا دی۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ دونوں فرسٹ ایڈ ہاؤس جا رہے تھے۔ زاہد کو باقاعدہ ایک کار مل گئی تھی جو اب اس کے استعمال میں رہتی تھی۔ یہ حسام احمد صاحب کا تحفہ تھا۔ چنانچہ وہ سست رفتاری سے کار ڈرائیو کرتا ہوا فرسٹ ایڈ ہاؤس کی طرف بڑھنے لگا پھر اس نے گفتگو کا آغاز کیا۔

"سرفراز تمھیں کچھ خاص اطلاعات دینی تھیں۔"

"جی جی فرمائیے۔"

"یہ دونوں افراد میرا مطلب ہے ... عازم اور فاخر شجاع احمد صاحب کے دوست کے بیٹے نہیں ہیں بلکہ اس شجاع احمد صاحب نے انھیں یہاں میری جاسوسی کے لئے مقرر کیا ہے۔"

"کیا ...؟" سرفراز اُچھل پڑا۔

"ہاں ... شجاع احمد صاحب کے بارے میں تم نے بھی یہ اندازہ لگا لیا ہو گا کہ وہ مجھے پسندیدگی کی نگاہ سے نہیں دیکھتے۔ دو تین بار میری اُن سے ملاقات ہوئی ہے۔ انھوں نے مجھے اپنے کاروبار میں دماغ سوزی کرنے کی دعوت دی اور میرے بہتر مستقبل کے لئے بھی انھوں نے کچھ پیش کش کی ہیں جنھیں بہر حال میں نے فوری طور پر منظور نہیں کیا۔ لیکن اگر میں چاہوں تو شجاع احمد صاحب بہت سی کام کی باتیں کر سکتے ہیں۔ میں نے چونکہ اس بات سے لاپرواہی برتی اور اپنے کام میں مصروف رہا چنانچہ شجاع احمد صاحب میرے بالکل مخالف ہو گئے البتہ وہ مجھے ابھی یہاں سے نکالنے کی جرأت نہیں کر سکتے کیونکہ تمام لوگ اس بات کی مخالفت کریں گے خاص طور سے دلدار جان جب وہ یہ سب کچھ نہ کر سکے تو یہ دو جاسوس یہاں لائے گئے ہیں۔ میں پہلے ہی دن اُن

کی جانب سے کھٹک گیا تھا۔ حالانکہ کوئی اہم بات نہیں تھی۔ شجاع احمد صاحب کے کسی بھی دوست کے بیٹے یہاں آسکتے ہیں۔ یہ اُن کا گھر ہے لیکن مجھے شجاع احمد صاحب کی فطرت میں نمایاں تبدیلی محسوس ہوئی وہ جو کسی چیز کو بھی خاطر میں لانے والوں میں سے نہیں ہیں۔ ان لڑکوں سے اتنے متاثر کیوں تھے۔ اس کی دو ہی وجوہات میرے ذہن میں آئی تھیں۔ پہلی تو یہ تھی کہ ممکن ہے شجاع احمد صاحب اپنی.. بیٹیوں کے لئے اُن لڑکوں کے بارے میں سوچ رہے ہوں کیونکہ اُن کے دوست کے بیٹے تھے اور اس تصوّر کے تحت اُنھیں یہاں بہت زیادہ اہمیت دی جا رہی ہو لیکن شجاع احمد صاحب کی اس بات کو بیگم صاحبہ نے بالکل ہی رد کر دیا۔ بیگم صاحبہ نے مجھے بلایا تھا اور کسی طالب علی صاحب کے بارے میں کہا تھا کہ وہ اپنے بیٹے کا رشتہ قدسیہ کے لئے لا رہے ہیں۔ دونوں باپ بیٹے تھوڑے عرصے میں یہاں پہنچنے والے ہیں اور ہمیں اُن کے استقبال کے لئے مناسب تیاریاں کرنی ہیں۔" زاہد نے کہا اس نے سرفراز کے بدن میں نمایاں کپکپاہٹ دیکھی تھی۔ لیکن اس نے اُسے نظر انداز کر دیا اور جلدی سے بولا۔

"بیگم صاحبہ اس رشتے کے حق میں نہیں ہیں۔ اُنھوں نے مجھ سے مدد مانگی ہے اور کہا ہے کہ مطلوب علی کو دیکھ لیا جائے کس ٹائپ کا لڑکا ہے کیا حیثیت رکھتا ہے۔ لیکن بذاتِ خود وہ اُن لوگوں سے مطمئن نہیں ہیں۔ اور سرفراز میاں! ہمیں قدسیہ کو اس طالب و مطلوب سے بچانا ہے مطلب یہ کہ ان لوگوں کے بارے میں مکمل چھان بین کرنی ہے اور ہر قیمت پر رشتہ ختم کرانا ہے۔ یہ ایک بہت بڑی ضرورت ہے جو ہر طور پوری ہوگی اور میں کسی قیمت پر یہ سب کچھ نہیں ہونے دوں گا۔" سرفراز نے کوئی جواب نہیں دیا اور وہ خاموشی سے سڑک پر نگاہ جمائے ہوئے تھا۔

"بہرِ حال کہنے کا مقصد یہ کہ ان دونوں جاسوسوں کی چوری پکڑی گئی۔ یہ میرے خلاف ہر شخص سے باتیں کرتے پھر رہے تھے وہ غالباً تمہارے پاس بھی پہنچے ہوں گے۔"

"ہاں عازم آیا تھا۔ اس نے قدسیہ سے اس کی تصاویر دیکھنے کی فرمائش کی تھی اور بہت سی باتیں کی تھیں۔ قدسیہ اس کے ساتھ بہتر طور سے نہ پیش آئی اور وہ بد دل ہو کر وہاں سے گیا تھا۔"

"ہوں، بہرِ طور یہ دونوں جاسوس چت ہو گئے ہیں اور اب ہم جب چاہیں اُنھیں کان سے پکڑ کر باہر نکال سکتے ہیں۔"

"کیا مطلب...؟" سرفراز چونک پڑا۔

"بھئی مجھے بھی تو اپنا دفاع کرنا ہے اس سلسلے میں تم سے کچھ کہنا چاہتا ہوں سرفراز۔"

"جی فرمائیے۔"

"بذاتِ خود تم ان پر نگاہ رکھ ہی رہے ہو گے جس حد تک بھی ممکن ہے لیکن اب ایک معاملہ سامنے آگیا ہے۔"

"جی جی..."

"بھئی کیسے کہوں شرم بھی آتی ہے اور یہ احساس بھی ہے کہ اُن کمبختوں نے ایسی بات کہی ہی کیوں۔ ان دونوں نے جاسوسوں کی حیثیت سے یہاں داخل ہو کر بڑی گہرائی میں پنجے گاڑنے کی سوچی ہے۔ یعنی وہ چاہتے ہیں کہ قدسیہ اور شاذیہ کو اپنے فریب کے جال میں پھانس کر... شجاع احمد صاحب کے داماد بننے کی کوشش کریں اور اس سلسلے میں وہ اپنی کارروائی کا آغاز کرنے والے ہیں۔"

"اوہ... اس کا مطلب ہے کہ وہ نہایت ہی کمینے لوگ ہیں۔"

"ہاں سرفراز اس میں کوئی شک نہیں ہے۔ تمھیں آگاہ کر دینا ضروری سمجھتا ہوں میرے دوست کیونکہ... بہر طور میں نے تمھیں اُن تمام لوگوں سے ہٹ کر اپنا دوست بنایا ہے ایک بات کا مجھے کھل کر جواب دو۔"

"جی..." سرفراز تعجب سے بولا۔

"قدسیہ کو چاہتے ہو تم؟" زاہد نے سوال کیا اور سرفراز ایک بار پھر کانپ گیا کافی دیر تک اس کے منہ سے آواز نہیں نکل سکی تھی۔ "سرفراز! اپنے دل کی بات تمھیں بتا دوں اگر قدسیہ تمہاری زندگی میں شامل ہو سکی تو سب سے زیادہ مسرت مجھے ہوگی۔ میں تم دونوں کا مددگار ہوں اور اور بے فکر رہو۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ اپنی آخری کوشش تک اس سلسلے میں صرف کر دوں گا کہ شجاع احمد صاحب تمھیں اپنے داماد کی حیثیت سے قبول کریں۔ یہ میری ذمہ داری ہے۔ لیکن میں کچھ ذمہ داریاں تمہارے سپرد بھی کرنا چاہتا ہوں۔ وہ یہ کہ قدسیہ کو حالات سے کسی قدر باخبر رکھو اور اُس سے ایک کام لو اگر لے سکتے ہو۔"

"کیا...؟" سرفراز کی کپکپاتی آواز اُبھری۔

"اس سے کہو کہ عازم کو تھوڑی سی لفٹ دے اُسے غلط فہمیوں کا شکار کرے۔ اُسے اس بات کا یقین دلا دے کہ وہ عازم سے متاثر ہے گو الفاظ واضح نہ ہوں لیکن انداز واضح ہونا چاہیئے۔"

"قد... قدسیہ صاحبہ ایسا کر سکیں گی؟"

"تم کرا سکو گے میرے دوست...؟ یہ کام میں نہیں کرا سکتا اس سے تمہارا اور اس کا معاملہ ذرا مختلف ہے۔"

"زاہد بھائی..." سرفراز نے پریشان لہجے میں کہا۔

"ہاں سرفراز! یہ صرف اتفاق ہے کہ میں تم دونوں کے درمیان ہونے والی گفتگو سن چکا ہوں۔ میں اُن پاک جذبوں کو کسی طور بُرا نہیں سمجھتا تم لوگ شریفانہ طور پر ایک دوسرے کا دامن تھامنے کی آرزو رکھتے ہو۔ میری بھی دلی خواہش ہے کہ ایسا ہو جائے لیکن میرے دوست جب

تک یہ دونوں گدھے یہاں موجود ہیں۔ ذرا احتیاط رہو۔ ورنہ یہ تمھاری کسی بھی بے احتیاطی سے فائدہ اُٹھا سکتے ہیں۔"

"جی جی... میں خیال رکھوں گا پورا پورا۔" سرفراز نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔

"یار بزدلوں کی طرح گفتگو مت کرو۔ مردانہ وار لہجے میں باتیں کرو۔ تمھارے سامنے تمھارا دوست ہے تمھارا زاہد۔"

"زاہد بھائی... آپ کے یہ احسانات میں زندگی بھر کبھی نہیں اُتار سکوں گا۔"

"جب نہیں اُتار سکو گے تو ذکر کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ بہرطور اتنا احسان ضرور کرو کہ جو کچھ میں کہہ رہا ہوں اس پر ذرا ہوشیاری کے ساتھ عمل کرتے رہو۔"

"آپ مطمئن رہیں۔ میں قدسیہ سے یہ کام کراؤں گا۔"

"ان لوگوں کو ایسی جگہ لے جا کر مارنا ہے۔ جہاں انھیں پانی بھی نہ ملے۔ آخر انھیں جرأت کیسے ہوئی ہمارے خلاف جاسوسی کرنے کی اور شجاع احمد صاحب، شجاع احمد صاحب کی میں شامت نہ بلا دوں تو میرا نام زاہد نہیں ہے۔" سرفراز مسکرانے لگا تھا پھر اس نے کہا۔

"ٹھیک ہے زاہد بھائی! آپ نے جو ذمہ داری میرے سپرد کی ہے میں اُسے دلجمعی سے پوری کروں گا۔ لیکن آپ نے بڑے عجیب انکشافات کئے ہیں۔ آخر آپ کو یہ ساری باتیں کیسے معلوم ہوئیں۔"

"میاں بس اپنا کھیل ہے یوں سمجھو کہ بعض اوقات قدرت خود بخود میری مدد کرتی ہے اور اس وقت تو مجھے ایک اتنے بڑے جاسوس کا سہارا حاصل ہے جو اس پوری کوٹھی کو ہلا کر رکھ دے۔"

"جاسوس۔" سرفراز نے تعجب سے پوچھا۔

"جاسوس نہیں جاسوس اعظم یعنی فیصل شجاع احمد صاحب۔"

"فیصل...؟"

"ہاں۔" زاہد نے کہا اور فیصل کے ٹیپ ریکارڈر کے بارے میں سرفراز کو تفصیلات بتانے لگا۔

"میرے خدا! آپ نے اس ننھے بچے سے اتنا بڑا کام لے لیا۔"

"اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ اس وقت وہ اس عمارت میں میرا سب سے اہم مُہرہ ہے کیونکہ بچہ ہے اس لئے اس پر کوئی توجہ نہیں دیتا لیکن یہ بچہ ایک لمبی سی قینچی لئے ایک ایک کے کان کترتا پھر رہا ہے۔" سرفراز ہنسنے لگا۔ تھوڑی دیر کے بعد کار فرسٹ ایڈ ہاؤس میں داخل ہو گئی۔

عازم کتابوں سے لدا پھندا احتشام احمد صاحب کی رہائش گاہ میں داخل ہو گیا۔ احتشام احمد صاحب کوئی کتاب پڑھ رہے تھے۔ عازم کو اس حالت میں دیکھ کر انھوں نے کتاب نیچے رکھ دی اور اُسے دیکھنے لگے۔

"کیا اُٹھا لائے عازم میاں! کیسی کتابیں ہیں یہ؟"

"بس دادا جان! جب سے آپ کی دلچسپی کے بارے میں سُنا ہے اس کوشش میں لگا ہوا تھا کہ کچھ نایاب قسم کی چیزیں حاصل ہوں تو آپ کی خدمت میں پیش کروں۔"

"اوہو، ہو... یہ کتابیں تم میرے لئے لائے ہو؟"

"جی ہاں! اگر آپ قبول فرمالیں تو۔"

"دکھاؤ تو سہی بھئی کیا کیا اُٹھا لائے۔" دادا جان نے کہا اور دلچسپی سے کتابوں کی جانب دیکھنے لگے۔

"دیکھئے آئن فلیمنگ کی عام کتابوں سے ہٹ کر یہ کتاب ہے۔ یعنی اس نے جو ناول لکھے وہ ایک الگ حیثیت رکھتے ہیں لیکن چونکہ وہ خود بحری کسٹم انٹیلی جنس کا ڈائریکٹر تھا اس لئے اس نے اپنی زندگی کے واقعات الگ سے تحریر کئے۔ اور یہ واقعات بھی بے پناہ دلچسپ ہیں۔"

"اوہ، اوہ... اچھا دوسری کتاب۔" دادا جان نے اس کتاب کو ہاتھ لگائے بغیر کہا۔

"یہ اسکاٹ لینڈ یارڈ کے لیکچرر کا روزنامچہ ہے۔"

"تیسری...؟" دادا جان نے اس کتاب کو دیکھے بغیر پوچھا اور عازم کو حیرت ہونے لگی۔

"یہ الفریڈ ہچکاک کا ایک قدیم نسخہ ہے جو بہت بعد میں طبع ہوا۔ اس کی جلدیں یہاں نایاب ہیں۔"

"چوتھی میاں چوتھی۔" دادا جان بولے۔ اور عازم نے کسی قدر مردہ انداز میں ایک اور کتاب دادا جان کے آگے کر دی اس کا عنوان پڑھنے کے بعد دادا جان نے پانچویں کتاب اس سے طلب کی اور عازم کے حوصلے پست ہونے لگے پھر اس نے مردہ سے انداز میں ایک ایک کر کے ساری کتابیں دادا جان کے حوالے کر دیں اور دادا جان سرسری سی نگاہ اُن پر ڈال کر عازم کی طرف دیکھنے لگے۔

"عازم میاں! اُن کتابوں پر تم نے کتنی رقم خرچ کی ہے؟"

"دادا جان! رقم آپ کے سامنے کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔"

"بہرطور تمھارا بے حد شکریہ بیٹے! لیکن ذرا میری لائبریری میں جا کر دیکھو یہ ساری کتابیں میرے پاس موجود ہیں اور ان کے علاوہ دُنیا کے نادر ترین نسخے بھی ہیں۔ اس سے پہلے یہ ساری چیزیں میرے پاس موجود نہیں تھیں لیکن تمھیں حیرت ہوگی کہ زاہد نے اسی موضوع پر جتنی کتابیں لکھی گئی ہیں میرے لئے لا دی ہیں۔ اور میاں بات صرف یہی نہیں

ہے کہ اس نے کتابیں لا کر ہی مجھے دے دیں بلکہ اس نے ان کتابوں کی ایک شرح بھی بنائی ہے۔ شاید تم اس بات پر یقین نہ کرو لیکن میں تمھیں آگاہ کر دوں کہ اگر زاہد کوئی ادیب ہوتا اور اس سے فکشن لکھنے کے لئے کہا جاتا تو شاید اس وقت دُنیا میں مانا ہُوا فکشن رائٹر ہوتا۔ وہ ان کتابوں کے نقائص نکالتا ہے۔ اور کوئی یہ تردید نہیں کر سکتا کہ جو کچھ اس نے کہا غلط کہا ہے۔ مصنّف کی زندگی بھر کی محنت کو وہ ایک لمحے میں اکارت کر دیتا ہے ایسے ایسے پوائنٹ تلاش کرتا ہے ان چیزوں میں کہ عقل دنگ رہ جائے اس نے ان کی شرح بنائی ہے۔ ان... کہانیوں کے انجام بدلے ہیں اور درحقیقت یہ انجام مصنّف کے لکھے ہوئے انجام سے کہیں بہتر ہوتے ہیں اس نے اُن معاملات پر جو تھوڑا بہت بھی لکھا... ہے وہ میری لائبریری میں محفوظ کر دیا ہے۔ تم خود جائزہ لو اس کا تو تمھیں اندازہ ہو جائے گا۔" عازم کا چہرہ لٹک گیا تھا پھر اس نے مرده سی آواز میں کہا۔

"میں نے یہ تمام چیزیں بڑی محنت سے اکٹھا کی تھیں۔ دادا جان لیکن بہرحال آپ کی لائبریری میں موجود ہیں تو اب اُن کی کیا قیمت ہے۔"

"نہیں میاں، قیمت ان کتابوں کی نہیں۔ قیمت اس خلوص کی ہے جس سے تم یہ سب میرے لئے خرید کر لائے۔ لاؤ مجھے دے دو۔ اب ایک ایک کے بجائے دو دو نسخے ہو جائیں گے میرے پاس۔"
صاف ظاہر تھا کہ اُنھوں نے عازم کا دل رکھنے کے لئے یہ الفاظ کہہ دیئے تھے۔ لیکن اُنھیں کتابوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی پھر عازم آہستہ سے بولا۔

"دادا جان میں خود بھی ایک کہانی لکھ رہا ہوں کسی وقت آپ کے سامنے پیش کر دوں گا۔"

"ضرور میاں ضرور۔ کوئی نئی چیز ہوگی تو وہ میرے لئے زیادہ دلچسپ ہوگی کب تک مکمل کر لو گے۔"

"بس بہت جلد دادا جان، اب اجازت دیجئے۔" عازم نے جواب دیا اور دادا جان نے اُسے اجازت دے دی۔ عازم کا یہ داؤ ناکام رہا تھا۔ دادا جان پر ڈورے ڈالنے کی پہلی کوشش کچھ کامیاب نہیں رہی۔

اب اُسے کوئی دوسری ترکیب کرنی تھی۔ بہرِطور ابھی دوسرا مرحلہ بھی باقی تھا وہ اپنی رہائش گاہ میں آیا اور اس کے بعد چھ کتابوں کا ایک بنڈل جو نہایت نفیس گرد پوش سے آراستہ تھیں بغل میں دبائے قدسیہ کے نگار خانے کی جانب چل پڑا۔ راستے میں اس نے ایک ملازم سے یہ بات معلوم کر لی تھی کہ قدسیہ اس وقت اپنے نگار خانے میں موجود ہے۔ خوش قسمتی یہی تھی کہ سرفراز قدسیہ کے ساتھ نہیں تھا۔ لیکن عازم یہ نہیں جانتا تھا کہ سرفراز قدسیہ کو کچھ مخصوص ہدایات دے چکا ہے۔ ہرچند کہ یہ ہدایات قدسیہ کے حلق سے نیچے نہیں اُتری تھیں۔ لیکن چونکہ سرفراز کی طرف سے ملی تھیں۔ اس لئے قدسیہ کو ان پر عمل کرنا ضروری تھا۔ عازم جب قدسیہ کے نگار خانے میں داخل ہُوا تو قدسیہ ایک تصویر کو فنشنگ ٹچ دے رہی تھی۔ عازم کو دیکھ کر اس کے ہاتھ رُک گئے ایک لمحے کے لئے اس کی تیوریوں پر ناگواری کی شکنیں نمودار ہوئیں۔ لیکن پھر اس نے خود کو فوراً سنبھال لیا اور مصنوعی مُسکراہٹ کے ساتھ بولی۔

"تشریف لائیے عازم صاحب خیریت؟"

"اوہ قدسیہ، بڑی آرزو تھی تمھارا یہ نگار خانہ دیکھنا چاہتا تھا کہ ایک حسین مصورہ کی تخلیقات کیسی ہوں گی۔"

"اوہو، اوہو... تب پھر آئیے میں آپ کو اپنی تصاویر دکھاؤں لیکن ایک شرط ہے۔"

"جی جی کیا شرط ہے؟" عازم نے پُوچھا۔

"تصویر شناسی ایک اہم بات ہے اگر آپ تصویروں کو سمجھنے کی قدرت رکھتے ہیں۔ تب تو میں آپ کو اپنی مزید تصویریں دکھاؤں گی۔ لیکن اگر آپ فیل ہو گئے تو پھر معاف کیجیے گا۔"

"نہیں بھئی... بڑا کڑا امتحان ہوگا یہ مصوّر کا ذہن جو کچھ سوچتا ہے اُس کے ہاتھ کی جنبش جو کچھ بناتی ہے وہ عام ذہن میں نہیں ہوتا اور پھر میں نے سُنا ہے کہ تم تجریدی آرٹ سے دلچسپی رکھتی ہو۔"

"جی ہاں، نمایاں خطوط تو انسانی ذہن کو کتاب کی طرح کھول کر رکھ دیتے ہیں۔ میری یہ تصاویر تو اہلِ دانش کے لئے ہیں سمجھو اور سمجھاؤ اب اس تصویر کو دیکھئے اس سے کیا اندازہ لگایا آپ نے۔" قدسیہ نے اس تصویر کی جانب اشارہ کر کے کہا جسے وہ فنش کر رہی تھی۔ عازم کے چہرے پر گھبراہٹ کے آثار نمایاں دیکھے جا سکتے تھے۔ اس نے تصویر کے ہر رُخ کو دیکھا اور پھر گہری سانس لے کر بولا۔

"غالباً یہ بوتل ہے۔ یہ تپائی ہے اور یہ اس کے نزدیک جو کچھ ہے یہ سمجھ میں نہیں آیا۔"

"جی ہاں جی ہاں یہی اصل حقیقت ہے یہ نہ بوتل ہے نہ تپائی ہے یہ تصوّر ہے انسانی ذہن مختلف افکار و خیالات کا شکار رہتا ہے۔ اور اس کی نفسیات بعض اوقات اُسے عجیب و غریب مناظر میں گم کر دیتی ہے یہ منظر ایک خوشگوار مستقبل کا ہے جس کی آرزو میں یہ بدنصیب ہوش سنبھالنے کے بعد سے ہوش ختم ہونے تک زندہ رہتا ہے اور اس کے بعد موت کی آغوش میں جا سوتا ہے۔ بڑا المیہ ہے یہ انسانی زندگی کا سب سے دردناک خاکہ۔" قدسیہ نے جواب دیا۔

"خُدا کی پناہ۔ کتنی گہرائی ہے اس تصوّر میں قدسیہ تمھارا ذہن اُن

بلندیوں تک کیسے پہنچ جاتا ہے؟" عازم نے چکراتی ہوئی کھوپڑی کو سنبھالتے ہوئے کہا۔ ورنہ اس کا ذہن بوتل اور تپائی کے علاوہ کچھ سمجھ نہ پایا تھا پھر اس نے کہا۔

"قدسیہ! یہ کچھ کتابیں مجھے ملی تھیں میں نے سوچا ایک مصورہ کے لئے ان سے بڑا اور کوئی تحفہ نہیں ہو سکتا یہ میں تمھیں پیش کرنے کی جسارت کر رہا ہوں۔"

"کیسی کتابیں ہیں؟"

"فن مصوری سے متعلق۔ تجریدی آرٹ کا شاہکار، مائیکو کا پوسو اور والسٹر وائن کے نوادرات ہیں یہ۔"

"اُوہ... بہت بہت شکریہ۔ لیکن میں ان کتابوں کو صرف اپنی لائبریری میں سجا سکتی ہوں۔ اُن سے استفادہ حاصل کرنا میرے لئے ممکن نہیں ہے۔"

"بھلا وہ کیوں؟" عازم نے کہا۔

"اس لئے کہ میں اپنے فن پر کسی کی چھاپ نہیں پڑنے دینا چاہتی یہ جو نام آپ نے لئے ہیں ممکن ہے مصوری کی دُنیا میں بہت بڑے نام ہوں لیکن ہر انسان کا اپنا ایک راستہ ہوتا ہے۔ اپنا ایک عمل ہوتا ہے میں قدرتی مصورہ ہوں۔ خالقِ حقیقی نے میرے ذہن میں اس کائنات کی تصویریں اُتاری ہیں۔ اور میری سوچ جہاں تک عمل کرتی ہے میں اس میں منفرد رہنا چاہتی ہوں اسی لئے میں نے آج تک کسی مصور کی کوئی تخلیق نہیں پڑھی ہے۔ میں فنِ مصوری کے بارے میں ان لگے بندھے اصولوں پر نہیں چلنا چاہتی جو متعین کر دیئے گئے ہیں۔ بلکہ اپنے لئے نئی راہیں تلاش کر رہی ہوں۔"

"خدا کی پناہ، خدا کی پناہ۔ کیا بلند خیال ہے کیا ہی سائنٹفک طریقہ ہے اپنے راہِ عمل منتخب کرنے کا۔ بہرطور بھی یہ کتابیں میں بڑی چاہ سے لایا ہوں تم قدسیہ مجھے معاف کرنا تم بذاتِ خود قدرت کا ایک حسین شاہکار ہو تمھارے خدوخال میں قدیم یونان جھلکتا ہے سر سے پاؤں تک تم ایک ایسا مجسمہ ہو جس پر صرف غور کیا جائے۔ ایک مصورہ کے حُسن کی تعریف کر رہا ہوں اس میں تمھیں برا ماننے کی ضرورت نہیں قدسیہ کیونکہ میں کو ایک فنکار کی تخلیق کی داد دے رہا ہوں۔ تمھاری ستائش میں میرا کوئی اور مقصد نہیں چھپا ہوا میں اپنے الفاظ کے لئے تم سے معذرت خواہ ہوں۔ براہِ کرم اُنھیں محسوس نہ کرنا۔"

"نہیں عازم صاحب! آپ نے جن الفاظ میں میری تعریف کی ہے۔ اُن سے تو میں فخر و غرور کا شکار ہو گئی ہوں۔ آپ میرے لئے ایسے اچھے جذبات رکھتے ہیں۔"

"ان سے کہیں زیادہ قدسیہ! ان سے کہیں زیادہ۔ کاش میرے پاس وہ الفاظ ہوتے۔ جن سے میں تمھاری صحیح عکاسی کر سکتا۔" عازم نے جذباتی لہجے میں کہا۔

"اچھا بیٹھئے تو سہی آپ کھڑے کیوں ہیں؟"

"قدسیہ میں اپنے دل کو تمھارے سامنے کھول دینا چاہتا ہوں۔ جب سے اس گھر میں داخل ہوا ہوں میرے شب و روز حرام ہو کر رہ گئے ہیں۔"

"کیوں... ؟ کیوں خیریت؟" قدسیہ نے انتہائی تمسخرانہ لہجے میں کہا۔

"بس تم میرے حواس پر مسلط ہو۔ میں کیا بتاؤں تمھیں قدسیہ کیا کیا سوچتا رہتا ہوں میں تمھارے بارے میں۔"

"بتا دیں تو اچھا ہے۔ میں بھی تو کچھ جان جاؤں۔"

"قدسیہ اتنی جلدی نہیں۔ پتہ نہیں تم کیا سوچو میرے ان الفاظ کے بارے میں۔ میں آہستہ آہستہ تمھیں اپنے بارے میں بتاؤں گا۔"

"چلئے ٹھیک ہے آغاز آج ہی سے کر دیں تو بہتر ہے۔"

"جو کچھ کہہ چکا ہوں اس پر غور کرنا تمھیں عازم کی قسم۔"

"ارے ارے... قسمیں نہ دلایئے عازم صاحب پلیز۔" قدسیہ نے اُنھیں روکتے ہوئے کہا۔

"اچھا مجھے اپنی تصویریں دکھاؤ۔"

"آیئے آیئے..." قدسیہ نے کہا اور عازم کو لئے ہوئے ایک تصویر کے پاس پہنچ گئی۔

"یہ کیا ہے...؟" اس نے عازم سے سوال کیا۔

"خود ہی بتا دو۔ میں تمھارے ذہن کی بلندیوں تک نہ پہنچ سکوں گا۔"

"پھر بھی کچھ تو کہیں۔"

"چارپائی ہے۔" عازم نے جواب دیا۔

"نہیں... یہ مدوجزر ہے۔ انسانی وجود میں جو جوار بھاٹا پیدا ہوتا ہے یہ اس کی عکاسی ہے۔"

"ٹھیک ہے، ٹھیک ہے یقیناً ہوگی۔" عازم گھبرائے ہوئے لہجے میں بولا۔

"اچھا ادھر آیئے۔" قدسیہ نے کہا اور ایک اور تصویر کے پاس پہنچ گئی۔

"بھلا یہ کیا ہو سکتا ہے؟"

"پھر کوئی اُلٹی سیدھی بات کہہ دوں گا۔ اور تم اس کا مذاق اُڑاؤ گی"

"نہیں... آپ تو میری رہنمائی کر رہے ہیں۔ میں جاننا چاہتی ہوں کہ میری تصویروں کو دیکھ کر ایک عام ذہن میں کیا تاثر اُبھرتا ہے۔" قدسیہ نے کہا اور عازم پریشان نگاہوں سے اُس تصویر کو دیکھتا رہا پھر بولا۔

"یہ غالباً ریچھ ہے اور یہ اس کے سر پر غالباً گیند قسم کی کوئی چیز رکھی ہوئی ہے" عازم نے کہا اور قدسیہ ہنس پڑی "کیوں کیوں... کہہ دی نا میں نے کوئی غلط بات"

"نہیں... آپ نے غلط بات ہی نہیں بلکہ اس تصویر کی توہین کی ہے"

"خدا کے لئے مجھے معاف کر دو قدسیہ! اس کے بعد مجھے اور کوئی تصویر نہ دکھانا۔ نہیں اس کی فرمائش کردں گا"

"ٹھیک ہے ٹھیک ہے... چلئے چھوڑیں۔ ویسے یہ سہاگن ہے"

"یقیناً ہوگی یقیناً ہوگی یہ سہاگن"

"نہیں عازم صاحب! کیسی باتیں کر رہے ہیں۔ یہ عورت ہے۔ روزِ ازل سے اس کے سر پر بوجھ رکھ دیئے گئے ہیں۔ تہذیب کے بنائے ہوئے اصولوں کے مطابق یہ اس بوجھ کو سر پر اٹھائے رکھنے پر مجبور ہے۔ میں نے ان ہی مجبوریوں کی عکاسی کی ہے۔ آپ دیکھ رہے ہیں نا۔ بعض اوقات اُسے اپنی ذات پر کس قدر وزن برداشت کرنا پڑتا ہے"

"ٹھیک ہے قدسیہ! بس اب اللہ کے واسطے کچھ اور مت دکھاؤ جو کچھ دیکھ لیا اتنا ہی کافی ہے"

"عازم صاحب! آپ کو فن سے دلچسپی نہیں ہے؟"

"ہے بہت زیادہ ہے مگر یہ فن۔ یہ فن میری سمجھ میں کبھی نہیں آیا"

"تب آپ کبھی بھی ایک اچھے نقاد نہیں بن سکتے"

"بننا بھی نہیں چاہتا بھائی۔ یہ تو بڑی گڑبڑ ہوگئی" عازم بھرائے ہوئے لہجے میں بولا۔

"کیوں... گڑبڑ کیوں ہوگئی؟"

"کچھ نہیں کچھ نہیں۔ بس میں چاہتا تھا کہ تمہارے بہت قریب آجاؤں۔ تمہارے ذہن میں جگہ حاصل کرلوں لیکن میں تمہارے شوق کا ساتھ نہیں دے پایا۔ مجھے دکھ ہے اس بات کا"

"ضروری تو نہیں ہے عازم صاحب کہ دنیا میں ہر شخص مصور ہو یا ہر [illegible] تصویر سمجھ بھی سکے۔ یہ تو الگ ہی بات ہوگئی"

"قدسیہ، قدسیہ... کیا تم مجھے اس کی اجازت دوگی کہ میں تم... سے ملتا رہوں"

"آپ اس کوٹھی میں ہیں۔ مجھ سے ملنے میں آپ کو کیا تکلیف پیش آسکتی ہے"

"نہیں میں... میں تم سے تنہائیوں میں ملنا چاہتا ہوں"

"کیوں سب کے سامنے ملتے ہوئے کیا آپ کو خوف آتا ہے" قدسیہ نے پوچھا۔

"نہیں قدسیہ تم سمجھنے کی کوشش کرو۔ میرے جذبات و احساسات کو سمجھنے کی کوشش کرو۔ قدسیہ میں میں... قدسیہ میں پریشان ہوں... تمہارے لئے"

"ارے... کیا پریشانی لاحق ہوگئی آپ کو آخر میں ٹھیک ٹھاک ہوں۔ صحت مند ہوں تندرست ہوں کھاتی پیتی ہوں عیش کر رہی ہوں۔ آپ کو ایسی کیا پریشانی لاحق ہوگئی ہے میرے سلسلے میں" قدسیہ نے سوال کیا۔

"میں تمہیں سمجھانے کی کوشش کروں گا قدسیہ! میں تمہیں سمجھانے کی کوشش کروں گا۔ آج شام میں تمہارا کیا پروگرام ہے؟"

"کچھ نہیں کوئی خاص نہیں"

"تو پھر رات کو ساڑھے دس گیارہ بجے کے قریب تم مجھ سے باغ میں ملوگی؟"

"کیوں، وہاں ملنے کی کیا تک ہے؟"

"کچھ نہیں۔ بس موسم کا لطف اٹھائیں گے" عازم نے کہا۔

"نہیں... میں آج مصروف ہوں"

"پھر کل صبح..."

"ہاں! کل کے بارے میں میں آپ کو بعد میں اطلاع دے دوں گی" قدسیہ نے جواب دیا۔

"تت... تو کیا میں جاؤں؟"

"جی ہاں بڑی نوازش ہوگی" قدسیہ روکھے سے انداز میں بولی۔

عازم یہاں سے بھی مردہ دلی سے واپس آیا تھا۔ دادا جان! کو متاثر کرنے میں قطعی ناکام رہا تھا۔ اور قدسیہ حالانکہ قدسیہ نے اس کی پذیرائی کی تھی۔ اس کے انداز میں وہ روکھائی نہیں تھی جس کا وہ متوقع تھا۔ لیکن بعد میں وہ اپنے امتحان میں فیل ہو گیا تھا۔

کاش... ! وہ فنِ مصوری کے بارے میں واقعی کچھ جانتا ہوتا۔ لیکن یہ الٹی سیدھی چیزیں بھلا اس کی سمجھ میں کیا آسکتی تھی۔

"کیا کرنا چاہیئے۔ کیا کرنا چاہیئے؟ کوئی ایسی ترکیب ہو کہ قدسیہ رام ہو جائے۔ کیا ترکیب ہونی چاہیئے۔ وہ سوچتا ہوا۔ اپنے کمرے میں واپس آگیا۔

●

فرسٹ ایڈ ہاؤس کی تعمیر جاری تھی۔ تسلی بخش طور پر کام ہو رہا تھا۔ اکثر حکومت کے نمائندے اس عمارت میں حسام احمد صاحب سے ملاقات کرتے رہتے تھے۔ ان کے مسائل پوچھتے اور بعض لوگ تو اس منصوبے سے اتنے متاثر ہوئے تھے کہ انھوں نے اس کی باقاعدہ امداد مقرر کردی تھی۔ ابھی اتنا فنڈ موجود تھا کہ مزید کی ضرورت نہیں تھی۔ اسی لئے آئرن ٹاور کی سرگرمیاں بند ہوگئی تھیں۔ لیکن یہ سیکشن کام بدستور کر رہا تھا۔ نئے شکار تلاش کئے جارہے تھے۔ اور ان کا ہدف مقرر کر لیا گیا تھا۔ ناہید نے دادا جان کو تین "بکروں" کی

تفصیلات مینا کی تھیں جو قربانی کے لئے تیار تھے اور اُن تینوں سے ملا کر تقریباً بیس لاکھ روپے حاصل ہو سکتے تھے۔ بہر حال دادا جان مطمئن تھے۔ اور دادا جان مطمئن تھے تو ناہر بھی اس طرف سے مطمئن تھا۔

چنانچہ آج کل اندرونی سرگرمیاں زور و شور پر تھیں۔ قدسیہ کی تصویروں کی نمائش تیار تھی۔ اور ناہر اس سلسلے میں پلاننگ کر رہا تھا۔ آج تک اس نے جو پروگرام بنائے تھے وہ سو فیصدی کامیاب رہے تھے۔ اس نمائش کو بھی وہ ایک مثالی نمائش بنانا چاہتا تھا۔ اور اُسے یقین تھا کہ وہ جو کچھ چاہ رہا ہے وہ اس کی خواہش کے مطابق ہی پایۂ تکمیل تک پہنچے گا۔ چنانچہ خاموشی سے وہ اپنے پروگرام کو آخری ٹچز دے رہا تھا۔ دوسرے کام بھی جاری تھے۔

مثلاً سرفراز کی رپورٹ "ابتدا ہو گئی ناہر صاحب!" سرفراز نے مسکراتے ہوئے کہا تھا۔

"کس سلسلے کی؟"

"ہاں! اس میں کوئی شک نہیں ہے۔ اتنے مسائل ہمارے سر پر آ گئے ہیں کہ اب تو مسئلہ ہو جانا چاہیئے۔"

"ہو جائے گا تم سناؤ کون سے مسئلے کی بات کر رہے ہو؟"

"عازم صاحب بمقابلہ قدسیہ شجاع احمد۔"

"اوہ... مقابلہ شروع ہو گیا۔"

"جی ہاں۔"

"کتنے راؤنڈ ہو گئے؟"

"ابھی تو پہلا راؤنڈ ہے۔"

"تفصیل بتاؤ۔"

"میں نے قدسیہ کو ہدایات دی تھیں بمشکل راضی ہوئی۔"

"کیا کہا تھا تم نے اس سے؟"

"دراصل فاخر کا معاملہ ہوتا تو شاید مذاق میں بھی تیار نہ ہوتی لیکن شکر ہے اس سلسلے میں عازم صاحب منظر عام پر آئے چنانچہ بات بن گئی۔ میں نے بڑی ترکیب سے اُن دونوں بھائیوں کے بارے میں اس سے گفتگو کی تھی۔ میں نے کہا قدسیہ ان لوگوں کو بے وقوف بنانا چاہیئے یہ خود کو بہت چرب زبان اور چالاک سمجھتے ہیں۔"

"ٹھیک... اچھی ابتدا کی۔"

"میں نے اس سے تھوڑا سا جھوٹ بھی بولا تھا۔"

"ہائے تو اس طرح شرما شرما کر کیوں بتا رہے ہو سرفراز بلبلے مجھل کی طرح بات کرو۔"

"میں نے اس سے کہا کہ شاید شاید عازم مجھے اپنا رقیب سمجھتا ہے۔ وہ مجھ سے طنزیہ گفتگو کرتا رہتا ہے۔ اس کے دل میں غلط فہمی ہے کہ شاید وہ تمہیں متاثر کرے گا۔"

"جیتے رہو سرفراز... پھر کیا ہوا؟"

"قدسیہ گڑبڑ گئی۔ لیکن میں نے اُسے ٹھنڈا کر لیا۔ میں نے اس سے کہا کہ عازم کو سبق ملنا چاہیئے۔ اور وہ اس طرح کہ ابتداً میں تم اُسے احساس دلا دو کہ تم اس کی طرف راغب ہو اور پھر کسی خاص مرحلے پر آ کر اس کا دماغ درست کر دو۔"

"ویری گڈ... وہ تیار ہو گئی؟"

"جی ہاں...!"

"پھر اس کے بعد بات کچھ اور آگے بڑھی؟"

"جی... عازم صاحب فن مصوری سے متعلق چند کتابیں لے کر اس کے پاس پہنچے اور اُسے تحفتاً یہ کتابیں پیش کر دیں۔ قدسیہ نے کتابیں تو قبول کر لیں۔ لیکن اُن سے عدم دلچسپی کا اظہار کیا۔ اس نے عازم صاحب کا امتحان لیا اور اس سے اپنی تصویروں کی تشریح چاہی۔"

"اللہ اکبر... بہت برا وقت آ پڑا ہو گا بے چارے پر جن تصویروں کی تشریح اس کائنات میں موجود کسی فرد کے بس کی بات نہیں ہے۔ ان کے ذریعے عازم کا امتحان لے ڈالا گیا۔ نتیجہ کیا نکلا عزیزم...؟" ناہر نے کہا۔

سرفراز بے اختیار ہنس پڑا تھا۔ پھر اس نے کہا۔ "عازم میاں نے وہی سب کچھ کہا جس کی توقع تھی اور اطمینان سے اپنے امتحان میں فیل ہو گئے۔"

"ہائے افسوس۔ پھر تو اُسے اپنی گری ہوئی ساکھ نبھانے میں بڑی دقت پیش آئی ہو گی۔"

"ہاں... لیکن ڈھیٹ انسان تھا۔ رات کو باغ میں ملاقات کی پیش کش کر ڈالی۔"

"قدسیہ کو...؟"

"جی ہاں۔"

"اس نے منع کر دیا؟" ناہر چیخ کر بولا۔

"نہیں... لیکن دوسرے دن پر ٹال دیا تاکہ مجھ سے مشورہ کر سکے۔" سرفراز نے جواب دیا۔

"بہت اچھے، عمدہ جا رہے ہو سرفراز، اور قدسیہ بھی زندہ باد۔ گویا چانس باقی ہے۔ بھئی بہت عمدہ، لاجواب۔ اس سلسلے میں ایک بہترین پروگرام پیش کیا جا سکتا ہے۔"

"اب جو حکم ہو آپ کی طرف سے؟"

"بس ذرا سی کسر ہے۔ بے چارا فاخر بھی اپنا کام انجام دے لیتا تو دونوں بھائیوں کو ایک ساتھ نمٹا لیا جاتا۔ یوں کرو قدسیہ کو ہدایت دے دو کہ اس سے ملاقات کا آخری وقت مقرر نہ کرے۔"

"یعنی...؟"

"یعنی یہ کہ عازم جیسے نیک نوجوان کو مایوس بھی نہ کرے۔ اور اس سے ملاقات کا وعدہ کرے۔ لیکن حالات کے تحت۔ وہ عازم سے کہہ دے کہ موقع ملنے پر وہ خود اُسے اطلاع دے دے گی کہ کس وقت ملاقات کی جا سکتی ہے۔"

"اوہ، گڈ۔ ٹھیک ہے میرا خیال ہے اس میں قدسیہ کو کوئی دقت نہیں ہوگی۔"

"بس تو یہ پروگرام طے۔"

"بالکل طے۔ اب ذرا میں اپنے اسسٹنٹ زیرو زیرو سیون سے رابطہ قائم کروں اس کی سرگرمیاں کیا کہتی ہیں۔" زاہد نے کہا اور سرفراز ہنستا ہوا چلا گیا۔

جاسوس ڈبل او سیون کی تلاش جاری ہوئی۔ اور اس سے ملاقات بھی ہوگئی۔ وہ بہت پرجوش تھا۔ "ہیلو چیف کمال ہے۔ میں آپ کو آپ کے کمرے میں تلاش کرکے آرہا ہوں۔"

"اور ہم آپ کی تلاش میں تھے زیرو زیرو سیون۔ کہیئے کوئی گرما گرم خبر؟"

"زبردست... ملاحظہ فرمائیے۔" فیصل نے ایک خوبصورت لفافہ جو سینٹ میں ڈوبا ہوا تھا نکال کر زاہد کی طرف بڑھا دیا۔

"یہ کیا ہے ڈبل او سیون؟"

"ایک عظیم الشان خزانے کا فراڈ۔ ایک بہت ہی خفیہ خط۔"

"آپ کو کہاں سے ملا؟"

"ملا نہیں، حاصل کیا گیا ہے۔"

"بھلا وہ کس طرح؟"

"دن کے تین لوقات میں جن میں دو میں آپ بھی شریک تھے مثلاً دوپہر کا کھانا۔"

"دوپہر کے کھانے پر کیا ہوا تھا؟"

"فاخر بھائی بدحواس تھے۔ شاذیہ باجی نے پلاؤ کی ڈش کی طرف ہاتھ بڑھایا تو فاخر بھائی میز پر اوندھے ہوگئے۔ ڈش حالانکہ شاذیہ باجی کے بہت قریب رکھی ہوئی تھی اور فاخر بھائی سے بہت دُور تھی لیکن فاخر بھائی نے خود اُٹھا کر پیش کی۔ پھر جلدی سے رائتے کا ڈونگا بھی پیش کردیا۔ لیکن شاذیہ باجی کبھی پلاؤ میں رائتہ نہیں استعمال کرتیں۔ اس لئے فاخر بھائی کو بڑی شرمندگی اٹھانی پڑی۔ شاذیہ باجی نے چڑ کر پلاؤ بھی نہیں کھایا۔"

"ونڈرفل... تمھاری نِگاہ بہت تیز ہے اسسٹنٹ۔"

"میں نے مکمل نِگاہ رکھی ہے اُن دونوں پر۔ بلکہ آج کل میں فاخر بھائی پر کام کر رہا ہوں۔"

"اور کیا واقعہ ہوا تھا؟"

"شام کی چائے پر، فاخر بھائی نے شاذیہ باجی کے بالکل قریب کی سیٹ پر قبضہ جمانے کی کوشش کی تو شاذیہ باجی اپنی چائے کی پیالی لے کر لان پر چلی گئیں۔"

"کمال ہے۔ ہاں مجھے یاد ہے کہ شاذیہ نے چائے لان پر پی تھی۔ بھئی زندہ باد اسسٹنٹ، تم اپنے چیف کا نام ضرور روشن کرو گے۔ یہ خط کیا تمھیں فاخر نے دیا ہے؟"

"جی نہیں۔ فاخر بھائی اپنے کمرے سے نکلے اور شاذیہ باجی کے کمرے کے سامنے پہنچ گئے۔ شاذیہ باجی چند لمحات میں ہی اپنے کمرے سے نکل کر امی جان کے پاس گئی تھیں۔ اور یہ بات فاخر بھائی کو معلوم تھی۔ میں فاخر بھائی کے پیچھے تھا جب وہ شاذیہ باجی کے کمرے میں داخل ہوئے تو میں ایک طرف چھپ گیا۔ فاخر بھائی نے شاذیہ باجی کی رائٹنگ ٹیبل پر یہ لفافہ رکھا اور اسی طرح واپس نکل آئے۔ میں نے اندازہ لگا لیا کہ یہ لفافہ چیف کے قابلِ توجہ ضرور ہوگا۔ چنانچہ بس جب وہ نکلے تو میں داخل ہوگیا اور پھر یہ لفافہ آپ کے جاسوس کے قبضے میں تھا۔"

"جیتے رہو فیصل میاں۔ گویا لفافہ ابھی شاذیہ باجی کے ہاتھ نہیں لگا۔"

"کیسے لگتا۔ پہلے یہ چیف کی نگاہ سے گزرنا چاہیئے تھا۔"

"بھئی فیصل! آپ کا یہ کارنامہ قابلِ تعریف ہے۔ اس سلسلے میں ہم آپ کو کوئی انعام پیش کرنا چاہتے ہیں۔ فرمایئے کیا خدمت کی جائے آپ کی۔"

"اسٹرابری چاکلیٹ کا ایک.... پیکٹ بڑا والا۔" ڈبل او سیون بے تکلفی سے بولے۔

"کل ٹھیک ایک بجے آپ کو آپ کی طلب کردہ چاکلیٹ کے چار پیکٹ پہنچ جائیں گے۔"

"اوہ۔ تھینک یو چیف! لیکن ایک شرط کے ساتھ۔"

"حکم...؟"

"امی کو اس بارے میں اطلاع نہ ملے۔"

"نہیں ملے گی اسسٹنٹ وعدہ۔ ہم آپ کو تھوڑی دیر کے بعد ایک تکلیف دیں گے۔" زاہد نے کہا۔

"خادم حاضر ہے۔" فیصل نے سینے پر ہاتھ رکھ کر جھکتے ہوئے کہا۔ اور پھر وہ باہر نکل گیا۔ زاہد نے لفافے سے بڑی احتیاط کے ساتھ خط نکال لیا۔ خوشبو میں بسا ہوا پرچہ تھا۔

ابتدا یوں تھی۔

"لو آؤ کہ رازِ پنہاں افشا کئے دیتا ہوں
داماں خاموشی لبریز شکایت کرتا ہوں
گھبرا کر ہجومِ وحشت سے اظہارِ جراُت کرتا ہوں
میں تم سے محبت کرتا ہوں میں تم سے محبت کرتا ہوں

شاذیہ ....!
سُنا ہے ہر انسان کی زندگی میں کچھ سنہرے لمحات ضرور آتے ہیں۔ جوانی نعمتِ خداوندی ہے اور محبت تحفۂ ایزدی۔ یہ بھی سُنا ہے کہ تقدیر دو وجود یکجا کرنے کے لئے انوکھے کھیل کھیلتی ہے۔ سو کیا یہ تقدیر کا کھیل نہیں ہے کہ میں نہ جانے کہاں سے چل کر تمہارے درِ دولت پر پہنچا ہوں۔ شاذیہ میرے وجود کا ذرہ ذرہ تمہارا نام پکار رہا ہے۔ میرے یہ ہر موئے تن میں تمہارا نام بس گیا ہے۔ لیکن میں تمہارے انداز میں کچھ ہچکچاہٹ محسوس کر رہا ہوں۔ شاذیہ محرومِ الفت کو محبت کی بھیک دے دو۔ یہ سائل ابد تک تمہیں دعائیں دیتا رہے گا۔ اگر میری تقدیر کے کنول تمہارے سینے میں کھل اُٹھیں تو رات کو گیارہ بجے پائیں باغ کے فوارے کے پیچھے تمہارے جواب کا انتظار کروں گا۔"

تمہارا فاخر

"اللہ واکبر، اللہ واکبر۔ بھائی فاخر خدا تمہاری مغفرت کرے تم نے ...واپنی موت کو اتنی جلدی آواز دے لی۔ ہائے تمہاری جوانمرگی۔ اس کی امید نہ تھی۔ کوئی بات نہیں۔ ٹھیک گیارہ بجے تمہارے جنازے کو ...اندھا دے دیا جائے گا۔"

فیصل کی فوری طور پر ضرورت پیش آگئی تھی۔ بہت اہم مسئلہ درپیش تھا۔ فیصل نے جس ہوشیاری سے اپنا کام کیا تھا۔ اس نے زاہد کو اعتماد بخشا تھا۔ وہ ایک اور کام اس کے سپرد ...کرنا چاہتا تھا۔

"ہیلو چیف! خادم کو طلب کیا تھا۔ ابھی شبراتی نے بتایا تھا۔"
"زیرو زیرو سیون، حالات کچھ ہنگامی ہو گئے ہیں۔" ...زاہد بولا۔
"ڈشوں ڈشوں کا موقع آگیا ہے کیا؟"
"ایسا ہی لگتا ہے۔"
"فکر نہ کریں چیف! میرے پاس اسٹین گن بھی موجود ہے اور ...ھرے والی بندوق بھی۔" فیصل نے اکڑ کر جواب دیا۔
"او نہیں فیصل! جاسوس صرف ٹھائیں ٹھائیں نہیں کرتے ...نے شرلاک ہومز کے بارے میں پڑھا ہے کبھی؟"

"پڑھا نہیں دیکھا بھی ہے۔"
"کہاں دیکھا ہے؟"
"ٹیلی ویژن پر۔"
"تو پھر تم نے یہ بھی دیکھا ہو گا کہ شرلاک ہومز ہر ایک سے مار پیٹ نہیں شروع کر دیتا۔ وہ زیادہ تر ذہنی ورزش کرتا ہے۔"
"ذہنی ورزش کیا ہوتی ہے؟"
"جو تم کر رہے ہو۔"
"او گڈ! تو اب مجھے کیا کرنا ہے چیف؟"
"یہ خط واپس اسی جگہ پہنچانا ہے جہاں سے تم لائے ہو۔" زاہد نے جواب دیا۔
"او کے! آپ کا یہ کام ہو جائے گا۔"
"ہو جائے گا نہیں بلکہ فوراً ہو جانا چاہئے!"
"خط کہاں ہے؟"
"یہ موجود ہے لیکن کسی کو کانوں کان خبر نہ ہونے پائے اور خود شازیہ کو بھی نہیں۔"
"شازی باجی شاپنگ کے لئے گئی ہوئی ہیں۔ ابھی تو وہ موجود بھی نہیں ہیں۔"
"بس تو یہ اور بھی عمدہ موقع ہے۔ ہوا ہو جاؤ۔" زاہد نے خط فیصل کے حوالے کر دیا اور وہ سلوٹ مار کر باہر نکل گیا۔ زاہد کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ فیصل کے جانے کے دس منٹ کے بعد وہ خود بھی اندرونی عمارت میں داخل ہو گیا۔ فیصل نظر آگیا تھا۔
"کام ہو گیا ہے۔" اس نے سرگوشی میں اطلاع دی اور زاہد نے مسکرا کر گردن ہلا دی۔ پھر وہ قدسیہ کے نگار خانے میں داخل ہو گیا۔ قدسیہ وہاں موجود تھی۔
"ہیلو قدسیہ!"
"آیئے۔" قدسیہ نے بیزاری سے کہا تو زاہد اس کے قریب پہنچ گیا۔
"میرا آنا پسند نہیں آیا قدسیہ؟ ضرور کسی خاص کام میں مصروف ہو گی۔"
"بور نہ کریں زاہد بھائی۔ میں پریشان ہوں۔"
"کیوں؟ خیریت؟"
"ڈیڈی اس گھر کا سکون چھین لینا چاہتے ہیں۔"
"میں پھر پوچھوں گا خیریت؟"
"یہ دو گدھے جو عذاب بنا کر ہم پر مسلط کر دیئے گئے ہیں عاجز ... مجھ سے باغ میں ملنا چاہتا ہے۔ ایک بار پھر یاد دہانی کرا گیا ہے۔"
"کیوں ملنا چاہتا ہے یہ سوچو قدسیہ۔"
"حالِ دل سُنانے کا خواہشمند ہے۔"

"کمال ہے۔ باغی ہیں؟"

"جی ہاں! میں پوچھتی ہوں زاہد بھائی! کیا ڈیڈی کی آنکھوں پہ پٹی بندھی ہوئی ہے۔ ہر طرح کے لفنگوں کو گھر میں لے آنا اچھی بات ہے؟ وہ خود نہیں سوچتے۔"

"بھئی یہ حالِ دل کیا چیز ہے جو اتنی رازداری سے سُنایا جاتا ہے۔ اس پر تمھاری کچھ ریسرچ ہے قدسیہ؟"

"آپ بھی بور کریں گے زاہد بھائی؟"

"نہیں... نہیں آج تک کیا ہے۔ مجھ سے مشورہ کیوں نہیں مانگا تم نے؟" زاہد گہری سانس لے کر بولا

"تو دیکھئے نا زاہد بھائی پریشان کیوں کرتے ہیں...؟" قدسیہ بُری طرح بے زار نظر آرہی تھی۔

"ڈیئر قدسیہ ان چھوٹی چھوٹی باتوں سے ذہن پراگندہ کیوں کرتی ہو۔ اس قسم کے لوگ تو سڑکوں پر لاتعداد بکھرے ہوئے نظر آتے ہیں۔ بعض اوقات یہ سڑکوں سے اُٹھ کر ہم میں بھی آشامل ہوتے ہیں تو کیا ہم ان کی وجہ سے اتنے پریشان ہو جائیں کہ ہمارا چہرہ ہی بگڑ جائے؟"

"میں ان باتوں کی عادی نہیں ہوں زاہد بھائی۔ یہ میری توہین ہے۔ یہ بے عزتی ہے میری کہ ٹکے ٹکے کے لوگ مجھ سے اس قسم کی باتیں کرنے لگیں۔ میں... میں یہ باتیں بالکل برداشت نہیں کرسکتی۔"

"تو ٹھیک ہے بھئی! ان ٹکے ٹکے کے لوگوں کو ٹھیک کر دیا جائے گا۔ کم از کم زاہد سے تو اس انداز میں بات نہ کرو۔"

"سوری زاہد بھائی! اگر آپ کو میرا بولنا ناگوار گزر رہا ہے تو اس وقت مجھے معاف کردیں۔ میں بُری طرح اپ سیٹ ہوگئی ہوں۔"

"دیکھو! عازم نے جو بدتمیزی کی ہے۔ اس کی اسے بڑی آسانی سے سزا دی جاسکتی ہے۔ یہ دونوں شجاع احمد صاحب کے مُنہ چڑھے ہیں۔ اگر تم براہِ راست ان سے کچھ کہو گی تو ممکن ہے وہ پوری طرح تم سے متفق نہ ہوسکیں۔ اگر انھوں نے عازم کو ڈانٹ ڈپٹ کر بھی دی تب بھی یہ تمھاری توہین کا انتقام تو نہ ہُوا۔ تم یوں کرو کہ دادا جان کے پاس چلی جاؤ۔ بڑے سادہ سے لہجے میں ان سے سوال کرنا کہ دادا جان! یہ حالِ دل کیا ہوتا ہے اور اس کے بعد انھیں سادگی ہی سے عازم کی ساری باتیں بتا دینا۔ میرے خیال میں اس سے عمدہ اور کوئی طریقہ نہیں ہوگا۔ ان سارے کاموں سے فارغ ہو کر تھوڑی سی رپورٹ مجھے بھی دے دینا۔ میں آج گھر پر ہی ہوں۔ کہیں باہر جانے کا ارادہ نہیں رکھتا۔ دادا جان اگر کوئی اطمینان بخش بات کہیں تو ٹھیک ہے اور اگر ان سے بات نہ بنے تو پھر اس سلسلے میں ہم کوئی اور ٹھوس قدم اُٹھائیں گے۔ بس تم مطمئن ہو جاؤ۔ جب زاہد نے تم سے وعدہ کر لیا کہ عازم کو اس کی ان حرکتوں کی بھرپور سزا ملے گی تو سمجھ لو گی ٹھیک ہے۔"

"ٹھیک ہے مگر مجھے بہت غصہ آرہا ہے۔"

"بھئی غصہ سارے کام خراب کر دیتا ہے۔ ہمیں ایسے لوگوں کی گوشمالی کے لئے ذہانت سے کام کرنا ہوگا۔"

"تو پھر میں جارہی ہوں دادا جان کے پاس..." قدسیہ نے کہا۔

"اوہو... ابھی نہیں۔ اب سے ٹھیک دو گھنٹے کے بعد۔ ہاں قدسیہ جو کچھ میں نے کہا ہے اسی طرح عمل کرو۔ اگر میری مانتی ہو تو... ورنہ پھر جیسی تمھاری مرضی۔"

"نہیں... نہیں میں نے آپ کی بات سے کبھی انحراف کیا ہے۔" قدسیہ نے کہا۔

"تو پھر ٹھیک دو گھنٹے کے بعد۔ اوکے۔"

"اوکے۔" قدسیہ نے مطمئن انداز میں گردن ہلا دی۔

"اچھا چھوڑو بھئی۔ اب یہ بتاؤ تمھاری ان تصاویر کا کیا حال ہے؟"

"دیکھ لیجئے آپ۔ سب کی سب تیار ہیں۔ وہ فاخر بھی احمق یہاں آیا تھا۔ تصاویر کے بارے میں پوچھ رہا تھا۔ میں نے وہ کھنچائی کی کہ طبیعت ہری ہوگئی بچو جی کی۔"

"ہاں! مجھے یہ واقعہ معلوم ہے۔ بتا چکی ہو تم۔"

"پتہ نہیں ڈیڈی کو بھی کیا سوجھتی ہے۔ دوست کے بیٹے تھے تو کہیں باہر رکھوا دیتے۔ انھیں گھر میں ہی لا گھسیڑنے کی کیا ضرورت تھی۔ اور پھر ایسے چھچھورے لوگ توبہ... توبہ...؟"

"بہرصورت شجاع احمد صاحب کا معاملہ ہے۔ وہ اتنی قدرت رکھتے ہیں کہ کسی گدھے کو بھی یہاں لا کر باندھ دیں۔ اب ان گدھوں کو بھگانا تو ہمارا ہی کام ہے نا۔ تو ہم تصویروں کی بات کر رہے تھے۔ کتنی تصاویر باقی رہ گئی ہیں تمھاری نمائش میں پیش کرنے کے لئے؟"

"سرفراز صاحب کا کہنا تو یہ ہے کہ یہ تصاویر کافی ہیں۔" قدسیہ نے جواب دیا۔

"گویا نمائش کی تیاریاں تقریباً مکمل ہیں۔"

"جی ہاں! لیکن زاہد بھائی پھر سوچ لیں۔ یہ نمائش مناسب رہے گی یا نہیں؟"

"نامناسب رہنے کی کیا بات ہے بھئی۔" زاہد نے غصیلے انداز میں آنکھیں نکالیں اور قدسیہ ہنسنے لگی۔

"آپ مطمئن ہیں میری ان تصاویر سے؟"

"کمال کی بات ہے بھئی۔ ہم نے تمھیں کوئی معمولی اُستاد تھوڑا ہی دیا ہے۔ جس شخص نے اس سلسلے میں تمھاری رہنمائی کی ہے... کیا ہے یہ زاہد جانتا ہے، اور جب وہ تمھاری طرف سے مطمئن تو زاہد میاں کس کھیت کی مولی۔ سرفراز کا کہنا ہے کہ تم نے دُنیا کی

ترین تخلیقات جنم دی ہیں۔ یہ تخلیقات اودھم مچا دیں گی دیکھنا توسہی۔"

"تو پھر کب کرا رہے ہیں یہ نمائش۔ میں اس مرحلے سے جلد گزر جانا چاہتی ہوں۔"

"بہت جلد! میرا خیال ہے میرا دوسرا پروجیکٹ یہی ہوگا۔" زاہد نے جواب دیا۔

"میں تو اس دن کا بڑے خوف اور بے چینی کے ساتھ انتظار کر رہی ہوں۔"

"بے چینی میں کوئی حرج نہیں لیکن خوف کو ذہن کے کسی کونے میں جگہ نہ دو۔ تمھیں پورے اعتماد کے ساتھ دیکھنے والوں اور ناقدین سے گفتگو کرنا ہے۔"

"تم... مجھے...؟" قدسیہ گھبرائے ہوئے لہجے میں بولی۔

"میں بھی ہوں گا تمھارے ساتھ۔ تم اس موقعے پر مجھے اپنا سیکریٹری بنا سکتی ہو۔"

"توبہ... توبہ! میں ایسی گندی بات کبھی زبان سے نکال سکتی ہوں۔ سرفراز صاحب بھی ذرا کم گو ہیں۔ میرا خیال ہے حاضر جوابی سے گریز کریں گے۔ آپ ہی اس سارے مسئلے کو سنبھالیں۔ زاہد بھائی میں تو بڑی نروس ہو رہی ہوں۔"

"تیسری بار اگر تم نے یہ جملہ کہا تو میں تم سے ناراض ہو جاؤں گا۔ نروس وہ ہو جسے کچھ آتا نہ ہو۔ تم ایک بار نمائش ہو جانے دو۔ اس کے بعد دیکھنا کہ زاہد نے تم سے کیا کہا تھا۔"

"اللہ مالک ہے۔" قدسیہ ٹھنڈی سانس لے کر بولی۔

"اچھا بھئی اب ہم چلتے ہیں۔ یہ شازیہ کیا خریدنے چلی گئی۔"

"پتہ نہیں شاید ٹیلر ماسٹر کے ہاں گئی تھی۔ کچھ اور چیزیں بھی لانی تھیں آ گئی ہوگی اب تو۔" قدسیہ نے کہا اور زاہد اس سے اجازت لے کر کمرے سے باہر نکل آیا۔ شازیہ کو مس نہیں کرنا تھا۔ وہ تو اسی وقت ایک عمدہ پروگرام پیش کرنے والی تھی۔ باہر نکلا تو شازیہ کے کمرے میں روشنی نظر آ رہی تھی۔

ایک ملازمہ سے معلوم کیا تو پتہ چلا کہ شازیہ واپس آ چکی ہے چنانچہ زاہد آس پاس ہی چہل قدمی کرنے لگا۔ وہ شازیہ کا ردِعمل دیکھنا چاہتا تھا اور یہ ردِعمل جلد ہی ظاہر ہو گیا۔ زیادہ دیر نہیں گزری تھی اور اس وقت وہ سامنے والی راہداری سے آ رہا تھا کہ اس نے شازیہ کے کمرے کا دروازہ دھڑاک سے کھلنے کی آواز سنی اور اچھل پڑا۔ شازیہ غصے میں آگ بگولا ہاتھ میں چپل تھامے باہر نکلی تھی اس کی آنکھیں گہری سرخ ہو رہی تھیں۔

ایک ہاتھ میں خط دبا ہوا تھا۔ دوسرے ہاتھ میں چپل تھی۔ زاہد دوڑتا ہوا اس کے قریب پہنچ گیا۔

"ارے، ارے! یہ کیا؟ یہ کیا بھئی؟ یہ چپل تم نے پاؤں کی بجائے ہاتھ میں کیوں پہن لی؟" اس نے غور سے شازیہ کی صورت دیکھتے ہوئے کہا۔

"ہٹ جائیے زاہد بھائی، ہٹ جائیے راستے سے، ہٹ جائیے ورنہ اچھا نہیں ہوگا۔"

"ارے... ارے ارے کیا تم اس چپل سے مجھے پیٹ ڈالو گی؟"

"پلیز زاہد بھائی ایسی باتیں نہ کیجیے۔ ہٹ جائیے میرے سامنے سے۔" شازیہ غرائی۔

"شازیہ... شازیہ کیا ہوا ہے۔ مجھے بھی نہیں بتاؤ گی؟"

"سر گنجی کر دوں گی اس کمبخت کا۔ کیا سمجھا ہے اس نے مجھے۔ فاحشہ ہیں ہم لوگ، اتنی کمینی ہیں۔ ایسی بازاری ہیں کہ جس کا جو دل چاہے کہہ ڈالے۔ کیا سمجھتا ہے خود کو یہ مردود۔ میں مار مار کر اس کی شکل بگاڑ دوں گی۔"

"ارے۔ ارے ارے ارے کس کی بات کر رہی ہو۔ قانون ہاتھ میں نہ لو۔"

"یہ قانون نہیں زاہد بھائی۔ جوتی ہے جوتی جس سے میں اس کی شکل بگاڑ دوں گی۔"

"مگر وہ خوش نصیب ہے کون جس کی شکل تمھاری اس خوبصورت چپل سے بگڑے گی۔"

"دیکھیے میرا غصہ ٹھنڈا نہ کیجیے۔ ایسا نہیں ہوگا زاہد بھائی اس وقت مجھے جانے دیجیے۔ آئندہ آپ جو کچھ بھی کہیں گے مان لوں گی۔"

"واپس کمرے میں چلو شازیہ۔" زاہد نے سرد لہجے میں کہا اور شازیہ تنک کر کھڑی ہو گئی۔

"اس وقت آپ کی بات میں نہیں مانوں گی، بس نہیں مانوں گی!"

"تمھاری مرضی ہے نہ مانو۔ جس گھر میں تمام لوگ میری عزت کرتے ہوں، سب مجھے پیار سے پکارتے ہوں، سب مجھے اپنا ساتھی اور سہارا سمجھتے ہوں۔ تم نے اگر یہ بے اعتنائی برتی تو پھر میں یہ گھر چھوڑ دوں گا۔"

"زاہد بھائی مان جائیے! دیکھیے اگر میرا غصہ ٹھنڈا ہو گیا تو میں کچھ نہیں کر سکوں گی۔"

"تم فکر نہ کرو۔ میں تمھارے غصے کو پھر سے گرم کر دوں گا مگر کمرے میں تو آؤ۔" زاہد نے شازیہ کا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا اور وہ اسی طرح چپل اور خط ہاتھ میں پکڑے اندر آ گئی۔

"اب بتاؤ کیا بات ہے؟"

"کچھ نہیں بتاؤں گی بس میرا غصہ ٹھنڈا مت کیجئے!"

"نہیں ٹھنڈا ہونے دوں گا بھئی! کمال کی آدمی ہو تمھارا غصہ ہے کہ جائے۔ ذرا سی دیر میں گرم ہوگئی، ذرا سی دیر میں ٹھنڈی ہوگئی۔ مجھے بات تو بتاؤ۔ میں دیکھوں تو سہی کہ غصہ کس بات پر آیا ہے۔"

"تو پھر لیجئے۔ دیکھ لیجئے۔۔" شازیہ نے خط زاہد کے ہاتھ میں تھما دیا۔

"یہ کیا ہے؟"

"محبت نامہ! فاخر صاحب کا محبت نامہ پڑھیئے۔ پڑھیئے ذرا اسے پڑھیئے" شازیہ نے کہا اور زاہد پرچہ پڑھنے لگا۔ اس نے اپنے چہرے سے ایسے تاثرات کا اظہار کیا جیسے پرچہ پہلی بار اس کے سامنے آیا ہو۔ پھر اس نے اس پر غصے کا اظہار بھی کیا تھا اور وہ دانت پیس کر بولا۔

"اس فاخر بدمعاش کی یہ مجال! کیا سمجھا ہے اس نے ہماری شازیہ کو؟"

"بس۔۔۔ بس مجھے جانے دیجئے۔ مجھے جانے دیجئے" شازیہ نے جھک کر پھر جوتی اٹھالی لیکن زاہد نے جلدی سے اس کا ہاتھ پکڑ لیا تھا۔

"ارے۔۔۔ ارے اس جوتے پر کیوں غصہ اتار رہی ہو۔ قصور فاخر نے کیا ہے۔ یہ بدنصیب جوتا کیوں بیچ میں آرہا ہے بار بار۔"

"اسی سے ماروں گی اسے۔ اسی سے ماروں گی۔"

"نہیں بھئی مار دھاڑ اچھی چیز نہیں ہوتی۔ جب ہم موجود ہیں تمھیں مشورہ دینے کے لئے تو پھر تم کیوں بھلا قانون ہاتھ میں لیتی ہو نہیں شازیہ۔ کچھ بھی ہے وہ شجاع احمد صاحب کے دوست کے بیٹے ہیں اور شجاع احمد صاحب بڑے احترام سے انھیں گھر لائے ہیں تم سوچو تو سہی اگر تم اسے جوتی سے پیٹ دوگی تو شجاع احمد صاحب پر کیا گزرے گی۔ اگر تم اسے مار بیٹھیں اور اس کے بعد یہ خط شجاع احمد کو ملا تو وہ صاف کہہ دیں گے کہ تم اس سلسلے میں جو کچھ کرسکتی تھیں کرچکی ہو۔ اب اس سلسلے میں وہ کیا کریں۔"

"تو پھر بتلائیے۔ میں کیا کروں؟" شازیہ غصیلے لہجے میں بولی۔

"ہاں۔۔۔ ہاں۔۔۔ ہاں یہ ہوئی نہ بات مشورہ لینے والی بھئی بلا فیس کا وکیل تمھارے پاس موجود ہے۔ مشورے دیتا رہا ہے دیتا رہے گا تو پھر پریشانی کیوں۔ شازیہ بیگم! شجاع احمد صاحب انھیں یہاں لائے ہیں نا تو میرا خیال ہے یہ خط بڑے اطمینان سے آپ شجاع احمد صاحب کو دیجئے۔ وہ مناسب فیصلہ کرلیں گے اس بارے میں اور اگر وہ فیصلہ ہماری مرضی کے مطابق نہ ہوا تو پھر ہم دیکھ لیں گے ان فاخر صاحب کو لیکن تم کسی غصے کا اظہار نہیں کرو گی شازیہ۔ ورنہ معاملہ بگڑ جائے جائے گا۔"

"کیا مطلب، کیا معاملہ بگڑ جائے گا؟"

"بھئی فاخر صاحب کو تم نے ان کے کمرے میں جاکر پیٹنا شروع کردیا تو لوگ کیا سمجھیں گے کہ انھوں نے کیا کیا۔ مزہ تو یہ ہے کہ ان کی پٹائی سب کے سامنے ہو۔ تمام اہل خاندان جمع ہوں۔ تب ذرا لطف بھی آئیگا۔"

"آپ یقین کریں زاہد بھائی میں ایسا کر بھی سکتی ہوں۔"

"کون نہیں جانتا اس بات کو۔ بھئی مجھے یقین ہے کہ تم جیسی بہادر لڑکی اور اسے کوئی ایسا خط لکھ دے۔ ناممکن شازیہ ناممکن تمھارا غصہ حق بجانب ہے اور سنو۔ اپنا غصہ ٹھنڈا مت ہونے دینا۔ اگر تمھارا غصہ ٹھنڈا ہوگیا تو میں سمجھوں گا کہ تم ایک بزدل لڑکی ہو اور پھر فاخر ہی کیا گلی کے تمام لڑکے تمھیں خط لکھنے لگیں گے کیا حیثیت رہ جائے گی تمھاری اگر تم نے فاخر کو معاف کردیا لیکن زاہد کے کہنے کے مطابق ذرا شجاع احمد صاحب کا ردعمل دیکھ لو اگر وہ تمھاری توقع پر پورے نہیں اترتے تو پھر یہ سارے کام ہم سب مل جل کر نمٹالیں گے۔ ہاں: ٹھیک ہے بھئی مانوگی میری بات۔"

"زاہد بھائی!"

"ہاں بھئی ایسی کوئی بات تھوڑا ہی کہہ رہا ہوں کہ تم اس کے ساتھ کچھ مت کرو۔ تم یہ خط شجاع احمد صاحب کے پاس پہنچادو۔ ان سے بات کرو اس موضوع پر کہ تمھیں کیا کرنا چاہیئے اور وہ تمھیں جو بھی مشورہ دیں وہ اس خادم کو بتادینا۔ اس سے پہلے کہیں یہ نہ کہہ دینا کہ زاہد سے مل کر آئی ہوں۔ ورنہ یقین کرو اس خط کی پوری ذمے داری میرے ہی اوپر آپڑے گی۔"

"کیسے آپڑے گی۔ ہم کیا مرگئے ہیں۔ اس گھر میں کون ہے جو زاہد بھائی پر انگلی بھی اٹھاسکے۔"

"بس تمھاری محبت ہے شازیہ جاؤ شاباش یہ کام کرو شجاع احمد صاحب شاید گھر میں موجود ہیں۔ باہر ان کی گاڑی تو کھڑی ہوئی ہے۔"

"جی ہاں! ڈیڈی موجود ہیں میں جاتی ہوں" شازیہ نے کہا اور غصے میں بھری ہوئی باہر نکل گئی۔ زاہد بھی تیزی سے اس کے پیچھے تک باہر آیا تھا۔ اسے خدشہ تھا کہ کہیں راستے میں فاخر نہ ٹکرا جائے۔ اگر فاخر کسی طرح اس کے سامنے آگیا تو سارا معاملہ گڑبڑ ہوجائے گا لیکن شکر تھا شجاع احمد صاحب کے کمرے میں داخل ہوتے تک فاخر سے شازیہ کی مڈبھیڑ نہیں ہوئی تھی جب زاہد نے شازیہ کو شجاع احمد صاحب کے کمرے کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوتے دیکھا تو اس نے سکون کی ایک گہری سانس لی تھی۔

اس دلچسپ داستان کے اگلے واقعات دوسرے (آخری) حصہ میں ملاحظہ فرمائیں

"اسسٹنٹ" زاہد نے فیصل کو آواز دی اور فیصل اٹینشن ہو گیا۔

"یس چیف!"

"بھئی کام سے گھبراتے تو نہیں ہو؟"

"جاسوسی کاموں سے کون گھبرا سکتا ہے۔ چیف فرمائیے کوئی نئی ذمے داری سونپنا چاہتے ہیں مجھے؟" فیصل نے سوال کیا۔

"ہاں! پے درپے واقعات پیش آ رہے ہیں۔ مجرم دندناتے پھر رہے ہیں اور جاسوس اس کے پیچھے لگے ہوئے ہیں اور جب تک جاسوس مجرموں کو کیفرِ کردار تک نہیں پہنچا دیں گے چین سے نہیں بیٹھیں گے آپ کا کیا خیال ہے؟"

"بیٹھنا بھی نہیں چاہیئے۔ فرمایئے کیا خاص بات ہے؟"

"یہ کیسٹ میں آپ کے حوالے کرنا چاہتا ہوں" زاہد نے جیب سے ننھا سا کیسٹ نکال کر فیصل کی طرف بڑھا دیا۔

"اوکے! مجھے اس کیسٹ کا کیا کرنا ہوگا؟"

"اب جو کام تمھارے سپرد کیا جا رہا ہے فیصل وہ بڑا اہم کام ہے یوں سمجھو لو کہ تمھاری اب تک کی کارکردگی میں سب سے زیادہ اہم کام جس میں تمھیں نہایت ذہانت اور چالاکی سے اپنی ڈیوٹی انجام دینی ہے۔"

"آپ اپنا اسسٹنٹ کو مستعد پائیں گے۔"

"مجھے یقین ہے بھئی۔ اس کا ثبوت تو تم دے چکے ہو۔ دادا جان سے کیسے تعلقات چل رہے ہیں آجکل؟"

"دادا جان کے اور ہمارے تعلقات ہمیشہ بہتر رہتے ہیں۔ دادا جان بھی تو جاسوسی ناول اتنے پڑھتے ہیں کہ بس کیا بتاؤں اور پھر کہانیاں بھی سُناتے ہیں مجھے اور شازیہ کو ایسی ایسی سنسنی خیز کہانیاں کہ رونگٹے کھڑے ہو جائیں۔"

"بس تو تم بھی دادا جان کو اپنے اس جاسوسی کارنامے سے مطلع کر دو لیکن میری ہدایت کے مطابق۔"

"کون سے جاسوسی کارنامے سے؟" فیصل نے سوال کیا۔

"تم یوں کرو۔ یہ کیسٹ لگا لو ٹیپ ریکارڈر میں۔"

"ابھی لگا لیتا ہوں۔ ٹیپ ریکارڈر اندر رکھا ہوا ہے۔"

"ٹھیک ہے۔ پہلے میری پوری ہدایت سُن لو۔ یہ کیسٹ ریوائنڈ کر لو اور ٹیپ ریکارڈر کو لے کر دادا جان کے پاس پہنچ جاؤ۔ فوری طور پر یہ کام کرنا ہے تمھیں۔ دادا جان تم سے تمھارے آنے کی وجہ پوچھیں گے۔ تم دادا جان کو اپنی خدمات پیش کر دینا تم ان سے کہنا کہ تم جاسوسی کے نہایت اہم کارنامے انجام دے سکتے ہو لوگوں کی گفتگو ریکارڈ کر سکتے ہو اور انھیں سُنا سکتے ہو ایسی ہی بہت سی باتیں۔ پھر دادا جان کو اپنا یہ کارنامہ سُنا دینا انھیں دکھانا کہ کس طرح تم نے دو خطرناک آدمیوں کی گفتگو ٹیپ کی ہے۔ تفصیل انھیں مت بتانا۔ بس یہ بتانا کہ تم کھیلتے ہوئے وہاں جا نکلے تھے۔ وہ لوگ باتیں کر رہے تھے اور تم نے ان کی گفتگو ریکارڈ کر لی۔ دادا جان سے کہنا کہ پورا سُنیں۔ پورا کیسٹ سُنائے بغیر نہ چھوڑنا انھیں" زاہد نے کہا اور فیصل نے گردن ہلا دی۔

"آپ مطمئن رہیں۔ یہ ساری گفتگو سُنا دی جائے گی، لیکن کیا وہ گفتگو بھی جو ڈیڈی جان اور ان لوگوں کے درمیان ہوئی ہے؟"

"نہیں نہیں بھئی۔ وہ گفتگو میں نے اس میں سے نکال دی ہے۔ صرف وہ باتیں جو کہ فاخرہ اور عازم کے درمیان ہوئی ہیں اس میں موجود ہیں۔"

"اوہ۔ لیکن ڈیڈی کی گفتگو میرا مطلب ہے اس کی ضرورت نہیں ہے؟"

"نہیں۔ . نہیں ابھی نہیں۔ بس تم اتنا کام کر دو۔ وہ گفتگو ویسے میں نے دوسرے کیسٹ پہ ریکارڈ کر لی ہے۔ اگر ہمیں اس کی ضرورت پیش آئی تو وہ میں تمھیں دے سکتا ہوں۔"

"ٹھیک ہے۔ ٹھیک ہے۔ ان معاملات کو آپ بہتر سمجھ سکتے ہیں۔ میں اپنی ڈیوٹی انجام دینے جا رہا ہوں۔"

"بالکل۔ اپنی یہ ڈیوٹی انجام دو اور اس کے بعد میں تمھاری رپورٹ کا منتظر رہوں گا۔"

"او۔ کے" یہ فیصل نے جواب دیا اور اپنے کمرے کی طرف چل پڑا۔ تھوڑی دیر کے بعد زاہد اسے دادا جان کے کمرے میں داخل ہوتے دیکھ رہا تھا۔ سارے کام اطمینان بخش طور پر ہو رہے تھے۔ اب یہ ان کی بدقسمتی ہی تھی۔ . . کہ اتنی جلدی ان کے لئے موت کا پیغام آ گیا ورنہ اگر اتنی سرگرمیاں نہ دکھاتے یہ لوگ تو زاہد انکو کچھ دن اور برقرار رہنے دے سکتا تھا۔

لیکن سارے ہی خاکے بند ہو گئے تھے۔ جو پروگرام ان لوگوں کے ذہن میں پرورش پا رہا تھا اس کے تحت انھیں یہاں نہیں رہنا چاہیے شجاع احمد صاحب کو زاہد کے ہاتھوں ایک اور بدترین شکست ہو رہی تھی۔

●

شازیہ شجاع احمد صاحب کے کمرے میں داخل ہو گئی۔ شجاع احمد صاحب کچھ کام کر رہے تھے۔ ان کے سامنے جدید ڈیزائن کا کیلکولیٹر رکھا ہوا تھا اور وہ کسی حساب کتاب میں مصروف تھے۔ شازیہ کو دیکھ کر وہ ہلکے ہلکے انداز میں مسکرائے اور انھوں نے اپنا کام ایک جانب سرکا دیا۔ پھر برابر رکھے ہوئے تمباکو کے پاؤچ سے تھوڑا سا تمباکو نکالا اور پائپ میں جمانے لگے۔ شازیہ ان کے نزدیک جا کھڑی ہوئی تھی۔ شجاع احمد صاحب نے مسکراتی نگاہوں سے اسے دیکھا اور بولے۔

"آؤ بھئی! شازیہ بیٹے! یقیناً کوئی اہم ہی مسئلہ ہوگا جو تم نے ہمیں یہ عزت بخشی۔ ورنہ ہم کہاں اور ہمارے بیٹے کہاں بھلا کون آتا ہے اس بوڑھے باپ کے پاس؟"

"ڈیڈی! آپ کے لئے ایک تحفہ لائی ہوں۔"

"اچھا! بیٹھو بیٹھو۔ کیا تحفہ خریدا ہے۔ ہمارے بیٹے نے ہمارے لئے" شجاع احمد صاحب پیار بھرے انداز میں بولے۔ شازیہ کو وہ کافی چاہتے تھے چھوٹی لڑکی تھی اور پھر لڑکیوں سے انھیں پیار بھی کچھ زیادہ ہی تھا۔ انھوں نے پائپ دانتوں میں دبایا اور اسے لائٹر سے سلگانے لگے۔ شازیہ نے خط ان کے سامنے رکھ دیا تھا۔

"یہ تحفہ ہے۔ کیا ہے اس میں پرائز بانڈ یا کوئی اور چیز ہے؟"

"آپ خود دیکھ لیجئے ڈیڈی میرا خیال ہے آپ اس تحفے کو دیکھ کر بہت خوش ہوں گے۔"

"اچھا اچھا بھئی! لاؤ ذرا دیکھیں۔" شجاع احمد صاحب نے کہا اور لفافہ کھول کر اس میں سے پرچہ نکال لیا پھر وہ پرچہ پڑھنے لگے چند ہی لمحوں میں پائپ انھیں ہاتھوں میں سنبھالنا پڑا۔ ورنہ وہ ان کے منہ سے گر جاتا۔ وہ پورے پرچے کو بار بار پڑھ رہے تھے۔ لمبی تحریر نہیں تھی لیکن وہ کافی دیر تک اسے سامنے رکھے بیٹھے رہے۔ ان کی آنکھوں میں گہری سرخی چھا گئی تھی۔ پھر پائپ انھوں نے نیچے رکھ دیا، اور شازیہ کو گھورنے لگے۔

"یہ کیا ہے؟"

"کیا آپ کو پڑھنا نہیں آتا ڈیڈی" شازیہ بپھرے ہوئے لہجے میں بولی۔

"کس نے دیا ہے تمھیں یہ پرچہ؟"

"میرے کمرے میں میری میز پر رکھا ہوا تھا۔"

"کیا مطلب! اس نے خود تمھیں نہیں دیا؟"

"میں تو شاپنگ کے لئے گئی ہوئی تھی۔ واپس آئی تو اس پرچے پر نگاہ پڑی۔ یہ میری میز پر رکھا ہوا تھا۔"

"لیکن یہ فاخرہ ہی کا ہے۔ تمھیں یقین ہے۔ . .؟"

"یہ یقین آپ کریں گے ڈیڈی۔ یہ میری ڈیوٹی نہیں ہے اگر آپ حکم دیں تو میں رات کو اس سے ملنے چلی جاؤں۔" شازیہ نے خوانخوار لہجے میں کہا اور شجاع احمد صاحب کی تیوریاں چڑھ گئیں۔

"کیا بکواس کر رہی ہو تم؟"

"بکواس میں نہیں کر رہی ڈیڈی۔ یہ سارے کارنامے آپ کے ہیں۔"

"گالیاں دینے آئی ہو مجھے۔"

"نہیں ڈیڈی! میں بھلا آپ کو گالیاں دینے کی جرأت کر سکتی ہوں لیکن یہ دونوں جب سے آئے ہیں گھر کا سکون حرام ہو کر رہ گیا ہے۔ طرح طرح کی فضول حرکتیں کرتے ہیں۔ پوری کوٹھی کو

انھوں نے اپنی شکار گاہ بنا لیا ہے۔ میں پوچھتی ہوں ہم پر یہ عذاب کیوں مسلط کیا گیا ہے؟"

"ٹھنڈے لہجے میں گفتگو کرو شازیہ، گھر کی بات ہے ابھی یہ بات باہر نہیں جانی چاہئے۔ پہلے تو ہمیں یہ اندازہ لگانا ہے کہ یہ حرکت فاخر کی ہے بھی یا نہیں۔ دیکھو شازیہ ہر بات کو پہلے پوری گہرائی سے تول لو پھر اس پر عمل کرنا مناسب ہوگا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کسی نے فاخر کے خلاف کوئی سازش کی ہو گی۔"

"ڈیڈی یہاں آپ کے اور آپ کے آدمیوں کے خلاف سازش کرنے والا کون ہو سکتا ہے۔ میں، باجی، امی یا دادا جان کون ہے یہاں جو آپ کے خلاف سازش کرے، جی؟ احمد رضا بھائی، ہارون بھائی یا ننھا سا فیصل کس پر شبہ ہے آپ کو ڈیڈی؟"

"تم بہت جذباتی ہو رہی ہو شازیہ۔ بلاشبہ یہ ایک قابل نفرت حرکت ہے۔ اگر یہ فاخر کی ہے تو تم کیا سمجھتی ہو۔ میں اسے چھوڑ دوں گا۔ میں اسے ایسی سزا دوں گا کہ یاد رکھے گا ہمیشہ۔ لیکن سوال تو یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ حرکت فاخر کی ہے بھی یا نہیں؟"

"سو فیصدی فاخر، سو فیصدی فاخر، آپ اس کی تحریر پہچان سکتے ہیں؟"

"افسوس اسی بات کا ہے کہ میں نے کبھی اس کی کوئی تحریر نہیں دیکھی۔"

"تو پھر آپ اس کو بلا کر پوچھئے۔ وہ انکار کر سکتا ہے۔"

"کہہ دے گا اگر اس نے یہ حرکت کی ہے تو اسے اس بات کا یقین نہ ہو گا کہ تم یہ خط مجھ تک پہنچا دو گی۔ اس سے پہلے زبانی طور پر بھی اس نے تم سے کچھ گفتگو کی ہے؟"

"کرتا تو اس کی شکل پہچاننے کے قابل نہ رہتی لیکن وہ ہمارے گرد منڈلاتا رہتا ہے ہر وقت جب دیکھو کسی نہ کسی طرح یہ دونوں بھائی میرے اور باجی کے گرد چکر لگاتے رہتے ہیں۔"

"قدسیہ کے گرد بھی۔۔۔؟" شجاع احمد صاحب نے ایک دم چونک کر پوچھا۔

"جی ہاں! میں اچھی طرح محسوس کر چکی ہوں آپ چاہیں تو باجی کو بلا کر پوچھ لیں۔"

"نہیں۔۔۔ نہیں اچھا شازیہ! تم یوں کرو جیسا میں بتاؤں گا ویسا کرو گی؟ سب سے پہلی بات تو یہ کہ ابھی اس سلسلے میں کسی کو بتلانے کی ضرورت نہیں۔ دماغ ٹھنڈا رکھو۔ مجرم کو رنگے ہاتھوں پکڑنا زیادہ بہتر ہوتا ہے۔ اگر وہ اس پرچے سے مکر گیا تو ہم اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکیں گے۔ ٹھیک گیارہ بجے جیسا کہ اس نے لکھا ہے تم اس جگہ پہنچ جاؤ جہاں کا اس نے اشارہ کیا ہے۔۔۔ اور اس سے بات کرنا۔ اگر کسی قسم کی بدتمیزی کرنے کی کوشش کرے تو تم اس کی ٹھکائی کر سکتی ہو۔ ہم سب تمہارے ارد گرد موجود ہوں گے اور اگر کوئی بدتمیزی نہ کرے صرف باتوں کی حد تک رہے تو اسے باتوں میں لگائے رکھنا۔ ساری باتیں سننے کے بعد میں وہاں پہنچ جاؤں گا اور پھر تم دیکھ لینا۔ اگر تم مطمئن نہ ہو تو مجھ سے شکایت کرنا۔"

"ڈیڈی آپ سوچ لیجئے اچھی طرح سے میں خود پر قابو نہیں پا سکتی۔ میں اسے اتنا ماروں گی کہ اس کی شکل پہچانی نہیں جا سکے گی وہ یہاں سے اپنے پاؤں پر واپس نہیں جا سکے گا۔"

"تم کیا ماروگی شازیہ! میں خود اس کی ہڈیاں توڑ دوں گا۔ کس کتے کی یہ مجال کہ میری بیٹی پر نظر ڈالے۔ میں آنکھیں نکال کر اس کے ہاتھ پر رکھ دوں گا۔ تم جاؤ تمہارا باپ یقین دلاتا ہے کہ اسے بدترین سزا دی جائے گی۔ تمہیں مطمئن کرنا میرا کام ہے لیکن جیسا میں نے کہا ہے تم ویسا ہی کرنا۔ رات کے کھانے پر مت آنا کیونکہ وہ تمہارے سامنے ہوگا تو تمہیں غصہ آئے گا۔ اس لئے رات کا کھانا اپنے کمرے ہی میں کھا لینا۔ ٹھیک گیارہ بجے اسی جگہ پہنچ جانا جہاں اس نے تمہیں بلایا ہے۔ صورت حال کا صحیح جائزہ لئے بغیر میں کوئی قدم نہیں اٹھانا چاہتا ہوں۔"

"آپ سوچ لیجئے ڈیڈی!"

"سوچ لیا ہے بھئی! جو میں کہہ رہا ہوں وہی کرو۔ میں تمہارا شکر گزار رہوں گا بیٹے! اور اس بات کو ذہن سے نکال دو۔ اس قسم کی بدتمیزی انھوں نے کی ہے اس کی انھیں سزا مل جائے گی اور ایسی سزا کہ آئندہ وہ کسی سے بدتمیزی نہ کر سکیں گے۔"

"ٹھیک ہے ڈیڈی! میں چلتی ہوں۔"

"آئی ایم سوری بیٹے! مجھے افسوس ہے کہ میں ان لوگوں کو یہاں تک لایا۔ بہر صورت کوئی حرج نہیں ہے میں سب ٹھیک کر لوں گا۔" شجاع احمد صاحب نے کہا تو شازیہ خاموش ہو کر کمرے سے باہر نکل گئی۔

شجاع احمد صاحب کی آنکھوں میں واقعی خون اتر آیا تھا۔ ان کا بس نہیں چلتا تھا کہ فاخر کی بوٹیاں چبا لیں۔ ایسی حرکت کی وہ توقع نہیں کر سکتے تھے لیکن۔۔۔ لیکن ممکن ہے۔ یہ بھی زاہد ہی کا کارنامہ ہو۔ زاہد بے انتہا چالاک آدمی ہے۔ اتنا شاطر کہ شجاع احمد صاحب خود بھی اس سے گھبرانے لگے تھے۔ اگر اس شاطر کو ذرا بھی شبہ ہو گیا کہ فاخر اور عاطر اس کے خلاف تحقیقات کرنے آئے ہیں تو پھر وہ اپنے بچاؤ کے لئے کوئی بھی قدم اٹھا سکتا ہے ممکن ہے یہ اسی کی مذموم حرکت ہو لیکن اس کا پتہ چلانا آسان کام نہیں

تھا. اگر فاخر کو بُلا کر وہ پُوچھتے تو انھیں یقین تھا کہ فاخر اس بات سے فوراً انکار کر دیتا. اور اس کے بعد اس کی صحیح جانچ پڑتال ممکن نہ ہوتی فاخر کی کوئی تحریر تو انھوں نے دیکھی نہ تھی. وہ اپنی تحریر بدل بھی سکتا تھا. پڑھا لکھا تھا لیکن یہ حرکت . . . یہ حرکت؟

شجاع احمد صاحب نے پائپ دوبارہ دانتوں میں دبا لیا اور اسے اس طرح چبانے لگے جیسے دشمن کی ہڈیاں چبا رہے ہوں. دوسری طرف شازیہ اپنی رپورٹ دینے زاہد کے پاس پہنچ گئی. زاہد نے اسے دیکھتے ہی "ہرا" کا نعرہ لگایا اور اُٹھ کر بیٹھ گیا.

"کہئے شازیہ بی بی! کام ہوگیا. . ؟"

"جی ہاں زاہد بھائی!"

"کیا ردِعمل رہا. ہمارے شجاع احمد صاحب کا؟"

"ڈیڈی بھی بہت خونخوار ہوگئے ہیں. انھوں نے کہا ہے کہ وہ انھیں بدترین سزا دیں گے اور اگر میں مطمئن نہ ہوئی تو پھر مجھے اجازت دیں گے کہ میں ان کے ساتھ جو چاہوں سلوک کروں."

"گڈ . . . گڈ . . . اس سزا کے لئے کوئی خاص تجویز رکھی گئی ہے میرا مطلب ہے یہ سزا کب شروع ہوگی؟"

"جی ہاں! ڈیڈی نے مجھ سے کہا ہے کہ میں رات کو گیارہ بجے وہیں پہنچوں جہاں اس ذلیل الانسان نے مجھے بُلایا ہے. انھوں نے کہا ہے کہ وہ قریب ہی موجود رہیں گے اگر وہ کوئی بدتمیزی کرنے کی کوشش کرے تو ڈیڈی نے مجھے اجازت دی ہے کہ میں بے تکلفی سے اس کی حجامت کر ڈالوں اگر اسے باتوں کی حد تک رہنا ہے تو پھر ڈیڈی خود اس کی باتیں سُننے کے بعد اس بات کا یقین کرلیں گے. دراصل ڈیڈی کو شُبہ ہے کہ کسی نے فاخر کے خلاف کوئی سازش تو نہیں کی ہے. ان کا کہنا ہے کہ اگر فاخر کو بُلا کر، اسے یہ خط دکھا کر اس سے پُوچھا جائے کہ یہ خط اس نے لکھا ہے تو وہ فوراً انکار کر دے گا. اسے یہ اُمید نہیں ہوگی کہ یہ خط میں ڈیڈی جان کے پاس پہنچا دُوں گی."

"بالکل مناسب بات کہی ہے انھوں نے اور ڈیئر شازیہ اب اس ڈرامہ کا ڈراپ سین تم بڑی خوش اسلوبی سے کرو گی. فاخر سے وہیں مُلاقات کرنی ہے. اپنے چہرے پر ذرا بھی یہ تاثر پیدا نہ ہونے دو کہ تم نے اس کی بات کا بُرا مانا ہے. ڈنر پر اس سے بڑی بے تکلفی سے گفتگو کرو بلکہ ہوسکے تو کچھ کھانے پینے کی چیزیں بھی اسے پیش کر دو تاکہ اس کی غلط فہمی مکمل ہو جائے. . " زاہد نے کہا.

"نہیں زاہد بھائی! یہ ممکن نہیں ہوگا."

"کیوں؟ بھئی دیکھو ضرورت. . " زاہد نے کہا.

"نہیں . . . نہیں آپ سمجھے نہیں. ڈیڈی نے مجھے منع کر دیا ہے کہ رات کے کھانے پر نہ آؤں اور انھوں نے یہ اس لئے منع کیا ہے کہ ممکن ہے فاخر کو دیکھ کر مجھے غصہ آجائے اور میں کوئی ایسی حرکت کر ڈالوں کہ وہ محتاط ہو جائے. اس لئے میں رات کے کھانے پر نہیں آؤں گی. رات کا کھانا اپنے کمرے میں ہی کھاؤں گی."

"ہوں" زاہد نے پُرخیال انداز میں گردن ہلائی "یہ بھی ٹھیک ہے اگر شجاع احمد صاحب نے یہ بات کہی ہے تو اس کا مقصد ہے کہ تمھارے معاملے میں وہ بالکل مخلص ہیں. اوکے شازیہ کام بن گیا. جب گھی سیدھی انگلیوں ہی نکل رہا ہے تو ہمیں اُنگلیاں ٹیڑھی کرنے کی کیا ضرورت ہے لیکن بی بی اب تم خود کو سنبھال کر رکھو. میرا مطلب ہے رات کے ڈرامے سے پہلے تمھارے چہرے سے کوئی یہ اندازہ نہ لگا سکے کہ کوئی خاص بات ہو گئی ہے. بڑے چالاک ہیں یہ لوگ فوراً ہی جان بچا جائیں گے."

"آپ مطمئن رہیں. جیسا آپ نے کہا ہے میں ویسے ہی کروں گی." شازیہ نے جواب دیا.

"اوکے. بی بی بہت بہت شکریہ! تم نے میری بات اس طرح مان لی." زاہد نے کہا اور شازیہ کو اپنے کمرے سے رُخصت کر دیا. زیادہ دیر شازیہ کو اپنے کمرے میں رکھ کر وہ کسی کو شُبہے کا موقعہ نہیں دینا چاہتا تھا.

●

دادا جان کا موڈ خاصا خوشگوار تھا. فیصل تیاریاں کرکے گیا تھا. اس کے اور دادا جان کے درمیان امپورٹیڈ ٹافیوں کا تبادلہ ہوتا رہتا تھا. دادا جان خود بھی ٹافیوں کے شائق تھے. ان کے دوست بھی انھیں تحفتاً باہر کی ٹافیاں بھیجتے رہتے تھے اور اس سلسلے میں صرف فیصل ہی ان کا پارٹنر تھا.

دُوسری طرف شجاع احمد کے کاروباری لوگ اگر ان کے بچوں کے لئے کچھ لانا چاہتے تھے تو اس میں فیصل کے لئے ٹافیاں ضرور ہُوا کرتیں کیونکہ شجاع احمد صاحب انھیں ہدایت کر دیا کرتے تھے. چنانچہ اس وقت بھی ٹافیوں کا ایک پیکٹ جاسوس اعظم کی جیب میں تھا. دادا جان اسے دیکھ کر مُسکرائے اور پیار بھرے انداز میں بولے.

"آؤ. آؤ بھئی تمھارا آنا کبھی بے مقصد نہیں ہوتا لیکن ہم آجکل قلاش جا رہے ہیں."

"یہ تو آپس کا معاملہ ہے دادا جان. ہم دونوں میں سے

کوئی سبب بھی امیر ہو دوسرے کے پاس پہنچ جائے یہ تو ہمارا معاہدہ ہے۔"

"او ہو۔ ہو۔ گویا کہیں سے کچھ مال ہاتھ لگا ہے۔" دادا جان مسکراتے ہوئے بولے۔

"جی دادا جان ملاحظہ فرمائیے عجیب و غریب ٹافیاں ہیں۔ تین ذائقے ہیں ان کے۔" فیصل نے پیکٹ دادا جان کے سامنے رکھ دیا۔

"ویری گڈ۔۔۔ ویری گڈ بھئی کھولو جلدی سے اصغیر، ٹافیاں دیکھ کر تو اپنے مُنہ میں پانی بھر آتا ہے۔ پتہ نہیں کب سے اچھی ٹافیاں نہیں کھائیں۔ کب پہنچا یہ مال تمھارے پاس؟"

"زیادہ دن نہیں ہوئے دادا جان۔ بس میں نے سوچا تھا۔ کہ افتتاح ہم دونوں مل کر کریں گے۔"

"تو پھر کرو بھئی! کرو جلدی سے۔" دادا جان نے کہا اور فیصل ٹافیاں کھولنے لگا۔ دادا جان نے ایک ٹافی مُنہ میں رکھی اور اسے چباتے ہوئے بولے۔

"میاں واللہ۔ کیا چیز ہے بھئی تین تین مزے اور ایک ساتھ کھاؤ تو مُنہ میں ایک عجیب سا مزہ گھل جاتا ہے اور پھر کتنی نرم ہیں یہ۔ بھئی بلاشبہ ذوق کی چیز ہے خوب بناتی ہے۔ لو، لو چکھو تو سہی تم نے چکھی یا نہیں؟"

"کمال ہے دادا جان۔ اگر چکھ لیتا تو معاہدہ منسوخ نہ ہو جاتا۔"

"زندہ باد، زندہ باد۔ بھئی بیٹا ہو ہمارا تو فیصل جیسا۔" دادا جان نے دو اور ٹافیاں مُنہ میں رکھ لیں۔ فیصل بھی ٹافیاں کھا رہا تھا۔

"اور سناؤ فیصل میاں پڑھائی کیسی جا رہی ہے؟"

"بالکل فٹ دادا جان! بہترین نمبر لا کر دکھاؤں گا۔"

"تو پھر ہماری طرف سے بھی تمھیں بہترین تحفہ ہی ملے گا۔ پڑھائی کے علاوہ کچھ اور تو مشاغل نہیں ہیں؟"

"کیوں نہیں دادا جان جاسوسی بھی ہو رہی ہے آجکل۔" فیصل مطلب پر آ گیا۔

"ایں۔ جاسوسی میاں تمھیں کب سے یہ شوق چڑھ آیا؟"

"دادا جان بعض اوقات آدمی کسی کو اپنا خیالی اُستاد بھی بنا لیتا ہے۔ جاسوسی کے سلسلے میں تو میرے اُستاد آپ ہی ہیں۔"

"ہم۔ بھئی واہ۔ ہم کیسے ہو گئے آپ کے اُستاد؟"

"بس یہ شوق مجھے آپ ہی سے تو لگا جس طرح چھوت کی بیماری لگتی ہے۔ ویسے دادا جان یہ چھوت کی بیماری کیا ہوتی ہے؟"

"میاں چھوڑو۔ جاسوسی کا شوق بیماری نہیں ہوتا بلکہ زندگی کا دلچسپ ترین مشغلہ ہے۔ اچھا یہ بتاؤ تم جاسوسی کیسے کرتے ہو؟"

"بس دادا جان مختلف لوگوں کی ٹوہ میں رہنا میرا بہترین مشغلہ ہے۔ میں دیکھتا ہوں لوگ کیا کیا کرتے ہیں کس کس انداز میں سوچتے ہیں۔ اب ذرا اپنے ان دوستوں کو لے لیجئے جن کا نام فاخر اور عازم ہے آجکل میں ان پر ورک کر رہا ہوں۔"

"اچھا۔۔۔ ان پر کیا ورک کر رہے ہو بھئی۔ ویسے عازم بھی جاسوسی کہانیوں سے بڑی دلچسپی رکھتا ہے۔ میرے خیال میں اچھا بچہ ہے۔"

"جی دادا جان اب بچہ جیسا بھی ہے یہ تو مجھے نہیں معلوم میں نے ان کی کچھ گفتگو ریکارڈ کی ہے۔"

"ریکارڈ کی ہے کیا مطلب؟"

"ملاحظہ فرمائیے۔" فیصل نے ٹیپ ریکارڈر نکال کر دادا جان کے سامنے رکھ دیا۔

"ٹافی ہے یہ؟" دادا جان تعجب سے بولے۔

"ٹافی نہیں، دادا جان ٹیپ ریکارڈر ہے۔"

"یہ۔۔۔!" دادا جان کے لہجے میں بے پناہ حیرت تھی۔

"جی ہاں! انکل مقصود نے بھجوایا تھا میرے لئے مغربی جرمنی سے نایاب چیز ہے دادا جان کتنا چھوٹا سا ہے لیکن اس کی آواز سُنئے ذرا آپ، ابھی سُناتا ہوں آپ کو۔" فیصل نے کہا اور پھر ٹیپ ریکارڈر آن کر دیا۔ دادا جان نے دو اور ٹافیاں مُنہ میں ڈالیں اور ٹیپ ریکارڈر سے اُبھرنے والی آواز سُننے لگے۔ فیصل نے آواز تیز کر دی تھی اور پھر عازم کی آواز اُبھری وہ فاخر سے رپورٹ طلب کر رہا تھا۔ فاخر نے احمد رضا کی کہانی سُنائی۔ اس کے بعد ہارون کی بس نے قدسیہ کے بارے میں بھی تفصیل بتائی تھی اور دادا جان کا تذکرہ بھی بڑے ناخوشگوار انداز میں آیا تھا۔ دادا جان کے مُنہ میں ٹافیاں گھل چکی تھیں لیکن اب وہ مُنہ نہیں چلا رہے تھے۔ ان کے چہرے پر بے پناہ سنجیدگی تھی اور وہ بڑے غور سے سُن رہے تھے عازم اور فاخر کی آواز وہ بخوبی پہچان سکتے تھے لیکن جب بات قدسیہ اور شازیہ پر پہنچی تو ان کے ہاتھوں کی مٹھیاں بھینچ گئیں۔ ان کی آنکھوں میں سُرخ سُرخ رنگ لہرانے لگا۔ فیصل ان تمام چیزوں سے بے نیاز ٹافیاں کھانے میں مصروف تھا لیکن دادا جان اب اپنا یہ مشغلہ ترک کر چکے تھے۔ وہ بڑے غور سے یہ ساری گفتگو سُن رہے تھے۔ تھوڑی دیر کے بعد ٹیپ ریکارڈر سے آواز آنا بند ہو گئی۔ عازم اور فاخر اپنی

گفتگو مکمل کر چکے تھے اور دادا جان ، عجیب و غریب سی کیفیت کا شکار تھے۔ ان کی گردن کی رگیں تنی ہوئی تھیں۔ آنکھوں سے وحشت جھانک رہی تھی۔ کافی غصے میں معلوم ہوتے تھے وہ۔ فیصل نے ان کی شکل دیکھی اور سہم سا گیا۔

"کک! کیا بات ہے دادا جان۔ کک کیا ہو گیا؟"

"ہوں" دادا جان چونک پڑے۔ پھر انھوں نے خود کو سنبھالا اور کہنے لگے۔

"ذرا اسے ریوائنڈ کرو فیصل میاں" فیصل کیسٹ ریوائنڈ کرنے لگا تھا۔

"اب اسے آن کر دو" دادا جان بولے اور فیصل نے پھر ٹیپ آن کر دیا۔ اس بار دادا جان زیادہ توجہ اور زیادہ دلچسپی سے پوری گفتگو سُن رہے تھے۔ اس کے بعد انھوں نے مزید تین دفعہ یہ کیسٹ سُنا۔ اب وہ کسی حد تک پُرسکون نظر آ رہے تھے۔ ان کے ہونٹوں سے آہستہ آہستہ آواز نکل رہی تھی جو فیصل کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ پھر وہ بھاری لہجے میں بولے۔

"یہ گفتگو تم نے کب ریکارڈ کی تھی فیصل میاں؟"

"پرسوں رات کو دادا جان۔ دونوں اپنے کمرے میں گھسے تو میں نے چپکے سے ٹیپ ریکارڈر اس جگہ پر رکھ دیا جہاں وہ بیٹھے ہوئے باتیں کر رہے تھے۔"

"ہُوں! انھیں پتہ تو نہیں ہے کہ تم ان کی آواز ریکارڈ کر چکے ہو؟"

"واہ۔ اگر معلوم ہو جاتا دادا جان تو پھر جاسوسی کیسی ہوتی" فیصل نے جواب دیا۔

"ہوں، ہوں! ٹھیک ہے لیکن۔۔۔ لیکن فیصل میاں یہ ٹیپ ریکارڈر آپ ہمیں ایک دن کے لئے اُدھار دے سکتے ہیں؟"

"کمال ہے دادا جان! میری اور آپ کی چیز الگ الگ نہیں ہوتی لے لیجئے! کیا کریں گے آپ؟"

"کچھ تھوڑی سی جاسوسی ہم بھی کریں گے" دادا جان کے لہجے میں بے پناہ عزم تھا۔

"تو ٹھیک ہے یہ آپ کے پاس محفوظ رہے گا لیکن احتیاط کے ساتھ مجھے واپس کر دیجئے گا۔"

"یقیناً۔ اس کے استعمال کا طریقہ بتا دو ہمیں" دادا جان اب ٹافیاں کھانا بھول گئے تھے۔ اس سے زیادہ سنجیدہ بات ان کے لئے اور کوئی نہیں ہو سکتی تھی۔ وہ شدید غصے کا شکار تھے لیکن فیصل بچہ تھا۔ اس کے سامنے اس غصے کا اظہار مناسب نہیں تھا۔ پتہ نہیں کس سے کیا کیا کہتے پھرتا۔ چنانچہ انھوں نے خود کو سنبھالا ہوا تھا۔

فیصل انھیں کیسٹ چلانے کا طریقہ بتانے لگا۔ دادا جان نے یہ طریقہ ذہن نشین کر لیا۔

"ٹافیاں تو لیجئے دادا جان۔ آپ نے تو صرف چند ہی ٹافیاں کھائی ہیں"

"بھئی بہت عمدہ چیز ہے لیکن اب اس سے زیادہ کھانے کا موڈ نہیں ہے۔ یہ تم کھا لو بیٹے۔ ہم بھی تمھیں بہت جلد اس کا متبادل کوئی تحفہ پیش کریں گے" دادا جان پھیکے سے لہجے میں بولے۔

"ٹھیک ہے دادا جان۔ میں چلوں؟"

"ہاں ٹھیک ہے" فیصل دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ باہر نکلا تو قدسیہ اُسے دادا جان کے کمرے کی طرف آتی ہوئی نظر آئی تھی۔

"ہیلو فیصل، دادا جان اپنے کمرے میں موجود ہیں۔۔۔؟"

"جی باجی! موجود ہیں" فیصل نے جواب دیا۔

"آپ وہیں جا رہی ہیں؟"

"ہاں۔۔۔ ذرا ان سے کچھ بات چیت کرنی ہے" قدسیہ نے کہا اور دادا جان کے کمرے کی طرف چل پڑی۔

فیصل مُسکراتا ہُوا تیزی سے زاہد کو رپورٹ دینے کے لئے چل پڑا تھا۔

●

حسام احمد شدید ذہنی ہیجان کا شکار تھے۔ بڑھاپے کو اپنا ضرور لیا تھا لیکن خاندان کی عزت بڑی مشکل سے بنائی تھی۔ اس کی حفاظت کے لئے آج بھی جان دینے کو آمادہ تھے۔ بالکل ہی کور چشم نہیں تھے ان معاملات کی طرف نگاہ رہتی تھی۔ لڑکے اور لڑکیاں اگر جائز مشاغل اپنالیں تو کوئی بُری بات نہیں تھی نئے دَور کے تقاضے تھے لیکن کوئی ان کے گھر میں آ کر ان کی عزت پر ہاتھ ڈال جائے تو وہ اسے زندہ دفن کرنے کی ہمت رکھتے تھے۔

زاہد پر انھیں پُورا بھروسہ تھا۔ اس کے بعد سرفراز آیا تھا لیکن اس شریف صُورت نوجوان پر کوئی بھی آنکھیں بند کر کے بھروسہ کر سکتا تھا۔ سرفراز کی شکل و صُورت اس کی شرافت کی آئینہ دار تھی۔ شجاع احمد کے معاملات میں بلاوجہ مداخلت انھوں نے کبھی نہیں کی تھی لیکن ایسے لونڈوں کو وہ گھر میں ایک لمحہ برداشت نہیں کر سکتے تھے اور یہ کیسٹ سُن کر ان کی بُری حالت ہو گئی تھی۔ دل تو چاہ رہا تھا کہ اسی وقت بندوق لیں اور ان دونوں کو شوٹ کر دیں لیکن شجاع احمد سے ایک بار گفتگو کر لینا چاہتے تھے۔

ابھی کوئی مناسب فیصلہ نہیں کر پائے تھے کہ قدسیہ نے اندر آنے کی اجازت طلب کی۔

"آؤ بیٹے! کیسے آئیں؟" انھوں نے خود کو سنبھال کر بھاری لہجے میں کہا۔

"کیا بات ہے دادا جان! طبیعت تو ٹھیک ہے؟"

"ہاں ٹھیک ہوں۔"

"آواز کچھ بھاری ہے۔ چہرہ بھی تمتمایا ہے۔"

"نزلہ ہو گیا ہے کوئی خاص بات نہیں ہے۔ تم اپنی سناؤ کیسے آئیں؟"

"ایک بات معلوم کرنی ہے دادا جان!"

"ہاں کہو!"

"یہ حالِ دل کیا ہوتا ہے دادا جان!"

"ایں۔ جو دل میں ہو۔"

"اور اگر دل میں کچھ نہ ہو تو؟"

"میں سمجھا نہیں۔"

"عازم مجھے حالِ دل سنانا چاہتا ہے۔" قدسیہ نے سادہ سے لہجے میں کہا لیکن دادا جان اُچھل پڑے۔

"کیا مطلب؟"

"دادا جان! یہ دونوں بھائی ہمارے لئے مصیبت بنے ہوئے ہیں اجازت لئے بغیر کمرے میں گھس آتے ہیں۔ میرے نگار خانے میں آ جاتے ہیں اور فضول باتیں کرتے ہیں۔ عازم نے آج رات گیارہ بجے مجھے دعوت دی ہے۔"

"رات گیارہ بجے؟"

"جی ــــ!"

"کیا دعوت دی ہے؟"

"کہنے لگا رات کو گیارہ بجے پائیں باغ میں کنج کے قریب ملنا۔ میں نے پوچھا کیوں؟ تو نشیلی آنکھیں بنا کر بولا کہ حالِ دل سنانا ہے۔"

"اوہ۔۔ اوہ۔۔۔ اپنے باپ سے بات کی تم نے؟"

"ہمت نہیں پڑی دادا جان۔ میں نے سوچا کہ پہلے آپ سے معلوم کر لوں کہ حالِ دل ہوتا کیا ہے۔"

"کون سے کنج کے قریب بلایا ہے اس نے۔"

"بڑے پیپل کے پاس والے۔"

"موں کس وقت سنائے گا وہ حالِ دل ہمـ"

"گیارہ بجے!"

"ٹھیک ہے بیٹے تم فکر مت کرو۔ تمھیں وہاں جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہم سُن لیں گے اس کا حالِ دل۔ ایسا سُنیں گے کہ اس کے بعد وہ زندگی بھر کسی کو دل کا حال نہیں سنائے گا۔"

"مجھے کیا کرنا چاہیئے دادا جان؟"

"اپنے کمرے میں آرام کرو۔ اپنے معمولات میں مصروف رہو اگر وہ پہلے بلانے آئے تو کہہ دینا کہ اب گیارہ بجے ہی بات ہوگی۔" دادا جان نے کہا۔

"بہتر دادا جان!" قدسیہ نے سعادت مندی سے کہا اور پھر جب وہ باہر نکلنے لگی تو دادا جان بولے۔

"زاہد کو تلاش کر کے میرے پاس بھیج دینا۔"

"جی بہتر!" قدسیہ نے جواب دیا اور دادا جان کے کمرے سے باہر نکل آئی۔ اس نے دادا جان کی ہدایت کے مطابق زاہد کو دادا جان کا پیغام دے دیا۔ فیصل اس وقت زاہد کے کمرے میں موجود تھا اس لئے زاہد نے قدسیہ سے اور کوئی سوال نہیں کیا تھا۔ بہر حال وہ دادا جان کے کمرے میں داخل ہو گیا۔

"زاہد میاں! باہر کے معاملات میں اُلجھ کر گھر کو فراموش نہیں کرنا چاہیئے۔"

"زاہد سے کبھی ایسی حماقت نہیں ہو سکتی دادا جان!"

"ہوئی ہے۔"

"نہیں ہوئی دادا جان۔"

"اور اگر میں ثابت کر دوں تو؟"

"زاہد گردن پیش کر دے گا۔"

"اتنا بڑا دعویٰ مت کرو زاہد۔ بتاؤ میں نے تمھیں اس وقت کس لئے بلایا ہے۔ کیا اُلجھن ہے مجھے؟"

"عازم اور فاخر۔" زاہد نے سکون سے جواب دیا۔

"تو قدسیہ نے تمھیں بتا دیا۔"

"اگر یہ ثابت ہو جائے دادا جان تو سزا دو گنی۔"

"اوہ! گویا تمھیں اندازہ ہے؟"

"صرف اس حد تک کہ وہ دونوں لفنگے چاروں طرف تاک جھانک کرتے رہتے ہیں۔ وہ اس قابل نہیں ہیں کہ کسی شریف عزت دار گھرانے میں ایک منٹ رہیں۔"

"پھر وہ یہاں کیوں ہیں؟"

"اس لئے کہ شجاع احمد صاحب کے چہیتے دوست کے بیٹے ہیں یا اس لئے کہ شجاع احمد صاحب نے انھیں ہمارے خلاف جاسوسی کے لئے یہاں رکھا ہے۔ وہ ان کے کسی دوست کے بیٹے نہیں ہیں۔"

"کیا... کیا مطلب؟" دادا جان حیرت سے بولے
"ثبوت موجود ہے دادا جان۔ پیش کیا جا سکتا ہے۔"
"اگر یہ حقیقت ہے تو اسے ثابت کرو۔"
"فیصل کا ٹیپ ریکارڈر آپ کے پاس محفوظ ہے نا؟"
"اوہ! ہاں ہے۔"
"میں نے بھی ایک دن کے لئے وہ فیصل سے قرض لیا تھا۔ ملاحظہ فرمائیے۔ یہ ایک دوسرا کیسٹ ہے۔ زاہد نے ایک اور کیسٹ نکال لیا۔ یہ اسی گفتگو کا دوسرا حصہ تھا۔ جسے زاہد نے ایک اور کیسٹ پر منتقل کر لیا تھا۔ یہ وہ گفتگو تھی جو شجاع احمد صاحب کے کمرے سے ریکارڈ کی گئی تھی۔

دادا جان نے یہ دوسری گفتگو سنی اور ان کی بُری حالت ہو گئی۔
"اس بھنگی زادے کی تو ایسی تیسی۔ ہمارے خلاف جاسوسی کرنے کو بلایا تھا ان لفنگوں کو۔ میں ابھی دیکھتا ہوں اس ذلیل کو۔" وہ آپے سے باہر ہو گئے تھے۔
"نہیں دادا جان! یہ پالیسی کے خلاف ہے۔ یہ بات صرف آپ تک محدود رہے گی۔"
"مگر کیوں۔۔۔ اس بدمعاش کی یہ حرکت میں کبھی معاف نہیں کروں گا!"
"نہیں دادا جان! یہ کیسٹ صرف آپ کے لئے ہے۔ میں نے آپ کو حقیقت بتانے کے لئے یہ حرکت کی ہے۔ ایک سازش تو طشت از بام ہو گئی۔ آئندہ بھی زاہد کے خلاف ایسی سازش کی جا سکتی ہے۔ آپ کے علاوہ اور کوئی سہارا نہیں ہے میرا۔"
"ارے بیٹے مجال ہے کسی کی جو کوئی تیرا بال ٹیڑھا کر سکتا ہے۔ ایک ایک کو دیکھ لوں گا۔ میں تو ابھی ٹھیک کر دوں گا اسے۔ تم منع کر رہے ہو تو خاموش ہو جاتا ہوں۔"
"بات ذرا مختلف ہو جائے گی دادا جان۔ ہم اس سازش کو بڑی خاموشی سے ناکام بنائیں گے۔"
"تمھیں معلوم ہے وہ دونوں کیا کر رہے ہیں یہاں؟"
"وہی تمام مذموم حرکتیں جو لفنگے کر سکتے ہیں۔"
"قدسیہ ان کی شکایت لائی تھی۔ فیصل نے ان کی خفیہ گفتگو ریکارڈ کی ہے۔"
"فیصل مجھے اسی بارے میں بتا رہا تھا کہ قدسیہ نے آپ کا پیغام دیا اور میں یہاں چلا آیا۔ فیصل نے صرف اتنا بتایا تھا کہ اس کا ٹیپ ریکارڈر آپ کے پاس ہے۔"

"ذرا سنو! ذرا سنو اس میں کیا ہے۔" دادا جان نے کہا اور ایک بار پھر زاہد نے وہ ٹیپ سنا۔ اس نے بہت حیرت کا اظہار کیا تھا۔
"ہوں! تو یہ ناپاک ارادے ہیں اس کے۔ لیکن میری زندگی میں وہ کامیاب نہیں ہو سکتے۔" زاہد بڑے پُرجوش لہجے میں بولا
"اور سنو۔۔۔ اور سنو! عاقل میاں نے رات کے گیارہ بجے قدسیہ کو باغ میں بلایا ہے۔ حالِ دل سنانا چاہتا ہے۔۔۔۔۔۔۔ اس کا حالِ دل تو میں سنوں گا اچھی طرح!"
"انھوں نے تو اس کوٹھی کی عزت دو کوڑی کی کر کے رکھ دی دادا جان کیا سزا ہونی چاہیئے ان کی؟"
"میں نے سوچ لیا ہے اور اسی لئے تمھیں بلایا ہے۔"
"خادم حاضر ہے۔" زاہد گرفت صحیح کر کے بولا۔
"قدسیہ کو میں نے منع کر دیا ہے کہ وہاں نہ جائے لیکن ہم لوگ وہاں اس کے استقبال کے لئے موجود ہوں گے۔ جاسوسوں کی پوری ٹیم وہاں ہونی چاہیئے۔ کسی رعایت کی ضرورت نہیں ہے پوری ڈالو اس پر اور خوب مار لگاؤ۔ اس کے بعد یونہی چھوڑ دو۔ بعد میں جو ہو گا دیکھا جائے گا۔"
"عمدہ تجویز ہے۔ کسی سے کچھ کہنے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ اصل بات خود سامنے آ جائے گی۔"
"بالکل! افہام تفہیم سے وہ پٹائی سے بچ سکتا ہے۔ پہلے تو جی بھر کے مرمت کر لی جائے اس جاسوس کے بچے کی۔ اس کے بعد دوسرے معاملات دیکھے جائیں گے۔"
"او کے دادا جان! آپ کی ٹیم کو ہدایت کر دی جائے گی۔"
"زاہد نے جواب دیا۔
"سارا کام بڑی خوش اسلوبی سے ہونا چاہیئے۔ وہ بچنے نہ پائے۔"
آپ مطمئن رہیں۔ آپ نے جو ڈیوٹی اس خادم کے سپرد کی ہے۔ وہ آپ کی مرضی کے مطابق انجام دی جائے گی۔" زاہد نے کہا اور پھر وہ دادا جان سے اجازت لے کر ان کے کمرے سے باہر نکل آیا۔
وہ بہت مطمئن تھا۔ شجاع احمد کی کوئی چال کامیاب نہیں ہونی چاہیئے۔ اس بات میں تو اب کوئی شک و شبہ نہیں تھا کہ شجاع احمد پوری طرح اس کی طرف سے مشکوک ہو گئے تھے۔
"آپ میرا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکیں گے شجاع احمد صاحب! ابھی تو آپ کو بہت کچھ کھونا ہے۔" اس نے بڑبڑاتے ہوئے کہا اور پھر اس کا رخ ملازموں کے کوارٹر کی طرف ہو گیا۔

تھوڑی ہی دیر کے بعد جاسوسوں کی پوری ٹیم رمضان کے کوارٹر میں جمع تھی۔

"ایک اہم کام انجام دینا ہے تمھیں۔"

"ارے ہم تو تیار ہیں باس جی۔ حکم کرو۔" رحیم داد نے مستعدی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔

"گل خان! رات کو گیارہ بجے تم کہاں ہوتے ہو؟"

"گیٹ پر باس۔"

"آج نہیں ہوگے۔ ٹھیک گیارہ بجے تمھیں فوارے کے پیچھے درختوں کی آڑ میں بیٹھنا چاہیئے۔"

"فضل تمھارے پاس بوری ہے۔"

"نہیں ہے تو آجائے گی۔"

"فوری طور پر بوری کا بندوبست کرو۔ فوارے کے سامنے سرخ پھولوں کے کنج کے پیچھے تمھیں رات کو ٹھیک گیارہ بجے عازم نظر آئے گا۔ عازم کو جانتے ہو؟"

"کیوں نہیں باس ان نئے چھوکروں میں سے ایک ہے۔"

"بالکل وہی۔ کہیں اس کے دھوکے میں کسی اور کو نہ پکڑ لینا۔"

"آپ اطمینان رکھیں باس جی۔ ہماری نگاہ بہت تیز ہے۔" گل خان نے کہا۔

"تم لوگ چالاکی سے اس کے قریب پہنچو گے اور اس پر بوری ڈال دو گے اور پھر اس کی صحیح مرمت ہونی چاہیئے۔ ٹوٹ پھوٹ نہیں ہونی چاہیئے لیکن ویسے طبیعت ہری کر دو۔"

"ایسا ہی ہوگا باس۔"

"اوّل تو تم سے کوئی بیان نہیں لیا جائے گا۔ پوچھا جائے تو کہہ دینا مشکوک حالت میں تھا اس لئے اسے چور سمجھا گیا۔"

"سمجھ گیا باس جی آپ فکر مت کریں۔" گل خان بڑی مستعدی سے بولا۔

"اور مجھے یقین ہے تم لوگ احتیاط سے اپنی ڈیوٹی انجام دو گے۔ خیال رکھنا وہ بھی چالاک ہے نکلنے نہ پائے۔"

"او صاب کیسے نکل جائے گا۔ اپنے وجود پر لعنت۔ گل خان ہونٹ سکوڑ کر بولا اور زاہد نے مطمئن انداز میں گردن ہلا دی۔

●

آج کی رات دلچسپ ہنگامے لئے ہوئے تھی۔ سارے کام پروگرام کے مطابق ہو رہے تھے۔ جوں جوں وقت گزرتا جا رہا تھا۔ دلوں کی دھڑکنیں تیز ہوتی جا رہی تھیں۔

شازیہ فاخر سے شدید نفرت کرنے لگی تھی۔ ذرا مختلف فطرت کی مالک تھی۔ اسے یہ حرکت اپنی ذات پر بہت بڑی چوٹ محسوس ہوئی تھی اگر اس وقت زاہد نہ روک لیتا اور فاخر نظر آتا تو شازیہ بے تکان جوتی اس کے سر پر توڑ دیتی لیکن زاہد کا مشورہ درست تھا۔ ڈیڈی اس سے جواب طلب کر سکتے تھے۔ اب وہ سب کچھ اپنی آنکھوں سے ہی دیکھ لیتے تو بہتر تھا۔ اگر کوئی تسلی بخش صورت حال نہ ہوئی تو پھر خود دیکھ لیا جائے گا۔ اس کمینے کو قابلِ عبرت سزا ملنا ضروری ہے۔

"ساڑھے دس بجے شجاع احمد خود اس کے کمرے میں آئے۔ وہ انھیں دیکھ کر چونک پڑی تھی۔

"تم تیار ہو؟"

"جی ڈیڈی!"

"خوف زدہ ہونے کی ضرورت نہیں۔ میں خود وہاں موجود رہوں گا۔ پوری تسلی سے جانا۔"

"جی ڈیڈی!"

"بس میں تمھیں یہی بتانے آیا تھا۔" شجاع احمد صاحب نے کہا اور باہر نکل گئے۔ شازیہ کو اندازہ ہو گیا کہ شجاع احمد اس معاملے میں پوری دلچسپی لے رہے ہیں۔

بہر حال گیارہ بجنے میں دو تین منٹ رہ گئے تو وہ باہر نکل آئی کوٹھی میں سناٹا چھا گیا تھا۔ وہ اس جگہ کی طرف بڑھنے لگی جس کی نشاندہی خط میں کی گئی تھی۔

یہ بھی پھولوں کا ایک گھنا درخت تھا لیکن یہ اس جگہ سے دور تھا جہاں عازم نے قدسیہ کو بلایا تھا لیکن اتنا دور بھی نہیں تھا کہ ایک جگہ کی آواز دوسری جگہ نہ پہنچ پائے۔

شازیہ پھولوں کے کنج کے پاس پہنچ گئی اور اسی وقت کنج کے عقب سے فاخر باہر نکل آیا۔

"تم آگئیں روحِ بہار! مجھے امید تھی۔ مجھے یقین تھا کہ میری محبت سچی ہے، میری تحریر تمھیں ضرور متاثر کرے گی۔ آؤ میرے نزدیک آؤ شازیہ۔ میں کائنات کی ساری لطافتیں اپنے وجود میں سمیٹ لینا چاہتا ہوں۔"

"اور میں تمھاری ہڈیاں توڑ دینا چاہتا ہوں کمینے۔" کنج کے پیچھے سے شجاع احمد کی آواز سنائی دی اور فاخر بے چارہ ہکا بکا رہ گیا۔

"یہ... یہ آواز کہاں سے آئی جانِ تمنا؟" وہ بولا لیکن جانِ تمنا کے جواب دینے سے قبل شجاع احمد صاحب باہر نکل آئے انھوں نے ٹارچ کی روشنی فاخر پر ڈالی۔ دوسرے لمحے فاخر نے ایک طرف چھلانگ لگا دی لیکن اس وقت شجاع احمد کے ہاتھ میں لئے ہوئے پستول

سے گولی نکلی اور فاخر کے لباس کو چھوتی ہوئی گزر گئی۔

"اگر ایک قدم کھسکنے کی کوشش کی تو اس بار گولی بھیجہ پھاڑ دے گی" شجاع احمد غرائے اور فاخر اپنی جگہ کھڑے کھڑے جھولنے لگا۔ پھر وہ نیچے گر پڑا تھا۔ شجاع احمد آگے بڑھنے ہی نہ پائے تھے کہ دفعتاً سرخ پھولوں کے کنج کے پاس سے شور بلند ہوا

"بیٹا۔ پکڑو جانے نہ پائے۔۔۔ کتے کا بچہ۔ ۔ ۔ ۔ مار دو بے ایمان کو" اور اس کے بعد خاصا ہنگامہ برپا ہو گیا۔ شجاع حیران رہ گئے تھے

"یہ کون ہے شازی۔ یہ۔۔۔؟"

"پتہ نہیں ڈیڈی۔ اوہ دیکھئے یہ پھر بھاگ رہا ہے" شازیہ جلدی سے بولی اور شجاع احمد فاخر کی طرف دیکھنے لگے لیکن فاخر نے اس بار بھاگنے کی کوشش نہیں کی۔ وہ کھڑا ہو کر آنکھیں ملنے لگا تھا پھر اس کی بھرائی ہوئی آواز ابھری۔

"یہ۔۔۔ یہ سب کیا ہو رہا ہے؟ میں کہاں ہوں؟"

"تم جنت میں ہو بیٹے اور فرشتے تم سے اٹھکیلیاں کر رہے ہیں۔ شازیہ تم ذرا یہ پستول سنبھالو میں ادھر دیکھتا ہوں کیا ہے! بھاگنے کی کوشش کرے یہ تو گولی مار دینا"

"جی ڈیڈی! سوراخ ہی سوراخ کر دوں گی اس کی کھوپڑی میں" شازیہ نے نفرت بھرے انداز میں کہا اور پستول سنبھال لیا فاخر سہمی ہوئی نگاہوں سے شجاع احمد کو دیکھ رہا تھا۔ پھر جب وہ دور چلے گئے تو اس نے بھکاریوں کے سے انداز میں شازیہ کو پکارا۔

"شازیہ! یہ۔۔۔ یہ سب کچھ کیا ہے؟"

"ڈیڈی بتاتے ہیں تمھیں"

"کیا یہ میری محبت کا صلہ ہے؟ کیا یہی میرے پیار کا جواب ہے؟"

"نہیں فاخر ڈیئر! ابھی تو ڈیڈی صرف وہ ہنگامہ دیکھنے گئے ہیں پورا جواب تو وہ خود آ کر دیں گے"

"میں تمھارے لئے جان دینے کو تیار ہوں شازیہ۔ میں تم سے سچا پیار کرتا ہوں"

"واقعی؟" شازیہ تمسخرانہ انداز میں بولی۔

"آزما لو شازیہ! میں ہر آزمائش میں پورا اتروں گا۔ اوہ تم نے یہ کیا کیا۔ ایک بار میری محبت کو محسوس کرتیں"

"آزما لوں؟" شازیہ ہنس پڑی۔

"ہاں! میں مجنوں اور فرہاد سے کم نہ نکلوں گا"

"تب پھر اٹھو!" شازیہ نے کہا اور فاخر اچھل کر کھڑا ہو گیا

"مجھے نکل جانے دو شازیہ۔ میں سب ٹھیک کر لوں گا۔ جو کچھ تم نادانی میں کر بیٹھی ہو اس کی پرواہ مت کرو۔ میں سب ٹھیک کر لوں گا۔ میں چلتا ہوں"

"خدا حافظ" شازیہ نے کہا لیکن جونہی فاخر پلٹا اس نے گولی چلا دی۔ یہ دوسری بات ہے کہ اس نے فاخر کا نشانہ نہیں لیا تھا۔ لیکن فاخر چیخ مار کر پھر بیٹھ گیا۔

"یہ۔۔۔ یہ کیا کر رہی ہو تم۔۔۔ ارے یہ کیا کر رہی ہو؟"

"تمھارا سچا پیار آزما رہی ہوں۔ تم میرے لئے جان دینے پر آمادہ ہو نا چلو بھاگنے کی کوشش کرو۔ ابھی تو پستول میں چار گولیاں ہیں۔ کوئی نہ کوئی تو تمھارے پیٹ میں گھس جائے گی اور تمھاری جان دینے کی آرزو پوری ہو جائے گی"

فاخر منہ پھاڑ کر رہ گیا۔ دوسری طرف کا ہنگامہ بدستور جاری تھا۔ چند لمحات کے بعد فاخر کی بھرائی ہوئی آواز نکلی "یہ۔۔۔ یہ ادھر کیا ہو رہا ہے۔۔۔؟"

"کوئی اور عاشق پکڑا گیا ہوگا"

"ارے! میرا بھائی، عازم۔ وہ بھی تو۔۔۔ وہ بھی تو۔۔" فاخر کی ڈوبتی آواز ابھری۔

"اوہ، گڈ! عازم صاحب اس طرف ہیں گڈ ویری گڈ! ان کی تواضع تم سے بہتر ہو رہی ہے۔ بہت خوب" شازیہ پھر ہنس پڑی۔

درحقیقت گل خان، رحیمو، فضل اور رمضان نے ذرا سی دیر میں ہی عازم کی بہترین تواضع کر دی تھی۔ دو فائر ہوئے تھے اور مار پیٹ کی آوازیں رات کے سناٹے میں گونجی تھیں اس لئے دوسرے لوگ بھی جاگ کر جائے واردات کی طرف دوڑ پڑے تھے۔

گو دادا جان وغیرہ سب ہوشیار تھے لیکن وہ لبعد میں وہاں پہنچے تھے۔ شجاع احمد صاحب نے نزدیک پہنچ کر اس ہنگامے کو روکا تھا۔

"کیا ہو رہا ہے یہ۔۔۔ ارے یہ کسے مار رہے ہو تم لوگ۔۔۔؟"

"چور ہے صاحب! ادھر چھپا ہوا تھا"

"بوری ہٹاؤ اس پر سے۔ نکالو اسے بوری سے کون ہے یہ۔۔۔؟"

شجاع احمد کی آواز لرز رہی تھی۔

"صاحب گردہ ہے چور دوں کا۔ ابھی ادھر گولی چلی ہے" رحیم داد نے کہا۔

"کیا ہنگامہ ہے ڈیڈی۔ یہ سب کیا ہے۔۔۔؟" احمد رضا نے پوچھا۔ اس کے ہاتھ میں پستول تھا۔

"تم اُدھر دیکھو احمد رضا... شاذیہ وہاں موجود ہے۔"
وہ سامنے پھولوں کے دوسرے تختے کے پاس اور احمد رضا اس طرف دوڑ گیا۔ دادا جان بھی قریب آگئے تھے۔ عازم پر سے لوہی ہٹا دی گئی اور شجاع احمد صاحب دنگ رہ گئے عازم پیروں پر کھڑا نہ رہ سکا۔ ان چاروں نے اس کی حالت تباہ کردی تھی۔ وہ زمین پر گر پڑا۔

"کیا کر رہے تھے یہاں عازم میاں! رات کو اس وقت؟"

"اُٹھا کر لاؤ اس بے غیرت کو بھی۔ میرے کمرے میں لاؤ" شجاع احمد نے نوکروں سے کہا۔

"او ہو ہو ہو... شجاع احمد! کیا کہہ رہے ہو تمہارے دوست کے بیٹے ہیں تمہارے عزیز ترین دوست کے بیٹے! وہ کیا کہے گا۔ کونسی ایسی غلطی ہو گئی ان سے؟ بچے ہیں رات کو کھیلنے کو جی چاہا ہو گا۔"
دادا جان کے لہجے میں بے پناہ طنز تھا۔

شجاع احمد کچھ نہ بولے۔ وہ فاخر کے پاس پہنچ گئے: "ڈیڈی! یہ فاخر بھائی ہیں" احمد رضا نے کہا۔

"لاؤ اسے بھی میرے کمرے میں"

"چچ! اچھا جان۔ یہ سب کیا ہے؟ میں کہاں ہوں؟" فاخر نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔

"پکڑو اسے اور گھسیٹتے ہوئے میرے کمرے میں لے آؤ" شجاع احمد نے کہا۔ رمضان اور رحیم داد نے فاخر کو بھی پکڑ لیا۔ عازم کی بُری حالت تھی۔ اس کا لباس بھی پھٹ گیا تھا۔

گھر کے تمام افراد شجاع احمد کے کمرے کے سامنے جمع ہو گئے۔ سب صورتِ حال معلوم کرنا چاہتے تھے۔ یہاں تک کہ بیگم صاحبہ بھی موجود تھیں۔

"آپ لوگ آرام کریں سب" شجاع احمد صاحب کرخت لہجے میں بولے۔

واردات کیا ہے یہاں؟ یہ معلوم کرنے سے سب کو دلچسپی ہو گی۔ تمہارے ان صبح کے چراغوں نے کیا گل کھلائے ہیں کسے یہ جاننے سے دلچسپی نہ ہو گی۔ آؤ سب لوگ اندر آؤ۔ سب کا اطمینان ضروری ہے" دادا جان نے کہا۔

"ابا! یہاں آپ! براہِ کرم" شجاع احمد صاحب نے احتجاج کیا۔

"تم بھی تو بلاوجہ رُعب جھاڑ رہے ہو یہاں۔ اصول کی بات کرو۔ اتنا بڑا ہنگامہ ہو گیا۔ گولیاں چلیں اور سب آرام سے جا کر سو جائیں۔ ایسی ان ہونی باتیں کیوں کر رہے ہو؟"

شجاع احمد نے زیادہ ضد نہیں کی اور کمرے میں داخل ہو گئے عازم اور فاخر ایک طرف کھڑے تھے۔ دفعتاً عازم زمین پر بیٹھ گیا اور اس نے گردن ڈال دی

"اوہ! یہ بے ہوش ہو گیا شاید" احمد رضا نے بتایا۔

"ارے ہوش میں لاؤ اسے۔ اے ہے کیا کیا بچوں نے۔ سب ان کے دشمن ہو رہے ہیں" بیگم صاحبہ بولیں۔

"کچھ نہیں بی بی۔ تھوڑا سا عشق کر رہے تھے بچیوں کو پھسلا رہے تھے تاکہ راتوں رات... دولت مند بن جائیں۔ شجاع احمد سے زیادہ بچیوں کی فکر کسے ہو سکتی تھی۔ وہی ان مایہ ناز سپوتوں کو یہاں لائے تھے۔ دوست کے بچے ہیں ان کے" دادا جان نے جواب دیا۔

"خدا کے لئے ابا میاں طنز نہ کریں۔ میں بھی انسان ہوں..." شجاع احمد بولے۔

"پوچھو ان مردودوں سے کیا کرنے گئے تھے وہاں؟" دادا جان نے گرج کر کہا اور پھر فاخر سے بولے: "کیوں بے! کیا کر رہا تھا پھولوں کے کنج کے پاس؟"

"وہ میں... میں سوتے میں چلنے کا عادی ہوں۔ کئی بار ایسا ہو چکا ہے" فاخر نے ہکلاتے ہوئے کہا۔

شجاع احمد خود مجرم تھے لیکن ان دونوں نے جو حرکت کی تھی وہ... ان کے لئے خود ناقابل برداشت تھی چنانچہ فاخر کے اس جھوٹ کو برداشت نہ کر سکے۔ ان کے زوردار تھپڑ نے فاخر کو زمین چٹا دی تھی۔

"اب جاگ گئے میاں۔ حقیقت اگل دو۔ جلدی شاباش!"

دفعتاً عازم کے حلق سے دھاڑ نکلی اور وہ اچھل کر کھڑا ہو گیا اس کی بے ہوشی اچانک دُور ہو گئی تھی۔ وہ اپنی کمر سہلا رہا تھا۔ دراصل زاہد اس کے پاس ہی کھڑا تھا اور عازم کی بے ہوشی اسکے ہاتھ میں دبے ہوئے ایک پن نے دُور کر دی تھی۔ جو عازم کی کمر میں آدھے کے قریب گھس گیا تھا۔

"لو عزیزم بھی ہوش میں آ گئے۔ چلو دونوں بھائی شروع ہو جاؤ" دادا جان بولے۔

"م... میں سچ عرض کر رہا ہوں دادا جان۔ میری مدد کریں میں سوتے میں چلنے کا عادی ہوں..." فاخر آنسوؤں بھری آواز میں بولا۔

"جی ہاں!"

"اور عازم میاں غالباً تمہاری تلاش میں وہاں گئے ہوں گے کیوں؟" دادا جان پیار سے بولے۔

"یہ بات تھی دادا جان۔ ہم سچ کہہ رہے ہیں یہی بات تھی۔" عازم نے بھی روتے ہوئے کہا۔

"کیوں شجاع احمد! بچے ٹھیک کہہ رہے ہیں کیا؟"

"بکواس کرتے ہیں یہ کمینے۔ یہ خط بھی تم نے عالم خواب میں لکھا ہوگا کیوں؟" شجاع احمد نے جیب سے خط نکال کر فاخر کے سامنے کر دیا۔

"خط! کیسا خط؟" فاخر بولا۔

"پڑھو... یاد کرو۔ شاید یاد آجائے؟"

"یہ... یہ میرے خلاف سازش ہے۔ میں نے کوئی خط نہیں لکھا جھوٹ ہے یہ سب۔" فاخر روتے ہوئے بولا۔

"ہاں! اس کوٹھی میں ہماری آمد کو اچھی نگاہ سے نہیں دیکھا گیا۔ روز اوّل ہی سے ہمارے خلاف سازشیں شروع کر دی گئی ہیں۔"

"اوہو! تو یہ بات ہے۔ سازشی کون ہیں فاخر میاں؟"

"زاہد... صرف زاہد صاحب۔ یہ بہت چالاک انسان ہے یہ یہاں... سب کے خلاف سازشیں کر رہا ہے..." عازم بولا۔

"احمد رعنا! پولیس کو فون کر کے بلاؤ۔ ہم ان سب کو پولیس کے حوالے کر دیتے ہیں۔ حقیقت خود سامنے آجائے گی۔"

"بہتر دادا جان!" احمد رعنا نے کہا اور شجاع احمد جلدی سے بول پڑے۔

"نہیں ابا میاں! ہم خود ہی انھیں ٹھیک کر لیں گے۔ پولیس کسی شریف آدمی کے ہاں نہیں آنی چاہیے۔"

"تو پھر اس کتے سے کہو کہ اپنے ناپاک منہ سے زاہد کا نام نہ لے۔ قدسیہ سے دل کا حال کون کہنا چاہتا تھا۔" دادا جان غرائے۔

"کیا مطلب؟" شجاع احمد چونک پڑے۔

"قدسیہ اپنا بیان دو۔" دادا جان نے کہا۔

"جی ہاں ڈیڈی! یہ عازم مجھے پریشان کر رہا ہے۔ اس نے مجھ سے کہا کہ رات کے گیارہ بجے پھولوں کے کنج کے پاس آجاؤں۔ یہ مجھے حالِ دل سنانا چاہتا ہے۔ میں نے یہ بات دادا جان کو بتادی۔"

"یہ سب جھوٹ ہے ہم سب قسم کھانے کو تیار ہیں۔ یہ سب جھوٹ ہے۔ قدسیہ بھی زاہد سے ملی ہوئی ہے۔" عازم بولا۔

"پھر زاہد کا نام لیا!" دادا جان اس کی طرف جھپٹے۔

"غور کر لینے میں کوئی حرج نہیں ہے ابا میاں۔ ہمیں یکطرفہ فیصلہ نہیں کرنا چاہیے۔ تم زاہد کا نام کیسے لے رہے ہو...؟" شجاع احمد نے پوچھا۔

"خط کی تحریر میری نہیں ہے۔ زاہد ہمیشہ ہماری تاک میں رہتا تھا۔ یہ سب اسی کا کیا دھرا ہے۔ آپ مجھ سے دوسری تحریر لکھوا کر دیکھ لیں اور یہ لڑکیاں... یہ دونوں لڑکیاں زاہد اور سرفراز کے چکر میں ہیں۔ ہاں۔" فاخر نے بدستور روتے ہوئے کہا۔

"کیوں ابا میاں! کیا اس بات کی تحقیقات نہیں کی جاسکتی؟" شجاع احمد بولے۔

"زیادہ بکواس کی تو جوتے لے کر شکل بگاڑ دوں گا۔ یہی ہیں تیرے جاسوس جنھیں تو جاسوسی کرنے کے لئے کوٹھی لایا تھا۔ یہ تیرے دوست کے بیٹے ہیں؟ کون ہے الیاس احمد؟ جواب دے مجھے۔ تو اتنا بے غیرت ہو گیا ہے شجاع احمد کہ اب اپنے گھر میں لفنگوں کو لا کر رکھنے لگا۔ زاہد کے خلاف جاسوسی کے لئے۔ یہ سن اور غیرت کر۔ لے سن۔" دادا جان نے اپنے لباس سے ٹیپ ریکارڈر نکال لیا اور پھر ٹیپ ریکارڈر سے ان دونوں کی آواز ابھرنے لگی۔ وہ شرمناک گفتگو جو وہ دونوں اس گھر کے بارے میں کر رہے تھے۔

شجاع احمد کا چہرہ دھواں ہو گیا۔ اب وہ اس ثبوت کی تردید نہ کر سکتے تھے۔ پھر اس کے بعد ان کی آنکھیں خون اگلنے لگیں۔

"یہ بھی زاہد کی آواز ہے؟" انھوں نے سرد لہجے میں پوچھا۔

عازم اور فاخر کے دم خم اب ختم ہو گئے تھے۔ اب ان کے پاس اپنی صفائی میں کہنے کے لئے کوئی بات نہیں رہ گئی تھی۔ پھر وہ آپے سے باہر ہو گئے۔ وہ ان دونوں پر ٹوٹ پڑے تھے۔

بڑی مشکل سے انھیں روکا گیا تھا۔ وہ تو شازیہ سے پستول چھین رہے تھے لیکن پستول دادا جان نے اپنے قبضے میں لے لیا۔ دوسرا پستول احمد رعنا کے ہاتھ میں تھا جسے اس نے چھپا لیا۔ بہرحال انھیں قابو میں کر لیا گیا۔ دادا جان نے عازم اور فاخر کو ٹھوکریں مارتے ہوئے کہا۔

"ان دونوں کتوں کو کوٹھی سے باہر نکال دو زاہد۔ کوئی سامان دینے کی ضرورت نہیں انھیں اور تم دونوں سن لو۔ آئندہ کبھی کوٹھی کے سامنے سڑک سے بھی گزرنے کی کوشش کی تو گولی مار دی جائے گی سمجھے!"

ان دونوں کو یہ صورت حال غنیمت لگی تھی۔ زاہد نے دونوں کی گدیاں پکڑیں اور گھسیٹتا ہوا باہر لے گیا۔ فیصل بھی باہر نکل گیا تھا

کوٹھی کے گیٹ سے انھیں باہر دھکا دیتے ہوئے زاہد نے کہا۔

"میرا مشورہ ہے پہلے تم لوگ جاسوسی کی باقاعدہ تربیت لو۔ آخر یہ تربیتی ادارے بے مقصد تو نہیں ہوتے۔ ویسے دادا جان کی بات کا خیال رکھنا۔ خدا حافظ۔"

وہ دونوں اس بُری طرح بھاگے کہ پلٹ کر نہ دیکھا۔ زاہد نے ایک قہقہہ لگایا تھا۔ پھر فیصل کے ساتھ واپس پلٹتے ہوئے کہا، "کہو کیسا مزا آیا۔"

"زبردست چیف۔ ہونہہ! اتنے بڑے جاسوسوں سے ٹکر لینے چلے تھے گدھے کہیں کے۔"

●

شجاع احمد سب کے سامنے رسوا ہوگئے تھے۔ ساری رات وہ ایک پل نہیں سو سکے تھے۔ جتنا غور کرتے اُلجھتے چلے جاتے۔ سب کچھ ان کی آنکھوں کے سامنے تھا۔ قدسیہ جھوٹ نہیں بول سکتی تھی۔ شازیہ نے انھیں خط لاکر دیا تھا۔ اور پھر ٹیپ ریکارڈر پر ان دونوں کی آواز موجود تھی۔ یہ تک پتہ چل گیا تھا سب کو کہ یہ دونوں کسی الیاس احمد کے بیٹے نہیں بلکہ ان کے جاسوس تھے جو زاہد کی جاسوسی کے لئے لائے گئے تھے۔

یہ معمولی بات تو نہ تھی۔ ان کے اہل خاندان تک ان سے بددل ہوگئے تھے اور زاہد کی پوزیشن پہلے سے زیادہ مضبوط ہوگئی تھی۔ اب اس عمارت میں اس کے خلاف کوئی کوشش کامیاب نہیں ہوسکتی تھی۔ انھیں رہ رہ کر ان دونوں پر غصہ آرہا تھا۔ فیصلہ نہیں کرپا رہے تھے کہ یہ سب اچھا ہوا یا بُرا۔ وہ دونوں کمبخت جس تھالی میں کھانے آئے تھے اسی میں سوراخ کرنے چلے تھے قدسیہ اور شازیہ کو ورغلا کر وہ کوئی اور مقام حاصل کرنا چاہتے تھے۔ اگر دونوں بچیاں زاہد جیسے شاطر کے تحفظ میں نہ ہوتیں تو بھٹک بھی سکتی تھیں۔ انھیں کانوں کان خبر نہ ہوتی اور وہ ہو جاتا جو ساری زندگی کے لئے ان کے چہرے پر کالک پھیر دیتا۔ اس طرح تو زاہد نے اپنا بچاؤ کرنے کے علاوہ ان پر ایک احسان بھی کر ڈالا۔ اس بات میں انھیں کوئی شک و شبہ نہیں تھا کہ عازم اور فاخر کی اس چال کو صرف زاہد نے ناکام بنایا ہے اور اس طرح کہ خود ان کی شخصیت بھی منظر عام پر آگئی لیکن اس کمبخت کو آخر پتہ کس طرح چلا؟

جی چاہا کہ فیصل کو بلا کر معلوم کریں کہ اس کے ٹیپ ریکارڈر میں ان کی آوازیں کس طرح ریکارڈ ہوئیں۔ یہ کس کی کوشش تھی لیکن بات نہ ہوئی۔ کسی نے کچھ بھی کہا ہوا تھا ان کے حق میں۔ اگر زاہد آنکھیں کھلی نہ رکھتا تو نہ جانے کیا ہوجاتا۔

صبح کو وہ ناشتے کی میز پر بھی نہ گئے۔ بریف کیس لے کر جلدی سے باہر نکل گئے۔ دفتر پہنچے تو قاسم حسین یاد آئے اور انھوں نے قاسم حسین کو طلب کرلیا۔

"وہ دونوں آپ کے پاس پہنچے؟"

"کون؟"

"فاخر اور عازم۔"

"نہیں۔ کوئی خاص بات ہوگئی ہے؟"

"آپ سے ان کا کیا تعلق تھا؟"

"میرے عزیز ہیں دونوں بچے۔"

"اور آپ نے ان عزیز بچوں کو راتوں رات کروڑپتی بنانے کے خواب دیکھے تھے۔ ایسے گھٹیا لڑکوں کو آپ نے میری کوٹھی میں کیوں بھیجا؟"

"میں سمجھا نہیں جناب!"

"سمجھ جائیں گے۔ استعفیٰ لکھ کر میرے پاس بھجوا دیں۔ کل سے آپ کی صورت نہ دکھائی دے ورنہ دھکے دے کر نکال دوں گا آپ کو۔ سمجھ گئے آپ۔" شجاع احمد گرج کر بولے۔

"لیکن میرا قصور شجاع احمد صاحب؟" قاسم حسین گھبرا کر بولے۔

"گیٹ آؤٹ۔ آئندہ آپ کی شکل نہ دیکھوں کبھی۔"

"بڑے آدمیوں کا کھیل ہے شجاع احمد صاحب۔ آپ خود اپنے گھر میں جاسوسی کرانا چاہتے تھے۔ اس میں میرا کیا قصور تھا۔ آپ اس بات کو ذہن میں رکھیں۔" قاسم حسین نے کہا۔

"گیٹ آؤٹ!"، شجاع احمد نے کہا اور قاسم حسین باہر نکل گئے۔

شجاع احمد سے اس کے بعد کوئی کام نہیں ہوسکا تھا۔ انھیں آپ اپنے دام میں پھنس جانے کا احساس اچھی طرح ہوگیا تھا لیکن اس بُری طرح پھنسے تھے کہ نکلنا مشکل ہوگیا۔ گھر واپس جانے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ اس لئے فوری طور پر ملک سے باہر جانے کا پروگرام بنالیا۔ ایک ملازم کو گھر بھیج کر چند جوڑے لباس منگوائے اور اسی شام وہ ہنگامی تیاریوں کے بعد اس شہر سے فلائی کر گئے۔

●

اس شام کی چائے پر زبردست قہقہے اُڑے تھے۔ دونوں جاسوس عاشقوں کے چرچے ہوتے رہے تھے۔ ہر شخص مزے

لے کر اپنے کارنامے بیان کر رہا تھا۔ بیگم صاحب ان دونوں کو
کوس رہی تھیں اور فیصل پیار سے اپنے ٹیپ ریکارڈر پر
ہاتھ پھیر رہا تھا۔

"لیکن ڈیڈی! آخر ان دونوں کو یہاں لائے کیوں تھے؟"
ہارون نے تعجب سے پوچھا۔

"بھئی دوست کے بیٹے تھے انکار کیسے کرتے..." زاہد
جلدی سے بولا۔

"لیکن داداجان نے تو کچھ اور کہا تھا۔ وہ جاسوسی والی
بات تھی۔"

"جاسوسی ان کے خلاف کی گئی تھی۔ شازیہ اور قدسیہ
کے خلاف بدتمیزی کی سزا دینے کے لئے۔"

"کیوں داداجان آپ کے الفاظ تو کچھ اور تھے؟"

"غصے میں کچھ بول گیا ہوں گا۔" داداجان نے بھی بات برابر
کرتے ہوئے کہا۔

"پتہ نہیں کمبخت کہاں جا کر مرے ہوں گے۔" شازیہ بولی۔

"اچھا ہوا خود ہی نکل گئے مجھے تو ایک آنکھ نہیں بھاتے تھے۔
ہر جگہ گھسنے کی کوشش کرتے تھے۔ ارے مہمان ہو مہمانوں کی طرح رہو
گھر میں۔ یہ کیا کہ گھر کے ہر کونے میں گھستے پھرو۔" بیگم صاحبہ نے کہا۔

"رویہ تو آپ کا بھی بہت اچھا تھا ان کے ساتھ امی جان۔"
احمد رضا نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"تمہارے باوا کی ہی ہدایت تھی کہ بچوں کو کسی طرح کی تکلیف
نہ ہونے پائے۔ کیا کرتی۔"

"وہ سسرا گدھا میرے لئے گھسی پٹی جاسوسی ناولوں کا تحفہ
لے کر آیا تھا۔ زاہد کی جگہ لینا چاہتا تھا۔ احمق کہیں کا..." دادا
جان بولے۔

"میرے لئے بھی تو کتابیں آئی تھیں داداجان۔" قدسیہ ہنس
کر بولی۔

"جاسوسی ناولیں؟" داداجان چونک کر بولے۔

"نہیں فن مصوری سے متعلق۔ بڑے بڑے مصوروں کی تصنیفات
ہے پڑی ہیں ایک کونے میں۔"

مجھے "دراصل ان گدھوں کو یہ علم نہیں تھا داداجان کہ قدسیہ
ب ان مصوروں سے بڑی فنکارہ بن چکی ہے۔ اس کی ٹکر کے مصور
ہے۔ نیا میں چند ہی ہوں گے بس..." زاہد نے اس گفتگو سے فوراً
مائدہ اٹھایا۔

"کیا واقعی؟" داداجان دلچسپی سے بولے۔

"ہاں داداجان بس آپ کی اجازت کی ضرورت ہے۔ اس کی تصاویر
کی ایک نمائش ہو جائے پھر آپ اس مصورہ کی شہرت دیکھئے۔ اس کوٹھی
کا نام ہو جائے گا۔"

"تو پھر نمائش کیوں نہیں ہو رہی بھئی؟"

"داداجان کے حکم کے بغیر یہ کیسے ممکن تھا؟"

"کمال ہے اب تک بتایا نہیں گیا ہمیں تیاریاں کرو۔ میں چاہتا
ہوں اسی ماہ نمائش ہو جائے۔ جب خدا نے اس گھر کو فن بخشا ہے
تو اس کو تاریکی میں کیوں رکھا جائے۔"

"کیوں بھئی سرفراز اجازت ہے؟" زاہد نے سرفراز کی طرف دیکھ کر
کہا تو وہ گڑبڑا گیا۔

"داداجان کی اجازت کے بعد کسی اور کی اجازت کی کیا ضرورت رہ جاتی
ہے زاہد بھائی۔" اس نے بمشکل کہا۔

"قدسیہ کے استاد کی حیثیت سے آپ کی اجازت بھی ضروری تھی
اس کے اندر چھپے ہوئے فنکار کو رنگوں اور لکیروں سے آپ نے ہی آراستہ
کیا ہے۔ سرفراز صاحب قدسیہ کے فن کی زندگی آپ کی مرہونِ منت
ہے۔" زاہد بولا۔ اور سرفراز کی گردن جھک گئی۔ شریف النفس انسان اپنے
احساس کا مجرم تھا لیکن زاہد جھٹ سے بولا۔

"کون کہتا ہے داداجان کہ حسنِ مشرق مٹ گیا۔ اس انکسار سے جھکی
ہوئی گردن پر لاکھوں بلندیاں قربان نہ کر دی جائیں۔ بہرحال سرفراز
کو اس نمائش پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔ داداجان کی اجازت مل گئی
ہے چنانچہ زاہد ذوالفقار زیدی نمائش کا اعلان کرتا ہے آپ تمام
حضرات کو بہت جلد اس کی تاریخ سے آگاہ کر دیا جائے گا۔"

زاہد کے اس اعلان کا تالیوں کی گونج میں استقبال کیا گیا۔
پھر زاہد نے کہا۔ فنکار کو اپنا فن اپنی اولاد کی طرح عزیز ہوتا ہے
لیکن سچا فنکار وہ ہے جو کسی کے کام بھی آئے۔ مجھے اجازت درکار
ہے کہ تصاویر کی نمائش کے اختتام پر ان تصویروں کو نیلام کر دیا
جائے اور ان سے جو کچھ وصول ہو وہ بیواؤں میں تقسیم کر دیا جائے
کیوں قدسیہ آپ مجھے اس کی اجازت دیں گی؟"

"خلوصِ دل سے۔ کاش آپ کی یہ کوشش بارآور ہو۔" قدسیہ
نے عجیب سے جذبات کے ساتھ کہا۔

"کیسے نہیں ہوگی۔ میرا نام زاہد ذوالفقار زیدی ہے۔" زاہد
نے آہستہ سے کہا جسے صرف سرفراز سن سکتا تھا۔

اسی رات سرفراز زاہد کے پاس پہنچ گیا۔ زاہد آرام کرنے لیٹ
گیا تھا۔ سرفراز کو دیکھ کر سنبھل گیا۔ "میں جانتا تھا کہ تمہارے
پیٹ کی حالت خراب ہوگی۔"

"آپ صرف پیٹ کی بات کر رہے ہیں زاہد بھائی! میرا سارا جسمانی نظام بگڑ گیا ہے۔"
"سبحان اللہ، سبحان اللہ۔ اپنے ڈاکٹر رضا سے رجوع کرو۔"
"اس کے ڈاکٹر تو آپ ہیں۔"
"حال بیان کرو۔"
"بے حال ہوں آپ کے اعلان کے بعد سے۔"
"وجہ ___؟"
"وہی جو بار ہا عرض کر چکا ہوں۔ یہ تصویریں اس گھر کی چار دیواری میں میری عزت کی طرح محفوظ تھیں۔ باہر جائیں گی۔ ناقدوں کی نگاہوں میں آئیں گی تو لوگ پستول لئے میرے پیچھے دوڑیں گے۔ خاص طور سے وہ جوان سے واقفیت رکھتے ہیں۔"
"واقفیت... ہونہہ... زاہد کو چیلنج کر رہے ہو سرفراز؟"
"اس کی جرأت شاید زندگی بھر نہ کر سکوں۔ خاص طور پر عازم اور فاخر کا حشر دیکھنے کے بعد۔"
"تو پھر کسی خدشے کا اظہار مت کرو۔"
"دنیا کو کیسے سمجھائیں گے زاہد بھائی؟"
"اس دنیا کو تم نے بڑی محدود نگاہوں سے دیکھا ہے سرفراز۔ میں اس سے بخوبی واقف ہوں۔ اپنے اعتماد کو بحال کرو۔ میں اپنے دست راست کو کمزور نہیں دیکھنا چاہتا۔"
"دست راست ___؟"
"ہاں میرے دوست۔ میرے مشن کی تکمیل میں تم میرے بڑے معاون ہو گے۔"
"مشن؟"
"بس کل سے میری کارروائی کا آغاز ہو جائے گا لیکن مجھے تمھاری ہمت کی ضرورت ہے۔ ہر تصویر کے بارے میں تمھیں سین دیا جائے گا۔ اسے یاد کرنا تمھارا کام ہو گا۔ اور تمھاری زبانی یہ سین قدسیہ تک پہنچنا چاہیئے۔ نہایت ہوشیاری سے کام جاری رکھو۔" زاہد نے فوراً خود کو سنبھال لیا۔
"جو اللہ کی مرضی میں کیا کر سکتا ہوں۔"
"بس وہ کرتے رہو جو میں کہوں۔"
"بہتر۔" سرفراز گہری سانس لے کر بولا۔
"کل رات یہی شکل لے کر پھر میرے پاس مت آجانا ورنہ مجھے غصہ آجائے گا۔"
"بہتر ہے خیال رکھوں گا۔" سرفراز نے ہنستے ہوئے کہا۔

"یہ دنیا بہت عجیب ہے سرفراز۔ یہ خود نہیں سمجھتی اسے سمجھایا جاتا ہے اور جو سمجھانے کا گر جانتے ہیں وہی اس دنیا میں جینے کا حق رکھتے ہیں۔ خدا حافظ۔" زاہد کا لہجہ تلخ ہو گیا تھا۔ سرفراز خاموشی سے وہاں سے اٹھ گیا۔

دوسرے دن زاہد سارا دن مصروف رہا۔ وہ فرسٹ ایڈ ہاؤس میں نہیں گیا تھا۔ تیسرے دن بھی اس کی مصروفیت کا یہی عالم رہا۔ البتہ اس دن دوپہر کو وہ فرسٹ ایڈ ہاؤس میں دادا جان سے ملا۔ پھر وہ اور دادا جان مل کر ایک وزیر کی کوٹھی پر گئے۔ تیسرے دن کے اخبارات ایک بہت بڑے اشتہار سے سجے ہوئے تھے۔

ملک کی عظیم مصورہ! قدسیہ شجاع احمد کے فن پاروں کی عظیم الشان نمائش۔ آرٹس امپوریم کی سب سے بڑی تقریب... دس مارچ سے بیس مارچ تک۔ قدسیہ اخبارات لئے ہانپتی کانپتی زاہد کو تلاش کرتی پھر رہی تھی۔

"ہیلو قدسیہ!" زاہد بیگم صاحبہ کے کمرے میں اسے مل سکا تھا۔
"آپ سے کچھ بات کرنی ہے زاہد بھائی۔"
"کرو... امی جان سے کون سی بات چھپائی جا سکتی ہے۔"
"یہ اشتہار... یہ...؟"
"پسند نہیں آیا۔"
"یہ بات نہیں ہے۔ میں ملک کی عظیم مصورہ کب سے ہو گئی؟"
"ہو نہیں گئیں تو ہو جاؤ گی۔ پرسوں اس سلسلے میں ایک پریس کانفرنس بلائی گئی ہے۔ سرفراز تمھیں اس کی تیاریاں کرا دیگا۔ دے گا۔"
"اوہ... اوہ!" قدسیہ ہانپنے لگی۔
"تم فن مصوری کے آسمان کا ایک درخشاں ستارہ ہو قدسیہ۔ دعوت نامے تیار ہو رہے ہیں۔ ملک کے طول و عرض سے بہترین فنکار بلائے جا رہے ہیں۔ جو تمھارے فن کو سراہیں گے۔ ایک اعلیٰ پائے کا سوینیئر تیار کیا جا رہا ہے۔ جس میں کوئی اشتہار نہیں ہو گا۔ یہ پبلسٹی آج سے اس تاریخ تک جاری رہے گی۔"
"اللہ کی پناہ! زاہد بھائی اتنے اعلیٰ پیمانے پر۔"
"اب تو ایسا ہی ہو گا بھائی۔ تم لوگ زاہد کے چکروں میں پھنس گئے ہو۔ کیا کیا جا سکتا ہے۔"
"خدایا ہر شریف گھرانے کو ایک زاہد دے دے۔ میں اس کے

علاوہ اور کیا کہوں" بیگم صاحبہ پیار سے بولیں۔

"ارے ارے امی! آپ ہمارا بُرا چاہ رہی ہیں۔ زاہد بھائی ہمارے ہیں ایسے دوسرے کہاں سے آئیں گے۔ دوسرے شریف گھرانوں کے لئے۔"

"بس بس۔ قدسیہ صاحبہ مکھن نہ لگائیں۔ آج رات میں فارغ ہُوں۔ آپ کو پریس کانفرنس کے لئے تیاریاں کرانی ہیں۔۔۔ تیار ہو جائیں۔"

"ہم تیار ہیں۔"

"شجاع احمد ابھی تک نہیں آئے۔" زاہد۔ شرمسار ہو کر گئے ہیں۔۔۔ بڑے جذباتی آدمی ہیں۔" بیگم صاحبہ نے کہا۔

"آپ فکر نہ کریں آجائیں گے۔ جو ہونا تھا ہو چکا وہ بھی جان کر لیتے بُرے لوگوں کو تو نہ لائے ہوں گے۔ ویسے میں دفتر سے معلوم کر لیتا ہُوں۔"

"ہاں یہ مناسب ہوگا۔"

"بہتر ہے۔ اجازت!" زاہد اُٹھ گیا۔ شام کو اس نے بیگم صاحبہ کو اطلاع دی کہ شجاع احمد صاحب چودہ تاریخ کو واپس آئیں گے۔ وہاں انھیں چیمبر آف کامرس کی ایک میٹنگ میں شرکت کرنی ہے۔"

اور پھر رات کو قدسیہ کے نگار خانے میں پریس کانفرنس کی ریہرسل ہو رہی تھی۔ بڑی مشکل سے زاہد اس کی جھجک دُور کر سکا تھا۔ قدسیہ کافی دیر کے بعد خود پر قابو پا سکی تھی۔ سرفراز اس سے زیادہ جھینپا ہُوا تھا اور زاہد ان دونوں کو ڈانٹ رہا تھا۔

وقت مقررہ پر پریس کانفرنس کا آغاز ہُوا۔ پریس کے نمائندوں کے لئے یہ کوٹھی اجنبی نہیں تھی۔ مہمانوں کی تواضع کے زبردست انتظامات کئے گئے تھے۔ پہلے انھیں مشروبات پیش کئے گئے۔ رات کے کھانے پر پندرہ اقسام کی ڈشز تھیں۔ ایک سے ایک شاندار۔ مشروبات کے بعد کانفرنس کا آغاز ہُوا۔

"معزز دوستوں سے ایک مؤدبانہ التماس ہے۔" زاہد نے آغاز کیا۔ "اس گھر کے ایک آدمی۔۔۔ غمگسار کی حیثیت سے میں یہ عرض کرنے کی جسارت کر رہا ہوں کہ محترمہ قدسیہ شجاع احمد پہلی بار کسی پریس کانفرنس کے سامنے ہیں۔ ایک مشرقی خاتون ہونے کی حیثیت سے ان کی جھجک فطری ہے ہم آپ حضرات سے پُر خلوص تعاون کے طلب گار ہیں۔ ان کے جوابات کو حسین الفاظ سے نوازیں ہم آپ کے شکر گزار ہوں گے۔"

"ہم اس عظیم۔۔۔ علم پرور۔۔۔ گھرانے کے لئے اجنبی نہیں ہیں۔ اِس کی عزت اور پذیرائی ہمارا فرض ہے۔" پریس کے ایک نمائندے نے کہا "جہاں مِس قدسیہ کو کوئی اُلجھن پیش آئی وہاں میں سمع خراشی کروں گا۔"

"کوئی حرج نہیں زاہد بھائی۔"

"خاتون قدسیہ! آپکے فن کی کیا عمر ہے۔۔۔؟"

"اصل عمر صرف چند ماہ لیکن میں بچپن میں بھی لکیروں سے کھیلتی تھی۔" قدسیہ شرماتے ہوئے لہجے میں بولی۔ زاہد کی زبان تھی۔

"خوب! فن مصوری میں آپ نے کسی خاص موضوع کو اپنایا؟"

"جی نہیں! مجھے احساسات پر کوئی بوجھ ناپسند ہے۔ زندگی کو جس رنگ میں پایا، محسوس کیا، پیش کر دیا۔"

"کیا ان فن پاروں کی نمائش کا خیال ابتدا سے آپ کے ذہن میں تھا؟"

"جی نہیں۔ میں نے انھیں اپنی پیاس کی تسکین کے لئے بنایا تھا۔ میرے دوستوں نے مجھے مجبور کیا کہ میں دوسروں کو ان سے محروم نہ رکھوں۔"

"ہاں! فنکار اپنے خول میں بند ہو جائے تو محدود ہوتا ہے آپ کی مصوری ہمارے ملک کو شہرت بخشے گی۔ فن کی تکمیل میں آپ نے کسی سے سہارا لیا؟"

"میں اسے صرف سہارا نہیں کہوں گی۔ خیالات میرے ذہن میں بند تھے۔ ان کی کوئی زبان نہیں تھی۔ کوئی نقش نہیں تھا۔ مجھے رنگ اور لکیروں کی شناخت میرے اُستاد سرفراز احسان کا احسان ہے۔ یہ احسان میری زندگی میں محیط ہے اور ان کے نام کے بغیر میں مصورہ کہلانے کی مستحق نہیں ہُوں۔"

"اس ضمن میں تھوڑا سا کریڈٹ اس خادم کو بھی ملتا ہے۔" زاہد نے کھڑے ہو کر کہا۔

"وہ کیا زاہد صاحب؟"

"میرے نوجوان دوست سرفراز ایک درویش انسان ہیں۔ انھوں نے کبھی اپنی کسی تصویر کی نمائش نہیں کی۔ فن کو انھوں نے اپنی حرم قرار دیا اپنی ذات کے لئے تخلیق کی اور فنا کر دی۔ بمشکل تمام میں نے انھیں آمادہ کیا کہ وہ قسم توڑ دیں اور اپنے فن کا کچھ حصّہ قدسیہ صاحبہ کو دے دیں۔ یوں وہ قدسیہ کے اُستاد بنے۔"

"کیا ہم سرفراز صاحب سے مل سکتے ہیں؟"

"ضرور۔ سرفراز احسان۔" زاہد نے سرفراز کو بازو سے پکڑ کر کھڑا کر دیا۔

فوٹو گرافروں نے سرفراز کی متعدد تصاویر بنائیں۔ پھر قدسیہ کو

اس کے قریب کھڑا کر کے کئی تصویریں لی گئیں۔ دونوں کے چہرے سرخ ہو رہے تھے۔

"کوئی اور سوال؟" زاہد نے پوچھا۔

"زاہد صاحب! بذاتِ خود آپ کیا چیز ہیں؟"

"اس گھر کا نمک خوار جو زیادہ تنخواہ کی پیشکش پر کہیں نوکری کو نہیں نکلا کیونکہ اس گھرانے نے اسے اپنے خاندان کے ایک فرد کی سی عزت دی ہے۔" زاہد نے گردن خم کر کے کہا۔ زاہد کی اس بات پر ایک قہقہہ پڑا تھا۔ دادا جان کھڑے ہو کر بولے۔

"یہ زاہد کی کسرِ نفسی ہے۔ شجاع احمد میرا بڑا بیٹا ہے اور زاہد چھوٹا۔ وہ میرے لئے کسی سے کم نہیں ہے۔"

اس کے علاوہ میں ایک اور اعلان کرنا چاہتا ہوں۔ بات جب سچے فن کی ہوتی ہے تو فنکار کے احساسات کا ذکر بھی ضروری ہے۔ قدسیہ صاحبہ نے دن رات کی شدید محنت کے بعد یہ تصویریں بنائی ہیں۔ لیکن انھوں نے ایک صاحبِ دل ہونے کا ثبوت بھی دیا ہے۔ نمائش کے بعد یہ تصویریں نیلام کی جائیں گی اور ان سے جو آمدنی ہوگی وہ اسی وقت پائی پائی کے حساب کے ساتھ ان بیواؤں کے لئے وقف کر دی جائے گی۔ جو عزت دار ہونے کی وجہ سے برسرِعام بھیک نہیں مانگتیں بلکہ محنت کر کے زندگی گزارنا چاہتی ہیں۔ یہ رقم انھیں باعزت روزگار فراہم کرنے کے لئے پیش کر دی جائے گی۔ بے گھر کو گھر دیا جائے گا۔ بے سہارا کو سلائی مشینوں اور دوسری صنعتوں کے لئے ضروری چیزیں فراہم کی جائیں گی۔"

"اس گھرانے نے انسانیت کی جو خدمت کی ہے اسے ہم فرسٹ ایڈ ہاؤس کے نام سے جانتے ہیں۔ یہ ایک اور عظمت ہوگی جو شجاع احمد اور حسام احمد کے نام کے ساتھ گنی جائے گی۔" نمائندوں نے کہا۔ مزید کچھ گفتگو کے بعد کانفرنس ختم ہو گئی۔ ڈنر کی تیاریاں مکمل ہو گئی تھیں۔

چنانچہ صحافیوں کو کھانے کی میز پر حملہ آور ہونے کی دعوت دی گئی اور انواع اقسام کی ڈشیں تاراج ہونے لگیں۔ یہاں تک کہ یہ تقریب ختم ہو گئی۔ دوسرے دن بادرچیوں کا کمال اخبارات کے صفحات پر عیاں تھا۔ بہت توصیفی الفاظ کے ساتھ اس کانفرنس کی تفصیلات لکھی گئی تھیں۔ جگہ جگہ سرفراز او رقدسیہ کی تصویریں لگائی گئی تھیں۔ شجاع احمد اور حسام احمد کے بارے میں نہ جانے کیا کیا لکھا گیا تھا۔ یہ کانفرنس کامیاب ترین کانفرنس قرار دی جا سکتی تھی۔

اخبارات دیکھ کر قدسیہ خوشی سے رو پڑی تھی۔ سرفراز کا رنگ بدستور فق تھا لیکن زاہد کے سامنے وہ بھونڈے سے انداز میں مسکرا رہا تھا۔

"بس تم تو مر ہی جاؤ بزدل کہیں کے۔" زاہد نے اس کی شکل دیکھ کر غصے سے کہا تھا۔

"خدا کرے زاہد بھائی میں واقعی مر جاؤں۔"

"خودکشی کر سکتے ہو۔ ہمت کیا ہے؟"

"حرام ہے۔" سرفراز ہنس کر بولا۔

"اور کسی کا دل جلانا حلال ہے کیوں؟"

"نہیں زاہد بھائی! کس طرح آپ کے ان احسانات کا قرض اتاروں گا۔"

"چانس ملے گا اس کا بھی؟" زاہد نے جواب دیا۔

"کب؟ خدا کرے وہ وقت جلدی آئے۔" سرفراز نے کہا

"آئے گا ضرور۔ اس وقت تمھارے جذبات دیکھوں گا۔ فی الحال تو ایک اور احسان کرنے جا رہا ہوں تم پر۔"

"کتنے احسانات کریں گے زاہد بھائی۔۔ کیا میں اس قابل تھا؟"

"خیر قابل تو شجاع احمد کے داماد بننے کے بھی نہیں ہو۔ ایسا بزدل انسان بھلا اس حیثیت سے شجاع احمد کا سامنا کس طرح رہے گا۔"

"کس حیثیت سے۔۔۔؟" سرفراز زاہد کے الفاظ پر بھونچکا رہ گیا تھا۔

"اپنے داماد کی بات کر رہا ہوں۔"

"کون؟ کس کا داماد؟"

"تم شجاع احمد کے داماد۔" زاہد نے کہا اور سرفراز کی آواز ہی بند ہو گئی۔ اس کے ہونٹ بے آواز ہل رہے تھے۔ چہرے پر شدید دہشت نظر آ رہی تھی۔

"او بھائی۔ تیرے ساؤنڈ بکس کو کیا ہوا۔۔۔؟"

"زاہد۔۔ زاہد بھائی یہ آپ؟ یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟" سرفراز کی دہشت بھری آواز ابھری۔

"میاں ہم کیا کہیں گے۔ اس کوٹھی کے در و دیوار کہہ رہے ہیں۔ نگار خانے کی ایک ایک تصویر کہہ رہی ہے۔ پائیں باغ کے شجر کہہ رہے ہیں۔ پھول پتوں کی زبان پر یہی نغمہ ہے۔"

سرفراز کے قدموں میں جان نہ رہی۔ وہ بیٹھ گیا۔ "خدا کے لئے زاہد بھائی، خدا کے لئے ایسی باتیں نہ کیجئے۔"

"شرم آ رہی ہے۔"

"نہیں۔ میں یہ خواب نہیں دیکھنا چاہتا۔"

"معاف کرنا، غور وار قصور ہمارا نہیں ہے۔ بس اس وقت تمہارے پاس آرہے تھے کہ پھولوں کے کنج کے قریب دو قمریاں چہکتی نظر آئیں اور ہمارے قدم رک گئے۔"

"خدا کی قسم، خدا کی قسم میرا قصور نہیں تھا۔ میں نے ایسی کوئی کوشش نہیں کی تھی۔"

"معلوم ہے... اور کچھ؟"

"کبھی اس کی کوشش نہ کریں زاہد بھائی۔"

"کیوں؟"

"میں اس قابل نہیں ہوں۔"

"بنایا جائے گا... بنایا جائے گا۔ تم لوگ میری ذمے داریوں میں کوئی نہ کوئی اضافہ کرتے ہی رہتے ہو۔"

"مگر یہ کیسے ممکن ہے زاہد بھائی۔ میں تو... میں تو اس گھر کا بھکاری ہوں۔ مجھے تو... مجھے تو جو کچھ ملا ہے۔ آپ کے طفیل یہیں سے ملا ہے۔"

"اس گھر کی دامادی بھی تمہیں ہمارے ہی طفیل ملے گی... حوصلہ رکھو۔ بزدلی مجھے ناپسند ہے۔"

سرفراز گہری گہری سانسیں لے رہا تھا۔ پھر اس نے گھٹی گھٹی آواز میں کہا۔

"آپ کو... آپ کو ساری حقیقت معلوم ہے نا زاہد بھائی۔ خدا کی قسم میں نے کبھی خواب میں بھی ایسی بات نہیں سوچی تھی۔"

"شجاع احمد کے سامنے بھی یہی کہہ دینا۔ مروا دینا زاہد کو..." زاہد نے آنکھیں نکال کر کہا۔

"نہیں زاہد بھائی۔ آپ کے لئے تو سو بار مر جاؤں گا۔ آپ ایک دفعہ کہہ کر تو دیکھیں۔"

"چلو چھوڑو ان باتوں کو بے فکر رہو۔ جب تک زاہد زندہ ہے تمہارے لئے عمل کرتا رہے گا۔ مجھے یہ جوڑی اس رات پسند آگئی تھی غالباً اس حادثے کی پہلی رات تھی۔ ایک بار پھر اپنی پوزیشن صاف کر دوں۔ میں تم سے ملنے جا رہا تھا کہ میں نے تم دونوں کو دیکھا۔ تمہاری گفتگو سنی اور دل میں سوچا کہ زاہد صاحب یہ جوڑی تو ملنی ہی ہے لیکن ابھی کچھ دیر لگے گی۔"

"یہ کیسے ممکن ہے زاہد بھائی۔ آخر یہ کیسے ممکن ہے؟"

"فرسٹ ایڈ ہاؤس بھی ناممکن تھا۔ ان دونوں جاسوسوں کو نکال بھگانا بھی ناممکن ہی تھا کیونکہ وہ شجاع احمد کی کمزوری تھے۔ آپ سے معاملات ناممکن تھے لیکن اب آہستہ آہستہ سب کچھ ممکن ہوتا جا رہا ہے۔ جاؤ عیش کرو سرفراز، زاہد موجود ہے تمہارے سروں پر۔"

"خدا آپ کو ہمیشہ سلامت رکھے۔" سرفراز نے پیار بھرے لہجے میں کہا اور زاہد اس کا گال تھپتھپانے لگا۔

"ایک سوال کرنا چاہتا ہوں زاہد بھائی؟"

"کرو۔"

"آپ کون ہیں؟ آپ کو ہماری یہ مدد کر کے کیا حاصل ہو رہا ہے؟"

"میں مریض ہوں سرفراز۔ اپنے علاج کے لئے بھاگ دوڑ کر رہا ہوں۔ میری کامیابی کی دعا کرو۔"

"سرفراز کو اپنا ہم راز نہیں بنائیں گے؟"

"وقت آنے دو۔ بس اب بھاگ جاؤ۔ مجھے ابھی زبردست کام انجام دینے ہیں۔"

"میں جاتا ہوں۔ خدا حافظ۔" سرفراز نے کہا اور آنسو خشک کرتا ہوا وہاں سے چلا گیا۔ زاہد کسی گہری سوچ میں گم ہو گیا تھا۔ اس کے چہرے پر عجیب سے تاثرات تھے۔ پھر اس نے اخبارات اٹھائے اور اپنی جگہ سے اٹھ کر باہر چلا گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ بیگم صاحبہ کے کمرے میں تھا۔

"آپ نے اخبارات دیکھے امی جی!"

"ہاں ہاں! ان اخبارات نے تو ہمیں بڑی اہمیت دی ہے یہ سب تمہارا کارنامہ ہے۔"

"میں نے ان اخبارات میں ایک چیز دیکھی ہے امی جس نے مجھے حیران کر کے رکھ دیا ہے۔"

"خیریت، آئیے۔"

"آپ اس صفحے کو دیکھئے، کوئی خاص بات نظر آئی آپ کو؟"

"ہاں۔ میں نے اس اخبار کا یہ صفحہ دیکھا ہے۔ پڑھا ہے اسے۔ ویسے تو ساری چیزیں ہی خاص ہیں... تمہارا اشارہ کس طرف ہے؟"

"نہیں امی! ایک بار پھر غور سے دیکھئے۔" زاہد نے کہا اور بے چاری بیگم صاحبہ بغور اخبار کے صفحے کی ایک ایک چیز دیکھنے لگیں۔ پھر بولیں۔

"دیکھ لیا میں نے۔"

"کوئی خاص بات نہیں نظر آئی؟"

"بھئی میں تو نہیں سمجھ سکی۔"

"ان تصویروں کو ذرا غور سے دیکھئے امی۔" زاہد نے کہا اور

بیگم صاحبہ سرفراز اور قدسیہ کی تصویریں دیکھنے لگیں۔

"بڑے پیارے لگ رہے ہیں دونوں۔"

"لگ رہے ہیں نا۔ بس یہی دکھانا چاہتا تھا میں آپ کو، انھیں دیکھ کر تو میں حیران رہ گیا ہوں۔"

"کیوں۔ اس میں حیرانی کی کیا بات ہے؟"

"امی یہ جوڑی دیکھئے۔ خدا کی قسم یوں لگ رہا ہے جیسے دونوں ایک دوسرے کے لئے بنائے گئے ہوں۔ امی کیوں نہ ہم اس تصویر کو دائمی رنگ بخش دیں۔" زاہد نے کہا۔ بیگم صاحبہ پہلے تو کچھ نہ سمجھیں پھر سمجھیں تو دنگ رہ گئیں۔ ان کا منہ حیرت سے کھلا رہ گیا تھا۔

زاہد مسکراتی نگاہوں سے بیگم صاحبہ کو دیکھ رہا تھا۔ تھوڑی دیر تک وہ حیرت کا شکار رہیں پھر دوبارہ اخبار اٹھایا اور اس تصویر کو بغور دیکھنے لگیں جس میں قدسیہ اور سرفراز ساتھ ساتھ کھڑے مسکرا رہے تھے۔ دیر تک وہ اس تصویر پر نگاہ جمائے رہیں پھر ان کی آنکھوں میں پیار جاگ اٹھا۔ چشم تصور میں شاید انھوں نے ان دونوں ایک دوسرے کے جیون ساتھی کے روپ میں دیکھا تھا۔ پھر دفعتاً ان کی مسکراہٹ سکڑ گئی۔

زاہد ان کے چہرے کے ایک ایک تاثر کو نوٹ کر رہا تھا۔

بیگم صاحبہ سیدھی سادی سی خاتون تھیں۔ ہر طرح کے فریب اور ریا سے پاک اس لئے ہر احساس کی لکیر ان کے چہرے پر نمایاں ہو جاتی تھی۔ چنانچہ زاہد سے بولیں۔

"ہاں مجھے بھی اس الجھن کا احساس ہے۔"

"اس سلسلے میں شاید ہم کسی طرح انھیں مجبور نہیں کر سکیں گے۔" بیگم صاحبہ متفکرانہ انداز میں بولیں۔ پھر چونک کر کہنے لگیں۔

"تم کس الجھن کی بات کر رہے ہو؟"

"جو آپ کے ذہن میں پیدا ہوئی ہے۔"

"بھلا کیا الجھن پیدا ہوئی ہے میرے ذہن میں؟"

"محترم شجاع احمد صاحب۔" زاہد مسکرا کر بولا۔

"جادوگر ہو تم بھی۔ خود سوچو۔ وہ برداشت کر لیں گے؟"

"قطعی نہیں برداشت کریں گے۔"

"پھر یہ سب کیسے ہوگا۔۔۔؟"

"میں صرف آپ کی رائے جاننا چاہتا ہوں امی جان۔"

"یہ دونوں تو بڑے ہی خوبصورت لگ رہے ہیں۔ میں نے اس نگوڑے کو پہلے اس طرح دیکھا ہی نہیں تھا۔" بیگم صاحبہ کے لہجے سے ممتا برس رہی تھی۔

"میں نے بھی نہیں دیکھا تھا امی جان! لیکن یہ تصویر دیکھ کر میری آنکھیں کھلی رہ گئیں۔"

"اس میں کوئی شک نہیں ہے۔ بڑی خوبصورت جوڑی لگ رہی ہے۔"

"ایسی ویسی، یوں لگتا ہے کہ جیسے آسمانوں میں ترتیب دی گئی ہے۔"

"لیکن شجاع احمد کا کیا ہوگا؟"

"قدرت خود اس کے اسباب پیدا کرے گی میرے ذہن میں ایک تاثر پیدا ہوا اور میں آپ کے پاس دوڑا آیا۔ آپ میرے اس جذبے کو سمجھتی ہیں امی جان؟"

"کون سا جذبہ؟"

"دراصل آپ جانتی ہیں کہ اس دنیا میں میرا خاندان آپ لوگ ہیں۔ میں نوکر کی مانند یہاں آیا تھا لیکن آپ کو امی جان کہتا ہوں۔ آپ لوگوں نے مجھے وہ مقام دیا جس سے محروم تھا اور شاید ساری زندگی محروم رہتا لیکن۔۔۔ اس گھر میں مجھے سب کچھ مل گیا۔ ماں باپ، دادا جان، بھائی، بہن، امی جان میں خاندان کے ایک فرد ہی کی مانند آپ سب لوگوں کے بارے میں سوچتا ہوں۔"

"یہ بات کون نہیں جانتا بیٹے۔" بیگم صاحبہ بڑی محبت سے بولیں۔

"میری نگاہ میں اس خاندان کے ایک ایک فرد کی۔۔۔ بہتری رہتی ہے۔ جو کچھ میرے ذہن میں آتا ہے لے دوڑتا ہوں۔ اب دیکھئے نا یہ تصویر دیکھ کر میں بے قابو ہو گیا۔ آپ اس کی وجہ جاننا چاہتی ہیں۔۔۔؟"

"ضرور۔"

"امی جان! دولت مند لوگوں کا ایک مخصوص انداز فکر ہوتا ہے۔ ایک مخصوص تربیت ہوتی ہے۔ شجاع احمد صاحب اپنی بیٹیوں کے لئے اس معیار کے رشتے تلاش کریں گے جس کے وہ خود ہیں۔ بلاشک و شبہ انھیں ایسے رشتے ملیں گے۔ یہ وہ لوگ ہوں گے جو دولت میں کھیلتے ہوں گے، اور معاف کیجئے گا دولت کے رنگ عجیب ہوتے ہیں۔ ان سے دنیا کی ہر شے خریدی جا سکتی ہے۔ عزت و وقار کے لاکھوں معیار اس دنیا میں پھیلے ہوئے ہیں۔ دولت ہو تو عزت خرید لیجئے، وقار خرید لیجئے۔ خاندانی شرافت و نجابت اس [illegible] میں مفقود نہیں ہے لیکن دولت کے۔۔۔ اثرات چار [illegible] نمایاں ہیں۔ نئی نسل جدت کے نام پر اخلاقی حدود سے گزر چکی ہے اور اب اخلاقیات اس کے لئے ایک بھولی بسری کہانی ہے۔ ہاں وہ نوجوان

شریف بھی اور اہلِ اخلاق بھی ہیں جو دولت کی چمک کے شکار نہیں ہوئے ان کے ذرائع محدود ہیں اس لئے وہ پستیوں میں نہیں گر سکے۔"

زاہد کہہ رہا تھا اور بیگم صاحبہ سن رہی تھیں چند لمحات رک کر اس نے ان کی شکل دیکھی پھر بولا۔

"آپ میری باتیں سمجھ رہی ہیں نا؟"

"ہاں بیٹا! کچھ سمجھ بھی رہی ہوں اور کچھ سمجھ میں بھی نہیں آرہی ہیں۔"

میں صرف اتنا کہنا چاہتا تھا امی جان کہ ہم اپنی ان بھول سی نازک بہنوں کے لئے دولت مندوں کے رشتے تیار کریں گے تو بے شک وہ ان کے معیار کے ضرور ہوں گے۔ . . لیکن انھیں اپنے معیار میں تبدیلیاں پیدا کرنی پڑیں گی۔ چونکہ وہ خود ان کی سطح کی ہوں گی۔ اس لئے وہ لوگ قدسیہ اور شازیہ کی برتری قبول نہیں کرسکیں گے۔ آپ نے اپنی بچیوں کے مان کو کبھی نہیں توڑا۔ جس طرح والدین اپنی اولاد کی پرورش کرتے ہیں وہی جانتے ہیں۔ میں کافی عرصے سے اس کوٹھی میں ہوں۔ دیکھ رہا ہوں کہ قدسیہ اور شازیہ کس طرح پروان چڑھ رہی ہیں۔ کوئی آرزو ان کے دل میں پیدا ہوئی اور ان کی پسند کی چیزوں کے ڈھیر لگا دیئے گئے لیکن اس وقت جب وہ کسی کی محکوم کی حیثیت سے اس کے زیر اثر ہوں گی اور کسی بات کی خواہش کریں گی تو اس خواہش کے جواب میں وہ جذبہ نہیں ہوگا جو آپ لوگوں کے سینے میں ہے۔ وہاں انھیں برابر کی نگاہ سے دیکھا جائے گا۔ انھیں ٹال دیا جائے گا۔ ان کی وہ تمام خواہشات قابل احترام نہیں سمجھی جائیں گی۔ جو ان کے ذہن میں پیدا ہوں گی۔ ہاں کوئی معمولی خواہش ہوئی تو ٹھیک ہے پوری کردی۔ تو امی جان جس طرح آپ نے ان کی شخصیت بنائی ہے۔ وہ دوسری جگہ جا کر قائم نہ رہ سکے گی اور انسان جب ٹوٹتا ہے تو بے انتہا محرومیوں کا شکار ہوتا ہے رفتہ رفتہ یوں ہوگا کہ وہ محرومیاں اپنانے لگیں گی۔ ان کی وہ شخصیت ہی نہ رہے گی۔ جو ہے گویا آپ نے اپنی بچیاں جہنم میں جھونک دیں۔ آپ کے پاس خدا کا دیا سب کچھ ہے آپ چاہیں تو عمر کی آخیر تک ان کی خواہشات اسی طرح پوری کر سکتی ہیں جس طرح آپ نے ان کی پیدائش کے بعد سے اب تک کی ہیں۔ جب یہ ساری چیزیں آپ کو حاصل ہیں، امی جان تو پھر کیوں اپنی بچیوں کو امارت کے غار میں دھکیل رہی ہیں۔ کیوں ایسے لوگوں کو تلاش کر رہی ہیں جو آپ کی سطح کے ہوں اور آپ کو کچھ نہ سمجھیں۔ مجھے بتایئے کوئی دولت مند شخص آپ کا داماد ہوگا۔ وہ اپنی دنیا کا انسان ہوگا۔ آپ کو کس طرح وہ خاطر میں لائے گا۔ گویا آپ نے اسے اپنی بچی بھی دی اور آپ کی کوئی حیثیت بھی نہ رہی۔ کیا آپ کی یہ بھول سی بچیاں دکھوں کا شکار نہ ہوجائیں گی؟"

بیگم صاحبہ کی آنکھوں میں نمی آگئی تھی۔ وہ ایک سسکی سی لے کر بولیں: "ہاں! کیوں نہیں کیوں نہیں۔"

"تو پھر امی اس کے ذرائع ہیں ہمارے پاس۔ ابھی سب کچھ ہمارے ہاتھ میں ہے۔ ہم نے اپنی بچیوں کو فروخت نہیں کیا ہم نے کسی بااثر اور دولت مند شخص کے ہاتھوں اپنا وقار بیچ نہیں دیا۔ ہم کیوں ایک ایسے شخص کو تلاش کریں جو ہمیں مستقبل میں کچھ نہ سمجھے۔ جو صرف ہمیں ایک ضرورت مند خیال کرے۔ آپ بتایئے۔ اس کے برعکس ہم ایسا کیوں نہ کریں کہ دو انتہائی شریف الطبع نوجوانوں کو جو ہماری اپنی مٹھی میں ہوں۔ ان بچیوں کے لئے منتخب کرلیں۔ ہم انھیں وہ حیثیت دے دیں۔ وہ اختیار دے دیں کہ وہ دوسروں کی نگاہ میں صاحب حیثیت ہوجائیں لیکن ہمیشہ اس بات کا خیال رکھیں کہ ان کی شخصیت کی تکمیل میں ہماری اپنی کوششوں کو دخل ہے آپ بتایئے میں ایک معمولی سی بات آپ سے کہہ رہا ہوں۔ سرفراز تعلیم یافتہ ہے، سمجھدار ہے، شریف ہے، خوبصورت ہے اور پھر امی جان یہ تصویر دیکھئے، کیا یوں نہیں لگتا کہ سرفراز اور قدسیہ ایک دوسرے کے لئے بنے ہیں۔ . . . بہت سے ایسے جوڑے ملتے ہیں۔ لڑکی انتہائی خوبصورت، لڑکا لنگور کی شکل کا۔ بے پناہ دولت مند ہے۔ اعلیٰ قسم کا سوٹ پہنے ہوئے ہے لیکن لنگور ہی لگ رہا ہے۔ امی کیا آپ لنگور کو انسان بنا سکتی ہیں؟"

"نہیں بالکل نہیں بنا سکتی۔" بیگم صاحبہ نے سہمے ہوئے لہجے میں کہا۔

"ٹھیک ہے نا اب آپ ذرا بتایئے کہ اگر سرفراز قدسیہ سے منسوب ہوجاتا ہے اگر آپ کی تھوڑی سی مدد کر کے اُسے الگ کاروبار کرادیتی ہیں تو یہ کوئی مشکل کام نہیں ہے۔ آپ یہ ذمے داری میرے اوپر چھوڑ دیں میں سرفراز کو اس کوٹھی سے ہٹا کر اس کو کوئی چھوٹا موٹا سا کاروبار کرادوں گا۔ ہم دیکھتے ہیں اس کی صلاحیتوں کو کہ وہ اس کاروبار کو کہاں تک بڑھا کر دکھا سکتا ہے۔ سرفراز کو ہم نے ایک کاروبار کرادیا۔ اس نے اس میں ترقی کی اپنے طور پر اپنے پیروں پر کھڑا ہوگیا اس کے بعد ہم نے عزت سے اس کا رشتہ آپ تک پہنچایا اور آپ نے اس کی شادی قدسیہ کے ساتھ کردی تو سرفراز یہ بات کبھی نہیں بھول سکے گا کہ اس کی تعمیر میں آپ کا ہاتھ ہے اور امی یہ چھوٹا موٹا سا کام تو آپ خود اپنے اکاؤنٹ سے کر سکتی ہیں اگر نہ کریں میں آپ سے کچھ نہیں مانگتا۔ میں اس کا انتظام کرلوں گا آپ کو صرف یہ فیصلہ کرنا ہے کہ ہر قسم کی مخالفت برداشت

کہ کہ قدسیہ کی شادی سرفراز ہی سے کرنی ہے۔ یہ بات آپ صرف اپنے ذہن تک ہی محدود رکھیں۔ باقی ذمے داری آپ زاہد پر چھوڑ دیں۔ بات یہ ہے امی کہ میری کوئی بہن نہیں تھی۔ کوئی بھائی نہیں تھا لیکن اب جب آپ نے مجھے ایک خاندان دے دیا ہے تو خدا کے لئے مجھے اس خاندان کی بہتری سوچنے کا اختیار بھی دیں۔ میں آپ سے پورے وثوق سے کہتا ہوں کہ سرفراز سے اچھا داماد آپ کو کبھی نہیں ملے گا۔ نیک، سعادت مند اور زندگی بھر آپ سے محبت کرنے والا۔ آپ کی کسی خواہش سے انحراف نہ کرنے والا۔ یہ بات میں نے بڑے غور و خوض کے بعد آپ سے کہی ہے امی جان یوں نہ سمجھیں کہ سطحی الفاظ میں، میں نے آپ سے کچھ کہہ دیا۔ آپ نے ایک کان سے سُنا دوسرے سے اُڑا دیا۔ اس بات کو اپنے ذہن میں بٹھا لیجئے، میری تو یہی رائے ہے ویسے اگر آپ کہیں تو میں اپنے اختیارات کو محدود بھی کر سکتا ہوں۔ اگر آپ کو یہ رشتہ پسند نہیں ہوگا تو یقین کیجئے کبھی دوبارہ آپ سے اس سلسلے میں کوئی تذکرہ نہیں کروں گا۔"

"نہیں نہیں زاہد! قدسیہ تمھاری بھی تو بہن ہے بیٹے! اب جبکہ تم اس خاندان کے ہر فرد کو اپنے ہی خاندان کا فرد سمجھتے ہو تو پھر یہ الفاظ کیوں کہہ رہے ہو مجھ سے، تم اس کے بڑے بھائی کی حیثیت رکھتے ہو۔ بلکہ سب سے بڑے بھائی تو تم ہو، شجاع احمد صاحب اپنے کاروباری امور میں اس طرح الجھے رہتے ہیں کہ انھیں گھریلو معاملات کی طرف توجہ دینے کی فرصت ہی نہیں ملتی۔ میں جانتی ہوں کہ وہ کسی رشتے دار کے بارے میں سوچیں گے، سطحی انداز میں اس کا جائزہ لیں گے، اور ہاں کہہ دیں گے۔ اب بھلا بتاؤ ساری زندگی کے لئے اپنی نازوں کی پلی بیٹی اس طرح کسی شخص کے حوالے تو نہیں کی جا سکتی۔"

"بالکل نہیں کی جا سکتی۔۔ بالکل نہیں کی جا سکتی۔ تو پھر امی یہ مسئلہ طے۔۔۔؟"

"لیکن یہ میں کیسے کہہ دوں؟"

"نہیں، نہیں، یہ میں آپ سے نہیں کہہ رہا کہ آپ ہاں کر دیجئے اور ہم سرفراز تک یہ بات پہنچا دیں یا اس کی امی سے کہہ دیں لیکن سرفراز کو اب آپ اسی نگاہ سے دیکھئے۔ باقی معاملات میں خود طے کروں گا۔"

"اور وہ طالب و مطلوب؟"

"ان کو میں ایسا ناچ نچواؤں گا کہ آپ دیکھتی رہئے، زندگی بھر یاد رکھیں گے۔ پھر کسی کی طلب نہ کریں گے اور نہ کوئی شے انھیں مطلوب ہوگی۔" بیگم صاحبہ ہنس پڑیں۔

"میں جانتی ہوں کہ تم یہ سب کچھ کر لو گے؟"

"تو پھر مجھے جواب دے دیجئے!"

"نہیں، نہیں، میں جواب نہیں دوں گی۔ جب میرے زاہد نے کسی مسئلے کو بہتر سمجھا ہے تو پھر میں بھی اسے اسی انداز میں سوچوں گی۔"

"ویری گڈ! یہ ہوئی نا بات امی جان! گویا ہمارے آپ کے درمیان یہ مسئلہ طے کہ قدسیہ کی شادی ہم سرفراز ہی سے کریں گے اب باقی سرفراز کے لئے جو کرنا ہوگا وہ میں کرتا رہوں گا۔ جب کسی مسئلے میں آپ کی ضرورت پیش آئی تو آپ کو تکلیف دوں گا۔ لیکن یہ سوچ لیجئے کہ اس سلسلے میں میری دست راست آپ ہوں گی۔"

"ہاں، ہاں کیوں نہیں۔ تم جس طرح کہو گے میں اسی طرح عمل کروں گی۔"

"تو پھر آج سے آپ سرفراز کو اسی نگاہ سے دیکھئے اور اگر مناسب سمجھیں تو یہ میری درخواست ہے آپ سے کہ سرفراز کی والدہ سے بھی ملاقات کرتی رہئے تاکہ وہ خاتون اپنے آپ کو اتنا کمتر نہ سمجھیں کہ کبھی اس انداز میں سوچ ہی نہ سکیں۔"

"ہاں، ہاں کیوں نہیں بالکل اور پھر تمھاری ہدایت ہے تو میں اس پر سو فیصدی عمل کروں گی۔۔" بیگم صاحبہ نے کہا۔

"بس۔۔ میری امی جان زندہ باد!" زاہد نے اپنی گردن جھکا کر کہا اور بیگم صاحبہ نے زاہد کو سینے سے لگا لیا۔

"ہاں! تیری امی جان۔ تیری امی جان زاہد!"

زاہد دل ہی دل میں بہت خوش تھا۔ اس نے داغ بیل ڈال دی تھی۔ کم از کم بیگم صاحبہ کے کانوں تک پہنچ چکی تھی یہ بات اور اب وہ اسی انداز میں سوچیں گی۔

سیدھی سچی اللسان تھیں جو کچھ کہتی تھیں وہی کرتی بھی تھیں اور زاہد کو اطمینان تھا کہ جو بیج اس نے آج بویا ہے اس کا پھل ضرور نکلے گا۔ اب اس سلسلے میں باقی کارروائیاں کرنی تھیں جن کا فیصلہ بعد میں کیا جائے گا۔ بیگم صاحبہ کے کمرے سے نکلا چند ہی قدم آگے بڑھا ہوگا کہ عقب سے کوئی اس کے

اُوپر آ پڑا۔

دو نرم و نازک ہاتھ اس کی آنکھوں پر آ جمے تھے۔ اس نے ان دونوں ہاتھوں کی کلائیوں کو پکڑ لیا۔ نرم و نازک سی کلائیاں تھیں۔ ایک لمحے کے لئے تو وہ سوچ نہ سکا کہ قدسیہ ہو سکتی تھی کیونکہ اس نے کبھی اتنی بے تکلفی کا مظاہرہ نہیں کیا تھا۔

"پھر . . پھر یہ کون ہے؟" اس نے آہستہ سے جھٹکا دے کر اپنی آنکھوں کو اپنے ہاتھوں کی گرفت سے چھڑا لیا اور شازیہ کی نقرئی ہنسی اس کے کانوں میں گونج اٹھی لیکن زاہد ایک لمحے کے لئے حیران رہ گیا تھا۔ شازیہ نوجوان لڑکی تھی۔ قدسیہ اور اس میں صرف ڈیڑھ سال کا فرق تھا۔ جسمانی طور پر وہ قدسیہ سے بڑی نظر آتی تھی۔ خوبصورت سراپا کی مالک لیکن یہ معصوم سی لڑکی کبھی زاہد سے اتنی بے تکلف نہیں ہوئی تھی۔ محبت ضرور کرتی تھی وہ اور اس کا اظہار دوسرے لوگوں کی طرح اس کے انداز سے بھی ہوتا تھا لیکن بس اپنے آپ میں گم رہنے والی تھی۔ کبھی کسی مسئلے میں آگے بڑھ کر اس نے کوئی حصّہ نہیں لیا تھا۔ اس وقت اس کی بے تکلفی پر ایک لمحے کے لئے زاہد جھجکا لیکن پھر فوراً سنبھل گیا۔

"ہم نے تو پہچان بھی لیا تھا بھئی۔ ہم نے سوچا کہ بس تمہیں بھی چکر دیا جائے۔"

"چکر تو آپ امی کو دے رہے تھے۔ میں نے آپ کی ایک ایک بات سنی ہے ایک ایک بات۔ ہائے اللہ! یہ تو بڑے مزے کی بات کہی زاہد بھائی آپ نے، سرفراز بھیا تو مجھے بھی بہت پسند ہیں۔ آپ یقین کریں کہ میں کبھی ان سے بے تکلف نہیں ہوئی لیکن دُور دُور سے انہیں دیکھتی تھی تو بڑے پیارے لگتے تھے وہ۔ مجھے بالکل ہی اپنے بھائیوں کی طرح محسوس ہوتے تھے۔"

"او ہو ہو ہو! تم تو بڑی خطرناک لڑکی ہو بھئی۔ ہمارے اتنے اہم راز سے واقف ہو گئیں آؤ ذرا اپنے کمرے میں آؤ . ." زاہد نے کہا۔ وہ واقعی بوکھلا گیا تھا۔ شازیہ معصوم صفت تھی پتہ نہیں کس کس سے کیا کیا کہتی پھرے گی اور یہ بات وقت سے پہلے شجاع احمد صاحب کے کانوں تک پہنچ جائے گی۔

شجاع احمد اس بات کو اچانک تو بالکل ہضم نہیں کر سکیں گے۔ اس کے لئے طویل و عریض گراؤنڈ بنانا پڑے گا۔ اس میں شجاع احمد صاحب کو دوڑایا جائے گا۔ یہاں تک کہ وہ ہانپ جائیں گے تو پھر انہیں یہ بات تسلیم کرنی پڑے گی لیکن اگر وقت سے پہلے یہ بات کسی کے کانوں پہنچ گئی اور اس کے ذریعہ شجاع احمد صاحب تک تو پھر معاملہ بڑا خراب ہو سکتا ہے چنانچہ شازیہ کو سنبھالنا بے حد ضروری تھا۔

شازیہ ہلتی ہوئی اس کے ساتھ اپنے کمرے میں آ گئی۔

"بیٹھئے شازیہ بیگم صاحبہ! یہ بتائیے آپ کو یہ عادت کب سے پڑ گئی ہے؟"

"کون سی عادت؟" شازیہ ہنستے ہوئے بولی۔

"یہی، لوگوں کی باتیں چھپ چھپ کر سننے کی؟"

"اللہ قسم! زاہد بھائی . . . زندگی میں پہلی بار کسی کے الفاظ میرے کانوں تک پہنچے ہیں اور وہ بھی میں نے خود کوشش نہیں کی۔ آپ اور امی بڑے پیارے باتیں کر رہے تھے۔ میں اندر آ رہی تھی۔ میں نے سوچا پتہ نہیں کیا باتیں کر رہے ہوں گے۔ انتظار کرنے لگی کہ آپ کی بات ختم ہو جائے۔ پھر کچھ ایسے الفاظ کانوں میں پڑے کہ میں مجبور ہو گئی۔ بھئی دیکھئے نا آخر میری بہن ہے قدسیہ، میری باجی ہے وہ اور ان کی شادی کے لئے میرے دل میں بھی بہت سی باتیں ہیں۔ اگر ان کی شادی کی بات ہو رہی تھی تو میں کیوں نہ دلچسپی لیتی؟"

"شازیہ بیگم! آپ یہ بتائیے کہ سرفراز آپ کو قدسیہ کے شوہر کی حیثیت سے پسند ہو گا؟"

"بہت پسند، بہت پسند، میں تو صبح کو ان دونوں کی تصویریں دیکھ کر یہی سوچ رہی تھی کہ کتنے پیارے لگ رہے ہیں یہ دونوں۔ آپ یقین کریں ایک لمحے کے لئے میرے ذہن میں یہ تصور آیا تھا کہ اگر ان دونوں کے چہرے پر سہرے کے پھول پڑے ہوتے تو کیسے لگتے۔ اخبارات میں تصویریں چھپتی ہیں نا کہ فلاں کی شادی فلاں کے ساتھ ہوئی اور فلاں کی شادی فلاں کے ساتھ ہوئی میں ان تصویروں کو بڑے غور سے دیکھتی ہوں اور یہ اندازہ لگاتی ہوں کہ یہ دولہا دلہن کے ساتھ کیسا لگتا ہے۔ کبھی آپ یقین کریں۔ دلہن بندریا ہوتی ہے اور دولہا خوبصورت، اور کہیں دولہے میاں، ویسے عام طور سے دولہا میاں ہی بندر نظر آتے ہیں۔ لڑکوں کی اچھی شکلیں جانے کہاں مٹ گئی ہیں۔ کمبخت دولہا بن کر تو اچھے نہیں لگتے۔" شازیہ نے ناک چڑھا کر کہا اور زاہد بے اختیار ہنس پڑا۔

"ہاں! اس میں کوئی شک نہیں ہے۔ عام طور سے لڑکے

دُولہا بنے ہوئے بہت کم اچھے لگتے ہیں لیکن شازیہ بیگم! سرفراز دُولہا بنا ہُوا بہت اچھا لگے گا۔"

"بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ میں تو کہتی ہوں کہ سرفراز بھائی کے علاوہ کسی اور سے تو قدسیہ باجی کی شادی ہونی ہی نہیں چاہیئے۔" شازیہ نے حسبِ عادت بڑی معصومیت سے کہا۔

"خیال تو میرا بھی یہی ہے لیکن آپ کے ڈیڈی کہاں مانیں گے؟"

"اجی کیسے نہیں مانیں گے ڈیڈی۔ انھیں ماننا پڑے گا۔ آخر ہم بھی تو کوئی حیثیت رکھتے ہیں اس گھر میں، ہم بھی تو کوئی فیصلہ کرنے کے قابل ہیں۔ یہ کیا بات کہ ہر مسئلے میں ڈیڈی ہی کے فیصلے مسلط ہُوں۔"

"ہاں! اگر یہ ہمت اور جرأت اس گھر کے ہر فرد میں پیدا ہو جائے تو پھر یہ گھر ایک جنتِ ارضی بن سکتا ہے۔ اب دیکھئے نا شجاع احمد صاحب اپنے گھر کے لئے کبھی بُرے انداز میں نہیں سوچ سکتے لیکن وہ بھی انسان ہیں۔ ان کے فیصلے بھی غلط ہو سکتے ہیں۔ وہ قدسیہ کے لئے تمھارے لئے ایسے بندروں کا انتخاب کر سکتے ہیں جن کی تصویر اگر اخبار میں چھپے تو لوگ اسی طرح ہنس پڑیں جس طرح تم اس قسم کے بندروں کو دیکھ کر ہنس پڑتی ہو۔ یہ بندر بہت دولت مند ہوں گے۔ بڑا مال ہوگا ان کے پاس، اعلیٰ سے اعلیٰ لباس پہنیں گے۔ اعلیٰ سے اعلیٰ کاریوں میں گھومیں گے لیکن کہلائیں گے تو بندر ہی شجاع احمد صاحب تو صرف یہ دیکھیں گے کہ وہ کتنے دولت مند ہیں اس لئے کہ ان کا نکتہ نگاہ ہی یہی ہے۔ وہ یہ تھوڑا ہی سوچیں گے کہ ان کی حسین بیٹیوں کے لئے ویسے ہی حسین شوہر بھی ہونے چاہئیں۔"

"سوچنے دیں، انھیں سوچنے دیں۔ ہم تو کسی لنگور سے شادی نہیں کریں گے۔" شازیہ نے جواب دیا۔

"بالکل نہیں کریں گے تو پھر شازیہ بیگم اتفاق سے یہ بات تمھارے کانوں تک پہنچ گئی کہ ہم سرفراز کو قدسیہ سے منسوب کرنا چاہتے ہیں لیکن شازیہ بیگم ایک بات سے آپ کو آگاہ کرنا بہت ضروری ہے۔"

"جی فرمائیے!"

"اگر آپ یہ چاہتی ہیں کہ آپ کی قدسیہ باجی اور سرفراز بھائی کا ہو جائیں تو جو کچھ سُن چکی ہیں اپنے کانوں میں بند کرلیں زبان اگر کھُل گئی تو یوں سمجھ لو کہ یہ رشتہ کبھی طے نہیں ہوسکے گا۔"

"کیا مطلب؟"

"بھئی وہی امیری غریبی کا فرق۔ یہ لوگ غریبوں کو انسان نہیں سمجھتے نہ جانے کیوں بھئی دولت تو خُدا کی دین ہے، کسی کو اللہ تعالیٰ نے ضرورت سے زیادہ دے دی ہے اور کسی کو ضرورت کے مُطابق بھی نہیں۔ یہ مسئلے تو اللہ تعالیٰ کے ہیں لیکن اُس نے یہ تو نہیں کہا کہ تم غریبوں سے نفرت کرنا سیکھ لو۔"

"نہیں، نہیں۔ بالکل نہیں۔ بلکہ علامہ اقبال نے تو ہمیشہ غریبوں سے محبت کرنے کا درس دیا ہے۔ وہ ہے نا۔

"ہو میرا کام غریبوں کی حمایت کرنا"

تو پھر ہم لوگ غریبوں کی حمایت کیوں نہ کریں۔ آخر علامہ اقبال اتنے بڑے شاعر تھے۔ اتنے بڑے مفکر تھے۔ کوئی بات بلا وجہ تو نہ کہہ دی ہوگی انھوں نے۔"

"بالکل نہیں۔ بالکل نہیں، انھوں نے جو کچھ کہا ہے انسانیت کی فلاح کے لئے کہا ہے، انھوں نے بُرائیوں کی طرف جانے والے کو بُرائیوں سے رُوکا ہے۔ اپنی نظموں میں انھوں نے ہمیشہ انسان کو انسانیت کا درس دیا ہے۔ غریب ہمارے معاشرے کا ایک انسان ہی تو ہے۔ تم خود سوچو، زندگی کے مسائل میں اُلجھے ہوئے، حالات کے ہاتھوں پریشان لوگ اگر دوسرے لوگوں کی نفرتوں کا شکار بن جائیں تو ان کے لئے جینے کا کیا سہارا رہ جاتا ہے؟"

"بالکل نہیں رہ جاتا۔ میں غریبوں سے محبت کرتی ہوں۔"

"زبانی نہیں شازیہ بیگم! آپ اپنا ایک عزم بنا لیجئے۔ آپ صرف غریبوں کو چاہیں گی۔ دولت مندوں کو ٹھکرائیں گی۔ بتلائیے کیا اس مشن کا آغاز کر رہی ہیں آپ؟"

"بالکل کر رہی ہوں۔ ملائیے ہاتھ۔" شازیہ نے اپنا ہاتھ زاہد کی طرف بڑھا دیا، اور اس نے بڑے پیار سے اپنے ہاتھ میں اس کا ہاتھ تھام لیا۔

"شازیہ! میں تو تمھارے لئے بھی یہی چاہتا ہوں کہ تم کسی غریب کو اپنے لئے منتخب کر لو۔"

"آپ بالکل صحیح چاہتے ہیں آپ فوراً کسی غریب کو میرے لئے منتخب کرلیں۔" شازیہ نے جواب دیا۔

"فوراً۔۔۔!"

"ہاں۔۔۔ مم۔۔۔ میر۔۔۔ میرا مطلب ہے۔ میرا مطلب ہے۔" شازیہ کو اپنے الفاظ کا احساس ہو گیا اور وہ جھینپ سی گئی۔

"تو پھر زاہد بھائی۔ میں آج ہی غریبوں سے محبت شروع کردوں گی یہ بات طے۔ میں جس غریب سے محبت کروں گی اس کے بارے میں آپ کو بتا دوں گی۔" شازیہ نے بڑی سادگی اور بڑے خلوص سے کہا۔

"ٹھیک ہے شازیہ لیکن کوئی ایسا قدم نہ اُٹھا بیٹھنا جو تمہارے لئے پریشان کن بن جائے۔"

"نہیں، نہیں آپ کے مشورے کے بغیر میں کوئی کام نہیں کروں گی۔ بس جس غریب سے بھی محبت کروں گی اسے آپ کے سامنے لے آؤں گی۔" شازیہ نے جواب دیا۔

"تو پھر ٹھیک ہے تمہارے مشن کا آغاز آج سے ہوگیا۔ اس بات کو ذہن میں بٹھا لو کہ اگر شجاع احمد صاحب کوئی بھی دولت مند رشتہ تمہارے لئے لائیں تم فوراً انکار کردو گی۔ تمہاری شادی کسی غریب سے ہی ہوگی اور میں تمہارے لئے وہ شخص منتخب کروں گا۔"

"وعدہ زاہد بھائی! آپ کی ہدایت کے مطابق ہی کام ہوگا۔"

"بہت اچھا! تو اب میں اس بات کا اطمینان رکھوں کہ تم یہ الفاظ کسی سے بھی نہیں کہو گی۔ میرا مطلب ہے سرفراز اور قدسیہ کے بارے میں۔"

"وعدہ! آپ سے جو وعدہ کروں گی۔ اُسے ہمیشہ نبھاؤں گی اس بات کو آپ ذہن میں رکھئے گا۔"

"بہت بہت شکریہ! میری چھوٹی سی بہن، پیاری سی بہن نے مجھے بہت بڑا درجہ دیا ہے۔ میں اس کے لئے اس کا شکرگزار بھی ہوں۔" زاہد نے کہا۔

"ارے نہیں زاہد بھائی! آپ تو ہمارے سارے بھائیوں سے اچھے ہیں۔ آپ یقین کریں آپ کو بہت زیادہ چاہتی ہوں۔ کبھی کہا ہی نہیں آپ سے کوئی موقعہ ہی نہیں ملا۔" شازیہ نے کہا۔

"کہنے کی ضرورت بھی نہیں ہے شازیہ۔ تمہاری آنکھوں سے محبت کا اظہار ہوتا ہے۔"

"اچھا!" شازیہ شرارت سے بولی اور اپنی آنکھیں جھپکانے لگی۔ زاہد ہنستا ہوا اس کے کمرے سے نکل آیا تھا۔

یہ ایک خطرہ پیدا ہوگیا تھا اس کے لئے چونکہ شازیہ بچوں کی سی فطرت رکھتی تھی۔ کسی کے سامنے بھی وہ اپنی زبان سے یہ الفاظ نکال سکتی تھی لیکن اب زاہد کو اطمینان تھا کہ وہ کسی سے یہ سب کچھ نہیں کہے گی۔

چودہ تاریخ کو شجاع احمد صاحب واپس آگئے۔ بجھے بجھے سے تھے۔ تھوڑے سے جھینپے ہوئے بھی۔ اس بارے میں کسی سے کوئی بات نہیں کی تھی۔ بس ہمیشہ کی طرح اپنے معمولات میں مصروف ہوگئے تھے انھیں کوئی اور پروگرام بھی ترتیب دینا تھا۔ غالباً باہر جانے کا پروگرام تھا۔ اس بار انھیں خاصے دنوں کے لئے باہر جانا تھا۔ اس کا تذکرہ انھوں نے صرف اپنی بیگم سے کیا تھا۔ بیگم صاحبہ بھی اس مسئلے کو گول کرگئی تھیں۔ حالات ان کے کانوں تک پہنچ گئے تھے اور وہ جانتی تھیں کہ یہ شجاع احمد صاحب کی ایک دُکھتی رگ ہے۔ ایک کمزور پہلو جسے وہ دوبارہ سُننا پسند نہیں کریں گے۔

شجاع احمد صاحب خاص طور سے دادا جان کے سامنے آنے سے کتراتے تھے۔ بہر صورت دادا جان نے بھی ان سے اس مسئلے پر کوئی باز پرس نہیں کی اور تقریباً عازم اور فاخر کا سلسلہ ختم ہی ہوگیا لیکن نمائش کے سلسلے میں شجاع احمد صاحب ذرا کچھ اُلجھے ہوئے تھے۔ دل چاہتا تھا کہ کسی سے کوئی بات کریں لیکن جانتے تھے کہ اس کا کوئی نتیجہ نہیں نکلے گا۔

اس نمائش کا رُوحِ رواں بھی زاہد ہی تھا۔ عازم اور فاخر نے جو حرکت کی تھی وہ بڑی مذموم تھی۔ خاص طور سے ان کی گفتگو کا کیسٹ سُننے کے بعد تو شجاع احمد صاحب کو ان کے وجود سے نفرت ہوگئی تھی۔ انھیں بخوبی معلوم ہوگیا تھا کہ وہ دونوں نوجوان اس قسم کے لوگوں میں سے تھے جو کسی کے گھر میں گھس کر ہمیشہ بُرائیوں کے بارے میں سوچتے ہیں لیکن جو رپورٹ انھوں نے زاہد کے بارے میں دی تھی اس رپورٹ سے شجاع احمد صاحب پوری طرح متفق تھے۔ انھیں یقین تھا کہ زاہد پوری طرح اس کوٹھی پر اپنا جال پھیلائے ہوئے ہے لیکن یہ سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ زاہد اس جال سے فائدہ کیا اُٹھا رہا ہے۔ اپنے طور پر انھوں نے بھرپور کوشش کی تھی کہ زاہد کے بارے میں معلومات حاصل کریں۔ اس سے گھلنے ملنے کی کوششیں بھی کی تھیں انھوں نے لیکن شجاع احمد صاحب زاہد کو فطرتاً ایڈجسٹ نہیں کر پائے تھے اور بہر صورت انسان تھے کسی ایک مسئلے پر اتنی توجہ بھی نہیں دے سکتے تھے انھیں یقین تھا کہ زاہد دادا جان کو بے وقوف بنا کر دولت اکٹھی کر رہا ہے۔ کوئی نہ کوئی ذریعہ اس نے ایسا نکال لیا ہوگا۔ جس سے اس کا بینک بیلنس بڑھتا جا رہا ہوگا لیکن انھیں اس

بات سے کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی۔

دس بیس لاکھ اگر نے بھی گیا تو کون سی مصیبت آجائے گی۔ افسوس تو انھیں صرف اس بات کا تھا کہ گھر کے سارے افراد اس پر بے پناہ اعتماد کرنے لگے تھے۔ قدسیہ اور شازیہ کا معاملہ بھی ان کے ذہن میں آیا تھا کہیں زاہد بھی اسی قسم کی کوئی حرکت کرنے کی کوشش نہ کرے۔ جو پہلے عاصم اور فاخر نے کی تھی۔

لیکن ابھی تک کوئی ایسی شکل انھیں نظر نہیں آئی تھی بلکہ بیگم صاحبہ نے تو ایک بار ان کی اس بات پر سخت برہمی کا اظہار کیا اور کہا تھا کہ وہ جانتی ہیں کہ زاہد قدسیہ اور شازیہ کو اپنی بہنوں کی مانند سمجھتا ہے۔ انھوں نے اس بات پر شدید نفرت کا اظہار کیا تھا کہ زاہد پر اس قسم کا کوئی شک کیا جائے۔

چنانچہ شجاع احمد صاحب کو کوئی موقع ایسا نہیں مل رہا تھا کہ وہ زاہد کو چت کر دیتے۔ کاروباری طور پر انھوں نے بڑے بڑے حریفوں کو چت کیا تھا۔ بلکہ اپنی فیلڈ میں کنگ کہلاتے تھے ایک بہترین دماغ تھا ان کے پاس لیکن ان معاملات میں وہ اپنے آپ کو زاہد کے سامنے بے بس پا رہے تھے۔ انھیں زاہد سے مسلسل خطرہ رہتا تھا۔ اگر کبھی وہ ان کی طرف متوجہ ہو گیا تو ان کے لئے واقعی بڑی پریشانی کا باعث بن سکتا ہے۔ حالانکہ ان کے لئے یہ کام مشکل نہیں تھا کہ کسی بھی وقت زاہد کی چھٹی کرا دیتے۔ دو چار بدمعاشوں کو دس بیس ہزار روپے دے کر یہ مشکل نہیں تھا لیکن اس حد تک وہ نہیں جانا چاہتے تھے۔ اس وقت تک جب تک کہ زاہد ان کے لئے کوئی بڑی مصیبت نہ بن جائے۔

ان دنوں نمائش کا چرچا تھا۔ گھر کا ہر فرد نئے نئے کپڑے بنا رہا تھا۔ سات دن کے لئے سات سات جوڑے بنائے گئے تھے۔ ہر روز نمائش میں جانے کا پروگرام بنایا جا رہا تھا۔ یہ باتیں شجاع احمد صاحب کے کانوں تک بھی پہنچ رہی تھیں۔

قدسیہ کے نگار خانے کو دیکھ چکے تھے۔ اوٹ پٹانگ تصویریں بے تکی کوئی ایک شکل واضح نہیں تھی بھلا یہ مصوری کی کون سی قسم ہے اور پھر مصوری کا ایسا جنون کس کام کا۔ آخر قدسیہ ایک عظیم مصورہ بن کر کیا کرے گی لیکن بس شوق۔ اس سے برے حالات ہارون کے تھے جھاڑ جھنکار داڑھی، بکھرے ہوئے بال سرخ سرخ آنکھیں پتہ نہیں کیا حلیہ بناتا جا رہا تھا۔

اپنے بیٹے کا یہ حشر ان کے لئے قابلِ برداشت نہیں تھا لیکن ہارون نے بڑی ہمت اور جرأت سے حالات کا مقابلہ کیا تھا۔ شجاع احمد صاحب یہ بھی جانتے تھے کہ نئی نسل کسی کے قابو میں آنے والی نہیں ہے۔ ذہنی رو جس طرف بھٹک جائے پھر اسے رد کرنا ایک مشکل ہی کام ہو گا۔ اور اس کے نتیجے میں بھیانک [illegible]ہر ہو سکتے ہیں۔ یہ بھی ممکن تھا کہ ہارون گھر سے بھاگ جاتا۔ سماج میں کیا عزت رہ جاتی ان کی۔ بیٹا گھر سے بھاگ گیا۔ ہپی بن گیا۔

توبہ۔۔۔ توبہ۔۔۔ وہ جب بھی سوچتے ان کا دل لرز جاتا تھا چنانچہ یہی بہتر تھا کہ کان دبائے حالات کے منتظر رہیں۔ ایک وقت تو ایسا آئے گا جب ان سب کی آنکھیں کھل جائیں گی۔ زاہد کے سامنے وہ کسی حد تک بے بس ہو چکے تھے لیکن اس بے بسی کو قبول کرنا ان کے بس کی بات نہ تھی۔ وہ منتظر تھے اس وقت کے جب زاہد کا کوئی کمزور پہلوان کے ہاتھ آ جائے۔ اس کمزور پہلو کو سامنے رکھ کر وہ زاہد کا ستیاناس تو کر سکتے تھے۔

نمائش کے سلسلے میں انھوں نے اخبارات میں تفصیل پڑھی تھی۔ بڑے بڑے لوگ اب اس میں دلچسپی لے رہے تھے۔ خاص طور سے اخبارات نے اس تذکرے کو بہت اچھالا تھا کہ شجاع احمد جیسے عظیم شخص کا خاندان خیر انسانوں کا خاندان ہے۔ اس گھر کا ایک ایک فرد انسانی ہمدردی سے لبریز ہے۔ ایسے حسین دلوں کے مالک خاندان کے لئے حکومت کو بھی ہر قسم کی آسانیاں فراہم کرنی چاہئیں۔ فرسٹ ایڈ ہاؤس کا تذکرہ بھی بار بار ہوتا تھا اور پھر قدسیہ کی تصویروں کی نمائش کے بعد تصاویر کے نیلام کا سلسلہ بھی اخبارات نے بہت اچھالا تھا۔ جس کی تمام آمدنی وقف کر دی گئی تھی بیواؤں اور یتیموں کے لئے۔

بلاشبہ ان تمام کاموں سے شجاع احمد صاحب کو انحراف نہیں تھا۔ یہ تو اچھی باتیں تھیں لیکن اس قسم کے معاملات اور اتنے زور و شور سے۔ آخر کیا معنی رکھتے ہیں؟ ٹھیک ہے اگر کچھ خیرات کرنا ہے تو مختلف انداز میں کر دی جائے لیکن اس کے لئے ایسے ہنگامے ہو رہے ہیں حالانکہ اس طرح ان کے خاندان کی عزت بڑھ رہی تھی لیکن بس ایک خلش تھی انھیں اگر قدسیہ اپنے طور پر اس طرف توجہ دیتی تو شاید انھیں اعتراض نہ ہوتا۔ لیکن یہ سب کچھ زاہد کے ذریعے ہو رہا تھا۔ یہ بات انھیں پسند نہ تھی۔ تاہم انھوں نے اس سلسلے میں خاموشی ہی اختیار کر رکھی تھی۔

ایک رات قدسیہ نے بڑی چاہت سے ان سے کہا۔

"ڈیڈی آپ کو علم ہے کہ اب میری تصویروں کی نمائش میں صرف چند دن رہ گئے ہیں۔ آپ یہ بتائیے آپ اس سلسلے میں ہمارے لئے کیا کر رہے ہیں؟"

"کیا چاہتی ہو مجھ سے؟" شجاع احمد صاحب نے بھاری لہجے میں پوچھا۔

"بس کچھ نہیں۔ سارا کام تو زاہد بھائی کر ہی رہے ہیں۔ آپ صرف ہماری اس نمائش میں چیف گیسٹ کی حیثیت سے آ جائیے۔"

"نہیں بھئی! لوگ کیا کہیں گے" شجاع احمد صاحب نے کہا۔

"کیوں؟ کیا کہیں گے لوگ؟"

"یہی کہ بیٹی کی تصویروں کی نمائش ہے اور ابا جان چیف گیسٹ بن گئے۔"

"اچھا۔ ۔ ۔ تو پھر اس کے لئے کسی کا انتخاب کیجئے۔"

"میں کیا کر سکتا ہوں" شجاع احمد صاحب نے کہا۔

"ڈیڈی کوئی ایسا نام تو تجویز کر سکتے ہیں جو اس سلسلے میں اس نمائش کا افتتاح کر سکے۔"

"اس کا فیصلہ زاہد نے کر لیا ہوگا" شجاع احمد صاحب نے کہا۔

"نہیں، میرا خیال ہے ابھی تک انھوں نے اس کا تذکرہ بھی نہیں کیا اور فیصلہ بھی نہیں کیا ہوگا۔"

"تم اس سے بات کر لو اگر کوئی گنجائش نکلی تو پھر مجھ سے جو کہو گی میں کر دوں گا۔"

"ایک بات تو آپ سے ضرور کہی جائے گی ڈیڈی،" قدسیہ نے کہا۔

"ہاں، ہاں کہو!"

"آپ ہماری ایک تصویر خریدیں گے۔"

"کیا مطلب؟"

"جب تصویروں کا نیلام ہوگا تو میری ایک تصویر آپ خرید لیں گے اور بہت قیمتی خریدیں گے بلکہ آپ یوں سمجھئے کہ اس کی ابتدا آپ ہی کریں گے۔"

"وہی بات ہو جائے گی۔ اگر میں تمھاری تصویر خریدنے کی ابتدا کروں گا تو لوگ یہ سمجھنے لگیں گے کہ میں دوسروں کو رجھا رہا ہوں۔"

"اچھا، اچھا چلئے، کوئی بات نہ مانئے۔ شریک تو ہوں گے ہماری نمائش میں۔"

"ہاں ہاں کیوں نہیں، کیوں نہیں" شجاع احمد صاحب نے کہا۔ بچوں کو وہ بے پناہ چاہتے تھے اور آج تک ان کی یہی کوشش رہی تھی کہ ان کے کسی بچے کو ان کی ذات سے کوئی تکلیف نہ پہنچنے پائے۔ قدسیہ نے شجاع احمد صاحب کے الفاظ کی روشنی میں زاہد سے اس سلسلے میں بات کی۔

"زاہد بھائی! یہ تو بتلائیے کہ ہمارا چیف گیسٹ کون ہوگا؟"

"یہ بات صیغۂ راز میں ہے۔ سوونیئر چھپ رہا ہے۔ تین دن پہلے اس بات کا انکشاف کیا جائے گا۔"

"مجھے تو بتا دیجئے کم از کم!"

"ہاں، ہاں! تمھیں بتانے میں کوئی حرج نہیں ہے لیکن ابھی کسی اور کو نہیں بتانا۔ میں نے اس سلسلے میں وزیر اطلاعات و نشریات سے رابطہ قائم کیا ہے۔ دادا جان نے ان سے ملاقات بھی کر لی ہے اور وہ بنفسِ نفیس ہماری اس نمائش کا افتتاح کرنے کے لئے تشریف لا رہے ہیں۔ ہاں آج ایک فوٹو گرافر آئے گا وہ ان تمام تصاویر کی ٹرانسپرنسی بنائے گا۔ سوونیئر میں چھاپنے کے لئے تم حسبِ خواہش اس سے تصاویر بنوا لینا۔"

"نہیں نہیں اس وقت آپ کا ہونا بہت ضروری ہے زاہد بھائی۔"

"بھئی میں تو نہیں ہوں گا۔ البتہ میں سرفراز کو اس سلسلے میں ہدایت کر دوں گا۔" زاہد نے کہا۔

"ٹھیک ہے سرفراز صاحب اپنی نگرانی میں یہ تصاویر بنوائیں۔ کب آئے گا فوٹو گرافر؟"

"میرا خیال ہے۔ ایک دو گھنٹے میں پہنچنے والا ہوگا۔ تم کسی اور کام میں مصروف نہ ہو جانا۔"

"ٹھیک ہے تو پھر ہماری تصاویر کی نمائش کے افتتاح کے لئے وزیر اطلاعات و نشریات آ رہے ہیں؟"

"ہاں، یہ بات تو طے ہو چکی ہے۔"

"یہ تو بہت اچھا ہوگا۔ میرا خیال ہے اس طرح اس نمائش کو اور بھی شہرت ملے گی۔"

"بس دیکھتی جاؤ قدسیہ جو وعدہ تم سے کیا ہے اُسے پورا کرنا تو میرا فرض ہے۔"

قدسیہ بہت زیادہ مسرور نظر آ رہی تھی۔ بالآخر اخبارات میں اس بات کا اعلان کر دیا گیا کہ بیس تاریخ کو ہونے والی نمائش میں افتتاح کے لئے وزیر اطلاعات و نشریات تشریف

لارہے ہیں۔ بڑے بڑے نقادوں کو ملک کے طول و عرض سے بُلایا گیا تھا اور ان کے قیام کے لئے اعلیٰ پائے کے ہوٹلوں میں بندوبست کردیا گیا تھا۔ سب کو خوش رکھنا زاہد کا فرض تھا۔ پریس کو بھی اس سلسلے میں اس نے بہت نوازا تھا اور تقریباً تمام اخبارات بہترین تعاون کا مظاہرہ کر رہے تھے۔

اشتہارات میں خصوصی رعایت دی جارہی تھی۔ پبلسٹی کرنے والی کمپنیاں بھی اس سلسلے میں دلچسپی لے رہی تھیں۔ جس کے لئے کوئی اشتہار نہیں حاصل کیا گیا تھا۔ بلکہ وہ اپنے ہی سرمائے سے تیار کیا جارہا تھا۔ یہ ایک مثالی سووینئر تھا۔ شجاع احمد صاحب کے خاندان کے بارے میں بہت ساری تفصیلات لکھی گئی تھیں۔ اہلِ خاندان کی مختلف تصاویر تھیں۔ سوائے شجاع احمد صاحب کے باقی سب کی تصاویر بنوائی گئی تھیں۔

پھر شجاع احمد صاحب کو مجبور کیا گیا کہ وہ اپنے اہلِ خاندان کے ساتھ ایک گروپ فوٹو بنوالیں اور وہ نہ چاہتے ہوئے بھی تیار ہوگئے۔ زاہد اسی سلسلے میں ہر وہ کام کر رہا تھا جو ممکن ہو سکتا تھا۔ یہ سووینئر جو اس نے چھپوایا تھا انتہائی حسین تھا خوبصورت ترین کاغذ پر بہترین طباعت سے آراستہ سووینئر تیار ہوگیا۔

بیس تاریخ کو زاہد نے آرٹس امپوریم میں چارج سنبھال لیا۔ صبح ہی سے تمام لوگ مصروف تھے۔ تصاویر کی نمائش کا افتتاح شام کو ساڑھے پانچ بجے ہونے والا تھا اور آج زاہد کو اپنے وہ کرتب دکھانے تھے جن کے لئے اس نے بہترین تیاریاں کرلی تھیں جُوں جُوں وقت قریب آتا جارہا تھا سب کے ہاتھ پاؤں پھول رہے تھے۔ خاص طور سے قدسیہ اور سرفراز سب سے زیادہ نروس تھے لیکن زاہد نے ان میں بھی چابی بھرلی، اور انھیں کافی حد تک اس بات پر آمادہ کرلیا کہ وہ پورے ہوش و حواس اور دلجوئی کے ساتھ نمائش میں سنتہ لیں۔ وقت ہوگیا۔ زاہد ایک خوبصورت لباس میں ملبوس مہمانوں کو ریسیو کر رہا تھا۔ قدسیہ اس کے پاس کھڑی تھی۔ تصاویر آویزاں کردی گئی تھیں اور ان پر کوئی چِٹ نہیں لگائی گئی تھی۔ بلکہ اس سلسلے میں بھی ذرا سی جدّت طرازی کی گئی تھی اور نقادوں کو مشورہ دیا گیا تھا کہ وہ خود ہی ان تصاویر کو دیکھ کر ان کے ناموں کا انتخاب کریں۔

قدسیہ کو اس سلسلے میں جو سبق پڑھائے گئے تھے اس نے راتوں کو جاگ جاگ کر یاد کئے تھے۔ بہرصُورت ٹھیک پانچ بجے وزیر اطلاعات ونشریات کی کار آرٹس امپوریم کے وسیع احاطے میں داخل ہوگئی۔ ان کا بہترین استقبال کیا گیا تھا۔

فوٹوگرافرز، پریس رپورٹرز، وزیر اطلاعات ونشریات کے عقب میں اندر پہنچے تھے اور مسلسل تصاویر بنائے جارہے تھے۔ یہ تصویریں قدسیہ، شجاع احمد صاحب اور وزیر اطلاعات و نشریات کے ساتھ کھینچی گئی تھیں۔ نقاد حضرات ایک ایک تصویر کا جائزہ لیتے پھر رہے تھے۔ وہ کسی قدر پریشان سے نظر آتے تھے لیکن جب وہ اس مجمع کو دیکھتے اور ایک اتنی بڑی شخصیت ان کی نگاہوں کے سامنے آتی تو ان کے چہرے معتدل ہوجاتے۔ ابتدائی کارروائی کے بعد نقادوں سے ان تصاویر کا نام تجویز کرنے کی درخواست کی گئی۔ ملک کے ایک بہت بڑے تجریدی آرٹ کے مصوّر سے ایک تصویر کے نام کے بارے میں پُوچھا گیا تو اس کے ہونٹوں پر ایک مدبرانہ مُسکراہٹ پھیل گئی۔

"میری ناقص رائے میں اس کا نام "ہجر" ہونا چاہئے۔ رنگ اور لکیریں یکجا ہوکر ایک ایسی آرزو کا مدفن بن گئی ہیں جو دل کے نازک شیشے میں پیدا ہوتے ہی مرجھا گئی ہو۔ یہ تصویر اور یہ رنگ اسی احساس کی نمائندگی کرتے ہیں۔ ایک ایسی حسینہ جس نے ایک چھوٹی سی جھونپڑی میں جنم لیا ہو لیکن جس کے احساسات کائنات پر محیط ہوں۔ جب اپنے وسائل محدود پاکر وہ اپنے مرکز کی تلاش میں ناکام رہی ہو تو یہ مسرّت مایوسی کے ان رنگوں میں ڈھل گئی۔ عظیم مصوّرہ نے ان رنگوں سے یہی خاکہ پیش کیا ہے میں اُسے "ہجر" کا نام دیتا ہوں۔"

چنانچہ فوراً ہی اس عظیم نقّاد کا دیا ہُوا یہ نام قبول کر لیا گیا اور تصویر کے نیچے "ہجر" لکھ کر لگا دیا گیا۔ دوسرے نقادوں نے جب یہ دیکھا تو انھوں نے تصاویر دیکھ دیکھ کر خوبصورت تشبیہات اور نئے نئے نام تلاش کئے۔ ایک تصویر کو "تنہائی" کہا گیا، دُوسری کو "سویرا"، تیسری کو "آبرو"، پانچویں کو "فریب" چھٹی تصویر میں نقّاد حضرات ذرا اُلجھ گئے تھے۔ زاہد نے اُن لوگوں کو دیکھا تو ان کے قریب پہنچ گیا۔ ایک بڑے فن کار نے قدسیہ سے سوال کیا۔

"بی بی — کیا آپ بذاتِ خود اس تصویر کی تھوڑی سی تشریح کر سکیں گی؟"

"جی... جی ہاں... یہ... میرا مطلب ہے۔ میں نے "بھنور" بنایا ہے۔ جب ہر شخص فکروں سے آزاد رنگوں کی لہروں میں

جھومتا پھر رہا ہوگا۔ یہ دُنیا مصائب سے پاک ہوچکی ہوگی۔ یہ ایک خوشگوار مستقبل کی آس ہے۔"

"بہت خوب۔ بہت خوب، دراصل میں تمھارے مُنہ سے یہ سُننا چاہتا تھا۔ سب اپنے آپ کو بڑا سمجھ کر ان تصاویر کی تشریح کرتے پھر رہے ہیں لیکن خود مصورہ کے ذہن میں کیا ہے یہ معلوم کرنا چاہتا تھا۔ مجھے بڑی خوشی ہے کہ ہمارے مُلک میں ہمارے فن میں ایک ایسے فنکار کا اضافہ ہُوا ہے جو دُنیا کو صرف اُلجھنوں میں نہیں دیکھ پایا۔ آرزوئیں سِسکتی ہیں اور انسان کی شکل بگڑ جاتی ہے لیکن روشنی کی ایک کرن اس کی بقا کے لئے ضروری ہے۔ اگر یہ کرن بھی فنا ہوجائے تو انسان ساری زندگی تاریکیوں میں بھٹکتا رہے گا۔ میں تمھارے اس شعور کو سلام کرتا ہوں۔ یہ نئی روشنی ہے، نئی صبح ہے۔ اس تصویر پر میں تمھیں خصوصی مُبارکباد پیش کرتا ہوں، قدسیہ شجاع احمد" ایک نقاد نے کہا اور قدسیہ نے گردن خم کردی۔

سرفراز کی آنکھیں حیرت سے پھیلی ہوئی تھیں اس کا دماغ ہَوا میں اُڑا جارہا تھا جو کچھ ہورہا تھا۔ اس کی سمجھ سے باہر تھا۔ یہ تصویریں جو کچھ تھیں سرفراز جانتا تھا۔ اتنا جانتا تھا کہ قدسیہ بھی اس سے ناواقف تھی قدسیہ بے چاری نے تو اس کے احکامات کی روشنی میں رنگ اور برش استعمال کئے تھے اپنے طور پر اس نے کچھ نہیں سوچا تھا۔ اُستاد پر مکمل بھروسہ تھا۔ اُسے اُستاد جو کچھ کہہ رہا ہے سچ ہی کہہ رہا ہوگا لیکن اُستاد نے جو کچھ کہا تھا۔ اس کی سچائی پر وہ خود بھی شرمندہ رہتا تھا۔

اور اب یہ نقادانِ فن کیا کچھ کہہ رہے تھے۔ وہ بڑے بڑے نام جنھیں وہ اخبارات اور رسائل کی زینت دیکھ چکا تھا۔ جن کے بارے میں بڑے بڑے مضامین لکھے جاتے تھے، ان تصویروں کے سامنے کھڑے ہو۔ انھیں نام دے رہے تھے انھیں تصویریں تسلیم کررہے تھے۔ یہ ایک ایسی عبرتناک بات تھی۔ جو کسی طور پر سرفراز کے حلق سے نیچے نہیں اُتر رہی تھی۔ . . . . .

اس دُنیا کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اس پر غور کررہا تھا۔ اس نے تو کچھ اور ہی . . . سوچا تھا۔ فنِ مصوری کے بڑے بھی ان تصویروں کو دیکھیں گے۔ ایک دوسرے کو دیکھ کر مُسکرائیں گے۔ پوچھیں گے کہ بھائی یہ کیا ہے اور شاید وہاں زاہد کی چرب زبانی بھی کام نہ آئے۔ اس کے بعد رسوائی، ذلت، شرمندگی۔ لیکن اس "ساحر" نے نہ جانے کیا سحر پھونکا تھا۔ سب اس کی زبان بول رہے تھے۔ کیوں، آخر کیوں، کیا سب بھی ایسے ہی حالات کا شکار تھے: من ترا حاجی بگویم تو مرا حاجی بگو، جس نے جو چاہا کیا دوسرے کا کام سراہنا تھا۔ یہ کون سی زبان بول رہے تھے۔

ایک نقاد نے ڈائس پر آکر کہا: "حیرت ہوتی ہے اس بات پر، سُنا ہے کنول کیچڑ میں کھلتے ہیں۔ گلاب کانٹوں ہی میں بہار دکھاتا ہے۔ یہ کیچڑ میں کنول کہاں سے کھِل اُٹھا؟ سنگِ مرمر نے منقش ایوانوں میں اس حساس دل کی نمود کیسے ہوئی؟ چھوٹی سی عمر اور کائنات پر اتنی گہری نگاہ۔ دل کا یہ گداز قدرت کی دین ہے اور قدرت کہیں کسی کو کچھ بھی دے دے۔"

ایک بہت بڑے نقاد نے کہا۔

"شجاع احمد صاحب ایک بہت بڑے صنعت کار اور تاجر ہیں۔ عموماً ایسے ماحول میں آنکھ کھولنے والے فنونِ لطیفہ کی اُلجھنوں کا شکار نہیں ہوتے۔ ان کا ذہن کاروباری امور میں اُلجھا رہتا ہے لیکن سُنا ہے یہ پورا گھرانہ ہی وجدانی کیفیتوں کا شکار ہے۔ کسی نے خود کو ساری زندگی کی کاوشوں کے بعد غریبوں اور ناداروں کے لئے وقف کردیا۔ کسی نے "تاج محل" بنانے کے بجائے فرسٹ ایڈ ہاؤس بنادیا۔ تاج محل دولت کے بل پر محبت کے اظہار کا ایک جذبہ تھا۔ بلاشبہ دُنیا آج بھی اس محبت کو یاد کرلیتی ہے جو صرف ایک محبوب کے لئے وقف تھی لیکن اس دَور کے شاہ نے ہر انسان کی محبت کا ثبوت دیتے ہوئے فرسٹ ایڈ ہاؤس کی بُنیاد رکھی۔ یہ انسان کی عظمت کا سب سے بڑا تاج محل ہے ایسے انسان دوست خاندان کو اس دَور کا سب سے بڑا عجوبہ کہا جاسکتا ہے۔ اس کی بلندی کا اعتراف دلوں میں ہے۔ شجاع احمد کے لئے تعریف کے جو الفاظ بھی کہے جائیں وہ کافی نہیں ہوں گے اور یہ عظیم مصورہ بھی اسی خاندان کی ایک فرد ہے۔ اس کے رنگوں کی سچائی، اس کی لکیریں اس خاندان کی عظمت کی ایک اور بُنیاد کھڑا کرتی ہیں۔"

پریس رپورٹرز ان ساری باتوں کو نوٹ کررہے تھے شارٹ ہینڈ بکس پر ان کی پنسلیں تیز رفتاری سے چل رہی تھیں اور دُور ایک گوشے میں بیٹھے ہوئے شجاع احمد ان تمام باتوں کو سُن کر عجیب سی کیفیت کا شکار تھے سوچ رہے تھے کہ یہ سب کیا ہُوا ہے اتنی شہرت تو انھوں نے ساری زندگی کی جدوجہد کے بعد بھی حاصل نہ کی تھی۔ کیا واقعی ان تصویروں میں ایسی کوئی بات ہے اور یہ فرسٹ ایڈ ہاؤس۔ خرچ تو بہت ہُوا ہے۔ اس میں نقصان بھی اُٹھانا پڑا ہے لیکن اسے نئے دَور کا تاج محل کہا جارہا ہے۔

اور . . . اور یہ سب کچھ ناہید کی کاوشوں کا نتیجہ ہے ایک ایک کام زاہد کے ذریعے ہوا ہے اور خود زاہد . . . اس کا نام تو کہیں نہیں ہے لیکن پھر انھوں نے فوراً ہی اپنے ذہن میں پیدا ہونے والی اس لچک کو ختم کر دیا۔

فرسٹ ایڈ ہاؤس سے شہرت کے علاوہ کیا ملے گا۔ جو گورکھ دھندا اس منحوس شخص نے پھیلایا ہے۔ اس سے کون سی آمدنی ہوگی سوائے خرچ کے اور جب یہ دولت ختم ہو جائے گی تو فرسٹ ایڈ ہاؤس میں الّو بولیں گے مصیبت بن جائے گا یہ سب کے لئے۔ کہاں سے پورے ہوں گے اس کے اخراجات۔ تقریریں جاری رہیں، لوگ اظہارِ خیال کرتے رہے اور شجاع احمد کا ذہن بھٹکتا رہا۔ آخر میں وزیرِ اطلاعات و نشریات نے اپنے جذبات کا اظہار کچھ یوں کیا۔

"فن انسانیت کا ورثہ ہے اور فنکار ملک و ملّت کا سرمایہ۔ اس کا تعلق کسی بھی طبقے سے ہو۔ دولت مند ہو یا غریب اگر وہ فنکار ہے تو مصائب و آلام کی زمین کو ایک ہی نگاہ سے دیکھتا ہے اور سچ بول دیتا ہے۔ اگر وہ سچ کو چھپانے کی کوشش کرے تو اسے فنکار تسلیم ہی نہیں کیا جا سکتا۔ میں اس عظیم خاندان کو مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ جس کا ایک ایک فرد ہیرے کی مانند دمکتا ہوا ہے۔ یہ سچے لوگوں کا خاندان ہے۔ جس طرح دولت اس خاندان میں آئی ہے۔ یہ اُسے صحیح انداز میں خرچ بھی کر رہا ہے بزرگ حسام احمد جیسی عظیم شخصیت کے زیرِ سایہ پروان چڑھنے والا یہ خاندان جو کارنامے انجام دے رہا ہے ان پر حیرت نہیں ہوتی فن اور آرٹ کے بارے، معاف کیجئے گا، میری معلومات بہت محدود ہیں۔ کسی دور میں جب تصاویر اپنی شکل و صورت ہم جیسی رکھتی تھیں تو پھر بھی انھیں دیکھ کر کہہ دیتے تھے کہ یہ اچھی لگ رہی ہے اور یہ بُری لیکن شعر و شاعری میں بھی جدت ہوئی۔ غزلیں، نظمیں آزاد ہوگئیں۔ شاعروں نے ردیف و قافیوں کے ہاتھ پاؤں توڑ ڈالے مصوروں نے نقوش پر تیزاب ڈال لیا۔ چار ستون بنائے اور ان میں کیلیں جڑ کر "فردوس" تخلیق کر دی جس میں گھسنے کا . . . کوئی راستہ ہمیں تو نظر نہ آئے گا، لیکن ہوگا کوئی نہ کوئی راستہ۔ ہماری نظر کی کمزوری ہے۔ مصور سے پوچھے بغیر کیسے اندازہ جا سکتے ہیں۔ شعر سنیں۔ ایک مصرع پورا۔ دوسرے میں سے لون غائب، جو دل چاہو جوڑ لو۔ آزادی ہے۔ اس بچی نے جو کچھ کہا ہے اللہ اسے بھی معاف کرے، اور ہم نہ سمجھے اللہ ہمیں بھی معاف کرے لیکن جو سمجھنے والے ہیں انھوں نے خوب سمجھا جس کا کام اسی کو ساجھے۔ وہ مانتے ہیں اور ہم انھیں مانتے ہیں۔ چنانچہ جوان کی نیت سو ہماری۔ مبارکباد دینے آئے ہیں ولی مبارک باد۔ اس بچی کو، اس کے والدین کو، اس کے اُستاد کو، ان سارے لوگوں کو جو سمجھدار ہیں۔"

وزیر اطلاعات کی اس حقیقت بیانی نے قہقہوں کا طوفان برپا کر دیا تھا۔ زاہد بھی مسکرائے بغیر نہ رہ سکا تھا۔ اس تقریر کے بعد آج کی اس تقریب کا اختتام ہوگیا۔

دوسرے دن کے اخبارات نے وہ دھوم مچائی کہ اس سے پہلے کبھی نہ مچی تھی۔ ناقدین کو احترام کے ساتھ رخصت کیا گیا۔ تحفے تحائف سے نوازا گیا اور وہ خود کو سرِ خدمت کے لئے حاضر کہہ کر رخصت ہوئے کہ خوش تھے بلکہ خوش کر کے بھیجے گئے تھے اخبار والوں کے لئے تو روزانہ دعوت کا انتظام تھا کیونکہ انھیں سات دن تک بڑا کام کرنا تھا۔ دوسرا دن شہر کے دوسرے تمام معززین کے لئے تھا اور تیسرے دن ہر کسی کو نمائش گاہ میں آنے کی آزادی تھی۔ پبلسٹی خوب کی تھی۔ اس لئے آرٹس امپوریم میں تل دھرنے کی جگہ نہ ہوتی۔ قدسیہ اور سرفراز کو آٹوگراف دینے سے فرصت نہ ملتی۔

چوتھے دن ایک بڑا دلچسپ واقعہ پیش آیا۔ ایک حسین و جمیل صاحبزادی نے سرفراز سے ملاقات کی۔ "میرا نام سحر قدوسی ہے۔"

"جی خادم کو سرفراز کہتے ہیں۔"

"آپ سے کچھ کہنا ہے۔"

"حکم؟"

"ایک التجا ہے۔ فرصت ملے تو سن لیجئے گا۔"

"ابھی فرمائیے!"

"یہ کارڈ ہے میرا۔ میں کسی بھی شام آپ کو خوش آمدید کہنا چاہتی ہوں۔"

"ان دنوں کی مصروفیت تو آپ دیکھ رہی ہیں۔"

"اس کے بعد سہی۔"

"حاضر ہوں گا کبھی۔"

"کبھی نہیں کوئی وعدہ۔"

"فون نمبر ہے آپ کا؟"

"جی ہاں کارڈ پر درج ہے۔"

"میں آپ کو فون کر لوں گا۔"

"کب؟"

"نمائش کے بعد۔"

"آہ۔ انتظار طویل ہے۔ میں آپ سے نمائش گاہ میں ملتی رہوں گی۔"

محترمہ نے فرمایا اور سرفراز نے گردن ہلا دی۔

سرفراز اسے ٹالنے کی کوشش کرتا رہا لیکن وہ رات گئے تک اس سے چپکی چپکی پھرتی رہی تھی۔ حالانکہ بعض مواقع سرفراز نے اس کے ساتھ بے اعتنائی کا سلوک بھی کیا تھا۔

فطرتاً وہ کسی کا دل توڑنے کا قائل نہیں تھا لیکن یہ لڑکی اسے پریشان کر رہی تھی۔ پتہ نہیں وہ کیا چاہتی تھی۔ بہر طور رات کو وہ واپس چلی گئی۔

زاہد اور دوسرے تمام ہی لوگ بُری طرح مصروف رہتے تھے ان دنوں اس لئے ایک دوسرے سے مُلاقات بھی بہت کم ہوتی تھی۔

بالآخر آخری دن آ گیا۔ اس دن تصاویر کا نیلام ہونا تھا جس کی اطلاع اخبارات میں چھپ چکی تھی۔ آج بھی اچھا خاصا ہجوم تھا لیکن بڑے بڑے امرا اور روسا کو خاص طور سے آج کے دن کے لئے دعوت نامے جاری کئے گئے تھے۔ یہی لوگ ان تصاویر کی صحیح قیمت لگا سکتے تھے۔ تصاویر کی نیلامی کے لئے زاہد نے خود ہی ذمہ داریاں سنبھالی تھیں۔ لوگوں کا بے پناہ ہجوم تھا۔ ایک ایک تصویر کے سامنے سینکڑوں افراد کھڑے ہوئے تھے۔ ان میں سیٹھ سجن بھائی، سیٹھ اللہ دوسایا، سیٹھ ببلو بھائی روئی والا، سیٹھ داؤد بھائی کیبن والا اور ایسے ہی بے شمار سیٹھ تھے۔

شجاع احمد صاحب بھی آج یہاں موجود تھے کیونکہ ان کے ہمعموں کی تعداد آج نمائش گاہ میں سب سے زیادہ تھی۔ ان کا ہجوم شجاع احمد صاحب کے گرد تھا۔ طرح طرح کی باتیں ہو رہی تھیں۔ پھر زاہد اس جگہ پہنچ گیا جہاں پہلی تصویر کی نیلامی ہونے والی تھی۔ اس نے بڑے شائستہ انداز میں اس تصویر کا تعارف کرایا تھا۔

"یہ ہجر ہے نقادانِ فن نے اس تصویر کو بڑی اہمیت دی ہے۔ رنگوں اور برش کا یہ کمال غیر انسانی ہاتھوں کا کارنامہ معلوم ہوتا ہے اور یہ تصویر جس گھر میں لگے گی ہمیشہ ایک عجوبہ بنی رہے گی۔ ان فن پاروں کی کوئی قیمت نہیں ہے لیکن ان کے لئے طے کیا گیا ہے کہ ان کو فروخت کر کے ان غریبوں و نادار انسانوں کے لئے زندگی گزارنے کا بہتر بندوبست کیا جائے گا۔ جو اپنے طور پر رزق کمانے کے لائق نہیں ہیں۔ ہم سڑکوں، گلیوں اور بازاروں میں فقیروں کے پھیلے ہوئے ہاتھوں پر نہ جانے کیا کچھ رکھ دیتے ہیں لیکن وہ جو ہاتھ نہیں پھیلاتے اور اپنی پناہ گاہوں میں سسکیوں اور آہوں کے درمیان غربت کی زندگی گزار رہے ہیں۔ اس بات کے مستحق ہیں کہ ہم زیادہ سے زیادہ ان کی اعانت کریں۔ یہ تصویریں جو دن رات کی انتھک محنت کے بعد تیار کی گئی ہیں۔ اُنکے نام ہیں اور ان کو خریدنے والے نہ صرف زخمی انسانیت کے مددگار ثابت ہوں گے بلکہ فن کی دُنیا سے اپنے لگاؤ کا اظہار بھی کریں گے تو ہجر کی قیمت لگائی جائے۔"

"ایک (ہزار) روپیہ!" سیٹھ گلو بھائی نے کہا تو زاہد نے تمسخرانہ نگاہوں سے انھیں دیکھا۔

"فن کی توہین نہ کریں حضرات، ابتداء وہاں سے کریں جہاں سے ان کی ابتدا ہو سکتی ہے۔"

"بیس ہزار!" دوسری طرف سے آواز آئی۔

"غنیمت ہے کم از کم آپ نے تھوڑی سی جرأت کا ثبوت تو دیا۔"

"بائیس ہزار۔"

"نہیں نہیں۔ دو، دو تین، تین ہزار سے بات آگے نہ بڑھئے دس کے فیگر سے کم بات نہ ہو۔"

"چالیس ہزار۔"

"بہت خوب۔ بلاشبہ ہمارے ملک میں فن کے قدردان موجود ہیں۔ کون کہتا ہے کہ یہ مُلک جذبات سے عاری ہے۔ تجوریوں میں بھرے ہوئے نوٹ کاروباری مقاصد کے لئے تو سامنے آتے ہی ہیں۔ آج انسانیت انھیں آواز دے رہی ہے جی تو چالیس ہزار۔"

"پچاس ہزار۔"

"ساٹھ ہزار۔"

"اسی ہزار۔"

"ایک لاکھ۔"

"بہت خوب، بہت خوب، آگے بڑھئے، آگے بڑھئے۔" سیٹھ فجا بھائی نے برابر بیٹھے ہوئے گلو بھائی کو دیکھا۔ گلو بھائی سٹے کا کاروبار کرتے تھے اور فجا بھائی کا بھی یہی کاروبار تھا دونوں میں لگتی تھی اور اس وقت ایک لاکھ روپے گلو بھائی نے لگائے تھے۔

"ڈیڑھ لاکھ۔" فجا بھائی نے غصیلی نگاہوں سے گلو بھائی کو دیکھتے ہوئے کہا اور گلو بھائی چونک پڑے۔

"فجا بھائی! اور بھی مقابلہ کرنا ہے۔ چلو لو، پھر

"دو لاکھ روپے۔"

"ڈھائی لاکھ۔"

"تین لاکھ۔" گلو بھائی نے غصیلے لہجے میں کہا اور فنا بھائی کو ہوش آگیا۔ کاغذ کے ایک رنگین ٹکڑے کے لئے تین لاکھ کی رقم کافی تھی۔ انھوں نے سوچا کہ گلو بھائی تو نرا ہے ہی پاگل، کاروبار میں بھی لفڑا کرتا ہے اور ادھر بھی گڑبڑ کر رہا ہے جانے دو غصے کو، چنانچہ فنا بھائی خاموش ہوگئے اور یہ تصویر تین لاکھ میں بک گئی۔ لوگوں نے گلو بھائی کو مبارکباد دی تھی۔

لیکن گلو بھائی فنا بھائی کو دیکھ رہے تھے جن پر انھوں نے فتح پائی تھی لیکن فنا بھائی بھی چالاک آدمی تھے۔ "تہائی،" جب ڈھائی لاکھ تک پہنچی تو انھوں نے پونے تین لاکھ کہہ کر سودا چکا لیا آخر وہ بھی ایک تصویر کے مالک بن گئے تھے۔

شجاع احمد کے قریبی دوست ببلو بھائی روئی والا نے صرف شجاع احمد کو خوش کرنے کے لئے دو لاکھ روپے میں ایک تصویر خریدی تھی۔

سحر قدوسی نے سرفراز کے کان میں سرگوشی کی۔

"مجھے آہو بہت پسند ہے کتنی قیمت لگاؤں اس کی؟" سرفراز چونک کر اسے دیکھنے لگا۔

"یہ تو آپ کی پسند پر منحصر ہے۔"

"نہیں اس کی قیمت کا تعین آپ کر دیں۔"

"میں اپنی کسی تصویر کی قیمت کا تعین نہیں کر سکتا۔ آپ آزاد ہیں۔"

بہر طور "آہو" سحر قدوسی نے خرید لی۔ اپنی دانست میں اس نے سرفراز کو خرید لیا تھا۔

فریب بھی بک گئی اور بھنور بھی۔ اس کے بعد دوسری تصویروں کا نمبر آیا اور سرفراز کو چکر آنے لگے جو کچھ ہو رہا تھا وہ اس کی سمجھ سے باہر تھا۔ یہ دولت مند بے ہودہ بھونڈی شکلوں والے موٹے، بڑی بڑی توندیں باہر نکالے ہوئے صرف اپنی امارت کا رعب جھاڑنے کے لئے، ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کے لئے ان رنگین کاغذوں کو خرید رہے تھے۔ اپنی انا کی تسکین کے لئے یہ ہنگامہ کیا جا رہا تھا۔ شجاع احمد کو خوش کرنے کا جذبہ بھی دلوں میں کارفرما تھا کیونکہ ان سے بہت سارے کاروباری مقاصد اٹکے ہوئے تھے۔

اور پھر سب یہ بھی جانتے تھے کہ ان تصاویر کی خرید کی پبلسٹی بھی ہوگی اور یہ پبلسٹی ان کے لئے بڑی کشش کا باعث تھی۔

جلال بخش مارواڑی نے ایک تصویر ڈھائی لاکھ روپے کی خرید لی تھی۔

بہر طور تصاویر کا نیلام اتنا عظیم الشان رہا جس کی ان لوگوں کو خود توقع نہیں تھی لیکن شاید ان میں زاہد شامل نہیں تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اس نے جو ہنگامہ برپا کر رکھا ہے اس کا نتیجہ یہی ہوگا ان دولت والوں کی دنیا کو وہ بہت قریب سے دیکھ چکا تھا۔ وہ ان کا بہت بڑا نباض تھا۔ بالآخر آخری تصویر بھی فروخت ہوگئی اور خریدنے والے فخریہ انداز میں ان کے فریم ہاتھوں میں لئے انھیں نمایاں کئے اپنی اپنی کاروں میں جا بیٹھے۔ یہاں تک کہ نمائش کا آخری مہمان بھی نکل گیا اور اب صرف آرٹس امپوریم کے منتظمین یا شجاع احمد کے گھرانے کے لوگ موجود تھے۔ خود شجاع احمد صاحب بھی یہاں سے جا چکے تھے۔

سات دن کی ہنگامہ خیزیوں کے بعد یہ پہلی رات تھی جب وہ لوگ سکون کی نیند سوئے۔ سب کے سب تھکے ہوئے تھے۔ اس رات کسی نے کسی سے ملاقات کرنے کی کوشش نہیں کی۔ دوسری صبح البتہ ناشتے کی میز پر بڑی گہما گہمی تھی۔ شجاع احمد صاحب حسبِ معمول سنجیدہ بیٹھے ہوئے تھے۔ باقی سارے کے سارے چہک رہے تھے۔ قدسیہ نے براہِ راست ان سے سوال کر ڈالا۔

"ڈیڈی! آپ نے اس نمائش کے بارے میں کوئی رائے نہیں دی۔"

"میری رائے کی ضرورت باقی رہ جاتی ہے؟" شجاع احمد جلے بھنے لہجے میں بولے۔

"کیوں نہیں۔ آپ ہی تو سب کچھ ہیں۔ آپ کی رائے تو سب سے زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔"

"لیکن بدقسمتی ہے میری کہ اس کوٹھی میں میرے الفاظ اب کسی کو پسند نہیں آتے۔"

"کیوں نہیں ڈیڈی! آپ کہئے تو سہی۔"

"ان سارے ہنگاموں پر جو روپیہ خرچ کیا گیا ہے، اس کا کوئی حساب کتاب رکھا ہے؟" شجاع احمد صاحب نے پوچھا۔

"کیوں بھائی حساب کتاب کے علاوہ تمہیں اور بھی کچھ آتا ہے؟" حسام احمد صاحب نے پوچھا۔

"ابو! اسی لئے تو میں کسی معاملے میں بولتا نہیں ہوں۔"

میری آنکھیں جو کچھ دیکھ رہی ہیں، جو مستقبل میری نگاہوں کے سامنے ہے۔ وہ بہت بھیانک ہے۔ یہ تمام بچے جن راستوں پر جا رہے ہیں وہ شہرت تو دلوا دیتے ہیں لیکن شہرت بعض اوقات گندی جھونپڑیوں میں دم توڑ دیتی ہے۔ شہرت نہ کھانے کی چیز ہے نہ پینے کی، اصل چیز دولت ہے۔ لاکھوں روپیہ حاصل ہوا ہے ان تصاویر سے کیا آپ اس میں سے وہ خرچ نکالیں گے جو ان تمام ہنگاموں پر صرف کر چکے ہیں۔ اگر نکالیں گے تو آپ کی وہ شان تو نہ رہے گی جو لوگوں کی نگاہوں میں ہے۔ جتنی رقم اس سلسلے میں آئی ہے اصولی طور پر تو وہ ساری کی ساری آپ کو اسی مد میں خرچ کرنا ہو گی جس کا آپ نے اعلان کیا ہے۔ اگر اس میں سے کچھ کٹوتی کریں گے تو لوگوں کے ذہنوں میں یہ بات بیٹھ جائے گی کہ آپ کا اپنا مفاد بھی اس میں وابستہ تھا۔"

"میاں! تو کٹوتی کر کون رہا ہے۔ جس مقصد کے تحت یہ سب کچھ کیا گیا اسی کی تکمیل کی جائے گی۔"

"ہوں اور اس سے حاصل، قدسیہ نے جو طویل عرصہ مغز ماری کی اس کا کیا بدل ہے۔ جو کچھ آپ لوگوں نے اس سلسلے میں خرچ کیا جھوٹی شہرت حاصل کرنے کے علاوہ اس کی کوئی اور اہمیت ہے۔"

"تو تمہارا کیا خیال تھا۔ ہم تصویریں بیچ کر اپنا گزارا کرتے۔"

"میں یہ نہیں کہتا ابو! لیکن کم از کم اپنا بھی تو کچھ فائدہ ہونا چاہئے تھا۔ قدسیہ نے اپنا فن دُنیا کے سامنے پیش کیا وہ کیا تھا؟ کیا ہے؟ میں اس سلسلے میں کوئی حجت نہیں کروں گا بلکہ مجھے وزیرِ اطلاعات و نشریات کی تقریر سب سے زیادہ پسند آئی تھی بہرصورت یہ بات چونکہ آپ کو ناگوار گزرے گی اس لئے میں اُسے آگے نہیں بڑھاتا۔ میری تو یہ خواہش تھی ابو کہ جس طرح آپ نے بارہ بنکی سے نکل کر اپنی یہ حیثیت بنائی اور پھر وہ حیثیت مجھ تک منتقل کر دی۔ میں نے جو کچھ بنایا ہے وہ بھی آپ کی آنکھوں کے سامنے ہے میں نے آپ کی اس دولت کو ہزار گنا بڑھایا ہے لیکن کیا میرے یہ بچے انہی راستوں پر چل رہے ہیں۔ جن پر آپ نے مجھے چلایا تھا۔ آپ نے اپنی اولاد کو تو التفات بخشا لیکن مجھے میری اولاد کے ساتھ انصاف برتنے سے روک دیا گیا ہے۔ میں ان لوگوں کو کیسے سمجھاؤں کہ جھوٹی شہرت ہی سب کچھ نہیں ہے۔ اسے برقرار رکھنے کے لئے بھی دولت کی ضرورت ہوتی ہے اور ان بچوں کے ذہن کو تو آپ دیکھ ہی چکے ہیں۔ قدسیہ بیٹی ہے میری۔ میں اس کی اس تعریف و توصیف سے ناخوش نہیں ہوں۔ بلاشبہ ہمیں وہ شہرت ملی ہے جس کا تصور بڑے بڑے نہیں کر سکتے۔ میری آنکھیں دُور تک دیکھ رہی ہیں۔ اگر یہ اسی طرح شہرت کے جال میں پھنسے رہے تو آہستہ آہستہ یہ دولت ختم ہو جائے گی۔ میرا کیا ہے ابھی چل رہا ہوں، چلتا رہوں گا۔ تھوڑے سے عرصے جو کچھ انھیں دے سکتا ہوں، ضرور دوں گا لیکن میں تو یہ جانتا تھا کہ آپ کا ایک بیٹا ہو کر میں نے آپ کی دولت کو اتنا بڑھا دیا، میرے تین بیٹے اس دولت میں کچھ نہ کچھ اضافہ ضرور کرتے لیکن میں دیکھ رہا ہوں کہ یہ صرف گنوانے پر تلے ہوئے ہیں۔ اب یوں کیجئے کہ ہارون کا ایک شو بھی کرا ڈالیئے۔ آخر اسے کیوں شہرت سے محروم رکھا جا رہا ہے وہ بھی تو بندروں کی طرح اچھل کُود کر لیتا ہے۔ ناچ گا لیتا ہے بھلا ہمارے خاندان میں ایک ناچنے والے کا اضافہ کیوں نہ ہو، لوگ یہ کیوں نہ جانیں کہ شجاع احمد صاحب کا ایک بیٹا حلق پھاڑ پھاڑ کر پھدک پھدک کر دھاڑتا بھی ہے۔ یوں کیجئے کہ اس کے رقص و موسیقی کی نمائش کا بھی بندوبست کر ڈالیئے اور پھر اس کمبخت کو بھی بیچ ڈالیئے اسٹیج پر کھڑا کر کے؟"، شجاع احمد صاحب نے کہا۔ سب لوگ ایک لمحے کے لئے خاموش ہو گئے تھے۔ صرف زاہد تھا جس کے ہونٹوں پر ایک طنزیہ سی مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی۔ شجاع احمد صاحب کے دل کی جلن کو وہ ہی محسوس کر رہا تھا پھر شجاع احمد صاحب بولے۔

"بہرحال آپ لوگ جو کچھ کر رہے ہیں کرتے رہیئے۔ میں اپنے طور پر اپنا فرض انجام دے رہا ہوں۔ مجھ سے کسی سلسلے میں میری رائے نہ پوچھی جائے۔"

ایک ناگوار سی خاموشی فضا پر مسلط ہو گئی تھی۔ حسام احمد صاحب نے بھی اس سلسلے میں کچھ نہ کہا لیکن کسی نے شجاع احمد صاحب کی بات کو لفٹ نہیں دی تھی اور جب سب ناشتے کی میز سے اُٹھے تو آپس میں چہ مگوئیاں کر رہے تھے۔

"ڈیڈی پر تو ہر وقت کاروبار ہی سوار رہتا ہے۔ جب ہم عملی زندگی میں آئیں گے تو یہ سب کچھ بھی کر لیں گے"، احمد رضا نے کہا۔

"نہیں نہیں، آپ کلینک کھولتے اور دونوں ہاتھوں سے لوگوں کی جیبیں خالی کرتے۔ کسی کو اپنے گھر میں نہ گھسنے دیتے تو پھر ڈیڈی کی خوشیوں کا کوئی ٹھکانہ نہ ہوتا۔" قدسیہ نے جلنے بھُننے انداز میں احمد رضا سے کہا۔

"اور ڈیڈی نے میری تو بڑی ہی توہین کر دی ہے آہ کاش وہ فنِ موسیقی سے کچھ واقفیت رکھتے۔"

"انھیں تو فنِ مصوری سے بھی کچھ واقفیت نہیں ہے۔ پتہ

نہیں ڈیڈی نے یہ زندگی کون سے جنگل میں گزاری ہے؟"

"نہیں نہیں بھئی! اس قسم کی باتیں نہ کرو۔ بہرصورت وہ ہمارے لئے قابلِ احترام ہیں۔ ان کی سوچ بھی ٹھیک ہے لیکن یہ بے پناہ دولت جو آ رہی ہے اسے سنبھال لیا جائے گا۔ اتنے فکرمند کیوں ہیں وہ؟" زاہد نے قہقہہ لگایا۔

"زاہد بھائی! آپ بالکل محسوس نہ کیا کریں ڈیڈی کی باتوں کو۔ ہم سب جانتے ہیں کہ وہ یہ سب آپ کی جلن میں کہتے ہیں لیکن وہ جلتے رہیں ہمیں اس بات کی پروا کب ہے" شازیہ نے کہا۔

"نہیں بھئی وہ میرے بھی بزرگ ہیں۔ بھلا میں ان کی باتوں کا برا کیوں مانوں گا اور ہم میں سے کسی کو بھی برا نہیں ماننا چاہئے بے چارے جو کچھ بھی کہتے ہیں ہمارے بھلے کے لئے کہتے ہیں۔ بس ذرا سوچنے میں غلطی ہے اور کچھ نہیں ہے شہرت انسان کو بہت کچھ دیتی ہے۔ اب تم مجھے بتاؤ حکومت کا کون سا محکمہ ہے جو تمہارے کسی مسئلے میں رکاوٹ بنے گا۔ بلکہ میں تو ایک بات کہتا ہوں قدسیہ تم یہ کام بھی کر دو۔ ضرورت مندوں کے لئے ہمارے گھر کے دروازے ہمیشہ کھلے رہنے چاہئیں۔ فرسٹ ایڈ ہاؤس تو ابھی تعمیر ہو رہا ہے لیکن اس کی ایک برانچ تم اس کوٹھی میں بھی تعمیر کر ڈالو۔ تم ہر جگہ ہر شخص کی سفارش کر سکتی ہو۔ تمہاری بات اب سنی جائے گی۔ چنانچہ جو کوئی کسی الجھن میں پھنسے تم اسے دعوت دو کہ وہ تمہارے پاس آئے، اور پھر تمہارا ایک ٹیلی فون ہی اس کے لئے کافی ہو گا۔ تقدیریں بدل جاتی ہیں لوگوں کی سفارشوں کے ذریعے، یہ دور سفارشوں ہی کا تو ہے۔ کیا تم ضرورت مندوں کی مدد کرنے سے انکار کر دو گی؟"

"ہرگز نہیں، ہرگز نہیں بلکہ میں تو خوش ہوں کہ آپ نے مجھے ایک نئی روشنی دکھائی۔"

"میں تو تمہیں روشنیاں دکھانے کے لئے اس کوٹھی میں آیا ہوں۔ دیکھتی رہو ابھی کیا کیا ہوتا ہے۔" زاہد نے پُراسرار لہجے میں کہا اور پھر وہ سب کے سب منتشر ہو گئے۔ شجاع احمد صاحب کے الفاظ نے تھوڑا سا تکدّر ذہنوں میں ضرور پیدا کر دیا تھا لیکن اس کی پروا کسے ہوتی۔ اب تو وہ ایک بے حیثیت انسان بن کر رہ گئے تھے اس عمارت میں۔

سرفراز، زاہد سے ملنے کے لئے سب سے زیادہ بے چین تھا۔ چنانچہ جوں ہی اس نے زاہد کو تنہا اپنے کمرے میں پایا بغیر اجازت کے اندر گھس کر دروازہ بند کر لیا۔ زاہد مسکراتی نگاہوں سے اُسے دیکھ رہا تھا۔

"آؤ سرفراز خیریت؟ بڑے پُراسرار انداز میں کمرے میں آئے ہو؟"

"زاہد بھائی، زاہد بھائی میرے لئے بندوبست کر دیجئے۔"

"کیا بندوبست...؟"

"پاگل خانے میں داخل کرانے کا۔"

"اوہ تو گویا تم زندگی کو اور قریب سے دیکھنے کے خواہش مند ہو۔" زاہد نے کہا اور سرفراز ہنس پڑا۔

"جو کچھ میں دیکھ رہا ہوں۔ یہ جو کچھ میں نے دیکھا اس کے بعد کچھ دیکھنے کی گنجائش تو نہیں ہے۔ صرف اپنے دماغ کا علاج کرانا چاہتا ہوں۔"

"کیوں بھئی ایسی کون سی مشکل پیش آ گئی تمہیں، جس سے تمہیں اپنے دماغ کا علاج کرانے کی ضرورت محسوس ہوئی۔"

"یہ آپ کہہ رہے ہیں زاہد بھائی۔ آپ یہ سوال کر رہے ہیں مجھ سے؟ بس میں کیا کہوں؟"

"کہو کہو میاں۔ جو دل چاہے کہو تمہیں روکنے والا کون ہے؟"

"زاہد بھائی یہ سب کیا تھا؟ یہ سب کیا ہے زاہد بھائی، میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔" سرفراز نے کہا۔

"جو کچھ سمجھ میں نہیں آیا بیٹے، پوچھ سکتے ہو۔ بچوں کو پوچھنا چاہئے۔" زاہد نے بزرگانہ انداز میں کہا اور سرفراز پھر گھٹے گھٹے انداز میں ہنس پڑا۔

"میں... میں مصوّر ہوں زاہد بھائی!"

"بھئی! دُنیا نے مانا ہے ہم کیا کہہ سکتے ہیں؟"

"کیوں مانا ہے دُنیا نے مجھے بس اس سوال کا جواب چاہئے۔ میں نے تو زندگی میں کبھی برش اور رنگ ہاتھ میں بھی نہیں پکڑے تھے۔ ایک پریشان حال آدمی تھا۔ نوکری کی تلاش میں مارا مارا پھر رہا تھا کہ آپ ایک مسیحا کی حیثیت سے مل گئے آپ نے روٹی کپڑا اور مکان دلا دیا اور مجھے مصوّر بنا دیا۔ اب بھلا بتایئے میں مجھ جیسا آدمی اور مصوّر اور پھر میں نے ایک اُستاد کی حیثیت اپنی شاگردہ کو مصوّری سکھائی۔ آپ یقین کریں لمحہ لمحہ اپنے دل میں قتل ہوا ہوں۔ جو کچھ بکواس اس کے سامنے کر رہا ہوں اس پر دانتوں کو گڑگڑا گڑگڑا کر خدا سے معافی مانگی ہے کہ اللہ مجھے معاف رکھ اگر میری روزی ایک آدمی کی عزّت کا سوال نہ ہوتا تو میں یہ جھوٹ کبھی نہ بولتا۔ میں اس معصوم لڑکی کے لئے بڑا افسردہ رہا ہوں جو خواہ مخواہ کینوس پر لکیریں کھینچ کھینچ

کر اور ان لکیروں پر رنگ پوت پوت کر خود کو مصوّرہ سمجھنے لگی
کبھی اس نے تنہائی بنائی، کبھی بہار، کبھی آبرو حالانکہ وہ نہیں
جانتی تھی کہ اگر یہ تصویریں منظر عام پر آ گئیں تو خود اس کی آبرو
لُٹ جائے گی لیکن ایک ساحر نے سحر پھونکا اور ساری دُنیا
پاگل ہو گئی۔ یہ کیسے ممکن ہُوا زاہد بھائی یہ کیسے ممکن ہُوا بس مجھے
اسی سوال کا جواب چاہیئے۔"

"آہستہ بول یار آہستہ۔ دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں
کیوں میری بھی عزت کے پیچھے پڑا ہُوا ہے۔ ارے بھائی نکال دے ذہن
سے ان ساری باتوں کو یہ دُنیا ایسی ہی چوں چوں کا مربّہ ہے
یہ اہلِ علم و دانش جو نقادانِ فن کہلاتے ہیں۔ سب ایک دوسرے
سے تعاون کرتے ہیں۔ فن اور ثقافت کبھی ایک حیثیت نہیں
رکھتی تھیں۔ آج کل تو نتھو، بندو اور خیراتی فنکار بن گئے ہیں۔
نتھو کے پاس دولت ہے۔ وہ بندو کو سراہتا ہے اور بندو کے
پاس دولت ہے وہ خیراتی کو مدبّر مانتا ہے۔ یہ سارے کے
سارے دھندے اسی طرح چل رہے ہیں۔ میرے عزیز یہ فنکار
یہ نقاد جو ہماری اس نمائش میں بطور مہمان آئے تھے احمق
نہیں ہیں۔ اگر یہ نمائش کسی گندے سے محلے میں رہنے والے
ایک باعمل فنکار کی ہوتی۔ ایک ایسے فنکار کی جو واقعی تصویریں
کر سکتا ہوتا اور اس کے پاس یہ وسائل نہ ہوتے جو اسے یہ
شہرت بخش سکتے تو یقین کرو ان تصویروں کا مذاق اُڑایا جاتا۔
نمائش گاہ میں دس آدمیوں کے علاوہ گیارہواں آدمی نہ ہوتا
اور یہ دس بھی وہ ہوتے جو تھوڑا بہت وقت گزارنے
کے لئے کہیں اور جانے کے بجائے آرٹس امپوریم میں گھس آتے
وہ ان تصویروں کو دیکھتے ان کے گڈمڈ رنگوں کو دیکھ کر
ناک بھوں پر چڑھاتے اور مصوّر کو گالیاں دیتے ہوئے
واپس چلے جاتے۔ ہونہہ تجریدی آرٹ بھی کوئی آرٹ ہے لیکن میرے
دوست، قدسیہ شجاع احمد ایک بہت بڑے باپ کی بیٹی ہے۔ اخبارات
نے پبلسٹی کی تھی، بڑے بڑے لوگ اس نمائش میں مدعو تھے۔ کسی
نے سوچنے سمجھنے کی کوشش نہیں کی نقادوں نے دیکھا کہ ان کی
زبردست پذیرائی ہو رہی ہے اور ان کا مستقبل سنورنے کو ہے
تو انھوں نے بھی یہ موقعہ ہاتھ سے نہ جانے دیا۔ قدسیہ نے جو کچھ
بنایا وہ جانے اور اس کا اللہ جانے۔ انھیں جو کچھ کہنا تھا
وہی وہ کہہ کر چلے گئے۔ اگر نہ کہتے تو اپنے لئے خواہ مخواہ بے شمار
دروازے بند کر لیتے۔ یہ وقت کی کہانیاں ہیں سرفراز ان پر
اتنی گہرائی سے نہ سوچو۔ ساری دُنیا ایک ہی رنگ میں رنگی ہوئی
ہے بس ان رنگوں کو جان لو تم دُنیا کے کامیاب ترین انسان
کہلاؤ گے۔"

"میری عقل یہ سب کچھ تسلیم نہیں کرتی۔"

"آنکھوں دیکھی حقیقت ہے کیسے جھٹلاؤ گے؟"

"عام لوگوں کی تو میں بات نہیں کرتا۔ مجھے صرف ان نقادوں
پر حیرت ہے۔ آخر انھوں نے انھیں کیسے تسلیم کر لیا۔"

"کرنا ہی تھا انھیں۔"

"ضمیر بھی تو کوئی چیز ہوتی ہے۔"

"ہوتی ہے لیکن ان دنوں کمیاب ہے۔ دولت کی چکاچوند
نے ان انسانوں سے حواس چھین لئے ہیں۔ وہ نہ کچھ دیکھ پاتا ہے
نہ سمجھ پاتا ہے۔ کون جانے ان لوگوں نے خود کو نقاد منوانے کے
لئے کتنے پاپڑ بیلے ہوں گے۔"

"بہرحال زاہد بھائی یہ آپ ہی کا کارنامہ ہے کہ آپ نے ایک
ناممکن کو ممکن بنا دیا۔ مجھے تو اُمید نہیں تھی۔"

"تم اگر چاہو تو ساری دُنیا میں ان تصویروں کی نمائش کرا
دُوں۔ ہر جگہ ان کی پذیرائی ہوئی ہو۔"

"ہاں آپ کرا سکتے ہیں۔ مجھے یقین ہے۔" سرفراز نے ہنستے
ہوئے کہا۔

"میں نے تمھارا مستقبل محفوظ کر دیا ہے سرفراز۔ اپنے ضمیر کے
بوجھ سے دب کر تم زاہد کو ذلیل نہ کرا دینا۔"

"نہیں زاہد بھائی کس دل سے ایسا کروں گا لیکن میں اُلجھن
میں ضرور ہُوں۔ وہ۔ . . وہ قدسیہ بھی احمق مجھ سے ضرورت سے
زیادہ متاثر ہو گئی ہے۔"

اس کی بھی فکر مت کرو۔ اس سلسلے میں مَیں آج کل بہت
غور سے سوچ رہا ہُوں۔"

"کیا سوچ رہے ہیں۔ . . ؟"

"میں نے ایک بات کہی تھی تم سے۔ اس بات کا اعتراف پہلے
ہی کر چکا ہُوں کہ اس رات میں نے تم دونوں کی گفتگو سُن لی تھی۔
مجھے دلی مسرت ہو گی اگر تم دونوں یکجا ہو جاؤ۔"

"یہ آپ کا خیال ہے زاہد بھائی! کیا آپ اس ناممکن کو بھی
ممکن بنا سکتے ہیں؟"

"اگر زندہ رہا تو؟"

"خدا آپ کو ہزاروں برس زندہ رکھے لیکن میری والدہ بہت
حساس ہیں۔ میری کوئی توہین برداشت نہ کر سکیں گی۔"

"ایسا نہیں ہو گا سرفراز بھروسہ رکھو۔ بیگم صاحبہ کے کانوں

تک یہ بات پہنچ چکی ہے۔ ممکن ہے چند ہی روز میں اُن کا رویہ بدلا ہُوا پاؤ۔"

"کیا مطلب؟" سرفراز چونک پڑا۔

"ہاں وہ اس سلسلے میں مجھ سے متفق ہیں۔"

"بیگم صاحب؟"

"ہاں یار! اس میں حیران ہونے کی کیا بات ہے۔ میں نے ان کے سامنے یہ تجویز پیش کر دی تھی۔"

"اوہ! زاہد بھائی۔ زاہد بھائی آپ فرشتہ ہیں آپ خدا کی قسم میرے لئے۔ زاہد بھائی آپ کا خیال دُرست ہے۔ کل رات ہی بیگم صاحبہ نے مجھے سینے سے لگایا تھا۔"

"او ہو، اکیلے اکیلے۔۔۔ میں۔۔۔ ہمیں پتہ بھی نہیں۔" زاہد اُچھل کر بولا پھر کہنے لگا۔ "مجھے اور کچھ کرنا ہے سرفراز۔ تمہاری ایک حیثیت بنانی ہے مجھے۔" سرفراز نے اس سلسلے میں کوئی اور سوال نہیں کیا تھا۔

شازیہ کی نگاہیں ان دنوں کچھ تلاش کر رہی تھیں۔ زاہد کا پڑھایا ہُوا سبق اس کے ذہن میں بیٹھ گیا تھا لیکن اُسے غریبوں کا کوئی تجربہ نہیں تھا۔ پتہ ہی نہیں غریب کیسے ہوتے ہیں۔

ایک شام وہ کسی سہیلی کے گھر سے واپس آ رہی تھی۔ اپنی کار خود ہی ڈرائیو کر رہی تھی۔ ایک ٹریفک سگنل پر کار رُکی تو ایک نوجوان اس کے پاس پہنچ گیا۔

"محترمہ کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔" شازیہ نے چونک کر اُسے دیکھا پھر بولی۔

"کیا بات ہے؟"

"میں فقیر نہیں ہوں۔ بس حالات کا شکار ہوں۔ باہر سے آیا تھا۔ نوکری کی تلاش میں جو کچھ تھا وہ چوروں کی نذر ہو گیا۔ انتہائی پریشان کن زندگی گزار رہا ہوں۔ میں بے حد غریب آدمی ہوں۔"

سگنل کھلنے والا تھا۔ شازیہ اس کی اس تمہید کا کوئی مطلب نہیں سمجھ سکی تھی۔ وہ کس قدر بے چین ہو رہی تھی۔ کلچ دبا رکھا تھا کہ سگنل کھلتے ہی گاڑی آگے بڑھا دے لیکن نوجوان کے آخری جملے نے اسے چونکا دیا۔

"تم غریب ہو؟" اس نے معذرت سے پوچھا۔

"بے حد۔"

"اچھا اچھا پیچھے بیٹھ جاؤ۔ ابھی سگنل کھلنے والا ہے۔ میں آگے چل کر تم سے بات کروں گی۔"

نوجوان ایک لمحے کے لئے ٹھٹکا پھر جلدی سے پچھلا دروازہ کھول کر بیٹھ گیا۔ شازیہ نے کار آگے بڑھا دی تھی۔ تھوڑی دُور جا کر اس نے کار سڑک کے کنارے روک دی۔ انجن بند کر کے اس نے پیچھے دیکھتے ہوئے کہا۔

"ہاں اب اپنی کہانی سناؤ۔"

"میری کہانی تو بہت لمبی ہے۔ مختصراً آپ کو بتا چکا ہُوں۔"

"ہُوں! مجھے بہت دُکھ ہُوا تمہاری کہانی سُن کر۔ بتاؤ میں تمہارے لئے کیا کر سکتی ہُوں۔"

"جو کچھ بھی کر سکیں ایک غریب انسان کے لئے۔ اگر آپ کے سینے میں انسانیت کا جذبہ ہے تو میری مشکل حل کر دیں۔"

"محبت کروگے؟" شازیہ نے پوچھا۔

"ایں۔۔۔؟" نوجوان کا مُنہ حیرت سے کُھل گیا۔

"دیکھو میں ایسی ویسی لڑکی نہیں ہُوں۔ ایک بہت دولت مند انسان کی بیٹی ہوں۔ کسی مسئلے میں غلط بھی نہیں ہوں۔ اگر غلط ہوتی تو اس کافر کے بچے کے خط پر مجھے یوں غصّہ نہ آتا۔ میں بالکل شریف لڑکی ہوں لیکن ان دنوں مجھے ایک غریب کی تلاش ہے۔"

"کیا کریں گی اس کا؟"

"پہلے تو محبت کروں گی باقی بعد میں دیکھا جائے گا۔"

"محبت کسی بھوکے کا پیٹ تو نہیں بھر سکتی۔"

"تم بھوکے ہو؟"

"پچھلے دو دن سے کچھ نہیں کھایا۔"

"اوہ آئی ایم سوری۔ تب آؤ پہلے کسی ریستوران میں چل کر تمہیں کچھ کھلاؤں سچ ہے کھائے پئے بغیر کوئی محبت کیسے [illegible] ہے۔"

شازیہ نے دوبارہ کار اسٹارٹ کر دی۔ نوجو[illegible] سٹی گم ہو رہی تھی۔ کہیں یہ لڑکی کسی مصیبت میں نہ پھنسا دے لیکن شازیہ کے دل میں سوتے پھوٹ رہے تھے۔ علّامہ اقبال کی نظم اس کے ذہن میں چکرا رہی تھی۔ بالآخر اس نے ایک ریستوران کے سامنے کار روک دی۔

"آؤ۔" وہ کار سے اُترتے ہوئے بولی۔

"اس ہوٹل میں؟" نوجوان گھگھیاتے ہوئے بولا۔

"ہاں آؤ!"

"میرا لباس اس قابل نہیں ہے۔"

"اب ایسا بُرا بھی نہیں ہے۔ آجاؤ۔" شازیہ نے بے نیازی

سے کہا۔ لباس واقعی اس شخص کا اچھا نہیں ہے لیکن مجھے لباس سے
کیا لینا غریب تو ہے۔ میرا کام تو غریبوں سے محبت کرنا ہے۔"
ریستوران میں زیادہ رش نہیں تھا۔ اس لئے یہ جوڑا زیادہ
لوگوں کے لئے باعث توجہ نہ بن سکا۔ کھانا تو اس وقت نہ مل
سکا۔ البتہ دوسری بہت سی چیزیں شازیہ نے منگوالی تھیں۔
جنھیں وہ غریب بڑے اطمینان سے حلق میں اُتار رہا۔ شازیہ اس
کا دل رکھنے کے لئے خود بھی کچھ نہ کچھ کھاتی رہی تھی۔
تمام برتن صاف ہوگئے تو اس نے پوچھا "کیا کچھ
اور منگواؤں؟"
"نہیں بس شکریہ! آہ! وقت نے کیا دن دکھا دیا۔"
"کوئی بات نہیں انسان ہی انسان کے کام آتا ہے۔ تم بالکل
فکر نہ کرو۔ کیا نام ہے تمھارا؟"
"محمد حمن صدیقی۔"
"میرا نام شازیہ ہے۔ مجھے بتاؤ میں تمھارے لئے
اور کیا کروں؟"
"وہ محبت والی بات آپ نے کیا کہی تھی؟"
"ہاں! میں تم سے محبت کرتی ہوں۔"
"لیکن آپ نے، میرا مطلب ہے آپ نے تو مجھے پہلی بار
دیکھا ہے۔"
"اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔"
"کیا میں اس قابل ہوں؟"
"میں بنالوں گی۔ یہ کوئی مشکل کام نہیں ہے۔"
"آپ نے فلم "محبت کی فتح" دیکھی ہے؟"
"نہیں کیوں؟"
"میں نے دیکھی تھی۔ اس میں بالکل اسی طرح ایک دولتمند
لڑکی کو ایک غریب شخص سے اچانک محبت ہو جاتی ہے۔ وہ اس
محبت کے لئے ساری دُنیا سے ٹکرا جاتی ہے اور پھر جیت محبت
ہی کی ہوتی ہے۔"
"ہماری محبت کی بھی جیت ہوگی۔"
"آپ کے والد صاحب پولیس میں تو نہیں ہیں۔"
"نہیں کیوں؟"
"کوئی اور رشتے دار پولیس میں ہے؟"
"نہیں، لیکن یہ پولیس کہاں سے گھس آئی؟"
"کیا کرتے ہیں آپ کے والد؟"
"بزنس مین ہیں۔ لاکھوں کا روبار کرتے ہیں۔"
"لاکھوں کا۔؟" نوجوان کی آنکھیں پھیل گئیں۔
"کروڑوں کا سمجھو۔"
"اور آپ ان کی اکلوتی بیٹی ہیں؟"
"نہیں میرے دوسرے بہن بھائی بھی ہیں۔"
"اوہ! یہ گڑبڑ ہوگئی۔"
"کیوں۔؟"
"محبت کی فتح میں ہیروئن اپنے ماں باپ کی اکلوتی بیٹی تھی
اس لئے اس کے باپ کو اس کے سامنے جھکنا پڑا۔ تمھارے والد
بزرگوار بہت سخت آدمی ہیں کیا؟"
"ہیں تو سخت؟"
"مار پیٹ بھی کرتے ہوں گے؟"
"نہیں ایسی کوئی بات نہیں ہے۔"
"میرے لئے کوئی خطرہ تو نہیں ہوگا؟"
"نہیں! زاہد بھائی ہمارے پشت پناہ ہوں گے۔"
"تم بہتر جانو۔ اب چلیں یہاں سے؟"
"چلو۔" شازیہ اُٹھ گئی۔ محمد حمن صدیقی ایک ڈکار لے
کر بولا۔
"بڑی مشکلات ہیں اس دُنیا میں انسان کے لئے۔ اب
مجھے دیکھو پیٹ بھر گیا ہے لیکن عزت کا خطرہ ابھی باقی ہے۔"
"کیوں۔؟"
"اس دوران قرض لے کر کام چلاتا رہا ہوں۔ قرض خواہ
شکل دیکھتے ہی تقاضے شروع کر دیتے ہیں۔ کب تک جھوٹے
وعدے کروں ان سے۔"
"اوہ، واقعی! مگر سُنو۔ ایک منٹ ٹھہرو۔" شازیہ نے اپنا پرس
کھول کر دیکھا۔ چار پانچ سو روپے پڑے ہوئے تھے۔ اس نے
سارے نوٹ نکال کر اس کے حوالے کر دیئے۔ "فی الحال یہ رکھو
کل آؤ گے ہمارے ہاں تو میں تمھارے قرض کی ایک ایک پائی
ادا کردوں گی۔"
"میں کس طرح تمھارا یہ احسان اُتاروں گا؟" وہ گلوگیر
لہجے میں بولا۔
"اس میں احسان کی کوئی بات نہیں ہے۔ تم محسوس ہی
نہ کرو۔ کل میں تمھیں سب سے ملواؤں گی۔ بتاؤ کس وقت
آؤ گے؟"
"جس وقت آپ کہیں۔"
"کل گیارہ بجے آجاؤ۔ میں انتظار کروں گی۔"

"اپنا پتہ دے دو" اس نے کہا اور شازیہ نے اپنی کوٹھی کا پتہ دُوہرا دیا۔

"اچھا خدا حافظ۔ آج ساری رات تمھیں یاد کرتا ہوں گا شازیہ۔ تم میری زندگی میں صبح بہار بن کر آئی ہو۔ آہ! میں تمھارے لئے آسمان سے ستارے توڑ لاؤں گا۔"

"خدا حافظ!" شازیہ اپنی کار میں جا بیٹھی اور پھر کار اسٹارٹ ہو کر آگے بڑھ گئی۔ چمن صدیقی آنکھیں پھاڑے اس وقت تک اس کار کو دیکھتا رہا جب تک وہ نظر آئی۔ پھر اس نے جیب میں رکھے ہوئے نوٹ تھپتھپائے: "واہ مالک سن لی تم نے" وہ بڑبڑایا اور آگے بڑھ گیا۔

دوسری طرف شازیہ مسرور تھی۔ یہ غریب اسے پسند تو نہیں آیا تھا لیکن اس کا دل نیک جذبوں سے سرشار تھا۔ گھر پہنچتے ہی اس نے زاہد کی تلاش شروع کر دی۔ زاہد اس وقت تو نہیں مل سکا تھا لیکن رات کو وہ ہاتھ لگ گیا۔

"کہاں چلے گئے تھے آپ زاہد بھائی! کتنی دیر سے آپ کا انتظار کر رہی ہوں۔"

"آیئے آیئے، ضرور کوئی خاص بات ہے۔"

"جی ہاں! بہت خاص بات۔ میں نے آپ کی ہدایت پر بالآخر عمل کر ہی ڈالا۔"

"بہت خوب، کون سی ہدایت تھی؟"

"ہو میرا کام غریبوں کی حمایت کرنا۔ میں نے ایک غریب آدمی کی نہ صرف حمایت کی بلکہ اس سے محبت بھی کر ڈالی۔"

"ارے ارے، اتنی پھرتی سے؟"

"جی ہاں! آج کا کام کل پر کیوں اُٹھا رکھا جائے۔"

"ہائے ہائے کون ہے وہ غریب جس سے آپ نے محبت کر ڈالی مس شازیہ اور وہ بھی اتنے دھڑلے سے؟"

"پوری کہانی سننی ہے آپ کو؟"

"ارشاد، ارشاد۔"

"بس میں دردانہ کے گھر سے آ رہی تھی ایک سگنل پر گاڑی رُکی تو وہ میرے پاس آگیا اور بڑے درد بھرے لہجے میں بولا کہ وہ غریب ہے میرا دل بھر آیا۔ میں نے ایک ریسٹوران میں اسے کھلایا پلایا۔ اس پر بہت قرض ہے۔ میرے پاس اس وقت جو کچھ تھا اسے دے دیا۔ کل گیارہ بجے میں نے اسے آپ سے ملانے کے لئے بلایا ہے۔"

"ملانے کے لئے؟"

"ہاں... آپ اسے دیکھ لیں تو پھر میں اس سے محبت کروں۔ ویسے میں نے اس سے پوچھا تھا کہ کیا وہ محبت کرے گا وہ تیار ہے۔"

"کیا... کیا؟" زاہد نے آنکھیں پھاڑیں۔

"ہاں وہ بالکل تیار ہے۔"

"ارے باپ رے۔ وہ فقیر تھا نا؟"

"نہیں غریب تھا۔" شازیہ معصومیت سے بولی۔

"اللہ تجھے سمجھے شازیہ! کتنے روپے دیئے اُسے...؟"

"پانچ چھ سو تھے۔ بس یہی تھے اس وقت۔"

"کل پھر اُسے کچھ دینا ہے؟"

"ہاں مقروض ہے بے پناہ۔"

"اور اس کے بعد آپ اس سے محبت کریں گی؟"

"نہ کروں؟"

"شکل و صورت کا کیسا ہے؟"

"اس پر تو میں نے غور نہیں کیا۔"

"یا اللہ! کس کس سے اس کا تذکرہ کر چکی ہو؟"

"ابھی تو کسی سے نہیں کیا۔"

"احسان ہے تمھارا بی بی۔ خدا کے لئے ابھی کسی سے اس کا تذکرہ بھی نہ کرنا۔ خدا کی بندی میرا یہ مقصد تو نہیں تھا کہ تم سڑکوں سے فقیر پکڑتی پھرو۔"

"تو پھر کہاں تلاش کروں غریبوں کو۔ کیا وہ کوٹھیوں میں ملیں گے؟" شازیہ آنکھیں نکال کر بولی۔

"ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔ کیا نام ہے اس کا؟"

"نام... نام..." شازیہ یاد کرتے ہوئے بولی۔ "ہاں محمد چمن صدیقی۔"

"اللہ و اکبر! کل گیارہ بجے آئیں گے موصوف؟"

"جی ہاں!"

"ٹھیک ہے شازیہ! کسی اور سے نہ ملانا اُسے خدا کے لئے اور نہ ہی کسی سے تذکرہ کرنا۔ پہلے میں اس کا جائزہ لے لوں پھر تمھیں اس بارے میں بتاؤں گا۔"

"او کے۔" شازیہ نے بڑے اطمینان سے کہا اور پھر تھوڑی دیر تک باتیں کرنے کے بعد وہ چلی گئی لیکن زاہد کے دلیتا کوچ کر گئے تھے۔ شازیہ کو اتنا معصوم بھی نہیں سمجھتا تھا۔ اسے گمان بھی نہیں تھا کہ ایسی حماقت کا ثبوت دے گی۔ بڑی مضحکہ خیز بات تھی۔ سوچو تو ہنسی آئے لیکن...

دوسری صبح اس نے اپنے سارے پروگرام ترک کر دیئے۔ اور وہ سرفراز کے ساتھ فرسٹ ایڈ ہاؤس چلے گئے تھے۔ دس بجے شجاع احمد بھی مل گئے۔ ذرا اطمینان ہُوا تھا۔

گیارہ بجے شازیہ کوٹھی کے گیٹ کے پاس پہنچ گئی اور پھر زاہد نے اسے ایک نوجوان کیساتھ آتے دیکھا۔ یہی حضرت محمد چمن صدیقی تھے۔ کل کے پیسوں نے کام دکھایا تھا۔ غالباً نقد کی پتلون تھی شارک سکن کی، سُرخ رنگ کی دھاری اور رُجسی بھی پتلون کے پائنچے نیچے سے مڑے ہوئے تھے۔ گلے میں گہرے نیلے رنگ کا اسکارف بندھا ہُوا تھا۔ بالوں میں تیل چپڑا ہُوا تھا۔ اس تیل سے چہرہ بھی چمک رہا تھا۔ پان کی دھڑی ہونٹوں پر، ہاتھ میں چھیڑی بھی تھی۔ زاہد کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ وہ جلدی سے باہر نکل آیا۔

"یہ محمد چمن ہیں" شازیہ نے تعارف کرایا۔

"تم اندر جاؤ" زاہد سخت لہجے میں بولا اور شازیہ چونک کر اسے دیکھنے لگی۔ زاہد نے چمن کا بازو پکڑا اور اسے لئے ہوئے اپنے کمرے میں آگیا۔

شازیہ ہکا بکا سی کھڑی رہ گئی تھی۔ بہرحال اس نے زاہد کی کوئی مصلحت سمجھی اور اندر چلی گئی۔ چمن کے بازو پر زاہد کی گرفت بہت سخت تھی۔

"تو تم ہو چمن؟" زاہد غرایا۔

"جج۔۔۔ جی ہاں۔۔۔ جی ہاں۔ انھوں نے میرے بارے میں بتا دیا ہوگا"

"ہاں بتایا تھا۔ بے فکر رہو۔ پولیس آنے ہی والی ہے"

"پپ پولیس؟" چمن صدیقی گھبرا کر کھڑا ہو گیا۔

"بیٹھ جاؤ کل تم نے اسے ٹھگ لیا تھا۔ کتنے روپے دیئے تھے اُس نے؟"

"چھ۔۔۔ چھ سو بتیس روپے"

"اور آج تم اس سے مزید روپے لینے آئے تھے؟"

"انھوں نے خود مجھ سے کہا تھا"

"یہ تو پولیس تم سے پوچھے گی کمینے۔ جان بچ گئی تیری اس کے ہاتھوں اس پر خُدا کا شکر ادا کر"

"خُدا کے واسطے صاحب۔ آپ ان سے پُوچھ لیں۔ میں نے تو کچھ بھی نہیں کہا تھا۔ وہ خود ہی کہنے لگیں کہ مجھ سے محبت کرو گے"

"اور تو نے محبت شروع کر دی۔ پولیس تم جیسے لفنگوں سے خوب نمٹنا جانتی ہے۔ اگر وہ لڑکی تجھ سے محبت شروع کر دیتی تو اس وقت تو اسپتال میں ہوتا"

"اسپتال میں۔۔۔ کیوں؟"

"وہ پاگل ہے۔ دماغی توازن خراب ہے اس کا۔ ایک نوجوان نے اسے دھوکہ دے دیا تھا۔ اب جب بھی اس پر دورہ پڑتا ہے وہ کسی کو پکڑ لاتی ہے۔ اخبار دیکھتے ہو کبھی؟"

"نہیں"

"تین نوجوانوں کو شدید زخمی کر چکی ہے۔ اب وہ اسی طرح دھوکہ دے کر کسی کو کوٹھی میں بُلاتی ہے۔ اسے اپنے کمرے میں لے جاتی ہے اور پھر اس پر جنون سوار ہو جاتا ہے۔۔۔ وہ چھرے سے حملہ کر دیتی ہے۔ پچھلی بار تین چھرے مارے تھے ایک نوجوان کو"

"ارے مر گیا حافظ جی! بب۔ بچا لیا تم نے مجھے اُستاد نکل جانے دو ایک بار نکل جانے دو میرا کوئی قصور نہیں ہے۔ خدا قسم آئندہ ایسا نہیں کروں گا۔ پولیس سے بھی بچاؤ مجھے"

"نہیں نہیں محبت کرو۔ کرو محبت"

"جانے دو بھائی صاحب۔۔۔! اب کبھی ادھر کا رُخ بھی نہیں کروں گا۔ جانے دو مجھے۔۔۔" وہ دروازے کی طرف کھسکنے لگا۔

"ابے جا تا کدھر ہے سُسرال میں آیا تھا نا۔ براتی آتے ہی ہوں گے بس" زاہد اسے پکڑنے دوڑا لیکن محمد چمن صدیقی نے دروازہ کھول کر باہر چھلانگ لگا دی تھی۔ زاہد اس کے پیچھے لپکا لیکن اس نے اسے پکڑنے کی کوشش نہیں کی تھی۔

شازیہ دُور سے شاید یہ منظر دیکھ رہی تھی۔ حیران پریشان زاہد کے پاس پہنچ گئی "وہ۔۔۔ وہ بھاگ کیوں گیا۔۔۔ کیا ہُوا تھا اُسے"

"یار شازیہ! اتنی احمق نکلو گی اس کی اُمید نہیں تھی"

"کیوں کیا ہُوا؟"

"شکل دیکھی تھی اس کی آدمی لگ رہا تھا"

"لگ تو نہیں رہا تھا لیکن غریب تھا"

"خُدا کی پناہ۔ فیصل تم سے کہیں زیادہ چالاک ہے۔ تم اتنی معصوم نکلو گی۔ مجھے شُبہ بھی نہیں تھا۔ کہاں تو فاخر کی یہ حالت بنا دی اور کہاں ایک فقیر کو پیچھے لگا لائیں"

"فقیر؟"

"تو اور کیا۔ غریب اس طرح سڑکوں پر بھیک مانگتے پھرتے

ہیں بھئی میں نے ایسے غریبوں کے بارے میں تو نہیں کہا تھا۔ وہ تو ٹھگ تھا شازیہ۔ یہاں سے کوئی قیمتی چیز اُٹھا بھاگتا اور بس۔ ایسے غریبوں پر توجہ تھوڑی ہی دینی چاہیئے۔ لوگ کیا کہتے تمھارے بارے میں؟"

"تو مجھے کیا معلوم تھا؟"

"خیر یہی شکر ہے دوسرے لوگوں کو اس بارے میں کچھ معلوم نہیں ہوا۔ لوگ مذاق اُڑاتے تمھارا۔ شازیہ اب تم کسی غریب کے بارے میں کچھ نہ سوچنا۔ میں تمھارے لئے انتخاب کروں گا۔ تم سے مشورہ کروں گا اور پھر ہم کام کریں گے۔"

"یہ ٹھیک ہے واقعی بڑا عجیب تھا وہ۔ اس نے تیل کتنا ڈال لیا تھا بالوں میں۔ میں نے تو بس غریب ہونے کی حیثیت سے برداشت کر لیا تھا۔"

"خدا کے واسطے آئندہ کسی غریب کو اس طرح مُنہ نہ لگانا۔"

"کیوں میں پاگل ہوں۔ بس ایک بار غلطی ہو گئی۔" شازیہ شرمندہ سے لہجے میں بولی۔

شازیہ کو سمجھا بجھا کر وہ اپنے کمرے میں واپس آ گیا۔ درحقیقت یہ شازیہ کی معصومیت کی انتہا تھی۔ حالانکہ اچھی خاصی جوان لڑکی تھی لیکن شجاع احمد صاحب کا کوئی بھی بچّہ شاطر نہیں تھا۔ شازیہ کے ذہن میں یہ بات بیٹھ گئی تھی اور غریبوں سے محبت کرنے کا یہ طریقہ نکال ڈالا تھا۔ اس لئے بہر طور زاہد نے فیصلہ کیا کہ ان معاملوں میں بھی اسے محتاط رہنا پڑے گا۔ دماغ گھوم کر رہ گیا تھا۔ اگر شجاع احمد صاحب کو یہ بات معلوم ہو جاتی اور پتہ چلتا کہ یہ سب زاہد کے اشارے پر ہو رہا ہے تو بات یقیناً بگڑ جاتی اور اس طرح بگڑتی کہ زاہد کے لئے سنبھالنا مشکل ہو جاتا۔ شکر تھا کہ حضرت محمد حسین صدیقی اس طرح اس کے ہاتھ لگ گئے تھے اور ان کی اُمیدیں خاک میں مل گئی تھیں۔

بڑی دیر تک وہ پریشان سا بیٹھا رہا۔ پھر تیار ہو کر باہر نکل آیا۔ فرسٹ ایڈ ہاؤس جانے کا ارادہ تھا۔ برآمدے میں پہنچا تو اس نے ایک خوبصورت سی چمچماتی کار پورٹیکو میں رُکتے دیکھی۔ پتہ نہیں کون آیا تھا۔ وہ ایک لمحے کے لئے رُک کر کار سے اُترنے والے کو دیکھنے لگا لیکن اُترنے والا، والا نہیں تھا بلکہ والی تھی۔ ایک خوبصورت سے خدوخال کی نوجوان لڑکی آنکھوں پر سنہرے فریم کی عینک جمی ہوئی تھی۔ ہاتھوں میں ایک پرس جھول رہا تھا۔ بادی النظر میں خاصی عمدہ لگ رہی تھی۔ زاہد کو دیکھ کر اس نے اُنگلی سے اشارہ کیا اور اسے اپنے قریب بُلا لیا۔

"ہیلو مجھے پہچانا؟" اس نے کہا اور زاہد آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اسے دیکھنے لگا۔

"بدقسمتی ہے میری کہ نہیں پہچان سکا۔ فرمایئے کس سے ملاقات کرنی ہے آپ کو؟"

"وہ سرفراز صاحب یہیں رہتے ہیں نا۔ ویسے میں نے تمھیں نمائش گاہ میں دیکھا تھا۔ تصاویر کا نیلام تم ہی کر رہے تھے نا؟"

"اوہ! جی ہاں، جی ہاں، اب میں پہچان گیا آپ کو شاید آپ نے ایک تصویر خریدی بھی تھی؟"

"ہاں ہاں وہی وہی آبرو میں نے خرید لی تھی۔"

"سبحان اللہ بڑا اچھا کیا تھا آپ نے۔ کیسی لگی تھی وہ تصویر آپ کو؟"

"بہت خوبصورت، بہت پیاری۔ میں نے اُسے اپنے بیڈ رُوم میں فریم کرا کے آویزاں کیا ہے۔ سرفراز صاحب کہاں ہیں؟"

"معاف کیجئے گا۔ آپ سرفراز صاحب کو کیسے جانتی ہیں؟"

"کمال ہے اس وقت مُلک میں کون انھیں نہیں جانتا وہ تو چھپے رستم نکلے۔ خود اپنی تصویروں کی نمائش کبھی نہ کی۔ پتہ ہی نہ چل سکا لوگوں کو کہ فنِ مصوری کے آسمان پر ایک ایسا ستارہ جگمگا رہا ہے۔ خود گمنامی میں زندگی بسر کی اور اس لڑکی کو کیا نام ہے اس کا وہ۔ جس کی تصویروں کی نمائش ہوئی تھی۔"

"قدسیہ شجاع احمد!" زاہد نے جواب دیا۔

"جی ہاں۔۔۔ جی ہاں۔۔۔ اسی کے بارے میں ہی بات کر رہی ہوں۔۔۔ اور اس لڑکی کو انھوں نے زمین سے آسمان پر پہنچا دیا۔"

"آپ قدسیہ سے واقف ہیں؟"

"نہیں بھئی! میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا اُسے حالانکہ شجاع احمد صاحب مشہور آدمی ہیں۔"

"جی ہاں، جی ہاں! سرفراز صاحب کو آپ اس سے پہلے سے جانتی ہیں یا بس نمائش ہی میں دیکھا تھا؟ ویسے میں نے ان کو آپ کے قریب کئی بار دیکھا ہے۔"

"ہاں بھئی! ہم دونوں میں گہری انڈر اسٹینڈنگ ہو گئی ہے سرفراز صاحب مجھے پسند کرتے ہیں اور میں انھیں، اس وقت انہی سے ملنے آئی تھی۔"

"پپ پسند کرتے ہیں آپ کو؟" زاہد ہکلا کر بولا۔

"ہاں! کیوں آپ کو حیرت کیوں ہوئی آیئے نا اندر کیا سوا

صاحب موجود نہیں ہیں ؟"

"جی نہیں، وہ اس وقت گھر پر نہیں ہیں"

"اور ان کے اہلِ خاندان ؟"

"ان کے اہل خاندان میں کوئی نہیں ہے محترمہ، بس وہ تنہا ہی ہیں"

"یہیں رہتے ہیں نا وہ ؟"

"کیا آپ کو انھوں نے یہاں کا پتہ بتایا تھا ؟"

"نہیں میں خود ہی پتہ لگاتی ہوئی پہنچی ہوں۔ سمجھ ہی میں کچھ نہیں آیا کہ ان سے کہاں رابطہ قائم کروں۔ کئی بار یہاں ٹیلی فون بھی کیا لیکن اتفاق سے وہ ٹیلی فون پر بھی نہیں مل سکے"

"جی ہاں، جی ہاں، وہ یہاں نہیں رہتے"

"پھر کہاں رہتے ہیں ؟"

"آیئے۔ ۔ ۔ میں آپ کو ان سے ملا دوں" زاہد نے جواب دیا۔

"اوہ تھینک یو۔ ۔ ۔ تھینک یو چلئے" لڑکی تیار ہوگئی اور زاہد جلدی سے اس کے ساتھ کار میں آ بیٹھا۔ سرفراز کی یہ شناسا بہت سے گل کھلا سکتی تھی۔ زاہد نے اس سے پہلے اس بات پر غور نہیں کیا تھا لیکن اب اسے یہ لڑکی اچھی طرح یاد آگئی تھی۔ کئی بار اس نے اُسے سرفراز صاحب کے ہمراہ دیکھا تھا لیکن وہ خود اتنا مصروف تھا کہ یہ اندازہ نہیں لگا سکا کہ وہ سرفراز کے اتنا قریب کیوں ہے۔ بس وہ یہی سمجھا تھا کہ نمائش میں آنے والی کوئی لڑکی ہے جو تصاویر میں دلچسپی لے رہی ہے۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ یہ لڑکی سرفراز میں بھی دلچسپی رکھتی ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد کار اسٹارٹ ہو کر کوٹھی سے باہر نکل آئی۔ پتہ نہیں کسی نے ان دونوں کو کار میں جاتے ہوئے دیکھا تھا یا نہیں، ویسے کوئی دیکھ بھی لیتا تو زاہد کا کوئی ایسا معاملہ نہیں تھا کہ کسی اور کو اس سلسلے میں کوئی تشویش ہوتی۔ ۔ ۔ بہرحال کوٹھی سے باہر آکر اس نے سکون کی سانس لی تھی۔

ایک محترم عزیب آئے تھے اور اب یہ دولت مند خاتون ایک عزیب کی تلاش میں تشریف لے آئی تھیں۔ ان کے انداز سے تو یہ معلوم ہوتا تھا کہ شاید مجھ پر نظرِ عنایت کچھ خاص ہی قسم کی ہے ہر طور زاہد کے لئے اسے کھول لینا کچھ مشکل کام نہیں تھا۔

"میں آپ کے نام سے واقف نہیں ہوسکا ؟" اس نے کہا۔

"حالانکہ آپ نے میرے نام پر تصویر کی رسید بھی بنائی تھی

مجھے سحر قدوسی کہتے ہیں"

"خوب، بہت خوب، واقعی آپ ایک بادلوں بھری صبح ہیں"

"بہت بہت شکریہ! آپ نے عجیب انداز میں میرے نام کی پذیرائی کی ہے"

"سرفراز سے آپ کا کیا ناتہ ہے" اس نے بے تکلفی سے پوچھا اور سحر قدوسی کے چہرے پر شرم کے آثار پھیل گئے۔

"وہ میرے سب کچھ ہیں" اس نے شرماتے ہوئے لہجے میں کہا اور زاہد کے حلق میں پھندہ سا لگ گیا۔ یہ نیا شوشا تھا ایک ناقابلِ یقین بات تھی لیکن۔ ۔ ۔ لیکن۔ ۔ ۔

اب مسئلہ ان سحر صاحبہ کو سنبھالنے کا تھا۔ ان کیلئے کیا کیا جائے۔ زاہد نے تھوڑی دیر تک سرفراز کی تلاش کے بہانے انہیں سیر کرائی اس دوران اس نے سحر قدوسی کے بارے میں کافی معلومات حاصل کرلی تھی۔ وہی تھی جو ہونا چاہیے تھی۔ یعنی ایک بگڑی ہوئی رئیس زادی۔ ناظم علی دولتمند انسان تھے

اور بیٹی کو ناز ونعم سے پال رہے تھے۔ کچھ دیر سیر کرانے کے بعد اس نے ان سے معذرت کرلی۔ اور بہت جلد سرفراز سے ملانے کا وعدہ کرلیا۔ سحر ناظم علی اس وقت تو رخصت ہوگئی تھی لیکن وہ آسانی سے پیچھا چھوڑنے والی مخلوق نہیں معلوم ہوئی تھی۔

اس دن بھی وہ اچانک کوٹھی پہنچ گئی۔ زاہد ہی سے سامنا ہوا تھا۔

"تم!"

"خادم۔"

"سرفراز ہیں؟"

"بدقسمتی سے نہیں ہیں۔"

کبھی ہوتے بھی ہیں۔"

بہت زیادہ ہوتے ہیں۔ لیکن آپ انتخاب ایسے ہی وقت کا کرتی ہیں جب وہ نہیں ہوتے۔ لیکن اگر آپ چاہیں تو انکی والدہ سے مل سکتی ہیں۔"

"والدہ۔" سحر چونک پڑی۔

"ہاں۔ کیوں کیا والدہ کوئی حیران کن چیز ہوتی ہے"

"مگر تم نے تو اس دن کہا تھا کہ اسکے اہل خاندان میں کوئی نہیں ہے۔"

"اہل خاندان آپ کسے کہتی ہیں۔"

افوہ۔ تم کیا کہنا چاہتے ہو۔"

"ماں خاندان گر ہوتی ہے۔ وہ اہل خاندان نہیں ہوتی۔"

"تم سے جیتنا مشکل لگتا ہے۔ چلو مجھے ان ملواؤ۔"

صابرہ بیگم نے اسے حیرت اور دلچسپی سے دیکھا تھا۔

سحر نے کہا "اب تمہاری موجودگی ضروری نہیں ہے۔"

"اوکے۔" زاہد وہاں سے ہٹ گیا۔

"بیٹھو بیٹی کون ہو تم؟"

"عظیم ماں کے عظیم بیٹے سرفراز کی پرستار۔ آپکو ایسے فنکار کو جنم دینے کی مبارکباد پیش کرنا چاہتی ہوں۔"

"شکریہ تم کیا کرتی ہو؟"

"عیش۔ بہت بڑے باپ کی بیٹی ہوں یوں سمجھے قسمت کی دیوی ہوں اور آپ پر مہربان ہونا چاہتی ہوں۔"

"مجھ پر"

"ہاں۔ میں سرفراز کو ان کا اصل مقام دینا چاہتی ہوں۔ میری دولت ان کا فن۔ اوہ مائی گاڈ۔ آپ نہیں جانتیں کیا ہوجائے گا اور پھر میں سرفراز کو چاہتی بھی ہوں۔"

صابرہ بیگم نے اسے تعجب سے دیکھا۔ یہ بیباکی انہیں عجیب لگی تھی۔ لیکن بہت بڑے باپ کی بہت بڑی بیٹی سے کچھ بعید نہیں تھا۔ بہرحال انھوں نے سنبھل کر کہا۔

"کیا کرتے ہیں تمہارے ڈیڈی؟"

"کوئی ایک کاروبار کرتے ہوں تو بتاؤں۔ آپ نے ان کا نام ضرور سنا ہوگا۔"

"کیا نام ہے ان کا؟"

"ناظم علی صدیقی"۔ سحر نے کہا اور صابرہ بیگم کے بدن کو ایک جھٹکا لگا۔ ان کا چہرہ پیلا پڑ گیا۔ پھر اچانک ان کے بدن میں تھرتھری سے پیدا ہوئی۔ پھر حلق سے کچھ بھینچی بھینچی سی آوازیں نکلیں اور پورے بدن سے پسینہ اگل آیا۔ سحر انکی یہ حالت دیکھ کر متوحش ہوگئی۔

"ارے کیا ہوگیا آپکو۔ میڈم۔ میڈم۔ او مائی گاڈ۔ سنو سنو تم کہاں گئے۔

زاہد دور نہ تھا دوڑتا ہوا آگیا۔

"دیکھو انہیں کیا ہوگیا۔"

زاہد نے صابرہ بیگم کو دیکھا اور بری طرح گھبرا گیا۔ "ارے کیا ہوگیا۔ کیا ہوگیا انہیں۔"

"پتہ نہیں۔ اچھی خاصی باتیں کررہی تھیں۔ تم انہیں دیکھو۔ میں چلتی ہوں۔" سحر چور سی ہوکر باہر نکل گئی۔ زاہد صابرہ بیگم کو سنبھالنے لگا لیکن زیادہ مشکل نہ پیش آئی۔ رفتہ رفتہ وہ اعتدال پر آگئی تھیں۔

"کیا ہوگیا تھا آپکو امی۔"

"ایں۔ کچھ نہیں ایسے ہی طبیعت بگڑ گئی تھی۔ اب ٹھیک ہوں۔ وہ بیچاری چلی گئی۔"

ہاں لیکن کچھ تو........

"یقین کرو۔ کوئی بات نہیں تھی۔ کیا سوچتی ہوگی بیچاری دل میں"

صابرہ بیگم معتدل ہوگئیں۔ لیکن نہ جانے کیوں زاہد کے دل میں ایک پھانس سی چبھ گئی تھی۔ "کچھ ہے کچھ ضرور ہے۔

حسبِ پروگرام حسام احمد صاحب نے اعلیٰ حکام کو فرسٹ ایڈ ہاؤس کے معائنے کی دعوت دی اور تاریخوں کے تھوڑے سے ردوبدل کے بعد یہ دعوت منظور کر لی گئی۔ حکومت خود اس عظیم الشان منصوبے سے متاثر تھی۔ چنانچہ یہ میٹنگ کامیاب رہی اور حکام نے خود ان لوگوں کو ان کی ضروریات کے حصول کے لئے مختلف راستے بتلائے اور خود بھی ہر طرح کے تعاون کا یقین دلایا۔ بہت سے منصوبوں پر بات چیت ہوئی جن کی تکمیل کے لئے حکومت کی طرف سے بھی امداد کی پیشکش کی گئی۔۔۔ چنانچہ کئی دن اسی طرح مصروفیات میں گزرے۔ دوسرے تمام پروگرام ملتوی کر دیئے گئے تھے اور تمام لوگ فرسٹ ایڈ ہاؤس کی تزئین کے لئے کوشاں ہو گئے تھے۔

اور اب صرف آخری مراحل رہ گئے تھے اس کے بعد فرسٹ ایڈ ہاؤس کا افتتاح ہونا تھا۔ اطلاع ملی تھی کہ شجاع احمد صاحب بھی غیر ملکی دورے سے واپس آ رہے ہیں۔ ان کی غیر موجودگی میں بھلا یہ عظیم کام کیسے ہو سکتا تھا۔ تقریباً بیس دن شدید مصروفیت کے گزرے سرفراز اور احمد رضا بھی شانہ بشانہ رہے تھے۔ ہارون وغیرہ اس معاملے میں کسی کام کے نہ تھے۔ اس لئے ان لوگوں کو کسی کام میں شریک نہیں کیا گیا تھا۔

ایک دوپہر کو زاہد وغیرہ فرسٹ ایڈ ہاؤس کے شاندار دفتر میں بیٹھے ہوئے تھے کہ اردلی نے ایک کارڈ لا کر دیا۔ سرخ رنگ کا بے حد خوبصورت کارڈ تھا جس پر "سحر ناظم علی" لکھا ہوا تھا۔ کارڈ دادا جان نے دیکھا اور پھر زاہد کی طرف بڑھا دیا۔ "اوہ! کہاں ہیں یہ۔۔۔؟" زاہد نے کارڈ دیکھ کر اردلی سے پوچھا۔

"میٹنگ ہال میں کھڑی ہیں صاحب۔ مجھ پر ناراض ہو رہی تھیں کہ میں نے انہیں روکنے کی کوشش کیوں کی۔"

"کسے پوچھ رہی تھیں؟"

"سرفراز صاحب کو۔"

"بلاؤ۔" زاہد نے کہا۔ سرفراز اس وقت کسی کام سے گیا ہوا تھا۔ چند ہی لمحات کے بعد سحر صاحبہ اندر داخل ہو گئیں۔ چہرہ لال بھبھوکا ہو رہا تھا۔ شدید غصے میں تھیں۔

"ایک بار میں اپنی ایک عزیزہ کے کسی کام سے سوئیڈن کے سفارت خانے گئی تھی۔ وہاں میں نے سوئیڈن کے سفیر کے اردلی کے تھپڑ مار دیا تھا۔" اس نے اندر داخل ہوتے ہوئے بغیر کسی تمہید کے کہا۔ دادا جان پلک کر عینک صاف کرنے لگے۔

"جواب میں اردلی نے کیا کیا بی بی؟" انھوں نے عینک ناک پر جما کر سحر کو بغور دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"فوراً دروازہ کھول دیا تھا۔" سحر نے دادا جان کی طرف دیکھے بغیر کہا۔

"باہر جانے کا۔۔۔؟" دادا جان برجستہ بولے اور سحر چونک کر انھیں دیکھنے لگی۔

"جی نہیں! اندر آنے کا۔ آپ کون ہیں؟"

"حسام احمد صاحب! یہ سحر صدیقی ہیں۔۔۔" زاہد جلدی سے بولا۔

"بڑی خوشی ہوئی ان سے مل کر۔ ویسے مجھے یقین ہے کہ سوئیڈن کے سفیر نے عملے کے بیشتر افراد کو برطرف کر دیا ہوگا اور ان کی اس عزیزہ کا کام آج تک نہیں ہُوا گا۔" دادا جان بولے۔

"جی نہیں! وہ کام کرا کر آئی تھی۔"

"تب وہ سفیر واپس بُلا لیا گیا ہوگا۔" دادا جان نے کہا اور زاہد بے اختیار ہنس پڑا۔

"چند لمحات کے لئے اجازت چاہتا ہوں دادا جان!"

"ایک شرط پر!" دادا جان بولے۔

"جی؟" زاہد نے تعجب سے انھیں دیکھا۔

"انھیں لیتے جاؤ۔" دادا جان سحر صدیقی کی طرف اشارہ کر کے بولے اور سحر تلملا کر رہ گئی۔

"میں آپ کے پاس نہیں آئی تھی۔" اس نے دانت پیس کر کہا۔

"خوش بخت ہو۔ جاؤ، میرے پاس آئیں تو تمھارے حق میں بہتر نہیں ہوگا۔" دادا جان نے کہا۔ زاہد جلدی سے سحر کو کمرے سے باہر نکال لایا تھا۔

"آپ کمال کرتی ہیں سحر صاحبہ! دادا جان سے گستاخی کر رہی تھیں۔" اس نے باہر نکل کر کہا۔

"یہ تمھارے دادا جان ہیں میرے نہیں۔ ویسے تم نے اپنے پورے خاندان کو یہاں لا پھنسایا ہے۔ کافی چالاک آدمی معلوم ہوتے ہو۔ یہ یہاں کیا کرتے ہیں اس عمر میں؟" سحر نے کہا اور زاہد گہری سانس لے کر خاموش ہو گیا۔

"سرفراز صاحب کہاں ہیں؟" پہلے سوال کا جواب نہ پا کر سحر نے پھر کہا۔

"کسی کام سے گئے ہوئے ہیں اور یہ بھی نہیں معلوم کہ کس وقت آئیں گے؟"

"عجیب انسان ہے ہاتھ ہی نہیں لگ رہا۔ کوٹھی پر معلوم کرتی

ہُوں تو وہاں پتہ نہیں چلتا اور یہاں بھی۔۔۔ ویسے یہ عمارت بے حد شاندار ہے۔ تم اپنے بارے میں نہیں بتاؤ گے کہ آخر تم ہو کیا چیز؟"

زاہد ایک دلچسپ صُورتِ حال سے دوچار تھا۔ ایک لمحے کے لئے تو وہ اُلجھا لیکن دفعتاً اس کے ذہن میں ایک خیال آگیا۔ سحر سے دوستی بھی تو کی جا سکتی ہے۔ اس طرح یہ معلوم کیا جائے کہ اس دن سرفراز کی امی سے اس نے کیا کہا تھا۔ جس کی وجہ سے اُن کی حالت بگڑ گئی تھی۔ بس یہ خیال ذہن میں آنا تھا کہ اس کے خدوخال بدل گئے۔ اس نے مُسکراتے ہوئے کہا۔

"آپ نے اتنے سارے سوالات کر ڈالے ہیں کہ فیصلہ کرنا مشکل ہو گیا ہے۔"

"کیسا فیصلہ؟"

"یہی کہ آپ کے کون سے سوال کا جواب پہلے دیا جائے۔"

"تم یہ بتاؤ کہ یہ بڑے میاں یہاں کیا کرتے ہیں۔ انھوں نے میرا موڈ خراب کر دیا ہے۔"

"حسام احمد صاحب شجاع احمد کے والد ہیں۔ کوٹھی میں سب انھیں دادا جان کہتے ہیں اور ان کا بے حد احترام کرتے ہیں۔ میں بھی اسی مناسبت سے انھیں دادا جان کہتا ہُوں۔ ورنہ میرا ان سے کوئی رشتہ نہیں ہے۔" زاہد نے جواب دیا۔

"اوہ میرے خُدا۔ یہ۔۔۔ یہ شجاع احمد کے والد ہیں؟" سحر موڈ بدل کر بولی۔

"جی!"

"تب تو گڑبڑ ہو گئی مجھے ان سے معافی مانگنی ہو گی۔ آؤ ذرا ایک منٹ کے لئے ان کے پاس چلو۔"

"اس وقت نہیں پھر کسی وقت یہ کام کر لیں۔ ویسے اس دن کے بعد سے آپ اس کوٹھی میں نظر نہیں آئیں؟"

"بڑی عزت افزائی کی گئی تھی میری وہاں۔ تم بھی تو ان لوگوں میں شامل تھے۔ نہایت بد تہذیب اور ناشائستہ لوگ تھے۔ سب ہی جھوٹے اور فریبی کسی نے بھی تو سچ نہیں بولا تھا۔۔۔ اور تم۔۔۔ تم تو سب سے زیادہ غلط انسان ہو۔"

"اگر مجھ سے کوئی غلطی ہو گئی ہے تو معافی چاہتا ہُوں۔"

"میں بہت نرم دل ہُوں۔ کینہ نہیں رکھتی دل میں۔ چلو ٹھیک ہے۔ پھر مجھے کسی سے غرض کیا ہے۔ میں تو بس سرفراز کے لئے وہاں گئی تھی۔ سنو، یہ سرفراز کس قسم کا آدمی ہے؟"

"آدمی تو ٹھیک ہے۔"

"آخر اُسے وہاں کیا مل رہا ہے۔ تقدیر کھُل رہی ہے اس کی لیکن اس نے ابھی تک توجہ نہیں دی۔ کم از کم رابطہ تو قائم کرنا چاہیئے تھا اُسے مجھ سے۔ تم خود سوچو کہ کوئی خوشی کو اس طرح ٹھکراتا ہے؟"

"ہرگز نہیں۔ یہ سراسر حماقت ہے اس کی۔" زاہد نے کہا۔

"تم اس سے بات کرو نا۔ دیکھو نا زاہد میں اسے زندگی کی ہر خوشی دینا چاہتی ہُوں۔ میرا خیال تھا ہم ایک ایڈورٹائزنگ کمپنی کھولیں۔ اُسے اپنا فن دکھانے کا موقع ملے اور پھر بے پناہ آمدنی، اعلیٰ معیار۔ کیا نہیں ہو گا اس بے وقوف کے پاس۔"

"آپ نے بس ایک غلطی کی سحر صاحبہ!"

"کیا۔۔۔؟"

"اس کی ماں سے اس دن آپ کی باتیں ہوئی تھیں؟ اگر آپ اُن سے یہ تذکرہ کرتیں تو سب سے مناسب ہوتا۔ ماں آخر ماں ہوتی ہے اور پھر وہ ماں سے زیادہ کس کی بات مان سکتا ہے۔" زاہد کے ان الفاظ پر وہ سوچ میں ڈوب گئی۔ پھر کچھ دیر کے بعد سر ہلا کر بولی۔

"بات تو گُر کی ہے یہی دُرست ہے۔۔۔ میں کوشش کروں گی۔ پتہ نہیں اس دن انھیں کیا ہو گیا تھا۔"

"آپ نے کوئی ایسی بات کہہ دی ہو گی ان سے جس کا انھیں شدید صدمہ ہُوا۔ آپ بتا سکتی ہیں کہ اس دن آپ کے اور ان کے درمیان کیا گفتگو ہوئی تھی؟"

"بخدا کوئی ایسی بات نہیں ہوئی تھی بس تعارف ہو رہا تھا ہمارے درمیان میں نے اپنے والد صاحب کے بارے میں بتایا تھا اور اس کے بعد ان کی یہ حالت ہو گئی تھی۔"

زاہد کسی گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ پھر گہری سانس لے کر بولا: "ناظم علی صدیقی صاحب، یہی نام ہے آپ کے والد صاحب کا؟"

"شہر کے متموّل ترین لوگوں میں شمار ہوتا ہے ان کا۔"

"یقیناً۔۔۔ یقیناً! بڑی معروف شخصیت کے مالک ہیں۔ اس کے علاوہ کوئی اور بات بھی یاد کریں جو آپ نے سرفراز کی والدہ سے کی ہو؟"

"اور کوئی بات نہیں تھی میں پورے وثوق سے کہہ رہی ہُوں۔"

زاہد ایک لمحے کے لئے خاموش ہو گیا۔ کیا ناظم علی صدیقی کا نام ان کے لئے کوئی خاص حیثیت رکھتا ہے!

"کیا سوچنے لگے تم؟"

"آپ کے بارے میں، کیسی نیک اور خُدا ترس انسان ہیں آپ

ایک بے معنی سی تصویر اتنی قیمتی خرید لی اور پھر سرفراز جیسے انسان کی تقدیر بنانا چاہتی ہیں۔ یہ سامنے کینٹین ہے آیئے میں آپ کو چائے پلاتا ہوں۔ بشرطیکہ آپ مجھ جیسی نچلی سطح کے انسان کے ساتھ بیٹھنا پسند کریں۔"

"کوئی حرج نہیں ہے کبھی کبھی ایسے بھی سہی۔" سحر نے کہا اور زاہد خاموشی سے گردن ہلاتا ہوا اندر داخل ہوگیا۔ کینٹین نے کام شروع کر دیا تھا۔ . . وہاں بہت بڑا عملہ مصروف کار ہوگیا اور اسے وہاں تمام اشیا مہیا کر دی گئی تھیں۔

زاہد نے ایک میز پر بیٹھ کر کافی طلب کی اور پھر بڑی نفاست سے اُسے سحر کے سامنے پیش کر دیا۔

"تمہارا خیال درست ہے زاہد۔ سرفراز میرے اسٹیٹس کا نہیں ہے لیکن میں انسان گر ہوں۔ اُسے اعلیٰ معیار کا بنانا میرے لئے کوئی مشکل کام نہیں ہوگا۔"

"گستاخی معاف۔ ایک ذاتی سا سوال کرنا چاہتا ہوں۔"

"ہوں کہو؟"

"کیا آپ سرفراز کو چاہنے لگی ہیں؟"

"ہاں! اس کی شخصیت پُراثر ہے لیکن سچی بات یہ ہے کہ اس کی طرف جھکنے کی وجہ دوسری ہے۔"

"پوچھ سکتا ہوں کیا؟"

"گڑبڑ تو نہیں کر دو گے تم خطرناک آدمی ہو۔"

"دوستوں کے لئے نہیں اور ہم ایک جگہ بیٹھے ہوئے کافی پی رہے ہیں۔ اس کا مطلب ہے کہ ہم دوست ہیں۔"

"دوستی نبھاؤ گے؟"

"ایسی ویسی آزمائیں تو سہی۔"

"دراصل زاہد، اس نمائش میں قدسیہ شجاع احمد کی مقبولیت دیکھ کر میرے دل میں یہ احساس پیدا ہوا ہے کہ میں خود ایسا مقام حاصل کروں۔ میں اس سے کہاں کم ہوں۔ اُسے سرفراز کی وجہ سے ہی یہ شہرت حاصل ہوئی ہے۔ میں سرفراز کو حاصل کر کے اس کی شہرت کو گہنانا چاہتی ہوں۔ اسی لئے میں سرفراز کو چاہتی ہوں۔ ویسے بھی وہ خوبصورت ہے اور نرم خو۔ میری زندگی اس کے ساتھ بہت اچھی گزرے گی۔"

"اوہ! یہ معاملہ ہے گویا ففٹی ففٹی۔ ایک تیر سے دو شکار۔ بے حد ذہین ہیں سحر صاحبہ!"

"تم یہ بتاؤ تم کیا کر سکتے ہو میرے لئے؟"

"آسمان سے ستارے توڑنے کے علاوہ سب کچھ۔" زاہد نے جواب دیا۔

"میں سمجھی نہیں۔"

"کوشش کروں گا کہ سرفراز آپ کی امداد حاصل کرنے کے لئے تیار ہو جائے۔"

"میں یہی چاہتی ہوں اور اس کے لئے مُنہ مانگا انعام تمہارا۔ کب سے کوشش کرو گے؟"

"یہ ذمہ داری آپ نے زاہد کو سونپ دی۔ اب مطمئن ہو جائیں بہت جلد آپ کو رپورٹ دُوں گا۔ اپنا پتہ اور ذاتی فون نمبر دے دیں مجھے۔" زاہد نے اس سے کہا اور سحر نے اُسے وہی سُرخ کارڈ دے دیا۔

"اوہ! یہ مجھے مل چکا ہے۔"

"اس پر جو فون نمبر درج ہے وہ میرے ذاتی فون کا ہے اور اس کی لائن الگ ہے۔"

"اور کتنے بھائی بہن ہیں آپ کے سحر؟"

"اکلوتی ہوں۔"

"کمال ہے۔ کافی اور لیں گی آپ؟"

"نہیں شکریہ! اب مجھے اجازت دو۔ تم سے گفتگو کر کے دل کو بے حد سکون ہوا ہے۔ پتہ نہیں ابھی تک سرفراز واپس آیا ہے یا . . . ."

"ابھی نہیں آیا ہوگا۔ آیئے آپ کو کار تک چھوڑ دوں۔"

سحر کے جانے کے بعد زاہد دیر تک پیشانی مسلتا رہا تھا۔ سحر کی حقیقت کھُل گئی تھی لیکن سرفراز کی والدہ کا معمہ۔ دیر تک وہ اس بارے میں سوچتا رہا تھا۔

●

فرسٹ ایڈ ہاؤس کی تکمیل بالکل آخری مراحل میں داخل ہو چکی تھی۔ بے شمار معاملات مکمل تھے عملہ رکھا جا رہا تھا۔ بہت سے کام کے لوگ مل گئے تھے۔ احمد رضا نے اپنا شعبہ سنبھال لیا تھا۔ عظیم الشان ڈسپنسری میں دوائیں ذخیرہ ہو رہی تھیں۔ وارڈ، بستروں اور دوسری ضروری چیزوں سے سجائے جا رہے تھے۔ لاکھوں روپے روزانہ خرچ ہو رہے تھے۔ سرفراز کو ایک نیا عہدہ مل گیا تھا۔ وہ اس پوری عمارت کا منتظم بنا دیا گیا تھا۔ آمدنی کے متعلقہ دفاتر نے کام شروع کر دیا تھا۔ عطیات کی اپیل شائع ہو چکی تھی۔ غرضیکہ ایک دُھوم مچی ہوئی تھی کہ کسی کو فرصت نہیں تھی لیکن ان تمام ہنگاموں کے باوجود زاہد کوٹھی کے معاملات سے غافل نہیں تھا۔ ایک ایک پر نگاہ تھی اس کی۔ قدسیہ کی "پینٹنگ" مکمل ہو گئی تھی

ہارون کو گوتیوں کی ایک بین الاقوامی تنظیم کی طرف سے لندن آنے کا دعوت نامہ موصول ہُوا تھا اور وہ خوشی سے پاگل ہو گیا تھا! اس سلسلے میں زاہد سے ابھی تک کوئی مشورہ نہیں ہو سکا تھا اور وہ پَر تولے بیٹھا تھا۔ شازیہ آجکل ہر وقت کھوئی کھوئی نظر آتی تھی۔ فیصل ہاؤس ڈکٹیٹیو بن چکا تھا اور اس نے گھریلو معاملات کی چھان بین پر پُوری پوری نگاہ رکھنے کے لئے جدید ترین آلات کا اضافہ کر لیا تھا۔ دادا جان کا جاسوس تھا کوئی معمولی بات نہیں تھی چنانچہ کثیر سرمائے سے اُسے چھوٹے چھوٹے ڈکٹو فون فراہم کئے گئے تھے جن کے ذریعے ہر کمرے سے ہونے والی گفتگو ریسیور پر سُنی جا سکتی تھی اور ضرورت پڑنے پر اسے بھی ریکارڈ کیا جا سکتا تھا لیکن اُسے سختی سے ہدایت کر دی گئی تھی کہ صرف احکامات کے تحت انھیں استعمال کرے اور اپنے طور پر اس سلسلے میں کوئی بھی کارروائی نہ کرے۔

اس کے علاوہ سحر کئی بار زاہد کو فون کر چکی تھی اور زاہد اُسے مسلسل تسلیاں دے رہا تھا اس نے صرف اس لئے اس کھیل کو جاری رکھا تھا کہ اس کے ذہن میں اس دن کے واقعے کا تجسّس تھا۔

پھر ایک دوپہر اسے موقع مل گیا اور وہ اکیلی جا پہنچا۔ سرفراز فرسٹ ایڈ ہاؤس میں مصروف تھا۔

"آؤ زاہد میاں کئی دن کے بعد شکل دکھی ہے" صابرہ بیگم نے محبت بھرے لہجے میں کہا۔

"میں بھی بہت محسوس کر رہا تھا امّی جان۔ چنانچہ آپ کو دیکھنے چلا آیا۔"

"دُعاؤں کے علاوہ تمھیں کیا دے سکتی ہُوں۔"

"کیسی طبیعت ہے؟"

"ٹھیک ہوں۔ خدا کا احسان ہے۔"

"ایک بات مجھے بہت دنوں سے پریشان کئے ہوئے ہے امّی جان۔ حق سمجھتا ہوں آپ سے اپنا اور بڑے اعتماد سے آیا ہوں۔"

"خیریت، مجھ سے اتنی تمہید؟ بیٹھو تو سہی۔" صابرہ بیگم نے تعجب سے کہا۔

"ہاں امّی ممکن ہے میرا استفسار آپ کو ناگوار گزرے۔"

"ارے تم کہو تو بیٹے! اپنے بارے میں میرے دل کا حال جاننا چاہتے ہو۔ بس اتنا کہوں گی کہ سرفراز کے بعد تمھیں چاہتی ہُوں اور ان لفظوں میں صرف سچ ہے۔"

"خدا کی قسم مجھے اس سچ کا یقین ہے۔ مجھے بتائیے اس دن آپ کی طبیعت اچانک اس طرح خراب کیوں ہو گئی تھی؟" زاہد نے ان کے چہرے پر نگاہیں جما کر کہا اور اس نے محسوس کیا کہ صابرہ بیگم کا رنگ ایک لمحے کے لئے اُتر گیا ہے۔ ان کے ہونٹوں پر اچانک خشکی کی پپڑیاں جمنے لگی تھیں اور ان کے اس انداز سے زاہد کو بخوبی اندازہ ہو گیا تھا کہ کوئی ایسی بات ضرور ہے جو صابرہ بیگم کے دل میں ہے اور یقیناً اس کا تعلق کسی نہ کسی طور سحر صدیقی سے ہے۔ چند لمحات وہ انتظار کرتا رہا اور پھر اس نے صابرہ بیگم کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

"امّی جان! کسی کے دل کو کریدنا عام طور سے کوئی اچھی بات نہیں سمجھی جاتی لیکن صرف وہی کسی کے ذہن کی گہرائیوں میں اُترنا چاہتے ہیں جنھیں کسی سے لگاؤ ہو۔ آپ نے دیکھا ہے میں تنہا ہُوں سرفراز میرے لئے سگے بھائی کی مانند ہے۔ اس ناتے سے میں آپ کو اپنی سگی ماں کا درجہ دیتا ہُوں۔ اگر یہ احساس میرے دل میں پیدا ہُوا ہے تو صرف اس محبت کی بنا پر جو آپ کے لئے میرے دل میں موجود ہے۔ تاہم اگر آپ زاہد کو بھی اس قابل نہیں سمجھتیں کہ اسے اپنے کسی راز میں شریک کریں تو بخدا مجھے تکلیف نہیں ہو گی۔ آپ مجھے بتانے سے انکار کر سکتی ہیں۔"

زاہد کے الفاظ پر صابرہ بیگم کا رنگ مسلسل متغیر ہوتا جا رہا تھا۔ ان کے چہرے پر تھکن کے سے آثار نمودار ہو گئے تھے پھر انھوں نے دونوں ہاتھوں سے سر پکڑ لیا۔ زاہد ان کے بالکل قریب ہی جا بیٹھا تھا۔

"امّی جان! خدا کی قسم مجھے آپ کو تکلیف دینا مقصود نہیں۔ بس یہ پھانس دل میں چبھ رہی تھی اور میں نے سوچا تھا کہ جب بھی مجھے وقت ملا میں آپ سے اس بارے میں معلوم کروں گا لیکن اگر آپ مجھے نہیں بتانا چاہتیں تو میں بالکل خاموش ہو جاتا ہُوں۔"

"زاہد گڑے مُردے اکھاڑنے سے کوئی فائدہ نہیں ہوتا، لیکن تمھارے اس خیال کی میں تردید نہیں کروں گی کہ اس دن میری طبیعت بلاوجہ نہیں خراب ہوئی تھی لیکن اس کا ایک پس منظر ہے اور یہ پس منظر میری زندگی میں ایک گہرے گھاؤ کی حیثیت رکھتا ہے۔ زاہد! میرے سینے میں زخم ہیں ایسے زخم جو رستے رستے ناسور بن چکے ہیں۔ دل تو یہی چاہتا ہے کہ ان ناسوروں کو کبھی عریاں نہ ہونے دُوں۔ کسی کو نہ دکھاؤں۔ میرا بچہ بڑا ہو گیا ہے۔ میں اسے اس کا ماضی یاد دلا کر یا بھولے بسرے خوابوں کو کرید کر تکلیف نہ دُوں لیکن حالات کی چکی کچھ اس طرح چلتی

ہے کہ انسان اسے روکنے پر قادر نہیں رہتا۔ گیا ہوا وقت ہاتھ نہیں آتا لیکن
گزرے ہوئے واقعات کبھی کبھی اس طرح تازہ ہوجاتے ہیں کہ انسان
ان کے سامنے بے بس ہوجاتا ہے۔ تم۔ ۔ ۔ تم بہت ہمدرد اور نیک
انسان ہو۔ اتنے احسانات ہیں تمہارے میرے اوپر کہ میں تمہارے
سامنے گردن نہیں اٹھا سکتی۔ یہ تمہاری سعادت مندی ہے کہ تم نے
ان احسانات کو کبھی محسوس نہ ہونے دیا یا انھیں جتانے کی کوشش نہیں
کی لیکن زندگی میں پہلی بار تم نے مجھ سے کوئی سوال کیا ہے تو میری
سمجھ میں نہیں آتا کہ میں کس طرح انکار کروں۔"

زاہد خاموشی سے ان کی شکل دیکھتا رہا تھا۔ صابرہ بیگم چند لمحات
خاموش رہیں پھر بولیں۔

"میری زندگی سے ایک ایسا راز منسلک ہے جو میرے لئے بے حد
تکلیف دہ ہے۔ یوں سمجھو کہ طویل عرصے سے میں نے اس بارے میں کچھ
نہیں سوچا اور یہ ہی طے کیا تھا کہ کبھی کسی کو اس بارے میں کچھ نہیں
بتاؤں گی۔ فائدہ بھی کیا تھا۔ اب میں زندگی کے ان نازک لمحات
سے گزر چکی ہوں جو کبھی مجھ پر بے حد گراں تھے۔ بچہ جوان ہو چکا
ہے۔ خدا کے فضل سے اور تمہاری مدد سے اس نے حالات سنبھال
لئے ہیں۔ میرے ذہن میں تو اب بس چند ہی آرزوئیں ہیں۔ وہی
آرزوئیں جو ہر ماں کے دل میں ہوتی ہیں۔ سرفراز کا ایک چھوٹا سا
گھر دیکھوں۔ اس گھر میں اس کے لئے سکون ہو۔ یہ خواب اس وقت
سے ہی ماں کی خواہش بن جاتا ہے جب وہ اپنے بچے کو جنم دیتی ہے
وہ اپنے بچے کے لئے کائنات کی ہر چیز مہیا کر دینا چاہتی ہے۔ بس خدا
نے ماں کے دل میں یہ جذبے دیئے ہیں۔ تم وعدہ کرو زاہد کہ کوئی ایسی
صورتحال سامنے نہیں لاؤ گے جس سے میرے سرفراز کی زندگی
میں تلخیاں گھل جائیں۔"

"وعدہ کرتا ہوں امی جان کہ ایسا نہیں ہوگا۔" زاہد نے پُرخلوص
انداز میں کہا۔

"تو سنو! سحر صدیقی، ناظم علی صدیقی کی بیٹی ہے اور ناظم علی صدیقی
سرفراز کے بھی باپ ہیں۔" صابرہ بیگم نے کہا تو زاہد سناٹے میں رہ گیا۔ اس
کے عضلات میں تناؤ پیدا ہو گیا تھا۔ وہ تعجب خیز نگاہوں سے صابرہ
بیگم کو دیکھ رہا تھا۔ تب صابرہ بیگم نے آنکھیں بند کر کے کرسی کی
پشت سے گردن ٹکا دی اور مشینی انداز میں بولنے لگیں۔

"میرے ان الفاظ سے کسی غلط فہمی کا شکار مت ہو جانا۔ بس
ایک عام سی معاشرتی کہانی ہے۔ میرا تعلق ناظم علی کے خاندان ہی سے
ہے۔ میں ان کے رشتے کے ماموں کی بیٹی ہوں۔ ناظم علی کی زندگی میں
بھی بہت سے اتار چڑھاؤ آئے تھے۔ پہلے ان کے والد ایک خاصے
کھاتے پیتے انسان تھے اور بہت اچھی حیثیت کے مالک تھے۔ ناظم علی
ان کے اکلوتے بیٹے تھے۔ پھر ان کے والد صاحب کو کچھ کاروباری
نقصانات ہوئے اور اپنی گرتی ہوئی ساکھ کو برداشت نہ کرسکے اور
یہی غم ان کی موت کا باعث بن گیا۔

میرے والد ناظم علی صاحب سے بہت پیار کرتے تھے اور ناظم علی
بھی ہر معاملے میں ان کی رائے ان کا مشورہ لیا کرتے تھے۔ اس
اچانک حادثے سے ناظم علی کی اپنی حیثیت بھی متاثر ہوئی۔ وہ اس
وقت بی۔ اے کے آخری سال میں تھے۔ اپنے والد کی موت سے وہ
بے حد سراسیمہ ہوگئے اور مایوس نگاہوں سے چاروں طرف دیکھنے
لگے تھے۔ تب میرے والد نے آگے بڑھ کر ان کو سہارا دیا۔ گرتی ہوئی
ساکھ کو سنبھالنے کے لئے ناظم علی کے پاس کچھ نہیں تھا۔ ان کے والد
بے پناہ مقروض تھے۔ چنانچہ ایسے نازک لمحات میں میرے والد ناظم
علی صاحب کے بہت کام آئے۔ ان کی تعلیم ختم ہوگئی اور وہ کاروبار
کی جانب متوجہ ہوگئے لیکن اب یہ کاروبار ان کے لئے ایک عذاب
تھا۔ ایسے حالات میں میرے والد صاحب نے آنکھیں بند کر کے
ناظم علی صاحب کی مدد کی۔ میرے والد نے اپنے تمام اثاثے فروخت
کر دیئے اور وہ سارا سرمایہ ناظم علی کے کاروبار میں لگا دیا جو ہمارے
پاس موجود تھا۔ ہم اپنی عالیشان کوٹھی کو چھوڑ کر ایک چھوٹے سے
مکان میں شفٹ ہوگئے تاکہ ناظم علی کی ساکھ بحال ہوسکے اور ہمارے
اس ایثار اور قربانی کا نتیجہ خاطر خواہ نکلا۔

ناظم علی صاحب کے کاروبار کی ساکھ بحال ہوگئی۔ یوں بھی
ناظم علی خود کافی ذہین آدمی تھا۔ باپ سے کاروباری گر سیکھے تھے
چنانچہ انھوں نے بڑی ہمت اور جانفشانی کے ساتھ اس کاروبار کو
سنبھال لیا اور پوری طرح اس پر حاوی ہوگئے۔

سنہرے دن پھر سے واپس آگئے تھے۔ اسی دوران میں ان کی
والدہ کا انتقال ہوگیا اور ناظم علی صاحب تنہا رہ گئے لیکن اپنے
ماموں کے اس احسان کو وہ نہیں بھول سکے تھے اور اسے لوٹا کرنے
کی فکر میں تھے چنانچہ سب سے پہلے انھوں نے ہماری وہ رقوم ادا کیں
جو ان کے کاروبار میں صرف ہوئی تھیں۔ انھوں نے میرے والد صاحب
کو پیشکش کی تھی کہ وہ کاروبار میں شریک ہوجائیں لیکن میرے والد
صاحب نے بغیر کسی لالچ کے یہ ایثار کیا تھا۔ اب اگر وہ کاروبار
میں شریک ہوجاتے تو یہ بات سو فیصدی ان کے خیال کے مطابق ان
کے لالچ پر محمول کی جاتی۔ چنانچہ انھوں نے اس بات کو منظور نہیں
کیا۔ البتہ ناظم علی صاحب نے جو رقومات انھیں واپس کیں انھوں
نے انھیں قبول کر لیا تھا پھر والد صاحب کے ذہن میں میرا

خیال آیا۔ میں نے صرف میٹرک تک تعلیم حاصل کی تھی اور سو فیصدی ایک گھریلو لڑکی تھی۔ دُنیا کے چھل فریب مجھے نہیں آتے تھے۔ سادگی کی زندگی میرا مقصد تھا چنانچہ میں اس قابل نہیں تھی کہ کسی ماڈرن گھرانے میں کھپ سکتی۔ والد صاحب کی نگاہ ناظم علی پر ہی پڑی تھی۔۔۔ انھوں نے کسی ذریعے سے اپنا یہ عندیہ ناظم علی صاحب پر واضح کر دیا اور ناظم علی صاحب کشمکش میں پڑ گئے۔

مجھے انھوں نے دیکھا تھا۔ اکثر و بیشتر ہمارے گھر آتے جاتے رہے تھے۔ میں نے بھی انھیں دیکھا تھا لیکن ہم دونوں کے دل میں کبھی کوئی تاثر نہیں اُبھرا تھا لیکن والد صاحب کی خواہش کو ناظم علی صاحب رد نہ کر سکے اور انھوں نے آمادگی کا اظہار کر دیا

زاہد بیٹے! میں نے زندگی میں کبھی سنہرے خواب نہیں دیکھے تھے۔ میری آنکھیں سادہ اور ہر قسم کے احساسات سے پاک تھیں۔ ناظم علی صاحب کے بارے میں جب مجھے بتایا گیا کہ میں ان کی زندگی میں شامل کی جا رہی ہوں تو میرے ذہن میں کوئی تاثر نہیں پیدا ہُوا۔ میں نے سوچا کہ میرے والد نے میرے بارے میں بہتر فیصلہ کیا ہوگا۔ چنانچہ میں ناظم علی صاحب کی زندگی میں داخل ہو گئی۔

شوہر کی زندگی اور اس کے اصولوں کے بارے میں جب مجھے معلومات حاصل ہوئیں تو میں نے فیصلہ کر لیا کہ میں ایک مسلمان مثالی بیوی کی حیثیت سے اپنے فرائض انجام دُوں گی اور پھر میں نے ایسا ہی کیا۔

ناظم علی صاحب کے لئے میں نے اپنی تمام زندگی نچھاور کر دی لیکن رفتہ رفتہ مجھے احساس ہُوا کہ ناظم علی صاحب نے صرف اس احسان کا بدلہ چکایا ہے جو میرے والد صاحب نے ان پر کیا تھا۔ وہ دلی طور پر مجھ سے کوئی لگاؤ نہیں رکھتے تھے اور ان کی محفلوں میں کچھ ایسے لوگ شامل تھے جو ان کی ذہنی و دلی قربت کا باعث تھے انہی میں ایک نادرہ خانم بھی تھیں۔ نادرہ خانم کسی بڑے باپ کی بیٹی تھیں اور ناظم علی صاحب کی زندگی میں شامل ہونے کی خواہشمند انھیں علم تھا کہ ناظم علی شادی شدہ ہیں لیکن اس کے باوجود وہ ناظم علی صاحب سے شادی کرنا چاہتی تھیں۔ بہت ہی ماڈرن اور بہت ہی اچھے گھرانے کی خاتون تھی۔ ناظم علی صاحب ان کی وجہ سے کشمکش کا شکار تھے۔ میں اپنے شوہر کی اس کیفیت سے ناآشنا نہ تھی لیکن میرا اپنا ایک وقار تھا۔ میری اپنی ایک خودی تھی۔۔۔ میں جدید تھی یا جاہل ناظم علی نے اپنے احسان کا صلہ اتارنے کے لئے نشانہ مجھے ہی کیوں بنایا۔ وہ چاہتے تو بڑے سادہ سے انداز میں معذرت کر سکتے تھے کچھ بھی کہہ سکتے تھے لیکن میرے لئے دل میں ایسے احساسات نہ رکھتے لیکن انھوں نے اپنا فرض پورا کرنے کے لئے مجھ سے شادی بھی کر لی اور مجھ سے مُنہ بھی موڑ لیا۔ مجھے یہ بات بے حد بُری لگی تھی۔ میں قربانی کا بکرا تو نہیں تھی۔ میری اپنی بھی ایک حیثیت تھی۔ ناظم علی صاحب نے یہ کیوں سوچا کہ وہ انسان ہیں اور میرے والد انسان ہیں۔ دو انسانوں کے درمیان کچھ وعدے وعید ہوئے اور مجھے ان وعدوں کے درمیان جھونک دیا گیا حالانکہ میرا ان رشتوں ناتوں سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ میں ناظم علی کی زندگی میں خود بخود نہیں آئی تھی مجھے تو میرے باپ نے اس شخص کے حوالے کیا تھا۔ حالانکہ دین و مذہب کے نام پر سماج و معاشرے کی بنائی ہوئی حدود کے مطابق اگر مجھے کسی غریب کلرک کے حوالے بھی کر دیا جاتا تو میں اسے بھی شوہر تسلیم کر کے اپنی پوری زندگی اس کے ساتھ گزار دیتی۔ مجھے یہ احساس زخمی کر گیا اور میں دل ہی دل میں سُلگنے لگی۔ اب میں ناظم علی کی ہر بات پر نگاہ رکھتی تھی لیکن میں نے انھیں ٹوکنے کی کوشش نہیں کی۔ پھر تقدیر نے میری پیشانی پر سیاہی کے نشانات بنانا شروع کر دیئے۔ میرے والد صاحب کا انتقال ہو گیا۔ والدہ پہلے ہی فوت ہو چکی تھیں۔ گویا مجھے میکے کا سہارا نہیں رہا تھا۔ ناظم علی صاحب کو میرے والد کی موت کے بعد کھُل کھیلنے کا موقع مل گیا تھا۔ صرف وہی ایسی ہستی تھے جو ناظم علی کا راستہ روکے ہُوئے تھے۔ مجھے انھوں نے فرنیچر کی حیثیت دی تھی جس کی صفائی ستھرائی اور نفاست کا خیال تو رکھا جاتا ہے لیکن اس کے بارے میں صرف یہی سوچا جاتا ہے کہ وہ ایک بے جان چیز ہے۔ جذبات و احساسات سے جس کا کوئی تعلق نہیں ہوتا اور اسے بے جان چیز سے زیادہ اہمیت دینے کی ضرورت نہیں رہتی۔

ناظم علی صاحب کی توجہ مجھ پر سے بہت کم ہو گئی تھی۔ ان دنوں میری طبیعت بھی بہت چڑچڑی ہو گئی تھی کیونکہ میں ماں بننے والی تھی۔ ناظم علی صاحب کو شاید اس کا علم ہو چکا تھا لیکن اس کے باوجود انھوں نے میری جانب کوئی توجہ نہیں دی۔ نادرہ خانم ان کے دل و دماغ پر حاوی ہوتی جا رہی تھی۔ پھر ایک دن میں نے اپنے منیجر سے سُنا کہ نادرہ خانم نے ناظم علی سے شادی کر لی ہے۔

مجھ پر رنج و الم کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔ آج تک مجھے میری وہ حیثیت نہیں ملی تھی جو بیوی کو شوہر کی زندگی میں ملتی ہے۔ ناظم علی صاحب تین دن کے بعد واپس آئے تھے۔ چہرے سے ہی

بہت خوش وخرم اور نکھرے نکھرے نظر آرہے تھے لیکن آج انھیں کچھ دوسرے حالات کا سامنا کرنا تھا۔ میں پہلی بار ان کے سامنے اس انداز میں پہنچی کہ وہ ہکا بکا رہ گئے۔ انھوں نے تحیّر خیز نگاہوں سے مجھے دیکھا اور بولے۔

"کیا بات ہے ؟"

"میں نے جو کچھ سُنا ہے کیا درست ہے ؟" میں نے ان سے سوال کیا۔

"کیا سُنا ہے تم نے ؟"

"یہی کہ آپ نے دوسری شادی کر لی ہے۔"

"ہُوں . . . تو یہ بات تمھارے کانوں تک بھی پہنچ گئی ہے ؟"

"جی ہاں !" میں ٹھوس لہجے میں بولی۔

"خوب ! بہر حال تمھیں ملنے والی یہ اطلاع بالکل دُرست ہے۔ میں تم سے یہ نہیں پوچھوں گا کہ تمھیں اطلاع دینے والا کون تھا۔ ممکن ہے کہ کچھ دنوں کے بعد میں خود ہی تمھیں یہ بات بتا دیتا۔"

"میں جان سکتی ہُوں کہ آپ نے ایسا کیوں کیا ؟"

"اس سوال کا جواب نہایت سیدھا سادا اور آسان ہے میرے دل میں ایک خواہش اُبھری تھی سو میں نے شادی کر لی۔"

"لیکن آپ کو علم ہے کہ ایک عورت یہ بات پسند نہیں کرتی اور نہ ہی اپنی زندگی میں کسی اور کا حق برداشت کر سکتی ہے۔"

"تمھیں میرے اس اقدام سے کوئی تکلیف نہیں ہوگی صابرہ تم آرام سے اپنی زندگی گزارو۔ تمھیں کوئی تردّد کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔"

"کیسی باتیں کرتے ہیں ناظم صاحب۔ میں آپ کی بیوی ہُوں۔ میں نے آج تک آپ کے سلسلے میں بہتر انداز میں سوچا ہے۔ کبھی مجھے آپ سے ایسی کوئی شکایت نہیں ہُوئی جو میرے لئے ناقابلِ برداشت ہوتی اور جو قابلِ برداشت باتیں تھیں انھیں میں برداشت کرتی رہی لیکن آپ اتنی آسانی سے اس مسئلے کو ختم نہیں کر سکتے" میں نے سخت لہجے میں کہا۔

"کیا مطلب ہے تمھارا ؟"

"میں جاننا چاہتی ہوں ناظم علی کہ کیا کمی تھی مجھ میں جو آپ کو کسی اور کی ضرورت پیش آئی۔"

"صابرہ ! بہتر ہے کہ تم یہ سب باتیں نہ کرو۔ میرے اور تمھارے درمیان کبھی اختلاف نہیں ہُوا۔ میں چاہتا ہوں کہ اپنی اس نئی زندگی میں تمھاری طرف سے کوئی تردّد نہ ہونے دُوں۔"

"لیکن میری پوری زندگی زخم بن گئی ہے ناظم صاحب، آپ نے مجھے مٹی کی بے جان مُورت کیوں سمجھ لیا۔ میں بھی انسان ہُوں۔ گوشت پوست کی انسان، میرے بھی جذبات و احساسات ہیں۔ میں نے آپ کے معاملات میں مداخلت اس لئے نہیں کی کہ میں آپ کو شوہر کا وہ اہم مقام دینا چاہتی تھی جو ہر عورت کا فرض ہوتا ہے لیکن ناظم علی اس کے ساتھ ساتھ آپ کے بھی تو کچھ فرائض ہیں۔ آپ نے میری زندگی میں یہ زخم کیوں لگایا۔ آپ کو اس کا کیا حق پہنچتا تھا ؟"

"کیسی باتیں کر رہی ہو صابرہ خانم ! آپ بھول رہی ہیں کہ آپ میرے لئے صرف ایک احسان کا بدلہ رکھتی ہیں۔ ماموں جان نے میرے ساتھ جو کچھ کیا تھا وہ بہت زیادہ تھا۔ میں ان کے احسانات کا صلہ ادا کرنا چاہتا تھا۔ جب میں نے ان کی یہ خواہش دیکھی کہ وہ آپ کو مجھ سے منسوب کرنا چاہتے ہیں تو میں نے انکار نہیں کیا لیکن صابرہ خانم میری سوسائٹی، میرا معیارِ زندگی کچھ اور ہے۔ میں نے کبھی یہ نہیں چاہا کہ آپ اپنی اقدار چھوڑ کر میرے ساتھ سوسائٹی میں وہ رنگ اختیار کریں جو ہمارے جیسے لوگوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ میں نے یہ سب کچھ اس لئے کیا کہ میں آپ کے اپنے جذبات کو مجروح نہیں کرنا چاہتا تھا لیکن ایک ایسی عورت جس کی سوسائٹی میں عزت ہو اور جو میرے وقار میں بھی چار چاند لگا سکے۔ اگر میری زندگی میں بھی داخل ہو گئی تو پھر میں اسے نظر انداز نہیں کر سکا اور میں نے اس سے شادی کر لی۔ وہ آپ کے بارے میں جانتی ہے اس کے باوجود اس نے مجھے قبول کیا ہے۔ آپ بھی اگر اس کے بارے میں جان گئی ہیں تو اسے قبول کر لیں۔ میں آپ دونوں کو کبھی آمنے سامنے نہیں لاؤں گا۔ کبھی کسی کے ذہن کو بوجھ کا شکار نہیں کروں گا۔ میں یہ بھی وعدہ کرتا ہوں آپ سے کہ آپ کو میری ذات سے کوئی تکلیف نہیں ہوگی لیکن جو کچھ ہو چکا ہے اس پر آپ کی نکتہ چینی بھی برداشت نہیں کروں گا۔"

"کیسی باتیں کر رہے ہیں ناظم ؟ میں آپ سے ایک بار پھر کہہ رہی ہوں میں مٹی کی کوئی مُورت نہیں ہوں۔ آپ نے میرے ساتھ ناانصافی کی ہے تو اس کے جواب میں، میں بھی کچھ کہنے کا حق رکھتی ہُوں۔"

"مثلاً ؟" ناظم صاحب نے سوال کیا۔

"مثلاً یہ کہ اب میں آپ کی زندگی سے بالکل الگ ہو جانا

چاہتی ہُوں!"

میرے ان الفاظ پر ناظم علی صاحب بھونچکے رہ گئے تھے۔ پھر ان کا چہرہ آہستہ آہستہ غصّے سے سُرخ ہو گیا اور وہ سخت لہجے میں بولے۔

"یہ... یہ آپ کہہ رہی ہیں صابرہ؟"

"ہاں! یہ جواب ہے ناظم صاحب، صرف جواب!"

"مگر یہ آپ کے لئے مناسب نہیں ہوگا!"

"مناسب کیوں نہیں ہوگا؟"

"آپ کس طرح میری زندگی سے الگ ہونا چاہتی ہیں؟"

"یہ میرا اپنا عمل ہوگا۔ میں آپ سے صرف ایک سوال کرنا چاہتی ہُوں!"

"جی فرمایئے!"

"کیا آپ نادرہ کو طلاق دے سکتے ہیں؟"

"نہیں، ہرگز نہیں!"

"تو پھر آپ مجھے طلاق دے دیجئے!" میں نے کہا اور ناظم صاحب سنجیدہ سی شکل بنائے مجھے دیکھتے رہے پھر بولے۔

"لیکن میں یہ بھی نہیں کر سکتا!"

"آپ کو یہ کرنا ہوگا۔ یہ میرا آخری فیصلہ ہے!"

"آپ کے لئے بہتر ہے کہ آپ اپنے اس آخری فیصلے پر غور کر لیں!"

"میں نے بہت غور و خوض کے بعد یہ فیصلہ کیا ہے!" میں نے ٹھوس لہجے میں جواب دیا۔

"اس کے باوجود میں آپ کی طرح جلد بازی نہیں کرنا چاہتا آپ آرام سے یہاں رہیں۔ اگر میری ذات سے آپ کو کوئی کوفت ہوتی ہے تو میں آپ کو تنگ نہیں کروں گا لیکن آپ کو طلاق دے کر ماموں کی روح کو اذیت کا شکار نہیں کرنا چاہتا!"

"کیسے معصوم بن رہے ہیں آپ ناظم صاحب! میری رُوح کو جو کچوکے لگ رہے ہیں۔ ان کا آپ کو کوئی احساس نہیں لیکن ایک مُردہ شخص کی رُوح سے آپ شرمندہ ہونا نہیں چاہتے!"

"آپ جذباتی ہو رہی ہیں صابرہ! بہتر ہے کہ غور کر لیں!" ناظم صاحب نے کہا اور اُٹھ کر چلے گئے۔ اس کے بعد تین یا چار دن تک میں نے ناظم صاحب کی شکل نہیں دیکھی لیکن ان تین چار دنوں میں میرے ذہن میں کھولتا ہُوا لاوا پکچھ اور پک گیا تھا۔ میں نے اپنے طور پر کچھ فیصلے کر لئے تھے۔ میں نے طے کر لیا تھا کہ ناظم صاحب سے طلاق لے لوں گی۔

چوتھے دن جب وہ مجھے نظر آئے تو میں نے ان سے طلاق کا مُطالبہ شدّت سے شروع کر دیا۔ جواب میں انھوں نے کہا کہ وہ مجھے طلاق نہیں دیں گے۔ اگر میں ان سے واسطہ نہیں رکھنا چاہتی نہ رکھوں۔ تب میں نے ان سے کہا کہ ٹھیک ہے ان کی اس جارحیت کے جواب میں مجھ سے جو کچھ ہو سکا کروں گی۔ چنانچہ ناظم صاحب کے جانے کے بعد میں نے اپنا سامان تیار کیا۔ میرے ایک بہت دُور کے رشتے دار دوسرے شہر میں رہتے تھے۔ میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ انہی کے پاس چلی جاؤں گی۔ گھر سے میں نے صرف چند چیزیں لی تھیں۔ حالانکہ اس گھر میں میرے باپ کا دیا بہت کچھ تھا۔ میں نے اس میں سے کچھ نہیں لیا اور خاموشی سے وہاں سے نکل کر اپنے عزیزوں کے گھر پہنچ گئی۔

میرے وہ عزیز خاصے عمر رسیدہ بزرگ تھے اور بس ٹھیک ٹھاک ہی زندگی گزار رہے تھے۔ میں نے ان سے کہا کہ میں اپنے طور پر زندگی گزاروں گی ان پر بوجھ نہیں بنوں گی۔ انھوں نے لاکھ چاہا کہ کسی طرح ناظم صاحب سے میرا تنازعہ طے کرا دیں لیکن میں نے ان سے کہا کہ اگر انھوں نے ایسی کوئی کوشش کی تو میں یہاں سے بھی چلی جاؤں گی۔ خُدا کی زمین بہت وسیع ہے۔ چنانچہ میں خاموشی سے وہاں رہتی رہی۔ مجھے نہیں معلوم کہ ناظم صاحب نے مجھے تلاش کرنے کی کوشش کی یا نہیں لیکن میں نے دل میں تہیہ کر لیا تھا کہ اب ناظم کی شکل دیکھنا بھی میرے لئے ممکن نہیں ہے۔

کافی دنوں کے بعد ایک دن مجھے ایک خط ملا۔ یہ خط میرے ان عزیزوں کے نام ہی تھا لیکن اتفاق سے میرے ہاتھ لگ گیا۔ خط پر ناظم کی تحریر دیکھ کر میں چونک پڑی۔ ان کے ہاتھ کی تحریر میں پہچانتی تھی۔ چنانچہ میں نے اس خط کو کھولنے کا گناہ کر لیا۔ ناظم صاحب اور میرے ان رشتے دار کے درمیان خط و کتابت ہو رہی تھی۔ انھوں نے میری موجودگی کے بارے میں ناظم صاحب کو اطلاع دے دی تھی۔ چنانچہ میں اپنے عہد کے مطابق خاموشی سے وہ جگہ چھوڑ کر چل پڑی۔ میں نے اپنے ان رشتے داروں کو یہ بھی نہیں بتایا تھا کہ میں کہاں جاؤں گی۔ میں نے وہ شہر بھی چھوڑ دیا اور ٹرین میں بیٹھ کر چل پڑی۔

لیکن میری حالت ناگفتہ بہ تھی۔ ٹرین کے زنانہ کمپارٹمنٹ میں میری حالت بہت زیادہ خراب ہو گئی اور مسز دُرانی نامی ایک مہربان خاتون نے وہاں مجھے سہارا دیا۔ ٹرین ہی میں سرفراز پیدا ہُوا۔ وہ خاتون مجھے اپنے گھر لے آئیں۔ بہت ہی خُدا ترس خاتون تھیں۔ میں نے انھیں اپنی حیثیت نہیں بتائی۔ مسز دُرانی کے

دو بیٹے یورپ میں تعلیم حاصل کر رہے تھے اور وہ یہاں تنہا زندگی گزار رہی تھیں۔ سرفراز ان کی کوٹھی میں پانچ سال تک ان کے زیر سایہ پرورش پاتا رہا۔ پھر ان کے دونوں بیٹے آگئے۔ وہ یورپ سے شادیاں کر کے آئے تھے۔ مسز درانی ان کی یہ سرکشی برداشت نہ کر سکیں اور ان کا انتقال ہو گیا۔ اس کے بعد میرا وہاں رہنا ممکن نہ رہا کیونکہ حالات سازگار نہیں تھے۔ میں نے وہ جگہ بھی چھوڑ دی لیکن اب میرے اندر خود اعتمادی پیدا ہو گئی تھی۔ چنانچہ ایک چھوٹے سے محلے میں مکان لے کر میں نے سرفراز کی پرورش شروع کر دی۔ میں سلائی کرتی تھی۔۔ یوں سرفراز کو پروان چڑھا رہی تھی۔

میں نے اُسے ایک چھوٹے اسکول میں تعلیم دلوائی اور اس کے بعد اس کے لئے وہ شہر چھوڑ کر ایک دوسرے شہر میں آگئی اور وہ شہر یہی ہے میرے بیٹے لیکن یہ ناظم علی کا شہر نہیں تھا میں نے اس کے بعد سے کبھی ناظم علی کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی کوشش نہیں کی۔ وہ کہاں ہے کیا کر رہا ہے۔ اس کا کیا حال ہے۔ نادرہ خانم کا کیا ہوا، کوئی بات معلوم کرنے کی میں نے کوشش نہیں کی۔ بس میری لگن میرا سرفراز تھا۔ میری صحت خراب ہوتی چلی گئی۔ سرفراز نے تعلیمی مراحل طے کئے لیکن وہ سیدھا سادا نوجوان تھا۔ کافی کوشش کے باوجود وہ اپنے لئے کوئی صحیح جگہ نہ بنا سکا، یہاں تک کہ ہمیں تمہاری مدد حاصل ہو گئی اور ہم یہاں آگئے۔ میں یہاں آنے کے بعد کسی حد تک پُرسکون ہو گئی تھی کہ سحر صدیقی نے یہاں آکر پھر میرے اندر بھونچال پیدا کر دیا۔ اس کے باپ کا نام ناظم علی صدیقی ہے اور اس نے اپنے باپ کے بارے میں جو کچھ بتایا اس سے مجھے اندازہ ہو گیا کہ یہ وہی ناظم علی ہیں۔ سحر صدیقی یقیناً نادرہ خانم کی بیٹی ہو گی اور اس کا نام سُن کر میں برداشت نہیں کر سکی تھی اور میری حالت خراب ہو گئی تھی۔ یہ ہے میری کہانی جو بظاہر عام سی کہانی ہے۔ اس میں کوئی ندرت کوئی جدت نہیں ہے لیکن میں نے۔۔۔ میں نے تمہاری خواہش کا احترام کیا ہے بیٹے۔ میں نے بس تمہاری خواہش کا احترام کیا ہے۔"

صابرہ خاتون کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ زاہد متاثر نگاہوں سے انھیں دیکھ رہا تھا پھر اس نے ذرا بھاری لہجے میں کہا۔

"مجھے بہت افسوس ہوا امی جان، مجھے بہت افسوس ہوا، واقعی مردوں کو اللہ تعالیٰ نے کچھ ایسے حقوق بھی دے دیئے ہیں جن سے وہ ناجائز فائدہ اُٹھا کر اپنے ہی جیسے ایک انسان کی زندگی تلخ کرنے میں عار محسوس نہیں کرتے۔ بہرطور امی طویل عرصہ گزر چکا ہے۔ کیا آپ کے دل میں ناظم علی صدیقی کے لئے گنجائش نہیں ہے؟"

"نہیں زاہد اب کیا رکھا ہوا ہے۔ زندگی کے وہ ماہ و سال برباد کر دیئے میں نے جو آرزوؤں اور امنگوں کے سال ہوتے ہیں۔ اب تو سرفراز میری آرزو ہے۔ بس اس کے بارے میں سوچنا چاہتی ہوں۔ باقی کوئی سوچ میرے لئے قابلِ توجہ نہیں ہے۔ اس کہانی کو تم نے سُن لیا۔ اب اسے اپنے ذہن کی گہرائیوں میں دفن کر لو۔ مجھے بتاؤ بیٹے، اور کیا کر سکتی ہوں میں تمہارے لئے۔"

"شکریہ امی جان! بس کچھ نہیں، اب مجھے اجازت دیجئے۔" زاہد نے کہا۔

"چائے بنا دوں؟"

"نہیں امی! ضرورت محسوس نہیں ہو رہی۔ ورنہ آپ کے سامنے آکر انکار کرنے کی گنجائش نہیں ہوتی۔" زاہد نے کہا اور وہاں سے چلا آیا لیکن صابرہ بیگم کی کہانی اس کے ذہن میں چکرا رہی تھی۔ سحر صدیقی سرفراز کی بہن ہے۔ ناظم علی صدیقی یہاں موجود ہیں۔ ایک انتہائی دولت مند آدمی۔۔۔ اور سرفراز ان کا بیٹا ہے۔ سحر صدیقی اکلوتی اولاد ہے یعنی ایک بیٹا اور ایک بیٹی۔ اب تو ان سحر صاحبہ سے کچھ زیادہ ہی تعلقات بڑھانا ہوں گے۔ معاملے کو سنبھالنا زیادہ ضروری ہے۔ اگر کوئی بہتر صورتِ حال نکل آئے تو سرفراز کی زندگی میں بھی تبدیلیاں آسکتی ہیں۔

⁂

شجاع احمد صاحب کا تار ملا تھا۔ آج شام کو واپس آ رہے تھے۔ عموماً وہ اطلاع دیئے بغیر ہی آجاتے تھے لیکن اس تار میں کچھ خاص ہدایتیں تھیں جو خاص طور پر زاہد کو بالکل نہیں معلوم ہو سکی تھیں۔

بہرصورت کوئی تین ساڑھے تین بجے کے قریب بیگم صاحبہ نے فرسٹ ایڈ ہاؤس میں فون کر کے زاہد میاں کو فوراً ہی طلب کیا۔

زاہد اس وقت کسی ضروری کام میں مصروف تھا۔ اس نے بیگم صاحبہ سے پوچھا کہ اس وقت اس کی کیا ضرورت پیش آگئی ہے تو بیگم صاحبہ نے کہا۔ "شام کو پانچ بجے کی فلائٹ سے شجاع احمد صاحب واپس آرہے ہیں۔ میں تمہیں بالکل تکلیف نہ دیتی لیکن تم سے

مشورہ کرنا بے حد ضروری ہے اس لئے آجاؤ۔"
"جی بہتر! ابھی پہنچ رہا ہوں۔" زاہد نے جواب دیا تھا تھوڑی ہی دیر بعد وہ کوٹھی واپس پہنچ گیا... اور بیگم صاحبہ کے کمرے میں داخل ہو گیا۔ اس نے ملازموں میں کچھ بھاگ دوڑ محسوس کی تھی۔ بیگم صاحبہ پریشان ہو رہی تھیں انھوں نے زاہد کو دیکھتے ہی کہا۔
"آ رہے ہیں اور اپنے ساتھ کچھ مہمانوں کو بھی لا رہے ہیں۔ میں سمجھتی ہوں یہ کون ہیں؟"
"کون ہوں گے؟" زاہد نے تعجب سے پوچھا۔
"تمھیں علم نہیں ہے۔ کچھ دنوں سے انھیں بیٹیوں کی شادی کی فکر بھی لاحق ہو گئی ہے۔ قدسیہ کے لئے کسی رشتے کی بات بھی کی ہے انھوں نے، میرا خیال ہے وہی لوگ ہو سکتے ہیں۔" بیگم صاحبہ نے بیزاری سے کہا۔
"اوہ، اچھا... بہرطور میرے لئے کیا حکم ہے؟"
"بھئی میں بڑی پریشان ہو گئی ہوں یہ سن کر۔ ظاہر ہے کہ تمھارے علاوہ میں اور کس سے مشورہ کر سکتی تھی۔ اب تم ہی کچھ کرو۔"
"مگر کرنا کیا ہے بیگم صاحبہ؟"
"زاہد اگر یہ لوگ وہی ہوئے تو کیا ہوگا؟"
"کیوں! اس میں پریشانی کی کیا بات ہے؟"
"بھئی تم تو سنجیدگی سے سوچ ہی نہیں رہے ہو۔ شجاع احمد صاحب ہم پر ایک کاری ضرب لگانا چاہتے ہیں۔ قدسیہ کے لئے جو بات تم نے میرے ذہن میں بٹھا دی ہے بیٹے اب میں اس سے منحرف نہیں ہو سکتی لیکن یہ بھی جانتی ہوں کہ شجاع احمد صاحب مخالفت برداشت کرنے کے عادی نہیں ہیں۔ تمھارے سلسلے میں انھوں نے جو کچھ کیا ہے اس میں ناکام رہے ہیں اور ان کی یہ ناکامی اب شدید جھلاہٹ میں تبدیل ہو چکی ہے اب اگر انھوں نے یہاں بھی ہماری مخالفت محسوس کی تو بالکل ہی آؤٹ ہو جائیں گے۔ بہرطور وہ گھر کے سربراہ ہیں اور ہمیں اس بات کا بھی خیال رکھنا ہے کہ کہیں کوئی گڑبڑ نہ ہو جائے۔ میرے تو ہاتھ پاؤں ہی پھول گئے ہیں۔ تم ہی کچھ بتاؤ۔ اب میں کیا کروں؟"
"بیگم صاحبہ! آپ کا زاہد موجود ہے۔ پریشان ہونے کی کیا ضرورت ہے جو کچھ ہوگا، سنبھال لیں گے۔"
"لیکن زاہد میں تو تمھارے لئے بہت پریشان ہوں بیٹے اگر کسی وقت انھوں نے تمھارے سلسلے میں ویٹو استعمال کر لیا تو کیا ہوگا۔"
"مثلاً؟" زاہد نے سوال کیا۔
"مثلاً وہ اس بات پر تل گئے کہ تمھیں اس گھر میں نہ رہنا دیا جائے گا تو بتاؤ بھلا ہم کیسے روکیں گے انھیں۔"
"بیگم صاحبہ! زاہد آپ کا خادم ہے۔ شجاع احمد صاحب کی بھی دل سے عزت کرتا ہوں۔ اگر صورتِ حال ایسی ہو ہی گئی تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ میں یہاں سے چلا جاؤں گا لیکن آپ کے ذہن اور دل سے تو دور نہ ہو سکوں گا۔"
"ایسا نہیں ہوگا زاہد! ایسا کبھی نہیں ہوگا۔ میں پہلے بھی اس سلسلے میں فیصلہ کن انداز میں تمھیں بتا چکی ہوں۔ تمھارا مستقبل اب ہمارے ہی ساتھ ہے۔ ہم مر جائیں گے تو کہیں بھی چلے جانا لیکن اپنی زندگی میں ہم تمھیں کہیں نہیں جانے دیں گے۔ خواہ اس کے لئے ہمیں کسی بہت بڑے نقصان سے دوچار کیوں نہ ہونا پڑے۔"
"آپ میرے لئے جذباتی نہ ہوں بیگم صاحبہ اور نہ ہی اس انداز میں سوچیں۔"
"کیا بیگم صاحبہ... بیگم صاحبہ کی رٹ لگا رکھی ہے۔ بار بار تمھیں یاد دلانا پڑے گا کہ مجھے تم تنہائی میں بیگم صاحبہ نہ کہا کرو۔"
"معاف کیجئے گا امی جان میں بھول گیا تھا۔"
"بس تو پھر بتاؤ۔"
"کچھ نہیں، انھیں آنے دیجئے۔ حالات کو احتیاط سے سنبھالیں گے کتنے افراد آ رہے ہیں؟"
"کچھ بھی تو نہیں معلوم، بس یہ تار ہے۔" بیگم صاحبہ نے ٹیلی گرام نکال کر زاہد کے حوالے کر دیا۔ لکھا تھا،
"کچھ اہم مہمانوں کے ساتھ آ رہا ہوں ان کے لئے اوپر والی منزل پر شاندار انتظام کر دیا جائے اور ٹھیک پانچ بجے مجھے ائیرپورٹ پر ریسیو کیا جائے۔"
زاہد نے تار پڑھ کر بیگم صاحبہ کی طرف بڑھا دیا۔ بیگم صاحبہ کہنے لگیں۔
"یہ الفاظ اہم ترین لوگوں کے لئے ہی استعمال ہو سکتے ہیں ورنہ تو شجاع احمد صاحب عام لوگوں کو خاطر میں لانے والے نہیں ہیں۔"

"آنے دیجئے۔ زندگی انہی ہنگاموں سے عبارت ہوتی ہے امّی جان۔ دیکھ لیں گے ان مہمانوں کو بھی۔ ویسے آپ شجاع احمد صاحب کے حکم کے مطابق تیاریاں شروع کرا دیجئے۔ میرے لئے کوئی حکم ہو تو فرمائیے۔"

"شام کو پانچ بجے ائیر پورٹ پہنچو گے؟"

"کہیں میری شکل دیکھ کر شجاع احمد صاحب بگڑ تو نہیں جائیں گے؟"

"بگڑتے ہیں تو بگڑ جائیں۔ اب ایسا بھی کیا۔ دو تین گاڑیاں لے جاؤ۔ میں بھی چلوں گی۔ احمد رضا، قدسیہ اور شازیہ بھی چلیں گے تاکہ فوری طور پر شجاع احمد صاحب کو کوئی شکایت نہ ہو۔ میری خواہش ہے کہ حالات کو آہستہ آہستہ سنبھالا جائے لیکن بیٹے یہ ذمّے داری بھی میں تمہارے ہی سپرد کر رہی ہوں۔ سرفراز میرے ذہن میں یوں رچ بس گیا ہے کہ میں اب اسے نکال نہیں سکتی اور اس دوران میں، میں نے ایک اور بات بھی محسوس کی ہے۔ بوڑھی ضرور ہو گئی ہوں لیکن آنکھیں اتنا دھوکہ بھی نہیں کھا سکتیں، قدسیہ اور سرفراز ایک دوسرے سے متاثر معلوم ہوتے ہیں۔"

"امّی جان! میں نے آپ کو ہلکے سے اشارے دیئے تھے۔ وہ غلط نہیں تھے۔"

"ہاں میں جانتی ہوں۔ بچّوں کی خوشیوں کے لئے ہی تو ماں باپ اپنی زندگیاں وقف کر دیتے ہیں۔ اگر بچے ہی ہماری ضد کی بھینٹ چڑھ جائیں تو پھر بھلا ہمارے ماں باپ ہونے کا کیا فائدہ۔"

"زندہ باد، امّی جان زندہ باد... بڑی اچھی بات کہی آپ نے مطمئن رہیئے۔ پانچ بجے ہم سب تیار رہیں گے۔" زاہد نے کہا اور تھوڑی دیر کے بعد بیگم صاحبہ سے رخصت ہو کر اپنے کمرے میں واپس آ گیا۔

سوچنے کی ضرورت تھی، حالانکہ اس کا ذہن جس برق رفتاری سے کام کرتا تھا۔ اس کی مثال ملنا مشکل تھی لیکن یہ معاملہ ایسا تھا اس میں بڑی گہرائی سے سوچنا تھا۔ سرفراز کی زندگی کا سوال تھا۔ صابرہ خاتون تھیں فرسٹ ایڈ ہاؤس تھا۔ قدسیہ تھی... ادون تھا، شازیہ تھی، اور نہ جانے کون کون تھا اور پھر... اور پھر کوئی اور بھی تھا۔ جس کے لئے زاہد کو بہت کچھ کرنا تھا۔ اس نے تو اپنی زندگی ہی وقف کر دی تھی، ان لوگوں کے لئے۔ یادیں کچھ اوراق احساس کے جھونکوں کے ساتھ الٹ گئے اور ان کی پرچھائیاں ان کے چہرے پر نمایاں ہو گئیں۔ اس وقت کوٹھی کے رہنے والے اگر زاہد کو دیکھتے تو پہچان نہ پاتے کہ یہ ہنس مکھ نوجوان بھی کرب سے آشنا ہو سکتا ہے۔ اس کا وجود تو مسرّت اور قہقہوں کی علامت سمجھا جاتا تھا اس کی ذات تو مسیحا تھی دکھیوں کے لئے اگر کوئی ذہنی الجھن کا شکار ہو جاتا تو اس کی آنکھیں زاہد کو تلاش کرنے لگتیں... اور جب زاہد کا چہرہ نظر آ جاتا تو دل کا اضطراب خود بخود کم ہو جاتا۔ یقین ہو جاتا کہ اب مشکل حل ہو جائے گی۔ یہ اعتماد کبھی مجروح نہ ہوتا لیکن وہ منبع اعتماد خود کتنا مجروح ہے۔ کسی کو گمان بھی نہ ہوگا۔ کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اس کے سینے میں بھی سوزش ہے۔

چند لمحات یہ احساسات اس کے چہرے پر نمایاں رہے اور پھر اس نے خود کو سنبھال لیا۔ "ابھی تو بہت کچھ کرنا ہے زاہد، اٹھو سنبھل جاؤ۔" اس نے خود سے کہا... اور اپنی جگہ سے اٹھ گیا۔ مہمانوں کے استقبال کے لئے اُسے بہت سی تیاریاں کرنی تھیں۔

زیادہ دیر نہیں گزری تھی اور زاہد ابھی اپنا کام ختم نہیں کر پایا تھا کہ فیصل نے دروازہ کھول کر اندر جھانکا اور زاہد چونک پڑا۔

"ارے... ارے آؤ فیصل میاں آؤ۔ خیریت کوئی خاص بات ہے؟"

"نہیں چیف! بس ان دنوں طبیعت ذرا کچھ اداس ہے۔" فیصل نے دلبنا گال کھجاتے ہوئے کہا اور زاہد کے ہونٹوں پہ مسکراہٹ پھیل گئی۔

"آؤ بیٹھو اور طبیعت کی اداسی کی وجہ بتاؤ۔"

"چیف! آپ کا فیصل ایک سرگرم کارکن ہے اور جب معاملات ٹھنڈے ہوں تو پھر بھلا زندگی میں کیا مزا رہ جاتا ہے۔" فیصل نے ایک کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"ہاں... فیصل میاں بات تو آپ کی بالکل درست ہے لیکن آپ کو خوش ہو جانا چاہیئے کہ آپ کا جاسوسی چرخہ بہت جلد چلنے والا ہے۔"

"واقعی؟" فیصل نے ایک دم منہ پھاڑ کر دلچسپی سے پوچھا۔

"ہاں! بلکہ میری رائے ہے کہ آپ اپنا کام شروع ہی کر دیجئے۔"

"یس سر... آپ مجھے حکم دیجئے۔" فیصل نے فوراً اٹینشن ہو کر کہا۔

"کچھ مہمان آرہے ہیں، آپ کے ڈیڈی کے ساتھ اور فیصل میاں ہمارا تجربہ ہے کہ شجاع احمد صاحب جب بھی باہر سے کوئی تجویز لے کر آتے ہیں اس کے پیچھے کوئی منصوبہ ضرور ہوتا ہے۔ چنانچہ نئے مہمانوں کی جاسوسی لازمی چیز ہے"

"گڈ! ہوئی نا بات، آپ کے پاس آنے سے کچھ نہ کچھ کام تو مل جاتا ہے تو پھر کیا حکم ہے میرے لئے؟"

"ملازمین کمرے آراستہ کر رہے ہیں۔ سجاوٹ کی چیزیں بچھائی جا رہی ہیں۔ میرا خیال ہے آپ اپنا وائرلیس نظام قائم کیجئے تاکہ آپ ان مہمانوں کی گفت وشنید سے آگاہ ہو سکیں"

"یہ کام ہو جائے گا"

"ہو نہیں جائے گا بلکہ ابھی ہونا چاہیئے۔ میرے ذہن میں تو آپ کا بالکل خیال ہی نہیں آیا تھا۔ یہ مہمان بڑے اہم قسم کے ہیں اور ان کے بارے میں ہمیں ہر قسم کے معاملات سے آگاہ ہونا ضروری ہوگا"

"تو آیئے آپ، ان جگہوں کا تعین کر دیجئے جہاں مجھے اپنے ڈکٹافون وغیرہ لگانے ہوں گے" فیصل نے کہا اور زاہد نے گردن ہلا دی۔

تھوڑی دیر بعد وہ اُوپر والی منزل کے ان کمروں میں پہنچ گیا جہاں ملازمین اپنا اپنا کام کر رہے تھے۔ ان کمروں کو دُلہن کی طرح سجایا گیا تھا۔ نہایت قیمتی ڈیکوریشن پیس رکھ دیئے گئے تھے۔ زاہد اور فیصل اپنے مطلب کی جگہوں کا انتخاب کرنے لگے اور متفقہ طور پر انہوں نے وہ جگہیں متعین کر لیں جہاں ڈکٹا فون چپکانے تھے یہ خاص قسم کے ڈکٹافون تھے جنکے نیچے ربڑ لگے ہوئے تھے اور یہ ربڑ اس قسم کا تھا کہ اسے جہاں بھی چپکا دیا جائے، وہاں سے آسانی سے نہیں چھڑایا جا سکتا... چنانچہ تینوں کمروں میں تین مناسب جگہوں پر طاقتور ڈکٹا فون چپکا دیئے گئے۔ کسی کو بھی کانوں کان خبر نہیں ہو سکی تھی کہ یہ وہ جگہیں تھیں جن کی آراستگی ہو چکی تھی اور اب اس بات کا امکان نہیں کہ ملازم وہیں ہاتھ لگائیں گے۔ اس کام سے فارغ ہونے کے بعد دونوں باہر نکل آئے زاہد نے فرسٹ ایڈ ہاؤس میں دادا جان کو فون کیا کہ کچھ مہمانوں کی آمد کے سلسلے میں اُسے مصروف رہنا ہے۔ چنانچہ اب وہ فرسٹ ایڈ ہاؤس نہیں پہنچ سکے گا۔ دادا جان نے بھی کہہ دیا تھا کہ اب کوئی خاص کام نہیں ہے لہٰذا وہ اطمینان وسکون سے اپنا کام کرے۔

شام کو گاڑیاں تیار ہو گئیں۔ قدسیہ، شازیہ، احمد رضا، ہارون، فیصل، بیگم صاحبہ، زاہد ڈرائیوروں کے ساتھ چل پڑے اور ایئرپورٹ پہنچ گئے۔ تھوڑی دیر میں طیارہ فضا میں نظر آیا اور پھر طیارہ جلد ہی زمین پر اُتر گیا۔ انھوں نے دُور سے آنے والے مہمانوں کو دیکھا سیڑھی سے جو اشخاص شجاع احمد کے ساتھ نیچے اُترے ان کی تعداد چار تھی۔ ان میں ایک دُبلے پتلے دراز قامت شیروانی میں ملبوس لیکن اچھی صحت کے مالک ادھیڑ عمر کے حضرت تھے۔ بڑی بڑی مونچھیں جو خاص انداز میں پھیلائی گئی تھیں۔ ان کے پیچھے ایک گول مٹول محترمہ جو میکسی پہنے ہوئے تھیں چھوٹے سے قد کی مالک لیکن انتہائی فرسودہ قسم کے میک اپ سے آراستہ ایک صاحبزادی، وہ بھی خوبصورت سی میکسی پہنے تھی اور اچھی خاصی شکل وصورت کی مالک تھیں۔ بال جدید طرز کے کٹے ہوئے تھے اور ان کے پیچھے ایک حضرت سُوٹ میں ملبوس، یہ بھی اپنے باپ ہی کی طرح دُبلی پتلی جسامت کے مالک تھے۔ چہرہ صفاچٹ تھا۔ خدوخال اچھے خاصے تھے لیکن باقی کوئی اندازہ نہیں ہو سکا تھا ان کے بارے میں۔ دُور ہی سے ان مہمانوں کو دیکھا گیا تھا اور تھوڑی دیر بعد کسٹم وغیرہ سے فراغت حاصل کر کے وہ سب باہر نکل آئے۔ بیگم صاحب نے آگے بڑھ کر اُن سب سے تعارف حاصل کیا۔ گول مٹول خاتون سے ہاتھ ملایا گیا۔ بچے اور بچی کے سر پہ ہاتھ پھیرا گیا اور بھائی صاحب کو سلام کیا گیا۔

بھائی صاحب ذرا کچھ نایاب چیز معلوم ہوتے تھے۔ غیر ملک میں بھی شیروانی کا استعمال ان کی اس طبیعت کا غماز تھا کہ وہ وطن پرستوں میں شمار کئے جاتے ہیں۔ شجاع احمد صاحب مسرور نظر آرہے تھے... انھوں نے اپنے تمام بچوں سے ان کا تعارف کرایا اور آخر میں جب ان کی نگاہ زاہد پر پڑی تو انھوں نے نفرت سے مُنہ پھیر لیا لیکن کرنل ضرغام صاحب ہی زاہد کی طرف بڑھ آئے تھے۔

"اور میاں۔ . . ایک آدمی تو تم نے چھوڑ ہی دیا بھئی تم کون ہو؟ چلو ہم لوگ خود ہی آپس میں تعارف حاصل کئے لیتے ہیں"

"خاکسار کو زاہد کہتے ہیں"

"ایں" کرنل صاحب چونک کر اسے دیکھنے لگے اس وقت شجاع احمد صاحب نے آگے بڑھ کر کرنل صاحب کا ہاتھ پکڑ لیا اور پھر آہستہ سے بولے۔

"آیئے کرنل صاحب گاڑیاں موجود ہیں۔ گھر پر چل کر گفتگو ہوگی" کرنل صاحب نے دو تین بار مڑ کر زاہد کو دیکھا تھا۔ لیکن زاہد یتیم سی شکل بنائے ان کے پیچھے چل رہا تھا۔ پھر اُسے ملازموں کی گاڑیوں

میں بیٹھا پڑا۔

کوٹھی میں ان کی پذیرائی بڑے شاندار انداز میں کی گئی۔ بیگم صاحبہ نے شجاع احمد صاحب کو خوش کرنے کے لئے ملازموں کو نئے لباس سے آراستہ کیا تھا اور تمام ملازم ایک جگہ ان کے استقبال کے لئے جمع تھے۔ بہرطور مہمانوں کو فوری طور پر ان کے کمروں میں پہنچا دیا گیا حالانکہ بیگم صاحبہ کو مہمانوں کی تعداد تو نہیں معلوم تھی لیکن انھوں نے تین کمرے آراستہ کرائے تھے جو کافی کشادہ تھے۔ پہلے تو یہ لوگ ایک کمرے میں جمع ہو گئے تھے۔ زاہد وہاں سے چلا آیا تھا۔ اس لئے اسے نہیں معلوم تھا کہ ان لوگوں کے درمیان کیا گفتگو ہوئی۔ بہرطور یہ پورا خاندان بے مقصد ہی یہاں نہیں آیا تھا اور زاہد کو اس سلسلے میں ان کے بارے میں سب کچھ جاننا تھا۔ چنانچہ اس نے سب سے پہلے فیصل سے ملاقات کی۔ فیصل معنی خیز انداز میں زاہد کو دیکھ رہا تھا۔

"چیف دشمن آگیا ہے۔"

"ہاں۔۔۔ فیصل میاں! تم یوں کرو کہ اپنے کمرے میں تمام تیاریاں مکمل کر لو۔۔۔ ان لوگوں کی سب باتیں ریکارڈ ہونی چاہئیں۔ میں وقت مقررہ پر تم سے رپورٹ طلب کر لیا کروں گا۔"

"چیف مجھے کچھ کیسٹ درکار ہوں گے۔ ہر وقت ان کی گفتگو وغیرہ ریکارڈ کرنے کے لئے مجھے کیسٹوں کی کافی تعداد چاہیئے۔"

"وہ آپ کو مہیا کر دیئے جائیں گے۔ جاسوس اعظم آپ فکر نہ کریں۔"

"او۔ کے چیف! آپ کا جاسوس آپ کی ہدایات کے مطابق اپنا تمام کام انجام دے گا۔" فیصل نے جواب دیا اور زاہد بالکل مطمئن ہو گیا۔

●

رات کے کھانے کی محفل بڑی جاندار تھی۔ بڑے ڈائننگ ہال میں کافی بڑی سی میز انواع و اقسام کے کھانوں سے بھری پڑی تھی۔ ان لوگوں کے تعارف کے مطابق جو دبلے پتلے شیروانی میں ملبوس حضرت تھے وہ برٹش آرمی میں کرنل کا عہدہ رکھتے تھے۔ ریٹائرڈ ہو چکے تھے۔ ضرغام نام تھا اور ترنم سے نلس کرتے تھے۔ یقیناً شاعر بھی ہوں گے۔ اس کے بارے میں ابھی کوئی معلومات یہاں کے رہنے والوں کو حاصل نہیں ہوئی تھیں۔ گول مٹول بیگم صاحبہ اگر کسی غریب گھرانے میں ہوتیں تو جنت کہلاتیں۔ کرنل ضرغام کی اہلیہ کی حیثیت سے ان کا نام فردوس تھا۔

صاحبزادی البتہ ماں کی جسامت پر نہیں گئی تھیں۔ نہایت ہی نرم و نازک سبک خطوط کی مالک تھیں اور نام ان کا فرمودہ تھا۔ اب یہ نام کس سلسلے میں تھا اور اس میں یہ انفرادیت کیوں تھی۔ یہ بات فوری طور پر تو منظر عام پر نہیں آسکتی تھی۔ صاحبزادے کا نام جالب تھا۔ جالب ضرغام صاحب شکل سے کسی قدر احمق نظر آتے تھے۔ ویسے تھے قبول صورت اور نفاست پسند۔ ان کے کپڑوں سے اٹھتی ہوئی پرفیوم کی خوشبو مہمانوں کا دماغ خراب کئے دے رہی تھی۔ غالباً تیز خوشبو استعمال کرنے کے عادی تھے۔ زاہد نے عمدہ لباس پہنا ہوا تھا۔ اور وہ کسی خادم کی حیثیت سے نہیں بلکہ گھر کے ایک فرد کی حیثیت سے ڈائننگ ہال میں ٹیبل کے گرد پڑی ہوئی کرسی پر بیٹھا ہوا تھا اس کی ہدایت اُسے بیگم صاحبہ نے کی تھی۔ دلچسپ ترین بات یہ تھی۔ کہ بیگم صاحبہ نے خاص طور سے سرفراز کو مدعو کیا تھا۔۔۔ اور اس سلسلے میں زاہد کو ہدایت کر دی گئی تھی کہ سرفراز کو بہترین سوٹ میں لے کر آئے۔ پتہ نہیں بیگم صاحبہ کے ذہن میں کیا پروگرام تھا بہرطور نہ زاہد کو یہ پوچھنے کا موقعہ ملا تھا اور نہ ہی بیگم صاحبہ نے اُسے کچھ بتایا تھا کیونکہ شام سے وہ مسلسل مہمانوں کی خاطر تواضع میں مصروف تھیں۔ سرفراز بہترین تراش خراش کے سوٹ میں ملبوس وہاں پہنچا تو بلاشبہ اس کی شخصیت قابل دید تھی۔ ویسے بھی خوبصورت خدوخال کا مالک تھا۔ اچھے لباس نے سونے پر سہاگے کا کام دیا تھا۔ کوئی نگاہ ایسی نہ تھی جو اس کی جانب نہ اُٹھی ہو۔ شجاع احمد صاحب تو زاہد کی اس کروفر سے یہاں موجودگی پر ہی کافی برہم نظر آنے لگے تھے۔ سرفراز کو بھی دیکھا تو چونک پڑے انھوں نے آہستہ سے بیگم صاحبہ کے کان میں کچھ کہا تھا اور بیگم صاحبہ نے انھیں سرد مہری سے جواب بھی دے دیا تھا۔ اب ذہنوں میں کیا تھا یہ تو اللہ ہی جانے لیکن بہرطور اس کے بعد شجاع احمد صاحب نے ان دونوں کی جانب توجہ نہیں دی تھی کرنل ضرغام نے البتہ سرفراز سے بھی تعارف حاصل کیا تھا۔ ملنسار قسم کے آدمی معلوم ہوتے تھے۔ ہر ایک سے ہنس کر ملنے کے عادی سرفراز کے بارے میں بیگم صاحبہ نے یہی بتایا کہ اپنا ہی بچہ ہے۔ یہیں اس کوٹھی میں رہتا ہے۔ اس سے زیادہ اور کوئی تعارف نہیں ہو سکا تھا۔ کھانے کا دور چلا۔ کرنل ضرغام ہر ڈش پر ایک شعر پڑھ رہے تھے اور اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ اُردو شاعری کی کافی چھان بین کی ہے۔

البتہ جالب صاحب غائب تھے۔ کچھ اُونگھنے کے عادی معلوم ہوتے تھے۔ کسی ایک نکتے پہ نگاہ جما دیتے تو اطراف کے ماحول کو بھول

جاتے تھے اور کوئی اتنی گہری نگاہ سے ان مہمانوں کا جائزہ لے رہا ہو یا نہ لے رہا ہو لیکن زاہد ان میں سے ایک ایک کی شخصیت کو پڑھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ فرمودہ بیگم بھی کچھ دلچسپ عادتوں کی حامل نظر آئیں۔ ان کی نگاہیں مسکراتی ہوئی تھیں۔ خوش اخلاق معلوم ہوتی تھیں جس سے بھی گفتگو کرتی اُسے یوں محسوس ہوتا جیسے فرمودہ بیگم اس پر نثار ہو رہی ہوں۔ باتیں کرنے کا یہ انداز بڑا خطرناک تھا۔

بیگم گول مٹول یعنی فردوس صاحبہ بھی خوش اخلاقی سے باتیں کرنے کی عادی تھیں اور ہر بات پر ہنسنا ان کی فطرت تھی۔ بظاہر بڑا ٹھیک ٹھاک معلوم ہوتا تھا۔ اب دیکھنا یہ تھا کہ ان کی آمد کس سلسلے میں ہے۔ ان لوگوں کا خدشہ دُرست ہے یا نہیں۔ کھانے پر دادا جان بھی تھے۔ تعارف کی رسم ادا ہوئی تھی اور دادا جان نے کرنل صاحب اور ان کے بیٹے سے ہاتھ ملایا۔ بیٹی اور بیگم صاحبہ کے سلام لئے تھے لیکن اس کے بعد انھوں نے ان سے کسی رغبت کا اظہار نہیں کیا تھا۔ اس کی وجہ یہ بھی ہو سکتی تھی کہ وہ ذہنی طور پر مصروف ہوں۔ کھانا ختم ہوا تو سب اپنی اپنی جگہ سے اُٹھ گئے۔ شجاع احمد صاحب نے کرنل ضرغام کو اپنے کمرے میں چلنے کی دعوت دی اور بیگم صاحبہ فردوس بیگم کو اپنے کمرے میں لے گئیں۔ بچّوں بچّیوں سے انھوں نے کہا تھا کہ آپس میں ایک دوسرے سے گھلنے ملنے کی کوشش کریں۔ ویسے بھی مہمان تھے اور اس کوٹھی کے لوگ آدم بیزار نہیں تھے۔ اس لئے احمد رضا اور قدسیہ نے بڑے ہونے کی حیثیت سے نووارد بہن بھائیوں کو دعوت دی کہ کوٹھی کے پائیں باغ میں چل کر بیٹھا جائے، ملازموں کو نشستیں لگانے کی ہدایات کر دی گئیں۔ زاہد اور سرفراز نے واپسی کی اجازت مانگی تو قدسیہ فوراً بول پڑی۔

"کیوں؟ بہت زیادہ مصروفیت ہے آپ کو یا آدم بیزار ہوتے جا رہے ہیں؟ آیئے لان میں بیٹھتے ہیں۔" اس کے لہجے میں ایک محبّت بھرا حکم تھا۔ زاہد شانے ہلا کر رہ گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ سب لان میں پڑی ہوئی رنگین کُرسیوں پر بیٹھے ہوئے تھے تب قدسیہ نے کہا۔

"معزز مہمانوں! جالب صاحب اور فرمودہ بیگم کی آمد پر خوشی کا اظہار کیا جاتا ہے اور ہم سب بڑی مسرّت سے انھیں خوش آمدید کہتے ہیں۔ اب تک بزرگوں کے درمیان جو ملاقات رہی اس میں ادب شامل تھا لیکن اب ذرا ہمارے درمیان بے تکلفی کا ماحول پیدا ہونا چاہئے۔ تعارف کا وہ رسمی انداز جو بزرگوں نے اختیار کیا تھا وہ بالکل نامکمل تھا چنانچہ میں نئے سرے سے ایک دوسرے کا تعارف حاصل کرنا چاہتی ہوں۔ کیا آپ لوگ میری بات سے متفق ہیں؟" اس نے جالب صاحب کی طرف دیکھا اور جالب صاحب بے اختیار چونک پڑے۔

"ج۔ جی۔ کچھ فرمایا آپ نے؟"

"خوب، خوب، بس صرف یہ آپ کا ہلکا سا تعارف ہے۔"

"ج... جی ہاں... جی ہاں" جالب صاحب نے دانت نکالتے ہوئے کہا اور پھر چونک کر سیدھے بیٹھ گئے۔

"مم... میں نہیں سمجھا۔" انھوں نے کہا۔

"کوئی بات نہیں ہم سمجھ گئے ہیں۔" قدسیہ بولی اور سب ہنسنے لگے۔ جالب صاحب ایک دم واپس آ گئے۔

"محترمہ فرمودہ! سب سے پہلے تو آپ اپنے اس نام کی وضاحت کریں جس نے ہمیں پریشان کر کے رکھ دیا ہے۔"

"پریشانی کی وجہ؟" فرمودہ نے ان سے مسکراتے ہوئے پُوچھا

"بھئی پہلی بار یہ نام سُنا ہے۔"

"یہ تو اچھی بات ہے۔ کم از کم مجھے اس بات سے خوشی ہوئی ہر شخص انفرادیت پسند ہے ناموں کے سلسلے میں بھی جہاں تک میری معلومات کام کرتی ہے آجکل جدّتیں ہو رہی ہیں۔ ایسے ایسے نام رکھے جا رہے ہیں جو بے معنی ہوتے ہیں اور جنھیں سُن کر یقین نہیں آتا کہ یہ کسی کا نام ہو سکتا ہے۔ فرمودہ بھی ایسا ہی ایک نام ہے اور کم از کم میں اس سلسلے میں دوسروں سے بازی لے گئی کہ آپ نے ابھی تک میرا نام کہیں نہیں سُنا۔ بہرطور اس کی وجہ تسمیہ میرے والدین ہی بیان کر سکتے ہیں۔ معنی، میں نے لغت میں تلاش کرنے کی کوشش کی لیکن مجھے... صحیح طور پر نہ مل سکے اس لئے میں نے اس پر ریسرچ چھوڑ دی۔ اب والدہ نے یہ نام کیوں رکھا یہ سوال آپ اُنہی سے کیجئے۔"

لڑکی کی بات سب کو پسند آئی تھی چنانچہ سب نے یہ طے کر لیا کہ اب فرمودہ کے نام پر اعتراض نہیں ہو گا۔ اس طرح جالب صاحب کا نام بھی ذرا مختلف تھا۔ جالب صاحب سے جب اس سلسلے میں پُوچھا گیا تو وہ گردن کھُجانے لگے۔

"مم! مجھے نہیں معلوم۔" انھوں نے آہستہ سے کہا۔ انداز ایسا تھا کہ سب ہنس پڑے تھے۔

"چلئے ٹھیک ہے ناموں کا مسئلہ چھوڑ دیا جائے۔ ہم لوگ بھی اپنا تعارف ایک بار پھر سے کرا دیں۔ پہلے میں زاہد بھائی سے ابتدا کروں گی۔ زاہد بھائی ہم سب کے بھائی ہیں۔ ہمارے محسن

اور ہمارے دوست ہم سب کے لئے قابلِ احترام اور اس عمارت کے
سب سے اہم رُکن آپ رشتوں کو جو بھی نام دینا پسند کریں دے لیں
زاہد بھائی ہمارے لئے ان تمام محبتوں کا مجموعہ ہیں۔"

"آداب . . . آداب . . ." زاہد نے لکھنوی انداز میں جُھک
کر کہا۔

"یہ سرفراز صاحب ہیں میرے اُستادِ محترم اور ہمارے خاندان
کے ایک اہم رُکن۔"

"اُستاد؟" فرمودہ نے سوالیہ نگاہوں سے قدسیہ کی
طرف دیکھا۔

"ہاں ــ!"

"کیا انھوں نے آپ کو پڑھایا ہے . . . ؟"

"ہاں! انھوں نے مصوری کا فن مجھے دیا ہے اور میری تصویریں
مقبولِ عام ہیں۔"

"بہت خوب، بڑی مسرت ہوئی آپ سے مل کر سرفراز صاحب!"
فرمودہ بولی۔

"اب اس کے بعد احمد رضا کی باری آتی ہے میرے بھائی۔
میں قدسیہ ہوں۔ یہ میری بہن شازیہ ہے اور وہ جو اس کونے
میں خاموش بیٹھے ہوئے ہیں ان کا نام ہارون ہے۔ یہ میرا سب
سے چھوٹا بھائی فیصل ہے اور ہم سب آپس میں ایک دُوسرے
کے دوست ہیں۔"

"بڑی خوشی ہوئی آپ سب حضرات سے مل کر۔ کیوں بھائی
جان؟" فرمودہ نے جالب صاحب کی طرف دیکھا۔ جالب صاحب
اس وقت ہوش و حواس ہی میں تھے جلدی سے بولے۔

"جی ہاں، مجھے بھی، مجھے بھی۔"

"ویسے آپ لوگوں کا شغل کیا رہا ہے؟"

"تعلیم کے حصول کے بعد سیر و سیاحت۔ ہم نے تقریباً آدھا
یورپ دیکھ لیا ہے۔ یہاں کبھی نہیں آئے تھے بچپن ہی سے غیر ممالک
میں رہے۔ ڈیڈی کا کاروبار بہت بڑا ہے۔ یقیناً آپ لوگوں کو اس
کے بارے بتا دیا گیا ہوگا۔ اب یہاں تقریباً چار چھ ماہ تک آپ
لوگوں کے ساتھ رہیں گے اور آپ کے ساتھ اس ملک کی سیر و سیاحت
کریں گے۔"

"سر آنکھوں پر . . . ہمیں آپ کی آمد سے دلی خوشی ہوئی ہے۔"
...نے کہا اس کے بعد کافی دیر تک مختلف موضوعات پر باتیں ہوتی
رہیں . . . اور نئے آنے والے مہمانوں کے بارے میں فیصلہ کیا گیا کہ
. . . ایک ذہین زیرک اور خوش اخلاق لڑکی ہے۔ جالب صاحب
ذرا الگ قسم کے آدمی ہیں، اور خیالات کی دُنیا میں کھو جانے کے عادی
ہیں۔ حالانکہ ان کے خیالات کے بارے میں ابھی تک کسی کو پتہ نہیں
چل سکا تھا کہ وہ کہاں چلے جاتے ہیں۔ نہ شاعری سے رغبت تھی
نہ مصوری سے، بظاہر کوئی ایسا سلسلہ نہیں تھا جس کے بارے
میں یہ سوچا جاسکے کہ جالب صاحب کسی خاص شغل کے عادی
ہیں۔ بیگم صاحبہ کے ذہن میں جو احساس تھا اس کے بارے
میں ابھی ان لوگوں کو کریدنا مناسب نہیں تھا . . . فرمودہ
سے گفتگو کے دوران پتہ چلا تھا کہ کرنل صاحب بہت بڑے
کاروباری ہیں اور یورپ کے مختلف ملکوں میں ان کا کاروبار
پھیلا ہوا ہے۔ ان کی یہی دو اولادیں ہیں۔ جنھوں نے یورپ
میں ہی تعلیم پائی ہے اور ان کی پرورش وہیں ہوئی ہے۔"

"آہ یورپ" زاہد گہری سانس لے کر بولا اور سب چونک کر
اُسے دیکھنے لگے۔

"کیوں خیریت؟ آپ آہیں کیوں بھر رہے ہیں؟" فرمودہ نے
دلچسپی سے کہا۔

"نوجوانوں کے لئے یورپ ایک اسان ہے۔ کتنے خوش نصیب ہیں
آپ لوگ" زاہد مغموم لہجے میں بولا۔

"فلسفے کی زبان ترک نہیں کی جاسکتی زاہد صاحب" فرمودہ
نے زاہد کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

"آہ، زندگی ایک فلسفہ ہی تو ہے۔ پیدائش کے بعد سب سے
پہلی خواہش پیٹ بھرنے کی ہوتی ہے۔ اس کے بعد چھوٹی چھوٹی
خواہشات کے طوفان دلوں میں موجزن ہو جاتے ہیں اور پھر
ایک ایسا دَور آجاتا ہے جس میں انسان خود اپنے آپ میں اُلجھ
کر رہ جاتا ہے۔ اس دُور کی خواہشات صاف الفاظ میں بیان
نہیں کی جاسکتیں۔ یورپ کی حسین داستانوں میں ہم دلچسپیوں
کے لئے ایسی دلکشی ہے کہ بس آرزو مند ہونے کے سوا اور کچھ
نہیں کیا جاسکتا۔ آپ لوگوں کی خوش بختی پر رشک آتا ہے کہ آپ ان
داستانوں کے کردار ہیں۔"

"خُدانخواستہ جو داستانیں یورپ سے منسوب ہیں۔ خدا نہ کرے
ہمارا ان سے کوئی واسطہ ہو۔"

"اچھا!" زاہد تحیر بھرے لہجے میں بولا۔

"ہاں زاہد صاحب! حقیقت کہہ رہی ہوں۔ ہم نے وہیں
تعلیم پائی، وہیں پلے بڑھے، لیکن گھریلو ماحول اس قسم کا تھا کہ
ہم ان داستانوں کے کردار نہیں بن سکے۔ یہ ہمارے ڈیڈی کی
دھان پان کے چہرے پر حسین مسکراہٹ سجائے ہوئے جو آپ کو

نظر آتے ہیں نا اندر سے فولاد کی طرح سخت ہیں۔ انھوں نے کچھ اصول وضع کئے ہیں اور ان اصولوں سے ہٹنا کسی کے لئے ممکن نہیں۔ عام حالات میں شاید ہمارے گھر میں کوئی تلخ گفتگو بھی نہ ہوتی ہو لیکن اگر ڈیڈی کی مرضی کے خلاف کوئی ایسا قدم اُٹھ جاتا ہے جس کی انھوں نے ممانعت کی ہو تو آپ نہیں جانتے کیسی سرد جنگ شروع ہو جاتی ہے ہمارے گھر میں۔ چنانچہ ہم اس کے عادی ہی نہیں رہے۔ یورپ میں ہمارا اپنا ایک حلقہ تھا۔ قدامت پسند لوگوں کا حلقہ سمجھ لیجئے اس قدامت پسندی کا مطلب وہ یہ لیتے ہیں کہ ہر قدامت پسند کی شرافت اس کے اپنے وطن کے معیار کے مطابق ہو۔ بات صرف بزرگوں تک ہی نہیں تھی بلکہ اس کی پرکھ نوجوانوں سے بھی ہوتی باقاعدہ اس کے بارے میں چھان بین کی جاتی۔۔۔ اور اگر وہ معیار پر پورا اُترتا تھا تو اسے حلقے میں شامل کر لیا جاتا تھا۔ اس طرح ہم نے اپنی ایک الگ دُنیا بنائی ہوئی تھی۔ ہم یورپین لباس پہنتے ہیں وہاں کی سوسائٹی میں گھلے ملے ہوئے ہیں لیکن وہ بُرائیاں جو ہماری اپنی اقدار سے ٹکراتی ہیں۔ انھیں اختیار نہیں کرتے اور نہ ہی ایسے افراد سے ہم دوستی رکھتے ہیں جو ان تمام بُرائیوں کو اپنائے ہوئے ہوں۔"

زاہد دلچسپی سے گفتگو سُن رہا تھا اور اس کی صداقت کا اندازہ فرمودہ کے چہرے سے لگا رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں ایک لمحے کے لئے تحسین کے الفاظ اُبھرے تھے لیکن دوسرے ہی لمحے اس نے خود کو سنبھال لیا تھا۔ ابھی اسے جو کردار انجام دینا تھا اس کے لئے ان لوگوں کی نگاہوں سے پوشیدہ رہنا ضروری تھا۔ لہٰذا وہ تعجب بھرے لہجے میں بولا۔

"اس کا مطلب ہے کہ آپ یورپ میں رہی ہی نہیں؟"

"ہاں! جن الفاظ میں یا جن الفاظ سے یورپ کو یاد کیا جاتا ہے ان کے تحت ہم واقعی یورپ میں نہیں رہے۔ ہم نے اپنی ادبی محفل الگ بنائی ہوئی تھی۔ ہماری اپنی دلچسپیاں ذرا مختلف تھیں۔ ہم وہاں شعر و شاعری کی محافل میں حصے لیتے تھے۔ شاعری سے مجھے یا جالب کو کوئی رغبت نہیں ہے لیکن ڈیڈی بدستور تشنہ ہیں اور اُردو شاعری کی ٹانگ توڑتے رہتے ہیں۔ سچی بات تو یہ ہے کہ انھیں آتا کچھ نہیں بس وطن سے لٹریچر منگواتے ہیں۔ غزل وغیرہ میں قطع و برید کرنے کے ماہر ہیں اور پھر انھیں اپنے نام سے پیش کر دینا ان کے لئے کوئی مشکل کام نہیں ہے۔ لندن میں سارے ہی بے وقوف نہیں ہیں۔ کچھ تو ایسے ہیں جو ان محفلوں میں صرف تفریحاً ہی شریک ہو جاتے ہیں۔ بذاتِ خود انھیں نہ شعر کہنے سے لگاؤ ہے نہ شعر سُننے سے لیکن چونکہ ہمارا یہ گروہ ٹھیک ٹھاک لوگوں پر مشتمل ہے اسی لئے وہ اس میں لگے رہنا پسند کرتے ہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جنھوں نے ڈیڈی کی غزلوں، نظموں پر کبھی اعتراض نہیں کیا۔ باقی جو جاننے والے ہیں وہ اخلاقاً انھیں معاف کر دیا کرتے ہیں کیونکہ ڈیڈی خود بھی ان کی کوئی ایسی ہی مسروقہ غزل یا نظم سُننے میں بخل سے کام نہیں لیتے۔" فرمودہ نے کہا تو تمام لوگوں کے ہونٹوں پر ایک دم ہی مُسکراہٹ پھیل گئی۔

"واہ۔۔ تب تو واقعی آپ لوگ ایک مثالی حیثیت کے حامل ہیں۔"

"مگر آپ یورپ کے بارے میں آئندہ کبھی آہیں نہ بھریں زاہد صاحب! یورپ بڑی عجیب جگہ ہے۔ بڑے غیر انسانی ممالک ہیں یہ، آپ وہاں کی تہذیب کے بارے میں باتیں کرتے ہیں۔ میرا اپنا یہ خیال ہے کہ یہاں کے لوگ یورپ کی داستانوں کو الف لیلیٰ کی داستانوں کی مانند سنتے ہوں گے لیکن اس الف لیلیٰ کا پس منظر جو کچھ ہے اس پر اگر کبھی غور کر لیں، تو آپ کو یہ احساس ہو کہ آپ کی اپنی اقدار کتنی قیمتی ہیں۔"

"جالب صاحب آپ بھی تو کچھ بولئے۔ لگتا ہے یورپ میں آپ کے پیروں پر پڑی ہوئی زنجیریں آپ کی ذات کو پژمردہ کرنے کا باعث بنی ہیں۔" زاہد نے بات کا رُخ دوسری طرف موڑتے ہوئے کہا۔

"جی۔۔۔" جالب صاحب چونک کر بولے اور ادھر اُدھر دیکھنے لگے۔

"سبحان اللہ۔۔ سبحان اللہ۔۔۔ کہاں کھوئے ہوئے تھے آپ؟"

"جی کہیں نہیں، کہیں نہیں۔ میں۔۔۔ میں تو یہیں ہوں" جالب نے کہا۔

"ٹھیک ہے، ٹھیک ہے کوئی ہرج نہیں ہے۔" زاہد نے ان کا شانہ تھپتھپاتے ہوئے کہا۔

کافی دیر میں یہ نشست ختم ہوئی تھی۔ اس دوران میں زا ان دونوں بہن بھائیوں کے بارے میں اندازہ لگا چکا تھا۔۔ فرمودہ کے بارے میں اس نے جو کچھ سوچا تھا اسکے مطابق وہ شگ لڑکی تھی۔ بھائی جالب بس لاڈلے تھے۔ یہ لفظ ان کی تمام تر شخصیت کو نمایاں کرنے کے لئے کافی تھا۔ جب یہ محفل برخاست ہوئی تو زا بھی اپنی آرام گاہ میں پہنچ گیا۔ سرفراز اپنی ٹیکسی میں چلا گیا تھا

اس نشست کے بارے میں ان دونوں کے درمیان کوئی بات چیت نہیں ہوئی تھی۔

دوسری صبح زاہد سو کر جگا بھی نہیں تھا کہ دفعتاً اس کے کمرے کا دروازہ پیٹا جانے لگا اور وہ بوکھلا کر بستر سے اُٹھ گیا۔۔۔ دروازہ کھولا تو بیگم صاحبہ تھیں۔ چہرے پر کوئی خاص تاثرات نہیں تھے۔ نرم نرم پُرسکون سی شکل بنائے ہوئے وہ زاہد کے سامنے کھڑی تھیں۔

"سوتے سے جگایا ہے نا تمھیں۔ صبح خیزی اچھی چیز ہوتی ہے" انھوں نے کہا۔

"واقعی، واقعی، مجھے افسوس ہے۔ ویسے وقت کیا ہوا ہے؟" زاہد نے پوچھا۔

"ساڑھے آٹھ ہوئے ہیں۔"

"اوہ، واقعی پھر تو خاصا وقت ہو گیا۔ دراصل رات کو ہم لوگ کافی دیر تک جاگتے رہے ہیں۔ ورنہ میں بھی ساڑھے سات بجے تک اُٹھ جانے کا عادی ہوں۔ خیریت تو ہے آپ کا اس وقت میرے یہاں آنا۔۔۔؟"

"کوئی خاص بات نہیں تھی۔ بس ذرا چہل قدمی کو نکلی تھی دل میں یہ بات بھی تھی کہ تم سے بات چیت بھی کروں گی۔ ظاہر ہے ناشتے کی میز پر سب ہی ہوتے ہیں اور تم سے بات ہوتی یا نہ ہوتی۔" بیگم صاحبہ نے کہا۔

"کوئی خاص بات ہے؟" زاہد نے پوچھا۔

"ہاں! رات کو میرے اور شجاع احمد صاحب کے درمیان گفتگو ہوئی تھی۔"

"اوہ، آیئے اندر آ جایئے۔"

"نہیں۔۔۔ اندر نہیں آؤں گی۔ بس تمھیں بتا کر واپس جا رہی ہوں۔"

"کوئی اہم بات ہے تو بتایئے۔"

"ہاں! یہ وہی لوگ ہیں۔ جن کے بارے میں شجاع احمد صاحب نے کہا تھا۔ جالب ہی وہ لڑکا ہے جسے شجاع احمد صاحب نے قدسیہ کے لئے منتخب کیا ہے اور یہ انتخاب خاصا مضبوط ہے۔ انھوں نے کہا کہ یہ لوگ بے پناہ دولت مند ہیں۔ یورپ کے بیشتر ممالک میں ان کا کاروبار پھیلا ہوا ہے اور صرف جالب ہی ان سب کا وارث ہے۔ چنانچہ قدسیہ کے لئے اس کے بعد اس سے بہتر رشتے کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا لہٰذا ان لوگوں کی اس طرح پذیرائی کی جائے کہ بالآخر یہ مسئلہ طے ہو جائے۔ اس میں کسی قسم کی کوئی کوتاہی وغیرہ نہیں ہونی چاہیئے۔"

"گڈ۔۔۔ ویری گڈ! اس کا مطلب ہے کہ ہمارا خدشہ دُرست نکلا۔"

"ہاں!" بیگم صاحبہ بھرائے ہوئے لہجے میں بولیں۔

"ارے، ارے آپ کی آواز کو کیا ہو رہا ہے امی جان؟" زاہد نے کہا اور بیگم صاحبہ عجیب سی نگاہوں سے زاہد کو دیکھنے لگیں۔ ان کی آنکھوں میں نمی چھلک رہی تھی۔ پھر انہوں نے زاہد سے کہا۔

"میں جالب کے ساتھ قدسیہ کو کبھی منسوب نہیں ہونے دُوں گی۔ زاہد یہ سوچ لو۔"

"کمال ہے امی جان، ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔ جب تک آپ کا زاہد موجود ہے، آپ کو کسی قسم کا تردد کرنے کی ضرورت نہیں؟"

"زاہد اس سلسلے میں ممکن ہے تمھیں خاصی مشکلات سے گزرنا پڑے۔"

"گزر لیں گے۔ کیا فرق پڑتا ہے۔"

"اتنی لاپرواہی سے مت سوچو۔ شجاع احمد صاحب شدید جارحیت کے موڈ میں ہیں۔ میرا خیال ہے وہ اس سلسلے میں کسی کی نہیں سُنیں گے۔"

"ایک بات بتایئے امی جان۔"

"ہاں، ہاں کہو!"

"آپ نے کسی قسم کے اختلاف کا اظہار کیا ہے؟"

"نہیں بالکل نہیں۔ تمھارے مشورے کے بغیر میں ایسا نہیں کر سکتی تھی۔" انھوں نے جواب دیا۔

"ویری گڈ! یہ آپ نے بہت اچھا کیا۔ بڑی سمجھداری سے کام لیا آپ نے۔ بہرحال ان لوگوں کو چت کرنا میرا کام ہے۔" زاہد نے کہا۔

"دیکھو بیٹے، تم نے یہ بیج میرے سینے میں بو دیا ہے لیکن اب یہ اتنا پروان چڑھ چکا ہے کہ اسے نکال پھینکنا میرے بس کی بات نہیں۔ قدسیہ اور سرفراز ایک دوسرے کے لئے لازم و ملزوم بن چکے ہیں۔ کم از کم میں اپنے ذہن میں ان دونوں کی علیحدگی کا تصور تک نہیں کر سکتی۔ ہر قیمت پر ہمیں اس رشتے کا تحفظ کرنا ہے۔"

"آپ بالکل مطمئن رہیئے امی جان، بس تمام حالات سے آگاہ کرتی رہیں، باقی میں سب سنبھال لوں گا۔"

"ٹھیک ہے۔ اب میں چلتی ہوں۔"

"خدا حافظ!" زاہد نے کہا اور بیگم صاحبہ چلی گئیں۔
زاہد دونوں ہاتھوں سے سر تھام کر مسہری پر جا بیٹھا تھا۔ تھوڑی دیر تک وہ بیٹھا رہا۔ پھر اپنی جگہ سے اُٹھ کر غسل خانے میں گھس گیا۔
تھوڑی دیر کے بعد وہ تیار ہو گیا تھا۔

ناشتے کی میز پر خوب ہنگامے تھے۔ مہمانوں کے قہقہے اُبل رہے تھے۔ درحقیقت کرنل عزغام دلچسپ آدمی تھے جس طرح وہ اشعار کو توڑ مروڑ رہے تھے۔ وہ قہقہہ آور تھی۔ کم از کم یہاں والوں کے لئے یہ اشعار اجنبی نہیں تھے لیکن کرنل صاحب سب پر اپنا حق جمائے بیٹھے تھے۔ ابھی تک کسی نے انھیں نہیں ٹوکا تھا۔ حالانکہ سب کی زبانیں مچل رہی تھیں لیکن احترام مانع تھا۔

زاہد سب سے بڑھ چڑھ کر کرنل صاحب کے اشعار کی داد دے رہا تھا۔ کئی بار اس نے کرنل صاحب کی تعریف کی تھی اور کرنل صاحب اب پوری طرح اس کی جانب متوجہ ہو گئے تھے۔ ناشتے کے اختتام پر انھوں نے کہا۔

"بھئی زاہد میاں! شعر و سخن سے تمھیں کافی دلچسپی معلوم ہوتی ہے۔ یقین کرو، تم سے مل کر بڑی خوشی ہوئی ہے۔"

"اُٹھو بھئی! کچھ اور بھی کام کرنے ہیں۔" شجاع احمد صاحب بُرا سا مُنہ بنا کر بولے کرنل صاحب اُٹھ کھڑے ہوئے۔ انھوں نے شجاع احمد صاحب کے لہجے پر کوئی خاص توجہ نہیں دی تھی۔ جبکہ باقی تمام لوگوں نے بات کو اس طرح درمیان سے کاٹ دینے کو شدت سے محسوس کیا تھا لیکن اس کا احساس زاہد کے چہرے پر نہیں تھا۔ دادا جان نے زاہد سے کہا۔

"زاہد کتنی دیر میں تیار ہو جاؤ گے؟"

"بس دادا جان حکم! میں تو بالکل تیار ہوں۔ ناشتہ کرنا تھا کر لیا۔"

"سرفراز میاں سے بھی کہہ دو کہ وہ فرسٹ ایڈ ہاؤس پہنچ جائے۔"

"یہ فرسٹ ایڈ ہاؤس کیا ہے؟" فرمودہ نے سوال کیا اور زاہد اس کی طرف دیکھنے لگا۔

"دلچسپ نام ہے نا۔"

"ہاں نام تو اچھا ہے مگر فرسٹ ایڈ ہاؤس، بات سمجھ میں نہیں آتی ہے۔"

"آ جائے گی۔۔۔ آ جائے گی۔ میرے خیال میں آج نہیں لیکن کل آپ کو اس کے بارے میں پوری تفصیلات بتا دی جائیں گی۔"

"سسپنس۔۔۔ چلو ٹھیک ہے۔ ہم کل تک کا انتظار کر لیں گے مگر یہ بتائیں کہ آپ لوگ وہاں کیوں جا رہے ہیں؟"

"ہمیں وہاں بہت سے کام کرنے ہیں فرمودہ صاحبہ!"

"واپسی کب تک ہو گی؟" فرمودہ نے سوال کیا اور قدسیہ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

"بس شام تک، مصروفیت کا کوئی تعین نہیں ہوتا۔"

"اوکے، اس کا مطلب ہے کہ آپ لوگ ہماری تفریحات میں شریک نہیں ہوں گے۔" فرمودہ نے کہا۔

"ارے نہیں، نہیں، زاہد بھائی کسی کے مُلازم تھوڑی ہیں۔ ساری تفریحات میں حصہ لیں گے۔ بے فکر رہو۔ آج چلا جانے دو، رات کو بیٹھ کر تفریحی پروگرام بنائیں گے۔" قدسیہ نے کہا اور فرمودہ خاموش ہو گئی۔

"کیوں جالب صاحب آپ کا اس سلسلے میں کیا خیال ہے؟" احمد رضا نے پُوچھا تو جالب چونک کر آنکھیں پھاڑنے لگا۔

"جی، ام میں سمجھا نہیں۔"

"میرا مطلب ہے فرسٹ ایڈ ہاؤس۔"

"فرسٹ ایڈ ہاؤس نہیں، فرسٹ ایڈ باکس۔" جالب صاحب نے کہا اور ایک زوردار قہقہہ بلند ہو گیا۔ جالب صاحب متحیرانہ انداز میں ایک ایک کی شکل دیکھنے لگے۔ پھر کافی کھسیائے ہوئے لہجے میں بولے۔

"میرے خیال میں، میں نے ایک غلط لفظ کی تصحیح کی تھی۔ اس میں ہنسنے کی کیا بات ہے؟"

"کوئی بات نہیں، کوئی بات نہیں، ہنسی تو کسی بھی بات پہ آ سکتی ہے۔" زاہد نے اس کی بات کا جواب دیا اور دادا جان کے ساتھ باہر نکل گیا۔

دادا جان خاموش اور سنجیدہ نظر آ رہے تھے۔ دونوں ساتھ ساتھ چلتے رہے۔ زاہد نے دادا جان کی خاموشی کو محسوس کر لیا تھا اور پھر اس نے انھیں ٹوک ہی دیا۔

"کیا بات ہے دادا جان! کچھ پریشان سے نظر آ رہے ہیں۔۔۔؟"

"نہیں، نہیں میاں! پریشانی کی کوئی بات نہیں ہے۔ بس یہی سوچ رہا تھا کہ اب فرسٹ ایڈ ہاؤس کا جلد از جلد افتتاح ہو جانا چاہئے۔ میں اس کام کی ابتدا کرنے کے لئے بے چین ہوں ویسے سیٹھ کوٹھاری کے بارے میں تم نے کیا فیصلہ کیا۔ خاصا چالاک آدمی معلوم ہوتا ہے۔ جو کچھ مواد ہمارے ہاتھ لگا ہے۔ اس سے

کم از کم وہ پھنس تو جائے گا لیکن باہمت آدمی ہے۔ ایسے آدمی ذرا ٹیڑھی کھیر ثابت ہوتے ہیں۔"

"کوٹھاری کو ہم نے اپنی لسٹ میں رکھ لیا ہے دادا جان، جو کچھ اس کے سلسلے میں کیا جا چکا ہے۔ وہ کافی ہے اگر وہ اس سے سنبھل جاتا تو ٹھیک تھا۔ اگر مقابلہ کر رہا ہے تو پھر اس کے لئے نئے نئے پینترے بدلنے ہوں گے اور ریٹ بھی بڑھا دیا جائے گا۔"

"کتنے پیسے مانگے ہیں تم نے اس سے؟"

"دس لاکھ۔"

"ہوں، ویسے آدمی بہت دولت مند ہے۔ دس لاکھ روپے دے تو سکتا ہے نا؟"

"بڑے آرام سے دادا جان! لیکن اب یہ رقم بڑھ کر پندرہ لاکھ ہو گئی ہے۔" زاہد نے کہا۔

"کیا مطلب؟"

"اس سے پندرہ لاکھ روپے وصول کئے جائیں گے۔"

"بھئی دس لاکھ روپے ہی وصول ہو جائیں تو بہت بڑی بات ہے۔"

"پندرہ لاکھ دادا جان، پورے پندرہ لاکھ روپے۔ سمجھا کیا ہے آخر یہ اپنے آپ کو۔" زاہد نے کہا اور دادا جان ایک دم ہنسنے لگے۔

"بھئی تمہاری ذہنی قوتوں سے مقابلہ کرنا تو ذرا مشکل کام ہی ہے۔" دادا جان نے ہنستے ہوئے کہا اور زاہد خاموش ہو گیا۔

تھوڑی دیر کے بعد دادا جان، سرفراز، زاہد اور احمد رضا ایک شاندار کار میں بیٹھے ہوئے فرسٹ ایڈ ہاؤس جا رہے تھے۔ چونکہ ڈرائیور کار چلا رہا تھا۔ اس لئے راستے میں کوئی بات نہ ہوئی اور تھوڑی دیر کے بعد یہ فرسٹ ایڈ ہاؤس پہنچ گئے۔

فرسٹ ایڈ ہاؤس میں دن رات کام ہو رہا تھا۔ پچھلے کچھ معاملات میں اچھی خاصی رقومات ہاتھ آ گئی تھیں۔ احمد رضا اسپتال سیکشن کی جانب چل پڑا۔ دادا جان دفتر کی جانب اور سرفراز ٹہلتے ہوئے دوسرے کاموں کی نگرانی کے لئے آگے بڑھ گئے۔

تمام کام دلجوئی سے ہو رہے تھے۔ فرنیچر تقریباً تیار ہو چکا تھا۔ پالش ہو چکا تھا۔ فرش صاف کیا جا رہا تھا۔ گویا فرسٹ ایڈ ہاؤس اب بالکل مکمل حالت میں تھا اور اب کوئی خاص ضرورت باقی نہیں رہی تھی۔ ہاں اس کی ضروریات کے لئے تو ابھی بے شمار معاملات تھے جو آہستہ آہستہ ہی طے ہو سکتے تھے جو عمارتیں لوگوں کی رہائش گاہ کے لئے بنائی گئی تھیں۔ وہاں ضرورت کا تمام فرنیچر پہنچ چکا تھا۔ آج اس فرنیچر کا معائنہ کرنا تھا۔ چنانچہ کافی دیر تک وہ ان فلیٹوں میں گھومتے رہے۔ اس کے بعد نیچے آئے تو ایک اردلی ان کا منتظر تھا۔

"کیوں خیریت گلاب خان کیا بات ہے؟" زاہد نے پوچھا۔

"صاحب! بی بی آپ سے ملنا چاہتی ہیں۔"

"کون بی بی صاحبہ؟" زاہد نے پوچھا۔

"ہم نام نہیں جانتا صاحب، پر وہ ادھر آتا رہتا ہے۔"

"اوہ، شاید سحر ہو گی۔" زاہد نے کہا اور سرفراز ایکدم ٹھٹھک گیا

"زاہد بھائی! آپ جایئے۔" سرفراز نے بوکھلائے ہوئے انداز میں کہا۔

"آؤ یار، ہمت سے کام لو۔ تمہیں ابھی زندگی کو بہت قریب سے دیکھنا ہے۔"

"زاہد بھائی زندگی کو قریب سے دیکھنا ہے موت کو تو نہیں۔" سرفراز نے ہنستے ہوئے کہا۔ زاہد اس کا بازو پکڑ کر آگے بڑھ گیا تھا۔

فرسٹ ایڈ ہاؤس کے عظیم الشان ویٹنگ ہال میں سحر قالین پر ٹہل رہی تھی۔ اس کے چہرے پر عجیب و غریب تاثرات تھے۔ خوبصورت ساڑھی میں ملبوس تھی اور بلاشبہ حسین نظر آ رہی تھی ان دونوں کو دیکھ کر وہ ٹھٹھک گئی۔ اس کے چہرے پر کبیدگی کے آثار نمایاں ہو گئے تھے۔

"ارے سحر صاحبہ کس وقت تشریف لائیں؟" زاہد نے پوچھا

"آ گئی بس آپ کو اس سے کیا؟" سحر نے کہا۔

"اوہ، اچھا، اچھا! میں باہر چلا جاتا ہوں۔" زاہد نے کہا۔

"مذاق مت کیجئے زاہد صاحب! اب مجھ پر یہ پابندیاں بھی عائد ہونے لگیں کہ یہاں نہ جاؤ، وہاں نہ جاؤ۔"

"کس نے کہیں یہ پابندیاں آپ پر عائد؟"

"آپ کے اردلی نے جو آپ کو اطلاع دینے گیا تھا۔ کہنے لگا ویٹنگ ہال میں بیٹھیں اور انتظار کریں۔ میں صاحب کو یہیں بلا کر لے آتا ہوں۔"

"اوہ، کمال ہے۔ ویسے اچھا ہی کیا اس نے تم ہمیں کہاں کہاں تلاش کرتی پھرتیں۔ فرسٹ ایڈ ہاؤس کوئی چھوٹی سی جگہ تو ہے نہیں۔" زاہد نے کہا۔

"اچھا طریقہ نکالا ہے تم نے بات ٹالنے کا۔ سنایئے سرفراز صاحب آپ کیسے ہیں۔ آپ کی تو شکل دیکھنے کو ترس گئی ہوں۔" سحر نے شکایتی لہجے میں کہا۔

"بس سحر صاحبہ! مصروفیات ہی ایسی ہیں۔ کیا بتاؤں آپ کو۔"

سرفراز نے کسی قدر سرد لہجے میں جواب دیا۔
"آپ یقین کریں جب بھی آپ کے بارے میں سوچتی ہُوں مجھے رونا آنے لگتا ہے"۔
"ارے نہیں۔ ۔ ۔ نہیں، آپ روتی ہوئی اچھی نہیں لگیں گی" زاہد نے کہا۔
"میں آپ سے بات نہیں کر رہی زاہد صاحب! سرفراز سے بات کر رہی ہُوں" سحر نے کسی قدر ناراضگی سے کہا۔
"ٹھیک ہے آپ سرفراز سے ہی باتیں کریں۔ میں آپ کو کب منع کر رہا ہوں" زاہد نے جواب دیا اور سرفراز چونک کر زاہد کو دیکھنے لگا۔ پروگرام تو یہ تھا کہ سحر کو اس طرح کاٹا جائے کہ اس کے حوصلے پست ہو جائیں لیکن زاہد اس کی پذیرائی کر رہا تھا۔ کیوں؟

سحر صدیقی کی آمد زاہد کے لئے اچنبھے کا باعث نہیں تھی۔ صابرہ بیگم کی کہانی سُننے سے پہلے اس نے یہی سوچا تھا کہ سحر صدیقی کو کس طرح راہ سے ہٹایا جائے لیکن مسئلہ دُوسرا ہو گیا تھا۔ سحر صدیقی، صابرہ بیگم کی کہانی کے ساتھ ایک دوسری حیثیت اختیار کر چکی تھی۔ سرفراز یہ بات نہیں جانتا تھا لیکن زاہد اس بات سے واقف ہو چکا تھا اور وہ سرفراز کے لئے بہت کچھ کرنا چاہتا تھا۔ چنانچہ اس نے سحر صدیقی کی باتوں پر کوئی توجہ نہیں دی اور جب سحر صدیقی نے اس سے فرسٹ ایڈ ہاؤس دیکھنے کی فرمائش کی تو وہ فوراً ہی تیار ہو گیا۔
"ہاں ہاں ضرور ضرور" زاہد نے جواب دیا اور سرفراز گہری سانس لے کر رہ گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ فرسٹ ایڈ ہاؤس کے مختلف حصّوں کی سیر کر رہے تھے۔ سحر صدیقی تعجب سے بولی۔
"دیکھا تو میں نے اس عمارت کو کئی بار ہے لیکن یہ اتنی وسیع اتنی کُشادہ اور اتنی عظیم الشان ہو گی۔ اس کا مجھے اندازہ نہیں تھا بس چند ہی حصّوں تک محدود رہی ہُوں میں"،
"ہاں سحر صاحبہ! عمارت واقعی بہت شاندار ہے"۔
لیکن اس تمام ہنگامہ خیزی کا مقصد کیا ہے؟ کیا ملے گا اس سے؟"
"بس دادا جان کا شوق ہے۔ رفاہِ عامہ کے لئے وہ یہ کام کر رہے ہیں"،
"خیر یہ بات بُری تو نہیں ہے لیکن تعجب خیز ضرور ہے کہ دادا جان رفاہِ عامہ کے لئے کام کر رہے ہیں اور خود ان کی کوٹھی میں رہنے والے اتنی معمولی زندگی گزار رہے ہیں جس شخص نے ان کے خاندان کو۔ ۔ ۔ اتنی شہرت بخشی کہ تقریباً پُورے مُلک میں ہی نہیں بلکہ باہر کے ممالک میں بھی ان کے خاندان کو جانا جاتا ہے۔ اس کی کوئی قدر نہیں ہے ان کے گھر میں، وہ انیکسی میں رہتا ہے" سحر صدیقی نے کہا۔
"خیر یہ ساری باتیں آپ کے سوچنے کی نہیں ہیں سحر صاحبہ۔ آپ سُنایئے آپ کے کیسے مزاج ہیں؟ کبھی اپنے گھر بھی بلایئے ہمیں" زاہد نے کہا۔
"واہ آپ مجھے کہہ رہے ہیں۔ میں تو کب سے اس کی خواہشمند ہُوں"
"کمال ہے۔ خواہشیں دل ہی دل میں رکھے رہنے سے کیا فائدہ، کبھی تذکرہ تو کیا ہوتا ہم سے" زاہد بولا۔ ایک بار پھر سرفراز نے متحیرانہ نگاہوں سے زاہد کو دیکھا تھا۔

"تو پھر آج شام ہی کی چائے ہمارے ساتھ ہو جائے"
"آج شام کی چائے نہیں کل رات کا کھانا رکھ لیجئے کیا خیال ہے؟"
"جیسی آپ کی مرضی، آج شام کو کیا بات ہے؟"
"کچھ نہیں بس کچھ مہمان آئے ہوئے ہیں۔ چونکہ کل ہی آئے ہیں اس لئے پتہ نہیں ان کا کیا پروگرام ہو گا۔ بہر طور ان کا کوئی بھی پروگرام ہو میں اور سرفراز کل رات آپ کے ہاں کھانے پر آ رہے ہیں"
"بسر و چشم، میں انتظار کروں گی" سحر نے جواب دیا۔
"آپ کے ڈیڈی سے بھی مُلاقات ہو گی نا؟"
"کیوں نہیں ہو گی۔ ڈیڈی خود آپ لوگوں سے ملنے کے شائق ہیں۔ کئی بار مجھ سے کہہ چکے ہیں"
"تو پھر ٹھیک ہے سحر صاحبہ، کل شام ساڑھے سات یا آٹھ بجے تک ہم آپ کی کوٹھی تک پہنچ جائیں گے"
"او۔ کے میں انتظار کروں گی" سحر نے کہا اور تھوڑی دیر کے بعد وہ چلی گئی۔ سرفراز گہری گہری سانسیں لے رہا تھا۔
"اب یہ نیا کھیل کیا ہے زاہد بھائی؟" اس نے گہری سانس لے کر پُوچھا۔
"بہت ہی دلچسپ، بہت ہی پُر اسرار کھیل، سرفراز میاں" زاہد نے معنی خیز لہجے میں جواب دیا۔
"میں نہیں سمجھا"
"یار سمجھ جاؤ گے، ہر بات کو سمجھنے کے لئے جلدی مت کیا کرو" زاہد نے جواب دیا اور سرفراز تھکے تھکے انداز میں ہنسنے لگا۔
"ویسے آج کل میں اُلجھنوں کا شکار ہُوں زاہد بھائی"
"کیوں کوئی خاص بات ہے؟"

"وہ۔۔۔ وہ دراصل قدسیہ نے کچھ ایسی باتیں کی ہیں جن سے مجھے الجھن ہوگئی ہے۔"

"نئے مہمانوں کے بارے میں؟" زاہد نے سوال کیا۔

"ہاں زاہد بھائی! میں دراصل اپنی کم مائیگی اور اپنی حیثیت سے خوف زدہ ہوں۔ مجھے پل صراط پر چلنا ہوگا۔ زاہد بھائی ایک پودا آپ نے میرے سینے پر لگایا ہے۔ اب اسے سینچنا بھی آپ ہی کا کام ہے۔ میں مجبور ہو چکا ہوں زاہد بھائی۔ اب آپ مجھے مجبوروں میں خیال کریں۔ اگر مجھے اپنی زندگی کے اس مشن میں ناکامی ہوئی تو شاید میں جی نہیں سکوں گا۔" سرفراز بڑے جذباتی لہجے میں بولا۔

"واہ، واہ، یار دو چار فلمیں بھی دیکھ لیا کرو کبھی۔ کم از کم رومانی ڈائیلاگ بولنے کا صحیح طریقہ تو آجائے گا۔" زاہد نے کہا اور سرفراز کی آنکھوں سے آنسو چھلک پڑے۔

"ارے ارے او احمق آدمی، یہ کیا حرکت ہے؟"

"زاہد بھائی! میری زندگی کے لئے یہ سب کچھ ضروری ہے میں قدسیہ کو بھول نہیں سکتا، سرفراز نے زاہد کے دونوں ہاتھ پکڑ لئے تھے۔ زاہد کا زوردار قہقہہ فضا میں گونج اٹھا تھا۔ بچوں کی طرح روتے ہوئے سرفراز کو دیکھ کر اس کا دل چاہا کہ اسے سینے سے لگا لے۔ بڑا معصوم سا تھا یہ شخص، بالکل ہی فرشتہ صفت۔

"کمال ہے سرفراز ابھی تک تم زاہد پر بھروسہ نہیں کر سکے او کون سی زبان استعمال کروں تمہارے لئے؟"

"خدا کی قسم بات آپ پر بھروسہ کرنے کی نہیں ہے۔"

"پھر ---؟"

"مجھے خود پر بھروسہ نہیں ہے۔ میں تو حالات کی بھول بھلیوں میں اس طرح الجھا ہوا تھا کہ کبھی زندگی کے ان معاملات کے بارے میں سوچا بھی نہیں تھا لیکن۔۔۔"

"زاہد نامی ایک مصیبت تمہارے گلے آپڑی اور اس نے تمہیں اس جال میں پھانس لیا۔ آنسو خشک کر لو سرفراز۔ یہ آنسو بے بسی کی علامت ہیں۔ ہم بے بس تو نہیں ہوئے۔"

"جب بھی غور کرتا ہوں زاہد بھائی اس سلسلے میں بڑی اونچی اونچی دیواروں میں خود کو محصور سمجھتا ہوں۔ قدسیہ ہمیشہ ان دیواروں کی دوسری طرف نظر آتی ہے۔"

"صرف تمہارے احساس کی دیواریں ہیں سرفراز۔ وقت سے پہلے ناکامی کا تصور نقصان دہ ہوتا ہے میرے دوست۔ زاہد کو

دیکھو کتنی آنکھوں کی کھٹک ہے لیکن میں نے ہمت نہیں ہاری۔ ویسے قدسیہ کیا کہہ رہی تھی۔۔۔؟"

"اس نے شجاع احمد اور بیگم صاحبہ کی باتیں سن لی ہیں۔"

"جالب کے بارے میں؟"

"ہاں ---!"

"جالب اس قابل نہیں ہے کہ قدسیہ کا نام بھی اس کے ساتھ لیا جائے۔ تم فکر مت کرو میرے دوست۔ ارے ہم نے تو اپنی زندگی ہی ایسے کاموں کے لئے وقف کر دی ہے۔ ہم زندہ ہیں تو فکر کیسی؟"

"یہ سحر صدیقی میرے ذہن میں بری طرح چبھ رہی ہے۔ کوئی مصیبت نہ کھڑی کر دے میرے لئے۔"

"شاباش! جتنا سوچو گے اتنی ہی مصیبتیں اپنے اطراف محسوس

کرو گے۔ آؤ یار کام کرنا ہے آؤ۔" زاہد نے اس کا شانہ تھپتھپاتے ہوئے کہا اور دونوں آگے بڑھ گئے۔

لباس وغیرہ بھی نہیں تبدیل کیا تھا، زاہد نے کہ جاسوسِ اعظم نے اندر آنے کی اجازت مانگی اور زاہد نے فیصل کو اندر بُلا لیا فیصل نے سلوٹ کیا تھا۔

"ہیلو سیکرٹ آفیسر! کیا رپورٹ ہے؟"

"گریٹ کرم چیف! ایک کیسٹ سنانے آیا ہوں آپ کو۔ کوئی خاص مصروفیت تو نہیں ہے؟"

"ہرگز نہیں تمھارا کام جاری ہے؟"

"میں ایک ذمے دار ایجنٹ ہوں چیف۔ دشمن پر نگاہ رکھنا میرا فرض ہے۔"

"گڈ، کیا رپورٹ ہے؟"

"جنرل رپورٹ کی چند جھلکیاں سُن لیجئے۔ بیگم فردوس غسل خانے میں پھسل گئیں۔ ان کی کان پھاڑ دینے والی چیخ سے میرے کانوں کے پردے پھٹنے لگے تھے۔ اتفاق سے کرنل صاحب کمرے میں موجود تھے۔ انھوں نے بیگم صاحبہ کی مدد کی اور ساتھ میں ڈانٹ ڈپٹ بھی۔"

"خاصی دلچسپ ہے ایک منٹ۔" فیصل نے کہا اور اپنے لباس سے چھوٹا سا ٹیپ ریکارڈر نکال لیا اور چند لمحات کے بعد کیسٹ سے آوازیں آنا شروع ہو گئیں۔ چیخ اور دھماکے کی آواز کافی زوردار تھی۔ اس کے بعد کرنل ضرغام صاحب کی آواز اُبھری۔

"ارے، ارے، کیا ہوا تمھیں؟"

"کیا ہوا۔ کیا ہوا کئے جا رہے ہو۔ یہ نہیں کہ مجھے اُٹھاؤ۔ ہائے میری ہڈی ٹوٹ گئی۔"

"جی، کیا فرمایا آپ نے ہڈی، عزیزہ ہڈی آپ کے بدن میں ہے کہاں۔ ہوگی بھی بے چاری تو گوشت کے تودوں کے نیچے اس طرح دب گئی ہے کہ اب اس تک ضرب پہنچنا ممکن نہیں ہے اُٹھئے تو اب مجھ غریب کی زندگی کے لئے کیوں عذاب بنی ہوئی ہیں۔ آپ خود بھی کوشش فرمائیے مجھ نحیف و ناتواں میں اتنی سکت کہاں ہے۔"

"مر جائیں گے اب بھی کیسے جائیں گے۔"

"کہہ تو بہت عرصے سے رہا ہوں خاتون آپ سنیں تو سہی کتنی بار کہا ہے کہ کھانے میں احتیاط رکھیں یہ گوشت کی تہیں تمھی چلی جائیں گی تو پھر کم نہیں ہوں گی۔"

"کیا خاک احتیاط کروں۔ یہاں لا کر تم نے مصیبت میں پھنسا دیا ہے مجھے۔"

"اب باہر تشریف لے آئیے تو بڑی عنایت ہوگی ورنہ اگر کوئی آ گیا اور ہمیں یہاں دیکھ لیا تو نہ جانے کیا کیا کہانیاں ہمارے بارے میں سُنا ڈالیں گی۔"

"اف وہ! مجھ سے تو اب چلا بھی نہیں جا رہا۔"

"کوشش کیجئے۔ کوشش کیجئے۔"

"دیکھو! میں اب اس مذاق کی متحمل نہیں ہو سکتی تم یہاں میرے بارے میں کچھ نہیں کہو گے۔"

"ہم نہیں کہیں گے عزیزہ تو اس سے کیا ہوگا۔ دُنیا کہہ رہی ہوگی۔" کرنل صاحب نے جواب دیا۔

"بھلا کیا کہہ رہی ہوگی؟"

"تمھارا اٹا پا دیکھ کر مجھ پہ ہنستی ہوگی دُنیا۔"

"میں کہے دیتی ہوں۔ میرا پیٹ نہیں بھرتا۔ میرے لئے انتظام کرو۔ کیا ارادے ہیں تمھارے؟ مجھے یہاں لا کر ختم کرنا ہے؟"

"ارے نہیں محترمہ! آپ کو تو ہم کہیں بھی لے جا کر ختم نہیں کر سکتے اور آپ ختم ہونے والی چیز ہی کہاں ہیں۔"

"مار ڈالو، زہر دے دو مجھے۔"

"زہر، خدا کی پناہ کتنا زہر لائیں گے آپ کے لئے دو چار بالٹی لانا پڑے گا اور آپ کو اندازہ ہے کہ دو چار بالٹی زہر کہیں نہیں ملتا۔"

"دیکھو میں کہتی ہوں خاموش ہو جاؤ۔ میرے چوٹ لگی ہے اور تم مذاق اُڑائے جا رہے ہو۔"

"اچھا بھئی خاموش ہو جاتے ہیں۔ خاموش رہ رہ کر تو یہ حال ہو گیا کیا کہیں آپ سے۔" کرنل صاحب نے کہا اور اس کے بعد خاموشی چھا گئی۔ چند لمحات خاموشی رہی پھر کرنل صاحب نے سوال کیا۔

"ویسے بیگم آپ سے گفتگو کرنا تھی۔"

"کیسی گفتگو؟"

"کیسا پایا آپ نے اس ماحول کو؟"

"ٹھیک ہے۔ سب لوگ ٹھیک ٹھاک ہیں کوئی خاص بات نہیں ہے۔"

"میرا مطلب ہے وہ بچّی۔"

"ہاں! بچی مجھے پسند ہے۔ اچھی لڑکی ہے۔"

"اور وہ گدھا۔ وہ گدھا بھی کچھ کر رہا ہے اس سلسلے میں یا نہیں؟"

"وہ کیا کرے بے چارہ!"

"اس نے اپنے بارے میں کیا تاثرات چھوڑے ہیں یہاں پر ابھی تک اس کی اونگھنے کی عادت نہیں گئی۔"

"اونہہ! تم اس کے پیچھے پڑے رہتے ہو۔ کہاں اونگھتا ہے کم گو ہے ذرا خاموش بیٹھ کر سننے کا عادی۔"

"ہاں بھئی سننے کے عادی تو ہم بھی ہو چکے ہیں حالانکہ پہلے نہیں تھے۔"

"اب تمہیں اپنی شکایات کرنے سے فرصت ملے تو کوئی اور بات کروں تم سے۔"

"اوہو! کوئی بات کرنی ہے۔"

"ہاں!"

"فرمائیے، فرمائیے!"

"میں کہہ رہی تھی کہ جدید دور کی لڑکی ہے۔ بلاشبہ خوبصورت ہے، پیاری ہے، اچھی طبیعت کی مالک ہے مگر اس کے بارے کم از کم اپنے جالب کا بھی تو خیال معلوم کر لیا جائے۔"

"کیا مطلب؟ صاحبزادے بے خیال ہیں۔"

"نہیں نہیں، میرا یہ مطلب نہیں ہے۔ ظاہر ہے ہم جس مقصد کے لئے آئے ہیں اس کی ابتدا تو ہونی چاہیئے۔"

"مثلاً کس انداز میں؟"

"جالب سے آپ بات کیجئے۔ اس سے کہیئے کہ قدسیہ کا قرب حاصل کرے۔ اس کے نزدیک رہ کر اس کی فطرت اور اس کی شخصیت کے بارے میں اندازہ لگائے۔"

"یہ حسین الفاظ اگر آپ ہی ان سے فرما دیں تو کیا حرج ہوتا ہے۔"

"تمہاری بات پر زیادہ توجہ دیتا ہے مجھے تو وہ اپنے برابر کی سمجھتا ہے۔"

"تھوڑی ہی سی بڑی ہوں گی آپ اس سے۔ اگر سمجھتا ہے تو کیا غلط ہے۔" کرنل صاحب نے کہا۔

"پھر مذاق! میں سنجیدہ ہوں۔"

"اچھا... اچھا بھئی تو بلائیے اس احمق الذی کو۔" کرنل صاحب نے کہا اور بیگم صاحبہ شاید اٹھنے کی کوشش کرنے لگیں۔ دو تین کراہوں کے بعد وہ دروازے سے باہر نکل گئی تھیں۔

اس کے بعد تھوڑی دیر تک خاموشی چھائی رہی تھی۔ کرنل صاحب دھیمی آواز میں کوئی شعر گنگنا رہے تھے۔ چند لمحات کے بعد کیسٹ سے جالب کی آواز ابھری۔

"ڈیڈی جی آپ نے بلایا ہے مجھے؟"

"ہاں میاں بلایا ہے۔ کچھ گفتگو کرنا تھی آپ سے۔"

"جی... جی فرمائیے میں آپ کے سامنے حاضر ہوں۔"

"حاضر ہی رہنا بیٹا! اگر غائب ہوئے تو خواہ مخواہ مجھے غصہ آ جائے گا۔"

"جی!" جالب نے مدہم لہجے میں کہا۔

"عزیزم تمہیں معلوم ہے کہ تمہیں اس مکان میں کیوں لایا گیا ہے؟" کرنل صاحب نے سوال کیا۔

"جی... جی ڈیڈی میں نہیں سمجھا۔" جالب صاحب نے گھبرائی ہوئی آواز میں کہا۔

"ہائے یہ نا سمجھی ہی تو میرے لئے پریشانی کا باعث ہے میاں یوں کہو کہ بار بار میرے منہ سے سننا چاہتے ہو صاحبزادے میں یہاں تمہاری شادی کرنا چاہتا ہوں۔"

"جی... جی وہ تو میں جانتا ہوں۔" جالب نے جواب دیا۔

"اور شادی یونہی نہیں ہو جاتی۔ تمہاری ان امی جان کو حاصل کرنے کے لئے ہمیں کن کن الجھنوں سے گزرنا پڑا تھا۔ کچھ معلوم ہے اس بارے میں؟"

"جی نہیں مجھے اس بارے میں کیا معلوم۔" جالب نے جواب دیا۔

"امی جان سے پوچھئے، ذرا ہمارے دل سے پوچھئے۔ بہرطور سلسلہ یہ ہے میاں کہ قدسیہ کو تم سے منسوب کرنا ہے۔ بتایا تو تمہیں پہلے بھی جا چکا ہے۔ تم نے اب تک اس سلسلے میں کیا کیا؟"

"کک... کچھ نہیں۔"

"جی ہاں مجھے یقین ہے کہ آپ کچھ نہیں کریں گے۔ ہمیشہ سے مکھیاں مارنے کے عادی ہو۔ اب اس کی شخصیت کے بارے میں معلوم کرو کہ وہ کیسی ہے کس شخصیت کی مالک ہے تمہیں پسند ہے وہ تمہیں پسند کرتی ہے یا نہیں کوئی اعتراض تو نہیں ہوگا اسے تم سے شادی پر۔"

"مم... مم... میں... میں کیسے معلوم کروں ڈیڈی؟"

"بیٹے دو چار کتابیں پڑھ لی ہوتیں تو کچھ نہ کچھ تو سلیقہ آ جاتا۔ تم تو بس آرٹ کی دنیا میں کھو جانے کے عادی ہو۔ قدسیہ کے کمرے میں جاؤ اس سے گفت و شنید کرو، تعلقات بڑھاؤ۔ خاص طور

پراس سے یہاں کے لوگوں کے بارے میں معلومات حاصل کرو۔ سب کچھ جاننا ضروری ہے بیٹے تمہارے لئے۔ انہی کوششوں کے لئے تمھیں یہاں لایا گیا ہے اور اگر تم یہاں بھی ناکام رہے تو پھر بہتر ہے کہ واپس یورپ چلتے ہیں یہاں وقت ضائع کرنے سے کیا فائدہ؟"

"نہیں ڈیڈی آپ جو حکم دیں گے میں کروں گا۔" جالب نے جواب دیا۔

"جیو میاں جیو! بڑے ہی سعادت مند ہو۔ شادی کے بعد بھی کوشش کرنا کہ ہمارے ہی احکامات کی پابندی کرتے رہو ورنہ عموماً اس سلسلے میں تجربات زیادہ بہتر نہیں ہوتے۔"

"جی۔" جالب نے جواب دیا۔

"بس جاؤ میاں آرام کرو ہم نے اسی لئے تمھیں بلایا تھا تو پھر یہ کوشش شروع کر دینا۔ اب دوبارہ ہدایت کی ضرورت نہ پیش آئے۔"

"جی۔" جالب نے جواب دیا اور اس کے بعد خاموشی چھا گئی۔ فیصل نے ہاتھ بڑھا کر کیسٹ بند کر دیا۔ "اس کے بعد یہ دونوں کمرے سے باہر نکل گئے تھے۔" اس نے بتایا۔

"بھائی فیصل میاں! جاسوس ہو تو تم جیسا۔ سچ جانو اگر اسکاٹ لینڈ یارڈ میں ہوتے تو لوگ تمہارے پاؤں دھو دھو کر پیتے۔ بہر طور ترقی کرو گے یہ ہماری پیش گوئی ہے۔" زاہد نے اس کا شانہ تھپتھپاتے ہوئے کہا۔

"شکریہ چیف! اب میرے لئے کیا ہدایت ہے؟"

"کام جاری رکھو۔ ویسے طریقہ کار کیا ہے تمہارا؟"

"جب کمرے میں نہیں ہوتا تو ٹیپ ریکارڈر ورنہ عموماً جب کمرے میں ہوتا ہوں دروازہ بند کر کے خود ہی رلسیور پر ہر جگہ کنیکٹ کرتا رہتا ہوں۔"

"گڈ، ویری گڈ، ویسے تینوں کمروں میں ڈکٹا فون کام کر رہے ہیں؟"

"یقیناً!"

"لیکن ریکارڈنگ تینوں کمروں کی ایک ساتھ نہیں ہو سکتی؟"

"ہاں یہ پرابلم تو ہے۔"

"چلو کوئی حرج نہیں ہے۔ ویسے چوتھا ڈکٹا فون بھی استعمال کرنا ہوگا۔"

"چوتھا! وہ کہاں؟" فیصل نے سوال کیا۔

"بھئی اس گھر میں سب سے خطرناک شخصیت میرا مطلب ہے سب سے زیادہ اہم شخصیت شجاع احمد صاحب کی ہے یہ ضروری ہے فیصل کہ ایک ڈکٹا فون وہاں بھی لگایا جائے۔"

"لگ جائے گا چیف آپ فکر نہ کریں۔"

"لیکن بہایت ہوشیاری کے ساتھ تم سمجھتے ہو کہ ہمیں اگر زبردست ذہنی جنگ لڑنی ہے تو شجاع احمد صاحب سے۔"

"او۔کے چیف ان کے کمرے میں چوتھا ڈکٹا فون پہنچا دیا جائے گا۔"

"لیکن میاں ہوشیاری کے ساتھ ہم اس سلسلے میں تمھاری کوئی مدد نہیں کر سکتے۔"

"آپ فکر نہ کریں میں اب بہت ٹرینڈ ہو چکا ہوں۔" فیصل نے جواب دیا۔

"خداوند کریم تمھیں اور زیادہ ٹرینڈ۔" زاہد نے جواب دیا۔

"اجازت چیف!"

"او۔کے۔" زاہد بولا اور فیصل کمرے سے باہر نکل گیا۔ زاہد کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی تھی۔ اس کا مقصد ہے کہ اب جالب میاں قدسیہ کا دل ہاتھ میں لینے کی کوشش کریں گے چلو ٹھیک ہے قدسیہ کوئی کمزور شخصیت نہیں ہے ٹھیک کر دے گی جالب صاحب کو۔ زاہد نے سوچا اس کے بعد اس کا ذہن سحر صدیقی کی جانب بھٹک گیا۔ سحر صدیقی کا سلسلہ تو کسی وقت بھی ختم ہو سکتا تھا لیکن ناظم علی صدیقی کا معاملہ ذرا ٹیڑھا تھا۔ یہ کہانی جو زاہد کے کانوں میں پڑ چکی تھی بڑی اہمیت رکھتی تھی اس کے لئے بہت سے اہم مسائل اس کی نگاہوں میں آگئے تھے۔

رات حسب معمول تھی۔ کھانے کے بعد دوسری دلچسپیوں پر غور کیا جانے لگا۔ پروگرام بنائے گئے کہ کیا کیا کرنا چاہیئے۔ شجاع احمد صاحب نے احمد رضا کو ہدایات جاری کیں اور کہا کہ جالب اور فرمودہ کو وطن کی سیر کرائی جائے۔ احمد رضا بے چارہ خاموش رہا تھا لیکن دادا جان نے ناک بھوں چڑھا لی تھی لیکن مہمانوں کی وجہ سے وہ کچھ بولے نہیں۔ اس کے بعد بزرگ اپنے اپنے کمروں میں چلے گئے اور یہ تمام ایک جگہ جمع ہو گئے خوش گپیاں ہونے لگیں۔ جالب صاحب کا وہی طرز عمل تھا۔ کوئی تبدیلی پیدا نہیں ہوئی تھی آج بھی ان کے انداز میں۔ رات گئے تک یہ محفل جاری رہی۔ دوران گفتگو فرسٹ ایڈ ہاؤس کا ذکر بھی آیا تھا۔ اور فرمودہ نے آج بھی اس سلسلے میں کچھ تفصیل جاننے کی فرمائش کی۔

"بھئی یہ نام ہمیشہ مجھے چبھتا ہے آخر ہے کیا چیز؟"

"اگر آپ مناسب سمجھیں تو کل اس چیز کا جائزہ لے لیں ویسے مجھے تعجب ہے شجاع احمد صاحب نے آپ لوگوں کو اس کے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔"
"کبھی تذکرہ ہی نہیں ہوا؟" فرمودہ نے کہا۔
"تو پھر کل آپ میرے ساتھ فرسٹ ایڈ ہاؤس دیکھنے کی دعوت قبول فرمائیے۔" زاہد نے کہا۔
"کب چلیں گے؟"
"بس صبح دس بجے۔ ناشتے سے فارغ ہونے کے بعد۔"
"ہم تیار ہو جائیں گے قدسیہ آپ بھی چلیں گی نا؟"
"آپ کہیں گی تو میں ضرور چلوں گی۔" قدسیہ نے کہا۔

"اور ہم کہیں گے تو؟" جالب صاحب بولے اور قدسیہ چونک کر انھیں دیکھنے لگی۔
"کمال ہے۔ آپ کا کہا تو کبھی ٹالا ہی نہیں جا سکتا جالب صاحب۔"
"بہر طور کل۔" زاہد نے فوراً ہی بات اُچک لی اور اس کے بعد یہ نشست برخاست ہو گئی۔

دوسرے دن دس بجے تمام لوگ گاڑیوں میں بیٹھ کر فرسٹ ایڈ ہاؤس چل پڑے۔ راستے میں گفتگو ہوتی رہی تھی سرفراز بھی ساتھ تھا۔ داداجان بھی تھے، احمد رضا بھی تھے۔ قدسیہ اور ان دونوں کو بھی ساتھ لے لیا گیا تھا۔ شجاع احمد صاحب نے اس سلسلے میں کوئی اعتراض نہیں کیا تھا۔ بس منہ بنا کر خاموش ہو گئے تھے۔ ویسے وہ زاہد سے شاذ و نادر ہی گفتگو کیا کرتے تھے۔ پتہ نہیں اس بات کو ابھی تک دوسرے لوگوں نے محسوس کیا تھا یا نہیں۔ کرنل صاحب شجاع احمد کے ساتھ کہیں جانے کی تیاریاں کر رہے تھے۔ تھوڑی دیر کے بعد یہ لوگ فرسٹ ایڈ ہاؤس پہنچ گئے۔ عمارت دیکھ کر فرمودہ نے ہونٹ سکوڑے تھے۔

"کمال ہے بھئی۔ یہ تو کوئی بڑا ہی عظیم الشان منصوبہ ہے مگر ہے کیا؟"
"آیئے! میں آپ کو پہلے اس کی سیر کراؤں۔ اس کے بعد اس کے بارے میں تفصیلات بتائی جائے گی۔"
"مجھے اجازت۔" احمد رضا نے کہا۔
"ہاں، ہاں تم جاؤ سرفراز تم بھی اپنا کام دیکھو میں معزز مہمانوں کو فرسٹ ایڈ ہاؤس کی سیر کرا رہا ہوں۔" زاہد نے کہا اس کے بعد وہ قدسیہ فرمودہ اور جالب کو لے کر فرسٹ ایڈ ہاؤس کے مختلف حصے دکھانے لگا۔ رہائشی عمارت، فنی شعبے اور دوسری تمام چیزوں کے معائنے میں ہی کئی گھنٹے لگ گئے۔ اس دوران میں بار بار زاہد سے اس بارے میں پوچھا گیا لیکن اس نے کہا کہ پہلے ان تمام چیزوں کو دیکھ لیا جائے اس کے بعد وہ ان تمام چیزوں کے بارے میں تفصیلات بتائے گا۔ احمد رضا کا کلینک بھی دیکھا گیا۔ اتنا شاندار کلینک دیکھ کر فرمودہ نے حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

"کمال ہے یہ تو یورپ کے معیار کا ہے۔ اتنے خوبصورت سے کلینک کا تو میں نے تصور تک بھی نہیں کیا یہ آپ کا ہے احمد رضا؟"

"نہیں میرا نہیں۔ یہ ہمارے وطن میں بسنے والوں کا ہے۔ یہاں اُن لوگوں کا علاج ہو گا جو اپنے علاج معالجے کے لئے اس اسٹینڈرڈ کے اسپتالوں میں نہیں پہنچ سکتے۔"
"کیا مطلب؟ اب بھی مجھے تفصیل نہیں بتائی جائے گی۔" فرمودہ نے پوچھا۔
"آیئے تشریف لایئے۔ احمد رضا، داداجان کہاں ہیں؟"
"پتہ نہیں۔ میرا خیال ہے معائنہ ہی کر رہے ہیں کسی کام کا۔ دفتر میں موجود نہیں ہیں۔" احمد رضا نے جواب دیا تھوڑی دیر کے بعد یہ لوگ دفتر میں آ بیٹھے۔
"ہاں فرمودہ صاحبہ آپ فرسٹ ایڈ ہاؤس کے بارے میں معلومات حاصل کر رہی تھیں۔ دراصل یہ ایک رفاعی ادارہ ہے جو سو فیصدی ہماری ذاتی کاوشوں اور کوششوں سے قیام میں آیا ہے۔ یہاں ہم ملک کے ان ناداروں اور پریشان حال لوگوں کے لئے کام کریں گے جن کے اپنے وسائل نہیں ہوتے۔" زاہد فرسٹ ایڈ ہاؤس کے بارے میں تفصیلات بتاتا رہا اور فرمودہ حیرت سے منہ کھولے یہ تمام تفصیل سنتی رہی پھر جب زاہد خاموش ہوا تو متحیرانہ انداز میں بولی۔
"میرے خدا! اس قسم کے سب منصوبے سرکاری طور پر تو بہت سے ممالک میں نظر آتے ہیں لیکن نجی . . . میں نے کہیں ایسا کوئی ادارہ نہیں دیکھا اور پھر یہ کوئی معمولی جگہ نہیں ہے۔ آپ نے کمال کر ڈالا ہے اس سلسلے میں کروڑوں روپیہ خرچ کر ڈالا ہو گا۔"
"ہاں! داداجان اس کے بانی ہیں اور انھوں نے جو کچھ ان کے پاس تھا اور جو دوسروں سے حاصل کر سکتے تھے اس میں صرف کر دیا ہے۔ اس ادارے کے اپنے چھوٹے چھوٹے ذیلی ادارے

بھی ہوں گے جو اس کے لئے روپیہ فراہم کریں گے اور اس طرح
یہ اپنا کام شروع کر دے گا۔"
"خدا کی قسم میں بڑی متاثر ہوئی ہوں۔ یہ منصوبہ کس کا تھا؟"
"زاہد بھائی کا۔" احمد رضا نے عقیدت سے کہا اور فرمودہ
عجیب سی نگاہوں سے زاہد کو دیکھنے لگی۔ زاہد سے آنکھیں
ملیں تب بھی اس نے آنکھیں نہیں جھکائی تھیں بس اس کے
چہرے پر عجیب سے تاثرات نظر آ رہے تھے۔ زاہد اس سے نگاہیں
ہٹا کر جالب کو دیکھنے لگا جس کے چہرے پر بالکل سو جانے
کی سی کیفیت تھی۔
"جالب صاحب!" اس نے آواز دی اور جالب صاحب
بُری طرح چونک کھا گئے۔
"ایں۔" انھوں نے متحیرانہ لہجے میں کہا اور فرمودہ بُرا سا
مُنہ بنا کر دُوسری طرف دیکھنے لگی۔
"جالب بھائی کو تو بس نیند کے علاوہ اور کسی بات سے
دلچسپی ہی نہیں ہے۔"
"میں سو کہاں رہا تھا؟"
"ہاں، ہاں فرمودہ! جالب صاحب سو تو نہیں رہے تھے۔"
زاہد نے کہا۔
"بس، بس جانے دیجئے ان کی بات۔ عاجز آ گئی ہوں ان
کی اس عادت سے میں۔"
"مم! مگر میں سو کہاں رہا تھا؟"
"پھر کیا کر رہے تھے آپ؟" فرمودہ نے سوال کیا۔
"سُن رہا تھا سب کچھ سُن رہا تھا۔"
"کیا سُنا آپ نے؟"
"وہ ادارہ فرسٹ ایڈ باکس۔ تم میرا مطلب ہے ہاؤس
ہاؤس۔" جالب صاحب نے جواب دیا۔
"واہ، خوب سمجھے آپ خوب سمجھے۔ واقعی ہاؤس۔" فرمودہ
نے کہا اور ہنس پڑی۔ پھر وہ زاہد کو دیکھ کر بولی۔
"زاہد صاحب یہ منصوبہ آپ کے ذہن میں آیا کیسے؟"
"ارے اب میرا انٹرویو نہ لینا شروع کر دیجئے فرمودہ
صاحبہ دراصل یہ ہم سب کی کاوشوں کا نتیجہ ہے۔ احمد رضا کے
بارے میں آپ شاید تفصیل نہیں جانتیں انھوں نے ڈاکٹری
کی اعلیٰ ترین تعلیم حاصل کرنے کے بعد کلینک کھول کر ہزاروں
اور لاکھوں کمانے کے بارے میں نہیں سوچا۔ بلکہ انھوں نے
اپنی تمام تر صلاحیتوں کو وطن کے ان غریب عوام کے لئے وقف
کر دیا ہے جو نادار ہیں اور اچھے علاج سے محروم ہیں یہ کلینک
مُفت کام کرے گا۔ یہاں جدید ترین مشینیں ہوں گی۔ حسبِ
استطاعت یہاں اُنیس فیصد کوٹہ ناداروں کے لئے مقرر
کیا گیا ہے اور بیس فیصد ان صاحب ثروت لوگوں کے لئے
جو کسی طور پر یہاں کی افادیت سے متاثر ہو کر اپنا علاج یہاں
کرانا پسند کریں گے ان کے لئے یہ ملک کا سب سے مہنگا ترین
اسپتال ہوگا کیونکہ وہی لوگ تو اُسے چلانے میں معاون ثابت
ہُوں گے۔ بڑے منصوبے ہیں ہمارے دیکھئے کب تک ان کی
تکمیل ہوتی ہے۔" زاہد نے کہا۔ فرمودہ زاہد کی صُورت دیکھ
رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں عجیب سے تاثرات تھے پھر
اس نے متاثر لہجے میں کہا۔
"زاہد! بلاشُبہ ہم اُسے دُنیا کا عظیم ترین منصُوبہ کہہ
سکتے ہیں۔ کاش میں خود بھی اس منصوبے کی تکمیل میں
کچھ حصّہ لے سکتی۔"
"شکریہ! آپ کے یہ الفاظ ہی ہمارے لئے بہترین عطیہ
ہیں فرمودہ صاحبہ!" زاہد نے جواب دیا پھر وہ سب دادا
جان کی آمد کی وجہ سے خاموش ہو گئے۔
"کیا گفتگو ہو رہی ہے بھئی بچّوں کے درمیان؟" دادا جان
نے پُوچھا۔
"دادا جان آپ فرمودہ اور جالب صاحب سے ٹھیک سے
ابھی تک نہیں ملے سرسری سی ملاقاتیں ہوئی ہیں۔"
"بھئی فرصت ہی کہاں ہے۔ ویسے کس قسم کے بچے ہیں یہ؟"
دادا جان نے پُوچھا۔
"نہایت ہی نفیس۔ بڑی اچھی شخصیت کے مالک۔" زاہد نے
جواب دیا۔
"جب زاہد کہہ رہے ہیں تو ہم نے تسلیم کر لیا۔ کہو بچو، تم نے
فرسٹ ایڈ ہاؤس کا معائنہ کیا؟"
"ہاں! دادا جان! آپ کی عظمت کا اعتراف دل میں لیکر
ہم یہاں سے رُخصت ہُوں گے۔"
"ارے نہیں بھئی، میں کیا او میری بساط کیا۔ یہ جانو تو
یہ بچّہ جسے لوگ زاہد کے نام سے جانتے ہیں بس یہ ان تمام
چیزوں کا بانی ہے میرا تو نام صرف ٹائیٹل کی حیثیت سے استعمال
کیا گیا ہے۔"
"نہیں دادا جان! آپ مجھے کانٹوں میں نہ گھسیٹیں۔"
"اچھا چھوڑو میاں نہیں گھسیٹتے۔ ان بچّوں کو کچھ کھلاؤ

پلاؤ۔ کافی بنواؤ۔ ہم بھی پئیں گے۔" دادا جان نے کہا۔ کافی کے دور کے بعد ان لوگوں کو یہاں سے رخصت کر دیا گیا۔ انھیں چھوڑنے کے لئے سرفراز کو طلب کر لیا گیا تھا۔ زاہد اپنے کاموں میں مصروف ہو گیا۔ اس کے بعد شام کو جب انھیں فرصت ہوئی تو زاہد نے سرفراز سے کہا۔

"سحر صدیقی کے ہاں چلنا ہے؟"

"زاہد بھائی! میں تو اس تصور ہی سے بڑا خوفزدہ ہوں۔ اگر قدسیہ کو پتہ چلا تو وہ کیا سوچے گی، دل میں اگر نہ بھی سوچے تب بھی اس سے رسم و راہ بڑھانے سے کیا فائدہ، عجیب لڑکی ہے۔"

"سرفراز یوں سمجھو کہ میں اس سے ملتے رہنا چاہتا ہوں۔"

"ارے ارے زاہد بھائی کیا کہہ رہے ہیں آپ؟" سرفراز نے تعجب سے پوچھا۔

"بس... بس زیادہ اونچی اڑان کی کوشش مت کرو سرفراز، یہاں ایسی کوئی بات نہیں ہے۔"

"خدا کا شکر ہے۔ ورنہ مجھے تو سر پیٹ لینا پڑتا۔" سرفراز نے ہنستے ہوئے کہا۔

"ایسا کرتے ہیں گھر چل کر تیاریاں کرتے ہیں۔ کوئی بہانہ کر دیا جائے گا۔"

"جیسا آپ مناسب سمجھیں۔" سرفراز نے کہا اور پھر وہ گھر واپس پہنچ گئے۔

گھر کی رونق حسب معمول تھی۔ شام کی چائے ساتھ پی گئی اور اس کے بعد زاہد نے دادا جان سے کہا۔

"دادا جان! ایک بہت ہی ضروری کام سے مجھے سرفراز کے ساتھ جانا ہے۔ آپ مجھے صرف چند گھنٹوں کی اجازت مرحمت فرما دیجئے۔"

"ٹھیک ہے میاں، کس کام سے جاؤ گے؟"

"بس ایسے ہی فرسٹ ایڈ ہاؤس کے کچھ معاملات ہیں خود اس سلسلے میں ہمیں ایک دو آدمیوں سے ملنا ہے۔"

"ٹھیک ہے۔ کب تک واپسی ہو جائے گی؟"

"ممکن ہے کہ رات کے کھانے پر آپ سے ہماری ملاقات نہ ہو سکے۔"

"او۔ کچھ کوئی حرج نہیں ہے۔" دادا جان نے کہا۔ فرمودہ اور دوسرے لوگ بھی یہ باتیں سن رہے تھے۔ بہر طور اس سلسلے میں ان سے کوئی باز پرس نہیں کی گئی۔ زاہد نے بڑا عمدہ لباس پہنا ہوا تھا۔ سرفراز بھی ایک خوبصورت سوٹ میں ملبوس تھا وقت مقررہ پر یہ لوگ اپنی کار میں بیٹھ چل پڑے۔ سحر صدیقی کا پتہ انھیں معلوم تھا۔ تھوڑی دیر بعد وہ جس کوٹھی کے دروازے پر پہنچے اس کی شان و شوکت دیکھنے کے قابل تھی۔ بڑی ہی خوبصورت سی کوٹھی تھی۔ زاہد کے سینے میں اس کوٹھی کے بارے میں ایک راز تھا جس سے سرفراز بالکل ناواقف تھا۔ وہ تو بس معمولی سی حیثیت میں زاہد کے کہنے کی وجہ سے یہاں تک آ گیا تھا اس کوٹھی کے برآمدے پر سحر صدیقی بڑی بے چینی سے ٹہل رہی تھی۔ وہ انھیں دیکھ کر خوش ہو گئی۔ "دیر نہیں ہو گئی آپ لوگوں کو؟" اس نے کہا۔

"میرے خیال میں نہیں، یہ دوسری بات ہے کہ آپ کے انتظار میں شدت ہو۔" زاہد نے کہا۔

"ممکن ہے ایسا ہی ہو۔ میں تو نہ جانے کب سے برآمدے میں کھڑی آپ کا انتظار کر رہی ہوں۔"

"شاید صدیوں سے؟" زاہد نے کہا۔

"شاید—!" سحر صدیقی کی آنکھیں سرفراز پر گڑی ہوئی تھیں۔ پھر اس نے کہا۔ "مجھے اس کوٹھی کے در و دیوار شکایت کرتے محسوس ہو رہے ہیں۔ وہ کہہ رہے ہیں کہ ایک عظیم فنکار کے شایان شان استقبال نہیں ہوا اس وقت تو در و دیوار سے موسیقی کی آوازیں آنی چاہئیں تھیں۔ ملک کا اتنا بڑا فنکار ہماری اس معمولی سی رہائش گاہ میں آیا ہے۔ کاش سرفراز صاحب میں آپ کو آپ کے شایانِ شان خوش آمدید کہہ سکتی۔"

"واہ، واہ سرفراز! حسد ہو رہا ہے مجھے تم سے۔ یہ الفاظ صرف تمہارے لئے ہیں۔ ہم تو تمہارے ساتھ ایک طفیلی کی حیثیت رکھتے ہیں۔" زاہد نے کہا اور سرفراز بری طرح جھینپنے لگا۔

"اب اگر مناسب سمجھیں خاتون تو اس برآمدے کے بعد کوٹھی کے اندرونی حصوں کو بھی اس فنکار کے قدموں سے سرفراز فرما دیں۔" زاہد نے کہا اور سحر صدیقی چونک کر اسے دیکھنے لگی۔ پھر سنبھل کر بولی۔

"ارے ہاں! آئیے آئیے ڈیڈی آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔" زاہد ایک لمحے کے لئے خاموش سا ہو گیا۔ ڈیڈی کے نام کے ساتھ ہی اسے صابرہ بیگم کی کہانی یاد آ گئی تھی۔ گویا کہ سرفراز اپنے ہی باپ کے سامنے ایک اجنبی کی حیثیت سے پیش ہونے والا تھا۔ بہر طور وہ ان لوگوں کے ساتھ آگے چل پڑا۔ پھر وہ ایک خوبصورت ڈرائنگ روم میں داخل ہوئے۔ ڈرائنگ روم بہت

حسین اور کشادہ تھا جیسا کہ اس عظیم الشان کوٹھی کا ہونا چاہیئے تھا۔ چنانچہ سحر نے انھیں بیٹھنے کی پیش کش کی اور پھر گھنٹی بجا کر ایک مُلازم کو طلب کر لیا۔ بڑا اہتمام کیا تھا۔ اس نے مُلازموں وغیرہ کے لباس میں بھی نمائش کی شائق تھی۔ چنانچہ جو کچھ بھی کر لیتی کم تھا۔ مُلازم سے اس نے ناظم علی صاحب کو اطلاع کروائی تھی اور تھوڑی دیر کے بعد ایک اُدھیڑ عمر کا بلند قامت شخص اندر داخل ہُوا۔ ہاتھ میں پائپ اور تمباکو کا پاؤچ دبا ہُوا اچھی صحت کا مالک تھا ان دونوں نے کھڑے ہو کر اس کا بڑے احترام سے استقبال کیا اور ناظم علی صدیقی صاحب مُسکراتے ہوئے سامنے آگئے۔ انھوں نے ان دونوں سے ہاتھ ملایا تھا۔

"میرا نام ناظم علی ہے اور آپ میں سے ایک یقیناً زاہد صاحب اور ایک سرفراز صاحب ہیں۔ آپ یہ بتا دیجئے کہ سرفراز کون ہے اور زاہد کون ہے؟"

"یہ سرفراز ہیں اور میرا نام زاہد ہے۔" زاہد نے آہستگی سے کہا۔

"مسرت ہوئی تم لوگوں سے مل کر۔ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے سحر کا سلیکشن غلط نہیں ہے۔"

"جی!"، زاہد نے کہا۔

"ہاں! میں نے اُسے ہمیشہ یہی ہدایت کی ہے کہ دوستوں کے انتخاب میں شخصیت کا دخل ضرور ہونا چاہیئے۔ اچھے چہرے اور کشادہ پیشانیاں بہترین انسان کی علامت ہوتی ہیں۔ ویسے تو ... [illegible] کا ایک دیوڑ ہے جنھوں نے مختلف ذرائع سے دولت حاصل کر کے خود کو ممتاز کر لیا ہے لیکن چہروں کی پاکیزگی اور شرافت آسمان سے ودیعت ہوتی ہے۔ آپ لوگوں سے مل کر مجھے بڑی خوشی ہوئی ہے۔"

"شکریہ ناظم صاحب سحر ہنر پسند ہیں۔ سرفراز مصور ہیں اور سحر کو ان کی مصوری بے حد پسند ہے۔"

"ہاں سحر کے بیڈروم میں میں نے ایک تصویر دیکھی ہے۔ جسے اس نے بہت زیادہ قیمت پر خریدا تھا اس نے مجھے بتایا ہے کہ یہ سرفراز کی ایک شاگردہ کی بنائی ہوئی تصویر ہے۔ بھئی اگر یہ تجریدی نہ ہوتی تو ہم بھی اس کی تعریف و توصیف میں کچھ کہتے لیکن بدقسمتی یہ ہے کہ کاروباری رہے ہیں فنونِ لطیفہ سے بہت زیادہ واقفیت نہیں رہی۔ کوئی اچھی چیز نظر آئی تو زبان سے کہہ دیا کہ اچھی ہے لیکن اس کی اچھائی کی تشریح کبھی نہ کر سکے۔" ناظم صاحب نے بیٹھتے ہوئے کہا۔

"بڑے اچھے الفاظ میں آپ نے اس تصویر کی تعریف کی ہے ناظم صاحب۔" زاہد نے کہا۔

"سرفراز بہت کم گو معلوم ہوتے ہیں۔"

"ہاں! یہ حقیقت ہے فنکار اپنے فن میں کھویا رہتا ہے۔ اُسے عام زندگی کے ہنگاموں سے بہت زیادہ رغبت نہیں ہوتی ہے۔"

"خیر اب ایسا بھی مناسب نہیں ہوتا۔ فن اپنی جگہ دُنیا اپنی جگہ کیوں سرفراز میاں!"

"جی بالکل دُرست فرمایا آپ نے بس یہ محبت ہے آپ سب کی کہ مجھے کسی قابل سمجھا جاتا ہے ورنہ آپ یقین فرمایئے میں نے ہمیشہ اپنے آپ کو بہت بے کار سمجھا ہے۔" سرفراز نے جواب دیا۔

"اچھا اب یہ بتایئے کیا پئیں گے آپ لوگ میرا خیال ہے ایک ایک کپ کافی ہو جائے۔ میں نے اپنی چند سہیلیوں کو بھی بُلایا ہے۔ انھیں آپ سے متعارف کراؤں گی لیکن میں نے جان بُوجھ کر انھیں دیر کا وقت دیا ہے تاکہ ہنگاموں کا شکار نہ ہو جائیں۔ آپ سے بہت سی باتیں کرنی ہیں۔"

"بہتر ہے آپ کافی پلوا دیجئے۔" زاہد نے کہا۔

"کیوں سرفراز صاحب؟" سحر صدیقی سرفراز کی طرف دیکھ کر بولی۔

"جی۔ جی ہاں کافی، کافی۔" سرفراز نے جواب دیا اور زاہد کے ہونٹوں پر مُسکراہٹ پھیل گئی۔ سحر نے ایک بار پھر گھنٹی بجا دی تھی ناظم علی صدیقی صاحب کہنے لگے۔

"بھئی اس وقت میرا مطلب ہے پہلی ہی ملاقات میں کچھ فرمائشیں کرنا مناسب نہیں ہے لیکن یوں سمجھو کہ اپنی زندگی میں سحر کے علاوہ کچھ نہیں ہے اس لئے جب بھی بولتا ہُوں اس کی زبان میں بولتا ہُوں اور اس کی خواہشات کو ہمیشہ مدِ نگاہ رکھتا ہوں۔ وہ تم سے مصوری سیکھنے کا شائق ہے سرفراز میاں مجھے تخاطب کی اس بے تکلفی پر معاف کرنا بس بچے ہی .... محسوس ہوتے ہو اپنے اس لئے تم کا لفظ استعمال کر رہا ہوں تو سحر مصوری سیکھنے کی شوقین ہے اور بہت سی باتیں کر چکی ہے مجھ سے تمھارے بارے میں۔ شجاع احمد کو میں اچھی طرح جانتا ہُوں۔ اچھے انسان ہیں۔ بڑے کاروباری ہیں۔ گو ہمارے بہت گہرے تعلقات نہیں ہیں لیکن شناسائی کی حد تک ضرور ہیں۔ سحر نے شکایت کی ہے کہ شجاع احمد نے تمھیں وہ مقام نہیں دیا جس کے تم حقدار تھے۔ اس نے مجھ سے بہت سی سفارشات کی ہیں۔ تمھارے لئے کہتی ہے کہ ایک ایڈورٹائزنگ ایجنسی

کھولی جائے۔ جو تمہارے سُپرد کر دی جائے حالانکہ دونوں شعبے ذرا مختلف ہیں۔ فنِ مصوری سے پبلسٹی کی کسی فرم کا کیا واسطہ لیکن سحر کاروباری ذہن بھی رکھتی ہے کہتی ہے کہ وہ اس کاروبار کو ایک نیا رنگ دے گی اور اس قسم کے کام کرے گی جو آج تک کسی ایسی کمپنی نے نہیں کئے ہیں۔ دیں پیشکش کرتا ہُوں سرفراز میاں کہ اگر تم پسند کرو تو اس سلسلے میں میں تم دونوں کی مدد کرنے کے لئے تیار ہُوں۔ اس بات کو امارت کا مظاہرہ مت سمجھنا بس یوں سمجھو کہ بیٹی کی خواہش پر سر جھکانا مقصود ہے۔"

ناظم صاحب! بہتر یہ ہے کہ ہم پہلی مُلاقات میں کاروباری باتوں سے گریز کریں۔ جہاں تک فنِ مصوری سکھانے کا تعلق ہے میں سرفراز کی طرف سے عرض کرتا ہُوں کہ جونہی انھیں موقعہ ملا سحر کی یہ خواہش پُوری کر دیں گے۔"

"بھئی ایک بات بتاؤ زاہد میاں! بُرا مت ماننا۔ سرفراز کی طرف سے تم بہت زیادہ بول رہے ہو۔ تم دونوں کے درمیان آپس میں کیا رشتہ ہے؟"

"یوں سمجھ لیجئے کہ میں سرفراز کی زبان ہُوں۔"

"بعض اوقات زبان ذہن کا ساتھ نہیں دے پاتی۔" ناظم صاحب مُسکرا کر بولے۔

"تو پھر آپ یُوں سمجھ لیجئے کہ میں سرفراز کا ذہن ہُوں۔"

"بھئی یہ تو کچھ زبردستی والی بات ہوئی۔" ناظم علی صاحب مُسکرا کر بولے۔

"نہیں انکل ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ زاہد صاحب جو کچھ کہہ رہے ہیں بلاشُبہ دُرست ہے۔ اگر آپ میری ہی زبان سے سننا چاہتے ہیں تو آپ یقین فرمائیے کہ ان دنوں بہت ہی مصروف ہُوں اور فوراً ہی سحر صاحبہ کو بھی وقت نہیں دے سکتا۔" سرفراز نے بولنا مناسب سمجھا۔

"ہاں! اس میں کوئی حرج نہیں ہے اگر مصروف ہو تو ظاہر ہے مجبور نہیں کیا جا سکتا لیکن وہ مصروفیت اگر شجاع صاحب کے لئے ہے تو پھر بے کار ہے بھئی دیکھو یا تو وہ تمھیں تمھاری ان کاوشوں کا بھرپور صلہ دیں یا . . ."

"آپ نے یہ کیسے تصور کر لیا۔ صرف سحر صاحبہ کے کہنے سے یہ بات ثابت نہیں ہوتی۔" سرفراز تڑپ کر بولا۔

"کیا مطلب؟ کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ شجاع احمد صاحب کی کوٹھی میں میں اتنا مطمئن و مسرور ہُوں جتنا کسی انسان کی ضرورت ہوتی ہے۔ چنانچہ یہ بات مناسب نہیں ہے کہ ہم بلاوجہ شجاع احمد صاحب کو الزام دینے لگیں۔ براہِ کرم اس سے پرہیز کیجئے۔"

"بہت خوب۔ بہت خوب بھئی۔ اچھی بات کہی تم نے۔ یہ بھی تمھاری شرافت کی دلیل ہے۔ ممکن ہے کہ سحر کو غلط فہمی ہوئی ہو۔ وہ ذرا جذباتی سی لڑکی ہے۔"

"میں بولوں گا تو اب آپ کہنے لگیں گے کہ سحر صاحبہ کی نمائندگی کیوں کر رہا ہُوں۔"

"نہیں، نہیں بھئی! تم تو بہت دلچسپ آدمی معلوم ہوتے ہو۔ کہو کہو کیا کہنا چاہتے ہو؟"

"سحر صاحبہ نے خواہ مخواہ یہ تمام باتیں محسوس کی ہیں اور ان پر یقین کر لیا ہے حالانکہ ان میں کوئی حقیقت نہیں ہے۔ اس کوٹھی میں ہم کوٹھی کے افراد کی مانند رہتے ہیں اور وہاں ہمیں کوئی تکلیف نہیں ہے جہاں تک معاوضے وغیرہ کا مسئلہ ہے تو شاید آپ اس بات پر یقین نہ کریں کہ سرفراز وہاں سے کوئی معاوضہ نہیں لیتے۔ بلکہ ہم لوگوں نے ایک اور مسئلہ شروع کر رکھا ہے جس کے لئے سرفراز بھی کام کرتے ہیں اور میں بھی، ہم اس کا مناسب معاوضہ وصول کرتے ہیں۔"

"وہ کیا سلسلہ ہے بھئی ذرا ہمیں بھی تو پتہ چلے۔" ناظم صاحب نے کہا۔

"فرسٹ ایڈ ہاؤس! آپ نے یہ نام سُنا ہو گا۔"

"کمال ہے۔ نہ سُننے کا کیا سوال ہے۔ شجاع احمد صاحب کا ٹریڈ مارک بن چکا ہے یہ فرسٹ ایڈ ہاؤس مگر یہ ہے کیا چیز! اس بارے میں آج تک نہیں جان سکے۔ شجاع احمد صاحب سے بھی کبھی اس موضوع پر گفتگو نہیں ہوئی کیونکہ ہماری اکثر مُلاقاتیں کاروباری ہوتی ہیں۔ یوں لگتا ہے جیسے فرسٹ ایڈ ہاؤس کو شجاع احمد صاحب سے زبردستی منسوب کر دیا گیا ہو کیونکہ انھوں نے خود کبھی اس کا کسی انداز میں تذکرہ نہیں کیا۔"

"وہ دراصل ان کے والد حسام احمد صاحب کا اہم مشغلہ ہے اور اس مشغلے پر غالباً کروڑوں کے حساب سے روپیہ خرچ کیا جا چکا ہے۔"

"ہاں! بھئی شجاع احمد صاحب کی آمدنی بھی تو لامحدود ہے۔ ویسے یہ فرسٹ ایڈ ہاؤس ہے کیا چیز؟ ہم اس کے بارے میں جاننا چاہتے ہیں۔"

"جگہ جگہ اس کے بارے میں نہیں بتایا جا سکتا۔ اگر آپ کو اس سے دلچسپی ہے ناظم صاحب تو براہِ کرم کبھی ہماری دعوت

قبول کیجئے۔ ہمارے ہاں تشریف لائیے۔ دیکھئے وہ کیا ہے؟"
زاہد نے کہا۔
"ٹھیک ہے اگر تم دعوت دو گے تو ضرور آئیں گے"، ناظم علی نے کہا پھر بولے۔ "ویسے سحر کے لئے سرفراز میاں جلدی وقت نکال لیں میں آپ کی ہر خدمت کے لئے تیار ہوں میرا مطلب ہے کہ اس سلسلے میں جو کچھ بھی آپ طے کریں گے وہ مجھے بالکل منظور ہو گا۔"
"میں نے عرض کیا نا کہ یہ ساری باتیں بعد کی ہیں۔ سحر صاحبہ نے بڑے پر زور اصرار میں کہا تھا کہ میں اور زاہد صاحب ان کے گھر آئیں گے چنانچہ ہم اپنی مصروفیت سے وقت نکال کر یہاں پہنچے ہیں۔"
"بڑی خوشی ہوئی۔ اب میں کافی پیوں گا تمہارے ساتھ اور پھر چلا جاؤں گا۔ رات کو بھی مجھے ایک کاروباری میٹنگ میں شرکت کرنی ہے۔" ناظم صاحب نے کہا۔ کافی بڑی خاموشی سے پی گئی۔ سحر کچھ چپ چپ سی تھی پھر ناظم علی صاحب اپنی جگہ سے اٹھ گئے۔ سحر صدیقی انھیں لے کر ڈرائنگ روم سے باہر نکل آئی۔
"آئیے میں آپ کو کوٹھی دکھاؤں۔"
"بھئی سحر! آپ سے ایک بات کہوں برا تو نہیں مانو گی؟" زاہد نے کہا۔
"نہیں نہیں فرمائیے!"
"میں خود کو ایک جملہ معترضہ سمجھ رہا ہوں اس وقت یوں لگ رہا ہے جیسے میں تمہارے درمیان زبردستی مخل ہو رہا ہوں اگر مناسب سمجھو تو مجھے یہیں بیٹھا رہنے دو اور سرفراز کو کوٹھی دکھا لاؤ۔" زاہد نے کہا۔
"ارے نہیں نہیں آئیے۔ سرفراز سے تو پھر تنہائی میں ملاقاتیں ہوں گی کیوں سرفراز؟" سحر نے اپنی دانست میں انتہائی بے تکلفی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ سرفراز نے اس بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ پھر وہ کوٹھی کے مختلف حصے دکھاتی رہی۔ اس نے اپنا بیڈ روم دکھایا جہاں قدسیہ کی ایک تصویر آویزاں کی گئی تھی۔ اس کے بعد وہاں سے نکل کر لان میں آئی تھی کہ دفعتاً دو گاڑیاں اندر داخل ہوئی تھیں۔ ان میں سے پانچ چھ لڑکیاں باہر نکل آئیں۔ سحر اور سرفراز کو دیکھ کر وہ اس طرف لپکی تھیں اور چند لمحوں میں ان کے پاس پہنچ گئیں۔ شوخ و شریر سی لڑکیاں تھیں۔ دولت مند والدین کی بیٹیاں، اس کا اظہار ان کے چہرے بھرے اور لباس سے ہو رہا تھا۔ انھوں نے سرفراز و زاہد سے تعارف حاصل کیا اور سحر ان کے بارے میں بتانے لگی۔
"ڈیڈی چونکہ کاروباری میٹنگ پر جانے والے تھے اس لئے میں نے سوچا کہ رات کے کھانے پر اپنی ان دوستوں کو بھی دعوت دے دوں اچھی ذرا رنگینی رہے گی۔"
"بڑا اچھا کیا آپ نے۔ کوئی حرج نہیں۔" زاہد نے کہا۔
لڑکیاں سحر سے سرفراز کے بارے میں پوچھ رہی تھیں اور شاید سحر نے سرفراز کے بارے میں انھیں بڑی تفصیل سے بتایا تھا۔ چنانچہ ان کی آنکھوں میں شرارتیں ناچ رہی تھیں۔ زاہد سے بھی کچھ لڑکیاں محو گفتگو تھیں لیکن زاہد جیسے شخص کو اڑانا ان کے بس کی بات نہیں تھی چنانچہ بس وہ قہقہے ہی لگا رہی تھیں۔ سحر نے سرفراز کو گھیر لیا تھا اور سرفراز کھلا کھلا سا نظر آ رہا تھا۔ اسے کچھ دقت سی ہو رہی تھی۔ پھر ایک اور لڑکی وہاں پہنچ گئی۔ سادہ سے سفید لباس میں ملبوس یہ لڑکی جیسے ہی لان پر پہنچی۔ سحر نے نعرہ لگایا۔
"ارے نشاط! اتنی دیر۔ ہمیشہ ہی دیر سے آتی ہو۔ سب پہنچ گئیں بس مجھے تمہارا ہی انتظار تھا۔ زاہد کی نگاہیں بھی اس طرف اٹھ گئیں لیکن دوسرے ہی لمحے اس کا ذہن جھنجھنا کر رہ گیا تھا یہ لڑکی... یہ لڑکی اس کے لئے اجنبی نہیں تھی بلکہ وہ اس لڑکی کو بخوبی پہچانتا تھا۔
"آؤ نشاط! سرفراز سے ملو یہ سرفراز ہیں۔ اپنے وقت کے مانے ہوئے مصور، جن کے برش کی جنبش انسان کو آسمان کی بلندیوں تک پہنچا دیتی ہے اور سرفراز یہ میری بہت ہی عزیز سہیلی نشاط ہے۔ نواب شمشیر زمان مرحوم کی بیٹی لیکن نوابی کی کوئی شان اس کی فطرت میں نہیں ہے۔ بہت ہی سادہ سی طبیعت کی مالک اور بہت ہی نفیس لڑکی ہے۔" سحر نے کہا تو سرفراز نے اپنی گردن خم کی۔
"اور نشاط یہ زاہد ہیں سرفراز کے دوست۔ بہت ہی دلچسپ انسان ہیں۔ تمھیں یقیناً ان سے مل کر خوشی ہو گی۔" سحر نے کہا۔ اور نشاط زاہد کی جانب گھوم گئی۔ اس نے مسکراتے ہوئے گردن خم کی لیکن دوسرے ہی لمحے وہ چونک پڑی۔ اس کی مسکراہٹ ایک دم غائب ہو گئی اور وہ متحیر آمیز نظروں سے زاہد کو دیکھنے لگی۔ زاہد گم صم سا ہو گیا تھا اور اپنی جگہ بیٹھا پھٹی پھٹی نگاہوں سے نشاط کو دیکھ رہا تھا۔ دفعتاً نشاط ہی سنبھلی اور اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"بڑی خوشی ہوئی ہے آپ سے مل کر زاہد صاحب" اس نے لفظ زاہد پر خاصا زور دیا تھا۔ زاہد بھی سنبھل گیا۔

"مجھے بھی مس... مس نشاط" اس نے آہستہ سے کہا اور نشاط ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔ سحر یا دوسری لڑکیوں نے اس لمحاتی تغیر کو محسوس نہیں کیا تھا۔ سحر مسلسل بکواس کئے جا رہی تھی۔ سرفراز کی شان میں قصیدہ خوانی سے وہ تھک نہ رہی تھی۔ بہرطور انہی خوش گپیوں کے درمیان کھانے کا وقت آ گیا اور اور ان لوگوں کو لے کر ڈائننگ ہال میں پہنچ گئی۔ اس نے اپنی امارت کا بھرپور مظاہرہ کیا تھا۔ پوری ڈائننگ ٹیبل انواع واقسام کے کھانوں سے بھری ہوئی تھی۔ سحر نے خاص طور سے اپنے برابر کی کرسی سرفراز کو دی اس کے برابر زاہد بیٹھا اور پھر دوسری تمام لڑکیاں آمنے سامنے بیٹھ گئیں۔

کھانے کے دوران لطیفے چلتے رہے تھے۔ زاہد نے اپنے آپ کو سنبھال لیا تھا حالانکہ اس کا ذہن شدید الجھنوں کا مسکن بنا ہوا تھا لیکن وہ بہت مضبوط اعصاب کا انسان تھا اور اپنے آپ کو مکمل طور پر سنبھالے ہوئے تھا۔ نشاط نے اس کے بعد ایک بار بھی زاہد سے ..... کوئی گفتگو نہیں کی تھی۔ اس کا دیکھنے کا انداز، اس کی مسکراہٹ کا سکڑ جانا اس بات کا غماز تھا کہ جو شاک زاہد کو لگا ہے وہ یقیناً اسے بھی لگا ہے لیکن وہ اعلیٰ ظرف لڑکی تھی، اپنی کیفیت کا اظہار دوسروں پر نہ ہونے دیا۔ بہت دیر تک سرفراز کی جان کھائی جاتی رہی۔ اس کے فن کے بارے میں اس سے معلومات حاصل کی جاتی رہیں۔ سحر جیسی دوسری لڑکیوں نے بھی شجاع احمد کے گھرانے کو برا بھلا کہا جہاں ایک فنکار کی تذلیل ہو رہی تھی۔ لڑکیوں نے پرزور سفارش کی کہ سرفراز وہ جگہ چھوڑ دے اور سحر کی استادی قبول کر لے تاکہ خود اس کی اپنی زندگی بھی بن جائے۔ سرفراز نے ان تمام باتوں کا کوئی جواب نہیں دیا تھا پھر اس نے کہا۔

"آپ تمام لوگوں کا بہت بہت شکریہ، اور مس سحر جیسا کہ میں نے ناظم علی صاحب سے وعدہ کیا ہے۔ فرصت ملتے ہی میں آپ کی خدمت کرنے کی کوشش کروں گا۔ اب ہمیں اجازت دیجئے۔"

"کمال ہے ابھی سے بھئی زاہد صاحب آپ میری سفارش کیجئے نا ابھی سے یہاں سے واپسی کی کیا ضرورت ہے۔ کون سے اہم کام ہیں آپ کو؟"

"میرا خیال ہے ہمیں جانے دیجئے مس صاحبہ۔ گھر میں مہمان آئے ہوئے ہیں۔ انھیں چھوڑ کر آنا مناسب نہیں تھا لیکن آپ سے چونکہ وعدہ کر لیا تھا۔ اس لئے یہاں پہنچنا بھی ضروری تھا۔"

بمشکل تمام سحر نے انھیں اجازت دی اور بالآخر یہ لوگ کار میں بیٹھ کر وہاں سے چل پڑے۔ سرفراز کی پیشانی پر ناگواری کی شکنیں تھیں زاہد خاموشی سے کسی سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ کافی دیر تک ان کے درمیان کوئی بات چیت نہیں ہوئی پھر سرفراز ہی نے کہا۔

"آپ کیوں خاموش ہیں پتہ چل گیا ایسی جگہوں پر آنے کا؟" زاہد چونک کر بولا۔

"کیا مطلب؟ میں سمجھا نہیں؟"

"ان لوگوں کی عامیانہ اور گھٹیا گفتگو آپ کو بھی اتنی ہی ناگوار گزری ہے زاہد بھائی۔ جتنی مجھے۔ شجاع احمد صاحب کا گھرانہ ہمارے لئے کیا ہے۔ یہ بات تو صرف ہم اور آپ ہی جان سکتے ہیں۔ ہم کسی سے بھی اس کے لئے برا نہیں سن سکتے۔"

"جذباتی ہونے کی ضرورت نہیں سرفراز۔ زندگی میں ہر قسم کے لوگوں سے واسطہ پڑتا ہے۔ یہ کیا بات ہوئی۔ وہ اپنی رائے کا اظہار کر رہی تھیں۔ ہم نے تو کبھی اس کی پذیرائی نہیں کی۔"

"مگر ہم ایسے الفاظ سنیں کیوں؟"

"سنا کرو سرفراز، سنا کرو زندگی میں بہت کچھ سننا پڑتا ہے۔" زاہد نے سنجیدگی سے جواب دیا اور سرفراز اسے چونک کر دیکھنے لگا۔

"نہیں کوئی خاص بات تو نہیں ہے بس کھانا زیادہ کھا لیا ہے۔ طبیعت پر کچھ گرانی سی ہو رہی ہے۔" زاہد نے جواب دیا اور اور اس کے بعد سرفراز بالکل خاموش ہو گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ کوٹھی پہنچ گئے۔

"آپ آرام کریں گے؟" سرفراز نے پوچھا۔

"ہاں بھئی اب اس وقت کسی کے ساتھ بیٹھنے کے موڈ میں نہیں ہوں چنانچہ اگر کوئی تم سے ٹکرا بھی جائے تو میری طرف سے معذرت کر لینا۔ میں واقعی آرام کرنا چاہتا ہوں۔ پتہ نہیں کچھ زیادہ ہی کھا گیا۔ یا اس وقت طبیعت کچھ بھاری ہو گئی ہے۔" زاہد نے جواب دیا اور اپنے بیڈروم کی جانب چل پڑا۔ اس نے دروازہ بند کر کے روشنی بجھا دی۔ ذہن و دل تہہ و بالا ہو رہا تھا، نشاط، نشاط کانوں میں دھماکے ہو رہے تھے۔ یہ اچھا نہیں ہوا۔ یہ بہت ہی برا ہوا۔" وہ دل ہی دل میں سوچ رہا تھا۔

★★

زاہد، سرفراز، احمد رضا وغیرہ فرسٹ ایڈ ہاؤس جا چکے تھے باقی تمام لوگ گھر میں تھے قدسیہ اپنے نگار خانے میں چلی گئی تھی مہمانوں کے کمرے میں بیگم فردوس اور جالب صاحب بیٹھے ہوئے تھے بیگم فردوس کہہ رہی تھیں۔

"دیکھو بیٹے! انسان کو زندگی میں خود آگے بڑھ کر ہر کام کی جدوجہد کرنا ہوتی ہے۔ تمہارے آبا تمہاری شادی شجاع احمد صاحب کی بیٹی قدسیہ سے کرنا چاہتے ہیں۔ پُرانے وقتوں میں تو یہ ہوتا تھا کہ والدین نے جو کچھ طے کر لیا بچوں نے مان لیا... اور شادی بیاہ ہو گئے لیکن اب نئے وقتوں میں کچھ نئی تبدیلیاں ہوئی ہیں۔ لڑکی اور لڑکا ایک دوسرے کو جان لیتے ہیں اور اس کے بعد شادیوں کے فیصلے کئے جاتے ہیں تمہارے آبا اس دن بھی تم سے کہہ رہے تھے اور رات کو بھی انھوں نے مجھ سے کہا کہ اس نکمے کو مجبور کرو کہ قدسیہ سے راہ و رسم بڑھائے۔ دونوں ایک دوسرے کو جان لیں تو پھر اس سلسلے میں سلسلہ جنبانی کی جائے۔

"کک، کیا کی جائے؟" جالب نے چونک کر پوچھا اور بیگم صاحبہ غصیلے لہجے میں کہا۔

"تو سو رہا ہے؟"

"نہیں... نہیں اس وقت تو خدا کی قسم ب، بالکل نہیں سو رہا۔" جالب ہکلاتے ہوئے لہجے میں بولا۔

"تو پھر تو نے سُنی کیوں نہیں میری بات۔"

"یہ... یہ جن جن بانی میرا مطلب ہے لک کیا رہی تھیں آپ؟"

"میرا مطلب یہ تھا کہ تمہاری شادی کے لئے بات چیت کی جائے۔"

"مم، اگر میں نے کب منع کیا ہے امی جان۔"

"منع تو نہیں کیا باؤلے مگر تو نے اب تک آبا کے کہنے کے مطابق قدسیہ سے تنہائی میں ملاقات بھی کی ہے۔"

"نہیں۔ تنہائی میں ملاقات کچھ عجیب سی لگتی ہے۔ وہ... وہ کیا سوچے گی؟"

"تیرا سر سوچے گی۔ چل تیار ہو۔ وہ اپنا سلک کا کُرتا اور پاجامہ پہن لے اس میں تو بالکل شہزادہ معلوم ہوتا ہے۔ اچھی طرح سے پرفیوم وغیرہ لگا کر اس کے نگار خانے میں پہنچ جا۔ سُنا ہے اُسے تصویر کشی کا شوق ہے۔ تصویروں کے بارے میں دو چار باتیں کرنا اس سے۔ ایسی گفتگو کرنا کہ وہ تیرے ذوق سے متاثر ہو جائے یوں تو اللہ کا شکر ہے کہ تیرے لئے لڑکیوں کی کمی نہیں ہے مگر ایسی خاندانی اور معیاری لڑکیاں ذرا مشکل ہی سے ملتی ہیں۔ دولت آجانے سے لوگ خاندانی نہیں ہو جاتے بیٹا۔ یہ لوگ اچھے لوگ ہیں۔ میں بھی انھیں چھوڑنا نہیں چاہتی۔ دیکھو تو کیسے ہمارے آگے پیچھے چل رہے ہیں اور پھر شجاع احمد صاحب معمولی حیثیت کے مالک نہیں ہیں۔ بہت کچھ ملے گا ہمیں یہاں سے۔ ارے اپنے پاس کچھ بھی ہو جب تک بہو اپنے ساتھ گھر بھر کے سامان نہ لائے مزا نہیں آتا۔ چل تیار ہو جا۔ جا اپنے کمرے میں۔" بیگم صاحبہ نے کہا اور جالب صاحب اُٹھ گئے۔ بیگم صاحبہ کی باتیں انھیں پریشان کر رہی تھیں۔ قدسیہ ٹھیک ٹھاک لڑکی تھی اگر اس سے شادی ہو جاتی تو کوئی حرج بھی نہیں تھا مگر اس کے ذہن میں محبت کے طوفان نہیں اُٹھے تھے انھوں نے شدتِ جذبات سے یہ نہیں سوچا تھا کہ قدسیہ کے بغیر زندگی بے مزا ہوگی۔ بس ٹھیک ہے بیوی تو بیوی ہوتی ہے۔ زندگی کی ساتھی اگر وہ بن جائے تو کوئی حرج نہیں ہے نہ بنے تو بھی کوئی پریشانی کی بات نہیں تھی۔ بہرطور والدین کا دباؤ تھا اس لئے اپنے کمرے میں تیار ہونے پہنچ گئے امی جان نے جو ہدایت کی تھی۔ اس کے مطابق ایک بہترین سلک کا کُرتا اور پاجامہ پہنا بال سنوارے خوشبو لگائی اور دروازے سے باہر نکل آیا۔ تھوڑی دور تک تو یاد رہا کہ کس کام سے نکلا ہے لیکن راہداری میں پہنچ کر بھول گیا اور ایک ستون سے ٹیک لگا کر باہر ہوا میں جھومتے ہوئے درختوں کو دیکھنے لگا۔ سبزے کی تازگی اس پر اثر انداز ہوئی تھی۔ کافی دیر تک وہ اسی طرح کھڑا رہا پھر اُسے خیال آیا کہ وہ کس کام سے باہر نکلا تھا چنانچہ اس نے قدسیہ کے نگار خانے کا رُخ کیا اور چند لمحات کے بعد اس کے نگار خانے کے دروازے پر پہنچ کر کھڑا ہو گیا عجیب بدتہذیبی سی محسوس ہو رہی تھی کہ اس کے دروازے کو پیٹنا شروع کر دے پریشانی کے عالم میں دیر تک اس جگہ کھڑا رہا کہ دفعتاً دروازہ کُھلا قدسیہ باہر نکل رہی تھی، ٹکراتے ٹکراتے بچی۔ جالب صاحب کو دیکھ کر اس کے حلق سے ایک آواز سی نکل گئی تھی اور پھر وہ دو قدم پیچھے ہٹ گئی۔

"خیریت جالب صاحب! آپ یہاں کیا کر رہے تھے؟"

"ایں!" جالب صاحب چونک کر بولے اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگے۔

"سو رہے تھے آپ شاید یہاں دروازے سے لگے ہوئے۔" قدسیہ کے ہونٹوں پر بے اختیار مسکراہٹ پھیل گئی۔

"نن، نہیں۔ میں رات کو جی بھر کے سویا تھا۔ آپ کے پاس

آنا چاہتا ہوں۔"

"آیئے آیئے تشریف لایئے" قدسیہ نے کہا اور جالب اندر داخل ہو گئے اندر داخل ہو کر وہ نگار خانے کا جائزہ لینے لگا۔ ذہن میں ماں کی باتیں گونج رہی تھیں۔ چند لمحات سوچتا رہا۔ پھر ایک تصویر کی جانب بڑھ گیا اور اسے دیکھنے لگا۔ قدسیہ یک طرف کھڑی اُسے دیکھ رہی تھی۔ اُس کے ذہن میں شرارتیں کلبلا رہی تھیں جالب کی شخصیت ابھی تک بند بند سی تھی۔ اس کی فطرت کھُل کر سامنے نہیں آئی تھی لیکن اس کے آرٹ کی دُنیا میں کھو جانے کا انداز یہ بتا رہا تھا کا پہیمبر تھوڑا سا خالی ہے۔ جب جالب کو وہاں کھڑے کئی منٹ گئے تو قدسیہ نے کھنکار کر گلا صاف کیا اور بالآخر اس کے قریب پہنچ گئی۔

"خیریت! کیا ہو گیا آپ کو؟"

"کک! کچھ نہیں اس تصویر کو دیکھ رہا تھا۔"

"کیا نظر آیا اس میں؟"

"رنگ بھی ہیں اور . . . اور نہ جانے یہ کیسی لکیریں ہیں کیا بنا رہی ہیں یہ آپ؟"

"بھینس!" قدسیہ نے جواب دیا۔

"اوہ اچھا اچھا" جالب نے آہستہ سے کہا اور پھر چونک کر تصویر کو دیکھنے لگے۔

"مم۔ مجھے تو اس میں بھینس کہیں نظر نہیں آئی ہے"

"واہ۔ نظر آجائے تو بھینس کہاں ہوتی ہے"۔ قدسیہ نے جواب دیا اور جالب پریشان نگاہوں سے اُسے دیکھنے لگا پھر وہ چونک کر بولا۔

"وہ . . . وہ امّی جان نے مجھے بھیجا تھا"

"کیوں خیریت۔ کیا بات ہے۔ کیا ہُوا چچی جان کو؟"

"وہ۔ مم۔ میرا مطلب ہے کہ وہ . . . اصل میں امّی جان یہ چاہتی ہیں کہ ہم دونوں . . . ہم دونوں ایک دوسرے کے بارے میں جان لیں"

"مَیں تو آپ کے بارے میں اچھی طرح جان گئی ہُوں" قدسیہ نے کہا۔

"کک۔ کیا جان گئی ہیں؟"

"یہی کہ آپ جالب بھائی ہیں۔ ہمارے انکل مرزا کے بیٹے ہیں۔"

"یہ تو میں بھی جان گیا ہُوں آپ کے بارے میں۔ مم۔ مگر شش شادی۔ میرا مطلب ہے شادی؟"

"شادی! آپ کا مطلب شادی کیسے ہو گیا۔ جالب کا مطلب تو کچھ اور ہوتا ہے شاید"

"نہیں قدسیہ۔ آپ نہیں سمجھیں دراصل امّی اور ابّو میرا مطلب ہے میرے ڈیڈی شادی کرنا چاہتے ہیں"

"کیا، کیا، کیا دوبارہ شادی کرنا چاہتے ہیں وہ اس عمر میں؟" قدسیہ نے سوال کیا۔

"ارے نہیں قدسیہ صاحبہ! وہ ہماری شادی کرنا چاہتے ہیں"

"اچھا . . . اچھا آپ کی شادی۔ سچ جالب بھائی، آپ شادی کر ڈالئے مجھے بڑی خوشی ہو گی آپ کی شادی میں شریک ہو کر"

"آپ کے ساتھ کرنا چاہتے ہیں" جالب صاحب سادگی سے بولے اور اب قدسیہ کو سنبھلنا پڑا۔

"میرے ساتھ۔ جالب بھائی ذرا غور کرنا پڑے گا ان باتوں پر"

"کیجئے کیجئے! ابھی جلدی نہیں ہے"

"ویسے آپ کی کیا خواہش ہے؟"

"مم . . . میں . . . میں کیا بتاؤں بس ممی اور ڈیڈی۔ میرا مطلب ہے امّی جان اور ابّو جو کچھ بھی کریں گے وہ سب کروں گا میں۔"

"ہُوں۔ بڑے سعادت مند ہیں آپ۔ میرے خیال میں ہم لوگوں کو شادی نہیں کرنا چاہیئے۔ ہماری طبیعت ایک دوسرے سے ہم آہنگ نہیں معلوم ہوتی۔ آپ کو اس تصویر میں کہیں بھینس نظر نہیں آ رہی"

"نہیں" جالب صاحب سادگی سے بولے

"تو پھر بتایئے آپ کے اور ہمارے درمیان جب اتنا اختلاف ہے تو پھر ہماری شادی کیسے ہو سکتی ہے۔ مجھے تو اس تصویر میں چاروں طرف بھینسیں ہی بھینسیں نظر آ رہی ہیں" قدسیہ نے کہا اور جالب تصویر کو دیکھ کر آنکھیں پھاڑنے لگا لیکن ایک لمحے کے لئے وہ پھر آرٹ کی دُنیا میں کھو گیا تھا۔ قدسیہ اس کی واپسی کا انتظار کرتی رہی اور جب وہ واپس نہ آیا تو وہ خود ہی کمرے سے باہر نکل آئی۔ اس نے دروازہ باہر سے بھیڑ دیا تھا دل تو چاہا تھا کہ کنڈی لگا دے لیکن پھر سوچا کہ مہمان ہیں۔ خواہ مخواہ بدتہذیبی میں شمار ہو جائے گا۔ چنانچہ وہ انہیں معاف کر کے باہر نکل آئی لیکن جالب کی یہ کاوش اسے گراں گزری تھی۔ صورتحال سے واقف تھی۔ اچھی طرح جانتی تھی

کہ شجاع احمد صاحب کس ارادے سے ان مہمانوں کو لائے ہیں۔ باپ کی طبیعت سے واقف تھی۔ اس لئے اس کی پریشانی بہی تھی۔ گو زاہد پر اعتماد تھا لیکن معاملہ زاہد کا نہیں سرفراز کا تھا اور سرفراز نیک اور سادہ طبیعت کا مالک تھا۔ وہ بذاتِ خود کچھ کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا تھا۔ قدسیہ ڈھکے چھپے انداز میں سرفراز سے اس فون کا ذکر کر چکی تھی لیکن اس سے زیادہ کچھ کہنا اس کے بس کی بات نہیں تھی۔

جالب کو اپنے نگار خانے میں چھوڑ کر وہ باہر نکل آئی دل بے حد پریشان ہو گیا تھا اور کچھ نہ سوجھا تو انیکسی کی طرف چل پڑی۔

صابرہ بیگم ایک آرام کرسی پر دراز کسی کتاب کے مطالعہ میں گم تھیں۔ آہٹ پر چونک کر نظریں اٹھائیں اور قدسیہ کو دیکھ کر مسرور ہو گئیں۔ انھوں نے جلدی سے کتاب رکھی اور کھڑی ہو گئیں۔

"آؤ قدسیہ بیٹی! آؤ، خیریت ہے؟"

"بالکل ٹھیک ہوں خالہ جان! آپ کو سلام کرنے چلی آئی تھی۔"

"بیٹھو بیٹی! کچھ الجھی الجھی سی لگ رہی ہو؟"

"نہیں۔ ایسی کوئی بات نہیں ہے خالہ جان! میں تو ٹھیک ہوں۔"

"مہمانوں کا کیا حال ہے؟"

"سب ٹھیک ہیں۔ آپ کی طبیعت اب کیسی ہے؟"

"تم سب لوگوں کے پیار نے مجھے دوبارہ زندہ کر دیا ہے دل تمہارے احسانات سے لبریز ہے۔"

"آپ نے احسان کا یہ بوجھ خواہ مخواہ سینے پر لاد لیا ہے۔ خالہ جان ایسی تو کوئی بات نہیں ہے۔ اگر آپ کو یہ احساس ہے کہ آپ یہاں رہ رہی ہیں تو میرے خیال میں یہ بات کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔ ہاں مجھے آپ سے ایک شکایت ضرور ہے۔"

"کیا بیٹی؟"

"آپ ہم سے الگ تھلگ رہتی ہیں۔ کبھی ہمارے ساتھ کسی محفل میں شریک نہیں ہوتیں۔ حالانکہ امی جان کی فطرت سے آپ واقف ہیں اگر آپ ہمارے درمیان گھلیں ملیں تو ہمیں بےحد خوشی ہوگی۔"

"تمہاری شکایت سر آنکھوں پر بیٹی لیکن بس مجھے ایک خوف رہتا ہے۔ ہم تمہارے معیار کے لوگ نہیں ہیں۔ ہم پر انگشت نمائی نہ ہونے لگے۔"

"کون کرے گا انگشت نمائی؟ آپ اس کا نام لیں۔"

"دنیا کی زبان کون پکڑ سکتا ہے بیٹی۔"

"کچھ کہوں تو ناراض تو نہ ہوں گی خالہ جان؟"

"نہیں کہو!"

"لوگ کسی کو نہیں مانتے۔ خود کو منوایا جاتا ہے۔ سرفراز صاحب نے اس خاندان کو مزید شہرت اور عزت بخشی ہے۔ میری کاوشوں میں صرف ان کی رہنمائی کا ہاتھ ہے ورنہ میں تو تصویر کی ابجد سے بھی واقف نہیں تھی۔"

"اسے معاوضہ ملا ہے اس کا۔ برے وقت میں ہمیں بڑے سہارے ملے ہیں۔"

"یہ تو دنیا کا اصول ہے خالہ جان!" قدسیہ کے چہرے پر عجیب سی کشمکش چھائی ہوئی تھی۔ صابرہ بیگم چونک کر اسے دیکھنے لگیں پھر آہستہ سے بولیں۔

"مجھے کسی قابل سمجھتی ہو قدسیہ۔ کیا حیثیت ہے تمہارے دل میں میرے لئے؟" اب قدسیہ کے چونکنے کی باری تھی۔ صابرہ بیگم کا یہ سنجیدہ لہجہ بے معنی نہیں تھا۔ وہ چند لمحات انھیں دیکھتی رہی پھر بولی۔

"امتحان لیجئے خالہ جان!"

"اتفاق سے اس وقت یہ موقع آگیا ہے۔ بتاؤ قدسیہ تم کیوں الجھی ہوئی ہو۔ بتاؤ کیا پریشانی ہے تمہارے دل میں؟"

"خالہ جان!" قدسیہ کی گردن جھک گئی۔

"یہ میرا امتحانی سوال ہے خالہ کہہ رہی ہو تو ماں بن کر دکھاؤں گی۔ تمہارا وقار میرے ہاتھوں کبھی مجروح نہ ہوگا!" صابرہ بیگم ایک عزم سے بولیں۔ قدسیہ سادہ فطرت تھی لیکن عمر نے عقل بھی دی تھی، چھل فریب نہ آتے تھے لیکن زندگی کے تقاضوں سے آشنا ہو چکی تھی۔ اسے احساس ہو گیا کہ صابرہ بیگم کی زیرک نگاہوں نے کچھ بھانپ لیا ہے۔ زندگی بھر کے معاملات دوسروں پر نہیں چھوڑے جاتے اپنے لئے بھی کبھی کچھ کرنا پڑتا ہے۔ زاہد قابلِ اعتماد تھا لیکن محدود تھا۔ سرفراز بذاتِ خود آگے بڑھنے کی صلاحیت نہیں رکھتا تھا۔ زندگی کے اس سب سے بڑے مسئلے کو حل کرنے کے لئے ہمت کرنی ہی ہوگی۔ اس وقت خاموشی پوری عمر کا روگ بن سکتی ہے گو وہ بہت آہستہ سے بولی۔

"ہاں خالہ جان میں پریشان ہوں۔"

"وجہ؟"

"ڈیڈی کے ساتھ آنے والے مہمان ہیں" قدسیہ نے اسی انداز میں کہا۔ صابرہ بیگم خاموشی سے اُسے دیکھتی رہیں پھر بولیں۔

"تم سے کچھ کہا گیا ہے؟"

"جی! مجھے بتایا جا رہا ہے کہ میں ان لوگوں کی ملکیت ہوں۔"

"تم نے کوئی جواب دیا؟"

"ابھی نہیں۔ میں خود کو کمزور محسوس کر رہی ہوں لیکن خالہ جان یہ ہو نہیں سکتا خواہ کچھ بھی ہو جائے۔"

"خداوند کریم تمھاری مدد کرے۔ خداوند کریم تمھیں دُنیا کی خوشیاں دے۔ مجھ ناتواں کیلئے کوئی خدمت ہو تو بتاؤ۔"

"میں چلتی ہوں خالہ جان۔" قدسیہ دفعتاً اُٹھ گئی اور صابرہ بیگم چونک کر اُسے دیکھنے لگی۔

"میری کوئی بات تمھیں بُری لگ گئی بیٹی رکو تو۔" انھوں نے دروازے کے قریب پہنچتی ہوئی قدسیہ کو بے چینی سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"نہیں خالہ جان کوئی بات بُری نہیں لگی، بس میں یہ کہنا چاہ رہی تھی کہ... کہ خالہ جان! میں آپ کے قدموں میں زندگی گزارنا چاہتی ہوں۔" قدسیہ نے کہا اور جھپاک سے باہر نکل گئی۔ صابرہ بیگم ایک لمحے تو کچھ نہ سمجھ سکیں لیکن پھر قدسیہ کے الفاظ ان کی سمجھ میں آئے اور وہ بے بسی سے رو پڑیں۔ قدسیہ اس سے زیادہ کیا کہہ سکتی تھی لیکن وہ... وہ ان الفاظ کی قیمت کیسے ادا کر سکتی تھیں۔ کوئی راستہ نہیں تھا ان کے سامنے لیکن قدسیہ کے یہ الفاظ ان کے لئے بے حد قیمتی تھے۔ وہ بہت دیر تک سوچتی رہی تھیں۔

شام کو سرفراز واپس آیا تو معمولات کے بعد انھوں نے سرفراز کو اپنے پاس بلالیا۔

"جی امی!"، سرفراز نے محبت سے پوچھا۔

"قدسیہ کے بارے میں تمھارا کیا خیال ہے؟"

"جی! میں نہیں سمجھا؟"

"تجاہل عارفانہ نہ برتو۔ مجھ سے صاف گفتگو کرو۔ تمھارے ذہن میں اس کے لئے کوئی مقام ہے؟"

"جی امی! میں اُسے آسمان کا چاند سمجھتا ہوں۔" سرفراز نے سنجیدہ ہو کر کہا۔

"مطلب؟"

"جسے آنگن میں لیٹ کر دیکھا جا سکتا ہے اپنے جھونپڑے میں نہیں سجایا جا سکتا۔"

"وہ چاند نہیں انسان ہے۔ چاند اپنی جگہ نہیں چھوڑ سکتا وہ چھوڑ سکتی ہے۔"

"آپ کیا کہنا چاہتی ہیں امی؟"

"یہی کہ تمھیں ابتدائی سہارے کی ضرورت تھی۔ بُرے وقت میں زاہد نے ہمیں نئی زندگی سے روشناس کرایا اور ہماری اکھڑی ہوئی سانسیں بحال ہو گئیں اس کے بعد بھی کیا ہمیں اسی سہارے کے ساتھ کھڑے رہنا چاہئے۔"

"کچھ اور تفصیل امی!"، سرفراز بولا۔

"کب تک یہاں رہو گے۔ کب تک یہ جھوٹا کھیل جاری رکھو گے۔ اپنے بازوؤں کی قوت بھی آزماؤ ان کی مضبوطی کا اندازہ بھی لگاؤ۔ زاہد نے ہمیں کھڑے ہونے کی جگہ بنا دی تھی وہاں لیٹنے کی کوشش مت کرو۔ اب بہت دن ہو چکے ہیں یہاں۔ اب کوئی ٹھکانہ بناؤ۔ اپنا کوئی مقام تلاش کرو سرفراز زندگی کی ڈور بُری طرح اُلجھ گئی ہے۔"

"امی جان! آپ نے جو کچھ کہا ہے درحقیقت یہی ہونا چاہئے اور آپ یہ بھی جانتی ہیں کہ میں نے ہمیشہ آپ کے حکم کو اپنا ایمان سمجھا ہے لیکن اگر مناسب سمجھیں تو مجھے یہ بتا دیں کہ اس وقت یہ سب کہنے کی ضرورت کیوں پیش آئی؟"

صابرہ بیگم ایک لمحے کے لئے اس کی آنکھوں میں دیکھتی رہیں پھر بولیں۔

"قدسیہ یہاں آئی تھی۔ اس نے مجھ سے بہت سی باتیں کی ہیں یہ نئے مہمان جو ان کے گھر میں آئے ہیں۔ ان کے آنے کی غرض یہ ہے کہ قدسیہ کو اپنی بہو بنا لیں۔ یہ سب قدسیہ کے لئے یہاں آئے ہیں اور اب قدسیہ پر دباؤ ڈالا جا رہا ہے اس کا طریقہ کار جو کچھ بھی ہو لیکن وہ پریشان ہوتی ہے۔ وہ میرے پاس آئی تھی اور اس نے ان الفاظ میں میرے سامنے اپنی دلی واردات کا اظہار کر دیا۔ جن میں ایک شریف لڑکی کسی سے کچھ کہہ سکتی ہے اس کی آنکھوں میں مدد کی طلب تھی۔ غالباً وہ کسی ایسی اُلجھن کا شکار ہوئی ہے جس کے بارے میں وہ مجھے تفصیل تو نہیں بتا سکتی تھی لیکن میں نے خود اندازہ کر لیا وہ اُلجھن یہی ہو سکتی ہے کہ اُسے اس کے مستقبل کے بارے میں بتایا گیا ہے سرفراز وہ لڑکی مجھے بھی بے حد پسند ہے اور مجھے یہ بھی اندازہ ہے کہ ہم نے جس جگہ ملازموں کی حیثیت سے زندگی گزاری ہے۔ وہاں کی بیٹی کو ہم اپنی بہو نہیں بنا سکتے لیکن اگر تم اپنی ذہانت سے

کام لے کر ایک مختصر سے عرصے میں اپنے آپ کو اس کا اہل ثابت کر دو تو کم از کم میں بیگم صاحبہ کے سامنے زبان کھول سکتی ہوں۔ میں ان سے کہہ سکتی ہوں کہ سرفراز ایک غریب ماں کا بیٹا ہے لیکن باعزت ہے اور ان کا داماد بننے کے قابل ہے وہ مستقبل میں بہت کچھ کرے گا۔ سرفراز اگر یہاں رہ کر میں ان کے سامنے یہ سوال کرتی ہوں تو کیا وہ مجھے عجیب سی نگاہوں سے نہیں دیکھیں گی؟"

"آپ ٹھیک کہتی ہیں امی جان! واقعی آپ ٹھیک کہتی، میں مطمئن رہیئے۔ بہت مختصر سے وقت میں، بہت تھوڑے سے وقت میں، میں اپنے لئے بہت ساری جگہ بنا لوں گا۔ ایک مقام پیدا کر لوں گا۔"

"اس عزم کو ہر لمحے تمھارے ذہن میں تازہ رہنا چاہیئے۔ ہمارے پاس وقت بہت کم ہے۔ اتنا کر لو کہ یہاں سے نکل جائیں۔ ایک باعزت زندگی اپنا لیں۔ اس کے بعد میں بیگم صاحبہ سے یہ سب کچھ کہتے ہوئے نہیں شرماؤں گی۔ ہاں البتہ اس وقتی طوفان کو روکنے کے لئے کوئی کوشش ضرور کرنا ہو گی اور اس کے لئے میں نے سوچا ہے کہ زاہد سے بات کروں۔"

"ٹھیک ہے امی جان! آپ زاہد کو بلا کے بات کریں۔ ویسے ایک سوال کروں گا میں آپ سے؟"

"ہاں، ہاں پوچھو کیا بات ہے؟"

"سحر صدیقی کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟" سرفراز نے پوچھا اور صابرہ بیگم چونک کر اُسے دیکھنے لگیں۔

"میں نہیں سمجھی۔"

"اس نے مجھے ایک ایڈورٹائزنگ فرم کھولنے کی پیشکش کی ہے۔ میں کسی کو دھوکا نہیں دینا چاہتا امی۔ ظاہر ہے میں ان تمام چیزوں سے ناواقف ہوں لیکن... لیکن اگر ہم اس کی یہ پیشکش قبول کر لیں تو کیا حرج ہے۔ دیکھتے ہیں کہ اس فیلڈ میں ہم کیا کر سکتے ہیں۔ فی الحال یہ ایک مختصر راستہ ہے کچھ کرنے کا اس کے بعد جو ہو گا دیکھا جائے گا۔" صابرہ بیگم ملامت آمیز نگاہوں سے سرفراز کو دیکھنے لگیں پھر بولیں۔

"گویا ایک اور انسان کو دھوکا دو گے سرفراز، بُری بات ہے بیٹے۔ تم جیسا نوجوان اس انداز میں سوچنے لگے تو بڑی بدائیاں پھیل سکتی ہیں۔ ہرگز نہیں تم اس لڑکی سے کسی قسم کی مدد نہیں لو گے۔ وہ تمھیں جس نگاہ سے دیکھتی ہے میں اسے پسند نہیں کرتی۔ میں تمھیں حکم دیتی ہوں کہ اُسے آگے بڑھنے کا موقعہ مت دینا۔"

"نہیں امی! کیسی باتیں کرتی ہیں آپ؟ آگے بڑھنے کا کیا سوال ہے قدسیہ کے لئے تو یہ سب کچھ کیا جا رہا ہے اور... اور" سرفراز کہتے کہتے رک گیا تھا لیکن صابرہ بیگم نے اس پر سے نگاہیں ہٹا لی تھیں۔ وہ اس بات کو زیادہ اہمیت نہیں دینا چاہتی تھیں پھر انھوں نے کہا۔

"ٹھیک ہے غور کرو، سوچو، بہتر طور پر سوچو کہ تم کیا کر سکتے ہو۔" انھوں نے کہا اور سرفراز نے گردن جھکا لی۔

تھوڑی دیر کے بعد وہ وہاں سے اُٹھے اور اب اس کا رُخ قدسیہ کی جانب تھا۔ بیگم صاحبہ نے انیکسی کی کھڑکی سے اُسے آواز دے کر کہا کہ اگر زاہد مل جائے تو اسے ان کے پاس بھیج دیا جائے۔ تھوڑی دیر کے بعد سرفراز نے زاہد کو صابرہ بیگم کا پیغام دیا اور خود قدسیہ کے نگار خانے کی طرف بڑھ گیا۔

قدسیہ نے دروازہ اندر سے بند کیا۔ سرفراز نے دستک دی تو دروازہ کھل گیا۔ قدسیہ بہت سنجیدہ نظر آ رہی تھی کینوس پر کچھ آڑی ترچھی لکیریں کھینچی ہوئی تھیں ان کا کوئی مفہوم واضح نہیں تھا۔ اس نے سرفراز کو ایک نگاہ دیکھا اور پھر پیچھے ہٹ کر کرسی پر جا بیٹھی۔

"کیا بات ہے بھئی؟ آج تو بڑی خاموشی سی ہے۔"

"نہیں کوئی بات نہیں ہے سرفراز صاحب!"

"یہ کیا بنایا جا رہا ہے؟"

"اُلجھن!" قدسیہ نے جواب دیا۔

"خوب۔ آئیڈیا اچھا ہے لکیریں اس طرح ایک دوسرے میں مدغم ہوتی ہیں کہ الجھنوں کا اظہار ہوتا ہے۔"

"ہاں سرفراز! زندگی کی لکیریں اس طرح ایک دوسرے میں اُلجھ کر رہ گئی ہیں۔"

"واہ آج تو فلسفہ بولا جا رہا ہے۔" سرفراز نے مسکراتے ہوئے کہا اور قدسیہ بڑی سنجیدہ سی نگاہوں سے اُسے دیکھنے لگی پھر بولی۔

"فلسفہ نہ سمجھنے کے لئے ہوتا ہے اور اگر کسی حقیقت سے جان بچانی ہو تو فلسفے کی زبان اپنائی جائے۔ اس سے مختلف مفہوم نکالے جا سکتے ہیں۔"

"شاید تم درست کہہ رہی ہو مگر معاملہ کیا ہے۔ فلسفے کی زبان سے ہٹ کر اگر ہم سادہ لہجہ اختیار کریں تو زیادہ بہتر ہو گا۔"

"کوئی بات نہیں ہے سرفراز بس ایسے ہی ذہنی طور پر

پریشان ہوں۔ آج جالب میرے کمرے میں آیا تھا۔ سادہ آدمی ہے مجھے اس سے کوئی پرخاش نہیں ہے لیکن کرنل صاحب اور ڈیڈی جو کچھ چاہتے ہیں وہ میرے لئے ممکن نہیں ہے۔ مجھے زندگی کا کوئی مناسب راستہ ملے یا نہ ملے لیکن یہ سب کچھ میں نہیں ہونے دونگی۔"

"قدسیہ! مجھے تھوڑا سا موقع دو۔ میں ان حالات پر قابو پانے کی کوشش کرتا ہوں۔" سرفراز نے کہا اور قدسیہ عجیب سی نگاہوں سے اُسے دیکھنے لگی پھر بولی۔

"سرفراز! تم کوشش شروع کردو۔ میں اب اس سے زیادہ تضحیک برداشت نہیں کرسکتی۔ پلیز سرفراز پلیز۔ ۔ ۔" اس نے کہا اور دونوں ہاتھوں سے مُنہ چھپا لیا۔ سرفراز عجیب سی نگاہوں سے اُسے دیکھنے لگا۔

زاہد کا اپنا ذہن تہہ و بالا تھا۔ آج کا پورا دن بھی اس نے فرسٹ ایڈ ہاؤس میں مختلف انتظامات کی نگرانی میں گزارا تھا۔ فرسٹ ایڈ ہاؤس کا افتتاح اب ہو جانا چاہئے۔ اسی سلسلے میں آج دوپہر داداجان سے ایک میٹنگ بھی ہوئی تھی اور انھوں نے بھی یہی کہا تھا کہ جو کچھ ہو چکا ہے اس کے لیئے فرسٹ ایڈ ہاؤس کا افتتاح ہوسکتا ہے۔ بعد میں جو کمی رہ گئی ہے وہ بھی آہستہ آہستہ پوری ہو ہی جائے گی لیکن ان ساری باتوں کے باوجود زاہد بجھا بجھا سا رہا تھا۔ نشاط کا تصور اس کے ذہن میں آتا تو اس کے ذہن میں بے شمار اُلجھنیں جنم لینے لگتیں۔ کہیں وہ لڑکی وقت سے پہلے کسی مصیبت کا پیش خیمہ نہ بن جائے۔ بڑی ذمہ داریاں لادلی تھیں اس نے خود پر۔ پتہ نہیں کیا کیا کچھ کرنا تھا ابھی تو۔ ابھی سے اس کے بارے میں کوئی بات منظرِ عام پر نہیں آنی چاہیئے۔ پتہ نہیں نشاط کس قسم کی لڑکی ہے اور پتہ نہیں وہ اسے پہچان بھی سکتی ہے یا نہیں۔ بہر طور زاہد کو محتاط تو رہنا ہی تھا۔

دن بھر سوچ بچار کے باوجود وہ کوئی فیصلہ نہیں کر پایا تھا۔ دل چاہتا تھا کہ نشاط کے بارے میں تفصیلات معلوم کرے لیکن خوف محسوس ہوتا تھا کہ کہیں اس سے ملنے کی کوشش مزید مصیبت کا باعث نہ بن جائے۔ ممکن ہے نشاط نے اس کے بارے میں کوئی اندازہ نہ لگایا ہو اور بات ختم ہو گئی ہو۔ اگر وہ خود اس سے ملنے کی کوشش کرے تو ممکن ہے نشاط کو کچھ یاد آجائے۔

شام بھی اسی الجھن میں گزری تھی اور اپنی تمام تر ذمہ داریوں، وہ سوچتا رہا۔ پھر اُسے سرفراز نظر آیا۔ وہ اس کی طرف آرہا تھا۔ زاہد سوالیہ نگاہوں سے اسے دیکھنے لگا۔

"زاہد بھائی! امّی بلا رہی ہیں آپ کو؟"

"کیوں خیریت؟"

"ہاں خیریت ہے کوئی خاص بات نہیں ہے۔ پتہ نہیں وہ کیوں آپ سے ملنا چاہ رہی ہیں" سرفراز نے کہا۔

"ابھی بُلایا ہے اُنھوں نے؟"

"اگر آپ کو فرصت ہو تو ابھی مل لیجئے۔"

"تم کہاں جارہے ہو؟"

"میں ذرا قدسیہ کی طرف۔"

"اچھا اچھا ٹھیک ہے تم جاؤ میں امّی کے پاس جارہا ہوں۔" زاہد نے کہا اور تھوڑی دیر کے بعد وہ صابرہ بیگم کے سامنے تھا۔ صابرہ بیگم کے خلوص اور پیار میں کوئی کھوٹ نہیں تھا۔ حقیقت ان کی نگاہوں میں زاہد کے لئے ایک بہت بڑا مقام پیدا ہوگیا تھا اور بعض اوقات زاہد کو ان کی آنکھوں میں محبت اور ممتا کی جو لہریں جھلکیاں مارتی نظر آتی تھیں وہ کسی ماں ہی کی آنکھوں میں ہوسکتی ہیں۔ اس وقت بھی ان کی یہی کیفیت تھی۔ چہرے پر ہلکی سی اُداسی چھائی ہوئی تھی اور آنکھوں کی سُرخی بتاتی تھی کہ شاید وہ روتی بھی رہی ہیں۔

"خیریت امّی! کیا بات ہے؟" زاہد نے بیگم صاحبہ سے پوچھا۔

"بیٹھ جاؤ۔" صابرہ بیگم نے بھرّائی ہوئی آواز میں کہا اور زاہد بیٹھ گیا۔

"جلدی بول ڈالیئے مجھے وحشت ہونے لگی ہے میں آپ کی آنکھوں کی یہ سُرخی قطعی نہیں دیکھ سکتا امّی مجھے بتایئے کیا بات ہے؟"

"کوئی خاص بات نہیں ہے بیٹے بس سرفراز ہی کے بارے میں سوچتی رہتی ہوں۔ جب بھی میں اپنے حالات پر نگاہ ڈالتی ہوں بہت سی اُلجھنیں آکھڑی ہوتی ہیں۔"

"زاہد موجود ہے امّی آپ لوگوں کو اس پر مکمل بھروسہ کرنا چاہیئے۔ اُلجھنیں صرف میرے لئے رہنے دیں آپ بالکل سکون کی زندگی گزاریں۔ خدا کی قسم مجھے اس سے بڑی طمانیت ہوگی۔"

"میں جانتی ہوں زاہد! میں جانتی ہوں میرے بچے

دراصل میں سرفراز اور قدسیہ کے بارے میں سوچ رہی تھی تم خود بتاؤ زاہد یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے کہ میں مُنہ کھول کر کبھی سرفراز کے لئے قدسیہ کا رشتہ مانگ سکوں۔ کیا مجھے مضحکہ خیز نگاہوں سے نہیں دیکھا جائے گا؟ کیا لوگ یہ نہیں سوچیں گے کہ کتنی ناسپاس عورت ہے جس گھر نے اسے سہارا دیا اس گھر پر سوار ہونے کی کوشش کر رہی ہے۔"

"ہُوں۔ آپ ٹھیک کہتی ہیں امی! لیکن میں آپ سے یہ بھی عرض کر چکا ہُوں کہ سرفراز کی شادی قدسیہ ہی کے ساتھ ہوگی۔ یہ زاہد کا فیصلہ ہے۔"

"میں مانتی ہوں زاہد تم بہت ذہین ہو ضرور کوئی ایسا راستہ تلاش کر لو گے لیکن بیٹے کیا اس کے باوجود میری حیثیت بدل سکتی ہے؟"

"مجھے سوچنے دیں امی، مجھے سوچنے دیں۔ سرفراز کے لئے وہ سب کچھ کرنا ہوگا جس سے اس کی حیثیت دُوسرا رُخ اختیار کر جائے۔"

"مجھے بھی ایک بار اطمینان دلا دو کہ کیا کر سکتے ہو تم اس کے لئے۔ کیا سوچو گے؟ بس زاہد یہ بتا دو مجھے میں نے اپنی اس تسلی کے لئے تمھیں بُلایا ہے۔"

"اوّل تو یہ کہ امی آپ اور سرفراز کو پہلی فرصت میں یہاں سے کہیں اور منتقل کر دیا جائے۔ نمبر دو سرفراز یہاں ایک مصوّر کی حیثیت سے داخل ہُوا ہے۔ کچھ بھی ہو بات صرف شجاع احمد صاحب یا قدسیہ کو بے وقوف بنانے کی نہیں ہے بلکہ ایک بہت بڑا طبقہ بے وقوف بنا ہے یہ [illegible] نہیں ہے امی بس دُنیا کا رنگ ہی ایسا ہو گیا ہے۔ ہم [illegible] کوئی اور کرے گا۔ میں سوچ رہا ہوں کہ سرفراز کو ایک مصوّر ہی کی حیثیت سے منظرِ عام پر لایا جائے اور کوئی ایسا چکر چلایا جائے کہ وہ اپنی حیثیت کو برقرار رکھ سکے۔"

"میں اب بھی نہیں سمجھی۔"

"امی یوں سمجھئے نا کہ اگر شجاع احمد صاحب کبھی سرفراز کو ہلکی نگاہ سے دیکھتے ہیں تو وہ صرف یہی سوچیں گے نا کہ سرفراز ان کے ساتھ رہا ہے انھوں نے اُسے مراعات دی ہیں۔ اگر سرفراز صرف قدسیہ تک ہی محدود رہے تو بھی شجاع احمد صاحب کی نگاہوں میں اس کے لئے کوئی مقام نہیں پیدا ہو پائے گا لیکن اگر سرفراز ایک بہت بڑے ایک بہت عظیم مصوّر کی حیثیت سے منظرِ عام پر آئے اور اس طرح کچھ دولت کما کر اپنا ایک مقام بنالے تو آپ کا خیال ہے شجاع احمد صاحب اُسے کبھی ہلکی نگاہوں سے دیکھیں گے وہ یہی سوچیں گے کہ ابتدا یہاں سے ہوئی تھی۔ اور انتہا یہ ہے امی آپ نے نادانستگی میں مجھے ایک بہت اچھا آئیڈیا دے دیا ہے سرفراز کے لئے اس سے عمدہ طریقہ کار اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ بس آپ یوں سمجھئے کہ میں اپنے کام کا آغاز کرتا ہوں۔"

"ہمیں بیٹے سب سے پہلے یہاں سے نکال دو جس طرح بھی ممکن ہو سکے ہمارے لئے کسی دوسرے مکان کا بندوبست کرو چاہے وہ کرائے پر ہی کیوں نہ ہو۔"

"آپ مطمئن رہیں یہ کام پہلی فرصت میں ہوگا۔" زاہد نے کہا اور انھیں اطمینان دلانے کے بعد وہاں نکل آیا۔ درحقیقت یہ بات بالکل دُرست تھی کہ یہ آئیڈیا اس وقت اس کے ذہن تھا جب قدسیہ کی تصاویر کی نمائش ہو سکتی تھی اور اس کی تصاویر اتنی قیمتی بک سکتی ہیں تو پھر سرفراز بھلا اس سے کیوں محروم رہے۔ ایک بار پھر وہی سب کچھ کرنا ہوگا اور اس کے لئے زاہد نے

بڑی زبردست منصوبہ بندی کی تھی۔ کافی دیر تک وہ اپنے کمرے میں بستر پر لیٹا انہی معاملات کے بارے میں سوچتا رہا تھا۔ پھر اس نے ایک خاکہ ترتیب دیا تھا۔ دوسرے ہی دن اس نے اس سلسلے میں عمل کا آغاز کر دیا۔ ناشتے کے بعد وہ سرفراز سے ایک تنہا گوشے میں کافی دیر تک بات چیت کرتا رہا تھا۔ سرفراز عجیب سی نگاہوں سے اُسے دیکھ رہا تھا۔ زاہد خاموش ہُوا تو سرفراز نے بھاری لہجے میں کہا۔

"زاہد بھائی! یہ پروگرام آپ نے امی سے گفتگو کرنے کے بعد طے کیا ہے؟"

"ہاں بھائی اب تم اس نکتہ چینی کرو گے۔"

"آپ کی کسی بات پر اعتراض کرنے کا تو میں تصور بھی نہیں کر سکتا لیکن آپ اچھی طرح سے سوچ لیجئے کہ کیا یہ ممکن ہو سکے گا؟"

"یار سرفراز! تم پھر وہی سوال کر رہے ہو آخر قدسیہ میں کیا لعل ٹکے ہوئے تھے۔ تم تو اس کے اُستاد ہو بس یہ ساری باتیں مجھ پر چھوڑ دو۔ پہلے ہم اپنے کام کا آغاز کر لیتے ہیں۔ اس کے بعد انشاءاللہ آہستہ آہستہ سب دُرست ہو جائے گا چنانچہ آج دوپہر کو فرسٹ ایڈ ہاؤس میں تمھیں دادا جان سے یہ گفتگو کرنی ہے۔"

"ٹھیک ہے جیسا آپ مناسب سمجھیں۔" سرفراز نے گردن

ہلائی اور کافی دیر تک زاہد کے مشورے کے بارے میں سوچتا رہا پھر اس نے گردن جھٹک دی زاہد جو کچھ کہہ رہا ہے وہی اس کے حق میں بہتر ہوگا کرنا۔"

فرسٹ ایڈ ہاؤس میں دوپہر کے کھانے کے وقت دادا جان سے فرسٹ ایڈ ہاؤس کے افتتاح کے بارے میں گفتگو ہوتی رہی پھر دادا جان نے کہا۔

"بھئی میں جانتا ہوں کہ اب تم لوگ بھی اپنے آپ کو اس سلسلے میں مکمل طور پر تیار کر لو۔ سرفراز فرسٹ ایڈ ہاؤس کے منیجر کی حیثیت سے جو فرائض ذمے داریاں سنبھال چکے ہیں، اس کا انھیں مناسب معاوضہ بھی ملنا چاہیئے اور زاہد بیٹے تمھیں بھی میں کچھ پیشکش کرنا چاہتا ہوں۔"

"بس بس، دادا جان خدا کے لئے مجھے پیشکشیں نہ کریں میں اپنی کھال میں مست ہوں ہاں سرفراز کا معاملہ ذرا مختلف ہے ان کے سلسلے میں، میں آپ سے ضرور سفارش کروں گا۔"

"کمال ہے بھئی اس میں سفارش کی کیا بات ہے جب ہم کام کر رہے ہیں تو پھر اس میں کسی آدمی کو کسی قسم کے دباؤ میں رکھنا غیر مناسب بات ہے۔"

"میں سمجھا نہیں دادا جان! کیسا دباؤ؟" سرفراز نے کہا۔

"سرفراز میاں! قدسیہ مصورہ بن چکی ہے۔ تم اس حیثیت سے ہمارے یہاں آئے تھے نا مصوری کی نمائش میں قدسیہ کو جو سرفرازی عطا ہوئی ہے، وہ تمہاری ہی کاوشوں کا نتیجہ ہے لیکن اب وہاں تمہارا کام تقریباً ختم ہوگیا ہے اور تمہارا زیادہ وقت فرسٹ ایڈ ہاؤس میں صرف ہو رہا ہے اس لئے میں سوچتا ہوں کہ فرسٹ ایڈ ہاؤس کے منیجر کی حیثیت سے تمہارے لئے تنخواہ کا تعین ہو جائے۔"

"دادا جان! فرسٹ ایڈ ہاؤس ایک رفاہی ادارہ ہے انسانوں کی بقا کے لئے انسانوں کی بھلائی کے لئے یہ کام کر رہا ہے۔ میں کم مایہ انسان اُسے کچھ نہیں دے سکتا لیکن اتنا حق تو مجھے ملنا چاہیئے کہ میں اس کیلئے اپنی خدمات وقف کر سکوں۔"

"میاں! یہ سب کچھ تو تم کر رہے ہو اس میں کون سی نئی بات کہی تم نے۔" دادا جان نے کہا۔

"دادا جان! میں فرسٹ ایڈ ہاؤس میں کام کرنے کا کوئی معاوضہ قبول نہیں کروں گا جو کچھ میں کر رہا ہوں کرتا رہوں گا اور اپنے لئے روزی کے دوسرے وسائل تلاش کروں گا۔"

"جزاک اللہ۔ رُوح خوش کر دی ہے تم نے سرفراز میاں! بے شک جذبے یہی ہونے چاہئیں تمہاری رگوں میں کسی عظیم باپ کا خون دوڑ رہا ہے۔ یقین کرو تمہارے ان الفاظ نے مجھے نہ جانے تخیلات کی کون سی دُنیا میں پہنچا دیا ہے لیکن بیٹے زندگی گزارنے کے لئے صرف جذبے ہی کارآمد نہیں ہوتے اور بھی کچھ کرنا ہوتا ہے۔ تم نے اس انداز میں سوچا بڑی مسرت ہوئی مجھے تمہاری اس سوچ سے مجھے میرے انداز میں سوچنے دو آخر تمہارے لئے بھی تو کچھ کرنا ہی ہے۔"

"دادا جان! بس آپ میرے لئے اتنا کریں کہ اگر کبھی میری راہ میں کوئی اُلجھن آئے تو آپ اپنے تعلقات سے کام لے کر انھیں حل کرا دیں۔"

"وہ تو میرا فرض ہوگا سرفراز میاں! لیکن؟"

"بس، اس کے علاوہ مجھے کچھ نہیں چاہیئے دادا جان آج سے میں فرسٹ ایڈ ہاؤس کے سلسلے میں ایک پیسے کی کوئی امداد قبول نہیں کروں گا۔" سرفراز نے کہا اتنا فیصلہ کن لہجہ تھا کہ دادا جان حیرت سے اُسے دیکھنے لگے۔ ان کے دل میں سرفراز کی عظمت کچھ اور بڑھ گئی تھی۔

"ٹھیک ہے میاں! اگر تمہارے سینے میں یہ جذبہ پروان چڑھ رہا ہے تو ہم اس کی راہ میں مزاحم نہیں ہوں گے لیکن ہم تو یہ بھی کسی قیمت پر نہیں چاہتے کہ تم کسی دوسرے کا احسان لو۔"

"کس دوسرے کا احسان؟"

"جیسے شجاع احمد کا۔"

"ہاں دادا جان! خود میرے ذہن میں یہ بات ہے لیکن میں اس کا حل سوچ چکا ہوں۔"

"کیا حل ہے؟"

"میں اب کوٹھی چھوڑ دوں گا۔ وہاں کا کام ختم ہو گیا ہے اپنے لئے روزی کمانا مشکل نہ ہوگا میرے لئے۔"

"مگر کوٹھی چھوڑنے کی کیا ضرورت ہے؟"

"زیادہ سکون، زیادہ اعتماد سے فرسٹ ایڈ ہاؤس کے لئے کام کر سکوں گا۔ کوئی دباؤ نہیں ہوگا مجھ پر۔"

"دباؤ تو اب بھی نہیں ہے تم پر اور مجال ہے کسی کی جو تمھیں دباؤ میں رکھے اور اگر کوئی شکل تمہارے لئے بہتر ہو تو مجھے اس میں کوئی اعتراض نہیں ہے اور پھر یہاں یار زندہ صحبت باقی۔ تمھیں کسی مشکل میں نہیں پڑنے دیں گے۔ ہم کس لئے ہیں اگر اپنے مستقبل کے لئے کچھ کرنا چاہتے ہو تو میں تمہارے

ساتھ ہُوں۔"

"شکریہ دادا جان! آپ دیکھیں گے کہ میں اپنے لئے ایک اعلیٰ مقام حاصل کر لوں گا۔"

"انشاء اللہ، انشاء اللہ۔" دادا جان نے کہا۔ گویا ان کی طرف سے بھی منظوری مل گئی تھی سرفراز نے زاہد سے مشورہ کیا پروگرام زاہد کی مرضی کے مطابق چل رہا تھا اور یہ اس سلسلے میں ایک مضبوط قدم تھا چنانچہ زاہد نے نہایت ہوشیاری سے یہ خبر کوٹھی میں پھیلا دی۔

بیگم صاحبہ ہانپتی کانپتی انیکسی میں صابرہ بیگم کے پاس پہنچی تھیں۔ ان کا چہرہ دُھواں دُھواں ہو رہا تھا۔ صابرہ بیگم نے ہمیشہ کی مانند بڑے پیار سے ان کا استقبال کیا تھا۔ بیگم صاحبہ کا روہانسا چہرہ دیکھ کر وہ پریشان ہو گئی تھیں۔

"کیا بات ہے خیریت، کیسی نظر آ رہی ہیں آپ؟" انھوں نے بیگم صاحبہ سے پُوچھا اور بیگم صاحبہ کی آنکھوں سے آنسو ڈھلک پڑے۔ صابرہ بیگم نے آگے بڑھ کر انھیں اپنے گلے سے لگا لیا۔

"کیا بات ہے بہن؟ بتاؤ تو سہی خُدا کے لئے آنسو نہ بہاؤ میرے سامنے۔"

"آپ... یہاں سے جا رہی ہیں؟" بیگم صاحبہ نے پُوچھا اور صابرہ بیگم کے ہونٹوں پر مُسکراہٹ پھیل گئی۔

"اس کوٹھی سے جا رہی ہُوں۔ دُنیا سے تو نہیں جا رہی۔ اس شہر سے تو نہیں جا رہی۔"

"خُدا نہ کرے جو آپ اس دُنیا سے جائیں۔ آپ لوگ تو میری زندگی میں بہت دُور تک اندر چلے گئے ہیں۔" بیگم صاحبہ نے کہا۔

"ہمارے دلوں کو بھی تم اپنے آپ سے خالی نہ سمجھو بہن۔" صابرہ بیگم بولیں۔

"تو پھر یہ کوٹھی چھوڑنے کا فیصلہ کیوں کیا ہے آپ نے؟"

"آپ سے جھُوٹ بولنے کو دل نہیں چاہتا بہن اور سچ بولنے سے خوف محسوس ہوتا ہے۔ بتائیں کیا کروں؟"

"اگر اس خوف کا تعلق مجھ سے ہے تو میری توہین نہ کریں آپ۔ میں آپ کو بہت کچھ سمجھتی ہُوں۔ اپنی بڑی بہن کی طرح چاہنے لگی ہُوں آپ کو صابرہ بیگم۔ خُدا کے لئے مجھے اتنی دُور سے نہ دیکھیں۔"

"تو پھر سُنو بہن، میرے دل میں ایک احساس چھُپا ہوا ہے میں قدسیہ کو اپنی زندگی میں شامل کرنا چاہتی ہُوں۔ میرے دل میں یہ آرزو بار ہا تڑپی ہے کہ قدسیہ جیسی لڑکی میری بہو بنے لیکن ہمیشہ خود کو بہت کم تر محسوس کیا ہے آپ سب سے۔ بڑا احساس ہے میرے سینے میں اس کا اور یہ گھُٹن یہ دُھواں بار ہا میری راتوں کی نیندیں حرام کر چکا ہے۔ ہم آپ کی نگاہوں میں کچھ بھی حیثیت اختیار کر لیں لیکن دُنیا کی نگاہوں میں اس کوٹھی کے ملازمین ہی کی حیثیت رکھتے ہیں۔ سرفراز کو یہاں سے تنخواہ ملتی ہے، کیا ہم اپنی اس اوقات کو بھُول سکتے ہیں۔ آپ مجھے بتایئے اگر اس انیکسی میں رہ کر میں اس بارے میں زبان کھولنا چاہوں تو کیا میری یہ جُرأت ہو سکتی ہے؟" صابرہ بیگم نے بیگم صاحبہ کی نگاہوں میں دیکھتے ہُوئے کہا اور بیگم صاحبہ کسی سوچ میں ڈوب گئیں پھر بولیں۔

"بات تو یہاں تک دُرست ہے میں جانتی ہُوں، اپنے آپ کو بھی جانتی ہوں اور آپ کو بھی۔ میرے شوہر ہلکی سوچ کے مالک ہیں۔ انھوں نے اپنا ایک مقام بنا رکھا ہے اور وہ اس مقام سے نیچے جھانکنا پسند نہیں کرتے، خُدا کی قسم اگر یہ تصوّر آپ کو یہاں سے لے جا رہا ہے تو مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے لیکن آپ یہ بھی سُن لیجئے کہ میں اس سلسلے میں کوئی دباؤ نہیں اختیار کروں گی۔ بیٹی کی ماں بن کر بات نہیں کروں گی بلکہ آپ کی بہن اور سرفراز کی خالہ بن کر یہ سب کچھ سوچ رہی ہوں۔ سرفراز میاں کو چاہیئے کہ اب وہ اس کوٹھی کا ایک بھی پیسہ قبول نہ کریں۔ شجاع احمد صاحب یا حسام احمد صاحب سے کچھ نہ لیں۔ خُدا کے فضل سے میرے اپنے پاس میرے ذاتی اکاؤنٹ میں بہت کچھ ہے اور یہ سب کچھ میں سرفراز کے حوالے کرنے کو تیار ہُوں۔ سرفراز میاں یہاں سے ہٹ کر ایک نئی زندگی کا آغاز کریں۔ ہماری دُعائیں اور ہماری کاوشیں ان کے ساتھ ہُوں گی۔ وہ خود کچھ بن جائیں اور اس کے بعد آپ لوگ یہ کوشش کیجئے۔ ہر چند کہ ہم لوگ آجکل شدید ذہنی بحران کا شکار ہیں اور وہ بحران شاید آپ کے کانوں تک پہنچ چکا ہو صابرہ بہن، فردوس بیگم اپنے بیٹے کا رشتہ لے کر آئی ہیں۔ انھیں شجاع احمد صاحب کا سہارا حاصل ہے اور بہت جلد وہ اس سلسلے میں کوئی باقاعدہ کارروائی کرنا چاہتے ہیں لیکن میں اپنی زندگی میں یہ نہیں ہونے دُوں گی۔ میں آپ سے یہ کہنے میں عار محسوس نہیں کرتی صابرہ بیگم کہ میں نے بھی تصوّر میں قدسیہ اور سرفراز کو ایک دوسرے کا شریک زندگی دیکھا ہے اور مجھے ہمیشہ مسرّت ہوئی ہے اس بات پر، میری دلی خواہش ہے کہ میں اپنے ان خوابوں کو عملی شکل دے دُوں۔ میں کمزور سے ذہن کی مالک ہُوں لیکن خُدا نے ہمارے درمیان ایک فرشتہ بھیجا ہے اور وہ فرشتہ ہماری

تمام مصیبتوں کو اپنے دامن میں سمیٹ لیتا ہے۔ تم سمجھ گئی ہوگی کہ وہ فرشتہ کون ہے۔ مجھے یقین ہے کہ زاہد اس مرحلے پر بھی اپنی خداداد صلاحیت سے کام لے کر کوئی سبیل نکالے گا۔ اس لئے نہ آپ کو ہراساں ہونے کی ضرورت ہے اور میں بھی خود کو سنبھالے ہوئے ہوں۔"

صابرہ بیگم کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے انھوں نے آگے بڑھ کر بیگم صاحبہ کو گلے سے لگالیا۔

"آپ نے بہت بڑا مقام دیا ہے ہمیں۔ اتنی عزت دی ہے ہمیں کہ ہم سر نہیں اُٹھا سکتے۔ آپ عظیم ہیں، بے حد عظیم۔" وہ بیگم صاحبہ سے گلے مل کر روتی رہیں۔ بیگم صاحبہ کی آنکھوں سے بھی آنسو رواں تھے پھر اُنھوں نے کہا۔

"اگر آپ اس سلسلے کی وجہ سے جانا چاہتی ہیں صابرہ بہن تو مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے میں آپ سے ملتی رہوں گی۔ ویسے ابھی تک شجاع احمد کو اس سلسلے میں کوئی شبہ بھی نہیں ہے بڑا مشکل مرحلہ ہوگا وہ۔ دُعا کرنا خُدا ان مراحل کو آسان کردے" بیگم صاحبہ نے کہا اور صابرہ بیگم گردن ہلانے لگیں تھوڑی دیر تک صابرہ بیگم کے ساتھ بیٹھے رہنے کے بعد بیگم صاحبہ وہاں سے رُخصت ہوگئیں۔

زاہد نے پروگرام کے مطابق سرفراز کے لئے کرائے کے خوبصورت مکان کا بندوبست کرلیا تھا۔ سرفراز کے اپنے پاس بھی کافی پیسے تھے اور پھر اس سلسلے میں دادا جان نے بھی دل کھول لیا تھا۔ سرفراز کے لاکھ منع کرنے کے باوجود دادا جان نے اچھی خاصی رقم اس مکان کے سلسلے میں خرچ کر ڈالی تھی اور سرفراز کا گھر اب مکمل طور پر آراستہ ہوچکا تھا چنانچہ طویل عرصے کے بعد وہ دن آگیا جب اس کوٹھی میں ذرا سی تبدیلی ہوئی۔ قدسیہ کی آنکھوں سے اس بات کا اندازہ ہوتا تھا کہ اُسے سرفراز کے جانے سے کتنا دُکھ ہورہا ہے لیکن اُسے صورتحال سمجھا دی گئی تھی اور اس نے اس سلسلے میں سمجھوتہ کرلیا تھا۔ احمد رضا، فازیہ اور فیصل سب ہی آبدیدہ تھے۔ انھیں یہ بات گوارہ نہیں تھی کہ ان کی کوٹھی میں ان کے دوستوں میں ایک ایسے شخص کی کمی ہوجائے جو ہمیشہ ان کے لئے مہربان اور محبت کرنے والا رہا ہے۔ بہرطور کسی نہ کسی طرح ان سب کو راضی کرلیا گیا اور ایک دن سرفراز کو اس کے گھر منتقل کردیا گیا۔

فرسٹ ایڈ ہاؤس کا خواب شرمندۂ تعبیر ہو چکا تھا۔ دادا جان کی ہمتیں لوٹ رہی تھیں۔ مسرت و شادمانی کی سُرخی ان کے چہرے سے جھلکتی تھی۔ حاجت مندوں کو یہاں سے ہر طرح کی امداد ملتی تھی۔ بے سہارا لوگوں کو ایک مضبوط اور پائیدار سہارا مل گیا تھا۔ فرسٹ ایڈ ہاؤس کے مہمان خانے میں آٹھ ایسے خاندان آباد ہو چکے تھے جن کا اس دُنیا میں کوئی سہارا نہیں تھا۔ ایک ایسا گھرانہ تھا جس کا سرپرست حادثے کا شکار ہو کر دونوں ٹانگیں کھو بیٹھا تھا۔ لمبے مقدمے کے بعد اُسے دس ہزار روپے کی امداد دی گئی تھی۔ اس سے کہیں زیادہ قرض اس مقدمے کے دوران اس پر ہو گیا تھا جسے ادا کرنے کے لئے اسے اپنی جھونپڑی بیچنی پڑی اور اب وہ خاندان تین چھوٹے بچوں کے ساتھ سڑک پر آ پڑا تھا۔ اسی سڑک سے اُٹھا کر فرسٹ ایڈ ہاؤس میں ایک باعزت مہمان کی جگہ دی گئی تھی۔ تینوں بچے فرسٹ ایڈ ہاؤس کے پرائمری اسکول میں داخل کر دیئے گئے تھے۔ عورت کے سپرد کچھ ذمّے داریاں کر دی گئی تھیں اور اُسے بھرپور مقام دیا گیا۔ دُوسرے سات خاندانوں کی کہانیاں بھی اس کہانی سے ملتی جلتی تھیں۔ وہ لوگ جو اُس دُنیا میں خوشیوں کا تصور کھو بیٹھے تھے۔ دوبارہ زندگی پا چکے تھے۔ پانچ ایسے ذہین طالب علم جو غربت کی وجہ سے اپنی تعلیم جاری نہیں رکھ سکتے تھے۔ فرسٹ ایڈ ہاؤس کے وظیفہ دار بن گئے تھے احمد رضا کے کلینک میں ستّر مریض علاج کے لئے داخل ہو چکے تھے اور ان کا بہترین علاج ہو رہا تھا۔ ایسے لوگوں سے درخواستیں طلب کی گئی تھیں جو اپنی بیٹیوں کی شادیاں کرنا چاہتے ہُوں اور ان کے پاس انتظامات نہ ہُوں۔ دُکھی انسانیت کے ہر دُکھ کی دوا جب توفیق یہاں موجود تھی اور ان نیک کاموں سے طمانیت انھیں ملتی تھی جو دولت کا دشوں کا معاوضہ تھی۔ ایک اصول کے ساتھ یہ نظام کام کرنے لگا تھا چند ایسے تعلیم یافتہ لوگوں کو مُلازم رکھا گیا تھا جو فرسٹ ایڈ ہاؤس سے باہر رہ کر کام کرتے تھے۔ ان کی ذمّے داری تھی کہ وہ ضرورتمندوں کے کوائف معلوم کریں اور ثبوت فراہم کریں کہ جو کوئی جو کچھ کہہ رہا ہے وہ حقیقت ہے یا مبالغہ آرائی کیونکہ ایسے لوگوں کا خیال بھی رکھا گیا تھا جو کچھ نہ کر کے صرف سہولتیں حاصل کرنے کے خواہشمند ہوتے ہیں بلکہ ایسے لوگوں کی تعداد زیادہ ہی ہوتی ہے۔

اب تمام لوگ باقاعدگی سے یہاں آتے تھے اور اپنی اپنی ذمّے داریاں پُوری کرتے تھے۔ سرفراز اور صابرہ بیگم کے کوٹھی سے چلے جانے پر چند روز یہاں اُداسی طاری رہی تھی لیکن بعد میں سرفراز نے یہ احساس ختم کر دیا تھا کہ وہ یہاں سے دُور ہو گیا ہے۔ روزانہ رات کو کوٹھی میں حاضری دینا اُس کا معمول بن گیا تھا۔ وہ بیگم صاحبہ کو سلام کرنے حاضر ہوتا تھا لیکن کوٹھی میں داخل ہوتے ہی اس کی نگاہیں بھٹکنے لگتی تھیں اور رقیہ نے جب اس کے آنے کے وقت کا تعین کر لیا تو اس نے بھی اپنی ذمّے داری بنا لی کہ اس وقت وہ بیگم صاحبہ کے پاس موجود ہو۔ اس دوران میں بیگم صاحبہ بھی صابرہ بیگم سے مُلاقات کرنے جا چکی تھیں۔

زاہد کی بھی گزر رہی تھی۔ فولادی انسان تھکے بغیر زندگی کی دوڑ میں حصّہ لے رہا تھا اُس کی نگاہ چاروں طرف تھی۔ فیصل جاسوسی کرتا تھا اور کوٹھی کی ساری رپورٹیں اُسے فراہم کرتا تھا۔ ہارُون اُستاد اعظم کو اپنے گیت سناتا تھا اور اب تو وہ خود ہی گیت لکھنے بھی لگا تھا شاعری کے جراثیم بھی زاہد ہی نے اس کے اندر دریافت کئے تھے اور جب ہارون نے اپنی پہلی نظم اُسے سُنائی تو اس نے سر دھن دیا تھا ہارون کا۔

اس وقت وہ غسل سے فارغ ہو کر باہر نکلا تھا کہ کمرے کے دروازے میں ہارون نظر آ گیا۔ عجیب سے انداز میں کھڑا ہُوا تھا۔ "ارے ہارون میاں خیریت؟ کیا بات ہے؟" اس نے ہارون کے چہرے پر بیتی کے آثار دیکھ کر تعجب سے پُوچھا۔

"وہ... وہ زاہد بھائی!" ہارون کی آواز بھرّائی ہوئی تھی۔

"آؤ۔ اندر تو آؤ۔" زاہد اُسے بڑے غور سے دیکھتے ہوئے بولا اور پھر ہارون مرے مرے قدموں سے آگے بڑھ آیا۔ "ضرور کوئی خاص بات ہو گئی ہے۔"

"ہاں!"

"شجاع احمد صاحب نے گھر سے نکال دیا ہے؟"

"نہیں۔"

"بیگم صاحب سے کوئی بات ہُوئی ہے؟"

"نہیں!" ہارون نے رو دینے کے سے انداز میں کہا

"عشق ہو گیا ہے کسی سے تمھیں؟"

"نہیں زاہد بھائی۔" ہارون بیٹھ گیا۔

"بھلے آدمی کچھ نہ کچھ تو ضرور ہُوا ہو گا جس نے تمھاری یہ حالت بنا دی ہے؟"

"وہ، وہ، دراصل زاہد بھائی، میں نے ایک نظم لکھی ہے۔"

"کیا؟" زاہد اُچھل پڑا۔

"ہاں! میں نے ایک نظم کہی ہے اس کی فکر میں غلطاں رہا ہُوں۔"

"آہ! یہ کیا ہو گیا ہارون؟ یہ کیسے ہو گیا؟"

"گ گ! کہاں۔ کیا زاہد بھائی؟" ہارون نے چاروں طرف متحیّرانہ انداز میں دیکھتے ہوئے کہا۔

"میرے بچّے! یہ نظم تمھارے ذہن میں کیسے اُتر آئی؟"

"بس میں نے اپنے طور پر سوچا آج تک دوسروں کے لکھے ہوئے گیت اور نظمیں گاتا رہا۔ میں نے سوچا یہ شعبہ بھی کیوں نہ اپنایا جائے۔"

"بہت خوب سوچا۔ واللہ بہت خوب سوچا۔ تو اپنی نظم ذرا مجھے بھی سناؤ۔"

"ایک درخت ہے۔" ہارون نے لہجے کو پُراسرار بناتے ہوئے کہا۔

"کہاں ہے؟ اپنے پائیں باغ میں یا گھر سے کہیں دُور؟"

"نہیں، نہیں یہ میری نظم ہے اور اس کا پہلا مصرع ہے یہ۔"

"اچھا، اچھا! میں سمجھا سچ مچ کا درخت ہے۔" زاہد نے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

"ایک درخت ہے جس کی شاخیں میرے ذہن کے دریچوں پر پھیلی ہوئی ہیں۔"

"اچھا پھر کیا ہوا؟" زاہد نے سوال کیا۔

"اور جب ان شاخوں کے پتے ہلتے ہیں تو ہوائیں میرے ذہن میں سرگوشیاں کرتی ہیں... سرگوشیاں، انوکھی سرگوشیاں، یہ سرگوشیاں اس کائنات کے بارے میں ہوتی ہیں، کائنات جو ایک سیاہ تاریک نکتہ ہے ایک ایسا نکتہ جس کے سربستہ راز آج تک نہیں کھل سکے ہیں... میں جب اپنے ذہن کے دریچوں کو بند کرتا ہوں تو شاخوں کی سرگوشیاں رُک جاتی ہیں اور میں سوچتا ہوں کہ سیاہ راستے کا سویرا کب ہوگا؟ سویرا، سویرا، سویرا۔"

"واہ... واہ... کیا خوب کہا ہے۔" زاہد نے داد دیتے ہوئے کہا۔ "بتی کب لگے گی؟"

"نہیں یہ روشنی کائنات سے پھوٹے گی اور کائنات کے ہر ذرے کو منور کر دے گی۔"

"یہ بھی اس نظم کا حصہ ہے۔" زاہد نے مصنوعی سی حیرت کا اظہار کیا۔

"نہیں! یہ تو میں نے آپ سے کہا ہے۔ اس نظم کو میں نے اس جگہ ختم کر دیا ہے اس کے بعد اس سے آگے بھی کچھ اور کہوں گا۔"

"ہارون! کیا واقعی یہ تمہارے اپنے ذہن کی کاوش ہے؟"

"کک، کیوں، کوئی گڑبڑ ہو گئی کیا؟" ہارون نے گھبرائے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

"نہیں بھائی! حیران کر دیا ہے تم نے مجھے۔ سوچ رہا ہوں کہ میں بھی کتنا بڑا احمق ہوں۔"

"کک... کیوں؟" ہارون نے پھر اُسی بوکھلائے ہوئے انداز میں کہا۔

"اب تک میں تمہارے اندر چھپے ہوئے شاعر کو نہیں دیکھ سکا۔ ہارون تم آسمان سے اُتری ہوئی مخلوق ہو۔ تمہارا ذہن کیا ہے یہ آج تک میری سمجھ میں نہیں آسکا۔"

"کک... کیا ہے... سمجھنے کی کوشش کیجئے۔" ہارون نے کہا۔

"میں نے ایک گویئے کے رُوپ میں تمہیں دیکھا اور یہ تسلیم کیا کہ بلاشبہ یہ فن تمہارے ہی لئے تخلیق کیا گیا ہے اور اب تم مجھے ایک شاعر کے رُوپ میں بھی نظر آرہے ہو۔ واقعی تمہارے ذہن میں شاعری کے جراثیم موجود ہیں۔ انہیں پروان چڑھاؤ ہارون۔ روزانہ ایک نظم یا ایک گیت لکھو۔"

"روزانہ!" ہارون نے حیرت بھرے لہجے میں پوچھا۔

"ہاں! فن کی تخلیق جس قدر جلد آجائے اسی قدر بہتر ہوتا ہے میں نے تو آج تک تمہارے بارے میں اس انداز میں سوچا بھی نہیں تھا۔"

"تت... تو زاہد بھائی آپ نے یہ نظم پاس کر دی ہے۔"

"کیوں شرمندہ کر رہے ہو۔ ہارون تم پاس کرنے کی بات کر رہے ہو۔ میں کہتا ہوں کہ اگر کسی مشاعرے میں یہ نظم پڑھی جائے تو شاعر حضرات ایک دوسرے کا منہ دیکھتے رہ جائیں گے۔"

"واقعی...!" ہارون پُرمسرت لہجے میں بولا۔ پھر وہ کہنے لگا۔ "اب میں اپنی غزلیں اور نظمیں خود ہی گایا کروں گا زاہد بھائی!"

"غزلوں کی طرف بالکل نہ جانا برخوردار، شاعر حضرات مار بھگائیں گے۔"

"کیوں؟"

"بس، بس نظم اور گیت ہی چلنے دو۔ وہی تمہارے حق میں بہتر ہوں گے۔"

"جیسی آپ کی رائے۔ میں آپ کو اپنے نئے نئے گیت اور نظمیں سناتا رہوں گا۔"

"مجھے ہی نہیں، دوسرے لوگوں کو بھی سناؤ تاکہ لوگوں کو پتہ تو چلے کہ ہارون کس پائے کا شاعر ہے۔"

"ٹھیک ہے۔" ہارون نے جواب دیا اور پھر تیسرے ہی دن کوٹھی کے لان پر ایک مشاعرہ برپا تھا جس کے انتظامات ہارون نے خود کئے تھے۔ اس کی اپنی نسل کے بہت سے شاعر اس مشاعرے میں شریک تھے۔ ہارون نے اس سلسلے میں کسی سے مشورہ نہیں کیا تھا۔ وہ اچانک ہی منظرِ عام پر آنا چاہتا تھا۔ بہرحال تماشا دیکھنے کے لئے سب ہی جمع ہو گئے۔

ایک باقاعدہ اسٹیج بنایا گیا تھا اس کے سامنے کرسیاں بچھائی گئی تھیں۔ نئے مہمان بھی وہاں پہنچ گئے۔ کرنل ضرغام فرمودہ اور جالب صاحب بھی مشاعرے میں شریک تھے۔ شجاع احمد صاحب

اپنے کمرے میں موجود تھے۔ انھیں اس ہنگامے کی ابھی تک خبر نہیں ملی تھی لیکن جب کوٹھی خالی پائی تو خود بھی ٹہلتے ہوئے وہاں پہنچ گئے اور وہاں کا منظر دیکھ کر ششدر رہ گئے۔ مشاعرہ گٹار پر ہو رہا تھا۔ سب سے پہلے ایک شاعر گویئے یا گویا شاعر اسٹیج پر آئے۔ پتلی پتلی ٹانگیں تھیں۔ کسی ہوئی چست پتلون پہنے ہوئے، سر پر چیل کا گھونسلا، داڑھی بڑھی ہوئی، آنکھوں پر چشمہ لگائے نہایت نازک اقدام مخنی سے پھدک پھدک کر کچھ گانے لگے جو کسی کی سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ شجاع احمد صاحب کے ہونٹ بھینچ گئے۔ مہمانوں کے سامنے یہ تماشا انھیں مزید ناگوار گزرا تھا۔

لیکن پچھلے دنوں سے وہ محسوس کرنے لگے تھے کہ اب یہاں وہ سب کچھ نہیں ہوتا جو وہ چاہتے تھے بلکہ پوری کوٹھی کا ماحول ہی بدل گیا تھا اور اس ماحول کا ذمے دار بڑے پُرجوش انداز میں جھوم جھوم کر اس بندر کی اچھل کود کو سراہ رہا تھا۔ یعنی زاہد ذوالفقار زیدی۔

فرمودہ ہنس رہی تھی اور جالب صاحب آنکھیں پھاڑے

اس اچھل کود کو دیکھ رہے تھے اور باقی سب لوگ حسب توفیق دلچسپی لے رہے تھے قدسیہ زاہد کے قریب آئی اور کہنے لگی۔

"زاہد بھائی یہ سب کچھ۔ یہ کیا ہو رہا ہے؟"

"مشاعرہ ہے مشاعرہ"

"آپ کیا کیا کرائیں گے یہاں؟"

"کیوں قدسیہ کیا بات ہے؟"

"شاعروں کی کیوں مٹی پلید کرائی جا رہی ہے۔ میں نے بھی یہی سنا تھا کہ مشاعرہ ہے [illegible] ہارون بھائی نے اسے ترتیب دیا ہے کم از کم اسے مشاعرے کا نام تو نہ دیا جاتا۔"

"قدسیہ! کیسی باتیں کر رہی ہو۔ تم جیسی ذہین اور روشن خیال لڑکی سے مجھے اس بات کی توقع نہیں تھی۔"

"بھلا کیوں؟" قدسیہ نے سوال کیا۔

"ہر چیز جدید ہو گئی ہے۔ شعرائے کرام نے اس جدت پر توجہ نہیں دی ہے۔ قدیم رسم و رواج کو بناتے اور سراہتے رہنا ہی ادب تصور کر لیا گیا ہے۔ عشق و محبت کی باتیں گل بدنی اور خم ابرو کے قصے کتنے فرسودہ ہو گئے ہیں تمھیں ان کا احساس ہے؟"

"ہاں ہے۔ آگے کہیے؟" قدسیہ نے مسکراتے ہوئے کہا

"بات اب اس دور سے نکل کر اس دور میں آگئی ہے اور یہی وجہ ہے کہ جدید کہانی کو، جدید افسانے کو، جدید غزل کو تعصب کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے اور ادب کے وہ قدیم لوگ اسے ادب ماننے کو تیار نہیں ہوتے۔ اس لیے کہ وہ خود اس انداز میں اس دور کا ساتھ نہیں دے پاتے مشاعروں کی وہ اقسام آج بھی رائج ہیں اور جس میں شرکا بھی وہی جغادری نظر آتے ہیں جو بہت عرصے سے لوگوں کے کان کھا رہے ہیں۔ دراصل اسی تعصب کا نتیجہ ہے کہ وہ مشاعروں کے قدیم انداز کو برقرار رکھنا چاہتے ہیں، اور اس میں ساز کو کوئی دخل نہیں لینے دیتے۔ تم خود بتاؤ کہ جب ہر چیز کمپیوٹرائزڈ ہوتی جا رہی ہے تو پھر مشاعروں میں یہ جدت کیوں نہ ہو۔ شاعر حضرات وہی سوکھے سوکھے برگد کیوں نظر آئیں ان کے برعکس یہ جدید قسم کے ترو تازہ نوجوان ان مشاعروں میں زیادہ جچ رہے ہیں۔ دیکھو ذرا دیکھو ان نئے صاحب کو دیکھو۔" زاہد نے ایک طرف اشارہ کیا۔

یہ حضرت بھی ایک عجیب و غریب قسم کے نوجوان تھے اور غالباً اپنی ہی نظم جھوم جھوم کر پڑھ رہے تھے۔ انداز ایسا تھا جیسے بھگا رہے ہوں۔ ہاتھ پاؤں ہلا ہلا کر نظم سنا رہے تھے۔ کرنل ضرغام نے شجاع احمد کو اپنے قریب بیٹھنے کی پیشکش کی اور ان سے کچھ کہنے لگے۔ شجاع احمد صاحب ...... کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا تھا لیکن وہ ہونٹ بھینچے ہوئے یہ سب کچھ دیکھتے رہے اور اس کے بعد جناب ہارون شجاع احمد کی باری آئی۔ ایک بڑے سے گٹار کو لے کر وہ اسٹیج پر پہنچ گئے اور انھوں نے امریکن لہجے میں اپنی اس نئی نظم کا تعارف کرایا۔ جس کا نام تھا "بھول"

اس کے بعد نظم شروع ہو گئی نظم تو خیر کیا سمجھ میں آتی گٹار کی آواز ان کی آواز پر بھاری تھی لیکن اچھل کود کا ایک ایک انداز نظم کے ایک ایک بند کی رومانیت کا اظہار کرتا تھا۔

شجاع احمد صاحب غصے سے اٹھ گئے اور پاؤں پٹختے ہوئے اندر کی جانب چل پڑے۔ بیگم صاحبہ بھی ہنس رہی تھیں انھوں نے اپنے نزدیک بیٹھی ہوئی فردوس بیگم کو مخاطب کر کے کہا۔

"اسے دیکھو تو سہی پتہ نہیں اس کی کمر میں اسپرنگ لگ گئے ہیں یا کیا ہو گیا ہے کیسا اچھل رہا ہے؟"

"بہن مجھے تو حیرت ہو رہی ہے۔ شجاع احمد صاحب ان سب باتوں کو کیسے برداشت کر لیتے ہیں۔ میرا جالب تو اس مسئلے میں بہت ہی سادہ ہے۔"

"ہاں! وہ اس مسئلے میں ہی نہیں ہر مسئلے میں سادہ معلوم ہوتا ہے۔" بیگم صاحبہ نے کسی قدر طنزیہ انداز میں کہا لیکن فردوس بیگم نے جالب کی خوبی سمجھیں اور مسکرا کر کہنے لگیں۔

"بہن اب اس معصوم سے موہنے کو اپنا بنا لو۔"

"ارے، ارے، مجھ سے کوئی دشمنی ہے آپ کو؟" بیگم صاحبہ نے فردوس بیگم سے کہا۔

"کیوں؟ کیا ہوا؟" فردوس بیگم چونک کر بولیں۔ اس وقت تالیوں کے شور سے مجمع گونج اٹھا۔ ہارون صاحب اپنی نظم پوری کر

چکے تھے اور پسینے سے شرابور نیچے آ رہے تھے۔ لوگوں نے دل کھول کر انھیں داد دی جس میں زاہد پیش پیش تھا۔

مشاعرہ ختم ہو چکا تھا۔ اس کے بعد طعام کا... بندوبست بھی تھا جو ہارون نے اپنی جیب سے کیا تھا۔ چنانچہ تمام شعرا گھر والوں کے ساتھ اس پُرتکلف دعوت میں شریک ہوئے۔ رات گئے تک یہ ہنگامہ جاری رہا اور اس کے بعد ختم ہو گیا۔ آج کا یہ مشغلہ خاصا دلچسپ رہا تھا۔ تمام لوگ ہی اس سے محظوظ ہوئے تھے۔

دوسرے دن تقریباً دس بجے فیصل کی آمد نے زاہد کو چونکا دیا۔

"ہیلو جاسوسِ اعظم کوئی خاص بات؟"

"جی ہاں! آپ کے خلاف کچھ ریکارڈنگ موجود ہے۔"

"خوب، تم تو صاحب کمال ہوتے جا رہے ہو فیصل جلدی بتاؤ کیا بات ہے؟"

"کیسٹ موجود ہے۔ آپ خود سُن لیجیے۔" فیصل نے کہا اور اپنی جیب سے ایک کیسٹ نکال کر زاہد کے سامنے رکھ دیا۔ زاہد نے کیسٹ ٹیپ ریکارڈر میں لگایا اور اُسے سُننے لگا۔ شجاع احمد صاحب اور بیگم صاحب کی گفتگو تھی جو نئی نہیں تھی بلکہ زاہد اس کی توقع کر رہا تھا۔

"تشریف لے آئیں آپ؟"

"ہاں! خیریت، کیوں، کیا بات ہے... بجے کیا؟"

"نہیں، بھئی اب آج کل کوٹھی میں جو ماحول پیدا ہو گیا ہے اس کے تحت تو کسی شخص سے کوئی سوال نہیں کیا جا سکتا۔ میرے تمام اُصولوں کی اس طرح دھجیاں بکھیری گئی ہیں کہ اب مجھے اپنا یہ ماحول خود ہی اجنبی محسوس ہونے لگا ہے۔ بارہا... دل چاہا کہ گھر چھوڑ کر اپنے لئے کوئی اور جگہ بنا لوں جہاں کم از کم سکون کے کچھ لمحات تو گزار سکوں لیکن پھر یہ احساس ہوتا ہے کہ جو کچھ میں نے تمام عمر کی ریاضت سے تخلیق کیا ہے۔ کم از کم اُسے اپنی آنکھوں کے سامنے ٹوٹتے ہوئے دیکھوں۔"

"کیا ہو گیا ہے آپ کو۔ خیریت تو ہے کیا بات ہے؟"

"جہاں سے آپ تشریف لا رہی ہیں اس کے بارے میں کچھ بتانا ضروری ہے؟"

"کہاں سے آ رہی ہوں میں کیسی باتیں کر رہے ہیں آپ؟"

"اُس چڑیا گھر سے جسے آپ کے بیٹے نے تخلیق کیا ہے۔ کیا اس گھر میں ایسے لوگوں کی آمد معیوب نہیں سمجھی جائے گی۔ کیا میرے ہم چشم میرا مذاق نہیں اُڑا رہے۔ کیا آپ لوگوں نے... آپ سب نے مل کر مجھے کوڑی کا بنا کر نہیں رکھ دیا ہے؟"

"کہے جائیے۔ کہے جائیے۔ پھر کوئی ایسی بات مزاج کے خلاف ہو گئی ہو گی۔ ارے آپ یہ بتائیں کہ کہیں آپ اس مشاعرے سے تو برگشتہ نہیں ہیں؟"

"مشاعرہ؟ ایسا تو صرف شجاع احمد کی کوٹھی میں ہی ہو سکتا ہے۔ بلکہ شاید اس ملک کی تاریخ میں پہلی بار منعقد کیا گیا ہے جس میں گٹار نواز اُلٹے سیدھے گٹار بجا کر مشاعرے کی مٹی پلید کر رہے تھے۔"

"تو بچوں کا شوق ہے کیوں اس چکر میں پڑتے ہیں۔ آپ تو یہ چاہتے ہیں کہ یہاں ہمیشہ سنجیدگی طاری رہے۔ کوئی زور سے بولے بھی تو آپ اُسے کڑی نگاہوں سے گھورنے لگتے ہیں۔"

"جو کچھ یہ ہو رہا ہے اس کے لئے ایک دن تمھیں سر پکڑ کر رونا ہو گا۔ یہ میری پیشن گوئی ہے۔ میں پہلے بھی کئی بار بتا چکا ہوں۔ میں بدنصیب ہوں کہ اپنے ہی گھر سے میرا اثر و رسوخ اس طرح اُٹھ گیا ہے کہ کچھ کہہ بھی نہیں سکتا۔"

"یہ صرف آپ کا خیال ہے۔ آپ کی انتہا پسندی ہے۔ آپ بچوں کی خوشی میں کبھی دلچسپی نہیں لیتے حالانکہ یہ انسانی فرض ہے۔ بچے جب چھوٹے چھوٹے ہوتے ہیں تو انھیں اپنی مرضی کے مطابق کھلونے کھیلنے کو فراہم کئے جاتے ہیں۔ جب وہ بڑے ہو جاتے ہیں تو انھیں ان کی مرضی دینا مناسب ہوتا ہے۔ وہ اپنے اچھے بُرے کی خود تمیز کر سکے۔"

"چاہے بُرائیوں کا ایک طوفان کیوں نہ گھر میں آ جائے۔"

"کوئی بُرائی نہیں۔ میں بھی اس گھر کی کچھ ہوں۔ میں ان کی ماں ہوں۔ اپنے بچوں پر نگاہ رکھتی ہوں۔ بھلا بتائیے کیا ہے آج تک۔ کیا جُرم کیا ہے میرے کسی بچے نے؟ چاروں طرف آپ دُھوم مچی ہوئی ہے۔ وہ فرسٹ ایڈ ہاؤس کیا تعمیر ہُوا ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے ہمارا گھر کسی وزیرِ اعظم کا دفتر ہو۔ لوگ اپنے اپنے مسائل لے کر آتے ہیں۔ چھوٹے موٹے مسائل جنھیں حل کر کے کتنی خوشی ہوتی ہے۔ آپ کو ان خوشیوں کا اندازہ نہیں ہے بے سہارا اور بے آسرا لوگوں کو جب مدد کی ضرورت ہوتی ہے تو وہ اُمید بھری نگاہوں سے ہمارے گھر کی طرف دیکھتے ہیں یہ کم اعزاز ہے خُدا کا ارے شجاع احمد خُدا کا دیا ہُوا ہی ہوتا ہے جو کسی کو دیا جاتا ہے۔ جب خُدا ہی کسی کو محروم رکھے تو کوئی کسی کو کیا دے سکتا ہے۔ لوگ اس گھر کو عقیدت بھری نگاہوں سے دیکھتے ہیں۔ آپ کو اندازہ نہیں ہے کہ کیسے ٹیلی فون مجھے موصول ہوتے ہیں گھر کے ایک ایک فرد کی اہمیت ہو گئی ہے۔ ذرا بتائیے تو اس حکومت کے کون سے محکمے میں یا پرائیویٹ ادارے میں آپ کا اپنا کوئی کام ہو اور وہ رک جائے۔ سب ہی ہماری بات مانتے ہیں اور یہ سب کچھ آپ کے اپنی بچوں نے کیا ہے۔ سمجھے آپ؟ میں آپا میاں کی بات مانتی ہوں انھوں نے اس سلسلے میں دل کھول کر دلچسپی لی ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ ہی انھیں اس بات پر آمادہ کرنے والا اور ان کے شانہ بشانہ عمل کرنے والا کون ہے؟"

"زاہد ذوالفقار زیدی یا زاہد علی زاہد یا ٹرپل زیڈ" شجاع احمد صاحب نے طنزیہ انداز میں کہا۔

"وہی ایک کا نام کھٹکتا ہے آپ کی نگاہوں میں۔ بتائیے تو سہی کیا نقصان پہنچا ہے اس سے آپ کو؟"

"نقصان؟ تم اسے نقصان کہتی ہو۔ میں تو یہ بات پورے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ اس گھر کا مالک اب میں نہیں ہوں زاہد ذوالفقار زیدی ہے۔"

"کمال ہے۔ کتنی کوٹھیاں بنالی ہیں اس نے آپ کی دولت سے؟ میں تو کہتی ہوں شجاع احمد صاحب خدا کو سامنے رکھا کیجئے۔ کبھی کسی کے پیچھے اس طرح نہ پڑ جایا کریں کہ خدا کو بھی برا لگے۔ اس لڑکے نے اس گھر کے لئے آج تک برا نہیں چاہا۔ وہ اس گھر کے لئے اپنی ہستی مٹائے دے رہا ہے اور آپ ہیں کہ ہمیشہ جب بھی آپ کو موقع ملتا ہے اس کے خلاف کچھ کہنے سے دریغ نہیں کرتے۔"

"تو پھر آپ سن لیجئے بیگم صاحبہ! ایک دن یہ گھر اس شخص کے ہاتھوں ہی فنا ہوگا۔ ایک دن تباہی و بربادی اسی کے ہاتھوں آئے گی یہاں۔ آپ اس بات کو اپنے ذہن میں محفوظ رکھیئے گا۔ میں کچھ بھی نہیں کہوں گا۔ بلکہ بہتر یہ ہوگا کہ اب میں کچھ بھی نہ بولوں۔ میں خود بھی پروگرام بنا رہا ہوں کہ ایک طویل عرصے کے لئے ملک سے باہر چلا جاؤں ممکن ہے میں واپس ہی نہ آؤں۔"

"کیسی باتیں کر رہے ہیں آپ۔ خدا نہ کرے ایسا ہو۔ آپ بتایئے نکال دوں اُسے۔ آپ منع کر دیجئے اس کو اس گھر میں رہنے سے اگر دیجئے آپ منع۔" بیگم صاحبہ آبدیدہ ہوگئیں۔

"ہاں، اب رونے بیٹھ جایئے آپ۔ کوسنے دیجئے مجھے لیکن یہ جو کچھ ہو رہا ہے میرے لئے ناقابل برداشت ہے۔"

"تو ٹھیک ہے میں نہیں بولوں گی آپ کے کسی معاملے میں۔ جایئے آبا میاں سے بات کیجئے۔ جایئے نکال دیجئے اُسے۔ بچوں کو سنبھالنے میں خود کچھ عرصے کے لئے سکون چاہتی ہوں۔ ہر وقت کوئی نہ کوئی جھگڑا کھڑا رہتا ہے اور وہ بھی صرف آپ کی ذات سے۔ بچہ ہے، یہاں سے چلا جائے گا تو کیا فرق پڑ جائے گا۔ ہم سب کو اس سے محبت ہو گئی ہے صبر کرلیں گے لیکن آپ خدا کے لئے یہاں سے کہیں نہ جایئے آپ ہم سب کے دلوں پر پتھر رکھ دیجئے گا۔" بیگم صاحبہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں اور شجاع احمد صاحب پریشان ہوگئے۔

"کچھ کہتا ہوں تو آپ یہ ڈرامہ شروع کر دیتی ہیں۔"

"ہاں ڈرامہ ہی تو شروع کر رہی ہوں۔ ایک بچہ ہے صرف ایک بچہ جو آپ کی آنکھوں میں کھٹکتا ہے۔ آخر کیا بگاڑا ہے اس نے آپ کا؟ ارے کوئی نقصان ہوا ہو اس کے ہاتھوں تو بتایئے تو سہی۔ آپ تو بہت بڑے آدمی ہیں۔ بہت اثر و رسوخ کے مالک ہیں آپ۔ ذرا یہ معلوم کر کے بتا دیجئے کہ اس نے آج تک کتنا بینک بیلنس بنایا ہے کتنا کمایا ہے ہم سے۔ دو روٹی کھا لیتا ہے۔ دو جوڑے کپڑے پہن لیتا ہے تو آپ اس کی جان کے گاہک بن گئے ہیں۔ بچوں کے ساتھ مل کر خوش گپیاں کرتا رہتا ہے تو آپ کو اس کی خوش گپیاں کھٹکتی رہتی ہیں۔ ایک وہی ایسا ہے جو آپ کی نگاہوں میں ملعون و مطعون ہے۔"

"اچھا اچھا بخشو جیسی آپ کی مرضی۔ اب نہیں بولوں گا اس مسئلے میں۔ خدا کی قسم اب نہیں بولوں گا۔" اور اس کے بعد گہری خاموشی طاری ہوگئی۔ کیسٹ ختم ہو گیا تھا۔

"تو یہ تھی تازہ ترین رپورٹ۔"

"زندہ باد جاسوس اعظم یہ رپورٹ تو کچھ ہم سے تعلق رکھتی ہے اس لئے ہم کو آپ کا شکر گزار ہونا چاہیئے۔"

"اگر آپ کہیں تو آپ کا یہ خادم اس سلسلے میں ایک باقاعدہ مہم شروع کرے۔"

"مہم؟" زاہد نے چونک کر پوچھا۔

"جی ہاں مہم! ایک دستخطی مہم، جس میں تمام لوگ اس بات کے لئے اپنی رائے دیں گے کہ زاہد ذوالفقار زیدی اس گھر کے لئے کیا ہے۔ میں تو ایک بات کہتا ہوں زاہد بھائی آبا میاں کو اس سلسلے میں اطلاع ضرور دی جائے اور ڈیڈی کا یہ خیال غلط ثابت کر دیا جائے کہ آپ اس گھر کے لئے نقصان دہ ہیں۔ ہم باقاعدہ الیکشن کراتے ہیں ووٹنگ کرائیں گے آپ کے سلسلے میں کہ زاہد ذوالفقار زیدی کو یہاں رہنا چاہیئے یا آبا میاں کو۔"

"ارے نہیں بھئی اس قسم کا کوئی کام نہ کرنا۔ بات دراصل یہ ہے فیصل میاں کہ یہ چھوٹی چھوٹی باتیں ہمارے پاؤں نہیں اکھاڑ سکتیں۔ ابھی فی الحال جانے دیجئے۔ آپ نے دیکھا نہیں امی جان نے کس طرح ساری بات کو ہموار کر دیا۔"

"وہ کتنی زور زور سے رو رہی تھیں مجھے تو بڑا دکھ ہوا میں نے سوچا میں خود ڈیڈی سے بات کروں گا۔"

"نہیں بیٹے! آپ ایسا کوئی کام نہیں کریں گے جس سے ہمارے لئے مشکلات پیدا ہوں۔ سمجھے آپ؟"

"جی! ٹھیک ہے۔"

"بس اب آرام کرو۔ ہاں یہ بتاؤ جالب صاحب کی کیا پوزیشن چل رہی ہے۔"

"کوئی خاص بات نہیں۔ میرا خیال ہے خاموشی اختیار کر رکھی ہے

انھوں نے آج کل۔"

"مصروف رہو کوئی ایسا پوائنٹ نہ مس ہو جائے جو ہمارے لئے نقصان دہ ہو۔"

"بالکل نہیں ہوگا۔ آپ مطمئن رہیں آپ کا جاسوس کوئی معمولی آدمی نہیں ہے۔"

"ہم جانتے ہیں۔" زاہد نے سینے پر ہاتھ رکھ کر کہا اور فیصل مسکراتا ہوا وہاں سے نکل گیا لیکن زاہد کسی گہری سوچ میں ڈوب گیا تھا۔ تھوڑی دیر اسی طرح گزر گئی اور پھر اس کے ہونٹوں پر ایک بے اختیار مسکراہٹ پھیل گئی۔

❋

شجاع احمد صاحب مصروف ہو گئے تھے۔ کوئی خاص بات نہیں ہوئی تھی ان دنوں میں زاہد حسب معمول اپنے کاموں میں مصروف تھا سرفراز کے لئے اُسے بہت کچھ کرنا تھا۔ اس کے ذہن میں تو ہزاروں منصوبے تھے۔ قدم بہ قدم وہ کامیابی کی منزل طے کرتا چلا جا رہا تھا۔ حالانکہ بہت سے معاملات ایسے تھے کہ ان سب کو قابو کرنا اتنا آسان مرحلہ نہیں تھا لیکن زاہد آہنی انسان تھا۔ اس کا دماغ چاروں طرف سوچتا تھا کسی کو بھی شکایت نہیں ہوتی تھی اس سے فرسٹ ایڈ ہاؤس کچھ اس طرح مقبول ہو گیا تھا کہ ان لوگوں کو خود بھی اس کی توقع نہیں تھی۔ اعلیٰ حکام نے پورا پورا تعاون کیا تھا۔ ہر طرح سے اس کے بارے میں جانچ پڑتال کر لی گئی تھی لیکن کوئی ایسی بات علم میں نہیں آسکی تھی جس سے فرسٹ ایڈ ہاؤس کی نیک نامی میں کوئی فرق آسکتا۔

یہ ادارہ تو انسانی محبت کے جذبے سے اس طرح سرشار تھا کہ دوسرے لوگ اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتے تھے آہستہ آہستہ اس کی مقبولیت بڑھتی چلی جا رہی تھی۔ بہت سے مخیر حضرات نے فرسٹ ایڈ ہاؤس کے لئے ایک باقاعدہ امداد مقرر کر دی تھی۔ ایک غیر ملکی وفد بھی یہاں آیا تھا جس کا تعلق ریڈ کراس سوسائٹی سے تھا اس نے یہاں آکر اس کے بارے میں معلومات حاصل کیں اور اتنے متاثر ہوئے وہ لوگ کہ باقاعدہ اس کی پوری فلم تیار کر کے لے گئے۔

انھوں نے اپنے بھرپور تعاون کا یقین دلایا اور کہا کہ بین الاقوامی طور پر بھی اس ادارے کو مراعات دلوائی جائیں گی۔ تمام تفصیلات اخبارات میں آتی رہتی تھیں۔ روزانہ ہی کوئی نہ کوئی خبر اس کے بارے میں ہوتی اور دادا جان جب بھی یہ خبر پڑھتے تو خوشی سے پھولے نہ سماتے۔ صحیح بات تو یہ تھی کہ اس طرح ان کی زندگی بڑھ گئی تھی ان کی صحت میں اگر کوئی خرابی تھی تو اب ختم ہو گئی تھی کیونکہ ہر لمحہ

مصروف رہتے تھے۔

پورے فرسٹ ایڈ ہاؤس کا ایک دن میں جائزہ لینا تو ناممکن بات تھی لیکن وہ کسی نہ کسی شعبے کا معائنہ کرتے رہتے تھے زاہد اور دوسرے تمام لوگ ان کے معاون اور مددگار تھے اور وہ بڑی کامیابی سے اپنی یہ خدمات انجام دے رہے تھے۔ اس وقت بھی زاہد تنہا ان کے کمرے میں بیٹھا ہوا تھا اور حسام احمد صاحب اس کی صورت دیکھ رہے تھے

"بھئی زاہد میاں! تم فرسٹ ایڈ ہاؤس کی کارکردگی سے بالکل مطمئن ہو؟"

"کیوں نہیں دادا جان! ہم نے جس انداز میں ابتدا کی ہے وہ واقعی بہت عمدہ ہے اور ہماری توقع سے بھی کہیں زیادہ لیکن ہم محدود نہیں ہوں گے دادا جان، ہم آہستہ آہستہ اپنے قدم آگے بڑھاتے رہیں گے۔"

"بے شک، بے شک، جب تک ہم زندہ ہیں اس کے لئے کام کرتے رہیں گے اور ہمارے بعد ایک پورا ادارہ ہوگا جو اس کو سنبھالے گا۔"

"اللہ تعالیٰ آپ کو طویل زندگی عطا فرمائے دادا جان! آپ کی ضرورت اس ادارے کو تمام عمر رہے گی۔"

"شکریہ بیٹے! لیکن پھر بھی بہر طور کسی نہ کسی دن تو موت کا مزہ چکھنا ہی ہے۔" زاہد سنجیدگی سے دادا جان کا چہرہ دیکھنے لگا تھا ایک لمحے کے لئے آنکھوں میں عجیب سے تاثرات نظر آئے لیکن پھر اُس نے خود کو سنبھال لیا۔

"یہ بتایئے دادا جان! ہمارے باقی معاونین کا کیا ہوگا؟"

"ہاں بھئی اس سلسلے میں میں بھی تم سے گفتگو کرنے والا تھا۔ دیکھو زاہد میاں جو کچھ ہم کر رہے تھے اور جن لوگوں کے خلاف کر رہے تھے وہ ہماری اپنی نگاہ میں جائز تھا جن لوگوں کے ذریعے ہمارے اس ادارے کو امداد ملی ہے وہ اس کے مستحق تھے کہ ان سے اس طرح رقم لی جاتی لیکن میں محسوس کرتا رہا ہوں کہ فی الحال فرسٹ ایڈ ہاؤس کو کسی ایسے مسئلے میں رقم کی ضرورت نہیں ہے جو ہمارے لئے بہت اہم ہو اس لئے ان لوگوں کو اگر معاف ہی رکھا جائے تو کیا حرج ہے۔ آئرن ٹاور بے شک اپنا ایک مقام رکھتا ہے اور بے شمار لوگ اس کے نام سے خوفزدہ ہیں لیکن اسے محفوظ رہنے دو جب کبھی اس کی ضرورت پیش آئے گی تو دیکھا جائے گا۔"

"اگر آپ یہ محسوس کرتے ہیں دادا جان تو پھر ٹھیک ہے مجھے اس میں کوئی اعتراض نہیں ہے۔"

"ایک بات ذہن میں بار بار کھٹکتی ہے زاہد!"

"جی داداجان فرمائیے۔"

"دیکھو میاں سرفراز کو تم نے ایک نیک جذبے کے تحت کوٹھی سے نکال دیا ہے۔ میں نہیں جانتا کہ اب اس کے ذرائع آمدنی کیا ہیں۔ ظاہر ہے شجاع احمد سے جو کچھ ملتا تھا وہ تو ختم ہو گیا ہوگا۔ اب وہ کس طرح گزر بسر کرے گا۔ جو کچھ اس کے لئے ہم نے کیا ہے وہ تو نہ ہونے کے برابر ہے اس کی خدمات کے صلے میں، لیکن بہرطور تم نے کچھ نہ کچھ اس کے بارے میں سوچا ہوگا؟"

"ہاں داداجان! وہ مطمئن ہے۔ بہت جلد میں اس کی تصویروں کی ایک نمائش کرنے والا ہوں اور اس نمائش میں اس کی تصاویر بھی فروخت کی جائیں گی اور اس طرح اسے مالی سہارا حاصل ہو جائے گا اس کے بعد ہم اس کے لئے کچھ اور سوچیں گے۔"

"دوسروں ہی کے لئے سوچتے رہو گے زاہد میاں کہ اپنے بارے میں بھی کچھ سوچو گے اصل بات میں یہ کہنا چاہتا تھا۔"

"میں اپنے بارے میں کیا سوچوں گا داداجان؟ خدا کے فضل سے سب کچھ تو مجھے حاصل ہے۔"

"نہیں زاہد! میرا ذہن اکثر اس سلسلے میں اُلجھا رہتا ہے۔"

"ارے، ارے داداجان! آپ میرے لئے کیوں اُلجھ رہے ہیں کوئی بات اگر آپ کے ذہن میں ہو تو مجھ سے پوچھ لیا کریں۔ اُلجھنے کی کیا ضرورت ہے۔"

"بھئی! تم جو کچھ کر رہے ہو وہ تمہارا اپنا فرض، احساس، محبت یا جو کچھ بھی تم تصور کر لو ہے لیکن ہم تو اندھے نہیں، میں کیا تم اس طرح زندگی گزار دو گے۔"

"داداجان! میری زندگی اسی طرح گزر جانے دیں تو بہتر ہے۔"

"نہیں بیٹے! جب ہمیں بزرگ کہہ دیا ہے تو بزرگانہ حقوق بھی دے دو۔"

"آپ کو تمام حقوق حاصل ہیں داداجان۔ مجھے حکم دیں کہ مجھے کیا کرنا چاہیئے؟"

"اپنے بارے میں کچھ سوچو۔ مجھے مشورہ دو میں چاہتا ہوں کہ تمہارا ابھی ایک الگ گھر ہو۔ شجاع احمد کی کوٹھی میں تمہارے لئے جو گنجائش ہے اس سے میں مطمئن ہوں بچے تم یہ جان چھڑکتے ہیں لیکن میں یہ بھی جانتا ہوں کہ شجاع احمد اچھی نگاہوں سے نہیں دیکھتا۔ میں تمہارا وقار مجروح ہوتے نہیں دیکھ سکتا۔"

"کوئی بات ہوئی ہے آپ سے داداجان؟"

"نہیں میاں! وہ مردود مجھ سے کیا بات کرے گا۔ مجھے اس سے صرف ایک ہی شکایت ہے۔ وہ یہ کہ وہ تم سے دشمنی کیوں رکھتا ہے۔ تمہیں بھائی کی حیثیت سے تسلیم کیوں نہیں کرتا۔ تمہیں اپنا بیٹا کیوں نہیں مان لیتا۔"

"نہ سہی داداجان آپ تو ہیں۔ مجھے کسی چیز کی کمی رہنے دی ہے آپ نے؟"

"ہاں بیٹے! ٹھیک ہے مگر میں چاہتا ہوں کہ تمہارا گھر بھی آباد کر دوں۔"

"کک کیا؟" زاہد نے خوفزدہ لہجے میں سوال کیا تھا۔

"ہاں شادی کر دوں تمہاری، تمہارے بچوں کو بھی اس طرح پروان چڑھاؤں جس طرح میں نے شجاع احمد کے بچوں کو گود میں کھلا کھلا کر جوان کیا ہے۔"

"داداجان! کیا میں شرما جاؤں؟" زاہد نے سوال کیا۔

"نہیں! پڑھے لکھے اور سنجیدہ آدمیوں کی طرح مجھ سے اس موضوع پر بات کرو۔"

"آپ میری بات مان لیں گے داداجان!"

"ہاں مان لوں گا وعدہ۔"

"تو پھر میری آپ سے ایک درخواست ہے میں آپ کے حکم سے انحراف نہیں کروں گا لیکن مجھے ابھی اس کے لئے کچھ وقت درکار ہے۔ ابھی جلدی نہ کریں داداجان وعدہ کرتا ہوں کہ جس دن اپنی ہنگامہ آرائیوں سے تھک کر سکون کی آغوش میں سانس لینے کے بارے میں سوچوں گا تو سب سے پہلے اس کا اظہار آپ سے کروں گا۔"

"دیکھو بھئی یہ غلط بات ہے۔ کم از کم اس معاملے میں تو مجھے کچھ کرنے دو۔"

"داداجان! میرے تمام منصوبے خاک میں مل جائیں گے۔ میں ابھی اس قابل نہیں ہوا ہوں۔"

"کتنا وقت چاہتے ہو؟"

"بہت مختصر وقت داداجان! تھوڑے عرصے کے بعد میں اپنے آپ کو آپ کے حوالے کر دوں گا۔"

"چلو ٹھیک ہے تو پھر یہ بات طے ہے کہ تم ایک دن خود ہی مجھ سے اس کا اظہار کرو گے۔"

"وعدہ داداجان! آپ کے علاوہ اس سے پہلے یہ بات کسی سے نہیں کہوں گا۔" زاہد نے جواب دیا۔ داداجان کی اس گفتگو سے وہ کچھ بوکھلایا ہوا سا نظر آرہا تھا۔ بہرطور تھوڑی دیر کے بعد وہ اپنی جگہ سے اُٹھ گیا باہر نکلا ہی تھا کہ ایک اردلی نے اسے کسی مہمان کی آمد کی اطلاع دی۔

"یہ کون ہے، کہاں ہے؟"

"جی! باہر ویٹنگ ہال میں موجود ہیں کوئی خاتون ہیں۔"

"نام بتایا؟"

"نہیں جناب! آپ کا نام لے کر کہنے لگیں کہ زاہد صاحب سے ملنا چاہتی ہوں۔" زاہد نے گردن ہلائی اور ویٹنگ ہال کی جانب بڑھ گیا۔ شاندار ویٹنگ ہال میں مختلف کیبن بنے ہوئے تھے۔ ایک بڑا ہال بھی تھا۔ خواتین کو کیبن میں بٹھایا جاتا تھا۔ اردلی نے کیبن نمبر پانچ کی طرف اشارہ کر دیا اور زاہد کیبن کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گیا۔ اندر بیٹھی ہوئی خاتون پر اس کی نگاہ پڑی اور ایک لمحے کے لئے اس کا ذہن جھنجنا کر رہ گیا۔ وہ ٹھٹکا لیکن پھر خود کو سنبھال کر آگے بڑھ گیا۔

"ہیلو! میرا نام زاہد ہے۔" اُس نے کہا اور لڑکی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

"مجھے نشاط کہتے ہیں۔" اس نے جواب دیا۔

"فرمائیے خاتون! آپ کی کیا مدد کی جا سکتی ہے۔" زاہد کا دل و دماغ تو تہہ و بالا ہو گیا تھا لیکن وہ ڈھٹائی پر اتر آیا تھا۔ وہ نشاط سے تھوڑے ہی فاصلے پر اس کے سامنے بیٹھ گیا۔

"یہ عجیب و غریب دُنیا تخلیق کی ہے آپ نے زاہد صاحب! فرسٹ ایڈ ہاؤس کے بارے میں کافی دن سے معلومات حاصل کر رہی ہوں۔ آپ کے بارے میں بھی بہت کچھ معلوم کر چکی ہوں۔ سحر صدیقی نے اس سلسلے میں میری مدد کی ہے۔ بہر طور، آپ کی شخصیت نے مجھے بہت متاثر کیا۔ خاص طور سے یہ جان کر کہ... فرسٹ ایڈ ہاؤس کے روحِ رواں آپ ہی ہیں۔ بڑی مسرت ہوئی۔ پتہ نہیں کون سے جذبوں کو آپ نے اس عمارت کی شکل میں پروان چڑھایا ہے۔"

"بہت بہت شکریہ آپ کا۔ ویسے فرسٹ ایڈ ہاؤس کے روحِ رواں کے طور پر آپ کو میرا نام غلط بتایا گیا ہے۔ وہ دراصل حسام احمد صاحب... ؟"

"ہاں ہاں! میں نے دادا جان کا نام بھی سُنا ہے اس سلسلے میں لیکن بات بہت دُور تک پہنچ گئی ہے۔ شاید آپ کو یہ علم ہو کہ بات میرے علم میں اُس وقت تک کی آ چکی ہے جب آپ اس کوٹھی میں داخل ہوئے تھے۔"

"اوہ... اس چھان بین کی کوئی خاص وجہ ہے؟" زاہد کے لہجے میں کچھ تبدیلی پیدا ہو گئی تھی۔

"جی ہاں! بہت خاص وجہ۔ بات یہ ہے کہ میری ایک عزیز ترین شخصیت گم ہو گئی ہیں اس کی تلاش میں سرگرداں تھی۔ بہت عرصے کے بعد میں نے اُسے آپ کی شکل میں دیکھا۔ اب ظاہر ہے کہ اپنے کسی اتنے قریبی دوست عزیز کی شکل میں کوئی نظر آئے تو اس سے ذہنی قربت تو ہو ہی جاتی ہے۔"

"خوب! کون تھا وہ؟" زاہد نے سوال کیا۔

"ظفر تھا اس کا نام اور کچھ ایسی شخصیتوں سے وابستہ تھا وہ کہ میں اس کے وجود کی اہمیت سے انکار نہیں کر سکتی۔"

"انتقال ہو گیا اس کا؟" زاہد نے پوچھا۔

"آپ کا یہ بے رحم لہجہ اور الفاظ کسی اور جذبے کے غماز ہیں۔" نشاط نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"نشاط صاحبہ! میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟"

"ظفر کو تلاش کرنے میں، میں آپ کی مدد چاہتی ہوں۔"

"فرسٹ ایڈ ہاؤس میں یہ شعبہ ابھی تک نہیں کھلا لیکن اگر آپ اپنا مافی الضمیر حسام احمد صاحب یا متعلقہ افراد تک پہنچا دیں تو شاید وہ اس سلسلے میں آپ کی مدد کر سکیں۔" زاہد کا لہجہ خشک تھا۔

"آپ نے یہ نہیں سوچا زاہد صاحب کہ آپ ہی کا انتخاب میں نے کیوں کیا اس سلسلے میں؟" نشاط سنجیدگی سے بولی۔

"ممکن ہے آپ سے انتخاب میں غلطی ہوئی ہو۔"

"نہیں میں ہر کام مکمل اعتماد کے ساتھ کرتی ہوں۔"

"اس کے باوجود ظفر صاحب کی تلاش میں ہیں۔ میں آپ کی کیا مدد کر سکتا ہوں؟"

"آپ کے علاوہ اور کون مدد کر سکتا ہے میری۔" نشاط نے کہا اور پھر پُرجوش لہجے میں بولی۔

"دیکھئے زاہد صاحب! میں ذرا مختلف قسم کی لڑکی ہوں۔ بعض اوقات انسان کو وہ مضحکہ خیز حرکتیں کرنی پڑتی ہیں جو اسے خود ہی پسند نہیں ہوتیں لیکن کم از کم ایسی حرکات اسے مطمئن نہیں کرتیں۔ میں اپنے بارے میں کہہ رہی ہوں۔ جو کچھ کہنا چاہتی ہوں کھل کر کہنے کی اجازت دے دیں مجھے تو میں فضول باتوں سے گریز کروں۔"

"جی، جی فرمائیے۔ مجھے آپ کی باتوں پر کوئی اعتراض نہیں ہو گا۔" زاہد نے کہا۔

"نام کیوں تبدیل کر دیا آپ نے؟" نشاط نے پوچھا۔

"ضرورتاً۔ مجھے اپنی زندگی کے لئے کوئی بہتر سہارا تلاش کرنا ہی تھا۔"

"شمشیر زمان کے پورے خاندان سے شکایت ہے آپ کو؟"

"ان باتوں کو اب کیوں کُرید رہی ہیں نشاط صاحبہ؟"

زاہد نے سوال کیا۔

"اس لئے کہ اس گھرانے میں کوئی ایسی شخصیت بھی پیدا ہو سکتی ہے جو اس گھر کے مزاج سے مطابقت نہ رکھتی ہو۔ اگر آپ کو اس بات سے اختلاف ہے تو آپ شمشیر زمان کے بارے میں کیا کہیں گے؟"

"وہ عظیم انسان تھے اور ان کی عظمت میرے سینے کی گہرائیوں میں موجود ہے۔"

"کیا ان سے منسوب اور کوئی بھی نام آپ کے دل کی سطح کو نہیں چھو سکا؟"

"نشاط صاحبہ! ابھی آپ نے فرمایا تھا کہ آپ سادہ زبان میں گفتگو کریں گی۔ بات پھر اُلجھ رہی ہے۔"

"ٹھیک ہے میں اپنی زبان میں مزید سادگی پیدا کئے لیتی ہوں میں اپنے گھر والوں کے اس سلوک کی آپ سے معافی مانگنا چاہتی ہوں جو انھوں نے آپ کی والدہ اور آپ کے ساتھ کیا تھا۔ میرا ضمیر کبھی مطمئن نہیں رہا ان تمام با سے میری بدقسمتی تھی کہ آپ اس وقت کوٹھی میں آئے جب میں خود بھی وہاں موجود تھی اگر میں وہاں نہ ہوتی زاہد صاحب تو شاید میں ان حالات سے کبھی واقف نہ ہوتی اور شاید میں اس بات کو اتنی سنجیدگی سے محسوس بھی نہ کرتی۔ میں آپ سے یہ نہیں کہوں گی کہ آپ کے وہاں سے چلے آنے کے بعد میری راتوں کی نیندیں حرام ہو گئیں۔ نہیں ہرگز نہیں ایسا بالکل نہیں ہوا لیکن میں نے جب بھی آپ کے بارے میں سوچا دل میں ایک کسک سی محسوس کی۔ میں نے آپ کے بارے میں تمام معلومات حاصل کیں۔ مجھے علم ہو گیا کہ آپ لوگوں کے ساتھ میرے ... خاندان نے اور خاص طور سے میری ماں نے کیا سلوک کیا ہے میں نے اپنی آنکھوں سے اُن کا رویہ آپ کے ساتھ دیکھا اور جب تمام تر صورتحال میرے علم میں آئی تو آپ یقین کیجئے کہ مجھے شدید شرمندگی و افسوس ہوا۔ میرے دل میں اس وقت ایک آرزو بیدار ہوئی کہ کاش کسی طرح آپ لوگ مجھے مل جائیں تو میں آپ سے معافی مانگوں اپنے گھر والوں کے رویے کی، اُن تمام مظالم کی معافی مانگوں جو آپ پر توڑے گئے۔"

"گزری ہوئی باتوں کو جانے دیجئے نشاط صاحبہ! مجھے بہت کچھ مل گیا ہے۔ نواب شمشیر زمان نے مجھ پر جو احسانات کئے تھے وہ میں اپنی ذات پر قرض سمجھتا ہوں اور ان کی ادائیگی کے لئے میرے سینے میں ہمیشہ ایک جذبہ رہا ہے۔ جب مجھے یہاں آکر معلوم ہوا کہ میری ماں کے ساتھ ایسا وحشیانہ سلوک روا رکھا گیا ہے تو آپ یقین کیجئے کہ میں وقتی طور پر دیوانہ ہو گیا تھا۔ مجھے اس دیوانگی کے عالم میں نہ جانے کتنی وحشتوں سے گزرنا پڑا کہ خوش قسمتی سے میری ماں مجھے مل گئی۔"

"مل گئیں؟" نشاط کے لہجے میں مسرت چھپی ہوئی تھی۔

"ہاں میری ماں مجھے مل گئیں۔ بابا کرم دین نے ان تمام باظرف لوگوں سے زیادہ ظرف کا ثبوت دیا تھا جنھوں نے میری ماں کو دربدر کر کے دُنیا کی ٹھوکریں کھانے کے لئے چھوڑ دیا تھا۔ بابا کرم دین اس وقت اس بے سہارا عورت کو لے کر اپنی جھونپڑی میں پہنچ گئے جب اس کا کوئی سہارا نہیں رہا تھا اور پھر بابا کرم دین نے میری ماں کو اپنی بیٹی بنا کر اس کا بوجھ سنبھال لیا جب میں وہاں پہنچا اور ہم ماں اور بیٹا ملے تو میری ماں نے سب سے پہلے جو بات کہی وہ یہ تھی کہ نواب شمشیر زمان کے گھر کو ایک مقدس گھر کی حیثیت دی جائے۔ اس کے کسی فرد کے بارے میں کبھی کسی بُرے انداز میں نہ سوچا جائے۔"

"مم... ماں... ماں نے کہا" نشاط کے لہجے میں اچنبھا تھا۔

"ہاں نشاط صاحبہ! میری ماں شدتِ جذبات سے بول اٹھیں ان کی قوتِ گویائی واپس آ گئی۔"

"میرے خُدا! کتنی حیرت انگیز بات ہے یہ زاہد احمد صاحب بلکہ ظفر۔ دُنیا آپ کو کچھ بھی کہے میں آپ کو ظفر ہی کہوں گی۔ ظفر خُدا کی قسم میں ایک غیر متعلق انسان ہوں۔ میں تو اپنے آپ کو آپ سے منسوب بھی نہیں کہہ سکتی۔ اس لئے کہ بچپن سے ہی آپ ہم سے اتنی دُور چلے گئے تھے اور ہمارے اور آپ کے درمیان وہ ربط و رشتہ نہ رہا۔ جو بچپن کے رشتے کہلاتے ہیں لیکن اس کے باوجود میں آپ کو اپنی مسرتوں کا یقین نہیں دلا سکتی۔ ان ساری باتوں سے مجھے جتنی خوشی ہوئی ہے میں بیان نہیں کر سکتی۔"

"نشاط صاحبہ! آپ بھی تو اس وقت وہاں موجود تھیں جب میں آپ کی کوٹھی میں پہلی بار داخل ہوا تھا اور بیگم صاحبہ نے جو سلوک میرے ساتھ کیا تھا وہ آپ نے بھی دیکھا تھا۔"

"ہاں! اور میں اس بات پر تاحیات شرمندہ ہوں گی اس لئے نہیں زاہد صاحب کہ اب آپ ایک اور شخصیت میں میرے سامنے آئے ہیں بلکہ اس لئے کہ یہ سب کچھ آپ کے ساتھ میری کوٹھی میں ہوا تھا۔ کاش یہ سب کچھ نہ ہوتا۔ کاش یہ نہ ہوتا!"

"بہرطور نشاط صاحبہ! میں آپ سے صرف ایک ہی عنایت کا متمنی ہوں۔"

"کہئے، فرمائیے!"

"میری اس شخصیت کو صیغۂ راز میں رہنے دیں۔ یہ میری درخواست ہے آپ سے۔ آپ جب مجھے صدیقی صاحب کے گھر پہ نظر آئی تھیں

تو میں نے سوچا تھا کہ یہ میری کاوشوں کا اختتام ہے۔ میری شخصیت کھول دی جائے گی۔ مجھے آپ سے کسی بہتر سلوک کی توقع نہیں تھی معاف کیجئے گا ممکن ہے میرے یہ الفاظ تلخ ہوں اور آپ کے ذہن پر گراں گزرے ہوں لیکن حقیقت یہی ہے نشاط صاحبہ! اس دن سے آج تک میں خوف کا شکار رہا ہوں۔ اس خوف کا کہ کب یہ لوگ یہاں سے مجھے یہ کہہ کر نکالتے ہیں کہ میں دھوکے باز ہوں۔ میں نے غلط طریقوں سے یہاں اپنے لئے مراعات حاصل کی ہیں۔"

"صاف صاف باتوں کی ہو رہی ہے ظفر صاحب تو پھر میں بھی یہ کہنے میں عار نہیں محسوس کروں گی کہ آپ کو دیکھ کر میرے ذہن کو شدید دھچکا لگا تھا۔ اگر آپ ظفر ہی کے نام سے یہاں پکارے جا رہے ہوتے تو یہ خاص بات نہیں ہوتی لیکن نام بدل لینے کی وجہ نہ اس وقت میری سمجھ میں آئی تھی نہ آج!"

"اگر ہمارے درمیان واقعی مخلصانہ جذبات پروان چڑھے تو میں آپ کو اس کی وجہ بتا دوں گا نشاط صاحبہ لیکن مجھے یقین ہے کہ آپ سطحی لڑکیوں کی طرح فوراً ہی اس انکشاف پر مصر نہیں ہو جائیں گی۔"

"کبھی نہیں ہوں گی۔ اس لئے کہ میں کبھی ایسا کام نہیں کرنا چاہتی جس سے آپ کی ذات کو تکلیف پہنچے۔ آپ یقین کیجئے ظفر کہ میں آپ سے کبھی نہ ملتی اگر آپ کے بارے میں مجھے وہ تمام تفصیلات معلوم ہو جاتیں جو میں معلوم کرنا چاہتی تھی۔ میں کس منہ سے آپ کے پاس آتی میں تو خود شرمندگی کا شکار تھی۔"

"نشاط صاحبہ! میں زیادہ اچھا انسان نہیں ہوں۔ یوں بھی میرا ماضی آپ کے سامنے ہے۔ تقدیر نے جن راستوں پر لا ڈالا تھا وہ ایسے نہیں تھے جو مجھے کوئی مناسب حیثیت دیتے لیکن یہ بات بھی میرے علم میں آچکی ہے کہ نواب شمشیر زمان صاحب نے ایک بیٹے کی حیثیت دی مجھے ان تمام مراعات سے نوازا جو صرف ایک باپ ہی اپنے بیٹے کو دے سکتا ہے۔ بڑی آرزوئیں لے کر آیا تھا اس دُنیا میں کیونکہ اس سے پہلے مجھے حالات کا علم نہیں تھا لیکن بعد میں جو کچھ مجھے معلوم ہوا اس نے مجھے توڑ کر رکھ دیا۔ اس کے بعد میری زندگی کا ایک مشن تخلیق ہوا نشاط صاحبہ! میں ایک عام انسان کی طرح اپنی ماں کے مل جانے کے بعد کسی پُرسکون گوشے کو اپنا سکتا تھا۔ ایک ایسی زندگی کا آغاز کر سکتا تھا جو مجھ جیسے انسان کو کرنی چاہئے تھی لیکن بس یوں سمجھئے کہ فطرت میں طوفانی کیفیت شامل ہے۔ ذہن و دل کا یہ طوفان پتہ نہیں مجھے کون کون سے راستوں پر لے جاتا۔ میں اس طوفان کی طغیانی کو سرد کر رہا ہوں۔ اپنے آپ کو ایسے راستوں پر لا رہا ہوں جو.....

مجھے غلط زندگی اپنانے سے روک سکتے ہیں چنانچہ یہی سب کچھ کر رہا ہوں۔ اس سلسلے میں ایک بات کا اور یقین دلا دوں جو میں ضروری سمجھتا ہوں۔ وہ یہ کہ میں جس خاندان میں شامل ہوں اس کے لئے میں کوئی ایسا کام نہیں کر رہا جو میری وجہ سے تباہی کا باعث بنے۔ ہاں کچھ ایسی باتیں شاید آپ کو نظر آجائیں جو آپ کے لئے تعجب خیز ضرور ہوں۔ اُن کا ایک مقصد ہے میرے ذہن میں چنانچہ!"

"ارے نہیں ظفر! یہ آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں مجھے آپ کی ذات پر یقین ہے کہ آپ نیک نفس انسان ہیں ورنہ ایسا نہ ہوتا تو آپ شمشیر زمان کے خاندان کے خلاف کچھ نہ کچھ ضرور کرتے اپنی ماں کا انتقام لینے کی کوشش ضرور کرتے۔"

"میں اس بات سے انحراف نہیں کروں گا نشاط صاحبہ بلکہ میں پہلے اس سلسلے میں آپ کو بتا چکا ہوں کہ جب میں اس کوٹھی سے چلا اور میری ماں کا مجھے پتہ نہ چل سکا تو میرے ذہن میں شدید انتقام کی آگ بھڑکنے لگی تھی لیکن یہ آگ میری ماں کی آواز نے سرد کر دی۔ اور اب مجھے شمشیر زمان کے خاندان سے کوئی شکایت نہیں ہے بیگم صاحبہ میری مراد بیگم مہرالنساء سے ہے ہمارے لئے زیادہ اچھے جذبات نہیں رکھتی تھیں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ میری ماں کی خاموشی نے انہیں بدگمانیوں کا شکار بنا دیا، میں ایک عورت کو اس سلسلے میں حق بجانب سمجھتا ہوں۔ خاص طور سے ایک ایسی خاتون کو جنہوں نے اپنی زندگی میں صرف ایک حویلی کا ماحول دیکھا ہوا اور دُنیا کی دوسری باتوں سے ناواقف ہوں. . ."

"ہاں! ہماری یہ ناواقفیت ابو کی غیر موجودگی میں ہمیں پریشان کر رہی ہے۔"

"کیا مطلب؟"

"کچھ نہیں! میں آپ کو اس سلسلے میں کچھ نہیں بتاؤں گی میرا حق بھی کیا بنتا ہے آپ پر۔ کس منہ سے آپ کو اپنی تکلیفوں میں شامل کر سکتی ہوں۔" نشاط نے کہا اور ظفر کے ہونٹوں پر ایکدم مسکراہٹ پھیل گئی۔

"ذرا چہرہ اِدھر کیجئے۔" اس نے کہا اور نشاط چونک کر اُسے دیکھنے لگی۔ "میں آپ کا منہ دیکھ رہا ہوں۔ آپ اسی منہ سے مجھے اپنی الجھنوں میں شریک کیجئے۔"

"نہیں ظفر! میں واقعی بے شرمندہ ہوں میری امی نے جو کچھ آپ لوگوں کے ساتھ کیا اور ایک طویل عرصے تک کیا اس کا کوئی بدل نہیں ہے میرے پاس۔ میں تو آپ سے ملنے کی بھی جرأت نہ کر سکتی لیکن بس دل چاہا کہ آپ سے مل ہی لوں۔ کم از کم ذرا سا ذہن کو سکون

تو مل جائے؟"

"تو اب مل گیا آپ کو ذہنی سکون؟" زاہد نے سوال کیا۔

"ہاں! مجھے آپ کی ذات پر مکمل اعتماد ہے۔ بس یونہی بہت سی باتیں میرے ذہن میں مچل رہی تھیں پھر آپ سے ان تمام باتوں کی معافی بھی مانگنی تھی۔ اس لئے کافی کشمکش کے بعد یہاں چلی آئی مجھے تو پہلے ہی دن آپ کے پاس پہنچنا چاہئے تھا لیکن بتا چکی ہوں کہ جرأت نہیں کر پائی تھی اس کی۔"

"کمال ہے اور میں بلاوجہ ہولتا رہا؟"

"کیوں آپ کیوں ہول رہے تھے؟"

"بھئی بتا چکا ہوں کہ زاہد کے نام سے یہاں رہ رہا ہوں زاہد... ذوالفقار زیدی، ان تین ناموں سے یہاں پر میں نے اپنا تسلط قائم کیا ہے اور شاید آپ کو یہ بات سن کر ہنسی آئے کہ میں یہاں بھی کچھ لوگوں کے لئے دردِ سر بنا ہوں۔"

"دردِ سر؟"

"ہاں دردِ سر۔"

"مگر، میرے علم میں تو ایسی کوئی بات نہیں آئی ہے ظفر صاحب۔"

"شجاع احمد صاحب سے آپ کی ملاقات نہیں ہوئی ہے نا؟"

"شجاع احمد صاحب سے تو واقعی ملاقات نہیں ہوئی لیکن سحر سے اس گھرانے کے بارے میں معلومات معلوم ہوتی رہتی ہیں اور ہاں! میں سرفراز صاحب کے بارے میں بھی آپ سے مزید پوچھوں گی لیکن بعد میں پہلے یہ بتائیے کہ شجاع احمد صاحب کا حوالہ آپ نے کیوں دیا تھا؟"

"وہ دردِ سری کی بات جو میں نے کی تھی نا وہ شجاع احمد صاحب ہی کے لئے تھی۔ وہ مجھے اپنے گھر میں اپنے لئے ایک بہت بڑی مصیبت سمجھتے ہیں۔"

"وجہ؟"

"وجہ کچھ نہیں۔ بس اس گھر کے لوگوں کے رجحانات دیکھتے ہوئے یہ اندازہ ہوا کہ انھیں پیسا جا رہا ہے اور وہ اپنی خواہشات کی تکمیل نہیں کر سکتے۔ جو ان کے سینوں میں دفن ہیں۔ میں نے بس انھیں ایک ذرا سی ہمت دلائی ہے اور انھیں ان کا صحیح مقام سمجھا دیا ہے۔"

"بہت سی باتیں سنی ہیں میں نے بڑا کرید کرید کر پوچھا ہے سحر سے آپ کے بارے میں، سنا ہے اس کوٹھی میں بھانت بھانت کے لوگ رہتے ہیں۔ کوئی مصور ہے تو کوئی موسیقار۔"

"ہاں! وہ سب اپنی ذات کی تسکین حاصل کرنے کے لئے میرے سہارے آگے بڑھ رہے ہیں۔"

"آپ نے کچھ تجریدی تصاویر کی نمائش بھی کرائی تھی جس میں سے ایک تصویر سحر نے خریدی ہے۔"

"ہاں! آپ نے دیکھا اسے؟"

"ہاں! آبرو نام ہے اس کا لیکن ایک بات عرض کروں آپ سے زاہد صاحب یا ظفر صاحب سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ کو کون سے نام سے مخاطب کروں۔"

"بہتر تو یہ ہوگا کہ آپ ظفر کو کچھ عرصہ کے لئے بھول جائیں اور زاہد کو یاد رکھیں۔ یہ زاہد کے حق میں بہتر ہوگا۔"

"چلئے ٹھیک ہے آج سے میں آپ کو زاہد ہی کہا کروں گی اور ویسے بھی میں واحد شخصیت ہوں جو فی الحال آپ کو ظفر کے نام سے جانتی ہے۔"

"بے شک، بے شک کم از کم یہاں کی حد تک۔"

"اس تصویر کے بارے میں، میں آپ سے کچھ معلوم کرنا چاہتی ہوں زاہد صاحب!"

"کیا؟" زاہد نے سوال کیا۔

"وہ کیا ہے اس میں آبرو تو کہیں نظر نہیں آتی مجھے۔"

"تجریدی آرٹ ہے سمجھنے میں ذرا دقت ہوتی ہے۔"

"آپ نے سمجھا اسے؟" نشاط نے پوچھا۔

"میں کیا اور میری بساط کیا، بڑے بڑے مصنفین نے اس پر مقالے لکھے ہیں۔"

"ہاں مجھے حیرت ہے حالانکہ مجھے فن مصوری سے کسی قسم کی کوئی واقفیت نہیں لیکن وہ تصویر مجھے سر سے پاؤں تک سمجھ ہی میں نہیں آئی ہے۔"

"نہ... نہ ایسا نہ کہئے نشاط صاحبہ وہ ایک معصوم لڑکی کی آرزوؤں کی تکمیل ہے۔ بڑی محنت سے بنایا ہے اس نے اسے۔"

"زاہد بہت سی باتیں کرنا چاہتی ہوں آپ سے۔ پتہ نہیں میرے بارے میں آپ کیا سوچیں لیکن کچھ بھی سوچتے رہیں مجھے اس کی فکر نہیں ہے۔ بس مجھے اس بات کا اندازہ ہو گیا ہے کہ آپ کی شخصیت میں کوئی گھناؤنا پن نہیں ہے۔ آپ صاف ستھری طبیعت کے مالک ہیں۔ چنانچہ میں آپ سے زبردستی بے تکلف ہونے کی کوشش کر رہی ہوں۔" نشاط نے کہا۔

"نہیں نشاط! آپ ایک ایسے شخص کی بیٹی ہیں جس کے احسانات تلے میرا رواں رواں دبا ہوا ہے۔ مجھے تو یہی مسرت ہے کہ میری ماں نے مجھے نواب صاحب کے بارے میں سب کچھ بتا دیا تھا اگر وہ مسلسل

گونگی رہتیں اور مجھے کچھ پتہ نہ چلتا تو نہ جانے میرے تاثرات کیا ہوتے؟
خیر چھوڑیئے ان باتوں کو۔ مجھے یہ بتایئے امی کہاں ہیں آپ کی؟"
"نشاط! اتنی جلدی یہ سب کچھ معلوم کر لینا چاہتی ہیں؟"
"میں آپ کو اپنے بارے میں کوئی یقین نہیں دلا سکتی۔ کوئی بھروسہ نہیں دلا سکتی آپ کو۔ لیکن التجا تو کر سکتی ہوں، کم از کم اس وقت تک مجھے برا نہ سمجھئے، جب تک میری ذات سے کوئی برائی آپ کو محسوس نہ ہو جائے۔"
"امی یہیں ہیں؟"
"کہاں؟ اسی شہر میں۔"
"ہاں!"
"اور کرم دین بابا؟"
"وہ بھی یہیں ہیں۔"
"اور چھیمو؟"
"وہ بھی امی کے ساتھ ہی ہے۔"
"آہ کیسے لوگ ہیں جو میری نگاہوں سے دور ہیں۔ میں ان سے ملنا چاہتی ہوں زاہد صاحب آپ میری یہ خواہش پوری کر سکتے ہیں؟"
"ابھی نہیں۔" زاہد نے جواب دیا اور نشاط اداس سی نگاہوں سے اُسے دیکھنے لگی۔ اس کی آنکھوں میں شکایت تھی کرب تھا جیسے کہنا چاہتی ہو کہ مجھ پر اعتبار کیوں نہیں کر رہے، میں تو وہ نہیں ہوں۔ میں نے تو اس وقت بھی تمہارے لئے کرب محسوس کیا تھا جب میری ماں نے تمہارے لئے سخت سُست الفاظ کہے تھے اور تمہاری بے عزتی کی تھی... لیکن وہ یہ تمام الفاظ زاہد سے نہیں کہہ سکتی تھی۔ چنانچہ گہری سانس لے کر بولی۔
"کیا میں اس کی امید رکھوں کہ کبھی آپ مجھ پر یقین کر لیں گے؟"
زاہد نے عجیب سی نگاہوں سے اُسے دیکھا۔ دیکھتا رہا پھر بولا۔
"نشاط مجھے افسوس ہے کہ میں نے آپ کو اتنے سرد لہجے میں منع کر دیا معافی چاہتا ہوں آپ سے لیکن آپ مجھے ایک دو دن کا موقع دیں۔"
"کیا واقعی ایک دو دن میں آپ مجھے ان سے ملا دیں گے؟" نشاط نے بچوں کی سی مسرت کے ساتھ پوچھا۔
"ہاں! ویسے آپ کا قیام کہاں ہے؟"
"ہوسٹل میں رہتی ہوں۔ ویسے ہمارے گھر کے حالات بھی بڑے پریشان کن ہو گئے ہیں۔ مجھے اپنی والدہ کے خط ملتے رہتے ہیں، ہمارے رشتے کے خالو ہیں توقیر صاحب، بس عجیب و غریب شخصیت کے مالک ہیں۔ کچھ دن پہلے ہی انھوں نے اچھا خاصا دباؤ ڈالنے کی کوشش کی تھی ہم پر، دو لفنگے قسم کے لڑکے ہیں ان کے، رفیق اور شفیق جن کے ذریعے وہ ہمیں بلیک میل کرنا چاہتے تھے، یہ تصورے کرائے تھے کہ میری کسی بہن کی شادی ان لوگوں کے ساتھ کر دی جائے گی اور اس طرح ہماری بچی کچی جائیداد ہڑپ کرنے کے منصوبے بنائے گئے تھے وقتی طور پر تو یہ منصوبے ناکام ہو گئے اور اُن لوگوں کو بڑی سراسیمگی کے عالم میں بھاگنا پڑا لیکن وہ اب بھی اپنی ریشہ دوانیوں میں مصروف ہیں اور ہمارے خلاف مسلسل سازشیں کی جا رہی ہیں کوئی ایسی تازہ حرکت بھی کی ہے انھوں نے جس کی وجہ سے ہماری امی سخت پریشان ہیں۔ انھوں نے مجھے خط لکھا تھا لیکن تفصیل تذکرہ نہیں کیا تھا۔ میں آج کل مصروف ہوں۔ چھٹیوں میں وہاں جاؤں گی اور معلوم کروں گی کہ کیا صورتِ حال ہے۔"
"اوہ نشاط صاحبہ! ایک بات میں آپ سے عرض کروں جیسا کہ میں نے آپ سے کہا کہ نواب شمشیر زمان کو میں نے ایک طویل عرصہ تک اپنا باپ ہی سمجھا ہے اور انھوں نے کبھی مجھے یہ احساس نہیں ہونے دیا کہ میں ان کے لئے کوئی غیر شخصیت ہوں۔ چنانچہ یہ فرض مجھ پر بھی عائد ہوتا ہے کہ ان کے خاندان کے لئے کچھ کروں۔ نشاط صاحبہ آپ مجھے وہاں کے بارے میں تفصیلات فراہم کیجئے، میں اس سلسلے میں بھی کوشش کروں گا۔ فرسٹ ایڈ ہاؤس کے ذریعے ہمارے اثر و رسوخ کافی بڑھ گئے ہیں اور اگر کوئی ایسا مسئلہ ہے تو پھر آپ بالکل مطمئن رہیں آپ کو کسی قسم کی کوئی تکلیف نہیں ہونے پائے گی۔" زاہد نے کہا۔
"ہاں میں آپ سے مدد لینے میں کبھی بھی اعتراض نہیں کروں گی۔ اس لئے کہ آپ کچھ بھی سمجھیں۔ میں آپ کو اپنا سمجھتی ہوں۔" نشاط نے پُرمحبت لہجے میں کہا۔
"اس کے لئے بہت بہت شکریہ، اور کوئی حکم میرے لئے؟" زاہد نے سوال کیا۔
"نہیں، بھگانا چاہتے ہیں آپ مجھے چلی جاتی ہوں۔" نشاط نے اپنا پرس سنبھالتے ہوئے کہا۔
"ارے نہیں نہیں بیٹھئے، واقعی بیٹھئے مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے اور کوئی خاص مصروفیت بھی نہیں ہے۔ براہِ کرم تشریف رکھئے۔" زاہد بولا اور نشاط مسکراتے ہوئے بیٹھ گئی۔
"آپ سے تو بہت ساری باتیں کرنے کو جی چاہتا ہے۔ امی لوں پڑی میں آپ کی۔"
"ہاں! بس وہ ایک جذباتی جھٹکا تھا۔ میں نے ان سے یہی سوال کیا تھا کہ کیا واقعی میری شخصیت مشکوک ہے۔ کیا میری نمود میں میری ماں کا کوئی گناہ شامل ہے۔ اس بات نے انھیں جذباتی کر دیا تھا اور

پھر انھوں نے مجھے تفصیل بتائی۔"

"کیا ۔۔؟"

"یہی کہ وہ دھوکا کھائی ہوئی تھیں۔ ان سے ایک شخص نے نکاح کیا تھا پھر اسی شخص نے انھیں ہلاک کرنے کی کوشش کی تھی۔ بس تقدیر تھی ان کی جو وہ بچ گئیں اور اس کے بعد نواب شمشیر زمان نے انھیں اپنے گھر میں ایک مقام دیا۔ یہ دوسری بات ہے کہ مہرالنساء بیگم نواب شمشیر زمان صاحب کی شخصیت کو نہ سمجھ سکیں اور انھوں نے ہمیشہ میری ماں کو مطعون کیا۔"

"خدا کے لئے اب ان باتوں کا تذکرہ اس انداز میں نہ کیجئے۔ آپ کے والد کا پتہ چل گیا؟"

"ہاں" زاہد نے عجیب سے انداز میں کہا۔

"اب وہ بھی آپ کے ساتھ ہی رہتے ہیں؟"

"نہیں، ایسا کوئی شخص آسانی سے میرے ساتھ نہیں رہ سکتا جس نے میری ماں کے ساتھ یہ وحشیانہ سلوک کیا ہو۔"

"اوہ! ویسے میں آپ کو بتا دوں، میں حمایت بیگ صاحب سے بھی ملی تھی۔"

"میں جانتا ہوں۔ ظاہر ہے آپ کو میرے بارے میں تفصیلات معلوم کرتے ہوئے حمایت بیگ کا بھی سہارا لینا پڑا ہوگا لیکن ایک بات بتائیں اس سلسلے میں حمایت بیگ آپ کی کوئی مدد نہیں کر رہے میرا مطلب ہے توفیق صاحب کے سلسلے میں۔"

"مدد تو کر رہے ہیں وہ۔ ابھی توفیق صاحب کھل کر سامنے نہیں آئے اور مجھے صحیح صورت حال بھی نہیں معلوم۔ حمایت بیگ کی والدہ سے بھی کوئی ملاقات نہیں ہوئی ہے۔ ویسے وہ کہہ رہے تھے کہ کچھ عرصے کے بعد وہ جائیں گے اور میری امی سے ملاقات کریں گے میرے دل میں بڑی خواہش ہے کہ میں آپ کی امی سے ایک دفعہ ضرور ملاقات کروں۔"

"آپ کی یہ خواہش پوری ہو جائے گی۔" زاہد نے کہا۔

"اچھا تو اب آپ مجھے اس فرسٹ ایڈ ہاؤس کے بارے میں تفصیلات بتائیے۔ ویسے اس کے بارے میں میں نے اخبارات میں بہت کچھ پڑھا ہے جگہ جگہ اس کے تذکرے ہو رہے ہیں۔"

"حسام احمد صاحب ایک نیک دل اور خدا ترس انسان ہیں انھوں نے اپنے تمام وسائل اس عمارت کی تعمیر میں جھونک دیئے ہیں اور اسے ایک رفاہی ادارے کی حیثیت سے آگے بڑھا رہے ہیں۔ آپ بھی دعا کیجئے کہ اس کے مقاصد کی تکمیل ہو جائے۔"

"صرف دعا نہیں میں کچھ عملی طور پر بھی کرنا چاہتی ہوں یہاں کے لئے ۔۔۔"

"وہ کیا؟" زاہد نے سوال کیا۔

"کیا آپ مجھے یہاں ملازمت نہیں دلا سکتے؟"

"کیسی باتیں کر رہی ہیں نشاط؟" زاہد نے کہا۔

"نہیں سچ کہہ رہی ہوں ملازمت بلا معاوضہ اس عظیم ادارے سے منسوب ہو کر میں اپنے آپ کو انتہائی خوش نصیب سمجھوں گی تھوڑا بہت وقت جو پڑھائی کے بعد مجھے مل جاتا ہے وہ یہاں میں کسی کام میں صرف کرنا چاہتی ہوں۔"

"ریسپشنسٹ بنیں گی یہاں کی؟"

"بخوشی!"

"آپ کے اوقات کار کیا ہیں؟"

"بس دوپہر کو فارغ ہو جاتی ہوں۔ اس کے بعد شام تک فارغ رہتی ہوں۔ پڑھنے لکھنے کا سلسلہ رات کو ایک دو گھنٹے جاری رہتا ہے اور اس کے بعد بس فرصت ہی فرصت!"

"گویا آپ سہ پہر تین بجے سے شام پانچ بجے تک خدمات انجام دے سکتی ہیں؟"

"سہ پہر تین بجے سے لے کر شام سات بجے تک۔" نشاط نے فوراً جواب دیا۔

"نہیں اگر صرف دو گھنٹے ہمیں دے دیں تو میرا خیال ہے یہی کافی ہوں گے۔"

"تو میں حاضر ہوں جس طرح بھی آپ پسند کریں۔" نشاط نے کہا۔ وہ بے حد خوش نظر آ رہی تھی پھر اس نے کہا۔ "تو پھر میں کب سے آ جاؤں؟"

"ابھی نہیں ذرا دادا جان سے بات کر لوں۔"

"جواب کب ملے گا؟"

"آپ کب تشریف لائیں گی؟"

"کل بھی آؤں گی، پرسوں بھی آؤں گی، روزانہ آؤں گی۔" نشاط نے جواب دیا اور زاہد مسکرانے لگا۔

"اچھا تو پھر کل جب آپ تین بجے تشریف لائیں گی تو آپ سے تفصیلی بات چیت ہوگی۔"

"بہتر، اب واقعی اجازت۔" نشاط نے اٹھتے ہوئے کہا اور زاہد اسے فرسٹ ایڈ ہاؤس کے مین گیٹ تک چھوڑنے کے لئے آیا۔ اس نے نشاط کو پیشکش کی کہ وہ اپنی گاڑی میں اسے اس کے ہوسٹل پہنچا دے گا لیکن نشاط نے معذرت کرتے ہوئے کہا۔ "ابھی اسے کچھ اور کام بھی ہیں جنھیں انجام دے کر وہ ہوسٹل واپس جائے گی۔" اس

کے بعد نشاط چلی گئی۔

سینے میں لاکھوں احساسات چھپائے وہ وہیں کھڑا اُسے دیکھتا رہا۔ نشاط نے ماضی کے ایک ایسے ورق کو اُلٹ دیا تھا جس سے اس نے ہمیشہ نگاہیں چرائی تھیں اور جسے اس نے ایک محدود عرصے کے لئے محفوظ کر دیا تھا لیکن آج وہ سب کچھ اس کے ذہن میں تازہ ہو گیا تھا۔ پُرانی باتوں سے نجات حاصل کرنے کے لئے وہ وہاں سے واپس پلٹا۔ کوئی بات سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ عجیب اُلجھی اُلجھی سی کیفیت ہو رہی تھی۔ کیا کروں، کہاں جاؤں۔ اس نے سوچا اور پھر وہ دادا جان سے اجازت لے کر وہاں سے چل پڑا۔

دیر تک وہ سڑکوں پر آوارہ گردی کرتا رہا۔ کسی کام میں جی نہیں لگ رہا تھا۔ پھر اس نے سرفراز کے گھر کی جانب رُخ کیا۔ سکون کا یہ گوشہ اُسے باقی تمام جھگڑوں سے زیادہ پسند تھا۔ چنانچہ وہ صابرہ بیگم کی خدمت میں حاضر ہو گیا۔

سرفراز اس وقت موجود نہیں تھا۔ فرسٹ ایڈ ہاؤس میں بھی آج اس سے ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ صابرہ بیگم نے بتایا کہ وہ کسی کام میں مصروف ہے۔

"آپ کیسی ہیں امی؟"

"بیٹے! بالکل ٹھیک ہوں۔ تم دیکھ رہے ہو میں یہاں آ کر بہت خوش ہوں۔"

"میرے لائق اور کوئی خدمت امی؟"

"نہیں، ابھی اور کوئی خدمت نہیں ہے۔ ہو گی تو ضرور بتاؤں گی۔" صابرہ بیگم نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"سرفراز کام کر رہے ہیں؟"

"ہاں! تم نے اُسے جس راستے پر لگا دیا ہے۔ اس میں دن رات وہ مصروف ہے۔"

"ٹھیک ہے امی جان! وہی راستہ اس کے مستقبل کے تمام راستے کھولے گا۔"

"تم جیسا بیٹا اور بھائی جسے مل جائے اُسے مستقبل کی کیا پروا ہو سکتی ہے۔ خدا تمھیں لمبی عمر دے زاہد، ہم تو تمھیں ہر لمحہ دُعائیں دیتے ہیں۔" صابرہ بیگم محبت سے بولیں۔

"آپ کی محبت ہے امی! ورنہ میں کیا اور میری بساط کیا۔ لیکن میں آپ سے کچھ اور بھی عرض کرنا چاہتا ہوں۔"

"ہاں ہاں کہو تم اس سلسلے میں فکر کیوں کرتے ہو؟"

"امی! جب کبھی بھی میں اس بارے میں سوچتا ہوں تو میرا ذہن بُری طرح پراگندہ ہو جاتا ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں کیا کروں؟"

"کہو، کیا بات ہے کیا اُلجھن ہے تمھیں؟"

"میں ناظم علی صدیقی کی بات کر رہا ہوں۔" زاہد نے کہا اور صابرہ بیگم ایکدم سنجیدہ ہو گئیں۔

"کیا کہنا چاہتے ہو اس سلسلے میں؟"

"امی! میں آپ سے یہ عرض کرنے میں عار نہیں محسوس کرتا کہ سحر تیز رفتاری سے سرفراز کی طرف دوڑ رہی ہے۔ اُسے اگر روکنے کے لئے کوئی مؤثر کوشش نہ کی گئی تو سرفراز کا تو کچھ نہیں بگڑے گا لیکن اس لڑکی کے لئے بہت بُرا ہو گا۔ میں چاہتا ہوں کہ ان کے راستے یہیں محدود کر دیئے جائیں۔ آپ اس سلسلے میں میری کیا مدد کر سکتی ہیں؟"

صابرہ بیگم پریشان ہو گئیں۔ وہ کسی سوچ میں ڈوب گئی تھیں۔ پھر انھوں نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔

"میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا زاہد۔ تم بتاؤ، تم بتاؤ مجھے اس سلسلے میں کیا کرنا چاہیئے؟"

"اگر ہم سحر کو روکنے کی حد تک اس بات کا انکشاف کر دیں تو کیا حرج ہے؟"

"نہیں زاہد نہیں۔ میں خاموشی ہی سے کسی گمنام گوشے میں مر جانا پسند کروں گی۔ اس شخص کے سامنے جانا پسند نہیں کروں گی جس آدمی سے میں نے ایک طویل عرصے تک دُوری اختیار کی اب اس کی قربت مجھے راس نہیں آئے گی میری زندگی کا اختتام اور قریب آ جائے گا۔"

"خُدا نہ کرے امی، کون مردود یہ چاہتا ہے کہ آپ کو کسی ذہنی تکلیف کا سامنا کرنا پڑے۔"

"تو پھر تم یہ سوچ لو کہ ناظم علی صدیقی سے میری مُلاقات میرے حق میں بہتر نہیں ہو گی۔"

"کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی پڑے گا امی، آپ آخر اس بات پر کیوں مصر ہیں کہ ناظم علی صدیقی صاحب کو سرفراز کے بارے میں کچھ نہ بتایا جائے۔"

"میں اُن کا ردِ عمل نہیں جانتی، نہ ہی اس بارے میں کوئی فیصلہ کر سکتی ہوں۔ اب تو صرف ان کے نام کی یاد میرے سینے میں باقی رہ گئی ہے۔ ان کی فطرت ان کی شخصیت تک کو بھول چکی ہوں میں۔ میں نہیں جانتی کہ اس انکشاف پر وہ کیا سوچیں گے۔ کہیں یوں نہ ہو کہ سرفراز کی دُنیا تہہ و بالا ہو جائے، سرفراز میرے بارے میں بدگمانیوں کا شکار ہو جائے۔ زاہد اگر ایسا ہوا تو... تو میں اپنی

زندگی کا آخری سہارا ابھی کھو بیٹھوں گی اور میں اپنے سرفراز کو کھونا نہیں چاہتی۔"

"امی! آپ کو اپنے بیٹے پر بھروسہ ہونا چاہیئے۔ وہ اتنا نیک نفس انسان ہے کہ آپ اس سے کسی قسم کا خدشہ رکھ ہی نہیں سکتیں۔"

"کوئی اور ترکیب سوچو زاہد۔ کوئی اور ترکیب سوچو۔ اگر ناظم علی صدیقی کا طرزِ عمل بہتر بھی رہا تو یہ بات میرے ذہن کے ایک ایک حصے میں چبھتی رہے گی کہ میں نے ان کا سہارا حاصل کرنے کی کوشش کی۔"

"آپ جس انداز میں سوچ رہی ہیں امی، وہ درست نہیں ہے۔"

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ ہے کہ ناظم علی صدیقی کی دولت سے سرفراز کو کوئی واسطہ نہیں ہوگا۔"

"تو پھر انتظار کرو اس وقت تک جب تک سرفراز اپنے پیروں پر کھڑا نہ ہو جائے۔ ناظم علی یہ نہ سمجھیں کہ میں نے آخری وقت میں باپ بیٹے کو ملانے کے لئے کسی سازش کا جال پھیلایا ہے تاکہ بیٹے کا مستقبل سنور جائے۔ سرفراز بہت حساس نوجوان ہے۔ اوّل تو وہ خود ہی ایک ایسے شخص کی دولت قبول نہیں کرے گا جس نے ساری زندگی اس کی ماں کو مصائب کا شکار رکھا اور اگر ناظم علی نے خود اس کے بارے میں یہ سوچ لیا تو پھر یہ سوچ لو کہ وہ میرے ہاتھ سے بھی جاتا رہے گا۔"

"لیکن پھر؟" زاہد نے سوال کیا۔

"بیٹے! خدا نے تمہیں بڑا زرخیز ذہن دیا ہے۔ تم اس بارے میں کچھ اور سوچ لو، کوئی اور ترکیب کرو۔" صابرہ بیگم کسی طور پر اس بات پر آمادہ نظر نہیں آتی تھیں کہ ناظم علی کو کسی طور اس بارے میں بتایا جائے لیکن زاہد کے اپنے دل میں یہ بات بیٹھ گئی تھی کہ وہ اپنے طور پر اس سلسلے میں ضرور کوشش کرے گا۔ ممکن ہے کوئی ایسا پہلو نکل آئے جس سے ناظم علی صدیقی کے دل کا گداز ظاہر ہو جائے۔ اگر اس طرح بچھڑا ہوا ایک خاندان مل جاتا ہے تو اس سے بڑی خوشی کی بات اور کیا ہو گی؟ اس نے اپنے طور پر چند فیصلے کئے اور پھر مسکرا کر بولا۔

"ٹھیک ہے امی! اگر آپ یہ نہیں چاہتیں تو نہ سہی ابھی ایک طویل عرصے تک خاموش رہوں گا، اس وقت تک جب تک کہ ہمارا سرفراز اپنے طور پر کسی اعلیٰ شخصیت کا مالک نہیں بن جاتا۔"

"ہاں! اگر اس کے بعد تم چاہو تو ناظم علی کو اس بارے میں بتا سکتے ہو۔" صابرہ بیگم نے کہا۔

"بس! بس آپ نے میرا دل مطمئن کر دیا۔ اب میں چلتا ہوں۔" زاہد نے کہا اور تھوڑی دیر کے بعد اُن سے رخصت ہو کر کوٹھی کی جانب چل پڑا۔ اب اس کا ذہن کسی حد تک اس انتشار سے چھٹکارا حاصل کر چکا تھا جو اس کی ذات میں ایک دم نشاط سے ملاقات کے بعد برپا ہو گیا تھا۔

جالب صاحب کوٹھی میں آوارہ گردی کر رہے تھے۔ غالباً وہ قدسیہ سے اس قدر متاثر نہیں تھے۔ شاید کسی سے متاثر ہونا ان کی فطرت میں ہی نہیں تھا، خود میں گم رہنے والے آدمی تھے۔ والدین نے ایک ذمے داری ان کے سپرد کر دی تھی تو اب اُسے نباہنے کے لئے کوشاں نظر آتے تھے۔ صرف اسی لئے کہ والدین کی خوشنودی میں ہی نجات ہے ورنہ خود بھی کچھ نہ کچھ کرنا ہوگا لیکن قدسیہ تھی کہ ہاتھ ہی نہ آتی تھی، ابھی تک وہ اپنی کسی کوشش میں کامیاب نہیں ہو سکے تھے قدسیہ کے نگار خانے میں گئے تو وہ انھیں وہاں چھوڑ کر کہیں چلی گئی اور جب وہ چونک کر باہر آئے تو قدسیہ کا کہیں پتہ نہیں تھا۔

والدین کی طرف سے اصرار بڑھتا جا رہا تھا اور اب تو انھیں یہ دھمکی بھی دی گئی تھی کہ اگر وہ کچھ نہ کر پائے تو پھر خود ہی سلسلہ جنبانی شروع کیا جائے گا۔ اس کے بعد عمل کر ڈالا جائے گا اس لئے بہتر یہ ہے کہ وہ قدسیہ کی رائے جان لیں۔ بڑی پریشانی میں تھے وہ آجکل۔

اس وقت بھی یہ آوارہ گردی قدسیہ ہی کی تلاش میں تھی۔ نگار خانے میں بھی نہیں تھی، پھر نہ جانے کہاں چلی گئی۔ پائیں باغ میں نکل آئے تھے۔ دوسرے انھیں شازیہ نظر آ گئی۔ شازیہ سے ابھی تک ان کی کوئی خاص گفتگو نہیں ہوئی تھی۔ بس رسمی سی سلام و دعا اس حیثیت سے تھی کہ وہ کرنل ضرغام کے بیٹے تھے اور شازیہ اپنے والد کی ہدایت پر کرنل ضرغام کو انکل کہتی تھی۔

اس وقت دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ شازیہ اخلاقاً رک گئی تھی۔ جالب صاحب دوڑتے ہوئے اس کے قریب پہنچ گئے۔

"ہیلو شازیہ ہیلو!"

"ہیلو فرمائیے کیسے مزاج ہیں آپ کے جالب بھائی؟"

"بس ٹھیک ہوں، عجیب الجھن کا شکار ہو گیا ہوں یہاں آکر۔"

"ارے، ارے کیوں آپ کو ہمارے شہر کا ماحول پسند نہیں آیا۔ ہماری کوٹھی میں کوئی تکلیف ہے آپ کو؟" شازیہ نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"ارے نہیں، ایسی کوئی بات نہیں ہے۔"

"پھر آپ کس الجھن کا شکار ہیں جالب بھائی؟"

"بس کچھ عجیب سے احساسات ہو گئے میرے۔ میں یوں محسوس کرتا ہوں جیسے آپ سب لوگ مجھ سے دور دور رہتے ہیں۔"

"نہیں جالب بھائی! ایسی کوئی بات نہیں ہے آپ تو تو دسوتے رہتے ہیں" شازیہ نے سادگی سے کہا۔

"کک... کہاں سوتا رہتا ہوں۔ لوگوں نے تو مجھ پر الزامات لگا رکھے ہیں بلاوجہ کہ میں سونے کا شوقین ہوں۔ یہ دوسری بات ہے کہ میں زیادہ گفتگو پسند نہیں کرتا۔"

"ہاں! وہ تو میں دیکھ رہی ہوں۔ فرمائیے کیسے مزاج ہیں آپ کے، میں کیا خدمت کر سکتی ہوں آپ کی۔"

"شازیہ! ایک کام کر سکتی ہو میرا؟"

"کیا، فرمائیے؟"

"وہ... وہ، دراصل میں... میں کیا بتاؤں تمہیں؟" جالب صاحب نے پریشان ہو کر کہا۔

"بیٹھ جائیے، سو جائیے۔ آپ کے حق میں یہی زیادہ بہتر رہے گا۔"

"مذاق مت اُڑاؤ میرا۔ کچھ مدد کرو میری۔" جالب نے روہانسے لہجے میں کہا۔

"جج جی، جی فرمائیے۔ کچھ پیسے چاہئیں آپ کو؟" شازیہ نے کہا۔

"پیسے، پیسوں کا میں کیا کروں گا۔ پیسے تو میرے پاس بھی بہت ہیں۔"

"تو پھر میں آپ کی کیا مدد کر سکتی ہوں؟"

"اچھا ٹھہرو، مجھے سوچ لینے دو، میں کوئی مناسب الفاظ تلاش کر رہا ہوں۔"

"لغت اُٹھا لاؤں۔"

"لغت... یہ کیا چیز ہوتی ہے؟"

"ڈکشنری... اردو ڈکشنری..."

"اس کا کیا کروں گا؟"

"مناسب الفاظ تلاش کرنے میں مدد مل جائے گی آپ کو۔" شازیہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"نہیں نہیں، ویسے تو میرے پاس بھی الفاظ بہت سے ہیں اچھا یہ بتاؤ تم نے محبت کی ہے کسی سے؟"

"کک... کیا؟" شازیہ تعجب سے آنکھیں پھاڑ کر بولی۔

"محبت، محبت۔ آئی مین لو!"

"کوشش کر رہی ہوں۔" شازیہ نے جواب دیا۔

"واقعی؟"

"ہاں بھئی آپ جھوٹ سمجھ رہے کیا؟"

"نن نہیں تو، لیکن کس سے محبت کریں گی آپ؟"

"کسی غریب آدمی سے۔"

"واہ؟"

"ہاں بھئی! دراصل مجھے کسی غریب آدمی کی تلاش ہے۔" شازیہ نے جواب دیا۔

"غریب آدمی؟"

"ہاں مجھے غربت سے عشق ہے۔ دراصل یہ دولت مند لوگ جو ہوتے ہیں نا۔ میرا مطلب ہے یہ ایسے ہی ہوتے ہیں۔ لاابالی۔ اچھی فطرت کے مالک نہیں ہوتے۔ ان کی بہ نسبت ایک غریب آدمی اس بات کا مستحق ہے کہ اس سے محبت کی جائے۔" شازیہ نے جواب دیا۔

"واہ، واہ، خیالات تو بہت اچھے ہیں تمہارے مگر غریب آدمی کہاں ملے گا؟"

"کیا بتاؤں؟ کوشش تو بہت کی تھی لیکن زاہد بھائی نے پسند ہی نہیں کیا۔"

"زاہد... زاہد... زاہد... اس کوٹھی میں زاہد کا نام بہت لیا جاتا ہے۔"

"کیوں، کیوں، آپ کو بھی ان سے اُلجھن پیدا ہو گئی؟" شازیہ ہونٹ سکوڑ کر بولی۔

"کوئی بھی اُلجھن نہیں بھئی۔ ہر مسئلے میں ہی زاہد کہیں نہ کہیں موجود ہے۔"

"ہاں یہ بات تو ہے۔ دراصل یہ پوری کی پوری کوٹھی ہی زاہد بھائی کی مرہونِ منت ہے۔ یہاں کسی آدمی کا کام اُن کے بغیر نہیں چلتا۔"

"کیا واقعی؟" جالب نے چونک کر پوچھا۔

"کیوں آپ کو کیا تکلیف ہوتی ہے؟"

"نہیں تکلیف نہیں ہوتی۔ پھر میں بھی... میں بھی کیوں نہ کوشش کروں۔ میں اپنا مسئلہ زاہد صاحب کے سامنے ہی کیوں نہ بیان کروں۔"

"تو پھر کر دیجئے، میں جاؤں؟"

"نہیں بیٹھو تو سہی۔ سنو ایک منٹ۔ دراصل میں... میں قدسیہ صاحبہ کو اپنی طرف متوجہ کرنا چاہتا ہوں۔"

"آواز دے کر متوجہ کر لیجئے۔"

"نہیں بھئی تم سمجھیں نہیں۔"

"تو پھر جلدی سے سمجھائیے نا ہمیں۔ ورنہ ہم جا رہے ہیں۔" شازیہ اُٹھتی ہوئی بولی

"بھئی دھمکیاں مت دو شازیہ، غور سے بات سنو، میں چاہتا ہوں کہ وہ بھی مجھ سے محبت کریں۔"

"وہ بھی ہے کیا مطلب یعنی آپ ان سے محبت کرتے ہیں؟"

"ہاں شازیہ میں ان سے محبت کرتا ہوں۔ میں ان سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔"

"سبحان اللہ، سبحان اللہ، تو پھر آپ یہ تمام باتیں ان سے کیوں نہیں کہہ دیتے؟"

"کہنے گیا تھا ایک دن لیکن ہمت نہیں پڑی۔"

"تب پھر ہمت پیدا کیجئے۔" شازیہ نے جواب دیا اور بُرا سا منہ بنا کر واپس پلٹ پڑی۔ جالب صاحب خاموشی سے کھڑے اُسے دیکھتے رہے سمجھ میں نہیں آتا تھا انھیں کہ اپنے اندر ہمت کیسے پیدا کریں۔

تھوڑی دیر کے بعد وہ وہاں سے پلٹ پڑے۔ دروازے کی طرف رُخ کیا تو سامنے سے زاہد کی گاڑی اندر داخل ہوتی ہوئی نظر آئی۔ ایکدم شازیہ کے الفاظ یاد آ گئے اور وہ زاہد کا انتظار کرنے لگے۔

جب زاہد کی کار پورچ میں رک گئی اور وہ دروازہ وغیرہ بند کر کے نیچے اُترا تو جالب صاحب تیزی سے اس کی طرف دوڑ پڑے۔

"او ہو زاہد بھائی۔۔۔ زاہد بھائی۔۔۔"

"سبحان اللہ آپ کو میرا نام کیسے معلوم ہو گیا جالب صاحب؟"

"کیا مطلب؟ یعنی آپ سے کتنی بار تو تعارف ہو چکا ہے اور میں نے آپ سے کچھ عرض بھی کیا تھا۔"

"میری یادداشت ذرا کمزور ہے، دوبارہ عرض کر دیں۔" زاہد نے اُس سے کہا۔

"میرے کمرے میں آنا پسند کریں گے آپ؟"

"نہیں۔" زاہد نے جواب دیا۔

"کیوں، ہم میں نہیں سمجھا۔" جالب صاحب چونک کر بولے۔

"مطلب یہ کہ آپ خود ہی میرے کمرے میں کیوں نہ چلیں۔"

"ایک ہی بات ہے، وہیں چلتے ہیں۔" جالب صاحب نے جواب دیا اور زاہد انھیں لئے ہوئے اپنے کمرے میں پہنچ گیا۔

"تشریف رکھئے، فرمائیے میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟"

"زاہد صاحب! میرا مسئلہ آپ کے علم میں ہو گا۔ کرنل ضرغام یعنی میرے والد صاحب میری شادی قدسیہ سے کرنا چاہتے ہیں۔ مجھے ہدایت دی گئی ہے کہ میں قدسیہ سے ربط وضبط بڑھاؤں۔ دراصل اس سلسلے میں مجھے کوئی تجربہ نہیں ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ میری مدد کریں۔"

"ہوں تو آپ قدسیہ سے ربط وضبط بڑھانا چاہتے ہیں۔ آپ نے بات کی ہے اس سے آج تک؟"

"کرنے کی کوشش کر چکا ہوں۔ بات تو خیر وہ کر لیتی ہے لیکن کبھی اس موضوع پر نہیں آتی۔"

"اس کے لئے طویل جدوجہد کرنا ہوتی ہے۔ میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟"

"براہ کرم میری مدد کیجئے۔ مجھے ان راستوں پر چلنے کا طریقہ بتایئے۔"

"ہوں! بڑا مشکل طریقہ ہے جالب صاحب۔ آپ اُسے کر نہیں سکیں گے۔"

"کروں گا۔ سب کچھ کروں گا۔ دراصل میں خود تو اس مسئلے میں اتنی زیادہ دلچسپی نہیں لے رہا لیکن کرنل صاحب آپ انھیں نہیں جانتے۔ اگر میں مسلسل فیل ہوتا رہا تو ایک دن میرا ہارٹ فیل ہو جائے گا۔"

"وہ کیوں؟"

"بس ان کی سزائیں اس قسم کی ہوتی ہیں۔ فوجی سزائیں۔ جو تکالیف وہ فوج میں بھگت چکے ہیں۔ اب انہی کو دوسروں پر آزماتے ہیں۔ میں کبھی ان کی دی ہوئی سزاؤں کا متحمل نہیں ہو سکتا۔"

"ٹھیک ہے آپ بھی کیا یاد کریں گے جالب صاحب کہ کسی زاہد سے پالا پڑا تھا۔ میں آپ کی مدد کرنے کو تیار ہوں۔"

"خدا کی قسم میں آپ کا ہمیشہ احسان مند رہوں گا۔"

"تعویذِ محبت کے بارے میں سُنا ہے آپ نے کچھ؟"

"کس کے بارے میں؟"

"تعویذِ محبت۔"

"یہ کیا ہوتا ہے؟"

"محبت کا تعویذ ہوتا ہے۔ گلے میں ڈالنا پڑتا ہے۔"

"کیسا ہوتا ہے؟" جالب صاحب نے رازدارانہ انداز میں پوچھا۔

"بس ایک پرس کی طرح ہوتا ہے۔ بہت قیمتی چیز ہوتی ہے بڑی مشکل سے حاصل ہو سکے گا۔"

"مگر اس سے ہو گا کیا؟"

"آپ بھی اپنے گلے میں ڈال لیجئے۔ عام حالات میں گریبان کے اندر ڈالے رکھئے لیکن جب قدسیہ کا سامنا ہو تو اُسے ہاتھ میں لے کر جھلانے لگئے چاہے وہ کہیں بھی ہو۔ آپ کو یہ عمل جاری رکھنا ہو گا۔"

"ٹھیک ہے۔ اس کے علاوہ کبھی رسّے پر چلنے کا فن بھی سیکھا ہے آپ نے؟"

"نہیں کبھی نہیں۔"

"دیکھا ہے کبھی؟"

"نہیں دیکھا بھی نہیں ہے۔"

"تو میں بتاؤں گا ایک رسّہ دو درختوں کے درمیان باندھا جاتا ہے اور پھر اس پر توازن برابر کر کے چلنا پڑتا ہے۔"

"اس سے کیا ہو گا؟"

"محبت بڑھتی ہے۔" زاہد نے جواب دیا۔

"رسّے پر چلنے سے؟"

"ہاں! اس کی مشق شروع کر دیجئے، لیکن سوچ لیجئے کہ اگر آپ نے کبھی بھی کسی کو یہ بتایا کہ اس کا مشورہ آپ کو میں نے دیا تھا تو بہتر نہیں ہوگا۔ سارا الٹا ہو جائے گا۔"

"وہ کیوں؟"

"سب لوگ یہ سمجھ جائیں گے کہ میں آپ کی اور قدسیہ کی شادی کے بارے میں کوئی سازش کر رہا ہوں۔ اگر آپ نے یہ بات کسی کو بتادی جالب صاحب تو پھر میں وہ پہلا آدمی ہوں گا جو اس سلسلے میں آپ کو کامیاب نہیں ہونے دے گا۔"

"ارے نہیں نہیں میں بھلا کیوں کسی کو بتاؤں گا؟"

"بس پھر ٹھیک ہے آپ یہ مشق بھی جلد از جلد شروع کر دیجئے ہمارے عقبی باغ میں دو درخت ایسے ہیں جن کا درمیانی فاصلہ بیس گز ہوگا یعنی ساٹھ فٹ، آپ چار فٹ کی بلندی سے اس سلسلے میں مشق کا آغاز کیجئے۔ بدن کو سنبھال کر رسّے پر پیدل چلنے کی کوشش کیجئے اور جب آپ اس میں کامیاب ہو جائیں گے تو پھر اس سلسلے میں میں آپ کو دوسرا عمل بتاؤں گا باقی رہا تعویذِ محبت کا مسئلہ تو میں اُسے حاصل کر لوں گا۔"

"اس کے لئے جو کچھ بھی خرچ ہوگا میں آپ کو وہ بھی دینے کے لئے تیار ہوں۔"

"کیسی باتیں کر رہے ہیں جالب صاحب، آپ میرے دوست ہیں۔ نوجوان آدمی ہیں، آپ کی مدد کر کے مجھے خوشی ہوگی لیکن کم از کم پندرہ دن تک یہ مشق جاری رکھئے اور اس سلسلے میں مزید کوئی کارروائی نہ کیجئے بلکہ اگر کوئی کارروائی کرنے کی کوشش بھی کرے تو آپ اُسے روک دیجئے۔ آپ کا عمل پورا ہو جائے تو سارے معاملات خود بخود حل ہو جائیں گے۔"

"کیا واقعی؟" جالب صاحب نے خوش ہو کر پوچھا۔

"سو فیصدی، سو فیصدی۔" زاہد نے جواب دیا اور جالب صاحب خوش ہو گئے۔

"آپ کتنے اچھے انسان ہیں۔ اس کا اندازہ تو مجھے اب ہوا ہے، زاہد صاحب!"

"شکر ہے آپ کو اندازہ ہو گیا لیکن لوگ تو مجھے اچھا انسان نہیں کہتے۔" زاہد نے کہا اس کے پیٹ میں قہقہے مچل رہے تھے۔ لیکن جب جالب صاحب وہاں سے چلے گئے تو وہ ایک بار پھر پریشان ہو گیا۔ اس کے اندر وہی ہوک پیدا ہو گئی۔

نشاط سے ملاقات اس کے لئے زیادہ بہتر نہیں ہو سکتی تھی، نہ جانے کیوں ایک بے کلی سی اس کے ذہن و دل پر چھائی ہوئی تھی۔ ایک عجیب سا احساس، ایک عجیب سی کیفیت تھی اس کی جسے وہ کوئی معنی نہیں پہنا سکتا تھا۔ اپنے آپ کو ہنگاموں میں گم رکھنے والا زاہد، چند لمحات کے لئے تنہائی کا طالب ہو گیا تھا لیکن تنہائی اس کے مقدر میں نہیں تھی۔

قدسیہ، شازیہ اور دوسرے تمام لوگ اپنے اپنے معاملات میں مصروف تھے رات ہو چکی تھی۔ زاہد یونہی ٹہلتا ہوا باغ میں نکل آیا، خوشگوار ہوا چل رہی تھی اور یہ ہوا زاہد کے ذہن و دل کو فرحت دے رہی تھی سرفراز کے یہاں سے چلے جانے کے بعد ایک خلا سا پیدا ہو گیا تھا ویسے تو یہاں کی زندگی میں ہنگامہ پسندی عروج پر تھی، ہر وقت ہی کچھ نہ کچھ ہوتا رہتا تھا۔ اگر ابھی وہ ہارون کے کمرے میں چلا جاتا تو ہارون کی تازہ نظم اُسے سُننے کو ملتی ویسے بھی اس کے کمرے کے سامنے سے کوئی گزرتا تو اُسے ہارون کے اشعار سُنائی دیتے جو کسی طور پر اشعار نہیں ہوتے تھے بس مختلف طرزیں بناتا رہتا تھا وہ اور ان طرزوں سے گھر والے عاجز آنے لگے تھے۔ کسی اور کام کا ہی نہیں رہ گیا تھا وہ، شازیہ بیچاری آج تک کسی غریب آدمی کی تلاش میں تھی اور اُسے کوئی غریب نہیں مل سکا تھا۔ زاہد اس وقت بیٹھا یہی تمام باتیں سوچ رہا تھا۔ کہ اُسے اپنے عقب میں قدموں کی آہٹ سُنائی دی۔

پلٹ کر دیکھا تو ایک نیا جنجال اس کے سامنے تھا، یہ فرمودہ صاحبہ تھیں۔ وہ جالب کی طرح احمق نہیں تھی۔ زاہد محسوس کر چکا تھا کہ اچھی خاصی ذہین لڑکی ہے۔ زاہد اُسے دیکھ کر کھڑا ہو گیا اور فرمودہ سبک روی سے چلتی ہوئی اس کے قریب پہنچ گئی۔

زاہد گہری نگاہوں سے فرمودہ کو دیکھ رہا تھا پھر اس نے سنبھل کر کہا۔

"اوہ فرمودہ صاحبہ! اِدھر کہاں نکل پڑیں؟"

"آپ کی تلاش میں۔" فرمودہ نے جواب دیا۔

"آیئے پھر بیٹھئے، دیکھئے کتنی اچھی ہوا چل رہی ہے۔"

"ہاں! مگر مجھے تعجب ہے کہ آپ بھی موسموں سے متاثر ہوتے ہیں؟"

"کیوں اس میں تعجب کی کیا بات ہے؟"

"سُنا ہے بھئی آپ مشینی انسان ہیں اور ہماری زبان میں روبوٹ کہلاتے ہیں۔"

"اب میں آپ کی زبان کو کیا کہہ سکتا ہوں۔" زاہد نے جواب دیا، فرمودہ اس کے سامنے بیٹھ گئی تھی۔

"زاہد صاحب! یہاں آکر آپ یقین کیجئے طبیعت میں ایسی تازگی

اور فرحت پیدا ہوتی ہے کہ میں بیان نہیں کر سکتی۔ یہاں کے سب لوگ بے حد اچھے ہیں۔ اتنا عمدہ اور ہنسی خوشی کا ماحول ہے کہ دیکھ کر رشک آتا ہے بھلا کس بدنصیب کا دل یہاں سے جانے کو چاہے گا؟"

"تو آپ لوگ جا کہاں رہے ہیں؟ میرا خیال ہے ابھی جانے کی کوئی بات تو نہیں ہوئی؟"

"ہاں! کہاں ہوئی ہے اور اگر ہو گی تو مجھ سے زیادہ افسوس کسی کو نہیں ہو گا۔"

"آپ لوگ یہیں سیٹل کیوں نہیں ہو جاتے؟ اگر آپ یہیں قیام کریں تو کیا حرج ہے۔ ویسے بھی میں نے کرنل صاحب کے بارے میں سنا تھا کہ وہ اس کا ارادہ رکھتے ہیں۔"

"بالکل رکھتے ہیں لیکن یہاں کی صورتِ حال ذرا بہتر تو ہو۔ کچھ رشتے استوار ہو جائیں کچھ ایسی باتیں بن جائیں جن کی وجہ سے ڈیڈی یہاں مکمل رہنے پر آمادہ ہو جائیں پھر بات بنے۔"

"رشتے استوار ہو جائیں؟"

"ہاں آپ کو جیسے معلوم نہیں۔" فرمودہ نے جواب دیا۔

"فرمودہ صاحبہ! میں سمجھا نہیں۔"

"مطلب یہ کہ ہمارے بزرگان یعنی شجاع احمد صاحب اور ضرغام صاحب اپنے دلوں میں یہ فیصلہ کر چکے ہیں کہ جالب صاحب اور قدسیہ کو ایک دوسرے سے منسوب کر دیا جائے۔ ہمارے یہاں رہنے کا اس سے بہتر جواز اور کوئی نہیں ہو گا۔"

زاہد ایک لمحہ خاموشی سے اُسے دیکھتا رہا۔ دل تو چاہتا تھا کہ فرمودہ کو کھری کھری سُنا دے لیکن ظاہر ہے جالب کی بہن تھی اور پھر اسے اپنی شخصیت کا بھی خیال رکھنا تھا۔ چنانچہ بڑے صبر و سکون سے اس بات کو پی گیا اور کہنے لگا۔

"یہ تو بہت اچھی بات ہے اگر بزرگوں نے اس انداز میں سوچا ہے تو کیا غلط سوچا ہے۔"

"میں غلط تو نہیں سوچا۔ جالب میرا بھائی ہے۔ بڑا بھائی ہے میرا۔ لیکن میں حق گوئی کی قائل ہوں۔"

"کیا مطلب؟" زاہد چونک کر بولا۔

"اس کی فطرت یہاں کے ماحول سے میل نہیں کھاتی قنوطی سا آدمی ہے۔ کیا قدسیہ اس کے ساتھ خوش رہ سکے گی؟"

"میں کیا عرض کر سکتا ہوں، آپ جانتی ہیں۔ میں یہاں صرف ایک ملازم کی حیثیت رکھتا ہوں اور کسی ملازم کو مالکان کے ذاتی معاملات میں مداخلت نہیں کرنی چاہیے۔" زاہد نے کہا۔

"زاہد صاحب! آپ کے یہ تمام [illegible] حیثیت رکھتے ہیں۔"

فرمودہ بولی۔

"وہ کیوں؟" زاہد نے سوال کیا۔

"آپ کے ان الفاظ سے اس عمارت میں رہنے والوں کی توہین ہوتی ہے۔ میں نے یہاں رہ کر بہت کچھ معلوم کیا ہے۔ میں نے محسوس کیا ہے کہ ان سب کے دلوں میں آپ کی بے پناہ محبت اور چاہت ہے اور ان میں سے کوئی بھی آپ کو اپنے سے کمتر نہیں سمجھتا۔ بلکہ اگر میں یہ کہوں تو غلط نہیں ہو گا کہ یہاں آپ کی حیثیت کافی لوگوں سے بڑھ کر ہے۔ ان حالات میں یہ الفاظ کیا مناسب ہیں؟"

"فرمودہ صاحبہ! اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ آپ نے جو کچھ کہا وہ بالکل صحیح ہے لیکن مجھے اپنی حیثیت کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے۔"

"میرا خیال ہے آپ کے سوچنے کا انداز بالکل غلط ہے جب یہ لوگ آپ کو اس قدر محبت اور اپنائیت دیتے ہیں تو آپ کو بھی خلوصِ دل سے یہ سب کچھ قبول کر لینا چاہیے۔"

"اس سے کیا میری حیثیت بدل جائے گی؟"

"جی ہاں! بدل جائے گی بلکہ بدل چکی ہے۔ اگر کسی کو یہ معلوم ہو کہ آپ اپنے آپ کو یہاں کا ملازم سمجھتے ہیں تو یہاں رہنے والوں کو انتہائی تکلیف ہو گی۔ زاہد صاحب اگر آج تک آپ کے دل میں یہ خیال قائم ہے تو براہِ کرم اُسے دل سے نکال ڈالیئے۔ یہاں ایسی کوئی بات نہیں ہے اور پھر سچی بات تو یہ ہے کہ ہم لوگ بھی آپ کے قائل ہو چکے ہیں۔"

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ آپ نے کس طرح ان سب کو اپنی مٹھی میں لے رکھا ہے، یہ نہ صرف میں جانتی ہوں بلکہ ڈیڈی اور ممی بھی جانتے ہیں۔"

"اوہ نہیں نہیں، یہ غلط فہمی دل سے نکال دیجیے۔ بس یہ ان لوگوں کی مہربانی ہے جو انہوں نے مجھے اپنے دل میں جگہ دے رکھی ہے ورنہ میں خود کو ان سب کے قابل نہیں سمجھتا۔"

"آپ کو کون کس قابل سمجھتا ہے زاہد صاحب براہِ کرم اس بات کو رہنے دیں۔" فرمودہ نے عجیب سے لہجے میں کہا اور زاہد ایک دم کھوپڑی پر ہاتھ پھیرنے لگا۔ فرمودہ کا لہجہ اُسے عجیب سا محسوس ہوا تھا۔

"کون ہے وہ... جو مجھے کسی قابل سمجھتا ہے؟" اس نے سوال کیا۔

"میں اپنی بات کر رہی ہوں۔" فرمودہ نے بے باکی سے کہا اور

زاہد چونک کر اُسے دیکھنے لگا۔

"میں اسے بھی آپ کی فراخ دلی اور عظمت قرار دیتا ہوں۔"

"بیکار باتیں مت کیجیے۔ میں دراصل ذرا حقیقت پسند قسم کی لڑکی ہوں دل میں جو بات آتی ہے اُسے کہنے میں عار محسوس نہیں کرتی۔ جانتے ہیں میرے والدین اس گھر پر مسلسل اپنا تسلط جمانے کی فکر میں کیوں سرگرداں ہیں؟"

"کیوں سرگرداں ہیں؟"

"قدسیہ کے بارے میں تو شاید کرنل صاحب کے اور شجاع احمد صاحب کے درمیان گفتگو ہو چکی ہے اور ہمارے گھر والے اُسے اپنے گھر کی ملکیت سمجھنے لگے ہیں۔ اس طرف سے مطمئن ہو کر انھوں نے ایک نیا رُخ اختیار کر لیا ہے۔"

"وہ نیا رُخ کیا ہے؟" زاہد نے حیرت سے پوچھا۔ اس کے ذہن میں سنسنی سی پیدا ہو رہی تھی۔

"احمد رضا... احمد رضا وہ دوسرا شخص ہے جس کی شادی کے بارے میں اس گھر میں قدسیہ کی شادی کے بعد فوراً سوچا جائے گا۔"

"ہاں اس میں کوئی شک نہیں ہے۔ ایسا تو ضرور ہو گا۔" زاہد نے کہا۔

"تو پھر کرنل صاحب اور ان کی بیگم صاحبہ یعنی میرے ڈیڈی اور ممی دوسری بات یہ سوچ رہے ہیں کہ قدسیہ کو اپنے گھر میں لانے کے ساتھ ساتھ وہ مجھے مستقل اس گھر میں تعینات کر دیں تاکہ میں ان کے نمائندے کی حیثیت سے یہاں کام کرتی رہوں۔"

"اوہ، وہ کس طرح؟"

"احمد رضا سے میرا رشتہ کر کے۔" فرمودہ نے جواب دیا اور زاہد ایک لمحے کے لئے بھونچکا سا رہ گیا۔

واقعی ذرا تیز رفتار چیز ہے یہ فرمودہ۔ اتنی آسانی سے اس نے یہ باتیں اُسے بتا دی تھیں لیکن ابھی تک زاہد کے علم میں ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ اس لئے اُسے اس پر تعجب ہوا تھا۔ تاہم ایک لمحے میں یہ فیصلہ کیا جا سکتا تھا کہ فرمودہ جو کچھ کہہ رہی ہے غلط نہیں ہے۔ اس کا کوئی نہ کوئی پسِ منظر ضرور ہے۔ چند لمحات سوچنے کے بعد اُس نے پُرمسرت لہجے میں کہا۔

"واہ، یہ تو بڑی دل خوش کُن بات ہے۔ آپ لوگوں میں کمی کیا ہے اور پھر میرا خیال ہے احمد رضا بھی ایک اچھا نوجوان ہے اور اگر لوگوں کو اعتراض نہ ہو تو میں اس رشتے کی تائید کرتا ہوں۔"

"کوئی خاص اعتراض تھا تو نہیں، پر اب ہو گیا ہے۔" فرمودہ نے جواب دیا۔

"کیا آپ... آپ احمد رضا سے شادی نہیں کرنا چاہتیں؟"

"ہاں! میں ایسا نہیں چاہتی۔"

"لیکن کیوں؟"

"بس میں اس حیثیت سے اس شخص کو پسند نہیں کرتی۔"

"تو اس کا مطلب ہے کہ احمد رضا آپ کے معیار پر پورا نہیں اُترا؟" زاہد نے متعجب انداز سے پوچھا۔

"نہیں ایسی بات نہیں ہے۔"

"تو پھر جو بات ہے صاف ہی بتا دیں۔"

"بھئی وہ بڑا اچھا نوجوان ہے، خوبصورت ہے، ہنس مکھ ہے۔ دل موہ لینے والی باتیں کرتا ہے اور پھر انتہائی قابل، غریبوں کا درد دل میں رکھتا ہے۔ ہر چند کہ اس کے خلاف ایک ماحول یہاں پیدا ہو چکا ہے اور میں نے یہی اندازہ لگایا ہے کہ وہ ماحول صرف اس لئے ہے کہ اس نے شجاع احمد صاحب کی بات نہ مان کر غریبوں کے لئے ایک کلینک قائم کر لیا اور بقول شجاع احمد صاحب کے احمقوں کی اس جنت میں پہنچ گیا ہے۔ جہاں حماقتوں کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔"

"یعنی فرسٹ ایڈ ہاؤس۔" زاہد نے سوال کیا۔

"جی ہاں! دراصل زاہد صاحب! اس دوران میں، میں نے آنکھیں کھلی رکھی ہیں۔ ہر شخص کے بارے میں معلومات حاصل کرتی رہی ہوں۔ ہر شخص کے بارے میں جاننے کی کوشش کرتی رہی ہوں۔ نہ صرف میں بلکہ شاید میرے ممی اور ڈیڈی کو بھی حالات کا کسی قدر اندازہ ہو چکا ہے۔ فرسٹ ایڈ ہاؤس بہت اعلیٰ پائے کا ادارہ ہے۔ اس کے اغراض و مقاصد سُن کر تو میں ششدر رہ گئی ہوں اور جس انداز میں اس نے اپنا کام شروع کیا ہے۔ وہ بھی میرے لئے حیرت انگیز ہے لیکن شجاع احمد صاحب اس سے متفق نہیں ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ یہ وقت ضائع کرنے کے علاوہ کچھ بھی نہیں ہے۔"

"ہاں! شجاع احمد صاحب کی یہ بات میرے علم میں ہے۔" زاہد نے جواب دیا۔

"خیر چھوڑیئے ان باتوں کو، تو کہنے کا مقصد یہ تھا کہ احمد رضا صاحب شجاع احمد صاحب کے لئے ایک طرح سے تکلیف دہ شخصیت بن گئے ہیں اور شجاع احمد صاحب انھیں کام کا آدمی نہیں سمجھتے۔ اب یہ دوسری بات ہے کہ میرے ڈیڈی اس بات کو تسلیم کر لیں کہ یہ ناکارہ آدمی ان کی بیٹی کے پلو سے باندھ دیا جائے لیکن زاہد صاحب میں اس بات کو پسند نہیں کرتی۔"

"وجہ؟" زاہد نے پُوچھا۔

"وجہ صرف یہ ہے کہ میرا مطمحِ نگاہ بدل چکا ہے۔" فرمودہ بولی۔

"اوہ یعنی... یعنی براہِ کرم تھوڑی سی وضاحت اور فرمایئے۔"

"زاہد صاحب! میں آپ کے بارے میں بہت زیادہ نہیں جانتی لیکن آپ کی شخصیت نے مجھے بے پناہ متاثر کیا ہے اور اگر آپ نے قبول کیا اور حالات نے ساتھ دیا تو میں اپنی زندگی کے لئے آپ کو بہتر ساتھی سمجھ سکتی ہوں۔" فرمودہ نے جواب دیا۔

زاہد کے دیوتا کوچ کر گئے تھے۔ فرمودہ بے شک اچھی لڑکی تھی۔ اب تک کوئی ایسی چھچھوری بات دیکھنے میں نہیں آئی تھی جس سے اندازہ ہوتا کہ وہ کسی بھی طور کوئی گھٹیا لڑکی ہے لیکن اس طرح بے باکی سے یہ سب کچھ کہہ دینا اور اس انداز میں سوچنا زاہد کے لئے ناقابلِ یقین تھا۔ وہ دیر

سے کچھ بچکے سے انداز میں فرمودہ کو دیکھتا رہا پھر اُس نے گہری گہری سانسیں لے کر کہا۔

"فرمودہ صاحبہ! آپ بہت اچھی انسان ہیں لیکن آپ جیسی خاتون کے بارے میں میں اس انداز سے نہیں سوچ سکتا۔ یہ مجھے زیب نہیں دیتا گو کہ آپ کے یہ الفاظ میرے لئے بہت قیمتی ہیں لیکن فرمودہ صاحبہ! کیا میں اپنی حیثیت کو نظر انداز کر دوں؟"

"دیکھئے زاہد صاحب شخصیت صرف وہ ہوتی ہے جو انسان کی اپنی ذات میں پوشیدہ ہو، آپ ہر لحاظ سے ایک مکمل انسان ہیں۔ میں نے بھی بہت غور و خوض کرنے کے بعد کسی اور سے کہنے کی بجائے اپنے دل کا حال آپ سے کہنا مناسب سمجھا اور آپ اس بات پر غور کر لیجئے اچھی طرح غور کر لیجئے میں ابھی آپ سے جواب نہیں مانگ رہی۔ اگر آپ نے میری یہ درخواست قبول کر لی جو یقیناً اس سے قبل کسی لڑکی نے کسی نوجوان سے نہ کی ہو گی یا پھر ممکن ہے کی ہو لیکن میرے جیسے حالات کا شکار ہو کر نہیں کی ہو گی۔ آپ اس پر غور کر لیجئے۔ اگر آپ کی طرف سے اس بات میں کوئی ہچکچاہٹ نہ ہوئی تو باقی معاملات میں سنبھال لوں گی کیونکہ مجھے احساس ہے کہ آپ آگے بڑھ کر یہ سب کچھ نہیں کر سکتے۔" فرمودہ نے کہا۔

زاہد گنگ ہو کر رہ گیا تھا۔ وہ اس بے باکانہ گفتگو کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔ اُسے حیرت تھی کہ فرمودہ نے لڑکی ہوتے ہوئے بھی کتنی آسانی سے یہ سب کچھ کہہ دیا تھا۔

چند لمحات وہ خاموشی میں ڈوبا رہا۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ فرمودہ کو کیا جواب دے۔ تصور بھی نہیں کر سکتا تھا وہ اس بارے میں سوچنے کا، ابھی تو اُسے زندگی کی پتہ نہیں کون کون سی منازل سے گزرنا تھا۔ اس کا مطمع نگاہ تو کچھ اور ہی تھا۔ ان حالات میں اپنے لئے کسی پُرسکون گوشے کی تلاش یا زندگی کی ایسی آسائشوں کا تصور جو انسان کے لئے لازم ہوں، زاہد کے لئے ناممکن تھا اور پھر فرمودہ جیسی بے باک لڑکی سے تو وہ کسی طور متاثر نہیں ہو سکتا تھا لیکن اُسے اپنی پوزیشن کا بھی احساس تھا۔ جانتا تھا دریا میں رہنا ہے۔ اس صورت میں مگرمچھ سے بیر نہیں رکھا جا سکتا تھا۔

کرنل ضرغام شجاع احمد صاحب کے بہترین دوستوں میں سے تھے اور اگر زاہد فرمودہ کو ناراض کر دیتا تو اُسے ایک اور بحران کا سامنا کرنا پڑ جاتا۔ ان حالات میں وہ نہایت ذہانت سے کام لینے کا خواہشمند تھا۔

اُس نے مُسکراتی نگاہوں سے فرمودہ کو دیکھا اور کہنے لگا۔

"کیا آپ یقین کریں گی فرمودہ صاحبہ کہ زندگی نے ابھی مجھے اتنی مہلت ہی نہیں دی کہ میں اپنے بارے میں کچھ سوچ سکتا۔ یہ زندگی بڑی بے رحم ہے خاص طور پر میرے لئے۔ ان خشک اور بے آب و گیاہ چٹانوں میں آپ نے اچانک نمی پیدا کر دی ہے۔ اب ان سے کونپلیں پھوٹنے کا انتظار کیجئے۔"

"میں انتظار کروں گی۔" فرمودہ نے پُرمسرت انداز میں کہا۔

"ویسے ایک سوال آپ کی ان تمام باتوں کے باوجود میرے ذہن میں اُبھر رہا ہے۔ میں جانتا ہوں فرمودہ صاحبہ کہ شجاع احمد صاحب کس قماش کے انسان ہیں۔ ان کے دوستوں میں بہت سے لوگ ایسے بھی ہوں گے جو معمولی حیثیت کے حامل ہوں لیکن میں نے کبھی ان کا ذکر نہیں سُنا۔ . . شجاع احمد صاحب ہمیشہ بلندیوں کی طرف دیکھنے کے شائق رہتے ہیں۔ کرنل ضرغام معمولی حیثیت کے آدمی نہیں ہوں گے اور یقیناً وہ اس قابل ہوں گے کہ شجاع احمد صاحب انھیں اپنے خاندان میں شامل کرنے کے خواہاں ہیں۔ ظاہر ہے آپ کرنل صاحب کی صاحبزادی ہیں۔ مجھ جیسے غریب آدمی کے ساتھ آپ کی زندگی کیسے گزر سکے گی اور کیا کرنل صاحب اس بات پر راضی ہو جائیں گے؟"

"ایک بات کہوں آپ سے؟" فرمودہ بولی۔

"جی ہاں ضرور۔"

"ڈیڈی فوجی ہیں۔ بہت سخت انسان ہیں لیکن اپنی اولاد کے معاملے میں میں نے ان سے زیادہ نرم انسان آج تک نہیں دیکھا۔ انھوں نے ہمیشہ اپنی اولاد کا خیال کیا ہے اور ایک بات اور بھی ہے۔ ذہنی طور پر وہ کمتر نہیں ہیں۔ یعنی ہر صاحبِ علم کو پسند کرتے ہیں۔ ہر ذہین آدمی ان کے لئے قابلِ توجہ ہوتا ہے۔ بہت ہی سادہ قسم کے انسان ہیں وہ۔ میرا خیال ہے اگر صورتِ حال ان کے علم میں لائی جائے گی اور انھیں صحیح طریقے سے اس مسئلے کے بارے میں سمجھایا جائے گا تو وہ اعتراض نہیں کریں گے۔ آپ یہ ساری کی ساری باتیں مجھ پر چھوڑ دیجئے۔ آپ کو کبھی منظرِ عام پر نہیں آنا پڑے گا۔"

"اس کے باوجود بھی آپ مجھے سوچنے کا موقع دے چکی ہیں۔" زاہد نے کہا۔

"ہاں، ہاں کیوں نہیں۔ ظاہر ہے یہ سب کچھ چند منٹوں میں نہیں ہو جاتا۔" فرمودہ نے کہا اور تھوڑی دیر زاہد کے پاس بیٹھنے کے بعد وہ چلی گئی لیکن بہت سی اُلجھنیں زاہد کے لئے چھوڑ گئی تھی وہ۔

★★

دوسرے دن فرسٹ ایڈ ہاؤس میں نشاط حسبِ وعدہ پہنچ گئی۔ بڑی نکھری نکھری سی اور شگفتہ طبیعت کی مالک لڑکی تھی۔ زاہد اس وقت دادا جان کے پاس ہی بیٹھا تھا۔ تب نشاط اندر آئی۔ زاہد نے نشاط کا تعارف دادا جان سے کرایا اور دادا جان نے پُرشفقت انداز میں اس سے گفتگو کی۔

"دادا جان! نشاط چاہتی ہیں کہ وہ فرسٹ ایڈ ہاؤس کے لئے اپنا تھوڑا سا وقت صرف کریں۔ ان تمام صاحبِ دل حضرات میں ان کا بھی

شمار ہوتا ہے جو فرسٹ ایڈ ہاؤس کے اغراض و مقاصد سے متاثر ہیں اور رضاکارانہ طور پر اپنی خدمات اس کے لئے پیش کرنا چاہتے ہیں۔ میں نے طے کیا ہے کہ انہیں دو گھنٹے کے لئے ریسپشنسٹ کی جگہ دی جائے۔ ہر چند کہ یہ بہت بڑی شخصیت کی مالک ہیں۔ ایک اتنے بڑے باپ کی بیٹی جس کے بارے میں میں آپ کو تفصیلات کبھی بتاؤں گا تو آپ سن کر حیران رہ جائیں گے، پڑھتی ہیں، ہوسٹل میں رہتی ہیں۔ میں آپ سے اس کے لئے اجازت چاہتا ہوں۔"

"اگر تم نے یہ بات طے کر لی ہے بیٹے، تو پھر اجازت کا کیا سوال ہے مجھ سے ایسی غیریت کی باتیں مت کیا کرو۔" دادا جان نے کہا۔

"لیجئے نشاط! آپ کی ملازمت پکی ہو گئی۔"

"ہاں بلا معاوضہ ملازمت۔" دادا جان نے ہنستے ہوئے کہا۔

زاہد نشاط کو اس کی جگہ لے آیا اور اسے اس کے کام کے بارے میں تفصیلات بتانے لگا۔ نشاط دوسری تمام باتوں کی طرف سے غیر متعلق ہو کر اپنے فرائض سمجھنے لگی تھی۔ پھر اس نے پُراطمینان انداز میں کہا۔

"یہ سب کچھ میں بڑی آسانی سے کر سکتی ہوں۔ بلکہ مجھے انتہائی خوشی ہو گی ظفر صاحب!"

"نہیں زاہد۔" زاہد نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"اوہ معافی چاہتی ہوں۔ آج کے بعد کبھی میرے منہ سے ظفر نہیں نکلے گا۔" نشاط نے کہا۔

"شکریہ!" زاہد نے گردن ہلاتے ہوئے کہا اور پھر بولا۔ "اب مجھے اجازت!"

"ہاں ٹھیک ہے آپ اپنا کام کیجئے اور مجھے اپنا کام کرنے دیں۔" نشاط نے کہا۔

زاہد پتہ نہیں کیوں نشاط کے کردار سے بے حد متاثر ہوا تھا۔ اول تو یہ اس شخص کی بیٹی تھی جس نے زاہد کی زندگی بنا دی تھی اور پھر خود اس کی اپنی شخصیت بھی ایسی نہیں تھی کہ زاہد اسے نظر انداز کر سکتا۔ اس کا پُروقار انداز زاہد کو بہت پسند آیا تھا۔ اس نے کس خاموشی کے ساتھ زاہد کے راز کو راز رکھا تھا اور زاہد کو یقین تھا کہ وہ زندگی بھر اس کا راز افشا نہیں کرے گی۔ ایسی قابلِ اعتماد لڑکی اس کے لئے قابلِ احترام نہ ہوتی تو کیا ہوتا۔

بہر طور نشاط کو اس کی جگہ مصروف کرنے کے بعد وہ اپنے کام میں مشغول ہو گیا۔ کسی بھی سلسلے میں وہ بہت زیادہ توجہ نہیں دے سکتا تھا۔ اس کی مصروفیات ہی ایسی تھیں۔

ان دنوں قدسیہ کے سلسلے میں خاص طور سے وہ الجھا ہوا تھا۔ اسے ڈر تھا کہیں یہ بات زیادہ آگے نہ بڑھ جائے اور اسے قدسیہ کے لئے محنت نہ کرنی پڑے۔ عازم اور فاخرہ کے سلسلے میں اس نے جو کچھ کیا تھا، وہ اسے آج تک یاد تھا۔ بہر طور ہر بار اسے کامیابی نصیب نہیں ہو سکتی تھی۔

ویسے اس نے مرحلے وار اس سلسلے میں مدافعت کا یقین کر لیا تھا۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ پہلے وہ اپنی سی کوششیں کرے گا اور اس کے بعد حالات اگر بالکل ہی چوپٹ ہو گئے تو پھر دادا جان زندہ باد۔ دادا جان یہاں کے معاملات میں آخری قوت تھے اور یقیناً یہ قوت معمولی نہیں تھی۔ شجاع احمد صاحب بھی اس سے کانپتے تھے۔

حالات مناسب ہی چل رہے تھے۔ بہر طور زاہد اپنے دفتر میں بیٹھا پروگرام بناتا رہا۔ بہت سے فیصلے کئے تھے اس نے اور اپنے ان فیصلوں سے وہ مطمئن تھا چنانچہ اسی دن جالب صاحب کو تعویذِ محبت فراہم کر دیا گیا۔

ایک بڑے سے چمڑے کے پیکٹ میں جس کی لمبائی چوڑائی ڈھائی تین انچ سے کم نہیں تھی۔ پتہ نہیں کیا کیا ٹھونس کر اسے سلوا لیا گیا تھا اور یہ پیکٹ یعنی تعویذ جالب صاحب کے گلے میں پہنچ گیا۔ رستے پر چلنے کی مشق کے بارے میں بھی اس نے جالب کو بہت سی ہدایات دے دی تھیں لیکن شرائط ہی بتائی تھیں کہ وہ کسی سے اس بارے میں کچھ نہیں کہیں گے۔

جالب صاحب کا اپر چیمبر واقعی خالی تھا۔ سیدھا سادہ آدمی تھا۔ زندگی کے کسی چھل فریب میں حصہ نہیں لیا تھا۔ قدسیہ کی جانب اسے زبردستی متوجہ کیا جا رہا تھا کیونکہ کرنل ضرغام بھی یہی چاہتے تھے کہ دوستی کا یہ رشتہ اور مضبوط ہو جائے۔ ورنہ اسے ذاتی طور پر دلچسپی کسی سے بھی نہیں تھی۔

بہر طور والدین کی ہدایات پر بھی عمل کرنا تھا۔ تعویذِ محبت گلے میں لٹکا لیا گیا۔ زاہد نے اسے کچھ خصوصی ہدایات دے دی تھیں جس کا مظاہرہ رات کو کھانے کی میز پر ہو گیا۔

وہ جان بوجھ کر شجاع احمد صاحب کے نزدیک بیٹھا تھا۔ تعویذ سینے کے اوپر پڑا ہوا صاف نظر آ رہا تھا۔ دوسرے لوگوں نے بھی اسے دیکھا اور کسی قدر حیرت کا اظہار کیا۔ شجاع احمد صاحب کی نگاہ ابھی تک اس پر نہیں پڑی تھی۔ زاہد نے اس سے کہا تھا کہ یہ تعویذ لڑکی اور لڑکی کے باپ دونوں کو رام کرنے کے لئے ہے۔ چنانچہ جب شجاع احمد یا قدسیہ اس کے قریب ہوں تو وہ تعویذ سے انہیں ہوا دے۔ تھوڑی بہت ہوا ان تک ضرور پہنچنی چاہیئے۔ چنانچہ جالب صاحب نے موقع پاتے ہی اپنا کام کر ڈالا۔ انہوں نے تعویذ کو ہاتھ میں پکڑا اور اسے شجاع احمد کے سامنے جھلانے لگے۔ شجاع احمد صاحب نے چونک کر انہیں دیکھا تھا۔ ایک لمحے کے لئے تو وہ کچھ نہ سمجھ سکے۔ پھر انہوں نے متعجبانہ انداز میں پوچھا۔

"یہ کیا ہے میاں؟"

"جی وہ کچھ نہیں، کچھ نہیں۔" جالب صاحب نے زور زور سے تعویذ اس کے سامنے جھلانا شروع کر دیا۔

"ارے ارے یہ کیا ہو گیا ہے تمہیں بھئی؟" انہوں نے بڑے

تعجب خیز انداز میں پوچھا اور جالب صاحب نے اپنا کام ختم کرنے کے بعد تعویذ قمیص کے نیچے کر لیا۔

"آخر یہ سب کچھ کیا ہے بھئی؟" کرنل ضرغام صاحب نے بھاری لہجے میں پوچھا۔

"وہ... وہ ڈیڈی کچھ نہیں، کچھ نہیں، بس ضرورت تھی۔"

"کیا ہو گیا ہے تمھیں۔ یہ کیا فضول حرکتیں کر رہے تھے۔ کیا ضرورت تھی تمھیں؟"

"وہ جی، بب... بس، اب تو کچھ بھی نہیں۔ یہ دیکھ لیجیے، یہ دیکھ لیجیے۔" جالب صاحب نے کہا اور اپنا سینہ سامنے کر دیا۔ کرنل ضرغام، شجاع احمد صاحب اور دوسرے تمام لوگ جالب صاحب کو حیرت سے دیکھ رہے تھے لیکن جالب صاحب نے سختی سے ہونٹ بھینچ لیے تھے۔ کیونکہ انھیں یہ ہدایت کر دی گئی تھی کہ اگر اس کے بارے میں کسی کو بتایا گیا تو پھر اس کے اثرات ختم بلکہ اُلٹے بھی ہو سکتے ہیں چنانچہ وہ ان اُلٹے اثرات کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں تھے لیکن تمام لوگ ناگواری سی محسوس کر رہے تھے۔

جالب صاحب کی یہ حرکت اتنی تعجب خیز تھی کہ کسی کو اس بات پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ بہرطور خاموشی اختیار کر لی گئی۔ اس سلسلے میں کوئی بھی باز پرس نہیں کی گئی تھی۔

کرنل ضرغام بھی تھوڑی دیر کے بعد اس حرکت کو بھول گئے۔

پتہ نہیں جالب کو کیا سوجھی تھی لیکن چند ہونٹوں پر مسکراہٹیں رقصاں تھیں۔ گو وہ بھی اس تعویذ کے بارے میں کچھ نہیں جانتے تھے لیکن جالب کی یہ حرکت خاصی دلچسپ تھی۔

کھانے کے بعد وہ سب اُٹھ گئے۔ کرنل ضرغام شجاع احمد صاحب سے باتیں کرنے لگے تھے۔ دوسرے دن غالباً شام کے چار بجے تھے۔ جب شجاع احمد صاحب نے جالب کی ایک اور حرکت دیکھی۔ وہ یونہی ٹہلتے ہوئے اس طرف آ نکلے تھے۔

انھوں نے دیکھا کہ جالب رسّی پر چلنے کی مشق کر رہا ہے۔ یہ رسّی دو درختوں کے تنوں سے بندھی ہوئی تھی۔ خاصی مضبوطی سے باندھی گئی تھی اور جالب سرکس کے کسی مداری کی طرح اس پر چل رہا تھا۔ ابھی وہ دو چار قدم ہی چلا تھا کہ دھڑام سے نیچے آ پڑا۔ اس کے بعد دوبارہ اُٹھا اور رسّے پر چڑھ گیا۔ شجاع احمد صاحب ناگواری سے... اُسے دیکھنے لگے تھے پھر وہ جالب کے نزدیک پہنچ گئے۔ جالب نے بھی ابھی تک ان پر توجہ نہیں دی تھی۔

"یہ کیا ہو رہا ہے؟" انھوں نے سخت لہجے میں پوچھا اور جالب جو رسّے کے تقریباً چار پانچ فٹ آگے آ گیا تھا۔ دھڑام سے نیچے گر پڑا۔ اس نے شجاع احمد صاحب کی طرف دیکھا اور جلدی سے اُٹھ کھڑا ہوا پھر اُس نے تیزی سے اپنے گریبان میں ہاتھ ڈال کر تعویذ نکالا اور پھر شجاع احمد کے سامنے پہنچ کر اُسے زور زور سے ہلانے لگا۔

"یہ کیا حرکت ہے تمھاری؟ کیا تم مجھے بے وقوف سمجھتے ہو؟"

"جی نہیں... جی نہیں" جالب بڑی جلدی جلدی تعویذ کی ہوا شجاع احمد صاحب کو دینے لگا۔ تعویذ ان کے چہرے کے اتنا قریب آ گیا تھا کہ شجاع احمد صاحب کو اپنا چہرہ پیچھے ہٹانا پڑا۔ انھوں نے آہستہ سے تعویذ اپنے ہاتھ میں پکڑ لیا اور اس کے بعد بولے "کیا تم نشے میں ہو؟"

"ج جی نہیں۔"

"تو پھر یہ کیا حرکت ہے؟"

"کچھ نہیں، کچھ نہیں۔"

"رسّے پر کیوں چل رہے تھے؟"

"بس چل رہا تھا۔ دیکھیے میں ابھی آپ کو رسّے پر چل کر دکھاتا ہوں۔ اگر آپ نہ ٹوکتے تو میں نیچے نہ گرتا۔" جالب نے کہا اور جلدی سے درخت کے تنے پر چڑھ کر رسّے پر چلنے کی کوشش کرنے لگا لیکن وہ مشکل سے تین چار قدم ہی چلا ہو گا کہ ایک بار پھر دھڑام سے نیچے آ گرا۔

شجاع احمد صاحب غصیلی نگاہوں سے اُسے گھورتے رہے۔ پھر انھوں نے کہا۔

"عجب نامعقول لڑکا ہے۔ ممکن ہے کسی نشے کا عادی ہو۔ میں اس سلسلے میں کرنل ضرغام سے بات کروں گا۔" انھوں نے بڑبڑانے کے سے انداز میں کہا اور وہاں سے چل پڑے۔

جالب کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی۔ پہلا کورس مکمل ہو گیا تھا لیکن ابھی رسّی پر چلنے کی مشق کرنا باقی تھی چنانچہ ایک بار پھر وہ رسّے پر چڑھ گئے۔

★★

فیصل نے زاہد کو اس بارے میں بھی رپورٹ مہیا کر دی تھی۔ وہ ہر اس کام کی تاک میں رہتا تھا جو ذرا دلچسپ اور اجنبی ہو۔ چنانچہ زاہد کو یہ تفصیلات فراہم کی گئیں تو زاہد اُچھل پڑا۔

"کیا واقعی؟ کیا واقعی ایسا ہو گیا ہے؟"

"جی ہاں! میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔"

"اس وقت جالب کہاں ہے؟"

"اپنے کمرے میں ہوں گے۔ کیوں؟"

"ذرا ایک منٹ کے لیے اُسے بُلا کر لے آؤ لیکن ہوشیاری کے ساتھ

کسی اور کو اس بارے میں پتہ نہ چلے" زاہد نے کہا اور فیصل چلا گیا تھوڑی دیر کے بعد جالب زاہد کے سامنے موجود تھا۔

"بس فیصل میاں تمہارا کام ختم ہو گیا ہے اب تم جاؤ۔ میں ذرا جالب صاحب سے تھوڑی سی گفتگو کروں گا" زاہد صاحب نے کہا اور فیصل وہاں سے چلا گیا۔

"ہاں جالب صاحب! سنا ہے آپ بڑی کامیابی کے ساتھ اپنی منزل کی جانب گامزن ہیں"

"جی ہاں، جی ہاں، اچھی خاصی ہوا دے چکا ہوں انکل شجاع احمد صاحب کو، لیکن بگڑ رہے تھے۔"

"یہ تو ہونا ضروری تھا۔ تعویذ کہاں ہے؟" زاہد نے پوچھا۔

"میرے گلے میں موجود ہے"

"بس اب اس کا کام ختم ہو گیا۔ تم اسے مجھے واپس کر دو۔"

"جی بہتر ہے" جالب نے کہا اور گردن سے تعویذ نکال کر زاہد کے حوالے کر دیا۔

"ایک بات سن لو جالب میاں، اگر تم نے کسی سے اس تعویذ کا ذکر کر بھی دیا تو تم پر ایسی نحوستیں اور تباہی نازل ہو گی کہ تم اس کا تصور نہیں کر سکتے ممکن ہے تم اپنے چاروں ہاتھ پیروں سے محروم ہو جاؤ۔ یہ ایسا ہی تعویذ تھا لیکن رسّے پر چلنے کی مشق جاری رہنی چاہیئے اور میں تم سے کہہ چکا ہوں۔ کہ صحیح صورتِ حال کا پتہ کسی کو چلنے بھی نہیں دینا چاہیے تم پر کتنی ہی سختیاں کیوں نہ کی جائیں"

"زاہد بھائی! آپ میرے لئے جو کچھ کر رہے ہیں۔ اس کا میں تہہ دل سے ممنون ہوں۔ آپ جو ہدایت کریں گے۔ اس سے بھلا کبھی انکار کیا جا سکتا ہے"

"شکریہ میرے شیر، بس اپنے کام میں مصروف رہو، تم دیکھنا چند ہی روز میں کیا سے کیا ہو جائے گا۔"

"آپ مطمئن رہیں، مجھ پر کتنی ہی سختی کی جائے میں اس سلسلے میں کسی کو کچھ نہیں بتاؤں گا"

"جیتے رہو۔ جیتے رہو۔ بس اب جاؤ" اور جالب صاحب وہاں سے چلے گئے لیکن ابھی ان کی مصیبت ختم نہیں ہوئی تھی۔

اندر پہنچے تو کرنل ضرغام نے طلب کر لیا۔ کرنل ضرغام کے کمرے میں شجاع احمد صاحب بھی بیٹھے ہوئے تھے۔ کرنل ضرغام تلخ نگاہوں سے جالب صاحب کو دیکھ رہے تھے۔

"کون سا نشہ کرتے ہو؟" انھوں نے جالب سے پوچھا۔

"جی۔۔۔ نن نشہ۔۔۔؟" جالب صاحب کے منہ سے ایکدم متحیرانہ انداز میں نکلا۔

"ہاں نشہ!"

"تم! میں تو بالکل نہیں کرتا"

"پھر فضول حرکتیں کیوں کرنے لگے ہو؟"

"تم میں نہیں سمجھا"

"وہ تمہارے گلے میں کیا تھا۔ جسے تم شجاع احمد صاحب کے سامنے لہرا رہے تھے؟"

"کک کچھ بھی نہیں، کچھ بھی تو نہیں"

"ادھر آؤ" کرنل صاحب دہاڑے اور جالب ان کے قریب پہنچ گیا۔ کرنل صاحب نے جالب کے گریبان میں ہاتھ ڈال لیا تھا لیکن شکر ہے تعویذ اس وقت موجود نہیں تھا۔

"وہ تمہارے گلے میں جو چیز پڑی ہوئی تھی وہ کہاں گئی جسے تم پچھلی رات شجاع احمد صاحب کے سامنے ہلا رہے تھے"

"کچھ نہیں تھی بس۔ ایسے ہی" جالب صاحب نے کرنل صاحب سے شرماتے ہوئے کہا۔

"ایسے ہی کے بچے میں پوچھتا ہوں کیا تھا وہ؟"

"کچھ نہیں تھا" جالب صاحب نے جواب دیا۔

"اور درختوں کے درمیان رسّہ باندھ کر اس پر چلنے کی مشق کیوں ہو رہی تھی؟"

"بس ہو رہی تھی"

"دماغ خراب ہو گیا ہے تیرا۔ اس سے پہلے تو تُو ایسی حرکتیں کبھی نہیں کرتا تھا"

"کرتا تھا ڈیڈی مگر آپ سے چھپ کر"

"کیا مطلب؟"

"جی ہاں، یہ میرا شوق ہے"

"یہ شوق کب سے تمہیں پیدا ہوا اور کیوں پیدا ہوا؟" کرنل ضرغام غصے سے بولے۔

"اس سلسلے میں میں آپ کو کچھ نہیں بتا سکتا" جالب نے کہا۔

"کیا دماغ خراب ہو گیا ہے جالب؟ مجھے جانتا ہے؟" کرنل ضرغام صاحب غصے سے بولے۔

"جی ہاں جانتا ہوں۔ مجھے اپنا مستقبل خود بنانا ہے۔ آپ مجھے اس سے نہیں روک سکتے" جالب صاحب نے جواب دیا اور غصے سے پاؤں پٹختے ہوئے کمرے سے باہر نکل آئے۔ بھلا اس سلسلے میں وہ اب کسی کو کیا بتا سکتے تھے۔ کرنل صاحب کی زیادتی تھی نا، یہ خود ہی تو انھیں قدسیہ کی جانب متوجہ کیا تھا اور اب وہ اس سلسلے میں کوششیں کر رہے تھے تو اس میں رکاوٹ بھی بن رہے تھے اب جیسا بھی ہو گا یہ عمل تو انجام دینا ہی ہے۔۔۔ چاہے

جیسے بھی ہیں، بے چارے زاہد کو کیوں بدنام کیا جائے۔ بلاوجہ اس کا نام سامنے آئے گا تو اس کے لئے بھی مصیبتیں پیدا ہوں گی۔ جالب صاحب زاہد سے بہت مخلص تھے۔

لیکن دوسری طرف کرنل ضرغام شجاع احمد سے کہہ رہے تھے۔

"ایسا کبھی نہیں ہوا شجاع احمد، ایسا کبھی نہیں ہوا۔ یہ تو بڑا سعادت مند بچہ تھا۔ پتہ نہیں کیا ہو گیا؟"

"کیا کہا جا سکتا ہے۔ آپ اس بات کا جائزہ لیں۔ یہ کسی نشے کا عادی تو نہیں ہے؟" شجاع احمد صاحب متفکرانہ لہجے میں بولے۔

"سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس سے قبل اس نے ایسا کبھی سوچا بھی نہیں ہو گا۔ پتہ نہیں کیا ہو گیا ہے اسے؟" کرنل ضرغام صاحب فکرمندی سے بولے۔

"اچھا اب میں چلتا ہوں۔" شجاع احمد صاحب نے کہا اور کرنل ضرغام کے کمرے سے باہر نکل گئے۔

✽

زاہد خود ہی ناظم علی صدیقی کی کوٹھی پہنچا تھا۔ سحر سے برآمدے میں ہی ملاقات ہو گئی۔ وہ پُرتپاک انداز میں زاہد کی طرف بڑھی تھی۔

"ہیلو زاہد! کیسے ہیں آپ؟"

"جیسا بھی ہوں آپ کے سامنے ہوں۔" زاہد نے جواب دیا۔

"آئیے، آئیے، اندر آئیے۔" سحر صدیقی ڈرائنگ روم کی طرف بڑھتے ہوئے بولی۔

"ڈیڈی کہاں ہیں آپ کے؟"

"ڈیڈی کہیں گئے ہوئے ہیں، کیوں کوئی کام تھا آپ کو؟" سحر نے پوچھا۔

"نہیں کوئی خاص کام نہیں تھا۔ یونہی آپ لوگوں سے ملنے چلا آیا۔ پتہ نہیں کیوں آپ لوگوں سے اتنی اُنسیت ہو گئی ہے۔" زاہد نے اُسے جواب دیا۔

"میں جانتی ہوں کہنے کی کیا بات ہے۔" سحر بولی۔

"آپ تنہا ہیں؟"

"ہاں بور ہو رہی تھی۔ سوچ رہی تھی کہاں جاؤں۔ تمہاری طرف آنے میں تو اب تکلف سا محسوس ہونے لگا ہے۔"

"کیوں بھئی...؟"

"بس فرسٹ ایڈ ہاؤس میں تم لوگ اتنے مصروف ہوتے ہو کہ وہاں جا کر یوں محسوس ہوتا ہے جیسے تمہارا وقت ضائع کیا جا رہا ہے۔ باقی رہی شجاع احمد صاحب کی کوٹھی تو وہاں جانے کو جی ہی نہیں چاہتا۔ اب اس میں رکھا ہی کیا ہے۔"

"جی ہاں، جی ہاں، ہم تو جیسے کوئی حیثیت ہی نہیں رکھتے۔"

"نہیں، صرف تمہاری بات الگ ہے زاہد۔ ایمان سے تم بہت ہی سوئیٹ انسان ہو۔"

"آپ سرفراز کے گھر نہیں گئیں؟"

"گئی تھی، دو دفعہ جا چکی ہوں مگر سرفراز سے ملاقات ہی نہیں ہوئی۔ فرسٹ ایڈ ہاؤس میں بھی ٹیلی فون کر کے پوچھا تو پتہ چلا کہ سرفراز نہیں ہیں ویسے زاہد ایک بات کہنا چاہتی ہوں۔ بہت غور و خوض کر رہی تھی اس سلسلے میں، یوں محسوس ہوا تم سے مشورہ لئے بغیر کام نہ بنے گا نہیں۔"

"زاہد حاضر ہے۔" زاہد نے سینے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

"سرفراز کے دل کا حال مجھے آج تک نہیں معلوم ہو سکا۔ جتنے مناسب طریقے تھے ان کے ذریعے میں نے اُسے اپنے بارے میں بتانے کی کوشش کی لیکن اس کے مُنہ سے ایک لفظ بھی نہیں سُن سکی۔"

"بات تو واقعی تشویش کی ہے۔ ویسے سحر صاحبہ! آپ نے بھی تو اپنے دل کا راز مجھے نہیں بتایا۔" زاہد نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"تو بتانے کی ضرورت باقی رہ جاتی ہے۔ میں تو ذرا صاف ستھری طبیعت کی مالک لڑکی ہوں۔ جو دل میں ہوتا ہے وہی زبان پر۔ کتنی بار اس کا اظہار کیا کہ میں سرفراز کو اپنی زندگی میں داخل کرنا چاہتی ہوں۔ ساری پیش کشیں اسی لئے تھیں زاہد، اگر آپ یقین کریں تو پینٹنگ خریدنے کا معاملہ بھی یہی تھا۔ بے شک مجھے آرٹس اور فنونِ لطیفہ سے دلچسپی ہے۔ لیکن سرفراز کی وجہ سے یہ دلچسپی کچھ اور بڑھ گئی ہے۔"

"ویسے سحر صاحبہ! معاف کیجئے گا آپ اس فن کو سیکھنے کی خواہش مند بھی تو تھیں۔"

"ہاں تھی لیکن صرف اس لئے کہ سرفراز کی توجہ نصیب ہو جائے جس سے اب تک محروم رہی ہوں۔" سحر نے آزردگی سے کہا۔

"ہوں، دراصل کچھ لوگ بہت موٹی عقل کے مالک ہوتے ہیں خاص طور سے ان معاملات میں۔ میرا خیال ہے آپ کو کھل کر سرفراز سے بات کرنی چاہئے تھی یا اگر آپ اس کا کوئی اور بہترین طریقہ مجھ سے پوچھنا چاہیں تو میں عرض کروں گا کہ اپنے دل کا تمام حال لکھ کر ایک خط میں سرفراز کو روانہ کر دیں اور اس سے کہیں اس کا جواب دے۔"

"بات تو کافی حد تک جچتی ہوئی ہے۔" سحر صدیقی نے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

"تو پھر آپ میری زیرِ نگرانی خط لکھ دیجئے گا۔"

"مجھے یہ خط لکھتے ہوئے شرم آئے گی۔ بھلا تمہارے سامنے کیسے اُسے خط لکھ سکتی ہوں؟"

"کمال ہے ابھی تو آپ نے کہا کہ آپ بہت صاف ستھرے مزاج کی

مالک ہیں۔ جب ایک بات آپ نے اس انداز میں مجھ سے کہہ دی تو پھر بھلا شرمانے کی کیا ضرورت ہے؟"

"تو پھر تم ہی مجھے گائیڈ کرو۔"

"چلئے، رائٹنگ ٹیبل پر چلئے۔" زاہد نے کہا اور پھر وہ سحر سے خط لکھوانے لگا۔

اس خط میں اُس نے وہ تمام ضروریات مدِنگاہ رکھی تھیں جو اس کے اپنے ذہن میں موجود تھیں اور اس کے پروگرام کا ایک حصّہ تھیں۔ اتفاق کی بات تھی کہ وہ سحر کے پاس جس مقصد کے لئے آیا تھا وہ خود بخود پُورا ہو گیا تھا اور اسے اس سلسلے میں مزید کچھ گفتگو کرنے کی ضرورت پیش نہیں آئی تھی۔ سحر نے خود ہی اس سے اس کا تذکرہ کر دیا تھا۔ ورنہ زاہد کے اپنے ذہن میں بھی یہی تھا کہ سحر صدیقی کو اس سلسلے میں ضرور استعمال کرے گا۔

"خط لکھنے کے بعد زاہد نے اس پر مطمئن انداز میں نگاہ ڈالی اور گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے، اب نیچے اپنا نام لکھ دیجئے۔"

"لیکن اس میں، میں نے ایک بار بھی سرفراز کو مخاطب نہیں کیا ہے۔"

"یہی تو ذہانت کی بات ہے۔ سمجھنے والا خود ہی سمجھ لے گا۔ اگر خط کسی اور کے ہاتھ پڑ بھی گیا تو آپ کو کوئی پریشانی نہیں ہوگی۔" سحر کچھ نہ سمجھنے والے انداز میں گردن ہلانے لگی تھی۔

سحر کی پُرسحر شخصیت ایسی ہی تھی کہ وہ ہر شخص کو باآسانی شیشے میں اُتار لیتا تھا۔ خط بند کر کے لفافے میں رکھ دیا گیا اور پھر سحر نے کہا۔

"لیکن اسے پہنچانے کی ذمّے داری کون قبول کرے گا؟"

"اگر آپ چاہیں تو خادم یہ فرض انجام دے سکتا ہے۔"

"تو... تو آپ... آپ یہ خط سرفراز کو دیں گے؟"

"نہیں... میں اس طرح یہ خط اس کے کمرے میں ڈال دوں گا کہ کسی کو پتہ بھی نہیں چل سکے گا کہ یہ کیسے پہنچا ہے۔"

"تب پھر ٹھیک ہے۔ یہ زیادہ اچھا ہوگا۔" سحر نے کہا۔

زاہد کافی دیر تک سحر سے باتیں کرتا رہا اور پھر وہاں سے چلا آیا۔

جالب صاحب کے سلسلے میں کام کرنے کے لئے یہ بات اس کے پروگرام میں شامل تھی لیکن اتنی جلدی یہ کام ہو جائے گا۔ اُس کی اُسے اُمید ہی نہیں تھی۔

خط سرفراز کے کمرے میں پہنچنے کی بجائے جالب صاحب کے کمرے میں پہنچا تھا اور فیصل کی ڈیوٹی لگا دی گئی تھی کہ وہ جالب صاحب کے معاملات پر نگاہ رکھیں۔

اور یہی ہُوا۔ فیصل نے جو رپورٹ دی وہ بے حد دلچسپ تھی۔

"جالب صاحب نے خط پڑھا اور پڑھ کر بُری طرح چونکے۔ جب سے انھوں نے خط پڑھا ہے وہ بُری طرح پریشان ہیں۔" فیصل نے زاہد کو بتایا۔

"گڈ، ویری گڈ فیصل، تم نہایت کام کے آدمی ہو۔ اب ٹیپ ریکارڈر جالب صاحب کے کمرے میں اور کرنل ضرغام کے کمرے میں ہونا چاہیئے۔ فی الحال یہ دونوں جگہیں ہمارے لئے بہت اہمیت رکھتی ہیں۔ ہمیں ان کے بارے میں تفصیلی رپورٹ درکار ہوگی۔"

"اوکے چیف، آپ کی ہدایت پر عمل کیا جائے گا۔ ان دونوں جگہوں کی رپورٹیں آپ کو مل جائیں گی۔" فیصل نے جواب دیا۔ زاہد اپنی کارروائی سے خاصا مطمئن نظر آرہا تھا۔

کام یونہی جاری رہا لیکن فیصل کی طرف سے کوئی خاص رپورٹ نہیں مل سکی تھی۔ البتہ دوسرے دن جالب صاحب فرسٹ ایڈ ہاؤس پہنچ گئے ڈرائیور کے ساتھ آئے تھے۔ غالباً انھوں نے فرسٹ ایڈ ہاؤس آنے کی فرمائش کی ہوگی۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ زاہد کو تلاش کرتے ہُوئے زاہد کے پاس پہنچ گئے۔ زاہد نے اپنے دفتر میں ان کا استقبال کیا تھا۔ جالب صاحب شکل ہی سے پریشان نظر آرہے تھے۔ کرسی پر بیٹھ کر گھبرائے ہوئے انداز میں بولے۔

"زاہد بھائی معاملہ کچھ اُلٹ گیا ہے۔ یہ سحر وہی لڑکی ہے نا خوبصورت سی جس سے آپ نے ہمارا تعارف کروایا تھا؟"

"میں نے تو نہیں کرایا تھا لیکن سحر کے بارے میں آپ کیوں سوال کر رہے ہیں جالب صاحب؟"

"وہ بس دراصل کچھ کچھ ایسے ہی... ایسے ہی..."

"ہاں ہاں، خیریت تو ہے بھئی کیا ہُوا۔ آخر بات کیا ہے؟"

"وہ... وہ زاہد بھائی، اب آپ سے کیا چھپانا۔ مجھے سحر کا ایک خط ملا ہے۔ پتہ نہیں کیسے میرے پاس پہنچا۔ مجھے اپنے کمرے کے دروازے پر پڑا ہُوا ملا تھا۔"

"سحر کا خط؟" زاہد نے متعجبانہ انداز میں پُوچھا۔

"ہاں زاہد بھائی! سو فیصدی اس کا ہے، میرے لئے لکھا ہے۔"

"ذرا دکھاؤ تو سہی۔" زاہد نے کہا اور جالب نے خط نکال کر زاہد کے حوالے کر دیا۔ زاہد خط پڑھتا رہا تھا اور پھر اس کے چہرے پر غم کے تاثرات نمایاں ہوگئے۔

"آہ!" اس نے ایک ٹھنڈی سانس بھر کے کہا اور جالب صاحب چونک پڑے۔

"کیا ہُوا زاہد بھائی! کیا ہُوا؟"

"محبت بھی عجیب چیز ہے۔ سحر وہ لڑکی ہے جس کے لئے بے شمار لوگ

کوششیں کرتے رہے لیکن ناکام ہوگئے۔ بہت ہی نفیس فطرت کی مالک ہے۔ کروڑوں روپے کی جائیداد کی تنہا مالک۔ لیکن دیکھو کیا ہو جاتا ہے انسان کو، آخر تمھاری محبت میں گرفتار ہوگئی۔"

"تم! میری محبت میں؟"

"ہاں! کاش تم اس خط کی زبان سمجھ سکتے۔ کاش ان الفاظ میں چھپی ہوئی گہرائیوں کو تم سمجھ سکتے جالب۔"

"اوہ زاہد بھائی! یہ تو بڑی گڑبڑ ہوگئی۔ اب میں کیا کروں؟"

"یہ فیصلہ تمھیں خود ہی کرنا ہے جالب!"

"مم مجھے؟"

"ہاں جالب، کیا تم کسی لڑکی کو زندگی سے محروم کرنا چاہتے ہو؟"

"گگ۔ کیا مطلب زاہد بھائی؟ تم میں نہیں سمجھا۔" جالب صاحب ہکلاتے ہوئے بولے۔

"جالب! اگر کوئی لڑکی مجھے اتنا محبت بھرا خط لکھتی تو میں ساری دُنیا کی نعمتیں ٹھکرا کر اُسے اپنی زندگی میں شامل کر لیتا۔"

"یہ ٹھیک ہے مگر اب میں کیا کروں؟ مجھے بتائیے۔"

"فیصلہ کرو۔ فیصلہ۔ مجھے تعجب ہے تعویذ کا اثر اُلٹا کیسے ہو گیا۔ ویسے تم نے تعویذ کے بارے میں کسی کو بتایا تو نہیں۔"

"کیسی باتیں کرتے ہو زاہد بھائی! آپ کی عزت میری عزت ہے بھلا میں تعویذ کے بارے میں بتا سکتا تھا کسی کو۔ چاہے میری جان ہی کیوں نہ چلی جاتی۔"

"تو اس خط کے بارے میں بھی تم کسی کو نہیں بتاؤ گے۔ یہ کسی لڑکی کی عزت کا سوال ہے جالب۔"

"میں کبھی ایسا نہیں کروں گا زاہد بھائی۔" جالب صاحب نے پُرجوش انداز میں کہا۔

"ویسے جالب ایک بات بتاؤ۔ تم نے مجھ سے کہا تھا کہ تم قدسیہ کو کسی خاص نگاہ سے نہیں دیکھتے۔"

"ہاں! میں نے غلط نہیں کہا تھا آپ سے۔"

"اور سحر کو؟"

"میں نے تو اسے بھی کسی خاص نگاہ سے نہیں دیکھا تھا۔ ویسے کافی خوبصورت لڑکی ہے۔ دراصل میں ان تمام باتوں پر بالکل غور نہیں کرتا زاہد بھائی۔"

"غور کرو میرے بھائی، غور کرو۔ ہر نوجوان کے لئے ان پر غور کرنا ضروری ہے۔ دیکھو جالب اگر شادی کرنا ہی ہے تو کسی ایسی ہستی کے ساتھ کرو جو تم پر جان دیتی ہو۔ اس طرح زندگی انتہائی حسین ہو جاتی ہے قدسیہ کو میں بُرا نہیں کہہ رہا لیکن میں محسوس کرتا ہوں کہ وہ بڑی نک چڑھی سی لڑکی ہے اور تمھیں اپنے جوتے کے برابر بھی نہیں سمجھتی۔"

"جوتے کے برابر؟" جالب صاحب نے اپنے جوتے کو بڑے غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"ہاں! اگر یقین نہ ہو تو کسی وقت اُسے آزما لو۔" زاہد نے پُرجوش لہجے میں کہا۔

"گگ کیسے آزماؤں؟"

"تم نے اس دن بتایا تھا مجھے کہ وہ تمھیں اپنے نگار خانے میں بالکل تنہا ہی چھوڑ کر کہیں نکل گئی تھی۔ اس سے کیا نتیجہ اخذ کیا تھا تم نے؟"

"کچھ بھی نہیں، کچھ سمجھ میں ہی نہ آسکا۔"

"اب سمجھ لو، وہ تمھیں اس قابل نہیں سمجھتی کہ تمھارے ساتھ کچھ وقت گزارے۔ ذرا غور کرو جو لڑکی اپنے نگار خانے میں تمھاری موجودگی برداشت نہ کر سکے اور تمھیں چھوڑ بھاگے وہ بھلا اپنی زندگی میں تمھاری شمولیت کیسے برداشت کر سکتی ہے؟"

"بالکل ٹھیک... بالکل ٹھیک... اب میں ایسا گیا گزرا بھی نہیں ہوں۔"

"گئے گزرے؟ میں کہتا ہوں لاکھوں میں ایک ہو تم۔ ایسے ہو جسے ساری دُنیا چاہے۔ میں کہتا ہوں جالب اپنی قدر پہچانو۔ اگر چاہو تو تجربہ کر سکتے ہو اس سلسلے میں۔" زاہد نے کہا۔

"تت... تجربہ وہ کیسے؟"

"قدسیہ سے تنہائی میں ملاقات کرو۔ کھل کر اس سے اظہارِ محبت کرو اور جائزہ لو کہ اس کے بعد وہ کیا چاہتی ہے۔"

"تو... تو آج ہی یہ کام کر لوں؟"

"ہاں! میرا خیال ہے اب تمھیں فیصلہ کر لینا چاہئے۔ میں اس سے پہلے کبھی تم سے سحر کے بارے میں نہ کہتا لیکن اس خط نے مجھے پریشان کر دیا ہے۔ میرا دل چاہ رہا ہے کہ میں خوب رووں۔ کیسا درد بھرا خط ہے وہ تم پر جان قربان کرتی ہے۔ تمھیں دُنیا میں سب سے زیادہ چاہتی ہے۔"

"ہاں مجھے بھی یہی اندازہ ہوا ہے اس خط کو پڑھ کر۔" جالب صاحب بولے۔

"بس تو پھر ٹھیک ہے جرأت سے کام لو۔ آج اس بات کا فیصلہ کر ڈالو۔ قدسیہ سے ملاقات کرو۔ اس سے پوچھو کہ اس نے تمھارے بارے میں کیا فیصلہ کیا ہے، وہ خوشی سے تمھاری زندگی میں شامل ہونے کو تیار ہے یا نہیں؟"

"اور اگر وہ تیار ہوگئی تو؟"

"تو پھر مجبوراً یہ سب کچھ قبول کر لو۔ یوں سمجھ لو کہ تقدیر تمھاری

زندگی میں سحر کو شامل کرنا نہیں چاہتی۔"

"مگر میں اُسے کیسے ٹھکرا سکوں گا۔ اُس نے کتنا درد بھرا خط لکھا ہے" جالب صاحب نے گلوگیر لہجے میں کہا۔

"پہلے قدسیہ سے اس بارے میں بات کر لو اس کے بعد فیصلہ کر لیں گے جالب صاحب، یہ کوئی مشکل کام نہیں ہے۔" زاہد نے کہا۔

"تو پھر ٹھیک ہے میں آج ہی رات اس سے ملاقات کروں گا۔"

"بالکل، بالکل۔" زاہد نے جواب دیا۔ تھوڑی دیر بیٹھنے کے بعد جالب صاحب چلے گئے، زاہد نے وہ خط اپنے قبضے میں کر لیا تھا تاکہ وہ غلط ہاتھوں میں نہ پہنچ جائے۔

جالب کے جانے کے بعد اس نے قدسیہ سے رابطہ قائم کیا اور تھوڑی دیر کے بعد قدسیہ سے اس کی ملاقات ہو گئی تھی۔

"ہیلو قدسیہ! زاہد بول رہا ہوں۔"

"خیریت زاہد بھائی! ٹیلی فون کیوں کیا؟"

"ایک اہم سلسلے میں تم سے بات کرنا تھی۔"

"کیا بات ہے زاہد بھائی بتایئے۔ میں سن رہی ہوں۔" قدسیہ نے جواب دیا۔

"ٹیلی فون پر کوئی اور تو نہیں ہے؟"

"میرا خیال ہے نہیں، یہاں ایسی حرکت کوئی نہیں کر سکتا۔"

"دیکھو قدسیہ! تم جانتی ہو، آجکل میں کس مسئلے میں کام کر رہا ہوں اشارے کے لئے سرفراز کا نام لے دینا کافی ہے۔"

"جی ہاں! آگے کہیئے۔" قدسیہ نے کہا۔

"اس تمام کارروائی کے لئے مجھے کچھ سازشیں بھی کرنا پڑ رہی ہیں اور درحقیقت میں نے اپنی پوزیشن بڑی مشکوک بنالی ہے لیکن ظاہر ہے میں تم لوگوں کو ایسے ہی نہیں چھوڑ سکتا۔ آج رات جالب صاحب تم سے ملاقات کرنے کی کوشش کریں گے انھیں اس طرح دل برداشتہ کر دو کہ آئندہ وہ تمھاری طرف رخ بھی نہ کر پائیں۔"

"اوہ! کوئی خاص بات ہے کیا؟"

"ہاں بھئی کہا نا، سب کچھ اسی سلسلے میں کیا جا رہا ہے۔ زاہد کی زندگی انہی کاموں میں صرف ہو کر رہ گئی ہے۔"

"اکتا رہے ہیں زاہد بھائی۔" قدسیہ کی شرگیں آواز ابھری۔

"ارے نہیں! بھلا میں اپنی بہن قدسیہ کے کسی کام سے اکتاؤں گا۔ بس میں یہ چاہتا ہوں کہ یہ مرحلے جو تمھاری زندگی میں بار بار داخل ہو جاتے ہیں ختم ہو جائیں اور تم دونوں سکون کی زندگی پا لو۔" قدسیہ نے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔

"ہیلو!"

"جی ہاں سن رہی ہوں۔" وہ بولی۔

"تو پھر تم تیار ہو نا؟"

"آپ جو کہہ رہے ہیں وہ ضرور کروں گی۔ ویسے بھی یہ شخص کچھ عجیب سی شخصیت کا مالک نظر آتا ہے۔ بڑی کریہہ شخصیت کا مالک ہے پتہ نہیں کیوں اس کے سامنے طبیعت پر گھٹن سی سوار ہو جاتی ہے۔"

"ارے نہیں نہیں، اب ایسا بھی نہ کہو۔ اپنے ماں باپ کا اکلوتا بیٹا ہے۔" زاہد نے کہا اور قدسیہ نے ہنس کر فون بند کر دیا۔ اب زاہد اس نئے پروگرام کا نتیجہ جاننے کا خواہشمند تھا۔

★★

جالب صاحب نے آج کوئی اہتمام نہیں کیا تھا۔ سحر کا خط ان کی زندگی میں پہلا خط تھا۔ جو انھیں کسی لڑکی کی طرف سے موصول ہوا تھا اور اس خط نے واقعی انھیں بہت زیادہ متاثر کر دیا تھا۔ ویسے بھی سحر خوبصورت لڑکی تھی اور کوئی بھی اُسے نظر انداز نہیں کر سکتا تھا۔ ہاں ان سب سر پھروں کی بات دوسری ہے جو پہلے ہی کسی کے گھائل ہوں جیسے سرفراز، چنانچہ جالب صاحب قدسیہ کے کمرے میں داخل ہو گئے۔ اس طرح بغیر اجازت کے اندر آ جانا قدسیہ کو بہت ناگوار گزرا تھا لیکن وہ بھی جالب صاحب کی متوقع تھی۔

زاہد کا کھیل ایسا ہی ہوتا تھا۔ کوئی بھی بات وہ بلاوجہ نہیں کہتا تھا۔ یقیناً اس نے جالب صاحب کو بھی اس تمام معاملے کے لئے تیار کیا ہوگا۔

"جالب صاحب! آپ کو اجازت لے کر اندر آنا چاہیئے تھا۔" اس نے خشک لہجے میں کہا۔

"اوہ! میں بھول گیا۔ معافی چاہتا ہوں۔" جالب صاحب بوکھلائے ہوئے انداز میں بولے اور پھر سنبھل گئے۔ "ویسے میں تم سے دو ٹوک بات کرنے آیا ہوں قدسیہ۔"

"آپ آج ضرورت سے کچھ زیادہ ہی بے تکلف ہو رہے ہیں۔ خیریت تو ہے؟"

"ہاں! خیریت ہے۔ میں اب اس سے زیادہ کچھ نہیں کر سکتا۔ غضب خدا کا تعویذِ محبت گلے میں لٹکائے پھرا پھر شجاع احمد صاحب کو ہوا دیتا رہا، رستوں پر چلنے کی مشق کی لیکن محسوس کرتا ہوں کہ اب تک جو کچھ کیا ہے وقت ضائع کیا ہے۔"

"کیا، کیا، میں آپ کا مطلب نہیں سمجھی۔"

"نہ سمجھو، اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔"

"آپ مجھ سے لڑنے آئے ہیں جالب صاحب؟"

"نہیں، کہہ چکا ہوں کہ دو ٹوک فیصلہ کرنے آیا ہوں۔"

"یکس سلسلے میں؟"

"شادی کے سلسلے میں۔"

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ تم مجھ سے شادی کرو گی یا نہیں؟"

"آپ کا دماغ خراب ہو گیا ہے جالب صاحب؟"

"ممکن ہے ایسا ہی ہو۔ در اصل میں تو خود تم سے متاثر نہیں ہوں مگر میرے ڈیڈی چاہتے ہیں کہ تم سے میری شادی کر دی جائے۔ تم بتاؤ قدسیہ تمھاری اس سلسلے میں کیا رائے ہے؟"

"میری بہترین رائے یہ ہے کہ آپ فوراً یہاں سے دفعان ہو جائیے میں آپ پر تھوکنا بھی پسند نہیں کرتی۔ پتہ نہیں آپ کس غلط فہمی کا شکار ہو گئے ہیں۔ کرنل صاحب اگر ایک احمقانہ بات سوچ رہے ہیں تو مجھے اس سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔"

"سنو... سنو قدسیہ جھگڑا نہ کرو۔ اگر یہ بات ہے تو میں خود بھی بالکل تم سے متاثر نہیں ہوں۔ یقین کرو میرا مطمع نگاہ تو کچھ اور ہی ہے۔"

"تو آپ یہ بات کرنل صاحب سے کیوں نہیں کہہ دیتے۔"

"فوجی آدمی ہیں ان سے کہتے ہوئے ڈر لگتا ہے۔"

"میں کہہ دوں؟"

"ارے نہیں، پتہ نہیں وہ کیا سوچیں۔"

"ایسی کوئی بات نہیں ہے میں آپ کی مدد کر سکتی ہوں اس سلسلے میں۔"

"مدد۔" جالب صاحب نے پرخیال انداز میں کہا۔

"ہاں! نہایت سادگی سے۔ نہایت شرافت سے بس آپ کو اپنے قول پر قائم رہنا ہوگا۔"

"مم... میں... میں قائم تو رہ سکتا ہوں مم... مگر... مگر بڑی مشکل پیش آجائے گی۔ ڈیڈی کے سامنے تو میں بول ہی نہیں سکتا۔" جالب نے کہا۔

"بولنا پڑے گا آپ کو جالب صاحب، ورنہ میں ابھی جا کر ان سے شکایت کرتی ہوں کہ آپ اول تو بلا اجازت میرے کمرے میں گھس آئے۔ اوپر سے مجھ سے الٹی سیدھی باتیں کر رہے ہیں۔ اگر آپ میرا تعاون ہی چاہتے ہیں تو چلئے صاف صاف چل کر کہہ دیجئے کہ آپ کی کیا خواہش ہے۔"

"اوہ... اوہ... مم... میں، میں کیسے جاؤں گا پپ... پتہ نہیں ان کا کیا ردِعمل ہو۔"

"اور آپ یہ نہیں جانتے کہ میرا کیا ردِعمل ہو سکتا ہے اس بات پر؟"

"خدا رحم کرے، خدا رحم کرے میں تو دوسری مصیبت میں پھنس گیا۔ اب کیا کروں؟"

"اس کے علاوہ اور کوئی چارۂ کار نہیں ہے۔ جالب صاحب کہ میرے ساتھ کرنل صاحب کے کمرے میں چلئے اور صاف صاف ان سے کہہ دیجئے بلکہ آپ نہ کہئے میں خود ان سے کہہ دیتی ہوں آیئے۔" قدسیہ نے موقع غنیمت جانا جالب صاحب کی اس حرکت کو آگے بڑھایا جا سکتا تھا جو زاہد کے پروگرام میں نہیں تھا لیکن قدسیہ سمجھتی تھی کہ اس سے زاہد کا منصوبہ پایۂ تکمیل تک پہنچ سکتا ہے۔"

بمشکل تمام جالب صاحب اس کے ساتھ چلنے پر رضامند ہو گئے۔ قدسیہ تیز تیز قدموں سے کرنل ضرغام کے کمرے کی طرف جا رہی تھی۔ یہ دلچسپ بات تھی اور شاید تقدیر بھی یاور تھی کہ شجاع احمد صاحب بھی اس وقت کرنل ضرغام کے کمرے میں بیٹھے ہوئے تھے پتہ نہیں کیا گفتگو ہو رہی تھی۔ ان دونوں کو دیکھ کر دونوں ہی چونک پڑے کرنل ضرغام نے مسکراتی نگاہوں سے انھیں دیکھا اور بولے۔

"بھئی واہ۔ یہ بات تو ہمارے مطلب کی ہوئی ہے۔ کیوں بھائی شجاع احمد صاحب ذرا دونوں کو دیکھو۔ کیسے لگ رہے ہیں دونوں ساتھ ساتھ۔"

"میں آپ کو بتاؤں انکل کیسے لگ رہے ہیں۔" قدسیہ نے غصیلے لہجے میں کہا۔

"ارے کیا بات ہے بیٹے خیریت تو ہے؟"

"جی ہاں! بالکل خیریت ہے انکل۔ یہ جالب صاحب آپ سے کچھ کہنا چاہتے ہیں۔"

"مم... میں... کک... کچھ... کچھ نہیں کہنا چاہتا۔ مم... میں بھلا کیا کہوں گا۔"

"تو میں کہے دیتی ہوں۔ جالب صاحب ابھی تھوڑی دیر قبل بغیر اجازت میرے کمرے میں داخل ہوئے آتے ہی مجھ سے کہنے لگے کہ اس سلسلے میں مجھ سے دو ٹوک فیصلہ کرنے آئے ہیں۔ کیوں جالب صاحب میں نے غلط تو نہیں کہا؟" قدسیہ نے ان کی طرف دیکھ کر کہا اور جالب نے غیر اختیاری طور پہ گردن نفی میں ہلا دی۔

"میں نے پوچھا کہ کس سلسلے میں دو ٹوک بات کرنا چاہتے ہیں تو وہ فرمانے لگے کہ شادی کے سلسلے میں۔ جالب صاحب کا کہنا ہے کہ وہ مجھ سے ذرا بھی متاثر نہیں ہیں اور کسی بھی طور پر مجھ سے شادی کرنے پر آمادہ نہیں ہیں لیکن کرنل ضرغام صاحب انھیں اس کے لئے مجبور کر رہے ہیں وہ اس سلسلے میں میری مدد چاہتے ہیں۔ میں نے ان سے کہا کہ اگر ایسی بات ہے تو میں بھی کوئی گری پڑی لڑکی نہیں ہوں اور کسی بھی طور پر اس سلسلے میں آگے بڑھنے کو تیار نہیں ہوں چنانچہ جالب صاحب نے کہا کہ وہ یہ بات کرنل ضرغام صاحب سے نہیں کہہ سکتے۔ اگر میں ان کی مدد

کر سکوں تو کر دُوں اور مَیں اس مقصد کے لئے یہاں حاضر ہُوئی ہوں۔ ڈیڈی میں نے آپ کے سامنے بہت کم گفتگو کی ہے۔ خاص طور سے ایسے موضوعات پر میں نے ہمیشہ آپ کی عزت کی ہے۔ آپ کا احترام کیا ہے لیکن آپ کی خواہش ہے کہ میں کسی اندھے کنوئیں میں چھلانگ لگا دوں کیا یہ مناسب رہے گا؟ ڈیڈی جالب صاحب کے بارے میں جو کچھ کہہ رہی ہُوں یہ موجود ہیں ان سے پُوچھ لیجئے۔"

شجاع احمد صاحب کا چہرہ غصّے سے سُرخ ہو گیا تھا انھوں نے کرنل ضرغام کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"اس سے پُوچھو کرنل ضرغام۔ کیا یہ دُرست ہے؟"

"کیوں میاں! کیا فرماتے ہیں آپ؟" کرنل ضرغام نے طنزیہ انداز میں جالب صاحب کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"جج... جی ہاں... دو... دُرست ہے م... میں... قدسیہ سے شادی کرنا نہیں چاہتا۔"

"تو پھر اس سلسلے میں اس کے کمرے میں جا کر گھسنے کی کیا ضرورت تھی۔ اپنی والدہ محترمہ سے کہہ دیتے جو تمہارے غم میں دُبلی ہوئی جا رہی ہیں جاؤ دفعان ہو جاؤ میرے سامنے سے۔ نکل جاؤ کمرے سے۔" کرنل صاحب دھاڑے اور جالب کان دبا کر باہر نکل گیا۔ تب کرنل صاحب قدسیہ کی طرف متوجہ ہو کر بولے۔

"بیٹی! کوئی بھی ایسا کام نہیں کیا جائے گا جو تم بچّوں کی مرضی کے خلاف ہو۔ مجھے افسوس ہے کہ وہ کمینہ تمہارے لئے باعث زحمت بنا۔ نکال دو یہ تاثر اور یہ غصّہ اپنے ذہن سے۔ کبھی نہیں ہو گا بیٹے۔ ایسا کبھی نہیں ہو گا۔ تم اس سے لاکھ درجہ بہتر ہو۔ اچھا ہُوا یہ بات کُھل کر اس طرح سامنے آگئی ورنہ ہم دونوں مشکلات میں اُلجھے رہتے" کرنل صاحب کے الفاظ نے شجاع احمد صاحب کا غصّہ بھی کسی حد تک کم کر دیا تھا لیکن وہ طبیعت میں بڑا تکدر محسوس کر رہے تھے۔ انھوں نے قدسیہ کی طرف رُخ کر کے کہا۔

"جاؤ قدسیہ، اپنے کمرے میں جاؤ۔ جو کچھ ہُوا ہے اسے بُھول جاؤ اور اس کا تذکرہ کسی اور سے کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔"

"ٹھیک ہے ڈیڈی لیکن ایک بات میں آپ سے عرض کئے دیتی ہُوں اگر آپ میری شخصیت کو توڑ مروڑ کر خاک میں ملا دینا چاہتے ہیں تو اس کا بہتر طریقہ یہی ہے کہ اپنا پستول نکال کر اس کی گولیاں میرے دل میں اُتار دیجئے۔ میں آپ کی اس قسم کی باتوں کی متحمل نہیں ہو سکتی۔ اس سے قبل کہ میں جذباتی ہو جاؤں اور کوئی ایسا قدم اُٹھاؤں جو آپ کے وقار کے منافی ہوں آپ کو خود ہی اس بات کا خیال کر لینا چاہیئے۔" شجاع احمد صاحب لاکھ نک چڑھے تھے لیکن صُورتحال کچھ ایسی پیش آگئی تھی کہ وہ کچھ بھی نہ بول سکے۔ قدسیہ دندناتی ہُوئی کمرے سے باہر نکل گئی۔ اس کے ہونٹوں پر ایک پُراسرار سی مسکراہٹ پھیلی ہُوئی تھی۔ دل چاہ رہا تھا کہ جا کر فوراً زاہد کو اس سلسلے میں رپورٹ دے لیکن یہ مناسب نہیں تھا بلکہ اب تو نہایت محتاط رہنے کی ضرورت تھی۔ کم از کم اس سلسلے میں نہایت ٹھوس اور اہم قدم اُٹھ چکا تھا ورنہ جالب صاحب بُری طرح گلے پڑ گئے تھے اور شجاع احمد صاحب کی شخصیت کو وہ اچھی طرح جانتی تھی۔ ایک بار وہ ناکام ہو چکے تھے۔ بار بار کی ناکامی انھیں مکدر کر دیتی۔ چنانچہ اس نے جبر کیا اور زاہد نے بھی اس رات اس سے مُلاقات کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔

لیکن دوسری صبح موقع پاتے ہی اس نے قدسیہ سے رابطہ قائم کیا اور قدسیہ نے رات کی کہانی اُسے سنا دی۔

"زندہ باد قدسیہ! اب تماشہ دیکھو۔ بات کس طرح آگے بڑھتی ہے۔"

"بڑی آزمائش کی گھڑی میں ڈال دیا تھا آپ نے زاہد بھائی!"

"بھئی آزمائشوں سے گزرنے کے بعد ہی تو ہر مقصود حاصل ہوتا ہے خُدا حافظ" زاہد نے کہا اور قدسیہ مُسکرانے لگی۔

★★

اُسے جالب صاحب کی بدقسمتی ہی کہا جا سکتا تھا کہ اس دن زاہد بے پناہ مصروف تھا۔ اس کا کام اتنی پھُرتی سے ہو گیا تھا کہ اُسے خود اس کی توقع نہیں تھی۔ قدسیہ نے جو قدم فوری طور پر اُٹھایا تھا اس سے زاہد پُوری طرح مطمئن تھا اور اب سحر کو اس مسئلے میں ملوث کرنے کی ضرورت باقی نہیں رہ گئی تھی۔ ویسے بھی سحر کا معاملہ مخدوش تھا لیکن زاہد اس کے لئے اپنے ذہن میں منصوبہ بندی کر چکا تھا کہ اگر صُورتحال ٹیڑھی ہو جائے تو اُسے کیسے سنبھالا جائے۔

اب یہ اتفاق کی بات تھی کہ وہ کام اتنی جلدی ہو گیا تھا جس کے لئے اس نے ایک طویل منصوبہ بندی کی تھی۔ چنانچہ اب وہ سمجھتا تھا کہ سحر اور جالب صاحب کے مسئلے کو آگے بڑھانے کی ضرورت نہیں ہے۔ معاملہ اب خود بخود ختم ہو جائے گا لیکن آج کا دن وہ مصروف تھا اور اُسے فرسٹ ایڈ ہاؤس کے چند کاموں کے سلسلے میں باہر ہی رہنا پڑا تھا۔ جالب صاحب اس کی تلاش میں پہنچے اور اسے نہ پا کر مضطرب ہو گئے۔ کافی دیر تک وہ انتظار کرتے رہے اور جب یہ انتظار ان سے برداشت نہ ہو سکا تو وہ خود ہی سحر کا پتہ معلوم کر کے اس کی طرف چل پڑے۔ ان کے دماغ میں پتہ نہیں کیا چیز سما گئی تھی کہ وہ انتظار نہیں کر پائے تھے۔

سحر کی کوٹھی کی معلومات حاصل کرتے ہوئے وہ بالآخر وہاں پہنچ گئے سحر اس وقت گھر ہی میں موجود تھی۔ ویسے بھی وہ بہت کم باہر آنے جانے کی عادی تھی۔ جالب صاحب کو دیکھ کر اس نے تعجب کا اظہار کیا۔ ناظم علی صدیقی صاحب بھی وہیں موجود تھے۔ جالب صاحب مسکینی سی شکل بنائے اس کے قریب پہنچ گئے۔

"میرا خیال ہے میں آپ سے مل چکی ہوں۔ غالباً فرسٹ ایڈ ہاؤس میں" سحر نے کہا۔
"نہیں، اس سے پہلے ہماری ملاقات شجاع احمد صاحب کی کوٹھی میں ہوئی تھی۔"
"اوہ! ہاں، آپ ان کے مہمان ہیں نا؟"
"کیسی باتیں کر رہی ہو سحر۔ میں جالب ہوں۔ تم تو اس طرح مجھ سے اجنبیت کا اظہار کر رہی ہو جیسے... جیسے..." جالب صاحب نے شرمائے ہوئے انداز میں کہا۔
"جی! تعجب ہے میرے اور آپ کے درمیان اتنی بے تکلفی کہاں سے پیدا ہو گئی؟"
"شرارت کر رہی ہو شاید" جالب صاحب نے مسکراتے ہوئے کہا۔
"دماغ خراب ہو گیا ہے آپ کا؟"
"کک... کیا مطلب؟" جالب صاحب چونک کر بولے۔
"میرے اور آپ کے درمیان شاید یہ دوسری یا پھر تیسری ملاقات ہو گی اور آپ اتنی بے تکلفی سے مجھ سے باتیں کر رہے ہیں۔"
"اب بھی تکلف درمیان میں رہے گا۔ میں نے فیصلہ کر لیا ہے سحر کہ میں تمہارے لئے ساری دُنیا کو چھوڑ دوں گا۔"
"جی!" سحر نے آنکھیں پھاڑ کر کہا۔
"ہاں!" میں بھی تمھیں اتنا ہی چاہتا ہوں سحر، کائنات کی کسی چیز کو میں اتنا نہیں چاہتا۔ میں تم سے شادی کرنے کو تیار ہوں۔"
"اگر آپ کسی شریف آدمی کے مہمان نہ ہوتے تو جوتا اُتار کر آپ کے سر پر اتنے برساتی کہ آپ کو لطف آجاتا" سحر نے کہا۔
"کیا... کیا مطلب؟" جالب صاحب کا منہ پھاڑ سا کھل گیا۔
"آپ سے یہ کس نے کہا ہے کہ میں آپ سے شادی کرنے کے لئے تیار ہو جاؤں گی؟"
"تت... تت... تو وہ... وہ کیا۔ مم۔ میرا مطلب ہے۔"
"میں لعنت بھیجتی ہوں آپ پر۔"
"کک... کیسی باتیں کر رہی ہو سحر۔ اگر یہ مذاق ہے تو کیا یہ خطرناک مذاق نہیں ہے؟"
"نہیں خطرناک مذاق تو اب شروع ہو گا" سحر نے کہا اور اُٹھ کھڑی ہوئی۔ شاید وہ کسی ملازم کو بلانا چاہتی تھی۔
"ارے ارے، یہ... یہ... یہ تم کیا کر رہی ہو سحر" جالب صاحب نے بوکھلائے ہوئے انداز میں کہا لیکن سحر اس قسم کی لڑکی تھی غصے سے باہر ہو گئی تھی۔ چنانچہ جالب صاحب کو اپنی جان چھڑانا مشکل ہو گئی اور سحر کی چیخ و پکار سے کئی ملازم بھی وہاں پہنچ گئے۔ انھوں نے جو یہ چیخ و پکار سُنی اور ایک اجنبی آدمی کو دیکھا جس پر سحر ناراض ہو رہی تھی تو خود بھی اُسے ڈانٹنے لگے۔ یہ ہنگامہ ناظم علی صدیقی کے کانوں تک بھی پہنچ گیا اور وہ بھی وہاں پہنچ گئے۔
"ارے ارے کون ہے یہ سحر، کیا کر رہی ہو؟"
"ڈیڈی! آپ اسے نہیں جانتے۔ دیکھئے اس مردود کو، مجھ سے ملنے آیا تھا، کہہ رہا تھا کہ میں تم سے شادی کرنے کو تیار ہوں۔ تمھارے بغیر زندگی نہیں گزار سکوں گا۔"
"کون ہے یہ؟" ناظم علی صدیقی صاحب نے جالب کو گھورتے ہوئے کہا۔
"جی... خ... خادم... کو ج... جالب کہتے ہیں۔ جالب ضرغام۔"
"یہاں کیوں آئے ہو صاحبزادے؟"
"وہ... وہ ان سے... ان سے میرا مطلب ہے شادی کرنا چاہتا ہوں" جالب صاحب نے سحر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔
"ہوں! میرے ساتھ آؤ" ناظم علی صدیقی نے کہا اور جالب صاحب جلدی سے ان کے پیچھے پیچھے چل پڑے اور بُری طرح ہانپ رہے تھے۔ ناظم علی صدیقی انھیں لئے ہوئے کمرے میں پہنچ گئے۔ سحر بھی ان کے پیچھے ہی تھی۔
"میں کہتی ہوں ڈیڈی آپ اس لفنگے کو لفٹ کیوں دے رہے ہیں یہ شجاع احمد صاحب کے پاس مہمان آیا ہوا ہے۔ کسی کرنل ضرغام صاحب کا بیٹا ہے۔"
"شجاع احمد صاحب کے ہاں مہمان آیا ہے؟" ناظم علی صدیقی نے چونک کر کہا۔
"جی ہاں! وہی شجاع احمد صاحب!"
"ہاں! میں جانتا ہوں انھیں۔ اچھی طرح جانتا ہوں مگر یہ یہاں کیوں آیا ہے آخر؟"
"وہیں پر ہی میری اس سے ملاقات ہوئی تھی اس وقت تو یہ بالکل ٹھیک ٹھاک تھا لیکن اب پتہ نہیں کیا اول فول بکتا ہوا یہاں گھس آیا۔"
"وہ... وہ... وہ خ... خط... خط میرا مطلب ہے میں" جالب کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا۔ بُری طرح بدحواس ہونے کی وجہ سے ان کے منہ سے الفاظ بھی نہیں نکل پا رہے تھے۔
"میاں! سحر نے تم سے کہا تھا کہ وہ تم سے محبت کرتی ہے؟"
"جج... جی وہ... اوہ..." اچانک جالب کو خیال آیا کہ اُسے خط کا تذکرہ نہیں کرنا چاہیئے۔ چنانچہ وہ سنبھل گیا۔
"جی... جی ہاں! یہ مجھ سے محبت کرتی ہے۔"

"اتنا پٹواؤں گی شکل نہیں پہچانی جائے گی مجھے۔" سحر نے غرّا کر کہا اور جالب صاحب دو قدم پیچھے ہٹ گئے۔

"یہ... یہ... تو... کوئی بات نہ ہوئی۔ پپ... پہلے تو تم نے... تم نے..."

"ہاں... ہاں کہو۔ کیا کہا تھا میں نے؟"

"کک... کہا تو کچھ نہیں تھا۔"

"سحر! ممکن ہے یہ شخص دیوانہ ہو۔ ایک شریف آدمی کے ہاں مہمان بن کر آیا ہے۔ میرا خیال ہے تم اسے معاف کر دو۔ میں شجاع احمد سے خود اس سلسلے میں بات کروں گا۔ ان سے کہوں گا کہ انھوں نے اپنی کوٹھی کو لفنگوں کا اکھاڑا کیوں بنا رکھا ہے۔" ناظم علی صدیقی نے کہا اور سحر خاموشی سے جالب کو گھورتی ہوئی باہر نکل گئی۔

"ہاں... میاں! اب بتاؤ۔ کیا تم کسی پاگل خانے سے بھاگے ہوئے ہو؟"

"نن نہیں... میں تو کبھی پاگل خانے نہیں گیا۔"

"جانے کا ارادہ رکھتے ہو؟"

"کک... کوئی ارادہ نہیں ہے مستقبل قریب میں۔" جالب صاحب نے جواب دیا۔

"پھر یہاں کیوں گھس آئے تھے؟"

"جی وہ... میں... مم... میرا مطلب ہے۔"

"سحر سے شادی کرنا چاہتے ہو کیوں؟"

"جج... جی ہاں، جی ہاں۔ وہ بھی مجھ سے محبت کرتی ہیں۔"

"ہاں اور میرے سامنے ہی تم سے محبت کا اظہار کر بھی چکی ہے چلو دفعان ہو جاؤ یہاں سے۔"

"جج... جناب عالی... مم... میں نجیب الطرفین میرا مطلب ہے شریف۔"

"جاتا ہے یا ملازموں کو بلاؤں۔" ناظم علی صدیقی دہاڑے اور جالب نے یہی بہتر سمجھا کہ وہاں سے نکل آئے۔ بُرے حال ہو گئے تھے اس کے۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ سحر اچانک کیوں بدل گئی۔ دل میں آیا کہ وہ خط نکال کر ناظم علی صدیقی کے حوالے کر دے جو سحر نے اُسے لکھا تھا لیکن خط تو زاہد کے پاس تھا۔ ایک بار پھر باہر نکلنے کے بعد انھوں نے زاہد سے ملنے کا فیصلہ کیا اور پھر دوبارہ فرسٹ ایڈ ہاؤس کی طرف چل پڑے۔

لیکن فرسٹ ایڈ ہاؤس میں اب بھی زاہد سے ملاقات نہیں ہو پائی تھی۔ بے چارے بُرے حال سے گھر پہنچے اور لباس تبدیل کر کے اپنا کمرہ بند کر کے بیٹھ گئے۔ ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ سحر کے مزاج میں یہ اچانک تبدیلی پیدا کیوں ہو گئی تھی۔ دفعتاً انھیں قدسیہ کا خیال آیا اور وہ ایک گہری سانس لے کر گردن ہلانے لگے۔ ضرور قدسیہ نے اس سلسلے میں ان سے بات کی ہے۔ اچھی بات ہے قدسیہ دیکھ لوں گا۔ انھوں نے غصیلے انداز میں سوچا اور قدسیہ سے انتقام لینے کے منصوبے بنانے لگے۔

★★

شام کے تقریباً پانچ بجے تھے۔ شجاع احمد صاحب شام کی چائے کے لئے لان پر جانے کی تیاریاں کر رہے تھے کہ انھیں ناظم علی صدیقی کا ٹیلی فون موصول ہوا۔ شجاع احمد صاحب نے فون کا ریسیور اُٹھا لیا۔

"جی! فرمائیے کون صاحب؟"

"میرا نام ناظم علی صدیقی ہے۔ غالباً آپ نے سنا ہو گا۔"

"ہاں، ہاں بھئی کیوں نہیں۔ کہئے ناظم صاحب میں شجاع احمد بول رہا ہوں۔ کیا خدمت کر سکتا ہوں آپ کی؟"

"آپ سے کچھ گفتگو کرنا چاہتا ہوں، ایک اہم مسئلے پر۔" ناظم علی صدیقی بولے۔

"مجھ سے؟"

"جی ہاں آپ سے۔"

"کیا مسئلہ ہے۔ ویسے آپ تشریف لے آئیے یا مجھ سے کہیں تو میں حاضر ہو جاؤں۔" شجاع احمد صاحب نے کہا۔ ناظم علی صدیقی کا نام وہ بھی اچھی طرح جانتے تھے بلکہ ایک دو بار ملاقات بھی ہو چکی تھی لیکن کوئی گہری شناسائی نہیں ہوئی تھی۔

"میں چاہتا ہوں کہ آپ کے سامنے حاضر ہو کر ہی آپ کو ساری تفصیلات بتاؤں۔"

"بڑی خوشی کی بات ہے۔ اگر آپ مناسب سمجھیں تو تشریف لے آئیے شام کی چائے ہمارے ساتھ ہی پیجئے۔"

"آپ کو فرصت ہے؟"

"جی ہاں! کوئی خاص کام نہیں ہے۔"

"کرنل ضرغام صاحب سنا ہے آپ کے ہاں مہمان آئے ہوئے ہیں۔"

"اوہ۔ آپ کی ان سے واقفیت ہے۔ ہاں وہ میرے مہمان ہیں آجکل یہیں ٹھہرے ہوئے ہیں۔"

"کیا وہ بھی تشریف رکھتے ہیں؟"

"جی ہاں! اس وقت اپنے کمرے میں موجود ہیں بلاؤں انھیں۔"

"جی نہیں بہتر ہو گا شام کی چائے پر آپ انھیں بھی بلا لیں۔" ناظم علی صدیقی نے کہا

"ٹھیک ہے وہ بھی آ جائیں گے آپ بتائیں کہ کب تک میرے ہاں تشریف لا رہے ہیں؟"

"بس آدھے گھنٹے کے اندر اندر" ناظم علی صدیقی صاحب نے جواب دیا اور فون بند کر دیا پھر آدھے گھنٹے کے بعد وہ شجاع احمد صاحب کی کوٹھی میں داخل ہوگئے۔ شجاع احمد صاحب اور کرنل ضرغام نے ان کا استقبال کیا تھا۔ ناظم علی صدیقی نے سلام دعا کے بعد دونوں سے مصافحہ کیا اور کرنل ضرغام کو دیکھتے ہی کہنے لگے۔

"آپ ہی کرنل ضرغام ہیں؟"

"ہاں ناظم صاحب! بدقسمتی سے میں آپ کو نہیں پہچان سکا۔ ویسے مجھے شجاع احمد صاحب نے کہا تھا کہ آپ پہلے سے ہی مجھ سے واقفیت رکھتے ہیں؟"

"جی ہاں! یہ واقفیت صرف غائبانہ ہے"، ناظم علی صدیقی صاحب نے طنزیہ انداز میں کہا اور شجاع احمد چونک کر انھیں دیکھنے لگے۔ اس طنز کو انھوں نے محسوس کر لیا تھا۔

بہر حال وہ انھیں لئے اس جگہ پہنچ گئے جہاں پر چائے وغیرہ کا انتظام کیا گیا تھا۔ بیٹھنے کے کچھ دیر بعد ناظم علی صدیقی صاحب نے اُن سے کہا۔

"معاف کیجئے گا آپ نے مجھے چائے کی پیشکش کی اس کا میں شکر گزار ہوں مگر جن حالات کے تحت میں یہاں آیا ہوں وہ اتنے خوشگوار نہیں ہیں کہ چائے ان میں شامل ہو جائے۔"

"مجھے کچھ یوں محسوس ہو رہا ہے ناظم علی صاحب جیسے آپ کو ہم لوگوں سے کوئی شکایت ہو۔ کیا بات ہے خیریت تو ہے کرنل ضرغام سے آپ نے کس قسم کی غائبانہ واقفیت کا اظہار کیا ہے؟"

"ان کے بارے میں تو میں نے یہ سُنا تھا کہ یہ یہاں تشریف لائے ہوئے ہیں لیکن ان کے صاحبزادے جالب صاحب میری کوٹھی پر پہنچ گئے تھے۔"

"جالب... ؟ وہ کیوں پہنچ گیا؟" کرنل ضرغام صاحب نے چونک کر پوچھا۔

"میں معافی چاہتا ہوں کرنل ضرغام صاحب! میں آپ سے کچھ سوال کروں تو آپ کو اعتراض تو نہیں ہوگا؟"

"نہیں، نہیں، فرمائیے۔"

"آپ نے اپنے بیٹے کو کس قسم کی تربیت دی ہے۔ کس ٹائپ کا انسان ہے وہ۔ کیا اس سے زندگی میں کوئی شریفانہ اقدام بھی سرزد ہوا ہے یا نہیں؟"

"آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟" کرنل ضرغام صاحب نے بڑے تیکھے انداز میں پوچھا۔

"آپ کو بتا دوں۔ اس کے بعد آپ خود ہی فیصلہ کر لیجئے کہ مجھے کیا کرنا چاہئے۔ جالب صاحب میری کوٹھی پر پہنچے تھے۔ میری بیٹی کے کمرے میں داخل ہوگئے اور اس سے اظہارِ محبت کرنے لگے ظاہر ہے نوجوان ہماری طرح متحمل مزاج نہیں ہوتے۔ اس کے نتیجے میں سحر کے ردِ عمل کا آپ خود اندازہ لگا لیں۔ سحر کا کہنا ہے کہ وہ ایک دو بار اس کوٹھی پر جالب سے ملی ہے اور کبھی براہِ راست اس کی اُن سے گفتگو بھی نہیں ہوئی جبکہ جالب صاحب کا فرمان ہے کہ وہ اس سے شادی کرنے کے خواہشمند ہیں۔"

"بچ... جالب... جالب نے یہ حرکت کی؟" کرنل ضرغام نے متحیرانہ انداز میں کہا۔

"جی ہاں! اگر بات صرف سحر کے سامنے ہی کی ہوتی تو شاید میں اس میں کسی مبالغہ آرائی کا حصہ بھی سمجھ لیتا لیکن صاحبزادے موصوف نے میرے سامنے بھی اپنے جذبات کا اظہار کیا اور مجھ سے فرمانے لگے کہ میں انھیں اپنی فرزندی میں قبول کر لوں۔ جب مجھے یہ معلوم ہوا کہ یہ صاحبزادے ایک ایسے شخص سے تعلق رکھتے ہیں جس سے میری باقاعدہ دوستی تو نہیں لیکن کافی حد تک شناسائی ہے۔ میری مُراد شجاع احمد صاحب سے ہے تو مجھے ذرا سا محتاط ہونا پڑا۔ شجاع احمد صاحب اگر آپ کا نام درمیان میں نہ آتا تو شاید اس صاحبزادے کو آپ کسی تھانے میں ہی خوش آمدید کہہ سکتے تھے" ناظم علی صدیقی نے کہا۔

"کہاں ہے وہ مردود؟ کہاں ہے؟ ذرا بلائیے اُسے، شجاع احمد صاحب ذرا بُلائیے اُسے" کرنل ضرغام غصّے سے اپنی جگہ سے کھڑے ہوگئے۔

"بُلا لوں گا، بلا لوں گا۔ ظاہر ہے ناظم علی صدیقی صاحب نے غلط نہیں کہا ہوگا۔ ذرا صبر و سکون سے کام لیجئے... مگر یہ اس بدبخت کو سوجھی کیا؟" شجاع احمد صاحب سخت شرمندگی محسوس کر رہے تھے۔ ناظم علی صدیقی کی شخصیت بھی معمولی نہیں تھی۔ وہ بھی شہر کے متمول لوگوں میں شمار ہوتے تھے اور شرفاء میں ان کا نام لیا جاتا تھا۔ ان کی بھی عزت تھی اس شہر میں کوئی ایسی ویسی شخصیت ہوتی تو شاید اتنی پریشانی کی بات نہ ہوتی لیکن جالب نے ناظم علی صدیقی کی عزت پر براہِ راست ہاتھ ڈالا تھا۔ شجاع احمد صاحب نے معذرت آمیز لہجے میں کہا۔

"اگر آپ کو غلط فہمی نہیں ہوئی ہے ناظم صاحب اور واقعی جالب ہی نے یہ حرکت کی ہے تو سب سے پہلے تو میں آپ سے اس کے لئے معافی کا خواستگار ہوں۔ پتہ نہیں اس نوجوان نسل کو کیا ہو گیا ہے ہاتھ سے نکلی ہی جا رہی ہے۔ بالکل ہی بے قابو ہو گئی ہے۔ میں اپنے بچّوں کے بارے میں بھی یہی محسوس کرتا ہوں کہ وہ بھی حد سے زیادہ آگے بڑھ گئے ہیں۔ پتہ نہیں کیا ہو رہا ہے یہاں؟"

"مگر میاں! ذرا جالب صاحب کو بلواؤ تو سہی تھوڑی سی معلومات تو حاصل کی جائیں اس سے" کرنل ضرغام نے کہا اور پھر ایک ملازم

کو اشارہ کر کے اپنے پاس بلا لیا۔
"جالب کہاں ہے؟"
"جی موجود ہیں۔"
"بلا کر لاؤ اُسے۔ فوراً بلا کر لاؤ۔" کرنل ضرغام صاحب نے کہا اور تھوڑی دیر کے بعد جالب صاحب وہاں پہنچ گئے لیکن اچانک ناظم علی صدیقی کو دیکھ کر ان کا رنگ فق ہو گیا تھا۔ ان کے چہرے پر ہوائیاں اُڑنے لگی تھیں۔
"یہی ہے جالب؟" شجاع احمد نے پوچھا۔
"آپ ان کا چہرہ دیکھ کر اندازہ نہیں لگا سکتے۔" ناظم علی صدیقی نے کہا۔ شجاع احمد صاحب، جالب کا چہرہ بغور دیکھ رہے تھے جالب صاحب کے بدن میں اب کپکپاہٹ سی پیدا ہو گئی تھی۔
"تم... ناظم علی صاحب کی کوٹھی پر گئے تھے؟" کرنل ضرغام صاحب نے جالب سے پوچھا۔
"جج... جی ہاں گیا تھا۔" جالب صاحب نے جواب دیا۔
"کیوں؟"
"وہ... وہ... بس وہ..." جالب صاحب سے کوئی بھی جواب نہ بن پڑا۔
"سحر سے ملے تھے؟"
"جی ہاں ملا تھا۔"
"ہوں۔" شجاع احمد صاحب کرنل ضرغام کی طرف دیکھنے لگے۔ کرنل ضرغام آپے سے باہر ہونے جا رہے تھے لیکن شجاع احمد صاحب نے انھیں روک لیا۔
"نہیں کرنل صاحب! ایسا نہ کریں معلومات حاصل کر لیں آخر اس نے ایسا کیا کیوں؟ ویسے مجھے افسوس ہے اولاد کی وجہ سے انسان کو بڑی پریشانیاں اُٹھانا پڑتی ہیں۔ میں آپ کو غلط نہیں کہوں گا اور ناظم علی صدیقی صاحب آپ سے بھی میں معذرت خواہ ہوں اور یہی الفاظ کہوں گا کہ کرنل صاحب کا اس معاملے میں کوئی قصور نہیں ہے۔ نئی نسل اس قدر گمراہ ہو چکی ہے کہ اب اس کو سنبھالنا ہم لوگوں کے بس سے باہر ہو گیا ہے۔"
"فکر نہ کریں ایک بار اور بھیج دیں اسے میری کوٹھی پر، میں اسے ایسا سنبھالوں گا کہ زندگی بھر پھر کبھی ایسی جرأت نہیں کر سکے گا۔"
"میں خود اس مردود کو گولی مار دوں گا۔ آج ہی واپس بھجوا دوں گا۔ اب اسے اس کوٹھی میں رہنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ خدا کی پناہ اس طرح میری عزت کو اُچھالتا پھر رہا ہے۔"
"یہ آپ کا اپنا مسئلہ ہے کرنل صاحب لیکن یہ یاد رکھیں کہ دوسروں کی بھی عزت ہوتی ہے۔"
"مجھے بے حد شرمندگی ہے ناظم صاحب اس لئے نہیں کہ آپ شجاع احمد کے دوست ہیں بلکہ اس لئے کہ ایک بیٹی کے باپ بھی ہیں اور میرے بیٹے کے ہاتھوں آپ کو یہ تکلیف پہنچی ہے۔" کرنل ضرغام معذرت آمیز لہجے میں بولے اور پھر جالب کی طرف مڑ کر بولے۔
"تجھے کیا سوجھی تھی مردود۔ کیوں گیا تھا تو سحر کے پاس؟"
"جی... وہ... تم... میں کیا... میں کیا بتاؤں میرا خیال تھا کہ وہ بھی مجھ سے... مجھ سے..." جالب صاحب نے کہا۔
"خیال کے بچے، کیا کہوں غیر جگہ ہے ورنہ تیرے اس خیال کا تو وہ جواب دیتا تجھے کہ تو عمر بھر یاد رکھتا۔ دفعان ہو جا مردود۔ یہاں سے فوراً ہو جا۔" انھوں نے کہا اور جالب صاحب گردن جھکائے وہاں سے چلے گئے عین اس وقت زاہد کوٹھی میں داخل ہوا تھا۔ فیصل نے فوراً ہی اُسے لپک لیا تھا۔ پتہ نہیں فیصل کہاں چھپا ہوا یہ ساری تفصیلات سُن رہا تھا۔ درختوں کی آڑ میں ہوتا ہوا وہ زاہد تک پہنچا۔ وہ ہانپ رہا تھا۔
"او ہو! ضرور کوئی خاص بات ہے؟"
"معرکتہ آرا بات ہے چیف جلدی آئیے۔ اُدھر درختوں کی اوٹ میں آ جائیے۔" فیصل نے کہا اور زاہد گردن اُٹھا اُٹھا کر جھانکتا ہوا بالکل درختوں کے پیچھے آ گیا۔
"وہاں چائے کی میز پر تین افراد موجود ہیں۔ کرنل ضرغام ڈیڈی اور ناظم علی صدیقی۔"
"اوہ، کیا بات ہے؟"
"جالب صاحب کا ہنگامہ ہو رہا ہے۔ سُنا ہے سحر صدیقی کی کوٹھی میں گھس گئے تھے ان سے شادی کرنے کے لئے سحر کو تو آپ جانتے ہیں نا زاہد بھائی۔"
"ہاں، ہاں جانتا ہوں پھر کیا ہوا؟"
"وہاں پٹتے پٹتے بچے ہیں اور اب ناظم علی صدیقی صاحب شکایت لے کر آئے ہیں۔"
"خدا کی پناہ۔ خدا کی پناہ، اور کچھ فیصل؟"
"نہیں فی الحال یہی ہنگامہ خیزیاں ہو رہی ہیں۔ جالب صاحب کو دربار میں طلب کیا گیا تھا۔ ڈانٹ ڈپٹ کی گئی۔ کرنل ضرغام صاحب تو شاید مار پیٹ بھی کرنا چاہتے تھے لیکن ڈیڈی نے روک لیا۔ اب جالب صاحب اپنے کمرے میں گئے ہوئے ہیں اور وہاں چائے اُڑائی جا رہی ہے۔"
"بات تو بڑی خوفناک ہے فیصل میں ابھی تھوڑی دیر میں واپس آتا ہوں۔ ذرا نگاہ رکھو ان حالات پر۔" زاہد نے کہا اور اُلٹے قدموں واپس نکل گیا۔ اُسے اپنے فوری بچاؤ کے انتظامات کرنے تھے۔
دوسری طرف فیصل پھر اپنی کمین گاہ میں پہنچ گیا۔ یہ کمین گاہ چائے

کی میز کے پیچھے ایک گھنے درختوں کا جھنڈ تھا۔ جہاں سے وہ تمام کارروائی نوٹ کر رہا تھا اور اس نے۔۔۔ بخوبی سُنا تھا۔ ناظم علی صدیقی صاحب کہہ رہے تھے۔

"آپ شریف آدمی ہیں کرنل صاحب، میں بھی شریف آدمیوں کی عزت کرتا ہوں۔ فی الحال اس مسئلے کو ختم کیا جاتا ہے لیکن براہ کرم دوسروں کی عزت اُچھالنے سے گریز کیجیے۔ اُسے سمجھائیے۔ اُسے اپنے قابو میں رکھیے۔"

"میں آپ سے بہت شرمندہ ہوں۔ ناظم صاحب۔ سمجھ میں نہیں آتا کس طرح آپ سے معذرت کروں۔ جو کچھ ہوا ہے بہت افسوسناک ہے۔ بلاشبہ آپ کی عزت میری عزت ہے۔ میں اس لڑکے کو یہاں نہیں رکھوں گا آپ مطمئن رہیئے۔ آپ کو دوبارہ شکایت کا موقع نہیں ملے گا۔"

ناظم علی صدیقی خاموش ہو گئے تھے۔ تھوڑی دیر رُکنے کے بعد وہ وہاں سے چلے گئے۔ کرنل ضرغام اور شجاع احمد گہری سوچ میں ڈوبے ہوئے تھے پھر کرنل ضرغام نے کہا۔

"میں تم سے بھی شرمندہ ہوں شجاع احمد۔ تم بھی سوچتے ہو گے کہ یہ سب کیا ہے۔ تم مجھے بھی مورد الزام ٹھہرا سکتے ہو لیکن یقین کرو۔ خدا کی قسم اس سے قبل ایسی کوئی حرکت میرے علم میں نہیں آ سکی تھی۔ یہ تو قنوطی سا لڑکا تھا پتہ نہیں یہ اس حد تک آگے کیسے بڑھ گیا۔ اگر تم مجھے اجازت دو تو میں اس بارے میں تحقیقات کروں۔"

"جیسا تم پسند کرو کرنل! مجھے افسوس ہے کہ ان حالات میں ہم وہ سب کچھ نہیں کر سکتے جس کا فیصلہ ہم نے کیا تھا۔" شجاع احمد صاحب نے کہا۔

"میں خود بھی تمہاری عزت اُچھالنے نہیں آیا ہوں شجاع احمد بے شک تمہاری بیٹی مجھے بھی اپنی ہی بیٹی کی طرح عزیز ہے اور میں اسے کسی مردود کے پلے نہیں باندھ سکتا۔"

شجاع احمد نے کوئی جواب نہیں دیا۔ چند لمحات کے بعد دونوں وہاں سے اُٹھ گئے۔ فیصل ان کے پیچھے لگا ہوا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ آگے کے معاملات اور دلچسپ ہوں گے۔ اُسے اطمینان تھا کہ کرنل ضرغام کے کمرے میں بھی اس کے جاسوسی کے آلات موجود ہیں اور وہاں کے حالات ریکارڈ کرنے میں کوئی دقت نہیں ہو گی۔

شجاع احمد صاحب اپنے کمرے میں چلے گئے تھے۔

کرنل ضرغام اپنے کمرے میں آ گئے۔ ان کی حالت بہتر نہیں تھی،

فردوسی بیگم ان کے سامنے ہی موجود تھیں۔ کرنل ضرغام صاحب نے انھیں دیکھتے ہوئے کہا۔

"سامان باندھ لیجیے محترمہ۔ بفضل تعالیٰ صاحبزادے اپنا فرض انجام دے چکے ہیں۔"

"میں نہیں سمجھی۔" فردوسی بیگم نے تعجب سے کہا۔

"اللہ رے آپ کی عقل۔ سامان باندھنے کا مطلب روانگی ہوتی ہے۔ ذہن پر گوشت نہ چڑھنے دیں تو عنایت ہو گی۔" کرنل صاحب نے کہا۔

"کہاں روانہ ہو رہے ہیں۔۔۔ اچانک۔۔۔؟" فردوسی بیگم بڑی حیرانی سے بولیں۔

"جہنم بہتر رہے گا۔ چلو پھر پانی تو ہمارے لئے کم پڑے گا۔"

"ارے، ارے ہوا کیا آخر۔ بات کیا ہے؟"

"بڑی معمولی سی بات ہے۔ صاحبزادے اب ماشاءاللہ کافی سمجھدار ہو گئے ہیں۔ جو کچھ اس سے پہلے کر چکے ہیں اس کی اطلاع تو آپ کو مل ہی چکی ہے۔"

"کوئی اور بات ہوئی ہے؟"

"جی ہاں! ماشاءاللہ ساری نوجوان لڑکیوں سے رومانس کرنے کا فیصلہ کیا ہے برخوردار نے۔ اللہ تعالیٰ اسے ترقی دے لیکن بی بی۔ یہاں سے نکل چلیں تو بہتر ہے یا پھر انتظار کریں گی اس بات کا کہ شجاع احمد، دھکے دے کر باہر نکالیں بڑی پُرانی دوستی ہے میری۔ خدا کے لئے اسے قائم رہنے دو۔"

"بات نہیں بتائیں گے مجھے؟"

"کیوں نہیں! آپ کو بھی خون بڑھانے کا موقع دوں گا۔" کرنل ضرغام صاحب نے کہا اور پھر وہ فردوسی بیگم کو ناظم علی صدیقی صاحب کی آمد کے بارے میں بتانے لگے۔ فردوسی بیگم ایک دم بڑی ششدر رہ گئی تھیں۔

"یہ تو بہت بُرا ہوا۔ میں بُلاتی ہوں اس مردود کو۔ ہماری عزت کا گاہک کیوں بن گیا ہے وہ۔ آپ ذرا رُکیئے میں بُلاتی ہوں اُسے۔" فردوسی بیگم نے کہا اور کمرے سے باہر نکل گئیں۔ کرنل صاحب شدید غصّے میں تھے اور جالب کی شامت اُسے آواز دے رہی تھی۔

فردوسی بیگم کہیں نہ کہیں سے جالب کو تلاش کر کے لے ہی آئیں۔ جالب صاحب بیچارے ہونق بنے ہوئے تھے۔ کوئی بات جو سمجھ میں آتی ہو ہر طرف سے پھٹکار پڑ رہی تھی۔ ہر تدبیر اُلٹی ہو گئی تھی۔ قدسیہ سے بگاڑ بیٹھے تھے۔ سحر سے جوتے کھا چکے تھے۔ ذہن پر زور دیتے تو کچھ سمجھ نہ آتا۔ عقل بے چاری ان معاملات میں بری الذمہ تھی۔ لعنت کے مارے اپنے کمرے میں گھسے بیٹھے تھے کہ فردوسی بیگم نازل ہو گئیں اور پھر اُنھوں نے کوئی بات کئے بنا ان کا ہاتھ پکڑا اور شوہر کے پاس لے گئیں۔ کرنل صاحب۔۔۔ نے آتش فشانی نگاہوں سے اُنھیں دیکھا اور ان کی گردن جُھک گئی۔

"بیٹھو نور چشم! بیٹھو برخوردار۔ کیا پر نکالے ہیں کیا اُڑان ہے ماشاءاللہ اب تو بڑی اُمیدیں وابستہ ہو گئی ہیں۔" شاید معاملات دل میں پی ایچ ڈی

"... کرنے کا ارادہ رکھتے ہو؟"

"ج... جی ہاں!" جالب صاحب نے کچھ بولنا ضروری سمجھا۔

"سبحان اللہ! تو ریسرچ ہو رہی ہے اس سلسلے میں؟"

"جی نہیں۔"

"پھر کیا ہو رہا ہے؟"

"کہاں...؟" جالب صاحب نے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"برخوردار! پہلے میرا بھی خیال تھا کہ خدا نے عقل ذرا کم دی ہے لیکن اب تم نے ثابت کر دیا ہے کہ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ تم ہم سب کو بے وقوف بنا رہے ہو۔ اِس سلسلے میں کچھ گوہر افشانی ہوگی؟"

"کس سلسلے میں؟"

"یہی جو چند معصوم شرارتیں کی ہیں آپ نے؟"

"م... میں نے نہیں کیں۔"

"ارے ہاں! آپ بھلا یہ سب کچھ کیسے کر سکتے ہیں؟"

"کرنل صاحب! آپ اسے نروس تو کئے دے رہے ہیں۔ کچھ اسے بھی بولنے کا موقع دیجئے۔ یہ تو ٹھیک نہیں ہے۔" فردوسی بیگم بیٹے کی حالت دیکھ کر بولیں۔

"ذلیل کر دیا ہے اس کم عقل نے۔ شجاع احمد بہت نک چڑھا انسان ہے۔ بس منہ سے نہیں کہہ رہا کہ ہم دفعان ہو جائیں ورنہ اس کے ہر انداز سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ بس اب غرق ہو جاؤ۔ جی صاحبزادے آپ اپنے بارے میں کچھ فرمانا چاہتے ہیں؟"

"جی ہاں...!" جالب صاحب نے جواب دیا۔

"ارشاد... کہو۔" کرنل صاحب کا لہجہ پھر طنزیہ ہو رہا تھا لیکن پھر اُنھوں نے خود کو سنبھال لیا۔

جالب صاحب کی جو حالت ہوئی تھی اُس نے اُنھیں بہت کچھ سمجھا دیا تھا۔ زاہد نے جو کچھ کہا تھا اس میں سے ایک بات بھی نہیں ہوئی بلکہ ہر کام اُلٹا ہو گیا تھا چنانچہ اُنھوں نے سوچا کہ اب زاہد کے بارے میں کچھ چھپانا حماقت ہے چنانچہ وہ بولے۔

"اس میں میرا کوئی قصور نہیں ہے۔"

"ہمارا ہے... سو فیصدی ہمارا ہے۔" کرنل صاحب بولے۔

"آپ کا بھی نہیں ہے۔"

"خوب گویا کوئی اور بھی اس میں ملوث ہے۔ ذرا تفصیل ہو جائے عزیز از جان!"

"آپ نے ہی تو کہا تھا کہ قدسیہ سے میری شادی کریں گے۔ اسے سمجھنے کی کوشش کریں۔ میں نے کوشش کی۔"

"پھر کیا ہوا؟"

"وہ مجھے گھاس نہیں ڈالتی تھی۔ جب بھی میں نے اس سے بات کرنے کی کوشش کی اس نے ناک چڑھالی۔"

"ممکن ہے اس کی ناک میں ڈیفیکٹ ہو۔ آپ نے کیسے اندازہ لگایا کہ وہ...؟"

"وہ مجھ سے ٹھیک سے بات بھی نہیں کرتی تھی۔ میں نے مسلسل کوشش جاری رکھی اور زاہد بھائی نے مجھے کچھ ترکیبیں بتائیں۔"

"کس نے...؟" کرنل صاحب چونک کر بولے۔

"زاہد بھائی نے۔"

"تو کبھی اس قابل ہوتے ہیں کہ اُن سے ترکیبیں پوچھی جائیں۔ بہر حال پھر کیا ہوا؟"

"زاہد بھائی نے مجھے جو ترکیبیں بتائیں میں ان پر عمل کرنے لگا۔ اُنھوں نے سختی سے ہدایت کر دی تھی کہ ان عملیات کے بارے میں کبھی کسی کے سامنے زبان نہ کھولوں لیکن ان عملیات سے کوئی فائدہ نہیں ہوا۔"

"وہ عمل کیا تھے؟" کرنل ضرغام نے پوچھا۔

"رسّے پر چلنے کی مشق۔ جس کے بارے میں زاہد بھائی نے بتایا تھا کہ شجاع احمد صاحب ایسے لوگوں کو بے پناہ پسند کرتے ہیں اور قدسیہ بھی فن کاروں کی قدر کرتی ہے۔"

"رسّے پر چلنے والے فنکاروں کی خوب۔ سبحان اللہ یہ بات تم سے زاہد نے کہی تھی اور اس کے ایما پر تم درختوں کے درمیان رسہ باندھ کر اس پر چلنے کی کوشش کر رہے تھے؟"

"جی ہاں...!"

"گدھے ہو، نامعقول ہو، بے وقوف ہو، احمق ہو سمجھے۔"

"جی ہاں جی ہاں...!" جالب صاحب نے بوکھلاتے ہوئے کہا۔

"اور کیا عمل بتایا تھا اس نے؟"

"وہ... وہ اُنھوں نے تعویز دیا تھا وہ تعویز اُنھوں نے کہا تھا کہ شجاع احمد صاحب کو اس تعویز کی ہوا دوں۔ میں نے کئی بار اُنھیں اس تعویز کی ہوا بھی دی۔"

"اوہ... اوہ تو زاہد نے تمھیں بے وقوف بنایا تھا۔"

"بے وقوف تو نہیں بنایا تھا بس یہ عمل کرنے کے لئے کہا تھا۔"

"خوب... اور سحر کا کیا معاملہ تھا؟" کرنل صاحب نے پوچھا۔

"وہ... وہ... وہ دوسرا معاملہ تھا مجھے سحر کا خط ملا تھا اپنے کمرے میں دروازے کے پاس میں نے وہ خط پڑھا تو اس میں سحر نے مجھ سے وہ کہا تھا۔ وہ، وہ... مجھ سے..." جالب صاحب کے چہرے پر شرم کے آثار نظر آنے لگے۔

"سحر نے خط لکھا تھا تمھیں؟"

"ج... جی ہاں! اور... اور..."

"ہاں ہاں کہتے رہو میاں کہتے رہو۔"

"میں نے وہ خط زاہد بھائی کو دکھایا تو زاہد بھائی نے مجھے مشورہ دیا کہ میں اپنی محبت منتقل کر دوں۔ قدسیہ نک چڑھی لڑکی ہے وہ اگر مجھے گھاس نہیں ڈالتی تو میں کوئی گیا گزرا یا گرا پڑا نہیں ہوں۔ سحر بھی معمولی شخصیت کی مالک نہیں ہے اور ڈیڈی سچی بات یہ ہے کہ میں... سحر کو پسند کرنے لگا تھا۔ اس نے اپنے خط میں مجھ سے ملاقات کے لئے لکھا تھا۔ زاہد بھائی نے مجھے مشورہ دیا کہ میں قدسیہ سے دو ٹوک بات کروں میں اس سے دو ٹوک بات کرنے پہنچا تھا اس وقت اور میرا خیال تھا کہ اب میں سحر سے شادی کروں گا۔ میں نے اس سلسلے میں خوب اچھی طرح غور کر لیا تھا۔ قدسیہ سے بات کی تو اس نے وہی انداز اختیار کیا تھا اور میں نے اس سے کہہ دیا کہ میں تو خود اس سے شادی کرنا نہیں چاہتا وہ سمجھتی کیا ہے اپنے آپ کو۔ تب وہ مجھے لے کر آپ کے پاس پہنچ گئی تھی۔"

"ہوں... پھر کیا ہوا؟"

"اس کے بعد ڈیڈی ساری باتیں ختم ہو گئیں اور میں سحر سے ملنے کے لئے گیا پھر... لیکن وہاں میرے ساتھ بہت برا سلوک کیا گیا۔ سحر نے کہا کہ وہ خط اس نے مجھے لکھا ہی نہیں ہے۔"

"خط کہاں ہے؟" کرنل صاحب کا لہجہ کسی قدر نرم پڑ گیا تھا۔

"وہ وہ... تو میں نے زاہد بھائی کو دے دیا تھا۔"

"کیا...؟"

"جی ہاں... میں نے جب انھیں خط پڑھوایا تھا تو انھوں نے اپنے پاس ہی رکھ لیا تھا۔"

"تعویذ بھی تم نے انھیں واپس کر دیا ہوگا۔" کرنل صاحب بولے۔

"جی ہاں...!"

"ہوں... تم کافی بے وقوف ہو اور جو کچھ کر چکے ہو اب اسے بدلنا ناممکن ہے۔ شجاع احمد کو میں اچھی طرح جانتا ہوں وہ اب کسی قیمت پر اس بات پر تیار نہیں ہو گا کہ قدسیہ کے ساتھ تمھاری شادی کرے لیکن کم از کم زاہد کو منظر عام پر لا کر میں اپنی پوزیشن صاف کر سکتا ہوں مگر یہ اس شخص نے ہمارے خلاف سازش کیوں کی؟ کیا مقصد تھا اس کا؟" کرنل صاحب خیال میں ڈوب گئے پھر انھوں نے بھاری لہجے میں کہا۔

"تم ایسا کرو کہ زاہد سے اس موضوع پر گفتگو کرو۔ اس سے کہو کہ اب تمھیں کیا کرنا چاہئے اس سے مشورہ مانگو۔ اس سلسلے میں اسے بتاؤ کہ اس نے جو ترکیبیں بتائی تھیں ساری کی ساری الٹی ہو گئی ہیں۔ اب اس کا کوئی حل نکالے اور جب تم اس سے گفتگو کرنے جاؤ تو ہم لوگوں کو اطلاع دیتے جاؤ۔ میں شجاع احمد کو ساتھ لے کر وہاں پہنچوں گا اور زاہد کا کچا چٹھا اس کے سامنے کھول دوں گا۔" جالب صاحب چند لمحے سراسیمہ نگاہوں سے باپ کو دیکھتے رہے اور جب ان کے انداز میں کرنل صاحب نے جھجک محسوس کی تو ڈپٹ کر بولے۔

"تمھیں یہ کرنا ہوگا بے وقوف آدمی! وہ شخص تمھیں انگلیوں پر نچا رہا ہے اور تم احمق بنتے رہے ہو۔ تمھاری اس حماقت نے ہمیں ذلیل کرا دیا ہے تم کیا سمجھتے ہو یہ اس نے تمھارے خلاف سازش کی تھی تمھیں نہ گھر کا چھوڑا نہ گھاٹ کا۔ قدسیہ سے بھی گئے اور سحر کی تو بات ہی جھوٹی معلوم ہوتی ہے ممکن ہے وہ خط خود زاہد نے لکھ کر کمرے کے دروازے میں ڈالا ہو۔ سنو تم اس سے وہ خط بھی ضرور مانگ لینا۔ انتہائی کوشش کرنا کہ سحر کا وہ خط تمھیں مل جائے۔"

"ٹھیک ہے۔"

"تو پھر کب کر رہے ہو یہ کام؟"

"آج ہی رات کو کسی وقت یا پھر کل دن میں۔"

"کل ساڑھے دس بجے کا وقت رکھ لو اور تم زاہد کے پاس پہنچ جانا بلکہ سنو ساڑھے دس بجے نہیں تقریباً ساڑھے آٹھ پونے نو بجے کا وقت رکھو تاکہ وہ نکل نہ جائے۔ ناشتے سے پہلے ہی اس کے کمرے میں پہنچ جانا اور ہمیں اطلاع دیتے جانا۔"

"ٹھیک ہے ڈیڈی! میں کل ہی ساڑھے آٹھ بجے زاہد بھائی کے کمرے میں چلا جاؤں گا۔" جالب نے کہا اور کرنل صاحب نے گردن ہلا دی۔

بیٹے کی طرف سے اب ان کا رویہ کچھ نرم ہو گیا تھا لیکن زاہد کے بارے میں وہ گہری سوچ میں ڈوب گئے تھے۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ زاہد نے ان کے خلاف یہ سازش کیوں کی پہلے تو سوچا کہ زاہد کو اپنے کمرے میں بلائیں۔ ڈانٹ ڈپٹ کریں اور اس سے پوچھیں کہ آخر ان باتوں سے اس کا مقصد کیا تھا۔ اسے ان لوگوں سے کیا دشمنی تھی اور اس کا اسے کیا فائدہ پہنچ سکتا ہے لیکن پھر دل میں سوچا کہ یہ حماقت ہوگی وہ سرے سے ساری باتوں سے انکار کر دے تو ان کے پاس کوئی ثبوت نہیں ہے۔

ویسے جوں جوں حالات پر غور کر رہے تھے انھیں یقین ہوتا جا رہا تھا کہ جالب اس معاملے میں بے قصور ہے۔ بس ذرا عقل سے پیدل ہے۔ اس لئے مار کھا گیا۔ جالب اپنے کمرے میں چلا گیا تو وہ کافی دیر تک فردوس بیگم سے اس بارے میں بات چیت کرتے رہے۔ فردوس بیگم آپے سے باہر ہوئی جا رہی تھیں۔ کہہ رہی تھیں کہ اس زاہد

کے بچے کو تو وہ اپنے ہاتھوں سے مروڑ کر رکھ دیں گی۔ آخر اس نے سمجھا کیا ہے، وہ چاہتا کیا ہے؟ کرنل صاحب نے انھیں ٹھنڈا کیا اور کہنے لگے۔

"محترمہ! عقل سے کام لیجئے۔ بات تو بگڑ ہی چکی ہے لیکن آخری کوشش کئے لیتا ہوں اگر ساری غلطی زاہد کی ہی ثابت ہو جائے تو پھر کچھ پوزیشن بہتر ہو جائے گی حالانکہ اس کے باوجود یہ بات سامنے آتی ہے کہ کیا شجاع احمد ایک ایسے بے وقوف کو اپنا داماد بنا لینا پسند کریں گے جو دوسروں کے ہاتھوں میں کھلونا بن جاتا ہے۔ بہر طور اگر یہ نہیں ہو سکا تب بھی شجاع احمد کے سامنے سے سرخرو ہو کر واپس جاؤں گا۔"

فردوسی بیگم ناک چڑھا کر کچھ سوچنے لگی تھیں۔

★★

نفیس نے رات کے تقریباً ساڑھے بارہ بجے نئی رپورٹ پیش کی اس کا چہرہ دمک رہا تھا۔ جب اس نے زاہد کے کمرے کے دروازے پر دستک دی تو زاہد چونک پڑا۔ سونے کی کوشش کر رہا تھا اور تقریباً غافل سا ہو گیا تھا لیکن اس دستک کو سن کر جلدی سے سنبھل گیا، دروازے کے قریب آ کر پوچھا۔

"کون ہے؟"

"جاسوسِ اعظم!" باہر سے نفیس کی آواز سنائی دی۔ اور زاہد نے جلدی سے دروازہ کھول دیا۔ نفیس غڑاپ سے اندر داخل ہو گیا۔

"ارے ابھی تک جاگ رہے ہو نفیس میاں؟"

"ڈیوٹی از ڈیوٹی۔ میں ڈیوٹی کے اوقات میں کبھی کاہل نہیں رہتا"

"گڈ ویری گڈ۔ کوئی خاص بات ہے؟"

"اتنی خاص بات کہ آپ سنیں گے تو اچھل پڑیں گے۔"

"تو پھر چلیے میں دو تین بار اچھلے لیتا ہوں اس کے بعد آپ اپنی

بات سُنائیے۔" زاہد نے کہا اور فیصل مُسکرانے لگا پھر بولے۔
"نہیں زاہد بھائی! آپ اس بار یقیناً خطرے میں پڑ گئے ہیں۔"
"اچھا!" زاہد نے آنکھیں پھاڑتے ہوئے کہا پھر بولا۔ "ذرا خطرے کی نوعیت تو بتاؤ؟"
"بتا نہیں رہا ہوں سُنا رہا ہوں۔" فیصل نے کہا اور کرنل صاحب کے کمرے میں ہونے والی گفتگو کا کیسٹ آن کر دیا۔ زاہد بغور یہ گفتگو سُن رہا تھا اور اس کے چہرے پر گہری سنجیدگی کے تاثرات پھیلتے جا رہے تھے۔ کرنل صاحب ان کی بیگم اور جالب صاحب کے تمام مکالمے سُننے کے بعد اس نے گردن ہلائی فیصل نے کیسٹ بند کر دیا تھا۔
"صورت حال کچھ اس قدر سسپنس فل تھی کہ میں نے انتظار کرنا مناسب نہ سمجھا۔ یہ گفتگو تو کافی دیر پہلے ریکارڈ ہو چکی تھی لیکن میں نے یہ بھی سوچا کہ کرنل صاحب بے وقوف آدمی نہیں ہیں۔ ممکن ہے انھوں نے آپ کے کمرے کی نگرانی شروع کرا دی ہو۔ اس لئے میں نے ایسے وقت کا انتظار کیا جب سب لوگ گہری نیند سو جائیں۔"
"یار فیصل! تمھارے بارے میں ایک پیش گوئی تو میں کر سکتا ہوں کہ اگر تمھیں جاسوسی کی باقاعدہ تربیت دلوائی جائے تو میرا خیال ہے تم ایک بہترین جاسوس ثابت ہو گے۔"
"زاہد بھائی! میں بھی چاہتا ہوں کہ بڑے ہو کر جاسوس بنوں۔ اس سلسلے میں آپ دادا جان سے گفتگو کیجئے۔"
"کروں گا۔ ضرور کروں گا بلکہ میں خود تمھیں جاسوس بناؤں گا تم فکر کیوں کرتے ہو۔ اب یوں کرو کہ یہ کیسٹ میرے کمرے میں چھوڑ جاؤ اور آرام کرو۔"
"لیکن زاہد بھائی! آپ نے میری تسلی نہیں کی۔"
"کیا چاہتے ہو؟" زاہد نے پوچھا۔
"اب آپ کیا کریں گے؟"
"فیصل میاں! یہ تو چٹکیوں کا کھیل ہے ذرا صبح ہونے دو پھر تماشہ دیکھ لینا۔"
"مم... مگر میں تو تماشہ نہیں دیکھ سکتا۔"
"میں تمھیں پوری رپورٹ پیش کروں گا۔" زاہد نے جواب دیا اور فیصل نے گردن ہلا دی۔
"تو اب میں جاؤں؟"
"زندہ باد فیصل! زندہ باد۔ بس ایسے ہی خاموشی سے چلے جاؤ۔ کسی کو شبہ نہیں ہونا چاہیئے۔"
"سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔" فیصل نے کہا اور کمرے سے نکل گیا۔ زاہد کمرے کے دروازے میں کھڑا اسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا تھا پھر جب فیصل نگاہوں سے اوجھل ہو گیا تو وہ واپس اپنے کمرے میں آ گیا۔ اس کے ہونٹوں پر ایک شرارت آمیز مسکراہٹ کھیل رہی تھی پھر اس نے ہونٹوں ہی ہونٹوں میں بڑبڑاتے ہوئے کہا۔ "کرنل صاحب! میرا نام زاہد ذوالفقار زیدی ہے۔"
صبح کو ساڑھے آٹھ بجے کے قریب زاہد جالب صاحب کا... استقبال کرنے کو تیار تھا۔ اس نے ابھی تک منہ بھی نہیں دھویا تھا۔ ویسے اس نے کرنل شہنام اور شجاع احمد صاحب کے لیے اپنی گفتگو سننے کا معقول بندوبست کر دیا تھا۔ صبح ہی صبح کمرے کی عقبی کھڑکی کھول دی تھی۔ بغلی کھڑکی بھی کھول دی تھی یہ دونوں حضرات جو جگہ بھی پسند فرمائیں اس نے ان کے لئے معقول انتظام کر دیا۔ جالب صاحب نے دروازہ کھٹکھٹایا تو زاہد نے اُٹھ کر دروازہ کھول دیا۔
"اوہو جالب صاحب! خیریت تو ہے۔ کہیئے صبح ہی صبح کیسے تکلیف کی؟" اس نے کہا۔
"گڑ بڑ ہو گئی زاہد بھائی!"
"جی... زاہد نے متعجبانہ انداز میں پوچھا۔
"ہاں... میں چوپٹ ہو گیا۔"
"کیا آپ نے کوئی خواب دیکھا ہے جالب صاحب! میرا خیال ہے رات کو آپ نے کوئی ڈراؤنا خواب دیکھ ڈالا ہے۔"
"زاہد بھائی! سنجیدہ ہو کر بات چیت کیجئے میں بڑی پریشانی میں پھنس گیا ہوں۔"
"مجھے حیرت ہے کہ آپ نے اپنی کسی پریشانی میں مجھے کیوں شریک کیا۔ آپ تو مجھے منہ ہی نہیں لگاتے تھے۔"
"کیا... ؟" جالب صاحب چونک کر بولے۔
"بہرطور یہ میری خوش بختی ہوگی کہ اگر میں آپ کے کسی کام آ سکوں۔" زاہد کا لہجہ انتہائی مہذب تھا۔
"وہ تعویز جو آپ نے دیا تھا زاہد بھائی بے کار گیا۔ رستے پر چلنے کی مشق بھی کسی کام نہیں آئی حالانکہ میں نے آپ کی ہدایت کے مطابق شجاع احمد صاحب اور..."
"جالب صاحب! جالب صاحب! کیا ہو گیا ہے آپ کو کیسی باتیں کر رہے ہیں۔ تعویز، رستہ یہ سب کیا ہے؟ میرا خیال ہے رات کو آپ نے کوئی بھیانک خواب دیکھ ڈالا ہے۔"
"زاہد بھائی! میں اس تعویز کی بات کر رہا ہوں جو آپ نے مجھے دیا تھا۔"
"سبحان اللہ! یہ آپ نے مجھے پیر فقیر کب سے بنا دیا۔ بہرطور بیٹھے میں کسی کو بتاتا ہوں۔ پتہ نہیں آپ کیسی بہکی بہکی باتیں کر

رہے ہیں۔"

اب جالب صاحب کے حیران ہونے کی باری تھی وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے زاہد کو دیکھنے لگے۔

"تو کیا آپ نے مجھے تعویز نہیں دیا تھا؟"

"حضور! میں نے تعویز گنڈے کا کاروبار کبھی نہیں کیا۔ بلکہ ایسا کاروبار کرنے والوں سے مجھے نفرت ہے اب رہی رستے پر چلنے کی بات تو یہ بھی میری سمجھ میں نہیں آئی۔"

"آپ ہی نے تو کہا تھا۔"

"کیا کہا تھا میں نے؟"

"یہی کہ... کہ رستے پر چلوں۔"

"خدا کی پناہ۔ میں کیا کروں آپ کے لئے جالب صاحب؟"

"کچھ نہیں زاہد بھائی! وہ دونوں ترکیبیں ناکام ہو چکی ہیں۔"

"اچھا اچھا کہئے۔ کہتے رہیئے کم از کم آپ کے دل کی بھڑاس تو نکل جائے۔" زاہد نے کہا۔

"وہ خط کہاں ہے جو سحر نے مجھے لکھا تھا؟"

"اب یہی مناسب ہوگا کہ میں کسی کو آواز دے کر آپ کی ناسازی طبیعت کے بارے میں اطلاع دے دوں۔"

"میں خط کی بات کر رہا ہوں اور آپ میری ناسازی طبیعت کی بات کر رہے ہیں۔"

"برادرم! کون سا خط؟ کیسا تعویز اور کون سا رستہ؟ آپ کی کوئی بھی بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔"

"تت... تو... تو کیا سحر کے لئے آپ نے مجھ سے نہیں کہا تھا۔"

"سحر کون سحر...؟ آپ صبح کا ذکر کر رہے ہیں یا کسی کے نام کا؟"

"پتہ نہیں آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں زاہد بھائی؟"

"یہی شکایت مجھے آپ سے ہے۔ میں آپ کے اگر کسی کام آسکتا ہوں تو حاضر ہوں اگر آپ نے کوئی خواب دیکھا ہے تو براہ کرم اپنے ذہن کو درست کر لیجئے۔ ٹھنڈا پانی پلاؤں آپ کو؟"

جالب صاحب متحیرانہ نگاہوں سے زاہد کو دیکھتے رہے پھر گھبرائی ہوئی آواز میں بولے۔

"تو... تو آپ کسی بات کا اعتراف نہیں کریں گے؟"

"آپ جو حکم دیں گے جالب صاحب! میں اعتراف کرلوں گا لیکن تعویز۔ سحر، رستہ یہ تمام چیزیں آپ کے معدے کی بدہضمی کی پیداوار ہیں۔ میرا بھلا ان باتوں سے کیا تعلق۔ اگر رات میں آپ نے کوئی خواب دیکھا ہے تو اپنا ذہن اس خواب کے سحر سے آزاد کر لیجئے۔ میرا اس میں کوئی قصور نہیں ہے۔"

"آپ آپ جھوٹ بول رہے ہیں زاہد بھائی۔"

"آپ مجھے زاہد بھائی بھی کہہ رہے ہیں اور گستاخی بھی کر رہے ہیں میرے ساتھ میں اور کیا خدمت کر سکتا ہوں آپ کی؟"

"بب... بس ان باتوں کا اعتراف کر لیجئے۔"

"اگر میں اعتراف کروں تو آپ کو کیا مل جائے گا؟"

"وہ... وہ کچھ بھی نہیں۔"

"خدا کے لئے مجھے ایسی احمقانہ باتوں کے لئے مجبور نہ کیجئے۔ آپ براہ کرم آیئے میرے ساتھ آیئے میرا خیال ہے میں کرنل صاحب سے بات کر کے آپ کی صحت کی خرابی کی تفصیل بتاؤں۔ آیئے..." زاہد نے اس کا بازو پکڑا اور دروازے کی طرف گھسیٹنے لگا جالب صاحب گھن چکر بن گئے تھے۔ ان کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اب کیا کریں دوسری طرف کرنل صاحب اور شجاع احمد صاحب ایک کھڑکی سے لگے ہوئے یہ باتیں سن رہے تھے۔ شجاع احمد نے کرنل صاحب سے کہا۔

ضرغام میاں! بلاوجہ وقت ضائع کر رہے ہو یہ لڑکا میرا مطلب ہے تمہارا جالب مجھے خاصا چار سو بیس معلوم ہوتا ہے۔ اب اپنی بلا دوسروں کے سر ڈالنے کی کوشش کر رہا ہے جو کچھ میں نے سنا وہ تم نے بھی سن لیا۔ اب اس کے بعد کچھ اور کہنا چاہتے ہو تو کہو؟ کرنل صاحب کچھ نہیں بولے تھے۔ خاموشی سے وہ واپس اپنے کمرے میں چلے گئے اور پھر اسی دن انھوں نے بوریا بستر باندھ لیا تھا۔ شجاع احمد صاحب کو تو دوپہر کو ان روانگی کے بارے میں علم ہوا۔

"ارے ارے اس طرح اچانک۔"

"ہاں شجاع احمد! بس میں جانا چاہتا ہوں۔"

"میں سمجھ رہا ہوں تم ناراض ہوگئے ہو مگر مجھے بتاؤ میں نے کون سی غلطی کی ہے؟"

"نہیں شجاع! میری تو بس ایک ہی خواہش ہے۔"

"جی جی کہئے فرمایئے۔" شجاع احمد صاحب نے کہا۔

"میں چاہتا ہوں کہ میری اور تمہاری دوستی میں فرق نہ آئے۔ ان حالات میں میں قطعاً یہ بات نہیں کہوں گا کہ جالب کے لئے معافی جیسی کوئی چیز ہو سکتی ہے لیکن میرا تو کوئی قصور نہیں ہے۔"

"کیسی باتیں کرتے ہو ضرغام! تم نے یہ کیوں محسوس کیا کہ میں تم سے ناراض ہو جاؤں گا۔"

"بس حالات ہی ایسے ہیں۔"

"نہیں، میری خواہش ہے کہ تم بھی اپنے دل میں میل نہ رکھنا جاؤ۔"

"نہیں، میرے دل میں میل نہیں بس میں شرمندہ ہوں۔"

"چھوڑو، بچوں کی باتوں کو بڑوں کے درمیان نہیں آنا چاہیئے۔ میں

ہے سچ کہتا ہوں کہ تمہارے لئے میرے دل میں کوئی میل نہیں ہے یہ ایک چھوٹا سا معاملہ تھا جو میں نے بھی سوچا تھا اور تم نے بھی سوچا تھا نہیں ہے۔ ہاں کیا فرق پڑتا ہے۔"

"ہاں... اس میں کوئی شک نہیں ہے۔ اس کے باوجود میں جانے کا خواہش مند ہوں۔"

"مگر اچانک جاؤ گے کہاں؟"

"بس ابھی کچھ دن یہاں رہوں گا کچھ اور شہر دیکھوں گا اور اس کے بعد واپس چلا جاؤں گا۔"

"تو اس کے لئے آئے ہی کیوں؟"

"بس دل میں ٹھان لی ہے شجاع احمد جانے دو۔" ضرغام صاحب نے اس طرح کہا کہ شجاع احمد کو خاموش ہونا پڑا اس دن شام کو ساڑھے چار بجے ضرغام صاحب ان لوگوں کو خدا حافظ کر کے چلے گئے تھے۔

فرمودہ نے زاہد کی بہت تلاش کی لیکن زاہد فرسٹ ایڈ ہاؤس میں بھی دستیاب نہیں ہو سکا تھا فرمودہ آنکھوں میں آنسو لئے وہاں سے گئی تھی اس کے دل میں زاہد کے لئے پتہ نہیں کیا کیا خیالات موجود تھے لیکن زاہد کو علم ہو چکا تھا کہ کرنل ضرغام صاحب جا رہے ہیں اور وہ فرمودہ کے بارے میں بھی جانتا تھا چنانچہ فضول قسم کی حماقتوں سے بچنے کے لئے اس نے روپوشی اختیار کر لی تھی۔

*

شجاع احمد صاحب لاکھ آزاد فطرت کے مالک تھے کسی بھی مسئلے کو بہت زیادہ ذہن پر مسلط نہیں کرتے تھے لیکن ضرغام کے اس طرح چلے جانے سے انہیں بہت افسوس ہوا تھا۔ کرنل ضرغام سے انہیں خاصا دلی لگاؤ تھا قدسیہ اور دوسرے بچوں کے بارے میں انھوں نے سنجیدگی سے کچھ نہیں سوچا تھا لیکن کبھی کبھی اُن کے ذہن میں باپ جاگ اٹھتا تھا اور وہ سوچتے تھے کہ دولت کے انبار لگنے سے کیا فائدہ؟ جب اپنے بچوں ہی کو کوئی سکھ نہ پہنچا سکے۔

چنانچہ بارہا انھوں نے اس موضوع پر سوچا تھا لیکن جب اپنے گھر کا جائزہ لیتے تو انہیں احساس ہوتا کہ بچے اس بُری طرح بگڑ چکے ہیں کہ اب انہیں سنبھالنے کی کوئی کوشش کارگر نہیں ہو سکتی۔ تھوڑے دن پہلے ہی کی تو بات ہے۔ اس وقت کی جب زاہد یہاں موجود نہیں تھا وہ اپنے گھر پر حکمران تھے۔ تمام بچے خوش و خرم بھی تھے اور ان کا احترام بھی کرتے تھے ان کی ہر بات مانتے تھے کس کی مجال تھی کہ ان کی آواز میں اپنی آواز میں ملا سکے۔ یہ خوف نہیں تھا بلکہ احترام تھا لیکن آہستہ آہستہ احترام رخصت ہو گیا ہاں اس دن سے جس دن سے زاہد اس گھر میں آیا۔ زاہد کا خیال آیا تو دل میں دھواں اٹھنے لگا اس شخص نے کس طرح اس گھر میں داخل ہو کر اپنے پنجے گاڑھ لئے ہیں۔ خود ان کے بچے اور ان کی بیوی ان سے برگشتہ ہو چکے ہیں اور ان کی کوئی بات نہیں مانی جاتی یہ سب حسام احمد صاحب کا قصور ہے۔ اُنھوں نے اس گدھے کو اتنا منہ لگا لیا کہ اب وہ سر پر چڑھ چکا ہے لیکن یہ تو مناسب نہیں ہے یہ سب کچھ اُنھوں نے اپنی کوششوں سے بنایا ہے باپ کا احترام سر آنکھوں پر بے شک وہ آج بھی حسام احمد صاحب سے ڈرتے تھے لیکن یہ خوف اب ان معنوں میں نہ تھا جن معنوں میں بچپن میں ہوتا تھا۔ اب تو یہ صرف احترام تھا باپ کے سامنے۔ بولنے کی جرأت نہیں کر پاتے تھے لیکن اپنے گھر کو تباہ ہوتے دیکھنا بھی تو ان کے لئے ممکن نہیں تھا۔

کیا عجب کہ زاہد جیسے چالاک آدمی نے جالب کو بے وقوف بنایا ہو اور اب صاف مکر گیا ہو... ہاں، یہ ہو سکتا ہے اُنھوں نے ماضی کا جائزہ لیا۔ زاہد کے بارے میں وہ بھی بہت دفعہ سوچ چکے تھے لیکن اتنی شدت ان کی سوچ میں کبھی پیدا نہیں ہوئی تھی۔ آج ذرا زاہد کا تجزیہ کر لینا ضروری تھا بے شک اس شخص کے بارے میں اُنھوں نے بہت سی کارروائیاں کی تھیں اور ان میں مکمل طور پر ناکام رہے تھے عازم اور فاخر کا معاملہ تھا قدسیہ کے لئے جب بھی اُنھوں نے کوئی کوشش کی پتہ یہ چلا کہ اس میں کوئی نہ کوئی ٹانگ اڑ گئی۔ آخر ایسی کیا بات ہے ایسا کیوں ہوا ہے آج تک اس کی کوئی نہ کوئی وجہ تو ہوگی اور وجہ زاہد کے علاوہ اور کوئی نہیں ہو سکتا یہ شخص ہمیشہ ان کے راستے میں آیا ہے تو کیا وہ خود قدسیہ کی طرف مائل ہے۔ اگر یہ بات ہے تو میں اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالوں گا اُنھوں نے دل ہی دل میں سوچا پھر اُنہیں بیگم صاحبہ کی گفتگو یاد آئی بیگم صاحبہ نے بڑے وثوق سے کہا تھا کہ زاہد قدسیہ کو اپنی بہن کی مانند سمجھتا ہے۔ اِس کا تجزیہ کیسے ہو۔ اس جیسا بے کردار آدمی دُنیا کا کوئی بھی کام کر سکتا ہے زبان میں کچھ دل میں کچھ۔ نہیں اگر وہ اُن کے گھر میں گندگی پھیلا رہا ہے تو وہ اپنی جان پر کھیل جائیں گے اور اس گندگی کو فروغ نہیں پانے دیں گے کچھ نہ کچھ کرنا ضروری ہے۔ اُنھوں نے سوچا تمام گھرانہ بگڑ گیا ہے۔ قدسیہ مصور بن گئی ہے تصاویر کی نمائش ہو رہی ہے ایسی تصاویر جن کا کوئی سر پیر نہیں ہے لیکن انہیں حیرت اس بات کی تھی کہ ان تصاویر کی کافی پذیرائی ہوئی تھی اس کے علاوہ ہارون جنگریز کر رہ گیا تھا۔ آدمی کا بچہ ہی نہیں رہا تھا خیر سے اب شاعر بھی ہو گیا تھا پہلے گویا تھا اب شاعری بھی شروع کر دی تھی اس نے کیا وہ کبھی کام کا آدمی بن سکے گا؟ احمد رضا جسے اُنھوں نے بڑی لگن سے ڈاکٹر بنایا تھا اور جس کے بارے میں بہت کچھ سوچا تھا اُنھوں نے سا احمد رضا اب ایک خیراتی ہسپتال کھولے بیٹھا تھا حسام احمد صاحب جنھوں نے فرسٹ ایڈ ہاؤس جیسا بوگس ادارہ بنا کر کروڑوں روپے ضائع کر دیا تھا۔ ہر چند کہ

فرسٹ ایڈ ہاؤس نے حکومت کی نگاہ میں بھی حیثیت حاصل کر لی تھی۔
یہ تمام باتیں سوچتے ہوئے اُنھیں احساس ہُوا کہ زاہد جو کچھ بھی ہے بے پناہ پُر سحر قوتوں کا مالک ہے وہ ہر شخص کو مسحور کرنا جانتا ہے وہ اپنی حماقتوں سے بڑے بڑے لوگوں کو متاثر کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے اور اس کی یہی پُر سحر شخصیت ان کے گھر پر بھی اثر انداز ہے۔ کیا کریں، کس سے مشورہ کریں۔ خاموشی سے زاہد کو گولی مار دیں، قتل کر دیں اُسے یا... یا اس سلسلے میں مزید کوئی کارروائی کریں۔ بیگم کا خیال آیا ابتدا بیگم ہی سے ہو سکتی تھی۔ زاہد اگر اس کوٹھی میں رہا تو یہ کوٹھی کبھی پنپ نہیں سکے گی۔ یہاں وہ حالات پیدا ہو جائیں گے کہ پھر سنبھالے نہ سنبھلنے پائیں گے کچھ نہ کچھ کرنا ضروری ہے زاہد کو قتل کرایا جا سکتا ہے کچھ روپیہ دے کر کچھ غنڈوں کو اس کے قتل پر مامور کیا جا سکتا ہے لیکن لیکن دل نہیں چاہتا تھا اس حد تک نہیں جانا چاہتے تھے زاہد بس یہ کوٹھی چھوڑ کر چلا جائے۔ یہی کافی ہے چنانچہ اس سلسلے میں اُنھوں نے بیگم صاحبہ سے گفتگو کرنے کا آخری فیصلہ کر لیا۔ یہ دو ٹوک گفتگو وہ بیگم صاحبہ سے کر کے زاہد کو ہمیشہ کے لئے اس گھر سے نکال دینا چاہتے تھے۔ وہ اپنی جگہ سے اُٹھ کر بیگم صاحبہ کے کمرے کی جانب چل پڑے۔ بیگم صاحبہ حسبِ معمول بڑے اطمینان سے بیٹھی ہوئی تھیں۔ شجاع صاحب کمرے میں داخل ہوئے تو اُن کے ہونٹوں پر ایک استقبالیہ مُسکراہٹ پھیل گئی۔ شجاع احمد صاحب بھی مصلحتاً مُسکرا دیئے تھے۔

"کیا بات ہے بیگم! آج بہت اچھے موڈ میں نظر آ رہی ہیں آپ؟"

"ارے کچھ نہیں، بس ایسے ہی۔"

"پھر بھی کچھ تو؟"

"نہیں نہیں کیا بتاؤں تم سے تو دل کی بات کہتے ہوئے بھی ڈر لگتا ہے۔"

"ہوں... ایک زمانہ وہ تھا جب آپ دل کی باتیں صرف ہم سے کیا کرتی تھیں۔" شجاع احمد صاحب نے کہا۔

"ہاں، اور تم سُنا بھی کرتے تھے لیکن آہستہ آہستہ تمھارے کان میری آوازوں کی طرف سے بند ہو گئے اور اب تمھیں میری کوئی بات اچھی نہیں لگتی۔"

"یہ آپ کا خیال ہے بیگم صاحبہ، ورنہ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔" شجاع احمد صاحب نے بڑی شگفتگی سے کہا اور بیگم صاحبہ حیرت سے انھیں دیکھنے لگیں۔ ان کے لہجے کی یہ نرمی بیگم صاحبہ کو عجیب سی لگی تھی کافی عرصہ ہو گیا تھا کہ شجاع احمد صاحب نے اس لہجے میں بات کرنا چھوڑ دیا تھا وہ ان کی شکل دیکھنے لگیں پھر بولیں۔

"تو پھر وعدہ کرو کہ جو کچھ میں کہوں گی اس کا بُرا نہیں مانو گے۔"

"چلیئے ٹھیک ہے وعدہ! آپ جو بھی حماقت کی بات کریں گی اس کا میں بُرا نہیں مانوں گا لیکن ایک وعدہ آپ کو بھی کرنا ہو گا۔"

"وہ کیا...؟"

"جو کچھ میں کہوں گا آپ اسے بھی مان لیں گی۔"

"تو میں کیا ایسا نہیں کرتی؟"

"جی ہاں! آپ بعض معاملات میں ایسا نہیں کرتیں۔"

"مجھے افسوس ہے اگر تمھیں مجھ سے یہ شکایت پیدا ہوئی بہرحال پہلے تم ہی کہہ ڈالو۔"

"جی نہیں پہلے میں آپ کی بات مانوں گا اور اس کے بعد اپنے دل کی بات کہوں گا۔"

"دیکھو غصے میں آنے کی ضرورت نہیں ہے میں کہے دے رہی ہوں۔"

"جی ہاں! جی ہاں وعدہ کر چکا ہوں، آپ سے غصے میں نہیں آؤں گا لیکن اگر آپ نے کوئی غلط بات کہیں تو اس سلسلے میں آپ سے گفتگو ضرور کروں گا۔"

"ہاں کیوں نہیں بھلا اس سے میں تمھیں کیسے منع کر سکتی ہوں۔" بیگم صاحبہ نے کہا۔

"تو پھر فرمائیے۔"

"یہ کرنل ضرغام اچانک چلے گئے۔"

"ہاں چلے گئے ان کی بات چھوڑو۔"

"آپ کس کس کی بات چھوڑیں گے شجاع احمد صاحب! بیٹی کے لئے آپ نے اب تک جو کوششیں کی ہیں کیا ان میں کوئی ڈھنگ کی کوشش بھی ہوئی مجھے جواب دیجئے۔"

"چلیئے مانتا ہوں کہ احمق ہوں اور حماقتیں کرتا رہتا ہوں۔ آپ فرمائیے، آپ کیا کہنا چاہتی ہیں؟"

"میرے دل میں ایک خواہش ہے دیکھو وعدہ کر چکے ہو بُرا مت ماننا"

"اب فرمائیے بھی۔ آپ بلاوجہ سسپنس پیدا کر رہی ہیں۔"

"میری خواہش ہے کہ قدسیہ کی شادی میں اپنی پسند سے کروں۔"

"یہ کوئی ایسی خواہش نہیں ہے جس پر میں ناراض ہوں یا آپ سے بلاوجہ گریز کروں۔"

"لیکن جو نام میں اس کی شادی کے لئے لینا چاہتی ہوں ممکن ہے وہ آپ کو پسند نہ آئے۔"

"ایک بات عرض کر دوں آپ سے۔" شجاع احمد صاحب کسی خیال کے تحت بولے۔

"دیکھیئے، دیکھئے... آپ کا لہجہ بدل رہا ہے۔"

"ایک تصور اس لہجے کو خراب کر رہا ہے بیگم! آپ سے یہ بات کی توقع رکھتا ہوں اس لئے اس سے پہلے کہ آپ میرے سامنے وہ الفاظ

کہیں میں آپ کو ہوشیار کر دینا چاہتا ہوں۔"

"تو پھر کہیئے۔"

"وہ شخص زاہد تو نہیں ہوگا۔" شجاع احمد صاحب نے کہا۔

"کیسے انسان ہیں آپ؟ میں اپنے منہ سے کہہ چکی ہوں کہ زاہد قدسیہ کو اپنی بہن کی مانند سمجھتا ہے کہیں اس کے سامنے قدسیہ کا تذکرہ کر کے دیکھ لیجئے خود اس سے پوچھ لیجئے کہ وہ قدسیہ کو کس حیثیت سے چاہتا ہے۔"

"اچھا آئیڈیا دیا ہے آپ نے، میں اس سے یہ سوال ضرور کروں گا۔" شجاع احمد صاحب نے کہا۔

"ہاں ہاں... ضرور کیجئے۔"

"خیر چھوڑیئے اچھا یہ بتلایئے آپ کے ذہن میں زاہد کا خیال تو نہیں ہے۔"

"اب بھی یہ سوال کر رہے ہو مجھ سے؟"

"اچھا معافی چاہتا ہوں۔ اب ذرا وہ نام مجھے بتا دیجئے جس کے لئے آپ اتنا گھبراؤ دُبھراؤ اختیار کر رہی ہیں۔"

"وہ نام ہے سرفراز!"

"کیا...؟"

"ہاں سرفراز..."

"وہی لڑکا جس نے قدسیہ کو مصوری سکھائی ہے؟"

"جی ہاں...!"

"اس کے علاوہ آپ سے اور کس بات کی توقع کی جا سکتی تھی۔" شجاع احمد صاحب نے ناخوشگوار لہجے میں کہا۔

"مطلب کیا ہے آپ کا؟"

"بیگم... ! میں مانتا ہوں کہ زاہد نے اس ماحول کو دو کوڑی کا بنا کر رکھ دیا ہے۔ میرے علم میں اچھی طرح یہ بات آ چکی ہے کہ احمد رضا، فیصل، ہمدان، قدسیہ اور شازیہ کو تباہ و برباد کرنے والا زاہد ہے۔ اس نے نہ جانے... کون سے جنتر کو بدلا ہم سے لیا ہے۔ ابا جان پر براہِ راست ہاتھ ڈال کر اس نے یہاں اپنی پوزیشن محفوظ کر لی۔ میں نے دُنیا دیکھی ہے بیگم۔ میں آپ کو یہ بتا دوں کہ میرا تمام تر تجربہ صرف ایک ہی سمت اشارہ کرتا ہے اور وہ یہ کہ زاہد ہم سے کسی قسم کا انتقام لے رہا ہے۔"

"ہاں اس گھر کو خوشیاں دے کر اس گھر کی عزت بڑھا کر اس نے واقعی ہم سے انتقام لیا ہے آپ صحیح کہتے ہیں شجاعت احمد صاحب بالفظ انتقام کو جو معنی آپ نے پہنائے ہیں شاید ہی کبھی کسی دوسرے نے اس لفظ کو اس طرح استعمال کیا ہو۔"

"گویا اس سے پہلے یہ گھر کباڑ خانہ تھا یہاں انسان نہیں بستے تھے زاہد نے یہاں آ کر سب کو سنوارا۔ اس گھر کے جانوروں کو انسان بنا دیا؟

کیوں یہی کہنا چاہتی ہیں نا آپ؟"

"نہیں میں اس قسم کی کوئی بات نہیں کر رہی لیکن میں جانتی ہوں کہ اس نے اس گھر کی بہتری کے لئے ہمیشہ سوچا ہے۔"

"جی ہاں جی ہاں! اور جو بہتری اُس نے اس گھر میں پیدا کی ہے وہ آپ بھی دیکھ رہی ہیں اور میں بھی دیکھ رہا ہوں۔ چھوڑیئے ان باتوں کو۔ سرفراز کا ذکر آپ نے کیوں نکالا۔ کیا خوبی ہے اس لڑکے میں؟ کس حیثیت کا مالک ہے وہ؟ یہاں سے چلا گیا ہے۔ مصوّر ہے تصویریں بناتا ہے، بیچتا ہے۔ کتنا کما لیتا ہوگا اس سے؟ کیا وہ اس قابل ہے کہ شجاع احمد جیسے شخص کا داماد بن سکے؟"

"ہاں وہ اس قابل ہے۔ میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ قدسیہ کی شادی سرفراز ہی سے کروں گی۔" بیگم صاحبہ نے کہا۔

"خوب... کیا آپ بیوہ ہو گئی ہیں بیگم صاحبہ! شوہر کی موجودگی میں آپ یہ فیصلہ کیسے کر رہی ہیں؟"

"خدا نہ کرے میں ایسی بات سوچ بھی نہیں سکتی لیکن میں آپ ہی کے تعاون سے یہ کام کرنا چاہتی ہوں۔"

"گھر مکمل طور پر تباہ ہو چکا ہے بیگم! ہر شخص کی سوچ بدل گئی ہے اور میں ایک خاموش تماشائی کی طرح زندگی گزار رہا ہوں لیکن بات آپ بھی کان کھول کر سُن لیجئے کہ مزید حماقتیں نہیں ہونے دوں گا... سرفراز بے حیثیت انسان ہے۔ ایک بیوہ ماں کا بیکار بیٹا۔ وہ کسی طور میرا داماد بننے کے قابل نہیں ہے اور ایسا کبھی نہیں ہو سکے گا۔ میں اس سلسلے میں مزید ایک لفظ بھی سننے کو تیار نہیں ہوں۔ البتہ اتنا ضرور جاننا چاہتا ہوں کہ کیا یہ مشورہ بھی آپ کو زاہد ہی نے دیا ہے؟"

"جب آپ اس موضوع پر ایک لفظ بھی سننا نہیں چاہتے تو پھر یہ تمام باتیں کرنے سے کیا فائدہ؟"

"ٹھیک ہے، اگر یہ آپ کی خواہش ہے تو میں اس سلسلہ گفتگو کو منقطع کر رہا ہوں۔ البتہ ایک گزارش کرنے حاضر ہوا ہوں آپ سے صورتِ حال کچھ ایسی ہی پریشان کن ہو گئی ہے کہ میں آپ کے سامنے یہ الفاظ کہنے پر مجبور ہوں؟"

"وہ الفاظ کیا ہیں؟" بیگم صاحبہ نے کہا۔

"وہ الفاظ یہ ہیں کہ جس قدر جلد ممکن ہو سکے زاہد کو اس کوٹھی سے نکال دیں۔ ورنہ پھر وہ میرے ہاتھوں مارا جائے گا۔"

"تو پھر ٹھیک ہے، آپ اُسے قتل کر دیں، گولی مار دیں لیکن ایک بات آپ بھی سن لیجئے کہ اس کے قتل کی اطلاع پولیس کو دینے والی سب سے پہلی فرد میں ہوں گی۔ آپ نے مجھے اپنا راز دار بنا لیا ہے نا! تو پھر یوں کیجئے کہ زاہد سے پہلے مجھے قتل کر دیجئے۔ دونوں کو گولی

مار دیجئے۔ اس کے بعد آپ کے قاتل ہونے کا کوئی ثبوت نہیں رہے گا۔ لیکن اگر زاہد کا بال بیکا ہوا تو میں سب کچھ بھول جاؤں گی۔ میں اپنی اولاد کے قاتل کو معاف نہیں کروں گی۔ سمجھے آپ" بیگم صاحبہ کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

"خوب گویا اتنے گہرے پہنچے گارڈ رکھے ہیں اس نے۔ آپ اس کے لئے مجھے پھانسی پر چڑھوانے کو تیار ہو جائیں گی"۔

"خدا نہ کرے خدا نہ کرے کہ آپ پھانسی پر چڑھیں لیکن آپ یہ بھی سن لیں کہ اگر زاہد کو کوئی نقصان پہنچا تو میں خودکشی کر لوں گی۔ کم از کم اتنا تو کر سکتی ہوں میں"۔

"تو پھر آپ میرا فیصلہ بھی سن لیجئے۔ اب اس کوٹھی میں یہ رہے گا یا زاہد"۔

"میں یہ بات نہیں کہہ سکتی۔ نکال دیجئے آپ اُسے نکال دیجئے اس بدبخت کو خواہ مخواہ اس گھر کی بہتری کے لئے سوچتا ہے۔ خواہ مخواہ سب کی محبتوں میں ڈوبا ہوا ہے۔ ایک ایک کے لئے مارا مارا پھرتا ہے۔ نکال دیجئے۔ نکال دیجئے... میں کب منع کرتی ہوں"۔ بیگم صاحبہ زار و قطار رونے لگیں۔ شجاع احمد صاحب چند لمحات اُن کی شکل دیکھتے رہے اور پھر غصے سے پاؤں پٹختے ہوئے باہر نکل آئے۔ زاہد بدبخت اُن کے بس کی چیز نہیں ہے اس کا انہیں احساس ہو چکا تھا۔

*

زاہد جانتا تھا کہ جالب نے شجاع احمد صاحب کو ترہ تفصیل بتادی ہے۔ شجاع احمد صاحب احمق نہیں تھے کہ ان باتوں پر غور نہ کرتے۔ انہیں کسی حد تک یقین آگیا ہوگا۔ یہ دوسری بات ہے کہ وہ زاہد کے خلاف کوئی ثبوت حاصل کرنے میں ناکام رہے تھے۔ ویسے زاہد کے تمام مہرے اپنی جگہ فٹ تھے۔ فیصل کی وجہ سے وہ اس بات سے آگاہ ہو گیا تھا ورنہ شاید جالب صاحب کے ہاتھوں دھوکا کھا جاتا۔ بہرحال اس نے محتاط رہنے کا فیصلہ کر لیا تھا اور سوچا تھا کہ کچھ دن کے لئے بالکل ہی خاموشی اختیار کر لی جائے اور کوٹھی کے معاملات میں کوئی گڑبڑ نہ کی جائے ورنہ جلد بازی کام بگاڑ کر رکھ دے گی۔ چنانچہ ان دنوں وہ مکمل طور پر فرسٹ ایڈ ہاؤس میں مصروف ہو گیا تھا۔ وہاں کے کچھ رکے ہوئے کام پورے کرنے میں اس کا پورا دن ہی صرف ہو جاتا تھا۔ اس لئے کوئی اور بات نہیں ہو سکی تھی۔

اس دن جب وہ دوپہر کو فرسٹ ایڈ ہاؤس پہنچا تو سرفراز اور سحر ایک کمرے میں بیٹھے ہوئے آپس میں گفتگو کر رہے تھے۔ اس کے قدم رک گئے لیکن سحر نے اُسے دیکھ لیا اور بولی۔

"آجائیے زاہد بھائی... آپ کیوں رک گئے"۔ زاہد مسکراتا ہوا کمرے میں داخل ہو گیا۔

"میں نے سوچا کہ کوئی پرائیویٹ گفتگو نہ ہو رہی ہو"۔

"زاہد بھائی! آج اس پرائیویٹ گفتگو میں آپ کو شریک کرنا بھی ضروری ہے۔ میں اب اپنی زندگی کے لئے کوئی مناسب فیصلہ کر لینا چاہتی ہوں اور میری خواہش ہے کہ آپ بھی میری مدد کریں"۔

"حکم حکم... میں حاضر ہوں"۔ زاہد نے کہا۔ سرفراز کا منہ بنا ہوا تھا۔ وہ ان دونوں کو دیکھتا ہوا ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔

"جی تو کیا مسئلہ درپیش ہے آپ حضرات کو؟"

"زاہد صاحب! میں نے لڑکی ہونے کے باوجود آج اپنے ذہن و دل کی تمام حالت سرفراز کے سامنے کھول کر رکھ دی ہیں اور ان سے جواب طلب کر رہی ہوں۔ میں جاننا چاہتی ہوں کہ سرفراز کے دل میں میرے لئے کیا حیثیت ہے"۔

"اوہ تب تو میرا یہاں رہنا بالکل ضروری نہیں ہے۔ میں چلتا ہوں"۔ زاہد نے اُٹھتے ہوئے کہا۔

"نہیں زاہد بھائی! براہ کرم بیٹھ جائیے۔ یہ مسئلہ خاصا دشوار ہو گیا ہے"۔ سرفراز نے تلخ سے لہجے میں کہا اور زاہد چونک کر اُس کی شکل دیکھنے لگا۔

"کیا ہوا بھائی آپ کو؟ آپ کے لہجے میں یہ کڑواہٹ کیوں پیدا ہو گئی ہے؟"

"زاہد بھائی! میں سیدھا سادا آدمی ہوں۔ اُلجھنوں سے بچنا چاہتا ہوں۔ سحر صاحبہ میرے بارے میں غلط فہمی کا شکار ہیں۔ یہ کسی طور یہ بات ماننے کو تیار نہیں ہیں کہ میں ان کی طرف رجوع نہیں ہو سکتا"۔

"میں کہتی ہوں آخر مجھ میں بُرائی کیا ہے۔ کیا میری شکل و صورت خراب ہے، کیا میرا کردار خراب ہے۔ کونسی ایسی خرابی دیکھی ہے آپ نے مجھ میں جو مجھے اس طرح ٹھکرا رہے ہیں"۔ سحر بڑی مایوسی سے بولی۔

"بی بی محبت زبردستی کی چیز تو نہیں ہوتی۔ میں آپ کو اس انداز میں نہیں دیکھتا جس انداز میں آپ سمجھتی ہیں... میں نے آپ کو ہمیشہ ایک اچھے انسان کی حیثیت سے دیکھا ہے۔ آپ نے کچھ ایسی باتیں کیں جو بعض اوقات مجھے ناگوار گزریں لیکن میں نے یہ سوچ کر ٹال دیا کہ یہ عمر ہی ایسی ہوتی ہے لیکن میں اپنی مرضی کا مالک ہوں"۔

"زاہد بھائی! آپ میری سفارش کیجئے۔ آپ نے تو کہا تھا کہ یہ سب کچھ ہو جائے گا"۔

"دراصل تمہارا مسئلہ ذرا سا گڑبڑ ہے"۔

"وہ کیا؟ مجھے بتائیے۔" سحر نے پوچھا۔

"ناظم علی صدیقی صاحب کو اگر یہ بات معلوم ہوگی کہ تم سرفراز کو اس انداز میں دیکھتی ہو تو کیا وہ اُسے برداشت کریں گے؟"

"جی ہاں! وہ ان تمام باتوں پر تیار ہو جائیں گے۔ یہ آپ میری ذمے داری پر چھوڑ دیجئے۔"

"نہیں بی بی! آپ کی ذمہ داری پر نہیں چھوڑا جا سکتا۔ ناظم علی صدیقی صاحب سے بھی تو اس موضوع پر بات کر لینا ضروری ہے آخر وہ آپ کے باپ ہیں۔"

"تو پھر بات کر لیجئے۔ آپ بات کریں زاہد بھائی! بلکہ اگر چاہیں تو سرفراز کو بھی اپنے ساتھ لیتے آئیں تاکہ یہ اپنے کانوں سے سُن لیں کہ میرے ڈیڈی اُن کے لئے کیا رائے رکھتے ہیں۔"

"کوئی شخص کوئی بھی رائے رکھتا ہو۔ مجھے اس سے کوئی غرض نہیں میں اپنی رائے کو اہمیت دیتا ہوں۔ میں نے بس آپ سے کہہ دیا کہ میں آپ کو اس انداز میں نہیں دیکھتا اور یہ سب کچھ نہیں ہو سکتا۔"

"تو پھر ایک بات آپ بھی سُن لیجئے سرفراز کہ میں صرف تین دن تک انتظار کروں گی، صرف تین دن۔ اگر ان تین دنوں کے اندر اندر آپ نے مجھے مثبت جواب نہیں دیا تو پھر میں زندہ نہیں رہوں گی۔ یہ میرا آخری فیصلہ ہے۔" سحر نے ایسے لہجے میں کہا کہ زاہد کے دیوتا کوچ کر گئے۔ سحر اُٹھ کر کمرے سے باہر چلی گئی تھی۔ سرفراز اُلجھی ہوئی نگاہوں سے اُسے دیکھتا رہا اور پھر زاہد کی طرف متوجہ ہو گیا۔

"اب بتائیے، میں کیا کروں؟" سرفراز نے پوچھا۔

"کچھ نہ کچھ کرنا ہوگا سرفراز میاں! کچھ نہ کچھ کرنا ہوگا۔ بہر طور وہ اتنی بُری لڑکی نہیں ہے کہ ہم اُسے مر جانے دیں۔"

"میں خود بھی نہیں چاہتا۔ بھلا اس بیچاری کی زندگی لے کر مجھے کیا ملے گا لیکن زاہد بھائی آپ تو جانتے ہیں..."

"ہاں ہاں میں سب کچھ جانتا ہوں۔ تم کیوں فکر کر رہے ہو یار! تمھارا زاہد زندہ ہے۔"

"زاہد بھائی! میں سحر کی موت نہیں چاہتا۔ وہ تو مجھے بالکل پاگل معلوم ہوتی ہے۔ کہیں وہی کچھ نہ کرلے جو کہہ کر گئی ہے۔"

"نہیں کرے گی، انشاءاللہ نہیں کرے گی۔" زاہد نے کہا اور کسی سوچ میں گم ہو گیا۔ سحر کا یہ رُخ اُسے خاصا پریشان کر رہا تھا۔ کہانی اتنی جلدی اس رُخ پر آجائے گی اس کا اُسے اندازہ نہیں تھا اور اب اس سلسلے میں کوئی ٹھوس اور سنجیدہ اقدام کر لینا ضروری تھا، ورنہ صورتِ حال خاصی بگڑ جاتی۔ چنانچہ کافی دیر تک سوچنے کے بعد اس نے سرفراز سے کہا۔

"میاں! تم اطمینان سے اپنا کام انجام دو۔ ایسی ذمے داریاں تو احمق آدمی ہمیشہ اپنے سر لینے کے لئے تیار رہتا ہے۔"

"لیکن زاہد بھائی یہ مسئلہ کافی ٹیڑھا ہے۔ بڑا سوچ سمجھ کر کام کرنا ہوگا۔"

"کریں گے، کریں گے۔ اب مجھے اجازت دو۔"

"میں بہت پریشان ہوں۔"

"ہوتے رہو مجھے کیا۔ جب میں نے تم سے کہہ دیا کہ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ ہم کچھ نہ کچھ کریں گے تو کیوں پریشان ہو رہے ہو۔ کیا اعتبار ختم ہو گیا ہے زاہد پر سے؟" زاہد نے کہا اور سرفراز مُسکراتی نگاہوں سے اُسے دیکھنے لگا۔

"نہیں زاہد بھائی! آپ پر اعتبار تو شاید آخری سانس تک ختم نہیں ہوگا۔"

"بس بس، ایسے ہی مُسکراتے رہو۔ مجھے یہ مُسکراہٹیں پسند ہیں۔" زاہد نے کہا اور کمرے سے نکل آیا۔ وہ سرفراز سے یہ بات کہہ تو آیا تھا۔ لیکن خود بھی محسوس کر رہا تھا کہ صورتِ حال خاصی بگڑ چکی ہے۔ سحر واقعی کہیں تین دن کے بعد خودکشی نہ کرے یہ بہت بڑا المیہ ہوگا۔ ایسا نہیں ہونا چاہئے۔ اس المیے کو روکنے کے لئے اسے کچھ ایسے اقدامات کرنا پڑیں گے جو اس وقت مناسب نہیں تھے لیکن اب وقت آگیا تھا کہ اُنھیں کر لینا ضروری تھا۔ چنانچہ وہ وہاں سے چل پڑا۔

اس کی کار کا رُخ سرفراز کی رہائش گاہ کی جانب تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ سرفراز کی رہائش گاہ میں داخل ہو رہا تھا۔ صابرہ بیگم کی حالت اب بہت بہتر تھی چہرے پر تازگی دوڑ گئی تھی۔ اُنھیں تو گویا نئی زندگی مل گئی تھی۔ دربدر ماری ماری پھر رہی تھیں کہ اُنھیں ایک فرشتہ مل گیا. جس نے اُنھیں اُٹھا کر پہلے ایک جگہ محفوظ کیا اور پھر اُنھیں اُن کا گھر دے دیا۔ اب اپنے اس گھر میں وہ سرفراز کے ساتھ بے حد خوش تھیں۔ ہر وقت کام میں مصروف رہا کرتی تھیں اور ان کی صحت پہلے سے کافی اچھی ہو گئی تھی۔

زاہد کو دیکھ کر ان کی آنکھوں میں محبت کا نور اُتر آیا۔ اُنھوں نے بڑے پیار سے اُسے خوش آمدید کہا اور سر پر ہاتھ پھیر کر اپنے کمرے میں لے گئیں۔

"بیٹھو زاہد میاں! نا وقت آنے کی وجہ ضرور پوچھوں گی چونکہ تمھاری مصروفیات کا مجھے اندازہ ہے۔"

"زندگی کی دوڑ کچھ اس طرح سے اُلجھ گئی ہے امّی جان کہ اب اُسے سُلجھانے کے لئے آپ کا سہارا ضروری ہے۔" زاہد نے کہا۔

"خدا تمھیں ہر آفت سے محفوظ رکھے۔ کیسی دوڑ کیسی اُلجھن...؟" صابرہ بیگم نے پوچھا۔

"آپ جانتی ہیں امّی جان کہ میرے اطراف میں بکھرے ہوئے

لوگ ہی میرا خاندان ہیں۔ میں آپ سب کو ہی اپنے اہل خانہ سمجھتا ہوں آپ لوگوں کے سوا میرا اپنا کون ہے؟ آپ کو اس کا اندازہ ہے۔"

"خدا تمھیں زندہ سلامت رکھے۔ ہم بھی یہی سمجھتے ہیں کہ تم ہماری زندگی کا جزو لازم ہو۔"

"امی جان! اگر کبھی کوئی ایسی اُلجھن مجھے پیش آجائے جس میں مجھے آپ کی مدد کی ضرورت ہو تو کیا آپ اس سے انکار کر دیں گی؟"

"بیٹے! جان بھی دے کر تمھاری اس اُلجھن کو دُور کروں گی۔"

"اگر میں آپ سے آپ کی جان نہ مانگوں بلکہ ایک ایسی انا کو قتل کرنے کی بات کروں جو آپ کو وقتی طور پر تھوڑا سا متاثر کردے تو کیا آپ میری بات مان لیں گی؟"

"میں سمجھی نہیں۔"

"نہیں پہلے میں آپ سے جواب چاہتا ہوں۔ اگر میں آپ سے کوئی ایسی بات کہوں جو عام حالات میں آپ کبھی پسند نہ کریں لیکن میری خوشی کے لئے آپ کو کرنا پڑے تو کیا آپ کر دیں گی؟"

"ہاں کر دوں گی۔"

"وعدہ کرتی ہیں امی جان؟"

"ہاں زاہد وعدہ کرتی ہوں تمھارے لئے میں اپنی شخصیت کو ٹکڑے ٹکڑے کر سکتی ہوں۔ کوئی ایسی چیز نہیں ہے میرے وجود میں جو تم سے بڑھ کر ہو۔ میں یہ الفاظ کئی بار تم سے کہہ چکی ہوں۔ الفاظ ہی انسان کے جذبات کے ترجمان ہوتے ہیں۔ اپنے جذبات کو اگر الفاظ کا قالب نہ پہنایا جائے تو پھر وہ کونسی چیز ہوگی جو کسی کو اپنے دل کا حال بتانے میں معاون ثابت ہوگی۔ میں تمھیں بار بار بتا چکی ہوں اور اس بار بھی بتا رہی ہوں کہ میں نہ صرف سرفراز کو بلکہ تمھیں بھی اپنا بیٹا سمجھتی ہوں اور ہمیشہ مجھے تم پر اعتماد رہا ہے۔ میں جانتی ہوں کہ تم جو کچھ کہو گے وہ اتنا ہی ضروری ہوگا کہ مجھے اُسے آنکھیں بند کر کے مان لینا چاہیے۔"

"آپ نے بہت بڑی بات کہی ہے امی جان! ممکن ہے میرے الفاظ آپ کو صدمہ بھی پہنچائیں لیکن... اب اس بات کی سخت ضرورت ہے کہ میں وہ آپ سے کہہ دوں جو میرے دل میں ہے۔"

"کہو کہو... اتنی تمہید کیوں باندھ رہے ہو۔ مجھے اُلجھن ہو رہی ہے۔"

"امی جان! میں چاہتا ہوں کہ آپ، آپ ناظم علی صدیقی صاحب سے ملاقات کر لیں۔ میں اُنھیں آپ کے بارے میں سب کچھ بتا دوں گا آپ دونوں مل جائیں امی جان! سرفراز کو اُس کے باپ سے ملوا دیجئے۔ وہ دیوار گرا دیجئے جو ان کے اور آپ کے درمیان حائل ہے۔ میں انتہائی کوشش کروں گا کہ ناظم علی صدیقی صاحب اپنی غلطیوں کا اعتراف کر کے آپ کے پاس پہنچ جائیں۔"

صابرہ بیگم بھونچکی رہ گئی تھیں۔ یہ بات تو اُنھوں نے کبھی خواب میں بھی نہیں سوچی تھی۔ وہ زندگی بھر نہیں سوچ سکتی تھیں کہ زاہد ایسے جملے اُن کے سامنے کہے گا اور اس اعتماد کے ساتھ کہ وہ اُنھیں پُورا کریں گی وہ گم صُم سی ہو گئی تھیں۔ پھٹی پھٹی نگاہوں سے وہ زاہد کو دیکھتی رہیں۔ تب زاہد نے کہا۔

"اگر مسئلہ ایک زندگی کا نہ ہوتا تو آپ یقین کریں میں اپنی ماں کی انا کو کبھی نہیں توڑتا۔"

"زندگی کا...؟" صابرہ بیگم آہستہ سے بولیں۔

"ہاں امی! ایک زندگی کا مسئلہ ہے۔ اگر یہ سب کچھ نہ ہُوا تو سحر خودکشی کر لے گی۔"

"سحر...؟" صابرہ بیگم پھر اُسی انداز میں بولیں۔

"آپ کو ساری تفصیل بتانا ضروری ہے۔ سحر سرفراز سے محبت کرتی ہے اور آپ جانتی ہیں کہ وہ سرفراز کی بہن ہوتی ہے۔ علیحدہ ہے تو کیا ہُوا باپ تو ایک ہے۔ سحر نے سرفراز سے ملاقات کی ہے۔ اس نے کہا ہے کہ اگر سرفراز نے اُسے اپنی زندگی میں شامل نہ کیا تو وہ خودکشی کر لے گی اور اس خودکشی کے لئے اس نے تین دن کا وقت دیا ہے۔ امی میں جانتا ہوں اس قسم کی لڑکیوں کو میں اچھی طرح جانتا ہوں کیا فائدہ ہوگا نہیں۔ اُسے قتل کر کے آپ مجھے خود بتایئے۔ سحر مر گئی تو ناظم علی صدیقی تنہا رہ جائیں گے۔ ایک باپ سے اس کی بیٹی چھن جائے گی۔ اگر ہمارے چند الفاظ، اگر ہماری تھوڑی کوشش اس کے ذہن سے یہ بات [illegible] کے لئے نکال سکے اور اُسے پتہ چل جائے کہ سرفراز اس کا بھائی ہے تو روگ ہمیشہ کے لئے ختم ہو جائے گا۔"

صابرہ بیگم کسی گہری سوچ میں غرق ہو گئی تھیں۔ ناظم علی صدیقی ان کی زندگی کا سب سے بڑا سرمایہ تھے۔ ناظم علی صدیقی سے اُنھیں بے پناہ شکایتیں تھیں لیکن دل سے یہی دُعا نکلتی تھی کہ وہ زندہ رہیں سلامت رہیں۔ کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ ان سے رجوع کریں گی۔ لیکن یہ مسئلہ اور پھر زاہد نے اُن سے یہ بات کہی تھی۔ سحر کی زندگی کا سوال تھا۔ یوں بہت ساری باتیں آپس میں گڈمڈ ہو گئی تھیں۔ کافی دیر تک وہ اسی طرح گُم صُم سی بیٹھی رہیں۔ اُنھیں چکر آ رہے تھے۔ ایک لمحے میں اُن کا چہرہ زرد پڑ گیا تھا۔ زاہد اُن کی یہ کیفیت دیکھ رہا تھا۔ لیکن برداشت کرنا ضروری تھا چونکہ معاملہ ہی ایسا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد اُنھوں نے ڈوبتی ہوئی آواز میں کہا۔

"زاہد... زاہد کیا یہ ممکن ہے؟"

"امی! صرف آپ کی اجازت کی ضرورت ہے میں اُسے ممکن بنا دُوں گا۔"

"لیکن سرفراز! سرفراز کو میں کیسے مُنہ دکھاؤں گی؟ کیا کہوں گی... اُس سے؟"

"سب کچھ میں کہہ لوں گا۔ آپ کو کسی سے کچھ کہنے کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔" زاہد نے کہا۔

"اگر تم یہ بہتر سمجھتے ہو تو ٹھیک ہے۔" انھوں نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ اور زاہد خوشی سے اُچھل پڑا۔

"امی... امی ایک گھر آباد ہو جائے گا۔ ایک نیا گھرانہ تخلیق پا جائے گا۔ سحر کو جب یہ علم ہوگا کہ سرفراز اس کا بھائی ہے تو اس کی محبت تبدیل ہو جائے گی وہ اسی قسم کی لڑکی ہے۔ میں جانتا ہوں اُسے اچھی طرح لیکن امی اگر ہم نے اس سلسلے میں جرأت مندانہ اقدام نہ کیا تو سحر خودکشی کر لے گی۔ ہم یہ المیہ اپنے درمیان کیوں جنم دیں۔ خدا سی انا کا سوال ہے نا تو کیا حرج ہے۔ اگر ناظم علی صدیقی کو اپنی حماقتوں کا احساس ہو جائے اور وہ خود آ کر آپ سے معافی مانگ لیں تو اس میں امی آپ کی انا مجروح نہیں ہوتی۔ آپ مان جایئے۔ میری بات مان جایئے۔" زاہد نے کہا۔

"ٹھیک ہے بیٹے! مان لی میں نے تمھاری بات لیکن اب سارے معاملات تم خود سنبھالنا۔ میں آگے بڑھ کر قدم نہیں اُٹھا سکوں گی۔"

"زاہد کے ہوتے ہوئے آپ کو بھلا کوئی قدم اُٹھانے کی کیا ضرورت ہے۔" زاہد نے کہا۔

"ٹھیک ہے..." صابرہ بیگم نے تھکے تھکے لہجے میں کہا اور زاہد نے آگے بڑھ کر اُن کے ہاتھ چوم لئے۔

"مجھے یقین تھا کہ میری ماں مجھے کبھی مایوس نہیں کرے گی۔ اب میں چلتا ہوں۔" صابرہ بیگم نے گردن ہلا دی۔

زاہد کے جانے کے بعد وہ صوفے کی پُشت سے ٹک کر خلا میں گھورنے لگیں۔

★★

ناظم علی صدیقی کے بارے میں معلومات کرنے سے پتہ چلا کہ اس وقت اپنے آفس میں موجود ہیں چنانچہ زاہد سیدھا اُن کے دفتر پہنچ گیا۔ ناظم علی صاحب نے اُسے اپنے دفتر میں بلوا لیا تھا۔

"خیریت؟ کیا خدمت کر سکتا ہوں میں آپ کی مسٹر زاہد؟" انھوں نے سوال کیا۔

"پہلے میں یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ آپ کسی ایسی ذہنی مصروفیت میں تو نہیں ہیں جس کی وجہ سے میری آمد آپ کے لئے باعث زحمت ہو۔"

"نہیں... نہیں کوئی خاص بات نہیں ہے۔ بیٹھو کیا پیو گے؟"

"تکلف کی ضرورت نہیں ہے ناظم صاحب! کچھ ایسی ہی خاص بات تھی جس کی وجہ سے میں نے آپ کو یہاں آپ کے دفتر میں زحمت دی ہے۔"

"کہو کیا خاص بات ہے؟" ناظم صاحب نے اُسے بغور دیکھتے ہوئے کہا۔

"ناظم صاحب! میں سحر کے بارے میں آپ سے کچھ گفتگو کرنا چاہتا ہوں۔"

"کیسی گفتگو؟"

"آپ کو علم ہے کہ سحر صاحبہ نے ایک دفعہ ایک آرٹ گیلری سے ایک تصویر خریدی تھی جس کا نام آبرو تھا؟"

"ہاں مجھے یاد ہے۔"

"اور یہ بھی یاد ہوگا کہ قدسیہ شجاع احمد سرفراز کی شاگرد ہے؟"

"ہاں بھئی! معموں میں گفتگو نہ کرو۔"

"آپ کو سحر کی ذہنی کیفیت بھی معلوم ہوگی کیونکہ جیسا کہ سحر مجھے بتا چکی ہیں کہ اُنھوں نے آپ کو اس کے لئے تیار کر لیا تھا کہ آپ سرفراز کے لئے ایک عمدہ قسم کی پبلسٹی فرم کھولیں گے۔"

"ہاں! سحر نے مجھ سے سرفراز کے بارے میں یہ سب کچھ کہا تھا میں خود بھی سرفراز سے مل چکا ہوں اور اس بات کو بُرا نہیں سمجھتا کہ کسی فنکار کی صلاحیتیں سامنے لائی جائیں۔ اسے وہ مقام دیا جائے جس کا وہ حقدار ہے۔"

"ناظم علی صاحب! کیا میں آپ سے یہ سوال کر سکتا ہوں کہ یہ سب کچھ آپ نے بے غرض ہو کر کیا تھا؟"

"مطلب...؟"

"مطلب یہ کہ کیا آپ کو سحر صاحبہ کی ذہنی کیفیت معلوم ہے...؟" ناظم علی صدیقی چند لمحات زاہد کو دیکھتے رہے پھر بولے۔

"میں یہ بات بتانے میں کوئی حرج نہیں سمجھتا سحر میری اکلوتی بیٹی ہے۔ اس کی ماں مر چکی ہے۔ میں نے جو کچھ کیا ہے آج تک اُسی کے لئے کیا ہے۔ میں اُسے زندگی کا وہ اعلیٰ ترین مقام دینا چاہتا ہوں جو ایک باپ اپنی اکلوتی بیٹی کو دے سکتا ہے۔ ذہنی طور پر میں ان احساسات کا بھی قائل نہیں ہوں کہ انسان اپنا ایک معیار مقرر کرے اور دوسرے انسانوں کو اس معیار پر پرکھتا رہے۔ سرفراز کے بارے میں میں نے جس قدر معلومات حاصل کی ہیں وہ یہی ہیں کہ سرفراز ایک پڑھا لکھا نوجوان ہے۔ اچھی طبیعت کا مالک ہے۔ غریب ضرور ہے لیکن غربت میری نگاہ میں کوئی بُری چیز نہیں ہے۔ اگر سحر سرفراز کو پسند کرتی ہے تو میں سرفراز کو وہ سب کچھ دے سکتا ہوں جو سرفراز کا معیارِ زندگی بلند کر دے جو کچھ اُس کے پاس نہیں ہے وہ میں پورا کر سکوں گا۔ مجھے اپنا یہ تمام کاروبار یہ تمام دولت قبر تک نہیں لے جانا۔ اپنی بیٹی کے ہی حوالے کرنا ہے۔ اگر میں یہ سب کچھ کسی اور دولت مند نوجوان کے سپرد کر دوں تو

اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ وہ کچھ اور دولت مند ہو جائے گا لیکن... سرفراز اگر سلیقے کا انسان ہے تو مجھے یہ سب کچھ اُسے دینے میں کوئی عار نہیں ہے بشرطیکہ وہ میری بیٹی کو خوش رکھ سکے۔ میرا بس اتنا ہی سا مقصد تھا۔"

"لیکن ناظم صاحب! اس سلسلے میں آپ نے آگے بڑھ کر کوئی اقدام نہیں کیا؟"

"ہاں تم ٹھیک کہتے ہو میں اس وقت تک خاموش تھا جب تک کہ یہ مرحلہ کسی خاص نہج پر نہ پہنچ جاتا۔ سحر نے ابھی تک کھل کر مجھ سے اس بارے میں کوئی خاص گفتگو نہیں کی ہے لیکن میں نے یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ اگر اس نے کبھی مجھ سے ایسی گفتگو کی تو میں اس سے پوچھوں گا کہ اس کے اور سرفراز کے درمیان کہاں تک گفت و شنید ہو چکی ہے اور سرفراز کو پس منظر کیا ہے۔ یہ تمام باتیں معلوم کرنے کے بعد میں سحر کو اجازت دیتا کہ وہ سرفراز کو مجھ سے ملا دے اس سے کہے کہ وہ اس حیثیت سے میرے پاس آئے۔ مجھ سے گفتگو کرے۔"

"ناظم علی صاحب! میں آپ کو ایک بلند خیال انسان سمجھتا تھا لیکن آج مجھے اس کا یقین بھی ہو گیا۔ ایک اعلیٰ ظرف اور ایسی شخصیت کے مالک سے کوئی بات کہنے میں اب مجھے تردد نہیں ہے۔ معاف کیجئے گا ایک بہت ہی نجی سوال کر رہا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ آپ اس سوال کو میری ایک ضرورت سمجھ کر معاف کر دیں گے۔"

"کہتے رہو میں نے تمہیں ٹوکا نہیں ہے۔" ناظم علی صدیقی بولے۔

"جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں کہ یہ سوال خالص ذاتی نوعیت کا ہے اور اس کے لئے میں آپ سے معافی بھی مانگ چکا ہوں۔ کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ سحر صاحبہ کی والدہ کا کب انتقال ہوا؟"

"کافی عرصہ ہو گیا۔"

"اس سے پہلے بھی کوئی آپ کی زندگی میں شامل ہوا تھا؟" زاہد نے کہا اور ناظم علی صاحب کے ہاتھ ایک لمحے کے لئے لرز گئے۔ اُنھوں نے... پریشان سی نگاہوں سے زاہد کو دیکھا اور بولے۔

"مطلب...؟"

"مطلب یہ کہ کیا اس سے پہلے بھی آپ نے کوئی اور شادی کی تھی؟"

"تمہارے ذرائع معلومات کے بارے میں پوچھ سکتا ہوں؟"

"پہلے میرا سوال آپ پر اُدھار ہے۔"

"ہاں سحر کی ماں میری دوسری بیوی تھی۔"

"کیا آپ کی اہلیہ کا نام صابرہ خاتون تھا؟"

"اوہ... اوہ... تم زاہد تم... تم اُسے کیسے جانتے ہو؟"

"براہ کرم پہلے صرف جواب دیجئے۔ اس کے بعد میں آپ کے سوالات کے جواب دوں گا۔"

"ہاں...!"

"یہ پوچھ سکتا ہوں کہ آپ سے ان کی علیحدگی کن حالات کے تحت ہوئی؟"

"افسوس میں اس حد تک تمہیں نہیں بتا سکتا۔"

"خیر چھوڑیئے۔ یہ بتلایئے کیا ان سے آپ کی کوئی اولاد بھی تھی؟"

"ہاں شاید ایک بیٹا تھا۔"

"شاید کا کیا سوال ہے؟"

"بس میں تمہیں بتا چکا ہوں کہ بالکل نجی گفتگو میں نہیں کروں گا۔"

"بہر طور یہ بات تو آپ تسلیم کرتے ہیں کہ آپ کا ایک بیٹا تھا؟"

"ہاں یہ تسلیم کرنے میں کوئی ہرج نہیں ہے۔" ناظم علی صدیقی نے جواب دیا۔

"کیا آپ نے کبھی اپنی اہلیہ اور بیٹے کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی کوشش کی؟"

"ہاں... ایک غلط فہمی کی بنا پر ہم لوگ ایک دوسرے سے علیحدہ ہو گئے تھے لیکن صابرہ، صابرہ بہت ہی زیادہ ضدی طبیعت کی مالک نکلیں۔ اُنھوں نے پھر کبھی مجھے اپنا پتہ نہیں دیا۔"

"کیا آپ کے دل میں یہ خواہش رہی کہ آپ کبھی اُن سے ملاقات کرتے؟"

"زاہد! براہ کرم اب تو مجھے میرے سوال کا جواب دے دو۔ کیا تم کسی طور صابرہ خاتون کے بارے میں جانتے ہو۔ میرا مطلب ہے کہ وہ کیا کبھی تم سے اُن کی ملاقات ہوئی ہے؟"

"جی ہاں...!"

"کیا وہ زندہ ہے؟" ناظم علی صدیقی صاحب کے لہجے میں اضطراب تھا۔

"جی ہاں، وہ زندہ ہیں۔"

"اور... اور اُن کا بیٹا! اُن کا بیٹا... کک... کیا وہ بھی زندہ ہے؟"

"آپ کا بیٹا بھی زندہ ہے؟"

"کہاں ہیں وہ دونوں؟ کیا تم مجھے ان کے بارے میں بتا سکتے ہو؟ زاہد پلیز... زاہد کیا تم مجھے ان کے بارے میں بتا سکتے ہو؟" ناظم علی صاحب بے اختیار ہو گئے۔

"جی ہاں ناظم علی صاحب! حالات کچھ اس طرح اُلجھ گئے ہیں کہ مجھے آپ کو یہ تفصیل بتانی پڑ رہی ہے۔ سرفراز آپ ہی کا بیٹا ہے... ناظم علی صاحب! صابرہ خاتون زندہ ہیں اور اسی شہر میں رہتی ہیں۔"

"کیا...؟" ناظم علی صاحب کا چہرہ ہلدی کی طرح زرد پڑ گیا تھا۔ وہ کرسی کی پُشت سے ٹک کر پھٹی پھٹی نگاہوں سے زاہد کو دیکھنے لگے۔

یوں لگتا تھا جیسے ان کی آواز ہی بند ہوگئی ہو۔ ان کی طبیعت خاصی بگڑنے لگی تھی۔ زاہد اپنی جگہ سے اٹھا اور ان کے قریب پہنچ گیا۔ پھر اس نے کہا۔

"خود کو سنبھالئے ناظم صاحب! مجھے دکھ ہے کہ یہ ناخوشگوار انکشاف مجھے کرنا پڑا ہے۔ لیکن صورتِ حال کچھ ایسی ہی ہوگئی تھی۔ کم از کم یہ جاننے کے بعد کہ وہ دونوں بھائی بہن ہیں۔ میں خاموش نہیں رہ سکتا تھا۔ سحر، سرفراز کو دوسری حیثیت سے چاہتی ہیں، وہ سرفراز سے شادی کرنا چاہتی تھی۔ انھوں نے سرفراز سے دو ٹوک گفتگو کی ہے کہ اگر اس نے ان سے شادی نہ کی تو وہ خودکشی کرلیں گی۔ اس کے لئے انھوں نے تین دن کا وقت دیا ہے۔"

ناظم علی صاحب کی بگڑتی ہوئی حالت کو دیکھ کر زاہد نے ملازم کو بلانے کے لئے گھنٹی بجائی اور اس سے ایک گلاس پانی طلب کیا۔ ملازم پانی لے آیا تو زاہد نے اپنے ہاتھ سے ناظم علی صاحب کو پانی پلایا اور بولا۔

"آپ خود کو سنبھالئے ناظم علی صاحب! یہ بہت ضروری ہے۔ ہم ان حالات کو نظر انداز نہیں کرسکتے۔ اگر آپ نے ہمت سے کام نہ لیا تو یہ کون بتائے گا کہ زاہد آپ کا بیٹا ہے۔"

"صابرہ کہاں ہے۔ خیریت سے تو ہے؟"

"جی ہاں! کچھ عرصہ قبل وہ شجاع احمد صاحب کی کوٹھی میں رہتی تھیں لیکن اب ان کی علیحدہ رہائش گاہ ہے۔ جہاں وہ سکون سے رہتی ہیں۔"

"سرفراز وہ میرا بیٹا ہے لیکن تمھیں یہ تفصیل کیسے معلوم ہوئی...؟"

ناظم علی صاحب نے ڈوبی ڈوبی آواز میں کہا۔

"سحر صاحبہ کئی بار ان سے ملاقات کرچکی ہیں۔ پھر ایک بار انھوں نے اپنا تعارف آپ کے حوالے سے کرایا تو ان کی حالت بگڑ گئی پھر انھوں نے تمام حالات سے مجھے آگاہ کردیا تھا۔"

"وہ بہت بلند، بہت اعلیٰ کردار کی مالک ہے۔ افسوس میں اس کی قدر نہ کرسکا۔" ناظم صاحب نے گلوگیر لہجے میں کہا: "وہ چاہتی تو مجھ سے انتقام لے سکتی تھی۔ مجھے زندگی کے سب سے بھیانک المیے سے دوچار کرسکتی تھی لیکن اس نے ایسا نہیں کیا۔"

"وہ شاید زندگی کے آخری سانس تک آپ سے نہ ملتیں۔ آپ کو اپنے بارے میں بتانے کی اجازت نہ دیتیں لیکن، سحر کی زندگی کے لئے انھوں نے مجھے آپ کو یہ سب کچھ بتانے کی اجازت دے دی ہے۔"

"زاہد بیٹے! مجھے اس کے پاس لے چلو۔ فوراً مجھے اس کے پاس لے چلو۔ میں اُس کے قدموں میں گر کر اس سے معافی مانگنا چاہتا ہوں۔"

"پہلے اس انوکھی صورتِ حال پر غور کریں۔ سحر کو سنبھالیں۔ کوئی ایسی ترکیب سوچیں جس سے سحر کو صحیح راستے پر لایا جائے۔"

"آہ، سرفراز کو بھی بلاؤ۔ سرفراز کو بھی ملاؤ مجھ سے۔ میں اُسے گلے..." ناظم علی صاحب رونے لگے۔

"خود کو سنبھالئے ناظم صاحب! خود کو سنبھالئے۔ ہمیں بہت احتیاط سے یہ سب کچھ کرنا ہوگا۔"

"میں مفلوج ہوگیا ہوں زاہد! خدا کے لئے میری مدد کرو۔ مجھے سہارا دو۔ میں کچھ سوچنے سمجھنے کے قابل نہیں ہوں۔" ناظم صاحب سسکیاں لیتے ہوئے بولے۔

دفعتاً ٹیلی فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ زاہد نے ہاتھ بڑھا کر ریسیور اٹھا لیا تھا۔ "ہیلو...؟"

"ڈیڈی کہاں ہیں؟ آپ کون صاحب بول رہے ہیں؟" دوسری طرف سے آواز آئی۔

"اوہ سحر! میں زاہد بول رہا ہوں۔"

"ڈیڈی کے آفس میں ہیں آپ؟"

"جی ہاں!"

"میری کہانی سنانے آئے ہوں گے۔"

"سحر براہِ کرم جلدی دفتر آجائیے۔ ناظم صاحب کی حالت بہت خراب ہوگئی ہے۔"

"یہ آپ نے اچھا نہیں کیا زاہد صاحب! یہ آپ نے اچھا نہیں کیا۔" سحر ناخوشگوار لہجے میں بولی۔ "ڈیڈی کہاں ہیں؟"

"وہ شاید آپ سے گفتگو نہ کرسکیں۔ ناظم صاحب! سحر کو یہاں بلا لیجئے۔" زاہد نے ریسیور ناظم صاحب کی طرف بڑھایا۔

"سحر! آجاؤ۔ جلدی آجاؤ بیٹی!" ناظم صاحب نے سسکتی آواز میں کہا اور دوسری طرف شاید سحر کے ہاتھ سے فون گر پڑا۔ ناظم صاحب ہیلو، ہیلو کرتے رہ گئے تھے۔

"وہ آرہی ہوگی۔" زاہد نے ریسیور اٹھا کر کریڈل پر رکھ دیا۔

"بہت چاہتی ہے مجھے کہیں بدحواس نہ ہوجائے، کوئی حادثہ نہ کر بیٹھے۔ آہ... یہ سب، صابرہ، مجھے سزا مل گئی ہے۔ آہ صابرہ میں تمھارا مجرم ہوں۔"

"ایک بات بتائیے ناظم صاحب! کیا آپ نے سحر کو اپنے ماضی کے بارے میں کبھی بتایا ہے۔"

"ہاں وہ جانتی ہے۔ اسے صابرہ کی تفصیل معلوم ہے۔"

"یہ ایک اچھی بات ہوئی۔" زاہد نے کہا۔ ناظم علی صاحب روتے رہے۔ تھوڑی دیر کے بعد سحر آندھی طوفان کی طرح اندر داخل ہوگئی۔ اس نے بے چین نگاہوں سے ناظم صاحب کو دیکھا اور پھر بے اختیار ہو کر ان کی طرف دوڑی۔

"ڈیڈی پلیز...! ڈیڈی روئیے نہیں۔ میں معافی چاہتی ہوں۔ یہ لوگ بہت خراب ہیں۔ میں آپ کے لئے زندہ رہوں گی ڈیڈی۔ میں خودکشی نہیں کروں گی۔ اس شخص نے جو کچھ کہا ہے آپ اسے بھول جائیے۔ وہ ایک جذباتی کیفیت تھی۔ میں کسی ایسے شخص کے لئے آپ کو نہیں چھوڑوں گی۔ زاہد نکل جاؤ یہاں سے۔ گیٹ آؤٹ...!" وہ چیخی۔

"صرف چند لمحات کی مہلت دے دیں سحر! میں چلا جاؤں گا۔"

"نہیں سحر! اسے کچھ نہ کہو۔ اس فرشتے کو کچھ نہ کہو۔ بیٹھ جاؤ بیٹی! تم نے زاہد کی بے عزتی کر کے اچھا نہیں کیا۔ بیٹھ جاؤ۔"

"آپ روئیے نہیں ڈیڈی! پلیز آپ روئیے نہیں۔ میں آپ کے لئے ساری دُنیا کو قربان کر سکتی ہوں۔ جاؤ زاہد، سرفراز سے کہہ دو میں اس پر تھوکتی بھی نہیں۔ میں اپنے ڈیڈی کے لئے زندہ رہوں گی۔ میں کسی ایسے شخص کے لئے..."

"سحر...! سرفراز تمھارا بھائی ہے۔ سرفراز میرا بیٹا ہے۔ وہ صابرہ کا بیٹا ہے۔ میں تمھیں صابرہ اور اپنے بیٹے کے بارے میں بتا چکا ہوں۔"

"کیا...؟" سحر کی آواز لرز گئی۔

"تم سرفراز کی ماں سے مل چکی ہو۔ وہ صابرہ ہے، میری بیوی صابرہ۔ تمھاری ماں... بڑی ماں!" ناظم صاحب نے کہا۔ سحر بے جان سے انداز میں بیٹھ گئی۔ اس میں کھڑے ہوئے کی سکت نہ رہی تھی۔ اس کی قوتِ گویائی سلب ہو گئی تھی "یہ سرفراز میرا ہی بیٹا ہے۔ میری اندھی آنکھیں اسے نہ پہچان سکیں۔" سحر نے زاہد کی طرف دیکھا تو زاہد بولا۔

"ہاں سحر یہ حقیقت ہے۔"

"تمھیں یہ حقیقت معلوم تھی۔"

"ہاں معلوم تھی۔"

"اور تم نے مجھے نہیں بتایا۔"

"سرفراز میرا دوست ہے، گہرا دوست، صابرہ خاتون کو میں اپنی ماں سمجھتا ہوں۔ کوئی کام میں اُن کی مرضی کے خلاف نہیں کرنا چاہتا تھا۔ تمھیں... یاد ہو گا جب تم نے اُن سے اپنا تعارف کرایا تھا اور ان کی حالت اچانک بگڑ گئی تھی۔"

"سب کچھ یاد ہے مجھے، بہت کچھ یاد ہے لیکن لیکن انھوں نے مجھے حقیقت نہ بتا کر بھی تو اچھا نہ کیا۔"

"افسوس جس حقیقت سے تم واقف ہو چکی ہو سحر، وہ غریب تو ابھی اس بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا۔" زاہد نے کہا۔

"کیا مطلب...؟" سحر چونک پڑی۔

"ہاں، وہ ابھی اس سے واقف نہیں۔"

پھر زاہد، ناظم علی سے اجازت لے کر سحر کے ساتھ دوسرے کمرے میں آ گیا

"میں نہیں سمجھی۔" سحر آہستہ سے بولی۔

"خدا کی قسم، ابھی اُسے اس حقیقت کا علم نہیں۔ وہ نہیں جانتا کہ ناظم علی صدیقی صاحب کون ہیں۔ وہ نہیں جانتا کہ تم کون ہو۔ سحر پہلے ہم اُسے بتائیں گے اور اس کے بعد اُسے اس بات پر آمادہ کریں گے کہ اس کے سامنے اس کے باپ کا انکشاف کیا جائے اب مسئلہ میرے اور تمھارے درمیان ہے سحر! پہلی بات جو میں تم سے پُوچھوں گا وہ بڑی معیوب سی ہے لیکن اب ہمارے تمھارے درمیان آنا حجاب باقی نہیں رہا کہ میں تم سے کچھ پُوچھتے ہوئے ہچکچاؤں۔"

"کہئے زاہد! کہئے کیا بات ہے۔" سحر نے شرمگیں آواز میں کہا۔ اُسے اپنے ان الفاظ کا واقعی افسوس تھا جو اس نے زاہد کے لئے ادا کئے تھے۔

"سحر صابرہ بیگم تمھاری سوتیلی ماں ہوں گی اور سرفراز اس حساب سے سوتیلا بھائی۔ کیا تم ذہنی طور پر ان دونوں کو قبول کر لوگی کیا تمھیں یہ بات گوارہ ہو گی کہ ناظم صاحب کی محبت میں کوئی اور بھی شامل ہو۔"

"زاہد صاحب! میں صحیح عرض کر رہی ہوں کہ میں اس قسم کے خیالات کو ذہن میں قطعی جگہ نہیں دیتی۔ میں تو ایک عجیب سی زندگی گزار رہی تھی۔ میں تو خود تنہائی کا شکار تھی۔ ایسی کوئی شخصیت میرے لئے کسی طور ناگوار نہیں ہو گی۔ میری خواہش ہے کہ آپ جلد از جلد میرے گھر کو پُر رونق کر دیں۔ زندگی کا نیا احساس دفعتاً میرے ذہن میں بیدار ہوا ہے اور خدا کی قسم میں اس سے بہت خوش ہوں۔ آپ بالکل یہ نہ سوچیں کہ میرے ذہن میں ان دونوں کی اپنے خاندان میں شمولیت سے کوئی تردد ہو گا میں تو اس سوچ کی حامل ہی نہیں ہوں جو حقیقتیں ہیں اُنھیں کسی طور جھٹلایا جا سکتا ہے۔ میں تو صرف اس بات پر شرمندہ ہوں کہ اب میں اپنے بھائی کے سامنے کیا مُنہ لے کر جاؤں گی۔ سرفراز میرا بھائی ہے کیسی عجیب بات ہے زاہد کیسی عجیب بات ہے تم خود سوچو۔"

"میں سب کچھ کر لوں گا تم فکر نہ کرو۔"

"تو پھر اب کیا کرنا چاہیئے یہ بتاؤ؟"

"اس سلسلے میں تو تم سے مشورہ کرنا ہے پہلے ناظم علی صاحب کو صابرہ بیگم سے ملایا جائے یا پہلے تمھیں سرفراز سے ملایا جائے کیا کیا جائے؟"

"جب تمھیں صابرہ بیگم کے بارے میں یہ بات معلوم ہوئی تھی میرا مطلب ہے صابرہ بیگم نے تمھیں بتایا تھا تو تمھارے اپنے ذہن میں کیا خیال اُبھرا! تم نے یہ سوچا کہ سرفراز کو اس بارے میں کچھ بتایا جائے؟"

"خواہش تو بہت تھی دل میں لیکن صابرہ بیگم نے سختی سے

کردیا تھا صرف اِسی لئے کہ وہ ناظم علی صدیقی صاحب تک نہیں پہنچنا
چاہتی تھیں۔"

"کتنی شرمندگی ہورہی ہے کتنی غیرت آرہی ہے مجھے میرے بارے
میں صابرہ بیگم کیا سوچیں گی۔"

"بھئی اب فرشتہ بننے کی کوشش مت کرو۔ ظاہر ہے تمھیں یہ
بات معلوم نہیں تھی۔ یہ جو باقی سب کچھ ہوا یہ لاعلمی کی بنا پر ہُوا۔۔۔ میں
صابرہ بیگم یعنی امی جان کی مرضی کے خلاف بھی کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ بڑا احترام
کرتا ہوں ان کا اتنی نفیس نیک اور بلند کردار خاتون ہیں وہ کہ میں تمھیں بتا
نہیں سکتا سحر!"

"مجھے بتانے کی ضرورت بھی کیوں پیش آئے تمھیں۔ ظاہر میں خود
اُنھیں نہیں جانتی؟" سحر نے کہا۔

"ہاں ہاں۔۔۔ ٹھیک ہے اچھا چلو اب ان پُرانی باتوں کو چھوڑو۔ یہ
بتاؤ کرنا کیا جائے پہلے؟"

"ڈیڈی کیا کہتے ہیں۔ ڈیڈی تو ان سے ملنے کے لئے بے چین
ہوں گے؟"

"ابھی میں نے اس سلسلے میں ان سے کوئی بات نہیں کی۔ میرا
خیال ہے وہ بھی خاصے جھجک رہے ہیں۔"

"تو پھر یہ ہمارا فرض ہے کہ ہم اس خاندان کو یکجا کریں۔"

"بے شک۔۔۔" زاہد نے تصدیق کی۔

"پھر آؤ پہلے سرفراز کے پاس چلتے ہیں۔ میں خود ہی اُن سے بات
کروں گی۔"

"ہمت ہے؟"

"ہاں ہمت پیدا کرنی ہے۔ ظاہر ہے ہمیں مستقبل میں ساتھ گزارنا ہے
اور وہ۔۔۔ وہ میرا بھائی ہے کتنا عجیب لگ رہا ہے۔ میں نے زندگی میں
کبھی کسی کو اتنے وثوق سے بھائی نہیں کہا کیونکہ میں جانتی تھی کہ میرا کوئی
بھائی نہیں ہے اب دفعتاً۔ دفعتاً۔۔۔ چلو زاہد جلدی کرو۔"

"مگر ناظم علی صاحب سے بھی تو مل لیا جائے۔" زاہد نے کہا۔

"آؤ۔۔۔ میں ڈیڈی سے بات کرتی ہوں۔" تھوڑی دیر کے بعد وہ
دونوں ناظم علی صدیقی صاحب کے کمرے میں پہنچ گئے۔ ناظم صاحب
دونوں ہاتھوں سے سر پکڑے بیٹھے ہوئے تھے ان کی آنکھوں سے ٹپ
ٹپ آنسو گر رہے تھے۔ میز کی سطح تھوڑی سی بھیگی ہوئی تھی۔ اُنھوں نے ان
دونوں کو دیکھ کر آنسو خشک کر لئے لیکن میز کی بھیگی ہوئی سطح کو دیکھ کر سحر
مسکرادی۔ اس نے اپنا چھوٹا سا دستی رومال نکالا اور میز کی وہ سطح صاف
کر دی۔ ناظم صاحب چونک کر شرمندہ سے ہو گئے۔

"آپ رو رہے ہیں ڈیڈی!" اس نے محبت بھرے انداز میں پوچھا اور
ناظم علی صاحب کی سسکیاں اُبھر آئیں۔

"سحر تم میں۔۔۔ میں۔"

"ساری باتیں بے کار ہیں ڈیڈی! تقدیر ہمارے لئے کچھ فیصلے کرتی
ہے اور ان فیصلوں کا ایک وقت مقرر ہوتا ہے۔ اگر زندگی میں یہ تبدیلیاں
نہ ہوں تو ہم زندگی کو صرف ایک سپاٹ اور سیدھا راستہ کہہ سکتے ہیں یہ
تمام پیچ و خم ہی تو زندگی کا راستہ بنتے ہیں ڈیڈی اور یہ کہانی بہت
دلچسپ ہو جاتی ہے۔ ماضی میں جو کچھ ہُوا ہوگا بلاشبہ بہت بُرا ہُوا ہوگا۔ آپ
کی اور میری امی جان کی جدائی کے کچھ عوامل ہوں گے اور انہی عوامل کی
وجہ سے آپ دونوں کے درمیان شدت پیدا ہوئی ہوگی لیکن یوں محسوس
ہوتا ہے کہ آپ کے دل میں بھی ان کے لئے گنجائش تھی اور ان کے دل میں
بھی آپ کے لئے جب محبت کی یہ فضا موجود ہے تو پھر جھوٹی انا کی
دیواریں درمیان میں کیوں حائل رکھی جائیں۔ آپ امی جان سے ملیے
بڑے احترام سے اُنھیں اپنے گھر لائیے۔ ڈیڈی اتنے طویل عرصے کے
بعد آپ کو ان کی خبر ملی ہے۔ آپ اگر بڑے انسان ہیں تو اپنی غلطیوں
کا اعتراف کیجئے اور ان سے معافی مانگ کر ان غلطیوں کی تلافی کر دیجئے
ڈیڈی! اس میں بُرائی نہیں ہے، کوئی ہلکا پن نہیں ہے۔"

"سحر سحر۔۔۔ تم تم۔۔۔"

"جی ہاں! میں آپ سے پُرزور درخواست کرتی ہوں کہ میری امی
اور میرے بھائی کو اس گھر میں لے آئیے۔ کتنی خوش نصیب ہوں میں کہ
میری تنہائی خدا نے دفعتاً دور کر دی ڈیڈی میں پہلے سرفراز بھائی سے
ملنے جا رہی ہوں۔ ان پر اس حقیقت کا انکشاف کروں گی اور اس کے
بعد ہم اُنھیں بھی مشورے میں شامل کرلیں گے یہ بتائیے کہ آپ اتنی دیر
برداشت کر سکتے ہیں۔"

"ہاں بھئی! اب تو تم ہی لوگ مجھے سہارا دے سکتے ہو۔ درحقیقت
میں اپنے تمام تر تجربے کو اس سلسلے میں نامکمل پا رہا ہوں اور تمھاری
مدد کا طالب ہوں۔ زاہد بیٹے! میں تمھارے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا
میرے پاس الفاظ نہیں ہیں کہ میں تمھارے اس احسان کا جواب دے سکوں۔"

"الفاظ نہیں ہیں نا۔" زاہد نے سوال کیا۔

"ہاں۔۔۔!"

"تو پھر رہنے دیجئے بلا وجہ تکلف سے کیا فائدہ۔" زاہد مسکراتا ہُوا
بولا اور سحر بھی مسکرادی۔

"اچھا ڈیڈی! ہم لوگ جا رہے ہیں ہم آپ کو ٹیلی فون کریں گے اور
جو بھی صورت حال ہوگی اس کی اطلاع دے دیں گے۔"

ناظم علی صدیقی صاحب نے گردن ہلادی۔

*

سرفراز فرسٹ ایڈ ہاؤس ہی میں موجود تھا اپنے کاموں میں مشغول تھا۔ حسام احمد صاحب کسی کام سے چلے گئے تھے اور باقی کام اسی طرح جاری تھے۔ یہ دونوں سرفراز کو تلاش کرتے ہوئے اس کے دفتر میں پہنچ گئے۔ سرفراز دونوں کو ساتھ آتے دیکھ کر چونک پڑا تھا پھر اس کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ پھیل گئی لیکن اس مسکراہٹ میں تھوڑی سی پریشانی کا عنصر شامل تھا سحر نے جو کچھ کہا تھا سرفراز اس کے لئے پریشان تھا بہرطور اس نے خوش اخلاقی سے ان لوگوں کا استقبال کیا اور انہیں بیٹھنے کی پیش کش کی۔ سحر عجیب سی نگاہوں سے سرفراز کو دیکھ رہی تھی پھر وہ آہستہ سے آگے بڑھی اور سرفراز کے بالکل قریب پہنچ گئی۔ سرفراز ایک لمحے کے لئے بھونچکا سا رہ گیا تھا پھر سحر کی سسکیاں ابھرنے لگی تھیں۔ زاہد نے جلدی سے آگے بڑھ کر دفتر کا دروازہ اندر سے بند کر دیا تاکہ کوئی دوسرا یہ منظر نہ دیکھ سکے۔ سرفراز واقعی پریشان ہو گیا تھا سحر اس کے سامنے کھڑی سسکیاں لے رہی تھی دفعتاً سرفراز کے ہاتھ اٹھے اور سحر کے سر پر پہنچ گئے۔

"سحر! تم اپنے آپ کو سنبھالو۔ خدا کے لئے اپنے آپ کو سنبھالو میں تم سے کچھ باتیں کرنا چاہتا ہوں۔ تمہاری یہ سسکیاں پتہ نہیں کیوں میرے دل کو دکھ کا شکار بنا رہی ہیں مجھے بڑی تڑپ سی محسوس ہو رہی ہے۔ سحر میں تمہیں تمہاری اس محبت کو اگر کوئی اور نام دے دوں تو کیا اسے قبول کرو گی؟"

"مثلاً...؟" زاہد نے تمسخرانہ انداز میں پوچھا اور سرفراز تڑپ کر بولا۔

"نہیں زاہد بھائی نہیں ... میں میں... آنسو برداشت نہیں کر سکتا اس کی سسکیاں میرے وجود کو زخمی کر رہی ہیں زاہد۔ اسے سمجھاؤ یہ میری بہن بھی تو بن سکتی ہے میں اسے محبت کا یہ نیا روپ بھی تو دے سکتا ہوں۔ اسے میری بہن بنا دو زاہد بھائی میری دلی خواہش ہے کہ یہ مجھے اپنی زبان سے اپنا بھائی کہے۔"

"بھائی جان!" سحر کے منہ سے بے اختیار نکلا اور سرفراز حیرت سے اچھل پڑا۔ اس کے چہرے پر دفعتاً مسرت کی سرخی نظر آنے لگی تھی۔

"سحر بہن! میری بہن میری چھوٹی سی بہن..." سرفراز نے آگے بڑھ کر اپنے دونوں ہاتھ سحر کے سر پر رکھ دیئے۔ زاہد کی آنکھوں میں ایک لمحے کے لئے نمی سی آگئی تھی لیکن دوسرے لمحے وہ آنکھوں کی اس نمی کو پی گیا سحر ابھی تک سسک رہی تھی لیکن ابھی اصل حقیقت کا علم صرف زاہد کو ہی تھا۔ سرفراز کے فرشتے بھی نہیں جانتے کہ یہ جملے جو اس کی زبان سے نکل پڑے ہیں کیا حقیقت رکھتے ہیں؟

زاہد کے ہونٹوں پر ایک پُراسرار مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی۔ وہ دلچسپ نگاہوں سے اس جذباتی منظر کو دیکھ رہا تھا۔ سرفراز نے اسے دیکھا اور خود بھی مسکراتے ہوئے بولا۔

"خدا کی قسم زاہد بھائی! آپ یقین کریں سحر میرے لئے بے حقیقت نہیں تھی۔ میرے دل میں اس کے لئے ایک بھائی کے سے جذبات رہے ہیں۔ زاہد بھائی میں سحر کو اس روپ میں چاہتا تھا۔ میں دفعتاً بہت مغرور ہو گیا ہوں۔ آج میں خود کو بہت بڑا آدمی سمجھ رہا ہوں۔ میں سحر جیسی بہن کا بھائی ہوں۔"

"کسی زمانے میں ایک جادوگر تھا شاید سامری۔" زاہد نے کہا۔ "طویل عرصے تک اس نے خلقِ خدا کو تنگ کیا۔ پھر مر گیا لیکن اپنے جادو کا پٹارہ چھوڑ گیا۔ وہ پٹارہ مختلف جادوگروں کے ہاتھ لگا۔ وہ اس سے فائدہ اٹھاتے رہے۔ طرح طرح کے جادو اس پٹارے سے نکال کر لوگوں کو پریشان کرتے رہے۔ آخر میں صرف ایک جادو رہ گیا لیکن سامری کی وصیت تھی کہ یہ آخری جادو کسی نیک کام کے لئے استعمال کیا جائے۔ چنانچہ جادوگروں نے اس جادو کو ہاتھ نہ لگایا یہاں تک کہ جادو کا وہ پٹارا اٹریپل زیڈ یعنی زاہد ذوالفقار زیدی کے ہاتھ لگ گیا۔ آج تک غور کرتا رہا تھا کہ سامری کی اس وصیت کو کیسے پورا کروں لیکن آج موقع مل گیا ہے۔"

"اوہ! آپ نے وہ جادو سحر پر آزما ڈالا اور اس کے دل میں میرے لئے بھائی کا پیار جگا دیا۔ واقعی میں اسے تسلیم کرتا ہوں۔" سرفراز نے کہا۔

"سامری کی توہین نہ کرو بچے! اس کا علم اتنا چھوٹا موٹا نہیں ہوتا تھا اور پھر سحر تو خود سحر ہے۔ اس پر کوئی جادو کہاں اثر کر سکتا ہے۔ بات اتنی چھوٹی سی نہیں ہے۔ اگر سحر تمہاری حقیقی بہن ہے تو یہ جادو کیسا رہے گا؟"

"آپ یقین کریں زاہد بھائی میں . . . ."

"سنو! یہ ہم نے سحر پھونکا اور یہ بچھڑے مل گئے۔ تو سرفراز میاں خوش ہو جایئے۔ سحر تمہاری حقیقی بہن ہے۔ تمہارے قائم کئے ہوئے رشتے سے نہیں بلکہ خدا کے قائم کئے ہوئے رشتے سے۔"

"آپ کے لئے کوئی ٹھنڈی چیز منگواؤں زاہد بھائی۔" سرفراز نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"اپنے لئے منگواؤ سرفراز میاں۔ ابھی تمہاری کھوپڑی اڑ جائے گی یہ ناچیز یعنی زاہد ذوالفقار زیدی انکشاف کرتا ہے کہ سحر تمہاری حقیقی بہن ہے۔ تمہارے باپ کی بیٹی۔ بلکہ ناظم علی صدیقی تمہارے اصلی والد محترم ہیں یعنی اب تم اپنے آپ کو سرفراز ناظم علی لکھ سکتے ہو۔"

"میں نہیں سمجھا زاہد بھائی!"

"محترم ناظم علی صدیقی، محترمہ صابرہ بیگم کے شوہر ہیں تو تمہارے کون ہوئے؟"

"زاہد بھائی!" سرفراز بھونچکا رہ گیا۔

"زاہد بھائی بے قصور ہیں صاحبزادے۔ قصوروار وہ لوگ ہیں جنھوں نے یہ رشتہ کر دیا تھا۔ دونوں کا نکاح کر دیا تھا پھر دونوں کے درمیان ناچاقی ہوگئی اور دونوں علیحدہ ہوگئے۔ ناظم علی صاحب نے دوسری شادی کرلی اور سحر کے باپ بن گئے۔ سب اُستاد محترم کی کاریگری ہے۔"

"زاہد بھائی!" سرفراز چیخ پڑا۔

"بُری بات کہہ رہا ہوں لیکن برادرم۔ صابرہ بیگم میری بھی ماں کی طرح ہیں۔"

"سحر۔۔۔؟" سرفراز بے بسی سے بولا۔

"یہ حقیقت ہے بھائی جان۔"

"تم لوگ مذاق تو نہیں کر رہے؟"

"اتنا خطرناک مذاق میں نہیں کرسکتا سرفراز۔ یہ صرف تقدیر کا کھیل ہے۔" زاہد نے کہا۔ سرفراز بے جان کرسی پر گر گیا، اسکا چہرہ متوحش نظر آرہا تھا۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے کبھی سحر کو دیکھتا۔۔۔ اور کبھی زاہد کو۔

"سرفراز! یہ بات مجھے بہت پہلے سے معلوم تھی۔ اُس وقت سے جب سحر پہلی بار امی جان کے سامنے پہنچی تھی اور جب انھیں پہلی بار یہ علم ہوا تھا کہ سحر ناظم علی صدیقی کی بیٹی ہے اور اس وقت ان کی طبیعت خراب ہوگئی تھی۔ یہ زاہد ہی تھا جس نے اُن سے ان کے دل کا حال اگلوا لیا۔ انھوں نے مجھے بتایا کہ اُن کے شوہر زندہ ہیں۔ انھوں نے مجھے اپنی پوری کہانی سُنائی کہ کس طرح ان کی ان کے شوہر سے ناچاقی ہوگئی اور وہ اپنی شدت پسند فطرت کی وجہ سے ان سے علیحدہ ہوگئیں اور اُس کے بعد انھوں نے اپنے کسی رشتے دار تک سے بھی رجوع نہ کیا۔ بلکہ تنہا ہی زندگی کے میدان میں نکل کھڑی ہوئیں۔ تمھیں ساتھ لے کر۔ انھوں نے تمھارے ساتھ ایک طویل زندگی بتادی۔ انھوں نے تمھارے ذہن کو مطمئن رکھنے کے لئے تم سے جو کچھ بھی کہا سرفراز وہ ان کی مجبوری تھی۔ انھوں نے اپنی تمام زندگی اسی طرح گزار دی۔ تمھیں پرورش کیا اور جس طرح بھی اُن سے بن پڑا انھوں نے تمھارے ذہن کو [illegible] ہونے دیا لیکن وہ کسی طور یہ برداشت نہیں کرسکتی تھیں کہ ناظم علی صدیقی کی سحر ان کے بیٹے سرفراز سے اس قسم کے روابط رکھے۔ میں نے جب ان سے اس سلسلے میں پوچھا کہ کیا میں اس کا انکشاف کرسکتا ہوں تو انھوں نے شدت سے مجھے منع کر دیا اور مجھ سے کہا کہ کوئی [illegible] ہی ذریعہ اختیار کروں جس سے سحر اور سرفراز آپس میں یہ رشتہ قائم نہ کرسکیں۔

"میں اپنے طور پر اس کوشش میں مصروف رہا لیکن مجھے تمھاری طرف سے اطمینان بھی ہوگیا چونکہ تم دوسری منزل کی جانب گامزن ہوگئے تھے مجھے اس سے خطرہ نظر نہیں آرہا تھا سرفراز، کیونکہ تمھارے دل میں سحر کے لئے وہ جذبات نہیں تھے جو سحر کے دل و ذہن میں تمھارے لئے تھے مجھے سحر سے بھی ہمدردی تھی اور تمھاری بہن کی حیثیت سے میں اُسے اپنی بہن بھی سمجھتا تھا لیکن مجبور تھا کیونکہ امی جان کے حکم کی تعمیل کرنا بھی میرا فرض تھا۔ میں تو شدید کشمکش کا شکار رہا ہوں۔ مجھے اس سلسلے میں قصوروار کبھی مت سمجھنا۔ میں اتنی ہمت کبھی نہیں کرپایا کہ تم پر اس حقیقت کا انکشاف کرتا۔ بات اگر معمولی ہوتی تو یقین تھا کہ تم اُسے برداشت کرجاتے لیکن اس بات کو برداشت کرنے کے لئے پہلے تمھیں ذہنی طور پر تیار کرنا تھا۔ چنانچہ خاموشی کے علاوہ میرے پاس اور کوئی چارۂ کار نہیں تھا لیکن سحر جب اس بات کی دھمکی دے کر گئی کہ وہ خودکشی کرلے گی تو پھر میرا فرض جاگا، میں بھی مجبور ہوگیا تھا لیکن خُدا کا احسان ہے کہ میں نے کوئی جذباتی قدم نہیں اُٹھایا بلکہ تمھاری امی کو اس کے لئے مجبور کیا کہ اب وہ حقیقتوں کو چھُپانے کی کوشش نہ کریں۔ میں نے ان سے اجازت لے لی سرفراز، اور ان کی اجازت سے میں نے ان حقیقتوں کا انکشاف کردیا۔ ناظم علی صدیقی صاحب کو تمھارے بارے میں بتا چکا ہوں سحر کو بھی میں نے تمھارے بارے میں بتادیا اور اس وقت یہ ایک بہن کا پیار لے کر تمھارے پاس آئی ہے۔"

سرفراز کافی دیر تک گم صُم بیٹھا رہا۔ اس کے چہرے کے تاثرات لمحہ لمحہ بدل رہے تھے۔ اس کے انداز میں ایک ہیجانی کیفیت تھی۔

زاہد نے اُس وقت کوئی مذاق کرنا مناسب نہ سمجھا اور خاموشی سے سرفراز کو سوچنے کا موقع دیا۔ سحر گردن جھکائے سرفراز کے سامنے کرسی پر بیٹھی تھی۔ دفعتاً سرفراز اپنی جگہ سے اُٹھا اور اس تیزی سے اُٹھا کہ اُس کی کرسی اُلٹ گئی۔ وہ سحر کی جانب بڑھا۔ "میری بہن، میری پیاری بہن، کتنا مسرور ہوں میں، کتنا مسرور ہوں۔۔۔ خدا کی قسم مجھے بہت کچھ مل گیا ہے۔ آہ امی جان نے مجھ پر بھروسہ نہیں کیا۔ مجھے راز دار نہیں بنایا۔ مجھے ان سے شکایت ہے بےحد شکایت، آہ زاہد بھائی اب میں رُک نہیں سکوں گا۔ آئیں میرے ساتھ چلیں سحر کو بھی ساتھ لے آئیں۔ ہم سب امی جان کے پاس چلیں گے۔۔۔ اور۔۔۔ اور میرے ڈیڈی کہاں ہیں۔ کیا وہ امی جان کے پاس ہی مل گئے؟" سرفراز بے اختیار ہوا جا رہا تھا۔

"میاں ذرا خود کو سنبھالو۔ ہم سارے کام ٹھیک ٹھاک کرچکا

چلو آؤ چلتے ہیں۔ ویسے ناظم علی صدیقی صاحب تمہارے فیصلے کے منتظر ہیں۔ وہ بے چارے تو ابھی کچھ بھی نہیں کر سکے انھیں تو یہی خدشہ تھا کہ تم انھیں قبول بھی کرو گے یا نہیں۔"

"مجھے وہ اختلافات نہیں معلوم جو اُن کے اور امی کے درمیان تھے۔ مجھے تو کچھ بھی نہیں معلوم زاہد بھائی لیکن یہ معلوم کر کے میری مسرتوں کا ٹھکانہ نہیں ہے کہ میرے ڈیڈی اس دُنیا میں موجود ہیں۔ کتنا خوش نصیب ہوں میں۔ کتنا بڑا سرمایہ ملا ہے مجھے، کتنی دولت ملی ہے مجھے۔ میری بہن، میرا باپ۔ آج تک میں خود کو تنہا سمجھتا تھا۔ آپ یقین کریں زاہد بھائی! بارہا ذہن میں یہ احساسات سر اُبھارتے تھے کہ کاش امی جان کے علاوہ بھی میرا اس دُنیا میں کوئی اور ہوتا کوئی ایسا عزیز، کوئی ایسا رشتے دار جسے میں اپنا سگا کہہ سکتا۔ زاہد بھائی مجھے اتنا بڑا خزانہ ملا ہے کہ میں آپ کو بتا نہیں سکتا۔"

"وہ تو ٹھیک ہے برادرم، لیکن اب مسئلہ یہ پیدا ہوتا ہے کہ تم جیسا ذہین آدمی اس سلسلے میں کیا مشورہ دے سکتا ہے۔ یہ بتاؤ ناظم علی صاحب کو لے کر امی جان کے پاس چلیں یا پہلے امی جان کے پاس چلیں؟"

"زاہد بھائی! اس سے بہتر فیصلہ آپ ہی کر سکتے ہیں۔ میرا تو دماغ ماؤف ہو رہا ہے۔"

"اس ماؤف شدہ دماغ کی اوورہالنگ کرو، بیٹھ جاؤ۔ میرا خیال ہے کہ تمہارے لئے کوئی ٹھنڈی چیز منگواؤں۔" زاہد نے کہا اور سحر بے اختیار ہنس پڑی۔

"پلیز زاہد بھائی!" سرفراز گڑگڑاتے ہوئے بولا۔

"ٹھیک ہے ٹھیک ہے، تو پھر یوں کرتے ہیں کہ پہلے یہاں سے ناظم علی صاحب کے پاس چلتے ہیں۔ پھر انھیں ساتھ لے کر امی جان کے پاس چلیں گے۔ اب تم بھی اس سلسلے میں امی جان سے زیادہ سوالات مت کرنا۔ بہرحال کا تو تمھیں اندازہ ہو ہی چکا ہے۔ انھیں شرمندہ کرنے سے کیا فائدہ!"

"نہیں نہیں میں کچھ نہیں کروں گا۔ چلئے ڈیڈی کے پاس چلتے ہیں" سرفراز کے لہجے میں محبت کا رس گھلا ہوا تھا۔

چنانچہ زاہد ان دونوں کو ساتھ لے کر ناظم علی صدیقی کی کوٹھی کی جانب چل پڑا۔ ناظم علی صاحب اب بھی اُسی کمرے میں اُسی جگہ بیٹھے ہوئے تھے۔ جہاں زاہد اور سحر انھیں چھوڑ کر گئے تھے۔ پتہ نہیں ان پر کیا گزر رہی تھی۔

سرفراز دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا اور ناظم علی صاحب نے چونک کر گردن اُٹھائی۔ پھر سرفراز کو دیکھ کر ان کا بدن کانپ گیا، وہ ڈبڈبائی آنکھوں سے اُسے دیکھنے لگے۔ ان کی نگاہوں میں بے بسی شرمندگی اور حجاب کے تاثرات تھے۔ سرفراز آگے بڑھا اور ناظم علی صاحب کے پاس پہنچ گیا۔

"ڈیڈی!" اُس نے لرزتی آواز میں کہا اور ناظم علی صاحب بے اختیار ہو گئے۔ وہ پاگلوں کی طرح اُٹھے اور سرفراز سے لپٹ گئے۔ ان کی ہچکیاں بندھ گئی تھیں۔ رونے کے علاوہ وہ ایک لفظ بھی ادا نہیں کر سکے تھے۔

"ڈیڈی... ڈیڈی... ڈیڈی! خاموش ہو جایئے۔ پلیز خاموش ہو جایئے۔ مجھے آپ سے کوئی شکوہ کوئی شکایت نہیں ہے۔ کچھ بھی نہیں ہوا ڈیڈی۔ سب ٹھیک ہے، سب ٹھیک ہے۔" سرفراز ان سے لپٹتا ہوا بولا۔ سحر بھی ان سے لپٹ گئی تھی اور زاہد کھڑا سر کھجا رہا تھا۔

رونے دھونے کا یہ سلسلہ کافی دیر تک جاری رہا۔ سرفراز کے رخسار بھی بھیگے ہوئے تھے۔ پھر زاہد نے کھنکھار کر کہا۔

"اب اس وقت میرا کیا کردار ہونا چاہئے۔ آپ لوگوں کے درمیان؟ اوّل تو یہاں کھڑے ہو کر میں خود کو چُغد محسوس کر رہا ہوں۔" زاہد کی آواز سُن کر سب چونک پڑے اور ناظم علی صاحب جھینپے جھینپے انداز میں مُسکرانے لگے اور پھر وہ آگے بڑھ کر بولے۔

"زاہد میاں! تم نے بھی تو بہت بڑا کردار ادا کیا ہے۔ اتنا بڑا کردار کہ میں تمہارے احسان سے سر نہیں اُٹھا سکتا۔"

"محترم! سر اُٹھانے یا جھکانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ یہ میرا فرض تھا لیکن اب مسئلہ یہ پیدا ہوتا ہے کہ آپ لوگ کتنی دیر کے بعد یہاں سے چلیں گے؟ امی جان کو یہ تمام تفصیلات بتا کر آیا ہوں۔ اُن کی ذہنی کیفیت بھی بہتر نہیں ہو گی۔"

"میں چل سکتا ہوں ان کے پاس؟" ناظم علی صدیقی صاحب نے پوچھا۔

"ضرور چل سکتے ہیں۔ تشریف لایئے۔" زاہد نے کہا اور ناظم علی صاحب اسی حلیے اور اسی لباس میں ان سب کے ساتھ چل پڑے۔

"لباس تو تبدیل کر لیں ڈیڈی۔" سحر نے کہا۔

"نہیں بیٹا! اس وقت اس کے لئے مجبور مت کرو۔" انھوں نے لجاجت سے کہا اور سحر نے شانے اُچکا دیئے۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ صابرہ بیگم کے گھر کی جانب جا رہے تھے۔

"فیصلہ یہ کیا گیا ہے کہ آپ، صرف آپ، امی جان کے سامنے جائیں گے اور ہم ڈرائنگ رُوم میں آپ کا انتظار کریں گے پھر جب آپ دونوں ساتھ ساتھ ہمارے سامنے تشریف لائیں گے تو ہم سب آپ کا [illegible] کریں گے۔" زاہد نے کہا اور ناظم علی صاحب بُری طرح [illegible]

کار تھوڑی دیر کے بعد صابرہ بیگم کی رہائش گاہ پہنچ گئی۔
زاہد نے ناظم علی صاحب کو صابرہ بیگم کے بیڈ روم کا راستہ بتا دیا اور خود ان دونوں کو لے کر ڈرائنگ روم میں آ گیا۔
تینوں خاموش تھے۔ ناظم علی صاحب، صابرہ بیگم کے کمرے میں چلے گئے تھے۔ اندر کا حال ان لوگوں کو معلوم نہ ہو سکا۔
کافی دیر گزر گئی دس منٹ، پندرہ منٹ، بیس منٹ اور پھر آدھا گھنٹہ گزر گیا تو زاہد کھڑا ہو گیا۔
"بھائی! میرا خیال ہے یہ داستان سالہا سال کی ہے اور اگر سالہا سال تک ہم یہاں بیٹھے رہے تو پھر تو بڑی گڑبڑ ہو جائے گی آؤ چلو دیکھیں انھیں۔"
لیکن اس سے قبل کہ وہ اُٹھتے، ناظم علی صاحب نے کمرے کا دروازہ کھولا۔ صابرہ بیگم جھکی جھکی نگاہوں کے ساتھ ان کے پیچھے آ رہی تھیں۔ چند لمحات کے بعد وہ دونوں ڈرائنگ میں داخل ہو گئے۔ سحر بڑی تیزی سے آگے بڑھی اور صابرہ بیگم کے گلے سے لپٹ گئیں۔
"میری امّی... میری امّی..." صابرہ بیگم نے بھی اُس کا بھرپور ساتھ دیا۔
"سحر میری بیٹی! میری بچّی!" وہ سحر کو بار بار چوم رہی تھیں اور سرفراز کے ہونٹوں پر مُسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی۔
"ڈیڈی اُس وقت ہونا تو یہ چاہئیے کہ میں آپ کے گلے سے لگ جاؤں۔" سرفراز نے کہا۔
"جب ہونا چاہئیے تو تم کیوں نہیں کر رہے۔" ناظم علی صاحب بولے اور سرفراز آگے بڑھ کر ان کے نزدیک پہنچ گیا۔
"میں پھر فالتو رہ گیا۔" زاہد نے کہا اور دروازے کی جانب بڑھ گیا۔
"ارے، نہیں، نہیں، بھئی تم فالتو کہاں ہو۔ تم تو ہمارے درمیان ایک ایسی انمول شے ہو جس کا کوئی مول نہیں ہے۔"
"بس بس رہنے دیجئے۔ میرا اب آپ لوگوں کے درمیان کیا کام؟" زاہد نے کہا۔
"زاہد بھائی پلیز!" سرفراز بولا۔
"بھیا رک جاؤ۔" سحر نے کہا اور زاہد رُک گیا۔
"تو پھر اب ہم اس کھیل کے ختم ہونے کی گھنٹی بجائے دیتے ہیں۔ باقی معاملات آپ لوگ خود طے کیجئے۔ زاہد کو اجازت۔ خدا حافظ۔" زاہد نے کہا اور وہاں سے رُخصت ہونے لگا۔
"بھئی کہاں جا رہے ہو۔ آج ہم آپس میں ساتھ ساتھ بیٹھ کر کھانا وغیرہ کھائیں گے۔"

"آج نہیں، میری شمولیت اس وقت مناسب نہیں ہے۔ سالہا سال کے بعد بچھڑے ہوئے ملے ہیں۔ آپ لوگ اپنی باتیں کیجئے پھر کبھی یہ دعوت اُدھار رہی۔" زاہد نے کہا۔ ان لوگوں کے لاکھ روکنے کے باوجود وہ وہاں نہیں رُکا تھا اور تھوڑی دیر کے بعد وہ اپنی کار میں بیٹھ کر واپس چل پڑا۔

⁂

باقی لوگوں میں سے کسی کو زاہد نے ابھی یہ تفصیل نہیں بتائی تھی۔ سرفراز اور سحر کو چھوڑنے کے بعد وہ واپس کوٹھی آ گیا تھا۔ یہاں کی تفریحات جوں کی توں جاری تھیں۔ پتہ نہیں کیوں اس کے دل میں ایک غبار سا بھر گیا تھا۔ طبیعت میں ایک بے چینی سی پیدا ہو گئی تھی۔ دل پتہ نہیں کیسے احساسات کا اظہار کر رہا تھا۔ اس کیفیت کو سنبھالنے کے لئے وہ ہارون کے پاس جا پہنچا۔ ہارون اپنے چکر دل میں لگا ہوا تھا۔ شعر و شاعری ہو رہی تھی۔ ساز بجے ہوئے تھے اور وہ بالکل ہی بگڑ گیا تھا۔
زاہد اس کی کچھ غزلیں سُنتا رہا۔ پھر قدسیہ اور شازیہ بھی آ گئیں۔ وہ زاہد کو تلاش کرتی ہوئی یہاں پہنچ گئی تھیں۔ ان لوگوں کے ساتھ کافی دیر تک ہنسی مذاق ہوتا رہا۔ جالب صاحب کے چلے جانے سے گھر کی فضا میں پھر ایک رونق سی پیدا ہو گئی تھی۔ رات کو اپنے بستر میں لیٹ کر بھی وہ بہت سے منصوبے بناتا رہا۔ اب کم از کم سرفراز کے لئے آسانی پیدا ہو گئی تھی۔ شجاع احمد صاحب جس قسم کے انسان تھے۔ اس سے زاہد کو یہ خطرہ تھا کہ قدسیہ اور سرفراز کے ملاپ میں وہ بہت بڑی رکاوٹ ثابت ہوں گے۔ اُسے ابھی تک بیگم صاحبہ اور شجاع احمد صاحب کے درمیان ہونے والے معرکے کا علم نہیں ہو سکا تھا۔ پتہ نہیں کیوں بیگم صاحبہ نے زاہد سے اس بارے میں کوئی تذکرہ نہیں کر سکی تھیں۔ وہ شجاع احمد صاحب کے کسی اقدام کی منتظر تھیں لیکن اپنے طور پر وہ زاہد کے لئے فکر مند ضرور تھیں۔ شجاع احمد صاحب پتہ نہیں اس سلسلے میں کیا اقدام کریں۔ وہ سوچتی رہی تھیں کہ زاہد کو ان معاملات سے آگاہ کر دیں لیکن ان کی ہمت نہیں پڑ رہی تھی۔ اپنے شوہر کے خلاف کوئی بھی قدم اُٹھاتے ہوئے انھیں خبر یا نہ احساس ہوتا تھا۔ وہ اس اُلجھن میں تھیں اور کوئی صحیح فیصلہ نہیں کر پائی تھیں۔
دوسرے دن زاہد اپنے معاملات سے فارغ ہونے کے بعد فرسٹ ہاؤس پہنچ گیا۔ دادا جان پہلے ہی وہاں پہنچ چکے تھے تھوڑی دیر تک دادا جان کی خدمت میں حاضر رہا۔ پھر سرفراز کے کمرے کی جانب چل پڑا۔ سرفراز آج ابھی تک نہیں آیا تھا۔ زاہد جانتا تھا کہ وہاں

جذباتی معاملات ہی طے ہو رہے ہوں گے اور ابھی تک اس سلسلے میں کوئی فیصلہ نہیں ہو پایا ہو گا کہ آگے کیا کیا جائے۔ اس نے سوچا کہ سرفراز اب جس انداز میں بھی زندگی گزارنا پسند کرے گا بھلا اس میں کسی رکاوٹ کا کیا سوال ہے لیکن اس نے اپنی زبان پر تالے لگا رکھے تھے اور یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ سرفراز سے بھی یہی کہے گا کہ ابھی اس بات کو منظر عام پر نہ لائے۔ اس میں ایک مصلحت پوشیدہ تھی۔

وہ سرفراز کے کمرے سے نکل رہا تھا کہ نشاط ریسپشن رُوم میں داخل ہوتی نظر آئی۔ اس نے ایک نگاہ زاہد کی جانب دیکھا اور خاموشی سے اندر چلی گئی۔ زاہد ایک لمحہ کے لئے ٹھٹک گیا تھا۔ نشاط بڑی ہی باقاعدگی سے اپنا کام انجام دے رہی تھی اور اس نے جو ذمہ داری اپنے سر لی تھی اُسے پُورا کر رہی تھی۔ زاہد چند لمحات وہیں کھڑا سوچتا رہا۔ اُسے احساس ہُوا کہ اُس نے نشاط کو بُری طرح نظر انداز کر دیا ہے۔ حالانکہ نشاط بھی ایک نیک جذبے کے تحت ہی یہاں آئی تھی لیکن اس دوران میں زاہد نے ایک آدھ بار ہی اس سے مُلاقات کی تھی۔ کہیں وہ یہ نہ سوچے کہ زاہد کے دل میں اس کے لئے کدورت ہے اس احساس کو دل میں لئے ہُوئے وہ ریسپشن رُوم میں داخل ہو گیا۔

نشاط نے ایک سنجیدہ نگاہ سے اُسے دیکھا اور پھر پھیکی سی مُسکراہٹ کے ساتھ بولی۔

"جی میرے لائق کوئی خدمت ؟"

"جی ہاں،" زاہد نے کہا۔

"تو پھر فرمایئے۔"

"آپ مجھے ایک کپ کافی پلا سکتی ہیں ؟" وہ بولا اور نشاط کے ہونٹوں پر پھیکی سی مُسکراہٹ کچھ اور گہری ہو گئی۔

"رحم کھا رہے ہیں زاہد صاحب ؟"

"جی نہیں کھانے کا موڈ نہیں ہے۔ البتہ کافی کو طبیعت چاہ رہی ہے اس لئے ہو سکے تو پلوا دیں۔"

"مناسب ہو گا ؟" نشاط نے سوال کیا۔

"کیا مطلب ؟"

"مطلب یہ کہ آپ کو کافی پینے کے دوران میں یہاں بیٹھنا بھی پڑے گا اور مجھے یقین ہے کہ آپ اپنے دل پر جبر کر کے یہ وقت یہاں صرف کریں گے۔"

"کمال ہے بھئی۔ آپ اگر کافی نہیں پلوانا چاہتیں تو دوسری بات ہے یہ خواہ مخواہ کے الزامات کیوں لگا رہی ہیں ؟"

"میں شکایت نہیں کروں گی زاہد صاحب، شکایت کرنے کا حق بھی نہیں ہے مجھے۔"

"مگر کیسی شکایت مجھ سے کوئی قصور ہو گیا ہے ؟" زاہد نے معصومیت سے سوال کیا۔

"کافی منگواتی ہُوں آپ کے لئے" نشاط نے کہا اور اُٹھ کر باہر نکل گئی۔ زاہد کو خواہ مخواہ پچھتاوے کا احساس ہو رہا تھا۔ واقعی نشاط کو نظر انداز کر کے اُس نے اچھا نہیں کیا تھا لیکن یہ صرف اتفاق تھا۔ جان بوجھ کر اُس نے ایسی کوئی حرکت نہیں کی تھی۔ نشاط اپنے گھرانے سے مختلف تھی اور جب کہ اُسے نشاط سے کوئی کدورت نہیں رہی تھی۔ یہ سب کچھ نہیں ہونا چاہئے تھا۔ نشاط کو بھی اپنے دوستوں ہی کی حیثیت دینی چاہئے تھی۔ یہ احساس جب اُس کے دل میں جاگا تو اس نے فیصلہ کیا کہ نشاط کی یہ شکایت دُور کر دے گا۔ تھوڑی دیر کے بعد نشاط واپس آ گئی۔

"ابھی کافی آ رہی ہے۔" اُس نے کہا۔

"آپ کے الفاظ نے مجھے ذرا پریشان کر دیا ہے نشاط ؟"

"معذرت خواہ ہُوں کہ آپ کے لئے کسی پریشانی کا باعث بنی۔"

"بھئی اب بہت زیادہ جُوتے بھگو بھگو کر نہ مارو۔ کیا واقعی مجھ سے کوئی غلطی ہو گئی ہے ؟"

"نہیں، آپ یقین کریں میں آپ پر طنز نہیں کر رہی۔ مجھے احساس ہے کہ آپ کا دل میری طرف سے کبھی صاف نہیں ہو سکتا۔"

"یہ دُوسرا الزام ہے نشاط۔ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔" زاہد نے کہا۔

"ہائے زاہد ہے۔ میں آپ کو بحالت مجبوری زاہد کہتی ہُوں۔ ورنہ میرا دل آپ کو ظفر کہنے کو چاہتا ہے۔"

"براہِ کرم اس مجبوری کو برقرار رکھو۔"

"آپ مجھے یہ حکم دے سکتے ہیں اور میں اس حکم کو ماننے میں مسرت محسوس کرتی ہُوں۔"

"بھئی بہت زیادہ تکلف ہو رہا ہے الفاظ کے استعمال میں۔ کیا آپ بے تکلفی سے باتیں نہیں کر سکتیں ؟" زاہد نے کہا۔

"دل تو چاہتا ہے مگر ہمت نہیں پڑتی۔"

"پھر وہی طنز، آخر میں ہُوں کیا چیز، جو آپ کی بات کرنے کے لئے ہمت نہیں پڑتی۔"

"زاہد صاحب ! میں اس احساس کو کبھی دل سے نہیں نکال سکتی کہ آپ کو اور آپ کی امی کو میرے خاندان کی وجہ سے بہت سی تکالیف کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ کاش اس کا ازالہ میرے بس میں ہوتا۔"

"وہ بات پُرانی ہو چکی ہے نشاط۔ آپ کیوں بار بار اس بات کو

دُہراتی ہیں۔"

"آپ اس کا موقع دیتے ہیں۔" نشاط کی آواز ایک سسکی کی سی شکل میں نکلی اور زاہد پریشان نگاہوں سے اُسے دیکھنے لگا۔

"اچھا چلو، غیر مشروط طور پر معافی مانگ لیتا ہوں۔ اگر ایسی کوئی غلطی ہوگئی ہے تو اس کی نشاندہی کر دو آئندہ نہیں ہوگی۔"

"میں کوئی نشاندہی نہیں کروں گی۔ البتہ ایک سوال ضرور کروں گی آپ سے۔ مجھے کیوں نظر انداز کیا جا رہا ہے؟" نشاط کے لہجے میں ایک عجیب سی کیفیت بیدار ہوگئی تھی۔

"اے نشاط! کیا بتاؤں اب مجھے خود بھی احساس ہو رہا ہے کہ ایسا ہوا ہے۔ اگر ہو سکے تو اپنی فراخدلی سے کام لے کر مجھے معاف کر دیں۔" زاہد نے کہا۔

"آپ میرا دل بہلانے کے لئے یہ بات کہہ رہے ہیں۔" نشاط بولی۔

"نہیں، اپنے آپ کو مجرم سمجھتا ہوں۔"

"آپ خلوص سے کہہ رہے ہیں یہ بات؟" نشاط نے متعجبانہ انداز میں پوچھا۔

"ہاں نشاط! انتہائی خلوص سے۔"

"تو پھر... تو پھر آپ مجھے بتایئے کہ آپ میرے بارے میں کیا خیال رکھتے ہیں؟"

"نشاط! آپ کے اس جذبے کی میں قدر کرتا ہوں۔ آپ اس گھرانے سے خاصی مختلف ہیں۔" زاہد نے کہا۔

"کون سے جذبے کی بات کر رہے ہیں آپ؟"

"یہی... یہی کہ آپ نے مجھے اتنی زیادہ اہمیت دی۔ ورنہ میں ہوں کیا چیز، آپ کے گھر کی خادمہ کا بیٹا۔ بھلا میری یہ جرأت ہو سکتی ہے کہ کسی طور آپ کے سامنے نگاہیں اُٹھا کر کھڑا ہوں۔ نواب شمشیر زمان جو میرے ڈیڈی نہیں تھے لیکن جنہوں نے ہمیشہ مجھے باپ کا پیار دیا اور مجھے میرے مستقبل کے لئے بہت کچھ دیا۔ آپ ان کی بیٹی ہیں نشاط، آپ میرے لئے انتہائی محترم ہیں۔"

"نہیں زاہد! جو کچھ ہوا ہے کاش... کاش میرے بس میں ہوتا میں اُسے تمہارے ذہن سے کھرچ پھینکتی۔" نشاط ایک لمحے کے لئے بے تکلف ہوگئی اور آپ سے تم پر آگئی۔

"نشاط! اب آپ یقین کیجئے کہ آپ لوگوں کے لئے میرے ذہن میں کوئی کد نہیں ہے۔"

"آپ ایک سچے انسان ہیں زاہد، اگر آپ کہتے ہیں تو میں یقین کر لیتی ہوں۔"

"خیر سچا انسان تو میں نہیں ہوں لیکن کم از کم یہ بات میں بڑی سچائی سے کہہ رہا ہوں۔"

"کیوں؟ آپ سچے انسان کیوں نہیں ہیں؟"

"بھئی، دیکھئے سچائی تو ظفر ہے اور میں زاہد ہوں۔ مجبوراً آپ کو بھی اس سچائی کو بھلا کر مجھے زاہد کہنا پڑ رہا ہے۔"

"کیا میں اس قابل ہوں کہ آپ مجھے ان تمام باتوں کی وجہ بتا سکیں؟"

"آپ یقیناً اس سے کہیں زیادہ قابل ہیں نشاط لیکن اس کے لئے مجھے تھوڑا سا وقت درکار ہوگا۔ ابھی میں آپ کو ان حقیقتوں سے روشناس نہیں کراؤں گا۔"

"میرے دل میں تو بہت سی آرزوئیں ہیں لیکن ان کی تکمیل کا میں کوئی راستہ نہیں پاتی۔"

"مثلاً؟" زاہد نے پوچھا۔

"مثلاً یہ کہ میں آپ کی امی سے ملنا چاہتی ہوں۔"

"نشاط! میں آپ کو ضرور ان سے ملا دوں گا لیکن ابھی کیا یہ مناسب رہے گا؟"

"نامناسب ہونے کی کیا بات ہے؟ مجھ پر اعتبار نہیں ہے آپ کو؟" نشاط نے پوچھا۔

"اعتبار ہے آپ پر لیکن نشاط آپ سوچ لیجئے اچھی طرح۔ یہ بات قبل از وقت ہوگی۔"

"میرے لئے نہیں ہونی چاہئے زاہد، میں آپ سے، سب سے زیادہ قریب ہوں۔ سمجھے زاہد؟ میں آپ سے بہت قریب ہوں، اتنی قریب کہ آپ سوچ بھی نہیں سکتے۔" نشاط جذباتی سی ہوگئی۔ اُس کی آنکھوں سے آنسو چھلکنے لگے تھے۔

زاہد اس کی شکل دیکھتا رہا اور نہ جانے کیوں ایک لمحے کے لئے اُس کا دل تڑپ اُٹھا۔ اُس کی آنکھیں نشاط کے چہرے پر جم گئی تھیں، تیکھے تیکھے سے نقوش، چہرے پر بے پناہ ملاحت، ڈبڈبائی نیم آنکھیں جھکی ہوئیں۔ یہ حسین چہرہ، نہ جانے کس راستے سے، نہ جانے کس چور راستے سے اس کے دل میں جا چکا۔ آج زندگی میں پہلی بار اُس نے نشاط کو اس نگاہ سے دیکھا تھا۔ دُوسرے لمحے اُس نے اپنے آپ کو سنبھالا۔ نہیں نہیں یہ کیا حماقت ہے۔ ایسا نہیں ہو سکتا۔ یہ ہونا بھی نہیں چاہئے۔ یہ ہو بھی نہیں سکتا۔ کسی قیمت پر نہیں ہو سکتا لیکن بہت سی انہونی اس طرح ہو جاتی ہے کہ کوئی سوچ بھی نہیں سکتا۔

زاہد جب نشاط کے پاس سے اُٹھا تو دل پر ایک عجیب سا بوجھ لئے ہوئے تھا۔ اُس نے نشاط سے کچھ دن کی مُہلت مانگ لی تھی اور کہا کہ وہ اُسے اپنی ماں سے ضرور ملوائے گا لیکن اس کے لئے اُسے بھی تھوڑا سا وقت درکار ہے۔ بہت تھوڑا سا۔

نشاط مان گئی تھی اور زاہد کچھ اور بے کل ہوگیا تھا۔ وہ پاگلوں

کی طرح اِدھر اُدھر گھومتا پھر رہا تھا۔ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کرے۔

کیا حماقت ہے یہ؟ ایسا تو نہیں ہونا چاہیئے۔ خواہ مخواہ میرے ذہن پر یہ بوجھ کیوں سوار ہو گیا؟ نہیں زاہد صاحب خود کو سنبھالئے ورنہ سارا کھیل چوپٹ ہو جائے گا۔ یہ تو کسی طرح بھی ممکن نہیں ہے۔ نشاط کو دل میں بسانے کا جرم ناقابلِ معافی ہوگا۔ اس کا کوئی نتیجہ نہیں نکلے گا۔ حماقت سو فیصدی حماقت۔ وہ بوکھلایا بوکھلایا، اِدھر اُدھر گھومتا رہا پھر احمد رضا کے کلینک میں جا گھسا۔ احمد رضا نے اس کا پُرجوش استقبال کیا تھا۔

"کہو رضا کیا ہو رہا ہے؟"

"آپ کی زیرِ ہدایت عمل کر رہا ہوں۔ دیکھ لیجئے کس طرح کلینک کا کام چل رہا ہے۔"

"خُدا تمھیں اس کا اجر دے گا احمد رضا۔"

"آپ یہ دُعا کیوں دے رہے ہیں زاہد بھائی؟ خُدا آپ کو بھی تو اس کا اجر دے گا کہ آپ نے مجھے سیدھا راستہ دکھایا۔"

"کلینک کے معاملات کیسے چل رہے ہیں؟"

"نہایت بہتر بلکہ یُوں سمجھئے کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے میرے اس جذبے کا بڑا پھل دیا ہے۔"

"وہ کیسے؟"

"میرا خیال ہے کہ میرے اس کلینک سے بہت مختصر سے عرصے میں بہت سے مریض صحت مند ہو کر جا چکے ہیں۔ بس اللہ تعالیٰ نے مجھے ایک روشنی دی ہے۔ بہت سے نئے نئے طریقے دریافت کئے ہیں میں نے۔ آئیے آپ کو اپنے کلینک کے مریضوں سے ملاؤں۔"

زاہد کافی دیر تک احمد رضا کے ساتھ مریضوں کی خیریت دریافت کرتا رہا۔ کلینک کا ماحول بے حد پُرسکون تھا اور ہر زبان احمد رضا کو دُعائیں دے رہی تھی۔ جب وہ وہاں سے واپس نکلے تو زاہد نے احمد رضا سے کہا۔

"احمد رضا دولت بلاشبہ زندگی کی ایک اہم ترین ضرورت ہے لیکن اس کے علاوہ بھی کچھ ایسی چیزیں ہوتی ہیں جو انسان کی زندگی میں بہت بڑا درجہ رکھتی ہیں۔"

"میں سمجھتا ہُوں زاہد بھائی، اور میں یہ بھی سمجھتا ہُوں کہ جو کچھ ہو رہا ہے اس کا نتیجہ آپ کے حق میں بھی اچھا نکلے گا۔ کیا خُدا آپ کو نظرانداز کر دے گا؟"

"اچھا چھوڑو۔ یہ بتاؤ کہ مستقبل کے بارے میں اور کیا کچھ سوچا ہے تم نے؟"

"بھلا مجھے سوچنے کی کیا ضرورت ہے؟ زاہد بھائی موجود ہیں ہم سب کے لئے سوچنے والے۔" احمد رضا نے مُسکراتے ہُوئے کہا۔

"احمد رضا! معاملات کچھ اور آگے بڑھیں تو اچھا ہے۔ زندگی پر جمود نہیں طاری ہونا چاہیئے۔"

"مثلاً؟"

"مثلاً اگر میں آپ سے یہ سوال کروں کہ آپ کے ممی اور ڈیڈی یعنی شجاع احمد اور بیگم صاحبہ آپ کی شادی کے بارے میں سوچیں تو آپ اس مقصد کے لئے کسی ایسی ہستی کا نام تجویز کریں گے جو آپ کے لئے قابلِ قبول ہو۔"

"سچی بات کہوں زاہد بھائی؟" احمد رضا نے کہا۔

"ہاں بالکل سچی بات۔"

"تو پھر یوں سمجھ لیجئے زاہد بھائی کہ رضا آپ کے سامنے جھُوٹ نہیں بول سکتا۔ میں نے آج تک اس نگاہ سے کسی کو بھی نہیں دیکھا کوئی ایسی تصویر میرے ذہن میں نہیں بسی اور ایک بات اور بھی کہوں گا۔ اگر آپ میرے لئے کسی ایسی لڑکی کا انتخاب کر دیں گے جو میرے لئے زندگی کی ساتھی بن سکے تو مجھے آپ کی پسند پر اتنا اعتماد ہوگا کہ شاید اپنی پسند پر بھی نہ ہو۔"

"واقعی۔" زاہد نے عجیب سے انداز میں کہا۔ ایک نیا خیال اس کے ذہن میں پیدا ہُوا تھا۔ بالکل نیا اور اچھوتا خیال۔

"تمھیں اپنے الفاظ پر مکمل اعتماد ہے رضا؟" اُس نے پُوچھا۔

"ہاں بالکل۔"

"تو پھر یوں ہی سمجھ لو کہ وہ لڑکی میں نے تمھارے لئے تجویز کر لی ہے۔"

"کیا واقعی؟ جلدی بتائیے مجھے، جلدی بتائیے مجھے اس کا نام۔ تاکہ میں اپنے دل میں اس سے محبت شروع کر دُوں۔" احمد رضا نے بے تکلفی سے کہا اور ہنسنے لگا۔

"انتظار کرو صاحبزادے، انتظار کرو۔ جلد بازی اچھی چیز نہیں ہوتی۔" زاہد نے کہا۔

"ٹھیک ہے... ٹھیک ہے ہم بھی دچا سوندھ بھرے گانے گاتے رہیں گے۔ بلکہ ممکن ہے اُس وقت تک جب تک آپ ہمیں اس کا نام نہ بتا دیں۔"

"بہت جلد اس کا نام بتاؤں گا۔ بہت ہی جلد، چند لوگوں سے مشورہ کر لُوں۔"

"کمال ہے۔ شادی ہماری ہوگی اور اُس کے لئے مشورہ آپ غیروں سے کریں گے؟"

"ہاں۔" زاہد نے جواب دیا۔ کافی دیر تک احمد رضا سے ایسی ہی دلچسپ باتیں کرتا رہا۔ وہ دراصل اپنے آپ کو بہلا رہا تھا پھر وہ

وہاں سے بھی نکل آیا لیکن احمد رضا سے اُس نے جو کچھ کہا تھا وہ مذاق نہیں تھا۔ احمد رضا ایک مثالی نوجوان تھا اور کوئی بھی لڑکی اس کے ساتھ منسوب ہو کر اپنی خوش بختی پہ ناز کر سکتی تھی۔ دراصل اس کے ذہن میں سحر کا خیال آیا تھا کہ وہ آزاد طبع ضرور تھی لیکن اب زاہد اس سے بخوبی واقف ہو گیا تھا۔ وہ اچھے کردار کی لڑکی تھی۔ اگر اُسے احمد رضا سے منسلک کر دیا جائے تو کیا بُرا ہے۔ اس سلسلے میں کام کرنا ہی پڑے گا۔ یہ سب کچھ تھا لیکن اپنے لئے کیا کیا جائے۔ آج کی کیفیت تو مجھے بھی تباہ کر سکتی ہے۔ نہیں زاہد سنبھالو۔ خود کو سنبھالو! اس نے اپنے آپ سے کہا۔ ایک عجیب سی بے کلی، ایک انوکھا احساس اُسے ستائے جا رہا تھا۔ کوئی بات سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ خود کو کوس رہا تھا۔ خود پہ ہنس رہا تھا۔ واہ زاہد میاں آپ بھی یہ حماقت کریں گے اور حماقت بھی ایسی جس کا کوئی سر پیر نہ ہو۔ کوئی عقل کی بات ہے نشاط آسمان ہے اور آپ... صرف ظفر... صرف ظفر بلکہ زاہد ایک شعبدہ باز... ایک...“

”زاہد بھائی!“ دفعتاً ایک آواز سُنائی دی۔ گھوم کر دیکھا تو پیچھے شازیہ تھی۔

”ارے شازی! آؤ کیسے چلی آئیں۔“

”بس ایسے ہی آپ کو تلاش کرتی پھر رہی تھی۔“

”کوئی خاص بات ہے؟“

”ہاں۔“

”کہو۔؟“

”ایک بہت غریب آدمی مل گیا ہے۔ بہت ہی غریب ہے بیچارا بھیک مانگتا ہے میں نے سوچا آپ سے مشورہ کروں اگر آپ اجازت دیں تو اس سے محبت کروں۔ آپ نے کہا تھا نا، کہ غریبوں سے محبت کرنی چاہیئے۔“

”بھکاری ہے وہ؟“

”ہاں! بے چارا نوجوان ہے کہتا تھا اس کی ماں بیمار ہے۔ میں نے اُسے بہت سے پیسے دے دیئے۔ پورا پرس اُسے دے دیا اور میں نے اس سے یہ بھی کہہ دیا ہے کہ کل اسی جگہ ملے۔ میں آپ کو اس سے ملاؤں گی اور اگر آپ نے اجازت دے دی تو میں اس سے محبت شروع کر دوں گی۔“

”نہیں شازیہ! غریب کبھی بھیک نہیں مانگتا۔ وہ قابلِ نفرت ہوتا ہے قابلِ محبت نہیں۔ میں تمھیں اس سے صرف نفرت کی اجازت دے سکتا ہوں۔ آئندہ کبھی اس سے نہ ملنا۔“

”اوہ! ٹھیک ہے نہیں ملوں گی مگر پھر میں...“

”ایسی جلدی کیا ہے شازیہ! ابھی تو لمبی عمر پڑی ہے۔ میں خود تمھارے لئے کسی غریب کو تلاش کروں گا۔“

”وعدہ؟“ شازیہ نے کہا۔

”پکا وعدہ، اور تم بھی وعدہ کرو کہ اب اس سلسلے میں خود کوئی کوشش نہیں کرو گی۔“

”کبھی نہیں کروں گی وعدہ۔ مگر یہ بتایئے پھر میں وقت کیسے گزاروں کوئی کام مجھے بھی بتایئے۔“

”کام... کام...“ زاہد سر کھجانے لگا۔ پھر بولا۔ ”تمھارے دل میں دُکھی انسانیت کا درد ہے؟“

”درد... درد تو میرے کہیں بھی نہیں ہے۔“

”میرا مطلب ہے تم انسانوں کے لئے کچھ کرنا چاہتی ہو ایسے لوگوں کے لئے جو ہمدردی کے مستحق ہوں۔“

”ہاں! بالکل کرنا چاہتی ہوں۔“

”تو پھر احمد رضا کے کلینک میں مریضوں کی دیکھ بھال کیا کرو۔ دُکھی انسانیت کے لئے یہ بہت بڑی خدمت ہے۔“

”ارے، اب تک میرے ذہن میں یہ خیال کیوں نہ آیا میں آج ہی سے یہ کام شروع کرنا چاہتی ہوں۔“

”تو جاؤ۔ احمد رضا سے بات کرو۔ دل چاہے تو میرا نام بھی لے لینا۔“ زاہد نے کہا اور شازیہ دوڑ گئی۔ زاہد مُسکراتی نگاہوں سے اُسے دیکھ رہا تھا۔ جب وہ نگاہوں سے اُوجھل ہو گئی تو اس نے گہری سانس لی اور ایک بار پھر نشاط اُس کے ذہن میں اُبھر آئی۔ خود کو اس خیال کے جنجال سے نکالنے کے لئے وہ نہ جانے کیا کیا جتن کر رہا تھا لیکن نشاط کا جادو سر چڑھ کر بول رہا تھا۔ پھر اُس نے دادا جان کے کمرے کا رُخ کیا تھا۔

”آؤ۔ کیا خبریں ہیں؟“ حسام احمد نے کہا۔

”ہنگامے کچھ سرد پڑ گئے ہیں دادا جان۔“

”مطلب؟“

”کچھ ہونا چاہیئے۔“

”بہت کچھ تو ہو رہا ہے۔ فرسٹ ایڈ ہاؤس کے لئے دُور دراز کے ممالک سے عطیات موصول ہو رہے ہیں۔ ہمارا منصوبہ بے حد کامیاب ہے اور سب لوگ دل و جان سے اس کے قائل ہوتے جا رہے ہیں۔“

”ہاں! خُدا کا احسان ہے دادا جان! اس کے باوجود زندگی میں ایک ٹھہراؤ سا محسوس ہو رہا ہے۔“

”اگر ایسی بات ہے تو کچھ سوچو۔“

"دادا جان! ان بچوں کے بارے میں کچھ نہیں سوچیں گے۔ ہمیں ان کی شادیاں بھی کرنی ہیں۔"

"کن بچوں کی؟"

"ارے آپ نے اس پر غور نہیں کیا۔ قدسیہ ہے احمد رضا ہیں شازیہ ہے اب یہ سب شادی کے قابل ہیں ان کا فرض بھی تو ہمارے ہی کندھوں پر ہے۔ فرسٹ ایڈ ہاؤس ہماری زندگی کا سنگ میل تھا۔ اس کی طرف سے اطمینان ہوگیا ہے تو اب ہمیں اپنے بچوں کی طرف بھی تو کوئی توجہ دینی ہے۔"

دادا جان محبت بھری نگاہوں سے زاہد کو دیکھنے لگے پھر بولے "تمہارے اندر کس کی رُوح ہے زاہد۔ اس خاندان سے تیرا کیا رشتہ ہے کیا کیا کرے گا اس کے لئے اپنی بھی تو کچھ سوچ۔"

"ابھی اپنی باری نہیں آئی ہے دادا جان۔ کسی مناسب وقت پر اپنے لئے بھی آپ ہی کو تکلیف دُوں گا۔"

"بچوں کے لئے ذہن میں کوئی خاص بات ہے۔"

"ہاں دادا جان! ایک بات ہے تو سہی لیکن کچھ اُلجھنیں ہیں۔"

"مثلاً؟"

"رازداری کا وعدہ کرتے ہیں دادا جان۔"

"بے فکر رہو۔" دادا جان اعتماد سے بولے۔

"ایک ایسا واقعہ ہوا کہ عقل حیران رہ گئی۔ اس وقت میں اس کے بارے میں آپ کو بتانے حاضر ہُوا ہُوں۔"

"تو بتاؤ۔"

"آپ وعدہ کرچکے ہیں کہ صبر و سکون سے یہ بات سُنیں گے۔"

"ہاں بھئی وعدہ کرچکا ہُوں۔"

"تو پھر پہلا انکشاف یہ ہے کہ میرے ذہن میں قدسیہ کے رشتے کے لئے سرفراز ہے۔"

"سس سرفراز؟" دادا جان چونک پڑے۔

"کیسا لڑکا ہے؟"

"لڑکا تو بہت اچھا ہے لیکن... لیکن..."

"غریب ہے۔"

"غریب ہونا بُری بات نہیں ہے۔ بس خاندانی معاملہ ہے اور شجاع احمد اس سلسلے میں بہت سخت ہے بے شک وہ میری یہ بات مانتا ہے لیکن اپنے بچوں پر بہر حال اسی کا حق ہے ممکن ہے اس سلسلے میں وہ زیادہ سخت ہوجائے۔ وہ کہہ سکتا ہے کہ وہ میری اولاد ہے۔ میرا اس پر حق ہے لیکن کم از کم اُسے اپنے بچوں پر تو حق دیا جائے۔"

"شجاع احمد کو بس یہی اعتراض ہوسکتا ہے کہ کسی اعلیٰ خاندان کا لڑکا نہیں ہے۔"

"ہاں! میرے خیال میں اور کسی اعتراض کی گنجائش نہیں ہے جہاں تک دولت کی بات ہے تو وہ سرفراز کو ہم دے سکتے ہیں۔"

"آپ ناظم علی صدیقی کو جانتے ہیں۔"

"کیوں نہیں۔"

"کیسا خاندان ہے ان کا؟"

"بہت اچھا ہے۔"

"آپ کے شایانِ شان ہے؟"

"کیوں نہیں مگر..."

"دادا جان! سرفراز، ناظم علی صدیقی کا بیٹا ہے اور اس کی ماں اُن کی بیوی ہے۔"

"کیا؟" دادا جان حیرت سے اُچھل پڑے۔

"جی ہاں! طویل عرصہ قبل دونوں میاں بیوی میں ناچاقی ہوگئی تھی اور..." زاہد نے دادا جان کو پُوری کہانی سنا دی اور یہ بھی بتا دیا کہ اب وہ سب مل گئے ہیں۔

"کب کی بات ہے۔ کب ہُوا یہ سب کچھ...؟"

"کل دادا جان! سحر سرفراز کی بہن ہے۔"

"سرفراز کہاں ہے؟" دادا جان بولے۔

"بہت عرصے کے بعد اپنوں سے ملا ہے میرا خیال ہے مصروف ہوگا جہاں تک میرا اپنا اندازہ ہے ناظم علی صدیقی صاحب معمولی حیثیت کے مالک نہیں ہیں۔ سرفراز کی شخصیت ایکدم بدل چکی ہے۔ تاہم اس کے ظرف سے مجھے یقین ہے کہ وہ ہم سے دُور نہیں جائے گا اور فرسٹ ایڈ ہاؤس کے لئے بدستور اپنی خدمات انجام دیتا رہے گا۔" زاہد نے کہا۔

"وہ تو ٹھیک ہے مگر... بھئی بڑی حیرت انگیز بات سُنائی یہ تم نے۔ یہ سب کچھ تم لوگوں نے اچانک خود بخود کرلیا مجھے اس کی ہَوا بھی نہیں دی۔"

"دادا جان! بس صُورتحال ہی کچھ ایسی تھی۔ اچانک ہی سارے انکشافات ہُوئے اور ہوتے چلے گئے ہمیں موقعہ ہی نہیں مل سکا کہ ہم سوچ بچار کرتے۔"

"بڑی عجیب بات ہے۔ بہر طور خوشی کی بھی ہے وہ بچّہ اتنا ہی اچھا تھا کہ بالکل اپنا ہی محسوس ہوتا تھا اور پھر زاہد میاں اچھا خاندان کبھی چھُپتا نہیں۔ وہ کیچڑ میں کھلا ہُوا پھُول تھا اور اس کی شخصیت سے یہی اندازہ ہوتا تھا کہ وہ کوئی معمولی آدمی نہیں ہے مجھے بیحد مسّرت ہے۔"

"چلئے چھوڑئیے دادا جان! یہ مسئلہ تو حل ہوگیا اب دُوسرے

مسئلے کا حل تلاش کیجئے۔"

"دوسرے مسئلے کا حل؟"

"جی ہاں!"

"بھئی ذرا تفصیل سے بتاؤ۔"

"ابھی میں نے آپ سے عرض کیا تھا ناکہ قدسیہ کے لئے میں سرفراز کو پسند کرتا ہوں۔"

"بالکل پسند کرسکتے ہو۔ بلکہ میرا خیال ہے اب تو کوئی رکاوٹ ہی نہیں رہے گی۔"

"داداجان! اس سلسلے میں ابتداء کیسے کی جائے۔ بات دراصل یہ ہے کہ جیسا کہ ابھی میں نے آپ سے کہا کہ میں کچھ عرصے سے حالات میں جمود سا محسوس کر رہا ہوں۔ میری خواہش ہے کہ یہ جمود ٹوٹے۔ فرسٹ ایڈ ہاؤس کے معمولات ماشاءاللہ اچھے خاصے چل رہے ہیں اور ہمیں اس کی طرف سے اب کوئی الجھن باقی نہیں ہے۔ جتنے لوگوں کو ہم نے جو جو ذمے داریاں سپرد کی ہیں وہ اپنا اپنا کام بخوبی انجام دے رہے ہیں تو اب میں چاہتا ہوں کہ کچھ گھریلو قسم کی تفریحات بھی شروع ہوجائیں اور ہم ان میں گم ہوکر اپنے لئے خوشی تلاش کرسکیں۔"

"بالکل ٹھیک ہے۔ گویا تمہارا خیال ہے کہ اب قدسیہ اور سرفراز کے سلسلے میں کوئی ایسا عملی قدم اٹھایا جائے جس سے۔۔۔"

"جی ہاں۔۔۔ جی ہاں۔۔۔ میں یہی چاہتا ہوں داداجان۔" زاہد نے کہا اور داداجان کسی سوچ میں ڈوب گئے۔ چند لمحات خاموش رہنے کے بعد وہ بولے۔

"دیکھو میاں! شجاع احمد کی فطرت سے میں بخوبی واقف ہوں اگر سرفراز کا نام اس کے سامنے لوگے تو بدک جائے گا۔ کچھ ایسی ہی طبیعت کا مالک ہے۔ بہتر یہ ہوگا کہ ہم سرفراز کا تذکرہ ہی نہ کریں۔ ناظم علی صدیقی صاحب سے بات کریں اور ناظم علی یہ رشتہ اپنے بیٹے کی حیثیت سے شجاع احمد کو دے۔"

"مگر اس میں ایک قباحت ہے داداجان! شجاع احمد صاحب یہ کبھی بھی نہیں سوچیں گے کہ اچانک ہی سرفراز، ناظم علی صدیقی کا بیٹا کیسے بن گیا؟"

اس سلسلے میں اگر ناظم علی صدیقی ہم سے کچھ تعاون کرے تو بات بن سکتی ہے۔"

"جی ہاں! میں سمجھ رہا ہوں۔" زاہد نے پرخیال انداز میں گردن ہلاتے ہوئے کہا پھر بولا۔ "اور ناظم علی کی بیٹی سحر بھی ہے۔"

"ہاں ہے۔"

"میرا مطلب ہے اپنا احمد رضا۔"

"اوہ، واہ بھئی کمال ہے۔ سوچتے ہو تو خوب سوچتے ہو مگر یہ سب کچھ ہوسکتا ہے آسانی سے؟ میرا مطلب ہے جس طرح ہم دونوں سوچ رہے ہیں کیا اس طرح دوسرے لوگ بھی سوچیں گے۔ میرا مطلب ہے سحر، سرفراز، قدسیہ، احمد رضا۔"

"داداجان! ہمارے اپنے بچے ہیں۔ ان پر ہمیں مکمل اعتماد ہے جہاں تک سرفراز کی بات ہے تو سرفراز پر بھی اعتماد کیا جاسکتا ہے۔ بس اب مسئلہ رہ جاتا ہے شجاع احمد صاحب کا، تو شجاع احمد صاحب کو بعد میں سمجھا لینا تو آپ کا کام ہے۔ میرا خیال ہے میں اس سلسلے میں ابتداء کردیتا ہوں۔"

"ٹھیک ہے میاں، حسام احمد تمہارے ساتھ ہے جو کچھ کروگے اس میں یوں سمجھو کہ کہیں بھی تنہا نہیں رہوگے۔"

"شکریہ داداجان! بہت بہت شکریہ!" زاہد نے کہا۔ تھوڑی دیر کے لئے طبیعت بہل گئی تھی۔ نشاط کا وہ پرسحر تصور ذہن سے اتر گیا تھا۔ داداجان کے کمرے سے نکل آیا لیکن ابھی تک دل میں ایک کسک باقی تھی۔ بے اختیار دل چاہتا تھا کہ نشاط کی طرف جائے۔ اسے ایک نظر دیکھے لیکن پھر وہ اپنے سر پر گھونسے مارنے لگتا تھا کم از کم اس کی فطرت کے لئے یہ احمقانہ احساس بڑی عجیب سی حیثیت رکھتا تھا۔

شجاع احمد صاحب، بیگم صاحبہ سے ناراض تھے۔ بات چیت بھی نہیں ہوتی تھی ان دونوں کے درمیان اور اس بات کو تقریباً ایک ہفتہ گزر گیا تھا۔ شجاع احمد صاحب کے دل میں یہ سوچ سوچ کر نفرت کا ایک طوفان ابلنے لگتا تھا کہ سرفراز جیسا شخص اور قدسیہ کے نام سے منسوب کیا جائے۔ بیگم صاحبہ کا تو دماغ خراب ہوگیا تھا بھلا یہ بات کس طرح ممکن تھی۔ حماقت کی باتیں سوچ رہی تھیں۔ سب کے سب پاگل ہوگئے تھے۔ سب ان کا وقار خاک میں ملانے کے لئے کوشاں تھے اور اس کا سب سے بڑا ذمے دار زاہد تھا۔

زاہد نے ان سب کے ذہنوں میں بغاوت پیدا کردی تھی۔ کیسی انوکھی بات تھی۔ ایک اجنبی شخص اس گھر میں گھسا اور پورے گھر کا مالک بن بیٹھا۔ اتنی بڑی حیثیت حاصل کر بیٹھا وہ کہ خود شجاع احمد کی شخصیت اس کے سامنے ماند پڑ گئی۔ دل میں جب طوفان اٹھتا تو یہی جی چاہتا کہ پستول نکالیں اور اس کی چھ کی چھ گولیاں زاہد کے سینے میں اتار دیں۔ بڑی نفرت محسوس ہوتی تھی انہیں زاہد سے۔ انہی حالات میں دن گزرتے رہے تھے کہ ایک دن دوپہر کو انہیں ناظم علی صدیقی صاحب کا فون ملا۔ شجاع احمد صاحب نے

خود فون ریسیو کیا تھا۔

"میں ناظم علی صدیقی بول رہا ہوں شجاع احمد صاحب۔" دُوسری طرف سے آواز آئی۔

"اوہ صدیقی صاحب کہئے کیسے مزاج ہیں؟"

"خُدا کا شکر ہے آپ سے کام آن پڑا تھا۔ شجاع احمد صاحب ملاقات کرنا چاہتا ہُوں۔"

"تو تشریف لے آیئے۔ اس میں تکلف کیسا؟" شجاع احمد صاحب نے جواب دیا۔ ناظم علی صدیقی ان کی اپنی حیثیت کے آدمی تھے اور ہر چند کہ ان دونوں کے درمیان زیادہ دوستی اور بے تکلفی نہیں تھی لیکن کاروباری شناسائی ہر قسم کی دوستی سے زیادہ اہمیت رکھتی ہے... شجاع احمد صاحب جیسا کاروباری آدمی صرف یہی تصوّر ذہن میں رکھتا تھا۔

"تو پھر آج شام کو چائے پلوا رہے ہیں آپ اپنے ہاں!"

"بڑی خوشی سے بلکہ خوش قسمتی ہے میری کہ آپ نے اتنی بے تکلفی سے مجھ سے چائے کے لئے کہا۔"

"ہاں بھئی۔ دراصل میں آپ سے بے تکلفی کے رشتے ہی قائم کرنا چاہتا ہُوں۔"

"تو غریب خانہ حاضر ہے شام کو چائے پر انتظار کروں گا۔" شجاع احمد صاحب نے کہا۔ ناظم علی صدیقی کا فون بند ہو جانے کے بعد وہ اس بارے میں سوچنے لگے۔ ناظم علی کو ان سے کیا کام ہو سکتا ہے ویسے اچھا کاروباری آدمی تھا۔ بڑی ساکھ تھی اس کی دولت بھی بے پناہ تھی۔ اس لئے شجاع احمد صاحب کو ان کی آمد ناگوار نہیں بلکہ خوشگوار لگ رہی تھی۔

شام کو پانچ بجے انھوں نے چائے کے لئے بڑا اہتمام کیا تھا اور پھر اپنے خوبصورت لان پر انھوں نے ناظم علی صدیقی صاحب کا استقبال کیا۔ ناظم علی صدیقی مُسکراتے ہوئے ان کی طرف بڑھے تھے۔ شجاع احمد صاحب نے ان سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔

"ایک بار نہایت پریشان کُن حالات میں آپ سے بالکل اسی جگہ پر مُلاقات ہوئی تھی لیکن اس وقت صُورت حال دُوسری ہے۔"

"کرنل ضرغام موجود نہیں ہیں کیا؟" ناظم علی نے پُوچھا۔

"نہیں چلے گئے وہ، بعض اوقات ناظم صاحب اولاد اتنی پریشان کُن ثابت ہوتی ہے کہ انسان اپنی شخصیت کھو بیٹھتا ہے۔ وہ بیچارے اپنی اولاد کا شکار تھے۔ بذاتِ خود بُری شخصیت کے آدمی نہیں تھے مگر اس نئی نسل کا کیا کیا جائے۔ جو پاگل پن کی طرف اپنے قدم بڑھاتی جا رہی ہے۔"

"ہاں! ہر قسم کے بچے ہوتے ہیں۔ خُدا کا احسان ہے تمھارے یا میرے ہاں ایسی کیفیت نہیں ہے۔"

شجاع احمد صاحب ایک لمحے کے لئے خاموش ہُوئے۔ دل نے اس بات کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا تھا لیکن اب دُوسروں کے سامنے تو یہ سب کچھ نہیں کہہ سکتے تھے۔ وہ مُسکرا کر رہ گئے۔ ناظم علی صدیقی اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے بولے۔

"بھابی صاحبہ پردے کی قائل ہیں؟"

"نہیں ایسی کوئی بات نہیں ہے۔"

"خیر کوئی بات نہیں۔ پھر کبھی سہی۔ اپنی بیگم کے ساتھ ان کی خدمت میں بھی حاضر ہوں گا۔ اس وقت تو صرف تمھارے ہی پاس آیا ہُوں۔"

شجاع احمد صاحب ایک لمحے کے لئے چونک کر انھیں دیکھنے لگے پھر کسی قدر محتاط انداز میں بولے۔

"بھئی معاف کیجئے گا ناظم صاحب۔ آپ سے بہت زیادہ بے تکلفی نہیں لیکن آپ کے بارے میں جو چند باتیں معلوم ہوئی ہیں آپ کے یہ الفاظ ان کی نفی کر رہے ہیں۔"

"مثلاً۔ میں سمجھا نہیں شجاع احمد صاحب!"

"میں نے سُنا تھا کہ آپ کی بیگم انتقال کر چکی ہیں کیا دُوسری شادی کر لی ہے؟"

"دُوسری شادی کی تھی میں نے۔ دُوسری بیگم ہی انتقال کر گئی ہیں۔ میرا مطلب ہے سحر کی والدہ۔ پہلی بیگم موجود ہیں خُدا کے فضل سے۔"

"کیا؟" شجاع احمد صاحب چونک پڑے۔

"ہاں! شجاع احمد زندگی ایسی ہی انوکھی کہانیاں سُناتی ہے میں آپ کو اپنے بارے میں بتا دینا ضروری سمجھتا ہُوں۔ خاصا عرصہ ہُوا میری شادی ہوئی تھی۔ بہت ہی اعلیٰ ظرف، بہت ہی نیک خاتون تھی میری پہلی اہلیہ لیکن بس وہی بات کہ صرف ایک بات ساری زندگی کے لئے افسانہ بن جاتی ہے۔ سو میرے ساتھ بھی یہی ہُوا۔ ہم دونوں ایک دوسرے کے خلاف غلط فہمی کا شکار ہو گئے۔ بہت ہی چھوٹی سی بات تھی جس پر ہم دونوں میں علیحدگی ہو گئی تھی۔ میرا خیال تھا کہ میری بیوی میری جُدائی برداشت نہیں کر سکے گی۔ لیکن غلطی میری ہی تھی۔ میں نے اس کے احساسات پر ایک ایسی نازک ضرب لگائی تھی کہ وہ اس چوٹ کو برداشت نہ کر سکی اور مجھ سے کنارہ کش ہو گئی۔ میرا ایک بیٹا بھی تھا اُنہی کے ساتھ تھا۔ جب میرے ذہن سے غلط فہمیاں دُور ہُوئیں تو میں پاگلوں کی طرح ان کی تلاش

میں دوڑا لیکن . . . لیکن وہ میرے لئے قصۂ پارینہ بن گئی میری کوئی بھی کوشش انھیں تلاش کرنے میں کامیاب نہ ہوسکی اور میں درد وغم میں ڈوب گیا۔ طویل عرصے تک میں اس درد وغم کا شکار رہا۔ کہاں کہاں نہیں تلاش کیا میں نے انھیں لیکن کوئی پتہ نہیں چل سکا۔ میرا بیٹا مجھے یاد آتا تھا۔ بہت ہی دکھ بھری زندگی گزاری میں نے اور اس کے بعد سحر کی والدہ کے ساتھ میری شادی ہوگئی۔ دوستوں نے مجبور کردیا تھا ورنہ شاید کبھی ایسا نہ ہوتا اور میں پہلی بیوی کے غم میں ہی بقیہ زندگی گزار دیتا۔ سحر کی والدہ بھی بے چاری اچھی عورت تھیں ان کے ساتھ وقت گزرتا رہا اور پھر ان کا انتقال ہوگیا اس کے بعد سے میں تنہا سحر کے ساتھ زندگی گزارنے لگا لیکن شجاع احمد خدا نے میری زندگی میں پھر پھول کھلا دیئے۔ اچانک میری بیگم مجھے مل گئی۔ میرا بیٹا بھی مجھے مل گیا۔ وہ دونوں مجھے مل گئے۔ غلط فہمیاں دور ہوگئیں اور بالآخر میری زندگی میں چراغاں ہوگیا۔"

"بھئی واہ۔ میری طرف سے دلی مبارکباد قبول کریں۔ ناظم علی صدیقی درحقیقت بڑی انوکھی کہانی ہے اور بڑی عظیم ہیں وہ خاتون جنھوں نے تمھاری غیر موجودگی میں تمھارے پھول کو پروان چڑھایا۔" شجاع احمد صاحب نے ناظم علی صدیقی سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔

"ہاں شجاع احمد! قسمت نے مجھ پر بے پناہ مہربانیاں کی ہیں۔ میں تمھیں بتا نہیں سکتا کہ ان دنوں میں کتنا خوش ہوں اور شجاع احمد اس خوشی میں میں اپنے دوستوں کو بھی پریشان کر رہا ہوں اور اس کی ابتدا میں نے تم سے کی ہے۔"

"دوست بھلا کبھی دوست کے لئے پریشان ہوتے ہیں ناظم علی۔ ہرچند کہ ہمارے آپ کے بہت زیادہ تعلقات نہیں رہے ہیں لیکن اس کے باوجود ہم دونوں ایک دوسرے کے لئے اجنبی نہیں ہیں میرے لائق کوئی خدمت ہو تو اس سے کبھی تکلف نہ کرنا۔" شجاع احمد صاحب نے کہا۔

"تکلف کرتا تو یہاں تک پہنچتا کیسے؟ میں تم سے کچھ مانگنے آیا ہوں شجاع احمد۔ میرے گھر میں کہکشاں اتر آئی ہے، اس چہار دیواری میں لیکن میں اس میں ایک چاند کی کمی محسوس کر رہا ہوں اور وہ چاند میں تم سے مانگنے آیا ہوں۔"

"بھئی ہم کاروباری لوگوں کی زندگی میں شاعری کی گنجائش کہاں۔ ہم تو شاعری سمجھنے کی صلاحیت بھی کھو بیٹھے ہیں۔ صاف صاف بتائیں میں کیا خدمت کر سکتا ہوں۔ واقعی اگر میں کوئی خدمت کر سکا تو اس سے گریز نہیں کروں گا۔" شجاع احمد نے کہا۔

"کہہ دینے میں کوئی حرج تو نہیں ہے چاہے بات کتنی بڑی ہو؟" ناظم علی صدیقی صاحب نے پوچھا۔

"کہو یار کیسی باتیں کر رہے ہو۔" شجاع احمد صاحب بے تکلف ہو کر بولے۔

"تو میں اپنے بیٹے کے لئے تمھاری بیٹی کا رشتہ مانگنے آیا ہوں میں چاہتا ہوں کہ تمھارے گھر سے تمھارا چاند لے جاؤں اور اپنے گھر کی کہکشاں میں ٹانک دوں۔"

"اوہو۔ بڑے شاعرانہ انداز میں تم نے یہ بات کہی ہے۔ بہرطور قابلِ غور ہے اور اس پر مکمل توجہ دی جائے گی۔ کس کی بات کر رہے ہو تم میری کون سی بیٹی کی؟"

"قدسیہ کی بات کر رہا ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ قدسیہ کی شادی اپنے بیٹے کے ساتھ کروں۔ میں یہ بھی جانتا ہوں شجاع احمد کہ تم مجھ سے بڑی حیثیت کے مالک ہو۔ بلاشبہ خداوندِ قدوس نے تمھیں بہت بڑا رتبہ، بہت بڑی حیثیت دی ہے لیکن اپنے اس غریب ساتھی کو بھی سینے سے لگا لوگے تو اس کی تقدیر بن جائے گی۔"

"ناظم علی! اب تم کسرِ نفسی سے کام لے رہے ہو۔ جب دوستی ہے تو پھر ان فضول باتوں کی کیا گنجائش ہے۔ میں سنجیدگی سے اس سلسلے میں غور کروں گا۔ بیگم سے مشورہ کروں گا اور اس کے بعد ہم یہ مسئلہ دوسری نشست کے لئے اٹھائے دیتے ہیں۔"

"تو پھر میں اپنی بیگم کے ساتھ کب حاضر ہو جاؤں یا کب تمھیں اپنے غریب خانے پر دعوت دوں؟"

"بھئی دعوت تو تم جب دوگے ہم قبول کرلیں گے۔ ویسے یہاں آنے کا جہاں تک معاملہ ہے جب دل چاہے آؤ یہ گھر تمھارے لئے کھلا ہے۔"

"تو پھر کل شام کو میرے گھر پر ایک نشست ہو جائے۔ رات کا کھانا آپ اور بھابی میرے گھر ہی کھائیں گے۔"

"جب تم پر آگئے ہو تو آپ کی بات نہ کرو۔ بے تکلفی کا یہ رشتہ اچانک ہی قائم ہوا ہے۔" شجاع احمد صاحب نے ناظم علی صدیقی سے کہا اور ناظم علی صاحب نے آگے بڑھ کر انھیں سینے سے لگا لیا۔

"مجھے امید ہے شجاع احمد صاحب کہ تم میری یہ آرزو ضرور پوری کروگے۔"

"انشا اللہ۔ انشا اللہ میں پوری پوری کوشش کروں گا۔" چلنے کے بعد ناظم علی صدیقی کو بڑے تپاک سے رخصت کیا۔ ناظم علی سے جو کہانی انھوں نے سنی تھی وہ دلچسپ تھی لیکن شجاع احمد صاحب جیسے کاروباری آدمی کو اس بات سے کوئی لگاؤ نہیں تھا کہ ناظم علی کی بیوی اور بیٹا کتنا عرصہ اس سے دور رہے اور کہاں کہاں انھوں نے زندگی گزاری بس ان کے لئے یہی بات کافی تھی کہ وہ ناظم علی صدیقی

صاحب کا بیٹا ہے اور ناظم علی صدیقی ان کی ٹکر کا آدمی تھا لیکن مسئلہ اب بیگم صاحبہ کا تھا۔ اس سرپھری عورت کو سمجھانا شجاع احمد صاحب کے لئے ذرا مشکل تھا۔

ناظم علی صدیقی سے وعدہ تو کر لیا تھا دوسرے دن آنے کا لیکن اب اس کے لئے بیگم صاحبہ سے مصالحت کرنا ضروری تھی اور انھیں اس بات کے لئے آمادہ کرنا واقعی ایک مشکل کام ہے کہ وہ قدسیہ کے لئے کسی اور لڑکے کو دیکھیں تاہم اب انھوں نے یہ ذمّے داری قبول کر لی تھی تو اُسے نبھانا ہی تھا۔

تاہم ناظم علی صدیقی صاحب کی شجاع احمد سے مُلاقات زاہد کی کوشش کا نتیجہ تھی۔ زاہد نے بڑی برق رفتاری سے کام کیا تھا۔ سرفراز فرسٹ ایڈ ہاؤس کو نظر انداز نہیں کر سکا تھا۔ دوسرے دن ہی دونوں بہن بھائی یعنی سحر اور سرفراز فرسٹ ایڈ ہاؤس پہنچے تھے زاہد اُس وقت وہیں موجود تھا۔ دادا جان کو جب ان دونوں کے آنے کی اطلاع ملی تو وہ خود بھی آفس سے نکل آئے اور انھیں راستے ہی سے اُچک لیا۔ اُنھوں نے بڑے پیار سے ان دونوں کو گلے لگایا تھا۔ سرفراز نے دادا جان کا مُسکراتے ہوئے جائزہ لیا اور گردن جھکالی۔

"بھئی مجھے ساری کہانی معلوم ہو گئی سرفراز میاں دُعاؤں کے علاوہ اور کچھ نہیں دے سکتا۔ دل کی مسرتوں کا اظہار میرے لئے ناممکن ہے۔" سرفراز ایکدم دادا جان کے سینے سے لپٹ گیا تھا اور پھر اُس نے کہا۔

"مجھے جو عزت اور پیار آپ سے ملا ہے دادا جان وہ ہمیشہ میری زندگی میں رہے گا اور میں اُسے کبھی فراموش نہیں کر سکوں گا۔"

"میری طرف سے سحر کو بھائی مُبارک ہو اور تمھیں بہن اور باپ۔" دادا جان نے کہا۔

"شکریہ دادا جان!"

"ویسے بیٹے بالکل اُلجھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ فرسٹ ایڈ ہاؤس میں تمھاری جو ذمّے داریاں ہیں جب بھی فرصت اور موقع ملے۔ میں تم پر یقین رکھتا ہوں کہ تم انھیں انجام دینے کی کوشش کرو گے۔ اس ادارے میں کام کرنا بھی ایک اعزاز ہے۔"

"دادا جان! اب تو میں بھی سوچ رہی ہوں کہ فرسٹ ایڈ ہاؤس میں مجھے بھی کوئی جگہ ملنی چاہیئے۔" سحر نے کہا۔

"بیٹے! یہ سب کچھ سب کا ہے۔ اس میں جہاں بھی اپنے لئے کوئی گنجائش محسوس کرو کام شروع کر دو۔ اس سلسلے میں کسی کی اجازت کی ضرورت نہیں ہے۔"

"بہت بہت شکریہ دادا جان!"

"آئیے آپ حضرات کو میں فرسٹ ایڈ ہاؤس کے مختلف شعبوں سے روشناس کراؤں۔" زاہد نے کہا اور مُسکراتا ہوا انھیں لے کر اپنے دفتر کی جانب چل پڑا۔ سحر اور سرفراز بہت خوش نظر آ رہے تھے۔ اس کے بعد زاہد نے شرارت بھری نگاہوں سے ان کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

"جی حضرات! کیسے مزاج ہیں آپ دونوں کے؟"

"بہت ہی عمدہ۔ بڑی خوشیاں مل گئی ہیں ہمیں۔" سحر نے جواب دیا۔

"بہر طور میری طرف سے بھی ایک پُرخلوص مُبارکباد قبول کرو تم لوگ۔ میں بے حد مسرور ہوں۔"

"پھر وہی جذباتی باتیں نکل آئیں گی۔ زاہد بھائی ہم آپ کا شکریہ ادا کریں گے اور آپ کی توہین ہو گی۔"

"ہاں میری توہین مت کرو۔" زاہد نے جواب دیا۔

کافی دیر تک وہ سحر صدیقی اور سرفراز سے گفتگو کرتا رہا اور پھر اس نے ان سے ناظم علی صدیقی کے بارے میں پُوچھا اور سرفراز بولا۔

"امّی نے کہا ہے کہ اگر ممکن ہو سکے تو میں آپ کو ساتھ لے کر آؤں۔ آپ آئے کیوں نہیں؟"

"بس بھئی میں نے سوچا کہ ذرا تم لوگ آپس میں گھل مل جاؤ ابھی تو آپ کے حالات ایسے ہی ہوں گے اس کے بعد میں مُلاقات کروں گا۔"

"آپ بھی تو ان جذبات میں برابر کے ہی شریک ہیں زاہد بھائی۔ آپ سے علیٰحدگی بھلا کیا معنی رکھتی ہے۔ بس اب آپ ہمارے ساتھ چلیں گے۔"

"ناظم علی صاحب کہاں ہیں؟"

"ڈیڈی آجکل دفتر نہیں جا رہے عموماً گھر میں رہتے ہیں۔" سرفراز نے کہا اور زاہد کو بڑی مسرت ہوئی۔ اس کے مُنہ سے ڈیڈی کا لفظ سُن کر پتہ نہیں کب سے سرفراز نے یہ لفظ اپنے مُنہ سے نہیں نکالا تھا۔ شاید بچپن سے ہی اُس نے بخوشی ان کے ساتھ چلنا منظور کر لیا۔ ویسے بھی وہ ناظم علی صاحب سے ملنا چاہتا تھا۔

دوپہر کو تقریباً ساڑھے بارہ بجے وہ لوگ وہاں سے چل پڑے سحر نے زاہد کو اپنے ساتھ لنچ کی پیشکش کی تھی۔ لنچ پر وہ سب یکجا تھے۔ مختلف موضوعات پر ان کی آپس میں گفتگو ہوتی رہی۔ پھر زاہد نے کہا۔

"بچّو! اب تم لوگ اپنے کمرے میں جاؤ۔ ہم بڑے بڑے ذرا بات چیت کریں گے۔" سحر اور سرفراز ہنستے ہوئے وہاں سے اُٹھ گئے تھے۔ حالانکہ ان کی سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ یہ بات چیت کس قسم کی ہوگی لیکن زاہد نے کہا تھا اس لئے رکنا مناسب نہیں تھا۔ وہ جب چلے گئے تو زاہد نے ناظم علی اور صابرہ بیگم کی طرف دیکھ کر کہا۔

"یہ شخص جس کا نام زاہد ذوالفقار زیدی ہے۔ ہمیشہ کسی نہ کسی کے لئے پریشانیاں پیدا کرتا رہتا ہے۔ یوں سمجھ لیجئے کہ یہ میری بہت بڑی کمزوری ہے۔"

"بھئی زاہد میاں، تمہارے بارے میں بہت سی معلومات حاصل ہو چکی ہیں مجھے۔ قدسیہ کو جس طرح تم نے مصورہ بنا دیا اور سرفراز کو جس طرح تم نے مصوری کا اُستاد بنا دیا۔ یہ تمہارا ہی کمال تھا اور بات صرف دو آدمیوں کی نہیں رہی۔ ایک بہت بڑے طبقے کو تم نے قدسیہ کی نمائش میں انگلیوں پر نچا ڈالا خُدا کی قسم میں تو حیران ہوں۔ میں نے خود بھی وہ نمائش دیکھی تھی اور اللہ گواہ ہے کہ میری سمجھ میں کچھ بھی نہیں آیا تھا۔ یہ سحر کی تصویر خریدلائی اور اب کونے میں منہ کر کے ہنستی ہے۔ جب سرفراز نے اُسے تصویر کی حقیقت بتائی تھی۔ مجھ سے بھی شرمندہ ہے کہ اچھی خاصی رقم اس بے تکی تصویر پر خرچ کر دی۔ جسے نہ بنانے والا سمجھتا ہے اور نہ دیکھنے والا۔ اور حد تو یہ ہے کہ بنانے والی کا اُستاد بھی اس تصویر کے بارے میں کچھ نہیں بتا سکتا کہ یہ تصویر کہاں سے ہو گئی۔" ناظم علی صدیقی صاحب نے کہا اور ہنس پڑے۔ زاہد بھی اپنی مسکراہٹ نہیں روک سکا تھا۔ پھر اس نے کہا۔

"لیکن آپ یہ دیکھ لیجئے ناظم علی صاحب۔ اُس دور کے اخبارات کا میرے پاس ریکارڈ موجود ہے۔ بڑے بڑے محققین نے اور ناقدین نے ان تصاویر کی اہمیت اور برتری کو تسلیم کیا۔ اب کیوں کیا۔ یہ وہ ہی جانیں اور اُن کا خُدا جانے۔" زاہد نے کہا۔ ناظم علی صدیقی نے پھر ایک قہقہہ لگایا۔

"ہاں بھئی! دُنیا اسی ڈگر پر چل رہی ہے۔ کوئی بھی بڑا آدمی کوئی چھوٹی سی بات کہہ دے وہ بڑی بن جاتی ہے۔ بہرحال بات ان سب کی نہیں اس ذہن کی ہے جو اس آتش فشانی کا موجب بنا لیکن بیٹے تم نے میری بیوی اور بیٹے کی جس طرح امداد کی میں اس کے لئے تمہارا احسان کبھی نہیں بھول سکتا۔"

"دیکھئے نا یہ ہے دُنیا صرف چند الفاظ کہہ کر سارے رشتے ختم کر دیئے۔ میں انھیں امی جان کہتا ہوں۔ کیا ان سے میرا کوئی ذاتی تعلق نہیں ہے۔ سرفراز کو میں نے اپنا بھائی سمجھا ہے۔ کیا میں اس قابل نہیں تھا۔ میں نے تو امی جان اور سرفراز کو کبھی خود سے الگ نہیں سمجھا۔"

"نہیں بیٹے! شرمندہ مت کرو۔ یہ الفاظ تو ممنونیت کے جذبات کا نتیجہ ہیں۔ تم ہم سے کسی طور الگ نہیں ہو اور اگر الگ سمجھو گے کبھی تو یہ تمہارا ظلم ہوگا ہم پر۔" ناظم علی صاحب نے کہا۔

"اچھا اچھا اب ہم جذباتیت کی حدُود سے نکل آئیں۔ آپ کو سرفراز نے ساری حقیقت بتا دی۔ میری پول کھول دی لیکن بہرحال میں ان ساری باتوں پر ناراض نہیں ہوں۔ اُسے یہ سب کچھ کہہ دینا چاہئے تھا۔ اس کے خلوص کا یہی تقاضا تھا اور پھر سچی بات یہ ہے ناظم علی صدیقی صاحب کہ اس نے ایک ایسے وقت میں باپ کا سایہ پایا کہ جب اُس کے ذہن میں اُس کا شائبہ بھی نہیں تھا۔ چنانچہ اُسے آپ سے اتنا ہی مخلص ہونا چاہئے تھا لیکن کچھ باتیں ایسی بھی ہُوں گی ناظم علی صاحب جو وہ آپ سے نہیں کہہ سکا ہوگا اور نہ ہی کبھی آئندہ وہ کہہ سکے گا۔ وہی باتیں کہنے کے لئے میں آپ کی خدمت میں حاضر ہُوا تھا۔"

"ہاں ہاں بھئی کہو۔ بلکہ میں تم سے کسی مناسب وقت میں مزید بہت سی معلومات حاصل کرنا چاہتا تھا۔"

"جی ہاں! مسئلہ یہ ہے کہ آپ کا بیٹا شادی کے قابل ہو چکا ہے کیا آپ اس کی شادی نہیں کریں گی؟"

"کیوں نہیں بھئی بالکل کریں گے۔ کیا اس سلسلے میں تمہارے ذہن میں کوئی بات ہے؟"

"جی ہاں!"

"تو پھر ٹھیک ہے۔ یہ تم نے اچھا کیا کہ بروقت اس سلسلے میں مجھے اطلاع دے دی۔ ممکن تھا کہ میرا ذہن کسی اور طرف ہی راغب ہو جاتا۔"

"جی ہاں ناظم علی صاحب! میں نہایت سنجیدگی سے آپ سے کچھ گفتگو کرنا چاہتا ہوں۔ اس میں کوئی بہت بڑی گہرائی یا کوئی بہت اُلٹ پھیر نہیں ہے۔ سرفراز قدسیہ سے شادی کرنا چاہتا ہے... جو شجاع احمد کی بیٹی ہے اور قدسیہ کی بھی یہی خواہش ہے۔ دونوں اُستاد شاگرد ایک دوسرے سے بے حد اُنسیت رکھتے ہیں اور وہ اپنے آپ کو ایک دوسرے کی زندگی میں شامل کرنے کا فیصلہ کر چکے ہیں۔ یہ کوئی بُری بات نہیں ہے۔ امی جان آپ کو شاید میرے ان الفاظ پر تعجب ہو لیکن مجھے یقین ہے کہ آپ بُرا نہیں محسوس کریں گی تو مقصد یہ ہے کہ شجاع احمد صاحب بہت مغرور انسان ہیں۔ کسی غیر دولت مند شخص کو وہ اپنی بیٹی کا شوہر بنانے کے بارے میں

سوچ بھی نہیں سکتے لیکن خدا کے فضل سے اب سرفراز آپ کے بیٹے ہیں اور آپ کسی بھی طور شجاع احمد صاحب سے کم حیثیت کے مالک نہیں ہیں لیکن ان دونوں کو یکجا کرنے کے لئے ناظم علی صاحب آپ کو ذرا ہوشیاری سے کام لینا ہوگا لیکن پہلے یہ تو بتائیے کہ کیا آپ خود ذہنی طور پر اس رشتے کے لئے آمادہ ہیں؟"

"بھئی ان حالات میں تو بالکل آمادہ ہوں اور پھر ویسے بھی شجاع احمد بہت اچھے انسان ہیں۔ خاندانی لوگ ہیں اور قدسیہ کو یقیناً تم لوگ بلکہ صابرہ بھی بہت اچھی طرح جانتی ہوں گی؟"

"خدا کی قسم ناظم علی میں نے ہمیشہ اس بچی کی حسرت کی ہے لیکن یہ سوچ کر خاموش رہی کہ میں کہاں اور وہ کہاں!"

"اب تو وہ ہماری دسترس میں ہے بیگم۔" ناظم علی صدیقی صاحب نے کہا۔

"ہاں! خدا کا اس احسان کے آگے میں سر نہیں اٹھا سکتی۔" صابرہ خاتون ایک ٹھنڈی سانس لے کر بولیں۔

"تو پھر بات یہ ہو رہی تھی ناظم علی صاحب کہ آپ نہایت ہوشیاری اور ذہانت کے ساتھ شجاع احمد صاحب سے اس رشتے کی بات کیجئے۔ ابھی سرفراز کا نام لینے کی ضرورت نہیں بلکہ آپ انھیں اگر چاہیں تو اپنی یہ مختصر سی کہانی مختصر الفاظ میں سنا سکتے ہیں لیکن بہتر یہ ہوگا کہ ابھی ان دونوں کا تذکرہ نہ کیا جائے۔"

"ہوں، میں سمجھ رہا ہوں تمھاری بات لیکن میرا خیال ہے کہ اگر میں شجاع احمد کو ساری تفصیل من و عن بتا بھی دوں تو بھی اس میں کوئی ہرج نہیں ہوگا اگر وہ رشتہ قبول کرنا چاہیں گے؟"

"اگر کی گنجائش نہیں ہے ناظم علی صاحب۔ یہ رشتہ ہر قیمت پر ہونا ہی ہے۔"

"ہاں ہاں ٹھیک ہے۔ بہر طور مجھے اس پر کوئی اعتراض نہیں ہے کہ میں گول مول الفاظ میں انھیں اپنی کہانی سنا دوں اور ان سے اس سلسلے میں بات کر کے ان کا عندیہ لوں۔"

"جی میں یہی چاہتا ہوں۔ اس کے علاوہ ناظم علی صاحب ایک بات میں آپ کے اور امی کے کانوں میں اور ڈال دینا چاہتا ہوں۔ گو اس میں اتنی جلدی کی ضرورت نہیں کیونکہ نہ تو میں ابھی سحر کے ذہنی رجحان سے واقف ہوں اور نہ ہی احمد رضا کے۔"

"کیا، کیا، یہ نیا نام؟"

"ہاں، یہ نیا نام صرف میرے ذہن کی اختراع ہے۔ ان دونوں کے درمیان ذرا بھی ربط نہیں ہے یعنی یہاں وہ معاملہ نہیں ہے کہ جو کچھ میں کہہ رہا ہوں وہ لازمی ہی ہو لیکن دونوں ہی میرے بھائی بہن ہیں اور اپنے دل میں ان لوگوں کے لئے یہ جذبے رکھتا ہوں میں کہ انھیں بہتر زندگی حاصل ہو۔ چنانچہ اس وقت جب ہم سرفراز کے معاملے سے فارغ ہو جائیں تو پھر سحر اور احمد رضا کے لئے بھی کوشش کریں گے۔"

"زاہد بڑا اچھا رشتہ رہے گا یہ بھی لیکن احمد رضا کے بارے میں تمھیں کچھ نہ کچھ تو معلوم ہوگا ہی بیٹے۔" صابرہ بیگم نے کہا۔

"جی امی! وہ کورا کاغذ ہے۔ اس کے ذہن پر کوئی تحریر... نہیں ہے اور مجھ سے انسیت بھی رکھتا ہے۔ جو کچھ میں کہوں گا میرا خیال ہے وہ مان جائے گا۔ تاہم یہ بات بھی آپ لوگ ذہن میں رکھیں۔ ابھی ابتدا کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔"

"تو پھر کل میں شجاع احمد صاحب سے ملاقات کرتا ہوں۔"

"جی ہاں بالکل۔ کل شام کو آپ اس سلسلے میں تیاریاں کر لیجئے اور آج رات کو ذرا میں کچھ اور تیاریاں کروں گا۔" زاہد نے کہا۔

پھر اُسی رات وہ بیگم شجاع احمد کے کمرے میں پہنچ گیا۔ اس وقت وہ تنہا تھیں۔ شجاع احمد صاحب کچھ کاروباری لوگوں سے ملاقات کرنے کے لئے کہیں گئے ہوئے تھے۔ بیگم صاحبہ نے مسکراتے ہوئے زاہد کا استقبال کیا۔

"آؤ بیٹے، آؤ کیسے مزاج ہیں تمھارے؟"

"واہ، آپ جب تکلف کے الفاظ ادا کرتی ہیں تو مجھے بڑی حیرت سی ہوتی ہے۔"

"نہیں بھئی! اب تم اتنے مصروف رہتے ہو کہ بعض اوقات تو تمھاری شکل بھی دیکھنے کو نہیں ملتی۔ اتنے کم کیوں آتے ہو میرے پاس تھوڑی دیر میرے پاس بھی بیٹھا کرو۔"

"اگر بیگم صاحبہ یہ آپ کا حکم ہے تو میں ضرور حاضر ہو جایا کروں گا۔"

"ہوں گویا آج ہی یہ حکم دیا ہے نا میں نے تمھیں؟"

"واہ امی جان! دراصل مصروفیات..."

"اچھا اچھا۔ چلو چھوڑو ان باتوں کو اور سناؤ باقی ہر طرح سے خیریت ہے نا؟"

"ہاں امی جان! سب خیریت ہے۔ البتہ وہ قدسیہ اور سرفراز کا معاملہ..." زاہد نے کہا اور بیگم صاحبہ کے چہرے پر ایکدم غم کے تاثرات پھیل گئے۔

"زاہد بیٹے! شجاع احمد صاحب سے بات ہوئی تھی اس موضوع پر، خاصا جھگڑا ہو گیا ہے میرے اور ان کے درمیان۔ بول چال بند ہے، کافی دن ہو گئے ہیں۔"

"اوہو، اچھا... لیکن میرا خیال ہے، امّی جان کہ میں نے آپ کے اس مسئلے کا حل دریافت کر لیا ہے۔ میں آپ سے سب سے پہلے اس بات کی معافی چاہتا ہوں کہ وہ تفصیل میں آپ کو نہیں بتا سکا جو مجھے آپ کو فوراً بتا دینی چاہیئے تھی۔ ذرا دیر سے حاضر ہوا ہوں۔ اس کے لئے معافی چاہتا ہوں۔"

"کیسی تفصیل بیٹے؟"

"دراصل امّی بہت ہی عجیب و غریب واقعات ہو گئے ہیں اتنے عجیب و غریب کہ بس میں کیا بتاؤں آپ کو . . . ."

"ارے ارے بتاؤ تو سہی جلدی سے۔ خواہ مخواہ مجھے ہولائے دے رہے ہو؟" بیگم صاحبہ نے کہا۔

"نہیں نہیں ہولنے کی بات نہیں ہے بیگم صاحبہ، خوش ہونے کی بات ہے۔ یوں سمجھئے کہ راستے کی رکاوٹیں اللہ تعالیٰ نے خود بخود دُور کر دی ہیں۔"

"کیسی رکاوٹیں، کچھ تو کہو، تفصیل تو بتاؤ مجھے؟"

"امّی جان آپ کو یہ سُن کر خوشی ہوگی کہ سرفراز دراصل ناظم علی صدیقی کا بیٹا ہے۔"

"کک . . . کس کا بیٹا ہے؟" بیگم صاحبہ نے حیرت سے پُوچھا۔

"ناظم علی صدیقی صاحب بہت بڑے آدمی ہیں۔"

"ارے ہاں میں جانتی ہوں گمران کی بیگم، ان کی بیٹی سحر۔"

"جی ہاں، جی ہاں، بالکل وہی بات میں آپ سے عرض کر رہا تھا دراصل ناظم علی صدیقی صاحب کی ایک پہلی بیگم بھی تھیں۔ کیا ان کے بارے میں آپ کو علم ہے؟"

"ہاں! بہت پہلے سُنا تھا کہ ان کی پہلے بھی کوئی شادی ہوئی تھی۔ اور سحران کی دوسری بیوی کی بیٹی ہے۔"

"تو پھر مجھ سے ایک چھوٹی سی کہانی سن لیجئے۔" زاہد نے کہا اور ابتدا سے صابرہ بیگم کی تفصیل بیگم صاحبہ کو بتائی۔ بیگم صاحبہ حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر رہ گئی تھیں۔ ان کی آواز شدتِ حیرت سے بند ہو گئی تھی۔ جب زاہد اپنی کہانی ختم کر چکا تو انھوں نے بے اختیار کہا۔

"واہ کمال ہے۔ خدا مجھے معاف کرے۔" صابرہ بیگم میرے ہاں اس کسمپرسی کی زندگی گزار چکی ہیں۔ کتنے دُکھ کی بات ہے کہ میں انھیں ان کے شایانِ شان جگہ نہ دے سکی۔ پتہ نہیں کہاں کہاں ان بے چاری کے سلسلے میں مجھ سے زیادتی ہوئی ہوگی۔ میں تو بڑی شرمندہ ہوں۔"

"نہیں امّی! میرا خیال ہے آپ نے اپنی فطرت کے تقاضوں سے دُور رہ کر ان کے ساتھ ہمیشہ بہتر سلوک کیا۔"

"ارے یہی سلوک کیا کم بُرا تھا ان کے ساتھ کہ میں نے انھیں ٹیکسی میں ڈلوا دیا تھا۔"

"اب ظاہر ہے سب کو امّی اپنے سینے پر تو جگہ نہیں دی جا سکتی۔ اور پھر ان کی اصل پوزیشن بھی ہم میں سے کسی کو معلوم نہیں تھی۔ میرا خیال ہے ان تمام باتوں کو ذہن سے جھٹک دیجئے۔ ذرا یہ خیال کریں کہ سرفراز کتنے بڑے آدمی کا بیٹا ہے۔ اب قدسیہ اور سرفراز کے راستے میں کچھ رکاوٹیں باقی نہیں رہی۔"

"خدا جانے میں تو پاگل ہوئی جا رہی ہوں یہ کہانی سُن کر۔ تو اب وہ کہاں ہے؟"

"وہ اپنے گھر پہنچ چکا ہے اور اب وہ سب بے حد خوش و خرم زندگی گزار رہے ہیں۔"

"اچھا اچھا۔"

"اور سنیں امّی! اب میں کوشش کر رہا ہوں کہ ناظم علی صاحب قدسیہ اور سرفراز کا رشتہ طے کریں۔ ہو سکتا ہے کل تک کوئی بات ہو۔ لیکن آپ اپنا رویہ بدستور رکھیں اور اگر شجاع احمد صاحب خود آپ سے ناظم علی صدیقی صاحب کے ہاں چلنے کے لئے کہیں تو آپ انکار نہ کیجئے گا۔"

"میں سمجھ گئی۔ کیا وہ مجھ سے یہ بات کہیں گے؟"

"ہاں میں نے کہا نا کہ اس سلسلے میں میں کوشش کر رہا ہوں اور انشاء اللہ کامیابی کی اُمید ہے۔" زاہد نے کہا۔

بیگم صاحبہ ابھی تک حیرت کے عالم میں تھیں۔ اس کے بعد وہ دیر تک زاہد سے کُرید کُرید کر پوچھتی رہیں اور زاہد انھیں بتاتا رہا۔ بیگم صاحبہ بولیں۔

"میرا تو جی چاہتا ہے کہ اُڑ کر صابرہ بیگم کے پاس پہنچ جاؤں اور انھیں سینے سے لپٹا کر مُبارکباد دُوں۔"

"بس تھوڑا سا انتظار کر لیں امّی جان ایک اور بات کہوں آپ سے لیکن وعدہ کریں اُسے خود تک محدود رکھیں گی۔"

"کہو۔ وعدہ۔"

"یہ سحر کیسی لڑکی ہے غور سے دیکھا ہے آپ نے اُسے؟"

"ہاں کیوں نہیں لیکن میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ وہ سرفراز کی بہن نکلے گی۔" بیگم صاحبہ نے کہا۔

"ہاں امّی! یہ تو کوئی بھی نہیں سوچ سکتا تھا لیکن بہرطور اب وہ سرفراز کی بہن ہے اور اس کے بارے میں غور کرنا میں سمجھتا ہوں ہمارے لئے بھی ضروری ہے۔"

"کس انداز میں غور کرنے کی بات کر رہے ہو زاہد؟" بیگم صاحبہ نے سوال کیا۔

"امّی! اچھی لڑکی ہے۔ اچھے خاندان سے تعلق رکھتی ہے اور ہم کافی عرصے سے اُسے جانتے ہیں۔ چنانچہ میرے ذہن میں اس کے لئے بھی ایک منصوبہ ہے۔"

"وہ کیا؟"

"اپنا احمد رضا! آخر اس کی شادی بھی ہمیں کہیں نہ کہیں کرنی ہی ہے۔"

"ایں؟" بیگم صاحبہ حیرت سے چونک پڑیں۔

"ہاں امّی میری خواہش ہے کہ آپ احمد رضا اور سحر کے بارے میں بھی سوچیں میرا خیال ہے کہ آپ ان دونوں کو اپنے ذہن میں لائیں سحر اچھی شکل و صورت کی لڑکی ہے طبیعتاً بھی اچھی ہے۔ احمد رضا اور اُس کی جوڑی میرے خیال میں بہت عمدہ رہے گی۔"

"مگر کیا تم نے اس سلسلے میں کوئی بات محسوس کی ہے میرا مطلب ہے اُن دونوں کے ذہنوں میں ایک دوسرے کے لئے کوئی گنجائش ہے؟"

"نہیں امّی! میں دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ دونوں نے ایسی بات نہیں سوچی یہ صرف میرے اپنے ذہن کی سوچ ہے۔"

"بُری نہیں ہے ظاہر ہے خاندانی بچی ہے اور پھر اس طرح یہ معاملہ اور اچھا ہو جائے گا لیکن کیا خیال ہے تمہارا کیا ہم اس سلسلے میں بھی کوشش کریں۔"

"نہیں نہیں میں نے ابھی صرف آپ کے کان میں یہ بات ڈال دی ہے۔ ہم پہلے ایک مسئلے کو حل ہو جانے دیں اُس کے بعد دوسرے مسئلے پر کام کریں گے۔" زاہد نے جواب دیا۔

"تو پھر ٹھیک ہے میں اس چیز کا بھی خیال رکھوں گی۔" بیگم صاحبہ نے کہا۔ بہت دیر تک زاہد بیگم صاحبہ سے بیٹھا باتیں کرتا پھر اس خیال کے تحت وہاں سے اُٹھ گیا کہ کہیں شجاع احمد صاحب نہ پہنچ جائیں۔ شجاع احمد صاحب اس کی طرف سے جس طرح محتاط رہتے تھے زاہد کو خود بھی اُن سے محتاط رہنا پڑتا تھا۔

زاہد کی کارروائیوں کے نتیجے میں ناظم علی صدیقی صاحب شجاع احمد کے پاس پہنچے تھے اور اُن کے کان میں یہ بات ڈال گئے تھے۔ شجاع احمد صاحب بڑی سنجیدگی سے اس سلسلے میں غور و خوض کرتے رہے تھے۔ ناظم علی صدیقی کا کہا غلط نہیں تھا اور کسی بھی طرح وہ اسے نظر انداز نہیں کر سکتے تھے۔ ہر طرح سے اُس شخص پر اعتبار کیا جا سکتا تھا چنانچہ اب بیگم کو ہموار کرنے کا مسئلہ تھا کیونکہ بیگم صاحبہ کے ذہن پر تو سرفراز سوار تھا کس طرح انھیں شیشے میں اُتاریں۔ بڑی سوچ بچار کے بعد انھوں نے ایک فیصلہ کیا اور پھر دوسرے دن صبح کو بیگم صاحبہ کے کمرے میں پہنچ گئے۔ بیگم صاحبہ نے انھیں دیکھ کر کسی خاص تاثر کا اظہار نہیں کیا تھا۔ وہ ہر طرح سے محتاط تھیں۔

"اب یہ ناراضگی کب تک جاری رہے گی بھئی؟" شجاع احمد صاحب نے سوال کیا۔

"ناراض تو آپ ہیں۔ میں کب ناراض ہوں آپ سے۔"

"چلئے ہم اپنی ناراضگی دُور کئے دیتے ہیں۔ آپ سے زیادہ عرصہ ناراض بھی تو نہیں رہ سکتے۔" شجاع احمد صاحب بڑے مصالحت آمیز لہجے میں بولے۔

"تو پھر ٹھیک ہے آپ کا کیا خیال ہے۔ میں آپ سے ناراض رہ کر خوش رہ سکتی ہوں؟" بیگم صاحبہ نے بھی اپنا وار کر دیا۔

"بھئی بیگم ہمارے اور آپ کے درمیان زاہد کو چھوڑ کر صرف ایک ایسا مسئلہ ہے جس میں ہمارے آپ کے مابین اختلاف چل رہا ہے۔ اگر اس دوسرے مسئلے کو حل کر لیں تو کیا حرج ہے؟"

"کوئی حرج نہیں ہے۔ میں بیٹی کی بہتری کی خواہاں ہوں اور مجھے یقین ہے کہ آپ جو بھی اقدام کریں گے۔ وہ غلط نہیں ہوگا۔"

"ارے اللہ کیا خوشی کی بات کہی ہے آپ نے کیا آپ کو واقعی اس بات کا اعتبار ہے کہ میں قدسیہ کے بارے میں بہتر انداز میں ہی سوچوں گا؟"

"کیوں نہیں، شرمندہ کر رہے ہیں آپ مجھے۔"

"کمال ہو گیا بھئی یہ تو ایک دم کایا ہی پلٹ گئی تو پھر بیگم صاحبہ ہم آپ کو بہت بڑی خوشخبری دینا چاہتے ہیں۔" شجاع احمد صاحب نے کہا۔

"جی فرمائیے مگر شرط یہ ہے کہ جالب یا پہلے جو دو بے وقوف پکڑ لائے تھے آپ ایسی کوئی بات نہ ہو۔" بیگم صاحبہ نے کہا۔

"ہرگز نہیں ہوگی۔ سنیں گی تو خوش ہو جائیں گی بلکہ بہتر یہ ہے کہ ہم ابھی آپ کو یہ خوشخبری نہ سنائیں۔ بس ایک بات بتانا چاہتے ہیں آپ کو اور وہ یہ ہے کہ آج شام کو ہم ناظم علی صدیقی صاحب کے یہاں چل رہے ہیں۔"

"کون ناظم علی صدیقی؟" بیگم صاحبہ نے انجان بن کر پوچھا۔

"بہت بڑی چیز ہیں۔ معمولی شخصیت نہیں ہیں۔ اپنی ٹکر کے ہی آدمی ہیں۔ دراصل ان کی بیگم کا انتقال ہو چکا تھا اس لئے کبھی گھریلو تعلقات نہیں قائم ہوئے لیکن میری ان سے دوستی ہے۔۔" شجاع احمد صاحب نے کہا۔

"ٹھیک ہے مگر کس سلسلے میں ان کے یہاں جانا چاہتے ہیں؟"

"یہ سلسلہ ہم آپ کو وہیں چل کر بتائیں گے۔"

"جیسے آپ کی مرضی۔" بیگم صاحبہ نے آمادگی ظاہر کر دی شجاع احمد

صاحب نے بیگم صاحبہ کی فطرت میں یہ نمایاں تبدیلی بخوبی محسوس
کرلی تھی۔ وہ اس قدر تعاون کرنے والی تو نہیں تھیں لیکن پھر یہ
سوچ کر خاموش ہوگئے کہ ممکن ہے تقدیر اس طرف انھیں بھی رواں
کر رہی ہو۔ بہت بڑا مسئلہ حل ہوگیا تھا۔ اس مسئلے کو وہ سب سے
زیادہ اہمیت دے رہے تھے۔ ناظم علی صدیقی سے وعدہ تو کر چکے
تھے لیکن پریشان تھے کہ بیگم صاحبہ اس بات پر راضی ہوں گی یا نہیں
لیکن بیگم صاحبہ اتنے آرام سے اس کے لئے تیار ہوگئی تھیں کہ انھیں
حیرت ہوئی تھی۔ تیاریاں مکمل کرلی گئیں۔ زاہد کا کام تو کسی حد تک
ختم ہی ہوچکا تھا۔ اب آگے کے سارے معاملات اللہ تعالیٰ کی
مرضی پر تھے۔

ناظم علی صدیقی صاحب نے اپنی کوٹھی کے برآمدے میں دونوں میاں
بیوی کا استقبال کیا۔ صابرہ بیگم بھی ناظم علی صدیقی صاحب کے
پیچھے ایک نفیس مگر سادہ لباس میں موجود تھیں وہ بڑی عجیب سی
کیفیت سی محسوس کر رہی تھیں ایک بہت بڑا انکشاف ہونے والا تھا
اور وہ سوچ رہی تھیں کہ پتہ نہیں اس کے نتائج کیا ہوں۔
بہرحال دونوں میاں بیوی اوپر پہنچ گئے۔ بیگم صاحبہ نے آنکھوں
ہی آنکھوں میں مسکراتے ہوئے صابرہ بیگم کی طرف دیکھا اور صابرہ
بیگم نے آگے بڑھ کر بیگم صاحبہ کے دونوں ہاتھ تھام لئے۔ اس نیک
خاتون کی وہ تہہ دل سے ممنون تھیں لیکن شجاع احمد صاحب
نے کبھی غور سے صابرہ بیگم کو نہیں دیکھا تھا۔ ایک آدھ بار سرسری
سی نگاہ پڑی تھی لیکن وہ ایسی چیزیں غور سے دیکھنے کے قائل نہیں
تھے جن سے اُن کا کوئی خاص ربط نہ ہو اس وجہ سے وہ صابرہ بیگم
کو نہیں پہچان سکے تھے تاہم انھوں نے مسکراتے ہوئے انھیں بھی سلام
کیا اور ناظم علی صاحب کی طرف دیکھ کر بولے۔

"بھئی آپ کو آپ کی بیگم کی مبارکباد۔"

"شکریہ، شکریہ، آیئے۔" ناظم علی صدیقی سمجھ گئے تھے کہ شجاع احمد
صابرہ بیگم کو نہیں پہچان سکے تھے۔ وہ بڑے احترام سے انھیں اپنے
ڈرائنگ روم میں لے گئے صابرہ بیگم، بیگم صاحبہ سے گفتگو کرنے لگی
تھیں بیگم صاحبہ ابھی جذباتی نہیں ہونا چاہتی تھیں چنانچہ بڑی
احتیاط سے اُن سے گفتگو کر رہی تھیں اور اُن کی یہی خواہش تھی
کہ کم از کم ان کی طرف سے یہ انکشاف نہ ہو لیکن حالات کچھ عجیب سے
تھے۔ شجاع احمد جیسے زیرک آدمی کو زیر کرنا آسان بات نہیں تھی
ناظم علی صدیقی صاحب بڑی احتیاط سے اُن سے گفتگو کر رہے تھے۔

"ہاں تو شجاع احمد صاحب اب تو آپ یہاں آ ہی گئے ہیں میرا
خیال ہے اس سلسلے میں گفتگو کا آغاز کر دیا جائے۔"

"ہاں، ہاں، کیوں نہیں۔ ناظم صاحب یہ بتایئے کہ آپ کے صاحبزادے
ہیں کہاں؟"

"بلاؤں؟" ناظم علی صدیقی صاحب نے عجیب سے انداز میں کہا
اور شجاع احمد انھیں چونک کر دیکھنے لگے۔

"کیا مطلب؟ بھئی بلاؤ گے نہیں ہمیں اُن سے۔ ہم بھی تو اُن
کو دیکھیں صاحبزادے کیسے ہیں اور کہاں روپوش رہے تھے
وہ اب تک۔"

"تم اُسے دیکھ چکے ہو شجاع احمد مجھے تعجب ہے کہ تم میری بیگم کو
نہیں پہچانے۔"

"جی؟" شجاع احمد صاحب چونک کر بولے۔

"ہاں تمہارا پاؤں ہمیشہ میری گردن پر رہے گا شجاع احمد
کیونکہ اُس وقت تم نے میری بیوی اور میرے بیٹے کو سہارا دیا جب
وہ زمانے کی اُلجھنوں کا شکار تھے۔ تمہارا یہ احسان میری گردن پر
ہمیشہ رہے گا اور میں اُسے کبھی نہیں بھولوں گا۔"

"میں نے سہارا دیا؟"

"ہاں میں اپنی مختصر سی کہانی تو تمھیں سُنا چکا ہوں وہ میری
بدنصیبی کی کہانی تھی۔ صابرہ بیگم میری بیوی ہیں اور یہ طویل عرصے
تمہاری کوٹھی کی انیکسی میں رہ چکی ہیں۔"

"کک کیا؟" شجاع احمد چونک پڑے اسی وقت سرفراز ایک خوبصورت
سوٹ میں ملبوس اندر داخل ہوا اور شجاع احمد صاحب کی آنکھیں حیرت
سے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

"یہ سرفراز ہے شجاع احمد۔ میرا بیٹا میرا لختِ جگر۔" سرفراز کے پیچھے
سحر بھی اندر آگئی تھی۔ شجاع احمد صاحب کے دماغ نے ایک لمحے کے
لئے کام کرنا چھوڑ دیا تھا لیکن دوسرے لمحے اُن کا خون بُری طرح
کھول اُٹھا۔ اُن کے ذہن نے نعرہ لگایا: "سازش"۔ یقیناً کوئی
گہری سازش ہے۔ بلاشبہ یہ سازش ہے اور ان کی اس ذہنی
کیفیت کے آثار ان کے چہرے پر بھی نمایاں ہوگئے۔ اُن کا چہرہ غصّے
سے سُرخ ہوگیا تھا۔ انھوں نے خونی نگاہوں سے اپنی بیگم کی
طرف دیکھا جو اطمینان سے بیٹھی صابرہ بیگم سے گفتگو کر رہی تھیں
سرفراز کو دیکھ کر بھی انھوں نے چونکنے کا مظاہرہ نہیں کیا تھا۔
اس کا مقصد یہ ہے کہ انھیں حقیقت معلوم تھی۔ صابرہ بیگم کو اگر
شجاع احمد نہیں پہچانتے تھے تو وہ تو انھیں بخوبی پہچانتی تھیں
انھیں صابرہ بیگم سے مل کر حیرت ہونی چاہیئے تھی۔ سرفراز کو دیکھ کر
انھیں بھی اُسی شدید حیرت کا شکار ہونا چاہیئے تھا۔ جس طرح وہ
ہوئے تھے لیکن وہ مطمئن تھیں۔ اس کا مقصد ہے۔ اُوہ اُوہ اس

گہری سازش کے پیچھے صرف زاہدی کا دماغ کام کر سکتا ہے۔ کسی طرح اُس نے ناظم علی صدیقی کو تیار کر لیا ہوگا کہ سرفراز کی سرپرستی قبول کر لیں اور اس طرح یہ بیل منڈھے چڑھ جائے۔ شجاع احمد کے چہرے کے تاثرات صاف نمایاں تھے اور ناظم علی صدیقی صاحب بھی انھیں غور سے دیکھ رہے تھے۔

"کیا سوچ رہے ہو شجاع احمد؟"

"کچھ نہیں ناظم علی صاحب۔ سرفراز کو تو میں اچھی طرح جانتا ہوں۔ یہ کافی عرصہ ہمارے ساتھ رہ چکے ہیں۔"

"ہاں دراصل یہ دونوں مجھ سے جُدا ہونے کے بعد بہت سی پریشانیوں کا شکار رہے۔ میری قابلِ احترام بیوی صابرہ بیگم نے نہ جانے کس کس طرح سرفراز کو پروان چڑھایا۔ سرفراز نے اچھی تعلیم حاصل کر لی اور یہ صابرہ بیگم ہی کا کارنامہ تھا۔ اس کے بعد سرفراز کسی حد تک پریشانی کا شکار ہو گیا۔ وہ فنِ مصوری سے دلچسپی رکھتا تھا اور یہ فن ایسا نہیں تھا کہ اُسے آسانی سے کوئی موزوں جگہ مل جائے۔ وہ مُلازمت کی تلاش میں بھٹک رہا تھا کہ زاہد نے اُسے سہارا دیا اور آپ کی بیٹی قدسیہ کا اتالیق مقرر کر دیا۔ اس طرح آپ نے یہ احسان میرے اُوپر براہِ راست کیا۔"

"ناظم علی صدیقی! صرف ایک سوال کروں گا۔ سرفراز بیٹے تم واپس جاؤ۔ ناظم علی میرے دوست ہیں جو کچھ بھی گفتگو ہوگی وہ اچھے ماحول میں ہوگی۔" شجاع احمد صاحب نے بمشکل خود پر قابو پا کر یہ بات کہی تھی۔ سرفراز خاموشی سے باہر نکل گیا۔ البتہ سحر وہیں رہ گئی تھی۔ شجاع احمد چند لمحات خاموش رہ کر ناظم علی کی شکل دیکھتے رہے۔ پھر بھاری لہجے میں بولے۔

"ناظم علی! میں تمھاری عظمت کو سلام کرتا ہوں۔ بڑے دل گردے کا کام ہے کہ کسی کے لئے اپنے آپ کو یوں وقف کر دیا جائے۔ کیا تم خُدائے لم یزل کو درمیان میں رکھ کر حلفیہ طور پر یہ بات کہہ سکتے ہو کہ سرفراز تمھاری اپنی اولاد ہے تمھارا اپنا بیٹا ہے؟"

"ہاں شجاع احمد! میرے ذہن میں یہ بات تھی کہ تم یہ سوال ضرور کرو گے۔ صابرہ یہاں آؤ۔" ناظم علی صدیقی صاحب نے انتہائی سنجیدگی سے کہا اور صابرہ بیگم اپنی جگہ سے اُٹھ گئیں۔

"تم عورت ہو صابرہ اور عمر کی اس منزل میں ہو جہاں فضول باتوں سے ہٹ کر ایک وقار، ایک پاکیزگی فطرت میں رچ بس جاتی ہے کیا تم اپنے خُدا کو حاضر و ناظر جان کر شجاع احمد صاحب کے سامنے یہ بات کہو گی کہ تم میری بیوی ہو؟"

"ہاں ہم نے خاندانی رسم و رواج کے مطابق اور بزرگوں کی زیرِ نگرانی شادی کی تھی اور اس کے ساتھ ساتھ آپ نے جو کچھ شجاع احمد بھائی سے کہا اس میں خُدائے بزرگ و برتر کی قسم کوئی بھی غلط نہیں ہے۔" صابرہ بیگم نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا اور شجاع احمد کا چہرہ ایک دم کھِل اُٹھا۔

"تو پھر میں آپ سے ناظم علی صدیقی صاحب اور صابرہ بہن آپ دونوں ہی سے معافی کا خواستگار ہوں کہ میں نے آپ پر شک کیا بات دراصل کچھ نہیں ہے کچھ ایسے عوامل تھے جن کی وجہ سے یہ احساس میرے ذہن میں پیدا ہوا۔ میں سچائی سے گریز نہیں کرتا۔ میں نے صرف یہ سوچا کہ آپ نے سرفراز کو اپنی سرپرستی میں لے کر یہ کام انجام دینے کا فیصلہ کیا ہے۔"

"اب تمھارا کیا خیال ہے شجاع احمد؟"

"اتنی بڑی قسموں کے بعد ان باتوں پر شک کرنا گناہِ عظیم ہے۔ میرا دل صاف ہو گیا۔"

"تو پھر میں تمھیں سینے سے لگا لوں۔" ناظم علی صدیقی نے خوشی سے بے قابو ہوتے ہوئے کہا۔

"دیکھئے ناظم صاحب! ایک بات تھی میرے ذہن میں۔ میں نے اُس کی تصدیق کر لی اور یہ سوال حق تھا آپ اس حق کو چیلنج نہیں کر سکتے۔ باقی رہی بعد کی باتیں تو ٹھیک ہے مجھے یہ رشتہ خلوصِ دل سے منظور ہے۔" شجاع احمد صاحب نے کہا اور ناظم علی بے اختیار ان سے لپٹ گئے۔ بیگم صاحبہ صابرہ بیگم سے بغلگیر ہو گئی تھیں اور دروازے سے لگا سرفراز بھی بے چینی سے اپنی تقدیر کے فیصلے کا انتظار کر رہا تھا۔ مسرت سے بے قابو ہو کر اس کمرے کی طرف دوڑ گیا جہاں سے اُسے فون پر زاہد کو اطلاع دینا تھی۔ زاہد نے اُسے ہدایت کر دی تھی کہ وہ فوراً اس مُلاقات کی اطلاع اُسے دے۔ اُس نے خود اس وقت وہاں موجود رہنا مناسب خیال نہیں کیا تھا۔ مبادا کہیں شجاع احمد صاحب اس کی بُو ہی نہ سُونگھ لیں۔

❖

سب کے دَرد کا درماں تلاش کرنے والے کے سینے میں کون کون سے آتش فشاں پوشیدہ ہیں۔ اس کا کسی کو علم نہیں تھا۔ اکثر تنہائیوں میں اس کے سینے میں مدوجزر اُٹھتے تھے۔ اُس وقت کوئی بھی اُسے دیکھنے والا نہیں ہوتا تھا۔ ان دنوں اُس کے ذہن و دل کی بُری حالت تھی۔ نشاط کو بار ہا دیکھا اُس نے۔ اُسے پہلی بار یہاں دیکھ کر وہ بُری طرح خوف زدہ ہو گیا تھا۔ اُسے خطرہ پیدا ہو گیا تھا کہ نشاط اس کا بھانڈہ پھوڑ دے گی۔ لیکن نشاط کم ظرف نہیں نکلی۔ اُس نے کسی

سے بھی ایک لفظ نہیں کہا اور اس کے بعد اس نے فرسٹ ایڈ ہاؤس کے لئے اپنی خدمات پیش کر دیں۔ زاہد نشاط کی شرافت سے متاثر ضرور تھا لیکن اس کے لئے اور کوئی جذبہ کبھی بھی پروان نہیں چڑھا تھا۔

اُس دن نہ جانے کیا ہوگیا۔ کمبخت کیوپڈ نہ جانے کہاں چھپا ہُوا بیٹھا تھا۔ ایسا تیر مارا کہ پار ہی ہوگیا۔ اُس وقت سے اب تک وہ بے کل تھا۔ دل چاہتا تھا کہ نشاط سے ملے لیکن خوف دامن گیر تھا۔ وہ اس احساس کو اور ہوا نہیں دینا چاہتا تھا۔ خوب مذاق اُڑایا تھا اُس نے اپنا، دل ہی دل میں۔ بہت سمجھایا تھا اپنے آپ کو، لیکن ایسے معاملات میں بھی کبھی دل سمجھانے سے باز آتا ہے۔

سرفراز کے درد کا درماں اُس نے تلاش کر لیا تھا۔ بیگم صاحبہ نے اُسے فون پر بتادیا تھا کہ شجاع احمد صاحب آج شام اُن کے ساتھ ناظم علی کے گھر جا رہے ہیں۔ بس اب اُسے نتائج کا انتظار تھا لیکن آج دل کی بے کلی پھر بڑھ گئی تھی۔

دل نے کہا یہ راز صرف تمھارے سینے میں ہے کسی اور کو تو اس کی ہوا بھی نہیں لگی۔ نشاط بے چاری کا کیا قصور ہے۔ اُسے کیوں نظر انداز کر رہے ہو۔ وہ تو یہی سوچے گی کہ تمھارے دل میں اُس کی ماں کی طرف سے کدورت ہے اس لئے تم اس سے نہیں ملتے۔ سو فیصدی یہی سوچے گی۔ مناسب نہیں ہے اس سے دل کا حال نہ کہو مل تو لیا کرو۔ دل نے کچھ اس طرح مجبور کیا کہ وہ نشاط کی طرف چل پڑا۔ ریسپشن پر ایک اور لڑکی بیٹھی ہُوئی تھی۔

"مس نشاط نہیں آئیں؟" اُس نے سوال کیا۔

"نہیں سر! تین دن سے میں یہی کام کر رہی ہُوں۔"

"تین دن سے؟" زاہد چونک پڑا۔

"جی ہاں۔"

"اوہ! اس کے بارے میں کوئی اطلاع ہے؟"

"میرے علم میں نہیں سر! وہ مخدوم صاحب سے کچھ کہہ کر گئی ہیں۔ اُنھوں نے ہی مجھے یہاں لگایا ہے۔"

مخدوم فرسٹ ایڈ ہاؤس ایک منتظم تھا۔ زاہد اس کے پاس پہنچ گیا۔ مخدوم نے اُسے بتایا کہ نشاط کا فون ملا تھا اُسے۔ اُس نے کہا تھا کہ وہ چند روز تک نہیں آسکے گی۔

"وجہ کیا ہُوئی؟" زاہد پریشان ہوگیا۔ کہیں بیمار تو نہیں ہوگئی۔ اس احساس نے اسے بے چین کر دیا۔ اب اس کے علاوہ کوئی چارہ کار نہیں تھا کہ نشاط کے ہوسٹل جا کر اُس کے بارے میں معلومات حاصل کرے۔ چنانچہ فوراً کار نکال کر چل پڑا۔ ہوسٹل سے معلوم ہُوا کہ نشاط اچانک اپنے گھر چلی گئی ہے عذرا نامی ایک لڑکی نے اُسے بتایا کہ گھر سے کوئی پریشان کن خبر ملی تھی۔ جس کی وجہ سے نشاط بُری طرح پریشان ہوگئی اور پھر فوراً ہی وہ چلی گئی۔

زاہد کھوئے کھوئے انداز میں ہوسٹل سے باہر آیا۔ "نشاط پریشان ہے کیا ہوگیا؟ کیا بات ہے آخر؟ کیا کرنا چاہیئے؟" کار ڈرائیو کرتے ہوئے وہ سوچ رہا تھا پھر دفعتاً اُسے وکیل حمایت بیگ یاد آئے۔ نشاط کے گھریلو معاملات سے وہ ضرور واقف ہُوں گے۔ وہ شمشیر زماں کے خاندانی وکیل تھے۔ دوسرے لمحے اُس نے کار کا رُخ حمایت بیگ کے دفتر کی طرف کر دیا۔

طویل عرصے کے بعد وہ حمایت بیگ صاحب کے دفتر کی طرف آیا تھا لیکن ان کی یادداشت بہت عُمدہ تھی۔ انھوں نے فوراً زاہد کو پہچان لیا اور پُرتپاک انداز میں اس سے ملے۔

"کیسے مزاج ہیں ظفر میاں آپ کے؟ کیا ہو رہا ہے؟ اس کے بعد سے تو آپ سے ملاقات ہی نہیں ہو سکی۔"

"زندگی اُلجھنوں کا مجموعہ ہے حمایت صاحب۔ بس اسے سلجھانے میں مصروف ہوں۔" زاہد نے جواب دیا۔

"کوئی خدمت میرے لئے۔۔۔؟"

"جی ہاں! ایک زحمت دینے حاضر ہُوا تھا۔ شمشیر زماں کی صاحبزادی نشاط یہاں تعلیم حاصل کر رہی تھیں۔ ایک دوبار ان سے ملاقات بھی ہوئی۔ اچانک نہ جانے کہاں چلی گئی ہیں۔ کیا آپ کا ان سے رابطہ رہتا ہے؟"

"رات ہی کو وہاں سے واپس آیا ہوں۔ بڑی اُلجھن میں پڑ گئے ہیں وہ لوگ۔ نشاط بھی اسی پریشانی میں مبتلا اپنے گھر چلی گئی ہے۔"

"خیریت! کیا اُلجھن ہے؟" زاہد نے پُوچھا۔

"بھئی بیگم شمشیر زماں کی ایک عزیزہ ہیں شاہدہ بیگم۔ ان کے شوہر توفیق صاحب ہیں۔ بیگم زماں کا کہنا ہے کہ کچھ عرصہ قبل توفیق صاحب۔ ان کے یہاں، بیوی، بچوں کے ساتھ قیام کرنے آئے تھے۔ ابتدا میں تو انھوں نے بہت ہمدردیاں جتائیں، لیکن پھر بہت جلد کُھل گئے۔ وہ اپنے بیٹوں کے ساتھ شمشیر زماں کی بچیوں کی شادی کر کے نواب صاحب کی دولت ہتھیانا

کے خواب دیکھ رہے تھے جب انکار کر دیا تو زیادتی پر اُتر آئے لیکن نواب مرحوم کے ایک دوست نے بزورِ قوت انھیں وہاں سے بھگا دیا۔ طویل عرصہ وہ خاموشی اختیار کئے رہے۔ اس دوران میں ان صاحب کا انتقال ہو گیا جنھوں نے پہلے اس سلسلے میں مداخلت کر کے انھیں بھگایا تھا۔ چنانچہ اب وہ صورتِ حال نہیں جس کا علم یقیناً توفیق صاحب کو ہو گیا ہو گا۔ اس بار تو وہ زیادہ سامان سے لیس ہو کر آئے ہیں اور نہ جانے کہاں سے کچھ دستاویزات لے آئے ہیں۔ ان دستاویزات کے تحت شمشیر زماں نے اپنی آدھی سے زیادہ جائیداد ان کے ہاتھ فروخت کر دی تھی اور چونکہ اس جائیداد کی آمدنی کا تصرف اس دوران میں بیگم شمشیر زماں کے پاس رہا ہے اس لئے حساب کتاب کر کے انھوں نے تقریباً دو کروڑ اسی لاکھ روپے بیگم صاحبہ پر واجب الادا قرار دیئے ہیں گویا باقی جائیداد بھی اس قرض میں ان کی۔ وہ بیگم صاحبہ کو کوڑی کوڑی کا محتاج کرنے کے لئے آئے ہیں اور وہ اس وقت انھی کی حویلی میں براجمان ہیں۔"

"اوہ! لیکن ان دستاویزات کی قانونی حیثیت کیا ہے؟" زاہد نے پریشانی سے پوچھا۔

"بھئی اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ وہ جعلی ہیں لیکن اُسے خاندانی تاریخ کی عظیم ترین جعلسازی کہا جا سکتا ہے۔ بڑے اعلیٰ پیمانے پر تحریریں نقل کی گئی ہیں۔"

"پھر آپ نے کیا کیا؟"

"دیوانی کیس تیار کر کے لایا ہوں۔ مقدمہ چلے گا لیکن صورتِ حال پریشان کن ہے۔"

"نشاط وہیں گئی ہوتی ہیں؟"

"ہاں! وہی ذرا سمجھدار لڑکی ہے۔ باقی تو سب اس گھر میں سیدھے سادے لوگ ہیں۔"

"بہتر! بس یہی معلوم کرنے حاضر ہوا تھا۔ ہاں توفیق صاحب کی سابقہ سکونت کہاں ہے۔ کچھ معلوم ہے آپ کو؟"

"ظاہر گڑھ میں رہتے تھے معمولی سے آدمی ہیں لیکن کام بہت شاندار کیا ہے۔" حمایت بیگ نے کہا۔

"شکریہ! میں اب اجازت چاہتا ہوں۔" زاہد نے کہا اور پھر وہ حمایت بیگ سے رُخصت ہو کر وہاں سے نکل آیا۔ دل میں نشاط کی محبت کا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ اس کی پریشانی کے احساس نے دوسرے تمام احساسات چھین لئے تھے۔ ذہن و دل میں طوفان برپا ہو گیا تھا۔ بہت کچھ سوچا اور پھر اسی رات وہ دادا جان کے کمرے میں داخل ہو گیا۔

دادا جان نے حسبِ معمول اس کا استقبال کیا تھا۔ "کہو بیٹے کوئی خاص بات ہے؟" انھوں نے پُوچھا۔

"جی ہاں! آج آپ سے ایک ذاتی کام آن پڑا ہے دادا جان۔" زاہد نے کہا اور دادا جان چونک کر اُسے دیکھنے لگے۔

"اس کا تعلق کس کی وجہ سے ہے یہاں؟" انھوں نے سوال کیا۔

"میری ہی سمجھ لیجئے دادا جان!"

"سبحان اللہ! کوئی جھگڑا ہو گیا ہے بھائی ہمارے تمھارے درمیان؟ یہ تمھاری ذات اچانک علیحدہ کیسے ہو گئی؟" دادا جان محبت بھرے لہجے میں بولے۔

"ایک بہت ہی سنجیدہ معاملہ آن پڑا ہے دادا جان! آپ کی بھرپور توجہ کا طالب ہے۔"

"اچھا۔ . . اچھا، بیٹھو۔ کہو کیا بات ہے۔" دادا جان بھی سنجیدہ ہو کر بولے۔

"وہ نشاط ہے نا دادا جان، جس نے رضا کارانہ طور پر ہمارے ہاں ریسپشنٹ کی۔ . . ."

"ہاں، ہاں، کہو بھئی۔ اُس کا تعارف کرانے کی ضرورت نہیں۔ میں جانتا ہُوں اس بچّی کو۔"

"شاید میں نے آپ کو یہ بھی بتایا تھا کہ وہ ایک سابقہ ریاست کے نواب شمشیر الزماں کی بیٹی ہے۔"

"اوہو! اتنی تفصیل سے اس سے پہلے تم نے مجھے اس بارے میں نہیں بتایا۔ اگر وہ کسی نواب کی بیٹی ہے تو۔ . . تو۔ . . تو ہمارے ہاں، میرا مطلب ہے؟"

"دادا جان! وہ صرف اس کا جذبہ ہے جس کے لئے وہ کام کر رہی ہے۔ نواب شمشیر الزماں انتقال کر چکے ہیں لیکن اس کے باوجود ریاست کی جو ذمّے داریاں تھیں ان کا نظام دُوسرے لوگوں کے ہاتھوں بخوبی چل رہا ہے۔ بیگم صاحبہ ہیں۔ میرا مطلب ہے نواب شمشیر الزماں کی بیوہ، بہت اچھی انسان ہیں۔ نشاط کا کوئی بھائی وغیرہ نہیں ہے۔ تین بہنیں ہی ہیں۔ ان کے ایک خالو ہیں توفیق صاحب، کچھ عرصے قبل توفیق صاحب ان لوگوں کو پریشان کر چکے ہیں۔ دراصل شمشیر الزماں کی غیر موجودگی سے رشتے دار مسلسل فائدہ اُٹھانے کی کوشش میں مصروف رہے اور اس بار سُنا ہے کہ توفیق صاحب اپنے اوباش بیٹوں اور بیگم کے ساتھ حویلی پہنچ گئے ہیں اور کچھ ایسی دستاویزات تیار کرا کے لائے ہیں جن کی رُو سے بقول ان کے وہ شمشیر الزماں کی آدھی جائیداد کے وارث ہیں اور یہ جائیداد انھوں نے

نواب شمشیر زماں سے خریدی تھی۔ اس کے علاوہ انھوں نے یہ بھی کہا ہے کہ شمشیر الزماں کی جو جائیداد ان کی اپنی ملکیت تھی اس کی وصولیابی کی مد قم ملا کر اتنی ہو چکی ہے کہ شمشیر زماں کی بقیہ جائیداد بھی ان ہی کے حصے میں آجائے گی۔ سنا ہے بہت ہی ٹھوس کام کر کے آئے ہیں اور ان بے چاروں کو پریشان کر رہے ہیں۔ نشاط اسی پریشانی کا شکار ہو کر اپنے گھر گئی ہوئی ہے میں نے جب اس کی غیر موجودگی کے بارے میں معلومات حاصل کیں تو یہ کہانی میرے علم میں آئی۔"

"بخدا یہ تو بہت ہی ذلیل حرکت ہے۔ اس بے ایمان شخص کی، جس نے ایک بیوہ عورت کے ساتھ یہ زیادتی کرنے کی کوشش کی ہے۔"

"دادا جان! اس خاندان کے میرے اوپر بھی بڑے احسانات ہیں۔ میں کسی وقت فرصت میں آپ کو اس کی ساری تفصیلات بھی بتا دوں گا لیکن یوں سمجھ لیجئے کہ میں ہر قیمت پر اس خاندان کی مدد کرنا چاہتا ہوں۔"

"بیٹا! ایک بات مجھے بتاؤ۔ ان توفیق صاحب کا پچھلا پس منظر معلوم ہو سکا... ؟"

"جی ہاں! ایک معمولی سے آدمی ہیں۔ معمولی جگہ کے رہنے والے ساری زندگی چکر پن میں ہی گزار دی۔ نہ ہی خود کسی قابل ہیں اور نہ ہی دونوں بیٹے کسی قابل ہیں۔ گھر کے لئے چارپائی خریدنا بھی ان کے لئے عذاب ہوتا ہوگا۔ اب وہ شمشیر زماں کی آدھی جائیداد پر اپنا حق ظاہر کر رہے ہیں۔"

"تمھیں یقین ہے کہ اس سلسلے میں ہم جو بھی اقدام کریں گے وہ جائز ہوگا؟"

"دادا جان! یہ آپ سے میں کہہ رہا ہوں۔ بس اتنا ہی کافی ہے۔"

"ٹھیک ہے میاں۔ اتنا ہی کافی ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ہمیں اس سلسلے میں کیا طریقہ اختیار کرنا چاہئے؟ کون سا قدم اٹھانا چاہئے... ؟ لیکن خدا کا احسان ہے کہ ہم سب کچھ کر سکتے ہیں۔"

"دادا جان! میں چاہتا ہوں کہ اتنے اعلیٰ پیمانے پر یہ کام کیا جائے کہ کسی قسم کی کوئی خامی نہ رہے۔ اگر بیگم شمشیر الزماں کو ایک بار بھی عدالت یا تھانے میں جانا پڑا تو میرے لئے ڈوب مرنے کا مقام ہوگا۔"

"نہیں جائیں گی بیٹے۔ انشاءاللہ تعالیٰ نہیں جائیں گی۔ ٹھہرو، اب اس سلسلے میں دیر کیسی۔" دادا جان نے کہا اور ٹیلی فون کے نزدیک پہنچ گئے۔ فرسٹ ایڈ ہاؤس کی وجہ سے دادا جان کی حیثیت معمولی نہیں رہی تھی۔ انھوں نے براہِ راست وزیرِ داخلہ کے سیکریٹری کو فون کیا اور ہوم سیکریٹری صاحب نے خود ہی ان کا فون ریسیو کیا۔

"میرا نام حسام احمد ہے۔ آپ مجھے فرسٹ ایڈ ہاؤس حوالے سے پہچان سکتے ہیں۔"

"فرمائیے حسام احمد صاحب! آپ کی اپنی ذات ہی کیا کم ہے جو آپ فرسٹ ایڈ ہاؤس کا حوالہ دے رہے ہیں۔"

"جناب ایک ایسا مسئلہ آن پڑا ہے کہ آپ کی اس میں مدد کی ضرورت ہے۔"

"فرمائیے، حسام احمد صاحب! تکلف کیسا؟ جو کہنا ہے کہہ ڈالیئے۔ یا پھر ملاقات مناسب ہو تو میرے ساتھ ایک نشست رکھ لیجئے۔" ہوم سیکریٹری نے کہا۔

"اس وقت آپ کی کیا مصروفیات ہیں؟"

"حضرت! مصروفیات کچھ بھی ہوں۔ آپ کے لئے کوئی مصروفیت نہیں ہے۔ اگر آپ تشریف لا سکتے ہوں تو تشریف لے آئیے۔ ورنہ میں حاضر ہو جاؤں۔"

"ارے نہیں، نہیں، محبت ہے آپ کی۔ میں آرہا ہوں۔" حسام احمد صاحب نے کہا۔

"براہ کرم تشریف لائیے۔ میں آپ کا انتظار کر رہا ہوں۔" ہوم سیکریٹری صاحب نے جواب دیا اور حسام احمد نے شکریہ ادا کر کے فون رکھ دیا۔

"کپڑے وغیرہ تبدیل کرنے ہیں؟" دادا جان نے زاہد سے پوچھا۔

"نہیں، میں تو ٹھیک ہوں۔"

"تو ہم بھی ٹھیک ہیں میاں۔ چلو چلتے ہیں۔" دادا جان نے جس طرح زاہد کے لئے فوری طور پر عمل کیا تھا۔ زاہد کے دل میں اس سے ان کے لئے بڑی عزت پیدا ہو گئی تھی۔ ویسے دادا جان اسے بلاشبہ شاید اپنے بیٹے سے بھی زیادہ چاہنے لگے تھے۔

تھوڑی دیر بعد ان کی کار ہوم سیکریٹری کی کوٹھی کی جانب جا رہی تھی۔ ہوم سکریٹری نے دربان کو ہدایت کر دی تھی کہ آنے والے مہمانوں کو احترام کے ساتھ اندر پہنچایا جائے۔ خود انھوں نے اپنی کوٹھی کے صدر گیٹ پر دادا جان کا استقبال کیا تھا۔ زاہد بھی دادا جان کے ساتھ نیچے اتر آیا تھا اور دونوں ان کے قریب پہنچ گئے۔ ہوم سیکریٹری صاحب نے ان دونوں سے مصافحہ کیا اور انھیں احترام کے ساتھ اندر لے گئے۔

"آپ نے بلا وجہ تکلّف برتا مجھے بس اطلاع پہنچا دی ہوتی۔ میں کسی نہ کسی طرح آپ تک پہنچ ہی جاتا۔"

"بہت نوازش ہے آپ کی۔ میں جانتا ہوں کہ آپ لوگوں نے مجھے کیا عزّت اور مرتبہ دیا ہے۔"

"آپ اس لائق ہیں حسام احمد صاحب آپ اس لائق ہیں۔" ہوم سیکریٹری صاحب نے کہا اور پھر انھیں بٹھانے کے بعد انھوں نے بڑے اپنائیت بھرے لہجے میں کہا۔ "کیا ضرورت پیش آگئی تھی آپ کو؟"

"بھئی بات یہ ہے میاں کہ اس قسم کے معاملات میں کبھی ملوث نہیں ہوئے۔ اس لئے اتنی بلندی تک پہنچ گئے۔ ہم نے سوچا کہ اتنے اُونچے پیمانے پر کام کیا جائے کہ کسی بھی قسم کا سقم ہی باقی نہ رہے۔"

"ضرور ضرور . . . آپ نے بڑا اچھا کیا جو اِدھر اُدھر بھٹکنے کی بجائے میرے پاس تشریف لے آئے۔ اب فرمائیے کیا کام ہے؟"

"ایک نواب تھے، مرحوم شمشیر زماں، ایک چھوٹی سی ریاست تھی اُن کی، سیر و شکار کے بہت ہی رسیا تھے اُن کا انتقال ہو گیا ہے اور . . ."

"آپ اُن شمشیر زماں کی بات کر رہے جو سیر و شکار کے بے حد شوقین تھے؟"

"ہاں ہاں۔ آپ جانتے ہیں انھیں؟"

"جانتا کیا ہوں حسام احمد صاحب، وہ تو میرے دُور کے عزیزوں میں شمار ہوتے ہیں۔" ہوم سیکریٹری صاحب نے جواب دیا۔

"چلئے پھر تو ایک بہت بڑا مسئلہ خود بخود حل ہو گیا۔ اچھا آپ مجھے یہ بتائیے کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ نواب شمشیر زماں نے اپنی آدھی جائیداد ایک ایسے شخص کے ہاتھ فروخت کر دی ہو جو اُن کا رشتے دار تھا اور غریب سا آدمی تھا۔"

"بخش دی ہو گی۔ فروخت کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کیونکہ ان کی مالی حالت کبھی اتنی خراب نہیں رہی۔"

"اگر آپ انھیں اتنی اچھی طرح جانتے ہیں تو پھر تفصیل میں جانا بے کار ہے۔ اُن کے ایک رشتے کے عزیز ہیں توفیق صاحب، معمولی سے آدمی تھے۔ بس ذرا لالچی طبیعت کے مالک ہیں۔ شمشیر زماں کی بیوہ کو پریشان کر رکھا ہے انھوں نے۔ کہتے ہیں کہ آدھی جائیداد شمشیر زماں نے اُن کے ہاتھ فروخت کر دی تھی۔ دستاویزات بنوا لائے ہیں کہیں سے شمشیر زماں کے جعلی دستخط کروا کے اور اب اس حویلی میں آ بیٹھے ہیں۔ بے چاری شمشیر زماں کی بیوہ پریشان ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ توفیق میاں کو مؤثر سزا دلوائی جائے، اور انھیں بے دست و پا کر دیا جائے تاکہ وہ آئندہ اس قسم کی کوئی کوشش نہ کریں۔"

ہوم سیکریٹری صاحب نے گردن ہلائی اور ٹیلی فون کے نزدیک پہنچ گئے۔ انھوں نے آئی جی صاحب کو فون کر کے اپنے پاس طلب کر لیا تھا۔ مسئلہ بہت ہی زبردست پیمانے پر حل کیا جا رہا تھا۔ آئی جی صاحب خود وہاں پہنچ گئے اور سیکریٹری صاحب نے انھیں تفصیلات بتا کر ہدایت دی کہ اس سلسلے میں کوئی فوری طور پر کارروائی کر لی جائے۔" ہوم سیکریٹری صاحب نے کہا۔

"اس کی گواہی شہر کی معزز ترین ہستی دے رہی ہے۔ اس کے علاوہ نواب صاحب مرحوم خود میرے اپنے رشتے دار بھی ہوتے ہیں۔ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ جعلی دستاویزات کا پتہ لگا لیا جائے گا کہ وہ کس طرح سے تیار کی گئیں لیکن یہ بات طے ہے کہ وہ شخص صرف بیگم شمشیر زماں کو پریشان کر رہا ہے اور ان کی بے بسی کا فائدہ اُٹھا کر جھوٹے طریقے سے ان کی دولت اور جائیداد ہتھیانے کی فکر میں ہے۔"

آئی جی صاحب نے حسام احمد صاحب کی طرف رُخ کر کے کہا "محترم حسام احمد صاحب! یہ بات اگر آپ مجھے بھی طلب کر کے فرما دیتے تو یہ کام میں خود ہی کر دیتا۔ آپ کی گواہی کسی ایسے سلسلے میں بہت کافی ہے۔ تاہم ایک گزارش مجھے آپ سے کرنی ہے۔ کوئی ایسا آدمی مجھے دیجئے جسے میں اس سلسلے میں مصروف کر دوں۔ میرا مطلب ہے کہ وہ خود جا کر شمشیر زماں کی کوٹھی سے اس احمق آدمی کو گرفتار کروا دے۔ باقی انتظامات انشاء اللہ خود ہی کر لُوں گا۔"

حسام احمد صاحب نے زاہد کی طرف دیکھا اور زاہد جلدی سے بول پڑا۔

"میں حاضر ہوں دادا جان، میں چلا جاتا ہوں۔"

"ٹھیک ہے آپ کا تعارف؟" آئی جی صاحب نے پُوچھا۔

"خادم کو زاہد ذوالفقار زیدی کہتے ہیں۔" زاہد نے جواب دیا۔

"ٹھیک ہے زاہد ذوالفقار زیدی صاحب، کل صبح ساڑھے نو بجے آپ مجھے دفتر میں مل لیجئے گا۔ میں اُسی وقت فوری طور پر بندوبست کر دُوں گا۔ یا اگر کوئی بہت ہی ارجنٹ معاملہ ہو تو یعنی ابھی آپ یہ سب کچھ کرنا چاہتے ہیں تو میں راتوں رات ہی بندوبست کر دیتا ہوں۔"

"نہیں نہیں بھئی۔ اتنی جلدی کی ضرورت بھی نہیں ہے

کل صبح ساڑھے نو بجے یہ آپ کے دفتر میں پہنچ جائیں گے۔" حسام احمد صاحب نے کہا اور آئی جی صاحب نے گردن ہلا دی۔

ہوم سیکریٹری نے ان کی مختصر سی خاطر مدارت کی اور اس کے بعد انھیں رخصت کرنے کے لئے دروازے تک آئے۔

زاہد دادا جان کے ساتھ خوش خوش واپس چل پڑا۔ راستے میں دادا جان نے کہا۔

"بیٹے! اگر تمھیں میری ضرورت بھی ہو، تو میں بھی چلوں۔" دادا جان نے کہا۔

"نہیں دادا جان! بس اب سب ٹھیک ہے۔ صبح میں آئی جی صاحب کے آفس پہنچ جاؤں گا۔ اُمید ہے حالات ٹھیک ہو جائیں گے اس دوران میں فرسٹ ایڈ ہاؤس کے معاملات میں دلچسپی نہیں لے سکوں گا۔ دراصل میں خود ان لوگوں کو اس مصیبت سے نجات دلانے کا خواہش مند ہوں۔"

"ٹھیک ہے تم چلے جانا اور فکر نہ کرنا۔ یہاں کے معاملات اگر کچھ ہیں تو میرے سپرد کر دو۔ انھیں میں دیکھ لوں گا۔"

"نہیں دادا جان، اب ایسی کوئی خاص بات بھی نہیں ہے۔" زاہد نے کہا۔

وہ لوگ گھر واپس آگئے۔ زاہد اپنی خواب گاہ میں آ کر پُرمسرت انداز میں یہ سوچنے لگا کہ نشاط کے لئے یہ ایک چھوٹا سا کام کتنا فرحت بخش ہے۔ وہ بے چاری تو پریشانی کے عالم میں وہاں پہنچی ہے۔ توفیق صاحب نے پتہ نہیں کیا کیا جھگڑے پھیلائے ہوں گے لیکن اب انھیں ان کے تمام جھگڑوں سمیت فنا کر دیا جائے گا۔ کم از کم ایسی سزا دلوائی جائے گی توفیق صاحب کو کہ زندگی بھر یاد رکھیں گے اور دوبارہ کبھی شمشیر زماں کی کوٹھی کی طرف رُخ کرنے کی ہمت نہ کر سکیں اور اس کی یہ کوشش نشاط کے ذہن پر کس طرح اثر انداز ہو گی یہ سوچ کر پھر دل کی دھڑکنیں بے ربط ہونے لگی تھیں۔

***

رات کو نیند بھی کچی پکی ہی آئی تھی۔ کئی بار آنکھیں بند کر کے نشاط کو دیکھا، کئی بار آنکھیں کھول کر، بالآخر صبح کی اذان ہو گئی تھی۔

صبح وہ جلدی سے اٹھ بیٹھا، شیو بنایا اور منہ ہاتھ دھو کر فارغ ہو گیا۔ پھر وہ ٹہلنے کے لئے پائیں باغ میں نکل آیا۔ عموماً ایسا بہت ہی کم ہوتا تھا کہ وہ اتنی صبح کو اُٹھ کر ٹہلنے کے لئے نکل آئے لیکن آج بس طبیعت کچھ عجیب سی تھی۔ اس لئے اس نے سوچا کہ ٹھنڈی ہوائیں ٹہلا جائے۔ شاید اس سے دل کی بے کلی کم ہو۔

کافی دیر تک وہ چہل قدمی کرتا رہا اور اس کے بعد قدسیہ کے کمرے کے سامنے پہنچ گیا۔

قدسیہ بھی صبح خیزی کی عادی تھی۔ ہمیشہ ہی صبح کو بہت جلدی اُٹھتی تھی اور غالباً نماز بھی پڑھنے لگی تھی وہ۔ چنانچہ نماز سے فارغ ہو کر وہ باہر نکلی ہی تھی کہ زاہد سامنے نظر آیا اور قدسیہ ایک دم چونک پڑی۔ وہ تیزی سے زاہد کے پاس پہنچ گئی تھی۔

"ارے زاہد بھائی۔"

"بھئی تمھاری طرف ہی آ رہا تھا۔"

"خیریت تو ہے اتنی صبح . . . ؟ ضرور کوئی پریشان کن بات ہے؟"

"ہاں! ہے تو پریشان کن ہی۔" زاہد نے بڑی عجیب سی شکل بنا کر کہا۔

"ارے، ارے آیئے، اندر آیئے۔ خیریت کیا بات ہے؟" قدسیہ کے انداز میں شدید پریشانی پیدا ہو گئی تھی۔

"بس کیا بتاؤں قدسیہ کچھ عجیب سی بات ہو گئی ہے۔" زاہد نے کہا۔

"زاہد بھائی! خدا کے لئے جلدی بتلایئے میں پریشان ہو رہی ہوں۔ کیا ہو گیا۔ کیا بات ہو گئی ہے؟"

"وہ دراصل تمھاری شادی طے ہو گئی ہے قدسیہ۔" زاہد نے جواب دیا۔

"کیا؟"

"ہاں! یہ پریشان کن بات نہیں ہے کہ اب تم اس کوٹھی سے چلی جاؤ گی۔ میرے لئے تو یہ بہت ہی دُکھ کی بات ہے۔" زاہد بولا۔

"کہاں چلی جاؤں گی؟ خدا کے لئے کیوں پریشان کر رہے ہیں مجھے، بتایئے نا؟"

"وہ، بس تم چلی جاؤ گی قدسیہ، ناظم علی صدیقی کے ہاں ان کے بیٹے سے تمھارا رشتہ طے ہو گیا ہے۔"

"کس سے؟" قدسیہ متعجب لہجے میں بولی۔

"ناظم علی صدیقی کے بیٹے سے۔"

"آپ کا مطلب ہے کہ . . . کہ سحر کے بھائی سے؟" قدسیہ نے متعجبانہ انداز میں پوچھا۔

"ہاں بھائی سحر کے بھائی سے۔"

"مم . . . مگر سحر کا تو کوئی بھائی نہیں تھا۔ یہ بھائی کہاں سے نکل آیا؟"

"بس نکل آیا کہیں سے اور تمھارے والد شجاع احمد صاحب نے تمھاری شادی اس لڑکے کے ساتھ طے کر دی۔"

"طے بھی کر دی؟" قدسیہ تنک کر بولی۔

"ہاں قدسیہ کوئی بھی کوشش کارگر نہ ہو سکی۔ اب بتاؤ کیا کیا جائے؟"

"ٹھیک ہے۔ آپ فکر نہ کریں۔ اب جو بھی کرنا ہے میں خود کروں گی۔"

"ارے ارے کیا کرو گی۔۔۔؟"

"بس دیکھتے جائیے زاہد بھائی۔ جو کچھ کروں گی اچھا نہیں ہوگا کیا سمجھتے ہیں ڈیڈی خود کو۔ پاگل سمجھا ہوا ہے انھوں نے ہم تمام لوگوں کو، جس طرف جس کو جی چاہا ہانک دیا۔ ہماری تو جیسے کوئی زندگی ہی نہیں ہے۔ سب ان کی خواہشات کا احترام کرتے رہیں واہ بھئی واہ ہمارے بھی جذبات ہیں، اُمنگیں ہیں۔ یہ کیا بات ہوئی جس کو دل چاہتا ہے پکڑ لاتے ہیں۔ کبھی کسی گدھے کو لے آئیں گے کبھی کسی کو۔۔ اور اس کے بعد مسلط کر دیں گے اُسے ہماری ذات پر۔ آخر اس بات کی تُک کیا ہے۔ ہمیں اپنی زندگی خود گزارنی ہے نہ کہ ڈیڈی کو۔۔۔۔۔ ٹھیک ہے شادی نہیں کرتے تو نہ کریں۔ ساری زندگی شادی نہیں کروں گی اگر اس گھر میں نہیں رکھ سکتے تو نہ رکھیں۔ میں کہیں بھی چلی جاؤں گی مگر اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ مجھے گائے کی طرح کہیں بھی ہانک دیں۔" قدسیہ شدید غصّے میں آگئی۔

"مگر ایک دقت ہے قدسیہ۔" زاہد نے بڑی مسکین سی شکل بنا کر کہا۔

"کیا دقت ہے؟" قدسیہ بھنویں سکوڑ کر بولی۔

"وہ ناظم علی صدیقی صاحب کے بیٹے کا نام بڑا غلط ہے سرفراز ہے اُن کے بیٹے کا نام۔ اب تم بتاؤ میں بھلا کیسے انکار کر سکتا تھا۔"

"سرفراز!" قدسیہ چونک کر بولی۔ پھر کہنے لگی۔ "سرفراز نام ہونے سے کیا فرق پڑتا ہے؟"

"فرق پڑتا ہے نا۔ وہ بے چارہ صابرہ خاتون کا بھی بیٹا ہے تھوڑے دن پہلے ہماری کوٹھی میں رہتا تھا۔ تمھیں مصوّری سکھاتا تھا۔ اب بعد میں وہ ناظم علی صدیقی کا بیٹا نکل آیا تو ہم کیا کر سکتے ہیں؟"

اب قدسیہ کو چونکنے کی باری تھی۔ وہ عجیب سی نگاہوں سے زاہد کی شکل دیکھنے لگی۔ پھر بولی۔ "زاہد بھائی! یقیناً آپ کوئی سنجیدہ مذاق کر رہے ہیں۔"

"ہاں! نہایت سنجیدہ مذاق ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے قدسیہ کہ سرفراز، ناظم علی صدیقی کا بیٹا نکلا۔ صابرہ خاتون، ان کی وہ بیگم تھیں جنھیں وہ چھوڑ چکے تھے چھوڑ نہیں چکے تھے بلکہ یوں سمجھو کہ ایک ذرا سی غلط فہمی کی بنا پر صابرہ بیگم نے ناظم علی صدیقی کو چھوڑ دیا اور پھر باقی زندگی تکلیفوں میں گزارتی رہیں۔ یہاں تک کہ ہماری خوش قسمتی انھیں یہاں لے آئی اور ہم ان کی سی حد تک خدمت کرنے کے قابل ہو گئے سرفراز انہی کا بیٹا ہے اور سحر کا بھائی ہے۔"

قدسیہ کی آنکھیں شدّتِ حیرت سے پھٹی کی پھٹی رہ گئی تھیں کافی دیر تک وہ کچھ بول نہ سکی۔ پھر وہ اپنی لرزتی ہوئی زبان میں بولی۔

"آپ سچ کہہ رہے ہیں زاہد بھائی؟ آپ سچ کہہ رہے ہیں نا؟"

"ہاں قدسیہ! میں سچ کہہ رہا ہوں۔ یہ سب کچھ حقیقت پر مبنی ہے اور دلچسپ بات یہ ہے کہ شجاع احمد صاحب خود بھی ناظم علی صدیقی صاحب سے مل چکے ہیں اور انھوں نے سرفراز کا رشتہ منظور کر لیا ہے اب بتاؤ میرے لئے پریشانی کی بات نہیں ہے کہ میری منّی سی بہن مجھ سے جدا ہو جائے گی"

"زاہد بھائی!" قدسیہ گلوگیر آواز میں بولی۔ "زاہد بھائی مجھے تنگ نہ کیجئے۔" قدسیہ کی آنکھوں میں نمی سی آگئی تھی۔ اُس نے ایک سسکی سی لے کر کہا۔

"زاہد بھائی! آپ نے میرے لئے وہ کام کیا ہے جو شاید دنیا کا کوئی بھائی اپنی بہن کے لئے نہ کر سکے۔"

"بھائیوں کے دلوں میں تو یہی آرزو ہوتی ہے کہ ان کی بہنیں اپنی زندگی سکون سے گزاریں، بس دیکھو میں نے صبح ہی صبح تمھیں کتنی اچھی خوشخبری سنائی ہے۔"

"زاہد بھائی! میں تو آپ کی صورت ہی دیکھ کر سمجھ گئی تھی کہ آج کا دن بہت خوشگوار ہو گا۔ اب میں جب تک آپ کی صورت نہیں دیکھا کروں گی آنکھیں ہی نہیں کھولا کروں گی۔"

"ارے ارے، نہیں بھئی ایسی بھی بات مت کہو۔ اب تم سرفراز کی صورت دیکھ کر آنکھیں کھولا کرنا۔ وہ بھی بہت خوش نصیب انسان ہے۔"

قدسیہ نے زاہد کو ایک صوفے پر بٹھاتے ہوئے کہا۔ "ٹھہریئے زاہد بھائی میں آپ کے لئے چائے بنا کر لاتی ہوں۔ اپنے ہاتھوں سے بنا کر لاؤں گی۔"

"لاؤ، لاؤ، میں تو بڑی شدت سے چائے کی ضرورت

محسوس کر رہا ہوں۔"

"بس ابھی آئی۔" قدسیہ نے کہا اور دوڑتی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئی۔ زاہد کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔ یہ تھوڑا سا وقت قدسیہ کے ساتھ بہتر گزرے گا۔ اس کے بعد اُسے گھر سے نکل جانا تھا۔

قدسیہ تھوڑی ہی دیر کے بعد چائے بنا لائی اور اُس نے نفاست سے چائے زاہد کے سامنے رکھ دی۔ پھر خود بھی ایک پیالی لے کر بیٹھ گئی۔ زاہد اور قدسیہ آپس میں گفتگو کرتے رہے۔ قدسیہ کو انتہائی حیرت تھی کہ یہ سب کچھ کیسے ہو گیا۔ زاہد اُسے آہستہ آہستہ تفصیل بتا رہا تھا۔

"او زاہد بھائی! یہ باتیں آپ نے مجھ سے بھی چھپائیں۔" قدسیہ بولی۔

"دیکھو قدسیہ! ایمانداری کا تو تقاضا یہی تھا کہ یہ باتیں کسی کو بھی نہ بتائی جائیں۔ حالانکہ سرفراز میرے لئے کتنی قیمتی چیز ہے لیکن میں نے سرفراز کو بھی اس بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا یقین کرو کہ اُسے بھی بس ابھی معلوم ہوا ہے کہ یہ سب کیا گورکھ دھندا تھا۔"

"زاہد بھائی! آپ عظیم ہیں۔ آپ جیسا بلند ظرف انسان ہی یہ کر سکتا تھا۔ بلاشبہ آپ دوسروں کے راز، راز میں رکھنا جانتے ہیں۔"

"ہاں قدسیہ! اب انشاء اللہ تعالیٰ اس سلسلے میں بہت جلد ہی ہم آخری اقدامات بھی کر لیں گے۔" زاہد نے کہا اور قدسیہ ایک دم شرما گئی۔ ویسے اس کا چہرہ کھلا پڑ رہا تھا اور زاہد کو اُس کا کھلا ہوا چہرہ دیکھ کر کافی مسرت کا احساس ہو رہا تھا۔

کافی دیر تک وہ بیٹھا قدسیہ سے گفتگو کرتا رہا اور مختلف موضوعات پر گفتگو ہوتی رہی تھی لیکن اُس نے نشاط کے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔ نشاط کے نام کو وہ اپنے ذہن کے گوشوں میں چھپا کر رکھنا چاہتا تھا۔

تقریباً ساڑھے آٹھ بجے وہ وہاں سے اُٹھا اور اپنے کمرے میں آکر لباس وغیرہ تبدیل کرنے لگا۔ چھوٹے موٹے سفر کے لئے اُس نے مختصر سی تیاری کر لی تھی اور ان تیاریوں کے بعد وہ باہر نکل آیا اور کار لے کر آئی جی صاحب کے آفس چل پڑا۔

تھوڑی دیر کے بعد وہ آئی جی صاحب کے آفس پہنچ گیا۔ جیسے ہی وہ آئی جی صاحب کے آفس میں داخل ہوا۔ اُسی وقت آئی جی صاحب بھی آفس پہنچ گئے۔ انھوں نے زاہد کو پہچان لیا تھا۔ اُسے بیٹھنے کی پیشکش کرنے کے بعد وہ اس سے مختلف باتیں کرتے رہے اور انہی باتوں کے دوران میں آئی جی صاحب نے ڈی آئی جی کو طلب کیا اور ڈی آئی جی صاحب نے ایک ایس پی کو۔ انھوں نے کہا کہ ایس پی صاحب یہ تمام معاملات اچھی طرح سنبھال لیں گے۔ انھیں اس سلسلے میں تفصیلات بتا دی جائیں۔

ایس پی گوہر علی زاہد کو فرسٹ ایڈ ہاؤس کی وجہ سے بڑی اچھی طرح پہچانتے تھے۔ خوش مزاج اور نوجوان آدمی تھے۔ چنانچہ انھوں نے تمام معاملات سمجھنے کے بعد زاہد کو اپنے ساتھ آنے کی پیشکش کی اور آئی جی صاحب نے کہا۔

"زاہد میاں! محسوس نہ کرنا، دراصل ان معاملات کو اسی طرح ڈیل کیا جاتا ہے۔ ایس پی صاحب آپ کو ہر طرح کی آسانیاں فراہم کر دیں گے اور ان لوگوں کو گرفتار کر لیں گے۔ ان کی گرفتاری کے لئے تمام کاغذات مکمل ہو جائیں گے۔ آپ ان کی بالکل فکر نہ کریں۔ ہمیں پہلے فوری اقدام کے تحت بیگم شمشیر زماں کو ان مردودوں سے نجات دلانی ہے۔"

"ٹھیک ہے جناب! میں آپ کا شکر گزار ہوں۔" اور پھر سب سے مصافحہ کرنے کے بعد وہ ایس پی گوہر علی کے ساتھ باہر نکل آیا۔ ایس پی صاحب نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"تو یہ سماجی خدمات انجام دے رہے ہیں آپ۔ ویسے ہی آپ کے سر پر یہ کیا کم ذمے داریاں تھیں کہ آپ ان جھگڑوں میں بھی پڑ گئے۔"

"نہیں ایس پی صاحب! دراصل شمشیر زماں کے خاندان سے میرے گہرے مراسم ہیں۔ اس خاندان کے مجھ پر بڑے احسانات ہیں۔ جنھیں میں ادا کرنا چاہتا ہوں۔"

"تب تو آپ گوہر علی کو بھی اس معاملے میں شریک ہی سمجھئے۔ میں ایسا کرتا ہوں کہ چند خاص لوگوں کو اپنے ساتھ لے لیتا ہوں۔ اسپیشل برانچ کے ایک انسپکٹر اور چار آدمی میرے ساتھ جائیں گے۔"

"ٹھیک ہے۔" زاہد نے جواب دیا اور پھر اس کے بعد تقریباً دس ساڑھے دس بجے تک یہ تمام کارروائیاں ہوتی رہیں اور پھر وہ لوگ سادہ لباس میں اسٹیشن جا پہنچے۔ ٹرین کے ذریعے یہ سفر طے کرنا تھا۔

راستہ نہایت ہی خوشگوار ماحول میں طے ہوا۔ ایک بار پھر زاہد اُسی جگہ جا رہا تھا جہاں سے اُس نے یہاں کیلئے سفر کا آغاز کیا تھا اور جہاں پہلی بار اُسے شجاع احمد صاحب سے نیاز حاصل ہوا تھا۔

طویل سفر کے دوران میں انھیں اندازہ بھی نہیں ہو سکا تمام لوگ گھل مل گئے تھے۔ ان کے پاس بس پولیس کے کاغذات موجود تھے اور ایسے شناختی نشانات جن کے تحت وہ یہ تمام کارروائی کر سکتے تھے۔ اس کے علاوہ، انھوں نے اور کوئی لباس وغیرہ ساتھ نہیں لیا تھا۔ چنانچہ جب یہ لوگ ٹرین سے اترے تو کسی نے بھی انھیں خاص طور پر محسوس نہیں کیا تھا۔

گوہر علی صاحب ان سب کے ساتھ، سب سے پہلے علاقے کے تھانیدار سے ملے۔ تھانیدار اپنے آفس میں بیٹھا خوش گپیوں میں مصروف تھا۔ درمیانی عمر کا آدمی تھا اور علاقائی تھانیدار ہونے کی وجہ سے بڑے رعب دبدبے کا مالک تھا۔ سادہ لباس میں ملبوس ان لوگوں کو اس نے اجنبی نگاہوں سے دیکھا اور اپنے مخصوص انداز میں ان کے ساتھ پیش آیا لیکن جب گوہر علی صاحب نے اپنا شناختی کارڈ دکھایا تو وہ بوکھلا کر اس طرح اُٹھا کہ اس کی کرسی اُلٹ گئی۔ اُس نے وہیں سیلوٹ مارا لیکن اس کا گھٹنا میز میں لگا تھا اور اس سے خاصی زوردار آواز پیدا ہوئی تھی۔

"ارے بھئی بس ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔ بیٹھو اس تکلف کی ضرورت نہیں ہے۔"

"سس سر! میں اس کی معافی چاہتا ہوں۔ دراصل پہچان نہیں سکا تھا۔"

"کوئی بات نہیں ہے۔ میں دراصل یہاں ایک خاص سلسلے میں آپ کے پاس آیا ہوں۔ اس کے لئے تمھاری مدد کی ضرورت ہوگی۔"

"میں حاضر ہوں جناب! بدقسمتی سے مجھے آپ کی آمد کی اطلاع نہیں مل سکی۔"

"ٹھیک ہے کوئی بات نہیں ہے۔ ہم لوگ بھی اچانک ہی آئے ہیں۔"

"آپ لوگ تشریف رکھئے۔ اِدھر تشریف لے آیئے۔" اُس نے اپنی کرسی ایس۔ پی صاحب کو پیش کر دی اور ایس پی صاحب بڑی بے تکلفی سے اس پر بیٹھ گئے۔ تھانیدار ایک طرف کھڑا ہو گیا تھا۔

"بھئی بات دراصل یہ ہے کہ نواب شمشیر زماں کا نام تو تم اچھی طرح جانتے ہو گے؟"

"جی ہاں، جی ہاں، کیوں نہیں۔"

"تمھیں یہاں کے حالات کے بارے میں بھی تھوڑی بہت معلومات ہوگی؟"

"جی ہاں! کیوں نہیں۔" تھانیدار نے اُسی انداز میں جواب دیا۔

"توفیق نامی کسی شخص کو جانتے ہو؟"

"جی ہاں کیوں نہیں۔" تھانیدار بولا اور زاہد مسکرائے بغیر نہ رہ سکا۔ دوسرے لوگ بھی مسکرانے لگے۔

"معافی چاہتا ہوں جناب! دراصل آپ کی آمد اتنی غیر متوقع ہے کہ میں بوکھلا کر رہ گیا ہوں۔"

"میں کہہ چکا ہوں کوئی بات نہیں ہے۔ یہ بتاؤ کہ توفیق کو کیسے جانتے ہو؟"

"یہ صاحب ابھی تھوڑے دن پہلے ایس پی زمان صاحب کا تعارفی خط لے کر آئے تھے اور مجھ سے ایک خاص سلسلے میں مدد کی درخواست کی تھی۔"

"وہ خاص سلسلہ کیا تھا؟" ایس پی گوہر علی صاحب نے پوچھا۔

تھانیدار ہچکچا کر باقی لوگوں کی جانب دیکھنے لگا اور ایس پی صاحب بول پڑے۔ "ان سب کا تعلق محکمہ پولیس سے ہے۔ اس لئے اس کی فکر مت کرو۔"

"وہ جناب... وہ... دراصل توفیق صاحب کا کہنا ہے کہ انھوں نے نواب شمشیر زماں کی جائیداد خرید رکھی ہے۔ یہ اُن کی زندگی میں ہی ہوا تھا لیکن اتنے عرصے تک وہ صرف اس لئے خاموش رہے کہ اُن کی شمشیر زماں صاحب سے رشتے داری تھی اور شمشیر زماں کی بیوی اُن کی بیگم کی رشتہ کی بہن ہیں لیکن اب وہ اس تمام جائیداد کو حاصل کرنا چاہتے ہیں انھوں نے یہ بھی بتایا تھا کہ کچھ عرصہ قبل جب انھوں نے اس سلسلے میں کوشش کی تھی تو بیگم شمشیر زماں نے کچھ ایسے لوگوں سے انھیں زدوکوب کرایا تھا جو شمشیر زماں کے عزیز اور دوست تھے۔ اُس وقت وہ خاموش ہو گئے تھے۔ صرف اس لئے کہ خاندان کی بات کہیں باہر نہ پھیلے لیکن اب بقول اُن کے پانی سر سے اُونچا ہو چکا ہے۔ انھوں نے سرکاری طور پر بھی کچھ کارروائیاں کی ہیں جن کی تفصیلات میرے پاس درج ہیں اور آج کل وہ لوگ شمشیر زماں کی کوٹھی ہی میں مقیم ہیں۔"

"تھانیدار صاحب ایک سوال کروں گا۔ اتنی ہی بے تکلفی سے اس کا جواب دیجئے۔ جتنی بے تکلفی سے میں آپ سے پیش

آرہا ہوں۔ اگر آپ نے تکلف کرنے کی کوشش کی یا مجھ سے کچھ چھپایا تو پھر آپ یہ سمجھ لیجئے کہ میں ضابطے کی کوئی کارروائی کرنے کے لئے مجبور ہوں گا۔"

"فرمائیے۔۔۔ فرمائیے، جو کچھ حقیقت ہے وہ میں آپ کو ضرور بتادوں گا۔"

"توفیق صاحب نے آپ سے براہِ راست ملاقات کی ہے؟"

"جی ہاں! وہ ایس پی صاحب کا خط بھی لائے تھے۔ وہ خط میرے پاس موجود ہے۔"

"خط میں کیا لکھا تھا؟"

"یہی کہ توفیق صاحب شریف آدمی ہیں۔ ان کی جو کچھ بھی مدد ہو سکے کی جائے۔"

"تو آپ نے کیا مدد کی اُن کی؟"

"ابھی تک کوئی ضرورت پیش نہیں آئی۔ البتہ انھوں نے یہ کہا تھا کہ اگر کچھ بیرونی لوگ اس معاملے میں مداخلت کرنے کی کوشش کریں یا انھیں کوٹھی سے بے دخل کرنا چاہیں تو پھر پولیس کو ان کی مدد کرنا ہوگی۔"

"کیا اس سلسلے میں انھوں نے کچھ رقم بھی پیش کی تھی آپ کو؟"

"جی ہاں! جھوٹ نہیں بولوں گا۔ دس ہزار روپے دیئے ہیں انھوں نے مجھے۔" تھانیدار صاحب نے کہا۔

"کوئی ہرج نہیں ہے جو کچھ انھوں نے کیا ہے وہ اُن کا اپنا مسئلہ تھا۔ آپ نے ابھی تک شمشیر زماں کے اہلِ خاندان سے کوئی زیادتی تو نہیں کی۔ کسی قسم کی رپورٹ درج کرائی گئی ہے ان کی طرف سے؟"

"جی ہاں! یہ زیادتی مجھ سے ہوئی ہے۔ میں نے رپورٹ درج کرنے سے انکار کر دیا اور بیگم شمشیر زماں سے یہی کہا کہ چونکہ توفیق صاحب حق پر ہیں اور وہ ایسی دستاویزات ساتھ لائے ہیں جن کی وجہ سے پولیس ان کے معاملے میں مداخلت نہیں کر سکتی۔ اس لئے میں مجبور ہوں۔"

تھانیدار بہت صاف گو آدمی تھا اور چونکہ اپنے افسرِ اعلیٰ کے سامنے تھا۔ اس لئے جھوٹ بھی نہیں بول سکتا تھا سب ہی ایک دوسرے کی رگوں سے اچھی طرح واقف ہوتے ہیں۔

"ٹھیک ہے۔ اس کے علاوہ اور کچھ؟" ایس۔ پی گوہر علی نے پوچھا۔

"نہیں جناب! آپ یقین فرمائیے۔ اس سے زیادہ میں نے اور کچھ نہیں کیا۔ بیگم شمشیر زماں بس مایوس ہو کر چلی گئی تھیں۔"

"ٹھیک ہے۔ فی الحال تو آپ کی ضرورت نہیں ہے لیکن بہت جلد آپ کو تکلیف دی جائے گی۔ اب ذرا ہم توفیق صاحب سے ملاقات کر لیں۔"

"جیسا آپ مناسب سمجھیں۔ پولیس آپ سے ہر تعاون کے لئے تیار ہے۔"

"آپ اس سلسلے میں دس ہزار روپے حلال کرنے کی کوشش نہیں کریں گے۔ یعنی آپ لوگ توفیق صاحب سے ملاقات نہیں کریں گے۔"

"سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اب آپ اس مسئلے میں شامل ہو گئے ہیں تو پھر آپ کے زیرِ ہدایت ہی کام کروں گا۔" تھانیدار صاحب نے کہا اور ایس۔ پی گوہر علی نے گردن ہلادی۔ اس کے بعد وہ زاہد کی طرف رُخ کر کے بولے۔

"کیا خیال ہے زاہد میاں! چلیں اُن لوگوں سے ملاقات کر لی جائے۔"

"ٹھیک ہے۔ دیر کرنا مناسب نہیں ہوگا۔" زاہد نے جلدی سے کہا۔

اور وہ لوگ شمشیر زماں کی کوٹھی کی جانب چل پڑے۔

✤ توفیق صاحب، شمشیر زماں کے گھر سے بے عزت ہو کر نکلے تھے اور اس دن سے آج تک تلملاتے رہے تھے۔ یہ لمحہ موقع حاصل ہوا تھا دولت پانے کا ہر طرح سے کام نکالنے کی کوشش کی تھی لیکن انھیں اندازہ ہو چکا تھا کہ نشاط اس گھر میں سب سے زیادہ شاطر لڑکی ہے اور اگر اُسے سنبھال لیا جائے تو پھر کام مشکل نہیں ہوگا۔ جو کچھ ان پر بیتی تھی وہ بہت زیادہ تھی لیکن اس کے لئے انھوں نے طویل انتظار کر لیا تھا۔

اس کے ساتھ ساتھ ہی وہ دوسری کارروائیوں میں بھی مصروف رہے تھے۔ شاہدہ بیگم سے ان کے مشورے جاری رہتے تھے۔ شاہدہ بیگم کو بیگم شمشیر زماں سے کوئی ہمدردی نہیں تھی ویسے وہ کوئی قریبی رشتے دار نہیں تھے اور پھر فاصلے بھی زیادہ رہے تھے۔ اس لئے ذہنی قربت کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا ہاں یہ سوچ کر ان کے گھر گئی تھیں کہ اب میدان خالی ہے رفیق اور شفیق کو بیگم شمشیر زماں کا داماد بنانے کے بعد بھلا کیا رہ جاتا ہے ساری دولت و جائیداد ان کی ہوگی۔ ایک بیٹی رہ جائے گی جس کے لئے کہیں باہر سے داماد خرید لیا جائے گا لیکن یہ اُس وقت ہوگا جب وہ مستقل طور پر شمشیر زماں کی دولت پر

قابو پالیں گی لیکن وہاں پہنچ کر صورتحال ہی الٹ گئی تھی اور انھیں وہاں سے نکلنا پڑا تھا۔

اس کے بعد توفیق صاحب اپنی کارروائیوں میں مصروف رہے تھے۔ انھوں نے دل میں ہار نہیں مانی تھی البتہ انھیں ایک طویل انتظار کرنا پڑا اور جب انھیں علم ہوا کہ شمشیر زماں کا وہ سب سے بڑا ہمدرد انتقال کر گیا ہے۔ تب ان کی خوشی کا ٹھکانہ نہ رہا۔ اس ہمدرد کی وجہ سے انھیں ہار ماننا پڑی تھی۔ اب وہ بھی نہ رہا تھا تو انھوں نے سوچا کہ اب دیکھوں گا کہ بیگم شمشیر زماں میرے خلاف کیا کر پاتی ہیں۔

وہ اپنی سی کوششوں میں مصروف رہے جتنا جمع جتھا تھا سب خرچ کر دیا۔ ایک ایس پی سے دوستی کی راہیں ہموار کیں اور اس کے بعد شمشیر زماں کے علاقے کے تھانیدار کے لئے ایک خطلے کر وہاں پہنچ گئے۔ دستاویزات کی تیاری میں بھی انھوں نے بڑی ذہانت سے کام لیا تھا اور ایسے ماہر شاطروں کا تعاون حاصل کیا تھا جو دستخط بنانے میں اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے۔

چنانچہ تمام دستاویزات جعلی تھیں۔ جاننے والے اور دیکھنے والے جو توفیق کو جانتے تھے فوراً یہ بات کہہ سکتے تھے کہ توفیق کے پاس تو ایک جھونپڑی خریدنے کے لئے رقم نہیں ہے وہ بھلا شمشیر زماں کی جائیداد کیسے خریدیں گے لیکن جو کچھ توفیق صاحب نے کیا تھا وہ بہت موثر تھا اور اس کی موجودگی میں کسی کو دم مارنے کی اجازت نہیں تھی بشرطیکہ یہ صورتحال کامیاب ہو جاتے اور اب توفیق صاحب کی دانست میں کوئی ایسی چیز نہیں رہی تھی جو ان کی راہ میں رکاوٹ بنے۔

چنانچہ بڑی تیاریوں کے بعد ایک بار پھر وہ شمشیر زماں کی کوٹھی میں داخل ہوئے تھے۔ بیگم صاحبہ نے ناگوار انداز میں ان کا استقبال کیا توفیق صاحب جانتے تھے کہ انھیں کوئی بھی اچھی نگاہ سے نہیں دیکھے گا لیکن سب کچھ سوچ سمجھ کر ہی آئے تھے۔ مہرالنسا بیگم سے بولے۔

"آپ کو ہماری آمد ناگوار تو گزری ہوگی۔ مہرالنسا بہن لیکن تکلف کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔ ہم تو پچھلی بار یہی سوچ کر آئے تھے کہ چلو گھر کے معاملات گھر ہی میں نمٹا لیتے ہیں لیکن آپ نے جو کچھ کیا آپ خود اس کے بارے میں اچھی طرح جانتی ہیں۔"

"جو کچھ ہوا یا جو کچھ کیا گیا وہ درست تھا بھائی صاحب آپ نے بھی تو ہم پر زیادتیوں کی انتہا کر دی تھی۔"

"زیادتی کیسی؟ یہ تمہارے بچے تھے میں نے سوچا گھر کی لڑکیاں گھر ہی میں رہیں گی۔ کوئی باہر کا مسئلہ نہیں بن سکے گا لیکن تم نے ہمیں اس قابل ہی نہ سمجھا۔"

"آپ اس قابل تھے بھی نہیں۔ بھائی صاحب معاف کیجئے گا۔ مجھے آپ کا یہاں آنا پسند نہیں ہے لیکن اب یہ بھی نہیں ہو سکتا کہ میں آپ کو ہاتھ پکڑ کے باہر نکال دوں۔"

"بی بی مہرالنسا! یہ اخلاقاً نہیں بلکہ قانوناً بھی نہیں ہو سکتا سمجھیں آپ۔ بہتر یہ ہوگا کہ ہمارے لئے مناسب قیام گاہ کا بندوبست کیجئے۔"

"اور اگر میں آپ سے یہ کہوں کہ میں یہاں آپ کا رہنا پسند نہیں کرتی تو۔ . . ؟"

"تو ہمیں اس بات پر افسوس نہیں ہوگا چونکہ ہم جانتے ہیں لیکن اس با[ت] پر افسوس ضرور ہوگا تو تمہارے کہنے سے یہ بات نہیں ہو سکتی۔"

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ ہم یہاں قانوناً رہنے کا حق رکھتے ہیں سمجھیں۔ چلو بیگم اپنے لئے جگہ کا انتخاب کرو اور یہاں قیام کرو۔"

مہرالنسا بیگم تلملا کر رہ گئی تھیں۔ ہر چند کہ یہاں ملازم بھی تھے اور ان کا اپنا ایک مقام بھی تھا لیکن بالآخر عورت تھیں۔ توفیق صاحب کا لہجہ اچھا نہیں تھا۔ چنانچہ کسی حد تک خوفزدہ بھی ہو گئی تھیں۔ صوفیہ اور نزہت بے چاری لڑکیاں تھیں۔ خالص گھریلو قسم کی لڑکیاں۔ بس ایک نشاط تھی جو حالات سے نمٹنا جانتی تھی اور ہر قسم کے معاملات کو فیس کر سکتی تھی لیکن وہ شہر میں بغرض تعلیم گئی ہوئی تھی۔ چنانچہ خاموش ہو گئیں لیکن ذہن شدید تردد کا شکار ہو گیا تھا۔

شاہدہ بیگم اس بار بہن سے مروت کرنے نہیں آئی تھیں شوہر کی سازش میں برابر کی شریک تھیں چنانچہ انھوں نے تین کمروں پر قبضہ جما لیا۔ یہ کمرے اوپری منزل پر تھے اور سب سے عمدہ تھے۔ ان میں سے ایک کمرہ نزہت اور صوفیہ کا تھا۔ رفیق اور شفیق نے ان کا سامان نکال کر باہر رکھ دیا۔ سب لوگ بڑے پریشان ہو گئے تھے۔ مہرالنسا امداد علی پھوپھا کے پاس پہنچ گئیں۔ امداد علی پھوپھا خود بھی حالات کا رنگ دیکھ چکے تھے۔ مہرالنسا کو دیکھ کر بولے۔

"کیا بات ہے مہرالنسا بہن؟ یہ لوگ پھر کیوں آ گئے؟"

"اس بار تو بس یوں لگتا ہے جیسے وہ غنڈہ گردی کرنے آئے ہیں۔"

"افسوس کہ خان صاحب اب اس دُنیا میں نہیں ہیں۔ اب کیا کیا جائے؟"

"کیا کیا جائے گا۔ ہم پولیس کی مدد لیں گے۔ آخر یہ کوئی تک ہے کہ کوئی ہمارے گھر میں آکر گھس بیٹھے۔"

"میرا خیال ہے کہ معاملہ پولیس تک پہنچانے سے پہلے کوشش یہ کی جائے کہ توفیق صاحب کو ہم ایک بار پھر سمجھالیں۔"

"میرا اپنا اندازہ ہے کہ اس بار وہ سمجھنے کے لئے نہیں آئے بلکہ اس بار وہ کچھ کرنا ہی چاہتے ہیں۔"

"خیر اب ایسی بات بھی نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمارا بھی مددگار ہے۔"

"آپ ایک کام تو کیجئے۔ نشاط کو فوراً خط لکھ دیجئے، اور اس سے کہئے کہ وہ یہاں آجائے۔ تمام حالات لکھ دیجئے گا۔"

"میں خاموشی سے یہ کام کرلوں گا۔" امداد علی صاحب نے کہا اور انھوں نے فوری طور پر نشاط کو ایک خط لکھ کر پوسٹ کردیا۔

توفیق صاحب بڑے کروفر سے پُوری حویلی میں دندناتے پھر رہے تھے۔ انھوں نے سب سے پہلے حویلی میں رہنے والے تمام لوگوں کو ایک جگہ جمع کیا اور پھر انھوں نے ان کے سامنے ایک تقریر کی۔

"دیکھو! میں بے وقوف آدمی نہیں ہوں شمشیر زماں بھائی سے میرے جیسے تعلقات تھے۔ شاید آپ لوگوں کو ان کا علم نہ ہو۔ ہمارے اور ان کے درمیان بہت سی باتیں خفیہ تھیں۔ جن کے بارے میں ہمارے درمیان معاہدہ تھا کہ کسی دوسرے کو نہ بتائی جائیں لیکن اب وہ اس دُنیا میں نہیں ہیں اس لئے مجھے مجبوراً انکشاف کرنا پڑ رہا ہے۔ آپ تمام لوگوں کو معلوم ہے کہ اس سے پہلے میں آیا تھا اور میں نے کوشش کی تھی کہ رفیق اور شفیق کی شادی شمشیر زماں کی بیٹیوں سے کرکے اپنا فرض پورا کردوں لیکن مہرالنسا نے مجھے انتہائی ذلیل و خوار کرکے یہاں سے نکلوا دیا۔ میں اس دوران تلملاتا رہا تھا۔ وہ سب کچھ نہیں کرنا چاہتا تھا جس کے لئے مجھے شمشیر زماں نے منع کیا تھا، لیکن اب مجبوری ہے میں آپ لوگوں کو بتادینا چاہتا ہوں کہ یہ جائیداد جو شمشیر زماں کی ہے آدھی سے زیادہ میری ملکیت میں ہے۔ شمشیر زماں بھائی کو ایک شوق تھا۔ مرحوم کے اس راز کو افشا کرکے میں گناہ نہیں کرنا چاہتا۔ اس شوق کے ہاتھوں بڑی بڑی رقمیں ضائع کرتے رہے ہیں اور میں نے ان رقموں کو بڑی مشکل سے مہیا کیا تھا۔ مختلف لوگوں سے قرضے لے کر، مختلف لوگوں سے اُدھار لے کر۔ یہ قرض شمشیر زماں ادا نہیں کرسکے۔ میں اپنی کمائی میں سے وہ ساری رقمیں ادا کرتا رہا۔ اور اس طرح وہ کاغذات میری دسترس میں آگئے چنانچہ اب میں اتنے عرصے سے اس جائیداد کا مالک ہوں۔ بات بہت پرانی ہے۔ میں نے یہ سوچ کر خاموشی اختیار کرلی تھی کہ اپنا ہی گھر ہے اس گھر کی عزت اُچھالنے سے کیا فائدہ لیکن صورتحال اب یہ ہے کہ میں اس جائیداد کو اب اپنے تصرف میں لانا چاہتا ہوں۔ میری بھی اولادیں ہیں۔ میں بھی ان کی بہتری کے لئے سوچنا چاہتا ہوں۔ تقریباً آدھی سے زیادہ جائیداد میری اپنی ہے اور اس کے سلسلے میں جس قدر آمدنی ہوئی ہے۔ میں اس میں سے پائی پائی کا حساب کرکے مہرالنسا بیگم سے وصول کرلوں گا۔ آپ لوگوں کو چاہیئے کہ مجھ سے تعاون کریں۔ جس کو آسانیاں اور مراعات یہاں سے حاصل ہیں۔ میں نہیں چاہتا کہ اُسے در بدر کردوں۔ جو کچھ ہے اس طرح ملتا رہے گا لیکن شرط یہی ہے کہ مجھ سے تعاون کیا جائے۔"

سب لوگ یہ سُن کر حیران رہ گئے تھے۔ امداد علی پھوپھا خاموشی اختیار کرگئے تھے لیکن بہرطور انھوں نے دل سے یہ بات تسلیم نہیں کی تھی۔ شمشیر زماں پر جو کیچڑ توفیق صاحب اچھال رہے تھے وہ ان کی کمینگی تھی۔ اس سے زیادہ کچھ نہیں۔

بہرطور کارروائیاں جاری رہیں۔ توفیق صاحب مکمل بندوبست کرکے آئے تھے۔ چنانچہ تین چار دن کے بعد دو غنڈے قسم کے آدمی یہاں پہنچ گئے اور انھوں نے حویلی کے بیرونی دروازے کا نظام سنبھال لیا۔ اب یہاں سے کسی شخص کو باہر نکلنے کی اجازت نہیں تھی۔ جو بھی نکلتا وہ یہ بتا کر جاتا کہ وہ کہاں جارہا ہے۔

بیگم شمشیر زماں کے ہاتھوں کے طوطے اُڑتے جارہے تھے

انھیں بہت خوف محسوس ہو رہا تھا۔ دو بیٹیاں ساتھ تھیں
نشاط شہر میں تھی۔ یہ بھی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کریں۔ اب تو
کسی ہمدرد پہ نگاہ ڈالتیں تو کوئی تصور بھی ذہن میں نہ آتا۔
کون تھا؟

بالآخر نشاط پہنچ گئی نشاط نے یہاں آکر حالات دیکھے جو
صورتحال اس نے دیکھی۔ وہ انتہائی خوفناک تھی۔ وہ بھی
اس بار بوکھلا کر رہ گئی تھی۔ کوئی بات سمجھ میں نہیں آ رہی
تھی کہ کیا کرے۔ بہر طور اس نے بیگم شمشیر زماں کو ایک بہانے
سے پولیس اسٹیشن بھیجا لیکن وہاں پہنچ کر بیگم شمشیر زماں کو
پتہ چلا کہ توفیق صاحب یہاں بھی اپنی کارروائی مکمل کر چکے
ہیں۔ تھانیدار نے توفیق صاحب کے خلاف کارروائی کرنے
سے انکار کر دیا تھا۔ بیگم شمشیر زماں کے پاس کوئی ایسی ترکیب
نہیں رہ گئی تھی کہ وہ مصیبت سے نمٹ سکیں۔ کونے میں بیٹھی
آنسو بہایا کرتی تھیں۔ شاہدہ بیگم تھیں کہ گھر کی مالک بن بیٹھی
تھیں۔ رفیق اور شفیق پوری حویلی میں دندناتے پھرتے تھے
اور ان دو ساتھی غنڈوں کے ساتھ مل کر خوب عیش کر رہے
تھے۔ حویلی کی فضا میں تبدیلی ہوتی جا رہی تھی۔ رفیق نے ایک دن
نشاط کے پاس پہنچ کر کہا۔

"نشاط بی بی! ہم تمھارے بہت قریبی عزیز ہیں لیکن صرف
بدنصیبی ہے ہماری یا تمھاری کہ تم نے وہ قربت ہمیں نہ دی
جس کے ہم حقدار تھے۔"

"کیا کہنا چاہتے ہیں آپ رفیق بھائی؟"

"یہی کہ اتی ابو نے جو کچھ کہا تھا اگر آپ لوگ اسے مان
لیتیں تو آج یہ نوبت نہ آتی۔"

"یعنی آپ سے ہم لوگوں کی شادی؟"

"ہاں! کیا حرج تھا۔ کیا برائی ہے ہم میں۔ بہترین زندگی
فراہم کر سکتے ہیں ہم تمھیں۔"

"رفیق بھائی وقت کا انتظار کیجیے۔ بہترین زندگی تو میں
آپ کو فراہم کروں گی۔"

رفیق نے ایک قہقہہ لگایا اور بولا۔ "بی بی! وہ وقت گزر
گیا جب تم لوگ غنڈہ گردی کرتی تھیں۔ آج ہمارا وقت ہے
دیکھو آنے والا وقت کیا کہتا ہے۔"

"آنے والا وقت جب کچھ کہے گا تو ہم سن لیں گے۔ فی الحال
آپ یہاں سے فوراً دفع ہو جائیے۔"

"بکواس مت کرو نشاط۔ تم جانتی ہو کہ تم ہمارے ہاں مہمان
کی حیثیت سے رہ رہی ہو۔ تم لوگوں نے بہت عرصہ ہماری اس
جائیداد پر عیش کیا ہے۔ اب ہمارا وقت ہے اور اگر چاہوں تو
کان سے پکڑ کر تمھیں باہر نکال دوں اور نوکروں کے کوارٹروں
میں پہنچا دوں سمجھیں۔ تم اس لیے ہوش و حواس میں رہ کر
بات کیا کرو۔"

نشاط خون کے گھونٹ پی کر رہ گئی۔ یہاں کی صورت حال
دیکھ چکی تھی اس لیے کوئی بات سمجھ میں نہیں آتی تھی کہ کیا کرے
اس بار وہ بھی کوئی موثر کارروائی کرنے میں ناکام رہی تھی
اب تو کوئی غیبی مدد ہی ہو سکتی تھی جو ان لوگوں کو پہنچتی۔
بظاہر تو اب کسی سے مدد کی نہیں کر سکتی تھی۔ حالات
یونہی گزر رہے تھے۔ ذہن میں رہ رہ کر کبھی کبھی جوار بھاٹا
سا اٹھتا اور ایک شکل نگاہوں میں گھوم جاتی لیکن وہ دل
مسوس کر رہ جاتی۔ یہ لوگ اس قابل نہیں تھے کہ ظفر کی امداد
حاصل کر سکتے۔ ظفر کے ساتھ جو کچھ یہاں کیا گیا تھا وہ بہت تھا
اور نشاط کسی قیمت پر بھی زاہد سے یہ نہیں کہہ سکتی تھی کہ زاہد
یا ظفر اس کی مدد کرے۔

چنانچہ اس نے اس سلسلے میں زاہد سے رابطہ قائم کرنے
کی کوشش بھی نہیں کی تھی۔ وہ صبح ہمیشہ کی مانند اداس اور
غمگین سی تھی۔ نشاط ایک کھڑکی میں بیٹھی ہوئی حسرت بھری
نگاہوں سے باہر کے مناظر دیکھ رہی تھی کہ دفعتاً اسے گیٹ
پر کچھ لوگ نظر آئے۔ وہ دونوں غنڈے جو توفیق، رفیق اور
شفیق کے ہمدرد تھے گیٹ پر کھڑے تھے۔ آنے والے تعداد میں
کئی تھے۔ پتہ نہیں کس بات پر تکرار ہو رہی تھی اور اس کے بعد
دفعتاً دھینگا مشتی شروع ہو گئی۔ تین چار آدمیوں نے ڈنڈوں
سے ان غنڈوں پر حملہ شروع کر دیا اور نشاط اچھل کر کھڑی
ہو گئی۔ وہ ان غنڈوں کو مارتے ہوئے اندر لے آئے تھے اور
اس کے بعد انھوں نے انھیں ایک جگہ بٹھا دیا۔ چونکہ وہ
آدمی کئی تھے اس لیے غنڈوں کی ان کے آگے نہیں چل
سکی تھی اور پھر تھے بھی وہ قد آور قسم کے لوگ، چنانچہ غنڈوں
کو مار پیٹ کر ایک جگہ بٹھایا گیا اور اس کے بعد نشاط نے ایک اور
حیرت انگیز منظر دیکھا۔ انھوں نے غنڈوں کے ہاتھ پشت پر کس
دیئے تھے۔ یہ کون لوگ ہیں۔ نشاط نے پریشان کن انداز میں
سوچا۔ پھر وہ لوگ کچھ اور آگے آئے۔ گیٹ پر دو آدمی کھڑے
ہو گئے تھے۔ باقی لوگ آگے آ گئے تھے۔ تب دفعتاً نشاط کا دل
دھڑک کر ایک لمحے کے لیے حلق میں آ گیا۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے

اُس شخص کو دیکھ رہی تھی۔ یہ زاہد ہی تھا۔ ہاں یہ زاہد ہی تھا۔ اُسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آرہا تھا۔ زاہد یہاں کیسے پہنچ گیا۔ یہ سب کچھ، یہ سب کچھ کیسے ہُوا اور... اور دوسرے لمحے اس کے وجود سے خوشیاں پھُوٹنے لگیں۔ کیا زاہد کو تمام تفصیل معلوم ہوگئی؟ کیا اُسے نشاط کی پریشانیوں کا علم ہوگیا؟ کہیں یہ سب خواب تو نہیں ہے۔ وہ پاگلوں کی طرح دیکھتی رہی۔ اس دوران میں شاید اندر ان حالات کی اطلاع پہنچ چکی تھی۔ توفیق صاحب شفیق، رفیق باہر نکل آئے۔ نشاط نے جلدی سے اپنی جگہ چھوڑ دی اور دوڑتی ہوئی نیچے آگئی۔ مہرالنساء بیگم نزہت یا صُوفیہ کو ابھی اس بارے میں کچھ نہیں معلوم تھا۔ وہ پاگلوں کی طرح دوڑتی ہوئی مہرالنساء بیگم کے کمرے میں داخل ہوگئی۔ مہرالنساء بیگم بے چاری ان دنوں شدید خوف و ہراس کا شکار تھیں ان کی حالت کافی بگڑ گئی تھی۔ بھیانک مستقبل مُنہ کھولے ان کے سامنے کھڑا تھا۔ مایوسیوں کے اندھیروں میں ڈوبی ہوئی تھیں۔ کوئی ہمدرد کوئی غمگسار نظر نہیں آتا تھا۔ حویلی میں جو لوگ موجود تھے وہ سب سیدھے سادھے لوگ تھے۔ امداد علی پھُوپھا جان دے سکتے تھے ان کے لئے لیکن قانونی طور پر توفیق صاحب کو نہیں روک سکتے تھے۔ اس سلسلے میں ہر طرح کی گفتگو ہو چکی تھی اور انھوں نے کہا تھا کہ زندگی بھر اُنھوں نے کبھی کسی کو نقصان نہیں پہنچایا۔ لیکن اگر شمشیر زماں کا نمک حلال کرنے کی ضرورت پیش آئی تو وہ توفیق کو قتل کر کے اپنی جان دینے کے لئے تیار ہیں لیکن یہ قتل و غارت گری بھی بیگم مہرالنساء کے لئے نقصان دہ تھی۔ اب ان کے ذہن میں بار بار ایک ہی خیال گردش کرتا رہتا تھا۔ وہ یہ کہ یہ سب کچھ انھیں چھوڑنا پڑے گا۔ کسمپرسی کی زندگی گزارنی پڑے گی۔ ممکن ہے حویلی بھی چھوڑنی پڑ جائے اور ان حالات میں چھوڑنی ہی پڑتی کیونکہ شفیق کے تیور خاصے خراب نظر آتے تھے۔ عزت خطرے میں پڑ گئی تھی۔ نزہت اور صوفیہ معصوم صفت تھیں۔ گو نشاط ان کے چنگل میں آنے والی نہیں تھی لیکن ان دونوں لڑکیوں کے زرد چہرے دیکھ کر بیگم مہرالنساء یہی سوچتی تھیں کہ تقدیر میں جو کچھ لکھا ہے وہ قبول کرنا ہی ہوگا۔ کم از کم بچیوں کو ان مصیبتوں سے تو نجات دلائی جائے کیا کریں؟ کیا نہ کریں؟ کوئی بات جو ذہن میں آتی ہو... ہمدردوں سے مایوس ہوگئی تھیں اور ہمدرد تھا بھی کون: ان حالات میں بار ہا انھیں وہ معصوم عورت یاد آئی تھی جسے شمشیر زماں بے یار و مددگار سمجھ کر یہاں لے آئے تھے اور یہاں بیگم مہرالنساء نے اس پر عرصۂ حیات تنگ کر دیا تھا۔ ہمیشہ ہی وہ اس گونگی اور معصوم عورت کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتی رہی تھیں۔ آخر آہوں کا اثر رنگ لاکر رہتا ہے ضمیر ہی سب سے بڑا محاسب ہوتا ہے۔ ضمیر نے ہمیشہ انھیں اس بات پر ٹوکا تھا کہ کسی مظلوم اور بے سہارا پر ظلم کرنا اچھا نہیں ہوتا لیکن حسد اور جلن ایسی خطرناک چیزیں ہیں کہ انسان کو عقل و خرد سے بیگانہ کر دیتی ہیں۔ پتہ نہیں کیوں ان دنوں انھیں وہ بہت یاد آتی تھی اس وقت نشاط کو اس بُری طرح دوڑتے دیکھا تو ہول کر رہ گئیں۔ چہرے پر خوف کے آثار سمٹ آئے۔ وہ بڑی سہمی ہُوئی آواز میں بولیں۔

"کیا ہُوا؟ کیا بات ہے نشاط؟"

"امّی جلدی آیئے۔ جلدی اُٹھیئے پلیز جلدی آیئے" نشاط نے ان کا بازو پکڑ کر کہا۔

"میری ٹانگوں میں جان نہیں ہے بیٹی۔ خُدا کے لئے بتاؤ تو سہی کیا ہوگیا ہے۔ سب خیریت تو ہے نا؟"

"ہاں! امّی کچھ زیادہ ہی خیریت ہے۔ آپ جلدی سے باہر تو آیئے۔"

"آہ۔ مجھ سے تو کھڑا بھی نہیں ہُوا جا رہا۔"

"سنبھالئے امّی سنبھالئے خود کو۔ خوشخبری ہے کوئی بُری خبر نہیں ہے۔"

"خوشخبری اور ہماری اس حویلی میں۔ کیا خوشخبری ہے؟"

"اُفوہ! آپ دیر کئے دے رہی ہیں۔ ذرا چل کر باہر کا منظر تو دیکھئے" نشاط نے کہا۔ مہرالنساء بیگم ہانپتی کانپتی اُٹھیں اور لڑکھڑاتے قدموں سے نشاط کے ساتھ باہر نکل آئیں۔ نزہت اور صُوفیہ بھی غالباً بھاگ دوڑ کی آواز سُن کر اپنے کمروں سے باہر نکل آئی تھیں اور نشاط کی رہنمائی میں باہر پہنچ گئیں۔

"یہ باہر اچھا خاصا تماشہ ہو رہا تھا توفیق صاحب آنکھیں نکالے کمر پر ہاتھ رکھے کہہ رہے تھے۔

"کیا غنڈہ گردی شروع کی ہے آپ لوگوں نے مجھے نہیں جانتے آپ۔ میرا نام توفیق ہے۔ اس علاقے کا سب سے بڑا آدمی ہوں۔ یہ تمام جائیداد، یہ حویلی میری ہے۔ میں شمشیر زماں کا جانشین ہُوں۔ کسی کی مجال نہیں ہوئی تھی آج تک کہ یہاں اُونچی آواز میں بولے۔ یہ آپ لوگوں نے کیا چکر چلا رکھا ہے آپ جانتے ہیں میرے اختیارات کتنے وسیع ہیں۔ میں آپ سب کو پولیس کے حوالے کر دُوں گا اور اس کے بعد آپ کو اپنی ضمانت کرانا مشکل ہو جائے گی۔ چھوڑ دیجئے ان لوگوں کو چھوڑ دیجئے۔"

وہ اپنے پالے ہوئے غنڈوں کے متعلق کہہ رہے تھے۔ ایس پی صاحب نے آگے بڑھ کر بڑے پُر احترام انداز میں کہا۔

"محترم! آپ توفیق صاحب ہیں؟"

"جی ہاں! مجھے ہی توفیق کہتے ہیں اور یہ میرے بیٹے رفیق اور شفیق ہیں۔"

"پُوچھ سکتا ہُوں آپ اس حویلی میں کیا کر رہے ہیں؟"

"کیا مطلب ہے تمھارا؟ میں اس حویلی کا مالک ہُوں!"

"لیکن ہم نے تو سُنا تھا کہ یہ حویلی شمشیر زماں کی ہے؟"

"ہے نہیں تھی۔ میں نے یہ تمام جائیداد خرید لی ہے۔"

"بیگم شمشیر زماں کہاں ہیں؟" ایس۔ پی صاحب نے پُوچھا۔

"وہ آگئیں پُوچھ لیجئے ان سے۔ تشریف لائیے بیگم صاحبہ ذرا ان حضرات کو بتلائیے کہ میں کون ہُوں اور میرا خیال ہے یہ غنڈے آپ ہی نے بلوائے ہیں۔ سبحان اللہ شمشیر زماں کی بیگم ان معاملات میں کافی آگے بڑھی ہوئی ہیں لیکن کیا سمجھتی ہیں آپ مجھے۔ ان معمولی غنڈوں سے ڈر جاؤں گا۔ رفیق جاؤ پولیس کو ٹیلی فون کرو اور پولیس سے کہو کہ چند غنڈے حویلی میں گھس آئے ہیں اور غنڈہ گردی کر رہے ہیں۔"

رفیق واپس پلٹ گیا۔ وہ دونوں غنڈے جواب ان لوگوں کے ہاتھوں بے بس ہو گئے تھے۔ اب ایک طرف کھڑے ہوئے تھے توفیق صاحب آگے بڑھ کر بولے۔

"انھیں کھول دیجئے ورنہ اچھا نہیں ہوگا۔"

"اب پولیس تو آ ہی رہی ہے بہتر ہے کہ وہی انھیں آکر کھولے اور ہمیں ان کی جگہ گرفتار کرے۔" گوہر علی صاحب نے کہا رفیق شاید اندر ٹیلی فون کرنے چلا گیا تھا۔ کسی نے اُسے نہ روکا تھوڑی دیر کے بعد وہ فون کر کے واپس آگیا۔

"پولیس ابھی پہنچ رہی ہے۔" اُس نے جواب دیا۔

"میں آپ لوگوں سے پھر کہتا ہوں کہ مجھ سے ٹکرانے کی کوشش مت کیجئے ورنہ نقصان اُٹھائیں گے۔ بیگم مہر النسا خاموشی سے یہ تماشہ دیکھ رہی تھیں۔ ان کا بدن تھر تھر کانپ رہا تھا لیکن پھر ان کی نگاہ زاہد پر پڑی اور وہ کسی حد تک چونک پڑیں۔ زاہد کی شکل ان کی نگاہ میں تھی۔ حالانکہ جوان ہونے کے بعد انھوں نے صرف ایک بار ہی زاہد کو دیکھا تھا لیکن جو کچھ انھوں نے زاہد سے کہا تھا اور جو زاہد نے ان سے کہا تھا وہ انھیں آج تک یاد تھا اس کے علاوہ زاہد کی شکل و صُورت خاصی حد تک ان کے ذہن میں یوں بھی تھی کہ وہ اس بُرے وقت میں اس نوجوان لڑکے کے بارے میں سوچتی رہی تھیں جو اپنی ماں کی تلاش میں یہاں آیا تھا اور بیگم صاحبہ کے ہاتھوں ذلیل و خوار ہو کر باہر نکلا تھا انھوں نے آہستہ سے نشاط سے کہا۔

"نشاط! وہ... وہ لڑکا کون ہے۔ اسے پہچانتی ہو میری آنکھیں دھوکا تو نہیں کھا رہیں؟"

"نہیں امّی! وہ ظفر ہی ہے۔"

"تت... تو کیا... کیا یہ بھی توفیق صاحب کے ساتھ شامل ہو گیا ہے۔ آہ... ہمارے دُشمنوں کا گروہ روز بروز بڑھتا ہی جا رہا ہے۔"

"امّی وہ دشمن نہیں ہے۔ وہ دوست بن کر یہاں آیا ہے۔ آپ نے دیکھا نہیں۔ وہ ان لوگوں کے ساتھ ہے۔ جنھوں نے توفیق خالو کے غنڈوں کو پکڑ کر باندھ دیا ہے۔"

"مم... مگر کیوں۔ یہ یہاں کیوں آیا ہے؟"

"اگر آپ اجازت دیں تو میں بات کروں اس سے؟"

"پُوچھو... پُوچھو۔ میری تو ہمت نہیں ہے اس کے سامنے جانے کی۔ سچی بات یہ ہے کہ میں اس سے شرمسار بھی ہُوں۔"

نشاط چند قدم آگے بڑھ آئی تھی۔ توفیق صاحب اُسے دیکھ کر غرّائے۔

"اے لڑکی! اندر جاؤ۔ لڑکیوں کا ان ہنگاموں سے کیا تعلّق ہے؟"

"کس حیثیت سے آپ یہ حکم دے رہے ہیں خالو جان؟" نشاط بولی۔

"کیا تمھارا مجھے خالو جان کہنا کافی نہیں ہے؟" توفیق صاحب نے کہا۔

"جی ہاں! یہ کافی نہیں ہے کیونکہ آپ جس قسم کے خالو جان ہیں وہ ہم سب لوگ بخوبی جانتے ہیں۔ آپ ہماری دولت ہماری جائیداد ہڑپ کرنے آئے ہیں اور ہم آپ کا بزرگوں کی حیثیت سے احترام کریں۔"

"ٹانگیں توڑ دوں گا اگر برآمدے سے نیچے قدم رکھا تو۔" توفیق صاحب غرّائے۔

"سبحان اللہ! یہ جملے تو کبھی ہمارے والد بزرگوار مرحوم نے بھی نہیں کہے تھے۔" نشاط نیچے اُتر کر زاہد کے پاس پہنچ گئی۔ زاہد عجیب سی نگاہوں سے اُسے دیکھ رہا تھا۔ نشاط اس کے بالکل نزدیک پہنچی تو اُس نے مُسکرا کر کہا۔

"ہیلو نشاط! کیسی ہیں؟"

"گویا میرا اندازہ غلط نہیں تھا۔ آپ زاہد کے ہم شکل نہیں بلکہ زاہد ہیں؟"

"ظفر ہوں میں۔" زاہد نے مسکراتے ہوئے آہستہ سے کہا۔

"خدا کا احسان ہے۔ آج آپ نے خود ہی اپنے نام کی تصحیح کر دی ہے۔ آخر یہ سب کچھ کیا ہے؟ ہم سب بُری طرح پریشان ہیں؟"

"آپ نے تو نشاط... ذرا اِدھر آیئے۔ پلیز اِدھر آیئے۔" زاہد نے نشاط سے کہا اور اُسے ان لوگوں سے ہٹا کر تھوڑے فاصلے پر لے گیا۔

"جی!"

"آپ نے تو ظفر کو غیر سمجھا۔ اپنا دشمن سمجھا اور اُسے کچھ بتائے بغیر یہاں چلی آئیں۔ آپ کیا سمجھیں ہم اتنے ہی کم ظرف، اتنے گرے ہوئے تھے کہ آپ کی کسی بھی پریشانی میں آپ کے شریک ہی نہ ہوتے؟"

"اوہ! ظفر، ظفر پلیز ایسے الفاظ استعمال نہ کریں؟"

"مجھے ان الفاظ کو استعمال کرنے کا حق ہے نشاط۔ آپ نے مجھے اتنا ذلیل کیوں کیا؟"

"ذلیل!"

"ہاں! کیا اس سے زیادہ ذلیل کر سکتی تھیں آپ مجھے۔ آپ یقین کیجئے کہ مجھے انتہائی دُکھ ہُوا ہے آپ کے اس رویے پر۔"

"مگر... مگر ہُوا کیا؟ مجھے بتاؤ تو سہی۔" نشاط نے بے چین ہو کر پُوچھا۔

"آپ اگر کسی پریشانی کا شکار تھیں، اگر وہاں سے آپ کو کوئی خط ملا تھا تو کیا آپ کا یہ فرض نہیں تھا کہ آپ مجھے بھی اس سے آگاہ کر دیتیں۔"

"میں نے... میں نے فرسٹ ایڈ ہاؤس فون کر دیا تھا کہ میں ذرا مصروف ہُوں نہیں آؤں گی۔ کیا ریسپشنسٹ نے آپ کو بتایا نہیں تھا؟"

"مجھے کسی نے بھی کچھ نہیں بتایا۔ اگر بتاتا بھی تو میری تسلّی نہ ہوتی۔ کیا آپ براہِ راست مجھ سے مل کر یہ جملے نہیں کہہ سکتی تھیں نشاط؟"

"چلئے آپ کے حکم کے مطابق جس طرح بھی آپ پسند کریں گے میں معافی مانگ لوں گی۔ آپ کے سامنے شرمسار ہو جاؤں گی بلکہ ہو چکی ہوں لیکن اس وقت ذرا یہ بتا دیجئے کہ یہ سب کیا معاملہ ہے۔ یہ لوگ کون ہیں؟"

"میں آپ کو زیادہ پریشان نہیں کروں گا نشاط! حالانکہ دل تو چاہتا ہے کہ آپ سے خوب بدلہ لُوں لیکن بدلے کا وقت ابھی نہیں ہے۔ پھر کبھی آپ سے ذرا تفصیل سے جھگڑا ہوگا۔ یہ ایس پی گوہر علی صاحب ہیں۔ آئی جی صاحب کا حکم لے کر آئے ہیں کہ توفیق صاحب کو ہتھکڑیاں پہنا کر لے جایا جائے گا آپ مطمئن رہیئے۔ کم از کم دس دس سال کے لئے بھجواؤں گا۔"

"گگ... کیوں... مگر کیوں؟"

"اس لئے کہ انھوں نے آپ کو پریشان کیا ہے؟"

"ظفر! آپ نے یہ سب کچھ ہمارے لئے کیا ہے۔ ان لوگوں کے لئے جنھوں نے آپ کو شدید تکلیف دی، جنھوں نے آپ کی امّی کو ہمیشہ دربدر رکھا۔"

"وہ واقعات پُرانے ہو چکے ہیں۔ میری امّی آپ لوگوں کو معاف کر چکی ہیں تو پھر میری کیا مجال ہے کہ میں آپ سے کسی قسم کی کدورت رکھوں۔ اس کے علاوہ نشاط شمشیر زماں نے ایک طویل عرصے تک میرے باپ کی حیثیت سے میری پرورش کی ہے۔ آپ لوگوں سے میری مُراد ہے بیگم مہرالنساء ہیں۔ اگر میری ماں بھی کھینچوالیتیں تو کم از کم میں اپنی حد تک یہ بات کرتا ہُوں کہ آپ یقین کیجئے کہ شمشیر زماں کے احسانات کو میں کبھی نظر انداز نہ کرتا اور اگر یہ صُورتحال پیش آتی تو وہی سب کچھ کرتا جو اب میں نے کیا ہے۔"

نشاط کی نگاہیں جُھک گئیں اُس نے آہستہ سے کہا۔

"ظفر! اب میں ان الفاظ کے بعد کچھ کہہ بھی نہیں سکتی۔ آپ کے الفاظ اتنے بڑے ہیں کہ ان کا جواب ناممکن ہے۔ بہرطور نشاط کا رواں رواں آپ کا قرضدار ہے آپ نے ہماری خواہش کے بغیر صرف اپنی محبت سے جو کچھ کیا ہے میں اُسے زندگی کی آخری سانس تک فراموش نہیں کر سکوں گی۔"

"وعدہ کرتی ہیں نشاط!" ظفر کے مُنہ سے بے اختیار نکل گیا نشاط نے نگاہیں اُٹھا کر اُسے دیکھا اور پھر آہستہ سے بولی۔

"ہاں! وعدہ۔"

"بس تو یوں سمجھئے کہ مجھے میری کائنات مل گئی۔" ظفر آہستہ سے بولا اور وہاں سے آگے بڑھ گیا۔ یہ الفاظ نشاط کے کانوں میں دیر تک گونجتے رہے تھے ان الفاظ کا مفہوم اس کی سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ وہ ان الفاظ کا جو مفہوم نکالنا چاہتی تھی اندر سے اس کی نفی ہو رہی تھی۔

"یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ یہ بھلا کیسے ہو سکتا ہے۔ یہ غلط فہمی ہے

صرف غلط فہمی۔ زاہد یا ظفر کے یہ جذبات صرف خلوص پر مبنی ہیں ان کا وہ مفہوم نہیں ہے جو وہ سمجھ رہی ہے۔" مجھے میری کائنات مل گئی، کائنات۔" یہ جملہ بے معنی ہے کیا؟ یہ صرف ایک جذباتی احساس کا ترجمان ہے۔ کیا ہے یہ؟ لیکن یہ وقت ان تمام باتوں کو سوچنے کا نہیں تھا۔ اس نے اپنے آپ کو سوچ کے اس بھنور سے نکالا اور آہستہ آہستہ آگے بڑھتی ہوئی بیگم مہر النساء بیگم کے قریب پہنچ گئی۔ مہر النساء سوالیہ انداز میں اُسے دیکھ رہی تھیں توفیق صاحب کی ڈانٹ پھٹکار کو نشاط نے قبول نہیں کیا تھا اور بیگم مہر النساء کو بڑی مسرت ہوئی تھی۔ کم از کم ان کی تینوں لڑکیوں میں سے ایک لڑکی اتنی جرأت مند اور بے باک ہے کہ توفیق صاحب کی ڈانٹ ڈپٹ کو قبول نہیں کرتی۔ صوفیہ اور نزہت کے حواس ہی خراب ہو کر رہ گئے تھے۔ ایک لفظ بھی نہیں نکل پاتا تھا، توفیق صاحب کے سامنے ان کے مُنہ سے، مہر النساء بیگم نے نشاط کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا اور نشاط آہستہ سے بولی۔

"امّی! وہ ظفر ہی ہے۔ وہی ظفر جسے آپ نے ذلیل و خوار کر کے یہاں سے نکال دیا تھا۔ اُسے جب یہ علم ہُوا کہ ہم پریشانیوں کا شکار ہیں تو وہ اپنی سی کوشش کرنے کے لئے آ گیا۔ وہ شمشیر زماں کا حق نمک ادا کرنا چاہتا ہے۔ توفیق خالو گردن تک پھنس گئے ہیں۔ اب ذرا آپ تماشا دیکھئے کہ اس کے آگے کیا ہوتا ہے۔"

بیگم مہر النساء جیسے زمین میں گڑ گئی تھیں۔ ان کے وجود کے اندر ایک طوفان برپا ہو گیا تھا۔ وہ ساری زیادتیاں یاد آ رہی تھیں جو انھوں نے اس لڑکے کی ماں کے ساتھ کی تھیں اور ظفر کو بھی انھوں نے کون سا چھوڑا تھا۔ کیا کچھ نہیں کہہ دیا تھا اُسے لیکن آج ظفر نے انھیں اتنے سارے لوگوں کے سامنے شرمسار کر دیا تھا۔ اس سے زیادہ شرافت کا مظاہرہ اور کیا ہو سکتا تھا۔ ان کے مُنہ سے ایک لفظ بھی نہ نکل سکا۔ وقت گذرتا رہا۔ رفیق صاحب بدستور ان لوگوں کو بُرا بھلا کہہ رہے تھے اور پولیس کے آنے کی دھمکی دے رہے تھے۔ ذرا سی دیر میں پولیس کی ایک جیپ وہاں پہنچ گئی اور جیپ سے وہی تھانیدار اُترا جو توفیق صاحب کا دوست اور ہمدرد تھا اس کی آمد پر توفیق صاحب خوشی سے کھِل اُٹھے۔

"آیئے تھانیدار صاحب! چند بدمعاشوں کو آپ کی خدمت میں پیش کر رہا ہُوں۔ یہ لوگ اس حویلی میں غنڈہ گردی کرنے آئے تھے۔ دیکھئے انھوں نے کس طرح میرے آدمیوں کو باندھ دیا ہے۔" تھانیدار نے بوکھلائی ہوئی نگاہوں سے گوہر علی صاحب کی طرف دیکھا گوہر علی مُسکرا رہے تھے پھر انھوں نے کہا۔

"آپ کے مجرم حاضر ہیں گرفتار کر لیجئے انھیں۔" تھانیدار آگے بڑھا اور اس نے توفیق صاحب کا بازو پکڑ لیا۔

"میں قانون کے نام پر آپ کو گرفتار کرتا ہوں۔"

"کیا... کیا کہہ رہے ہو تم تھانیدار؟ کیا کہہ رہے ہو تم، میں... میں توفیق ہوں۔"

"گرفتار کر لو انھیں۔" تھانیدار نے اپنے ساتھی سپاہیوں کو حکم دیا رفیق اور شفیق بھی ہکا بکا رہ گئے تھے۔ اندر سے شاہدہ بیگم کی چیخ سُنائی دی وہ شاید کسی آڑ میں کھڑی ہوئی یہ تماشا دیکھ رہی تھیں۔

"ارے، ارے خُدا تمھیں غارت کرے ارے۔ انھیں کیوں گرفتار کر رہے ہو؟ ارے میرے بچے، ارے میرے بچے!"

"خاتون! زنانہ پولیس ہمارے ساتھ نہیں ہے اس لئے ہم یہ چاہتے ہیں کہ آپ کوئی جدوجہد نہ کریں۔ آپ یقیناً شاہدہ بیگم ہیں۔" گوہر علی صاحب نے آگے بڑھ کر کہا۔

"اے مگر... مگر... تم ہو کون۔ لفنگے کمینے کہیں کے چھوڑ دو میرے بچوں کو۔ میں کہتی ہوں چھوڑ دو۔" شاہدہ بیگم آگے بڑھیں اور تھانیدار نے کہا۔

"اے خاتون! تمیز سے بات کیجئے۔ چلو انھیں لے کر گاڑی میں بٹھا دو۔" تھانیدار نے شاہدہ بیگم کی طرف رُخ کر کے اپنے سپاہیوں سے کہا اور فوراً ہی دو سپاہی شاہدہ بیگم کے اِدھر اُدھر کھڑے ہو گئے۔

"ارے ارے توبہ۔ ارے خُدا تمھیں غارت کرے۔" شاہدہ اتنا تو سمجھ چکی تھیں کہ اس وقت انھیں اپنے شوہر کے ساتھ جانا ہی پڑے گا لہٰذا وہ توفیق صاحب کی طرف بڑھیں۔

"ارے میرے مولا، مگر میں... میں۔" شاہدہ بیگم میں میں کرتی رہ گئیں۔ پولیس والے سب کو گرفتار کر کے لے گئے ان دونوں غنڈوں کو بھی پولیس نے جیپ میں بٹھا لیا تھا اور پھر ایس۔ پی گوہر علی صاحب نے آگے بڑھ کر مہر النساء بیگم سے کہا۔

"بیگم آپ غالباً نواب شمشیر زماں کی بیوہ ہیں۔"

"ہاں بھائی! میں ہی ہوں۔ یہ میری بچیاں ہیں۔"

"میں معافی چاہتا ہوں محترمہ مہر النساء بیگم کہ آپ کو تکلیف

پہنچی لیکن آپ نے کسی کو اطلاع بھی تو نہیں دی اور خاموشی سے ان لوگوں کا ظلم و ستم برداشت کرتی رہیں۔ بہر حال آپ مطمئن رہیں۔ اب یہ زندگی بھر آپ کی طرف رُخ نہیں کریں گے۔ میرا نام گوہر علی ہے۔ ایس پی ہوں۔ سادہ لباس میں یہاں آیا تھا تاکہ یہ لوگ فرار ہونے کی کوشش نہ کریں۔"

مہرالنساء بیگم کچھ نہ بول سکیں۔ زاہد نے انھیں آگے بڑھ کر سلام کیا اور مہرالنساء بیگم کے ہونٹ کپکپا کر رہ گئے پھر زاہد نے نشاط سے کہا۔

"اچھا نشاط! آپ مطمئن رہیں۔ یہ لوگ اب کبھی آپ کو تکلیف دینے نہیں آسکیں گے۔ میں ان کا ایسا معقول بندوبست کر دوں گا کہ یہ زندگی بھر یاد رکھیں گے۔" زاہد ایک بار پھر مہرالنساء بیگم کو سلام کر کے وہاں سے واپس پلٹا تو ان کے مُنہ سے بے اختیار نکلا۔

"ظفر!"

زاہد چونک کر وہیں رُک گیا اور بے اختیار پلٹ کر انھیں دیکھنے لگا۔

"کیا تمھارا ابھی ان کے ساتھ جانا ضروری ہے؟"

ظفر نے ہچکچاتی نگاہوں سے اُنھیں دیکھا اور بولا۔ "آپ حکم دیجئے۔ میں مزید کیا خدمت کر سکتا ہوں؟"

"وہیں سے واپس مت چلے جانا۔ میں تمھارا انتظار کروں گی۔"

"بہتر! میں حاضر ہوتا ہوں۔" ظفر نے جواب دیا اور واپس پلٹ گیا۔ مہرالنساء بیگم کے رویے نے اُسے بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا تھا۔

✦

جب سے توفیق صاحب یہ نیا شوشا لے کر حویلی میں آئے تھے اور مہرالنساء بیگم نے ان کے تیور دیکھے تھے۔ ان کا کھانا پینا حرام ہو گیا تھا۔ ہر وقت خوف و دہشت سے لرزتی رہتی تھیں جانتی تھیں کہ اس دُنیا میں اب ان کے لئے کوئی سہارا کوئی بھی ہمدرد نہیں ہے۔ جو بے چارے ہمدرد تھے وہ ختم ہو گئے تھے یہ معمولی سے لوگ جو ان کے ادھر اُدھر بکھرے ہوئے تھے کچھ نہیں کر سکتے تھے ان کے لئے۔ چنانچہ اب انھیں اپنا مستقبل تاریک نظر آرہا تھا۔ یہ جو کچھ ہُوا تھا اتنا غیر متوقع تھا کہ انھیں دیر تک یقین نہیں آیا۔ امداد علی پھوپھا اور دوسرے تمام لوگ یہ سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ چکے تھے۔ اس سلسلے میں وہ بے چارے بالکل ہی بے بس تھے لیکن ان لوگوں کی صُورتحال دیکھ کر ان کے دلوں میں بھی خوشی کی لہریں پھوٹنے لگیں۔ سب بیگم مہرالنساء کے گرد جمع ہو گئے۔

"یہ سب کیسے ہُوا بیگم صاحبہ! یہ توفیق صاحب کی کایا کیسے پلٹ گئی اور تو اور شاہدہ بیگم کو بھی لے گئے۔"

"خُدا انھیں جہنم رسید کرے۔ خدا ان لوگوں کو غارت کرے جو ہم بے سہارا لوگوں کو اس طرح دربدر کرنے کے لئے آئے تھے۔ خُدا کی لاٹھی بے آواز ہے۔" مہرالنساء بیگم کے مُنہ سے نکلا۔ سب لوگ انھیں مبارکباد دینے لگے۔ مہرالنساء بیگم، نشاط نزہت اور صُوفیہ کے ساتھ اندر آگئی تھیں۔ اندر پہنچ کر وہ اپنے کمرے میں داخل ہو گئیں۔ اپنے پلنگ پر بیٹھ کر انھوں نے سر پکڑ لیا تھا۔

"کیا بات ہے امّی؟ اب تو آپ کو خوش ہونا چاہیئے۔" نشاط بولی

"میں خوش ہوں نشاط مگر... مگر میرے دل پر ایک ایسا زخم لگا ہے۔ آج مجھے ایک ایسا احساس ہُوا ہے کہ میں... میں خود اپنی نگاہوں میں ذلیل ہو کر رہ گئی ہوں۔" مہرالنساء بیگم نے کہا۔ نشاط سمجھ گئی تھی کہ مہرالنساء بیگم کیا کہہ رہی ہیں لیکن اُس نے خود اس سلسلے میں کچھ نہ کہا۔ مہرالنساء بیگم تھوڑی دیر بیٹھی رہیں پھر انھوں نے نگاہیں اُٹھا کر نشاط سے پُوچھا۔

"کیا وہ تمھیں... تمھیں... میرا مطلب ہے یہاں سے جانے کے بعد۔ جب میں نے اُسے ذلیل کر کے یہاں سے نکالا تھا وہ تمھیں دوبارہ ملا تھا؟"

"آپ ظفر کی بات کر رہی ہیں امّی جان؟" نشاط نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

"ہاں! اُس کی بات کر رہی ہوں۔ یہ کیا ہُوا نشاط! توفیق ناکام ہو گئے۔ شاہدہ مجھے تباہ کرنے میں کامیاب نہ ہو سکی۔ یہ میرے لئے بڑی پُر مسّرت بات ہے۔ وہ لوگ ناجائز کام کر رہے تھے۔ خُدا نے انھیں اس کا صلہ بھی دے دیا لیکن جس ذریعے سے دیا نشاط۔ کیا ظفر تمھیں دوبارہ ملا تھا۔ مجھے بتاؤ۔ پلیز مجھے بتاؤ۔"

"ہاں امّی! وہ مجھے شہر میں ملے تھے بلکہ ان سے اکثر میری ملاقات ہوتی رہی ہے۔"

"کس حیثیت سے؟"

"وہ مجھے پہچان گئے تھے اور میں بھی اُنھیں پہچان گئی تھی۔"

"تو اُس نے تم سے کسی قسم کا نفرت کا تو برتاؤ نہیں کیا تھا؟"

"نفرت کا برتاؤ؟ امی کیا ان ماں بیٹوں کی رگوں میں نفرت کا لہو تھا۔ کیا اس کی ماں نے کبھی آپ کے ساتھ نفرت کا برتاؤ کیا۔ مجھے جواب دیجئے امی۔ آپ کے تمام ظلم و ستم کے باوجود وہ یہاں زندگی گزارتی رہی۔ کیا اتنی ہی بے بس، بے کس تھی وہ؟ جب میرے ابو اپنی زندگی میں اس کی اتنی قدر و عزت کرتے تھے تو کیا وہ ان سے یہ نہ کہہ سکتی تھی کہ وہ ان کو کوئی الگ جگہ دے دیں۔ کیا ابو اس کی درخواست پر ایسا نہ کرتے مگر امی یہ ایثار پسند لوگ ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے لہو کے ایک ایک قطرے کو دوسروں کے لئے روشنی کے چراغ بنا دیتے ہیں۔ ظفر نے ایک بات بھی ایسی نہیں کہی مجھ سے جس سے نفرت ٹپکتی ہو۔ میں آپ سے جو کچھ کہہ رہی ہوں اس میں ذرا بھی جھوٹ نہیں ہے۔ ہمارا رابطہ بہت کم رہا لیکن ظفر ہمیشہ مجھ سے بہت عزت و احترام سے پیش آئے۔ انھوں نے کبھی ایک غلط لفظ آپ کے بارے میں نہ کہا سوائے آپ کی خیریت پوچھنے کے۔ میں تو انھیں بتا کر بھی نہیں آئی تھی کہ میں کس پریشانی کا شکار ہو کر جا رہی ہوں۔ پتہ نہیں کس طرح انھوں نے یہ بات معلوم کی اور وہ بے چین ہو گئے۔ انھوں نے اپنی تمام تر کوششیں کیں۔ امی میں آپ کو یہ بات بتا دوں کہ ظفر معمولی حیثیت کے مالک نہیں ہیں۔ حکومت کے بڑے بڑے عہدے داران کے دوست ہیں۔ وہ ایک منٹ میں توفیق خالو اور ان کے اہل خاندان کو اس طرح ملیا میٹ کر سکتے ہیں کہ ان کا نام و نشان باقی نہ رہے۔ امی! ظفر بہت بڑی شخصیت کے مالک ہیں لیکن بہر طور میں وہ منہ نہیں رکھتی تھی کہ ان سے آپ کی مدد کے لئے کہتی۔ آپ نے اُس کی ماں کو اس طرح دربدر کر کے نکال دیا جبکہ وہ اپنی ماں کی تلاش میں آیا تو اُسے یہ بھی پتہ نہیں تھا کہ اس کی مظلوم ماں کہاں ہے؟"

مہر النسا بیگم کی آنکھوں سے ایک دم ہی ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ کافی دیر تک وہ کچھ نہ بول سکیں اور پھر انھوں نے آنسو خشک کر کے کہا۔

"مجھے تو اس کی سزا ملنی چاہئے تھی نشاط۔ پتہ نہیں مجھے سزا کیوں نہیں ملی؟"

"آپ کو احساس ہے امی کہ آپ نے غلط کیا؟"

"ہاں! مجھے احساس ہے۔ شدت سے احساس ہے گو یہ بعد از وقت ہے لیکن شرمندگی وقت گزرنے کے بعد ہی ہوتی ہے۔ میں وہ کھو چکی ہوں جسے اب میں کبھی نہیں پا سکتی۔" مہر النسا بیگم تھوڑی دیر تک اسی طرح غمزدہ سی بیٹھی رہیں پھر انھوں نے بھاری لہجے میں کہا۔

"کیا ظفر واپس آئے گا؟"

"وہ وعدہ کر کے گئے ہیں . . . اس لئے آئیں گے۔" نشاط نے کہا۔

"نشاط! ظفر کے بارے میں مجھے کچھ اور تفصیلات بتاؤ۔"

"نہیں امی! ان کے راز ان کی امانت ہیں۔ وہ کیا کر رہے ہیں۔ کس طرح وہ رہ رہے ہیں۔ یہ میں آپ کو ابھی نہیں بتاؤں گی کیونکہ میں نے ظفر سے اس کی اجازت نہیں لی ہے۔"

مہر النسا بیگم نے ایک نگاہ اُٹھا کر اس کو دیکھا اس نگاہ میں پتہ نہیں کیا تھا کہ نشاط کی آنکھیں جھک گئیں۔ مہر النسا بیگم دیر تک اُسے دیکھتی رہیں۔ اب باہر کی دنیا کا کوئی تجربہ نہیں تھا انھیں لیکن اتنی احمق بھی نہیں تھیں کہ بیٹی کے اس اعتماد اور اس وثوق کو نظر انداز کر دیتیں۔ وہ اس کے چہرے پر کچھ تلاش کرتی رہیں لیکن نشاط کا چہرہ سپاٹ تھا۔ چند لمحات کے بعد انھوں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

"نشاط اگر ہو سکے تو اُس کی زبان سے میرے لئے معافی کے الفاظ کہلوا دو۔ مجھے بڑا سکون ملے گا۔"

"نشاط منہ کھول کر رہ گئی لیکن اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ کافی دیر گزر گئی۔ صوفیہ اور نزہت بھی خاموش بیٹھی ہوئی تھیں پھر نزہت نے نشاط سے کہا۔

"ظفر واپس ضرور آئیں گے آپ کو یقین ہے؟"

"ہاں! میں ان کی فطرت کو تھوڑا بہت جانتی ہوں۔" اُسی وقت باہر سے امداد علی پھوپھا کی آواز سنائی دی۔

"مہر بہن! ظفر آئے ہیں۔"

"اوہ!" سب بوکھلا کر جلدی سے کھڑی ہو گئیں۔ مہر النسا بیگم بے اختیار باہر نکل آئی تھیں۔ امداد علی پھوپھا وہیں کھڑے ہوئے تھے۔

"کہاں ہیں ظفر؟ کہاں ہیں وہ؟" مہر النسا بیگم نے بے چین لہجے میں پوچھا۔

"میں نے انھیں ڈرائنگ روم میں بٹھا دیا ہے۔"

"ارے امداد بھائی! بلاؤ اُسے اندر لے آؤ۔ جلدی پلیز!" مہر النسا بیگم نے کہا۔ امداد علی پھوپھا واپس پلٹے تو مہر النسا بیگم خود بھی ان کے پیچھے پیچھے دوڑی چلی آئیں۔ امداد علی صاحب فوراً

ڈرائنگ روم میں داخل ہوئے اور انھوں نے کہا۔

"بیگم صاحبہ آپ کو اندر بلاتی ہیں" امداد علی کی بات سن کر ظفر باہر ہی نکلا تھا کہ مہرالنسا بیگم سے ٹکراؤ ہو گیا۔ وہ ٹھٹک کر کھڑی ہو گئیں۔ چند لمحات اپنی جگہ وہ یونہی کھڑی رہیں۔ ظفر انھیں سامنے کھڑے دیکھ رہا تھا پھر مہرالنسا بیگم ڈوبتی ہوئی آواز میں بولیں۔

"یہ ہمت نہیں ہے مجھ میں ظفر۔ یہ ہمت نہیں پا رہی اپنے اندر کہ تمھیں آگے بڑھ کر گلے سے لگا لوں۔ اگر میں تمھیں گلے سے لگا لوں گی تو ان حالات میں صرف یہی جذبہ تصور کیا جائے گا کہ چونکہ تم نے ہمیں مصیبتوں سے نکالا ہے۔ اس لئے ہم شکر گزاری کے طور پر تمھارے ساتھ یہ سلوک کر رہے ہیں"

"نہیں بیگم صاحبہ! میں اتنا کم ظرف نہیں ہوں کہ ایسی چھوٹی بات سوچوں"

"تو پھر مجھے اجازت دو کہ میں تمھیں گلے سے لگا لوں" ظفر نے آہستہ سے گردن جھکائی اور آگے بڑھ آیا۔ مہرالنسا بیگم نے آگے بڑھ کر اسے اپنے بازوؤں میں سمیٹ لیا تھا۔ اس وقت انھیں قطعی یہ احساس نہیں ہو رہا تھا کہ ظفر اجنبی ہے۔ اس سے پہلے انھوں نے اپنی ساری زندگی کسی بھی بیٹے کو گلے نہیں لگایا تھا۔ ان کا اپنا تو کوئی بیٹا نہیں تھا لیکن ظفر کو گلے سے لگا کر انھیں ایسا ہی سکون محسوس ہوا تھا کہ جیسے برسوں کے بعد ان کا کوئی بچھڑا ہوا بیٹا ان سے مل گیا ہو۔ ظفر خاموشی سے ان کے ساتھ لگا کھڑا رہا۔ اس نے خود ہاتھ بڑھا کر مہرالنسا بیگم کو اپنی گرفت میں لینے کی جرأت کی تھی۔ مہرالنسا بیگم چند لمحات اسے گلے سے لگائے کھڑی رہیں۔ نشاط کی آنکھوں میں نہ جانے کیوں نمی آ گئی تھی۔ نزہت اور صوفیہ بھی متعجب انداز میں ماں کی یہ کیفیت دیکھ رہی تھیں۔ پھر مہرالنسا بیگم نے ظفر کو الگ کر کے کہا۔

"خدا کی قسم ظفر! اس لئے نہیں کہ تم میرے اوپر احسان کیا ہے۔ صرف اس لئے کہ میں اپنے کئے پر پشیمان ہوں۔ میں تم سے بڑی شرمندہ ہوں ظفر۔ مجھے یہ الفاظ تم سے کہنا نہیں چاہئیں لیکن دل کی یہی آواز ہے تم سے کہہ دینے میں عار نہیں سمجھتی۔ ہو سکے تو بیٹا مجھے معاف کر دو۔ میں نے تمھارے ساتھ اور تمھاری ماں کے ساتھ جو کچھ کیا ہے۔ خدا مجھے اس کے لئے کبھی معاف نہیں کرے گا لیکن اگر تم مجھے معاف کر دو گے تو میرا خدا بھی مجھے معاف کر دے گا"

ظفر نے پہلی بار ہاتھ بڑھا کر مہرالنسا بیگم کے ہاتھ پکڑ لئے اور پھر بھاری لہجے میں بولا۔

"بیگم صاحبہ! اس گھر سے میرا خمیر اٹھا ہے اس گھر میں میں نے پہلی بار آنکھیں کھولی تھیں۔ اس گھر میں مجھے زندگی ملی تھی۔ اس گھر کی چھت کے نیچے میری ماں کو تحفظ ملا تھا بیگم صاحبہ اس گھر کا مالک میری ماں کو ایک ایسی جگہ سے اٹھا کر لایا تھا جہاں وہ زندگی اور موت کی کشمکش کا شکار تھی۔ اگر اس وقت یہ چھت میری ماں کو پناہ نہ دیتی تو شاید وہ جنگل میں موسم کی سختیوں اور اپنے زخموں کی تاب نہ لاتے ہوئے دم توڑ دیتی اور ظفر کا وجود اس دنیا میں نہ ہوتا۔ اس گھر کے احسانات مجھ پر اور میری ماں پر اتنے زیادہ ہیں کہ ساری زندگی اس کی خدمت کرتا رہوں تو بھی وہ احسانات ادا نہیں ہو سکیں گے چنانچہ مجھے یہ الفاظ کہہ کر شرمندہ نہ کریں کہ اس گھر میں مجھ پر یا میری ماں پر مظالم ہوئے ہیں۔ وقت گزر چکا ہے بیگم صاحبہ واقعات زندہ ہیں لیکن اگر ہم ان واقعات اور اس گھر کے مجھ پر احسانات کو ایک ترازو میں رکھیں تو احسانات کا پلڑا بھاری رہے گا۔ گو ایک بیٹے کے لئے اس سے زیادہ اذیت ناک کوئی بات نہیں ہے کہ اس کی ماں نے جو زندگی گزاری وہ موت سے بدتر تھی لیکن جس شخص کا نام اس گھر سے منسوب ہے وہ فرشتہ تھا اور اس شخص کے لئے آپ تو کیا ساری کائنات کو معاف کیا جا سکتا ہے۔ وہ میرا باپ نہیں تھا لیکن اس نے مجھے باپ کی طرح سہارا دیا۔ اس نے کبھی مجھے یہ سوچنے کی مہلت نہیں دی کہ میں بن باپ کا بیٹا ہوں۔ بہت سے احسانات ہیں اس کے بیگم صاحبہ مجھ پر اور وہ۔ . . وہ شخصیت تھی جس نے آپ سے محبت کی۔ جس نے نشاط، نزہت اور صوفیہ کو اپنے سینوں پر پروان چڑھایا۔ بیگم صاحبہ آپ تو بہت بڑی چیز ہیں۔ یہ لڑکیاں تو بہت بڑی حیثیت رکھتی ہیں میرے لئے اس گھر کا کتا بھی قابل احترام ہے۔ آپ براہ کرم مجھ سے معافی نہ مانگیں مجھے اذیت ہو گی" ظفر کی آواز جذبات میں ڈوبی ہوئی تھی۔ بیگم صاحبہ ایک بار پھر آگے بڑھیں اور اسے گلے سے لگا لیا وہ بولیں۔

"ظفر . . .! بس تم ایک بار اپنے منہ سے کہہ دو کہ تم نے مجھے معاف کیا"

"اگر آپ کا یہ حکم ہے بیگم صاحبہ تو میں آپ کے کہے کو دہرا دیتا ہوں۔ ہاں! میں نے آپ کو معاف کر دیا"

"خدا تمھیں بہت بڑا مرتبہ دے۔ خدا بہت بڑا رتبہ دے تمھیں"

"بھئی اب یہ جذباتی گفتگو ختم ہوگی یا نہیں یا پھر ہم لوگ باجماعت رونا شروع کر دیں"، لشاط نے آگے بڑھ کر ماحول کو بدلنے کی کوشش کی اور چہک کر بولی۔

"آیئے ظفر صاحب! اندر تشریف۔ . . آیئے بھئی" ظفر ان لوگوں کے ساتھ آگے بڑھ گیا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر ایک عجیب سی مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی۔ بیگم صاحبہ اُسے اپنے کمرے میں لے کر پہنچ گئیں۔ تینوں لڑکیاں بھی ان کے ساتھ تھیں۔ پھر بیگم صاحبہ نے پوچھا۔

"ظفر! شہر میں کیا کر رہے ہو؟"

"ملازمت کر رہا ہوں بیگم صاحبہ!" ظفر نے جواب دیا۔

"کہاں؟"

"بس ایسے ہی ایک ادارہ ہے فرسٹ ایڈ ہاؤس کے نام سے اس کا قیام عمل میں آیا ہے اُس کا ملازم ہُوں۔"

نشاط ظفر کی باتیں سُن کر مسکرا رہی تھی۔ بیگم صاحبہ چند لمحات گردن جھکائے بیٹھی کچھ سوچتی رہیں پھر بولیں۔

"ساری باتیں ایک دم ہی کر لینے کو جی چاہتا ہے لیکن بڑا معیوب سا معلوم ہوتا ہے۔ اب میں تمھیں یہاں سے نہیں جانے دُوں گی۔ بس جب تم نے اپنے مُنہ سے میرے لئے مُعافی کے الفاظ کہہ دیئے ہیں تو پھر میرا تم پر حق ہو گیا ہے۔ جب ایک شخص کو تم نے معاف کر ہی دیا تو پھر اب اس سے کوئی گلہ شکوہ نہیں ہوگا۔ شمشیر زماں تمھیں اپنی اولاد کی مانند سمجھتے تھے۔ میں نے ہمیشہ ان سے انحراف کیا اور میری وجہ سے تمھیں بہت سی تکالیف کا سامنا کرنا پڑا لیکن اب جبکہ مجھے اپنی شدید غلطی کا احساس ہو چکا ہے اور تم نے اپنی بڑائی سے کام لے کر مجھے مُعاف کر دیا ہے تو چاہتی ہوں کہ تم مجھے ایک سچے انسان کی طرح اپنے بُزرگ کی حیثیت دو۔"

"بیگم صاحبہ آپ میری۔ . . !"

"بیگم صاحبہ نہیں! پلیز بیگم صاحبہ نہیں۔ شمشیر زماں کے رشتے سے تم مجھے امّی ہی کہو۔"

"ذرا وقت لگے گا یہ کہنے میں، بہر طور امّی جان آپ مجھے یہ سب کچھ کہہ کر مسلسل شرمندہ کئے جا رہی ہیں۔ آپ فوراً حکم دیجئے کہ مجھے کیا کرنا ہوگا؟"

"پہلی بات تو یہ ہے کہ تم ملازمت وغیرہ نہیں کرو گے۔ میرے پاس رہو گے میرے ساتھ رہو گے، میرا سہارا بن کر میری دیوار بن کر تجھے دیوار کی ضرورت ہے ظفر۔ دیکھ لو کس طرح ویرانے میں کھڑی لرز رہی ہوں۔ تین بیٹیوں کا بوجھ میرے شانوں پر ہے۔ ایک بہت بڑی ذمّے داری میں نے سنبھال رکھی ہے ظفر میں ایک ایسے تناور درخت کی طرح ہوں جو اندر سے بالکل کھوکھلا ہو گیا ہے۔ اس کے تنے کو دیکھ کر لوگ یہ اندازہ لگاتے ہیں کہ وہ مضبوط بھی ہوگا لیکن اپنے اندر کا حال تو میں ہی جانتی ہوں۔ اُس سے پہلے کہ تیز آندھی کا کوئی جھونکا مجھے زمین بوس کر دے میرے لئے دیوار بن جاؤ شمشیر زماں کے نام پر۔ شمشیر زماں کے نام پر ظفر جنھیں تم بہت بڑا درجہ دیتے ہو۔"

ظفر اپنی جگہ سے اُٹھا بیگم صاحبہ کے قریب پہنچا اور ان کے قدموں میں بیٹھ گیا۔

"مجھے آپ کی خدمت کر کے فخر ہوگا امّی جان آپ یقین کیجئے میں خلوصِ دل سے آپ کے لئے حاضر ہُوں۔"

"تو بس وعدہ کرو کہ یہاں سے کہیں نہیں جاؤ گے۔"

"میری چند مجبوریوں کو آپ نگاہ میں رکھئے امّی جان! لیکن ایک بات کا یقین رکھئے کہ اس گھرانے کی مکمل ذمّے داریاں مجھ پر ہیں۔ آپ نے مجھے اس قابل سمجھا ہے تو میں اپنی اس خوش بختی کو نہیں ٹھکراؤں گا لیکن امّی جان! میں آپ سے بہت کچھ لے چکا ہُوں۔ اب مجھے کچھ دینے کی کوشش نہ کریں ورنہ وہ میرے جذبات کی توہین ہو گی۔ مجھے یقین ہے کہ آپ اپنے بیٹے کو ٹوٹتا ہُوا۔ دیکھنا پسند نہیں کریں گی" ظفر کے لہجے میں کچھ ایسا استحکام تھا کہ بیگم صاحبہ لاجواب ہو گئیں پھر انھوں نے کہا۔

"مگر ظفر! ہمیں سہارا تو دو گے نا ہماری بہتری کے لئے کچھ تو کرو گے جیسا کہ تم نے اس وقت کیا ہے۔"

"ہاں امّی جان! یہ اب میری ذمّے داری ہے اور آپ مطمئن رہیں۔ میں اُسے پُورا کروں گا" ظفر نے جواب دیا۔

"تو پھر۔ . . تو پھر میرے لئے کوئی ایسی چیز بتاؤ کہ میں اپنے آپ کو اتنا بے سکون محسوس نہ کروں۔"

"مناسب ہوگا کہ آپ اس حویلی کو چھوڑ دیں شہر میں قیام کریں۔ میرا خیال ہے یہ انتہائی مناسب بات ہوگی بشرطیکہ آپ میری یہ درخواست قبول کر لیں۔"

"تم قبول کرنے کی بات کرتے ہو میں تم سے دوسری فرمائش یہی کرتی کہ میرا شہر میں کوئی معقول بندوبست کر دو یہ ساری جائیداد یہ سارا کاروبار دوبارہ ان بچیوں کے لئے ہے میں ان سے سبک دوش ہو جاؤں تو پھر سمجھوں گی کہ میں نے بہت کچھ پا لیا ہے لیکن ظفر اب جبکہ مجھے تمھارا سہارا مل گیا ہے تو میں اسے

چھوڑنا نہیں چاہتی۔ دیکھو یہ لالچ یا کمینگی نہیں ہے۔ ایک مجبوری ہے۔ ایک ایسی مجبوری جو اپنی تین بیٹیوں کے ساتھ خود کو بے سہارا سمجھتی ہے۔ یہ سارے لوگ جو یہاں رہتے ہیں میرے وفادار ضرور ہیں۔ مجھ سے محبت بھی کرتے ہیں۔ میرے عزیز ہیں یہ لوگ لیکن یہ سب بھی زمانے کو اسی طرح دیکھ رہے ہیں جیسے میں نے دیکھا ہے۔ ان میں آگے بڑھ کر کچھ کرنے کی جرأت نہیں ہے۔ میں ان سب کو اپنے ساتھ سمیٹ کر لے جاؤں گی بس تم اتنا کر دو میرے لئے کہ یہ تمام انتظام خود سنبھال لو۔ یہ کام اسی طرح اپنی مٹھی میں لے لو کہ مجھے اُسے دیکھنے کی ضرورت نہ پیش آئے ہاں! ظفر سچے دل سے کہہ رہی ہوں۔ میں اپنی ایک ایک ذمے داری تمھیں سونپ دینا چاہتی ہوں۔ اگر تم میری ذات سے منسلک ہو کر کچھ کرنے پر آمادہ نہیں ہو تو میں تمھیں شمشیر زماں کا حوالہ دے چکی ہوں۔ ان کے حوالے سے میرے لئے یہ سب کچھ کرو ظفر۔ میں اب کچھ نہیں کر سکتی۔ میں بہت تھک گئی ہوں۔"

ظفر نے ان کے شانے تھپتھپاتے ہوئے کہا۔

"آپ مکمل مطمئن رہیں اور میں آپ سے پوری طرح متفق ہوں آپ کو میں شہر بلا لوں گا۔ بہت جلد انتظام کرنے کے بعد، باقی اپنے ان تمام لوگوں کی طرف سے آپ مطمئن رہیں۔ آپ کا ظفر آپ کے لئے ہر طرح کا تعاون فراہم کرے گا۔ نشاط ہم کل ہی شہر چل رہے ہیں۔ شہر چل کر ہم سب سے پہلے کام یہ کریں گے کہ امی جان اور اپنی ان دونوں بہنوں کو وہاں کسی خوبصورت اور آرام دہ جگہ سیٹ کر دیں۔ آپ میرے ساتھ چلیں گی نا نشاط؟"

"ہاں! کیوں نہیں بالکل!"

"تو ٹھیک ہے میں اب تھوڑی دیر کے لئے اجازت چاہتا ہوں ذرا گوہر علی صاحب کو رخصت کر دوں۔ ان سے معذرت کر کے آیا ہوں۔ ان چاروں حضرات کو یعنی توفیق صاحب، رفیق، شفیق اور شاہدہ بیگم کو شہر روانہ کرنا ہے۔ وہاں ان پر مقدمہ چلے گا۔ ان تمام کارروائیوں کے لئے ہم حمایت بیگ کا سہارا بھی لیں گے کیونکہ بہرطور وہ آپ کے خاندانی وکیل ہیں اور اچھے انسان ہیں ان لوگوں کو کیفر کردار تک پہنچانے کے بعد ہم ان سارے معاملات کو دیکھیں گے۔ آپ بالکل مطمئن رہیں امی جان! آپ نے جو ذمے داری میرے سپرد کی ہے میں اُسے پورا کروں گا۔"

بیگم صاحبہ کے ہونٹ بار بار کچھ کہنے کے لئے متحرک رہے تھے پھر انھوں نے زاہد کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔

"ساری باتیں ہو گئی ہیں ظفر! ایک سوال کرنے کی ہمت نہیں کر پا رہی۔ مجھے دلاسہ دو مجھے ہمت دلاؤ۔"

"کیسا سوال امی جان! جب آپ ساری باتیں کر چکی ہیں تو پھر کسی ایک سوال کے لئے آپ کو اُلجھنے کی کیا ضرورت ہے؟"

"تمھاری امی کہاں ہیں؟" بیگم صاحب نے سوال کیا اور دفعتاً ظفر کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ چند لمحات وہ اسی طرح بیٹھا سوچتا رہا پھر اُس نے کہا۔

"وہ شہر ہی میں ہیں۔ وہاں آپ کی ان سے مُلاقات ہو جائے گی۔"

ایس پی گوہر علی ملزمان کو لے کر روانہ ہو گئے تھے۔ زاہد ان لوگوں کو تسلیاں دے کر اور ان کے لئے شہر میں بندوبست کرنے کا وعدہ کر کے دوسرے دن وہاں سے رخصت ہو گیا۔ نشاط اُس کے ساتھ تھی۔ ٹرین کے فرسٹ کلاس کمپارٹمنٹ میں ان دونوں کے علاوہ کوئی بھی نہ تھا۔ زاہد نشاط کو اس طرح اپنے قریب پا کر ایک انوکھے احساس سے دوچار تھا۔ کافی دیر سے ان کے درمیان کوئی گفتگو نہیں ہوئی۔ آخر اس خاموشی سے اکتا کر نشاط نے کہا۔

"آپ اتنے گم تو نہیں ہیں ظفر؟"

"ایں!" زاہد چونک پڑا۔ پھر مسکرا کر بولا۔ "محترمہ اب ہم حویلی سے نکل آئے ہیں۔ آپ ظفر کو اب بھول جائیں اور دوبارہ مجھے زاہد سمجھ لیں۔"

"میری مدد کے لئے زاہد آئے تھے یا ظفر؟"

"مدد کیسی مدد؟ آپ بلاوجہ اسے مدد کا نام دے رہی ہیں۔ میں نے خود اپنی مدد کی تھی۔ میں نے اپنے لئے ہی کیا تھا یہ سب کچھ۔"

"بے شک مجھے یقین ہے اس بات کا۔" اور احساسِ کمتری کا شکار ہو گئی ہوں میں۔"

"وہ کیوں؟"

"اس لئے کہ ہم لوگ اتنے بڑے نہیں ہیں جتنے آپ ..."

"اب آپ خود دیکھ لیں نشاط، آپ اب بھی زیادتی کر رہی ہیں۔ ہم لوگ اور آپ کیا اس طرح آپ مجھے خود سے الگ نہیں کر رہیں؟" زاہد نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"الفاظ پہ نہ جائیے۔ مفہوم سمجھئے آپ اس کا۔" نشاط سنجیدگی سے بولی۔

"میں اس وقت کوئی سنجیدہ گفتگو نہیں کروں گا۔ سمجھیں آپ۔ یہ ساری باتیں اس سے پہلے بھی ہو چکی ہیں۔ کوئی نئی بات کیجئے۔"

"دل میں تو بہت کچھ ہے ظفر لیکن ہمت نہیں ہوتی ظاہر

شرمندہ ہونا پڑے گا" نشاط مسکرا کر بولی۔

"شاید ایسا نہ ہو نشاط؟" زاہد آہستہ سے بولا۔

"تو پھر آپ مجھے یہ بتائیے کہ آپ زاہد کیسے بن گئے اور کیوں بن گئے؟"

"کسی سے انتقام لینے کے لئے۔"

"انتقام اور آپ؟ ناممکن ہے۔"

"نشاط! میں آپ سے جھوٹ نہیں بول سکتا۔"

"کس سے انتقام لینا چاہتے ہیں آپ؟"

"تفصیل کے لئے تھوڑا سا وقت اور دے دو نشاط۔ میں ممنون ہوں گا۔" وہ لجاجت سے بولا۔

"بات اتنی سنسنی خیز ہے کہ برداشت نہیں ہوتی۔"

"میرے لئے یہ لمحات برداشت کر لو۔"

"چلئے ٹھیک ہے۔ اب آپ یہ بتائیے کہ آئندہ کے لئے پروگرام کیا ہے؟"

"میرے یہ الفاظ آپ کے پاس میری امانت ہیں۔"

"ہاں! آپ مجھے سچا پائیں گے۔" نشاط نے کہا۔

"مجھے یقین ہے۔"

"اتنی جلدی آپ نے مجھ پر اتنا اعتماد کر لیا۔" نشاط اُسے بغور دیکھتی ہوئی بولی۔

"ہاں!"

"کیوں؟" نشاط نے سرگوشی کے انداز میں کہا اور زاہد اُسے دیکھ کر رہ گیا۔ دیکھنے کا یہ انداز لاکھ زبانیں رکھتا تھا۔ نشاط کی آنکھیں جھک گئیں۔ اس کے بعد وہ بہت دیر تک اُس سے سوال نہ کر سکی زاہد نے کہا۔

"آپ سب لوگ یہاں آجائیں۔ مجھے بے حد مسرت ہوگی۔ میں سب سے پہلے یہ کارروائی مکمل کر لوں گا اس کے بعد کوئی دُوسرا کام کروں گا۔"

"میں آپکو کوئی دُوسرا کام کرنے کب دُوں گی۔"

"اسی لئے اتنی خاموشی سے چلی گئی تھیں مجھے کچھ بتائے بغیر۔" زاہد نے کہا۔

"اُس وقت آپ پر اتنا اعتماد نہیں تھا زاہد۔"

"اور اب؟"

"جواب نہیں دُوں گی۔" نشاط نے کہا۔

"ہم حمایت علی بیگ سے ملیں گے اور اُن پر کچھ ذمے داریاں ڈالیں گے۔"

"خود میرے ذہن میں بھی یہی خیال تھا۔"

سفر اس طرح کٹ گیا کہ وقت کا پتہ ہی نہ چل سکا۔ جس وقت ٹرین سے ہم لوگ اُترے تو رات ہو چکی تھی۔ زاہد نے ٹیکسی روکی اور ڈرائیور کو سرفراز کے گھر کا پتہ بتا دیا۔ نشاط نے اس سلسلے میں کوئی سوال نہیں کیا تھا۔ سرفراز کے ہاں سب لوگ جاگ رہے تھے۔ زاہد کو دیکھ کر سرفراز خوشی سے اُچھل پڑا۔ صابرہ بیگم بھی اس کے ساتھ ہی تھیں۔ نشاط کو انھوں نے بڑی خوش دلی سے خوش آمدید کہا تھا۔

"نشاط کو جانتے ہو، نا سرفراز؟" زاہد نے پوچھا۔

"کمال ہے۔ آپ مجھ سے یہ سوال کر رہے ہیں۔ امی یہ نشاط ہیں پڑھتی ہیں۔ یہاں ہوسٹل میں رہتی ہیں اور فرسٹ ایڈ ہاؤس کے لئے انھوں نے اپنی رضاکارانہ خدمات پیش کر دی ہیں۔"

"آؤ۔ بیٹی میں تمھیں اپنے گھر میں خوش آمدید کہتی ہُوں" صابرہ بیگم نے پیار سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ زاہد نے سب کا تعارف کرایا اور پھر نشاط کو صابرہ بیگم کے پاس چھوڑ کر سرفراز کے ساتھ باہر نکل آیا۔

"نشاط کے ساتھ میں شمشیر زماں کے ہاں سے آرہا ہُوں حالات کچھ ایسے تھے کہ میرا وہاں جانا ضروری تھا۔ میں تمھیں بتا چکا ہُوں بہرحال خُدا کا احسان ہے۔ سب ٹھیک ہو گیا ہے۔ نشاط کی والدہ اور بہنیں اب یہاں منتقل ہونا چاہتی ہیں۔ تم اپنی مصروفیات کے بارے میں بتاؤ۔ اس دوران کوئی خاص بات تو نہیں ہوئی؟"

"خاص باتیں تو آجکل روزانہ ہو رہی ہیں زاہد بھائی حیرت انگیز بات یہ ہے کہ شجاع احمد صاحب کا رویّہ بالکل ہی بدل گیا ہے کل یہاں بھی آئے تھے۔"

"خوب، خوب، بھئی کیوں نہ آئیں گے آخر سُسر ہیں تمھارے؟" زاہد نے مُسکراتے ہوئے کہا اور سرفراز شرمائے ہوئے سے انداز میں ہنسنے لگا۔

"دُنیا کے بدلتے ہوئے رنگ دیکھ کر مجھے بڑا تعجب سا ہوتا ہے زاہد بھائی' بہرحال آپ چھوڑیئے ان باتوں کو اس سلسلے میں جو کارروائیاں ہوئی تھیں وہ ہو رہی ہیں بیگم صاحبہ بھی بہت خوش ہیں اور۔۔۔"

"جی ہاں! اور۔۔۔ اور قدسیہ سے بھی مُلاقات ہُوئی" زاہد نے مسکراتے ہوئے پُوچھا۔

"ہاں۔۔۔ ہوئی تھی وہ بہت خوش ہیں" سرفراز نے شرمگیں لہجے میں کہا۔

"کیوں نہ خوش ہوں گی بھائی۔"

"زاہد بھائی۔۔۔! یہ سب کچھ۔۔۔ یہ سب کچھ آپ ہی کا

مرہونِ منت ہے۔"

"بس بس مکھن مت لگاؤ۔ اچھا اب مسئلہ یہ ہے سرفراز کہ تمہاری مصروفیات کچھ بھی ہوں لیکن کل تم میرے ساتھ حمایت علی ایڈووکیٹ کے ہاں چلو گے۔ ان سے بات چیت کریں گے اور پھر تم ان کے ساتھ مل کر یہاں کوئی بہت ہی عالیشان مکان تلاش کرو۔ بہت خوبصورت مکان ہونا چاہیئے۔ ہم اُسے نشاط کی امّی کے لئے خریدیں گے۔ یہ سب لوگ جس قدر جلد یہاں منتقل ہو جائیں بہتر ہے۔"

"ٹھیک ہے آپ میری جو ڈیوٹی لگائیں گے میں حاضر ہوں۔" سرفراز نے کہا پھر بولا۔

"لیکن معاملہ کیا تھا؟" زاہد مختصراً اُسے اس سلسلے کی تفصیلات بتانے لگا پھر اُس نے کہا۔

اس وقت ہم اسٹیشن ہی سے آ رہے ہیں۔ میں نے اس وقت نشاط کو ہوسٹل بھیجنا مناسب نہیں سمجھا اس لئے رات کو ہم یہاں رہیں گے صبح کو یہ ہوسٹل منتقل ہو جائے گی۔"

"زاہد بھائی! نشاط سے آپکی قربت یقیناً بے مقصد نہ ہوگی۔ میں اس سلسلے میں کوئی سوال نہیں کروں گا آپ سے، لیکن نشاط ہوسٹل میں کیوں رہے گی؟ جب تک یہ اپنا مکان نہیں لے لیتیں یہاں کیا حرج ہے؟"

"کوئی حرج نہیں ہے صبح ہونے دیں۔ نشاط سے بات کر لیں گے۔"

رات گئے تک وہ اس موضوع پر گفتگو کرتے رہے دوسری صبح ناشتے پر صابرہ بیگم نے خود نشاط کو یہاں رہنے کی پیشکش کر دی۔ نشاط نے تھوڑی سی رد و قدح کے بعد یہ پیشکش منظور کر لی تھی۔ چونکہ اس نے اس میں زاہد کی رضامندی بھی پالی تھی زاہد اس دوران میں ایک خاص بات محسوس کرتا تھا وہ یہ کہ نشاط کسی ایسے مسئلے پر اپنی کوئی رائے نہیں دیتی۔ جس کا فیصلہ زاہد کر چکا ہوتا تھا گویا اُسے زاہد پر بے پناہ اعتماد ہو گیا تھا۔ حالات زیادہ سے زیادہ بگڑتے ہی جا رہے تھے۔ زاہد کا اپنا یہی خیال تھا کہ حالات بگڑتے جا رہے ہیں کیونکہ اب نشاط پر آنکھیں بند کر کے بھروسہ کرنے لگی تھی اور بھروسے کا [illegible] اگر صرف ممنونیت کے جذبات کا مرہونِ منت ہے تو پھر زاہد کی اپنی کیفیت کیا ہوگی۔ وہ یہ بات اس سے پہلے بھی کئی بار سوچ چکا تھا۔

دن کو گیارہ بجے انھوں نے یہاں سے حمایت علی کو ٹیلی فون کیا اور زاہد نے انھیں مختصر تفصیل بتاتے ہوئے کہا کہ وہ اس وقت ان سے ملنا چاہتا ہے۔ حما علی نے کہا کہ وہ ان کا انتظار کر رہے ہیں۔ چنانچہ زاہد، نشاط اور سرفراز کے ساتھ وہاں چل پڑا۔ حمایت علی ایڈووکیٹ نے ان کا گرم تپاک استقبال کیا تھا نشاط کو دیکھ کر وہ مسکرائے۔

"کیسی ہو بیٹی؟"

"ٹھیک ہوں انکل۔ بہت خراب حالات کا شکار ہو گئے تھے ہم لوگ۔"

"ہاں بھئی! میں اس بارے میں جاننا چاہتا تھا کیا سلسلہ رہا ٹیلی فون پر زاہد نے مجھے کچھ تفصیل نہیں بتائی تھی۔"

"وہ سلسلہ تو ختم ہو گیا حمایت علی صاحب، جس کے لئے میں آپ سے ملا تھا . . . ."

"آپ ملے تھے انکل سے؟" نشاط نے پوچھا۔

"ہاں بھئی! یہیں سے تمھارے بارے میں ہمیں سب تفصیلات معلوم ہوئی تھیں۔ تمھارے ہوسٹل میں گیا وہاں سے بس یہ پتہ چلا کہ یہاں کوئی ایک خط آیا تھا جس کی وجہ سے تم ہوسٹل سے چلی گئیں۔"

"ٹھیک۔"

"بھئی مجھے تو میری بات کا جواب دو۔ کیا کیا تم نے اس سلسلے میں زاہد؟"

"توفیق صاحب! ان کے بیٹے اور ان کی بیگم گرفتار ہو چکے ہیں اور اب ان کی گلو خلاصی کا کوئی ذریعہ نہیں ہے۔ جو رویّہ انھوں نے ان لوگوں کے ساتھ اختیار کیا تھا اس کی انھیں سزا ملنا ضروری ہے ورنہ وہ پھر سر اُٹھائیں گے۔"

"گرفتار ہو گئے اور وہ دستاویزات جو انھوں نے پیش کی تھیں۔" حمایت بیگ صاحب بولے۔

"اس سلسلے میں، میں آپ کو تفصیلات بتائے دیتا ہوں مقدمہ تو یقیناً چلے گا۔ دستاویزات جعلی ہیں۔ اس سلسلے میں آئی جی صاحب خود چھان بین کریں گے۔ ہم وزیر داخلہ کے سیکریٹری صاحب سے بھی مل چکے ہیں اور انھوں نے آئی جی صاحب کو اس سلسلے میں ہدایات جاری کی تھیں۔"

"ڈوب گئے توفیق میاں چونکہ دستاویزات تو جعلی تھیں۔ فرض کرو اگر ہینڈ رائیٹنگ ایکسپرٹ کے پاس پہنچ گئیں تو حقیقتِ حال واضح ہو جائے گی۔"

"ہاں! اب یہ کوئی مسئلہ نہیں رہا۔ حمایت علی بیگ صاحب، میں بیگم صاحبہ سے مل چکا ہوں۔ وہ شدت سے اس بات کی خواہاں ہیں کہ یہاں شہر میں منتقل ہو جائیں۔ چنانچہ ان کے لئے ایک عالیشان مکان کی تلاش ہے مجھے، جس میں یہ پورا خاندان سما سکے اور یہ

کام جس قدر جلد ہو سکے بہتر ہے۔ میں سرفراز کو آپ کی مدد کے لئے پیش کرتا ہوں۔ یہ بہت ذہین اور سمجھدار آدمی ہیں۔ سارا کام بخوبی کریں گے۔ میں چاہتا ہوں کہ ایک ہفتے کے اندر اندر یہ لوگ یہاں منتقل ہو جائیں۔"

"ٹھیک ہے ایسا ہی ہوگا۔ جائیداد وغیرہ کے انتظام کا کیا رہے گا؟"

"جو لوگ اس سلسلے میں کام کر رہے ہیں ابھی ہم انھیں ہی کام کرنے دیں گے۔ بعد میں ایسے لوگوں کو چھانٹ دیا جائے گا۔ جو تم شیرزمان کے وفادار نہیں ہیں اور ان کی جگہ نئے لوگ مقرر کر دیئے جائیں گے۔ جائیداد کی دیکھ بھال کا کام اسی انداز میں جاری رہے گا جس طرح چلتا رہا ہے۔"

"بھئی بیگم صاحبہ نے بہت ہی شاندار فیصلہ کیا ہے اس حویلی کو چھوڑنے کا۔ میں تو خوش ہو گیا ہوں۔ بہرطور اب یہ میری ذمّے داری ہے کہ سارے کام چھوڑ کر اس سلسلے میں مصروف ہو جاؤں۔"

"گڈ! میں بھی یہی چاہتا ہوں۔ اچھّا نشاط اب آپ یہاں سے ہوسٹل جائیں گی اور ہوسٹل سے اپنا مختصر سامان لے کر گھر منتقل ہو جائیں گی۔ حمایت علی بیگ صاحب اب نشاط، سرفراز کے گھر میں رہا کریں گی۔ ہماری بات ہو گئی ہے۔"

"سرفراز بھائی آپ میرے ساتھ ہوسٹل چلیں گے اور پہلے مجھے گھر پہنچائیں گے اس کے بعد کوئی اور کام کریں گے۔"

"ٹھیک ہے یہ ذمّے داری میری، اور زاہد بھائی اب آپکا کیا پروگرام ہے؟" سرفراز نے پوچھا۔

"میں ذرا اپنے محبان و مہربان کو دیکھ لوں" زاہد نے مسکراتے ہوئے کہا اور سرفراز نے گردن ہلا دی۔

"اچھّا نشاط! فکر نہیں کر دسب ٹھیک ہو جائے گا . . . انشاءُ اللہ تعالٰی! آپ فکر نہ کریں۔ یہ خریداری کا مسئلہ حل کر لیا جائے گا بعد میں ہم بیگم صاحبہ سے حساب کتاب کریں گے چنانچہ آپ کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔"

"نہیں ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ اگر رقم کی ضرورت ہوئی تو وہ باآسانی یہیں سے مل جائے گی۔ یہاں کے بینکوں میں بھی ہمارے اکاؤنٹس ہیں۔"

"جی ہاں! ہمیں علم ہے کہ آپکے بہت سے اکاؤنٹس ہیں اچھا خدا حافظ" زاہد نے کہا۔

"سنیئے زاہد صاحب! رات کو آپ سے ملاقات ہوگی؟" نشاط نے پوچھا۔

"بھئی حاضری دینی پڑے گی، آپ کی خدمت میں" زاہد نے مسکراتے ہوئے کہا اور نہ جانے کیوں نشاط شرما سی گئی۔

☆☆

شہر کے ایک بہت بڑے سرمایہ دار احمد دین نے شجاع احمد صاحب کو فون کیا اور شجاع احمد صاحب نے ریسیور کان سے لگا لیا۔

"میں احمد دین بول رہا ہوں شجاع احمد۔"

"کہیئے احمد دین صاحب! کیسے مزاج ہیں یہ شجاع احمد کی یاد کیسے آ گئی آپ کو؟"

"بڑی اہم ضرورت پیش آ گئی ہے شجاع احمد ملنا ہے تم سے۔" احمد دین نے کہا۔

"جہاں آپ فرمائیں حاضر ہو جاؤں" شجاع احمد صاحب اپنے سے زیادہ دولت مند اشخاص سے اس طرح انکساری سے ملا کرتے تھے۔

"اگر مناسب سمجھو تو میرے گھر آ جاؤ یا میں آ جاتا ہوں" احمد دین صاحب نے کہا۔

"میں حاضر ہو رہا ہوں۔ ابھی آ جاؤں؟"

"ہاں! ابھی آ جاؤ تو اچھا ہے" احمد دین صاحب کے لہجے سے ایک عجیب سا احساس ہوتا تھا۔ شجاع احمد صاحب نے ان کے پاس پہنچنے کا وعدہ کیا اور پھر تھوڑی ہی دیر کے بعد تیار ہو کر وہاں سے چل پڑے۔

احمد دین کے ساتھ تین اور آدمی تھے۔ یہ بھی شہر کے بڑے بڑے سرمایہ دار تھے اور شجاع احمد انھیں اچھّی طرح جانتے تھے۔ انھوں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"آج تو بڑے بڑے لوگوں کا اجتماع ہے یہاں پر۔ کہیئے کیسے مزاج ہیں آپ تمام حضرات کے؟"

"ہمارے مزاج تو اچھے ہیں شجاع احمد مگر ہماری باتیں سُن کر تمھارے مزاج اچھے نہیں رہیں گے آؤ" احمد دین نے ناخوشگوار سے انداز میں کہا اور شجاع احمد بھونچکے ہو کر انھیں دیکھنے لگے پھر دونوں کے ساتھ آگے بڑھتے ہوئے بولے۔

"احمد دین صاحب خیریت تو ہے۔ میرے بارے میں کوئی غلط فہمی تو نہیں ہو گئی؟"

"میاں، تمھارے بارے میں غلط فہمی تو نہیں ہوئی مگر جو کچھ تم لوگ کر رہے ہو وہ اچھا نہیں ہے۔ پتہ نہیں تمھاری معلومات اس سلسلے میں کہاں تک ہیں ہم نہیں جانتے" احمد دین نے کہا اور انھیں ساتھ لئے ہوئے اپنے ڈرائنگ رُوم میں داخل ہو گیا۔ شجاع احمد صاحب کی حالت خراب ہونے لگی تھی۔ احمد دین کا لہجہ یہ بتاتا تھا کہ کوئی بہت ہی ناخوشگوار واقعہ ہُوا ہے لیکن ان کے علم میں ایسی کوئی بات نہیں تھی احمد دین کے ساتھ جو افراد موجود

تھے ان کے لہجے بھی زیادہ خوشگوار نہیں تھے وہ سب ایک میز کے گرد بیٹھ گئے۔

"تو میاں دراصل ہم نے سوچا کہ بات آگے بڑھانے سے پہلے تم سے اس سلسلے میں گفتگو کرلی جائے۔"

"معاملہ کیا ہے؟ آپ کا لہجہ بہتر نہیں ہے۔" شجاع احمد صاحب بھی خشک لہجے میں بولے۔

"میاں، لہجہ بہتر کیسے رہے گا۔ اٹھادن لاکھ روپیہ میں دے چکا ہوں، بیس لاکھ روپے انھوں نے دیئے ہیں۔" احمد دین نے اپنے ساتھی کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ "تقریباً اتنے ہی رمضان والا نے دیئے ہیں۔" انھوں نے دوسرے آدمی کی طرف رُخ کر کے کہا۔

"میں نے بھی تو تقریباً سترہ لاکھ روپے ادا کئے ہیں۔" تیسرے آدمی نے جواب دیا۔

"کسے ادا کئے ہیں۔ آخر آپ لوگ کچھ تفصیل تو بتلیئے۔ میں زیادہ گول مول بات کرنے کا عادی نہیں ہوں۔" شجاع احمد صاحب نے کہا۔

"آئرن ٹاور کو دیئے ہیں ہم نے، یہ پیسے سمجھے آپ۔ بلیک میل کیا تھا اُس نے ہمیں۔ آئرن ٹاور کے بارے میں تو آپ ضرور جانتے ہوں گے شجاع احمد صاحب۔" چودھری رمضان بولے۔

"یہ آئرن ٹاور کیا چیز ہے؟"

"جو چیز ہے ہمیں پہلے بھی اس کا شبہ تھا لیکن اب یہ شبہ یقین میں بدل گیا ہے۔"

"میں آپ سے پہلے بھی عرض کر چکا ہوں کہ میں گول مول باتیں کرنے کا عادی نہیں ہوں چودھری رمضان، جو معاملہ ہے مجھے صاف صاف بتایا جائے۔ آپ لوگ اگر اس ناخوشگوار لہجے میں اور اس ناخوشگوار ماحول میں مجھ سے ملنا چاہتے تھے تو مجھے پہلے سے اطلاع کی ہوتی۔ میں بھی کوئی گرا پڑا آدمی نہیں ہوں۔ جو آپ کی خدمت میں اس طرح حاضر ہو جاتا۔ میں تو صرف دوستانہ طور پر یہاں پہنچا ہوں۔" شجاع احمد بگڑتے ہوئے لہجے میں بولے۔

"بگڑنے کی ضرورت نہیں ہے شجاع احمد۔ صورتحال سنو اور ہمیں بتاؤ۔ میں تو سب سے زیادہ اس کا شکار ہوا ہوں۔"

"تفصیل بتائیں تو کچھ عرض کروں۔ آپ تو صرف اپنی ہی گائے جا رہے ہیں۔" شجاع احمد صاحب نے بھاری لہجے میں کہا۔

"آئرن ٹاور کیا ہے یہ تم جانتے ہو؟"

"اگر جانتا ہوتا تو آپ سے اس سلسلے میں نہ پوچھتا۔"

"تم نے کبھی اپنے والد صاحب کا تعمیر کردہ فرسٹ ایڈ ہاؤس دیکھا ہے؟"

"جی ہاں! اچھی طرح دیکھا ہے۔"

"کیا فرسٹ ایڈ ہاؤس کے دروازے پر ایک آئرن ٹاور نہیں بنا ہوا ہے؟"

"ہاں بالکل بنا ہوا ہے مگر وہ تو ایک شناختی نشان کے طور پر ہے۔"

"اس شناختی نشان نے ہی ہماری زندگی برباد کر کے رکھ دی ہے۔ میں تمھیں تفصیل سے بتاتا ہوں۔" احمد دین نے کہا اور پھر وہ اپنے بلیک میل ہونے کی کہانی سُنانے لگے جس کے تحت انھوں اٹھادن لاکھ روپیہ آئرن ٹاور کو ادا کیا تھا۔ اسی طرح چودھری رمضان نے بھی اپنا قصہ سُنایا اور اس کے بعد باقی تمام افراد نے بھی جو انہی کی طرح آئرن ٹاور کے ہاتھوں بلیک میل ہو کر یہ رقمیں گنوا چکے تھے۔

"تو پھر آپ کا مقصد یہ ہے کہ یہ آئرن ٹاور فرسٹ ایڈ ہاؤس کی تخلیق ہے؟"

"میاں کروڑوں روپیہ خرچ ہوا ہے اس پر۔ کہاں سے آیا وہ، کیا حسام احمد صاحب اتنے دولت مند آدمی تھے کہ اپنی جیب سے یہ سب کچھ کرتے رہے۔ ٹھیک ہے گورنمنٹ نے بھی انھیں امداد دی ہے مگر کتنی امداد۔ آج اگر ہم یہ تخمینہ لگانے بیٹھ جائیں کہ فرسٹ ایڈ ہاؤس کی تعمیر میں کتنا پیسہ خرچ ہوا تو شجاع احمد لینے کے دینے پڑ جائیں گے تمھیں۔ حکومت تم سے یہ سوال بھی کر سکتی ہے کہ آخر فرسٹ ایڈ ہاؤس کی تعمیر کے لئے روپیہ کہاں سے آیا۔ جتنا روپیہ اس پر خرچ ہوا ہے اس کا تو حساب کچھ نہ کچھ ہو گا ہی۔ باقی رقم کہاں سے آئی۔ اس کے لئے بلیک میلنگ کے علاوہ کچھ نہیں کیا گیا۔"

"تو آپ کا مقصد ہے کہ حسام احمد صاحب نے آپ کو بلیک میل کیا ہے۔" شجاع احمد صاحب بولے۔

"ہاں ــــ!"

"مگر یہ بلیک میلنگ کس سلسلے میں تھی حضرات؟" شجاع احمد صاحب نے پوچھا۔

"یہ ہمارے ذاتی معاملات ہیں اس لئے ظاہر ہے ہم تمھیں نہیں بتا سکتے۔"

"تو پھر مجھے کیا بتانے کے لئے آپ نے یہاں بلایا ہے۔"

"یہی کہ یہ سب کچھ ٹھیک نہیں ہے شجاع احمد۔ ہم لوگ کاروباری ہیں۔ ٹھیک ہے یہ رقمیں ہمارے ہاتھوں سے نکل گئیں اور ہمیں

ان کا دُکھ بھی ہُوا ہے۔ ابھی تو ہم صرف چار یا پانچ ہی افراد ہیں میرا خیال ہے شہر کے تمام بڑے بڑے دولت مند لوگ آئرن ٹاور کے لئے بلیک میل ہوئے ہیں۔ بلیک میلنگ کی یہ رقم ہم سے زبردستی حاصل کی گئی ہے۔"

"فرض کیجئے اگر میں یہ بات مان بھی لوں کہ آئرن ٹاور کا نام فرسٹ ایڈ ہاؤس ہی سے منسوب ہے تو پھر بھی آپ سے یہ سوال ضرور کروں گا کہ آپ نے ان کے خلاف کسی قسم کے ثبوت بھی فراہم کئے ہیں؟"

"ابھی تو صرف اتنا ہی ثبوت ملا ہے کہ آئرن ٹاور فرسٹ ایڈ ہاؤس میں موجود ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ آگے بھی جو کچھ ہوگا تم اس کا اندازہ نہیں کر سکتے۔"

"مجھے یہ دھمکیاں دینے کے لئے بلایا ہے آپ نے؟" شجاع احمد صاحب نے کہا۔

"نہیں، صرف یہ معلوم کرنے کے لئے کہ ان معاملات میں تمہارا ہاتھ کہاں تک ہے؟"

"میں آپ لوگوں کی دولت اور بلیک میلنگ پر لعنت بھیجتا ہُوں۔ سمجھے آپ، میں نے جو کچھ کمایا ہے اپنے قوتِ بازو سے کمایا ہے آپ لوگ یہ الزام مجھ پر نہیں لگا سکتے باقی رہا فرسٹ ایڈ ہاؤس اور آئرن ٹاور کا مسئلہ تو کس احمق نے آپ کو منع کیا ہے کہ اس کے بارے میں آپ تفتیش نہ کریں۔ اگر فرسٹ ایڈ ہاؤس اس سلسلے میں ملوث ہے تو میری دلی خواہش ہے کہ آپ اس کے بارے میں جس طرح چاہیں چھان بین کرائیں اور ان لوگوں کو مجرم ثابت کرکے گرفتار کرا دیں۔ اس سلسلے میں مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔"

"شجاع احمد! گویا... گویا... تم اس معاملے میں ملوث نہیں ہو؟"

"میں آپ کو تیسری بار یہ جملہ کہنے کی اجازت نہیں دے سکتا اگر آپ نے یہ سب کچھ کہا تو پھر میں بذاتِ خود پولیس ڈیپارٹمنٹ میں جاکر اس سلسلے میں اطلاع دوں گا اور آپ لوگوں کی یہ تفصیل جاکر ان لوگوں کو بتا دوں گا۔"

"نہیں، نہیں شجاع احمد! اگر یہ بات ہے تو ہم تم سے معافی چاہتے ہیں لیکن تم ہماری مدد کر سکتے ہو۔ یہ بات معلوم کرکے کہ فرسٹ ایڈ ہاؤس کی تعمیر کے لئے جو رقومات خرچ ہوئی ہیں وہ کہاں سے آئیں؟"

"بہت ساری رقم حسام احمد کے پاس موجود تھی اور کافی رقم میں نے بھی فراہم کی ہے۔ پھر کچھ امداد بھی ملی ہے، فرسٹ ایڈ ہاؤس کو، چونکہ اس ادارے کے مقاصد بہت اچھے ہیں اور پسند کئے گئے ہیں۔"

"اگر کبھی اس کا تخمینہ لگانے بیٹھو تو تم اندازہ لگا سکتے ہو کیا عطیات اور حسام احمد صاحب کا ذاتی اثاثہ اتنا تھا کہ فرسٹ ایڈ ہاؤس جیسا عظیم ادارہ ہو سکتا؟"

شجاع احمد صاحب گہری سوچ میں ڈوب گئے۔ درحقیقت انھوں نے اس بارے میں کبھی نہیں سوچا تھا۔ یہ تصور بھی اُن کے ذہن میں نہیں تھا کہ حسام احمد صاحب بلیک میلنگ جیسا کام بھی کر سکتے ہیں۔ ان کے ذہن میں ایک فلم سی چلنے لگی۔ حسام احمد صاحب کو جاسوسی ناول پڑھنے کا بے پناہ شوق تھا۔ پھر زاہد اُنکے ساتھ شامل ہُوا۔ زاہد نے کوٹھی میں اپنے پنجے گاڑے۔ ہر شخص کو اپنا مطیع کر لیا اور اسکے بعد فرسٹ ایڈ ہاؤس کی بُنیاد ڈالی۔

فرسٹ ایڈ ہاؤس تعمیر ہُوا۔ رقومات حسام احمد اور دُوسرے ذرائع سے حاصل ہُوئیں۔ عطیات کا تخمینہ واقعی اتنا زیادہ نہیں تھا کہ فرسٹ ایڈ ہاؤس جیسی عظیم الشان عمارت اتنے سازوسامان کے ساتھ تیار ہوتی۔ انھیں ان لوگوں کی باتوں میں حقیقت نظر آنے لگی اور ان کا چہرہ غصّے سے سُرخ ہوگیا۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ اگر آئرن ٹاور کے نام سے بلیک میلنگ شروع کی گئی تو یہ بھی زاہد ہی کا کارنامہ ہوگا۔ وہ اندر ہی اندر کھولنے لگے ان کا بس نہیں چلتا تھا کہ زاہد کو اپنے دانتوں سے چبا ڈالیں ان کا پُورا بدن اینٹھن کا شکار ہوگیا تھا پھر انھوں نے آہستہ سے کہا۔

"میری طرف سے آپ حضرات کو مکمل اجازت ہے کہ آپ پولیس سے رابطہ قائم کریں بلکہ میں خود چاہتا ہوں کہ آپ اس سلسلے میں بھرپور کارروائی کریں۔ آپ چاہیں تو میں آپ سب سے پہلے انسپکٹر بنزل صاحب سے مل کر اس سلسلے میں ان سے تفتیش کے لئے درخواست کروں۔ اگر حسام احمد صاحب اس کے مجرم پائے جاتے ہیں تو میں یہ بات بھول جاؤں گا کہ وہ میرے والد ہیں۔ میں انھیں اچھی طرح جانتا ہُوں۔ اس قسم کے آدمی تو نہیں ہیں وہ لیکن کسی کے ورغلانے میں بھی آسکتے ہیں۔ ذرا طبیعت میں سادگی ہے اس لئے ممکن ہے کہ کوئی دُوسرا ان کے کاندھے پر رکھ کر بندوق چلا رہا ہو۔"

"وہ تو ٹھیک ہے شجاع احمد مگر یہ معاملہ پولیس کے کانوں تک لے جایا بھی تو نہیں جا سکتا۔ یہاں پر مسئلہ وہی پیدا ہوتا ہے کہ ہم پولیس سے کیا کہیں گے جس وجہ سے ہمیں بلیک میل ہونا پڑا ہے ظاہر ہے وہ پولیس کی نگاہوں میں تو نہیں لائی جا سکتی۔"

"تو پھر آپ نے یہ فضول باتیں مجھ سے کرنے کی زحمت کیوں گوارہ کی؟" شجاع احمد نے کہا۔

"تمھیں سمجھانا چاہتے تھے کہ جو کچھ ہُوا ہے وہ بہت بُرا ہُوا ہے ہمارے تمھارے تعلقات ہیں۔ اگر تم براہِ راست اس مسئلے میں ملوث نہیں ہو تو اپنے والد صاحب سے معلومات حاصل کرو، ان متعلقہ لوگوں کو چیک کرو۔ جنھوں نے یہ سب کچھ کیا ہے بلاوجہ ہی تو یہ سب کچھ نہیں ہو گیا۔"

"سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آپ کے خلاف ثبوت انھیں کہاں سے فراہم ہو گئے جن کے ذریعے آپ بلیک میل ہُوئے۔"

"میں تو نہیں جانتا لیکن یہ چودھری رمضان آپ کے متعلق کچھ کہہ رہے ہیں۔"

"کیا۔ ۔ ۔ ؟"

"آپ کا ایک مُلازم فضل دین اکثر چودھری رمضان کے ہاں آتا جاتا رہا ہے اور انھیں شُبہ ہے کہ وہی ان کے خلاف ثبوت حاصل کرنے کا ذریعہ بنا تھا؟"

"فضل دین!" شجاع احمد صاحب نے پُر خیال انداز میں گردن ہلاتے ہُوئے دُہرایا۔

"ہاں۔ ۔ ۔ بس یونہی میرا ذہن اس طرف چلا گیا تھا اس کی حرکات وسکنات پُراسرار تھیں۔ بعد میں جب میں سوچنے بیٹھا تو مجھے اندازہ ہُوا کہ وہی ہمارے گھر سے ہمارے راز چُرانے کا ذریعہ بن سکتا ہے۔"

"خیر اب آپ یہ بتائیے کہ مجھ سے کیا چاہتے ہیں؟" شجاع احمد صاحب نے سوال کیا۔

"شجاع احمد اگر ہمارا لہجہ تلخ ہو گیا ہو تو اس کی ہم معافی چاہتے ہیں۔ بس ہم یہی چاہتے ہیں کہ تم حسام احمد صاحب سے بات کرو۔ یہ معاملہ پولیس تک نہ جانے دو اور ہماری رقمیں واپس دلا دو اگر یہ نہیں ہو سکا تو شجاع احمد ہم دُوسرا کام کریں گے اور وہ دُوسرا کام یہ ہو گا کہ جس طریقے سے یہ رقم گئی ہے اُسی طریقے سے ہمیں واپس بھی مل جائے وہی حربہ ہم بھی ان پر آزما سکتے ہیں جو انھوں نے ہم پر آزمایا ہے۔"

"تو میں آپ کو اس کی کھُلی دعوت دیتا ہُوں۔ آپ جو دل چاہے کریں۔ میں آپ کے معاملات میں مداخلت نہیں کروں گا۔"

"مگر ہماری مدد کرنا تو تمھارا فرض ہے۔"

"ویسے یہ مدد مانگنے کا صحیح طریقہ نہیں ہے جو آپ نے اختیار کیا ہے۔"

"بھئی اب اس بات کو ذہن سے نکال دو۔ ہم نے تم سے جو کچھ تلخ لہجے میں کہا ہے۔ ہم اس کے لئے معافی چاہتے ہیں شجاع احمد لیکن تم خود سوچو کاروباری آدمی ہیں۔ اتنی بڑی بڑی رقمیں نکل جانے کی وجہ سے پریشان بھی ہو گئے ہیں اور ہمارا دل بھی تلملاتا رہتا ہے۔ کیا ہم اتنا بھی حق نہیں رکھتے کہ کم از کم اپنے نقصان کا رونا بھی رو سکیں۔"

"لیکن غلط آدمی کے سامنے آپ رونا رو رہے ہیں۔ جائیے حسام احمد صاحب سے ملیئے۔ انھیں یہ دھمکیاں دیجئے۔ یہی زیادہ بہتر رہے گا۔"

"اور اگر تم سے ہم درخواست کریں کہ تم اس سلسلے میں اپنے طور پر تفتیش کرو تو کیا تم اس سے انکار کر دو گے؟" احمد دین صاحب نے کہا۔

"احمد دین صاحب! جس انداز میں آپ نے یہ بات شروع کی ہے وہ مجھے انتہائی ناگوار گزری ہے۔ اگر اس کا انداز کچھ اور ہوتا تو شاید میں ہمدردی سے اس بارے میں غور کرتا لیکن افسوس کہ اب میں آپ کی کوئی مدد نہیں کر سکتا۔ بلکہ میں تو اس بات کا ہی مخالف ہُوں کہ آپ پولیس کو اس کی اطلاع نہ دیں۔ جب میں آپ سے خود عرض کر رہا ہُوں کہ میرے والد صاحب مجرم نکلے اور ان کے خلاف کوئی کارروائی ہُوئی تو کم از کم میں آپ سے اپنے تعلقات خراب نہیں کروں گا تو پھر آپ جو چاہیں کر سکتے ہیں۔"

"نہیں نہیں ابھی ہم پولیس میں نہیں جانا چاہتے۔ تم بھی براہِ کرم ایسا مت کرنا۔ ہم اپنے تحفظ کا مناسب بندوبست کر لیں۔ اس کے بعد ہم اس بات کو بھی ثابت کر دیں گے کہ جو انھوں نے کہا ہے بالکل غلط کہا ہے۔"

"خیر یہ بات تو آپ کبھی کسی دن بھی ثابت نہیں کر سکیں گے۔ آپ سے یہ سوال بھی کیا جا سکتا ہے کہ جب ایک غلط بات تھی تو یہ بتائیں کہ آپ نے بلیک میلنگ کی رقم کیوں ادا کی؟" شجاع احمد صاحب نے کہا۔

"ہاں! یہ ٹھیک ہے بہر حال ہم نے تمھیں یہ سب کچھ بتا دیا ہے اور ہماری مدد کرنا تمھارا فرض ہے۔"

"یہ مجھے سوچنا پڑے گا۔" شجاع احمد نے کہا۔ کافی دیر تک یہ لوگ بیٹھے رہے۔ وہ سب شجاع احمد کو ہموار کرنے کی کوشش کر رہے تھے شجاع احمد صاحب تھوڑی دیر کے بعد کسی قدر نرم پڑے اور کہنے لگے۔

"بہتر یہ ہو گا کہ آپ حضرات دوسرے لوگوں سے بھی رابطہ

قائم کریں اور یہ تفصیلات معلوم کر کے مجھے بتائیں کہ مزید کتنے لوگ بلیک میلنگ کا شکار ہوئے ہیں اور کتنی رقومات انھوں نے دی ہیں۔ آپ اپنا حساب بنا کر مجھے بھی بتا دیجئے تاکہ میں اس سلسلے میں کوئی مناسب کارروائی کر سکوں۔"

"شجاع احمد! ہم سب تمہارے شکر گزار ہوں گے۔"

"اچھا، یہ بتائیے بلیک میلنگ کا یہ سلسلہ اب بھی جاری ہے یا ختم ہوگیا ہے؟"

"اب تو کافی عرصے سے ان بلیک میلروں نے ہم سے کوئی رابطہ قائم نہیں کیا۔"

"ذرا مجھے ان کے کام کے طریقے کے بارے میں بتائیے؟" شجاع احمد نے کہا اور چودھری رمضان انھیں تفصیلات بتانے لگے۔ تمام حالات چیخ چیخ کر کہہ رہے تھے کہ کارروائی زاہد کے علاوہ اور کسی کی نہیں ہو سکتی۔ شجاع احمد صاحب بہت دیر تک غور کرتے رہے۔ پھر ان لوگوں سے اجازت لے کر وہاں سے اُٹھ گئے۔ چلتے ہوئے انھوں نے کہا تھا۔

"میں کوئی وعدہ نہیں کرتا آپ سے۔ رقومات کی واپسی کا تو کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ ہاں اگر میرے اہلِ خاندان یعنی حسام احمد صاحب اس کارروائی میں ملوث ہیں تو میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ آئندہ وہ اس قسم کا کوئی کام نہیں کر سکیں گے۔ باقی معاملات آپ کی اپنی مرضی پر ہیں۔ جس وقت بھی آپ حسام احمد کے خلاف کوئی دعویٰ دائر کریں گے میں اس کے لئے جوابی کارروائی نہیں کروں گا۔ یہ میرا وعدہ ہے لیکن شرط یہی ہے کہ پہلے آپ مکمل ثبوت حاصل کرلیں اور اس کے بعد کوئی کارروائی کریں۔ ورنہ دوسری صورت خود آپ لوگوں کے لئے نقصان دہ ہوگی۔ میں صرف آپ لوگوں کے لئے خاموش ہوا جاتا ہوں ورنہ اصولاً تو مجھے یہاں سے سیدھا آئی جی صاحب کے پاس جانا چاہئے تھا اور اس سلسلے کی تمام تفصیلات بتانی چاہئے تھیں۔"

"مصیبت تو یہ ہے حکومت بھی فرسٹ ایڈ ہاؤس کے معاملات میں بہت زیادہ دلچسپی لے رہی ہے اور حسام احمد صاحب کی بہت بڑی پوزیشن بن گئی ہے۔"

"اگر آپ یہ سمجھتے ہیں تو پھر ان سے ٹکرانے کا تصوّر بھی نہ کریں۔ آپ کو منہ کی کھانی پڑے گی چونکہ جرم آپ سے ہوا ہے اور اس جرم کا جرمانہ بھگتنا پڑا ہے آپ کو۔" شجاع احمد نے کہا۔

"خیر شجاع احمد! یہ بات تو تم غلط کہہ رہے ہو۔ ہم سب ہی کاروباری لوگ ہیں اور کسی نہ کسی طرح ہمارے پاؤں غلط جگہوں پر بھی پھنسے ہوئے ہیں۔ تم خود بھی اس کا شکار ہو گے اس لئے ہمارے سامنے بڑھ کر یہ لو لو۔"

"ٹھیک ہے لیکن میں آپ کی طرح بلیک میل نہیں ہوا۔"

"ہوتے کیسے میاں! اپنے گھر کی بات تھی۔ بھلا تمھیں کون بلیک میل کرتا۔" چودھری رمضان صاحب بڑے جلے کٹے انداز میں بولے۔

"میں آپ کے یہ الفاظ یاد رکھوں گا رمضان صاحب۔" شجاع احمد صاحب نے کہا اور ایک جھٹکے سے مڑ کر واپس چل پڑے۔

وہاں سے نکلنے کے بعد ان کا ذہن ہواؤں میں اُڑنے لگا۔ اگر یہ سب کچھ سچ کہا جا رہا ہے تو اس کا مقصد یہ ہے کہ واقعی ذرا بیٹھ کر حساب کتاب تو لگایا جائے کہ فرسٹ ایڈ ہاؤس کی تعمیر اور اس میں موجود ساز و سامان کی مالیت کیا ہے اور اس کے بعد ہی مزید کارروائی کی جا سکتی ہے۔ اس وقت تو انھوں نے سوچا کہ اپنے آپ کو قابو میں رکھیں گے اور کسی سے اس سلسلے میں تذکرہ نہیں کریں گے جب تک فرسٹ ایڈ ہاؤس کی لاگت کا تخمینہ نہ ہو جائے یہ بات اُن کے لئے ہولناک حیثیت رکھتی تھی۔ اگر یہ سب کچھ ہوا ہے تو اُن کا خاندانی وقار، ان کی عزت سب کچھ خاک میں مل جائے گی۔ حسام احمد صاحب اپنا بچاؤ نہیں کر سکیں گے۔ فرسٹ ایڈ ہاؤس بلاشبہ ایک فلاحی ادارے کی حیثیت رکھتا تھا اور اس کے اغراض و مقاصد بہت ہی انوکھے اور شاندار تھے لیکن اگر یہ پتہ چل جائے کہ اس کی تعمیر میں . . . بلیک میلنگ کا روپیہ بھی شامل ہے تو پھر . . . . . تو پھر دونوں ہی پھنسیں گے۔ حسام احمد صاحب بھی پھنسیں گے اور جس وجہ سے وہ لوگ بلیک میل کئے گئے ہیں وہ وجہ بھی منظرِ عام پر آ جائے گی اور وہ لوگ بھی پھنس جائیں گے۔ بہت سوچ سمجھ کر یہ کام کرنے ہوں گے۔

وہ رات شجاع احمد صاحب کے لئے جاگنے کی رات تھی۔ ساری رات وہ بیٹھے ہوئے فرسٹ ایڈ ہاؤس کے اخراجات کا تخمینہ لگاتے رہے اور یہ اندازہ لگانے میں ان جیسے کاروباری آدمی کو کوئی خاص مشکل نہیں ہوئی کہ فرسٹ ایڈ ہاؤس میں جو رقم حسام احمد صاحب کے اکاؤنٹ سے اور دوسرے ذرائع سے خرچ کی گئی ہے دراصل اس سے تین گنا زیادہ رقم اس پر خرچ ہوئی ہے اور باقی رقم کے حصول کا کوئی ذریعہ ان کے علم میں نہیں تھا اور وہ جانتے تھے کہ حسام احمد صاحب کے خود بھی دوسرے ذرائع نہیں ہیں اس کا مقصد یہ ہے کہ ان لوگوں نے جو بھی کچھ کہا ہے وہ

درست ہے۔ بلیک میلنگ کے ذریعے ہی سے یہ رقم حاصل کی گئی ہے اور بلیک میلنگ پر انھیں اکسانے والا زاہد کے علاوہ اور کون ہوسکتا ہے شجاع احمد صاحب کا پورا بدن سُن ہو رہا تھا دماغ میں سارا خون جمع ہوگیا تھا بس بلڈ پریشر کی سی کیفیت ہوگئی تھی۔ ان کے ذہن میں یہ بات رہ رہ کر آ رہی تھی کہ زاہد ان سے کسی قسم کا انتقام لے رہا ہے انھیں اور ان کے خاندان کو تباہ کرنا چاہتا ہے۔ انھوں نے غرائی ہوئی آواز میں کہا۔

"اگر وہ میرے خاندان کو تباہ کرنے کا منصوبہ بنائے ہوئے ہے تو میں اس کی پوری نسل کو تباہ کردوں گا۔ میرا نام شجاع احمد ہے شجاع احمد۔" وہ غم و غصے سے کھولتے رہے اور جب یہ شدت کسی قدر کم ہوئی تو وہ سنجیدگی سے اس پروگرام کے اگلے اقدامات پر غور کرنے لگے۔ زاہد ان کے لئے دنیا کا سب سے قابلِ نفرت شخص تھا۔ کافی دیر اسی طرح گزر گئی پھر دفعتاً انھیں فضل دین کا خیال آیا۔ فضل دین اُن کا ڈرائیور تھا۔ ان کے تمام ضروری معاملات سے واقف۔ اگر فضل دین نے ان کے چکر میں آ کر یہ حرکت کی ہے تو پھر معلومات کا بہترین ذریعہ وہی ثابت ہوسکتا ہے چنانچہ انھوں نے یہ فیصلہ کرلیا کہ پہلے فضل دین سے اس سلسلے میں معلومات حاصل کریں گے ان کے پاس اس کے لئے بے شمار ذرائع موجود تھے۔ دوسرے دن وہ تمام تیاریوں کے بعد اپنی گاڑی میں بیٹھ کر وہاں سے چل پڑے۔ فضل دین کار ڈرائیو کر رہا تھا۔

"سمندر کے کنارے چلو۔" شجاع احمد صاحب نے کہا اور فضل دین نے چونک کر گردن ہلادی۔ پیچھے پلٹ کر دیکھنے کی ہمت تو نہیں کرسکا تھا۔ یہ صبح ہی صبح سمندر کے کنارے جانے کی صاحب کو کیا سوجھی تھی۔ وہ سوچ رہا تھا۔ اُسے علم تھا کہ سمندر کے کنارے شجاع احمد کی خاصی خوبصورت ہٹ بنی ہوئی ہے جہاں وہ کبھی کبھی اپنے دوستوں کے ساتھ کوئی میٹنگ کرنے جایا کرتے تھے۔ بہرحال وہ بڑی خاموشی کے ساتھ سمندر کی جانب چل پڑا۔

تھوڑی دیر کے بعد وہ فاصلہ ختم ہوگیا چونکہ عام دن تھا۔ اس لئے اس دن تفریح کرنے کے لئے کوئی بھی سمندر کے کنارے کے کنارے نہیں آیا تھا۔ کار فضل دین نے ہٹ کے احاطے میں جا کر روک دی۔

"میرے ساتھ آؤ فضل دین کچھ سامان اُٹھانا ہے یہاں سے۔" شجاع احمد نے کہا اور فضل دین مستعدی سے ان کے پیچھے پیچھے چل پڑا۔ شجاع احمد اس دوران میں اطراف کا بخوبی معائنہ کرچکے تھے۔ کوئی موجود نہیں تھا اور اس وقت کام کرنے کا بہترین موقع تھا۔

چنانچہ وہ فضل دین کو ساتھ لئے ہوئے ہٹ کے بالکل اندرونی کمرے میں پہنچ گئے۔ یہ کمرہ خالی تھا اور یہاں چند میز کرسیوں کے علاوہ اور کوئی چیز نہیں تھی۔ البتہ شجاع احمد صاحب نے نہ جانے کس مقصد کے لئے ایک ہنٹر رکھا ہوا تھا چنانچہ انھوں نے کمرے کا دروازہ اندر سے بند کیا اور میز کی دراز سے ہنٹر نکال لیا۔

ہنٹر دیکھ کر فضل دین کے دیوتا کوچ کرگئے تھے۔ شجاع احمد کی ..... آنکھوں کی خونخوار کیفیت سے اُسے خوف محسوس ہونے لگا اور اُس نے بوکھلائے ہوئے انداز میں منہ کھول دیا۔

"فضل دین، یہ ہنٹر دیکھ رہے ہو۔ میں ہنٹر مار مار کر تمھیں اس جگہ ہلاک کردوں گا۔ کسی کو خبر بھی نہیں ہوگی کہ کیا ہوا۔ تمھاری لاش یہاں سے اُٹھا کر میں ریت کے کسی ٹیلے کے نیچے دفن کردوں گا اور پھر ساری زندگی کوئی یہ نہیں جان سکے گا کہ تمھیں کس نے قتل کیا۔"

"مم... صاحب... مم... مم... میں... میں تو آپ کا نمک خوار ہوں۔" فضل دین نے خوفزدہ لہجے میں کہا۔

"نمک خوار ہو۔ اس لئے تو تمھارے ساتھ رعایت کر رہا ہوں۔ مجھے میرے چند سوالات کے صحیح صحیح جواب دو۔ ورنہ جو کچھ میں نے کہا ہے وہی کچھ میں کردوں گا۔" فضل دین کی حالت خراب ہونے لگی تھی۔ شجاع احمد صاحب نے ہنٹر ہلایا اور پھر غرائی ہوئی آواز میں بولے۔

"احمد دین کے ہاں تو کیا کرنے جاتا تھا؟"

"جی صاحب... وہ..." فضل دین کا چہرہ تاریک ہوگیا۔ دوسرے ہی لمحے شجاع احمد صاحب کا ہنٹر والا ہاتھ گھوما اور فضل دین کی کھال اُدھڑ گئی۔

"میں صرف جواب چاہتا ہوں خاموشی نہیں۔"

"ج... جاسوسی... جاسوسی کے لئے۔ میں ان کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لئے۔" فضل دین نے اپنی چوٹ کو سہلاتے ہوئے کہا۔

"کس قسم کی جاسوسی..." شجاع احمد صاحب بدستور غرائے ہوئے لہجے میں بولے۔

"وہ جی... وہ جی... صرف میں ہی تو نہیں کرتا، دوسرے لوگ بھی تو ہیں، دوسرے بھی تو ہیں۔" فضل دین نے گھگھیاتے ہوئے کہا۔

"دوسروں کے بارے میں بھی معلوم کرلوں گا تجھ سے۔ تو پہلے مجھے میری پہلی بات کا جواب دے کہ کس قسم کی جاسوسی کرنے کے لئے؟"

"جی ان کی خفیہ کارروائیوں کے لئے... جو وہ کرتے ہیں میں ان کے ملازموں سے اور دوسرے لوگوں سے ان باتوں کے بارے میں معلومات حاصل کرکے... کرکے۔"

"ہاں، ہاں کرکے؟" شجاع احمد صاحب نے کہا۔

"زاہد بھائی کو پہنچاتی تھیں۔ یہ ساری باتیں میں زاہد بھائی کے لئے کرتا تھا۔" شجاع احمد صاحب کی آنکھوں میں چمک پیدا ہوگئی تھی۔

"اور کون کون لوگ شامل ہیں اس میں؟"

"جی سبھی لوگ ہیں گل خان چوکیدار، رمضان، جمیلہ اور رحیم داد سب ہی کو تنخواہ ملتی ہے صاحب سب کو الگ سے تنخواہ ملتی ہے۔"

"اور یہ تنخواہ زاہد دیتا ہے؟"

"ج، جی ہاں، جی ہاں!" فضل دین نے جواب دیا۔

"کون کون لوگ تھے جن کے خلاف تم یہ جاسوسی کر رہے تھے؟"

"جی احمد دین۔ نیاز احمد اور...." فضل دین نے بہت سے نام گنا دیئے۔

"تجھے معلوم ہے فضل دین کہ ان کے خلاف جاسوسی کرکے زاہد کیا فائدہ اٹھاتا تھا؟" شجاع احمد صاحب نے پوچھا۔

"جی وہ... وہ انھیں بلیک میل کرتے تھے، اور پتہ نہیں کیا کیا کرتے تھے صاحب، ہم ان ساری باتوں کو کیا جانیں ہم کو تو بس تھوڑی سی رقم کا لالچ تھا اور اس رقم کے لالچ میں ہم کام کر رہے تھے۔" فضل دین نے کہا۔

"ہوں! فضل دین تم لوگ نہیں جانتے کہ زاہد کی وجہ سے تم کتنی بڑی مصیبت کا شکار ہوگئے ہو۔ یہ بات تو تمھارے علم میں بھی ہے کہ بلیک میلنگ حکومت کی نگاہوں میں جرم ہے اور بلیک میلر کو موت کی سزا بھی ہوسکتی ہے اب اس کے لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ صرف زاہد ہی اس معاملے میں پھنسے تم سب بھی مصیبت میں گرفتار ہوجاؤ گے اور پھر یا تو ساری زندگی جیل میں سڑتے رہوگے یا تمھیں پھانسی ہوجائے گی۔ تم لوگ زاہد کے ہاتھوں میں کھیل کر جس عذاب میں گرفتار ہوچکے ہو اس سے بچنے کا صرف ایک ہی طریقہ ہے اور وہ یہ کہ پولیس کے گواہ بن جاؤ تمھیں پولیس کے سامنے یہ گواہی دینی ہوگی کہ یہ تمام کام تم سے زاہد کرواتا تھا اور جب تم کہتے تھے کہ تم یہ کام نہیں کروگے تو وہ تمھیں دھمکی دیتا تھا کہ مصیبت میں پھنسا دے گا۔ بولو! حق نمک ادا کرنے کے لئے تیار ہو یا نہیں۔ زاہد صرف دوسرے لوگوں کے لئے ہی مصیبت نہیں بنا بلکہ تمھارے مالک یعنی میرے لئے بھی وہ بہت بڑا عذاب بن گیا ہے اور میری عزت خطرے میں ہے۔ تم یہ بتاؤ کہ کتنے عرصے سے تم میرا نمک کھا رہے ہو۔ اب یہ بتاؤ تم میری عزت کے لئے کام کروگے یا تھوڑی سی دولت کے لئے...؟" شجاع احمد صاحب نے پوچھا۔

"معاف کر دیجئے صاحب، معاف کر دیجئے، ضرورت نے ہمیں اندھا کر دیا تھا مگر اب ہماری آنکھیں کھل گئی ہیں ہم وہی کریں گے جو آپ کہہ رہے ہیں۔"

"ہوں... تو پھر سب سے پہلا کام تمھیں یہ کرنا ہے کہ اپنی زبان بند رکھو گے۔ اگر تم لوگوں نے ایسا نہیں کیا تو پھر خدا کی قسم میں تمھیں خود پولیس کے حوالے کر دوں گا اور اپنے اختیارات سے کام لے کر تمھیں ایسی سزا دلواؤں گا کہ تم زندگی بھر یاد رکھو گے۔"

"معاف کر دیجئے صاحب، ہمیں معاف کر دیجئے ہم وہی کریں گے جو آپ کہہ رہے ہیں۔ اگر ہم اس سے الگ کریں تو آپ جو سلوک ہمارے ساتھ کرنا چاہیں بے شک کریں۔" فضل دین نے کہا۔

"تو پھر تم لوگ اپنی زبان مکمل طور پر بند رکھو۔" شجاع احمد صاحب نے کہا۔

"یہ زبان اگر کھلے تو کاٹ دیجئے گا سرکار۔ بس ایک بار غلطی ہوگئی۔ اب یہ بار بار تھوڑا ہی ہوگی۔" فضل دین نے کہا اور شجاع احمد صاحب گردن ہلانے لگے۔ اس کے بعد انھوں نے فضل دین کے ساتھ واپسی کا فیصلہ کرلیا۔ ابھی انھیں رحیم داد گل خان، رمضان، جمیلہ وغیرہ کو بھی دیکھنا تھا۔

زاہد کے خلاف پہلی بار ان کے ہاتھ کوئی ایسا ٹھوس ثبوت آیا تھا کہ اب وہ اسے ضائع نہیں کرنا چاہتے تھے، زندگی کے دوسرے مسائل بھی ان کے سامنے تھے لیکن پہلے اس مسئلے سے نمٹنا ان کے لئے ضروری تھا۔

چنانچہ یکے بعد دیگرے انھوں نے ایک ایک ملازم کو مار پیٹ کر اس سے تمام باتیں منوائیں اور پھر انھیں بھی وہی دھمکیاں دیں جو فضل دین کو دی تھیں۔ ملازم بے چارے معمولی سے لوگ

تھے۔ شجاع احمد صاحب کے رُعب میں آگئے اور انھوں نے پکا وعدہ کرلیا کہ وہ پولیس کو زاہد کا کچا چٹھا بتا دیں گے۔ زاہد کا اب ان سے براہِ راست کوئی تعلق نہیں رہا تھا۔ اس لئے وہ ان سے ملاقاتیں بھی نہیں کرتا تھا۔ چونکہ تمام مُعاملات تقریباً مکمل ہو چکے تھے اور اب ان باتوں کی ضرورت نہیں تھی جن کے لئے زاہد ان سے ملتا رہتا... شجاع احمد صاحب کافی عرصہ سوچتے رہے تھے۔

انھیں صرف ایک تردّد تھا وہ یہ کہ حسام احمد صاحب خود بھی زاہد کے ہاتھوں کھلونا بنے ہوئے تھے۔ جب وہ یہ معاملہ پولیس کے حوالے کریں گے تو حسام احمد صاحب پر بھی بات آئے گی اور وہی نتیجہ ہوگا یعنی خود شجاع احمد صاحب بھی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکیں گے۔ کون جانے لوگ یہی الزام لگائیں گے کہ شجاع احمد صاحب براہِ راست ان معاملات میں شریک تھے۔ دو کوڑی کی عزت ہو کر رہ جائے گی ان کی تو۔

چنانچہ انھوں نے غصّہ اختیار کرنے کی بجائے ان سب لوگوں کے سامنے زاہد کا کچا چٹھا کھولنے کا فیصلہ کیا تھا کہ کم از کم اس طرح زاہد کو ان کی نگاہوں سے گرا کر یہاں سے نکال دیا جائے۔ یا اس کے خلاف کوئی ایسی کارروائی کرلی جائے جس میں یہ سب گواہی دینے کے لئے تیار ہُوں۔ اس کے لئے اُنھوں نے ایک اہم معرکہ سر انجام دینے کا فیصلہ کرلیا تھا اور پھر انھوں نے اس کا وقت بھی مقرر کرلیا۔

قدسیہ اور سرفراز کا رشتہ طے ہو چکا تھا۔ شجاع احمد صاحب کو اب اس بات میں کوئی تردّد نہیں تھا کہ وہ سرفراز اور قدسیہ کی شادی کردیں۔ سرفراز کچھ عرصہ پہلے ان کی نگاہوں میں ایک ایک معمولی حیثیت رکھتا تھا لیکن اب اس کی وقعت بہت بڑھ چکی تھی۔ یہ بات پایۂ تکمیل کو پہنچ چکی تھی کہ وہ ناظم علی صدیقی کا بیٹا ہے اور شجاع احمد، ناظم علی صدیقی کی مالی حالت اور خاندانی حیثیت سے بخوبی واقف تھے۔

بیگم صاحبہ کی دلی مُراد بر آئی تھی اور اس سلسلے میں وہ دن رات مصروف رہتی تھیں۔ شجاع احمد صاحب سے ان کی مکمل مفاہمت چل رہی تھی اور وہ بہت خوش نظر آتی تھیں۔ پُورا گھر ہی خوش تھا۔ قدسیہ کی ذہنی کیفیت کا ابھی کوئی تجزیہ نہیں ہو سکا تھا لیکن کم از کم اس کے چہرے پر پھیلی ہوئی شگفتگی سے سب نے یہ اندازہ لگالیا تھا کہ وہ اس رشتے سے بالکل خوش ہے۔ اندرونی حالات تو چند لوگ ہی جانتے تھے۔

ایک شام شجاع احمد صاحب نے یہ محفل جمانے کا فیصلہ کرلیا۔

زاہد گھر پر موجود تھا۔ وہ دیکھ چکے تھے۔ حسام احمد صاحب بھی تھے سب ہی کے موڈ خوشگوار تھے لیکن شجاع احمد صاحب اب اس سلسلے میں ایک آخری ضرب لگانے کی کارروائیوں میں مصروف تھے۔ انھوں نے فیصلہ کرلیا تھا کہ زاہد کے ناپاک وجود سے اس گھر کو پاک کرنے کے بعد ہی یہاں خوشیوں کا دَور دَورہ ہوگا اور اس سلسلے میں انھوں نے اپنی اولادوں کو بھی الگ رکھنا مناسب نہیں سمجھا تھا۔

ہارون کو شجاع احمد صاحب کا پیغام ملا تھا کہ وہ انھیں اپنے کمرے میں طلب کرتے ہیں تو حسبِ معمول اُس کی رُوح فنا ہوگئی لیکن پیغام کو رد نہیں کیا جاسکتا تھا۔ ہارون جب ان کے پاس پہنچا تو شجاع احمد صاحب اُسے بغور دیکھنے لگے انھوں نے پتہ نہیں کیسے آنکھوں میں محبّت کے آثار پیدا کرلئے تھے۔ پھر اُنھوں نے ہارون احمد کو اپنے نزدیک ہی بیٹھنے کی پیشکش کرتے ہوئے کہا۔

"ہارون بیٹے! کبھی آئینہ دیکھتے ہو؟"

"جج... جی ہاں... ڈیڈی... کیوں نہیں۔" ہارون نے جواب دیا۔

"کیا حُلیہ بن گیا ہے تمھارا...؟ تم جیسا خوبصورت جوان کیسی شکل وصُورت کا مالک بن گیا ہے؟ اس کا کبھی تمھیں احساس ہُوا ہے؟"

"ڈ ڈ... ڈیڈی... میں... میں تو مطمئن ہُوں۔"

"ہاں، تم واقعی مطمئن ہوگے کیونکہ تمھاری رگوں میں جو زہر انڈیل دیا گیا ہے وہ ایسا ہی ہے۔"

"زز... زہر... کس نے انڈیلا ہے یہ زہر؟"

"بیٹے! ذہنی طور پر تم مفلوج ہوتے جا رہے ہو۔ سمجھ جاؤ گے سب کچھ سمجھ جاؤ گے۔ آج میں تمھیں اس زہریلے سانپ کی اصل تصویر دکھانا چاہتا ہوں۔ جو ہمارے لئے عذاب بن کر اس گھر میں گھس آیا ہے۔"

"سانپ..." ہارون نے چونک کر چاروں طرف دیکھا۔ اتنی دیر شجاع احمد صاحب کے بلاوے پر قدسیہ بھی وہاں پہنچ گئی پھر شازیہ بھی وہاں پہنچ گئی۔ تھوڑی دیر کے بعد بیگم صاحبہ بھی پہنچ گئیں۔ بڑی دلچسپ صُورتِ حال تھی۔ سب کو حیرت تھی اس بات پر کہ شجاع احمد صاحب نے ایک ایک فرد کو کیوں بلایا ہے۔ شجاع احمد صاحب پُرسکون انداز میں ایک کُرسی پر بیٹھے ہوئے تھے۔ تب بیگم صاحبہ مُسکراتے ہوئے بولیں۔

"کیا بات ہے آج ان سب لوگوں کو کیوں جمع کیا جارہا ہے؟"

"بیگم! میں ان سب کو جمع کر کے یہ بتانا چاہتا ہوں کہ میں ان کا باپ ہوں۔ میں وہ ہوں جس نے ان کے لئے ہمیشہ بہتری سوچی لیکن لوگوں کی نگاہوں سے اس قدر گر گیا کہ اب شاید ان کے اور میرے درمیان رشتے بھی دھندلا گئے ہیں۔ یہ مجھے صرف ایک قصائی سمجھتے ہیں۔ یہ بھول کر کہ میں اس وقت سے ان کا بہی خواہ ہوں۔ جب یہ اپنے طور پر اپنے ہاتھ پاؤں بھی صحیح طور پر نہیں ہلا سکتے تھے۔ میں نے انھیں بتانے کے لئے آخری بار جمع کیا ہے۔ سمجھ جائیں تو سب کی تقدیر، ورنہ اس کے بعد میں وعدہ کرتا ہوں کہ کسی سے کچھ نہیں کہوں گا۔ کسی کے ذہن پر بار نہیں بنوں گا۔ یہ میرے بچے ہیں۔ ان کی صحیح رہنمائی کرنا میرا فرض ہے۔ سمجھ جائیں گے تو انہی کے لئے اچھا ہوگا ورنہ . . ."

"ارے ارے یہ کیسی باتیں کر رہے ہیں آپ؟ ان سب لوگوں کو کیا یہ بات معلوم نہیں ہے کہ آپ ان سب لوگوں کی بہتری کے خواہاں ہیں؟"

"ہاں افسوس تو اسی بات کا ہے کچھ عرصے سے یہ لوگ اس بات کو بھول گئے ہیں اور ایک ایسے سانپ کے زیر اثر آگئے ہیں جو ہمارے خاندان کو ڈسنے کے لئے اس گھر میں آگھسا ہے۔" بیگم صاحبہ نے چونک کر شجاع احمد صاحب کی شکل دیکھی۔

"کون ہے وہ سانپ؟"

"بتا دوں گا . . . بتا دوں گا۔ یوں سمجھو کہ اس گھر کی عزت تباہی کے اس آخری سرے پر آپہنچی ہے جس کے بعد گہری کھائیوں کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے۔ آپ لوگ اچھی سوچ لیجئے اچھی طرح سن لیجئے بغور خیال جو میں آپ لوگوں کو بتا رہا ہوں۔ کس قدر سنگین نوعیت کی حامل ہے۔" شجاع احمد صاحب اتنا ہی کہہ پائے تھے کہ حسام احمد صاحب بھی تشریف لے آئے۔ انھیں بھی خاص طور پر بلایا گیا تھا اور آخری آدمی یعنی زاہد کو بلانے کے لئے آدمی روانہ کر دیا گیا تھا۔ حسام احمد صاحب مسکراتے ہوئے اندر داخل ہوئے تھے اور انھوں نے خوش مزاجی سے کہا۔

"اوہو ہو یہ شجاع احمد صاحب کو شاید خیال آگیا ہے کہ اپنے اہل خاندان کے ساتھ بھی کبھی اپنی خواب گاہ میں اٹھیں بیٹھیں، ان سے بات چیت کریں چلو بھئی ہمیں تو خوشی ہے کہ صبح کا بھولا شام کو واپس گھر آگیا ہے ورنہ ان کے اور ہمارے درمیان تو کچھ ایسی دوری پیدا ہوگئی ہے کہ اب تو حسام احمد کو بھی یہ سوچنا پڑتا ہے کہ کیا کبھی شجاع احمد صاحب کے ساتھ بے تکلفی بھی تھی؟"

"ابوجان! یہ صرف آپ کا خیال ہے۔ میں آپ کے قدموں کی خاک ہوں، اور کبھی بھی یہ بات میرے ذہن سے جدا نہیں ہوسکی کہ آپ کی انگلی پکڑ کر میں نے دنیا دیکھی ہے۔"

"بھئی کمال ہے۔ آج تو ہمیں اپنی اس انگلی پر فخر ہو رہا ہے۔" حسام احمد صاحب نے اپنی شہادت کی انگلی ہلاتے ہوئے کہا اور بچے ہنس پڑے۔ احمد رضا بھی آگیا تھا۔ غرض یہ کہ تمام لوگ جمع ہوگئے تھے۔ پھر حسام احمد بولے۔

"مگر بھائی یہ تقریب کس خوشی میں ہو رہی ہے؟"

"ابوجان! میں آپ سے ہوں۔ مجھ سے پہلے ایک عزت دار انسان کی حیثیت سے اس ماحول سے متعارف ہوئے تھے اور آپ ہی کی عزت کا کچھ حصہ مجھے ملا۔ میں نے آپ کے اشاروں پر چل کر شدید محنت کی اور اس کا نتیجہ ہمارے سامنے ہے لیکن ابوجان! میں آپ کو بتانا چاہتا ہوں کہ آپ عمر کے اس حصے میں وہ تمام ذہانت اور فراست فراموش کر بیٹھے ہیں جس کے تحت آپ نے یہ عزت اور وقار حاصل کیا، ایک ناپاک انسان کے زیر اثر آکر آپ نے وہ کام کیا ہے جو اب ہم سب کے لئے تباہی کا موجب بن گیا ہے۔ میں آپ کو آخری تصویر دکھانا چاہتا ہوں اور اس کے بعد فیصلہ میں آپ سب لوگوں پر چھوڑ دوں گا۔"

زاہد بھی کمرے میں پہنچ گیا لیکن وہ یہاں کا ماحول دیکھ کر مودب ہوگیا تھا۔

شجاع احمد صاحب نے نفرت بھری نگاہوں سے زاہد کو دیکھا اور زاہد نے مسکراتے ہوئے اپنا چہرہ دوسری طرف کر لیا۔ شجاع احمد صاحب اس کی اس حرکت پر بڑی طرح جھنجلا گئے تھے لیکن خود پر ضبط کرتے ہوئے بولے۔

"میرا خیال ہے اب کسی اور کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ دروازہ بند کر لیا جائے۔" اور دروازہ بند ہوگیا۔ تب پھر شجاع احمد بولے۔

"نیاز احمد، احمد دین، رحیم الٰہی، قاضی زاہد حسین اور دوسرے چند سرمایہ داروں نے مل کر فیصلہ کیا ہے کہ وہ ایک وفد کی شکل میں صدر مملکت سے ملاقات کریں اور انھیں فرسٹ ایڈ ہاؤس کا کچا چٹھا بتائیں اس کی گھناؤنی شکل سے روشناس کرائیں۔ یہ بتائیں کہ کس طرح آمرن ٹاور نامی بلیک میلنگ کے ادارے کے ذریعہ بلیک میل کر کے ان سے بڑی بڑی رقمیں،

وصول کی گئی ہیں۔ سو یوں یہ عوام کی بھلائی کا ادارہ تعمیر کیا گیا ہے۔ ان لوگوں نے مجھ سے بھی ملاقات کی تھی اور میں نے نہایت منت سماجت کے ساتھ انھیں روکا ہے اور ان سے وعدہ کیا ہے کہ میں ان کے نقصانات پورے کر دوں گا۔ میں ان کی رقومات واپس کروں گا۔ ابو جان! میں جانتا ہوں آپ سادہ لوح ہیں آپ اگر اس معاملے میں ملوث ہوئے ہوں گے تو صرف اس شیطان کی وجہ سے جو ہماری اس چھوٹی سی جنت میں آگھسا ہے اور جس نے ہمارے درمیان رشتے تک فنا کر دیئے، میں جس نے ہمیں برباد کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی ہے۔ میں نہیں جانتا کہ زاہد کون ہے اور کیوں ہمیں تباہ کرنا چاہتا ہے لیکن یہ حقیقت ہے کہ وہ ہمیں تباہ کر چکا ہے۔"

"بکے جا رہا ہے بکے جا رہا ہے۔ زبان کو لگام دے کمبخت۔" دادا جان کا دماغ گھوم گیا۔

"آج یہ مشکل ہے ابو جان! میں اسے اپنا آخری اقدام قرار دے چکا ہوں۔"

"کہنے دیجیے دادا جان! شجاع احمد صاحب کا خول اُتر رہا ہے انھیں کہنے دیجیے۔" زاہد بولا۔

"میں اپنے ہاتھوں سے تجھے گولی مار دوں گا مردود۔ اتنا مجبور بھی نہ سمجھو مجھے۔" شجاع احمد گرج کر بولے۔

"غلط فہمی کا شکار ہیں آپ شجاع احمد۔ یہ کام آپ کے لئے آسان نہیں ہوگا۔ بہت نڈر ہیں آپ۔ ذرا دیکھوں آپ انسانوں کو کس طرح قتل کرتے ہیں۔" زاہد کے لہجے میں پہلی بار ان لوگوں نے ایک انوکھی غراہٹ سنی تھی۔ شجاع احمد بھی دنگ رہ گئے تھے لیکن پھر وہ سنبھل کر بولے۔

"ہاں! اپنا اصلی روپ ضرور دکھاؤ ان لوگوں کو زاہد تاکہ یہ تمھاری حقیقت سمجھ سکیں۔"

"آپ میری حقیقت نہیں سمجھ سکے شجاع احمد صاحب یہ بیچارے تو..." زاہد نے جواب ادھورا چھوڑ دیا۔

"میں زاہد کو پولیس کے حوالے کرنا چاہتا ہوں۔"

"میں جس وقت پولیس کی تحویل میں پہنچوں گا شجاع احمد صاحب تو اس کے ٹھیک ایک گھنٹے کے بعد آپ بھی میرے پاس ہوں گے یہ زاہد کا قول ہے۔ اگر آپ مجھے آزمانا چاہتے ہیں تو بسم اللہ!"

"تم خاموش ہو جاؤ زاہد۔ میں بات کرتا ہوں اس سے۔ ہاں تو عزیزم ان تمام سرمایہ داروں کا یہ ارادہ ہے مگر تمھیں کیا پریشانی ہے بھائی۔ تم ان کی رقمیں کیوں ادا کرنا چاہتے ہو۔ جانے دو انھیں صدر مملکت کے پاس ذرا دلچسپیاں رہیں گی۔ ثبوت بھی تو دینے ہوں گے۔ اگر وہ ثبوت دے سکے تو ہمیں گرفتار ہونے میں کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ ہم خوشی سے خود کو گرفتاری کے لئے پیش کر دیں گے۔ ذرا جیل کی آب و ہوا بھی دیکھنے کو مل جائے گی۔" دادا جان بولے۔

"میری عزت کا کوئی خیال نہیں ہے آپ کو؟" شجاع احمد صاحب نے کہا۔

"چلو ہم اعتراف کرتے ہیں شجاع احمد کہ ہم نے ایسا کیا۔ ان کی ناپاک کمائی میں سے غریب اور ناداروں کے لئے کچھ حصہ وصول کر لیا لیکن بیٹے عدالتیں ان کے باپ کی سسرال نہیں ہیں جس جرم کی پاداش میں انھوں نے ہمیں یہ رقمیں ادا کی ہیں وہ بھی تو سامنے آئے گا۔ اگر وہ اسے جھٹلا سکتے تو ہمیں ایک پائی بھی ادا نہ کرتے۔ کیا خیال ہے وہ بچ جائیں گے۔"

"وہ بچیں یا نہ بچیں لیکن میرا خاندان بلیک میلروں کا خاندان نہیں کہلائے گا۔" شجاع احمد صاحب نے کہا۔

"اس حمام میں سبھی ننگے ہیں شجاع احمد۔ ہمیں ان کے آگے بڑھنے کا انتظار ہے تمھیں اگر کسی کی رقم ادا کرنے کا شوق ہے تو ضرور پورا کرو لیکن ہماری بھی سن لو۔ ان میں سے ایک بھی کہیں نہیں جائے گا۔ ان کے دل اپنے گناہوں اور خوف کی وجہ سے دلفگار ہیں وہ بے غیرت کیا کہیں جائیں گے۔"

"آپ لوگوں نے کوٹھی کے ملازموں سے بھی جرائم کرائے ہیں۔ کیا نہیں کیا ہے آپ لوگوں نے۔ نوکروں کا حوصلہ ہی کتنا ہوتا ہے۔ کہیں بھی زبان کھول سکتے ہیں رحیم داد، جمیلہ، فضل دین اور دوسرے یہ ہمارے نوکر ہیں اور آپ نے ان لوگوں سے جاسوسی کرائی ہے۔"

"دادا جان!" زاہد نے دخل دیا۔ "صورتِ حال واضح ہو گئی۔ شجاع احمد کی معلومات کا ذریعہ یہی لوگ ہیں باقی کہانی ان کی اپنی ہے۔ میں خود بھی یہی سوچ رہا تھا کہ ان لوگوں کو یہ جرأت کیسے ہوئی لیکن اب یہ مسئلہ بھی حل ہو گیا۔ ٹھیک ہے شجاع احمد صاحب وہ لوگ جو کچھ کرتے ہیں کرنے دیجیے آپ اس سلسلے میں فکر نہ کریں۔"

"وہ لوگ کچھ کریں یا نہ کریں زاہد لیکن میں تمھیں ضرور فنا کر دوں گا۔ میں خود پولیس کو یہ کیس دوں گا۔ آج ہی عزت دو کوڑی کی ہوتی ہے تو ہو جائے۔ جو کل ہونا ہے وہ آج ہی ہو

جائے۔" شجاع احمد نے کہا۔ "میں اس خاندان کو بلیک میلروں کا خاندان نہیں بننے دوں گا۔"

"صرف بلیک میلروں کا خاندان نہ کہیں شجاع احمد صاحب۔ بلیک مارکیٹوں اور اسمگلروں کا خاندان بھی کہیں۔ جیل گڑھی کے گوداموں کا بھی ذکر کریں جن میں کروڑوں روپے کی مشینری اسمگل ہو کر بھری پڑی ہے اور اس کی وجہ سے لاتعداد صنعتی کارخانے بند پڑے ہوئے ہیں کیونکہ آپ اسپیئر پارٹس کی قیمتیں بڑھانا چاہتے ہیں۔ عالم پور کے اناج کے گوداموں میں سڑ جانے والی غیر ملکی شکر کا ذکر بھی آئے گا جو خفیہ طور پر آئی ہے اور شجاع احمد نے اُسے جعلی لائسنس حاصل کر کے اُسے منگوایا ہے۔ وہ شکر عوام میں پہنچنے کے بجائے۔۔ گوداموں میں سڑ رہی ہے۔ یہ کام بھی آج ہی ہو گا۔ ہوم سیکریٹری صاحب کو اس تمام کھیل کی اطلاع بھی آج ہی ہو گی۔ اگر یہ دو باتیں کافی نہ ہوں تو میں تیل کے اس جہاز کی تباہی کا تذکرہ بھی کروں جو غرق نہیں ہُوا تھا۔ بلکہ غرق کرا دیا گیا تھا، اور سویا بین کے اس ذخیرے کی تباہی کے بعد آج بھی گھی کی قیمت بڑھی ہوئی ہے حکومت تو حکومت عوام بھی آپ کو نہیں چھوڑیں گے شجاع احمد صاحب!"

شجاع احمد کی کیفیت ایکدم بدل گئی۔ یُوں لگا جیسے ایکدم غبارے کی ہَوا نکل گئی ہو۔ ان کا چہرہ ہلدی کی طرح زرد ہو گیا۔ تمام لوگ اور خود داداجان حیران رہ گئے تھے۔

"پانی۔۔۔ پانی۔ ایک گلاس پانی" وہ بمشکل تمام بولے اور ان کے لئے پانی منگوایا گیا۔

"میرا نام زاہد ہے شجاع احمد صاحب! اندازہ لگالیں میرا ایک وار پانی مانگنے پر مجبور کر دیتا ہے۔" زاہد نے کہا لیکن شجاع احمد کی زبان پر تو تالا لگ گیا اور ایک لفظ بھی نہ بولے۔

"یہ کیا معاملہ ہے زاہد؟" داداجان بولے۔

"معافی چاہتا ہوں داداجان! اس سلسلے میں اگر میری زبان کھُلی تو صرف پولیس کے سامنے کھُلے گی۔ جتنے لوگوں کے نام میرے سامنے لئے گئے ہیں۔ ان پر میں بیس بیس لاکھ روپے جرمانہ کرتا ہوں۔ انھیں اس رقم کی ادائیگی کے نوٹس کل روانہ کر دیئے جائیں گے اور صرف سات دن کی مدت دی جائے گی۔ انھیں، آٹھواں دن صرف ان کی خودکشی کا دن ہو گا، اور شجاع احمد صاحب اگر آپ اپنی جان بخشی چاہتے ہیں تو ایک کروڑ روپیہ سات دن کے اندر فرسٹ ایڈ ہاؤس کے اکاؤنٹ میں جمع کرا دیجئے۔ یہ آئرن ٹاور کا حکم ہے۔ اگر ایسا نہ ہُوا تو آٹھویں دن یہ تمام دستاویزات ہوم منسٹری پہنچ جائیں گی۔" زاہد کی غرائی ہُوئی آواز اُبھری اور اس کے بعد وہ پُروقار قدموں سے چلتا ہُوا کمرے کا دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔

سب سکتے کے سے عالم میں رہ گئے تھے۔ کافی دیر کوئی کچھ نہ بولا۔ پھر دفعتاً شجاع احمد بولے "مرجاؤ۔۔۔ تم سب مرجاؤ خدا کرے۔ آہ تم نے مل کر مجھے تباہ کر دیا ہے، آہ کیا کروں میں۔ بتاؤ کیا کروں میں۔۔۔؟" شجاع احمد کی آواز ایکدم گلوگیر ہو گئی تھی۔

"اگر اُس نے جھُوٹے الزامات لگائے ہیں تو اس کو پولیس کے حوالے کر دو۔ ورنہ پھر خداوندِ کریم سے توبہ کرو اور اپنی عاقبت سنوارو۔" داداجان نے کہا اور وہ بھی اُٹھ کر باہر چلے گئے۔

☆☆

چھ ہزار گز پر ایک عالیشان کوٹھی خریدی گئی تھی۔ زاہد سرفراز اور حمایت علی بیگ صاحب نے دن رات محنت کر کے اُسے آراستہ کر لیا۔ دولت کے کھیل ایسے ہی ہوتے ہیں۔ ٹھیک آٹھ دن کے بعد زاہد خود نشاط کے ساتھ دس ٹرک نے کر پہنچا اور مہرالنساء بیگم کو شہر لے آیا۔ تمام مُلازم ساتھ آئے تھے۔ نشاط کی مسرت کا ٹھکانہ نہیں تھا۔ خود انھیں تو مہینوں لگ جاتے۔ اس پورے ہفتے زاہد شجاع احمد کی کوٹھی نہیں گیا تھا۔ ہاں فون پر اس کا رابطہ حسام احمد صاحب سے قائم تھا۔ تمام رقمیں وصول ہو گئی تھیں۔ یہاں تک کہ شجاع احمد صاحب نے بھی ایک کروڑ روپے جمع کرا دیئے تھے شجاع احمد کی کوٹھی میں البتہ صفِ ماتم بچھی ہُوئی تھی۔ ایک ایک فرد زاہد کے لئے پریشان تھا۔ قدسیہ اپنے کمرے میں گھُسی رہتی تھی۔ بیگم صاحبہ پانچ دن سے کھانے میں شریک نہیں ہوئی تھیں۔ کوئی شجاع احمد سے بات نہیں کرتا تھا۔ جہاں تک کہ فیصل بھی ان سے کچھ ناراض تھا۔

شجاع احمد کی ذہنی حالت ابھی تک خراب تھی کمبخت زاہد نے جو انکشافات کئے تھے۔ انھوں نے شجاع احمد کی رُوح کو بھی لرزا دیا تھا۔ ایک بات بھی غلط نہیں تھی۔ اس کے ذرائع لامحدود تھے۔ احمد دین نے ایک بار پھر ان سے ملاقات کی تھی لیکن شجاع احمد بُری طرح پیش آئے تھے۔

دوسری طرف زاہد مہرالنساء بیگم کے لئے دن رات مصروف تھا۔ اُس نے اپنی فہم و فراست سے کام لے کر آن کی آن میں سارے مسئلے حل کر دیئے تھے۔ توفیق صاحب پر مقدمہ قائم ہو

گیا تھا۔ دستاویزات ہینڈ رائٹنگ ایکسپرٹ نے مسترد کردی گئی تھیں۔ مہرالنساء بیگم اب بہت پچھتا رہی تھیں۔ اُن کی ہمت نہیں پڑ رہی تھی کہ زاہد سے حسینہ کی بات کریں۔ نشاط زاہد کے رازوں کی امین تھی۔ ماں کے پوچھنے پر انھوں نے بتایا کہ اس سلسلے میں اُس کی زاہد سے کچھ پوچھنے کی جرأت نہیں ہے۔ پھر ایک دن مہرالنساء بیگم نے ہمت کر ہی ڈالی۔

"ظفر بیٹے! تم شمشیر زمان کے پیار کا قرض کبھی کا اُتار چکے ہو اور اب جو کچھ کر رہے ہو وہ ہم پر قرض ہو رہا ہے۔ ہم اس کی ادائیگی کیسے کریں گے؟"

"آپ مجھے غیر سمجھتی ہیں امی؟" زاہد نے کہا۔

"انسان بے حد خود غرض ہے بیٹے! اپنے ہمدردوں سے پیار کرتا ہے اور دشمنوں سے نفرت۔ ایک دن وہ تھا جب میں نے تمھیں . . . میں ان لمحات کے لئے خود کو کبھی مُعاف نہیں کرسکوں گی، اور آج جب تم نے ہمیں نئی زندگی دی ہے ہم سب تمھارے گُن گا رہے ہیں لیکن ظفر تم اپنی اعلیٰ ظرفی سے کام لے کر مجھے معاف کر چکے ہو پھر ہمیں غربت کا احساس کیوں دلا رہے ہو؟"

"اگر مجھ سے ایسی کوئی گستاخی ہوگئی ہے امی تو اُسے سنے بغیر آپ سے معافی چاہتا ہوں۔" زاہد نے کہا۔

"ایسے معاف نہ کریں امی۔ یہ ظفر بہت چالاک ہیں، اصل بات سُنے بغیر گول کردیں گے۔" نشاط نے کہا۔ صوفیہ اور نزہت بھی مُسکرا دیں۔

"نہیں نشاط! میں امی کے ہر سوال کا جواب دینے کے لئے تیار ہوں۔" زاہد نے سنجیدگی سے کہا۔

"تو بتاؤ، حسینہ کہاں ہیں؟" بیگم صاحبہ نے کہا اور زاہد فوراً کسی سوچ میں گم ہو گیا۔ پھر اس کے بعد اُس نے بھاری لہجے میں کہا۔

"مجھے اس سوال کے جواب کے لئے ابھی کچھ وقت درکار ہوگا امی جان ممکن ہے زیادہ وقت نہ لگے۔ یا پھر اگر آپ کا سوال اتنا ہی محدود رہے تو اس کا جواب ہے کہ وہ یہیں موجود ہیں۔ آپ کے اسی شہر میں اور آرام سے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ آپ مجھے یہ مہلت ضرور دے دیں گی۔" بیگم مہرالنساء خاموش ہوگئی تھیں۔

دادا جان نے سرفراز کو حکم دیا تھا کہ زاہد کو فوراً ان سے ملایا جائے۔ پچھلے کئی دنوں سے زاہد نہ تو فرسٹ ایڈ ہاؤس آیا تھا اور نہ اُس نے کوئی فون کیا تھا۔ وہ نہ سرفراز کے ہاں رہتا تھا اور نہ مہرالنساء کی کوٹھی میں۔ تاہم سرفراز سے اس کا رابطہ ضرور رہتا تھا۔ چنانچہ دادا جان کے حکم کی تعمیل میں وہ فرسٹ ایڈ ہاؤس پہنچ گیا۔

دادا جان بولے۔ "یہ تم نے کیا چکر چلایا ہے زاہد؟ مسلسل غائب ہو۔ کہاں رہتے ہو آجکل؟"

"میں اب اجازت چاہتا ہوں دادا جان۔ میں محسوس کر رہا ہوں کہ اب میرا کام آپ کے ہاں سے ختم ہوگیا ہے۔ کوئی اور میرے لائق خدمت ہو تو بتائیے۔ ورنہ اب پھر آپ مجھے اجازت دے دیجئے۔"

"ہم سے کیا غلطی ہوئی ہے بیٹے؟ ہم نے تو شجاع احمد کا ساتھ نہیں دیا . . . ؟" دادا جان ایک دم گلوگیر لہجے میں بولے۔

"وہ آپ کا چمن ہے دادا جان! بہت سے پھول توڑے ہیں میں نے وہاں سے۔ اب اسے مزید اجاڑنے کی سکت نہیں ہے مجھ میں۔"

"تم بھی تو اسی چمن کے پھول ہو زاہد۔ اگر مجھ سے کوئی غلطی ہوئی ہے تو میری بوڑھی عقل کی رہنمائی کرو۔ میں تو اب تمھارے سہارے چلنے کا عادی ہوگیا ہوں۔" دادا جان کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے تھے۔

"وہ شجاع احمد کی کوٹھی ہے دادا جان! اور وہ میرے دشمن ہیں۔ میں اب اُس کوٹھی میں نہیں جاؤں گا۔" زاہد نے کہا اور حسام احمد اپنے آنسو خشک کر کے اُسے گہری نگاہوں سے دیکھنے لگے پھر بولے۔

"کل سے فرسٹ ایڈ ہاؤس ضرور آؤ گے۔ یہ میرا حکم ہے۔"

"بہتر ہے دادا جان!" زاہد نے جواب دیا اور پھر اس نے اجازت طلب کرلی۔

اسی شام کوٹھی کے سارے افراد دادا جان کے پاس جمع تھے۔ دادا جان نے انھیں زاہد کے بارے میں گفتگو کرنے کے لئے بُلایا تھا۔

"زاہد اس کوٹھی سے چلا گیا ہے اور اب وہ یہاں کبھی نہیں آئے گا۔"

"اب وہ ہیں کہاں دادا جان؟ سُنا ہے آج وہ آپ کے پاس آئے تھے۔ مجھ سے بھی نہیں ملے۔" احمد رضا نے کہا۔

"مجھ سے اجازت مانگ رہا تھا۔ کہتا ہے اس نے میرے بچّوں کو بہت اجاڑا ہے۔ اب یہاں زیادہ بربادی کرنا نہیں چاہتا۔ اُس نے کہا کہ وہ شجاع احمد کی کوٹھی ہے اب وہ اس میں نہیں جائے گا۔"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے؟" بیگم صاحبہ بولیں۔

"اُس نے یہاں جو تباہی پھیلائی ہے اس سے سب واقف ہیں۔ اس کی ہم سے یہ بے اعتنائی دُرست ہے۔ اب کسی کو اس سے کیا کام رہ گیا ہے۔ اب کسے اس کی ضرورت ہے۔ ایک ایک کے لئے مرا ہے وہ۔ اس کے لئے مرنے والا کون ہے جواب دو گے تم لوگ مجھے؟"

"ہم سب اس کے لئے مرنے کو تیار ہیں دادا جان" قدسیہ رو پڑی۔

"اتنے دن ہو گئے اُسے یہاں سے گئے ہوئے۔ کیا کیا ہے تم لوگوں نے؟ اب یہ بھی اسی کا کام ہے کہ وہ تمھیں بتائے کہ تم اس کے لئے کیا کرو۔ دیکھو! بہو، بچّو، میں اپنی سوچ کا مالک ہوں۔ تم سب مجھے عزیز ہو لیکن خُدا کی قسم میرا خون نہ ہونے کے باوجود زاہد بھی مجھے تمھارے برابر ہی پیارا ہے۔ وہ مجھے خود سے الگ نہیں معلوم ہوتا۔ وہ اس گھر میں نہیں آئے گا تو میں بھی اس گھر میں نہیں رہوں گے۔ وہ جہاں بھی رہے گا میں اس کے ساتھ رہوں گا۔ تم لوگ مجھے اس کے لئے مُعاف کر دینا۔"

"دادا جان! خُدا کی قسم اگر آپ یہاں نہیں رہیں گے تو میں بھی یہاں نہیں رہوں گا۔" ہارون نے کہا۔

"ہم میں سے کوئی بھی یہاں نہیں رہے گا دادا جان!" قدسیہ بولی۔

"میں بھی آپ کے ساتھ چلوں گا دادا جان!" فیصل بولا۔

"ٹھیک ہے۔ میں بھی یہ گناہ کروں گی۔ جب میرے بچّے میرے ساتھ نہیں ہوں گے تو۔ ۔ ۔" بیگم صاحبہ نے کہا اور اُسی وقت شجاع احمد دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گئے۔ ان کا چہرہ لال بھبھوکا ہو رہا تھا۔

"زاہد کا سُلگایا ہُوا جہنم معمولی نہیں ہے۔ اس کا مجھے بخوبی احساس ہے میرا اپنا گھر جس کے خلاف سازشوں کا مرکز بنا ہُوا ہے اس لئے میں نے آپ لوگوں پر نگاہ رکھنا ضروری سمجھا تھا اور اس وقت بھی میں اس اجتماع سے بے خبر نہیں تھا ابّا جان! میں خودکشی کرنا پسند کروں گا لیکن زاہد اس گھر میں کبھی نہیں داخل ہو گا۔ اگر سب لوگ اس کے لئے مجھے چھوڑنا چاہتے ہیں تو ٹھیک ہے۔ مجھے منظور ہے۔ یہی کہنے کے لئے حاضر ہُوا تھا۔ ۔" شجاع احمد نے کہا اور جس طرح اچانک آئے تھے اُسی طرح باہر نکل گئے۔

"میں تیرے اس حق سے انحراف نہیں کروں گا شجاع احمد بے شک یہ گھر تیرا ہے" دادا جان نے کہا، اور پھر بولے "میں فرسٹ ایڈ ہاؤس جا رہا ہُوں اور اب میں اس گھر میں واپس نہیں آؤں گا تم لوگ اپنے بارے میں خود فیصلہ کر لینا۔ خُدا حافظ!" دادا جان باہر نکل گئے۔ کمرے میں گہری خاموشی طاری تھی۔ پھر احمد رضا نے کہا۔

"امّی! ڈیڈی کا ہم سب پر حق ہے لیکن ہم بچّے نہیں ہیں میں صرف اُصول کے لئے ڈیڈی کو چھوڑ رہا ہُوں۔ فرسٹ ایڈ ہاؤس میں بہت جگہ ہے اور اب میں وہاں پناہ لینے والوں میں شامل ہُوں۔ حالات، واقعات اور وقت یہ ثابت کر چکے ہیں کہ ڈیڈی صرف اپنی ذات کے لئے زندہ ہیں۔ انھیں ہم میں سے کسی سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ زاہد کو وہ صرف اس لئے ناپسند کرتے ہیں کہ زاہد نے ہمیں زندہ رہنے کا فن سکھایا۔ اس نے ہماری بہتری کے لئے وہ سب کچھ کیا جو کسی انسان کے بس میں ہو سکتا تھا۔ زاہد نے فرسٹ ایڈ ہاؤس تعمیر کرایا۔ اس کے ذہن میں دُکھی انسانیت کا درد تھا اور اس کے لئے اگر اُس نے دولت مندوں سے کچھ رقومات وصول کیں تو وہ اس میں حق بجانب تھا کیونکہ دوسری شکل میں یہ لوگ اپنی تجوریوں کو ہاتھ ہی نہ لگاتے۔ ڈیڈی خود بھی مجرمانہ کارروائیوں میں ملوث تھے اور آپ سب لوگوں نے دیکھ لیا کہ زاہد کے ایک معمولی سے اشارے پر ان کے حواس گم ہو گئے۔ زیادہ سے زیادہ وہ کیا کر سکتے تھے۔ یہی نا کہ ہم سب کو اپنی اولادوں کو اپنے سرمائے سے اپنی جائیداد، اپنی کوٹھی سے محروم کر دیں تو امّی میں بڑا ہو چکا ہُوں۔ میں کسی ایسے باپ کا احسان مند نہیں ہو سکتا جو جرائم پیشہ ہو۔ میں اپنی ماں اور اپنے بہن بھائیوں کی کفالت کرنے کے قابل ہو چکا ہوں۔ اس کے باوجود میں یہ کہنے کا حق نہیں رکھتا کہ آپ لوگ بھی میرے ساتھ چلئے لیکن میں اب معذرت خواہ ہوں کہ اس کوٹھی میں نہیں رہ سکتا۔"

"احمد رضا جلدبازی سے کام مت لو۔ کچھ سوچو، کچھ غور کرو۔" بیگم صاحبہ نے کہا۔

"امّی! آپ نے سُنا نہیں ڈیڈی آخری الفاظ کہہ چکے ہیں۔

میں زاہد کو نہیں چھوڑ سکتا اور جو زاہد کو نہیں چھوڑ سکتا وہ اس کوٹھی میں نہیں رہ سکتا۔"

"اُسے کوئی نہیں چھوڑے گا۔ خُدا کی قسم وہ بھی میری اولاد ہے وہ میرا بچّہ ہے سمجھے احمد رضا۔ میں اسے تم سے کم نہیں سمجھتی۔ واہ بھلا کیسے چھوڑ دوں اُسے۔ کیا کچھ نہیں کیا اُس نے ہمارے لئے۔ اپنے آپ کو ذلیل و خوار کر لیا اور ہم اُسے چھوڑ دیں۔ کیا یہ ہمارا فرض نہیں ہے کہ وہ جو ساری زندگی ہمیں تحفظ فراہم کرتا رہا ہے اب ہم اُسے تحفظ دیں چلو احمد رضا۔ تم! میں تمھیں مجبور نہیں کروں گی لیکن میں تمھارے باپ کا گھر چھوڑ کر جا رہی ہوں۔ میں احمد رضا کے ساتھ جا رہی ہوں۔ تم میں سے جو بھی میرے ساتھ چلنا چاہے۔ اپنی مرضی، اپنی خوشی سے چل سکتا ہے ورنہ یہ تمھارے باپ کا گھر ہے۔"

"کمال ہے امّی! وہ ہم سب ہی کو یہاں سے نکل جانے کے لئے کہہ کر چلے گئے ہیں۔ اب ہم یہاں کیسے رہ سکتے ہیں۔" شازیہ نے کہا۔

"تو پھر ٹھیک ہے انھیں یہاں تنہا رہنے دیا جائے۔ وہ یہاں تنہا رہیں گے۔ اس جائیداد، اس کوٹھی، اس دولت سے عیش کریں گے۔ ہمارے لئے بھی خُدا نے سب کچھ مہیا کر دیا ہے ہم اپنے زاہد بھائی کے پاس رہیں گے۔" ہارون بولا۔

اس کے بعد یہ لوگ اجتماعی شکل میں کوٹھی سے باہر نکل آئے۔ دادا جان شدید غصّے کے عالم میں سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر چلے گئے تھے۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد یہ سب ہی فرسٹ ایڈ ہاؤس پہنچ گئے تھے۔ دادا جان کو جب یہ اطلاع ملی تو وہ ان کے پاس پہنچے اور انھیں بغور دیکھتے ہوئے بولے۔

"تم لوگوں نے میرے خیال میں بہت جلدی کی ہے۔ تم سب کو سوچنا چاہئے تھا۔ اس نے توہین تو صرف میری کی ہے۔ میں باپ ہوں اس کا، لیکن اُس نے صاف کہہ دیا کہ زاہد کے طرفدار اس کوٹھی میں نہیں رہ سکتے۔"

"تو دادا جان! ہم سب زاہد ہی کے طرفدار ہیں۔ آپ ہمیں اپنے فرسٹ ایڈ ہاؤس میں جگہ دے دیجئے۔"

"فرسٹ ایڈ ہاؤس بہت بڑا ہے۔ اتنا کشادہ سینہ ہے اس کا کہ ہزاروں خاندان اس میں سما سکتے ہیں۔ آؤ۔ میں تمھیں تمھاری رہائش گاہ دکھاؤں۔" دادا جان انھیں لے کر فرسٹ ایڈ ہاؤس کے ایک حصّے میں پہنچ گئے اور پھر ایک خوبصورت حصّے میں ان کو منتقل کر دیا گیا۔ یہاں کس چیز کی کمی تھی۔ بہت سے بے خانماں خاندان آباد تھے۔ انہی میں یہ خاندان بھی شامل ہو گیا۔

کوٹھی چھوڑ کر آئے تھے یہ لوگ لیکن دلوں میں کچھ ایسے جذبے تھے کہ یہاں آکر خاصے مسرور ہو گئے۔ فرسٹ ایڈ ہاؤس تو ایک شہر تھا۔ یہاں موجود لوگوں کی زندگی کا تجزیہ ایک بہترین مشغلہ ہو سکتا تھا اور پھر لوگوں کو جب یہ معلوم ہو گا کہ ان میں آ بسنے والے کون ہیں تو وہ ان کا کتنا احترام کریں گے۔ کتنا پیار دیں گے انھیں۔ یہاں آکر تو اچھی خاصی تفریحِ طبع کا سامان ہو گیا تھا۔

دوسرے دن زاہد دادا جان کے حکم کے مُطابق فرسٹ ایڈ ہاؤس پہنچ گیا۔ دادا جان اپنے آفس میں موجود تھے۔ احمد رضا کلینک میں اپنا کام کر رہا تھا۔ آج تو سرفراز بھی آیا تھا اور نشاط بھی اپنی ڈیوٹی پر موجود تھی۔ زاہد ان سب کو دیکھ کر مسرور ہو گیا۔ دادا جان نے اُسے اپنے دفتر میں طلب کیا اور زاہد ان کے دفتر کی جانب چل پڑا لیکن دفعتاً اُسے ٹھٹک جانا پڑا۔ تھوڑے ہی فاصلے پر فیصل میاں کھڑے ہوئے کسی سے گفتگو کر رہے تھے۔ اچانک ان کی نگاہ زاہد پر پڑی۔ زاہد کو اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا تیزی سے آگے بڑھا۔ فیصل بھی دوڑتا ہُوا اس کے قریب پہنچ گیا تھا۔

"اوہو زاہد بھائی! زاہد بھائی، آپ یہاں کیسے نظر آ رہے ہیں؟" فیصل بولا۔

"بھئی جاسوسِ اعظم! یہی سوال تو ہم آپ سے بھی کرنا چاہ رہے ہیں۔"

"ہم تو یہاں رہنے کے لئے آگئے زاہد بھائی۔ کتنا مزہ آ رہا ہے۔ یہ تو بڑی عمدہ جگہ ہے۔ مجھے تو یہاں آکر اتنی خوشی ہو رہی ہے کہ میں آپ کو بتا نہیں سکتا۔"

"سب یہاں آگئے؟" زاہد نے متعجبانہ انداز میں پُوچھا۔

"ہاں! امّی، قدسیہ باجی، ہارون بھائی، شازیہ آپی۔ ہم سب ہی یہاں آگئے ہیں۔ دیکھئے ادھر ہمارا گھر ہے۔" فیصل نے کہا اور زاہد کا سر چکرا کر رہ گیا۔ وہ دادا جان کے کمرے کی طرف جانا بھول گیا اور فیصل کے ساتھ اس طرف چل پڑا جہاں ان سب کی رہائش گاہ تھی۔ اس کی عقل ساتھ نہیں دے رہی تھی۔ یہ کیا ہُوا؟ یہ کیسے ممکن ہے؟ وہ سوچ رہا تھا لیکن جو کچھ تھا آنکھوں کے سامنے ہی تھا۔ اُس نے بیگم صاحبہ کو دیکھا جو اطمینان سے ایک کمرے کے صوفے پر بیٹھی سوئیٹر بُن رہی تھیں۔ زاہد کو دیکھ کر اُن کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل

گئی۔ زاہد پریشان نگاہوں سے انھیں دیکھنے لگا۔

"یہ سب، ارے، شازیہ اور ہارون یہ سب آپ... آپ سب لوگ یہاں کیسے آگئے، دیکھنے آئے ہیں نا فرسٹ ایڈ ہاؤس؟"

"جی نہیں، دیکھنے نہیں، رہنے آئے ہیں۔ آپ کہاں غائب ہیں حضرت۔ یہ تمھاری آنکھوں میں سُور کا بال کیسے آ گیا؟ تمھیں اندازہ نہیں ہے کہ تمھیں دیکھے بغیر ہماری آنکھوں کی بینائی کمزور ہو جاتی ہے۔" بیگم صاحبہ نے کہا۔

"اوہ امی! معذرت خواہ ہوں حاضر ہوتا آپ کے پاس لیکن مصروفیات..."

"زاہد! دروغ بیانی کرو گے تو مجھے دُکھ ہوگا۔ یہ مکاری کی نشانی ہے اور میں تمھارے وجود میں کوئی ایسا سقم نہیں دیکھنا چاہتی کہ جو انسانی کمزوری کا باعث ہو۔ میں تمھیں ایک مکمل انسان سمجھتی ہوں۔ بتاؤ کیوں نہیں آتے تھے کوٹھی؟"

"امی! حالات میرے خلاف ہو گئے۔ آپ کو خود اندازہ ہے مجھ سے یہ سوال کیوں پوچھ رہی ہیں؟"

"تو تم نے ہمیں چھوڑ دیا۔ کیوں یہی بات ہے نا؟"

"نہیں امی! چھوڑنے کا کیا سوال ہے لیکن اب وہاں آنا میرے لئے ممکن نہیں تھا۔ زندگی کی ڈور سلجھا رہا تھا کسی نتیجے پر پہنچنے کے بعد ہی آپ کی خدمت میں حاضری دیتا۔"

"تنہا سلجھا رہے تھے تم اپنی زندگی کی ڈور۔ ہم سب مر گئے تھے تاہم کیا اس قابل نہیں تھے کہ تمھارے ان احسانات کا صلہ بھی ادا نہ کرتے جو تم ہم لوگوں پر کرتے رہے ہو، بےکار ہی سمجھا تھا، نا تم نے ہمیں؟"

"امی! میں آپ کی زبان سے ایک بھی تلخ جملہ برداشت نہیں کر سکوں گا۔ آپ میرے لئے بہت بڑی ہیں، بہت عظیم ہیں۔ آپ خُدا کے لئے مجھ سے طنز کا ایک جُملہ نہ کہئے۔ پتہ نہیں کیوں ان دنوں میں ٹوٹ سا گیا ہوں۔" زاہد نے کہا۔

"تو پھر ہمیں اپنے آپ سے دُور کیوں رکھا۔ وہاں سے ہٹ کر تو نے یہ تو سوچا ہوگا زاہد کہ سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ رفتہ رفتہ ہم تجھے بھول جائیں گے۔ کیوں سچ بتاؤ یہی خیال تھا نا تیرے دل میں؟"

"نہیں امی جان! میں جانتا ہوں کہ آپ لوگ مجھے کبھی نہیں بھول سکتے تھے۔"

"تو پھر اپنے اس جاننے سے تو نے فائدہ اُٹھایا۔ تڑپا کر رکھ دیا ہمیں۔"

"غلطی ہو گئی۔ مُعافی چاہتا ہوں مگر آپ سب، آپ سب؟"

"ہم نے شجاع احمد کی کوٹھی چھوڑ دی ہے جس کوٹھی میں زاہد کا احترام نہیں۔ اس کوٹھی میں ہم میں سے کوئی نہیں رہ سکتا۔ ہم نے شجاع احمد کو چھوڑ دیا ہے سمجھے تم نے۔ ہم نے انھیں خیرباد کہہ دیا ہے۔"

"ارے... ارے یہ فیصلہ؟"

"یہ سب کا فیصلہ ہے۔ ابا میاں بھی یہیں آ گئے ہیں ہارون شازیہ، قدسیہ، فیصل، احمد رضا۔ سب لوگ یہاں آ گئے ہیں اب یہی ہمارا ٹھکانہ ہے۔ ہم سب یہاں عام انسانوں کی طرح زندگی بسر کریں گے۔ بھلا انسان، انسان میں بھی کوئی فرق ہوتا ہے۔ جہاں بھی زندگی گزارنے کے لئے صحیح مواقع ملیں وہاں انسان کو اپنے آپ کو ضم کر لینا چاہئے۔"

زاہد کے پورے بدن میں تھرتھری سی دوڑ رہی تھی اسے اتنا بڑا درجہ ملے گا۔ اتنا احترام کیا جائے گا اس کا۔ اتنی بلندی پر پہنچا دیا جائے گا۔ اُسے گمان بھی نہیں تھا وہ آگے بڑھا اور بے اختیار بیگم صاحبہ کے گلے سے لگ گیا۔ زندگی میں یہ پہلا موقع تھا جب وہ اس طرح جذباتی ہوا تھا لیکن بیگم صاحبہ کو اس کا وجود اجنبی محسوس نہیں ہوا۔ انھیں یہی لگا تھا جیسے احمد رضا نے ان کی آغوش میں سر چھپا لیا ہو۔ ان کے ہاتھ اس ممتا اس جذبے اور اس محبت سے زاہد کے گرد لپٹ گئے تھے۔ سب لوگ حیرت و دلچسپی سے یہ منظر دیکھ رہے تھے۔ قدسیہ کے ہونٹوں پر مُسکراہٹ تھی اور آنکھوں میں آنسو۔ تب زاہد نے کہا۔

"ٹھیک ہے امی! میں اب آپ سے بالکل نہیں کہوں گا کہ آپ نے ایسا کیوں کیا بہت اچھا کیا۔ آپ نے شجاع احمد صاحب کو چھوڑ دیا وہ اچھے انسان نہیں ہیں۔ بہت بُرے انسان ہیں وہ۔ بہت ہی بُرے ہیں۔" امی جان نے کوئی جواب نہیں دیا۔ زاہد ان کے گلے سے کافی دیر تک لگا اس لمس سے سکون محسوس کرتا رہا پھر اُس نے کہا۔

"میں بھی اب یہیں پر آپ کے ساتھ رہوں گا۔"

"تو پھر اور کہاں رہو گے تم؟" بیگم صاحبہ نے کہا اور پھر زاہد کافی دیر تک ان سے گفتگو کرتا رہا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ داداجان کے پاس پہنچ گیا تھا۔ داداجان نے اس موضوع پر اس سے کوئی بات نہیں کی بس فرسٹ ایڈ ہاؤس کے معاملات پر گفتگو کرتے رہے۔ وہ شام بڑی دلچسپ و دلکش تھی، نشاط

سرفراز اور سحر وغیرہ بھی یہیں پر موجود تھے۔ دلچسپ بات یہ تھی کہ نشاط کے نزہت اور صوفیہ کو بھی ٹیلی فون کر کے یہیں بُلالیا تھا۔ فرسٹ ایڈ ہاؤس کے دروازے پر ان دونوں کا استقبال کیا گیا۔ بیگم صاحبہ چونکہ گھریلو مصروفیات میں اُلجھی ہوئی تھیں۔ اس لئے وہ یہاں نہیں پہنچی تھیں۔ شام بڑی دلچسپ رہی۔ بیگم صاحبہ ان بچیوں سے مل کر بہت خوش ہوئی تھیں۔ زاہد نے مختصراً ان کا تعارف کرایا تھا تفصیل نہیں بتائی تھی۔ دادا جان قہقہے لگانے میں پیش پیش تھے۔ اور یوں ہی محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ سب شجاع احمد صاحب کی کوٹھی سے نکل کر یہاں آنے کے بعد بہت مسرور ہوں خاصی رات گئے تک یہ ہنگامہ جاری رہا۔ پھر نشاط، نزہت اور صوفیہ کو ان کے گھر پہنچانے کے لئے زاہد نے اپنی خدمات پیش کر دیں۔

"بھئی یہ بچیاں تو مجھے بہت ہی پسند آئی ہیں۔ کیا یہ نہیں ہو سکتا زاہد کہ ہم اپنی اس چھوٹی سی رہائش گاہ میں کسی دن ان لوگوں کو بُلائیں۔ ان کی امی کو بھی دعوت دیں۔"

"ہو سکتا ہے۔ بالکل ہو سکتا ہے۔ ہم سب آپ کی یہ دعوت قبول کرتے ہیں۔" زاہد نے ہنستے ہوئے کہا۔

"ارے، ارے تم عجیب دوغلے آدمی ہو۔ ہم سب سے تمہاری کیا مُراد ہے تم تو میزبان ہو گے۔"

"آدھا یہاں سے میزبان، آدھا وہاں سے مہمان۔"

"اچھا جی! اتنا بڑا مسئلہ ہے۔" بیگم صاحبہ پُرخیال انداز میں زاہد کو دیکھتے ہوئے بولیں اور نہ جانے کیوں زاہد جھینپ سا گیا۔ نشاط بھی اپنے اندر ایک چور سا محسوس کر رہی تھی کیونکہ زاہد کے بعد بیگم صاحبہ کی نگاہ نشاط پر ہی پڑی تھی۔ جہاندیدہ خاتون تھیں۔ زاہد آدھا آدھا ایسے ہی نہیں بٹ سکتا تھا۔ ضرور اس کی کوئی خاص وجہ ہو گی۔ وہ سوچ رہی تھیں۔

*

خانۂ ویراں میں شجاع احمد صاحب کا چوتھا دن تھا۔ اُس وقت تو جذبات میں آکر یہ بات کہہ گئے تھے کہ سب لوگ اگر جانا چاہیں تو چلے جائیں لیکن بھول کر بھی نہیں سوچ سکتے تھے کہ سب کے سب اس طرح چھوڑ دیں گے۔ واپس گھر پہنچے تو کوٹھی بھائیں بھائیں کر رہی تھی فیصل کی معصوم قلقاریوں کا کہیں پتہ نہیں تھا۔ شازیہ کے قہقہوں کی کھنک کہیں سے سُنائی نہیں دے رہی تھی۔ بیگم صاحبہ کا کمرہ خالی تھا۔ بس ملازموں کے کوارٹر میں روشنی تھی۔ اس تاریکی کو دیکھ کر ان کا دل ہول گیا۔ روشنیاں جلاتے پھرے ایک ایک کمرے کی سب کچھ جوں کا توں تھا۔ وہ لوگ کچھ بھی اپنے ساتھ لے کر نہیں گئے تھے۔

پاگلوں کی طرح اِدھر سے اُدھر دوڑتے پھرے۔ مجبور ہو کر ملازموں کے کوارٹر میں پہنچے۔ ملازم بے چارے سہمے سے اپنی جگہ موجود تھے۔ انھوں نے افضل خان سے پوچھا۔

"افضل خان! کہاں چلے گئے یہ سب لوگ؟"

"س... سرکار گاڑی میں بیٹھ کر چلے گئے۔ کسی کو کچھ بتا کر نہیں گئے۔"

"کیا بکواس ہے۔ تم میں سے کسی کو پتہ ہو گا کہ یہ سب کے سب کہاں چلے گئے؟"

"نہیں سرکار ہم پوچھ نہیں سکتے۔"

"ابو جان ... ابا میاں بھی ... میرا مطلب ہے وہ بھی چلے گئے؟"

"وہ تو ان سے پہلے ہی چلے گئے تھے۔"

"ہوں۔" شجاع احمد صاحب اپنے کمرے میں آگئے۔ گھریلو کام کاج کرنے والے ملازم موجود تھے۔ انھوں نے کھانے پینے کے لئے پوچھا لیکن شجاع احمد صاحب نے انکار کر دیا۔ وہ ساری رات انھوں نے اپنے کمرے میں ایک صوفے پر بیٹھے بیٹھے گزار دی دوسری صبح سر بُری طرح چکرا رہا تھا۔ وہ آرام کرنے لیٹ گئے شدید خواہش تھی کہ نیند آجائے لیکن دماغ میں رینگنے والے خیالات نیند کو دُور بھگا چکے تھے۔

دوپہر ہو گئی تو ملازموں نے منت سماجت کی کہ کچھ کھا پی لیا جائے۔ انھوں نے صرف چائے کی ایک پیالی اور چند بسکٹ کھا لئے تھے۔ طبیعت اندر سے اُلٹی جا رہی تھی۔ زاہد کا تصور کر کے ذہن پر جنون سوار ہو جاتا تھا۔ وہی تو تھا جس نے ان سب کو ان سے برگشتہ کر دیا تھا وہی تھا بالکل۔ اُس نے کیا نہیں کیا۔ احمد رضا کا خانہ خراب کر دیا۔ ایک اعلیٰ پائے کے ڈاکٹر کو ایک خیراتی اسپتال کا انچارج بنا دیا تھا۔ ہارون جو ایک خوبصورت اور اسمارٹ لڑکا تھا، ہپی بن گیا۔ ساز و آواز اور شعر و شاعری کے علاوہ اس کی زندگی میں کچھ نہ رہا۔ قدسیہ نے مصوری سیکھ کر اپنے آپ کو تباہ کر لیا۔ شازیہ اور فیصل ابھی بچے تھے اس لئے اس سے بچ گئے۔ بیگم صاحبہ تباہ ہو گئیں۔ دادا

جان مجرمانہ کارروائیوں میں ملوث ہو گئے اور انھوں نے دولت کو لوٹنے کے لئے ایک ایسا منصوبہ تکمیل کو پہنچا دیا جو اب حلق کی ہڈی بن کر رہ گیا تھا۔ گو فرسٹ ایڈ ہاؤس کے اپنے ذرائع تھے لیکن اس کے بارے میں جو حالات معلوم ہوئے تھے۔ اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ یہ ادارہ بلیک میلنگ کر کے بھی دولت جمع کرتا تھا۔ یہ سب کچھ تھا۔ بلاشبہ اس سے شجاع احمد کی ذات پر کوئی خاص اثر نہیں پڑا تھا لیکن بھلا وہ یہ کیسے برداشت کر سکتے تھے کہ ان کی اپنی مملکت میں کسی اور کا حکم چلے۔ زاہد صرف زاہد۔

دوسرا دن اُسی طرح گزر گیا۔ دفتر وغیرہ کا رُخ بھی نہیں کیا تھا۔ جتنے ٹیلی فون آئے ان کے لئے کہہ دیا کہ وہ مصروف ہیں کسی سے نہیں مل سکتے۔ پھر انھوں نے اپنے سیکریٹری کو حکم دیا کہ ان کے تمام پروگرام منسوخ کر دیئے جائیں۔ وہ بیمار ہو گئے ہیں کوئی ٹیلی فون گھر پر نہیں آنا چاہیئے۔ بہت ہی شدید اذیت کے عالم میں زندگی بسر ہو رہی تھی۔ دُو راتیں اور دُو دن تک وہ پلک تک نہ جوڑ سکے تھے۔

تیسرے دن وہ خود بخود سو گئے تو سارا دن سوتے رہے رات کو آنکھ کھلی تو اپنے اردگرد پھیلی ہوئی ویرانی کا احساس ہوا۔ کیا کرنا چاہیئے۔ کیا ہو سکتا ہے۔ معلوم تو کیا جائے کہ یہ سب کے سب گئے کہاں۔ چنانچہ اپنی جگہ سے اُٹھے اور اپنے سیکریٹری کو حکم دیا کہ خفیہ طور پر یہ معلوم کرے کہ حسام احمد صاحب کہاں ہیں؟ باقی لوگوں کے بارے میں انھوں نے کچھ نہیں کہا تھا۔ رات کو تقریباً ساڑھے گیارہ بجے انھیں اطلاع ملی کہ ان کا پورا خاندان فرسٹ ایڈ ہاؤس میں مقیم ہے۔ اس اطلاع سے شجاع احمد صاحب کے تن بدن میں آگ لگ گئی تھی۔ . . . فرسٹ ایڈ ہاؤس ہی بالآخر ان کے لئے ان کا رقیب ثابت ہوا تھا۔ بہر حال چوتھے دن ان کا پیمانۂ صبر لبریز ہو گیا۔ یہ لوگ جس انداز میں بھی زندگی گزاریں جو بھی ہو گا دیکھ لیا جائے گا لیکن زاہد . . . اُسے زندہ نہیں رہنا چاہیئے تھا۔ انھوں نے اپنے دل میں فیصلہ کیا اور ان کے سینے میں انتقام کا جہنم سُلگنے لگا۔ اُسی شام انھوں نے دراز سے پستول نکالا اس کے چیمبر چیک کئے۔ لباس تبدیل کیا اور باہر نکل گئے۔ ان کے چہرے پر خوف ناک ارادے رینگ رہے تھے۔

کار ڈرائیو کرتے ہوئے وہ فرسٹ ایڈ ہاؤس کی جانب چل پڑے۔ چار پانچ دن سے شیو نہیں بنایا تھا۔ بال بھی بے ترتیب تھے۔ اس حلیئے میں انھیں اس سے پہلے کسی نے نہیں دیکھا ہو گا۔ اگر کوئی قریبی ساتھی بھی انھیں دیکھتا تو پہچان نہیں سکتا تھا کہ یہ وہی نفیس طبیعت شجاع احمد ہیں۔

کار تھوڑی دیر کے بعد فرسٹ ایڈ ہاؤس کے اندر داخل ہو گئی اور وہ اُسے لاک کر کے ایک شخص سے ان لوگوں کی رہائش گاہ کے بارے میں معلوم کرنے لگے۔ اُس نے مؤدبانہ انداز میں شجاع احمد صاحب کو حسام احمد صاحب کی رہائش گاہ بتا دی۔

*

فرسٹ ایڈ ہاؤس کی اس رہائش گاہ میں آج بے شمار مہمان آئے ہوئے تھے۔ سرفراز، سحر، مہر النساء بیگم، نشاط، صوفیہ اور نزہت، ناظم علی صاحب کو بھی مدعو کیا گیا تھا لیکن وہ کسی کام سے شہر سے باہر گئے تھے اس لئے وہ آج کی اس دعوت میں معذرت کر گئے تھے۔ قدسیہ اور شازیہ نے اپنے ہاتھوں سے آج سارا دن باورچی خانے میں مہمانوں کے لئے کھانے تیار کئے تھے دادا جان کے فلک شگاف قہقہے گونج رہے تھے۔ سب کے سب ایک بڑے ہال نما کمرے میں موجود تھے۔ مہر النساء بیگم شجاع احمد صاحب سے مل کر بے حد خوش ہوئی تھیں اور بیگم شجاع احمد ان کے کانوں میں انھیں بتا چکی تھیں کہ قدسیہ کی نسبت سرفراز سے طے ہے اور بہت جلد ان دونوں کی شادی کر دی جائے گی اور سحر احمد رضا سے منسوب ہے۔ انھوں نے نہایت بے تکلفی سے کہہ دیا تھا۔

"بہن تمہاری ان تینوں بیٹیوں میں سے کم از کم دو بیٹیاں میں چھین لوں گی۔ ایک اپنے زاہد کے لئے اور دوسری ہارون کے لئے، ارے یہ لڑکا اتنا بُرا نہیں ہے جو تمھیں ہی نظر آ رہا ہے بس دماغ پر سنک سوار ہو گئی ہے جس دن چاہیں گے یہ سنک اُتار دیں گے۔"

مہر النساء کے سینے سے جیسے دو سلیں ہٹ سی گئی تھیں زاہد نے ان سے درخواست کی تھی کہ جس جگہ وہ جا رہی ہیں وہاں اُسے ظفر کے بجائے زاہد کے نام سے پکارا جائے تو وہ اس پر حیرت کا اظہار نہ کریں۔ وہ بتا دے گا کہ سب کچھ ایسا کیوں ہوا ہے۔

بہر طور مہر النساء بیگم کے دل میں یہ خواہش پچھلے کچھ دنوں سے بیدار ہو گئی تھی کہ ظفر اگر ان کی کسی بیٹی کو قبول کرے تو وہ خوشی سے اس کا ہاتھ ظفر کے ہاتھ میں تھما دیں گی۔ یہاں ظفر

کی اہمیت اور قدروقیمت دیکھ کر انھیں اندازہ ہوگیا تھا کہ ظفر ان کی نگاہوں میں کیا شے ہے چنانچہ وہ مسکرا کر خاموش ہوگئی تھیں۔ تقریب کی دلچسپیاں یونہی جاری تھیں کہ دفعتاً دروازہ کھلا اور شجاع احمد اندر داخل ہوگئے۔ ان پر سب سے پہلے پڑنے والی نگاہ داداجان کی تھی۔ شجاع احمد کا حلیہ دیکھ کر داداجان چونک پڑے۔ ان کی آنکھوں میں ایک لمحہ کے لئے غصہ اور دوسرے لمحے تشویش کے آثار نظر آئے شجاع احمد کی خونی نگاہوں میں وہ خون کی چمک صاف محسوس کر چکے تھے۔ شجاع احمد کی نگاہیں ان لوگوں پہ بھٹک رہی تھیں اور پھر وہ زاہد پہ آجمیں۔ بیگم صاحبہ شجاع احمد کو دیکھ کر متحیرانہ انداز میں کھڑی ہوگئی تھیں دوسرے لمحے شجاع احمد نے پستول نکال لیا، آگے بڑھے اور زاہد کا گریبان پکڑ کر اس کو اس کی جگہ سے گھسیٹ لائے سب لوگوں کے حلق سے چیخیں نکل گئی تھیں۔ شجاع احمد کے ہاتھ میں دبے ہوئے پستول کو دیکھ کر سب ہی ایک دم بدحواس سے ہوگئے تھے۔ تب شجاع احمد صاحب غرائی ہوئی آواز میں بولے۔

"اور آج۔ ۔ ۔ آج تیرے ان ہمسدردوں کے مجمع میں میں تیرا بدن گولیوں سے چھلنی کردوں گا۔ میں تجھے قتل کرنے آیا ہوں زاہد۔ دیکھتا ہوں کون تجھے اس وقت موت سے بچا سکتا ہے۔" زاہد نے آہستہ سے اُنکی کلائی پہ ہاتھ ڈالا اور اپنا گریبان ان کے ہاتھ سے چھڑا لیا۔

"یہ تو آپ کا پُرانا پیشہ ہے شجاع احمد کون سی نئی بات ہوگی یہ۔ میری ماں کو بھی آپ نے ہی قتل کیا تھا۔ اگر آج مجھے بھی قتل گے تو ممکن ہے ان لوگوں کے لئے کوئی اجنبی بات ہو لیکن میرے لئے نہیں۔"

"شجاع احمد! تیرا دماغ خراب ہوگیا ہے۔ پستول پھینک دے زاہد کو مارنا اتنا آسان کام نہیں ہوگا۔ اس کے ساتھ ہی تجھے یہاں موجود بیشتر انسانوں کو قتل کرنا ہوگا۔ پستول پھینک دے ورنہ اچھا نہیں ہوگا۔"

شجاع احمد، زاہد کے الفاظ میں ایک لمحے کے لئے گم ہوکر رہ گئے تھے زاہد تلخ لہجے میں کہہ رہا تھا۔

"ہاں! میرے معزز مہربانوں، بیگم صاحبہ، داداجان، الحمد رضا تمھارا یہ باپ اور حسام احمد صاحب، آپ کا یہ بیٹا میری ماں کا بھی قاتل ہے۔ ہاں! یہ میری ماں کا بھی قاتل ہے۔"

"یہ کوئی نیا کھیل کھیلا تو نے۔ میں تیری فطرت کے ایک ایک پہلو سے واقف ہوں زاہد!"

"زاہد نہیں ہے میرا نام۔ ظفر کہتے ہیں مجھے۔ کیوں بیگم شمشیر زمان بتایئے، میرا نام کیا ہے۔ بتایئے اس شخص کو کہ میں کون ہوں۔ سنایئے اُسے میری کہانی۔ خدا کا شکر ہے کہ وہ وقت آگیا کہ آپ سب لوگ اتفاقیہ طور پر یہاں جمع ہیں۔ ہاں سن لیجئے زاہد کی کہانی اس میں مرکزی کردار اس شخص کا ہے۔ اس معزز آدمی کا جس کا نام شجاع احمد ہے۔ شہر کا متمول ترین آدمی ہے۔ یہ بڑے بڑے کام کر چکا ہوں اس میں سرفہرست اس کا ایک کارنامہ ہے۔ وہ یہ کہ یہ میری ماں کا قاتل ہے۔ ظفر کی ماں کا قاتل۔" زاہد کی آنکھوں میں ایک دم خون کی سرخی پیدا ہوگئی تھی اور شجاع احمد صاحب ایک لمحے کے لئے ان الفاظ پہ بھونچکے رہ گئے تھے۔

"مجھے پہچانو شجاع احمد! ہمیشہ ہی تم میرے بارے میں تشویش کا شکار رہے ہو کہ میں کون ہوں؟ ہاں میں تمھیں تباہ کرنے کی قسم کھا کر آیا تھا۔ میں تمھیں قتل کرنے کے لئے تمھاری اس کوٹھی میں داخل ہوا تھا۔ اس لئے کہ تم نے بڑی بے دردی سے میری ماں کو قتل کر دیا تھا۔ نام تو یاد ہوگا تمھیں میری ماں کا۔ وہ تھی میری ماں جو تمھیں شاجی کہتی تھی۔ گل زمان کی بیٹی جمال گڑھی کی رہنے والی۔ شہ بانو تھا اس کا نام۔ مجھے چاہنے والو میری کہانی سُنو۔ میرا نام ظفر ہے۔ پہاڑوں کی آغوش میں رہنے والے ایک خاندان کا فرد ہوں میں۔ شجاع احمد نے وہاں جنگلوں کی کٹائی کا ٹھیکہ لیا تھا۔ میری ماں سے اس نے محبت کی پینگیں بڑھائیں، اور پھر اس کے بزرگوں کو مجبور کر کے اس سے شادی کرلی لیکن وہاں سے واپسی پر جب اُسے مجبور کیا گیا کہ وہ اپنی بیوی کو بھی ساتھ لے جائے تو یہ شخص بوکھلا گیا۔ بستی والوں کو دھوکا دینے کے لئے وہ میری ماں کو وہاں سے لے آیا لیکن جنگل میں لاکر اس نے اُسے گولی ماردی۔ گاؤں کی اس معصوم دیہاتی لڑکی کو وہ اپنے خاندان میں اپنی بیوی کی حیثیت سے کیسے پیش کر سکتا تھا۔ اُسے گولی مار کر جنگل میں پھینک آیا لیکن مارنے والے سے بچانے والا بہت بڑا ہے۔ نواب شمشیر زماں شکار کھیلنے گئے تھے۔ اُنھوں نے میری ماں کو دیکھا اور اُسے وہاں سے اُٹھا لائے۔ میں بدنصیب اس کے شکم میں تھا۔ شمشیر زماں کی کوٹھی میں میری ماں کو پناہ ملی۔ اس حادثے نے اس

سے گویائی چھین لی تھی۔ میری ماں شکوک و شبہات کا شکار رہی۔ اس کا نام صفیہ رکھ دیا گیا۔ میں پیدا ہوا اور نواب شمشیر زماں نے رحم دلی اور محبت کی بنا پر مجھے بیرونِ ملک تعلیم کے لئے بھجوایا۔ پھر خدا نے مجھ سے میرا باپ چھین لیا۔ شمشیر زماں ایک حادثے کا شکار ہو گئے۔ میں بڑا ہو چکا تھا۔ شمشیر زماں کی طرف سے مسلسل خاموشی سے پریشان ہو کر میں واپس آ گیا تو مجھے علم ہوا کہ اب میری ماں بھی اس کوٹھی میں نہیں ہے۔ میں اس کی تلاش میں سرگرداں رہا اور وہ مجھے مل گئی۔ میں نے اُسے مجبور کیا۔ وہ مجھے بتائے کہ میں کس کی اولاد ہوں اور میرے الفاظ کی تلوار نے اُس کی زبان کھول دی۔ وہ بول پڑی اور اُس نے مجھے اس قاتل کے کے بارے میں بتایا۔ تب میں اس کی تلاش میں لگ گیا اور میں نے اُسے تلاش کر لیا۔ میں اُسے فنا کرنے آیا تھا لیکن اس کی کوٹھی میں داخل ہو کر میں جذباتی ہو گیا میں نے یہاں ایسے معصوم چہرے دیکھے جو اس کے زیرِ پناہ تھے۔ اُس کو باپ کہتے تھے۔ میں اُلجھ گیا۔ میں نے اُسے قتل نہیں کیا لیکن اس کی شکل دیکھ کر میرے وجود میں جہنم سلگتا رہتا تھا۔ اُسے کسی ذہنی اذیت کا شکار دیکھ کر میرے دل دل میں ٹھنڈک پیدا ہوتی تھی۔ میں نے اپنے انتقام کی شکل بدل دی تھی، اور دیکھو میرا انتقام۔ آج یہ تنہا ہے۔ گولی مارو مجھے شجاع احمد۔ تم قاتل ہو۔ پرانے قاتل۔ تمہارے لئے یہ کام کون سا مشکل ہے۔"

شجاع احمد بید مجنوں کی مانند کانپ رہے تھے۔ زاہد کے ایک ایک لفظ پر وہ قتل ہوئے تھے۔ زاہد کی کہانی پر سب ہی رو رہے تھے۔ مہرالنساء بیگم شرم سے زمین میں گڑھی جا رہی تھیں۔

دفعتاً وہ آگے بڑھیں اور پُرجوش لہجے میں بولیں۔

"ظفر کو کون مار سکتا ہے کس کی مجال ہے جو اس کا بال بھی ٹیڑھا کر سکے۔ میں اس کی ماں ہوں۔ یہ شمشیر زماں کا بیٹا ہے۔ لعنت بھیجو ظفر۔ میرا سب کچھ تمہارا ہے۔ تم میرے بیٹے ہو۔ کہاں ہے میری صفیہ، مجھے اس کے پاس لے چلو۔ میں اس کے قدموں میں سر رکھ کر معافی مانگوں گی۔ ظفر جیسا اعلیٰ ظرف تمہارا بیٹا کیسے ہے شجاع احمد۔ اس نے میری عزت بچائی ہے۔ صفیہ کو شمشیر زماں ساتھ لائے تھے۔ میں نے اُسے شک کی نگاہ سے دیکھا اور اس کے ساتھ جانوروں کا سا سلوک کیا وہ ہمیشہ میرے ستم کا شکار رہی لیکن جب مجھے تباہی کا سامنا کرنا پڑا تو یہ صرف ظفر تھا جس نے میری عزت بچائی۔ اپنی عزت کے اس محافظ کے لئے خدا کی قسم میں ہزار بار مرنے کے لئے تیار ہوں۔"

پستول شجاع احمد کے ہاتھ سے گر گیا۔ دادا جان پُرسکوت تھے۔ دفعتاً وہ اپنی جگہ سے اُٹھے پاؤں سے جوتا اُتارا اور پھر شجاع احمد پر پل پڑے۔ وہ شجاع کو بُری طرح پیٹ رہے تھے اور شجاع احمد گردن جھکائے کھڑے تھے۔

"مردود، کمینے، ذلیل، خاندان میں کسر تھی نا۔ بارہ سنگی کے گدھے یہ ہے تیری شرافت بول، ابے بول۔ شادی کی تھی تو نے، جواب دے کی تھی؟"

"ہاں آبا میاں، ہاں ابو جان! اُس نے جو کچھ کہا ہے وہ سچ ہے۔ اب یہ جوتا اس کے ہاتھ میں دے دیجئے۔ اگر آپ اس پر حق رکھتے ہیں تو اس سے کہئے کہ اس جوتے سے میرے پورے بدن کو داغدار کر دے۔ اس سے کہئے ابو جان کہ یہ مجھے مارے۔ دل کی ساری بھڑاس نکال لے یہ، اور... اس کے بعد اگر میں زندہ بچ جاؤں تو۔ مجھے معاف کر دیجئے۔ مان سکتا ہے وہ آپ کی بات ابو جان کر سکتا ہے یہ۔ مجھے معاف کر دیجئے ابو جان۔ آپ مجھے سب کچھ دیتے رہے ہیں، آج پھر میں بہت چھوٹا ہو گیا ہوں مجھے میرے بیٹے سے معاف کرا دیجئے ابو جان!"، شجاع احمد صاحب زار و قطار رونے لگے۔

"ابے لعنت ہے تجھ پر۔ مقدمہ چلاؤں گا میں تجھ پر۔ جیل میں سڑواؤں گا ساری عمر۔ مجرم روسیاہ۔ ابے ہم کھڑے ہیں۔ دولت کما لینے سے ذات تھوڑی بدل سکتی ہے۔ تو نے یہی کیا جو کر سکتا تھا۔"

"زاہد۔" بیگم شجاع احمد آگے بڑھیں۔ "ایسا ہی کرو گے زاہد، بولو ایسا ہی کرو گے۔ وہ میرا سہاگ ہیں۔ وہ شبانو کا سہاگ ہیں۔ وہ تمہاری قدسیہ کے باپ ہیں۔ تمہارے باپ ہیں۔ زاہد! میں کہتی ہوں انھیں معاف کر دو۔ میں کہہ رہی ہوں زاہد۔ میں..." بیگم صاحبہ نے دونوں ہاتھوں سے زاہد کی قمیص پکڑ لی۔ اُن کی آواز میں شدید ہیجان تھا۔ دانت بھینچے ہوئے تھے ان کے۔

"میں نے اپنی اوقات سے بہت بڑھ کر بات کی ہے زاہد۔ نہ جانے کیوں میرے لئے معاف کر دو انھیں... انھیں معاف کر دو۔"

"میں نے معاف کر دیا امی۔ خدا کی قسم میں آپ کا حکم نہیں ٹال سکتا۔" زاہد نے ان کا سر سینے سے لگا لیا، اور بیگم چیخ مار کر بے ہوش ہو گئیں۔ زاہد نے انھیں اپنے بازوؤں پر سنبھال لیا تھا۔

خوشیوں کی یہ محفل عجیب ہو گئی تھی۔ بیگم صاحبہ ہوش میں آئیں تو زاہد ان کے قریب موجود تھا۔ "زاہد... شہانو کہاں ہے؟"

"یہیں اسی شہر میں، ہیں وہ بابا اکرم دین اور چھیمو ان کے ساتھ ہیں۔"

"چلو، انھیں لینے چلو۔ وہ مجھ سے پہلے ہے۔ تم شجاع احمد کے بڑے بیٹے ہو۔ سب تمھارے بعد ہیں۔ میں جانتی ہوں کہ تم شجاع احمد سے کہیں زیادہ اپنے بہن بھائیوں کے ہمدرد ہو۔ انھیں سنبھال سکتے ہو۔ چلو جلدی کرو۔ میں اُن معصوم کو یہاں لاؤں گی۔ اس کے بغیر کچھ نہیں ہو گا۔ سب چلیں گے اُسے لینے ہم سب چلیں گے۔"

گاڑیاں تیار ہوئیں اور برات چل پڑی۔ ایک گندے محلے کے معمولی سے مکان میں شہانو موجود تھی۔ سب زاہد کے معترف تھے۔ اس نے دولت کی اس ریل پیل سے اپنے لئے کچھ نہیں کیا تھا۔ بعد کے مناظر بے حد رقت انگیز تھے۔ بانو شجاع احمد کو دیکھ کر سکتے میں رہ گئی تھی۔ مہر النساء اس کے قدموں سے لپٹ گئی تھیں۔ دادا جان اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہہ رہے تھے۔

"گھر چلو بہو۔ یہ کنجڑے کی اولاد ہے۔ اس سے اور کیا توقع کی جا سکتی تھی۔ میں بد نصیب اس کا باپ تم سے شرمندہ ہوں۔ مجھے معاف کر دو بہو گھر چلو۔"

"واپسی میں جب گاڑیاں فرسٹ ایڈ ہاؤس کی طرف چلیں تو شجاع احمد نے کہا۔" دادا جان کوٹھی چلئے۔ سب نے مجھے معاف کر دیا ہے تو اب۔ وہاں جانے کی کیا ضرورت ہے اور گاڑیاں شجاع احمد کی کوٹھی کی طرف مڑ گئیں۔ پوری کوٹھی روشن ہو گئی۔ ایک ایک بلب خود شجاع احمد نے اپنے ہاتھ سے جلایا تھا۔ چھیمو نے نشاط کے کان میں کہا۔

"نشاط بی بی یہ... یہ صفیہ پھوپی کے میاں ہیں۔" اشارہ شجاع احمد کی طرف تھا۔ نشاط نے اس کے سر پر دھول جما دی تھی۔

ایک ماہ کے بعد قدسیہ اور سرفراز کی شادی تھی۔ چاروں طرف ہنگامے ہی ہنگامے تھے۔ اس دوران بہت کچھ ہو چکا تھا بزرگوں میں بہت سے رشتے طے ہو گئے تھے۔ نشاط ظفر کے لئے مانگ لی گئی تھی۔ سحر احمد رضا کے لئے اور نزہت ہارون کے لئے جسے مار مار کر زاہد نے شاعر سے آدمی بنا دیا تھا دوسرے مہینے ان تین جوڑوں کو یکجا کرنے کی تاریخ طے پا گئی تھی۔

شادی کے ہنگاموں میں زاہد کو نشاط سے گفتگو کرنے کا موقع ملا تو اس نے کہا۔

"منسوبہ محترمہ۔ ذرا ہر چیز کی ریہرسل کر لیجئے۔ اگلے ماہ ہمیں بھی انھیں مراحل سے گزرنا ہے۔"

"شرارت نہیں ظفر صاحب! بس میں کہے دیتی ہوں ہاں!" نشاط نے شرما کر کہا۔

"ایک نظم کہی ہے اس موقع پر۔" عقب سے ہارون کی آواز سنائی دی۔

"ابے تیری نظم کی ایسی تیسی..." زاہد اس کی طرف مڑا، اور ہارون ہوا ہو گیا۔